آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر

ایک عظیم تاریخی دستاویزی اور شاہکار پیشکش

آئینۂ حسنِ خوباں

جلد اوّل

از قلم حقیقت رقم

ادیب شہیر رئیس التحریر صاحب تصانیف کثیرہ

علامہ محمد وارث جمال قادری

مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی انڈیا

ناشر

آل انڈیا تبلیغ سیرت

حبیب منزل ڈمٹمکر روڈ ممبئی ۸

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر
ایک عظیم تاریخی دستاویزی اور شاہکار پیش کش

آئینۂ حسنِ خوباں

(جلد اوّل)

از قلم حقیقت رقم

ادیب شہیر، رئیس التحریر، صاحبِ تصانیف کثیرہ

علامہ محمد وارث جمال قادری

مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت

ناشر

آل انڈیا تبلیغ سیرت

حبیب منزل، ڈِمٹمکر روڈ، ممبئی ۸

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب: آئینۂ حسنِ خوباں

مصنف: مولانا محمد وارث جمال قادری یار علوی

تصحیح: مولانا محمد آصف جمال قادری، اُستاذ جامعہ امام احمد رضا، رتنا گیری

مولانا ظفر احمد نورانی امجدی، خطیب و امام غوثیہ مسجد، چاندولی، ممبئی

کمپوزنگ: محمد زبیر قادری (رابطہ: 9867934085)

صفحات: 896

اشاعت: فروری ۲۰۲۴

قیمت: 1100

تزئین: شعبہ نشریات آل انڈیا تبلیغ سیرت اڈیشا M.9438213988

پرنٹر: ارقم گرافکس برہم بردہ جاجپور Mob:-9853188270

ناشر: آل انڈیا تبلیغ سیرت، حبیب منزل، ڈِمٹمکر روڈ، ممبئی ۸

Mob:-9820815674,9892122786,9658133151

ملنے کا پتہ:

دفتر آل انڈیا تبلیغ سیرت، حبیب منزل، ڈِمٹمکر روڈ، ممبئی ۸ Mob:-9892122786

دفتر ادارۂ شرعیہ کٹک اڈیشا Mob:-9853757574

دفتر اقرا ہائی ٹیک ایجوکیشنل بورڈ اڈیشا Mob:-9853600232

خانقاہ قادریہ راہ سلوک۔ بونتھ بھدرک Mob:-9938749306

حُسنِ ترتیب

اظہارِ خوباں (تذکارِ جمال)

آئینۂ سیرت

داستانِ حرم

تاریخ عزیمت

منظرنامہ

آئینۂ رضویات

اُجالوں کے سفیر

یادِ رفتگاں

آئینۂ معاصر

آئینۂ تحریکات

آئینۂ خدمات

نقد ونظر

آئینہ در آئینہ/روبرو

☑☑☑☑☑☑

شرفِ انتساب!

سلطان المناظرین، امام المتکلمین، سند الکاملین، سنّوسی ہند حضرتِ اقدس بابرکت سرکار مجاہدِ ملت

علامہ مفتی شاہ **محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی حامدی اشرفی**، رئیس اعظم اُڑیسہ

اوران کے استاذِ جلیل حضور صدر الافاضل، فخر الاماثل، اُستاذ العلماء، سند الحکماء، امام الہند،

سید المفسرین، امام المناظرین، حضرت علامہ مفتی **سید نعیم الدین مراد آبادی**

اور آپ یعنی حضرت مجاہدِ ملت کے مرشدِ اجازت وخلافت شیخ الانام، حجۃ الاسلام، امام العلماء، شہزادۂ اعلیٰ حضرت، حضرت علامہ مفتی **محمد حامد رضا خاں بریلوی** ومرشدِ اجازت وخلافت مخدوم الاولیاء،

تاج المشائخ مجددِ سلسلۂ چشتیہ اشرفیہ حضرتِ اقدس، پیر طریقت

مولانا سید شاہ **علی حسین اشرفی میاں اشرفی** جیلانی کچھوچھوی

اور آل انڈیا تبلیغ سیرت کے محسنِ اعظم جنھوں نے اس جماعت میں ایک نئی روح پھونکی اور اس کے عروج وارتقا کے لیے بے پناہ مالی قربانیاں پیش کر کے اسے تب وتاب جاودانہ عطا کیا۔ جس کی برکتوں کے فیضان سے اس جماعت کا شہرہ عرب وعجم میں ہوا۔ پوری دنیا میں اس کا آوازہ بلند ہوا۔ جس کی خصوصی عنایت وتوجہ خاص نے آل انڈیا تبلیغ سیرت کو وہ نقطۂ عروج عطا فرمایا کہ زمانہ دیکھتا رہ گیا۔ اور جب اس نے ایک جاں سوختہ عشق واخلاص پیشہ کی طرف (یعنی حضور مجاہد ملت) اپنی دوستی کا ہاتھ بڑھایا، تو اپنی آخری سانس تک حقِ دوستی ادا کرتے ہوئے دنیا کو دوستی کا مفہوم سمجھا گیا۔

یعنی مردِ خود آگاہ وخدا آگاہ عارفِ حق **حضرت دولہا خاں عرف ٹوپی والے بابا**

قدس اسرارہم ورفع درجاتہم کے نام!

تشنۂ توجہ ومحتاجِ کرم

محمد وارث جمال قادری یار علوی

مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت

۱۴ر ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ مطابق ۴ر جون ۲۰۲۳ء

ہدیۂ خلوص وعقیدت!

میرے مرشد بیعت، شیخ المشائخ حضور شعیب الاولیاء، عاشقِ محبوبِ کبریا،
حضرتِ اقدس بابرکت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قادری چشتی، بانی دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف

اوران کے نامور فرزند ارجمند اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک دار العلوم کے ناظم اعلیٰ وخانقاہِ فیض الرسول کے سجادہ نشین اپنے والد گرامی ومرشد اعظم کے خصوصی انتخاب
حضرتِ اقدس بابرکت پیر طریقت مولانا محمد صدیق احمد قادری چشتی ضیائی

اور حضور شعیب الاولیاء کے نہ صرف مرید بلکہ مراد اور اُن کے خلیفۂ اعظم ومرشد زادے
حضرتِ اقدس بابرکت پیر طریقت قطبِ زمانہ حضرت **پیر عبد المتین صاحب** قبلہ ڈھلمئو شریف

اور میرے مرشد اجازت وخلافت، عاشقِ رسول، صاحبِ تصانیف کثیرہ وجلیلہ، مفسرِ قرآن
حضرتِ اقدس بابرکت علامہ **مفتی محمد فیض احمد اویسی**، بہاول پور پاکستان

اور میرے اُستاذ کریم شیخ الاساتذہ، سند المحققین، رئیس الاتقیاء، فخر المدرسین
حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی شاہ محمد بدر الدین احمد قادری رضوی

علیہم الرحمۃ والرضوان کی بارگاہانِ قدس میں بہ صد ہزار اخلاص فراواں کے ساتھ!
ع گر قبول زہے عز وشرف!

سگِ بارگاہانِ عالی وطالبِ دُعا
محمد وارث جمال قادری یار علوی
۱۴ر ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ مطابق ۴ر جون ۲۰۲۳ء

ہدیۂ تشکر و پُرخلوص دعائیں!

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے مرکزی باڈی کے ارکان وعہدے داران وبہی خوان دل کی اتھاہ گہرائیوں کے ساتھ شکر گذار و دعا گو ہیں۔ گونا گوں صلاحیتوں کے حامل، بے حد متحرل وفعال، کشادہ دست، کشادہ قلب شخصیت گرامی قدر محترم مولانا الحاج علامہ **مفتی محسن رضا قادری رضوی ثقافی اڑیسوی**، مرکزی جنرل سیکریٹری آل انڈیا تبلیغ سیرت کا، جنھوں نے اس عظیم وضخیم تاریخی ودستاویزی کتاب
"**آئینۂ حُسنِ خوباں**" کی طباعت کا بارِ عظیم (جس کا بجٹ لاکھوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے) اپنے توانا کاندھوں پر اُٹھالیا اور جماعت کے ذمے داروں کو اس تعلق سے فنڈ فراہمی کی زحمتوں سے بچالیا ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند
مولیٰ عزوجل ان کے اس اخلاص کو قبول فرمائے اور اپنے حبیب پاک صاحبِ لولاک صلی المولیٰ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے ان کے علم وفضل میں، عمر میں، رزقِ حلال میں خوب خوب برکتیں عطا فرمائے۔
انھیں اور ان کے پورے خاندان کو دین ودنیا کی تمام تر سعادتوں ومسرتوں سے نوازے اور انھیں تمام تر آسمانی بلاؤں، وباؤں سے محفوظ و مامون فرما کر اپنے حفظ و امان میں رکھے اور امام التارکین حضور مجاہدِ ملت، حضرت علامہ مفتی شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی حامدی اشرفی علیہ الرحمۃ والرضوان کی روحانیت قدم قدم پر ان کی دستگیری فرمائے۔ آمین بجاہِ حضور سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

محمد وارث جمال قادری یار علوی

مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت وارکان
حبیب منزل، ڈِمٹمکر روڈ، ممبئی ۸

ایک اہم اور ضروری اعلان

آل انڈیا تبلیغ سیرت، یہ امام التارکین، سلطان المناظرین، اُستاذ الکاملین، رئیس المتکلمین حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری، حامدی اشرفی علیہ الرحمہ کی ایک عظیم یادگار تنظیم ہے۔ جس کے فروغ واشاعت کے لیے حضور مجاہد ملت نے بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔ جس کی دینی، ملّی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی خدمات کا دائرہ مذہبی میدانوں سے لے کر سیاسی ایوانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ جو اپنے عہدِ زرّیں میں ہندوستانی مسلمانوں ومظلوموں کا مرکزِ امید اور ان کی آبرومندانہ بقا کی علامت کے طور پر مسلمانوں کے دلوں میں ہی نہیں بلکہ ان کی دھڑکنوں میں رچی بسی رہی۔ جس کے پچھتّر ۷۵ ر سالہ حسنِ خدمات کی ایک زرّیں تاریخ ہے۔ جو اردو زبان کی طرح عروج وزوال کے کئی دور دیکھنے اور اپنوں کے ہاتھوں لہولہان ہونے کے باوجود بڑی سخت جان ہے۔ جس نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے۔ جسے خود غرضیوں کی بھینٹ چڑھانے اور مفاد پرست ہاتھوں سے بچانے، نیز سرکار مجاہد ملت کے بے لوث وبے غرض اہلِ عقیدت ومحبت کے ذمے دارانہ ہاتھوں میں مستقلاً محفوظ کر دینے کی غرض سے پچیس ۲۵ ر برس پہلے حکومت ہند سے کل ہند سطح پر رجسٹرڈ کرا لیا گیا ہے۔ جس کے مرکزی صدر ملک کے مشہور عالم دین وعالمی شہرت یافتہ صاحبِ طرز انشا پرداز ادیب شہیر، رئیس التحریر، صاحبِ تصانیف کثیرہ حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری یار علوی اور نائب مرکزی صدر محترم مولانا الحاج ہدایت اللہ خاں قادری اور مرکزی جنرل سکریٹری ملّی جذبے سے سرشار، کشادہ دست وکشادہ قلب حضرت مولانا الحاج مفتی محمد محسن رضا قادری رضوی ثقافی اڑیسوی ہیں۔

ان کے علاوہ ممبئی کی اہم شخصیات ورجال پر مشتمل ایک پُروقار باڈی ہے، جو آل انڈیا تبلیغ سیرت کو پہلے ہی کی طرح متحرک وفعال بنانے کے لیے بڑی خاموشی کے ساتھ مصروفِ عمل ہے۔

پورے ملک کے ہر خاص وعام کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کا نام استعمال کرنے کے لیے آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی کی تحریری اجازت ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر بمبئی ہائی کورٹ میں اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

البتہ پورے ملک میں ہر جگہ آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی کی تحریری اجازت سے تبلیغ سیرت کی شاخیں کھولی جاسکتی ہیں اور جگہ جگہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کو قائم کیا جاسکتا ہے۔

من جانب: **اراکین مرکزی آل انڈیا تبلیغ سیرت**، حبیب منزل، ڈِمٹمکر روڈ، ممبئی ۸

مناجات

از: اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی

اے خدا اے مہرباں مولائے من اے انیسِ خلوت شبہائے من

اے کریم و کارساز و بے نیاز دائم لاحسان شہہ بندہ نواز

اے بیادت نالہ مرغِ سحر اے کہ ذکرت مرہم زخم جگر

اے کہ نامت راحتِ جان و دِلم اے کہ فضلِ تو کفیلِ مشکلم

ہر دو عالم بندہ اکرام تو صد تو جانِ من خدائے نام تو

ما خطا آریم تو بخشش کنی نعرۂ انِّی غفورٌ می زنی

اللہ اللہ! ایں طرف جرم و خطا اللہ اللہ! زاں طرف رحم و عطا

تو فرستادی بما روشن کتاب می کنی با ما حکامت خطاب

از طفیل آں صراطِ مستقیم قوتِ اسلام رادہ اے کریم

بہرِ اسلامے ہزاراں فتنہا اِک مہ و صد داغِ فریاد اے خدا

اے خدا بہرِ جنابِ مصطفےٰ ﷺ چار یارِ پاک و آلِ باصفا

بہرِ آب گریہ تر دامناں بہرِ شور خندۂ طاعت کناں

بہرِ حبیب چاکِ عشق نامراد بہرِ خونِ پاک مردانِ جہاد

پر کن از مقصد تہی داماں ما از تو پز رفتن زما کردن دعا

ما کے بودم و دعائے ماچہ بود

فضلِ تو لداد اے رب و دود

نعتِ پاک

تعالیٰ اللہ ذاتِ مصطفیٰ کا حسن لاثانی
کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصاف انسانی

دعائے یونسی خلق خلیلی صبرِ ایوبی
جلالِ موسوی، زہد مسیحی، حسن کنعانی

بہار آئی ہوئی آراستہ پھر بزم امکانی
ہوا گلزار عالم پھر جواب باغِ رضوانی

کہاں کا دشت ایمن طور کیا برقِ تجلّی کیا
یہ سب کچھ تھا جمالِ مصطفیٰ کی پرتو افشانی

محمد وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی
محمد وہ حریم قدس کا شمع سبستانی

وہ فاتح جس کا پرچم اطلس زنگاری گردوں
وہ اُمّی جس کے آگے عقلِ کل طفل دبستانی

وہ شاہ بوریا مسند سکھایا جس نے دنیا کو
یہ اندازِ جہانگیری، یہ اندازِ جہاں بانی

خدا ہی جانے اس سرکار کا کیا مرتبہ ہوگا
غلام بارگاہ جس کے کہیں ما اعظم ثانی

اظہارِ خوباں

(تذکارِ جمال)

آغازِ سخن

مولای صل وسلم دائماً ابداً علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

سرد آہیں، گرم آنسو، آنسوؤں میں خونِ دل
کہہ رہے ہیں اس طرح افسانہ در افسانہ ہم

یہ ضخیم ومبسوط کتاب ''آئینۂ حسنِ خوباں'' جوآپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ میری کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ یہ میرے چند مقالات ومضامین کا مجموعہ ہے جومختلف اوقات میں لکھے گئے اور ملک وبیرونِ ملک کے رسائل وجرائد میں شائع بھی ہوئے۔ البتہ چند شخصیات ورِجال پر چند مقالات تازہ ونئے ہیں۔ اور کچھ رسائل وکتب بھی جو ماضی قریب میں شائع ہو چکے ہیں۔ جیسے ''سر میدان کفن بر دوش دارم''، ''فقہ وفقۂ حنفی وامام اعظم ابوحنیفہ''، ''اختلاف بین المسلمین اوراس کا پس منظر''، ''اسلام میں بریلوی ایک فرقہ!''، وغیرہ وغیرہ۔ جواس لیے شاملِ اشاعت کر دیئے گئے کہ وقت کے بے رحم ہاتھوں سے یہ ضائع ہونے سے بچ جائیں۔

یوں تومیرے قلم کی عمر نصف صدی سے بھی زائد ہے اورڈھائی درجن سے زیادہ کتابیں مختلف موضوعات پر لکھنے کی مجھے سعادت حاصل ہے۔ اربابِ علم ودانش اور اصحابِ فضل وکمال کا ایک بڑا طبقہ ہماری زبان وقلم اور اسلوب ونگارش کا قدردان ہے۔ اوراس میں وقت کی عظیم وجلیل شخصیتیں بھی شامل ہیں، جیسے حضور مجاہد ملت حضرت علامہ مفتی حبیب الرحمٰن قادری عباسی، خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی، رئیس القلم علامہ ارشد القادری، شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی، خطیب اعظم حضرت علامہ قمر الزماں اعظمی، علامہ سید جیلانی محامد اشرفی جیلانی، علامہ سید شمیم گوہر الہٰ آبادی، پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد مجددی نقشبندی، علامہ سید وجاہت رسول قادری، علامہ مفتی محمد مکرم دہلوی اور یہ تعداد کم نہیں ہے۔ جس پر میں اپنے رب کا جتنا شکرادا کروں وہ کم ہے۔

اب میں عمر کی اس منزل میں داخل ہو چکا ہوں جسے زندگی کا آخری پڑاؤ کہا جاسکتا ہے۔ تقریباً ۷۵ رسال! بیماریوں میں گھرا ہوا ہوں۔ دونوں آنکھوں کا آپریشن ہو چکا ہے۔ آنکھیں بھی اب قلم کا ساتھ نہیں دے پارہی ہیں۔ کمزوریوں کے سبب نہ زیادہ دیر بیٹھ سکتا ہوں اور نہ دیر تک قلم ہی چلا سکتا ہوں۔ ؎

بس ہو چکی نماز مصلّے بڑھائیے

یہ کتاب بہت پہلے منظر عام پر آچکی ہوتی مگر ابھی ۱۲ رجمادی الاخریٰ ۱۴۴۴ھ مطابق ۵ رجنوری ۲۰۲۳ء شب

جمعہ میری اہلیہ، میری نصف بہتر اور میرے چھ بچوں کی ماں نے داعی اجل کو لبیک کہا انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔
بعد نمازِ جمعہ درگاہ قبرستان ممبرا میں حضرت خواجہ سید فخر الدین علیہ الرحمہ کے جوارِ رحمت میں آسودہ خاک ہوئیں۔
نور اللہ مرقدھا و قدست سرھا و جعل الجنۃ مشواھا فیھا ۔

کیا خبر کس بہانے آجائے　　　　موت کے سو بہانے ہوتے ہیں

نمازِ جنازہ میرے مخلص دیرینہ ورفیق دیرینہ، میرے کرم گستر و کرم فرما وقوتِ بازو، گرامی قدر محترم مولانا ہدایت اللہ قادری متینی، نائب مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت نے پڑھائی۔ علمائے کرام وخواص اہلِ سنّت کی ایک بڑی تعداد نمازِ جنازہ وتدفین میں شریک تھی ۔

امیر جمع ہیں سب لوگ دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے

میں بہت پہلے سے اپنوں کا گزیدہ تھا اور ہوں۔ کم وبیش ۲۲ ربرس سے وہ ہمیں قسطوں مار رہے تھے اور ابھی بھی رُلا رہے ہیں۔ ایسے میں ان کا وجود میرے لیے ایک حفاظتی دستہ ہی نہیں بلکہ ایک آہنی حصار بھی تھا۔ پہلے انھوں نے اس آہنی حصار کو توڑا کہ میرا قصہ جلد تمام ہو سکے۔ تا کہ باپ کی وراثت جو شرعاً سات حصوں میں تقسیم ہونی تھی، جو کم وبیش دس کروڑ کی مالیت کی ہے، وہ صرف دو حصوں میں تقسیم ہو، جس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔
الدّنیا جیفۃ و طالبھا کلاب۔ دنیا مردار ہے اور اس کے طالب کتّے۔
بے شک بندہ جب اپنے سیاہ باطن کے سبب جری علی اللہ، جری علی الرسول اور جری علی الشریعۃ ہو جاتا ہے تو اس کے دل سے ہر طرح کا خوف نکل جاتا ہے۔ نہ قبر کی تاریکی کا خوف، نہ موت کا خوف اور نہ دنیا وآخرت کی روسیاہی کا خوف۔ جرم واحساسِ جرم، گناہ واحساسِ گناہ دل سے نکل جاتا اور اس قرآنی حقیقت اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ سے قصداً آنکھیں چرا لیتا ہے۔ اور اپنے عالمانہ وضع قطع اور دینی لباس میں بڑے بڑے خالص دنیا داروں کو پچھاڑ دیتا ہے۔ اور یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ اس معاملے میں جو پیش پیش ہے، اس پر عالمِ دین کی تہمت لگی ہوئی ہے فَاِلَى اللّٰهِ المشتکی ۔

نہ اِدھر اُدھر کی تُو بات کر، یہ بتا کہ قافلہ کیوں لُٹا
مجھے رہزنوں سے غرض نہیں، تیری رہبری کا سوال ہے

حضرت علامہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی مرحوم نے بہت پہلے اپنی اہلیہ کے انتقال پر اپنے قلبی تاثرات اور عہدِ پیری میں ان کے داغِ مفارقت کے درد کو صفحۂ قرطاس پر اُتار کر رکھ دیا تھا۔ اس کے کچھ اشعار ہمارے بھی حسب حال ہیں

آہ و جبر و بے کسی اور وہ صبر و بندگی　　　　درد تو تھا صدا نہ تھی آگ تو تھی دھواں نہ تھا
اپنی متاعِ زیست تو چشم زدن میں لٹ گئی　　　　مانا یہ سانحہ کوئی نادرہ جہاں نہ تھا

نرگس کور دیدہ کہ لگ ہی گئی نظر اسے　　لالہ بے کلف میرے وہم کو بھی گماں نہ تھا

ہائے نصیب دشمناں آنکھ کھلی تو الاماں

زیر قدم زمیں تو تھی سر پہ آسماں نہ تھا

خیر سے وہ ایک عظیم عالمِ دین، شاعروادیب ونقاداور عالمی شہرت یافتہ حکیم ودانش ور تھے۔ پھر ان کے بعد خاکِ اشرفیہ سے کوئی دوسرا اشر رمصباحی نہیں پیدا ہوا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

جبکہ ایک معمولی سانثر نگار میں بھی درد کے اسی صحراو کرب کے اسی منزل سے گذر رہا ہوں، جس سے وہ بہت پہلے گذر چکے تھے۔ البتہ اپنے مجموعہ محاسن کے باون سالہ رفاقت اور ازدواجی زندگی اس کی قربانیوں، اس کے صبر وضبط اور تحمل وقوتِ برداشت، ذہانت، متانت، کم گوئی، دل جوئی، دل نوازی ودل بدست آوری کی تفصیل سپر دِقلم کروں تو مزید سو صفحے کا اضافہ ہوجائے گا ؎

قافلہ درد کااس رات کی تاریکی میں　　منزل ضبط کا رہ رہ کے پتہ مانگے ہے

چپ ہے ہر رگِ گلو چپ ہے شہیدوں کا لہو　　دستِ قاتل ہے کہ محنت کا صلہ مانگے ہے

دنیا میں میرے لیے وہ قدرت کا بہت بڑا انعام تھیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ مولیٰ عزوجل نے اپنے فضل عطا فرما کر مجھ پر ایک بڑا احسان کیا تھا الدّنیا کلّھا مَتَاعٌ وجز متاع الدنیا المرۃ الصالحۃ کا عملی نمونہ تھی۔ وہ نہ صرف تہجد گذار بلکہ صاحبۂ ترتیب بھی تھی۔ نماز، روزے کی پابندی کے ساتھ کثرتِ نوافل میں لا یزال عبادی یتقرب بالنوافل الخ حدیث قدسی کی اس منزل سے بہت قریب تھی۔ جب کسی مرد وعورت کو شب جمعہ یا جمعہ مبارکہ کے دن انتقال کی خبر سنتی تو اپنے ہاتھوں کو اپنے رب کے حضور پھیلا دیتیں کہ اپنے پاس بلانے کے مجھے بھی یہی دن رات دینا۔ اس کی یہ دعا مستجاب ہوئی۔ شب جمعہ وصال ہوا اور بعد نمازِ جمعہ آسودۂ خاک ہوئی۔

اس کے انتقال پُرملال کا آوازہ دنیا کے ایک بڑے حصے تک پہنچا۔ عرب وعجم، حِل وحرم، برصغیر ہندوپاک، نیپال، امریکہ وبرطانیہ وغیرہ میں اس کی بخشش ومغفرت کی دعائیں ہوئیں۔ عمرہ وزیارتِ حرمین طیبین جانے والے قافلے درقافلے حرمِ الٰہی وحرمِ مصطائی میں اس کے لیے دست بہ دعا تھے۔

خانقاہِ وامقیہ اشرفیہ، بریلی شریف کے ولی عہد وجانشین پیر طریقت حضرت اسلم میاں اپنے پورے قافلے کے ساتھ، حضرت علامہ سید معین الدین اشرف اشرفی جیلانی، ان کے برادرِ اکبر سید علی اشرف اشرفی جیلانی، حضرت علامہ مفتی محسن رضا ثقافی اڑیسوی اپنے پورے قافلے کے ساتھ، حضرت علامہ مفتی محمد ابراہیم مقبولی رتنا گیری اپنے قافلۂ حجاز کے ساتھ اللہ و رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں مسلسل دست بہ دعا رہے۔ ملک و بیرونِ ملک کی گراں مایہ شخصیات و رِجال نے دعانامے اور تعزیت پیش کی۔ جیسے حضرت علامہ قمرالزماں خان اعظمی لند، علامہ فروغ القادری لندن، علامہ قاری محمد اسمٰعیل اعظمی لندن، علامہ ڈاکٹر سید شمیم گوہر الٰہ آباد، محقق مسائلِ جدیدہ علامہ مفتی نظام الدین، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک

پور، مفتیٔ اعظم ہالینڈ علامہ مفتی محمد شفیق الرحمٰن عزیزی ہالینڈ، حضرت سیّد مہدی میاں صاحب اجمیر شریف، علامہ محمد اسمٰعیل علوی شیخ الحدیث دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف، علامہ الحاج محمد حلیم یار علوی بھاؤ پور، ان کے فرزند ارجمند علامہ عبدالمصطفےٰ ازہری، حضرت علامہ غلام عبدالقادر علوی اور ان کے ولی عہد و جانشین علامہ آصف علوی ازہری براؤں شریف، حضرت علامہ صوفی محمد صدیق یار علوی بھیرہوا روج نیپال، حضرت علامہ غلام غوث علوی دھوراجی گجرات.... یہ فہرست ابھی کافی لمبی ہے۔

اور ان کے لیے قرآن خوانیوں کا ایک خوش گوار تسلسل تھا جو دارالعلوم امام احمد رضا رتنا گیری سے شروع ہو کر بہت دور تک پہنچا۔ کئی سو قرآن ختم ہوئے، تاہنوز یہ سلسلہ بھی جاری ہے۔ ان کے مرشد گرامی سلطان المناظرین یعنی امام التارکین سرکار مجاہد ملت حضرت علامہ مفتی حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمۃ والرضوان کا حلقۂ ارادت ومحبت اس تعلق سے بہت آگے آگے رہا۔

ہمارے بھانجے مولانا عطاء الرحمٰن فیضی ومولانا احمد ظفر نورانی امجدی، مولانا قمر الدین مدرس مدرسہ غوثیہ بڑھیا، مولانا نور محمد نعیمی صدر تنظیم افکارِ صدرالافاضل اور دکتورہ عظمیٰ سلطانہ مراد آبادی کا خصوصی شکر گزار و دعا گو ہوں کہ ان سبھوں نے ہماری اہلیہ کے لیے اپنی اپنی جگہوں، اِداروں، دانش کدوں میں دعائے بخشش ومغفرت اور قرآن خوانیوں کا اہتمام کیا۔

فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

ماضی قریب میں اتنا زیادہ قرآن خوانی ودعائے بخشش ومغفرت کسی مذہبی شخصیت کے لیے بھی شاید و باید ہوئی ہو۔ یہ فیضان ہے ان کے مرشدِ اعظم حضور مجاہد ملت کا۔

اور یہ شاخسانہ بھی ہے ساداتِ کرام اور اہلِ بیت اطہار سے بے پناہ عقیدت ومحبت کا، بالخصوص سیدۃ النساء حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا، ان کے فرزندان حضرت امام حسن مجتبیٰ وامام عالی مقام حسین اعظم شہید کربلا ؎

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو صرف آواز ہی آواز ہے

محمد وارث جمال قادری

مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، ممبئی

یکم ذیقعدہ ۱۴۴۴ھ/ ۲۲ مئی ۲۰۲۳ء

ڈاکٹر محمد امجد رضا امجدؔ
(قاضی شریعت) مرکزی دار القضا ادارہ شرعیہ بہار پٹنہ

مردے از غیب بروں آمد و کارے کردہ ست

تا صد ہزار خار نمی روید از زمیں
از گلبنے گلے بگلستاں نمی رسد

علم و ادب کا شہکار، بزرگوں کی بارگاہوں کا مقرب، اکابر اہل سنت کی داد تحسین کا حامل، جماعت اہل سنت کے مفکر اور اہل زبان و قلم مین امتیازی مقام رکھنے والی شخصیت کا نام وارث جمال قادری ہے۔ اپنے اندر علم اخلاص اخلاق جذبہ جوش جنون سنجیدگی متانت عبادت اور عشق جیسی صفات رکھنے والی اس شخصیت کے لئے اگر کہا جائے کہ اس نے اپنے ہم عصروں کو متاثر اور مابعد نسل کی فکری پرورش کی ہے تو بے جا نہیں ہوگا، کیوں کہ حضرت مولانا وارث جمال صاحب قبلہ اس وقت سے لکھ رہے ہیں، چھپ رہے ہیں جب ہم جیسے لوگ مدارس کے ابتدائی مرحلے میں ضرب یضرب ضرباً کی گردان لگا رہے تھے، ایسے میں اگر کہا جائے کہ ۷۰ رکی دہائی سے ۲۰۲۰/۲۲ تک لکھنے والی اس شخصیت نے ایک نسل کو لکھنے کا جذبہ، قلم تھامنے کا شعور، جماعتی درد رکھنے کا حوصلہ اور اعلیٰ حضرت کے عشق کا سودائی بنایا ہے تو اس میں غلط کیا ہے اور پھر فکری و ذہنی پرورش کسے کہتے ہیں۔

حضرت مولانا وارث جمال صاحب قبلہ کی خدمات مختلف جہتوں میں ہیں اور جہت ''کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست'' کا مصداق ہے۔ وہ صاحب طرز ادیب ہیں، بیک وقت متنوع جہتوں پہ کام کرنے والے مفکر ہیں، رضویات پہ گہری نظر رکھنے والے مصنف ہیں، عالمی منظر پہ تنقیدی نگاہ رکھنے والے بالغ نظر و مدبر عالم دین ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ حقائق کے اظہار میں بے باک اور مخلص ہیں۔ ان کی انہیں خوبیوں نے انہیں ممتاز بنایا ہے جس کی مثالیں خود ان کی تحریریں میں موجود ہیں۔

ان کی قلمی خدمات میں تنوع کا عالم یہ ہے کہ وہ کبھی سماج کے حوالہ سے ''اسلام اور شادی'' پر کتاب لکھتے ہیں تو کبھی ''محمود غزنوی اور حضرت اورنگ زیب کے تاریخی شواہد پہ۔ کبھی مدارس کی اہمیت اور جدید عصری تقاضے کو موضوع بناتے ہیں تو کبھی اختلاف بین المسلمین اور اس کے پس منظر کو۔ کبھی سیرت رسول کے ان چھوئے عنوان ''محمد عربی بحیثیت سپہ سالار'' کو زیب دستار قلم بناتے ہیں تو کبھی فقہ اسلامی اور فقہ کے امام اعظم کی اہمیت اور ان کی خدمات جلیلہ کو۔ کبھی اسلامی شخصیات کے حوالہ سے اپنی عقیدت محبت اور حقیقت کا دریا بہاتے ہیں تو کبھی اہل سنت کی ملی تنظیمیں ''آل انڈیا تبلیغ سیرت

''اور ''کل ہند خاکساران حق'' کی خدمات واثرات کو۔کبھی بین الاقوامی سیاست میں اسلام دشمن طاقت کی ریشہ دانیوں کو آئینہ کرتے ہیں تو کبھی بنام اسلام پیدا ہونے والے جدید فرقے کی حقیقت اوراس کے خفیہ عزائم کو۔کبھی رضویات کے بحر ذخار میں غواصی کرتے ہوئے:

امام شعروادب

انوارِ کنزالایمان

امام احمدرضااورتحریک ندوہ

امام احمدرضابین المدح والقدح

تومراخراب کردی بایں سجدۂ ریائی

جیسے وقیع مقالے سے ہماری علمی وروحانی پیاس بجھاتے ہیں تو کبھی مقامات مقدسہ کے دیدہ زیب مناظراورروح پرور کیفیات کی منظرکشی سے۔غرض ایک جلوہ صدرنگ ہے جونگاہوں کوخیرہ کرتاہےاورذہن ودل کوحیرت بداماں۔

زشعر دلکش حافظ کسے شود آگاہ
کہ لطف طبع وسخن گفتن دری داند

مولاناوارث جمال صاحب کی شخصیت کاایک دوسراپہلو یہ ہے ان کی نگاہوں نے جماعت اہل سنت کی ان عظیم شخصیات کودیکھاان کی صحبت میں بیٹھےاوران سے اکتساب فیض کیاہےجن سے پوری صدی منسوب ہوجاتی ہے۔ظاہر ہے جنہیں ایسوں کی صحبت مل جائے اسے اپنے عہد کاباکمال ہوناہی چاہئے۔اس لئے انشراح صدرسے اس کااعتراف کیا جاناچاہئے کومولاناوارث جمال قادری ہمارے عہد کے باکمال عالم دین ہیں جن پرجماعت اہل سنت کوفخرہے۔

ان کاشخصیت کاایک تیسراپہلو ہے جوان کے ہمعصروں کے لئے سامان رشک وحسد ہےاوروہ یہ کہ ان کے قلم زرنگار نے وقت کےان ناموارن ادب سے بھی دادتحسین حاصل کیاہےجوکبھی مولویوں کی تحریروں کولائق اعتنانہیں سمجھتے۔یہ ایک منفی اندازفکرہےجوخاص طورپرہمارے یہاں کےادیبوں میں پایاجاتاہےاورتکلیف تب بڑھ جاتی ہے جب وہ کسی مولوی کی تحریرپہ داددینے کے لئے ''مولوی ہوکرایسے شعرکہتاہے'' جیسامتکبرانہ جملے استعمال کرتے ہیں،مگر یہ بھی کمال سخنوری ہے کہ ایسے پتھرسے بھی مولاناوارث جمال صاحب نےتحسین کے پانی نکال لئے ہیں چنانچہ ان کی کتاب ''بھیگی پلکوں کا بوجھ'' مطالعہ کرنے کے بعدجناب حیات اللہ انصاری کوخوشگوارحیرت کااظہارکرتے ہوئے کہناپڑاتھا:

میں ایسے شخص کودیکھناچاہتاہوں جومولوی ہوکرایسے جملے لکھتاہے

یونہی اعلیٰ حضرت امام احمدرضاقدس سرہ کےشعروادب پہ ان کی لازوال کتاب ''امام شعروادب'' کامطالعہ کرنے کے بعدحکومت ہند کے ''پدم شری ایوارڈ'' یافتہ جناب ندافاضلی نےفون پرانہیں مبارک باددی اور ملنے کی خواہش کااظہار کیا۔اسی طرح بہارکی ایک عظیم ادبی شخصیت ''ش مظفرپوری'' نے جوافسانوی ادب کےصف اول میں شمارہوتے ہیں آپ کی

کتاب ''اسلام اورشادی'' کے مطالعہ کے بعد آپ کومبارک بادی کا خط لکھا،جس کا یہ حصہ خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے:

> ''کتاب نہایت دل چسپ اور مفید ہے۔آپ نے اس موضوع پر بڑے ادبی پیرائے میں کافی معلومات سے قاری کومستفید کیا ہے۔کئی نکتے خود میری سمجھ میں آئے۔میں نے پوری کتاب لفظ بہ لفظ پوری استغراق سے پڑھی،اس طرح شاذ ونادر ہی کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہوں کیوں کہ نہ کتاب میں اتنی کشش ہوتی ہے اور نہ مجھے اتنی فرصت ہوتی ہے۔زیادہ تر کتابوں کو جابہ جا پڑھ لیتا ہوں اور بعض کو تو بس سونگھ کر ہی رکھ دیا کرتا ہوں، آپ کی کتاب میں مقناطیس ہے۔''

حضرت مولانا وارث جمال صاحب کی خوبیوں کا ایک رخ ان کی خردہ نوازی بھی ہے جس کا میں خود شاہد ہوں۔سن ۲۰۱۷ء میں میں نے اپنے رسالہ سہ ماہی رضا بک ریویو کا ''حجۃ الاسلام نمبر'' شائع کیا جو ۸۱۶ر صفحات پر مشتمل ہے۔جب یہ نمبر ان کے مطالعہ میں آیا تو انہوں نے میرا نمبر حاصل کر کے مجھ سے بات کی،مبارکبادیاں دیں اور حجۃ الاسلام ومجاہد ملت کے درمیان نیاز وناز کے رشتہ کے حوالہ سے بہت سی ان سنی باتیں سنائیں جس سے قلب روشن ہو گیا کچھ دنوں بعد تقریباً ۵ر صفحات پر مشتمل اس نمبر پہ ان کا تبصرہ باصرہ نواز ہوا جسے پڑھ کر ہماری پلکیں فرط مسرت میں بوجھل ہوگئیں۔ان کی ہی تحریک پر اجمیر شریف سے حضرت سید مہدی میاں صاحب قبلہ نے فون کر کے ''حجۃ الاسلام نمبر'' کی اشاعت پہ مجھے مبارک باد دی،اجمیر شریف مدعو کیا اور اپنے دولت کدہ پہ ٹھہرنے کا مشفقانہ حکم دیا۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ حضرت کی قلمی خدمات کا ذخیرہ ''وادی نور'' کے نام سے منظر عام پہ آرہا ہے،جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے زندگی کے قیمتی لمحات اسی فکر میں گزارے ہیں کہ کس طرح جماعت اہل سنت کے معتقدات ومعمولات کو جدید تقاضے کے مطابق عوامی ذہنوں میں اتارا جائے،اس کی حقانیت پہ تاریخی شواہد پیش کئے جائیں اور اکابر علما ومشائخ کی حیات وخدمات کو منظر عام پہ لایا جائے،جدید نسل کو ان سے متعارف کرایا جائے تاکہ وہ ان کے کارناموں سے اپنے تابناک مستقبل کی راہیں نکال سکیں۔

آئینۂ حسن خوباں میں شامل مقالات ومضامین اور تاثرات میں موضوع کے اعتبار سے بڑا تنوع ہے۔یہ تنوع اور جلووں کی رنگارنگی قاری سے مطالعہ کا بھیک نہیں مانگتی بلکہ مطالعہ کا اسیر بنالیتی ہے۔شخصیات کے باب میں ان کا قلم کن کن گلستاں کی سیر کراتا ہے ملاحظہ کیجئے:

امام احمد رضا ایک جہان حیرت
حجۃ الاسلام عظمت وجلالت کے بلند روشن مینار
مبلغ اسلام:شخصیت کا اجمالی جائزہ
صدر العلما علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی

شمس العلما قاضی شمس الدین جعفری
بحر العلوم مفتی عبد المنان اعظمی
مولانا اشفاق حسین نعیمی
حضور اشرف العلما: ایک تجزیاتی مشاہدہ
علامہ الحاج فروغ احمد اعظمی
شیخ الاسلام علامہ مدنی میاں کی انفرادیت
فقیہ ملت مفتی جلال الدین امجدی
سراج ملت علامہ سید سراج اظہر رضوی
علامہ نسیم بستوی
سید المشائخ علامہ وامق بریلوی وغیرہ

ان شخصیات پہ درجنوں مطبوعہ مقالات و مضامین دستیاب ہیں بعض پہ مقالات کے مجموعے تک شائع ہو چکے ہیں مگر اس کے باوجود مولانا وارث جمال قادری کے لکھے ہوئے ان مقالات و مضامین کی اپنی الگ شان ہے اور یہ شان وعظمت صرف اس لئے ہے کہ یہ ان کے لکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر سے علمی حلقوں میں وہ اعتبار قائم کیا ہے کہ ان سے منسوب مضامین کے مطالعہ کے لئے طبیعت میں رغبت پائی جاتی ہے اور یہ اعزاز یقینا کسی بھی شخصیت کے لئے وجہ افتخار ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسی طرح ان کے مضامین کے دوسرے عناوین، جیسے:

تصوف اور رواداری
بھگوان کا آدمی
دینی مدارس اور ان کی اہمیت
کیا بتائیں کیسے کاٹی ہم نے قید زندگی
جشن عید میلاد النبی کی تاریخی حیثیت
ایران کی غداری وغیرہ

پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو مجھے پہلی بار پڑھنے کو ملے اور طبیعت اس کے مطالعہ سے پھڑک اٹھی، حقیقت کی آئینہ بندی کے ساتھ قارئین کے ذہنوں میں پیوست ہو جانے والے لہجے کی جو خوبو ان کے اندر ہے وہی ان کی انفرادیت ہے جو انہیں اوروں سے ممتاز کرتی ہے۔ مثلا اپنے مقالہ ''امام احمد رضا ایک جہان حیرت'' میں محقق جلیل تاج العلما علامہ عبد الحق خیر آبادی کے تعلق سے ان کا تعارف حاشیہ میں کس انداز میں کرتے ہیں آپ پڑھ کر خود ہی ان کے لہجہ کی کھنک کا اندازہ لگائیے:

موصوف اکابر واسلاف کی نادر یادگار تھے۔ایک ذات واحد میں کمالات غریبہ واوصاف عجیبہ کا جمع ہوجانا مولانا کی ذات بابرکات کا خاصہ تھا۔بقول لسان الملک ریاض خیر آبادی۔۔۔۔زمانہ توصورت ظاہری کا معاوضہ ادا ہی نہیں کرسکتا،وہ نورانی چہرہ،وہ خندہ روئی،زندہ دلی،وہ سراپا علم،وہ رعب کمال،وہ شان ادب،وہ فضل وجلال،وقار وتمکنت، جرأت اظہار،استغنا،نازک مزاجی،نوابانہ طمطراق،نفاست،نزاکت،دریادلی،سیر چشمی، حق گوئی،صداقت شعاری یہ سب آپ کی خصوصیات سے ہیں۔دوردراز سے تاجر آپ کی دادودہش،قدردانی،منہ مانگی قیمت کا شہرہ سن کرآپ کے پاس آتے،اگرکسی نے اپنی چیز کی قیمت وہی مانگی جس حساب سے عام لوگوں کو دیتا ہے اوراس کا اظہار بھی کردیا،توفورا واپس کردیتے۔آپ کی زندگی کے بے شمار واقعات بھرے پڑے ہیں،جنہیں دیکھ کرکسی دریادل اور بااختیار حکمراں کے دربار کا نقشہ سامنے آجاتا تھا،خود ہی فرماتے،تاجر ہمارا نام سن کرآتے ہیں منہ مانگے دام نہ پائیں تو کاہے کوئی آئے۔لوگوں میں یہ چرچا تو ہے کہ نوابوں کی مانند ایک بوریہ نشیں ملائے مکتبی بھی ایسا ہے جوامرا کی طرح دل رکھتا ہے ؎

جن کے دم سے تھی شہر کی رونق
کیا ہوئے وہ کدھر گئے چہرے

اب ایسے لوگ کہاں جو اپنی علمی وجاہت،عالمانہ طمطراق،اوراپنی عزت نفس کے تحفظ کے لئے بڑی سے بڑی شخصیتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔آج علما اور ذی علم علما کی اکثریت نے بھی اپنے علمی پندار اور عالمانہ وجاہت وطمطراق کواہل ثروت ودولت کے سامنے گروی رکھ دیا ہے۔

امام احمد رضا سے متعلق اسی مقالہ''امام احمد رضا ایک جہان حیرت'' کا یہ حصہ بھی ملاحظہ کیجیے،کس اچھوتے انداز میں وہ امام احمد رضا کی شان انفرادیت سے پردہ اٹھاتے ہیں:

کائنات ارضی کبھی اہل کمال سے خالی نہیں رہی ارسطو،افلاطون،سقراط،فارابی البیرونی، ابن سینا،ابن رشد نیوٹن،کیپلر،گلیلیو،غزالی،رومی،رازی،خیام وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں،جن کے ذکر سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں،اورخود یہ لوگ انسانی تاریخ،تہذیب انسانی، انسانی تمدن،انسانی معاشرہ،سیاست مدن،فنون ارتقا اور تہذیب الاخلاق پر بایں طور اثر انداز ہوئے کہ آج تک ان کے نقوش سے تاریخ کے صفحات فروزاں ہیں ؎

کچھ نقش تیری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک

دل بے سروساماں سہی ویران نہیں ہے

مگر چودھویں صدی کی ابتدا ہی میں برصغیر ہند سے تاریخ کی سطح پر ایک ایسا نام مطلع انوار بن کر ابھرا جو علما فقہا عقلا حکما فلاسفہ اور متکلمین کی فہرست میں اپنا بلند نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کر کے گل سرسبد بنا۔

چلتے چلتے اسی کتاب میں صدر العلما حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی سے متعلق ایک مقالہ کا یہ حصہ بھی ملاحظہ کرلیں جس میں ان کے رفیق درس حضور مجاہد ملت اور حضرت حافظ ملت علیہما الرحمہ کا ضمنی تذکرہ ہے مگر اس تذکرے کو انہوں نے جذبے کی اس گہرائی میں اتر کے قلمبند کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ملاحظہ کیجیے:

اب ان فریقانِ درس کی فہرست پر بھی ایک نگاہ ڈالیں جو اس راہ محبت واستقامت یعنی حصول تعلیم میں آپ کے قدم بہ قدم تھے۔ جو آگے چل کر سواد اعظم کے قائد و رہنما اور اپنے زمانے میں اساطین امت قرار پائے۔ جن کے حسن خدمات سے آج پورا عالم مشکبو ہے اور جن کے فیضان علم وفضل نے کئی براعظموں کو اپنے لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ خود علامہ میرٹھی کبھی کبھی عالم سرخوشی میں فرمایا کرتے تھے لائے زمانہ میرے ساتھیوں کا جواب۔ پھر ان میں سے ہر ایک کا نام بڑی محبت سے لیا کرتے تھے اور سبھوں کے نام کے آگے یہ مولوی فلاں، یہ مولوی فلاں مگر حضور مجاہد ملت کا نام نہ لے کر بالالتزام مجاہد ملت ہی فرمایا کرتے تھے۔ ان کے تذکرے پر آپ کا چہرہ فرط مسرت سے تمتما جاتا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بڑا رئیس زادہ تھا مگر دل فقیروں کا پایا تھا۔ غریبوں اور مظلوموں کے لیے اس کا دل دھڑکتا رہتا تھا ۹ ر سال کے طویل عرصے میں دار الخیر اجمیر میں صرف تین اسباق ناغہ ہوئے۔ وہ بھی مجاہد ملت کی دوستی میں۔ کسی مظلوم کی دادرسی کے لیے کبھی وہ کمشنری کا گھیراؤ کرتا، کبھی کلکٹر کا۔ کہتا جیلانی! تمہیں بھی ساتھ میں رہنا ہے۔ اور میں دوستی کی خاطر ان کے ساتھ گھسٹتا رہتا۔ اسی کی خاطر پورے نو سال کے عرصے میں تین اسباق ناغہ ہوئے مگر وہ بندہ انگریز کلکٹر و کمشنر یا متعلقہ آفیسر کا اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک مظلوم کی دادرسی نہ ہو جاتی۔ نہ کسی سے دبتا تھا نہ ڈرتا تھا۔ خوف نام کی کوئی چیز اس کے دل میں جیسے تھی ہی نہیں۔ ہمارے ساتھ ایک حافظ صاحب بھی تھے جو ہم تمام ساتھیوں کو بہت پیارے تھے۔ سنجیدہ، باادب وسعادت مند۔ ہم تمام ساتھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ اتنا بڑا کام کر گیا کہ دنیا دیکھتی رہ گئی ہمیں اس پر فخر ہے۔ اس تذکرے پر ہم گومگو کی کیفیت میں ہوتے تو مسکرا کے فرماتے، اچھا تم سمجھے نہیں۔ ارے وہی جن کو تم حافظ ملت کہتے ہو۔ دار العوم اشرفیہ مبارک پور کے شیخ

الحدیث۔ایک جگہ بیٹھ کر بڑی خاموشی کے ساتھ ایسے افراد تیار کردئے جنھوں نے دین وسنیت کا بڑا کام کیا۔فردا فردا سب کا تذکرہ کرنے کے بعد ایک خاص کیفیت کے عالم میں فرماتے: یہ ہمارے ساتھی ہیں۔جب ان کا کوئی جواب زمانے کے پاس نہیں پھر ہمارے اساتذہ کا جواب کیا ہوسکتا؟ جانتے ہمارے اساتذہ کو حضور صدرالافاضل اور حضرت صدرالشریعہ ہمارے استاذ تھے جن کے مثل ان کے زمانے میں نہیں دیکھا۔

مضت الدهور وماآيتن بمثله

ولقد اتى فعجزت عن نظرائه

یہی لہجہ بتاتا ہے کہ وارث جمال ہونا، کمال تو ہے مگر آسان نہیں۔نام کے اجزائے ترکیبی کا بھی تقاضا یہی تھا کہ علوم نبویہ کا وارث،صورت وسیرت کے ساتھ تحریر وتقریر میں بھی جمال کا پیکر نظر آئے،ان کے مضامین کا یہ مجموعہ ثابت کرتا ہے کہ مولانا وارث جمال قادری صاحب قبلہ واقعی اسم بامسمیٰ ہیں۔

آئینۂ حسنِ خوباں ان کے مقالات ومضامین کا حسین گلدستہ ہے جو سج دھج کر منظر عام پہ آرہا ہے،علمی حلقوں میں یہ کتاب اس حوالہ سے ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی کہ یہ وارث جمال قادری کے جادوئی قلم کا شہکار ہے۔اس میں جو بات ہے وہ دیدہ ہے یا دیدہ وروں سے شنیدہ ہے،اسلوب نگارش میں برجستگی ہے صفائی ہے پاکیزگی ہے جو دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔بعض مقامات پہ وہ کیفیت بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ قاری،صاحب تذکرہ کی مجلس میں پہنچا ہوا محسوس کرتا ہے۔ایسی تحریر کوئی کوئی ہی لکھ پاتا ہے،ان لکھنے والوں میں ایک معروف نام حضرت مولانا وارث جمال قادری صاحب کا ہے خدائے پاک انہیں سلامت رکھے اور ان کی نگارشات کو موثر ومقبول عام بنائے۔آمین

☑☑☑☑☑☑

حضرت مصنف کا مختصر سوانحی خاکہ

ازقلم: مولانا آصف جمال قادری مصباحی،
اُستاد جامعہ امام احمد رضا، رتنا گیری، کوکن، مہاراشٹر

ادیب شہیر، رئیس التحریر، صاحبِ تصانیف کثیرہ، حجۃ الخلف، یادگارِ سلف، حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری یارعلوی کی حیات وخدمات، ان کے قومی، ملّی، دینی اور علمی سرگرمیوں کی تفصیل ایک مستقل کتاب کی متقاضی ہے۔ چونکہ یہ کتاب پہلے سے کافی ضخامت لیے ہوئے ہے، لہٰذا یہاں پر آپ کی زندگی کا صرف اجمالی خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔ ان کی حیات وخدمات پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کی دوسری جلد یا پھر الگ سے مستقل ایک کتاب میں پیش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ المولیٰ تعالیٰ

اسم گرامی: ــ محمد وارث جمال قادری یارعلوی بن الحاج محمد منیف یارعلوی بن الحاج دنیار شاہ بن عبداللہ بن نبی بخش بن نورنگ شاہ نوراللہ مرقدہم

مذہباً سُنّی، مشرباً قادری، مسلکاً حنفی

جائے پیدائش: ــ موضع جُلہا بھاری، پوسٹ گھنیاؤ، تحصیل اٹوا، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی (ننہال)

سنِ ولادت: ــ ۱۳۷۹ھ/ مطابق ۱۹۴۹ء

آبائی وطن: ــ موضع بڑھیا، پوسٹ کھنڈسری، بازار، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی، انڈیا

مستقل سکونت: ــ بمبئی سے ۱۹۷۲ء سے۔

ممبئی آفس: ــ یوپی اسٹیل مارٹ، باپٹی روڈ، ۱۵۳/۱۵۱، ممبئی ۴۰۰۰۰۴

رہائش: ــ مع اہل وعیال نورمحل، سی وِنگ، کوسہ ممبرا، ضلع تھانہ، مہاراشٹر

ذریعۂ معاش: ــ اسٹین لیس اسٹیل کی تجارت

دیگر مصروفیات: ــ تصنیف وتالیف، دینی وملّی خدمات، مختلف تحریکات سے وابستگی بالخصوص حضور مجاہدِ ملت کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت میں باقاعدہ شمولیت اور اس کے عروج وارتقا کا کلیدی کردار

تعلیم گاہیں: ــ (۱) مدرسہ غوثیہ فیض العلوم، بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر، یوپی

(۲) دارالعلوم فیض الرسول، بڑھیا، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی

(۳) مدرسہ اسلامیہ عربیہ، اندرکوٹ، میرٹھ، یوپی

(۴) الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی

اساتذۂ کرام:- قرآنِ مجید ناظرہ و پرائمری درجات: مولوی عبدالمعید صاحب اسگو اوالے

درسِ نظامی کے اساتذۂ کرام:-

شیخ العلماء علی الاطلاق و شیخ الادب بالاتفاق حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی، جلالۃ العلم حضور حافظ ملت حضرت علامہ حافظ عبدالعزیز مراد آبادی ثم محدث مبارک پوری، شارح بخاری امام النحو حضرت علامہ سید غلام جیلانی محدث میرٹھی، حضرت مولانا قاری محمد یعقوب صاحب گونڈوی ثم میرٹھی، امام الحکمت روحِ اشرفیہ حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب مبارک پوری، بحرالعلوم حضرت مفتی عبدالمنان مبارک پوری، شیخ الادب حضرت علامہ الحاج محمد شفیع قریشی مبارک پوری قاضی شریعت، محقق عصر حضرت علامہ مظفر حسن ظفر ادیبی، شیخ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری رضوی، حضرت علامہ الحاج محمد یونس نعیمی اشرفی، فقیہ ملّت حضرت علامہ الحاج مفتی جلال الدین احمد امجدی، مفکرِ ملت حضرت علامہ محمد حنیف قادری براونی، حضرت مولانا صوفی امام بخش تیغی مظفر پوری، حضرت مولانا صوفی محمد صدیق قادری یار علوی بھیرہوا نیپال، حضرت مولانا عبدالجبار اشرفی قدست اسرارھم وطاب اللہ سراھم وجعل الجنۃ مثواھم۔

رفقائے درس:-

علامہ سید کلیم اشرف جائسی، علامہ محمد فاروق بریلی شریف، مولانا شاہد رضا سنبھلی، مولانا محمد عارف مصباحی، مولانا نصیر الدین عزیزی بلاموی، مولانا عبدالوکیل دیوریاوی، مولانا معین الدین شیخ الحدیث دارالعلوم شاہ عالم، مولانا شمس الضحیٰ پورنیہ بہار، مولانا صاحب علی پرتاول، مولانا محمد علی جوہر چھپرہ، مولانا اقبال عزیزی بمبئی وغیرہ وغیرہ صرف اشرفیہ مبارک پور کے ۳۰؍رفقائے درس۔

معاصرین:-

قائد اہلِ سنّت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ عبدالحکیم شرف قادری، حضرت علامہ وجاہت رسول قادری، اشرف العلماء حضرت سید حامد اشرف اشرفی جیلانی، پیر طریقت سید کمیل اشرف اشرفی جیلانی، شیخ الاسلام علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی، شمس العلماء علامہ مفتی نظام الدین الٰہ آبادی، خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی، علامہ مفتی شریف الحق امجدی، علامہ ارشد القادری، علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی، علامہ کامل سہسرامی، علامہ ریحان رضا خاں رحمانی میاں بریلوی، علامہ مفتی اختر رضا خاں بریلوی، علامہ ضیاء المصطفیٰ امجدی، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مجددی، علامہ قمر الزماں اعظمی، علامہ عاشق الرحمٰن حبیبی الٰہ آبادی، ڈاکٹر علامہ طلحہ رضوی برق داناپوری، علامہ سید رکن الدین اصدق نالندہ بہار، علامہ کوکب نورانی، مولانا صوفی نظام الدین امروڈبھا، علامہ شاہ تراب الحق قادری، علامہ شاہد رضا نعیمی، علامہ محمد ہاشم نعیمی مراد آبادی، علامہ مفتی مکرّم دہلوی، علامہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی مبارک پوری، پروفیسر ڈاکٹر مولانا حسن رضا خان پٹنہ، بہار، علامہ غلام عبدالقادر علوی براؤں شریف، علامہ سید کاظم پاشا حیدرآباد، علامہ عبداللہ خاں عزیزی، علامہ غلام غوث علوی

دھوراجی، علامہ ڈاکٹر سید شمیم گوہر الہٰ آبادی وغیرہ وغیرہ۔

اور چند بلند پایہ ہستیوں سے تو اُستاذ بھائی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ جیسے حضرت علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ مفتی شریف الحق امجدی، حضرت علامہ رحمانی میاں بریلی شریف، علامہ ارشد القادری، مفسّر قرآن علامہ عبداللہ خاں عزیزی، علامہ سیّد کمیل اشرف اشرفی جیلانی، شیخ الاسلام علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی، حضرت علامہ صوفی نظام الدین بستوی وغیرہ۔

اور بحمدہٖ تعالیٰ اپنے زمانے کے گنج ہائے گراں مایہ شخصیتوں میں رئیس التحریر علامہ وارث جمال قادری کی شخصیت محض ایک عدد اضافہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ان کے درمیان یہ فرقِ مراتب وبحیثیت من کل الجہات آپ کی انفرادیت مسلّم ہے۔

مرشدانِ بیعت وإجازت وخلافت:-

مرشدِ بیعت: شیخ المشائخ حضور شعیب الاولیاء حضرتِ اقدس بابرکت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قادری چشتی نقش بندی سہروردی، بانی دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف، ضلع سدھارتھ نگر، یوپی

مرشد اجازت وخلافت:-

(۱) حضرت اقدس بابرکت پیر طریقت، قطب زمانہ، حضرت پیر عبدالمتین صاحب، ڈھلمئو شریف، خلیفہ ومرشدزادے حضور شعیب الاولیاء براؤں شریف، یوپی

(۲) مفسر قرآن، برکت العصر، صاحب تصانیف کثیرہ وجلیلہ آبروئے علم وفضل

(۳) حضرت علامہ فیض احمد اویسی، بہاول پور پاکستان۔

سلسلۂ عالیہ قادریہ چشتیہ اویسیہ رضویہ کی مدینہ منورہ میں عطافرمائی۔

(۴) صوفی باصفا حضرتِ اقدس صوفی محمد طاہر حسین مدنی نے سلسلۂ نقشبندیہ کی خلافت واجازت مدینہ منورہ میں مرحمت فرمائی۔

(۵) شیخ الاسلام، مفسر قرآن حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی کچھوچھوی نے حضرت علامہ حافظ محمد ایوب اشرفی، فرزند نسبتی حضرت علامہ سید غلام جیلانی محدث میرٹھی کے ذریعے لندن سے ازخود بھجوایا۔

اور یہ ساری خلافتیں واجازتیں ازخود بغیر کسی طلب کے عطا ہوئیں۔ فللحمد للہ ربّ العلمین۔

حج وزیارت:-

پہلا حج ۲۰۰۰ء میں مع اہلیہ اور بیٹی نجم السحر اور دوسرا حج ۲۰۰۲ء میں۔

دونوں حجوں کے ساتھ پندرہ عمرے میں جو زیادہ تر جعرانہ سے ہوئے۔

بین الاقوامی سرگرمی:۔

عراق کی عالمی اسلامی کانفرنس میں ۱۹۹۱ء میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے وفد کی قیادت کرتے ہوئے عالمی اسٹیج پر برصغیر ہند کی سنیت کو اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کی قیادت و امام کے حوالے سے پیش کیا، جس کی تفصیل اسی کتاب بنام سفر نامہ عراق میں موجود ہے۔

نکاح:۔ ۳ رمئی ۱۹۶۹ء/ ۲۵ رصفر المظفر ۱۳۸۹ھ

اولاد:۔ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی۔

علمی خدمات پر ایک نظر:۔

(۱) **اسلام اور شادی:** بین الاقوامی شادیوں پر ایک ضخیم دستاویز، جو زبان و ادب کے اعتبار سے اردوئے معلّٰی کا ایک نمونہ ہے۔

(۲) **بھیگی پلکوں کا بوجھ:۔** چند خاصانِ خدا کا تذکرۂ محبت بزبانِ حکایت جو صرف بھیگی پلکوں سے پڑھی جاسکتی ہے۔

(۳) **امام شعر و ادب:۔** اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی نعتیہ شاعری کا ایک علمی و ادبی و لسانی و فنی جائزہ۔

(۴) **محمود غزنوی تاریخ کے آئینے میں:۔** تاریخ انسانی کے ایک عظیم فاتح، ایک محیر العقول، اولوالعزم شخصیت کے حیرت انگیز کارنامے۔

(۵) **انوارِ کنز الایمان:۔** اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے ترجمۂ قرآن کنز الایمان و تفسیر خزائن العرفان پر ایک گراں قدر تصنیف۔

(۶) **امام احمد رضا بین المدح والقدح:** ۔اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کی عظیم شخصیت اور ان کی خدمات و کارناموں پر بلند پایہ شخصیات و رجال کے فرمودات و تاثرات۔

(۷) **امام احمد رضا اور تحریک ندوہ:۔** اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے تمام تجدیدی کارناموں میں سے ایک بڑا کارنامہ۔

(۸) **دینی مدارس اور ان کی اہمیت:۔** دینی اداروں کی اہمیت اور ایڈ والحاق کی مضرت رسانیوں پر ایک گراں قدر گفتگو۔

(۹) **عربی مدارس اور جدید عربی تقاضے:۔** دینی مدارس کے نصابِ تعلیم و نصب العین کے ساتھ عصری حقائق پر چشم کشا تحریر۔

(۱۰) **محمد عربی بحیثیت سپہ سالارِ اعظم:** ۔سیرتِ طیبہ پر ایک طویل و تاریخی و انفرادی تحریر جو باوضو لکھی گئی ہے۔

(۱۱) **اختلاف بین المسلمین اور اس کا پس منظر:** ۔ ہر دَور اور ہر زمانے میں اختلاف بین المسلمین کسی کی سیاسی ضرورت رہی ہے۔ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کا نچوڑ یعنی سمندر کو کوزے کی ایک منفرد مثال۔

(۱۲) **سفرنامہ عراق:**۔ عراق جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد کا آنکھوں دیکھا حال۔ ایک تاریخی سفرنامہ عروس البلاد سے خیر البلاد کی طرف۔

(۱۳) **:۔وادیِ نور کا سفر:**۔ جنوبی ہند کے ایک روحانی سفر کی روداد، جو شمالی ہند کی بڑی بڑی درگاہوں و آستانوں کے ذمے داروں کے لیے تازیانۂ عبرت۔

(۱۴) **حضور شعیب الاولیاء:**۔ بانی فیض الرسول براؤں شریف کے حالات و خدمات اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے ایک مرید نہیں بلکہ مراد کا احوال و تذکرہ اور اس کے حسنِ خدمات کی ایک جھلک۔

(۱۵) **امام المسلمین امام اعظم:** ۔ جن کا حلقۂ اطاعت دنیا کے تقریباً سو کروڑ مسلمانوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(۱۶) **آل انڈیا تبلیغ سیرت، ایک تاریخ:**۔ سُنّی مسلمانوں کی سب سے قدیم مذہبی تنظیم کے قیام کا تاریخی پس منظر اور مسلمانوں و دیگر مظلوموں کی آبرومندانہ بقا اور اس کے حسنِ خدمات کا تذکرہ۔

(۱۷) **اسلام میں بریلوی ایک فرقہ:**۔ نفس موضوع پر ایک چشم کشا تحریر، جس کو پڑھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔

(۱۸) **تو مرا خراب کردی بایں سجدہ ریائی:**۔ احترامِ سادات اور امام احمد رضا بریلوی پر ایک طویل مقدمہ، جو مستقل ایک کتاب ہے۔

(۱۹) **تحریک کُل ہند خاکسارانِ حق:**۔ اس تحریک کا قیام کا تاریخی پس منظر، مسلمانوں کے لیے اس کی افادیت کا تذکرہ۔

(۲۰) **سر میدان کفن بردوش دارم:**۔ ملک کی آزادی، مسلمانوں کی بے مثال قربانیوں کی تحقیق و تفصیل۔

(۲۱) **محسن ملت اور ان کی سیاسی خدمات:**۔ ایک جلیل القدر عالم دین و باکمال مجاہد آزادی اور اعلیٰ حضرت کے تلمیذ رشید و خلیفۂ راشد علامہ حامد علی فاروقی کا تذکرۂ محبت۔

(۲۲) **فقہ و بانی فقہ و فقۂ حنفی:**۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی جلالتِ شان اور ان کی عزیمت و استقامت اور ان کی بے کراں و بے مثال شخصیت کے حضور ایک خراجِ عقیدت و اظہارِ حقیقت۔

(۲۳) **حج کانفرنس نمبر:**۔ ایک ضخیم و مبسوط مجلّہ جو اسلام کے رکنِ اعظم حج اور اس کے متعلقات و حج کمیٹی کی بدعنوانیوں پر مشتمل ہے۔

☑☑☑☑☑☑

تعارف

خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی الہٰ آبادی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری فضل و کمال، علم و آگہی اور تحقیق و معارف میں ایسے یکتائے روزگار اور منفرد العصر ہیں کہ پوری صدی آپ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز و درماندہ ہے۔ پھر علم و فضل کی مسند کا یگانہ روزگار صدر نشین اپنے منصب کی تمام تر رعایتوں اور ذمے داریوں کے بے پناہ ہجوم میں ملکِ سخن کی شاہی کرتا نظر آتا ہے، تو عقیدتوں سے لبریز دل اسے ان کی کرامت کہنے پر مجبور اور غیر جانب دار نظر حیرتوں کے عالم میں اعترافِ امامت کرتی نظر آتی ہے۔

بلا شبہ اعلیٰ حضرت شاعری میں بھی یکتائے روزگار اور امامِ وقت ہیں۔ آپ کی شاعری میں عشق کی وارفتگی اور سرمستی بھی ہے، محبت کا گداز اور سپردگی بھی ہے، ایمان کی حلاوت و مٹھاس بھی ہے اور ادب و احترام کے تمام تر لوازمات بھی اور ان تمام التزامات کے ساتھ آپ کا ہر شعر فن کا پیمانہ اور شاعری کی میزان ہے۔ جس شعر کو دیکھیے فنی نزاکتوں کا ساغر چھلکتا نظر آئے گا ؎

کیا حسن ہے جمال ہے کیا رنگ و روپ ہے
وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

یہ صحیح ہے کہ اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری ہماری محض عقیدت کی زینت اور بزمِ محبت کا جمال بنی رہی لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اعلیٰ حضرت کی عظیم شاعری جامد عقیدتوں کے سرد خانوں کی نذر ہو کر رہ گئی۔ خدا بھلا کرے فاضل گرامی مولانا وارث جمال کا جنھوں نے اعلیٰ حضرت کی مظلوم شاعری کو نقد و تبصرے کی گرمی و حرارت کے ساتھ ملک میں متعارف کرانے اور اعلیٰ حضرت کو امامِ فن تسلیم کرانے کا التزام کیا ہے۔

مولانا وارث جمال دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کے فرزند علمی اور ہماری جماعت کے معروف ذمے دار صاحبِ طرز انشا پرداز ہیں۔ مولانا اپنی عمر کے اعتبار سے ایک نوعمر اور نوخیز عالمِ دین ہیں۔ لیکن اپنی تحریر کی گہرائی، گیرائی اور حقیقت نگاری میں اتنے کہنہ مشق اور قادر الکلام ہیں کہ اپنے قلم کے آئینہ میں اپنی کمسنی کو بے اعتبار کرتے نظر آتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے تقریباً تمام جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور شاعری کی ان تمام قسموں میں آپ کی خداداد صلاحیتوں کا کمال اور فنی نزاکتوں کا شباب نظر آتا ہے۔ مولانا وارث جمال نے ان تمام اصناف کا تجزیہ کرتے ہوئے دیگر اساتذۂ شعر و سخن کے کلام سے اعلیٰ حضرت کے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ایک غیر جانب دار قلم کار کی حیثیت سے بے لاگ تبصرہ بھی کیا ہے اور حق نقد و نظر بھی ادا کیا ہے۔

یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں حضرت رضا بریلوی ایک کہنہ اُستادِ سخن، ایک فقید المثال شاعر اور تاجدارِ اقلیم

شاعری نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی مولانا وارث جمال اپنی تمام تر عقیدت کیشیوں کے باوجود ایک غیر جانب دار، کہنہ مشق صاحبِ فن کے روپ میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

مولانا نے اپنی تمام تر غیر جانب داریوں کے باوجود جہاں عقیدتوں کا حق ادا کیا ہے، وہیں ایسا فرضِ کفایہ ادا کیا ہے کہ اگر یہ کتاب نہ لکھی جاتی تو پوری جماعت گنہ گار عقیدت قرار پاتی۔ یقین ہے کہ یہ کتاب عقیدت مندوں کے لیے، بالخصوص اربابِ شعر وسخن کی محفلوں کی زینت بھی بنے گی اور اعلیٰ حضرت کی شعری امامت پر تعارف کا بھرپور حق بھی ادا کرے گی۔

☑☑☑☑☑☑

ادب شناس

علامہ ڈاکٹر حسن رضا بریلوی، پٹنہ بہار

انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹڈیز اینڈ ریسرچ ان عربک اینڈ پرشین لرننگ، پٹنہ

آج اشاعتی پروگرام کا تجزیہ کیا جائے تو ادیب بہت ملیں گے لیکن ان کا قلم ادب شناس بھی ہو ایسا بہت کم نظر آتا ہے، انھیں چند گنے چنے لوگوں میں (مولانا وارث جمال قادری صاحب ہیں جن کے یہاں) ادب شناس کا شعور قاری کو ہر مقام پر واضح طور سے نظر آتا ہے۔ تمکنت ان کے قلم کو چومتی دکھائی دیتی ہے اور وقار ہر قدم پر سر تسلیم خم کرتے نظر آتے ہیں۔

مولانا وارث جمال صاحب حضور مجاہد ملت اور اپنے روحانی اسلاف کی روحانی کیفیت کو نہ صرف سنبھال رکھا ہے بلکہ ایک مثبت توانائی بن کر ان کے شعبۂ حیات کے ہر گوشے کو روشن اور ان کی فکر کو ایک گہری معنویت اور تجربات کو وسعت عطا کرتی ہے جس کا اظہار ان کی تخلیقات میں جا بجا نظر آتا ہے۔

حضور مجاہد ملت وسیع تر مقاصد کی تکمیل کے لیے ہمیشہ بے چین رہتے تھے اور یہی ان کی زندگی تھی۔ اسی بے چینی کے صدقے میں ملت کی پروقار زندگی باقی تھی۔ اس وراثت کے امین کی حیثیت سے دیکھتے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت کی تنظیم ''تبلیغ سیرت'' اور ''خاکسارانِ حق'' کے سارے اراکین نظر آتے ہیں اور اس کے ـــ۔ حضرت مولانا وارث جمال صاحب کی ذات نظر آتی ہے۔ اللہ اس امانت کو سلامت رکھے۔ آمین

آج اشد ضرورت ہے کہ اکابر کی سرپرستی میں ملت کی شیرازہ بندی اور عروج تک پہنچانے کا تجربہ رکھنے والے دانشورانِ قوم وملت کو تنظیمی شکل دے کر آج کے پُرفتن دور اور پُرتشدد ماحول میں زندگی کو پامالی سے بچانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ مجھے یقین ہے کہ مولانا وراث جمال صاحب کی صدارت میں تبلیغ سیرت کے پلیٹ فارم سے یہ کام انجام پا سکتا ہے۔

تشنۂ دُعا

حسن رضا

”آئینۂ حسنِ خوباں: ایک مستحسن کام

علامہ محمد قمر الزماں خاں اعظمی
سیکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
حامدًاو مصلیًا و مسلمًا

مجھے یہ جان کر بے پایاں مسرت ہوئی کہ حضرت مولانا وارث جمال مدظلہ العالی کی حیات اور کارناموں پر ایک کتاب مرتب ہورہی ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مستحسن کام ہے۔ بڑوں کی خدمات کو پڑھ کر بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے ان کے خطوط پر کام کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ مولانا موصوف سے میرا تعلق ان کے زمانۂ طالب علمی سے آج تک قائم ہے۔

مولانا نے زیادہ تر تعلیم براؤں شریف کے مشہور دار العلوم میں حاصل کی۔ ان کا زمانۂ طالب علمی دار العلوم براؤں شریف کا انتہائی تابناک زمانہ تھا اور جامعہ اشرفیہ کے بعد وہاں کے نظم ونسق اور تعلیم کا شہرہ پورے ملک میں تھا۔ مولانا وارث جمال کے اساتذہ میں سے حضرت علامہ بدر الدین علیہ الرحمہ اور حضرت علامہ مفتی جلال الدین علیہ الرحمہ وغیرہ تھے۔ براؤں شریف کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم الجامعۃ الاشرفیہ حاصل کی، اور اس زمانے میں اُستاذ العلماء سیدی حافظ ملت اور حضرت علامہ عبدالرؤف صاحب نائب شیخ طریقت، نیز بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب علیہم الرحمۃ والرضوان جیسے عظیم اور عبقری شخصیات مسندِ تدریس پر فائز تھیں۔ اس کے بعد اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے سیبویہ وقف اور اخفش زمانہ حضرت شیخ العلماء حضرت علامہ غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا۔

براؤں شریف میں آپ نے شعیب الاولیاء جناب صوفی یار علی صاحب علیہ الرحمہ کے فیض صحبت سے فیض یاب ہوئے، جو اپنے تقویٰ، عبادت اور اخلاص و دردمندی کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ وہ نماز باجماعت کے بہت پابند تھے اور سفر وحضر میں اپنے ساتھ ایک خادم اور ایک حافظ کو رکھتے تھے۔ جو جماعت کے نظام کو قائم رکھ سکے۔ غالباً وہ صاحبِ ترتیب بزرگ تھے۔ مشرقی یوپی بالخصوص براؤں سے نیپال تک انھوں نے مسلک کے تحفظ میں عظیم کارنامہ انجام دیا۔ میں نے ان کی زیارت نانپارہ کے زمانۂ تدریس میں ۱۹۶۳ء میں کی اور دوروپئے سے نوازا گیا۔ میں اُن سے بہت متاثر ہوا اور یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی ان کے نقش قدم کی اتباع کرسکتا۔

مولانا ایک اچھے ادیب اور مصنف ہیں اور اپنے معاصر علماء اور ادباء سے مراسلت کی۔ جن میں حضرت علامہ ڈاکٹر پروفیسر مسعود صاحب قبلہ، علامہ فیض احمد اویسی، حیات اللہ انصاری مدیر قومی آواز لکھنؤ، شین مظفر پوری سے مراسلت ان کے علمی اور ادبی ذوق کی شہادت کے لیے کافی ہے۔ یوں تو مولانا موصوف اپنے دور کے جملہ اکابر سے استفادہ کرنے کی

کوشش کرتے رہے مگر حضور مجاہد ملت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے بہت متاثر رہے اور ان کی تحریک خاکسارانِ حق نیز تبلیغ سیرت سے وابستہ رہے۔ ان کے زمانے میں تبلیغ سیرت ایک بہت ہی نمایاں تحریک ہے اور مختلف اخبارات و رسائل میں تحریک کی تائید میں مولانا کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے بعد مراسلات کا انگلش ترجمہ بھی انگریزی اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ کاش یہ سارے مواد ان کی کتاب میں موجود ہوں۔

اپنے معاصر بزرگوں میں علامہ ارشد القادری، خطیب مشرق علامہ نظامی سے بہت قریب رہے۔

وہ ایک بہت اچھے قلم کار ہیں۔ ان کی تحریریں انتہائی معیاری ادب عالیہ کا نمونہ اور شگفتہ ہیں۔ قاری ان کو پڑھتے وقت کہیں بھی اُکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔

علمی اور ادبی کتابوں کے علاوہ انھوں نے تحریک خاکسارانِ حق کا تعارف، حج کانفرنس نمبر، ہٹ دھرم قوم مجاہدین آزادی، اسلام اور شادی، بھیگی پلکوں کا بوجھ اور سفرنامۂ عراق وغیرہ تحریر کیں۔ انھوں نے تحریک تبلیغ سیرت کے پلیٹ فارم سے عراق کا سفر کیا اور وہاں کے عمائدین سے ملاقاتیں کیں۔ میرے نزدیک غالباً انھوں نے بابری مسجد کے حوالے سے مجاہد اوّل اور شہید حضرت مولانا امیر الدین علی امیٹھوی کا ذکر بھی کیا ہے، جن کا مزار رُدولی کے قریب شجاع گنج کے پاس ہے۔

ان کی شہادت کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے واجد علی شاہ کے زمانے میں بابری مسجد کو رام جنم بھومی کے نام سے مشہور کیا اور ہنوؤں کو اُکسایا کہ وہ رام جنم بھومی کو آزاد کرائیں۔ اُس زمانے میں اجودھیا کے ہندوؤں نے اس پر قبضہ کرلیا، جس کو آزاد کرانے کے لیے مولانا امیر الدین علی نے واجد علی شاہ کی اجازت سے ایک فوج تیار کی اور اجودھیا کے لیے روانہ ہوئے۔ ادھر انگریزوں نے ہندوؤں کو آمادۂ جنگ کیا اور اِدھر واجد علی شاہ سے کہا کہ امیر علی طاقت ور ہورہے ہیں۔ انھیں اجودھیا پہنچنے سے پہلے شہید کردیا جائے۔ چنانچہ اجودھیا سے ہندوؤں کی فوج اور لکھنؤ سے واجد علی کی فوج روانہ ہوئی۔ مولانا امیر علی کو حالات کی نزاکت کا اِدراک ہوا۔ چنانچہ انھوں نے شہادت سے ایک روز قبل یہ رُباعی لکھی ؎

بذکرِ حق سراپا گوش دارم	مئے حبّ علی در جوش دارم
سنو تاریخ من قبل از شہادت	سر میدان کفن بردوش دارم

سرِ میدان کفن بردوش دارم سے ان کی تاریخ شہادت نکلتی ہے۔ یہ رُباعی آج بھی ان کے لوحِ مزار پر تحریر ہے۔ مگر لوگ ناواقف ہیں۔ یہ میری اپنی تحقیق ہے۔ مگر مولانا وارث جمال کی تحقیق اس کے برعکس ہو تو اسے قلم زد کرسکتے ہیں۔

بہرکیف میں ان کی حیات اور کارناموں پر مشتمل کتاب کا انتظار کروں گا اور ان کے صاحبزادے سے درخواست کروں گا کہ وہ ان کی کتابیں دوبارہ شائع کراکر اہلِ علم تک پہنچائیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ! مولانا موصوف کو ان کی خدمات کا بہترین صلہ دے۔ آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

☑☑☑☑☑☑

تصوف نوازی کے آئینے میں مولانا وارث جمال کا علمی سفر

از ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر مصباحی
سجادہ نشین خانقاہِ حلیمیہ ابوالعلائیہ، پریاگ

ہر بندۂ خاص روزِ ازل سے تصوف، اس کے طرزِ عمل اور اس کی قربانیوں سے قربت رکھی۔ اسی رنگ میں صبر وقناعت اور اذیت نوازی کا درس پایا۔ اس راز نے سبھی کا خیر مقدم کیا کہ راہِ تصوف پر گامزن رہے بغیر امتحانات، آزمائش کے تقاضوں کا احترام نہیں کیا جاسکتا، جب تک صبر آزما آزمائشوں کی کیفیات اور یادِ الٰہی کے انہماک و استغراق کی تہوں کا اندازہ نہیں ہوتا، تقربِ الٰہی اور دیدارِ تجلیاتِ حق نصیب نہیں ہوپاتی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے رنگِ متصوفانہ کو معراج عطا فرمائی۔ اس رنگ ونور سے ایک لمحہ بھی جدا نہ ہوئے۔ ہر اذیت وتفکر کی منزلوں سے گزرتے ہوئے راحت محسوس کی۔ ارشاد فرماتے ہیں: "التفکر ساعة خیر من عبادت الثقلین" "ایک ساعت کا تفکر تمام جہان سے بڑھ کر ہے۔" حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم دائمی طور پر مراقبۂ حضور اور تفکر تمام میں رہا کرتے تھے۔ (شمس المعارفین، اردو ترجمہ، صفحہ ۸۸)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

"لی مع اللہ وقت لا یبغی فیہ ملك مقرب ولا نبی مرسل۔"

میرا اللہ کے ساتھ ایک ایسا وقت ہوتا ہے نہ اُس وقت کسی فرشتے کی گنجائش ہے، نہ کسی نبی مرسل کی۔

(روح البیان، جلد ۱۱، ص ۴۳۶)

الدنیا سجن المؤمن۔ (حدیث کریم) "دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے۔"

الدنیا دَارُ المَرَضیٰ۔ (حدیث کریم) "دنیا امراض کی جگہ ہے"

کی روشنی میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "کوئی ایسی اذیت میں نہیں ڈالا گیا جیسی میں نے اذیت اُٹھائی ہے۔" (مکتوباتِ صدی، ص ۵۳۳)

اسی راہِ تصوف پر چلتے ہوئے دنیا کے تمام صوفیوں نے نعمتِ الٰہی جان کر ہر صعوبت واذیت کو کلیجے سے لگا کر رکھا۔ اس کے علاوہ اپنی درس وتدریس کی عظمتوں نے ساری دنیا کو سنوارا۔ اس کے فضائل وبرکات بے شمار ہیں۔ حق وباطل کے درمیان یہی ایک خطِ امتیاز ہے جو گمراہیوں سے دور رکھنے، جائز وناجائز اور حلال وحرام کو جاننے اور ان پر عمل کرنے کا درس دیتا ہے۔

اصفیائے کرام نے اپنی سیکڑوں ہزاروں کتابوں اور رسالوں میں احکام وفضائل اور شریعت وطریقت کے اُصول و ضوابط کا دریا بہایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علومِ ظاہری کو علومِ روحانی و باطنی پر کبھی حاوی نہیں سمجھا۔ علومِ ظاہری کے پاس اتنی وسعت کہاں جو الہام والقا کے ذریعہ علم لدنی تک پہنچ سکے جو تجلیاتِ الٰہی کے اسرار ورموز سے آگاہ ہو سکے۔ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

العلم لیس بکثرت الروایه انما العلم نور یجعل الله فی القلب.

علم کثرتِ روایات سے نہیں حاصل ہوتا بلکہ علم ایک نور ہے جسے اللہ تعالیٰ قلب میں ڈال دیتا ہے (رواہ ابن ابی حاتم فی تفسیرہ)

حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اگر کوئی علم اس نیلے آسمان کے نیچے تصوف سے زیادہ شریف ہوتا تو ہم اور ہمارے احباب اس کو حاصل کرنے کی سعی بلیغ کرتے۔ (خواجہ بندہ نواز کا تصوف، ص ۳۳)

رنگِ تصوف اختیار کیے بغیر اور روحانی اسرار ورموز سے قربت حاصل کیے بغیر تبلیغ کا حق نہیں ادا کیا جا سکتا۔ علومِ اسلامیہ کی روشنی میں صوفیانہ عظمتوں کے اظہار نے ساری دنیا کو متاثر کیا ہے۔ طرف دارانہ رویہ کا بھی اپنا ایک اُصول ہوتا ہے۔ خاصانِ خدا کی بلندیوں سے بغاوت کرتے ہوئے کسی دوسرے کو آسمان تک پہنچانے کی کوشش تعصب و نادانی کی علامت نہیں تو پھر کیا ہے۔ ترجیح نوازی سے پہلے اس حقیقت پر غور ضروری ہے کہ روحانی سطح پر اس کی حیثیت کیا ہے۔ راہِ حق میں کب اور کتنے دنوں تک ذکر وضرب، پاس انفاس، حبس دم اور بھوکا پیاسا رہنے میں راحت محسوس کی۔ مراقبہ و استغراق کے کتنے سفر انجام دیئے۔ صعوبتوں اور اذیتوں کے سائے میں کتنے مرحلے طے کئے۔ علم وادب جب جائز و حلال، حیلہ ومباح اور تاویلات ومراعات کا عادی بن جاتا ہے تو پھر رنگِ تصوف کا بوجھ سنبھل نہیں پاتا۔

اب اسی منزل پر مولانا وارث جمال کی یاد آ گئی۔ محبّ گرامی حضرت محترم علامہ وارث جمال صاحب قبلہ مصباحی جماعتِ اہلِ سنّت کے بے خوف عالمِ دین، بے لوث قلم کار اور پُر جوش خطیب ہیں۔ صوفیانہ مزاج کے علم بردار اور مقدس قدروں کے حامی۔ بدلتی ہوئی ذہنیت اور طرف دارانہ مصنوبوں پر گہری نظریں رکھتے ہیں۔ کافی عرصے سے تحریری و تقریری خدمات میں مصروف ہیں۔ جس کے حق میں اعتراف وتائید اور وصف بیانی کرنے والوں کی طویل فہرست مرتب کی جا چکی ہے۔ مولانا موصوف کے علم وادب کا یہ خصوصی پہلو ہے کہ مروجہ نظریات وافکار کے تحت ہوا کے اُس رُخ کو قبول نہیں کر پائے جس میں غوث وخواجہ کے سامنے سر جھکانے کے جذبے کو دبایا جائے اور مقابلہ وموازنہ کی تحریک کو اُکسایا جائے۔ جو ہوا صرف عمارتوں کی بنیاد پر اپنی ساکھ بنانے کے لیے مقدس روایات کو مجروح کرنا جانتی ہو۔ ہوا کے اس رخ کی کیا حیثیت بن سکتی ہے جس میں تصوف کی روشنی، تصوف کی تبلیغ اور تڑپ موجود نہ ہو۔ اتحاد واتفاق اور خلوص وانکساری کی رمق تابندہ نہ ہو۔ مقدس خانقاہوں اور آستانوں کی آفاقی وروحانی عظمتوں کو بغاوت نواز منصوبوں کے سانچے میں ڈھالنا

آسان ہے کیا؟ شیخ نوازی کے رجحان ومیلان اور تبلیغی عمل سے جذبۂ نیک کو یقیناً نئی روشنی ملتی ہے، تاہم انتہائی عقیدت و محبت کے ساتھ اس شعور وتوفیق کو ہمیشہ سر پر رکھنا چاہیے۔ یہ روشنی غوث وخواجہ کے سنگِ در کا صدقہ ہے جس نے بے شمار شیوخ ومرشدین کو جام عشقِ رسالت مآب پلا کر اور اپنی تقلیدی تجلیوں میں غرق کر کے شیخ الاسلام کے عہدے سے نوازا ہے۔ ایسے ہی نظریات وجذبات کے آئینے میں مولانا موصوف نے اپنی ذہنیت کا خاکہ تیار کیا اور اسی انداز میں خامہ فرسائی کے جوہر دکھاتے آئے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں جب یہ خاکسار تحصیل علم کے لیے ممتاز و مایۂ ناز دانش گاہ دارالعلوم اشرفیہ، مبارک پور اعظم گڈھ گیا تو اس وقت محبِ گرامی مولانا وارث جمال صاحب زیر تعلیم تھے۔ گویا ۱۹۷۰ء سے میں ان کی لطیف شخصیت اور حسنِ اخلاق سے واقف ہوں۔ مولانا جماعت کے ذہین وزیرک اور فعّال طالب علموں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جس محفل یا جس بزم میں ہوتے دورانِ گفتگو فوقیت کے حامل قرار پاتے۔ اندازِ بیان میں سنجیدگی ومتانت موجود ہے۔ دورانِ طالب علمی مجھے ان کی متعدد تقریریں سننے کا موقع ملا اور ہر بار متاثر ہوا۔ یہ سلسلہ ایک زمانے سے جاری ہے۔ جب بھی کسی رسالے میں مولانا موصوف کے مقالے پر نظر پڑتی ہے سب سے پہلے اسی کا مطالعہ کرتا ہوں۔ اندازِ تحریر میں بے ساختگی، سلاست ہے اور متاثر کرتی ہے۔ قرآن واحادیث کے حوالوں اور علمی جوہروں کا ترجمان ومظہر ہوتا ہے۔ کوئی بھی قاری ان کے مضامین کی تحقیقی کارفرمائیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مقالہ نگاری ان کے علمی مشغلے کی سب سے ممتاز علامت ہے۔ اسی حقیقت کے پیش نظر مولانا کی شخصیت کو نمایاں طور پر دولتِ وقار ومعیار ملی ہے۔ جماعتی یا شخصی سطح پر ان منصوبوں کے سامنے کبھی سر نہیں جھکایا اور نہ ہی طرف دارانہ ہواؤں کے رُخ سے متاثر ہوئے۔ جہاں صوفیانہ مزاج وروش کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کیا جاتا ہے اور عظمتِ غوث وخواجہ کا بدل پیش کیا جاتا ہے۔ مولانا کے رنگِ تصوف وسلوک کی جو بھی کیفیت ہو گر صوفیوں کی چاہت میں زبان وتحریر، حرص نواز اور ذخیرہ اندوز جبلت اور سمجھوتے سے ہمیشہ دور رہی۔

اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں محبِ گرامی علامہ وارث جمال صاحب قبلہ کی حیات واقبال میں مزید بلندیاں عطا فرمائے اور دینی وعلمی خدمات کی توفیق میں مزید اضافہ فرمائے۔ یہ خاکسار اُن کے مجموعۂ مضامین وتاثرات کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہے اور عمر طویل کی دعا کرتا ہے۔ آمین

☑☑☑☑☑☑

اُٹھ کے ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کردیں!

علامہ فروغ القادری، برطانیہ

رئیس التحریر حضرت علامہ وارث جمال قادری زید مجدہٗ (صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، بمبئی) علمی، فکری اور مذہبی ادبیات کا باکمال ادیب و محقق، جس نے ایک جہان کو اپنے طرزِ نگارش سے متاثر کیا ہے۔ لوح و قلم کی راہوں میں ان کی دقت طرازی اور صحرا نوردی کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ انھوں نے بین الاقوامی سطح پر حیاتِ انسانی کے معاشی، معاشرتی، ملّی و مسلکی مسائل پر جامع و وقیع مقالات لکھے ہیں، جو ہندو پاک کے مؤقر جرائد و مجلّات میں نہایت ہی اہتمام کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن ممالک میں اردو بولی اور پڑھی جاتی ہے، وہاں کے علمی و ادبی حلقوں میں ''علامہ وارث جمال قادری'' کا نام حد درجہ احترام سے لیا جاتا ہے۔۔۔۔

انھیں صرف متاعِ لوح و قلم کی کج کلاہی ہی حاصل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے گراں قدر تحاریر کے آئینے میں قوم و ملّت کے ایک دردمند مصلح اور بے باک سپاہی بھی ہیں۔ جن کی آواز پر اسلامیانِ ہند کے دل دھڑکتے ہیں۔ ان کی آواز دلوں میں ایمان و اسلام اور جذبۂ عشق رسول کی تڑپ پیدا کرتی ہے۔ خوابیدہ اقوام و ملل کو حرّیت فکر اور درسِ حق گوئی عطا کرتی ہے۔ اور احساسِ کمتری کو احساسِ برتری کا نعم البدل دیتی ہے۔

''علامہ وارث جمال قادری'' نے اپنی تحریروں میں اربابِ حل و عقد کی بے حسی و بے بسی اور حاشیہ برداروں کی عیّاری و ستم ظریفی پر ماتم بھی کیا ہے۔ انھوں نے جبّہ و دستار میں گوشہ گیر زہد فروشان سجّادگانِ طریقت پر اصلاح پذیر تنقید بھی فرمائی ہے۔ ملّتِ بیضا کے خوابیدہ وجود میں چراغِ زندگی روشن کرنے کی پیہم کوشش بھی کی ہے۔ مرعوب و محکوم ضمیروں کو جذبۂ حرّیت سے گرمایا بھی ہے۔ انھوں نے بابری مسجد کی شہادت ۱۹۹۲ء کے نتیجے میں ملک میں پھوٹ پڑنے والے فسادات کے بعد اسلامیانِ ہند کو۔۔۔ دیدۂ خونبار سے دیکھا ہے، اور ان کے زوال اقبال پر حسرت و یاس کے ساتھ ماتم بھی کیا ہے۔ دراصل یہی وہ مابہ الامتیاز خصوص ہیں جو۔۔۔۔ علامہ وارث جمال قادری۔۔۔ کو عصر حاضر میں دیگر اربابِ قلم سے ممتاز کرتے ہیں۔۔۔ ان کی تحریریں آج کے مایوس کن حالات میں بھی اربابِ دعوت و عزیمت کو فکری و عملی بیداری سے مسلح ہونے کی اہمیت کا شعور بخشتی ہیں۔

نوا پیرا ہوا ہے بلبل کے ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا (اقبالؔ)

ایمانِ کامل، عشقِ رسالت، تحریک وتنظیم، فکری وتربیتی نظام اور متحرک عملی جدّو جہد یہ وہ عناوین ہیں جو اِن کی نگارشات میں نمایاں ترین مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اکثر وبیشتر مضامین معانی اور مقتضائے حال سے مملو، فکری خزانوں سے لبریز، انفرادیت کا نمونہ ہیں۔۔۔ جسے قاری بے تکان پڑھتا چلا جاتا ہے اور تصورات وخیالات کی شاہراہیں روشن ہوتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔۔ان کے گہربار قلم سے نکلا ہوا ایک ایک حرف عشق واعتقاد کی جنت میں کوثر وتسنیم کی طرح بہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

علامہ وارث جمال قادری کے علم اور معلومات کا دائرہ وسیع تر ہے، جو اُن کے مضامین، مقالات اور گراں قدر تصنیفات سے ظاہر ہے۔ ان کے جیّد اساتذہ اپنے دور کے رازی وغزالی تھے، جن کا شمار نادرِ دہر، فقید المثال عبقریوں میں ہوتا تھا۔ یہ اسی درسگاہِ فیض کا اثر ہے کہ انھوں نے ہر موضوع پر قلم اُٹھایا ہے، خواہ مذہب ہو یا سیاست۔۔۔ تنقید نگاری ہو یا واقعات نگاری۔۔۔ فنّ تصوف ہو یا اصلاح وتذکیر۔ ہر موضوع پر فکریات اور دانش حاضر سے بھر پور اور دل پذیر ان کی تحریریں اربابِ علم ودانش کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتیں۔ ان کی ذات میں وسیع ترین علم کے ساتھ ساتھ ایک گہری بصیرت اور بے مثل عقلی توازن بھی موجود ہے۔

علامہ وارث جمال قادری۔۔۔ دلوں کو مسخر کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات اور مذہب حق کو اپنی تحریروں کے ذریعے سے ایسے دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ مخالفین کے دلوں میں بھی گھر کرتے چلے جاتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اہم موضوعات پر لکھی گئی ان کی کتابوں کے متعدد ایڈیشن ہندو پاک سے شائع ہوئے۔ انھیں جس قدر ہندوستان میں شہرت حاصل ہے، اسی قدر وہ پاکستان میں بھی مقبول ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی تحریروں میں معقولیت پسندی، اعتدال وتوازن، اوران کا اپنا مخصوص، غیر مستعار اندازِ نگارش ہے۔۔۔ وہ ہندو پاک کے اربابِ قلم کے لیے سرمایۂ افتخار اور اپنے اسلاف کے علمی میراث کے حامل ہیں۔

وہ ایک عظیم مفکر۔۔۔ ایک بے باک قائد۔۔۔ اور ایک حیات آفریں شخصیت کے مالک ہیں۔۔۔ انھوں نے اپ منظم اور انفرادی واجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں ''آل انڈیا تبلیغ سیرت بمبئی'' کو نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک شناخت بخشی ہے، جن کی شب وروز کی دقت طرازی اور انتہادرجہ کاوشوں کی وجہ سے یہ تحریک اسلامی احیا اور غلبۂ دین مصطفوی کی عالمی آوازیں بن کر شرق وغرب کے دور دراز گوشوں پر چھا گئی۔۔۔ بلاشبہ اس کی بنیادیں جہاں حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی آہِ سحر گاہی شامل تھی، وہیں اس کی ناقابل تسخیر فصیلوں کی تعمیر میں علامہ وارث جمال قادری کا جوہر قلم کارفرما ہے۔

یہ کون غزل خواں ہے پُر سوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

☑☑☑☑☑☑

ادیب شہیر علامہ محمد وارث جمال قادری کی لفظی تصویر

اثر خامہ: سید صابر حسین شاہ بخاری قادری (اٹک پاکستان)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ النبی الامین خاتم النبیین
صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عصر حاضر میں برصغیر پاک وہند میں اہل سنت کے جن علما کرام نے قلم وقرطاس سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہوئے جہاد بالقلم کے محاذ پر اپنے قلم کی نمایاں معرکۂ آرائیاں دکھائی ہیں ان میں ایک اہم اور ممتاز نام علامہ محمد وارث جمال قادری دامت برکاتہم العالیہ کا ہے۔ دنیائے علم وادب میں آپ کا نام اور کام کسی بھی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کا آبائی وطن ہندوستان کے شمالی یوپی کے ضلع سدھارتھ نگر کا مشہور موضع "بڑھیا" ہے۔ جسے رئیس الاتقیا علامہ مفتی بدر الدین قادری رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ جو اہل سنت کی معروف درس گاہ دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف سے جانب شمال صرف چھ میل کے فاصلے پر مرجع خلائق ہے۔

علامہ محمد وارث جمال قادری دامت برکاتہم العالیہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر چھیالیس سال سے ممبئی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہیں۔

آپ کی تعلیمی زندگی کا زیادہ عرصہ بڑھیا اور براؤں شریف میں گزرا۔ صدر العلماء حضرت سید غلام جیلانی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ سے خصوصیت کے ساتھ پڑھنے کی تڑپ انہیں میرٹھ لے گئی اور آخر میں اہل سنت کی معروف درس گاہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے سند فراغت حاصل کی اور پھر علمی وادبی دنیا میں آفتاب بن کر ایسے چمکے کہ آج آپ کی نورانی کرنیں چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہاں آپ کی حیات وخدمات کا احاطہ تو نہیں کیا جا سکتا البتہ قارئین کے سامنے آپ کی ایک لفظی تصویر پیش کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کی سعی کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

1) مشاہیر اساتذہ کرام:

شیخ العلماء علامہ غلام جیلانی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء حضور حافظ ملت رحمۃ اللہ علیہ

صدر العلماء سید غلام جیلانی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

امام الحکمت علامہ حافظ عبد الرؤف مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ

شیخ الاساتذہ علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ

بحر العلوم علامہ مفتی عبد المنان رحمۃ اللہ علیہ (سابق شیخ الحدیث شمس العلوم گھوسی اعظم گڑھ)

آپ کے یہ تمام مشاہیر اساتذہ کرام اپنی اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک تحریک، ایک ادارہ اور ایک دار العلوم کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت نے آپ کو کندن بنایا۔

2) عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

مولانا محمد وارث جمال قادری مصباحی دامت برکاتہم العالیہ قافلۂ عشق و وفا کے راہی ہیں۔ آپ کا قلب جذبۂ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار نظر آتا ہے۔ اس پر آپ کی ہر تحریر شاہد و ناطق ہے۔ آپ کی جس کتاب کو کھولیں، آپ کے جس مقالے کو پڑھیں اس کی سطر سطر سے عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوتے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

3) القابات و خطابات:

دنیائے علم و ادب نے آپ کی خدمات جلیلہ کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کو جن گراں قدر القابات و خطابات سے نوازا ہے ان میں سے چند یہ ہیں۔

ادیب شہیر، رئیس التحریر، وارث العلماء، محب اولیا و علما، ترجمان فکر رضا۔

4) فکر رضا کی ترجمانی:

علامہ محمد وارث جمال قادری مصباحی دامت برکاتہم العالیہ کی ساری زندگی فکر رضا کی ترجمانی میں گزری۔ ہندوستان میں آپ پہلے وہ خوش نصیب عالم دین قلم کار ہیں جنہوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو مستقل موضوع سخن بنایا۔ لکھنا شروع کیا، پھر لکھتے گئے۔ اس پر آپ کی تصانیف و مقالات شاہد و ناطق ہیں۔

ان میں سے آپ کے اس مقالہ "الامام احمد رضا بین المدح والقدح" کو شہرت عام اور بقائے دوام حاصل ہوا۔ اس میں سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

"یہی وجہ تھی کہ پورے برصغیر کا مسلمان اپنے مذہبی و دینی معاملات میں صرف بریلی شریف کی طرف دیکھتا تھا جو

وہاں سے فیصلہ ہو جاتا اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا، متحدہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے دلوں پر پورے ادب و احترام کے ساتھ امام احمد رضا کا قبضہ تھا۔ اس لئے جدھر وہ رخ کرتے ادھر ہی پورا برصغیر چل پڑتا۔ اعلیٰ حضرت کا ایک جنبش قلم ساری بساط الٹ دیتا تھا۔ اس صورت حال سے امام احمد رضا کے حریف بہت پریشان رہا کرتے تھے اور رات دن اسی فکر میں لگے رہتے کہ مولانا احمد رضا خان سے کیسے دور کیا جائے۔''

اسی مقالہ سے دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیں:۔

''جب کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا مجدد وقت تھے، مصلح امت تھے، عظیم پیشوا تھے، دور کے امام اعظم ابوحنیفہ وحضور غوث پاک کے نائب اکبر تھے۔ دینی مسائل اور دینی ضرورتوں میں پورے عالم اسلام کے مرجع تھے اور پورے عالم اسلام کے عظیم روحانی پیشوا بھی تھے عرب وعجم حل وحرم میں آپ کے علم وفضل کا ڈنکا بجتا تھا اور آپ کے فضل وکمال کا سورج سوا نیزے پہ چمکتا تھا ایسے عالم میں آپ کے ارشادات و فرمودات جو عین تقاضائے دین ایمان ہیں عین تقاضائے شریعت وطریقت تھا۔''

5) احترام سادات:

عشق رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تقاضا ہے کہ آپ کے صحابہ کبار اور اہل بیت اطہار کے ادب واحترام میں کوئی کسر نہ چھوڑی جائے۔

میرے ممدوح مولانا محمد وارث جمال قادری مصباحی دامت برکاتہم العالیہ نے نہ صرف صحابہ کبار اور اہل بیت اطہار کے ادب واحترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی بلکہ ان کی اولادوں کے ادب واحترام میں بھی کسی بھی جانب سے کوئی انگلی اٹھی تو آپ کا راہوار قلم حرکت میں آیا اور پھر اس نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردیا۔

1997ء میں جب کچھ لوگوں نے بریلی شریف اور کچھوچھہ شریف کے درمیان دوریاں پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی اور کچھوچھہ شریف کے خانوادے کی سیادت پر انگلیاں اٹھائی گئیں تو اس زمانے میں ناچیز ہیچ مدان کی کتاب ''احترام سادات اور امام احمد رضا محدث بریلوی'' رضا اکیڈمی لاہور پاکستان سے چھپ کر جب ہندوستان میں آپ کے ہاتھوں میں پہنچی تو آپ کی خوشی دیدنی تھی۔ آپ نے فوراً اس کتاب پر چالیس صفحات پر مشتمل نہایت طویل مقدمہ لکھ کر آل انڈیا تبلیغ سیرت بمبئی کے زیر اہتمام نہایت ہی آب وتاب سے چھاپ کر وہاں کے علما ومشائخ کے ہاتھوں میں پہنچایا اور سادات کچھوچھہ شریف پر کسی قسم کا کوئی حرف نہ آنے دیا اور یوں مخالفین کی چالوں کو ناکام بنایا۔ آپ نے اپنے مقدمہ میں ہندوستان میں کتاب کی اشاعت کی غرض وغایت سے پردہ اٹھایا اور فرمایا کہ پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں اس کتاب کی ضرورت ہے۔ آپ کا یہ گراں قدر مقدمہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

6) زود نویسی:

آپ نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا آپ کا رہوار قلم ایسا چلا کہ اس موضوع کا حق ادا کردیا۔

آپ کی تصانیف میں سے "اسلام اور شادی" اپنے موضوع پر ایک منفرد اور لاجواب کتاب ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

''عربی مدارس اور جدید تقاضے'' نے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کیا ہے۔

7) **پراثر تحریر:**

آپ کی ہر تحریر منفرد اور پراثر ہے۔

آپ کی تحریر میں کچھ ایسی کشش اور مقناطیسیت ہوتی ہے کہ قاری جب اسے پڑھنا شروع کرتا ہے تو پھر پڑھتا ہو چلا جاتا ہے یہاں تک کہ کتاب ختم کئے بغیر نہیں رہتا۔

''بھیگی پلکوں کا بوجھ'' آپ کی ایسی علمی وادبی کاوش ہے کہ اسے اشکبار آنکھوں ہی سے پڑھا جا سکتا ہے۔

8) **انشاء پردازی:**

اردو ادب میں رئیس التحریر علامہ ارشد القادری رحمۃ اللہ علیہ اور خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ کا نام آتا ہے، جو جب کسی بھی موضوع پر لکھتے ہیں تو پھر آپ لفظوں سے کھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عمدہ فقرات بندی، ضرب الامثال، تشبیہات، استعارات اور روزمرہ جملوں کا استعمال آپ کی تحاریر میں جابجا نظر آتے ہیں۔

9) **جلال وجمال کا حسین امتزاج:**

آپ کی تحاریر میں جلال و جمال کا حسین امتزاج نظر آتا ہے جب آپ کا قلم اپنوں کی تعریف وتوصیف میں اٹھتا ہے تو پھر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسا یہ کوثر وتسنیم میں دھلا ہوا ہو اور اگر جب یہ گستاخوں کے تعاقب میں اٹھتا ہے تو پھر یہ خنجر خونخوار کا روپ دھار لیتا ہے۔

10) **اصلاح معاشرہ:**

آپ نے اپنی زبان اور قلم سے نہ صرف فکر واعتقاد کی اصلاح کی بلکہ معاشرے میں مروجہ بدعات ومنکرات کی بھی خوب خبر لی ہے۔

11) **محبِّ اولیا وعلما:**

آپ خود عالم فاضل اور محقق بے نظیر ہیں لیکن آپ نے ہمیشہ اکابر اولیا وعلما کا خود بھی اور دوسروں کو بھی ادب واحترام سکھایا ہے۔ اس پر آپ کی کتاب زیست کا صفحہ صفحہ شاہد وناطق ہے۔

12) **ہمہ گیر مقبولیت**

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ جس نے بھی اخلاص وللہیت سے دین کا کام کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اسے شہرت عام اور بقائے دوام بخشا ہے۔ آج برصغیر پاک وہند، بنگلہ دیش، نیپال ، امریکہ، افریقہ اور شاید ہی کوئی ایسا خطہ ہو جہاں کا کام او نام نہ پہنچا ہو۔ آپ کی زندہ وجاوید تحریریں ہر خانقاہ اور لائبریری کی زیب وزینت بنی ہوئی ہیں۔

13) **مہربان اور قدردان:**

عصر حاضر میں ہمارے کئی علما و مشائخ ایسی بلندیوں پر فائز ہیں جہاں ہماری رسائی ناممکن ہے۔لیکن آپ ایک کامیاب تاجر اور عدیم الفرصت عالم دین قلم کار ہونے کے باوجود اصاغر نوازی میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

تین سال قبل جب مجلہ ''ذوق'' اٹک کے مدیر اعلیٰ نے مجھ ناچیز ہیچ مدان کے بارے میں اپنے مجلہ کا خصوصی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو آپ کی خدمت میں بھی ایک عریضہ ارسال کیا گیا کہ آپ بھی ایک مضمون لکھ کر عنایت فرمائیں تو آپ نے فوراً ایک نہایت بصیرت افروز مضمون لکھ کر عنایت فرمایا جو مجلہ ذوق اٹک کے" فضیلۃ الشیخ نمبر" کی زینت بنا ہوا ہے۔

گزشتہ سال جب آپ کی اہلیہ محرومہ کا انتقال پر ملال ہوا تو ناچیز ہیچ مدان نے ایک مختصر تعزیتی شذرہ لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔آپ نے باضابطہ صوتی رابطہ فرما کر شکریہ ادا فرمایا۔

اللہ تعالیٰ اپنے محبوب حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل آپ آپ کا سایہ ہما پایہ دراز فرمائے۔ آپ کو ہمیشہ شاد و آباد اور بامراد رکھے آپ کے علم وقلم میں مزید برکتیں عطا فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔ہ

آمین ثم آمین یا رب العالمین بجاہ سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و وازواجہ وذریتہ واولیاء امتہ وعلما ملتہ اجمعین

دعا گو و دعا جو

گدائے کوئے مدینہ شریف

احقر سید صابر حسین شاہ بخاری قادری غفرلہ

خلیفۂ مجاز بریلی شریف

مدیر اعلیٰ سہ ماہی مجلہ ''خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' (انٹرنیشنل)

ختم نبوت اکیڈمی، برہان شریف، ضلع اٹک پنجاب پاکستان پوسٹ کوڈ نمبر 43710

(5 محرم الحرام 1445ھ / 24 جولائی 2023ء بروز پیر بوقت 4:47 قریب العصر)

غبارِ راہ سے کہہ دو سنبھالے نقش قدم
زمانہ ڈھونڈے گا انہیں رہبری کے لئے

مولانا محمد قمر الزماں مصباحی
ڈائریکٹر ادارہ لوح وقلم ،سعد پورہ ،مظفر پور، بہار

وقار زبان وادب ، نازش قرطاس وقلم ، رئیس التحریر حضرت علامہ مولانا محمد وارث جمال قادری صاحب قبلہ زید مجدہ کی شخصیت بڑی تہہ دار ، متنوع اور ہمہ گیر ہے پورے برصغیر میں ایک ذی علم ، ذی شعور ، ذی فہم اور صاحب بصیرت عالم دین کی حیثیت سے متعارف ہیں آپ نے ایک متدین اور تاجر گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور علومِ اسلامیہ سے فراغت کے بعد خود بھی تجارت سے وابستہ ہو گئے مگر لوح وقلم کی دولت گرانمایہ کے تحفظ میں اپنے شعور وادراک ، علم وآگہی اور فکر وبصیرت کا سارا لہو نچوڑ کر رکھ دیا جو نئی نسلوں کے لئے مینارہ نور ہے اور آج کوئی بھی منصف مزاج شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ زبان وادب اور خامہ وقرطاس کے پاسبانوں میں آپ کا نام اور کام دونوں ہی نمایاں اور ممتاز ہے ۔آپ کی پوری زندگی جماعتی درد ، ملی کرب ، اخلاقی قدروں کے فروغ ، اخلاص وللّٰہیت اور علمی وادبی کاوشوں سے عبارت ہے

آپ کی ذات کا اصل اہداف ناموس رسالت کی پہریدار ، سنیت کی اشاعت اور افکار رضا کی ترسیل وتبلیغ ہے یہی وجہ ہے کہ آپ علمی ، دینی ، سماجی اور ثقافتی دنیا میں یکساں طور پر قبولیت کا درجہ رکھتے ہیں تقریباً چالیس پچاس سالوں سے اپنی قلمی طمطراق اور فکری بصیرتوں کے ذریعہ لوح وقلم کی پرورش کر رہے ہیں آپ اسلامیات کے ایک اچھے اسکالر ہونے کے ساتھ آفاقی فکرونظر کے مالک اور اپنے بزرگوں کے علمی وراثتوں کے امین ہیں فکری گیرائی ، نکتہ آفرینی ، استحضار ذہن ، حاضر جوابی ، بذلہ سنجی ، وسعتِ افلاک سی نگاہ ، کثرتِ مطالعہ اور سچے جذبوں کی آنچ آپ کی کائنات حیات میں پوری طرح محسوس کی جاسکتی ہے آپ کی تصانیف میں ایک خاص رنگ ، ایک خاص اسلوب بیان ، جدت طرازی ، افکار معنی کی تازگی اور خوبصورت زبان وادب کے قابلِ قدر عنصر کا جمالیاتی پہلو بھی خوب دیکھنے کو ملتا ہے گویا یہ کہئے کہ سازدل کے خموش مئے سے کیف آگیں خمار ٹپک رہا ہے اور لفظوں کی دلکشی ، قوت فکر ، شوکت زبان ، تخیل کی بلندی اور لطیف لہجے کی کھنک ہر لمحہ قاری کو ایک نئی دنیا کی سیر کراتی ہے اور پوری کتاب پڑھ لینے کے بعد بھی تشنگی کا بھرپور احساس ہوتا ہے سچائی یہ کہ آپ کا قلم بجھے بجھے دماغوں میں علم وآگہی کا اجالا ، فکرونظر کی سلامتی ، عشق ویقین کی چنگاری اور تقدیس واحترام نبوت کا تازہ نور بھر دیتا ہے آپ نے ہر عنوان پر لکھا اور خوب لکھا نظم ہو یا نثر ، ادب لطیف ہو یا اسلامیات ، تاریخ وسیر ہو یا

تحقیق وتنقید، فقہ ہو یا دینیات ، مذہبی حکایات ہوں یا مسائلِ تصوّف ، حکمت وفلسفہ کی باریکیاں ہوں یا عقائد باطلہ کا ردو طرد الغرض جس موضوع کو اپنی تحریر کا سرنامہ بنایا اس کا پورا پورا حق ادا کردیا خشک سے خشک عنوان پر بھی قلم اٹھایا تو فن کا جمال ،فکر کی لطافت اور ادب کا وقار مجروح نہیں ہونے دیا بلکہ پڑھنے کے بعد قاری کا یہ تاثر کہ

تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

یہ بات بھی اپنی جگہ مسلمات سے ہے کہ انہوں نے لفظیات کے صوتی حسن سے اپنی تحریر کو آراستہ کرنے میں کہیں بھی سطحیات کو قریب پھٹکنے نہیں دیا ہے بلکہ تراکیب الفاظ کے جلوہ صد ہزار سے پوری تحریر باغ و بہار نظر آتی ہے

دیکھا یہ جاتا ہے کہ جو الفاظ اور جملوں سے کھیلتے ہیں ان کے مضمون کا سارا حسن بکھر کر رہ جاتا ہے زور بیان، معنویت اور تعمق وترفع جو تحریر کی اصل روح ہے وہ رخصت ہو جاتی ہے مگر آپ الفاظ کو بے اثر اور بے معنی نہیں ہونے دیتے بلکہ الفاظ کی زیری لہروں سے لذت خیال کے ساتھ فکری بلندی کی گونج صاف سنائی دیتی ہے جو یقیناً آپ کے فنی اختصاص کا اشاریہ ہے اس وقت میری نگاہوں کے منبر ومحراب میں بھیگی پلکوں کا بوجھ، سر میداں کفن بردوش دارم، اختلاف بین المسلمین، فقہ، بانی فقہ اور فقہ حنفی، محمود غزنوی تاریخ کے آئینے میں ، اسلام اور شادی ، امام احمد رضا بریلوی اور تحریک ندوہ، امام شعر وادب اور سفر نامہ عراق جیسی علمی ، ادبی فکری ، تاریخی اور معلوماتی کتابیں سجی ہوئی ہیں جس کی سطر سطر سے شعور و آگہی، علم وتحقیق اور نقد ونظر کے اجالے برس رہے ہیں اور ان کی شمیم قلم سے دل، دماغ اور ذہن وفکر کی دنیا معطر ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ آپ اپنی عمر کی تقریباً ستّر اسیّ بہاریں دیکھ چکے ہیں مگر آپ کی قلمی فتوحات اور ادبی خدمات کا سلسلہ زلف جاناں کی طرح دراز سے دراز تر ہوتا جارہا ہے

دعا ہے کہ خالق لوح وقلم آپ کی عمر میں مزید برکتیں عطا فرمائے تا کہ آنے والی نسلوں کو مملکت لوح وقلم بانٹتے رہیں۔

☑☑☑☑☑☑

لوح وقلم کے سپاہی

مولانا محمد شاکر نوری، امیرِ سنّی دعوتِ اسلامی

لوح وقلم کی اہمیت و اِفادیت ہر دور اور ہر عصر میں مسلّم رہی ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو آغازِ اسلام سے ہی لوح وقلم سے اپنا رشتہ مضبوط کرنے کی تلقین فرمائی۔ خالقِ قلم نے اپنے محبوب نبی حضور تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل فرمائی تو اس میں قلم کا صراحت سے ذکر فرمایا بلکہ قرآنِ کریم میں ''القلم'' کے نام سے پوری سورت موجود ہے، جس میں قلم اور نوشتۂ قلم کی یاد فرمائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ۔ (القلم:۱)

ترجمہ: قسم ہے قلم کی اور قسم ہے اس کی جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں۔

قلم سے جو باتیں حیطۂ تحریر میں آجاتی ہیں، وہ زندہ جاوید ہوجاتی ہیں۔ اس کے برخلاف آواز میں یہ پائیداری نہیں ہے۔ آواز فضاؤں میں گونج کر ختم ہوجاتی ہے۔ بخاری ومسلم و دیگر کتب تفاسیر وحدیث لکھے ہوئے صدیاں گزر گئیں لیکن ان کا فیضان آج بھی زندہ وتابندہ ہے اور ان کے مصنفین بھی اپنے ان گراں مایہ خدمات کی بنیاد پر زندہ ہیں اور رہتی دنیا تک ان کا نام کرۂ ارض پر لیا جاتا رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابَةِ۔ یعنی علم کو لکھ کر مقید کرلو۔

ایک عربی شاعر نے تحریر کی اہمیت واضح کرتے ہوئے بہت پیارا شعر کہا ہے ؎

ومامن کاتب الا سیفنی ویبقی الدھر ما کتبت یداہ

ترجمہ: ہر لکھنے والا عن قریب دنیا سے فنا ہوجائے گا لیکن اس کے ہاتھوں نے جو لکھا ہے زمانے میں باقی رہے گا۔

علمائے اہلِ سنّت نے ہر دور میں قرطاس وقلم کے ذریعے اسلام وسنّیت کی حفاظت وصیانت کی اور ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُٹھنے والے فتنوں کا ردِ بلیغ فرمایا۔ ان علما میں ادیب شہیر حضرت علامہ وارث جمال قادری دام ظلہ العالی (صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، ممبئی) کا نام سرفہرست ہے۔ آپ نے اہم دینی اِداروں میں رہ کر وقت کے اساطینِ علم سے اکتسابِ فیض کیا۔ آپ کے اساتذہ میں شیخ العلماء علامہ غلام جیلانی اعظمی، حافظ ملت حضرت علامہ الشاہ عبدالعزیز محدث مبارک پوری، شارح بخاری علامہ سید غلام جیلانی محدث میرٹھی، علامہ مفتی الشاہ بدرالدین قادری، علامہ مفتی جلال الدین امجدی وغیرہم کا نام سرِفہرست ہے۔

آپ نے مختلف موضوعات پر دو درجن سے زائد کتابیں اور درجنوں مقالات قلم بند فرمائے ہیں۔ آپ کی بعض

کتابیں اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر عوام وخواص تک پہنچیں۔ ان میں بھیگی پلکوں کا بوجھ، امامِ شعر وادب، محمد بحیثیت سپہ سالارِ اعظم، اختلاف بین المسلمین اور اس کا پس منظر، عربی مدارس اور جدید عصری تقاضے وغیرہ۔

علامہ موصوف کی تحریریں زبان وادب کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ آپ ایک صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے اہلِ علم وقلم کے درمیان متعارف ہیں۔ آپ کی تحریروں کا پڑھنے والا آپ کی فصاحت وبلاغت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کی بعض کتابوں کے علاوہ آپ کے مضامین بھی میری نگاہوں سے گزرے، جو اہم دینی جرائد ورسائل میں شائع ہوتے رہے۔

تصنیفی وتالیفی خدمات کے علاوہ ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کے بینر تلے آپ نے دین وسنّیت کی اہم خدمات انجام دیں۔ سن ۱۹۷۸ء ممبئی میں اس تحریک کا قیام عمل میں آیا۔ اوّلاً آپ اس کے ناظم نشر واشاعت رہے، پھر آپ کو صدر بنایا گیا۔ آج بھی آپ اس معزز عہدے پر فائز ہیں۔ اس پلیٹ فارم سے کئی کتابیں شائع ہوئیں اور مقبولِ عوام وخواص ہوئیں۔ ۱۹۵۲ء میں جب شدھی تحریک نے ملک کے متعدد صوبہ جات خاص کر بہار اور گجرات کے اضلاع میں اپنے پیر پسارے تو تبلیغ سیرت کے نمائندوں نے پوری شدت کے ساتھ میدان میں اُتر کر اس فتنے کی سرکوبی کی۔ تبلیغ سیرت کے بینر تلے کئی کامیاب اجلاس اور کانفرنسیں بھی ہوئیں، جن میں آپ کا نمایاں کردار رہا۔

دعا ہے کہ اللہ کریم حضرت علامہ کی تمام دینی ومذہبی، علمی وقلمی خدمات کو قبول فرمائے اور ان خدمات کو توشۂ آخرت بنائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم۔

☑☑☑☑☑☑

علامہ وارث جمال قادری ایک عظیم صاحبِ قلم

محمد طاہر القادری کلیم فیضی بستوی

جانشین نسیم ملت خلیفۂ ضیغم اہل سنت وارشد ملت وسربراہ اعلیٰ مدرسہ انوارالاسلام قصبہ سکندر پور ضلع بستی یوپی

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں،
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

مصنف کتب کثیرہ، عالم باوقار رئیس التحریر مفکر اسلام وسنیت نمائندہ وترجمان اہلسنت حضرت علامہ ''وارث جمال قادری صاحب''، خلیفۂ حضور متین الاولیاء وصدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی، ایک بہت ہی معروف شخصیت ہیں۔ جن کی ولادت 1949 /عیسوی موضع بڑھیا پوسٹ کھنڈسری ضلع سدھارتھ نگر میں ہوئی۔

انھوں نے اپنی حیات میں علم وادب کے بڑے بڑے گلشن کھلائے ہیں، اسی سبب سے وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں رہ گئے ہیں۔ فقیر بے توقیر کو یہ سن کر یک گونہ مسرت ہوئی کہ حضرت موصوف کے نوک قلم سے جھڑے ہوئے انمول علمی ودینی موتیوں وجواہر پاروں اور مختلف موضوعات پر بکھرے ہوئے مضامین ومقالات کو مفاد عامہ کے لئے یکجا کئے جارہے ہیں، جن کو کتابی شکل دینے کا عزم وارادہ ہے، ماشاء اللہ

بہت بہتر کام ہے، ''علامہ وارث جمال قادری صاحب'' ایک نمایاں قابل ذکر اور اونچی سطح کے صاحب بیان وقلم ہیں،

ان کی تحریر میں وافر آرائش وزیبائش کا عنصر پایا جاتا ہے ساتھ ہی انداز بیان نہایت ہی شستہ ودلپذیر اور اسلوب نگارش کا کیا کہنا،!

بڑا ہی انوکھا و نرالا ہے، اسی لئے ان کی تحریریں خواص وعوام کے ہر طبقہ میں یکساں طور پر مقبول ومحبوب ہیں اور بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں،

آپ نے کثیر مضامین ومقالات کے ساتھ ساتھ مختلف عنوانات پر تقریباً 25 / کتابیں تصنیف کیں ہیں لیکن بعض کتابیں کسی سبب سے زیور طبع سے آراستہ ہونے سے رہ گئیں، اور کئی کتابیں اشاعت پذیر ہو کر ارباب علم ودانش سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں، مثلاً"

بھیگی پلکوں کا بوجھ

اسلام اور شادی،

اختلاف بین المسلمین اور اس کا پس منظر،

امام شعر و ادب،
خاکساران حق،
آل انڈیا تبلیغ سیرت ایک تاریخ ایک تحریک،
فقہ حنفی امام اعظم ابو حنیفہ،
اسلام میں بریلوی ایک فرقہ،
سفرنامہ عراق جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد آنکھوں دیکھا حال،
محمود غزنوی،
محسن ملت اور آپ کی خدمات،
اسی طرح پچیس کتابیں مطبوعہ وغیر مطبوعہ ہیں، جو آپ کے بلند افکار و خیالات و احساسات اور بوقلموں استعداد کا پتہ دے رہی ہیں۔

مذکورہ بالا کتب میں ایک کتاب ''بھیگی پلکوں کا بوجھ'' ہے جو اپنی مثال آپ ہے جسے ارباب علم و شعور نے بیحد پسند کیا اور اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے۔ اس کتاب کی تحریر میں عجیب کشش، خوبی و برجستگی اور روانی ہے کہ قاری پڑھتا جائے مگر اسے کہیں کوئی اکتاہٹ محسوس نہ ہو،

''علامہ وارث جمال قادری صاحب'' طبعاً منکسر المزاج، متواضع، خوش گو، میٹھی گفتار، خندہ رو، ملنسار، اخلاق مند، کشادہ ظرف اور اپنے اکابر علماء و بزرگان دین کے بڑے ہی عقیدت مند واقع ہوئے ہیں۔

علامہ محمد وارث جمال قادری صاحب ڈھلمؤ شریف اور براؤں شریف کے بزرگوں کے بھی دل سے عقیدت مند ہیں اور وہاں کے بزرگوں کا بڑے احترام و عقیدت سے تذکرہ کیا کرتے ہیں، کیوں نہ ہو کہ آپ کے پیر و مرشد شیخ المشائخ شعیب الاولیاء سیدنا شاہ ''محمد یار علی قادری چشتی''، قدس سرہ بانی ادارہ و خانقاہ فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر یوپی اور مرشد اجازت وخلافت خلیفہ سرکار شعیب الاولیاء شہزادہ محبوب الاولیاء حضرت پیر! عبد المتین محبوبی یار علوی، سابق سجادہ نشین خانقاہ محبوبیہ ڈھلمؤ شریف یوپی ہیں علاوہ ازیں اور کئی سلاسل کے بزرگوں سے اجازت وخلافت حاصل ہے۔

لیکن انہوں نے پیری مریدی سے اپنے آپ کو دور رکھا کہنے کے لئے شاید و باید ہی کسی کو اپنا مرید بنایا ہو۔

علامہ موصوف ہمیشہ اکابر علماء و مشائخ کے محبوب نظر بھی رہے ہیں۔

یوں تو وہ کسی درسگاہی ادارے سے غیر منسلک ہیں مگر ان کا سیال قلم ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ جس موضوع اور قابل ذکر شخصیات پر جب چاہیں مضمون لکھوالیں، مضمون لکھنے میں وہ کمال کے فیاض ہیں اور ہمیشہ عدم تاخیر سے کام لیتے ہیں اور لکھتے ہیں تو بڑی محبت سے لکھتے ہیں اور مطلوبہ موضوع پر زبردست خامہ فرسائی کرتے ہیں، کوئی بھی عنوان ادھورا نہیں چھوڑتے ہیں۔

وقفہ وقفہ سے انہوں نے کئی مضمون والد گرامی سلطان القلم ادیب شہیر حضرت علامہ الحاج محمد صابر القادری نسیم بستوی علیہ الرحمہ سابق استاذ و ایڈیٹر ماہنامہ فیض الرسول براؤں شریف کی شخصیت پر تحریر کیا ہے اور حقیقت بیانی کرتے ہوئے خوب دل کھول کر لکھا ہے۔

یوں تو اہلِ سنت کے اکثر رسائل وجرائد میں آپ کے مضامین ومقالات زینت قرطاس بنتے رہے مگر خاص طور پر ''ماہنامہ فیض الرسول'' براؤں شریف میں برابران کے قیمتی مضامین ومقالات شائع ہوتے رہے، جسے قارئین بڑی توجہ و دلچسپی اورانہماک کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت کوعلم وفضل، ذہانت و دانائی کے ساتھ ساتھ دنیاوی دولت وثروت سے بھی شادکام فرمایا ہے۔ آپ نے ایک متمول گھرانے میں والدین کی آغوش پیار ومحبت میں آنکھ کھولی، اور بڑے ہی ناز ونعم سے آپ کی پرورش ہوئی، ہوش وگوش اور شعور وفکر کی دہلیز پر قدم رکھا تو آپ کے والد" محترم جناب ملا منیف صاحب نے مذہبی تعلیم وتربیت سے آراستہ کرنے کے لئے آپ کو دینی درسگاہ سے وابستہ کر دیا۔

آپ کی ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں" موضع بڑھیا پوسٹ کھنڈسری میں ہوئی،........ بعدہ دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف میں داخلہ لیا اور وہاں ماہرین درسیات اور باکمال اساتذہ کرام کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کر کے اکتساب علم کیا ان اساتذہ کرام کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں؛" شیخ العلماء حضرت علامہ محمد اویس حسن غلام جیلانی گھوسوی ''بدرملت حضرت علامہ محمد بدرالدین صدیقی گورکھپوری''، ''نسیم ملت حضرت علامہ الحاج محمد صابر القادری نسیم بستوی''، ''بحرالعلوم حضرت علامہ محمد یونس نعیمی اشرفی''، ''فقیہ ملت حضرت علامہ الحاج مفتی جلال الدین امجدی''، ''مفکر ملت حضرت علامہ محمد حنیف قادری''، علیہم الرحمہ،........ درمیان میں کچھ دنوں کے لئے ''مدرسہ اسلامیہ عربی اندر کوٹ میرٹھ چلے گئے جہاں'' امام النحو حضرت علامہ سید غلام جیلانی علیہ الرحمہ کی درسگاہ سے اکتساب علم کیا" خطیب اسلام حضرت علامہ سید محمد کلیم اشرف جائسی مدظلہ آپ کے رفیق درس رہے لیکن وہاں زیادہ وقت نہ دے سکے اور پھر دوبارہ براؤں شریف آ گئے۔

براؤں شریف چند ماہ وسال تعلیم کا حصول کرتے رہے پھر کچھ نامساعد حالات پیدا ہو گئے جس کے باعث وہاں سے ''دارالعلوم اشرفیہ'' مبارک پور اعظم گڈھ کا رخ کیا اور تقریباً دو سال اقامت پذیر رہ کر وہاں اس وقت کے ماہر وقابل، بالغ نظر اور پختہ فن اساتذہ کرام خصوصاً" جلالت العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ؛" حضرت علامہ عبدالرؤف علیہ الرحمہ، حضرت علامہ ظفرادیبی، بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی علیہ الرحمہ حضرت علامہ محمد شفیع قریشی علیہ الرحمہ وغیرہم سے منتہی کتابوں کا درس لیا اور سن 1971 عیسوی میں عالمیت وفضیلت کی دستار لیکر باضابطہ فراغت حاصل کی۔

حضرت علامہ موصوف جس ادارے میں بھی زیر تعلیم رہے پورے ذوق وشوق اور دلچسپی وانہماک کے ساتھ اپنے اساتذہ درس کی بارگاہ میں خوشہ چینی کرتے رہے اور ایک قابل وذی صلاحیت عالم وفاضل بن کر نکلے اور اپنے گھر وخاندان کا نام روشن کیا۔

فراغت کے بعد اپنے" گاؤں موضع بڑھیا کے مدرسے میں فی سبیل اللہ درس وتدریس کا آغاز کیا اور کم وبیش ایک سال تک یہ سلسلہ چلا، پھر ممبئ سے بعض اہم کام کے لیے بلاوا آ گیا اور وہاں چلے گئے، ممبئ میں جس کام کی ذمہ داری آپ کو دی گئی اس کو بے کم وکاست نبھایا اور انجام تک پہنچانے میں ذرا بھی کسر نہ چھوڑی۔

موصوف انتہائی متحرک وفعال اور سرگرم عمل رہ کر سنیت کا زبردست کام کیا ممبئ کی ایک معروف تنظیم ہے" آل انڈیا تبلیغ سیرت"، جس کے آپ "صدر" منتخب کیے گئے۔ اسی کے بینر تلے بہت سارے قومی وملی مسلکی ورفاہی کام کیے،.........

امریکہ اور عراق کی جنگ کے موقع پر جماعت اہل سنت کا نمائندہ وترجمان بن کر اپنی تحریک ومشن کو آگے بڑھایا، علامہ وارث جمال قادری صاحب اپنے سینے میں دل دردمند رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے آج وہ پیرانہ سالی اور ضعف ونقاہت کے باوجود بھی لکھنے پڑھنے میں سست نہیں ہیں، پرورش لوح وقلم ان کا محبوب اور عزیز از جان مشغلہ ہے،،!

علامہ محمد وارث جمال قادری صاحب مدظلہ کی شخصیت اوائل عمر سے اب تک خدمات دینیہ وفروغ حق اہل سنت سے عبارت ہے اور ان کی سیرت وطبیعت تمام مضر اوصاف سے بالکل مبرہ اور پاک وصاف ہے۔

علامہ محمد وارث جمال قادری صاحب کی شخصیت اور کارنامے پر لکھنے کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے، یہ فقیر کی جانب سے چند سطور فقط بطور خراج محبت ہے،.........

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے وطفیل حضرت کو صحت کے ساتھ درازی عمر عطا فرمائے آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم،

☑☑☑☑☑☑

تقریظ جلیل

مولانا عبدالرشید رحمانی برکاتی، خطیب وامام مینارہ مسجد، بمبئی

الحمدللہ! نحمدہٗ ونصلی ونسلم علی حبیبہ الکریم وآلہٖ الکرام اجمعین۔

امّا بعد!

ریاستِ لوح وقلم کے امیر، رئیس القلم، حضرت علامہ ومولینا وارث جمال صاحب قبلہ مدظلہ العالی علمی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کے لوح وقلم، درس وتدریس کا رشتہ ہمارے بڑے بڑے اسلاف سے براہِ راست ملتا ہے۔

امام النحو حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ جن کی دقت نظر نے علمِ نحو کی دنیا میں اپنوں اور پرایوں پر جن کا پرچم لہرایا، اور علمِ حدیث میں جن کی علمی، فنی عظمت کا پتہ ان کی مختصر سی تصنیف وتشریح سے چلتا ہے۔ براہِ راست، بلاواسطہ حضرت مولینا وارث جمال صاحب قبلہ کو شرفِ تلمذ حاصل ہے اور خود انھیں اس نسبت پر ناز ہے۔ اور شاید ان کی علمی شخصیت کے علاوہ حضرت کے تلامذہ میں اب ویسا کوہِ گراں باقی نہ بچا ہو۔

دوسرے بزرگ جن کی سادگی اور للّٰہیت اور خدمتِ دین وسنیت کی دنیا مدح خواں ہے حضرت مولینا بدرالدین صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان جنھوں نے "سوانح اعلیٰ حضرت" تحریر فرما کر ہم سنیوں کے لیے اعلیٰ حضرت پر بیس اور بنیاد فراہم فرمائی جسے بطور سَند اور شہادت پیش کیا جاتا ہے۔ ایسے عظیم المرتبت بزرگ سے ان کے گھرانے نے تربیت پائی۔ بلاواسطہ حضرت مولینا وارث جمال صاحب قبلہ علمی دنیا کے لیے سَند وشہادت قرار پائے۔

میری دانست میں ان کی علمی عظمت کے لیے یہ دونوں بزرگ کافی ہیں لیکن رئیس اعظم اڑیسہ حضور مجاہد ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی طرف منسوب نا کرنا یہ بڑی زیادتی ہوگی۔

حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کا مجاہدانہ کردار اپنے اور بیگانے سبھی جانتے ہیں۔ ہندوستان میں ہی نہیں بیرونِ ہند میں بھی آپ کی جواں مردی اور استقامت کے چرچے ہیں۔ یقیناً حضرت مولینا وارث جمال صاحب قبلہ کی زندگی میں بھی حضور مجاہد ملت کا عکس وپَرتو نظر آتا ہے۔

جس زمانے میں حضور مجاہد ملت پر سعودی گورنمنٹ نے ظلم وستم ڈھائے، حضرت مولینا وارث جمال صاحب نے ہندوستان کی سرزمین پر حضرت کے لیے احتجاج فرما کر حق دفاع ادا کردیا۔

تصنیف وتحریر کی دنیا میں اور تقریر وخطابت کے میدان میں آج بھی علمی دبدبہ قائم ہے۔ خطابت کے لیے ان کا نام ہی اجلاس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ قلمی میدان میں آپ نے جو تصنیفات فرمائیں ان کا اگر احاطہ کیا جائے اور ان پر تبصرہ کیا جائے تو وہ بذاتِ خود ایک ضخیم کتاب بن جائے۔

''بریلوی کوئی نیا فرقہ نہیں''، اہلِ سنّت وجماعت ہی کو لوگ بریلوی کہتے ہیں۔ یہ ان کی پہچان ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے اسے فرقہ کے طور پر متعارف کرایا، تو حضرت مولینا مدظلہ نے ان کا تعاقب کیا اور ثابت فرمایا کہ بریلوی کوئی فرقہ نہیں بلکہ کچھ لوگوں کا دیا ہوا لقب ہے۔

ان کے مقالات ومضامین کا ایک مجموعہ جلد ہی منظر عام پر آ رہا ہے جس کے مطالعہ سے یقیناً ان کی علمی شخصیت کا اندازہ کر لیں گے۔ مجھ جیسے کم علم سے بس اتنا ہی بہت ہے۔ والسلام

☑☑☑☑☑☑

ادیب شہیر ایک تجزیاتی مطالعہ

ازقلم: حضرت علامہ نعیم القادری بلرام پوری

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنیٰ کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

حضرات قارئین کرام! آج میں ایک ایسی شخصیت کے حوالے سے قلم جنبانی کی جرأت کر رہا ہوں جو اپنے دینی، ملی، مذہبی اور قلمی خدمات کے حوالے سے محتاج تعارف نہیں ہے، میری مراد رئیس التحریر حضرت علامہ الحاج محمد وارث جمال قادری یارعلوی مدظلہ العالی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی کی ذات ہے۔

نسبت ارادت کے لحاظ سے وہ چشتی یارعلوی ہیں جن کے مرشد کریم حضور شعیب الاولیاء شیخ المشائخ الحاج الشاہ صوفی محمد یارعلی چشتی نوراللہ تعالیٰ مرقدہٗ کی ذاتِ والاصفات نے شمالی اتر پردیش کے ضلع بستی، بہرائچ، گونڈہ، فیض آباد، گورکھپور، مہراج گنج، نیز ملک نیپال کے سرحدی علاقوں میں اسلام وسنّیت کی شمع روشن کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ حضور شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے براؤں شریف کی سرزمین پر دارالعلوم فیض الرسول قائم کر کے اسلامیانِ ہند کے ایمان وعقیدے کی حفاظت وصیانت کا جو عظیم کارنامہ انجام دیا ہے وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ اُس مرکزی ادارے نے علماء و خطبا کی صورت میں دین کی خدمت کے لیے اتنے سپاہی پیدا کر دیے کہ جن کی تبلیغی وتدریسی کارگزاریوں سے پورا ملک مستفیض ومستنیز ہو رہا ہے۔ انھیں فیض یافتہ لوگوں میں ایک نمایاں نام رئیس التحریر حضرت علامہ الحاج محمد وارث جمال قادری مدظلہ العالی کا ہے۔ یوں تو رئیس التحریر نے حصولِ تعلیم کے لیے الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور اور صدر العلماء حضرت علامہ غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں بھی حاضری دی مگر دارالعلوم فیض الرسول اور حضور شاہ صاحب علیہ الرحمہ کے فیضانِ کرم سے بھی انھیں کامل فیضان ملا۔ علامہ موصوف حق گوئی و بیباکی میں اپنی مثال آپ ہیں، بزرگوں کی بارگاہ کے ادب شناس اور فیض یافتہ ہیں۔ فی زمانہ ایک بہت بڑی خوبی جو کمیاب ہے کہ وہ مشربی زعم وتعصب کے سلگتے ماحول میں بھی انھوں نے اپنی زبان اور اپنے قلم کو علماء ومشائخ کی گستاخیوں سے محفوظ رکھا فللحمد للہ علیٰ ذالك۔

حصولِ تعلیم کے بعد اپنے والد گرامی کے ساتھ (جو خود بزرگوں کی صحبت سے مالامال اور حضور شاۃ صاحب علیہ الرحمہ سے نسبت ارادت رکھتے تھے) عروس البلاد ممبئی آگئے اور اپنے والد گرامی کے ساتھ کاروبار سے وابستہ ہو گئے۔ میری دانست میں تاہنوز آپ نے کسی مسجد و مدرسے میں باضابطہ ملازمت نہیں کی مگر آپ نے الحمد للہ رب العٰلمین اپنا تشخص برقرار رکھا۔ قرطاس وقلم سے آپ کا جو اٹوٹ رشتہ تھا اسے نبھاتے رہے۔ ممبئی کے مشہور اخباروں میں آپ کے مضامین کو خصوصی کالم میں چھاپا جاتا جس سے قارئین مستفید ہوتے رہتے۔ حضور مجاہد ملّت علیہ الرحمہ کی قائم کردہ غیر سیاسی

تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کے پلیٹ فارم سے آپ نے کئی نمایاں کارنامے انجام دیے، مثلاً تحفظ بغداد کانفرنس، حج کانفرنس اور متعدد سیاسی وسماجی پروگرامات، اوّل الذکر کانفرنس نے تو پوری دنیا میں اہلِ سنّت وجماعت کا سر فخر سے اونچا کردیا۔ بین الاقوامی سطح پر آل انڈیا تبلیغ سیرت کو ہندوستان میں وہ عزت حاصل ہوئی جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تبلیغ سیرت کا یہ کارنامہ بارگاہِ غوثیت مآب میں ایسا مقبول ہوا کہ تبلیغ سیرت کے تقریباً ۳۰ نفری وفد کو حاضری کی سعادت حاصل ہوگئی، فلحمدللہ رب العٰلمین۔

ذاتی طور پر میں نور محمد نعیم القادری بلرامپوری، بانی تنظیم افکار صدر الافاضل ممبئی علامہ موصوف کا اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ ۱۹۹۸ء میں حضرت استاذ العلماء علامہ مفتی شعبان علی نعیمی حبابی علیہ الرحمہ کے ایماواشارے پر حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ کی حیات وخدمات پر کام کرنے کا ارادہ اور جذبہ لے کر حاضر خدمت ہوا اور مدعا بیان کیا تو علامہ موصوف ہندوستان میں قابلِ فخر قلم کاروں میں وہ پہلے آدمی ہیں جنھوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور ہر موڑ پر اپنا قلمی تعاون دینے کا وعدہ فرمایا جسے تنظیم افکارِ صدر الافاضل ممبئی کی تقریباً ایک درجن کتابوں میں آپ ملاحظہ بھی کرسکتے ہیں۔ ادارے کی قابلِ فخر پیشکش فتاویٰ صدر الافاضل جب ترتیب وتبویب کے مرحلے سے گذر رہی تھی تو مسئلہ درپیش ہوا کہ مقدمے کے لیے کسی مشہور مفتی وقلمکار سے رابطہ کیا جائے۔ متعدد لوگوں سے ناچیز نے رابطہ بھی کیا جواباً پوچھا جاتا کہ کتنے صفحے کا مقدمہ چاہیے، صفحات پوچھنے کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہمارے کسی عزیز نے بتایا کہ آج کل فی صفحہ لکھنے کا جو نذرانہ چل رہا ہے اسی کے پیشِ نظر قلم کار اس طرح کا سوال کرتے ہیں۔ جس کا ذکر میں نے حضرت رئیس التحریر سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ حضرت مفتی شعبان علی نعیمی صاحب سے عرض کیجیے کہ مقدمہ وہ خود لکھیں۔ اگر کسی وجہ سے وہ تیار نہیں ہوں گے تو بتانا ان شاء اللہ میں مقدمہ لکھ دوں گا۔ بالآخر حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمہ نے فتاویٰ صدر الافاضل کے لیے ایک طویل مقدمہ تحریر فرمادیا۔ بطور تاثر حضرت رئیس التحریر نے جو گراں قدر مقالہ مذکورہ کو آپ کے لیے تحریر فرمایا وہ اپنے آپ میں خود کسی مقدمے سے کم نہیں ہے، جسے فتاویٰ صدر الافاضل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

آپ کو حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ کی ذات سے جو والہانہ عقیدت اور محبت ہے، اسے آپ کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ بارگاہِ صدر الافاضل میں آپ کا خراجِ عقیدت یقیناً مقبول ہوا کہ ۲۰۱۳ء میں عرس نعیمی کے موقعہ پر جامعہ نعیمیہ مرادآباد میں شہزادۂ رضوان ملّت صاحب سجادہ حضرت علامہ سیّد انعام الدین صاحب نعیمی نے ہزاروں علماء وعوام کی موجودگی میں آپ کو صدر الافاضل ایوارڈ سے نوازا۔

حضرت رئیس التحریر کے اندر میں نے چند خوبیاں محسوس کیں جو فی زمانہ نایاب تو نہیں کمیاب ضرور ہیں۔ (۱) فرائض واجبات پر سختی سے عمل (۲) بزرگوں کی بارگاہ کا مؤدب (۳) بلاحیل وحجت اور بروقت حق بات کہہ دینے کی جرأت۔ یہ ایسی چند باتیں ہیں کہ وقت پر بڑے سے بڑوں کو بے پردہ ہوجانا پڑتا ہے۔ ایک عالمِ دین ہونے کی وجہ سے اہلِ علم اور علماء ومشائخ سے جہاں آپ کا گہرا تعلق ہے، وہیں بڑے بڑے سیاست دانوں اور منسٹروں سے بھی آپ کے تعلقات ہیں

جوآپ کے سیاسی شعور اور قومی وملی تڑپ رکھنے کی وجہ سے آپ کی بے پناہ قدر کرتے ہیں۔

یوں تو آپ کی درجنوں کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، غیر مطبوعہ کتابیں اور مختلف موضوعات پر آپ کے مقالہ جات جو اب تک منظر عام پر نہیں آسکے ہیں انھیں جدید ترتیب وتہذیب کے ساتھ منظر عام پر لانے کا بیڑا آپ کے حقیقی بھانجے اور نوجوان ومتحرک عالمِ دین حضرت مولانا عطاء الرحمٰن فیضی سلمہ المولیٰ تعالیٰ نے اٹھالیا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اس راہ میں آنے والی تمام دقتوں اور دشواریوں کو دور فرما کر مولانا عطاء الرحمٰن فیضی کی غیب سے مدد فرمائے آمین۔

حضرت رئیس التحریر کی سبھی کتابوں کو تو ہم نے نہیں دیکھا ہے مگر جن چند کتابوں کے مطالعے کی سعادت حاصل ہے، ان کو ہم نے اوّل تا آخر دو چند نشست میں پڑھ ڈالا اور میرا خیال ہے کہ ہر قاری اسی طرح کرتا ہوگا وہ اس لیے کہ آپ کی تحریر میں کہیں سے بھی خشکی کا احساس نہیں ہوتا، وہ چاہے جس بھی موضوع پر ہو۔ حقائق اور الفاظ کی بندش نیز اردوئے معلّٰی کی چاشنی آپ کو کہیں سے بھی بور نہیں ہونے دیتی۔ تقریباً آپ کی سبھی کتابوں کا یہی حال ہوگا کہ جب قاری ورق گردانی شروع کرے گا تو مقفّٰی ومسجع الفاظ اسے ھَل من مزید کے طور پر تمت بالخیر پر مجبور کردیں گے۔

مولیٰ تعالیٰ آپ کے سایۂ کرم کو تادیر قائم رکھے اور مزید لوح وقلم اس حوالے سے خدمت دین کی توفیق رفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

یکے از غلامانِ نعیمی
اسیر نعیم **نور محمد نعیم القادری بلرامپوری**
بانی تنظیم افکار صدر الافاضل ممبئی
متوطن، نواز پور، کواپور، ضلع بلرامپور، یوپی

جامع الصّفات شخصیت

از: عبدالمجید خان رضوی مصباحی

صحت تنومند، جسم خوب صورت اور دل فریب قد بالا، گورا رنگ، متبسّم چہرہ، جس سے علم و مذہبیت کا نور نمایاں، حسین چہرے پر بھری ہوئی داڑھی اور ترشی مونچھیں، دمکتی ہوئی پیشانی جس سے اقبال مندی ظاہر، پُرنور نرگسی آنکھیں جن سے ذہانت، متانت، محبت و شفقت عیاں، ہتھیلیاں کشادہ، مضبوط مگر انگلیاں متناسب، جو قوتِ فکر و تحریر پر شاہد، اور رفتار باوقار، پُرشوکت جس سے عالمانہ جھلک نمایاں۔

عموماً سفید کرتا، کبھی کبھی اس پر صدری، حد شرع پائجامہ، بلند ٹوپی میں حضرت علامہ وارث جمال صاحب مصباحی مدظلہ العالی ملبوس رہتے ہیں۔ ہر جامہ آپ کے اوپر جچتا اور بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل لباس سے آپ کی زیب و زینت نہیں ہوتی، بلکہ لباس کو آپ سے شرفِ زینت حاصل ہوتا ہے۔ اللہ جل جلالہ نے جتنی اچھی موہنی صورت اور پُرشکوہ ظاہر دیا ہے، اتنا ہی پُرعظمت باطن عطا فرمایا ہے۔ ہزاروں کے مجمع میں آپ کی شخصیت اپنی خاص آن بان کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہے۔ بشرہ اس قدر ہمہ گیر کیفیات کا مظہر ہے کہ مفکرین میں ہوتے ہیں تو تفکّر کی اعلیٰ ترین علامتیں وصلاحیتیں پڑھی جاتی ہیں۔ علما و پاک بازوں کی جماعت میں ہوتے ہیں تو باطن کے آثار جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو چیزیں ظاہر ہوتی ہیں وہ اصلیت سے خالی نہیں ہوتیں۔ اگر اندر یہ سب نہ ہوتا تو باہر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ کیوں کہ ظاہر باطن ہی کا تو آئینہ دار ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ایک عالمِ دین کے لیے جتنی ضروری صفات و کمالات ہونی چاہیے وہ آپ میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ آپ کے مختلف النوع کمالات اور خوبیوں میں آپ کے علمی محاسن اُجاگر و نمایاں ہیں۔

لاریب آپ اپنے والد ماجد جناب الحاج ملّا منیف صاحب کے کردار کے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ حقیقت کے اعتبار سے کلیہ یہی ہے کہ سفید کپڑے کو جس رنگ میں ڈالا جائے گا وہ وہی رنگ اختیار کرلے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ سیاہی میں ڈالیں اور سُرخ و سبز ہو جائے۔ آفرینش کے اعتبار سے ہر انسان فطرت کی پوری سادگی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے ماں باپ، ماحول، تعلیم و تربیت جیسے مؤثرات سے اس کو کافر یا مسلمان، یہودی یا نصرانی، خوش اخلاق یا بداخلاق و بدتہذیب بناتے ہیں۔

حضرت علامہ وارث جمال صاحب مدظلہ کی کتابیں ''محمود غزنوی''، ''اسلام اور شادی''، میں نے اُس وقت دیکھی تھیں جب الشعوری کی منزل میں تھا۔ اس وقت دارالعلوم محمدیہ میں حفظ کر رہا تھا۔ آپ اور آپ کے والد ماجد کا نام دینی سرگرمیوں اور اشاعتی کاموں میں پیش پیش رہنے کی وجہ سے سنا کرتا تھا۔

ایک بار اثنائے گفتگو حضرت موصوف نے فرمایا کہ: بہت سی وہ مسجدیں جن پر بدمذہبوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور ایک

زمانے سے ان کا ہی امام ہوتا تھا۔ اسے حضرت ٹوپی والے بابا نے اس طرح حاصل کیا کہ ایک دو دن پہلے میرے ابّا (ملّا منیف صاحب) سے کہہ دیتے تھے کہ ایک عالم امام چاہیے۔ مسجد نامزد کر دیتے اور وقت کا تعین کر دیتے۔ وقت مقررہ پر ٹوپی والے بابا، ملّا منیف صاحب اور امام پہلی صف میں امام کے مصلّے کے پیچھے بیٹھ جاتے۔ جب جماعت کا وقت ہوتا تو ٹوپی والے باباسنّی امام کو اشارہ کرتے کہ مصلّے پر چلے جائیں۔ وہ نماز پڑھاتے، اس کے بعد مسجد اہلِ سنت و جماعت کے زیر تولیت ہو جاتی۔ مجال نہیں کہ کوئی اُف تک کرے۔ اس طرح کئی مساجد جن پر بد مذہبوں کا ناجائز، غاصبانہ قبضہ تھا ان کے تسلّط سے نکال کر سنیوں کے قبضے میں دے دی۔

یقیناً ان حضرات کی بڑی قربانیاں ہیں جن سے لوگ عموماً ناواقف ہیں۔ آج پوری جماعت مل کر جو کام نہیں کر پاتی ہے وہ بڑی خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ بحسن وخوبی کر ڈالتے تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ نہ چوں نہ چرا، نہ لڑائی نہ جھگڑا، نہ کورٹ نہ کچہری۔۔۔ اللہ تعالیٰ جس سے چاہے اپنے دین کی خدمت لے لے۔

آپ کی آنکھوں کی بھنویں اور پلکیں بڑی گھنی اور دراز ہیں۔ یہ دو خوبیاں آنکھیں اور چہرے کی خوب صورتی کی علامت ہوا کرتی ہیں۔

ایک بار دورانِ گفتگو آپ نے فرمایا تھا کہ ایک مردِ قلندر نے میرے چہرے بشرے، پلکوں اور بھنوؤں کو دیکھ کر فرمایا: ایسے لوگ یا تو درویش وقلندر ہوتے ہیں یا بادشاہ۔ ممکن ہے علامہ موصوف یہ سوچتے ہوں کہ مردِ درویش نے جو کہا تھا وہ نہ ہو سکا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ وہ بادشاہت آپ کو مل گئی۔ یہ زمینی بادشاہت تو اس دنیائے فانی تک محدود رہ جاتی ہے۔ آپ کو تحریر کی بادشاہت ملی ہے۔ حضرت ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

كِتَابُ الْعَالِمِ وَلَدُهُ الْمُخَلَّدِ۔ عالمِ دین کی کتاب اس کی ہمیشہ باقی رہنے والی اولاد ہے۔

انسان اس دنیائے فانی سے چلا جاتا ہے۔ لوگ تھوڑے دنوں بعد اسے بھول جاتے ہیں۔ بسا اوقات اولاد و احفاد بھی نسیان کی وادیوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن تصنیفات و تالیفات مرورِ زمانہ کے باوجود اس کا ذکرِ حسن دائمی طور پر باقی رکھتی ہیں۔ حضرت امام ابن جریر علیہ الرحمہ کو اس دنیا سے کوچ کیے ہوئے گیارہ سو برس گزر گئے، مگر آج بھی ان کی تصنیفات و تالیفات کا دینی وعلمی اور تحریری سرمایہ ان کے ذکرِ حسن کے ساتھ انھیں باقی رکھے ہوئے ہے۔

ادبائے اردو اور مصنفین ومؤلفین کی صفوں میں آپ "ملک التحریر" اور "رئیس التحریر" سے یاد کیے جاتے ہیں۔ اور صبح قیامت تک یاد کیے جائیں گے۔ (ان شاء اللہ) برصغیر ہند میں تذکرہ نگاروں، قلم کاروں کی بزم میں انھیں مؤقر اور معلّٰی القاب سے پہچانے جاتے ہیں۔ ہزار صفحات سے زائد "مضامین جمال" اسلامیات کے اسلامی پردے پر آرہے ہیں۔ جسے اربابِ علم و دانش رہتی دنیا تک پڑھتے اور استفادہ کرتے رہیں گے۔ یہی چیزیں انسان کو زندہ جاوید رکھتی ہیں۔ حضرت شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بس نامور بزیر زمین دفن کردہ اند　　　　کز ہستیش بروئے زمین برنشاں نماند

خیر کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر　　　　　زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

حضرت موصوف مدظلہ جہاں ایک صلح پسند عالم دین ہیں، وہیں حلال وحرام میں تمیز رکھنے والے بااُصول اسٹیل کے تاجر بھی ہیں۔ باپ، بیٹے، پوتے ان تین نسلوں کو میں اسی طرزِ تجارت پر دیکھ رہا ہوں۔ جس کاروبار میں اور جس دور سے آپ کے والد اس سے منسلک ہیں، انگوٹھا لگانے والے مال ودولت میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے، مگر یہ بقدرِ ضرورت روٹی، کپڑا اور مکان ہی میں رہ گئے۔ حرام دولت کا انبار نہ لگایا، ورنہ نہ جانے کون کون سے مِلّت بن جاتے۔

بلاشبہ حضرت مدظلہ نہایت خوش طبع، خوش اخلاق، پیکرِ اخلاص، علم وحلم، تحمل وتدبر،۔۔۔۔ انسانیت، بصیرتِ دینی، مستقبل شناسی، دور اندیشی، بالغ نظری، اعلیٰ ظرفی و بلند خیالی، وجاہت علمی، علم نوازی، روشن دماغ اور حسّاس قلب کے مالک ہیں۔ دنیائے سنیت کے مطلع پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے ہیں۔ طرزِ تحریر نہایت سلجھا ہوا، موضوع و بیان حقیقتوں کی تہہ کا سراغ لگاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

چند برس پہلے مجھے آپ کی دو کتابیں ملیں، یہ یاد نہیں کہ کیسے ملیں۔ کتابوں کے نام ہیں ''اسلام میں بریلوی ایک فرقہ'' اور ''اختلاف بین المسلمین اور اس کا پس منظر'' اوّل الذکر کتاب کو آپ نے ایسی تحقیق وشواہد کے ساتھ لکھا ہے کہ اپنے اور غیر سب کو بے قیل وقال قبول کرلینا چاہیے۔

شہزادۂ اعلیٰ حضرت، تاجدارِ اہل سنت، قطب عالم، سیدی مرشدی مطاعی مفتی اعظم حضرت علامہ شاہ مصطفیٰ رضا خاں بریلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

''جب اہلِ سنّت کو ''بریلوی'' کہہ کر خطاب کیا جائے تو اس جدید خطاب سے شدت کے ساتھ انکار کیا جائے۔ ہم وہی چودہ سو سالہ قدیم اہل سنت وجماعت ہیں۔ یہ جدید نام وہابیہ ملاعنہ اہلِ سنّت کو دیتے ہیں۔''

(اہل سنت میں اختلاف وتفریق کے الم ناک واقعات، از علامہ محمود احمد رفاقتی اشرفی قادری۔ ص ۱۳۔ بحوالہ اسلام میں بریلوی ایک فرقہ؟ ص ۶)

شارح بخاری، فقیہ العصر، نائب مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی (صدر شعبۂ افتا جامعہ اشرفیہ) علیہ الرحمہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''بریلوی'' وہابیوں کی طرف سے دیا ہوا لقب ہے۔ جو ہمارے لیے قطعاً قابلِ قبول نہیں ہے کہ وہ بلاشبہ محمد ابن عبدالوہاب نجدی کے نئے پیرو ہیں۔' (اسلام میں بریلوی ایک فرقہ؟، ص ۱۲)

حضرت مولانا مفتی عبدالحلیم ناگپوری فرماتے ہیں کہ ''میرے دورِ طالب علمی میں شیر بیشۂ اہلِ سنّت حضرت مولانا حشمت علی خاں صاحب علیہ الرحمہ حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ وہاں آپ کا قاضی حرم سے مباحثہ ہوا۔ جس میں انھوں نے بتایا کہ بریلوی کوئی فرقہ نہیں ہے، میں سُنّی ہوں۔ کس کی مجال نہیں کہ میرے سامنے آکر کوئی یہ بات ثابت کرے کہ ہندوستان میں بریلوی کوئی نیا فرقہ ہے۔'' (اسلام میں بریلوی ایک فرقہ، ص ۱۳)

مقتدائے اہلِ سنّت حضرت علامہ اختر رضا خان ازہری بریلوی (نور اللہ مرقدہ) نے پہلے قاضی حرم کے اس سوال کہ

کیا آپ بریلوی ہیں؟ کے جواب میں بڑے پُراطمینان انداز میں فرمایا تھا کہ: میں اہلِ سنّت وجماعت کا ایک فرد ہوں۔ البتہ بریلی میرا وطن ہے۔ (اسلام میں بریلوی ایک فرقہ؟،ص ۲)

قائد اہلِ سنّت حضرت مولانا شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ نے جامع مسجد ماریشس کے حجرۂ امام میں ایک صاحب سے ان کا نام پوچھا تو انھوں نے ایک نسبت کے ساتھ اپنا نام بتایا۔ تو حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے بڑے دُکھ کے ساتھ فرمایا کہ ''ہمیں پہلے بریلوی باور کرایا گیا۔ اب یہ ایک نسبت اور آ گئی۔'' (راوی راقم السطور)

حقیقت بھی یہی ہے کہ آج انھیں نسبتوں کو اپنے کی ضرورت ہے جنھیں ہمارے بزرگوں نے اپنایا۔ وہ روشن ضمیر تھے اور فراستِ ایمانی سے مالا مال تھے۔ اعلیٰ حضرت بریلوی نے کہیں بھی بریلوی نسبت کو اختیار نہیں فرمایا۔ اور ان کے تلامذۂ کرام اور علمائے اہلِ سنت مثلاً حجۃ الاسلام، حضور مفتی اعظم ہند، صدر الشریعہ، صدر الافاضل اور شیر بیشۂ اہلِ سنّت حضرت مولانا حشمت علی خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی بریلوی نسبت کو اختیار نہیں فرمایا (مفتی محمد مکرم، شاہی امام فتح پوری مسجد، دہلی۔ کتاب مذکور صفحہ ۱۸)

اتنے سارے نظائر ہوتے ہوئے جسے حضرت موصوف نے اپنی کتاب میں پیش کیا، عوام وخواص اہلِ سنّت کو ''بریلوی'' کہنے اور لکھنے میں غایت درجے احتیاط کرنا چاہیے۔ ہاں اگر کسی کا بریلی وطن اصلی ہے تو اس کے لیے کوئی حرج نہیں۔ جب کہ اسلافِ کرام نے بھی اپنے کو مسکن کی طرف اپنے کو منسوب کیا ہے۔ اور تمام مذاہب کے نامور افراد کرتے آرہے ہیں۔

آپ کی دوسری کتاب ''اختلاف بین المسلمین اور اس کا پس منظر'' موصوف اس کے صفحہ ۳۴ پر لکھتے ہیں:

''اپنے فہم وشعور، فکر و اِدراک کا جائز استعمال عمل میں لائیں۔ اور اس مرکزی نکتے پر پوری توجہ مبذول کر دیجیے کہ اس گھر کو آگ کب لگی؟ کیسے لگی؟ مسلمانوں کو باہم لڑانے کا منصوبہ کس نے بنایا؟ افتراق بین المسلمین کس کی ضرورت تھی؟ ملّی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کون سے ہاتھ آگے بڑھے؟ اور ان ہاتھوں کو کس ڈھنگ سے استعمال کیا گیا؟ اتحاد المسلمین پر پہلا تیشہ چلانے والے کا ٹریڈ مارک اور وہ کس ہیئت کذائی میں تھے؟

میں کس کے ہاتھ میں اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

کیا برصغیر ہند کی مذہبی تاریخ میں تقویت الایمان، جلاء العینین، صراطِ مستقیم، رسالہ یک روزی کے پہلے بھی کسی قابل ذکر مذہبی مناقشے اور افتراق بین المسلمین کی نظیر پیش کی جاسکتی ہے۔ (الدالرفضہ)

انگریزوں کے عزائم میں لکھی گئیں یہ وہ مذہبی کتابیں تھیں اور اب بھی ہیں جو تیرہ سو سال پہلے کے اسلام کو مسترد کر رہی تھیں۔ ان کتابوں کو برٹش گورنمنٹ نے لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کرایا۔ آخر قاتلوں، خون کے پیاسوں، اسلام کے دشمنوں کو اسلامی کتب کی اشاعت سے اتنی دل چسپی کیوں ہوگئی تھی

کوئی محبوب ہے اس پردۂ زنگاری میں

ان کتابوں کی اشاعت سے مسلمانوں کے اندر زہر پھیل گیا۔ مسلم اتحاد پر جبّہ و دستار کی آڑ میں یہ انگریزوں کا پہلا اٹیک تھا۔ مسلم اجتماعیت پر یہ پہلا زبردست حملہ تھا۔ اور انگریزوں کا یہ پہلا شب خوں تھا جو اسلامی اتحاد پر مسلم نما ہاتھوں سے کیا گیا۔

حضرت مدظلہ نے اس کتاب کو حقیقت پر مبنی ایسے مصلحانہ اور حسین انداز میں لکھا ہے کہ مطالعہ کے بعد طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے۔ مگر وہیں انتشار بین المسلمین سے تکدر بھی پیدا ہوتا ہے اور ایک انصاف پسند انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر علمائے اہلِ سنّت کا نورانی اور جانثار قافلہ ان کا تعاقب نہ کرتا تو اسلام کو مسخ کرنے اور روح ایمانی لوگوں کے دلوں سے نکالنے کے لیے انگریز نوازوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

حج کانفرنس:

امام المحتاطین، سید التارکین، مناظر اعظم، حضرت مولانا شاہ الحاج حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ قدس سرہٗ (رئیس اعظم رؤوفیہ اسٹیٹ، دھام نگر، اڑیسہ) اللہ کے ان مطیع اور مقبول بندوں اور اصحابِ عزیمت فرزندوں میں سے تھے جو حق و صداقت اور اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کبھی اپنے دائیں بائیں ہمراہیوں اور رحمانیوں کا انتظار نہ کیا۔ اور اس راہ میں تمام مصائب وآلام اور قید و بند کی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں مسرور نظر آتے رہے۔ یقیناً مجاہد ملت کا لقب آپ کی ذات کے لیے ایسا موزوں ومناسب تھا جیسے انگوٹھی کے لیے نگینہ۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت انھیں کی قائم کردہ ایک کثیر الجہت تحریک تھی۔ جس کی پورے ہندوستان میں دھوم تھی۔ حضور مجاہد ملت قدس سرہٗ نے اپنے معتمد، پیکر اخلاص ومحبت کو ہر لحاظ سے اعتبار واعتماد کی حامل شخصیت، صاحبِ فکر ونظر، مشہور عالم دین، عالمی ونامور دانشور مفکر، ملک التحریر حضرت علامہ الحاج محمد وارث جمال قادری صاحب مدظلہ کو آل انڈیا تبلیغ سیرت کا بحیثیت مرکزی صدر منتخب فرمایا۔ آپ کو حضور مجاہد ملت نور اللہ مرقدہٗ سے نہایت والہانہ عقیدت ومحبت ہے۔ اسی حسنِ عقیدت کا نتیجہ ہے کہ خلوص وللّٰہیت کے ساتھ تبلیغ سیرت کا پرچم بلند کیا۔ اور اسی کے زیر اہتمام ماضی میں ''حج کانفرنس'' کے نام سے ایک عظیم الشان اجتماع کیا۔ جس میں دانشورانِ ہند کو جمع کیا۔ جس کا مقصد ہندوستان سے سفر حج پر جانے والے حجاجِ کرام کی مالی وجسمانی مشکلات کو اربابِ حل وعقد سے دور کرانا تھا۔ آپ نے اپنے نیک مقاصد میں کامیابی حاصل کی۔ جس پر علما ومشائخ ہند نے آپ کی کلماتِ تحسین وآفریں سے خوب حوصلہ افزائی کی۔

مقدمۂ تذکرۂ مخدوم علی مہائمی:

استاذی الجلیل حضرت علامہ یٰس اختر صاحب قبلہ مصباحی (بانی دار القلم دہلی) اور محقق مسائل جدیدہ حضرت علامہ مفتی نظام الدین صاحب مدظلہ نے ممبئی کے ایک سفر میں مجھے یاد کیا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ''تذکرۂ مخدوم علی

مہائمی'' لکھنے کا حکم ہوا۔ فقیر نے اپنے شفیق استاذ کے حکم کی تعمیل و تکمیل کو باعثِ سعادت تصور کیا۔ اپنی بساط کے مطابق جب لکھ لیا تو کتاب کے مقدمہ کے لیے جب نگاہ دوڑایا تو ہر جہت اور زاویے سے حضرت ملک التحریر مدظلہ پر آ کر ٹھہر جاتی۔ میں نے عرض کیا، آپ نے کرم فرمایا اور گیارہ صفحات پر مشتمل بڑا پُر مغز، بسیط مقدمہ تحریر فرما کر اس ناچیز پر نوازش کی۔ نہ میں اپنے الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں اور نہ ہی ان کی تحریروں کی کماحقہٗ تعریف کر سکتا ہوں۔ حق یہ ہے کہ ان کے مقدمہ نے کتاب کی افادیت پر چار چاند لگا دیے۔ آپ کے مقدمہ کا ایک اقتباس ہدیۂ قارئین ہے۔ اس میں اردو ادب بھی ہے، اور مصنفین و قلم کاروں کا دُکھ درد بھی۔ اور آپ کا یہ خاص ایک وصف بھی ہے جس کا آپ اظہار بھی کیا کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

''اس سفرِ محبت میں وہ (یعنی عبدالمجید خاں رضوی مصباحی) کتنے دشوار کن وصبر آزما مراحل سے گزرے ہوں گے اس کا صحیح اندازہ اس راہ کے مسافر کو ہی ہو سکتا ہے جو اس وادیِ پُرخار سے گزر چکے ہیں۔ مگر انھیں مقررین و واعظین کی طرح کوئی دنیوی صلہ نہیں ملتا۔ بس آخرت ہی ان کی آخری امید ہوتی ہے۔ بخلاف پیشہ ور مقررین و واعظین کے کہ انھیں آخرت میں نہیں بلکہ اس کا صلہ اہلِ دنیا سے لینا ہوتا ہے۔ جو اپنے اُچھل کود، چیخنے، دہاڑنے، ہنسنے ہنسانے کی فیس نذرانے کی شکل میں اہلِ دنیا سے وصول لیتے ہیں۔ اور اس کے بدلے میں ان سادہ لوحوں کو جنت کا زبانی ٹکٹ دے دیتے ہیں۔

اس دنیا کا سب سے مظلوم طبقہ اہلِ قلم کا ہے کہ مقررین و واعظین کی طرح انھیں کوئی اہلِ کرم نہیں ملتا ؎

بہت عزیز ہے ہم کو ردائے فقر و غنا
ہمارے ہاتھ میں کیوں کاسۂ سوال دیا

(تذکرۂ مخدوم علی مہائمی، ص ۲۹)

عراق و ایران کی جنگ کے موقع پر حضرت موصوف میرے یہاں تشریف لائے، اس وقت میں ''اَلْاِعْجَازُ الْعَدَدِیْ لِلْقُرْاٰنِ الْکَرِیْمِ'' مطبوعہ ''انکشافات القرآن'' کے ترجمہ اور تحشیہ میں مشغول تھا۔ دیکھ کر خوشی کا اظہار فرمایا۔ معاً یہ بھی فرمایا کہ اتنی ضخیم کتاب کی طباعت کی کیا صورت ہوگی؟

یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارا کوئی عالم دین محقق اگر کوئی علمی و تحقیقی کام عرق ریزی و دل سوزی سے کرتا ہے تو اس کی طباعت کے لیے وہی سوال پیدا ہوتا ہے جو موصوف نے مجھ سے کیا۔ ہندوستان کے تاجرانِ کتب (اِلّا ماشاءاللہ) کا حال یہ ہے کہ جیسے ایک بوڑھا باپ اپنی بیٹی کو پال پوس کر بڑا کرتا ہے، جب اس کے شادی کی بات کرتا ہے تو جہیز کے رہزن کہتے ہیں کیا دوگے؟ فلاں تو یہ یہ دے رہا تھا۔

ہماری لاچتیر یریوں میں تو حضرت علامہ وارث جمال کے نام سے تو آج ہزاروں صفحات ملنے چاہیے تھے مگر ایسا نہ ہوا۔ اس کی پہلی وجہ یہ ہے جو سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا۔ کہ کتاب کی تصنیف ایک بڑا مرحلہ، اس کے بعد اس کی طباعت اس سے بڑا مرحلہ ؎

قدر داں قیمت بازار سے آگے نہ بڑھے
فن کی دہلیز پر فن کار نے دم توڑ دیا

دوسری وجہ یہ کہ ذی علم، اہلِ علم وصاحبِ فضیلت کے قدرداں ہیں۔مگر بے علم، بے عمل قوم کے سینہ عالم دین محققین سے خلافِ اولیٰ اور خلافِ احتیاط کسی چیز کو دیکھ لیتے ہیں تو حسد کی بنیاد پر ان کے خلاف بے محل فتوے جاری کر کے ان کے علمی اثرات کو ختم کرنے، اور لوگوں میں محبت کی بجائے نفرت کی بدبو پھیلانا شروع کر دیتے ہیں۔

یادرہے کہ تصلب فی الدین اعلیٰ وصف ہے۔مگر بے جا تشدد اور تعصب نہایت رذیل اور نکموں کا مذموم وصف ہے۔
مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ اس جامع الصفات شخصیت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی پیش آیا۔ہم اپنی بربادی کے افسانے سنانے کہاں جائیں ؎

گھر جل گیا گھر کے چراغ سے

ہماری جماعت کے پروفیسر مسعود احمد دہلوی، علامہ وارث جمال مصباحی مدظلہ وغیرہما جیسے بہت سے قیمتی ہیرے تین سفید کپڑے پہن کر ہمیشہ کے لیے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔دلِ حساس ان کے لیے اشکِ رواں اور دعائیں ہی کرسکتا ہے وبس۔۔۔۔ ؎

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

☑☑☑☑☑☑

آئینۂ سیرت

سیّدنا محمد عربی ﷺ بحیثیت سپہ سالار

حسنِ یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشتِ زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

جنگ انسانی فطرت کا ایک خاصہ بھی ہے اور ایک معاشرتی ضرورت بھی، جس سے انکار ممکن نہیں جو ہر زمانے میں دنیا پر کسی نہ کسی انداز میں مسلط رہی۔

مذہب کے نام پر حق کے لیے، ضرورت کے تحت، دفاع کی خاطر، شہرت و ناموری کے لیے فاتح عالم بننے کے جنون میں، ہوس ملک گیری کے تحت۔

انسانی تاریخ جہاں داستان بزم آرائی سے مالا مال ہے وہیں داستانِ رزم سے بھی اس کی زلفیں سنواری گئیں۔ دنیا نے فاتحین عالم کو بڑی عزت دی اور فخر سے ان کے کارناموں کو پیش کیا۔ دارا و سکندر، کسریٰ و قیصر، نپولین، ہنسیال، ہٹلر، مسولینی، رچرڈ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں دنیا جنگ وجدال، حرب وضرب کا ماہر سمجھتی ہے۔

طویل فوجی تربیت، بے کراں مادی وسائل، بے پناہ اسباب و ذرائع اور بے حد وحساب سپاہ کی کثرت کی بدولت یہ فاتح بنے۔ انھوں نے ایک وسیع خطے کو اپنی جارحانہ یلغار سے روندا۔ خلق کو تہ و بالا کیا۔ ایشیا و یورپ کو تہس نہس کیا۔ ان کی عسکری قیادت مسلّم۔ حرب وضرب کی بالادستی تسلیم۔ جنگی صلاحیت کی حیرت انگیزی سر آنکھوں پر۔ ان کے اٹل جنگی اصول فوجی اسکولوں میں داخل نصاب یہ سب کچھ اپنی جگہ پر صحیح۔

مگر کیا یہ مکمل جرنیل تھے؟

ہم فاتحین وسپہ سالار کی طویل فہرست سامنے رکھ ان کر کی فوجی زندگی کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی ایسا نہیں جس کی عسکری قیادت اور حربی سیادت پر انگلی نہ اٹھی ہو۔ عسکری زندگی کے نمایاں گوشے والی داغدار نہ ہوئے ہوں، شکست کی ذلتوں سے دوچار نہ ہوئے ہوں۔ دارا ہوں یا سکندر، ہنسیال ہوں یا رچرڈ، نپولین ہوں یا ہٹلر ان میں کوئی خودکشی کر کے مرا۔ کسی نے شکست یاب ہو کر قید و بند کی حالت میں جان دی اور کوئی عظیم اور تاریخی شکست کے غم میں دنیا سے گیا۔

لیکن آج سے چودہ سو (۱۴۰۰) سال پہلے انسانی فضل و کمال، جاہ وجلال کا ایسا پیکرِ مجسم تشریف لایا جو اپنی گونا گوں تہ در تہ ہی صفت، ہمہ جہت اور جامع الصفات خوبیوں کے ساتھ ایسا کامل و اکمل مکمل جرنیل تھا کہ روئے زمین پر جس کی عسکری قیادت، جنگی صلاحیت اور حربی امامت کی مثال ہی ممکن نہیں جس نے نہ تو کسی فوجی مکتب میں کمیشن لیا۔ نہ ہی عملی طور پر کسی جنگ میں حصہ لیا۔ کبھی کسی جنگی مشق کے قریب نہیں گیا۔ نہ ہی کسی سپہ سالار کی زندگی دیکھی۔ کسی میجر جنرل کے گھر میں

پیدا بھی نہیں ہوا۔ کسی استاد کی شکل بھی نہیں دیکھی کہ عسکری قیادت کا کتابی علم ہی حاصل ہو جائے۔

(آنحضرت ﷺ سولہ سال کی عمر میں حرب الفجار کے موقع پر اپنے چچا حضرت زبیر کے ساتھ تیر لے کر گئے تھے۔ دورانِ جنگ آپ اپنے چچا کو تیر اٹھا اٹھا کر دیتے تھے بس)۔ نہ تو سپاہ کی کثرت، نہ اسباب کی فراوانی۔ افراد کی قلت اور ذرائع کی بے سروسامانی کا یہ عالم کہ جب ملکِ عرب کی سب سے بڑی طاقت یعنی قریش مکہ سے اس کا پہلا معرکہ ہوا تو جنگی ساز و سامان سے آراستہ دشمن کے مقابلے میں اس کے پاس صرف ۳۱۳ سپاہی اور پوری فوج میں صرف دو گھوڑے تھے، وہ بھی عمر کے اس حصے میں جب انسانی قویٰ مضمحل، اعصاب کشیدہ اور ہمتیں پست ہو جاتی ہیں۔ اختلافِ روایت کی بنیاد پر ۱۹ سے ۲۹ جنگوں میں بہ نفسِ نفیس سپہ سالاری کے فرائض انجام دیئے۔ ۷۴ جنگی مہمیں بھیجیں۔ ۹ جنگوں میں گھمسان کا رن پڑا۔ ہر جنگ میں فتح و کامرانی نے قدم چومے۔ عمر کے آخری ۱۰ سال کے اندر اندر پورے ملکِ عرب کو فتح کیا۔ ملک کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پورے جزیرۃ العرب میں کوئی سر ایسا نہیں رہ گیا جو اس کے مقابل اٹھ سکے۔ مفتوحہ علاقوں کو اگر سالوں اور دنوں پر تقسیم کیا جائے تو دس سال میں دس لاکھ مربع میل اور یومیہ ۲۷۴ مربع میل پر قبضہ کیا۔ اپنے جانی نقصان کا تناسب مہینے میں ایک اور دشمن کا ایک سو پچاس۔

جب سے اس روئے زمین پر انسانی وجود کا نمود ہوا، تاریخ حرب و ضرب اور داستان جنگ و جدل میں کوئی مثال اس طرح کے عسکری قیادت اور فوجی لیڈر شپ کی ہے؟

جنھیں تلوار پکڑنے کا سلیقہ نہیں تھا ان بے سلیقوں، اونٹوں کے چرانے والوں، کافور پر نمک کا دھوکہ کھانے والوں کو ایسے خطوط پر فوجی تربیت دی کہ ان خطوط پر چل کر انھوں نے وقت کی جابر ترین حکومتوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیا۔ ایشیا، یورپ، افریقہ، ہند، سندھ، روم، شام پر حیرت ناک طور پر فاتحانہ قبضہ کیا اور فاتحین عالم کی فہرست میں سرِ فہرست اپنا نام لکھوایا۔ خالد بن ولید، ابوعبیدہ، مثنیٰ بن حارثہ، سعد بن ابی وقاص، عمرو بن عاص، یزید بن ابی سفیان، معاویہ، محمد بن قاسم، موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد، قتیبہ بن مسلم، عبدالرحمٰن بن الداخل، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، صلاح الدین ایوبی، بایزید یلدرم، محمد فاتح، امیر تیمور لنگ۔ یہ وہ فاتحین عالم سپہ سالاران عساکر اور نامور ترین جرنیل ہیں جن کی عسکری قیادت، جنگی مہارت اور شجاعانہ کارناموں کا غلغلہ اور ان کی ناموری کا شہرہ شرق سے غرب، شمال سے جنوب اور یورپ سے ایشیا تک پھیلا ہوا ہے۔

ہند و سندھ، روم و ایران، ہسپانیہ، ایشیائے کوچک، افریقہ و یورپ ہر جگہ اپنی فتح و ظفر اور بے مثال عسکری قیادت کا جھنڈا لہراتے ہوئے اس منفرد و بے مثل سپہ سالاران عساکر کی عام سطح سے بالاتر اس سپہ سالارِ اعظم کا خطبہ پڑھتے رہے جو شکمِ مادر میں ہی یتیم ہو چکا تھا۔ آغوشِ مادر میں آپ کے ابتدائی سالوں ہی میں ممتا کی شفقتوں کی ٹھنڈی چھاؤں سے بھی ہمیشہ کے لیے محروم ہو گیا۔ شعور کی آنکھیں کھلیں تو سارا ماحول بداخلاقی، بدتری، روحانی ابتری اور شر و فساد کی پستی میں ڈوبا ہوا نظر آیا۔ گرد و پیش نظر ڈالنے پر شرک و بت پرستی، جہالت و بربریت، حیوانیت و بہیمیت کا نقطۂ عروج نظر آیا۔ شباب کی

خاردار وادی میں پہنچا تو نور ونکہت، حسن وعشق، شراب وشباب کی سرمستیوں نے اپنی تمام ترحشر سامانیوں کے ساتھ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر وہ ہر طرح کی آلائشوں سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے عمدہ خصائل، پاکیزہ اطوار، بلند کردار، اخلاقی برتری اور معنوی تقدس کے ساتھ جوانی کی دہلیز کو اس انداز میں پار کر گیا کہ گردوپیش کا سارا ماحول انگشت بدنداں ہوکر رہ گیا۔ نتیجتاً اکڑی ہوئی سرکش گردنیں احترام وعقیدت میں اس کے حضور جھک گئیں۔ ہر ایک اپنے دل کے دروازے کو وا کیے رہا کہ وہ جب چاہے اپنے قدم ناز سے ہمارے دلوں کے فرش کو عزت بخشے۔ ؎

حسن کی جب داستاں پھیلی تو لامحدود تھی
اور جب سمٹی تو تیرا نام ہوکر رہ گئی

حرمت واکرام، عقیدت واحترام، شفقت ومحبت اور ہر دلعزیزی کا یہ وقفہ بہت غیر معمولی تھا۔ دس بیس برس نہیں بلکہ چالیس برس کی عمر تک اہلِ مکہ اپنے سروں پر بٹھائے، پلکوں پر سجائے اور دل کی دھڑکنوں میں جگہ دیئے، اس کی عظمتوں کا خطبہ پڑھتے رہے کہ اچانک اس نے فاران کی چوٹی پر کھڑے ہوکر اپنی قوم کو خطاب فرمایا۔ خدا نے تمہاری فلاح ونجات اور رُشد وہدایت کے لیے مجھے اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے۔ یہ چاند، سورج، ستارے، کہکشاں، پہاڑ، دریا، طوفان اور پتھر کے تراشے ہوئے بت تمہارے خدا نہیں۔ یہ قدرت کے مظاہر ہیں، قدرت نہیں۔ چاند کی چاندنی، سورج کی تابانی، دریا کی روانی، آبشاروں کا ترنم مخلوق ہیں خالق نہیں۔ انسانیت کی طرف سے سب سے بڑی تعظیم وتکریم (سجدۂ عبادت) خالق ہی کے لیے ہوسکتی ہے مخلوق کے لیے نہیں۔ تم میں کوئی بڑا نہیں کوئی چھوٹا نہیں۔ بڑا وہ ہے جسے خدا نے عظمت دی ہے اور جس تقویٰ بڑا ہے۔ حیثیت الٰہی سے جو محروم ہے وہ چھوٹا ہے۔ تم سب آدم ہی کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں۔ انسان افضل واعلیٰ اپنے کردار وعمل اور تقویٰ و پرہیز گاری سے ہے۔ حسب ونسب، مال ودولت کی بدولت نہیں۔

بس اتنی سی بات تھی کہ ہر طرف آگ لگ گئی۔ سارا ماحول سلگنے لگا۔ حالات کی برہمی اس نقطۂ عروج پر پہنچی کہ اسے جان بچانے کے لیے وطن سے بڑی بے سروسامانی کے عالم میں بے وطن ہونا پڑا۔

مسلسل تیرہ برس تک قریش مکہ کی اذیتیں سہنے، دکھ اور صدمے اٹھاتے، توہین وتذلیل برداشت کرنے کا جفا کارانِ قریش نے معاوضہ یہ دیا کہ آپ کے قتل کا بڑی خاموشی کے ساتھ پلان بنا کر اس پر فوری عمل درآمد کا فیصلہ کرلیا۔ اور جب آپ کا قتل یقینی ہوگیا تو سیّدنا محمد عربی ﷺ نے اپنے رب کے حکم سے یثرب کو اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے ایک نیا دفاعی میدانِ عمل منتخب کیا۔ چنانچہ آپ مکہ سے ہجرت کرکے یثرب نامی شہر میں آگئے۔ قدم رنجہ فرمانے کے ساتھ ہی وہ یثرب مدینۃ النبی بن گیا جو آگے چل کر مدینہ سے مشہور ہوا۔ اور اسے یثرب کہنا ممنوع ہوا۔

اپنی مستقل سکونت کے لیے مدینہ کا انتخاب ہی خداداد فوجی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ آپ کو اس کا بخوبی احساس تھا کہ قریش مکہ اللہ کے نام لیواؤں کو بآرام بیٹھنے نہیں دیں گے۔ اسلام کا نظام مساوات واخوت انھیں چین لینے نہیں دے گا۔ اور مسلمانوں کو ہمہ وقت ان کی جارحیت کے نشانے پر رہنا پڑے گا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر مسلمانوں کے تحفظ کا خاطر خواہ

انتظام بہت ضروری تھا۔ آپ کی باریک اور دوربین نگاہوں سے مدینہ کی جغرافیائی حیثیت اور محلِ وقوع اوجھل نہیں تھا۔

مدینہ کا محلِ وقوع اور اس کی دفاعی حیثیت

مدینہ اپنے محلِ وقوع اور جغرافیائی حیثیت کے اعتبار سے اپنے دامن میں بسنے والوں کے لیے قدرتی دفاع مہیا کرتا ہے۔ اس کے آس پاس طویل پہاڑی سلسلہ، جہاں حملہ آوروں کے لیے دشوار گذار ہے وہاں دفاع کرنے والوں کے لیے انتہائی کارآمد ہے۔ کیونکہ پہاڑیوں کی آڑ سے پیش قدمی کرنے والوں پر حملہ کرکے انھیں سخت نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔

مدینہ اُس وقت آج کے مدینہ سے مختلف تھا۔ اس وقت وہاں نہ عالیشان عمارتیں تھیں اور نہ ہی گھنی آبادیاں۔ مختلف مذاہب کے لوگ تھوڑی تھوڑی دور پر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے تھے۔ گویا مدینہ چھوٹی چھوٹی بستیوں کے اس مجموعے کا نام تھا جس میں یہودی، بت پرست اور مسلمان سب آباد تھے۔ جو جوفِ مدینہ کے دس میل لمبے اور دس میل چوڑے میدان میں پھیلے ہوئے تھے اور اس میدان کو چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ شمال میں جبلِ ثور اور جنوب میں جبلِ غیر ہے۔ مدینہ کی آبادی جبلِ ثور سے جبلِ غیر تک پھیلی ہوئی تھی۔ پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس لمبے چوڑے میدان کو حضور سیّدنا محمد عربی ﷺ نے مدینہ تشریف لاکر حرمِ مدینہ قرار دے دیا۔

مدینہ کے حدود متعین کرکے اسے حرم قرار دے دینا سرکار رسالت مآب ﷺ کے دفاعی منصوبے کی ایک کڑی تھی جس کی حیثیت سیاسی بھی تھی اور مذہبی بھی۔ حرم کا یہ اصول کوئی نیا نہیں تھا۔ اسلام سے پہلے اور بعد میں عرب و عجم دونوں جگہ اس کا رواج تھا۔ پہلی جنگِ عظیم میں برطانیہ اور ترکی نے بیت المقدس کو حرم قرار دے دیا، فی زمانہ موجودہ روم کا شہر جو پاپائے روم کے زیر اقتدار ہے حرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں اپنے ہندوستان میں غالباً سکھوں کا گولڈن ٹیمپل (جو آج سکھ سیاست کا مرجع بنا ہوا ہے) جسے سکھ مقدس گوردوارہ کہتے ہیں۔ جو سکھ انتہا پسندوں کا مان و مسکن بنا ہوا ہے، حکومتِ ہند کے خیال میں مقدس گوردوارے کی تقدیس کا سکھ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ حکومت کے ناپسندیدہ عناصر وہاں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ مگر حکومتِ ہند وہاں اپنے سپاہی بھیج کر اس کی تلاشی اور کشت و خون کا جواز نہیں پارہی ہے۔ کیونکہ جو جگہ کسی مذہبی تقدیس سے منسوب ہوجاتی ہے وہاں کسی طرح کی خوں ریزی وایذا رسانی نہیں ہوتی، حتیٰ کہ بڑے سے بڑا مجرم جب تک اس میں رہتا ہے محفوظ و مامون رہتا ہے۔

حرمِ مکہ جس کی تقدیس کا یہ عالم ہے کہ انسان تو انسان جانور بلکہ پیڑ پودے بھی محفوظ رکھنے کا حکم ہے۔ ان کی کاٹ چھانٹ نہیں ہوسکتی۔ باپ کا قاتل بھی اگر اس میں پناہ گزیں ہے تو بھی اس پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ حرمِ مکہ کے تقدیس و احترام کا سیاسی فائدہ قریش اٹھاتے تھے۔ کیونکہ براہِ راست ان کا اس پر کنٹرول تھا۔ سیّدنا محمد عربی ﷺ نے حرمِ مکہ کے متوازی مدینہ کو حرم قرار دے کر اہلِ مدینہ کو وہی حیثیت دے دی جو اہلِ مکہ کو حاصل تھی۔ اہلِ مدینہ، مدینہ میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو اسی طرح سے محفوظ سمجھنے لگے جس طرح اہلِ مکہ اپنے آپ کو سمجھتے تھے۔ واضح لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ

مکہ والے حرم کی تقدیس کا سیاسی فائدہ کماحقہ اسی وقت تک اُٹھا سکتے تھے جب تک کہ وہ حرمِ مدینہ کی تقدیس کا احترام کریں۔آپ نے حرمِ مدینہ کے جو واضح حدود متعین کیے تھے اس کے آثار اب تک ہیں۔ دفاعی حیثیت سے یہ حرمِ مدینہ ایسے دوررس اثرات کا حامل ثابت ہوا جو مسلمانوں کے لیے مدینہ کی حفاظت کے پیشِ نظر افرادی قوت کی قلّت میں معاون ثابت ہوا۔ ادھر قریش کو بھی من مانی دھاندلی کے لیے کافی محتاط بنا دیا۔

حرمِ مدینہ کے چاروں طرف ایک دوسرے سے ملے ہوئے پہاڑیوں کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے جس کی وجہ سے آمد ورفت کے راستے بہت تنگ اور پُر پیچ ہو گئے ہیں۔ اور پھر حرمِ مدینہ کے میدان بھی ہموار نہیں بلکہ اس میں بھی جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جو جنگ کے وقت دفاعی نقطۂ نظر سے بہت اہم ہیں۔ پھر مکہ سے باہر ملکوں یعنی شام، عراق، فارس وغیرہ جانے کے لیے آسان ترین گذرگاہ مدینہ ہو کر ہی تھی۔

اس زمانے میں قافلوں کے گذرنے کے لیے آسان ترین اور مشہور صرف تین راستے تھے۔ ان میں ایک بحرِ متوسط، دوسرا شام اور تیسرا مصر سے آتا تھا۔ اس طرح ایک راستہ شام سے دومۃ الجندل اور پھر وہاں سے عراق کی طرف نکل جاتا تھا۔ دوسرا دومۃ الجندل سے ہوتا ہوا مکہ کی طرف جاتا تھا۔ پھر یہ راستے عراق اور خلیج فارس وغیرہ ہوتے ہوئے بہت آگے نکل جاتے تھے۔ انھیں راستوں سے ایشیا، یورپ اور مصر وغیرہ کے تجارتی قافلے گذرتے تھے۔ ان کے علاوہ ملک کا باقی حصہ جان لیوا، بے آب وگیاہ صحرا تھا۔ پُر پیچ اور گہری وادیاں اس قدر دشوار گذار تھیں کہ ان سے گذرنے کا تصور ہی لرزہ خیز تھا۔ صحرا کے خونی بگولے الگ سے دشمنِ جاں تھے۔ ایسے دشوار گذار راستوں، ہلاکت خیز قیامتوں سے گذرتا ہوا قافلہ جب نخلستانِ مدینہ کی ٹھنڈی چھاؤں میں پہنچتا تو جھلسا دینے والی ہواؤں کے تھپیڑوں کی جگہ ٹھنڈی ہوائیں، ٹھنڈے میٹھے پانی کے ذخیرے، سرسبز وشادات ماحول پا کر وہ جیتے جی جنت بداماں پہنچتا محسوس کرتے۔

مصر سے کشتیوں کے ذریعے مکہ پہنچنے کا راستہ مدینہ ہو کر ہی تھا۔ رومی حکومت نے بھی ۲۴ ق م قبل مسیح ان راستوں پر قبضہ کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ مدینہ کا محلِ وقوع اپنی تمام تر جغرافیائی حیثیتوں کے ساتھ، مدینہ والوں کے لیے قدرتی دفاع مہیا کرنے میں بڑا معاون ثابت ہو رہا تھا۔

نبوت کے تیرہویں سال بیعت عقبۂ ثانیہ کے موقع پر منیٰ کی گھاٹی میں خفیہ طور پر مدینہ کے ۷۲ مسلمان عرب وعجم سے بیک وقت اعلانِ جنگ پر بیعت کرتے ہوئے انتہائی خلوص ومحبت سے عرض کر رہے تھے کہ یارسول اللہ! آپ ہمارے یہاں تشریف لے آئیں، ہم آپ کی حفاظت ونصرت میں اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔

پردے کے پیچھے دیکھنے والی نگاہِ نبوت ان کے شدید اصرار کے پیچھے جذبۂ خلوص وعقیدت کے ساتھ ساتھ مدینہ کی پوری دفاعی اہمیت اور جغرافیائی حیثیت ملاحظہ فرما رہی تھی۔ بہت کچھ سوچ کر اپنے رب کی مرضی سے مدینہ کو اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے صدر مقام منتخب فرمایا تھا۔

چنانچہ آپ مکّہ چھوڑ کر مستقل سکونت کے لیے مدینہ تشریف لے آئے۔ آپ سے پہلے آپ ہی کی اجازت سے مکّی

مسلمان ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے۔

اور جب آپ مدینہ تشریف لے آئے تو مدینہ والوں نے اپنی دینی اور دُنیوی قیادت دونوں آپ کے سپرد کر دی۔ گویا کہ مدینہ والوں نے اپنی دینی، مذہبی، سیاسی، معاشی، اخلاقی غرض کہ ہر طرح کی سربراہی آپ کے ذمۂ کرم پر ڈال دی۔

مدینہ پہنچ کر اور مدینہ والوں کی دینی و دنیاوی سربراہی قبول فرما کر سرکار مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں رہے۔ آپ کو پختہ یقین تھا کہ تین سو ساٹھ خداؤں کے خلاف ایک خدا کی حکمرانی اور اسلام کا نظام مساوات و اخوت خون کے پیاسوں کو خاموش نہیں رہنے دے گا۔ کسی بھی لمحہ وہ مدینہ پر چڑھائی کر سکتے ہیں۔

چنانچہ ہجرت کے بعد قریش مکّہ نے عبداللہ[1] بن ابی (منافق) رئیس انصار کے پاس دھمکیوں بھرا خط بھیجا:

''تم نے ہمارے آدمی یعنی سیدنا محمد عربی ﷺ اپنے یہاں پناہ دے رکھی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ تم ان کو قتل کر دو یا انھیں اپنے یہاں سے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ کر کے تمہارے تمام لڑنے والے مَردوں کو قتل کر کے ان کی عورتوں کو اپنے تصرف میں لائیں گے۔'' (ابوداؤد شریف، جلد۲، ص ۶۷)

سید العرب والعجم ﷺ جب قریش کے ان دھمکیوں بھرے خط کی اطلاع ہوئی تو آپ اس کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ تم اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو قتل کرو گے! (یعنی انصار کو جو مسلمان ہو گئے تھے) ابن ابی اس نکتہ کو سمجھ گیا، اور قریش کے منصوبے پر عمل نہیں کیا۔

ہجرت کے ابتدائی سالوں میں سرکار کو مکہ والوں کی طرف سے انتقامی حملے کا خدشہ اتنا شدید تھا کہ لوگ راتوں کو جاگ جاگ کر پہرہ دیا کرتے تھے۔ ایک رات آرام کرنے کی خواہش ہوئی تو فرمایا کہ آج کوئی قابل آدمی میری جگہ پر پہرہ دے تو میں آرام کرلوں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کھڑے ہوئے، زرہ پہن کر عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ آرام فرمائیں۔ میں آپ کی جگہ پہرہ دیتا رہوں گا۔ اُنھیں ایام میں جب مدینہ والے دن نکلنے پر اپنے کھیتوں پر جاتے تو احتیاطاً اپنے ہتھیار ساتھ رکھتے تھے۔ جب حالات اس قدر سنگین تھے تو آپ مطمئن ہو کر کیسے بیٹھ جاتے۔

مدینہ کی دفاعی تیاریاں:

چنانچہ آپ نے مدینہ کی دفاعی تیاریاں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے آپ نے مدینہ کو تحریری دستور العمل یعنی آئینِ مملکت عطا کیا، جسے میثاقِ مدینہ کہا گیا۔ جس پر تمام قبیلوں نے اتفاق کیا۔ جس کی خاص خاص دفعات یہ تھیں:

۱۔ خون بہا اور ہدیہ کا طریقہ جو پہلے سے چلا آرہا تھا وہی رہے گا۔

۲۔ یہودیوں کو مذہبی آزادی رہے گی۔ ان کے مذہبی رسوم میں کسی طرح کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

---

(۱) عبداللہ بن ابی یہ وہ شخص ہے جس کو مدینہ والے اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، جس کی تیاریاں بھی ہو چکی تھیں، کہ اسی درمیان سرکار دوعالم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آگئے۔ مدینہ والوں نے دینی و دنیوی قیادت آپ کے سپرد کر دی۔ اس طرح وہ بادشاہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس جلن میں وہ زندگی بھر اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی رکھتا رہا۔ بظاہر مسلمان بن کر زندگی بھر اسلام کے خلاف نبرد آزما رہا۔

۳۔ یہودی اور مسلمان دونوں آپس میں باہمی برتاؤ رکھیں گے۔
۴۔ یہودیوں یا مسلمانوں کو اگر کسی دوسرے سے لڑائی پیش آجائے تو ہر فریق ایک دوسرے کی مدد کرے گا۔
۵۔ اگر مدینہ پر کوئی حملہ آور ہوا تو دونوں فریق مل کر حملہ آور کا دفاع کریں گے۔
۶۔ کوئی فریق قریش اور ان کے مددگاروں کو پناہ نہیں دے گا۔
۷۔ کوئی فریق اگر کسی دشمن سے مصالحت کرلے تو دوسرا فریق بھی اس مصالحت میں شامل مانا جائے گا۔ البتہ مذہبی لڑائیاں اس سے مستثنیٰ رہیں گی۔
۸۔ سیدنا محمد عربی ﷺ اجازت کے بغیر کوئی فریق اعلانِ جنگ نہیں کرے گا۔
۹۔ اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ اور رسول کے سامنے پیش ہوگا۔

میثاقِ مدینہ کے ان دفعات سے پتہ چلتا ہے کہ حضور سید عالم ﷺ تشریف آوری کے بعد مدینہ کو ایک آزاد اسلامی مملکت کی شکل دے دی گئی۔ اور اس تحریری دستاویز کے ذریعے باہر کے لوگوں کو یہ بتایا جارہا ہے کہ اب وہ یثرت نہیں رہ گیا جو متفرق طور پر الگ الگ چھوٹی چھوٹی آبادیوں پر مشتمل تھا بلکہ سرکارِ دوعالم حضور خاتم النبیین ﷺ کے قدم ناز کی برکت سے اب وہ مدینۃ النبی کی شکل میں باقاعدہ ایک آزاد اسلامی ریاست ہے، جس کا اپنا ذاتی آئین، قانون، دستور العمل اور اس کی اپنی الگ حیثیت ہے۔

ہجرت کے بعد ایک سال تک حضور رحمت عالم ﷺ مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، روحانی تربیت اور دفاعی تیاریوں میں لگے رہے۔ اس عرصے میں قریش کی دشمنیاں، ریشہ دوانیاں، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نت نئی سازشیں کرتی رہیں اور انھیں مٹادینے کا منصوبہ ہر آن ان کے پیش نظر رہا۔

مسلمانوں کی بے سروسامانی کی حالت میں وطن سے بے وطن کرکے قریش مکہ کو چاہیے تو یہ تھا کہ خاموش ہوجاتے مگر وہ تو خدائے واحد کے تصور اور اپنے فرسودہ نظام کہن کی تبدیلی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ انھیں کسی پہلو قرار نہ تھا۔

مسلسل تیرہ برس تک نبی کریم ﷺ اور ان کے جاں نثار صحابہ پر ظلم وستم، تحقیر و تذلیل کی قیامتیں توڑتے رہے اور مسلمان کوہِ استقامت بنے ان کا ہر ظلم برداشت کرتے رہے۔ حد یہ کہ اپنا مال و متاع، گھر بار، سب چھوڑ کر صرف اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے مدینہ میں پناہ لے لی۔ مگر اس پر ظالموں کا جوشِ انتقام فرو نہیں ہوا۔ بلکہ مسلمانوں کے مدینہ چلنے جانے کے بعد ان کے خلاف قریش مکہ نے کئی محاذ کھول دیئے۔

۱۔ مدینہ کے اندر جو یہودی آباد تھے، انھیں مسلمانوں کے خلاف مسلسل بھڑکاتے رکھنا تاکہ مسلمانوں کا اندرونی امن وسکون غارت رہے۔
۲۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی دیگر منافقین جو اسلام اور مسلمانوں کے بدترین دشمن تھے انھیں مسلمانوں کی شکل وصورت میں کلمہ ونماز کی بیساکھی کے ساتھ مسلمانوں کے شہ رگ پر بٹھا کر ان کے ذریعے نت نئی سازشوں سے

مسلمانوں کو تنگ کیے رہنا۔

۳۔ قبائل عرب خصوصاً وہ قبیلے جن کی سرحدیں مدینہ سے ملی ہوئی تھیں ان کو مدینہ کے خلاف مستعد کر کے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دینا۔

۴۔ جب مسلمان اندرونی طور پر کمزور ہو جائیں تو ایک بار پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کے نام ونشان کو مٹا دینا۔

چنانچہ جنگِ بدر سے پہلے مکّہ والوں کا وہ قافلہ جو ملک شام تجارت کے لیے گیا تھا اسی کی واپسی کا انتظار تھا کہ جیسے وہ قافلہ واپس آئے پوری طاقت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر کے ان کا وجود ختم کر دیا جائے۔

سید العرب والعجم ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ آپ دشمن کے ہر حملے کا دفاع فرماتے۔

منصب نبوت ورسالت کے ساتھ ہی ساتھ ایک بے سروسامان، تہی دست، اسباب و ذرائع سے عاری، مختصر سی غیر تربیت یافتہ فوج کی قیادت اور اس کی سپہ سالاری کا فریضہ بھی آپ ہی کو انجام دینا تھا۔

انھیں سب وجوہ کی بنا پر سرکارِ دوعالم نے حفاظت خود اختیاری اور دفاعِ مدینہ کے پیش نظر سرِ دست دو تدبیروں پر فوری عمل درآمد کا فیصلہ کر لیا۔

اوّل یہ کہ قریش مکہ کی شامی تجارت کا وہ راستہ جس پر ان کی معاشی زندگی کا دارومدار تھا، اسے ان کے لیے غیر محفوظ کر دیا جائے، تاکہ بدلے ہوئے حالات کے تحت وہ مدینہ پر حملہ کا منصوبہ ترک کر کے مسلمانوں سے صلح پر مجبور ہو جائیں۔

دوم یہ کہ مدینہ کے اطراف وجوانب میں جو قبائل آباد ہیں ان سے امن وامان کا معاہدہ ہو جائے تاکہ قریش مکہ حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں اور اگر کریں بھی تو کچھ قبائل کی ہمدردیاں اور عملی تعاون حاصل رہے اور جو قبیلے عملی تعاون نہ دے سکیں وہ کم از کم مکی مدنی ٹکراؤ کی صورت میں غیر جانب دار رہیں۔

چنانچہ محسن انسانیت سیدنا محمد عربی ﷺ نے انھیں دو تدبیروں کے پیش نظر اپنے صحابہ کو چھوٹے چھوٹے دستوں کے ساتھ مدینہ کے اطراف میں بھیجنا شروع کر دیا اور کبھی کسی دستے کے ساتھ خود بھی تشریف لے جاتے۔

صحابہ کے یہ چھوٹے چھوٹے دستے کبھی کسی قبیلے سے معاہدۂ امن کے لیے، کبھی قریش مکہ کی فوجی نقل وحرکت کا پتہ لگانے کے لیے اور کبھی ان کی شامی تجارت کے راستے کو مخدوش وغیر محفوظ کرنے کے لیے جاتے۔ اسی سلسلے میں قریش مکہ اور ان کے حلیفوں کے ساتھ مسلمانوں کا ٹکراؤ ہونا شروع ہوا۔ جس کو اسلامی تاریخ وسیر میں غزوات وسرایا کہا گیا۔

اختلافِ روایات کی بنیاد پر غزوات کی تعداد ۱۹ سے لے کر ۲۹ تک اور سرایا کی تعداد سینتالیس ۴۷ سے لے کر چھپن ۵۶ تک آئی ہے۔ حضرت امام بخاری نے حضرت زید بن ارقم سے ۱۹ غزوے کی تعداد نقل فرمائی ہے، جو کم سے کم تعداد ہے۔ غزوے کی تعداد ۲۹ کی بجائے اُنیس ۱۹ اور سرایا کی تعداد چھپن کی بجائے سینتالیس ۴۷ ہی مان لی جائے تو گویا نو ۹ سال کے اندر اندر سرورِ دوجہاں مونس انس وجاں ﷺ چھیاسٹھ لڑائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُنیس جنگوں میں سپہ سالاری

کا فریضہ بہ نفسِ نفیس انجام دیا۔ یہ سب لڑائیاں ہجرت کے بعد عمر کے اس حصے میں پیش آئیں جب انسانی قویٰ مضمحل، اعصاب کشیدہ، حوصلے پست اور ارادے کمزور ہوجاتے ہیں۔ پہلا غزوہ ودّان ہے جو ۲ھ میں پیش آیا اور آخری تبوک ہے جو ۹ھ میں پیش آیا۔ اُن اُنیس ۱۹ غزوات میں صرف نو ۹ غزوے ایسے ہیں جن میں باقاعدہ جنگ ہوئی۔

صرف دو غزوے اُحد اور خندق کے علاوہ بقیہ ساری جنگوں میں خود حضور ﷺ نے پیش بندی کے طور پر دفاعی حملہ کیا۔ باقی ۹ رجنگوں کے علاوہ غزوے میں سپہ سالار لشکر اسلام ﷺ کے تدبر، فوجی بصیرت، عسکری قیادت اور نئی نئی جنگی تدبیروں نے لشکر کفار کو ایسا حواس باختہ اور پست حوصلہ کر دیا کہ بغیر لڑے بھڑے بھاگ گئے۔ حالانکہ ان تمام جنگوں میں اسلحہ، اسباب، ذرائع اور افرادی قوت کی برتری ہمیشہ کفارِ مکہ ہی کی تھی۔

مسلسل تیرہ برس تک کفارِ مکہ کا ظلم وستم حضور اور ان کے صحابہ نے برداشت کیا۔ یہاں تک کہ گھر در سب دے کر صرف ایمان اور جان بچانے کے لیے وطن سے بے وطن ہونے پر بھی جان بچتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ قریش کی مسلسل شرارتیں، زیادتیاں، چیرہ دستیاں اپنے نقطۂ عروج کی طرف بڑھتی رہیں۔ مسلمانوں کا صبر وضبط اور قوتِ برداشت بھی آخری اسٹیج پر پہنچ رہا تھا۔ مگر ابھی تک انھوں نے اپنی دفاع کے لیے تلوار نہیں اُٹھائی۔ کیوں کہ تلوار اٹھانے کا کوئی واضح حکم ربّ العلمین کی طرف سے مسلمانوں کو اس وقت تک ملا نہیں تھا۔ ان صبر آزما اور نازک حالات میں خدائے ذوالجلال کو اپنے مخلص بندوں پر رحم آیا۔ ربّ العلمین نے پہلی بار مسلمانوں کو اپنے دفاع میں تلوار اُٹھانے کی اجازت دی ۲۲ رصفر المظفر ۲ھ کا دن اسلامی تاریخ کا وہ عظیم اور یادگار دن ہے جس میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرٌ۔

جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیوں کہ وہ (مسلمان) مظلوم ہیں اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔

دوسری جگہ یوں فرماتا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ۔

خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

چنانچہ حضور سید عالم ﷺ ۲ھ میں دوسو ۲۰۰ رآدمیوں کا دستہ لے کر ابوا اور ودّان کی جانب تشریف لے گئے۔ وہ علاقہ قریش کے تجارتی قافلوں کی گذرگاہ تھی۔ اس مہم کا مقصد صرف اتنا تھا کہ اہلِ مکہ کو یہ احساس ہوجائے اور ان کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوجائے کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہیں بدلی تو ان کے قافلوں پر حملہ کر کے ان کی تجارت کی شہ رگ کاٹ دی جائے گی۔

ملکوں اور قوموں کی توانائی ان کے اقتصادی اور معاشی توانائی میں مضمر ہے۔ کسی بھی ملک یا طاقت یا قوم کو کمزور کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کی معاشی طاقت پر کاری ضرب لگا کر انھیں تجارتی بحران میں مبتلا کر دیا جائے۔ فی زمانہ بھی

یہی صورتِ حال ہے کہ جس ملک کو تجارتی فروغ حاصل ہے وہی فوجی اعتبار سے بھی توانا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا سابقہ جن لوگوں سے پڑا تھا وہ مالی اعتبار سے بڑے خوش حال اور تجارت پیشہ تھے۔ ان کے مال بردار قافلے بڑے پابندی کے ساتھ عرب سے باہر غیر ملکوں میں آیا جایا کرتے تھے۔

حضور نے اپنی وسیع تر فوجی تدبیر کے تحت انھیں خائف وہراساں کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ حضور ﷺ اس بات کا بخوبی علم تھا بلکہ عملی تجربہ بھی تھا کہ مکّہ والوں کی زندگی کا سارا دارومدار ان کی باہر سے تجارت ہی پر موقوف ہے۔ اگر ان کے تجارتی نظام کو درہم برہم کردیا جائے تو مسلمان کو تباہ و برباد کرنے سے پہلے انھیں اپنی تجارت کو بچانے کی فکر لاحق ہوگی اور مسلمانوں کے خلاف زیادہ تیزی دکھانے سے پہلے وہ کئی بار سوچنے پر مجبور ہوں گے۔ اسی کے پیش نظر آپ نے چند سفر اختیار فرمائے جن کا شمار غزوات النبی کی فہرست میں آتا ہے۔ ان غزوات میں سرِ فہرست ابوا اور ودّان ہے۔ حضور سرورِ عالم ﷺ نے وہاں جاکر ان لوگوں سے ایک دفاعی معاہدہ کیا جس کی رُو سے انھیں آئندہ قریش اور مسلمانوں کے تصادم کی صورت میں بالکل غیر جانب دار رہنا ہوگا۔ یہ ایک بڑی سیاسی فتح بھی تھی اور ایک اہم دفاعی تدبیر بھی ۲ھ میں آپ نے غزوۂ بواط اور غزوۂ العشیرہ کے لیے پیش رفت فرمائی جس کا مقصد وہی قریش کی گذرگاہوں کو پُرخطر اور مخدوش بنادینا۔ اوران کے تجارتی قافلے کی ناکہ بندی کا احساس دلاکر مسلمانوں کے ساتھ انھیں نرم رویہ اور صلح جوئی پر مجبور کرنا تھا۔

ذوالعشیرہ مکّہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے۔ وہاں بنومدلج اور بنوضمرہ آباد تھے۔ حضور ﷺ نے وہاں ایک ماہ قیام فرماکر ان سے دوستی کا معاہدہ فرمایا۔ گویا جن مقاصد کے پیش نظر یہ سفر اختیار فرمایا تھا وہ پورے ہوگئے۔

قریش کے تجارتی قافلوں کو دہشت زدہ کرنا اس علاقے کے قبائل سے تعلقات استوار کرنا، اس کے علاوہ ان غزوات کے دوران اطراف کے میدانوں اور پہاڑیوں کا جنگی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کا موقع بھی مل گیا۔ جوانوں کی جنگی مشق بھی ہوگئی۔ اور ۲ھ ہی میں وہ عظیم ترین معرکہ بھی پیش آگیا جس کا ذکر فرش سے عرش، شرق سے غرب، جنوب سے شمال تک پھیل گیا۔ جس کی گونج ہر زمانے میں سُنی گئی، جس کی دھمک ایوانِ باطل میں آج بھی محسوس کی جارہی ہے۔ ابدالآباد تک جس کا غلغلہ بلند ہوتا رہے گا۔ یہی وہ جنگ تھی جس نے بابِ فتح نبوی کو ایسا وا کیا کہ پھر کبھی بند نہ ہوا۔ پہلی بار آپ کی عسکری قیادت، فوجی بصیرت، بے پناہ عزم و استقلال اور زبردست قوتِ ارادی کا مظاہرہ ہوا۔ وہ جنگ ایسی نتیجہ خیز اور دوررس اثرات کی حامل ثابت ہوئی کہ عرب کی تاریخ بدل دی۔ بہتے ہوئے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ طاقت کے توازن کا یک طرفہ جھکاؤ ختم کردیا۔ پہلی بار ملک عرب میں ایک نئی اُبھرتی ہوئی طاقت (اسلام) کا احساس سیاسی سطح پر اہلِ عرب کو ہوا۔ یہ معرکہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کا نام ہی کئی سو صفحات پر مشتمل تعارف پر بھاری ہے۔ یعنی غزوۂ بدر کبریٰ (جنگ بدر) جس میں صرف ۳۱۳ مسلمانوں نے سیدنا محمد عربی ﷺ کے زیر قیادت بے سروسامانی کے عالم میں اپنے سے تین گنا زائد، سامانِ حرب سے آراستہ دشمن کو ایسی شکستِ فاش دی کہ آج بھی تاریخ کی آنکھیں حالتِ حیرت میں پھٹی ہوئی ہیں اور اسباب وعلل کا جویا ذہن انگشت بدنداں نظر آتا ہے۔ جس میں ستّر بڑے بڑے سردار اور صنادید مارے گئے اور اتنی

ہی تعداد میں قید کر کے مدینہ لائے گئے۔

آر۔ وی۔ سی باڈلے جو پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کی طرف سے فوجی خدمات انجام دینے کے سبب لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچا، جو ماہر حرب وضرب ہونے کے ساتھ ایک صاحبِ قلم بھی ہے۔ جس کے نوکِ قلم سے ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں نکلیں، اس کی ایک اہم تالیف "The Messenger" اردو ترجمہ ''محمد رسول اللہ'' مترجم سید امین زیدی (مکتبہ عالیہ لاہور) کے چند پیرا گراف ملاحظہ ہوں۔

یہ قریش ہی تو تھے جن کے سبب آج آپ ہر طرح سے قلاّش، بے خانماں اور بے یار و مددگار بن کر رہ گئے تھے۔ یہ بات بالکل عیاں تھی اور یہ بھی روزِ روشن کی طرح واضح تھا کہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ یہ کہ اب قریش کو اپنی حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ انھوں نے صلح جوئی کی ہر تجویز کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس لیے یہ دیکھنا اب خالی از دلچسپی نہ تھا کہ اگر ادھر سے بھی جارحانہ رویہ اختیار کیا جائے تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔

حضرت محمد (ﷺ) کے دفاعی اقدام کے کچھ اور بھی اسباب تھے۔ آپ کو ایک قومی خزانہ (بیت المال) قائم کرنے کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ نہ آپ کے پاس اتنا سرمایہ تھا اور نہ ہی آپ کے کسی خوش حال مہاجر کے پاس۔ کیوں کہ ان لوگوں کی تجارت، ان کے جانوروں کے گلّے، ان کے مکانات، ان کی جائیدادیں سب اہلِ مکّہ نے ضبط کر لیے تھے۔ دوسرے یہ کہ اسلام کو فروغ دینے اور لوگوں کو طمانیت پہنچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ انھیں کچھ رقم بھی دی جائے۔ اور خوراک مہ[illegible] کرنے کے علاوہ انھیں مصروف بھی رکھا جائے۔ اِن مہمّات نے دونوں مسئلے حل کر دیئے۔

حضرت محمد (ﷺ) کے طاقت استعمال کرنے کا ایک سبب خود قریش تھے۔ آپ کے خلاف ابو جہل کی دشمنی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مسلسل حملہ آور جماعتیں بھیج رہا تھا، جو مسلمانوں کی چھوٹی اور بکھری ہوئی جماعتوں پر چُھپ کر حملہ کرتے تھے۔ اس نے چند اچانک حملے مدینہ کے قرب وجوار میں بھی کیے اور کھیتوں اور باغات کو نقصان پہنچایا۔ اس کا مقصد حضرت محمد (ﷺ) پر یہ واضح کر دینا تھا کہ آپ کے متعلق اس کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور اس کے اِرادے اب بھی اتنے ہی خونی اور قاتلانہ تھے۔ دونوں فریقوں کی نظر میں اس کا ایک ہی حل تھا یعنی لڑ کر فیصلہ کر لیا جائے۔

حقیقت میں جنگ حضرت محمد (ﷺ) کے لیے ناگزیر اور مصلحت کا تقاضا تھی، جو بعد میں سودمند بھی ثابت ہوئی۔ لیکن آپ ان عرب حملہ آوروں کی طرح نہ تھے (کہ) جنگ کرنا، خون بہانا جن کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ اور اگر قریش آپ کو اپنے دین کی تبلیغ کے لیے تھوڑا سا بھی موقع دے دیتے تو لڑائی کا خیال آپ کے دل میں نہ آتا۔

اس وقت تک حضرت محمد (ﷺ) نہ کسی سے لڑے تھے، یہاں تک کہ کسی سے ہاتھا پائی بھی نہیں کی تھی اور نہ آپ نے کبھی فوج کی سالاری کی تھی، نہ ہی فنِ لشکر کشی میں تربیت حاصل کی تھی۔ لے دے کر اس ضمن میں آپ کا تجربہ صرف اتنا تھا کہ سولہ ١٦ سال کی عمر میں ایک دفعہ ایک قبائلی جنگ میں آپ اپنے چچا کے تیر لے کر ان کے ساتھ گئے تھے۔ (یہ اشارہ حرب الفجار کی طرف ہے جو چار سال تک جاری تھی اور آپ اپنے چچا حضرت زبیر کے ساتھ کئی مرتبہ شرکت فرمائی۔ اس

جنگ میں آپ اپنے چچا کو تیر اُٹھا اُٹھا کر دیتے تھے) نہ آپ کے پاس مسلح جنگ آزمودہ سپاہی تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ جانتے تھے کہ اپنے آپ اور اپنے دین کو زندہ رکھنا ہے تو آپ کو لازمی طور پر لڑائی کے لیے تیار رہنا ہوگا اور یہ بھی کہ قریش نے مدینہ پر اگر حملہ کیا اور وہ کامیاب ہو گئے تو اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ آپ نے چھاپہ مار دستے بھیجنا شروع کر دیئے جس نے مسلمانوں میں جنگ کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی انھیں ہتھیاروں کے استعمال کا عادی اور مشاق بنا دیا۔ کبھی یہ چھاپہ مار دستے حضرت حمزہ یا ابوعبیدہ کی سرکردگی میں جاتے اور کبھی خود حضرت محمد (ﷺ) سالار ہوتے۔

لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ حضرت محمد (ﷺ) نے فوجی معاملات کا کوئی تجربہ نہ رکھنے کے باوجود ہر چھوٹی بڑی جھڑپ اور لڑائی جن میں حصہ لیا، ایک جنرل ہونے کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ آپ بہادر بھی تھے اور عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اپنے نوجوان سے نوجوان سپاہیوں کے ساتھ ہر صعوبت اور تکلیف برداشت کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے تھے۔'' (The Messenger, Page 260 to 265.- محمد رسول اللہ، کرنل آر وی سی باڈلے، صفحہ ۲۶۰ تا ۲۶۵)

عصر قدیم کے ایک جرنیل سن زو (Sunzu) نے ایک کامیاب ترین سپہ سالار اور بہترین جرنیل کی خصوصیات یہ بیان کی ہیں۔

برتر و کمتر درجے کی فوجوں کو لڑانے کی ہنر سے واقفیت، دشمن کی طاقت کا صحیح اندازہ لگانے کی خوبی، مشکلات، خطرات اور فاصلوں کے صحیح اندازہ لگانے کی بصیرت۔ اپنے فوجیوں، سپاہیوں اور جوانوں سے اپنی اولاد کی طرح محبت، نازک ترین حالات میں شجاعت کے اعلیٰ ترین مظاہرے کی صلاحیت۔

اور عصرِ جدید کے ماہرین دفاع کے نزدیک ایک لائق ترین سپہ سالار کے جوہر ذاتی اور اس کے اوصاف کا خلاصہ یہ ہے:

''انسانیت کا علم اور اس سے خصوصی لگاؤ، فتح کا عزم محکم، شجاعت، تدبر، تحمل، دانش مندی، حوصلہ مندی، خود اعتمادی اور دوسروں میں اعتماد پیدا کرنے کی صلاحیت، ایسی شخصیت جو جوانوں کے لیے منبع فیض ہو، بلند خیال، فراخ دل، ذہنی و جسمانی چستی و توانائی، انتظامی مہارت، اپنے اور دشمن کی فوجوں کی صلاحیت اور حالات کا وسیع علم، جوانوں کی فوجی تربیت دینے کی صلاحیت اور جذبۂ عفو و کرم۔'' (رسول اللہ کا حرب و ضرب۔ از میجر جنرل فضل مقیم)

عصرِ قدیم و جدید کے ماہرین حرب کے ان آرا کو سامنے رکھ کر سید العرب والعجم حضور روحی فداہ سیدنا محمد عربی ﷺ کی سیرتِ طیبہ خصوصاً آپ کے حرب و ضرب اور دفاعی یلغار کو سامنے رکھ کر تجزیہ کیجیے کہ ایک جنگی ماہر اور سپہ سالار کی حیثیت سے آپ اس معیار پر پورے اُترتے ہیں یا یہ کہ یہ معیار ہی آپ کی ذات جامع الصفات سے فروتر دکھائی دیتا ہے ؎

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن جلوۂ یار کا جواب کہاں

یوں تو حضور سیدنا محمد عربی ﷺ کا ہر غزوہ، ہر لڑائی، ہر جنگ آپ کی فوجی بصیرت، جنگی مہارت اور زبردست عسکری قیادت کی انفرادیت اور بے مثالی کی آئینہ دار ہے۔ فاتح بدر و حنین نے ہر محاذ پر اپنی خداداد عسکری قیادت کی عبقریت کا

خراج اہلِ عرب سے لیا، جن کے ذکر سے تاریخ کے صفحات فروزاں ہیں۔

جی تو یہ چاہتا تھا کہ دو چار جنگوں کے قدرے تفصیلی حالات پیش کر کے اس کے اہم گوشوں پر جنگی نقطۂ نظر سے گفتگو کی جائے۔ مگر میری بے پناہ مصروفیات کے ساتھ استقامت کے زیر عنوان صفحات کی قلت آرزوئے شوق کی تکمیل میں دیوار بنی ہوئی ہے۔ اس لیے اب ہم صرف ایک جنگ پر اکتفا کرتے ہوئے قدرے تفصیل سے اس پر گفتگو کر کے اپنی بات ختم کریں گے۔

ہجرت کے بعد باقاعدہ تصادم کے ابتدائی دور میں لڑی جانے والی یہ جنگ اسلامی تاریخ میں ایک عظیم اور یادگار اہمیت کی حامل ہے جس کی عظمت کی یادگاروں پر زمانے کا کوئی انقلاب اثر انداز نہ ہو سکا۔

۳ نبوی میں لڑی جانے والی یہ جنگ کہ جس میں حضور سید عالم ﷺ ایک اعلیٰ ترین جرنیل کی حیثیت سے انسانی تاریخ کے اُفق پر نمایاں نظر آ رہے ہیں۔ اور آپ کی عسکری قیادت کا نقطۂ عروج تاریخ حرب وضرب کی انگشت بدنداں کیے ہوئے ہے۔ یہ جنگ تاریخ میں "جنگ اُحد" کے نام سے "بدر" ہی کی طرح بہت مشہور ہے۔ ہجرت کے تیسرے سال یعنی جنگ بدر سے ایک سال بعد اہلِ مکہ بظاہر بدر کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے پوری تیاریوں کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں بالخصوص پیغمبر امن وامان ﷺ نیست و نابود کرنے کے لیے مدینہ پر چڑھائی کے لیے چل پڑے۔ اگر چہ مکّہ میں کچھ اہلِ محبت سرکارِ دو عالم ﷺ کے اشارے پر کفّارِ مکّہ کی ہر آن منصوبہ بندیوں کی آگہی کے لیے رہ گئے تھے مگر خلافِ معمول اس بار غیر معمولی تاخیر ہوئی۔

یوں تو اصحابِ سیر و مغازی نے ہر غزوہ کا الگ الگ کوئی نہ کوئی سبب لکھا ہے۔ مگر دراصل تقریباً ہر غزوے کا ایک بنیادی سبب تھا۔ نبی و دینِ نبی ﷺ اُن کے صحابہ کو روئے زمین سے نیست و نابود کر دینا۔ مشرکینِ عرب اور کفارِ قریش کو حضور سرورِ عالم ﷺ سے ہر حال اور ہر آن جنگ لڑنی تھی۔ ہر لڑائی کے لیے الگ معمولی سبب۔ یہ تو گرتے کو ٹھیلنے کا بہانہ تھا۔

سرکارِ دو جہاں ﷺ مسجد قبا میں تشریف فرما تھے کہ مکّہ سے بذریعہ خط یہ خبر وحشت اثر ملی کہ کفّارِ مکہ تین ہزار کی جمعیت کے ساتھ مدینہ پہنچنے ہی والے ہیں۔ یہ اطلاع سرکار نے اپنے ہی حد تک محدود رکھی تا کہ شہر میں خوف وہراس نہ پھیل جائے۔ عبداللہ بن ابی منافق ہی صرف اس خط کے مضمون سے آگاہ تھا مگر سرکار نے اسے سختی کے ساتھ تاکید کر دی تھی کہ یہ خبر اپنے ہی تک محدود رکھنا۔ دوسرے دن آپ نے مسلمانوں کو مشورہ طلب کرنے کی غرض سے اکٹھا کیا کہ دشمن کا مقابلہ اور مدینہ کا دفاع کس طرح کیا جائے؟ حضور خود شہر بند ہو کر لڑنا چاہتے تھے۔ عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگوں کا بھی یہی مشورہ تھا۔ خود ابن ابی منافق کی بھی یہی رائے تھی کہ دشمن کی تعداد اور اچانک حملے کے پیش نظر شہر کے اندر رہ کر دفاع کیا جائے۔ مگر نوجوان طبقہ خصوصاً وہ لوگ جو جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، جنھیں جوش زیادہ ہوش کم تھا، ان کے اصرار پر اہل الرائے کی اکثریت نے فیصلہ نوجوانوں کے حق میں دے دیا۔ البتہ منافقین کا سردار ابن ابی آخر وقت تک سرکار دو عالم ﷺ ہم

خیال رہا کہ شہر بند ہو کر ہی دفاع کیا جائے۔ لیکن وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ کے مطابق اکثریت کے فیصلے کا لحاظ کرتے ہوئے آپ حجرے کے اندر تشریف لے گئے اور جنگی لباس زیب تن فرمایا۔ سینے اور پشت پر چار آئینہ لگایا۔ بائیں طرف چمڑے کی پیٹی میں تلوار لٹکائی۔ ہاتھ میں کمان، سر پہ لمبی نوک کا خود اور اس کے گرد سیاہ عمامہ باندھا۔ شانے سے لٹکتی ہوئی ڈھال نے اسلحے کی تکمیل کر دی۔ پورے جنگی لباس میں جب آپ باہر تشریف لائے تو صحابہ کو احساس ہوا کہ شاید ہمارا شہر سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ خاطر اقدس کو ناگوار ہوا۔ عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، جو مرضی مبارک ہو اسی پر عمل کیا جائے۔ ہم ہر حال میں راضی برضا ہیں۔

سید العرب والعجم، مالکِ رقاب اُمم حضور پُرنور روحی فداہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"پیغمبر کے لیے یہ زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اُتار دے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے اور اس کے دشمنوں کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اگر تم لوگوں نے میدانِ جنگ میں صبر سے کام لیا تو ضرور تمہاری ہی فتح ہوگی۔"

حضور سید عالم ﷺ جب مدینہ سے باہر نکلے تو آپ کے ساتھ ایک ہزار کا لشکر تھا۔ جس میں یہودی، منافقین اور مشرکینِ عرب کی بھی ایک مختصر تعداد تھی۔ سرکار نے مسلمانوں کے علاوہ اور کسی کو اس جنگ میں شرکت کی اجازت نہ دی۔ یہودی اور مشرکین عرب کے ساتھ عبداللہ بن ابی منافق بھی اپنے ساتھیوں کو لے کر یہ کہتا ہوا نکل گیا، چونکہ شہر بند ہو کر لڑنے کی میری بات نہیں مانی گئی لہذا میں بے فائدہ اپنے آدمیوں کو نہیں کٹوانا چاہتا۔

اب مسلمانوں کی تعداد صرف سات سو ۷۰۰ رہ گئی۔ جبکہ قریش مکّہ کی جمعیت تین ہزار ۳۰۰۰ تھی، جس میں سات سو صرف زرہ پوش تھے۔ جن کے پاس دو سو ۲۰۰ گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے۔ مزید برآں تقریباً ڈیڑھ درجن پر مشتمل مکہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی حمیت انگیز اور غیرت خیز حسین خواتین رجزیہ اشعار پڑھ پڑھ کر نوجوانوں کو آمادۂ قتال رکھنے کے لیے سرگرم تھیں۔

نحن بنات طارق	نحشی علی النمارق
ہم آسمانوں کے تاروں کی بیٹیاں ہیں	ہم قالینوں پر چلنے والیاں ہیں
ان تقبلوا نعائق	ان تدبروا نطارق

اگر تم بڑھ کر لڑو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گے اور اگر پیچھے قدم ہٹایا تو ہم تم سے الگ ہو جائیں گے۔

سید عالم ﷺ نے اپنی فوجوں کے ساتھ پہلے سیدھے مشرق کا رُخ کیا۔ پھر تھوڑا سا بائیں مڑ کر کوہِ احد کے جنوب مشرق کونے کی چھوٹی سی گھاٹی سے داخل ہو کر اُحد کے میدان میں بار برداری کا اونٹ چھوڑتے ہوئے احد کے جنوب کی گھاٹی سے نکل کر مغربی کونے پر صف آرا ہوئے، جہاں سے مکّی لشکر سامنے نظر آ رہا تھا۔ آپ کی صفوں کا داہنا کنارہ اُحد سے ملا ہوا تھا اور بایاں کنارہ وادی قناۃ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس طرح صف آرائی میں آپ کی فوجوں کا رُخ مغرب اور جنوب مغرب کی جانب تھا اور مدینہ قدرے بائیں طرف اور احد آپ کے داہنے ہاتھ پر تھا۔ اُحد کا وہ میدان جس میں اب عمارتیں بن گئی ہیں، عقب میں تھا۔ بائیں اور پیچھے جبل عینین (جسے اب جبل رماۃ کہا جاتا ہے) تھا۔ اس دوگنبدی پہاڑی پر آپ

نے پچاس مشاق اور نشانہ باز تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا تا کہ اگر وادی قناۃ کے راستے سے ہوتا ہوا دشمن کا کوئی دستہ حملہ آور ہو تو اسے تیروں کی بوچھاروں سے روکا جا سکے۔ آپ نے دونوں پہلوؤں کو اس حسنِ تدبیر سے محفوظ کر لیا کہ دشمن کا مضبوط ترین ساز و سامان سے آراستہ لشکر بے بس ہو کر رہ گیا۔ اُحد کی عمودی چٹان آپ کے پشت کی طرف سے دفاع کا بہترین فریضہ انجام دے رہی تھی۔ اپنے سے تین گنا زائد دشمن کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے احد کے میدان کا یہ انتخاب آپ کی بے پناہ عسکری قابلیت کی آئینہ دار ہے۔

جبل رماۃ پر اپنے تیر اندازوں کو مقرر فرماتے وقت بار بار ہدایت دیتے رہنا کہ دیکھو چاہے ہم جنگ ہاریں یا جیتیں، خبردار! خبردار! تم اپنی جگہ سے ہرگز ہرگز نہ ہٹنا۔ فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے آپ کی تیز اور باریک نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ پہاڑی جس پر تیر انداز مقرر کیے جا رہے ہیں، یہی ایک راستہ ہے جو قطعاً محفوظ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے کہ ہر وقت لشکر اسلام دشمن کی زد پر رہے گا۔ آپ نے خالد بن ولید کے تیزی کے ساتھ حرکت کرنے والے دستے کا خطرہ محسوس کر لیا تھا۔ اسی لیے آپ ان تیر اندازوں کو بار بار تاکید فرماتے تھے۔ بعض روایتوں میں یہاں تک آیا ہے کہ تم ہمارے جسموں کو دیکھو کہ گدھ نوچ رہے ہیں، پھر بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا۔

دشمن کی کثرتِ تعداد اور اپنی قلت و بے سر و سامانی کے باوجود دفاعی تدبیروں اور خدائے ذوالجلال کی تائید و نصرت اور لشکریوں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو دیکھتے ہوئے امر یقینی تھا کہ اگر ہدایات پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مسلمانوں کی فتح ہو کر رہے گی۔

چنانچہ ہوا بھی یہی۔ جس وقت آپ مسلمانوں کو صف آرا کر رہے تھے، قریشی لشکر بھی نیچے میدان میں پہنچ چکا تھا۔ دونوں طرف کی فوجوں نے آمنے سامنے مورچے جما لیے اور عربی طرز کی لڑائی کا پہلا مرحلہ شروع ہوا۔ قریشی لشکر کا موروثی پرچم بردار طلحہ سب سے آگے بڑھا اور مبارزت کے لیے مسلمانوں کو للکارا۔ لشکر اسلام سے حضرت زبیر یا حیدر کرّار علی شیر خدا نکلے۔ حالانکہ طلحہ اور علی کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ فیل پیکر طلحہ کے مدمقابل ایک نوخیز نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ حیرت تو دوست اور دشمن دونوں کو تھی۔ مگر جب شاہِ مرداں، شیر یز داں، قوتِ پروردگار کی تلوار لہرائی۔ ایک بجلی کوندی، آنکھیں جھپکیں اور جب حیرت کا طلسم ٹوٹا تو دشمن کے علم بردار کا سر اس کے شانوں سے اُچھل کر دور تک لڑھکتا ہوا دیکھا گیا۔ حضور رسالت مآب ﷺ نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ مسلمانوں نے اس کا جواب دیا تو اُحد کی پہاڑیوں کی گونج سے باطل نے اپنے سینے میں اس کی دھمک محسوس کی۔ طلحہ کے بعد اس کا بھائی ابو طلحہ آیا، وہ پلک جھپکتے جہنم رسید ہوا، یہاں تک آٹھ شہسوارانِ قریش و صنادید عرب جوشِ انتقام میں بھرپور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے آگے بڑھتے رہے۔ اسلام کی تلوار لہراتی رہی، بجلی چمکتی رہی۔ سروں کے فیصلے ہوتے رہے۔ ہر بار احد مسلمانوں کے نعروں سے گونجتا رہا۔ لشکر قریش کا سردار ابوسفیان اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور عام حملے کا حکم دے دیا۔ ادھر مسلمان مجاہدین بھی اپنی صفوں میں بے چین تھے۔ ان کے بہادروں کے ابتدائی کارناموں نے ایک اور بدر کا نقشہ جما دیا تھا۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ مسلمانوں کے جوش و خروش، عزم و

حوصلہ اور بڑھتے ہوئے فاتحانہ جذبوں کی یلغار نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اہلِ مکّہ کے قدم اُکھڑ گئے۔فوجیں تتر بتر ہونے لگیں۔مسلمانوں کی جاں بازی اور مجاہدانہ خروش کے آگے افرادی قوت،تعداد کی کثرت اور اسلحہ کی برتری کچھ کام نہ آئی۔خالد بن ولید کا طوفانی دستہ بھی ناکام رہا۔وہ جب بھی پشت سے حملے کے لیے آگے بڑھتا، ماہرانہ انداز میں متعین شدہ تیر انداز انھیں چھید کر رکھ دیتے۔حضرت حمزہ،حضرت علی،حضرت عمر،حضرت زبیر جیسے بہادرانِ اسلام اپنی ہلاکت خیز تلوار کے ساتھ ہر جگہ موجود رہتے۔

تعداد کی قلت اور بے سروسامانی کے باوجود رسول اللہ ﷺ عسکری قیادت کا جلوہ پورے عروج پر تھا۔کفّار حوصلہ ہار بیٹھے۔شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور دیکھتے دیکھتے ان کے قدم میدانِ جنگ سے اُکھڑ گئے۔ان میں بھگدڑ ایسی مچی کہ اپنے پڑاؤ سے بھی پیچھے ہٹ گئے۔

کفّارِ قریش کی اس کھلی ہوئی بدترین شکست پر مسلمان ان کا تعاقب کر کے انھیں گرفتار یا قتل کرنے کے بجائے مالِ غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔جبل رماۃ پر متعین شدہ تیر اندازوں نے دیکھا کہ لڑائی ختم ہوگئی ہے اور ہمارے مسلمان بھائی مالِ غنیمت حاصل کرنے میں لگے ہوئے ہیں،تو وہ بھی اپنے اپنے آپ کو روک نہ سکے۔حالانکہ ان کے افسر عبداللہ بن جبیر نے بہت روکا۔حضور کا بار بار تاکیدی فرمان یاد دلایا۔مگر نیچے منظر ہی ایسا تھا کہ ایک عام عرب (وہ بھی ہجرت کے ابتدائی دور کا مختصر سا فیض صحبت اُٹھایا ہوا) اسے دیکھ کر رُک ہی نہیں سکا۔دستے کے کمانداد حضرت عبداللہ بن جبیر اور ان کے صرف چند ساتھیوں کو چھوڑ کر باقی سب لوگ پیچھے دیکھے بغیر نہایت بے ترتیبی کے ساتھ نیچے میدان کی طرف دوڑے اور دم لیے بغیر مالِ غنیمت کے لوٹنے میں بھڑ گئے۔

خالد بن ولید جس نے اگرچہ فوجی تربیت حاصل نہیں کی تھی مگر اس شخص کے اندر فوجی قیادت کی ایک فطری صلاحیت تھی۔وہ فطرتاً جنگ جو اور دلیر شہسوار تھے۔نیزے اور تلوار کو اسی مہارت سے چلا سکتے تھے جس مہارت سے وہ اپنی فوج کو لڑا سکتے تھے۔دورانِ جنگ ان کی نظر ہر وقت تیر اندازوں پہ رہی۔وہ جب بھی ان کی طرف سے تساہل دیکھتے،فوراً اپنے دستے کے ساتھ ان کی طرف چڑھ دوڑتے۔یہ الگ بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ تیر انداز تیروں کی بارش کر کے ان کی ہر کوشش ناکام کر دیتے۔

میدانِ احد میں سیدنا محمد عربی ﷺ نے جس انداز میں اپنی صفوں کو ترتیب دیا تھا،اس سے بہتر ترتیب ممکن ہی نہیں تھی۔اس اندازِ صف آرائی پر دشمن بھی خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور تھا۔اور وہ ہر انسان جس کو حرب و ضرب میں ذرا بھی شدھ بدھ ہے غزوۂ احد کی پیش بندی پر عش عش کرتے ہوئے اس بے سروسامان فوج کے سپہ سالار کو خراجِ عقیدت پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔جبل رماۃ پر تیر اندازوں کا متعین فرمانا،آپ کی خداداد فطری عسکری قیادت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

بالفرض جبل رماۃ پر اگر تیر انداز دستہ نہ ہوتا تو کیا خالد بن ولید کا طوفانی رسالہ جنگ کا فیصلہ اتنی جلدی اور وہ بھی مسلمانوں کے حق میں کر دیتا؟

چنانچہ خالد بن ولید نے جب دیکھا کہ تیر اندازوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی ہے اور اب اس کے بازو اور عقب کا راستہ کھل گیا ہے تو وہ اپنے طوفانی دستے کو لے کر فوراً پلٹے۔ اور مسلمانوں کی غیر منظم صفوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ اس قدر اچانک، اتنا شدید، حیران کن، طوفانی اور جان لیوا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے لڑائی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ مسلمان فتح کی خوشی میں مگن ہو کر مالِ غنیمت اور اسلحہ کے حصول میں اس قدر منہمک تھے کہ گرد و پیش سے بے خبر ہو گئے تھے، جنھیں خالد کے نیزہ بازوں نے اپنے نیزوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔

مکہ کی شکست خوردہ فوج نے جب دیکھا کہ خالد نے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا ہے تو وہ بھی واپس ہوگئی۔ اب مسلمانوں پر دوطرفہ حملہ ہو گیا۔ گویا مسلمان دو چکی کے پاٹ میں پھنس گئے۔ بار بار تاکیدی فرمان کے باوجود تیر اندازوں کی اس بھیانک غلطی نے جیتی ہوئی جنگ کا رُخ بدل دیا۔ اچانک طوفانی حملے نے مسلمانوں کو حواس باختہ کر دیا۔ ذہنی طور پر غیر حاضر ہو کر لڑ رہے تھے، اس لیے وہ قتل کرنے کے بجائے شہید زیادہ ہو رہے تھے۔

اسلامی لشکر کے سپہ سالار سیدنا محمد عربی ﷺ نے جب دیکھا کہ مسلمانوں پر حملہ دوطرفہ ہو گیا تو آپ نے اپنے لشکر کی دوبارہ تنظیم شروع کر دی۔ گھمسان کے رن میں وہ بھی نازک ترین حالات میں گھری اور پٹتی ہوئی فوج کو دشمن کے نرغے سے نکال کر انھیں الگ سے دوسرے محاذ پر قائم کرنا، یہ معمولی کارنامہ نہیں۔ جب کہ لوگ بے ترتیب ہو کر اِدھر اُدھر بکھرے تھے اور کچھ دشمن کے تعاقب میں دور تک نکل گئے تھے۔

آپ نے بلند آواز سے پکار کر دوبارہ فوج کو اپنے گرد جمع ہونے کا حکم دیا۔ ارشاد فرمایا:

''یہاں ہوں میں اللہ کا رسول۔ یہاں آؤ۔ میرے پاس لوٹ آؤ۔ اے فلاں! اے فلاں! آؤ میری طرف۔ میں یہاں ہوں اللہ کا رسول۔

حضور سرورِ عالم ﷺ کا محافظ دستہ جو سات انصار اور سات مہاجر کل چودہ آدمیوں پر مشتمل تھا، آپ کے ساتھ ہی موجود تھا۔ دشمن کا زور بھی آپ ہی کی طرف زیادہ تھا۔ وہ تو آپ کو مارنے کے لیے سو ۱۰۰ بار مرنے کو تیار تھے۔ وہ تو چاہتے یہی تھے کہ شمع نبوت جلد گل ہو۔ مگر آپ کے جاں نثاروں، شمع نبوت کے پروانوں نے بھی آپ کے گرد اپنے جسموں کا بڑا مضبوط حصار قائم کر دیا۔ انسانی تاریخ میں ایسے جاں نثاروں کی مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ ایسا تو بہت ہوا ہے کہ اپنے سردار، اپنے سپہ سالار، اپنے بادشاہ کو بچانے کے لیے بہتوں نے جان دی ہے۔ ان دیکھے حملے اور اندھیرے کے تیر نے ان کی جان کو ممدوح کے قدموں میں ڈال دی۔ مگر کیا ایسا بھی ہوا ہے کہ ماتھے کی آنکھیں سنسناتے تیر، چمکتے نیزے، لہراتی تلواریں اور فضا میں کوندتی بجلیاں دیکھ رہی ہیں اور محبوب تک پہنچنے سے پہلے ہی اپنی چھاتیوں، سینوں، پشتوں کو ان کے درمیان حائل کر دیا ہو؟ ؎

سرفروشی کی تمنّا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

چشمِ فلک نے بھی اتنا حیرت زار اور اثر آفریں منظر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوگا۔ تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ بڑے بڑے بہادرانِ اسلام اور نامور صحابہ اس جنگ میں شہید ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کے نامور شفیق اور مہربان چچا حضرت حمزہ، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت زیاد بن مسکن وغیرہ، ستّر ۷۰ نفوسِ قدسیہ نے اسلام کی ڈوبتی اُبھرتی نیم جاں رگوں میں اپنا گرم اُبلتا ہوا تازہ لہو ڈال کر اسلام کو حیاتِ نو کی تازگی بخشی۔

جب اللہ کے مقدس رسول اور مدنی لشکر کے سپہ سالار نے بلند آواز سے پکارا کہ میں یہاں ہوں تو آپ کی آواز سُن کر کچھ لوگ آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہوگئے۔ آپ ان کو دوبارہ منظم کر کے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے اور دشمن کے پے در پے حملے روکتے رہے۔ دشمن کا دباؤ آپ کی ذات پر اتنا شدید تھا کہ آپ زخمی ہوگئے۔ دندانِ مبارک شہید ہوگئے اور چہرۂ اقدس پر خود کی کڑیاں پیوست ہوگئیں۔ اپنی اور سارے مسلمانوں کی تمام تر خستہ حالی کے باوجود اپنی کامیاب دفاع کرتے ہوئے کوہِ احد کے جنوبی حصے کی بلندی پر پہنچ گئے، جس سے دشمن ناکام ہو کر رہ گیا۔ بائیں جانب سے قریش کے ایک دستے نے برابر کی بلندی سے حملے کی کوشش کی مگر حضور نے حضرت عمر کو چند مہاجر دے کر دشمن کو بھگا دیا۔

اسی درمیان یہ افواہ اُڑ گئی کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہوگئے اور یہ غلط خبر مدینہ تک پہنچ گئی۔ وہاں سے حضرت فاطمۃ الزہرا، عائشہ صدیقہ اور بہت ساری خواتین میدانِ جنگ میں پہنچیں، جن میں انصارِ مدینہ کی ایک ایسی خاتون بھی تھیں جن کے باپ، بھائی، شوہر تینوں شہید ہوگئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی پوچھنا شروع کیا کہ رسول اللہ کا کیا حال ہے؟ ان سے کہا گیا: تمہارا باپ شہید ہوگیا۔ بولیں کوئی بات نہیں، مگر یہ تو بتاؤ کہ میرے رسول کا کیا حال ہے؟ انھیں بتایا گیا کہ تمہارا شوہر بھی شہید ہوگیا۔ کہنے لگیں مجھے اس کی بھی فکر نہیں۔ صرف یہ بتاؤ کہ میرے آقا و مولیٰ اللہ کے مقدس اور آخری رسول کیسے ہیں؟ انھیں پھر بتایا گیا کہ تمہارا بھائی بھی شہید ہوگیا۔ فرمانے لگیں: خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ بس ہمیں اللہ کے رسول کی خیریت سب سے پہلے چاہیے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ حضور سید عالم ﷺ کے حفظ و امان میں ہیں، تو انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور فرمایا کہ جب سرکار موجود ہیں تو پھر اِس خوشی کے آگے سارے جہان کا غم کچھ بھی نہیں۔

حضرت فاطمۃ الزہرا نے آتے ہی سرکار کا زخم دھونا شروع کر دیا۔ عائشہ پاک نے فوجیوں کو پانی پلایا۔ حضور کے زخموں کی جراحی اور مرہم پٹی جوں ہی ختم ہوئی آپ نے ایک نیا خود سر پر رکھا اور نیچے کی طرف دیکھنے لگے کہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ابوسفیان اور اس کے ساتھی مسلمان شہدا کی لاشوں کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ غالباً وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ قتل ہونے والوں میں خاص خاص چہرہ کون سا ہے؟ لیکن حضرت حمزہ اور مصعب بن عمیر کے علاوہ مزید کسی خاص الخاص صحابی کی نعش دستیاب نہ ہوسکی۔

کچھ دیر تک تک ابوسفیان ڈھلتی دھوپ میں احد کے چمکتی اطراف پر نظر دوڑاتا رہا۔ ایک چٹانی شگاف کے پاس چند لوگوں کو دیکھ کر ہانک لگائی۔

کیا تم میں محمد ہیں؟ (ﷺ) جواب میں سرکار نے خاموش رہنے کا اشارہ فرمایا۔

پھر چلّایا: کیا تم میں ابوبکر ہیں؟ سرکار کی مرضی کے مطابق مسلمان پھر خاموش رہے۔
پھر لالپا۔ کیا تم میں عمر ہیں؟ صحابہ خاموش رہے۔ اور جب ادھر سے کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے کہا چلو اچھا ہوا کہ یہ سب کے سب مر گئے۔ (معاذ اللہ ربّ العلمین)
عمر فاروق اعظم اس طعنے کو برداشت نہ کر سکے۔ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور بلند آواز میں جواب دیا۔ او دشمنِ خدا! ہم میں سے ہر ایک زندہ ہے اور تم سے لڑنے کے لیے ہر دم تیار۔ مگر ابوسفیان نے جوابی حملہ کے بجائے یہ جواب دیا کہ آج ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا ہے۔ یہ ہبل کی کرامت ہے۔ ہبل ہمارا ہے، تمہارا نہیں۔
حضرت عمر نے جواب دیا: اللہ ہمارا ہے، تمہارا نہیں۔
ابوسفیان نے نعرہ لگایا: اُعْلُ هُبَلُ، اُعْلُ هُبَلُ۔ اے ہبل تو سر بلند ہو جا، اے ہبل تو سر بلند ہو جا۔
حضور کے اشارے پر مسلمانوں نے نعرہ لگایا: اَللّٰہُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ۔ اللہ بلند تر اور بزرگ تر ہے۔
ابوسفیان نے کہا: اَنَا الْعُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ۔ ہمارے لیے عزیٰ (بت ہے) اور تمہارے لیے کوئی عزیٰ نہیں ہے۔
حضور کے سکھانے پر صحابہ نے جواب دیا: اَللّٰہُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ۔ اللہ ہمارا مددگار ہے اور تمہارا کوئی مددگار نہیں۔
اس مکالمہ کے بعد ابوسفیان نے اپنے لشکر کو جمع کیا اور مکّہ کی طرف کوچ کر گیا۔ جوں ہی قریش لشکر کا آخری سپاہی نظروں سے اوجھل ہوا، حضور سید عالم ﷺ بڑی احتیاط کے ساتھ اپنے حفاظتی دستہ کو لے کر پہاڑ سے نیچے اُترے کہ کہیں دشمن کی کوئی جنگی چال نہ ہو۔ مگر شہدا کو دیکھنے اور ان کی تکفین وتدفین کی فکر بھی دامن گیر تھی۔
آپ اپنے محبوب چچا حضرت حمزہ کی اعضا بریدہ نعش اور مصعب جیسے وفا پیشہ بہادر سردار اور دیگر جاں نثاروں کی لاشوں کو دیکھ کر آب دیدہ ہو گئے۔
آپ نے حکم دیا کہ جو جہاں ہے اسے وہیں دفن کر دیا جائے، تاکہ یہ رہتی دنیا تک زبانِ حال سے اپنی وفاداری اور اسلام کی صداقت کی شہادت دیتے رہیں۔
میدانِ احد میں ستّر سے زیادہ قبریں اسلام کی صداقت اور مصطفیٰ جانِ رحمت کی ذات والا صفات سے شدید وابستگی، حبّ رسول اور اپنے جذبۂ عشق و وفاداری کی شہادت دے رہی ہیں۔ ؎
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
لاکھوں کروڑوں سلام اور خدا کی بے پناہ رحمتیں ہوں، اے غازیانِ احد تم پر کہ تمہارے خون کی سرخی سے آج بھی اسلام کی بہاروں کا سہاگ قائم ہے۔ خدائے غافر وقدیر تمہاری تربتوں پر صبح وشام انوار کی بارش فرمائے۔
شہدا کی تجہیز وتکفین کے بعد اپنی بچی کھچی مختصر سی فوج لے کر آپ مدینہ واپس آ گئے۔ آپ کو خدشہ تھا کہ کہیں ابوسفیان مدینہ پر حملہ نہ کر دے۔ اگر ایسا ہوا تو اسے خدا کی ذات کے سوا کوئی روک نہیں سکتا۔ آپ اپنے گھر تشریف لائے، جہاں ازواجِ مطہرات بڑی بے چینی سے آپ کا انتظار فرما رہی تھیں۔ انھوں نے کپڑے بدلوائے۔ کھانا پیش کیا۔ آپ کھانا

تناول فرما کر آرام فرما ہوئے۔ آپ کافی تھکے ہوئے تھے اور بڑی تکلیف بھی محسوس کر رہے تھے۔ لیکن آپ بد دل اور مایوس ہرگز نہیں تھے۔ مناسب وقت تک آرام فرمانے کے بعد آپ نے تازہ دَم ہو کر دوبارہ ہتھیار لگا لیے اور حضرت بلال کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع ہونے کے لیے اذان دیں۔ مسجد میں سب لوگوں کو جمع ہو جانے کے بعد آپ نے نماز پڑھی اور اعلان کیا کہ ہم فوری طور پر قریش کے تعاقب کے لیے نکل رہے ہیں۔ ابھی حیرانی کا وقفہ طویل بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ لب کشا ہوئے۔ ''اس تعاقب میں صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو کل جنگ میں شریک تھے۔''

یہ فرمان جاری فرما کر آپ اپنے تھکے ماندے زخمی سپاہیوں کو لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ سپہ سالار عسا کر سیدنا محمد عربی ﷺ کے خیالات بہت صحیح تھے۔ کیوں کہ ابوسفیان مدینہ سے آٹھ دس میل دور رواحہ کے مقام پر ٹھہر کر مدینہ پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا تھا۔

اگر آپ کے تعاقب اور مسلمانوں کے جوش و جذبہ، غم و غصہ اور قہر و جلال کی خبر سے ہیبت زدہ اور مرعوب نہ ہو جاتا تو اس کا بے خبری میں پلٹ کر حملہ یقینی تھا۔

کرنل آر وی سی باڈلے (انگریز مؤرخ) کا اس جنگ پر ایک پیراگراف ملاحظہ ہو۔ اپنی تصنیف The Messenger میں رقم طراز ہے:

> ''جنگ کے دوسرے دن رات کا اندھیرا ہوتے ہی اسلامی لشکر نے قریش کی فوج کو جا لیا۔ (ابن جریر طبری کے مطابق آپ حمزہ الاسد جو مدینہ سے آٹھ میل دور ہے) تک تعاقب فرمایا اور تین روز تک وہاں قیام فرمایا۔ کیوں کہ ابوسفیان تھوڑی ہی دور رواحہ کے مقام پر ٹھہر کر دوبارہ مدینہ پر حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن جب اسے معبد الخزاعی سے (جو دراصل حضور ہی کے فرستادہ تھے، اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر سرکار کے حلیف اور دلی طور پر آپ کی بہتری کے خواہاں تھے) مسلمانوں کے تعاقب کی خبر ملی، تو ان کے عزم و حوصلہ سے مرعوب اور خوف زدہ ہو کر بھاگ گیا)۔ آپ نے قریش کے لشکر سے کچھ فاصلے پر ٹھہرنے کا حکم دیا۔ اور رات کو پڑاؤ کیا۔ جب تاریکی پھیل گئی تو آپ کے حکم سے دشمن کے کیمپ کے متوازی اونچی ٹکڑیوں پر سیکڑوں جگہ پڑاؤ کی آگ روشن کی گئی۔ (طبقاتِ ابن سعد کے مطابق پانچ سو جگہ پر آگ روشن کی گئی) نتیجہ بالکل آپ کے منشا کے مطابق نکلا۔ (ابوسفیان سپہ سالار عسا کر قریش) نے یہ سمجھا کہ محمد (ﷺ) نے مدینہ سے مزید فوج اکٹھا کی ہے۔ چنانچہ وہ ڈیرا ڈنڈا سنبھال کے جنوب کی سمت تیزی سے روانہ ہو گیا اور جب تک مکہ پہنچ کر فصیل کے اندر داخل نہ ہو گیا اپنے آپ کو محفوظ نہ سمجھا۔ جب آپ مطمئن ہو گئے کہ آپ کی چال پوری طرح کامیاب ہو گئی تو آپ پلٹے اور تیزی سے مدینہ واپس آ گئے اور لوگوں کو باور کرلیا کہ اہلِ قریش اب بھی اتنے ہی بزدل ہیں جتنے کے بدر میں تھے۔ غالباً

یہ کارنامہ حضرت محمد کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ آپ نے یہ قدم اُٹھا کر یہ ظاہر کر دیا کہ آپ کو انسانی نفسیات سمجھنے اور اس کے مطابق لوگوں سے کام لینے کا کتنا زبردست ملکہ حاصل تھا۔ حضرت محمد (ﷺ) کو احد میں بڑی ہزیمت اُٹھانی پڑی تھی۔ گو اس میں ان کی اپنی کوئی غلطی نہیں تھی اور یہ آپ کے احکام کی نافرمانی کا نتیجہ تھا (یعنی جبل رماۃ پر تیر اندازوں کا بغیر اجازت ھا اپنی جگہ چھوڑ دینا) لیکن بہر صورت آپ ہار گئے تھے۔ اور لوگوں کی نظروں میں بحیثیت پیغمبر آپ کا وقار کچھ گر گیا تھا اور اگر آپ شکست تسلیم کر لیتے تو مزید گرنے کا احتمال تھا۔ چنانچہ آپ نے شکست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس سے پہلے کہ عورتیں سپاہیوں کے گرد جمع ہو کر بے سرو پا باتیں بنائیں، آپ نے ان کو صف آرائی کا حکم دے دیا۔ حالانکہ آپ زخمی تھے، جسم میں اکڑاؤ تھا۔ بہت تھکے ہوئے تھے اور آپ کی عمر بھی چھپن سال کی ہو چکی تھی۔ لیکن آپ فوراً گھوڑے پر سوار ہو گئے اور اس طرح روانہ ہوئے گویا کہ آپ کسی ہارے ہوئے اور پست دشمن کے تعاقب میں جا رہے ہیں۔ یہ ایک بے مثال جنگی تدبر اور شاندار نفسیاتی اقدام تھا۔ جو ایک تباہ شدہ فوج کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے کسی بڑے سے بڑے جرنل کے ذہن میں شاید ہی کبھی آیا ہو۔

چنانچہ جب آپ مدینہ لوٹے تو نہ آپ نے آرام کیا اور نہ ہی کسی شکست خوردگی کا مظاہرہ کیا بلکہ اس کے برخلاف آپ نے ایک تحکمانہ اور تہدید آمیز رویہ اختیار کیا۔ شکرانے کی نماز پڑھاتے ہی آپ منبر پر تشریف لے گئے اور تقریر کی۔ آپ نے لوگوں کو بتایا کہ احد میں جو کچھ ہوا اِس کا سبب یہ ہے کہ ابھی آپ نے اللہ کے رسول کی اطاعت کرنا نہیں سیکھا۔ اگر آپ یہ سمجھ لیتے کہ میرے احکام اللہ تعالیٰ کے احکام تھے اور اگر آپ ان کی پوری تعمیل کرتے تو یقینی طور پر فتح آپ ہی کی ہوتی بالکل اسی طرح جیسے بدر میں۔''

(محمد رسول اللہ، ص ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ کرنل آر وی سی باڈلے، اردو ترجمہ)

خط کشیدہ الفاظ سے کسی طرح کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ ایک غیر مسلم عیسائی مصنف کے احساسات ہیں، جس سے صرف اسی طبقے کے لوگ متاثر ہوں تو ہوں لیکن عام انسان خصوصاً مسلمان نہیں۔ جنگ احد میں سیدنا محمد عربی ﷺ کی کسی طرح کی ہزیمت نہیں ہوئی۔ اس لیے شکست تسلیم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے جنگ نہیں ہاری بلکہ ایک مورچے پہ پسپا ہوئے۔ وہ بھی عارضی وقتی طور پر۔ مجموعی طور پر میدان آپ ہی کے ہاتھ رہا۔ وہ اس طرح پر کہ اوّل اوّل جب اسلام اور کفر متصادم ہوئے تو مسلمانوں نے اپنی تمام تر بے سروسامانی اور افرادی قلت کے باوجود اپنے سے تین گنا زائد سامانِ جنگ سے آراستہ دشمن کو بدترین شکست کی ذلتوں سے ہم کنار کیا۔ کیوں کہ نصرتِ ربّانی کے تحت اس کی کمان ایک ایسے جنرل کے ہاتھ میں تھی جس سے بڑا جنرل روئے زمین پر پیدا ہی نہیں ہوا۔ ''فنِ حرب وضرب'' میں ان کی

مہارتِ تامہ کسی انسان کا رہین منت نہیں تھی بلکہ براہِ راست پروردگارِ عالم کی طرف سے ان کی فطرت میں ودیعت فرمائی گئی تھی۔ اسی لیے جب تک وہ اپنے جرنیل کی ہدایت پر سختی سے عمل پیرا رہے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور دیکھتے دیکھتے اپنے دشمن کو زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا۔ اور جوں ہی ایک تاکیدی ہدایت سے غفلت برتی تو قدرت کی طرف سے اس کی زبردست اور کڑی سزا پوری قوم کو ملی۔

لیکن جب تیر اندازوں کی غفلت اس پر خالد کی تیزی نے جنگ کا پانسہ پلٹا اور قتل وخون کا ایک ہنگامہ محشر برپا ہوا۔ مسلمان زیادہ تعداد میں شہید ہونے لگے تو مسلمانوں کے سپہ سالار نے حالات سے بددل اور خوف زدہ ہو کر میدان نہیں چھوڑا بلکہ ایسے نازک ترین حالات میں انتہائی ذہانت اور فطری دلیری کے ساتھ دفاعی جنگ لڑتے ہوئے اپنی بچی کھچی فوج کو لے کر پہاڑ کی ایک بلند چوٹی کو اپنا مستقر بنایا۔ اور وہیں سے دفاع فرماتے رہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ لڑائی بند ہو جانے کے بعد سردارِ قریش ابوسفیان کے طعنے کا جواب فاروقِ اعظم دے رہے ہیں۔ آپس میں مکالمہ بازی بھی ہو رہی ہے مگر ابو سفیان عزم اور حوصلہ سے بھرپور فوجیوں کے ساتھ مسلمانوں کی مختصر سی فوج پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں پا رہا ہے۔ مکالمہ بازی ہی تک کیوں محدود رہا، آگے بڑھ کر ایک ہی ہلّے میں اسلام کے وجود کو مٹا کیوں نہیں دیا؟

قریش کے دشمنِ جاں اور ایمان جانے کے بعد سردارِ قریش ابوسفیان کے غصّے کا جواب فاروقِ اعظم دے رہے ہیں۔ آپس میں مکالمہ بازی بھی ہو رہی ہے مگر ابوسفیان عزم وحوصلہ سے بھرپور فوجیوں کے ساتھ مسلمانوں کی مختصر سی فوج پر حملہ کرنے کی ہمت نہیں پا رہا ہے۔ مکالمہ بازی ہی تک کیوں محدود رہا۔ آگے بڑھ کر ایک ہی ہلّے میں اسلام کے وجود کو مٹا کیوں نہیں دیا؟

قریش کے دشمن جان وایمان ان کے باطل خداؤں کا کس بل نکالنے والے ان کے اسلاف کے نظامِ کہن کو پاؤں سے روندنے والے، اسلام کے نظامِ مساوات واخوت کا جھنڈا بلند کرنے والے خدائے واحد کی عظمتوں کا پرچم لہرانے والے عرب کی صدیوں پرانی روایات کے باغی ان کے فرسودہ معاشرے کے مجرم۔ ان کی رات کا چین دن کا سکون حرام کرنے والے۔ بڑے بڑے صحابہ یہ ابوبکر، یہ عمر، یہ عثمان، یہ علی، یہ سعد سبھی تو موجود ہیں اور سب پر مستزاد تو خود مصطفےٰ جانِ رحمت کی ذاتِ والاصفات کہ جن کے قتل کے لیے ایک قریشی کا فرسٹّر سٹّر بار قتل ہونے اور مرنے کے لیے ہمہ وقت تیار۔ ایسے شدید دشمن پر ابوسفیان اپنی افرادی کثرت کی قوت اور اسلحہ کی برتری کے باوجود رحم کھا گیا؟ نہیں ہرگز نہیں حاشا وکلّا۔ پھر ایک بھی مسلمان کا قیدیا گرفتار نہ ہونا۔ شکست اسی کا نام ہے؟ پھر حضور سیدِ عالم ﷺ اپنی فوج کے ساتھ اپنے محاذ پر اس وقت تک جمے رہ جانا جب تک کہ دشمن کا ایک بھی فرد میدان سے نہ چلا گیا ہو۔ کیا شکست اسی کو کہتے ہیں؟ پھر حملہ آور فوج کا ایک بھی مقصد حاصل نہ کر سکنا۔ مثلاً مدینہ کو لوٹنا۔ مسلمانوں کو قتل کر کے ان کی عورتوں بچوں پر قبضہ کر کے انھیں باندی غلام بنانا وغیرہ وغیرہ۔ ان مقاصد میں سے کسی میں وہ کامیاب ہوئے؟ ہرگز نہیں۔ ہاں اتنا ہوا کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا جانی نقصان زیادہ ہوا۔ خصوصاً انصارِ مدینہ کا جو غیر تربیت یافتہ تھے۔ اس سے شکست کہاں لازم آئی۔ جنگ میں کبھی کسی

فریق کا جانی مالی نقصان کم ہوتا ہے اور کبھی زیادہ۔ ہاں شکست کی ذلّت اس کا مقدر ہوتی ہے جو مقصد حاصل کیے بغیر میدان پہلے چھوڑ دے۔ اس نقطۂ نظر سے اس جنگ میں بھی شکست قریش مکہ ہی کو ہوئی تھی۔ قریش مکہ نے مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ جیتا تھا، جنگ نہیں جیتی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس نے ایک مورچے پر کامیابی حاصل کی اسے فاتح مانا جائے او جو اوّل و آخر دونوں محاذ پر فاتح اور ثابت قدم رہا اسے شکست خوردہ اور ہزیمت زدہ قرار دیا جائے۔ ع

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

واضح دوٹوک لہجے میں روایت و درایت تاریخ وحقائق کا فیصلہ یہ ہے کہ احد کی جنگ قریش مکہ نے نہیں بلکہ مسلمانوں نے جیتی۔ اوّل اوّل حیران کن فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ یعنی جنگ کا پہلا دور مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ تیراندازوں کی واضح غفلت نے جنگ کا نقشہ بدلا۔ نتیجے میں دوسرا دور قریش کے ہاتھ رہا۔ اور اس دور میں مسلمانوں کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ تیسرا اور آخری دور (یعنی پہاڑی کی چوٹی کو اپنا مستقر اور دوسرا محاذ بنا کر مسلمانوں کا آخری دم تک ڈٹے رہنا) مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ اور دشمن کے میدان چھوڑ دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ اپنی فوج کے ساتھ مدینہ واپس آ کر آٹھ میل تک قریش کا ایک کامیاب تعاقب فرما کر انھیں حیران و ہیبت زدہ کر کے بھاگم بھاگ مکہ پہنچنے پر مجبور کر دینا کیا شکست اور درماندگی کی دلیل ہے؟ ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اس طویل گفتگو سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ کی صفت جامعیت کا یہ پہلو بھی انتہائی روشن اور نمایاں ہے۔ ؎

حسنِ یوسف دمِ عیسیٰ ید بیضاء داری
آنچہ ہمہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

فتوحات کے اعتبار سے بھی آپ ایک کامیاب ترین جرنل اور بے مثال سپہ سالار تھے۔ فاتحوں، سپہ سالاروں اور جرنیلوں کی طویل فہرست میں آپ سرِ فہرست نظر آتے ہیں اور ان کے بے پناہ ہجوم میں ایک عجیب انفرادیت لیے اتنے قدآور نظر آ رہے ہیں کہ دور سے دیکھنے والا پہچان لے کہ وہ ہے دنیا کا سب سے بڑا فاتح۔ ؎

کیا حسن ہے، جمال ہے، کیا رنگ و روپ ہے
وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

بے سروسامانی کے عالم میں اپنی جان بچا کر وطن سے بے وطن ہونے والا۔ ملک کی سب سے بڑی طاقت یعنی قریش مکہ کے مقابلے میں مٹھی بھر (۳۱۳) اسباب و ذرائع سے عاری مگر عزم و حوصلہ سے بھرپور جوانوں کو لے کر اٹھا تو ایسا اٹھا کہ دس سال کے اندر اندر پورے ملک پر اس کا فاتحانہ قبضہ ہوگیا۔ اس کے سامنے ہر اٹھا ہوا سر جھک گیا۔ ہر تنی ہوئی گردن ڈھیلی ہوگئی۔ ہر اکڑی ہوئی طاقت سرنگوں ہوگئی۔ جان کے دشمن، قاتل، خون کے پیاسے ایسے بے دام کے بندے ہوئے

کہ آگے پیچھے دائیں بائیں سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ہمہ وقت اس پر قربان ہونے کے لیے تیار۔

تیرے بے دام کے بندے ہیں رئیسانِ عجم
تیرے بے دام کے بندے ہیں ہزارانِ عرب

حد یہ کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت سلطنت روما کی سرحدوں پر یلغار کر کے وہاں مچادینا۔ اور عرب سے باہر کی دنیا کو عملی طور پر یہ بتادینا کہ ہم اپنی سرحدوں کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ کیا یہ عسکری تاریخ میں معمولی کارنامہ کہا جائے گا؟ پھر فاتح بدر و حنین کا اپنے سے کئی گنا زیادہ دشمنوں کو جنگ کے ہر نئے محاذ پر ایک نئی تکنیک اور نئی صورتِ حال سے دو چار کرتے رہنا یہ ایک ایسی صفت اختراعی تھی کہ آپ کے دشمن جسے سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ مثلاً بدر میں صفوں کی ترتیب اور اپنے پسند کی زمین پر دشمن کو لڑنے پر مجبور کر دینا۔ احد میں جنگ لڑنے کے لیے جگہ اور اس کے محلِ وقوع کا انتخاب۔ غزوۂ احزاب میں غیر متوقع طور پر خندق کھود کر اس میں محصور ہو جانا۔ انھیں عرب کی عادت کے خلاف ایک عجیب و نادر صورتِ حال سے دو چار کر کے حیرت زدہ کر دینا۔ رسد کے ذخیرے کو قریش کے فوجیوں تک نہ پہنچنے دینا۔ پھر اَلْحَرْبُ خُدْعَةٌ کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کے حلیفوں میں انتشار ڈال کر غنیم کو طویل محاصرہ اٹھا کر بھاگ جانے پر مجبور کر دینا۔ نامعلوم راستے سے مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر ایک بے حد دور رس معاہدے پر دشمن کو صلح کے لیے مجبور کر دینا۔ حنین میں لشکر اسلام کی غیر منظم ابتدائی پسپائی کے وقت تنہا دس بارہ افراد کے ساتھ خوفناک دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہو کر انہیں للکارنا۔ پھر اسی للکار سے جاں نثاروں کی غیرت کو بیدار کر کے مکمل فتح حاصل کرنا فتح مکہ کے وقت انتہائی خاموشی اور بے پناہ رازداری کے ساتھ اچانک پورے جاہ و جلال اور عسکری توانائی کے ساتھ ان کے سروں پر نمودار ہو کر ان کے ہاتھ پاؤں کو پھلا دینا اور پھر بغیر لڑے بھڑے دنیا کے اس باعظمت مقدس اور روئے زمین کے سب سے قدیم پہلے اور متبرک شہر پر نہایت آسانی کے ساتھ قبضہ کر لینا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے عرب کا مالک و مختار ہو کر قاتلوں، ظالموں، خون کے پیاسے دشمنوں حد یہ کہ بے حد عزیز چچا کے کلیجے کو چبانے والی تک کو معاف کر دینا۔ یہ عسکری تاریخ میں ایسی روشن تابناک اور محیر العقول روایات ہیں کہ انسانی وجود کے نمود سے لے کر آج تک جس کی مثال ممکن ہی نہیں۔

تیرے تو وصف عیب تناہی سے ہیں بری
حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے
کہہ لے گی سب کچھ ان کے ثنا خواں کی خامشی
چپ ہو رہا ہوں کہہ کے میں کیا کیا کہوں تجھے
لیکن رضا نے ختم سخن اس پہ کردیا
خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

☑☑☑☑☑☑

جشنِ میلادالنبی ﷺ تاریخی حیثیت

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اس دل فروز ساعت پہ لاکھوں سلام

محسنِ انسانیت، معلمِ کائنات، روحِ کائنات حضور سیّدنا محمد عربی ﷺ تاریخ ولادت جمہور کے نزدیک مستند، معتبر اور مشہور ۱۲؍ربیع الاوّل بروز دوشنبہ بوقت صبح صادق ہے۔ اہلِ مکہ کا اسی پر عمل درآمد رہا کہ وہ لوگ ۱۲؍ربیع الاوّل ہی کو کاشانۂ اقدس کی زیارت کے لیے جاتے اور وہاں میلاد شریف کی محفلیں منعقد کرتے تھے۔ (مدارج النبوۃ جلد دوم صفحہ ۲۳ مطبوعہ ادبی دنیا دہلی مصنفہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی)

ولادتِ باسعادت سن عیسوی کے اعتبار سے ۲۰؍اپریل ۵۷۱ء، سن بکری کے اعتبار سے یکم جیٹھ ۶۲۸ اور سن فارسی کے اعتبار سے ماہ نیساں کی ۲۰؍تاریخ تھی۔ آفتاب اس دن برج حمل میں ۳۱ دقیقے پر تھا۔ اس دن صبح صادق کا طلوع افق مکہ پر دھوپ گھڑی کے اعتبار سے ۴ بج کر ۲۰ منٹ پر تھا۔ ''غفر'' منازل قمر میں تین چھوٹے چھوٹے ستارے! ان کے طلوع کے وقت ولادتِ پاک ہوئی اور یہی تمام انبیاء کے ولادت کا وقت بھی ہے۔ (اشرف السیر ص:۱۴۹ از شارح بخاری علامہ مفتی شریف الحق امجدی)

نوسو (۹۰۰) برس قبل پوری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد تھے اور ہیں۔ حضورِ پاک صاحبِ لولاک ﷺ جشنِ ولادت پاک اور محافل میلاد کا انعقاد بہت بڑے پیمانے پر کرتے آئے ہیں، پورے اطراف واکنافِ عالم میں یہ جشن میلاد النبی ﷺ تو اور دھوم اور پورے تزک واحتشام میں منایا جا رہا ہے، گویا کہ یہ تاریخ پوری دنیا میں مظاہرۂ شوکت اسلام سے عبارت ہو کر رہ گئی۔ ؎

تا کہ تاریخ ولادت کو نہ بھولیں نسلیں
بزمِ میلاد نبی یوں ہی سجائے رکھیے

اب سے نوسو (۹۰۰) برس پہلے عراق کے شہر موصل میں ایک صالح بزرگ حضرت عمر بن محمد علیہ الرحمہ گزرے ہیں۔ اوّل اوّل انھوں نے ہی محفلِ میلاد کا انعقاد کیا اور اس بزمِ محبت کو سجایا اور اس تاریخِ ولادت کو اپنے حرزِ جاں بنائے ہوئے پوری زندگی بڑے عقیدت واحترام سے محفلِ میلاد منعقد کرتے رہے۔ آپ کے اس پاکیزہ عمل کی خوشبو دور دور تک پھیل گئی، جس کی اتباع کرتے ہوئے اربل کے بادشاہ اسلام ابوسعید محمد مظفر الدین کوکری حکومتی سطح پر بہت بڑے پیمانے پر جشن میلاد النبی کا اہتمام کرنے لگے اور ہر سال اسے خوب سے خوب تر بناتے اور کافی وسعت دیتے رہے۔ اسی دوران

حضرت امام حافظ ابوالخطاب بن دحیہ علیہ الرحمہ نے فضائل میلاد شریف پر ایک اہم کتاب 'التنویر فی مولدِ السراج المنیر' لکھ کر ۶۰۴ھ میں بادشاہِ اسلام کو پیش کیا۔ بادشاہِ اسلام کے منعقد کردہ محفل مولود شریف جس میں بادشاہ اسلام بہ نفس نفیس خود شرکت کرتا، اسی کتاب سے میلاد شریف پڑھا گیا۔ بادشاہ میلاد شریف سن کر بہت خوش ہوا اور کتاب کے مصنف کو ایک ہزار اشرفی بطور انعام دیا۔

بادشاہِ اسلام جو خود بڑا عادل، متقی، پرہیز گار کے ساتھ بڑا شجاع، بہادر نامور اور اپنے زمانے کا بڑا امر دِ مجاہد تھا، ہر سال اس تاریخ ولادت کا بڑا اہتمام کرتا۔ عظیم الشان پیمانے پر محفل میلاد منعقد کرتا، لاکھوں روپے خرچ کرتا۔ غریبوں، محتاجوں، فقیروں کو اعلیٰ ترین کھانے کھلاتا، کپڑا دیتا اور ان کی حاجت روائی کرتا۔ عوام وخواص سبھوں کے لیے اپنا دستر خوان وسیع تر کرتا اور اپنی پوری حکومت میں جگہ جگہ دعوتِ عام کرتا اور اس تاریخ کو اپنے بذل وسخا کے دریا بہا دیتا۔

۱۲ ربیع الاوّل کے اس تزک واحتشام اور مقدس تاریخ کی دھوم دھام کی شہرت بہت جلد پورے عالمِ اسلام میں پھیل گئی اور دنیا یہ سمجھ بیٹھی کہ اس کارِ خیر وامرِ عظیم کا آغاز اس خوش نصیب عادل وعاشق رسول بادشاہ نے کیا۔ حالانکہ اس کی ابتدا نو سو برس پہلے اس مردِ درویش اور عاشق صادق نے کیا جس کا نام نامی اسمِ گرامی عمر بن محمد تھا۔

چونکہ یہ کارِ خیر حضورِ پاک، صاحبِ لولاک سیّدنا محمد عربی ﷺ سے زبردست اخلاص ومحبت وبے پناہ حسنِ عقیدت و شدید جذباتی وابستگی پر مبنی تھی نیز اس سے شوکت اسلام اور حضورِ پاک کی عظمت وجلالت ہویدا تھی اور حضور سیّد عالم کی ذاتِ پاک سے محبت کا اظہار تھا اس لیے اس فعل احسن کی پوری دنیا میں ہمہ جہت وہمہ گیر پذیرائی ہوئی۔ تفصیل وتحقیق کے لیے دیکھیے کتابِ مستطاب ''اثابت احسان برائے محفل میلاد ذی شان'' از حضرت علامہ ابوالحسن فاروقی مجددی ازہری دہلوی۔ پھر تو اس موضوع پر بڑے بڑے ائمہ احادیث، حفاظِ احادیث، علماء کرام، فقہاء عظام نے بڑی بڑی کتابیں تصنیف فرمائی۔ جیسے علامہ حافظ ابن کثیر، حضرت امام سخاوی، حضرت امام حافظ ابن جزری، حضرت امام حافظ ابن دحیہ وغیرہ وغیرہ۔ مزید تفصیل وتحقیق کے لیے ملاحظہ فرمائیں حضرت ابوالحسن زید فاروقی مجددی ازہری کی کتاب ''احسان برائے محفل میلاد ذیشان''۔

☑☑☑☑☑☑

جلوسِ میلاد النبی ﷺ تاریخی حیثیت

حضور آقائے کائنات، فخر موجودات سیّدنا محمد عربی ﷺ جب اہلِ مکہ نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو آپ نے اپنے رب کے حکم سے حضرت سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی معیت میں مکہ چھوڑ کر بڑے سخت وصبر آزما مراحل سے گذرتے ہوئے اوّل اوّل قبا تشریف لائے ، کچھ دنوں تک قبا میں ٹھہر کر ایک عالیشان مسجد، مسجد قبا کے نام سے تعمیر کر دیا، یہی مسجد اسلام کی سب سے پہلی مسجد قرار پائی جس کی بڑی فضیلت ہے۔ قرآنِ عظیم میں خصوصیت کے ساتھ جس کا ذکر آیا۔

وہاں سے مدینہ منورہ کچھ ہی فاصلے پر تھا جو حضور کی تشریف آوری سے پہلے یثرب کہلاتا تھا۔ وہاں سے جب آپ مدینہ کی طرف چلے تو وہ ربیع الاوّل کی ۱۲؍ تاریخ اور دوشنبہ کا دن تھا۔ آپ کا داخلہ مدینہ منورہ میں ایک زبردست اور بڑے جلوس کی شکل میں ہوا۔ حضرت بریدہ اسلمی جو اسی دن اپنے ستّر ساتھیوں کے ساتھ اسلام لائے تھے، وہ ایک جھنڈے کے ساتھ اپنے ستّر ساتھیوں کے ساتھ آگے آگے، ان کے پیچھے حضور ﷺ کے ننہال قبیلہ بنونجار کے لوگ بڑی تعداد میں دررویہ حضور کے آگے آگے، حضرت سیّدنا ابوبکر صدیق ومولائے کائنات شیر خدا علی مرتضیٰ دائیں بائیں اور اہلِ قبا کی ایک بڑی تعداد پیچھے پیچھے دیوانگی شوق کے عالم میں نعرے لگاتے، خوشیاں مناتے یہاں تک کہ پردہ نشین خواتین بھی فرطِ مسرت کے عالم اپنے اپنے گھروں سے نکل کر چھتوں پر آگئیں یارسول اللہ و یا محمداہ کا نعرہ لگاتے ہوئے۔ اور یہ جلوس نکالنے والے، جلوس کی شکل میں چلنے والے، بہجت ومسرت کے شادیانے بجانے والے کون لوگ تھے؟ یہ جلیل القدر صحابۂ کرام تھے۔ یہ السّابقون الاوّلون صحابہ کبار تھے جو حضورِ پاک کے اردگرد پروانہ وار قربان ہو رہے تھے۔ مدینہ منورہ میں حضور کے نزولِ اجلال سے شکر الٰہی بجا لا رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی دف بجا بجا کر **طلع البدر علینا من ثنیات الوداع** کا ترانہ گا رہی تھیں۔

تفصیل وتحقیق کے لیے دیکھیے مسلم شریف جلد چہارم، باب حدیث الہجرۃ ص:۲۳۱۱ ، البدایہ والنہایہ اردو ترجمہ، جلد اوّل، ص:۱۰۷ ، مدارج النبوت، جلد دوم، ص:۱۰۵، ادبی دنیا دہلی، سیرت المصطفیٰ ،ص:۱۳۷ ،علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی۔

عیسائی سیرت نگار کرنل آر سی ، باڈلے کی کتاب ''دی مسینجر'' اردو ترجمہ محمد رسول اللہ مترجم سیّد امین زیدی مکتبہ عالیہ لاہور، ص:۲۳۳ ، ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے۔ کرنل آر۔سی۔ باڈلے کے مطابق:

یہ ایک بڑا پُرشکوہ منظر تھا، تقریباً بالکل ناقابلِ یقین! کہ ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ کو مکہ کی گلیوں سے چھپ کر دبے پاؤں گذرنا پڑا تھا اور ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں اگلے موڑ پر کوئی خنجر لے کر کھڑا نہ ہو۔ اور کسی کے متعلق یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ کون دوست ہے اور کون دشمن؟ اور آج آپ عرب کے ایک سب سے اچھے شہر میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں اور جب یہ جلوس مدینہ کے دروازے پر پہنچا تو جوش وخروش سے نعرے بلند ہونے لگے۔ ان تمام شہادتوں اور ناقابلِ تردید حقائق سے یہ ثابت ہوا کہ یہ جلوس عید میلاد تو عہدِ رسالت کی یادگار ہے فالحمد للہ رب العلمین۔ ؎

نثار تیری چہل پہل پر ہزاروں عیدیں ربیع الاوّل
سوائے ابلیس کے جہاں میں سبھی تو خوشیاں منا رہے ہیں

داستانِ حرم

مدینہ : کائناتِ عشق کی راجدھانی

انسانیت جاں بلب تھی اور اس کا پیرہن خون اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کائنات پر تاریکیوں مسلّط تھیں۔ اور وحشت و بربریت کے خونی بگولوں نے اسے ہر طرف سے جکڑ رکھا تھا۔ گیتی کا فرش تیرہ و تار، ظلمت کدوں میں بدل کر رہ گیا تھا اور مجروح انسانیت زخموں سے چور تھی، تاریک رات کے مسافر کسی روشنی کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ کائنات بھر کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو کسی راہنما کی تلاش تھی۔ شام میں یہودی وعیسائی پیشوایانِ مذاہب کی نگاہیں اپنے گردوپیش سے مایوس ہو کر فلسطین کی وادیوں میں اس نجات دہندہ کی تلاش میں تھیں جس کی آمد کی بشارت ان کے آسمانی صحیفوں میں دی جا چکی تھی۔ ظلم وستم، جبرواستبداد کی چکّی میں پسنے والی مظلوم سسکتی کراہتی انسانیت عدل وانصاف رحم وکرم کے لیے مضطرب تھی۔ درد کی ماری دکھیاری عرب کے باہر کی آبادی کے بہت سے لوگ رحمتِ ایزدی سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے۔ امن وآشتی، صلح ومحبت کے جویاؤں کی پتھرائی ہوئی نگاہیں کسی صبحِ سعادت کے انتظار میں تھیں۔ مگر جاہل، ضدی، مغرور، خونخوار، جفا پیشہ عرب کا ضمیر ہر طرح کی روشنی سے محروم تھا، اپنے مقدر کے ظلمتوں کے لیے کسی روشنی کی ضرورت ہی نہیں محسوس کر رہے تھے وہ اپنے بدترین ماضی پر مفتخر اور حال کی پستیوں پر مغرور ومگن تھے۔ ہر وہ شاہراہ جس پر اسلاف کے نقشِ قدم نہ تھے ہرگز قابلِ قبول نہیں تھے۔ وراثت میں پائی جانے والی ہر برائیوں کے امین اور اس کے محافظ تھے، ان کا وجود زندگی کی ہر سعادت کی نفی کرتا تھا۔ وہ اپنے ظلمت کدے کو ہر طرح کی روشنی سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے مگر یہی وہ ظلمت کدہ تھا جو امن وشانتی اور روشنی کے متلاشیوں کا مرکز بننے والا تھا، یہی وہ بنجر اور سنگلاخ زمین تھی جسے قدرت نے اپنے احسانات وانعامات کی موسلادھار برسات کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ یثرت جو جہالت وبربریت، نفرت وحقارت، وحشت وانتقام، نسلی قبائلی اور خاندانی عصبیتوں کی آماجگاہ تھا۔ معمولی باتوں پر خون کا دھارا بہا دینے والی زمین جہاں وحشت وبربریت کے عفریت انسانی خون سے اپنی پیاس بجھایا کرتے تھے، امن وسلامتی، رحم وکرم، صلح وآشتی، محبت واخوت کا سب سے بڑا گہوارہ بنے گی۔ نسل درنسل انتقام کے شراروں کی جگہ محبت واخوت کے چشمے اُبلیں گے، فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والے آفتابِ رسالت کی ضیا پاشیوں کے سب سے زیادہ مستحق اسی کے درودیوار ہوں گے، ارض وسما کی ساری نعمتیں، برکتیں اور سعادتیں اس کا مقدر بن جائیں گی۔ یہ سرزمین روئے زمین کے بےبسوں، بیکسوں، مجبوروں، فلاکت زدوں کی امید بن جائے گی۔ اس زمین کے فرش پر بیٹھنے والے مرمریں ایوانوں میں رہنے والے کج کلاہوں کی قسمتوں کا فیصلہ کریں گے۔ جہاں کے مکین شکوہِ قیصر اور سطوتِ کسریٰ کو اپنے قدموں سے روند ڈالیں گے، جہاں کے فرش نشین اللہ کی عظمت وجلال اور اس کی کبریائی وجبروت کا پرچم چہار دانگِ عالم میں لہرا دیں گے۔ وہی یثرت جس کا غلغلہ شرق سے غرب، جنوب سے شمال اور فرش سے عرش تک مچا ہوا

ہے۔ دنیا کے نقشے تو درکنار خود عرب میں بھی اسے لائقِ اعتنا نہیں سمجھا جارہا تھا۔ جب کفروشرک، جہالت و بربریت کی دبیز تاریکیوں کو چیرتے ہوئے رسالت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا اور وادئ بطحا نبوت کی ضیا پاشیوں سے تابناک ہوئی۔ اہلِ مکہ پر مظلوم سسکتی انسانیت کے نجات دہندہ نبیِ رحمت (ﷺ) نے اسلام کی دعوت پیش کی تو غریبوں، مسکینوں، مظلوموں، غلاموں، کنیزوں اور چند قابلِ ذکر نفوس کی ایک قلیل تعداد کے علاوہ اہلِ مکہ کی اکثریت نے نبئ رحمت علیہ السّلام کی دعوت کو مسترد کر دیا۔ نہ صرف مسترد بلکہ پیغمبر امن و امان ﷺ اور ان کے رفقاء کے ایسے درپے آزار ہوئی کہ ان پر ان کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ مسلسل تیرہ برس تک دن رات کی جدوجہد اور جانکاہ مشقت کے باوجود اہلِ مکہ کا کفر و طغیان، عداوت و دشمنی، تمرد و سرکشی، خباثت و کجروی نے پیغمبر اسلام ﷺ شکستہ خاطر کر دیا جس پر انسانیت کے محسنِ اعظم نے اپنے رب کے حکم سے یثرب کو تبلیغ کے لیے مستقل ایک نیا میدان منتخب کیا۔ اپنے رفیقوں اور جاں نثاروں کو پہلے ہی سے اجازت دے رکھی تھی کہ اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے مکہ چھوڑ دیں۔ اپنے آبائی وطن کو بے سروسامانی کے عالم میں ہمیشہ کے لیے چھوڑتے وقت ان جاں نثاروں کو جن صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا، اس کی تفصیل بہت دردناک ہے۔

یثرب جو ابھی تک عرب کے نقشے پر کوئی نمایاں مقام حاصل نہ کر سکا تھا۔ مشیتِ ایزدی اس کی ارجمندی کا فیصلہ کر چکی تھی، خاکِ یثرب کو ثریا کا اوج، کہکشاں کا جمال، چاند کی چاندنی، ستاروں کی تابانی، پھولوں کی مہک، غنچوں کا تبسّم، کلیوں کا نکھار اور آبشاروں کا ترنم ملنے والا تھا، صبح قیامت تک چہار دانگِ عالم میں اس کی شوکت و عظمت کا غلغلہ بلند ہونے والا تھا۔ ابھی یثرب کی مٹی کو خاکِ طیبہ کا خطاب نہیں ملا تھا۔ ابھی اس نے بڑھ کر قدمِ ناز کا بوسہ نہیں لیا تھا۔ مگر گھر گھر، گلی گلی، فرد فرد کی زبان پر یہی تذکرہ تھا کہ جلد ہی خدا کا آخری اور مقدس رسول بیدار بختیوں کی ایک نئی دنیا لیے ہمارے اندر ہمیشہ کے لیے رونق افروز ہونے والا ہے، ہر شخص دیدہ و دل فرشِ راہ بنا ہوا ہے۔ ساری آبادی سراپا انتظار ہے۔ خوش بختیوں کی معراج ہونے والی ہے۔ ہر شخص چشمِ تمنّا لیے ہوئے آرزوؤں کی بارات سجائے تمنّاؤں ناپیدا کنار وسعتوں میں غوطہ زن ہے۔

خوشا نصیب ایک دن ساری آبادی چونک پڑتی ہے۔ دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ مسرتوں کا ایک ہیجان انگیز تلاطم ہے۔ آرزوئے شوق کی گہما گہمی ہے۔ ایک شادی کی سی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ کسی نے ان کے سوکھے کانوں میں یہ ملکوتی نغمہ گھول دیا ہے۔

''انسانیت کا نجات دہندہ، ابوبکر کی رفاقت میں مکہ چھوڑ چکا ہے۔ خفیہ طور پر چلتے چلاتے، چھپتے چھپاتے، راستہ بدلتے کسی بھی وقت وہ یثرب میں نزولِ اجلال فرما سکتا ہے۔''

بس ابھی سے دلوں کا عالم زیر وزبر ہونے لگا۔ افراد اشتیاق اور جذبۂ شوق کی گہما گہمی میں آبادی آبادی کو چھوڑ چھوڑ کر باہر آجاتی کہ کب وہ رحمت و نور، الطاف و کرم اور جمال و جلال کا پیکر مجسم، دلنواز تبسّم کے ساتھ ہمارے دلوں کے فرش کو عزت بخشے۔ جب سے ان جنم جنم کے پیاسوں نے سُنا کہ عزتوں، حرمتوں، عظمتوں، بخششوں، رحمتوں اور ہدایتوں کا چشمۂ

سیّال راستے کے ہر تشنہ لب کو سیراب کرتے منزل بہ منزل نہایت تیزی کے ساتھ ہم کو اپنے آغوشِ رحمت میں لینے کے لیے ہماری ہی طرف بڑھا چڑھا آ رہا ہے، ان کی تشنگی دو چند ہو گئی۔

بالآخر ایک دن رحمتوں کا سویرا ہوا، گلِ قدس کی خوشبو اڑی، روح کی بہاروں کا رُت بدلی۔ خوش بختیوں کا اجالا ہوا۔ اہلِ یثرب چیخ اٹھے لو! انسانیت کا نجات دہندہ، اللہ کا آخری برگزیدا اور مقدس رسول، بیدار بختیوں اور اقبال مندیوں کا امین بن کر ہم میں جلوہ افروز ہو گیا۔ اب کیا تھا ہر طرف خوشیوں کا چشمۂ سیّال اُبلنے لگا۔ بہجت و مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے، مرد عورت، آج کسی کی خوشیوں کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی اچھلنے کودنے لگیں اور معصومانہ لے میں اپنی اپنی دفوں پر خوشیوں کا ساز چھیڑ دیا۔؎

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ

ہم پر چودہویں کا چاند ثنیات الوداع (لوگوں کے رخصت کرنے کی جگہ) سے طلوع ہوا۔

وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ

ہم پر اللہ کا شکر واجب ہو گیا جب تک دُعا مانگنے والے دُعا مانگتے ہیں۔

اَيُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِيْنَا جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ

اے وہ ذاتِ گرامی جو ہم میں بھیجی گئی آپ ایسے دین کو لائے جو لائق اطاعت ہے۔

اَنْتَ شَرَّفْتَ الْمَدِيْنَه مَرْحَبًا يَا خَيْرَ دَاعِ

آپ نے مدینے کو شرف و بزرگی بخش دی اے بہترین دعوت دینے والے تو آپ کے لیے خوش آمدید ہے مرحبا ہے۔

فَلَبِسْنَا ثَوْبَ يَمَنٍ بَعْدَ تَلْقِيْنِ الرِّقَاعِ

پس ہم نے یمنی کپڑے پہنے جبکہ اس سے پہلے پیوند لگے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

فَعَلَيْكَ اللهُ صَلّٰى مَا سَعٰى لِلّٰهِ سَاعِ

پس آپ پر اللہ عزوجل اس وقت تک رحمتیں نازل فرماتا رہے جب تک کوشش کرنے والے کوشش کرتے رہیں۔

اور پھر اس محسنِ انسانیت، معلمِ کائنات آقائے دوجہاں ﷺ نے خاکِ یثرب کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے سرفراز فرماتے ہوئے اب تک کے یثرب کو ہمیشہ کے لیے مَدِيْنَةُ النَّبِي ﷺ سے بدل دیا اور ارشاد فرمایا اب آج سے کوئی اسے یثرب نہ کہے۔ بلکہ یہ مدینہ ہے

اور جب یثرب مدینہ سے بدل گیا تو اس کے لیے عُشاقانِ بارگاہِ رسالت نے کیسی کیسی آرزوؤں کی بارات سجائی ہے۔ بھیگی ہوئی پلکوں کی چلمن سے ذرا ان آرزوئے شوق کا تماشہ تو دیکھیں۔؎

یہ نہیں کہ خلد نہ ہو نکو وہ نکوئی کی بھی ہے آبرو
مگر اے مدینہ کی آرزو جسے چاہے تو وہ سماں نہیں

(اعلیٰ حضرت بریلوی)

آرزوئے جنت الماوٰے بروں کردن زدل
جنّتم ایں بس کہ بَرخاکِ درت ماوٰی کنم

(مولانا جامیؔ)

خاکِ طیبہ از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ دروے دلبر است

(ڈاکٹر اقبال)

اُن کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر میں

(اعلیٰ حضرت)

طیبہ میں مر کے سیدھے چلے جاؤ آنکھیں بند
سیدھی سڑک یہ شہر شفاعت نگر کی ہے
عاصی بھی ہیں چہیتے یہ طیبہ ہے زاہدو
مکہ نہیں کہ جانچ جہاں خیر و شر کی ہے
پھول تو پھول میری آنکھوں میں
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

(اعلیٰ حضرت)

مر کے جیتے ہیں جو تیرے در پہ جاتے ہیں حسنؔ
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر
کون کہتا ہے کہ زینت خلد کی اچھی نہیں
لیکن اے دل فرقت کوئے نبی اچھی نہیں

(علامہ حسنؔ)

مدینہ کی زمیں بھی کیا زمیں معلوم ہوتی ہے
لیے آغوش میں عرشِ بریں معلوم ہوتی ہے
تعالی اللہ اے ارضِ مدینہ تیرا کیا کہنا
بلندی عرش کی زیرِ زمیں معلوم ہوتی ہے

(محدث اعظم سیّد محمد کچھوچھوی)

طیبہ نہ سہی افضل مکّہ ہی بڑا زاہد
ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے

(اعلیٰ حضرت)

حسرت میں خاک بوسیٔ طیبہ کی اے رضاؔ
ٹپکا جو چشم مہر سے وہ خون ناب ہوں

(اعلیٰ حضرت)

اس در کی حضوری ہی عصیاں کی دوا ٹھہری
ہے زہر معاصی کا طیبہ ہی شفا خانہ

(مفتیٔ اعظم ہند)

کسی نے لی رہِ کعبہ کوئی گیا سُوئے دیر   پڑے رہے ترے بندے مگر ترے در پر
اخیر وقت ہے آسی چلو مدینہ کو   نثار ہوکے مرو تربتِ پیمبر پر

(سرکارآسی)

حریمِ کعبہ میں بھی یاد آئی طیبہ کی   کہ یادگارِ حرم میں ہے کو بہ کو تیری
دشتِ طیبہ ہے یہاں چل سر کے بل اے اعظمی   مصطفٰے کا جنتی دربار تھوڑی دور ہے

(عبدالمصطفٰے اعظمی)

یہ کعبہ ہے یہاں دیوانگی بھی حسنِ ایماں ہے   اگر طیبہ میں دامن ہاتھ سے چھوٹا تو سب چھوٹا

(بیکلؔ)

تلاشِ نقشِ کفِ پائے مصطفٰے کی قسم
چُنے ہیں آنکھوں سے ذرات خاکِ کوئے رسول

(بیدمؔ وارثی)

نامِ مدینہ لے لیا چلنے لگی نسیمِ خلد
سوزشِ غم کو ہم نے بھی ایسی ہوا چلائی کیوں

(اعلیٰ حضرت بریلوی)

او پائے نظر ہوش میں آ کوئے نبی ہے   آنکھوں سے یہاں چلنا بھی بےادبی ہے
مدینہ جاؤں پھر آؤں اور پھر جاؤں   تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

مسلمان تو مسلمان ہندو شعراء بھی مدینۃ النبی ﷺ خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں عرض کناں ہیں۔ فکر کی طہارت، جذبات کی صداقت اور والہانہ عقیدت ملاحظہ ہو۔

یہ ارضِ مقدس ہے یہ طیبہ کی زمیں ہے
جنّت بھی یہیں مالکِ جنّت بھی یہیں ہے

(چندر پرکاش)

اے خاکِ مدینہ ترے اعزاز کے صدقے
جو عرش نشیں ہے وہ یہاں فرش نشیں ہے

(جوہرؔ بجنوری)

دل محو ہے ہمارا مدینے کی سیر میں
گھر بیٹھے ہو رہی ہے زیارت رسول کی

(رامیشور ناتھ عیش الہ آبادی)

کافر نہ کہو شاد کو ہے عارف و صوفی
شیدائے محمد ہے وہ شیدائے مدینہ

(مہاراجہ سرکشن پرشاد شاؔد حیدرآبادی)

یہ ربطِ نبوت اور وحدت ہر حال میں یکساں ہوتا ہے
جھکتی ہے جبیں کعبہ کی طرف اور دل میں مدینہ ہوتا ہے

(کرشن بہاری نوؔر لکھنوی)

درِ رحمت پہ حاضر ہیں شفاعت چاہنے والے
بڑی حسرت سے اُمیّدِ شفاعت لے کے آئے ہیں

(گنیش بہاری طرؔز)

جب کبھی جاتے ہیں مل کر سُوئے طیبہ خوش نصیب
کارواں کے ساتھ گردِ کارواں ہوتا ہوں میں

(کنور مہندر سنگھ بیدی سحر)

میں اگر خاک نشینِ درِ احمد ہوں گا
رفعتِ عرش کے ہمسر مری بستی ہوگی
جیتے جی روضۂ اقدس کو نہ آنکھوں دیکھا
روح جنّت میں بھی ہوگی تو ترستی ہوگی

(منشی شنکر لال ساقی)

جی چاہتا ہے کوچۂ انوار میں چلوں
اپنے رسولِ پاک کی سرکار میں چلوں

(پنڈت ہری کشور شرما نظر)

☑☑☑☑☑☑

اندازِ مسیحائی

زُلفِ بنگال، چشمِ بنگال، سحرِ بنگال کی تمام ترحشر آفرینیوں کے باوجود سلطان غیاث الدین بلبن کا فیاض، بہادر، اولو العزم بیٹا بغرا خاں اپنی زندگی کی مشکل ترین مہم سے سُرخرو ہو کر جشن فتح بنگال منا رہا تھا۔ ہر طرف سے تحسین و مرحبا، مبارک و سلامت کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ درباری شعراء اس عظیم الشان فتح پر ایک سے بڑھ کر ایک فتح نامے اور قصیدے پیش کر رہے تھے۔ فراخ دل، عالی حوصلہ اور فیاض شاہزادہ بھی فیض و عطا کا پیکرِ مجسّم بنا ہوا تھا۔ اور جب طوطئ ہند، خاقانئ زماں، بلبل خوشنوا خُسر و نے منفرد لب ولہجہ میں اپنا قصیدہ پیش کیا تو رنگ و آہنگ کا موسم بدل گیا اور پڑھنے والوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنا قصیدہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا کہ ؎

پھر اس کے بعد چراغوں کی روشنی نہ رہی

تو پھر شہزادے نے بھی جود و سخا کی تاریخ میں ایک جلی عنوان کا اضافہ کرتے ہوئے حضرت امیر خسرو کو پانچ لاکھ تنگے عطا کیے۔

امیر خسرو اس گرانقدر انعام کو خچروں پہ بار کرا کے شاہی لشکر کے ہمراہ دلّی واپس ہوئے۔

شاہی لشکر دلّی کی طرف رواں دواں تھا۔ منزلِ مقصود کا فاصلہ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے والدین، بیوی بچّوں سے جلد تر ملاقات کے شوق میں فوج زمین کی طنابیں سمیٹ رہی تھی۔

رات اپنا سیاہ بازو پھیلائے کائنات کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے دوسرے پہر میں داخل ہونے والی تھی کہ اچانک ایک سرائے سے گزرتے ہوئے امیر خسرو نے اپنے گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔ آپ کے رُکتے ہی پیچھے رواں دواں لشکر رُک گیا۔ منزل کی طرف تیزی سے بڑھتے کاروں کے اچانک رُک جانے سے فوج میں فطری اضطراب ہوا۔ آپ کے پیچھے چلنے والے ایک فوجی نے ادب کے ساتھ دریافت کیا ”حضور! آپ نے سواری کو کیوں روک لیا؟“

”آہ! تمھیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”بوئے شیخ می آید۔“ (پیر کی خوشبو آ رہی ہے)

”بوئے شیخ؟“

”ہاں ہاں بوئے شیخ، مرشدِ کامل کی خوشبو!“

”حضورِ والا دلّی تو ابھی بہت دور ہے۔“

"جانے کتنی میل دور! اتنی دور سے بوئے شیخ کا کیا مطلب ہے؟"

"ارے بھائی بوئے شیخ کا مطلب بوئے شیخ ہی ہوتا ہے۔" یہ کہہ کر اضطرابی کیفیت میں گھوڑے سے اُتر پڑے۔ وارفتگئ شوق میں سرائے کی طرف لپکے جہاں سے بُوئے شیخ آرہی تھی۔

ایک فوجی نے آگے بڑھ کر مطمئن کرنا چاہا۔

"حضورِ والا! اس سرائے سے بوئے شیخ کا کیا واسطہ؟"

آپ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا:

"تجھے کیا معلوم بُوئے شیخ کیا ہوتی ہے۔"

تو نے تو کردیا طبیب آتشِ سینہ کا علاج
آج کی درد آہ میں بُوئے کباب آئی کیوں

"میرے بھائی اگر بوئے شیخ اس طرف سے نہیں آئی تو خسرو کی مشامِ جاں معطر و بےخود کیوں ہوئی۔ ہو نہ ہو اس سرائے میں کوئی خاص بات ضرور ہے، جس نے اردگرد کے ماحول کو عطر بیز کر رکھا ہے۔"

کوچے کوچے میں مہکتی ہے یہاں بُوئے قمیص
یُوسفتاں ہے ہر گوشۂ کنعانِ عرب

رات بھیگ چکی تھی۔ سیاہ شب کی زلفیں بکھر چکی تھیں۔ مسافر نیند کی میٹھی آغوش میں پہنچ چکے تھے البتہ سرائے کا مالک جاگ رہا تھا۔

فوجیوں کی مسلسل دستک پر اس نے دروازہ کھولا۔ جوں ہی نظر پڑی، حواس باختہ ہوگیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ کپکپائی آواز میں گویا ہوا "سرکار ہم سے کوئی غلطی ہوئی؟ کوئی جرم سرزد ہوا، جانے انجانے میں کوئی بھول ہوئی؟"

"ارے نہیں بھائی! تم سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہم چند مسافروں کو دیکھنا چاہتے ہیں بس!"

جوں ہی پھاٹک کھلا، امیر خسرو بےتابانہ اندر داخل ہوئے، سامنے ہی ایک خستہ حال مسافر پر نظر پڑی جو زمین پر بےخبر سو رہا تھا۔ اس کی طرف سے بوئے شیخ آرہی تھی جس نے خسرو کے سوزِ دروں کو دوچند کر دیا تھا۔

دل میں جو چوٹ تھی دبی ہائے غضب اُبھر گئی
پوچھو تو آہِ سرد سے ٹھنڈی ہوا چلائی کیوں

آپ نے بڑی آہستگی سے اُسے جگایا۔ آنکھیں کھولنے پر اپنے چاروں طرف فوجیوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ حواس باختگی کے عالم میں قبل اس کے کہ وہ بھی سرائے کے مالک کی طرح اپنی صفائی پیش کرتا۔ حضرت امیر نے اسے انتہائی نرم، شیریں، لطیف اور کریمانہ لہجے میں مخاطب فرمایا:

”بھائی ہم تمہاری نیند میں خلل انداز ہوئے، معذرت چاہتے ہیں۔ دل نیاز پیشہ کے اضطرابِ مسلسل نے مجبور کر دیا۔ اچھا یہ بتاؤ تم کہاں سے آرہے ہو؟“

”حضورِ والا! ہم دلّی سے آرہے ہیں!“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم دلّی میں بادشاہِ دین و دُنیا، سلطان المشائخ، محبوبِ الٰہی سرکار نظام الدین اولیاء کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے تھے، تمھیں اُن کی زیارت نصیب ہوئی تھی؟“

”جی ہاں! خاص کر ہم انھیں کی خدمتِ عالی میں ایک بڑا مقصد لے کر بڑی امیدوں کے ساتھ حاضر ہوئے تھے۔ ان کی چارہ سازی، دردمندی، بندہ نوازی، کرم فرمائی، دستگیری اور اندازِ مسیحائی کا بڑا شہرہ سُن کر۔ مگر اپنی زنگ آلود، مقفل قسمت کی کنجی وہاں بھی نہیں ملی۔“

ہائے رے وقت کی بے مہری، جس کی فیض وعطا، داد و دہش کا شہرہ برصغیر بھر میں پھیلا ہوا ہے، وہاں سے بھی خالی ہاتھ واپس ہو رہا ہوں۔ ؎

اُمید بھی اب ٹوٹی رستہ ہے نہ منزل ہے

”ایسا ہو نہیں سکتا کہ ان کی بارگاہِ فیض وعطا سے کوئی ہاتھ خالی جائے۔ بالخصوص تم جیسا خستہ حال، غریبُ الدیار آدمی، اپنی پریشانی، خستہ حالی اور ضرورت کے ساتھ صورتِ واقعہ کی پوری تفصیل بیان کرو۔“

”حضورِ والا! میں ایک پریشان حال اور بے حد غریب آدمی ہوں، حالات کی کڑی دھوپ نے مجھے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ غریب اور بھی دنیا میں ہوں گے مگر معاشی بدحالی نے مستقل مجھ سے دوستی کر لی ہے، زندگی کی گاڑی جیسے تیسے کھینچ کھانچ کر عمر کی اس منزل تک لے آیا۔ میری حرماں نصیبی یہی نہیں کہ غربت نے مستقل میرے گھر پر ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ مزید برآں اس جانِ ناتواں پر جوانی کی پُرخطر دہلیز تک تلے اوپر پہنچنے والی سات جوانیوں کا بوجھ بھی ہے۔ ہم نے اب تک بڑے غم برداشت کیے۔ صدمات جھیلے، دُکھ کے بوجھ اٹھائے جو میرے کربناک ماضی کا ایک حصّہ ہیں۔ مگر سات جوانیوں کے بوجھ سے ابھی سے لرزہ براندام ہوں۔ میرا سکون غارت ہو چکا ہے۔ میری تمنّا تھی کہ میں اپنی بچیوں کی شادی سے سبکدوش ہو جاؤں مگر مجھے اتنی بھی توفیق نہیں کہ میں اپنی ایک ہی لڑکی کو اس کی زندگی کی سب سے بڑی مسرت سے ہمکنار کر سکوں۔“ ؎

غموں کی دھوپ میں کاٹا ہے زندگی کا سفر
کہ راستے میں کوئی نخلِ سایہ دار نہ تھا

انھیں ناتمام حسرتوں کو لے کر میں سلطان الاولیاء سرکار محبوبِ الٰہی کی بارگاہِ بندہ نواز میں حاضر ہوا۔ اپنی داستانِ الم گوش گزار کی، جسے سُن کر آپ کی پلکیں نم آلود ہو گئیں، تسلّی کے کلماتِ خیر سے مجھے تسکین فرمائی اور ارشاد فرمایا کچھ دن میرے پاس رہ جاؤ، خدائے ذوالجلال بہتری کی کوئی صورت پیدا کرے گا۔

چنانچہ آپ کے حکم کے مطابق میں آپ کے قدموں میں رہنے لگا۔ اس امید قوی پر کہ یہاں تو ہر طرف سے فتوحات کا سیلاب آتا ہے جس سے خلق خدا سیراب ہوتی ہے۔ میری بھی بگڑی کسی دن بن جائے گی۔ مگر ہائے رے برگشتگیٔ تقدیر! جس دن سے میرے منحوس قدم وہاں پڑے کہیں سے کوئی چیز آپ کی بارگاہ میں آئی ہی نہیں کہ جس سے میرے درد کا درماں ہوتا۔

کچھ دن انتظار کے بعد بالآخر میں نے رخصت کی اجازت چاہی تو آپ تڑپ اٹھے۔ ندامت بھرے انداز میں فرمانے لگے ''اس فقیر سے بڑی امیدیں وابستہ کرنے والے مہمان! میں تم سے شرمندہ ہوں کہ فی الحال میں تمہاری کوئی خدمت نہ کرسکا اور حق میزبانی ادا نہ ہوسکا۔ بروقت تمھیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، البتہ ایک جوڑی پُرانی جوتی ہے جو میری اپنی ملکیت ہے۔ اگر تم اسے قبول کرلو تو مجھے بڑی مسرت ہوگی کہ تم میرے یہاں سے بالکل خالی ہاتھ نہیں گئے۔''

''اسے میں نے اپنا نصیبہ سمجھ کرلے لیا اور وہاں سے چل پڑا۔''

''امیر و غریب، رئیس و فقیر، شاہ و گدا کو نوازنے والی بارگاہ سے اپنی محرومی پر میں سخت اداس و غمزدہ ہوں۔ اپنی لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ لے کر میں بادشاہِ دین و دنیا کے پاس حاضر ہوا تھا۔ اُن کی بارگاہِ فیض و عطا سے ایک پُرانی جوتی ملی۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اب میرے مسئلے کا حل کیا ہوگا۔ میرے نصیبے کی دربدری کب ختم ہوگئی؟'' ؎

ہمارے گھر کی دیواروں پر ناصر
اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

امیر خسرو نے ساتھیوں سے مخاطب ہوکر فرمایا ''دوستو! کیا میں نہیں کہتا تھا کہ اس سرائے میں ضرور کوئی خاص بات ہے جس نے خسرو کے پاؤں میں زنجیر ڈالی دی ہے۔''

''اجنبی مسافر! کیا تم اس مقدس نعلین کو جو سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی سیّد نظام الدین محمد نے تمھیں اپنے کرم سے عطا فرمائی ہے، میرے ہاتھوں فروخت کرنا پسند کروگے؟''

سوال سے زیادہ لہجہ عجیب تھا۔ وہ چکرا کے رہ گیا۔ ایک ایسا شخص جو فوجی عہدیداروں میں نمایاں، ممتاز اور منفرد و معزز نظر آرہا تھا۔ فوجی جس کے سامنے مؤدب اور وہ خود ان کی نگاہوں میں محترم تھا! اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پُرانی جوتی کو جو چلتے وقت سلطان المشائخ نے اسے عطا فرمائی تھی، جس کے بارے میں ابھی تک وہ خود سنجیدہ نہیں ہوسکا تھا اس کو خریدنے کے لیے کوئی سوچے گا بھی! جبکہ یہاں ایک بڑا محترم انسان اس کی خرید و فروخت کی بات بھی کررہا ہے۔ ابھی وہ سوچ کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکا تھا کہ امیر خسرو کی دوبارہ آواز ابھری:

''خوش نصیب انسان! تم نے بتایا نہیں کہ اس قابلِ احترام جوتی کا تم کیا لوگے؟''

دوبارہ مخاطب کرنے پر وہ چونکا۔ آپ مذاق تو نہیں فرمارہے ہیں؟ بھلا آپ جیسا معزز آدمی پُرانی جوتی کو لے کر کیا کرے گا؟ کسی بادشاہ یا شہزادے کی بھی نہیں کہ اس کے نقش و نگار میں کچھ سونے چاندی کی زری نکل آئے۔ ایک دنیا بیزار درویش کی جوتی اتنی اہمیت تو نہیں رکھتی کہ آپ جیسا معزز انسان اس کو خریدنے کی بات کرے۔ اگر کسی طرح کا یہ اندازِ ستم

ہے تو دکھوں کے ڈھیر میں ایک ہلکا اضافہ یہ بھی سہی کہ۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

استغفراللہ! معاذ اللہ! تمھیں کسی طرح کی تکلیف پہنچانا یا مذاق اُڑانا میں گناہ سمجھتا ہوں۔ آخر تم یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں اپنی پیشکش میں مخلص ہوں۔ ویسے کوئی زورزبردستی نہیں، صرف گزارش ہے کہ وہ مقدس نعلین کو قیمتاً دے دو۔ جو بھی مناسب قیمت تم کہو گے میں دینے کو تیار ہوں۔ آپ کے متین و سنجیدہ لب و لہجے سے اسے یقین ہو چلا کہ مجھ سے مذاق نہیں کیا جا رہا ہے۔ بڑی مشکل سے اٹکتے جھجکتے صرف اتنا کہہ سکا ''اس محترم انسان کی نعلین کی قدر و قیمت کا مجھے اندازہ نہیں۔ آپ جو بھی عطا فرمائیں گے ہم اُسے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیں گے۔''

سرِ دست میرے پاس صرف پانچ لاکھ تنگے ہیں، اس سے زیادہ نہیں کہ تمہاری طرح میں بھی حالتِ سفر میں ہوں۔ اس حقیر اور معمولی رقم کے عوض اگر مجھے تم وہ قیمتی اور مقدس نعلین دے دو تو ہم تمہارے شکر گزار رہوں گے۔ آپ جذبۂ شوق میں بولے جا رہے تھے اور آس پاس کے لوگ عالمِ حیرت میں دم بخود۔ خود مسافر پر تو حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

امیر خسرو نے بڑی مشکل سے یقین دلایا کہ اس سلسلے میں جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں کذب یا مذاق کا شائبہ تک نہیں ہے۔

عجب چیز ہے لذّت آشنائی — دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

حیرت کا طلسم ٹوٹنے پر مسافر نے عرض کیا ''حضورِ والا! اگر آپ اپنی اس پیشکش میں مخلص ہیں، جبکہ آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ میں بھی تمہاری ہی طرح مسافر ہوں تو اتنی بڑی رقم آپ حالتِ سفر میں کہاں سے لائیں گے؟''

''سب کچھ میرے پاس یہیں ہے۔ پانچ لاکھ تنگے خچروں پر لدے ہیں جو سرائے کے باہر کھڑے ہیں۔ یہ مقدس جوتی ہمیں دے دو۔ اس کے بدلے میں یہ دولت گھر لے جاؤ۔ بچیوں کی شادی کشادہ دستی سے کرو اور اپنی زندگی بھر کی محرومیوں کا ازالہ کرو۔''

مسافر تیزی کے ساتھ سرائے سے باہر نکلا اور بڑی بے یقینی کے عالم میں خچروں پر لدی دولت کو دیکھنے لگا۔ جاگتی آنکھوں سے وہ خواب نہیں بلکہ زندگی کی ایک خوبصورت حقیقت دیکھ رہا تھا۔

''اب تو تمھیں یقین آ گیا۔ جلدی بولو کیا کہتے ہو؟''

''حضورِ عالی! اب مجھے یقین آ گیا۔ مگر میں یہ دولت کیسے لے جا سکتا ہوں؟ راستے میں چور، لٹیرے، ڈاکو ملیں گے، تنہا ایک میری جان، مال الگ لوٹ لیں گے، جان الگ جائے گی۔ میں پھر اسی طرح کنگال کا کنگال رہ جاؤں گا۔''

''فوج کی حفاظت میں دولت تمہارے گھر پہنچا دی جائے گی۔ بس اب تو مطمئن ہو۔ اب لاؤ جلدی کرو۔''

اس مفلوک الحال، غریب الدیار، اجنبی مسافر نے بھیگی پلکوں کے ساتھ مقدس نعلین کو چومتے ہوئے امیر خسرو کو پیش کیا۔ پھر گلوگیر آواز میں کہنے لگا ''دلّی پہنچ کر بادشاہِ دین و دنیا، شہنشاہِ فیض و عطا سے دست بستہ سلام کہیں، واپسی پر راستے

میں بدگمان بھی کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا کہ میرے سنگین مسائل کا حل کیا یہی پُرانی جوتی ہے؟ غلام بہت شرمندہ ہے۔ میری طرف سے معافی بھی مانگ لیں۔ ہم جیسے کم نگاہ اور ظاہر بیں اس اندازِ مسیحائی کو کیا سمجھیں۔ جود و سخا، فیض و عطا کے بادشاہ کا اندازِ بخشش و عطا ہم گدا گروں کے فہم و ادراک سے بہت ماورا ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

آپ نے اس اجنبی مسافر سے پیر و مرشد کے مقدس نعلین لے کر بڑے احترام و عقیدت کے ساتھ چوما، آنکھوں سے لگایا، سر سے دستار کھول کر نعلین شریف کو اس میں لپیٹ کر سر سے باندھ لیا۔

جذبۂ شوق کا اضطراب لیے کاروں کے ساتھ منزل بہ منزل دلّی کی طرف بڑھنے لگے۔ راستہ ہے کہ کٹتا ہی نہیں۔ زمین کی طنابیں جیسے سمٹنے کے بجائے پھیلتی جا رہی ہیں۔ کبھی خوشی کے لمحات بھی جاں گسل ہوتے ہیں۔ بالآخر جذبۂ شوق کی گہماگہمی میں دلّی پہنچ گئے۔ سب سے پہلے پیر و مرشد نظام الحق والشرع والدین کی بارگاہِ کرم میں حاضر ہوئے۔ قدم بوسی کی اور دست بستہ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ آپ کے ارد گرد حاجت مندوں، مرادیوں، اپنوں بیگانوں سب کا مجمع لگا ہوا تھا۔ سلطان المشائخ کی آواز ابھری:

"خسرو! اقبال مند، عالی حوصلہ شہزادے کے ساتھ گئے تھے، فتح کی جلو میں واپس آئے تو میرے لیے بھی کچھ لائے کہ بس خالی ہاتھ چلے آئے؟"

اگرچہ صورتِ واقعہ پورے طور پر آپ پر روشن تھی۔ لوگوں کے دلوں کے خطرات سے آگاہ رہنے والے سلطان المشائخ نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا کہ خسرو کی بے پناہ محبت کا تماشہ لوگ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں اور لوگوں پر ظاہر ہو جائے کہ اس ترک سے میری شدید وابستگی یوں ہی نہیں ہے۔

میں اس عارفانہ تجاہل کے صدقے — ہر اک دل کو چھیدا مرا دل سمجھ کے

نم آلود پلکوں سے عرض کرنے لگے: ایک غلام کی حقیقت ہی کیا جو سلطانِ فیض و عطا کو کچھ پیش کر سکے۔ ہاں حضورِ والا کے قدموں کی ایک نشانی اپنے سر کا تاجِ زریں بنا کر خدمت اقدس میں حاضر ہو گیا ہوں۔ یہ میری حیات کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر اسے شرفِ قبولیت عطا ہو جائے تو میرے لیے سب سے بڑی سعادت ہوگی۔ یہ کہہ کر دستار سر سے کھولی اور اس میں سے وہی جوتی نکال کر خدمت اقدس میں پیش کر دی۔

ارے! یہ تو میں نے ایک مفلوک الحال مسافر کو دے دی تھی، تمھیں کیسے ملی؟

جی ہاں قبلۂ عالم! یہ وہی مقدس نعلین ہے، جسے ہم نے اس مسافر سے قیمتاً خریدی ہے۔

"خسرو! تم نے اس غریب آدمی سے کتنے میں خریدی؟ میں بھی تو کچھ سنوں۔" (تبسّم زیرِ لب مچل رہا تھا)

"حضورِ والا! پانچ لاکھ تنگے میں!"

"صرف پانچ لاکھ؟"

"جی سرکارِ والا تبار!"

"خسرو! بسیار ارزاں خریدہ۔" (خسرو! تم نے بڑے سستے داموں خریدا)

"سرکارِ عالی! خسرو غریب بھی اس غریب کی طرح غریب الوطن تھا۔ مسافرت میں میرے پاس یہی سب کچھ تھا۔ اگر میں دلّی میں ہوتا تو اس کی بڑی سے بڑی قیمت دے سکتا تھا، امیر خسرو کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ پیر و مرشد کے قدموں سے لگ کر عزت پا جانے والی جوتی کو اتنے کم داموں پر خرید کر شرمندہ تھے۔

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

خانقاہ میں سنّاٹا طاری تھا۔ لوگ دم بخود تھے۔ یہ محبت کیسی تھی؟ یہ کیسا عشق تھا؟ تڑپ کی یہ کون سی منزل تھی؟ چاہت کا یہ کیسا انداز تھا؟ جذبِ دروں کی یہ کون سی کیفیت تھی؟

یہ راز و نیازِ محبت ہیں ناصح
نہ وہ بے خبر ہیں نہ ہم بے خبر ہیں

یہی جذبۂ سوزِ دروں تھا کہ سلطان المشائخ فرماتے تھے "میں سب سے تنگ آ جاتا ہوں یہاں تک کہ اپنے سے بھی۔ مگر اس ترک (یعنی خسرو) سے نہیں۔ اگر شرع اجازت دیتی تو ہم اور خسرو ایک ہی قبر میں آرام کرتے۔"

مکتبِ عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

خسرو سے حضرت محبوبِ الٰہی کی محبت کا اندازہ اس سے لگائیے۔ فرماتے ہیں "کل میدانِ قیامت میں خدائے ذوالجلال نے مجھ سے پوچھا کہ نظام الدین دنیا سے میرے لیے کیا لائے؟" تو میں عرض کر دوں گا "مولی! میں تیرے لیے اس ترک کے سینے کا سوز لایا ہوں۔"

فرماتے ہیں "میں جنت میں اس ترک کے بغیر قدم نہیں رکھوں گا۔"

بلبلِ شیراز حضرت شیخ سعدی آپ سے ملنے ہندوستان آئے۔ حضرت خضر سے امیر خسرو کی ملاقات ہوئی۔ کلام میں شیرینی، لطافت، مقبولیتِ عام کے لیے لعابِ دہن کی درخواست کی۔ حضرت خضر نے جواب دیا:

"یہ سعادت حضرت سعدی حاصل کر چکے جوان کا مقدر تھی۔ اب دوسرے کے لیے نہیں!" یہ سن کر آپ کو بڑا تکدر ہوا چہرے پر تکدر کی کیفیت لیے قبلۂ عالم کی بارگاہ میں حاضری دی۔

"ترک کیا بات ہے؟ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

"پیر و مرشد روشن ضمیر ہیں"

''تم بھی تو کچھ کہو۔''

''آج حضرت خضر سے ملاقات ہوئی تھی۔ کلام میں شیرینی کے لیے لعابِ دہن کی درخواست کی، جو یہ کہہ کر مسترد فرما دی گئی کہ یہ شیخ سعدی کا نصیبہ تھا جو وہ حاصل کر چکے۔ اب دوسرے کے لیے ممکن نہیں۔''

''بس اتنی سی بات پر منہ اُتر گیا اچھا اپنا منہ کھولو۔''

خسرو نے اپنا منہ کھولا۔ آپ نے ان کے منہ میں اپنا لعابِ دہن ڈال دیا۔

اس کی بدولت کلام میں وہی حلاوت، وہی لطافت اور آپ کے کلامِ بلاغت نظام کو جو قبولیتِ عام کی سند ملی وہ صبح قیامت تک کے لیے ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔

بیعت میں انفرادیت:۔ والدِ محترم ابتدائی عمر ہی میں محبوبِ الٰہی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تا کہ دامنِ کرم سے وابستگی کا اعزاز مل جائے۔ جب خانقاہ کے دروازے پر پہنچے تو والد گرامی سے کہنے لگے، آپ اندر جائیے۔ میں یہیں باہر بیٹھتا ہوں بغیر بُلائے نہیں جاؤں گا۔ دراصل بچپن ہی میں بیعت میں انفرادیت چاہتے تھے۔ والد ماجد اندر جا کر خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ امیر خسرو نے باہر بیٹھے بیٹھے ایک رُباعی نظم کی جسے زیر لب آہستگی سے گنگنانے لگے۔ ؎

تو آں شاہی کہ بر ایوانِ قصرت   کبوتر گر نشیند باز گردد
غریبے مستمندے بر درآمد   بیاید اندروں یا باز گردد

تو ایسا بادشاہ ہے کہ تیرے قصر کے کنگورے پر اگر کبوتر بیٹھ جائے تو وہ بھی باز بن جائے۔ ایک غریب حاجت مند تیری چوکھٹ پہ حاضر ہوا وہ اندر آئے یا باہر ہی سے واپس چلا جائے۔ یہ سوچ کر کہ اگر شیخ کامل ہیں تو اُن کی نگاہ دلوں کے خطرات پر بھی ہوگی۔ پھر اگر انھوں نے مجھے اپنی غلامی میں لینے کے قابل سمجھا تو ضرور اندر بلائیں گے اور اگر انھوں نے نہیں بُلایا تو ایسے ہی بغیر ملے واپس چلا جاؤں گا کہ وہ مرشد کامل ہی کیا جو دلوں کی دھڑکنوں سے باخبر نہ ہو سکے۔ ابھی اس غور وفکر میں تھے کہ سلطان الاولیاء نے اپنے خادم خاص سے مسکراتے ہوئے فرمایا: دراز ے کے باہر ایک لڑکا بیٹھا ہوگا اس کے سامنے یہ رُباعی پڑھ کر خاموشی کے ساتھ واپس چلے آؤ۔ ؎

بیاید اندروں مردِ حقیقت   کہ باما یک نفس ہمراز گردد
اگر ابلہ بود آں مردِ ناداں   ازاں راہے کہ آمد باز گردد

چاہیے کہ اندر آئے وہ مردِ دانا کہ میرے ہمراہ بیٹھ کر میرا ہمراز ہو جائے اور اگر وہ مردِ احمق و نادان ہے تو اسے چاہیے کہ جس راستے سے آیا ہے اسی راستے سے واپس چلا جائے۔

اتنا سنتا تھا کہ انتہائی بیتابی کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ پیر و مرشد کے قدموں پر سر رکھا اور جانِ بے تاب کو ہمیشہ کے لیے ان کے حوالے کر دیا۔ ؎

تقریب محبت کی کیا خوب وہ ساعت تھی

جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہِ جبیں واقف

یوں تو سلطان الاولیاء، خیر الاذ کیا، امام الاصفیا حضرت سیّدنا ومولانا محمد نظام الحق والشرع والدین کے دامنِ کرم سے وابستہ ہوکر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ حضرت بُرہان الدین غریب، حضرت قطب الدین منور، علامہ فخر الدین زرادی، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا شمس الدین یحییٰ، سیّد نصیر الدین چراغ دہلوی، اخی سراج بنگالی، مولانا حسام الدین ملتانی وغیرہم۔ یہ وہ لوگ ہیں جو علم وفضل، زہدو ورع، تقویٰ وطہارت، جذب وسلوک، اعتماد و یقین، توکّل و استغناء میں بے مثل و بے مثال تھے۔ ان نفوسِ قدسیہ کو بارگاہِ سلطان الاولیاء میں بڑا قرب حاصل تھا۔ وہ خلافت واجازت کی دولت سے مالامال تھے۔ انھیں میں ''حضرتِ خسروؔ'' بھی تھے۔ مگر ایک انفرادی شان لیے ہوئے۔ مزاجِ اقدس میں بے پناہ اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں اہم ترین معاملات میں خسرو سفارشی ہوتے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سلطان الاولیاء سرکار نظام الحق والشرع والدین نے ان کی عرض داشت کو رد فرمایا ہو۔ وہ اپنے ترک (خسرو) کا ناز اٹھاتے تھے۔ ہر نازک موڑ پر آپ نے خسرو کے بجا اعتماد کی لاج رکھی۔

سلطان علاء الدین خلجی کے دو خاص درباری، ملک نصرت اور محمد علی زنبیلی جو سلطان الاولیاء کے مرید بھی تھے۔ انھوں نے پیرومرشد سے حضرت بُرہان الدین غریب کی شکایت کردی۔

''حضور اب آپ کی بارگاہ کے تربیت یافتہ، آپ کے صحبت یافتہ مخصوص خلفاء میں بھی تن آسانی اور عیش پسندی آتی جارہی ہے۔ ابھی سے شیوخ کے طریقے پر سجادگی پر بیٹھنے کی مشق شروع ہوگئی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو تم لوگ! وہ کون لوگ ہیں؟''

''حضورِ والا! ہم بالکل درست کہہ رہے ہیں۔ اب یہی بُرہان الدین غریب کو لے لیجیے۔ دیکھنے میں بالکل مسکین صورت، نیک نفس، شریف النفس، عبادت گزار، صاحبِ تقویٰ اور آپ کے مخلص غلاموں میں سے ہیں۔ مگر ان کا حال یہ ہے کہ وہ ایک کمبل کو تہ در تہ کرکے اسے اونچا کرتے ہیں۔ پھر مشائخ کے طرز پر اس پر تشریف رکھتے ہیں۔ بھلا ان کو ابھی سے ایسا کرنے کی ضرورت تھی؟ وہ پیرومرشد تو نہیں ہوگئے کہ اندازِ نشست کو اس طرح سے اپنائیں اور سجّادۂ شیخی پر بیٹھیں۔

یہ سن کر سلطان الاولیاء کے مقدس چہرے پر رنج وملال ظاہر ہوا، فوراً خادمِ خاص کو بُلایا۔ ''اقبال!''

''جی حضور!''

''دیکھو خانقاہ میں بُرہان الدین غریب بیٹھے ہوں گے۔ ان سے کہو کہ وہ یہاں سے فوراً اپنے گھر چلے جائیں اور اب ان کو یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ہاں میرا خلافت نامہ بھی واپس لے لینا۔

سخت وحشت کے عالم میں خادمِ خاص، اقبالؔ غریب کے پاس گیا۔ اس غریب کو اس غریب پر ترس آرہا تھا۔ بے چارے سیدھے سادھے، نیک، خداترس، سوکھی ہڈیوں کا مجموعہ غریب! واقعی غریب ہوچکے تھے۔

جھجکتے اٹکتے خادم کہنے لگا، جنابِ عالی! سرکار کا حکم نامہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔

سراپا اشتیاق بن کر: ”کیا حکم ہے آقا کا؟“
آپ اپنا خلافت نامہ واپس کر کے ابھی خانقاہ سے چلے جائیں اور پھر اب یہاں مت آئیں۔ یہ حکم سناتے ہوئے حقیقتاً بہت افسوس ہو رہا ہے۔ ملک نصرت اور علی زنبیلی حضرت کی بارگاہ میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہی کچھ لگائی بجھائی ہے۔

اتنا سنتے ہی غریب بدحواس ہو گئے۔ خرمنِ آرزو پر بجلیاں گر پڑیں، گریۂ بے اختیار نے آنکھوں کو ساون بھادوں بنا دیا۔ آہ! میں تباہ و برباد ہو گیا۔ مرکزِ حیات ہی جب روٹھ گیا تو اب زندگی کس کام کی؟
برستی آنکھوں سے خلافت نامہ واپس کیا، کمبلہ کاندھے پر رکھا اور لرزیدہ قدموں سے اپنے حجرے کی طرف چل دیئے۔ اب صرف وہ تھے اور ان کی گریۂ تنہائی! ؎

سوکھی ہیں بہت دیر سے پلکوں کی زبانیں
بس آج تو دل بھر کے رُلائے کوئی آکر

دربارِ سرکار سے فرصت پا کر کئی دن کے بعد خسرو سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں پہنچے۔ سب نظر آئے مگر ”غریب“ نہیں۔ موقع پاتے ہی خادمِ خاص سے پوچھا:
”اقبال! غریب کہاں ہیں؟“
”اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ابھی کچھ نہیں معلوم!“
”ارے بھائی پہیلیاں مت بجھاؤ! کیا کوئی حادثہ پیش آ گیا اس کو؟“
”حادثہ سے بڑھ کر! پیر و مرشد نے انھیں خانقاہ سے نکال دیا۔ اپنا خلافت نامہ بھی واپس لے لیا اور خانقاہ میں آنے پر پابندی لگا دی۔“
”آخر کیوں؟“
”یہ ملک نصرت اور علی زنبیلی کی شرارت ہے۔ وہ کمبل تہ کر کے خانقاہ میں بیٹھے تھے۔ اس کے متعلق کچھ لگائی بجھائی کر کے پیر و مرشد کو ناراض کیا ہے۔ اب وہ کہیں نکلتے بھی نہیں۔ بس اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ گھر کے اندر اکثر روتے رہتے ہیں۔ سب لوگوں کو اس حادثہ کا بڑا قلق ہے، لیکن حضور کی بارگاہ میں کسی کی ہمّت نہیں پڑتی۔ آپ ہی پر سب کی نگاہیں ہیں۔ ؎

خدا گواہ بھری انجمن میں میرے سوا
نہیں ہے کوئی جو ان کی نظر کو پہچانے

امیر خسرو ”غریب“ کے گھر تشریف لے گئے۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا، جیسے ہی خسرو پر نظر پڑی، دوڑ کر لپٹ گئے۔ کہاں تھے میرے بھائی! میرے دوست! یہاں مجھ پر کئی قیامتیں گزر گئیں اور تم اب آ رہے ہو۔

''غریب! میرے بھائی، تم گھبراؤ نہیں اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ملک نصرت اور زنبیلی کی شرارتوں کا علم ہو چکا ہے۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو، میں معافی دلوا دیتا ہوں۔''

''نہیں خسرو! نہیں! میرے اندر اتنی ہمّت نہیں کہ ناراضگی کے عالم میں قبلۂ عالم کا سامنا کروں۔''

''ارے بھائی! تم چلو تو سہی، تمھیں کون کہتا ہے کہ تم سیدھے حضرت کے روبرو کھڑے ہو جاؤ۔ تمھیں حضرت کے سامنے اس وقت پیش کروں گا جب وہ تم سے راضی ہو چکے ہوں گے۔''

دونوں ساتھ ساتھ حضرت سلطان الاولیاء کی خانقاہ میں آئے۔ غریب کو خسرو نے ایک گوشے میں بٹھا دیا اور خود ننگے سر، ننگے پاؤں، دستار گلے میں لپٹی ہوئی عفو و تقصیر کے لیے مجرمانہ انداز لیے حاضر ہوئے۔ خسرو کو اس انداز میں دیکھ کر آپ تبسّم ریز ہوئے۔

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی   یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

''ترک! کیا بات ہے؟''

''بندہ پرور! غریب کی خطا معاف کر دی جائے۔''

''غریب کا قصور تمھیں معلوم ہوا؟''

''جی میرے آقا! ہو گناہِ بے گناہی کا مرتکب ہوا۔''

''یعنی وہ تمہاری نگاہوں میں بے قصور ہے، اسے نا کردہ گناہوں کی سزا دی گئی ہے؟''

''وہ صفائی کی جرأت نہ کر سکا۔ ورنہ حضور کی نگاہوں میں بھی بے قصور ہوتا۔''

''تو اس کی طرف سے تم صفائی پیش کرنے آئے ہو؟''

''نہیں اس کی طرف سے خطا کی معافی چاہنے آیا ہوں۔''

''جب خطا ہی نہیں تو معافی کا کیا سوال؟''

''اس کے گناہِ بے گناہی کی یہی تفصیل تو حضورِ والا کی بارگاہِ کرم تک پہنچی ہے کہ بُرہان الدین کمبل تہ کر کے مشائخ کے طریقے پر ابھی سے بیٹھتا ہے۔ بے شک وہ بُرہان الدین کمبل تہ کر کے اس پر بیٹھتا ہے مگر مجبور ہو کر! آپ کی نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ خانقاہِ عالیہ میں سوکھی ہڈی کے پنجر کا نام ''بُرہان الدین غریب'' ہے خصوصاً اس کے پاؤں کی ہڈیاں کس قدر سوکھی ہیں! اپنے پاؤں کی ابھری ہوئی ہڈیوں کی وجہ سے وہ ننگے فرش پر نہیں بیٹھ پاتا! بس اتنی سی بات کو ہمارے پیر بھائیوں نے افسانہ بنا دیا۔''

''اچھا! لیکن وہ دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔ آخر کہاں رہتا ہے؟''

''ابھی حاضر کیے دیتا ہوں۔''

غریب قدموں پر آ کر گر پڑے۔ سرکارِ عالی نے سینے سے لگا لیا۔ سینے سے لگاتے وقت ایک غریب کو سلطانِ فیض و

عطا نے جو کچھ عطا فرمایا اسے فوراً دنیا نے دیکھ لیا اور آج سات سو سال سے زیادہ ہوا، دنیا دیکھ رہی ہے۔ سینے سے لگانے کے بعد نئے سرے سے اجازت وخلافت عطا فرمائی۔ کچھ دنوں کے بعد دولت آباد (دکن) کی طرف مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر سلسلۂ عالیہ چشتیہ کو وہ نقطۂ عروج عطا فرمایا کہ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خلقت اس قدر رجوع ہوئی اور ولایت کا آوازہ اس قدر بلند ہوا کہ آپ کے نام پر ُبرہان پور' شہر آباد ہوا۔ جسے مدینۃ الاولیاء، دارالسرور برہان پور شریف بھی کہا جاتا ہے جو مدھیہ پردیش کا ایک عظیم تاریخی شہر ہے۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی داستانیں اس سے وابستہ ہیں۔ اسی لیے اس شہر کی تعمیر وترقی، تنگ نظری وعصبیت کا شکار ہے۔ ورنہ اس کے مقابلے میں کھنڈوہ جو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا، اسے تعمیر ترقی کے آسمان پر پہنچایا جارہا ہے۔ لیکن بے چارہ برہان پور جو ایک عظیم قوم کی داستانِ عظمت وجلال سے منسوب ہے، اس کے ساتھ سوتیلا سلوک برتا جارہا ہے۔ ؎

پڑی ہے لاش تعصب کی دوراہے پہ مگر
اک جنازہ ہے جو قوموں سے اٹھائے نہ بنے

امیر خسرو کون تھے؟:۔ وسطِ ایشیائی ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین سمرقند کے قریب شہر ''کیش'' جو بہت بعد میں شہر ''سبز'' کہلایا۔ جسے امیر تیمور کے شہر سبز سے زیادہ شہرت ملی۔ وہ چنگیزی حملوں کے درمیان وطن سے بے وطن ہو کر بلخ میں آبسا ۱۲۲۰ء میں تاتاریوں کا ایک زبردست لشکر خود چنگیز خاں کی قیادت میں سمرقند و بخارا کو تباہ و برباد کرتا ہوا بلخ کی طرف بڑھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بارہ سو مسجدوں والے اس عظیم اسلامی شہر میں ایک سال بعد کوئی دیا جلانے والا نہیں رہ گیا۔ امیر سیف الدین محمود اپنے قبیلے کی ایک شاخ ''ہزارہ'' کے سردار تھے۔ حملے کے وقت بلخ چھوڑ کر ہندوستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ عالمِ اسلام پر چنگیزی عتاب نے ہندوستان کو پناہ گزینوں کا مسکن بنا دیا تھا۔ ادھر کے اُجڑے ہوئے بہترین شہسواروں، مدبروں دانشوروں اور اصحابِ علم وفضل کے لیے بالغ نظر درویش صفت بادشاہ شمس الدین التمش کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

انھیں پناہ گزینوں میں سیف الدین محمود بھی تھے۔ ابتدائی چند سال معمولی خدمتوں میں گزرے۔ بعد میں انھیں متھرا سے ایٹہ جانے والی شاہراہ پر گنگا کے کنارے پٹیالی عرف مومن آباد قصبے میں ایک چھوٹی سی جاگیر عطا ہوئی۔ سیف الدین محمود کی شادی ایک ہندوستانی امیر عماد الملک کی بیٹی دولت ناز سے ہوئی، چار بچے یعنی ایک بیٹی، تین بیٹے تولد ہوئے۔ یمین الدین محمود ان میں منجھلے تھے جو ۱۲۵۲ء/۶۵۱ھ میں پیدا ہوئے جو اپنے تخلص اور موروثی خطاب ''امیر'' کی بدولت ''امیر خسروؔ'' کہلائے۔ امیر خسرو کی شہرت اتنی ہوئی کہ اصل نام دب گیا۔

اس مختصر توضیح سے معلوم ہوا کہ آپ ہندی الاصل تھے۔ جیسا کہ آپ کا یہ شعر بھی دلالت کرتا ہے ؎

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارد کز عرب گویم سخن

آٹھ سال کی عمر میں پدرِ بزرگوار کی شفقتوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ نانا امیر عماد الملک نے آپ کی خصوصی تربیت و پرورش کی۔ عماد الملک حکومتِ وقت کے چار بڑے ستونوں میں سے ایک تھے۔ ۷۰ رسال عارضِ مما لک (سکریٹری محکمۂ بخشی گری) رہے۔ دو سو ترک غلام، دو دو ہزار پیدل غلام، ہزار سواران کے جھنڈے تلے رہتے تھے۔ پچاس آدمی تو صرف ان کے پاندان، خاصدان پر ملازم تھے۔ بڑے مخیر، سخی حاتم تھے۔ ایسے صاحبِ حشمت و منصب وجاہ کے نواسے یمین الدین خسرو محمود تھے۔

بیس سال سے کم عمر میں انھوں نے ایک دیوان ''تحفہ القاری'' لکھا اور عمر کی بیسویں بہار پر پہنچ کر جب وہ کسب معاش اور فکری روزی میں نکلے تو شاعرانہ شہرت اور ایک بہترین دیوان ان کے ساتھ تھا۔ عملی زندگی میں سب سے پہلے سلطان بلبن کے شاہ خرچ بھتیجے علاء الدین کشلو عرف ملک چھجو کی ملازمت اختیار کی۔ دو برس وہاں رہ سلطان بلبن کے بیٹے بغرا خاں سے شناسائی حاصل کی۔ بغرخاں سامانہ کا حاکم تھا (جسے بعد میں ریاستِ پٹیالہ کہا گیا) امیر خسرو علاء الدین کشلو کی ملازمت چھوڑ کر بغرا خاں کے پاس سامانہ آ گئے۔ ناصر الدین بغرا خاں نے خسرو کو اپنا ندیم بنا لیا۔ یہیں انھوں نے پنجابی زبان سیکھی اور اس کے لوک گیتوں کی لَے ۱۲۷۹ء میں حالات نے انھیں بنگال کے صدر مقام لکھنوتی پہنچا دیا۔ مگر وہاں آپ زیادہ دن نہ رہ سکے، واپس دلی آ گئے۔ سلطان بلبن کے سپہ سالار ولی عہد بیٹے سلطان محمد قا آن سے رابطہ قائم کیا۔ ۱۲۸۰ء میں شہزادے کی خدمت میں ملتان حاضر ہوئے، کلام سُنایا۔ اس قدر پسند کیے گئے اور اس انداز میں پذیرائی ہوئی جو خسرو کے وہم و گمان میں نہ تھی۔

پنجاب، سندھ دونوں کے لیے ملتان فوجی چھاؤنی تھا۔ علماء، شعراء، ادباء، اصفیاء، اتقیاء کا گڑھ۔ اس کے علاوہ عراق، عرب کے موسیقاروں کا جمگھٹا تھا۔ شہزادہ سلطان محمد قا آن ذی علم، صاحبِ فکر و نظر، بہادر، فیاض، شاعری و موسیقی کا دلدادہ، شمشیر و سنان، طاؤس و رباب دونوں میں بے مثل تھا۔ اس کا دربار خسرو کے لیے بہترین تربیت گاہ ثابت ہوا۔ یہیں امیر خسرو نے اپنا دوسرا دیوان ''وسط الحیوۃ'' ترتیب دیا۔ یہیں قول (حدیث) کے عربی لحن کو موسیقی سے جوڑا جسے بعد میں قولِ قلبانہ سے شہرت ملی۔ یہیں عربی اور ترکی سازوں کو پنجاب کے لوگ گیتوں کے لیے استعمال کیا۔ یہیں انھوں نے عربی و فقہ کی تحصیل و تکمیل کی اور بتیس (۳۲) قصیدے سلطان محمد کی شان میں لکھے، جواب تک کسی کے لیے نہیں لکھے تھے۔ پہلی بار انھیں ایک لائق، بہادر، فیاض، سیر چشم، جوہر شناس، قدرداں ممدوح ملا تھا۔ منگولوں کے ساتھ ایک زبردست معرکے میں سلطان محمد شہید ہو گیا۔ خسرو بھی گرفتار ہوئے مگر بہ ہزار خرابئ بسیار وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ واپس دہلی آ گئے۔ کچھ دن وہاں رہ کر ماں اور عزیزوں کے ساتھ اپنے آبائی وطن پٹیالی آ گئے اور وہیں رہنے لگے، مگر دلی کے درباری حالات پر برابر نظر رہی۔ امراء کی سازش، سیاسی داؤں پیچ، حالات کے اتار چڑھاؤ سے برداشتہ خاطر ہو کر امیر علی مرجاندار حاتم خاں سے وابستہ ہو گئے۔ دو سال اودھ میں رہے۔ برج بھاشا، اودھی بول چال، وہاں کی اپنی لوچ دار تہذیب، مخصوص انفرادیت، نفاست، نزاکت تو بہت پسند آئی مگر زیادہ دن دلی سے دور نہ رہ سکے۔

جیسے ہی دلی پہنے، سلطان معزالدین کیقباد نے بلابھیجا۔ خاطر خواہ قدر افزائی کی۔ تین ہزار نو سو چوالیس اشعار پر مشتمل مثنوی ''قران السعد ان'' چھ ماہ کے بعد مکمل کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ مثنوی کئی حیثیتوں سے نہایت ہی اہم ہے۔ باپ بیٹے کی تاریخی ملاقات جو قتل و غارت گری کے بجائے شفقت و محبت میں بدل گئی۔ خسرو اس کے چشم دید گواہ تھے۔ سلطان نے جی کھول کر داد دی۔ خوب انعام و اکرام سے نوازا اور ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا۔

معزالدین کیقباد کے بعد جوڑ توڑ کی سیاست نے عنانِ حکومت جلال الدین خلجی کو دی۔ اس کے مختصر دورِ حکومت میں خسرو مقرب بارگاہِ سلطانی تھے، یہاں تک کہ فوجی مہمات میں بھی ساتھ ساتھ رہتے۔ اس کی جنگی مہموں کی یادگار میں ایک مثنوی ''مفتاح الفتوح'' لکھا۔ سلطان جلال الدین خلجی کا عہد اس حیثیت سے خسرو کے لیے بڑا مبارک رہا کہ اس کے مختصر عہد حکومت میں خسرو کو سلطان الاولیاء کی بارگاہ میں زیادہ سے زیادہ موقع حاضری کا نصیب ہوا اگر چہ حضور محبوبِ الٰہی کی غلامی میں عہدِ طفلی ہی سے آ گئے تھے مگر کسب معاش اور دربار سرکار سے انھیں ایسے مواقع کم میسر ہوئے۔ اسی بادشاہ کے عہد میں آپ نے اپنا سب سے اہم دیوان ''غرۃ الکمال'' اپنے صاحبِ نظر اور بزرگ دوستوں کے مشورے پر ترتیب دیا۔ یہ پہلا دیوان تھا جس میں حمد الٰہی و نعتِ مصطفائی کے بعد بادشاہ کی تعریف سے پہلے اپنے پیر و مرشد سلطان الاولیاء حضرت سیّد نظام الدین محبوبِ الٰہی کی مدح فرمائی۔

۱۶ر رمضان المبارک ۶۹۵ھ بروز بدھ، بوڑھے، نرم رو، نرم خو، کرم کشا، رحمدل، چشم پوش، کشادہ دل، کشادہ مزاج، کشادہ ظرف، خوش مزاج، خوش خصال، خوش اطوار بادشاہ سلطان جلال الدین خلجی کو اس کے سگے داماد، سگے بھتیجے اور پروردۂ نعمت نے دھوکے سے قتل کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

اس نے اپنے پیش رو معزالدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے برعکس بلبن کی سخت گیر، بےلوچ اور غیر شاعرانہ پالیسیوں کو اپنایا اور بیس سال تک بڑی شان و شوکت، بڑے کروفر، بڑے جاہ و جلال اور شاہانہ طمطراق سے حکومت کی اور اپنے عزم و یقین، فاتحانہ حوصلے اور زبردست تسخیری قوت کی بدولت وہ ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا۔

ایسے سخت گیر، کھردرے اور غیر شاعرانہ مزاج رکھنے والے بادشاہ کے یہاں بھی خسرو کا منصب و وظیفہ برقرار رہا۔ اس نے خسرو کو اپنی درباری زینت بنائے رکھا۔ سفر و حضر میں اپنے ساتھ رکھتا۔ اپنے اور سلطان المشائخ کے درمیان انھیں رابطے کی ایک کڑی سمجھتا۔ سلطان الاولیاء کی بارگاہ سے خسرو ہی کے ذریعے رابطہ قائم رکھتا اور ہر کڑے وقت اور کڑی آزمائش میں آپ کی دُعاؤں کا طالب رہتا۔

دورِ علائی آپ کی شاعری کا نقطۂ عروج ہے۔ اس کے عہد میں کئی مثنویاں اور خمسے لکھے۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں اسی عہد یعنی ۱۲۹۹ء کی یادگار ہے۔ عہدِ علائی کو بارہ برس تک پرکھنے کے بعد اپنے قلم کا پہلا نثری سرمایہ ''خزائن الفتوح'' لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ علاء الدین خلجی کے دور کی شمالی و جنوبی فتوحات کی ایسی منہ بولتی تصویر ہے کہ اس کا نام ہی ''تاریخ علائی'' پڑ گیا۔

عہدِ علائی ہی میں آپ نے سلطان المشائخ کے اقوال کو "افضل الفوائد" کے نام سے قلم بند فرمایا۔ جو آج تصوف کی راہ کا سنگِ میل ہے اور نفحات الانس، تاریخِ فرشتہ وغیرہم ہی کی طرح ایک ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ضخیم نثری تصنیف "رسائل الاعجاز" بھی دورِ علائی ہی کی دین ہے۔

پھر ہندوستان کی بساطِ سیاست پر نئی چالیں چلی گئیں۔ ادھر قصرِ ہزار ستون میں علاء الدین نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی، ادھر سازشیوں کی چال نے اس کی مضبوط ترین حکومت کے تانے بانے بکھیر کر رکھ دیئے۔

علاء الدین خلجی کے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لی۔ مگر نوجوان بادشاہ نے عیش وطرب، ظلم و بربریت، سفّاکی وخونریزی، اپنوں کو دشمن بنانے کے علاوہ ایک بے حد طرحدار حسین، رعنا اور خوبصورت، یادو قبیلے کے حسن نامی نوجوان کے ساتھ عشق نہیں، ہوس رانی اور اس کے ساتھ عیش وطرب میں بڑا بدنام ہوا۔ بالآخر ۷/ مئی ۱۳۲۰ء مطابق ۷۲۰ھ جمادی الثانی کی چاندرات کو اپنے اسی شریکِ بزمِ عیش ونشاۃ کے ہاتھ بے دردی سے قتل ہوا۔ خاندانِ علائی کے کمسن بچوں تک کو چُن چُن کر قتل کر دینے کے بعد خسرو خاں کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ پھر تو اضطراب و بے چینی کا ایک نیا دور شروع ہوا، بالآخر تاریخ نے ایک اور کروٹ لی۔ غازی ملک تغلق نے سخت خونریزی کے بعد اسے شکست دے کر قتل کیا اور حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

خسرو اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ دربارِ تغلق کی زینت بن گئے اور وہ بلبلِ ہزار داستان، وہاں بھی نغمہ سنج ہوا۔

تاریخ کا یہ اجمالی پس منظر بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ خسرو کی عظمتوں کے نقطۂ عروج کا پس منظر سمجھ میں آجائے۔ سات بادشاہوں کے درباری شاعر، ان کے مزاج میں اثر و رسوخ رکھنے والے اتنی عظمتوں، رفعتوں اور آفاقی شہرتوں کے حامل خسرو سلطان الاولیاء سرکار محبوبِ الٰہی کے بندۂ بے دام تھے۔

سلطان الاولیاء ہر ایک کو بے حیل وحجت شرفِ بیعت سے نوازتے، دامنِ محبوبیت ہر ایک کے لیے کشادہ تھا۔ سیہ کار، گنہگار، نیکوکار، امیر، غریب، فقیر، رئیس، درویش سب ان کے دامنِ کرم سے وابستہ ہوتے۔ خسرو عشا کی نماز کے بعد حاضرِ بارگاہ ہوتے۔ شہر بھر کی خبریں اور درباری حالات سُناتے۔ اس کے بعد محفلِ سماع منعقد ہوتی، سلطان المشائخ کی طرف مخلوق کا بے پناہ رجوع اور ہر دلعزیزی، حکومت اور بادشاہ سے بے تعلقی، بے نیازی اور حاسدین کی لگائی بجھائی سے غیاث الدین آپ سے بدگمان ہوا۔ ایک بار حکم دیا کہ آپ دربار میں آکر سماع کے متعلق وضاحت کریں۔ علمائے دین کی طرف سے اعتراض ہو رہا ہے۔ آپ اپنے خدام اور رفقاء کے ہمراہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے۔ کتابی علماء اور بادشاہ کو بہ دلائلِ احسن مطمئن کیا۔ بادشاہ نے واپسی کی اجازت میں نہ تو سماع کے متعلق کچھ منع کیا اور نہ ہی کھلی چھوٹ دی مگر اس قدر باوقار و بے نیازانہ انداز میں آپ کا بادشاہ کے دربار سے واپس آنا اسے بہت کھل گیا۔ رفتہ رفتہ یہ نا گواری، سوءِ ظن وحسد کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ بالآخر جلا پا اتنا بڑھا کہ ۱۳۲۴ء میں بنگال کی مہم پر جاتے وقت کہلوا بھیجا کہ میری واپسی تک دلّی چھوڑ دیں۔

اس مہم میں خسرو بھی سلطان کے ہمراہ تھے۔ بنگال سے واپسی میں پھر ایک بار قاصد بھیجا کہ میرے آنے سے پہلے

پہلے دلّی چھوڑ دیں۔ آپ کے خُدّام و اہلِ محبت میں تشویش و اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ مگر آپ بڑے پُرسکون تھے، بڑے اطمینان بھرے لہجے میں فرمایا "ہنوز دلّی دور است" (ابھی دلّی دور ہے) یہ تاریخی جملہ بعد کو کہاوت بن کر آپ کی خدارسیدہ زبان حق ترجمان سے نکلا تھا جو بے ادب، بدنصیب تغلق کی تقدیر بن گیا۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

غیاث الدین تغلق کو دلّی آنا ہی نصیب نہ ہوا۔ ۱۳۲۴ء کی آخری تاریخوں میں دلّی شہر سے باہر بیٹے نے باپ کے استقبال و اعزاز کے لیے ایک لکڑی کا شاندار محل بنوایا۔ سعادت مند بیٹے نے فتح مند باپ کا اسی طرح استقبال کیا۔ باپ نے بیٹے کے دسترخوان پر کھانا کھایا۔ اسی رات محل کی چھت زمین بوس ہوئی۔ غازی ملک تغلق اپنے انجام کو پہنچا۔ اللہ کے ایک برگزیدہ بندے کی دل آزاری کی اسے بڑی قیمت دینی پڑی۔

نہ پوچھ اِن خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

۱۶؍ربیع الثانی ۷۲۵ھ کو سلطان المشائخ سیّدنا سرکار محبوبِ الٰہی نظام الدین اولیاء نے اپنے سب سے زیادہ صاحبِ تقویٰ مرید و خلیفہ حضرت سیّد نصیر الدین چراغ محمود کو خلافت و جانشینی عطا فرما کر داعیٔ اجل کو لبّیک کہا۔ حضرت امیر خسرو اس وقت بادشاہ کے ہمراہ بنگال میں تھے۔ جوں ہی یہ خبر وحشت اثر ان تک پہنچی، حواس باختہ ہوگئے۔ ملازمت سے استعفا دے دیا۔ بھاگم بھاگ دلّی پہنچے، زار و قطار روتے ہوئے یہ کہتے ہوئے کہ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آفتاب زیرِ خاک سو گیا اور خسرو ابھی زندہ ہے۔ سر کو پتھروں سے ٹکراتے رہے۔

اب ہم ہیں اور ماتم ایک شہر آرزو!
ٹوٹا وہ آئینہ کہ جو تمثال دار تھا

یہی کیفیت چھ ماہ تک رہی، نہ کھانے کا ہوش، نہ تن کی خبر۔ دن رات روتے رہتے۔ اکثر رات کو اس قدر پھوٹ پھوٹ کر روتے کہ دیکھنے والوں کو ترس آنے لگتا۔ ٹھیک چھ ماہ بعد اسی دن اسی تاریخ کو قبرِ انور پر سر رکھا، سرد آہ کھینچی، زور سے یہ دوہا کہا۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس　　　چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس

اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔　　جان دی دی ہوئی اسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

پوری دنیا ایسی محبت کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ محبت ہی کی جلوہ آرائی تھی کہ حضرت سلطان الاولیاء فرمایا کرتے تھے جسے میرے قبر پر آنا ہو تو خسرو کی قبر پر حاضری دے۔ سات سو سال سے زائد ہوگئے، یہ رسم جاری ہے۔ عوام و خواص سبھی پہلے خسرو کی بارگاہِ عشق میں حاضری دیتے ہیں۔ اس کے بعد محبوبِ الٰہی کی چوکھٹ کو چومنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

تاریخ فرشتہ کے مطابق: "خسرو جیسا انسان آج تک خاکِ ہند پیدا نہ کرسکی۔"

اے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سستے
جو آگ بجھا دے گی وہ آگ لگائی ہے

سلطان المشائخ، صاحب فیض وعطا، بادشاہِ دین ودنیا، تاجدارِ روحانیت، حضرت خواجہ سید نظام الدین اولیاء بدایونی ثم دہلوی جن کا شہرہ، جن کا غلغلہ، جن کا آوازہ ہر سو، ہر طرف زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا ہے۔

غوث عالم نظام ملت ودین قطب ہفت آسماں وہفت زمین

متحدہ ہندوستان کے جلیل القدر وعالی مرتبت اور کبائر مشائخ کے درمیان آپ کا بہت خاص مقام ومرتبہ ہے۔ جو بہت سارے اولیاء، اقطاب واغواث کو میسر نہیں ہوا۔ ان کی عظمت وجلال پر آج تک انگلی نہیں اُٹھائی جاسکی۔ آپ کی چارہ سازی وفیض رسانی کا سحاب کرم ہے کہ سات سو برس سے برس رہا ہے۔ اور آپ کے فیض وعطا کا دجلہ ہے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ بقول خاقانِ ہند طوطیٔ نغمہ سرا حضرت امیر خسرو

در حجرۂ فقر بادشاہے در عالم دل جہاں پناہے
شہنشاہ بے سریر بے تاج شاہانش بہ خاک پائے محتاج

خود ہی فرماتے ہیں:

در ملک قناعت جہاں سلطانیم کیخسرو بے حاجب و بے دریا نیم
از لذت فاقہ زوقہای گیرم از دولت فقر ملکہا می را نیم

ڈاکٹر اقبال جیسے دیدہ ور نے اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے سفر یورپ پر روانہ ہونے سے پہلے سلطان المشائخ کے قدموں میں کھڑے ہو کر جو التجائے دل پیش کی تھی، اس کی اجابت واثرات کو دنیا نے کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کیا

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا بڑی جناب تیری، فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے قائم ہیں نظام مہر کی صورت نظام ہے
نہاں ہے تیری محبت میں شانِ محبوبی بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا
اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زار تو ام دگر کشادہ جبینم گل بہار تو ام
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں تیری دعا سے عطا ہو وہ نردبان مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو
دلوں کو چاک کرے مثل شانہ جس کا اثر تیری جناب سے ایسی ملے فغاں مجھ کو
وہ شمع بارگہ خاندانِ مرتضوی رہے کا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہوجائے یہ التجائے مسافر قبول ہوجائے

(کلیاتِ اقبال)

مقررین اور خطبائے کرام منقبت کے اس مشہور زمانہ اشعار کو سیرتِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرے میں بیان کرتے ہیں۔ اور حضرت امیر خسرو کی جگہ سید الملائکہ حضرت جبریل امین سے جوڑتے ہیں، اور یہ مروجہ وعظ کی کتابوں میں بھی کہیں کہیں اس کی نسبت رسولِ پاک صاحب لولاک سید الکونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف کردیتے ہیں۔

حالانکہ سلطان الشعرا، خاقانی ہند، امام عشق ومحبت حضرت امیر خسرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک منقبت ہے جسے بڑے والہانہ انداز میں اپنے مرشد کامل سلطان الاولیاء بادشاہِ دین ودنیا حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شان میں عرض کیا ہے ؎

(۱) اے چہرہ زیبا تیرا رقص بتانِ آذری — ہر چند وصفت می کنم زحسن زاں بالا تیری

(۲) آفاقہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام — بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

(۳) تو از پری چابک تری وز برگ گل نازک تری — وز ہر چہ گویم بہتری حقا عجائب دلیری

(۴) من تو شدم تو من شدی من تن شدی تو جاں شدی — تا کس نہ گوید باز ازیں من دیگرم تو دیگری

(۵) خسرو غریب است وگدا افتادہ در شہر شما — باشد کہ از بہر خدا سوئے گریباں بنگری

(۱) اے کہ چہرۂ زیبا بتانِ آزری کے لیے قابل رشک ہے تیری جتنی بھی تعریف کی جائے تو اس سے کہیں زیادہ تر ہے۔

(۲) میں نے دنیا جہاں کی سیر کی ہے اور بہت سارے حسینوں، مہ جبینوں کو دیکھا ہے مگر تو ان سے الگ تھلگ کوئی اور ہی چیز ہے۔

(۳) تو پری سے زیادہ سبک اور برگِ گل سے زیادہ نازک ہے۔ (تیری شان میں) جو کچھ بھی کہوں تو ان سب سے الگ کوئی اور ہی چیز ہے۔

(۴) میں تُو اور تُو میں ہوگیا (یعنی میں تیری ذات بن گیا اور تو میری ذات) میں تن ہوا تو جاں ہوا۔ یعنی محبوب و محبّ (ایک دوجے کے آئینہ بن گئے) اب کوئی یہ نہ کہے کہ میں الگ ہوں اور تو الگ۔

(۵) خسرو تمہارے شہر اجنبی اور گدا بن کر پڑا ہے — خدا کے لیے اجنبیوں پر بھی ایک نظر فرماؤ

(دیوان امیر خسرو، ص۴۵۶ (ردیف یائے تحتانی)

یہ ہے سلطانِ عشق حضرت امیر خسرو کی دیوانگی عشق اور وارفتگی شوق اپنے مرشد کامل حضرت نظام الحق والشرع والدین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے۔ کیا طریقت تمام خانوادوں میں اپنے مرشد سے عشق وعقیدت کی ایسی کوئی دوسری مثال پیش کی جاسکتی ہے؟

سرتو زلب سخن کشادی ہمہ خلق بے زباں شد
تو خرام کار کروی ہمہ دیدہا رواں شد

☑☑☑☑☑☑

وادیِ نور کا سفر

(ایک مقدّس سفر کی سرگزشت)

ہم نے اپنی کتاب ''عربی مدارس اور جدید عصری تقاضے'' میں جنوبی ہند کے دو عظیم دینی اِدارے مرکز الثقافۃ السنیہ (کالی کٹ، کیرالہ) و جامعہ سعدیہ (کاسرگوڈ، کیرالہ) کے ہمہ جہت و عظیم دینی، ملّی و علمی اور ان کے تاریخی کردار و عمل اِجمالی جائزہ لیتے ہوئے اور ان کی حیرت ناک مثالی مرکزیت پر گفتگو کرتے وقت شمالی ہند کے عربی درس گاہوں کی توجہ خاص ان کی طرف مبذول کراتے ہوئے عرض کیا تھا:

''کہ ہم جنوبی ہند کی ان عظیم درس گاہوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکے کہ ہم ان سے ایسے لاتعلق و بے خبر ہیں کہ جیسے ملک کا وہ خوش حال ترین، ترقی و تعلیم یافتہ علاقہ برصغیر ہند کے بجائے کسی دوسرے براعظم میں بسا ہو، ہمیں یورپ و امریکہ و افریقہ کے مذہبی حلقوں اور وہاں کی دینی خدمات کی خبر تو ہے۔۔۔ مگر ہم اپنے ہی ملک میں آباد ایک خطے سے بالکل بے خبر ہیں۔

دیوارِ برلن تو گر گئی مگر نارتھ و ساؤتھ کے درمیان جو دیوارِ چین حائل ہے، اسے ہم ابھی گرا نہ سکے۔''

ان دونوں اِداروں اور ان کی ہمہ جہت دینی و ملی خدمات کو خود تو نہیں دیکھا لیکن ہم نے اپنی کتاب ''عصر جدید کے تقاضے'' میں جو کچھ لکھا ہے، وہ مصدّقہ اطلاعات اور اپنی صحیح معلومات کی بنیاد پر لکھا تھا۔ ہواؤں میں ہم نے کبھی تیر نہیں چلایا۔

خواہش تو تھی اور اب بھی ہے کہ ان اِداروں کو بہت قریب و بہت سکون و اطمینان سے دیکھا جائے۔ جو جنوبی ہند میں شہرستانِ علم و فضل کی شکل میں دین وسنّیت کا وقار و عظمت اور پورے برصغیر ہند میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کا سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہیں۔ فللحمد للّٰہ ربّ العالمین۔

حسنِ اتفاق کہیے کہ وہاں پہنچنے کی ایک سبیل پیدا ہو گئی تھی اور میں کاسرکوڈ پہنچا بھی مگر افسوس ہزار خواہش کے باوجود حالات نے وہاں یعنی جامعہ سعدیہ پہنچنے نہیں دیا ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

اس اجمال کی قدرے تفصیل کچھ یوں ہے۔۔۔

غالباً اگست کے آخری عشرے میں جامعہ سعدیہ اور مرکز الثقافۃ السنیہ کے معتمد علیہ عزیزم مولانا شاہ الحمید صاحب میرے آفس دوٹانکی آفس بمبئی ۸ میں تشریف لائے اور مجھے مرکز الثقافۃ السنیہ الاسلامیہ کے سالانہ اجلاس جو دسمبر ۱۹۹۶ء

کے ۲۰، ۲۱، ۲۲رتاریخ ہور ہے ہیں، اس میں شرکت کی خصوصی دعوت پیش کی۔ عزیزم مولانا موصوف سے یہ میری تیسری ملاقات تھی۔ ایک سال پہلے وہ پہلی بار میرے رفیقِ درس محترم مولانا صوفی غلام حسین قادری نوری شافعی کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ جامعہ سعدیہ کے کیلنڈر پر اردو زبان میں اپیل لکھوانے کے لیے۔ ان کی خصوصی گذارش پر اپیل تو میں نے لکھ دی اور وہ کیلنڈر اسی اپیل کے ساتھ شائع بھی ہوا، لیکن موصوف سے محبّانہ شکوہ یہ ہے کہ خود اپنی لکھی ہوئی اپیل چھپی ہوئی نہیں دیکھ سکا۔ اس بار مرکز الثقافۃ السنیہ الاسلامیہ کے کیلنڈر کے لیے قدرے تفصیلی اپیل لکھوا کر لے گئے ہیں، دیکھیے مرکز الثقافہ کے کیلنڈر کی زیارت بھی ہوتی ہے یا نہیں؟

مولانا نے دسمبر۱۹۹۶ء کے اجلاس کے لیے بصد خلوص اصرار کیا مگر میں نے معذرت پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ ۱۸؍اکتوبر۱۹۹۶ء کو منگلور کے لیے میری فلائٹ ہے ۱۱؍اکتوبر کو حضرت سیدنا مالک بن دینار رضی اللہ عنہ میں میری حاضری کا پروگرام پہلے سے طے ہے، بلکہ ظہر کی نماز میں ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد میں پڑھنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس لیے اتنی جلدی دوسرا سفر شاید نہ کرسکوں۔ اس لیے میں دسمبر۱۹۹۶ء کے سالانہ اجلاس میں شرکت کا وعدہ نہیں کرسکوں گا۔

میرے کاسرگوڈ پہنچنے کی یقینی خبر سے وہ بہت مسرور ہوئے اور عالم سرخوشی میں کہنے لگے: حضرت! ہمارا دوسرا سب سے بڑا دینی ادارہ جامعہ سعدیہ حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ کی درگاہ سے بہت قریب ہے۔ صرف تین یا چار کلومیٹر! تو آپ وہاں ضرور تشریف لائیں بلکہ دوپہر کا کھانا جامعہ سعدیہ میں کھائیں۔ ہم وقت پر حضرت مالک بن دینار میں گاڑی لیے حاضر رہیں گے۔

میں نے کہا: مولانا! دعوت اور حضرت مالک بن دینار میں میرے استقبال کے لیے آپ کی موجودگی یہ تو آپ کے اخلاق واخلاص کا ایک حصہ ہے۔ بالفرض آپ سے میری یہ ملاقات نہ بھی ہوتی اور نہ ہی کاسرگوڈ میرے پہنچے کی اطلاع! تاہم اگر یہ بات مجھے معلوم ہوجاتی کہ میں کیرالہ میں علم وفن کے دوسرے سب سے بڑے مینار جامعہ سعدیہ کے قریب پہنچ چکا ہوں تو اس کے جلوؤں سے دل ونگاہ معمور کرنے میں ازخود پہنچ جاتا۔ ؎

جنوں میں شرط ہے ہر وقت چاک دامانی
نگار موسم گل کا نہ انتظار کرو

انھوں نے کہا: نہیں! مجھے آنا ہی ہے کہ وہاں سے ہمارا مرکز جو کالی کٹ میں ہے، مرکز الثقافۃ السنیہ الاسلامیہ بائی روڈ صرف ۶رگھنٹے کا راستہ ہے۔ لگے ہاتھ اسی سفر میں وہاں لے کر آپ کو پہنچنا ہی ہے۔ پھر موقع ملے نہ ملے۔ اگر آپ اکتوبر۱۹۹۶ء کے سفر میں وہاں پہنچ گئے تو پھر دسمبر کے اجلاس کے لیے اصرار نہیں کروں گا۔

میں نے جامعہ سعدیہ میں حاضری کا حتمی وعدہ کرلیا۔ مگر کالی کٹ کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ میرے پروگرام کا شیڈول پہلے سے بن چکا تھا۔ ۱۲؍اکتوبر کو بذریعہ ہوائی جہاز واپسی بھی کنفرم ہوچکی تھی۔ مولانا نے اصرار کرتے

ہوئے فرمایا کہ کالی کٹ سے ممبئی کے لیے پلین کا ہی انتظام کریں گے۔ مجھے یہاں ممبئی میں آپ کی مصروفیت کا احساس ہے۔ میں نے کہا وعدہ تو نہیں کروں گا مگر وہاں پہنچنے کے بعد وقت وحالات پر منحصر ہے۔ پھر میں نے فون پر اپنے منگلور کے میزبان محترم سید فرید صاحب سے تفصیلی بات کرادی، جس پر وہ مطمئن اور خوش ہو گئے۔

برادرِ دینی محترم سید فرید احمد کوذی انڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ بائیکلہ اور ان کا پورا خانوادہ یعنی برادرِ اکبر محترم سید خلیل و سید محمد ہاشم وسید غیاث وعزیزم سید ناصر صاحبان مجھ سے دیرینہ اخلاص ومحبت رکھتے ہیں۔ میرا اُن کا رشتہ صرف اور صرف دین سنّیت کا ہے۔ ابتدا ہی سے ان سب بھائیوں نے ایک عالمِ دین کی حیثیت سے مجھے جو احترام دیا، اس میں کبھی بھی سرِ مو فرق نہیں آنے دیا۔ نہ میں اُن کا پیر ہوں، نہ پیر زادہ اور نہ اُستاد ہوں اور نہ اُستاد زادہ اور نہ کسی مخصوص نوعیت کا صاحبزادہ۔ میرے اور ان کے درمیان صرف ایک قدر مشترک ہے "وہ ہے دین وسنّیت" اور میرے نزدیک یہی دینی رشتے سب سے زیادہ معتبر ہوتے ہیں۔ خونی رشتے کب دغا دے جائیں، کب بدمذہبیت کا شکار ہو کر **یٰنوح لیس من اھلك** کے مصداق ہو جائیں، کیا ٹھکانہ؟

آج آخر پوری دنیا میں جہاں کہیں مسلمان ظلم وستم کے شکار ہوتے ہیں تو دنیا بھر کے مسلمان بے چین ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ فلسطین ہو یا عراق، بوسنیا ہو یا چچنیا، افغانستان ہو یا کشمیر، یہ بے چینی صرف دینی رشتے کے حوالے سے، ایمان کے رشتے سے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ انما المؤمنون اخوۃ معلوم ہوا کہ دین کا رشتہ سب سے مضبوط رشتہ، ورنہ رشتے دار تو ابولہب بھی تھا، یزید بھی تھا اور عمرو بن سعد بھی!

حسن ز بصرہ بلال از حبش صہیب ز روم
ز خاک مکہ ابو جہل ایں چہ بوالعجبی است

چنانچہ اسی دینی وایمانی رشتے اور دیرینہ اخلاص ومحبت کے پیش نظر محترم سید فرید احمد صاحب نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی عزیزم سید محمد ناصر سلمہٗ کی شادی میں خصوصی شرکت کے لیے اپنے آبائی وطن اسرار الدین کمبل، تعلقہ منگلور چلنے کی دعوت بصد خلوص واصرار پیش کی، تو میں نے اسے مشروط کرتے ہوئے کہا "سُنا ہے کہ آپ کے یہاں سے حضرت سیدنا مالک بن دینار رضی اللہ عنہ کی بارگاہ زیادہ دور نہیں۔ تو اگر آپ مجھے وہاں پہنچانے کا وعدہ کریں تو کمر ہمت کسوں، کہ سفر کرنے سے گھبراتا ہوں۔ اتنی دور تو اُن کی بارگاہِ اقدس میں حاضری کی نیت سے چل سکتا ہوں، تا کہ اتنی دور چلنے کا بھی اجر مل جائے۔" **انما الاعمال بالنیات**۔

انھوں نے بڑی خوشی سے اس کا وعدہ فرمالیا کہ وہاں پہنچانا ہی نہیں بلکہ میں خود لے کر آپ کو چلوں گا۔ یہ ہماری محرومی ہے کہ ابھی تک ہم وہاں حاضر نہیں ہو سکے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ان کی بارگاہ میں میری حاضری ایک عالمِ دین کے ساتھ ہوگی۔ میرے اس مشروط دعوت قبول کرنے سے وہ بہت زیادہ خوش ہوئے۔

۸ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ایک بجے منگلور کے ہوائی اڈے "باجپے" پہنچے۔ اپنے وعدے کے مطابق سید فرید احمد صاحب

اپنے احباب کے ساتھ ہمیں لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ طیارہ ایک گھنٹہ اپنے معمول سے لیٹ پہنچا۔ اپنے اپنے مہمانوں کا استقبال کرنے والا الانتظار اشد من الموت کے مرحلے سے گذر چکے تھے۔ سوا گھنٹے کی کُل مسافت جس میں ایک گھنٹہ تاخیر۔ ٹرینوں کی طرح جب ایک ایک گھنٹہ طیارے لیٹ ہونے لگیں تو پھر کیا پوچھنا اور یہ بے قاعدگی صرف انڈین ایئرلائنز میں ہوتی ہے۔ پرائیویٹ ائربسوں میں تو اتفاقی حادثے کے طور پر خلافِ معمول وخلافِ وقت پروازیں ہوتی ہیں۔ جیسے ایسٹ ویسٹ، دمانیہ، جیٹ ائرلائنز وغیرہ کہ یہ اپنے مسافروں کو صحیح وقت پر لے کر اُڑتی ہیں، لیکن ہمارے اس عظیم ملک کی سرکاری مشنریاں اپنی انھیں حسب معمول کوتاہیوں کی وجہ سے امتیازی شان رکھتی ہیں۔ ہمارے اس ملک میں سیاسی سطح پر غلطیاں، گھپلے یا نظامِ حکومت میں خامیاں، کوتاہیاں چھوٹی چھوٹی نہیں ہوتیں کہ اس سے ملک کی بڑائی میں فرق پڑتا ہے۔ مہنگائی بھی بڑھانے کے لیے پہلے اربابِ اقتدار اس بات کا اندازہ لگاتے ہیں کہ مہنگائی بھی اتنی ہی بڑی ہونی چاہیے کہ جتنا بڑا یہ ملک ہے۔ اسی طرح سیاسی سطح پر اگر عوام کو لوٹا جاتا ہے تو یہ ڈاکہ زنی معمولی درجے کی اور معمولی لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ اس غیر معمولی ملک کے غیر معمولی لوگوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ ملکی سطح پر بدنظمی وبدانتظامی ہی اس وقت ہمارے اس عظیم الشان ملک کی پہچان ہے۔ چونکہ پلین کا سفر سب سے زیادہ مہنگا ہے اور دن بہ دن مہنگا ہوتا جارہا ہے۔ حالانکہ پلین میں صرف آسودہ حال ہی سفر نہیں کرتے بلکہ متوسط درجے کے لوگ بھی حالات سے مجبور ہوکر سفر کرتے ہیں۔ اس لیے پلین کا کرایہ جست لگا لگا کر بڑھنا نہیں چاہیے۔ اندرونِ ملک تو اس سفید ہاتھی سے سابقہ آئے دن پڑتا رہتا ہے، مگر ہمیں نہیں یاد پڑتا ہے کہ انڈین ایئرلائنز نے کبھی صحیح وقت پر اُڑان بھری ہو۔ اور اب تو ان کی سروس بھی پرائیویٹ کمپنی کے مقابلے میں ناقص ہوچکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پرائیویٹ ائربسوں میں جگہ نہیں ملتی، تبھی آدمی انڈین ائرلائن میں آکر پھنستا ہے۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر ہم ہوائی اڈے سے سید فرید صاحب کے مکان کنی کمبل پہنچ گئے۔ جدید اور عصری ضرورتوں سے آراستہ ایک وسیع وعریض اور خوب صورت بنگلہ جس کے ہر زاویے سے امارت وخوش حالی نمایاں تھی۔

فلحمد للہ علی نعمائلہ الکاملۃ۔

اسرارالدین سُنّی حنفی مسجد:۔

اسی دن دوپہر کے کھانے کے بعد میں دارالعلوم حنفیہ رضویہ قلابہ ممبئی کے سند یافتہ حافظ وقاری محترم عبدالغنی صاحب رضوی (خطیب امام اسرارالدین سُنّی حنفی مسجد کنی گمبا پوسٹ، کنی کمبل) اپنے چند حافظ وقاری ساتھیوں کے ساتھ ملے اور کھانے کے فوراً بعد یہ لوگ مجھے اپنی مسجد لے گئے کہ یہاں شادی کے گھر کی بہ نسبت کافی سکون بھی رہے گا، آرام بھی اور ہم لوگوں کو استفادہ کا موقع بھی ملے گا۔ امام صاحب نے میری آمد پر بہت زیادہ مسرّت کا اظہار کیا اور بڑا ہی پُرخلوص تعاون پیش کیا۔ میں کئی دنوں تک وہاں رہا اور بار بار اس مسجد میں نماز پڑھی اور پڑھائی بھی۔ میں جب بھی حاضر ہوتا، امام صاحب اس حد تک احترام واہتمام فرماتے کہ میزبانی ناز برداری کی حدوں میں داخل ہوجاتی۔ مولی عزوجل اپنے حبیب پاک

ﷺ کے صدقے انھیں اس حسنِ خدمت وسعادت کا صلہ عطا فرمائے۔

کنی گمبا ایک دیہاتی قصبے کا ایک اہم چوراہا ہے، جہاں سے مختلف شہروں کی طرف روڈ نکلتے ہیں۔ وہاں دور، دور تک کوئی مسجد نہیں تھی۔ عام طور پر اس بازار میں کام کرنے والوں کی ظہر وعصر کی نمازیں قضا ہو جاتی تھیں۔ بے شک یہ مسجد وہاں کے مسلمانوں کی ایک شدید دینی ضرورت تھی، جسے سید فرید احمد وسید خلیل وسید محمد ہاشم وسید غیاث وسید ناصر صاحبان نے اپنے صرفِ خاص سے زمین خرید کر بنوایا۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزا فی الدارین**۔ البتہ مسجد سے متصل ہی ایک ایکڑ زمین لب روڈ دینی مدرسہ قائم کرنے کی نیت سے جو خریدی گئی ہے، وہ سید فرید صاحب نے اپنے متعلقین واہلِ محبت و دیگر اہلِ خیر مسلمانوں کے خصوصی تعاون سے خریدی ہے۔ اور وہاں پر صاحبِ حیثیت واہلِ خیر مسلمانوں کے خصوصی تعاون سے سید فرید وبرادران نے ایک بڑا دینی اِدارہ قائم کرنے کے لیے کمر ہمت کس لی ہے۔ وہاں زمین بہت مہنگی ہے۔ انھوں نے مجھے یہ خوش خبری سنائی ہے کہ حضرت! اب ہم مسجد سے فارغ ہو گئے ہیں۔ اب ہم جلد ایک منفرد بڑے دینی ادارے کی طرف متوجہ ہوں گے۔ پہلے قدم کے طور پر زمین جو سب سے اہم مسئلہ تھا، وہ ہم نے حاصل کر لی۔ ایک ایکڑ زمین! اس علاقے میں دینی اداروں کی بڑی کمی ہے۔ اگر کہیں کچھ ہے بھی تو صرف مکتب یا مکتب نما۔ میں یہاں بمبئی میں بار بار انھیں ایک قابل ذکر ومثالی ادارہ قائم کرنے کی ترغیب دیتا رہا۔ کہ آپ لوگ صاحبِ حیثیت وصاحبِ وسائل ہیں۔ چاہیں تو بڑے پیمانے پر ایک دینی ادارہ قائم کر سکتے ہیں۔ دین وسنیت کی مؤثر خدمات میں دینی اداروں کا کردار ہمیشہ بڑا کلیدی اہمیت کا حامل رہا ہے۔

مسجد اور اس سے ملی ہوئی زمین وہ بھی لب روڈ اسے دیکھ کر بڑی مسرّت ہوئی، اس کا محل وقوع بہت شاندار ہے۔ وہ مسجد سطح زمین سے کافی بلندی پر پہاڑ کھود کر بنائی گئی ہے۔ بمبئی کی طرح نمازیوں کے لیے تمام سہولتیں وضو وطہارت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس مسجد میں امام ومؤذن کے لیے دو فلیٹ بھی بنائے گئے ہیں کہ وہ اپنی فیملی کے ساتھ بہت سکون و اطمینان کے ساتھ رہ سکیں اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ بمبئی جیسے عظیم شہر میں بھی یہ سہولت نہیں ہے حالانکہ بمبئی جیسے شہروں کی مساجد میں امام کے لیے فیملی روم ضرور ہونا چاہیے۔ کاش! ٹرسٹیانِ مساجد اس طرف توجہ کر سکیں۔ مسجد سے باہر نکلتے ہی جانبِ مشرق پہاڑوں، کوہ ساروں اور سبز پوش وادیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دور دور تک خوب صورت قدرتی مناظر جنھیں دیکھ کر دل ونگاہ مسرت وشادمانی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔ نیچے کافی گہری وادیوں میں ناریل وسُپاری کے درختوں کے جھنڈ اور ان کے گرد پھیلے ہوئے سبز پوش پہاڑیوں کا حسن قابلِ دید ہوتا ہے۔

اسی دن ۸/ نومبر کو بعد نمازِ عصر مسجد کے امام محترم حافظ عبد الغنی صاحب نے کہا، حضرت اس علاقے کے ایک بزرگ جن کے نام پر یہ پوری آبادی ہے۔ اور جو اس پورے علاقے کے نسلاً بعد نسل مرکزِ عقیدت ہیں۔ حضرت سیدنا اسرار الدین کمبل علیہ الرحمہ۔ کیا وہاں فاتحہ خوانی وحاضری کے لیے چلیں گے؟

میں نے کہا: اللہ آپ کو جزائے خیر دے، اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ ان کا تذکرہ تو بہت دنوں سے میں سُن

رہا ہوں۔

چنانچہ ہم لوگ وہیں سے آٹو رکشہ کے ذریعے ان کے مزار شریف پر حاضر ہوئے۔ حضرت سید اسرار الدین کمبل علیہ الرحمہ اب سے تقریباً چار صدی پیش تر بیجا پور سے یہاں تشریف لائے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ کے بزرگوں میں سے ہیں۔ صرف چند واسطوں سے آپ کا مبارک سلسلہ حضرت سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی سے جا ملتا ہے۔ بیجا پور سے آتے وقت آپ کے ساتھ آپ کے ایک شاگرد اور ایک اہلِ محبت مرزا صاحب تھے۔ آج یہ آبادی جو ایک سوا ایکڑ میں پھیلی ہوئی تین ہزار لوگوں پر مشتمل ہے، جو اسرار الدین کمبل کے نام سے موسوم ہے۔ آپ کی آمد سے پہلے اس کا نام ''بلنگل گڈے'' تھا، یعنی جنگل و بیابان، یہ سات شیطانوں کی بستی تھی۔ اس علاقے سے گذرتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے اور اس سے دور ہی دور رہتے تھے۔ جنگل و پہاڑ سے گھری ہوئی شیطانوں کی بستی ہی کو آپ نے اپنے قیام کے لیے منتخب فرمایا۔ بے شک اللہ والے جنگل کو منگل، ویرانے کو آباد اور خرابے کو شاد آباد کر دیتے ہیں۔

اسرار الاولیاء حضرت سید اسرار الدین علیہ الرحمہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس جنگل و پہاڑیوں سے گھری ہوئی شیطانوں کی اس بستی کو اللہ کے بندوں سے آباد کرنے کا عزم کر لیا۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و عنایات سے آپ نے ان شیطانوں پر قابو پایا۔ چھ ۶ شیطانوں کو ختم اور ایک کو وہاں مقامی لوگوں کی خدمت اور بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانے پر مامور کیا، جو آج بھی بحسن و خوبی اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ آج بھی اس بستی میں اگر کوئی اجنبی یا مہمان اپنی منزل کا راستہ بھول جاتا ہے تو آس پاس کہیں سے ایک آدمی نمودار ہوگا اور اسے اس کی مطلوبہ جگہ پر پہنچا کر ہٹ جائے گا۔ یعنی نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔

اسرار الدین کمبل شریف:

اس بستی کا نام اسرار الدین کمبل شریف ہے۔ غیر مسلم حضرات بھی آپ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور ہیں اس لیے وہ ان کو گرو کمبل کہتے ہیں۔ اسرار الدین کمبل پوسٹ کنی کمبل تعلقہ منگلور، کرناٹک کا مشہور شہر جو ساحل سمندر پر آباد ہے۔ جہاں بندرگاہ بھی ہے یعنی منگلور وہاں سے صرف ۱۸ ر کلومیٹر دور ہے۔

کمبل کی وجہ تسمیہ:

آپ کا پورا نام تو محمد اسرار الدین ہے۔ اس نام کے ساتھ کمبل کا اضافہ یہیں آ کر ہوا۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ یہاں آئے تو آپ کے پاس ایک کمبل تھا۔ جس کو آپ بچھا کر اسی پر آرام کرتے تھے۔ اس علاقے کی حکمراں رانی نگر چنم کا ایک لڑکا سالوں سے بیمار تھا۔ ہر طرح کا علاج کرا کے مایوس ہو چکی تھی۔ اس نے جب سنا کہ میری ریاست میں ایک مسلمان فقیر آیا ہے جس کی دعاؤں سے مریض اچھے ہو جاتے ہیں، تو اسے اپنے بیٹے کے لیے اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ چنانچہ وہ خود ہی اپنے بیٹے کو لے کر فقیر کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بڑے مؤدبانہ انداز میں دعا کی طالب ہوئی۔ آپ نے ایک بوتل پانی میں کچھ پڑھ کر دَم کیا اور فرمایا: اسے پلاتے رہو۔ دعا کا پانی پینے سے رانی کا لڑکا ایک ہفتے کے اندر ہی اندر

مکمل طور سے شفایاب وصحت مند ہو گیا ؎

نہ دیکھ ان خرقہ پوشوں کو، اِرادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

رانی بہت خوش ہوئی، شکر گزاری وخوش نودی کے لیے کچھ گراں قدر تحفے ونذر دینی چاہی مگر آپ نے کچھ قبول نہیں کیا۔ اس کے اصرار پیہم پر آپ نے فرمایا: اچھا یہ ہمارا کمبل ہے، یہ جہاں تک پہنچے اتنی جگہ مجھے قیمتاً دے دو۔ چنانچہ آپ کے کمبل کا اون نکال کر اسے پھیلایا گیا تو وہ ایک سوا ایکڑ کے رقبے تک پہنچ گیا۔ اتنی زمین رانی نے تحفتاً دینی چاہی مگر آپ نے قیمت دینے پر اصرار کیا۔ بالآخر حضرت کی خوشی کی خاطر اُس نے کچھ رقم لے کر وہ ایک سوا ایکڑ زمین تانبے کے پتر پر لکھ کر دے دی۔ تانبے کا وہ پتہ آج بھی حکومت کرناٹک کی تحویل میں ہے۔ اسی ایک سوا ایکڑ زمین پر آپ کا مزار شریف، مدرسہ، مسجد اور آپ کے عقیدت مندوں کی نسلیں (جو اَب تین ہزار تک پہنچ گئی ہیں) آباد ہیں۔ بڑے سکون واطمینان کے ساتھ ہر خوف وخطر سے بے نیاز ہو کر گویا کہ وہ پوری آبادی اپنے آپ کو حضرت سید اسرار الدین کمبل علیہ الرحمہ کی پناہ میں سمجھتی ہے ؎

نہ تخت وتاج میں نے لشکر وسپاہ میں ہے — جو بات مردِ قلندر کی اِک نگاہ میں ہے

گاؤں واہلِ محلہ ہی نہیں، وہ پورا علاقہ حضرت اسرار الاولیاء قدس سرہٗ العزیز سے بڑی عقیدت رکھتا ہے۔ اپنے وطن سے دور وہ جہاں بھی رہے، اپنی عقیدت کا چراغ دلوں میں جلائے رہے۔ خود یہاں بمبئی میں ان کے اہلِ محبت نے کئی یادگاریں ان کے نام سے قائم کر رکھی ہیں: (۱) محفل اسرار الدین کمبل (۲) اسرار الدین ایجوکیشن سوسائٹی رجسٹرڈ (۳) جمعیۃ اسرار الدین کمبل۔ ان کے نام اور ان کی یاد میں یہ تین ادارے صرف بمبئی میں ہیں۔ اور اپنے وطن اسرار الدین کمبل تعلقہ منگلور میں تو کئی مساجد، درگاہیں واِدارے ان کے نام سے منسوب ہیں۔ (۱) درگاہ وجامع مسجد اسرار الدین کمبل (۲) اسرار الدین سُنّی حنفی مسجد، کنی گمبا (۳) دار العلوم اسرار الدین کمبل (۴) اسرار الدین گوڈا اردو اسکول (۵) اسرار الدین اردو ہائی اسکول (۶) اسرار الدین ہنڈی کرافٹ ونرسری کلاسیس وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو ان کی عقیدت ویاد کی اجتماعی شکلیں ہیں، انفرادی طور پر بھی اہلِ عقیدت اپنے تجارتی فرموں کے نام حضرت اسرار الاولیاء کے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے اسرار الدین الیکٹرکس، اسرار الدین فرنیچرس، اسرار الدین ٹیلرس وغیرہ۔ وہاں کے لوگوں میں یہ ان سے عقیدت کی انفرادی جھلکیاں ہیں۔ حضرت کا عرس ہمیشہ بڑی پابندی کے ساتھ ۲۳ر شوال المکرم کو منایا جاتا ہے، بڑے ہی تزک واہتمام کے ساتھ۔

حضرت کا روحانی تصرّف:

تقریباً چار صدی ہونے کو آئے، اتنی بڑی آبادی میں صرف مسلمان آباد ہیں۔ غیر مسلموں کے صرف دو گھر ہیں برائے نام، آج تک تیسرا نہ ہو سکا۔ انھیں کسی نے روکا نہیں اور نہ وہاں انھیں بسنے کی کوئی ممانعت ہے۔ اور نہ وہاں

مسلمانوں کی ایسی کوئی مونو پولی ہے۔ سندھیوں، گجراتیوں، پارسیوں اور جینیوں کی طرح کہ وہاں ان کی برادری کے سوا دوسرا نہیں رہ سکتا، خاص کر مسلمان! ایسی کوئی بات یہاں نہیں۔ غیر مسلموں نے بہت بار حوصلہ آزمایا وہاں سکونت اختیار کرنے کے لیے مگر وہ خود ہی نہیں رہ سکے۔ بھلا ایسی جگہ کون نہیں رہنا چاہے گا جو محل وقوع کے اعتبار سے بہت پُر امن، بہت پُر سکون، بہت ہی سر سبز و شاداب ہو، جسے دیکھ کر کسی ہل اسٹیشن کا گمان ہو۔ بارہا ایسا ہوا کہ غیر مسلم حضرات خوشی سے آئے، گھر بنائے، بس ایک رات رہے، دوسری صبح بڑی خاموشی کے ساتھ کوچ کر گئے۔ اللہ اللہ! یہ کیسا اسرار ہے۔ کیسی روحانیت اور کیسا تصرف ہے؟ خدا کے ایک پُر اسرار بندے کا۔

الٰہی یہ تیرے پُر اسرار بندے — ہے بخشا جنھیں تو نے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے ہیں کوہ و صحرا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

ایک صاحبِ کرامت بزرگ:

اسرار الاولیاء حضرت سید اسرار الدین کمبل ایک صاحبِ تصرف و صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ آپ کے عقیدت مندوں و اہلِ محبت نے ان کے نام سے چھوٹی بڑی اتنی یادگاریں قائم کر ڈالیں مگر ان کی حیات و خدمات پر باقاعدہ اب تک کوئی کتاب نہ پیش کر سکے۔ میں کئی بار سید فرید صاحب کو کچوکے لگا چکا ہوں کہ اتنے بڑے صاحبِ نسبت و صاحبِ فیض بزرگ اور ان کی ولایت کی خوشبو کو آپ لوگ اپنے علاقے سے باہر نکلنے نہیں دینا چاہتے ہیں۔ آہ! کیسے کیسے عظیم المرتبت بزرگانِ دین ہیں کہ مقامی آبادی ان کارناموں اور تذکرۂ محبت کو نسلاً بعد نسل، سینہ بہ سینہ بڑی دیانت داری کے ساتھ ایک امانت کی طرح محفوظ کیے ہوئے ہیں، مگر ترقی کے اس دور میں بھی ان کے تذکروں کو کاغذ پر منتقل کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینے کی سنجیدہ کوشش اب تک نہیں ہو سکی۔ خیر وہ تو ایک دیہات ہے، ترقی یافتہ ہی سہی مگر وہ بمبئی تو نہیں۔ یہاں بمبئی کے مشہور ترین بزرگوں اور یہاں کی مشہور ترین درگاہوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ آپ حاجی علی، حاجی ملنگ، شیخ مصری، حضرت بابا بہاء الدین وغیرہ کے بارے میں یہی بتا دیا جائے کہ وہ کون تھے؟ کہاں سے آئے؟ اسلام کی کیا خدمات انجام دیں؟ ان کے علاوہ بمبئی و مضافاتِ بمبئی میں ایک درجن سے زائد معروف درگاہیں اور اولیاء اللہ کے آستانے ہیں، جہاں بے شمار بندگانِ خدا کی حاضری ہوتی ہے اور ان کی حاضری کے سبب بے پناہ و بے تحاشا روپے کا مُن برستا ہے۔ مگر ان درگاہوں میں آئے ہوئے بے پناہ لاکھوں کروڑوں روپے کہاں جاتے ہیں؟ کس مد میں خرچ ہوتا ہے؟ اس روپے سے عوامی فیض رسانی کی کیا شکلیں ہیں اور اگر کہیں کچھ ہے بھی تو آمدنی کے مقابلے میں اس کی حیثیت اونٹ کے منہ میں زیرہ کی ہے۔ اور ان درگاہوں کی لاکھوں، کروڑوں کی آمدنیوں پر بہت کھل کر گفتگو آگے کریں گے۔ ابھی تو ان کے ذمے داران اور ان لاکھوں، کروڑوں روپے کی آمدنیوں کے مالک حضرات عوام کو یہی بتا دیں کہ یہ بزرگانِ دین کون تھے؟ صرف مخدوم مہائمی پر چند سال پیشتر تک قصۂ گل بکاؤلی کے طرز پر ایک سڑک چھاپ چند ورقی کرامت نامہ کے علاوہ اور کیا تھا؟ چند برس پہلے پرواز اصلاحی صاحب نے مخدوم مہائمی کے عنوان سے آنسو پونچھنے کی ایک سعیٔ مشکور کی تھی۔ ان کے

علاوہ اور اتنی بہت ساری مشہور درگاہوں واصحابِ درگاہ کے بارے میں عوام تو الگ، خواص ہی کیا جانتے ہیں؟

کرامت:

اللہ والوں کے لیے کرامت اتنی بڑی حیثیت نہیں رکھتی، جتنی بڑی حیثیت استقامت کی ہے۔ دین پر استقامت تو ایک بڑی کرامت ہے۔ اور اس دورِ بے دینی میں تو استقامت وتصلب فی الدین الحب فی اللہ والبغض فی اللہ سب سے بڑی کرامت ہے۔ پھر مختلف ادوار میں بزرگانِ دین سے کرامتوں کا ظہور ہوا اور وہ بھی زمانے کے حالات و تقاضے کے مطابق دینی ضرورتوں کے لیے۔

اسی طرح اسرار الاولیاء حضرت سید اسرار الدین کمبل سے کرامتوں کا ظہور ہوا۔ مقامی اہلِ عقیدت کے سینوں میں پوری محبت واحترام کے ساتھ ان کی عظمتوں وکرامتوں کی قندیل روشن ہے۔ وہابیت ودیوبندیت، غیر مقلدیت کی شکل میں سعودی پٹروڈالر کی بدولت آج گمراہی وبے دینی وبدعقیدگی کا جو سیلاب آیا ہوا ہے، ایسے عالم میں بزرگانِ دین کی حیات و خدمات، ان کے فیوض، باطنی تصرفات وکرامات کو عالم آشکارا کرنے کی ضرورت شدید ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ مسلمانوں کو جب تک اسلاف وبزرگانِ دین سے منحرف اور ان کی بارگاہ سے وابستگی کو یہ نہیں ختم کر پاتے ہیں، ان کا کوئی داؤ کارگر نہیں ہوتا ہے۔

ان منکرین اولیاء اور ابلیس کے ان بھائی بندوں کا سب سے زیادہ زور اولیاء کرام کی بارگاہ سے مسلمانوں کو بدعقیدہ کرنا ہے۔ کیوں کہ جب تک وہ کسی اللہ والے کی پناہ میں ہیں محفوظ ہیں اور جیسے ہی ان کی عقیدت ومحبت کے دائرے سے باہر نکلے، شیطان نے اپنا جال ڈال دیا۔ بے شک بزرگانِ دین اولیاء اللہ کے تذکروں کا ان کی روحانیت وفیوضِ باطنی کی اشاعت دینی ضرورتوں میں سے ہے۔

آپ کی ایک بڑی مشہور کرامت ہے کہ آپ یعنی سید اسرار الدین کمبل کے ایک دوست کا منگلور میں وصال ہو گیا۔ خبر پاکر آپ وہاں تشریف لے گئے۔ دوست کو جب کفن پہنایا گیا تو آپ بھی اسی کے ساتھ کفن اوڑھ کر لیٹ گئے۔ چونکہ لوگوں کی نگاہوں میں آپ ایک مقدس وبرگزیدہ شخصیت تھے، اس لیے کسی نے منع تو نہیں کیا البتہ حیران ضرور ہوئے۔ لوگوں نے معلوم کرنے کی کوشش کی مگر آپ ٹال گئے۔ زیادہ اصرار پر فرمایا: یہ میرے اور میرے دوست کا معاملہ ہے۔ پھر آپ کے دوست کو سمندر کے کنارے دفنایا گیا۔ تدفین سے فراغت کے بعد آپ نے وہیں سمندر کے پانی پر اپنا مصلیٰ بچھایا اور نماز پڑھنے لگے۔ جوں ہی سجدے میں گئے تو نگاہوں نے آپ کو سمندر میں ڈوبتے دیکھا۔ مگر جب کافی دیر ہوئی اور آپ سطحِ آب پر نہیں اُبھرے تو لوگوں کو فکر وتشویش ہوئی اور جب رات کا اندھیرا بھی پھیل گیا تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ آپ سمندر میں ڈوب گئے۔ لوگ سخت ملول ہوئے۔ اس زمانے میں منکرین اولیاء وہابی دیوبندی بدعتی بدعقیدہ لوگ تو تھے نہیں کہ استہزا کرتے۔ لوگ حقیقت میں دُکھی ہوئے اور حضرت کو صبر کر لیا۔

لیکن اسرار الاولیاء ڈوبے نہیں تھے بلکہ منگلور کے سمندر میں غوطہ لگا کر اندر ہی اندر وہاں سے بہت دور کنّا نور (کیرالہ)

میں نکلے۔ وہاں ایک روز فجر کی نماز کے لیے پھوس اور چھپر کی ایک مسجد میں گئے۔ مسجد میں موجود ایک شخص سے اذان دینے کے لیے کہا۔ وہ شخص پیدائشی گونگا تھا۔ اُس نے اشاروں سے اپنی کیفیت بتائی کہ میں اذان نہیں دے سکتا۔ آپ نے بہت زور سے ایک طمانچہ اس گونگے کو مارتے ہوئے حکم دیا: اذان پڑھ۔ طمانچہ مارنا تھا کہ اس کو فوراً قوتِ گویائی مل گئی۔ اللہ کے کرم، اس کی مشیت سے ایک پیدائشی گونگے کو نہ صرف زبان ملی بلکہ آواز کو خوش الحانی اور سوز و گداز بھی عطا ہوئی ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

من كان لله كان الله له. جو بندہ اپنے وجود کی نفی کر کے خدا کی طاعت، محبت میں گم ہو گیا تو (پھر) اللہ تعالیٰ اُس کا ہو گیا، تو اس کی شان کچھ یوں ہو جاتی ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس کی بے کمالی اس درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے کہ اس کے لیے یوں فرمایا جاتا ہے: كنت سمعه الذى يسمع و بصره الذى يبصر به و يده التى يبطش بها الله۔ اللہ یہ نوازش، یہ عطا، یہ بلندی، یہ مرتبہ، یہ اعزاز اور یہ اِکرام کہ خود اس کا رب فرمائے کہ میں اُس بندے کا کان ہو جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے۔ اس بندے کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اپنے اس پیارے بندے کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ بے شک یہی وہ لوگ جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ؎

ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

زبان ملنے کے صلے میں جذبۂ تشکر میں ڈوب کر پوری خوش الحانی کے ساتھ اس گونگے نے اللہ اکبر! اللہ اکبر! کی صدائے زمزمۂ نور بلند کی، تو جیسے اس صدا کی لرزش نے فضا کی ہر لرزش کو چھین لیا ہو۔ صبح کے سکوت و سنّاٹے میں جیسے ہی اذان کی آواز گونجی، سننے والے چونک پڑے کہ آخر کس نے آج یہ ملکوتی نغمہ چھیڑا۔ جس نے ان کے ایمان کو حلاوت کی نئی چاشنی عطا کر دی۔ اس اذان نے نمازیوں کو جلد ہی مسجد میں پہنچا دیا۔ آنے والوں کو حیرت بھی تھی اور تجسّس بھی کہ آخر اتنی پیاری مدھر آواز میں کس نے انھیں خدا کی طرف بلایا۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ آج جنم جنم کے گونگے نے اذان دی ہے تو وہ سراپا حیرت بن گئے کہ یہ انہونی ہوئی کیوں کر؟ اور جب اس گونگے نے صورتِ حال بتاتے ہوئے کہا کہ یہ انہونی اسی ایک طمانچے کی برکت و کرامت ہے، تو لوگوں نے حسرت و اشتیاق سے اس خدا رسیدہ بندے کو پوچھنا شروع کیا۔ گونگے نے بتایا کہ وہ نماز میں سب سے آخری صف میں تھے مگر نماز ختم ہوتے ہی وہ فوراً باہر نکل گئے۔ بے شک اللہ کا ولی کبھی اپنی نمائش نہیں کراتا اور جب خدا کی کوئی مشیت انہونی بن کر اس کے ہاتھوں پر ظاہر ہو جاتی ہے تو علی العموم وہ فوراً وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔ بخلاف اس نمائشی بزرگ کے جسے بندے بزرگ بتاتے ہیں۔ جو پیراں نمی پرند مریداں پرانند کے مصداق ہوتے ہیں۔ ظاہری نمود ہی ان کی پونجی ہوتی ہے اور نمائش ہی ان کا سرمایہ اور جب یہ مسلمانوں کی سادہ لوح جبینِ عقیدت پر اپنی بزرگی کا قطب مینار نصب کرتے ہیں تو اہلِ نظر و دیدہ و بینا رکھنے والے حیرت سے صرف دیکھتے ہی رہ

جاتے ہیں یا ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

الٰہی یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ادھر آپ کے مریدین و اہلِ عقیدت آپ کو جاں بحق سمجھ کر آپ کے چہلم کی تقریب منعقد کرنے کے لیے ٹھیک چالیسویں دن جب ایصالِ ثواب ومجلس فاتحہ خوانی آراستہ کر رہے تھے، تو اسی وقت آپ جھولی لٹکائے نمودار ہوئے۔ لوگ حیرت ومسرت سے چیخ پڑے اور پھر وہ محفل چہلم جشنِ مسرت میں بدل گئی۔

رانی نگر چنما نے عقیدت سے آپ کی سواری کے لیے ایک ہاتھی نذر پیش کیا تھا۔ حضرت اسرار الاولیاء اسے ایک درخت سے باندھ دیا کرتے تھے۔ بتدریج اس درخت نے ہاتھی کی شکل اختیار کرلی۔ وہ درخت آپ کے بعد بھی کئی سو سال تک قائم رہا۔ لوگ جب زیارت وفاتحہ کے لیے درگارہ شریف حاضر ہوتے تو خدا کی قدرت کو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ ابھی پچھلے پچیس برس پہلے تک وہ درخت موجود تھا۔ اس کی عمر تقریباً چار سو سال تھی۔ ابھی پچیس سال پہلے سوکھ کر ختم ہو گیا۔ بے شک وہ درخت ان کی عقیدت اور حضرت کے تصرفات کی یاد دلاتا تھا۔ آپ کا وصال ۱۴؍رمضان المبارک کو ہوا، مگر عرس اسی چالیسویں دن ہی منایا جاتا ہے یعنی جس دن آپ اچانک نمودار ہوئے تھے۔ ۲۳؍شوال المکرم کو۔ آپ کی صرف ایک صاحب زادی تھی۔ برادرِ دینی محترم سید فرید اور ان کا خاندان انھیں صاحب زادی صاحبہ کی پاکیزہ نسل سے ہیں۔ ننہیالی رشتے سے گویا حضرت سید اسرار الدین علیہ الرحمۃ والرضوانُ سید فرید اور ان کے خاندان کے جدِّ کریم تھے۔ دولت و عزت ونیک نامی کے ساتھ پورے خاندان پر دین وسنّیت کا غلبہ اسی پاکیزہ خون کی برکتیں ہیں۔ اس پورے علاقے میں سید فرید وسید خلیل وبرادرانِ دین وسنیت کے لیے نشانِ نصرت ہیں۔ اللھم زدفزد۔

حضرت اسرار الاولیاء کے درگاہ کی تولیت وخدمت آج بھی انھیں لوگوں کے ذمے ہے۔

ایک مثالی شادی:

اسلام نے شادی کو عبادات میں شامل کیا ہے یعنی نکاح بھی ایک عبادت ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے کیمیائے سعادت کے باب النکاح میں اس پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ لیکن آج علی العموم مسلمانوں نے ہندو معاشرے کے زیر اثر اس مقدس عبادت کو داغ دار اور اس کی پاکیزگی کو لہولہان کر دیا ہے۔ ہندو سماج کی نقل میں مسلمانوں نے اس میں اتنی ناجائز وحرام چیزوں کی آمیزش کر دی ہے اور بے جا نام ونمود کے لیے اپنی دولت کو ایسا برباد کرتے ہیں کہ الاماں والحفیظ۔ اس عبادت کے آگے پیچھے، نیچے اوپر بے ہودہ، باطل غلط وناجائز رسوم کی دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں۔ اور اس قدر ہنگامہ ہاؤ ہو کرتے ہیں کہ اصل عبادت جاں کنی میں مبتلا ہوجاتی ہے اور اس کے لیے آنکھیں بند کر کے دولت کو برباد کیا جاتا ہے۔

حالانکہ مولیٰ عزوجل کا ارشاد ہے: ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیٰطین وکان الشیطان لربہ کفورا۔ اور فضول نہ اُڑا بے شک اُڑانے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا

ناشکرا ہے۔

حضور سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں:

ان اللہ تعالیٰ کرہ لکم ثلاثاً قیل و قال و اضاعتہ المال و کثرۃ السوال۔ بے شک اللہ نے تین چیزیں تمہارے لیے ناپسند رکھیں۔ قیل وقال یعنی بیکار گفتگو۔ بربادئ مال اور کثرتِ سوال۔

شیخ محقق حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلوی "ماثبت بالسنۃ" میں فرماتے ہیں:

من بدعۃ الشنیعۃ ما تعارف الناس فی اکثر بلاد الھند من اجتماعھم للھو و اللعب با النار و احراق الکبریت۔

بہت بُری بدعتوں میں سے جو اکثر بلادِ ہند میں متعارف ہے کہ لوگ آگ سے کھیل تماشا کے لیے اکٹھا ہوتے ہیں اور پٹاخے چھوڑتے ہیں۔ ایسی ایسی ناپاک وملعون رسوم و بدعات ایک مقدس دینی فریضے وعبادت (یعنی نکاح کے اندر) گھس آئی ہیں، جس نے مسلم معاشرے میں ایک ناسور کی شکل اختیار کرلیا ہے۔ اوراب تو یہ بدعتیں ولعنتیں وخباثتیں ان گھرانوں میں بھی گھس آئی ہیں جو مہذب مانے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے اندر بہت ساری ذات برادریاں ہیں اور ہر برادری علی العموم ان لعنتوں میں گرفتار ہے۔ دولت کی بے جا نمائش میں اسلامی روح اوراس کی قدروں کو بار بار اور بُری طرح پامال کیا جاتا ہے۔

مسلمانو! اللہ نے اپنے فضل وکرم سے یہ جو تمہیں بے پناہ دولت دے دی ہے اوراس کے خرچ کے لیے تمہاری رسّی جوڈھیلی کردی ہے، اس سے بے پرواہ نہ ہوجانا۔ تمہاری چھوٹی سی چھوٹی نیکیاں اور تمہاری معمولی سی معمولی غلطیاں گناہ اور خرمستیاں سب اُس کی نگاہ میں ہیں۔ ومن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ۔

اس نے جو تمہیں دولت دی ہے، اس کے خرچ کا حساب بھی تم سے لے گا کہ ہم نے تمہیں جو دولت دی تھی، اسے تم نے کہاں کہاں خرچ کیا لن بطش ربك لشديد۔ بے شک تمہارے رب کی پکڑ بہت سخت ہے ؎

کیا حسابِ جرم دوگے تم خدا کے سامنے

اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم۔

ہم یہاں جس شادی کا تذکرہ کرنے جارہے ہیں اس میں میرے علاوہ کئی مذہبی شخصیتوں نے بھی شرکت فرمائی۔ بنگلور سے شیخ طریقت شمس العلماء حضرت علامہ سید شمس الحق صاحب قبلہ مدظلہ العالی، بمبئی سے حضرت علامہ مفتی محمد وکیل صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ غریب نواز، ممبرا اوران کے داماد مولانا نظام الدین صاحب اعظمی، حضرت مولانا مختار احمد صاحب مصباحی خطیب وامام جامع مسجد بلوائی کارکلاء، کرناٹک، حضرت مولانا سید نسیم صاحب گونڈوی، حضرت مولانا مرزا عزیز بیگ، عزیزم حافظ عبدالغنی صاحب وغیرہ وغیرہ۔

الحمدللہ وہ شادی بایں معنی مثالی تھی کہ فی زمانہ بے جا رسوم وبے جا دولت کی نمود، غیر شرعی حرکتوں، بے ہودگیوں اور

تمام آلائشوں سے پاک تھی۔

حد یہ کہ ویڈیو اور کیمرہ جو اس وقت شہر و دیہات ہر جگہ شادی کا جزوِ اعظم بنے ہوئے ہیں، وہ شادی کا گھر اس سے بھی پاک تھا۔ یہ لعنت اب تو مذہبی تقریبات و دینی جلسے اور ختم بخاری شریف جیسی بابرکت محفلوں میں اصحابِ جلسہ کی اجازت سے جگہ پانے لگی ہے۔ اور وہ جن کے فرقِ اقدس پر اس طرح کی لعنتوں سے مسلم اُمت کو بچانا تھا، اب وہی اسے اپنے فرقِ اقدس پر سجانے میں بڑی مسرت وطمانیت محسوس کرنے لگی ہیں۔ اور اب تو خالص دینی و مذہبی اجلاس میں بھی سیاسی اجلاس کی طرح یہ لعنتیں زور پکڑ رہی ہیں۔ سیاسی لیڈروں کی طرح اصحابِ جبّہ و دستار بھی پوز بنا بنا کر ویڈیو اور کیمرے کی زد میں آتے ہوئے بڑی طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ خاص کر علماء کونسل کے افراد، چاہے کونسل کا اہم اجلاس ہو یا اُن کا اپنی دینی اجلاس۔

اس راز کو فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

کسی طرح کی ریکارڈنگ قوالی، بم پٹاخے، پھلجڑی کچھ بھی نہیں۔ اور ایک بڑا حسن یہ بھی تھا کہ محترم سید خلیل صاحب جو اِس خاندان کے سربراہِ اعلیٰ ہیں، انھوں نے بالالتزام کسی دیوبندی، وہابی، بدعقیدہ کو رسماً و اخلاقاً بھی دعوت نہیں دی۔ سرِ راہ چلتے چلتے بھی نہیں کہا، نہ کارڈ دیا۔ وہابیت کے جراثیم وہاں بھی کچھ ہیں، صرف چند گھر اور چند لوگ۔ پہلی بار کسی اہم شادی میں وہابیت و دیوبندیت اس طرح اچھوت قرار پائی۔ شادی کے ایک دن پہلے وہ میرے پاس آکر کہنے لگے: حضرت! میں نے اپنے یہاں کسی وہابی دیوبندی کو قصداً دعوت نہیں دی۔ اب مجھ پر پریشر پڑ رہا ہے کہ پوری بستی میں وہی چند گھر ہیں جو بُری طرح سے اپنے نظر انداز کردینے کو محسوس کررہے ہیں۔ لہٰذا آپ دعوت دیں۔ مگر میں راضی نہیں ہوا۔ بولے حضرت! کیا میں نے کوئی غلط کام کیا؟

اس خبر سے مجھے بڑی مسرّت ہوئی۔ میں نے اُن کے اس دینی جذبے کو سراہتے ہوئے کہا: نہیں خلیل بھائی! اس پوری شادی میں میرے نزدیک یہی سب سے اچھا کام ہوا ہے۔ اس دورِ مداہنت میں یہ تو ایک کارنامہ کے برابر ہے کہ آپ نے سیاست مدن کی بھی پرواہ نہیں کی۔ اسی کو کہتے ہیں تصلب واستقامت فی الدین۔

آہ! ہماری چشم گنہ گار نے اسی بمبئی میں وہ اندوہ ناک منظر بھی دیکھا کہ بمبئی میں جس کا نام کبھی سنّیت کے تشخص کی علامت بنا ہوا تھا، بمبئی میں بابری مسجد فساد کے بعد ایک ندوہ کونسل بنام علماء کونسل جو قائم ہوئی تھی، جس نے سنّیت کے چہرے کو آگے چل کر داغ دار کیا۔ اس کے اہم ترین ستون جو کبھی سنیت کی آبرو ہوا کرتے تھے، ان کی شادی میں وہ بھی ان کی مسجد میں یہاں تک کے بڑے بڑے جغادری قسم کے وہابی دیوبندی علما و ائمہ شریک تھے، کہ یہ سیاست مدن تھی اور حالات کے تقاضے دین کے تقاضوں پر غالب آچکے تھے۔ جب سنیت کے لیے ایسی ایسی تنی گردنیں حالات کے آگے جھک جائیں اور احتساب کرنے پر عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا مظاہرہ کرنے لگیں تو ایسے عالم میں ایسا شخص جو نہ عالم، نہ فاضل، نہ

اس کے خاندان میں کوئی عالم، فاضل، حافظ، قاری ہو محض علما کی صحبت اور ایک بزرگ کی پاکیزہ نسبت ہو اور بس ان کا اس انداز میں تصلب فی الدین کا مظاہرہ بے شک ایک کارنامہ ہے **الحب فی اللہ و البغض فی اللہ** کے بہت قریب!

ہم سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی ایک مذہبی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے سید خلیل، سید فرید و سب بھائیوں اور ان سب سے پہلے، ان کی والدہ ماجدہ کو کہ وہ ایک صاحبِ ثروت ہونے کے باوجود اور آخری بیٹے کی شادی تھی کہ اس میں بڑے ارمان نکالے جاتے ہیں۔ شادی کے وقت ہر حال میں اللہ و رسول جل علی و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا و خوشی کو مقدم جانا۔ اور فی زمانہ جھوٹی نمائش، جھوٹی و فانی شان و شوکت اور روایتی غلاظتوں سے اسے پاک و صاف رکھا۔ انھیں مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دُلہن کے والد گرامی محترم شیخ اقبال احمد اور ان کے اہلِ خانہ کو بھی کہ ایک بڑے صنعت کار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنی بچی کے لیے ایک ایسے خاندان کو ترجیح دی جس پر دین و سنیت و مذہبیت کا غلبہ ہے اور ایک صاحبِ نسبت بزرگ کے حوالے سے پورے علاقے میں محترم ہیں **فلحمد للہ علی ذٰلك**۔

مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب پاک کے صدقے و طفیل ہمارے یہاں کے لوگوں کو بالخصوص دولت مندوں میں یہی دینی و مذہبی و نیک جذبہ اپنے بچوں کی شادیوں کے وقت عطا فرمائے۔ آمین

ہمیں وہاں جو معلومات بہم ہوئیں وہ یہ کہ وہاں پر شادیوں میں علی العموم ولیمہ کا وہ اہتمام نہیں ہوتا جو ہمارے یہاں ہوتا ہے۔ ہمارے شہر و دیہات میں ہر جگہ ولیمہ کا بڑا اہتمام ہوتا ہے۔ سید فرید صاحب نے تو بحمدہٖ تعالیٰ تیسرے دن شایانِ شان طور پر ولیمہ کا بڑا اہتمام کیا۔ وہاں ولیمہ کا رواج عام طور پر نہیں ہے، مخصوص گھرانے ہی کرتے ہیں۔ عام طور پر شادی سے ایک دن پہلے حسب استطاعت عام دعوت کی جاتی ہے۔ دوست و احباب، رشتے داروں، گاؤں، محلے والوں سب کو مدعو کرتے ہیں۔ مگر شادی کے بعد چند خاندان کو چھوڑ کر بقیہ عام طور پر ولیمہ نہیں کرتے۔ شادی کے ایک دن پہلے جو ضیافت کا کھانا ہوتا ہے، وہی اصل ہوتا ہے۔ جبکہ ولیمہ اس دعوتِ طعام کو کہتے ہیں جو شب عروسی کے بعد ہوتی ہے۔ بیوی کی شکل میں متاعِ حیات کی ایک گراں قدر نعمت پانے کی خوشی میں شکرانۂ نعمت کے طور پر، جس کی حدیث شریف میں بڑی تاکید آئی ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے ولیمہ کرنے اور ولیمہ کی دعوت قبول کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں: **اولم ولو بشاط**۔ ولیمہ کرو چاہے ایک بکری دستیاب ہو۔

شادی و شب زفاف سے پہلے آپ چاہے جتنی بڑی دعوت کھلا دیں، وہ ضیافت کہلائے گی، ولیمہ نہیں۔ جس کی تاکید رسولِ محترم ﷺ نے کی ہے۔

اس علاقے کے مسلمانوں سے مخلصانہ گذارش ہے کہ اپنی شادیوں میں ولیمہ کی دعوت کو لازم کرلیں۔ آپ کا اپنا رسم و رواج جو بھی ہو، وہ نبی کریم ﷺ سنت سے بڑھ کر تو نہیں۔ آپ حضرات اپنے رواج میں بس اتنی سی ترمیم کرلیں کہ جو کھانا بڑے اہتمام سے شادی کے ایک دن پہلے کھلاتے ہیں، اسے شادی و رخصتی کے دوسرے دن کھلا دیں۔ ایک دن بعد کر دینے سے اگر، سرکار دوعالم کی سنّت ادا ہو جائے تو اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟ ہماری ریت و روایت اور

رواج آقائے دوجہاں حضور مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ سنت سے بڑھ کر نہیں ہوسکتی۔

نکاح میں فلاح وخیر وبرکت حضور کی سنّت میں ہے۔ اسے ترک کرنے میں نہیں۔ جیسے نکاح کرنا حضور کی سنّت ہے، یوں ہی ولیمہ بھی حسب توفیق سرکار کی سنت کریمہ ہے۔

اللهم اصلح امة محمد صلى الله عليه وسلم۔

وادیِ نور کی طرف:

۱۰/اکتوبر کو ہم شادی سے فارغ ہو چکے تھے۔ ۱۲/تاریخ کو ولیمہ تھا اور ۱۱/تاریخ کو مولانا شاہ الحمید صاحب کو دوپہر میں امام مالک کی بارگاہ میں وقت دے دیا تھا۔ چنانچہ مورخہ ۱۱/اکتوبر کو ہم لوگ صبح ۸/بجے گھر سے نکل گئے۔ پلاننگ یہ تھی کہ پہلے منگلور حضرت بی بی سیدہ کی درگاہ میں حاضری دیں گے، وہاں سے اُلّانی حضرت سیدنا سید شریف المدنی کی زیارت کرتے ہوئے سیدھے وہاں سے کیرالا حضرت سیدنا رافع بن حبیب اور ان کے ساتھیوں کی بارگاہ میں پہنچیں گے اور پھر وہاں سے کاسرکوڈ حضرت سیدنا مالک بن دینار میں حاضری کی سعادت حاصل کریں گے۔ وہاں سے حاضری کے بعد جامعہ سعدیہ کی زیارت سے دل ونگاہ کو شادکام کریں گے۔ حسنِ اتفاق ۱۱/اکتوبر کو جمعہ مبارکہ کا دن پڑا۔

اسرار الدین کمبل سے منگلور صرف ۱۸/کلومیٹر دور ہے۔ گھر سے نکلنے کے بعد سید فرید صاحب کی گاڑی جو ٹاٹا سیرا تھی، وہ بھی بالکل نئی، اس کا کانچ نیچے اوپر نہیں ہو رہا تھا۔ اگر گھر ہی پر یہ بات معلوم ہوجاتی تو ان کی اور بھی کئی گاڑیاں کنٹیسا، ون ون ایٹ وغیرہ ہیں، وہی لے لیتے۔ فرید بھائی نے کہا: حضرت! برسات کا موسم ہے، کہیں بھی بارش مسئلہ پیدا کرسکتی ہے۔ لہٰذا گاڑی کے کانچ کو منگلور میں ٹھیک کرا کے پھر چلتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا آدھا گھنٹہ لگے گا۔ جس گیراج میں گاڑی لے کر گئے، وہ ٹاٹا سیرا ہی کی بڑی عالی شان گیراج تھی۔ بمبئی کا مسافر سمجھ کر فوراً اسے ہاتھ میں لے لی گئی، مگر اس چھوٹے سے کام میں اتنا وقت لگ گیا کہ وہیں ایک بج گیا۔ بمشکل تمام بھاگتے دوڑتے ہوئے جمعہ کی وہ بھی دوسری رکعت ہی مل سکی۔

جمعہ پڑھنے والوں کا بے پناہ مجمع سنّی شافعی امام کی بہت خوش الحان عربوں کے لہجے میں قرأت سبحان اللہ! طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد فوراً ہم مسجد سے قریب ہی بی بی سیدہ کے مزار پر حاضر ہوئے۔ لبِ روڈ چوراہے پر بڑی شاندار درگاہ اور بڑا عالی شان روضہ۔ اولین نظر میں وہ بڑی عظیم الشان مسجد نظر آئی۔ بڑے بڑے مینارے وگنبد بالکل مسجد کی طرز پر درمیان میں آپ کا بڑا خوب صورت مزار۔ چونکہ تاخیر زیادہ ہوچکی تھی، ہم جلدی میں تھے، اس لیے ان کے تعلق سے ہم کوئی تفصیلات حاصل نہ کرسکے۔ فاتحہ خوانی کے بعد ہم لوگوں نے ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اور جب ہم منگلور سے کاسرکوڈ جانے والی ہائی وے پر اُلّال کے لیے نکلے تو تین بج رہے تھے۔ منگلور سے کنیا کماری جانے والی ہائی وے روڈ پر ابھی ہم کچھ ہی دیر چلے تھے کہ گاڑی داہنے ہاتھ پر ہائی وے سے نسبتاً ایک پتلے روڈ پر مڑی۔ گاڑی جوں جوں آگے بڑھتی جاتی تھی، سڑک کے دونوں طرف بہت خوب صورت مناظر سے آنکھوں میں جیسے ٹھنڈک اُترتی جاتی تھی۔ پورا علاقہ سبز پوش پہاڑیوں، ناریل کے باغات، زیادہ تر قدرت کے اَن دیکھے ہاتھوں سے سجے سنورے

اور کچھ انسانی ہاتھوں کی حنا بندی سے مزین۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ٹکڑا کشمیر سے اُٹھا کر وہاں لا کر رکھ دیا گیا ہو۔ میں نے خوش گوار حیرت کے ساتھ سید فرید صاحب سے پوچھا یہ ہم کہاں آ گئے؟ انھوں نے کہا: حضرت! ہم اُلال پہنچ رہے ہیں۔ اللہ اکبر! اس قدر خوب صورت مناظر جیسے خواب دیکھ رہے ہوں ؎

میری مشاطگی کو کیا ضرورت حسن معنی کی
کہ قدرت خود کیا کرتی ہے فطرت کی حنا بندی

باتوں باتوں میں ایک پُرشکوہ، دیدہ زیب، خوب صورت، مقدس اور بہت ہی بافیض آستانہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ یعنی حضرت سید شریف المدنی کا آستانۂ رحمت جو آج اپنے اندر فیض رسانی میں پورے ملک کی بڑی بڑی درگاہوں و آستانہ جات سے بہت منفرد، ممتاز و بے مثال ہے۔ میں اس کے اندازِ فیض رسانی کو دیکھ کر ایک تحیر خیز مسرّت سے دو چار ہو گیا اور دل میں ایک ہوک اُٹھی کہ یہی اندازِ فیض رسانی ملک کی دیگر بڑی بڑی درگاہوں سے کیوں نہیں؟ بالخصوص شمالی ہند کی درگاہوں جیسے اجمیر شریف، بہرائچ شریف، کچھوچھہ مقدس، کلیر شریف، بائیس خواجہ کی چوکھٹ دہلی اونچہ شریف، مدینۃ الاولیاء احمد آباد کی بڑی بڑی درگاہیں، اورنگ آباد میں خلد آباد شریف، پونا میں شیوا پور، حضرت قمر علی شاہ درویش، دیوہ شریف، لکھنؤ میں شاہ مینا۔ خاص کر بمبئی میں مخدوم مہائمی، حاجی علی، حاجی ملنگ، حضرت بابا بہاء الدین صاحب (دھوبی تالاب) وغیرہ وغیرہ۔ بے شک اگر وہی اندازِ فیض رسانی یہاں بھی اختیار کر لیا جائے تو مسلمانوں کے اندر جو غربت، جہالت، معاشی بدحالی پھیلی ہوئی ہے، اس پر بہت حد تک قابو پا لیا جائے گا۔

ہم نے دیکھا تو نہیں البتہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ گلبرگہ شریف کے آستانہ معلی یعنی درگاہ حضرت سیدنا سید محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے انتظامیہ اور لائق صد احترام سجادہ نشین نے بڑی خاموشی کے ساتھ حضرت بندہ نواز کے اندازِ فیض رسانی کو ایک نئی جہت، ایک نئی سمت اور ایک انقلابی و تاریخی موڑ دیا ہے۔ اور مسلمانوں کی چارہ سازی کے لیے کئی منزلیں وہ طے کر چکے ہیں اور ہندوستان کے قابل ذکر اور مشہور و مالدار ترین درگاہوں کے انتظامیہ و ٹرسٹیان کو اپنے نقش قدم پر چلنے کی خاموش دعوت دے چکے ہیں ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

فجزاهم الله احسن الجزاء عن سائر المسلمين.

جلیل آسان نہیں آباد کرنا گھر محبت کا　　　یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

درگاہ حضرت شریف المدنی کی حسنِ خدمات اور اس بارگاہ کے اندازِ فیض رسانی کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

دینی، مذہبی اور عصری درس گاہوں اور اس کے مختلف شعبۂ جات میں استفادہ اور فیض یاب ہونے والے طلبا ------------------------------ چھ ہزار (۶۰۰۰)

(۱) دینی و عربی اِدارے ---------------- اکیس ہزار (۲۱۰۰۰)

(۲) مساجد جن کا پورا انتظام وانصرام درگاہ کمیٹی کی طرف سے ---- سترہ (۱۷)
(۳) اسپورٹس، جمنازیم (ورزش گاہ) ---------------- تین (۳) عدد
(۴) سید مدنی چیرٹیبل اسپتال ---------------- ایک (۱) عدد
(۵) سید مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ ---------------- ایک (۱) عدد
(۶) سلطان ٹیپو کالج ---------------- ایک (۱) عدد
(۷) سید مدنی اردو ہائی اسکول ---------------- ایک (۱) عدد
(۸) سید مدنی پرائمری اسکول ---------------- ایک (۱) عدد

یہ تمام ادارے اور عوامی فیض رسانی کے یہ چشمے سید مدنی درگاہ ٹرسٹ کی جانب سے چلائے جارہے ہیں۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت مبارک باد پیش کرتی ہے درگاہ حضرت سید شریف المدنی کی ٹرسٹ وانتظامیہ کو بے شک روحانیت کے ایک تاجدار کی بارگاہ سے عوامی فیض رسانی کا یہ انداز بہت منفرد ومثالی ہے اور قومی تعمیر کی کئی جہتیں لیے ہوئے ان کا یہ کارنامہ ان کی امانت ودیانت اور فرض شناسی کی لائق تقلید مثال ہے۔ فجزاھم اللہ تعالیٰ جزاء کثیرا۔

جبکہ اُلّال کوئی شہر نہیں ایک قصبہ ہے اور وہاں زائرین کی روزمرّہ حاضری بھی یہاں کی مشہور ترین درگاہوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔

اجمیر شریف، دہلی، بہرائچ شریف، کچھوچھہ مقدسہ، کلیر شریف، دیوہ شریف وغیرہ کی تو بات چھوڑ یئے یہ تو بہت بڑی بڑی بارگاہیں اور برصغیر ہند کی منفرد وممتاز درگاہیں ہیں، ان کی آمدنیاں اور پراپرٹیاں بھی لاکھوں، کروڑوں اور اجتماعی طور پر اربوں تک پہنچیں گی۔ مگر ان کی عوامی فیض رسانی کا انداز اور مسلمانوں کی غربت وجہالت، بے روزگاری اور معاشی بدحالی دور کرنے کے لیے کچھ کام بھی ہورہا ہے ان درگاہوں کی لاکھوں کروڑوں کی آمدنیاں کہاں جارہی ہیں؟ کون لوگ اس سے پل رہے ہیں؟ اور قومی سرمایہ صرف چند خاندان کی میراث ہوکر جس انداز میں عوامی روپے کا استحصال کیا جارہا ہے کیا اس سے اہلِ نظر وباخبر حلقے بےخبر ہیں؟ ہم یہاں بمبئی کے تین بہت مشہور درگاہ اور جامع مسجد ٹرسٹ کا نام لیں گے، جن کے پاس کثیر سرمایہ ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ دن رات دولت کا ہن برستا ہے یہاں، مگر اس کے مقابلے میں عوامی فیض رسانی کا کیا حال ہے، یہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آج حاجی علی درگاہ، مہائم شریف میں مخدوم پاک کی بارگاہ اور دھوبی تالاب میں سرکار بابا بہاء الدین کا آستانہ معلیٰ یہاں روزمرہ بالخصوص جمعرات وجمعہ کو جو انسانی سیلاب اُمڈ پڑتا ہے اور حاضرین وزائرین کی شکل میں انسانوں کا بے پناہ اژدہام اللہ اکبر! جن کی بدولت یہاں دن رات دولت کا ہن برستا رہتا ہے، مگر بے پناہ آمدنی کے مقابلے میں ان درگاہ کمیٹیوں کا کچھ ایسا کام بھی ہے جس سے مسلمانوں کی غربت، جہالت، بے روزگاری اور معاشی بدحالی دور کرنے کا سبب ہو۔ کہیں تھوڑا سا ہو بھی رہا ہے تو آمدنی کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت ہے، آخر یہ بے پناہ دولت کہاں جاتی ہے؟ کس کے مصرف میں خرچ ہورہا ہے؟ اگر بینک میں اکاؤنٹ کا جم

بڑھ رہا ہے تو اس سے عوام کا کیا فائدہ؟

آل انڈیا تبلیغ سیرت ان قابل احترام درگاہوں کے انتظامیہ وٹرسٹ سے مخلصانہ گذارش اور مؤدبانہ التجا کرتی ہے کہ درگاہ شریف کی ان بے تحاشا آمدنیوں سے صرف بینک کا وزن نہ بڑھائیے بلکہ قوم کی غربت، جہالت، بے روزگاری کو دور کرنے کے لیے کچھ کیجیے۔ طبیہ کالج، انجینئرنگ کالج، اسپتال، صنعتی ادارے، مختلف قسم کے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، مستحق مساجد وا داروں کی امداد وغیرہ۔

آپ اس کثیر دولت کے مالک نہیں بلکہ اس کے امین ومحافظ ہیں اور وہ لاکھوں کروڑوں کا سرمایہ عوامی ملکیت ہے جو آپ کی تحویل میں ہے، جس کا حساب آپ کو یہاں بھی دینا ہے اور اس قہار وجبار مالک ذوالجلال احکم الحاکمین کو بھی۔ واضح رہے کہ یہاں اگر اس عوامی ملکیت کا صحیح استعمال نہیں ہوا اور بالفرض دنیوی احتساب سے بچ بھی گئے تو بھی فیصلے کا ایک دن مقرر ہے، جہاں ذرے ذرے اور قطرے قطرے کا بھی حساب لیا جائے گا۔ جہاں خدائے ذوالجلال کا قہر غضب پر ہوگا اور اس کے سامنے ہمارے کارناموں کا دفتر ہوگا۔ ان یوم الفصل کان میقاتاً۔

رنگ جب محشر میں لائے گا تو اُڑ جائے گا رنگ
یوں نہ سمجھو سرخی خون قتیلاں کچھ نہیں

قبل اس کے کہ اس کے لیے کوئی تحریک چلے، درگاہ کمیٹیوں اور ان کی انتظامیہ کو اپنی غفلتوں کا احساس ہوجانا چاہیے۔ اور اُن کا رخ ان تاریخی جہتوں کی طرف ہوجانا چاہیے۔ جہاں سے جہالت، معاشی بدحالی اور غربت پر بہت حد تک قابو پانا ممکن ہے **حسبنا اللہ ونعم الوکیل**۔

حضرت سید شریف مدنی کی درگاہ سے متّصل ہی بڑی عالی شان خوب کشادہ اور کافی وسیع وعریض ایک مسجد ہے۔ مسجد کے حوض میں وضو کر کے اس کے سامنے درگاہ کمیٹی کے کشادہ آفس میں داخل ہوئے، جہاں چار چار اکاؤنٹنٹ اپنے فرائض منصبی میں مصروف تھے۔

ان میں جو سب سے سینئر دار ذمے دار شخص تھے، سید فرید صاحب نے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے حوالے سے ہمارا تعارف کرایا۔ تبلیغ سیرت کے حوالے پر انھوں نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔

ہم نے آستانہ معلٰی اور صاحبِ آستانہ حضرت سید شریف المدنی اور درگاہ شریف کی جانب سے جو عوامی فیض رسانی ہورہی ہے، اس کی خدمات کی تفصیل چاہی تو انھوں نے فوراً کئی کتابیں انگریزی وکنڑ زبان میں چھپی ہوئی خوش ہوکر پیش کردیں۔ ہم وہاں سے نکل کر مزارِ پُرانوار پر حاضر ہوئے۔ بڑے خلوص وعقیدت اور احترام کے ساتھ دیر تک فاتحہ خوانی اور دعائیں مانگتے رہے۔ بہت خوب صورت، بہت دیدہ زیب مزار ہے۔ مزار کے تعویذ کے گرد چاروں طرف سے خوب صورت جالیاں لگی ہوئی ہیں۔ فاتحہ خوانی کے بعد جب وہاں سے درگاہ حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ کے لیے نکلے تو تو چار بج چکے تھے۔

حضرت سید شریف المدنی علیہ الرحمہ:

اسم گرامی سید محمد شریف۔ مدینہ شریف سے تشریف آوری کی وجہ سے مدنی کہلائے اور اب یہ لفظ مدنی آپ کے نام کا ایک ایسا جز ہوگیا ہے کہ اگر اسے نام سے الگ کر دیا جائے تو پھر آپ کی شخصیت سمجھ میں نہیں آئے گی۔ گویا مدنی اب آپ کے نام کا علَم ہوگیا ہے۔ چنانچہ پورا نام سید شریف المدنی قرار پایا۔ آپ چار صدی قبل مدینہ منورہ سے بحری راستے سے تشریف لائے تھے۔

ساحل سمندر پر آباد اُلّال نام کی بستی میں قیام فرمایا۔ ابتدا میں اُلّال گاؤں کی میلنگنڈی کی چھوٹی سی مسجد میں آپ نے قیام فرمایا۔ آپ کے قیام کی برکت ہی کہیے کہ وہی چھوٹی سی مسجد اُلّال، پرمنور، سومیشور، منوّر کونیکر اور چاپنا موگرو گاؤں کی اس وقت بہت خوب صورت و پُرشکوہ جامع مسجد ہے۔

آپ کی زندگی بڑی سادہ تھی۔ آپ نے چھوٹے بڑے ہر ایک کے ساتھ حسن اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ خصوصاً غریبوں کی چارہ سازی کی، بیماروں کو اپنی دعاؤں سے شفا بخشی، مخلوقِ خدا سے محبت کا عملی مظاہرہ کیا۔ آپ کی دعاؤں سے بیماروں کو شفا ملنے لگی، جس کی وجہ سے اُلّال گاؤں اور اطراف و جوانب سے لوگوں کی بھیڑ آپ کے گرد جمع ہونے لگی۔ آپ کی شفقت و محبت اور رواداری سے غیر مسلموں کی بھی بڑی تعداد آپ کے گرد جمع ہونے لگی اور آپ کی دعاؤں سے فیض یاب ہونے لگی۔

آپ سے مسلسل کرامتوں کا بھی ظہور رہا، جس سے آپ کا شہرہ دوردور تک ہوگیا۔ وہاں رہتے ہوئے آپ کو جب ایک عرصہ ہوگیا، مقامی لوگوں سے آپ کی اُنسیت بڑھی اور بستی والے بھی آپ کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگے۔ چنانچہ آپ نے وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

آپ نے وہیں ایک دین دار، باعزت گھرانے کی غریب لڑکی سے نکاح فرمایا۔ وہ غریب گھرانہ ایک زمین دار کی زمین پر آباد تھا۔ اس وقت کے زمین داری اُصول کے مطابق وہ زمین دار کی زمین پر ناریل کی کاشت بھی کرتا تھا۔

ایک سال ناریل کی فصل بہت اچھی آئی۔ زمین دار نے دیکھا تو اس کی نیت ہی بدل گئی۔ چنانچہ ایک دن آپ کی غیر موجودگی میں اُس نے سارے ناریل تڑوالیے۔ مانگنے پر بھی ایک ناریل بچوں کو نہیں دیا۔ وہ سارے ناریل اُٹھوا کر اپنے گھر لے آیا۔

حضرت جب گھر آئے تو بچوں کو بڑا ملول اور دل گرفتہ پایا۔ بچے آپ کو دیکھ کر رونے لگے۔ صورتِ حال سے آپ کو آگاہ کیا گیا۔ آپ نے صبر کیا اور بچّوں کو تسلی اور دلاسا دیا۔ ادھر زمین دار عتابِ الٰہی میں گرفتار رہا۔ اس کے پیٹ میں سخت درد اُٹھا، ہر چند بہت دوائیں کیں مگر افاقہ نہ ہوا۔ آخر کار مجبور ہوکر شرمندگی و ندامت کے ساتھ آپ کے پاس آیا اور اپنے درد کا درماں چاہا۔ آپ نے ایک گلاس پانی دَم کر کے دیا، پیتے ہی درد ختم ہوگیا۔ زمین دار بہت متاثر ہوا اور وہ ساری زمین اُس نے آپ کو نذر پیش کر دی۔ آپ ایک صاحبِ کرامت بزرگ تھے اور آپ سے مسلسل کرامتوں کا صدور رہا۔

ایک مرتبہ آپ الکیل گاؤں کی مسجد میں ٹانکی کے قریب بیٹھ کر وضو کر رہے تھے کہ اچانک مغرب کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی مغرب کی سمت پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ وہاں موجود لوگ حیرت کرنے لگے کہ حضرت کو کیا ہو گیا۔ جب پانی پھینک چکے تو لوگوں نے پھینکنے کی وجہ پوچھی، تو آپ نے فرمایا: حرم شریف مکّہ معظّمہ میں آگ لگی ہوئی تھی، اسی کو بجھا رہا تھا۔

اس سال جو لوگ حج پر گئے تھے، انھوں نے واپس آ کر بتایا کہ اس سال حرم شریف کے ایک حصّے میں آگ لگ گئی تھی کہ اچانک بارش شروع ہو گئی اور وہ آگ بجھ گئی۔

ایک دفعہ عرب سے ایک جہاز بنگلور کے لیے روانہ ہوا۔ اس جہاز میں ایک بکس سونے و کچھ دیگر قیمتی اشیا سے بھرا ہوا تھا۔ ساحل سمندر پر جہاز اُتارنے میں غلطی سے وہ بکس سمندر میں گر گیا۔ کپتان کی بے پناہ کوششوں کے باوجود وہ نہیں۔ کپتان بہت پریشان ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے حضرت سید شریف المدنی کی طرف کپتان کی رہنمائی کی اور اسے کافی ڈھارس بندھائی کہ تم حضرت سے کہو۔ کپتان حضرت کی خدمت میں آیا اور پاؤں پر سر رکھ کر رو دیا۔ آپ نے اسے تسلی دی اور دوسرے دن بلایا۔

چنانچہ کپتان دوسرے دن پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے پیچھے سے وہ بکس اُٹھا کر سامنے رکھ دیا، جس سے پانی ٹپک رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ابھی ابھی سمندر سے نکالا گیا ہو۔

حضرت نے غربت و سادگی کی زندگی گزاری۔ مرض الموت میں آپ کی اہلیہ رونے لگیں۔ غربت و بے سروسامانی کے سبب اپنی بقیہ زندگی پر خوف ظاہر کرنے لگیں کہ اب میرا کیا ہوگا اور میرا گزر بسر کیسے ہوگا؟ آپ نے اُنھیں تسلی دی اور فرمایا: تم گھبراؤ نہیں۔ اللہ تمھاری کفالت فرمائے گا۔ اطمینان رکھو، تمھیں ہر دن تکیہ کے نیچے ایک روپیہ مل جایا کرے گا، جو تمھاری ضرورتوں کے لیے بہت کافی ہوگا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ آپ کے وصال کے بعد اہلیہ محترمہ کو تا حیات ایک روپیہ روز تکیہ کے نیچے مل جایا کرتا تھا، جو اُن کی ضرورتوں کے لیے بہت کافی تھا۔ آپ کے وصال کے بعد اہلِ محبت نے آپ کی قبر پر ایک مینار بنایا۔

آپ کے کرامات و تصرفات اور فیض رسانی کا سلسلہ بعد وصال بھی جاری رہا اور آج تک جاری ہے۔ ایک بار آپ کی بارگاہ میں ایک گونگا شخص حاضر ہوا اور وہ گونگا ہمیشہ حاضر ہوتا رہتا تھا۔ ایک دن اُس نے مواجہہ اقدس میں کھڑے ہو کر دعا مانگی۔ اتفاقاً وہ وہیں گر پڑا۔ جب اُٹھا تو بولنے لگا۔

یوں ہی ایک بار آپ کے عرس کے موقع پر قصائی نے گوشت کے وزن میں ڈنڈی ماردی۔ کچھ دیر بعد اس کے پیٹ میں شدید درد اُٹھا۔ دوا، دارو کچھ بھی فائدہ بخش نہ ہوا۔ قصائی مزار شریف پر حاضر ہوا، گڑگڑا کر معافی مانگی، توبہ کیا، تو فوراً درد جاتا رہا۔

البرٹ نامی ایک عیسائی حضرت کی درگاہ معلّٰی میں صفائی و رنگ کا کام کر رہا تھا۔ اس کے دو سونے کے ہار چوری ہو گئے۔ اس نے بصد خلوص و عقیدت منت مانی کہ میرے دونوں ہار اگر مجھے مل گئے تو میں ہمیشہ پابندی کے ساتھ حاضری

دیتا رہوں گا۔ دوسرے ہی دن بنگلور میں وہ دونوں ہار ایک عورت کے پاس سے برآمد ہوئے۔ اس عیسائی نے حضرت کی بارگاہ میں حاضری کو لازم قرار دے لیا۔

۱۹۴۵ء میں دورانِ عرس لوگوں کی زبردست بھیڑ کی وجہ سے پانی ختم ہوگیا۔ بڑی پریشانی ہوئی، جانوں کے لالے پڑنے لگے کیوں کہ دور دور تک پانی ختم ہو چکا تھا۔ لوگ آپ کے مزار شریف آ کر جمع ہوئے اور دعائیں مانگنا شروع کیں، اتنے میں ایک زوردار گرج ہوئی اور درگاہ شریف کا کنواں لبالب بھر گیا۔ اور آج تک اس میں کمی نہیں آئی۔ زائرین و عقیدت مند حضرات بڑے ادب و احترام کے ساتھ اسے پیتے ہیں۔ اس کنویں کے پانی میں شفا ہے۔ لوگ اپنی بیماریوں میں اسے استعمال کرتے ہیں۔

آج بھی جن لوگوں کے مال و اسباب کھو جاتے ہیں، وہ خلوصِ دل سے حضرت کے مزار پر حاضری دیتے ہیں، تو اُن کا کھویا ہوا سامان مل جاتا ہے۔

آپ کا عرس: یوں تو آپ کا عرس پہلے سے ہر سال ہوتا تھا، مگر ہر پانچ سال کے بعد بہت بڑے پیمانے پر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ادھر بڑے پیمانے پر انتظام کے پیش نظر بڑے عرس کو ہر سال بعد کر دیا گیا۔ اس میں مخلوقِ خدا کا بڑا زبردست اژدہام ہوتا ہے۔ ہر طرف انسان ہی انسان نظر آتے ہیں۔ ہندو، مسلم، عیسائی تمام مذاہب کے لوگ بڑی عقیدت و محبت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔ جنوبی ہندوستان کے ہر صوبے سے لوگ اُبل پڑتے ہیں۔ کرناٹک، کیرالا، آندھرا پردیش، تامل ناڈو، مہاراشٹر سے بہت لوگ حاضر ہوتے ہیں ۱۹۸۵ء کے عرس میں تقریباً دس لاکھ اہلِ عقیدت جمع ہوئے۔ اتنے بڑے مجمع کو بغیر پولیس کے کسی طرح کی مدد کے محض حضرت کی روحانیت کے سہارے کنٹرول کر لیا گیا تھا اور اب تو دن بہ دن مجمع بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ آپ کی مسجد کو جو اس وقت ایک بڑی جامع مسجد ہے ۱۹۵۸ء میں نئے سرے سے تعمیر کیا گیا۔ اور اسی طرح آپ کے مزار شریف کے گنبد کو ۱۹۷۰ء میں وسیع کیا گیا اور کچھ نئی دیدہ زیب تبدیلیاں کی گئیں۔

حضرت سید شریف المدنی قدس سرہ العزیز کے اندازِ فیض رسانی پر میں گذشتہ سطروں میں لکھ چکا ہوں، جس میں شمالی ہندوستان کی بڑی درگاہوں، خاص کر بمبئی کی مشہور درگاہوں، جہاں دن رات دولت برستی ہے، انھیں اور درگاہ کمیٹیوں کے غافل ٹرسٹیوں کو اس سمت توجہ دلا چکا ہوں کہ آپ کے یہاں سے فیض رسانی کا وہ انداز کیوں نہیں؟ خاص کر حاجی علی، ماہم شریف، دھوبی تالاب درگاہ کمیٹیوں کو، جہاں بے حساب و بے اندازہ دولت ہے۔ اور وہ قومی تعمیر اور قومِ مسلم کی فلاح و بہبود کے لیے اس انداز میں خرچ نہیں ہو رہا ہے، جس انداز میں ہونا چاہیے۔

کتنی عجیب بات ہے کہ اس قدر بلند پایہ ہستی کا تذکرہ اور ان کا ذکر جمیل، تصوف و تاریخ کی قابلِ ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔ علاقائی زبانوں میں اگر کچھ ہے تو وہ ناکافی ہے۔ اردو زبان آج دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان بن چکی ہے۔ ہزار ہا بزرگانِ دین و اولیائے اُمت کا تذکرہ اس عالمی زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ ہم نے آپ کے تعلق سے یہاں جو

کچھ عرض کرنے کی کوشش ناتمام کی ہے، وہ انگریزی و کنڑ زبان میں ایک کتابچہ کی مدد سے لیا، جو درگاہ کمیٹی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ یہ کتابچہ ہمیں درگاہ کے آفس سے دستیاب ہوا تھا۔ علاقائی زبانوں میں اگر کچھ ہے بھی تو صرف انھیں لوگوں کے لیے جو پہلے سے حضرت کو جانتے ہیں، بقیہ سارا ہندوستان جس کی زبان اردو ہے، وہ بالکل نہیں جانتے۔ کیرالہ کے اربابِ علم ودانش حضرات کو اس طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔

حضرت رافع بن حبیب رضی اللہ عنہ:

سید ناصر سلمہٗ کے نکاح کے اسٹیج پر جامع مسجد بلوائی کارکلاء کرناٹک کے خطیب وامام حضرت مولانا مختار احمد صاحب مصباحی سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ بڑی گرم جوش ملاقات ۱۹۷۱ء میں دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور سے سند فضیلت کے بعد جب میں نے اشرفیہ کو چشم پُرنم سے الوداع کہا تو موصوف اُس وقت پڑھ رہے تھے اور ان کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اور اب اچانک اتنے برسوں بعد ملاقات ہو رہی تھی، وہ بھی اچانک بے سان وگمان تو حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی۔ اشرفیہ چھوڑتے وقت وہ شباب کی ابتدائی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے۔ یعنی بچپن و جوانی گلے مل رہے تھے اور اب جو ملاقات ہوئی تو عمر کا سورج دوپہر کی منزلیں طے کر چکا تھا۔

آہ! وقت اتنی تیزی کے ساتھ دبے پاؤں گزر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ظہر کے وقت میں داخل ہوگیا۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن   دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں

انھوں نے عالم سرخوشی میں ترغیب وتحریص ہی نہیں بلکہ اس پر اصرار کرتے ہوئے فرمایا: مولانا وارث جمال صاحب! جب آپ یہاں تک آہی گئے ہیں تو دو تین مقامات پر ضرور حاضر ہوں۔

ایک تو کاسر کوڈ میں حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت مالک بن دینار میں حاضری کی نیت ہی سے یہاں آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ شادی میں شرکت تو ایک ذریعہ ہے۔ انھوں نے تحسین فرماتے ہوئے کہا کہ اچھا تو دوسری بارگاہ حضرت سید شریف مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ وہاں آپ ضرور حاضری دیں اور ہاں وہاں سے نکل کر مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں جب چلیں گے تو انھیں کے راستے میں بائی وے سے صرف ۵ رکلومیٹر آپ کو اندر جانا پڑے گا۔ وہاں پر مشہور صحابی رسول حضرت رافع بن حبیب رضی اللہ عنہ کا مزار شریف ہے۔ بڑی نورانی بارگاہ اور بڑا ہی پُرفضا مقام ہے۔ میں خود وہاں حاضر ہوا ہوں۔ پھر وہ مجھے راستہ سمجھانے لگے اور محبانہ اصرار کرنے لگے کہ آپ وہاں ہر حال میں جائیں۔

اس نئی خبر سے تو مجھے گویا کرنٹ لگ گیا۔ ایک صحابی رسول کی بارگاہِ معلیٰ اور مجھ جیسا گنہ گار! اس سے قبل اپنے عراق کے متعدد سفر میں حضرت سیدنا سلمان فارسی وحضرت ابوحذیفہ یمانی اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور حضرت علی مرتضیٰ وامام عالی مقام کی بارگاہوں میں حاضری کی سعادت حاصل ہو چکی تھی۔ اپنے ملک میں کسی صحابیِ رسول کی بارگاہ میں حاضری کا شرف وسعادت واقعی بڑی نعمت تھی۔ بے شک میں اس اعتبار سے بہت خوش نصیب ہوں۔

مولانا مصباحی راستہ اور اس کے مقامات کے نام سمجھانے لگے۔ ایک تو اس علاقے بلکہ کیرالہ کے اکثر مقامات کے نام اس قدر سخت و مشکل اور اپنے لیے اتنے نکارت لفظی لیے ہوتے ہیں کہ وہ جلد زبان ہی پر نہیں چڑھتے۔ ان علاقوں کے نام نکارت لفظی لیس قبر حرب قبر سے بھی زیادہ نکارت۔

میں نے اپنے میزبان محترم سید فرید احمد صاحب کو شادی کے اسٹیج ہی پر بُلا کر مولانا سے ملاقات کرائی اور کہا: فرید بھائی! آپ مولانا سے راستے اور مقامات کے ناموں کو کاغذ و ذہن دونوں میں محفوظ کرلیں کہ اس نورانی سفر میں آپ ہی رہنما ہوں گے۔ انھوں نے اس خبر کو سُن کر مجھ سے بھی زیادہ حیرت وشوق ظاہر کیا کہ ہم اتنے قریب رہ کر بھی بے خبر ہیں۔ سید فرید صاحب چونکہ کافی دین پسند و دین دار ہیں اور صحابہ و بزرگانِ دین کے بے حد عقیدت مند، اس لیے انھیں اپنی اس بے خبری پر حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا۔

پھر میں نے اسی جگہ پیر طریقت حضرت سید شمس الحق صاحب قبلہ سے استفسار کیا، تو آپ نے بھی حیرت ظاہر کرتے ہوئے فرمایا میں پہلی بار سن رہا ہوں، حالانکہ حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں برابر حاضری دیتا ہوں۔ کل پھر انھیں کی بارگاہ میں حاضر ہو رہا ہوں۔ ہم نے مولانا مصباحی صاحب سے راستے کی تفصیلات لے کر ان کا بہت شکریہ ادا کیا۔

چنانچہ شادی کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۱ر نومبر بروز جمعہ صبح ۱۰ر بجے ہم پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق نکل پڑے۔ جس کی تفصیلات پچھلے صفحات میں گزر چکی۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۹۶ء بعد نماز جمعہ ہم حضرت سید شریف المدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ سے حاضری دے کر حضرت سیدنا رافع بن حبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ کی حاضری کے لیے نکلے تو الاٰل ہی میں ۴ر بج چکے تھے۔ منگلور شہر سے ۲۵ر کلومیٹر کے فاصلے پر ''اوپڑلا'' نام سے ایک مقام ہے، اس سے صرف ۳ر کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی آبادی پڑتی، جہاں چند دُکانیں ہیں۔ یہ جگہ کاسر کوڈ کے راستے ہی میں پڑتی ہے۔ وہیں سے بائیں ہاتھ پر قدرے بلندی لیے ہوئے ایک روڈ ''اچلمکوڈ'' کے لیے جاتا ہے۔ کئی جگہ راستے میں گاڑی روک روک کر پتہ کرنے پر ہم بالآخر صحیح جگہ پر پہنچ گئے۔ اوپڑلا سے تین کلومیٹر وہ آبادی آنے پر ہم بائیں ہاتھ پر مڑ گئے۔ اچلمکوڈ جہاں حضرت رافع بن حبیب رضی اللہ عنہ کی آخری آرام گاہ ہے، جوں جوں ہم آگے بڑھتے رہے، راستے میں روڈ کے کنارے سنگ میل کی طرح کئی جگہ سبز رنگ میں درگاہ حضرت رافع بن حبیب پتھروں پر لکھا نصب دکھائی دیا۔ ۴ یا ۵ر کلومیٹر کے بعد داہنے ہاتھ پر ایک بس اسٹاپ پڑتا ہے، مہاراشٹر میں روڈ پر بنے ہوئے اسٹاپ کی طرح اس اسٹاپ کے داہنے ہاتھ پر پگڈنڈی نما ایک پتلا سا روڈ ہے، جس پر صرف گاڑی ہی چل سکتی ہے۔ بس اسٹاپ کے پاس داہنے ہاتھ اس مختصر روڈ پر مڑ جائیں۔ اس علاقے میں وہ درگاہ بہت مشہور ہے۔ کسی سے بھی پوچھیے فوراً بڑے احترام وعقیدت سے حضرت رافع بن حبیب کا نام لیتا ہوا صحیح رہنمائی کرتا ہے۔

اب ہم اس ذیلی سڑک پر مڑ گئے۔ چونکہ برسات تاخیر لیے آخری سیزن کی منزل میں شام کے پانچ بج رہے تھے۔ دھوپ کی تمازت دم توڑ چکی تھی۔ بادلوں کی مہیب گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ کسی بھی وقت دھواں دھار بارش ہوسکتی تھی۔ روڈ

کے بائیں ہاتھ ایک کافی گہری ندی بہہ رہی تھی۔ ایک طرح سے وہ ذیلی مختصر سڑک دریا کا کنارا لیے ہوئے ہے۔ اس جھاڑ جھنکار، مستزاد سبزہ ہی سبزہ، ہریالی ہی ہریالی۔ دور دور تک پُرسکون سناٹا، جھاڑیوں اور درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا راستہ! بالآخر وہ مختصر پتلی سی سڑک جس پر ہماری گاڑی دوڑ رہی تھی، قدرے کھلے میدان میں پہنچ گئی۔ جس کی بائیں طرف وہی بڑا سا دریا اور ایک پہاڑ، آگے راستہ مسدود اور پہاڑی کے بعد لہریں لیتا ہوا سمندر۔ ابھی ہم دیدۂ حیرت کے ساتھ اسے دیکھ ہی رہے تھے کہ نگاہوں کا زاویہ دائیں طرف جانب شمال کی طرف پڑا، تو وہ حیرت مسرت میں بدل گئی۔ جسم کی ساری حسّیات آنکھیں بن گئیں۔ ایک بہت خوب صورت دیدہ زیب اور بہت عالی شان روضہ اور اسی سے ملی ہوئی عربی طرز پر ایک بہت ہی خوب صورت دیدہ زیب، وسیع و کشادہ مسجد جسے دیکھ کر دل کی خوش گوار دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ دل وفورِ مسرت سے جھوم اُٹھا۔ آرزوئے شوق مچل اٹھی کہ کعبۂ مراد نگاہوں کے سامنے جنت نگاہ بنا ہوا تھا۔

ہم اور سید فرید صاحب نے سب سے پہلے وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد حضرت سیدنا رافع بن حبیب رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ ایک ہی گنبد میں سات مرقد انور، پچھّم کی سمت سے سب سے پہلے صحابی رسول حضرت سیدنا رافع بن حبیب رضی اللہ عنہ کی آرام گاہ قدرے امتیازی شان لیے ہوئے۔ ان کے بعد انھیں کے محاذ میں ایک لائن سے چھ اور مزارات ایک دوسرے سے بالکل متصل۔ حضرت عمر، حضرت ہارون، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ، حضرت علی، حضرت عبدالرحمن قدست اسرارہم پچھّم سمت کی سنگ مرمر کی دیوار بطور کتبہ عربی رسم الخط میں صحابۃ الرسول رافع بن حبیب رضی اللہ عنہ سن وفات ۳۷ ہجری۔ اور پھر ان کے بعد چھ اور نام یعنی عمر، ہارون، عثمان، عبداللہ، علی، عبدالرحمن لکھا ہوا۔ روضۂ مبارک کے سامنے ایک مدرسہ بھی حفظ کا ہے۔ ہم لوگوں کو درگاہ شریف میں حاضر ہوتے دیکھ کر وہیں رہنے والے ایک صاحب بھی فاتحہ میں شامل ہو گئے۔ انھیں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ بقیہ چھ صحابی نہیں ہیں۔ ان میں تین شہدا اور اولیاء کرام ہیں۔ مبلغین اسلام کا جو مقدس قافلہ مالابار میں اُترا تھا، اُن میں ۱۲ر اصحابِ رسول پاک کی آخری آرام گاہیں آج بھی کیرالہ کی متبرک و مقدس سرزمین پر مختلف جگہوں پر ہیں۔ انھیں میں سے ایک سیدنا رافع بن حبیب بھی ہیں۔

یہ وہ مقدس نفوسِ قدسیہ ہیں جنھوں نے اللہ کی عظمت وجلال اور اس کی کبریائی و جبروت کا پرچم بلند کرنے، اسلام کے ابدی پیغام کو یہاں پہنچانے اور اسلام کی مقدس شمع سے ہندوستان کے ظلمتوں کو روشن کرنے، اور ہم ہندوستانیوں کے لیے ابدی سعادت کا دروازہ کھولنے کے لیے اپنے وطن عزیز مدینۃ الرسول کو چھوڑا۔ عشق ومحبت کے سالارِ قافلہ حضرت علامہ جامی فرماتے ہیں ؎

آرزوئے جنت الماویٰ بروں کردن ز دل — جنت ایں بسیں کہ بر خاک درت ماویٰ کنم

برصغیر کے مشہور عاشق رسول اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے جس کے لیے اپنی آرزوؤں کی بارات اس طرح سجائی ہے

یہ نہیں کہ خلد نہ ہو نکو وہ نکوئی کی بھی آبرو — مگر اے مدینہ کی آرزو جسے چاہے تو وہ سماں نہیں

اور فرماتے ہیں ؎

اُن کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے　　　آنکھوں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر کریں

پھول کیا دیکھوں میری آنکھوں میں　　　دشت ِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

اور جس کے لیے ڈاکٹر اقبال یوں عرض کناں ہیں ؎

خاکِ طیبہ از دو عالم خوشتر است　　　اے خنک شہرے کہ در وے دلبر است

اور پھر اپنا وطن تو اپنا وطن ہوتا ہے، جس کے لیے حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

خاک وطن از ملک سلیماں خوش تر　　　خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

پھر جس کا وطن طیبہ ہو، اس کا کیا پوچھنا اور پھر ان مقاصد کی عظمتوں کا حال کیا ہوگا جس کے لیے مدینہ طیبہ جیسا وطن عزیز قربان کیا جا رہا ہو۔ اور جس وطن کے لیے عقیدے کی زبان یہ بن چکی ہو کہ

طیبہ میں مر کے سیدھے چلے جاؤ آنکھیں بند
سیدھی سڑک یہ شہر شفاعت نگر کی ہے

دو لفظوں میں محدث اعظم ہند کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے الفاظ میں ؎

مدینے کا کچھ کام کرنا ہے سیّد　　　مدینے سے بس اس لیے جا رہا ہوں

تو انسانیت کا وہ مقدس قافلہ مدینے سے ہندوستان آ کر مدینہ کا ایسا زبردست کام کیا کہ قیامت تک آنے والی ہندوستانی مسلمانوں کی نسلیں اور ان نسلوں کی گردنیں ان کے احسانات کے بوجھ تلے دبی رہیں گی۔ ان کی بارگاہ میں حاضر ہو کر ایسی طمانیت، ایسا سکون، ایسی فرحت و مسرت اور سرشاری کی ایسی کیفیات سے دوچار تھے جس کی تشریح و تعبیر کے لیے زبان و قلم دونوں عاجز!

آنکھوں میں گرم گرم آنسو اور وفورِ جذبات سے گلے رُندھ جاتے! ان کے مواجہہ اقدس میں اللہ کی بارگاہ میں دست بہ دعا تھے کہ مولیٰ تیرے اس بندۂ خاص اور ان کے رفقا نے یہاں ہندوستان میں تیرے دین پاک کی جو خدمات انجام دی ہیں اس کے لیے ہم تمام مسلمانوں کی طرف سے تیرے کرم کے شایانِ شان جو صلہ ہو، وہ عطا فرما۔ یقین جانیں ایسی سرشاری اور ایسی کیفیات تو کبھی کبھی اور کہیں کہیں طاری ہوتی ہے ؎

اللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

ہم درگاہ شریف سے جب باہر نکلے تو مدرسہ کے چھوٹے چھوٹے بچّے ہمیں حیرت و شوق سے دیکھ رہے تھے۔ درگاہ شریف اور وہاں موجود کچھ ذمے داروں نے میزبانی کے فرائض انجام دینے کی خواہش کی تو ہم نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ہمیں ہر حال میں مغرب سے پہلے حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ کی بارگاہ میں پہنچنا ہے۔ وقت بہت کم ہے، موسم کا تیور بھی اپنے خلاف جا رہا ہے۔ البتہ سید فرید صاحب نے ایک مناسب رقم بچوں کے سامنے ان کے نگراں نظر والے ایک

صاحب کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ رقم ان بچوں کو ہدیہ ہے، اسے ان میں تقسیم کر دیں۔ ہم وہاں سے نکلے تو وقت کا دامن کافی تنگ ہو چکا تھا۔ قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ وہاں مناظر فطرت اکٹھا کر رکھا ہے۔ ایک طرف وسیع وعریض بھرا ہوا بہتا دریا، ایک طرف سمندر، ایک طرف پہاڑ، ایک طرف دریا کے کنارے کنارے جھاڑیاں و درخت اور جھاڑیوں و درختوں کے درمیان گذرتی ہوئی سڑک۔ مگر ہمیں ان مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونے کا نہ تو موقع تھا، نہ ہی ہوش کہ ہمارے سامنے سفر کا ایک مرحلہ باقی تھا۔ مغرب ہونے میں اب زیادہ وقت نہیں رہ گیا تھا۔ موسم کا تیور الگ غضب ناک تھا۔ ابھی ہمیں وہاں کاسر کوڈ، کاسر کوڈ سے جامعہ سعدیہ اور جامعہ سعدیہ سے واپس منگلور ہوتے ہوئے کئی کمبل، کم وبیش سو ۱۰۰ کلومیٹر سفر طے کرنا تھا۔ اس پر پہاڑ و ناہموار راستہ، برسات اس پر مستزاد اور موسم نامہرباں! اور اسی رات واپسی ہر حال میں ضروری کہ صبح واپسی کی فلائٹ ٹکٹ کنفرم تھی۔

سید فرید صاحب اتنی لمبی ڈرائیونگ کے عادی نہیں تھے، جسمانی اعتبار سے اپنے تمام بھائیوں میں سب سے نازک و نازک مزاج بھی ہیں۔ یہ تو ایک مقدس جذبہ اور بزرگوں کی عقیدت تھی جو اتنے خراب موسم، خراب و ناہموار روڈ اور پہاڑی راستے پر گاڑی چلوا رہی تھی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

نئی ٹاٹا سیرا گاڑی پوری برق رفتاری سے زمین کی طنابوں کو جیسے سمیٹ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم کاسر کوڈ شہر جو ساحل سمندر پر آباد ہے، وہاں پہنچ گئے۔ شہر کے آخری حصے پر بالکل سمندر کے کنارے آرزوؤں کی وہ جنت سجی سجائی کھڑی تھی جس کے لیے ہم نے بمبئی سے اتنا لمبا سفر کیا تھا اور جس کی بارگاہ میں حاضری کے صدقے میں ایسے ایسے مقامات پر شرف حضور نصیب ہوئی، جس کا کوئی تصور بھی حاشیہ خیال میں کبھی تھا ہی نہیں فلحمد للہ ربّ العٰلمین۔

چونکہ ہم باوضو تھے، اس لیے بغیر کسی تاخیر کے حضرت سید مالک بن دینار رضی اللہ عنہ کے مزار پُر انوار پر حاضر ہو گئے۔ بہت پُرشکوہ اور فنِ تعمیر کے اعتبار سے بھی بہت دیدہ زیب و دل آویز اور اس سے ملی ہوئی کاسر کوڈ کی پہلی تاریخی جامع مسجد، جو صرف اعلیٰ ترین لکڑیوں سے تعمیر ہوئی ہے۔ یہ وہی تاریخی مسجد ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان کی سب سے پہلی مسجد ہے۔ ہم لوگ وہاں فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ اور جیسے ہی ان کی بارگاہ سے نکلے مغرب کی اذان ہونے لگی اور موسم نے بھی آنکھیں دکھانی شروع کر دی۔ ہم نے مغرب کے لیے تازہ وضو کیا اور حضرت مالک بن دینار کی مسجد میں نماز مغرب باجماعت پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔ اسی کے بازو میں اسی مسجد سے ملا کر اسی طرز پر ایک اور بھی جدید مسجد کی تعمیر ہوئی ہے۔ بظاہر بادی النظر میں دونوں مسجدیں ایک ہی معلوم ہوتی ہیں، مگر وہاں کی انتظامیہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ محبت کی اس عظیم قدیم یادگار کو نئی توسیع و تعمیر کے وقت ذرا بھی نہیں چھیڑا گیا۔ حد یہ کہ سطح زمین سے مسجد کا فرش بلندی پر ہے اور تین زینوں کا متقاضی! مگر وہاں پر موٹی سی رسّی لگی ہے اور اس میں گانٹھ ڈال دی گئی کہ اس کو پکڑ کر اسی کی مدد سے لوگ مسجد کے فرش پر قدم رکھتے ہیں۔ واپسی میں سید فرید صاحب مجھ سے پوچھنے لگے: حضرت! فرش کی اتنی اونچائی سمجھ میں نہیں آئی، جبکہ وہاں دو تین زینہ ڈالا جا سکتا ہے۔ تجسّس تو مجھے بھی ہوا تھا مگر وہاں معاملہ تو یہ تھا کہ زبانِ یارِ من

ترکی و من ترکی نمی دانم کی منزل تھی۔ وہاں پر ہماری کوئی زبان سمجھنے والا نہیں تھا اور نہ ہی ہم ان کی زبان سمجھ رہے تھے۔ سید فرید صاحب اپنی انگریزی و کنڑ کی مدد سے کچھ کام چلا لیتے تھے۔ میں نے اپنے طور پر جو سمجھا وہ یہ کہ جن نفوسِ قدسیہ نے اوّل اوّل یہ مسجد تعمیر کی تھی، ۱۴ رسو سال قبل ان کے لیے اتنی بلندی کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ وہ قد آور لوگ تھے۔ ان کے قدوں کے تناسب سے یہ بلندی صحیح ہے۔ پہلے زمانے کے اعتبار سے کئی پشت پہلے سے ہماری نسلیں ان کے مقابلے میں بہت کوتاہ قد ہیں۔ غالباً یہ حسنِ ادب اور حسنِ احترام ہی ہے، جس نے محبت کی یادگار میں اتنی بھی ترمیم گوارا نہ کی اور اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کی یادگار کو جوں کا توں سلامت رکھا۔ یہی میرے سمجھ میں آیا اور یہی میں نے اپنے رفیق سفر کو سمجھایا، جو قرین قیاس بھی ہے۔ خدا کرے کہ یہی وجہ درست ہو۔

مجھے یقین تھا مولانا شاہ الحمید صاحب اپنے رفقا کو لے کر وہاں ضرور آئے ہوں گے جس کا انھوں نے حتمی طور پر یقین دلایا تھا۔ ہماری ملاقات اور وہاں پہنچنے کا وعدہ ظہر کے وقت کا تھا مگر ہمیں حالات نے وہاں اپنے وقت پر پہنچنے نہیں دیا۔ جس کی تفصیل میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں۔ ہم مولانا موصوف سے قطعاً شرمندہ نہیں کہ ہمارا وعدہ، وعدۂ محبوب نہیں تھا۔ ہمیں جو لوگ قریب سے جانتے ہیں انھیں بار بار اس کا تجربہ ہے کہ میرا وعدہ پتھر کی لکیر ہوتا ہے اور میں اپنے وقت و زبان کا پابند ہوں۔ اگر کوئی آسمانی سلطانی نہ ہو جائے۔ اور میرے ساتھ آسمانی سلطانی راستے میں ہوئی، اس لیے میں دیئے ہوئے وقت پر تو نہیں پہنچ سکا، البتہ اسی تاریخ اور اسی دن میں وہاں حاضر ہو گیا۔ میں مولانا موصوف کو بھی کوئی الزام نہیں دے سکتا کہ آخر کوئی کب تک انتظار کرے گا۔ وہ آئے ہوں گے اولا نتظار اشد من الموت کے مرحلے سے گزرنے کے بعد چلے گئے ہوں گے۔ تاہم وہاں پہنچنے کے بعد بھی ہمارا ارادہ جامعہ سعدیہ پہنچنے کا تھا۔

مغرب کی نماز سے گرج وتڑپ کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع، ساتھ طوفانی ہواؤں کے جھکڑ، قریب ہی سمندر کی مہیب موجیں، طوفانی ہواؤں کے جھکڑ، پہاڑی راستہ، انجان منزل، ایک طرح سے ہم طوفانِ باد و باراں میں پھنس گئے۔ مجھے بھی کافی وحشت و گھبراہٹ تھی۔ میں نے فرید بھائی سے مشورۃً پوچھا کہ جامعہ سعدیہ کے لیے اب کیا ہو گا؟ انھوں نے کہا: حضرت! اب تو کسی طرح گھر پہنچنے کی سوچیے۔ صبح ہی آپ کی فلائٹ ہے۔ اس طوفانی بارش میں راستے میں کوئی آدمی بھی نہیں ملے گا کہ گاڑی روک کر اس سے جامعہ سعدیہ کا راستہ پوچھوں۔ فرید بھائی نے میرے خیال کی تائید کر دی۔ میری ہمت اب مزید آگے جانے کے لیے جواب دے رہی تھی۔ بعد نمازِ مغرب کافی دیر تک ہم لوگ مسجد میں بیٹھے رہے۔ گاڑی قدرے فاصلے پر کھڑی، بارش کا عالم یہ تھا کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے ہم شرابور ہو جاتے۔ بارش رکنے کے انتظار میں ہم وہاں رُکے رہے مگر جب بارش نہیں رُکی تو ہم لوگ کسی نہ کسی طرح بھیگتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ سید فرید نے واقعہ بڑی ہمت کی۔ مسلسل کئی دنوں سے شادی کی دوڑ دھوپ اور اس میں بھاگ دوڑ و بیداری، پھر صبح ہی سے گاڑی چلاتے رہنا، وہ بھی خلافِ عادت اور پھر رات کو یہ مرحلۂ جاں گداز! اسی لیے ہم جامعہ سعدیہ کے قریب پہنچ کر بھی اس کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی نہ کر سکے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی! زندگی نے وفا کی تو ایک اطمینان کا سفر ضرور کریں گے۔ یہی سید فرید صاحب کا

بھی عزم ہے ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

بہر حال ہم وہاں سے چل پڑے۔ چونکہ واپسی کا راستہ جانا پہچانا تھا، اس لیے قدرے اطمینان تھا مگر پھر بھی بارش اور طوفانی ہوائیں اور اونچا نیچا پہاڑی راستے وحشت زدہ کیے ہوئے تھے۔ اور بارش کا سلسلہ تھا کہ طول شب فرقت بنتی جا رہی تھی اور اس نے کرناٹک کے بارڈر تک پیچھا نہیں چھوڑا۔ آج بھی اس رات کے تصور سے جھرجھری سی آجاتی ہے۔

حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ: وہاں کی مقامی آبادی آپ کو صحابی یقین کرتی ہے۔ بعد نمازِ مغرب ہم نے وہاں کے امام صاحب سے عربی زبان میں معلوم کیا تو انھوں نے بڑے فخر و مسرت کے ساتھ صحابی بتایا اور یہ بھی کہا کہ یہاں ۱۲/ اصحابِ رسول پاک کے مزاراتِ مقدس ہیں، جن میں اچلمکوڈ میں ایک نام انھوں نے حضرت رافع بن حبیب کا لیا۔ کچھ نام اور بتائے، جن کے مزارات کنانور میں ہیں۔ کچھ اور مقامات کے نام انھوں نے لیے جو میری زبان پر اپنی نکارت کے سبب چڑھ نہیں سکے۔ بنگلور کرناٹک کے مشہور عالم دین اور پیر طریقت حضرت علامہ سید شمس الحق صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے بڑے اعتماد و یقین سے صحابی بتایا۔ لیکن میرے علم و اطلاع کے مطابق جس مالک بن دینار کی بڑی شہرت اور روحانیت کی دنیا میں ان کے بڑے چرچے اور جن کی روحانی حیثیت بڑی آفاقی ہے، اگر یہ وہی مالک بن دینار ہیں تو یہ تابعی ہیں۔ چنانچہ تصوف کی مشہور ترین انتہائی معتمد ماخذ و حوالے کی حیثیت والی کتاب ''الطبقات الکبریٰ'' میں امام سید عبدالوہاب شعرانی نے جلد اوّل، صفحہ ۸۶ پر تابعین کی فہرست میں بتیسویں نمبر پر آپ کا ذکر جمیل کیا ہے اور سن وصال ۱۳۱ ہجری قرار دیا ہے۔ اس میں آپ کے حالات کی تفصیل تو نہیں البتہ آپ کے فضائل و مناقب، خصوصیات و درجات کا اجمالی تذکرہ اور آپ کے چند اقوال کا ذکر ہے۔

اسی طرح ایک اور تذکرہ و تصوف کی کتاب جو تصوف کی دنیا میں سندِ اعتبار کا درجہ رکھتی ہے، جو ماخذ و حوالے کی منزل میں بھی ہے، یعنی ''تذکرۃ الاولیاء'' اس میں حضرت خواجہ فریدالدین عطار نے بھی آپ کا تذکرہ تابعین ہی کے ضمن میں کیا ہے۔ چھیانوے اجلّہ اولیاء عظام و بزرگانِ دین کے تذکرے میں آپ کا ذکر چوتھے نمبر پر کیا ہے اور آپ کو عظیم روحانی مقتداؤں میں لکھا ہے۔ حضرت امام جعفر صادق، حضرت اویس قرنی، حضرت امام حسن بصری کے بعد ہی آپ کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ جس میں آپ قیام دمشق حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی جامع مسجد میں بتایا ہے اور اسی کا عام طور پر شہرہ بھی ہے۔ ''تذکرۃ الاولیاء'' کے مطابق آپ کافی دولت مند اور بہت خوب صورت تھے۔ آپ کی ولادت اپنے والد دینار کے دورِ غلامی ہی میں ہوئی تھی۔ گو ظاہری طور پر آپ غلام زادے تھے مگر باطنی طور پر فیوض و برکات و روحانیت کا سرچشمہ تھے۔ کشورِ روحانیت کے بڑے بڑے تاجداروں میں آپ کا نام سرفہرست رہتا ہے۔

مجھے وہیں سے ایک کتابچہ دستیاب ہوا تھا۔ جس کا نام بھی حضرت مالک بن دینار رضی اللہ عنہ ہے۔ مصنف کی حیثیت سے اس کے ٹائٹل پر ٹی عبید اور مترجم کے۔ احمد ہیں۔ وہ کتابچہ بھی بہت غیر مربوط اور کافی اضطراب لیے ہوئے ہے۔ بہت

مختصر ونا کافی۔ اس کے صفحہ ۱۹ پر حضرت مالک بن محمد کے زیر عنوان یہ تحریر ہے: ”بعض حضرات نے مالک بن محمد بن دینار اوران کے ساتھیوں کو حضرت رسول ﷺ کا صحابی قرار دیا ہے، یہ رائے ضعیف ہے۔“

ٹی۔ عبید صاحب نے اپنے اس خیال کے اظہار کے لیے شیخ زین الدین مخدوم کی ایک کتاب ”تحفۃ المجاہدین“ کا سہارا لیا ہے۔ اور یہی ٹی۔ عبید صاحب اس سے قبل صفحہ ۸ پر یوں رقم طراز ہیں:

”ساتویں صدی عیسوی میں عربستان میں اسلام کا ظہور ہو چکا تھا۔ ساحل مالابار (کیرالہ) میں بھی اسلام پہنچ چکا تھا، جس کے قطعی دلائل موجود ہیں۔ راجہ چیرمان پرومال جس کی راجدھانی کڈنگلور تھی، اسلام قبول کر کے عرب چلا گیا تھا۔ اسی کے اصرار پر ایک وفد کیرالہ پہنچا۔ جس میں مالک بن دینار، اشرف بن مالک جیسے بزرگ موجود تھے۔ اس وفد نے کیرالہ میں پہلے دس مسجدیں تعمیر کیں۔ ان تاریخی نقطوں پر مؤرخین متفق ہیں اور کیرالہ کے مسلم وغیر مسلم اکثریت ہمیشہ اس بات پر متفق رہی کہ چیرومان پرومال کی روانگی حضور ﷺ حیاتِ طیبہ ہی میں ہوئی وغیرہ وغیرہ۔

پھر خود انھوں نے اپنی مذکورہ بالا تحریر کو ”تحفۃ المجاہدین“ کے حوالے سے بے دلیل قرار دیا۔ مالابار، کیرالہ میں اسلام عرب تاجروں کے ساتھ عہدِ رسالت ﷺ میں پہنچ چکا تھا اور مالابار کا راجہ زمورن یا سامری نے 'معجزہ شق القمر' اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اور عرب مسلمان تاجروں سے اس کی تصدیق کر کے مسلمان ہو گیا تھا۔ سرکارِ دوعالم ﷺ ظاہری حیات ہی میں۔

مشہور مؤرخ و محقق اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اپنی مشہور و مبسوط اور بلند پایہ ”آئینۂ تاریخ نما“ کے ابتدا ہی میں اس پر بڑی تحقیقی و تفصیلی بحث کی ہے۔ اور انھوں نے اپنے تذکرہ میں بھی مالک بن دینار و مالک بن حبیب اور ان کے ساتھیوں کی عظیم خدمات کو سفر نامہ ابن بطوطہ وغیرہ کے حوالوں سے اور ان کے متعدد مقامات پر مساجد کی تعمیر کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ ہم علمائے کیرالہ بالخصوص مرکز الثقافۃ السنیہ الاسلامیہ اور جامعہ سعدیہ کاسرکوڈ کے علمائے کرام اور اربابِ علم و دانش کی خدمت میں مؤدبانہ ومخلصانہ گذارش کریں گے کہ آپ حضرات مقامی ہیں، کیرالہ کی قدیم تاریخ اور ملیالم زبان یا عربی میں کہیں نہ کہیں ضرور یہ حقیقت واشگاف ہوگی۔ تھوڑی سی محنت وتوجہ کی ضرورت ہے، اس کی تحقیق بہر حال ہو جانی چاہیے، کہ یہ وہی مالک بن دینار ہیں جن کا تذکرہ تصوف و تذکرہ کی مستند کتابوں میں بحیثیت تابعی کیا گیا ہے اور جن کا قیام دمشق بتایا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جذبۂ تبلیغ دین انھیں کھینچ کر ہندوستان لایا ہو۔ یا یہ کوئی الگ مالک بن دینار ہیں، جو واقعی صحابی ہوں۔ اس لیے کہ مالابار کیرالہ میں صحابہ کی تشریف آوری متحقق و متیقن ہے۔ اور جنوبی ہند میں بڑے بڑے صحابہ کرام کے مزارات بھی یقینی طور پر موجود ہیں۔ بعثتِ نبوی سے قبل بھی عرب تاجر شمال کی جانب بحر اسود کے ساحل اور روس تک اور جنوب مشرق میں مالابار و منڈل سراندیپ، جاوا، سماترا اور چین کے ساحل تک بادبانی کشتیوں میں بیٹھ کر تجارت کی غرض سے جاتے تھے، اور اسلام لانے کے بعد یہی تاجر اپنی تجارت کے ساتھ ہی اسلامی مبلغ کی حیثیت بھی اختیار کر چکے تھے۔ سندھ میں محمد بن قاسم اور ہند میں سبکتگین و محمود غزنوی سے بہت پہلے اسلام بغیر کسی تیر و تلوار اور لاؤ لشکر کے صدیوں پہلے پہنچ

چکا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ چین کی بندرگاہ پر حضور ﷺ کے ایک صحابی حضرت وہب رضی اللہ عنہ کا مزار اور دوسری بندرگاہ محمود بندر پر حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ اور مدراس سے بارہ میل جنوب کے ساحل پر مشہور صحابی رسول حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ کا مزار مقدس موجود ہے۔

حضرت رافع بن حبیب کا ہم ذکر کر ہی چکے ہیں جو اچلمکوڈ میں آرام فرما ہیں۔ کنّا نور میں کئی صحابہ کے مزار ایک ہی جگہ پر ہیں، جس پر ھذا قبور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہوا ہے۔

جب ایسی ظاہر و باہر حقیقتیں ہیں تو ہوسکتا ہے اس نام کے کوئی صحابی ہوں، ضرور ہوں۔ کتب واحادیث و اسماء الرجال میں اگر یہ نام نہیں ملتا تو یہ ضروری نہیں کہ کتب احادیث و کتب اسماء الرجال میں سارے صحابہ کا احاطہ ہو گیا ہو۔

حضور پاک ﷺ کے مبارک و مسعود عہد ہی میں بہت سارے اصحاب رسول بحیثیت تاجر دنیا کے دور دراز گوشوں میں تجارت کے ساتھ ہی اسلامی مبلغ کی حیثیت سے گئے اور وہیں بود و باش اختیار کرلی اور پھر ان کا عرب میں آنا ہوا ہی نہیں۔

آخر محمد بن قاسم کے سندھ پر فاتحانہ حملے کا اصل سبب تو ان جہازوں کا لوٹا جانا ہی ہے، جس کو سراندیپ کے راجہ نے خلیفۃ المسلمین ولید بن عبدالملک کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں سراندیپ میں بس جانے والے کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو حج کرنا اور اپنا وطن بھی دیکھنا چاہتے تھے اور کچھ بیوہ عورتیں و یتیم بچے تھے، جو بیوہ و یتیم ہو جانے کے باعث اب اپنے وطن ملک عرب کو لوٹ رہے تھے۔ راجہ داہر نے جہازوں کو لوٹتے وقت انھیں بھی لوٹ لیا تھا اور بڑی بے دردی کے ساتھ ان پر زندگی کے تمام دروازے بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

یہ راجہ داہر اسی راجہ چچ کا بیٹا تھا جس نے بدھ دھرم کے پیرو راجہ ساہ سی کے ۱۰۶ھ میں اس کے تخت پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا۔ اگر یہ مسلمان بہت پہلے سے جنوبی ہند آ کر بود و باش نہ اختیار کر لیے ہوتے تو ان کی یتیم اولادیں اور بیوائیں کہاں سے آتیں؟ بے شک ان کے آنے کا زمانہ زیادہ تر صحابہ ہی کا زمانہ ہے۔

میں اپنے رب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے بے کراں فضل و عنایات اور اپنے بندۂ خاص قطب ربّانی، محبوبِ سبحانی، غوثِ صمدانی، محی الدین جیلانی سیدنا و مرشدنا و مولانا ابو محمد سیّد عبدالقادر جیلانی کے صدقے و بطفیل مرشدنا الکریم حضور شعیب الاولیاء، مجھے تہی دست و تہی داماں و بے سر و ساماں و بے زاد و راحلہ انسان کو مسلسل ارجمندیاں عطا فرمائیں اور اپنے فضل و عطا کے دروازے کھول دیئے۔ فالحمد للہ ربّ العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہٖ واصحابہ وابنہ الغوث الاعظم الجیلانی البغدادی اجمعین۔

ماخطا آریم تو بخشش کنی — نعرہ انی غفورٌ می زنی

☑☑☑☑☑☑

سفرنامۂ عراق

آل انڈیا تبلیغ سیرت کو اپنی اس ارجمندی اور سربلندی پر فخر ہے کہ اس کو ایک بار پھر سرکار غوثیت کبریٰ نے اپنی بارگاہِ رحمت میں طلب فرمایا۔ بغداد کی "عالمی کانفرنس" میں شرکت تو ایک بہانہ تھی ؎

اصل مراد حاضری اُس پاک در کی ہے

تبلیغ سیرت برصغیر ہند میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی ایک عظیم نمائندہ مذہبی تنظیم ہے۔ جسے ملک وملت کے جلیل القدر علما ومشائخ نے اب سے تینتالیس ۴۳ سال قبل ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۹ء کو سرزمین بریلی شریف (یوپی) میں اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مولانا شاہ احمد رضا قادری قدس سرہٗ العزیز کے عرسِ مبارک کے موقع پر قائم کیا اور اس کی زمامِ قیادت مشائخ زمانہ کے امام، اکابرین وقت کے پیشوا، فقیہانِ عصر کے استاذ، مجاہدین صف شکن کے قائد اعظم، سماحۃ الشیخ حضرت علامہ مولانا الشاہ محمد حبیب الرحمن قادری عباسی رئیس اعظم اڑیسہ ومتولی رؤفیہ اسٹیٹ دھام نگر اڑیسہ کے ہاتھ میں دے دی۔ موصوف نے اپنی دولت ومجاہدانہ جذبۂ ایثار سے اس تنظیم کو بہت متحرک اور فعال بنایا اور اس کے ذریعے دینِ متین کی ایسی خدمت کی اور قومِ مسلم کی آبرومندانہ بقا کے لیے وہ قربانیاں دیں کہ ؎

ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

یوں تو آل انڈیا تبلیغ سیرت کی پوری زندگی کارناموں ہی سے عبارت ہے۔ اس نے ۴۳ر سال کے طویل عرصے میں حق اور احقاقِ حق کی خاطر ظلم وجبر کے ماحول میں بھی ایک لمحے کے لیے مصلحتوں سے سمجھوتہ نہیں کیا اور جب بھی قوم وملت پر کوئی وقت پڑا تو حالات وزمانہ کے تیور کو نہ دیکھتے ہوئے پوری تب وتاب جاودانہ کے ساتھ میدانِ عمل میں اُتر کر کام کیا۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

حال ہی میں تبلیغ سیرت کو اُس وقت ایک بڑی قربانی سے گزرنا پڑا جب پوری دنیا کی سپر طاقتیں ایک چھوٹے سے ملک "عراق" کے خلاف ایک معمولی سے مسئلہ کو لے کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئیں۔ میڈیا کے ذریعے رائی کو پربت بنا کر پوری دنیا کو رائے عامّہ کو گمراہ کر دیا اور زبردست پروپیگنڈے سے ماحول کو اس حد تک بگاڑ دیا کہ حق کی حمایت میں زبان کھولنا جرم سمجھا جانے لگا۔

ایسے عالم میں بلا خوف لومتہ لائم اور داد وصلہ سے بے نیاز ہو کر حق کے لیے میدانِ عمل میں اُتر جانا کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں۔ اور آل انڈیا تبلیغِ سیرت نے یہ فریضہ ادا کیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:۔

عراق نے اپنے سابقہ حصّے کویت کو اپنے قبضے میں لیا جہاں الصباح خاندان اپنی رعایا کا خون چوس چوس کر دن رات

عیاشیوں اور مغربی سامراج خصوصاً امریکہ کے مفادات کی تکمیل اور اس کی حفاظت میں لگا ہوا تھا، اسرائیل اور سعودیہ کی طرح وہ بھی امریکی مفادات کا ایک مستقر بن چکا تھا۔ امریکہ کی غلامی میں اس حد تک ڈوب چکا تھا کہ اس کے ذریعے امریکہ کسی بھی وقت عراق کا تختہ پلٹ کر کویت وسعودیہ کی طرح اسے بھی اپنی عملداری میں لے سکتا تھا۔ اگر عرب دنیا کے مردِ آہن عراق کے صدر صدام حسین ذرا بھی چوکتے تو بجائے کویت کے عراق پر کویت کے ذریعے امریکہ حملہ کر چکا ہوتا۔

عراق پر قبضے کا منصوبہ بڑی تیزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا تھا کہ صدام حسین نے امریکہ سے زیادہ تیزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا داؤں اسی پر اُلٹ دیا یعنی 2 اگست 1990ء کی شب میں بڑی خاموشی کے ساتھ کویت پر قبضہ کرلیا۔ امریکہ سناٹے میں آ گیا۔ پوری دنیا پر سنسنی طاری ہوگئی اور ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ حالانکہ اس طرح کا واقعہ تاریخ کا کوئی پہلا حادثہ نہیں تھا۔ ماضی قریب ہی میں اس سے کہیں زیادہ سنگین واقعات ہوئے۔ چین نے تبت پر قبضہ کرلیا۔ پناما امریکی دہشت گردی کا شکار ہوا مگر اس طرح کے کسی بھی المیے پر ایسا ہنگامۂ عالم برپا نہیں ہوا۔

اس واقعہ نے امریکہ کی نیند حرام کردی۔ اس سے برطانیہ کی بوڑھی گھوڑی (تھیچر) بے لگام ہوگئی، روس ہل گیا، سعودیہ لرز اُٹھا، اسرائیل بدحواس ہوگیا۔ چھوٹی چھوٹی عرب ریاستوں کے شیوخ، جن کے رات دن کے مشغلے ہی یہ تھے کہ ۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

سکتے میں آگئے اور کویت کا عیاش و بزدل حکمراں جابر جو عمر کی اس منزل پر تھا کہ ۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر مینا میرے آگے

اپنی چار بیویوں اور 66 داشتاؤں کو چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ میرے پیچھے ان مہ وشوں، مہ جبینوں، لالہ رخوں اور گل بدنوں کا کیا حال ہوا، جو صرف اس کی بوڑھی و ہوسناک نگاہوں کے لیے سامانِ تسکین تھیں ورنہ ان غزالانِ چمن کو اس تلخ حقیقت کا نہ صرف احساس بلکہ تجربہ رہا ہوگا کہ ۔

نہ خنجر اُٹھے گا نہ تلوار ان سے
یہ بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں

واضح رہے کہ یہ وہی بدباطن حکمراں ہے جس کی حکومت نے سلمان رشدی کی ناپاک کتاب شیطانی آیات کی اشاعت میں 40 فیصد حصّہ لیا۔ اس خبیث اشاعتی ادارہ (پن گوین) میں جس نے اسے چھاپ کر دنیا بھر کے مسلمانوں کو تڑپایا اور جس کی وجہ سے سیکڑوں مسلمان اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کی حرمت و ناموس پر قربان ہوگئے۔ ایک طرح سے وہ مچھیرا اہلِ بیت اطہار و خاندانِ نبوت کی حرمتوں کا سوداگر بھی تھا۔

کویت پر عراق کے قبضہ سے نہ صرف برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش بلکہ پوری دنیا کے ایمان فروش سعودی ایجنٹوں مذہبی بازی گروں اور ان کے مذہبی و نیم مذہبی اداروں میں صفِ ماتم بچھ گئی کہ کویت کے پیچھے سعودی عرب بھی برباد ہو جائے تو پھر ہمارا کیا ہوگا۔

یوں تو پوری دنیا کے ذرائع ابلاغ اور میڈیا پر صیہونی و مغربی سامراج ہی کا قبضہ ہے اور برصغیر میں ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے یہ ایمان فروش بھیڑیئے اور سفید پوش دلال جو براہِ سعودیہ و کویت من وجہ صیہونی و مغربی سامراج کے ایجنٹ ہیں، ان کے لیے کویت کی جلاوطن حکومت اور حکومتِ سعودیہ نے اپنے خزانے کا منہ کھول دیا اور وہ خدائی خوار بھی اس کو اپنے زندگی کی آخری قسط سمجھتے ہوئے اپنے پہلے سے بکے ہوئے ضمیر و ایمان کو پیٹرو ڈالر کی نئی حرارت سے توانا کر کے پریس و قلم پر اپنے قبضے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دن رات سعودی و یہودی اور امریکی مفادات کی تکمیل میں لگ گئے۔

اس کی صرف ایک مثال مسلمانوں میں بدنامِ زمانہ تنظیم جمیعتہ العلماء ہے جو خلیج کی جنگ کے فوراً بعد بڑی ٹوٹ پھوٹ کی شکار ہوئی اور بڑی تعداد میں اس کے اہم ذمہ داران یا تو نکالے گئے یا خود ہی نکلے۔ اس تنظیم کو ''تحفظ حرمین'' کے نام سے عراق کے خلاف غلط پروپیگنڈا کے لیے 48 لاکھ ڈالر سعودی عرب و کویت سے ملے تھے۔ جس کی بندر بانٹ کے نتیجے میں بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی۔ حالاتِ حاضرہ سے باخبر حضرات کا ایک بڑا طبقہ اس حقیقت صادقہ سے اچھی طرح واقف ہے اور بڑے اخبارات نے اپنے اس وقت کی اشاعت میں 48 لاکھ ڈالر کے اسکینڈل پر بڑی بڑی سرخیاں لگائی تھیں۔

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

عراق کے اس تاریخی اقدام سے پوری دنیائے انسانیت کے حقیقت پسند افراد خاص کر عرب دنیا کے غریب عوام جن پر زندگی کی تمام آسائشوں کے دروازے ان کے حکمرانوں نے بند کر رکھے ہیں بہت خوش ہوئے اور مظلوم فلسطینیوں کی تو عید ہوگئی کیونکہ عراق کے صدر صدام حسین نے کویت کی آزادی کو بیت المقدس اور آزادی فلسطین سے جوڑ دیا تھا۔

صدام حسین عراق کے صدر بننے سے پہلے بھی آزادی فلسطین کے بڑے علم برداروں میں سے تھے، صدر بن جانے کے بعد ان کی ہمدردیوں میں اور اضافہ ہوگیا۔ کویت پر قبضہ کے اہم ترین مقاصد میں ایک بڑا مقصد یہ بھی کارفرما تھا کہ فلسطین و بیت المقدس کی آزادی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک سعودی عرب نہ چاہے، کیونکہ اس پورے خطے میں سعودی عرب کو اسرائیل کا بڑا بھائی ہونے کا حق حاصل ہے۔ برطانیہ نے اسی بڑے بھائی کی مرضی و اجازت ہی سے فلسطین پر یہودیوں کا قبضہ کرایا ہے اور بیت المقدس پر غاصبانہ قبضے کا ذمہ دار بھی سعودی عرب ہے۔ خلیج کے اس معرکۂ عظیم نے اس حقیقت کو دن کے اجالے میں پھر سے ننگا کر دیا ہے۔

خطۂ عرب میں اسرائیل کا استحکام سعودی عرب کی سیاسی ضرورت بھی ہے۔ اسرائیل کے استحکام میں درپردہ سعودیہ

کی مدد بھی شامل ہے چنانچہ 1981ء میں عراقی ری ایکٹر کو اسرائیل نے امریکی طیارہ ایف نمبر 15 و ایف نمبر 16 کے ذریعہ جو تباہ و برباد کیا تھا وہ بھی سعودی عرب کی مرضی و اجازت سے اسرائیلی طیاروں نے عراقی ری ایکٹر کی تباہی کے لیے جو اُڑان بھری وہ سعودی حدود ہی سے بھری گئی اور سعودی عرب سے جہازوں کے لیے پٹرول بھی حاصل کیا گیا۔

کویت پر قبضہ سعودیہ اور امریکہ کی کمزور ترین رگ پر انگلی رکھنا بھی تھا، چنانچہ کویت کی آزادی کے مطالبے پر صدام حسین نے بڑا ہی مومنانہ اعلان کیا تھا۔ پٹرول کی دولت سے مالا مال کویت لے لو، اس کے بدلے میں مسلمانانِ عالم کو ان کا بیت المقدس واپس کردو۔ لیکن خائن الحرمین جواری فہد نے اس ایمان بھرے مطالبے کو بڑی شدت کے ساتھ مسترد کردیا۔ صدام حسین کے اس مومنانہ اعلان نے پوری دنیا کے مسلمانوں میں مسرت کی لہر دوڑا دی کہ اب ضرور بیت المقدس آزاد ہوجائے گا۔ اس ایمانی پیشکش کے باوجود دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سعودی ایجنٹوں نے عراق کے خلاف کردار کشی کی مہم چلائے رکھی، صیہونی و امریکی میڈیا نے اپنی الگ مہم چلا رکھی تھی۔

اہلِ حق، اہلِ ضمیر، اہلِ انصاف، اہلِ ایمان کی آواز، مغربی ذرائع ابلاغ اور پریس میڈیا کی دھاندلیوں اور خرمستیوں میں، نقارخانے میں طوطی کی آواز ہوکر رہ گئی تھی اور پوری دنیا کی رائے عامہ کو عراق کے خلاف اتنا سخت کردیا گیا اور عراق کے خلاف فضا کو اس قدر بوجھل کردیا گیا کہ ایسے مخالفانہ ماحول اور تاریک ایام میں عراق کی حمایت میں زبان کھولنا دیوانگی سمجھا جانے لگا۔ اپنوں کا ایک خاص طبقہ بھی ”رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی“ کے فارمولے کو کیش کرنے میں مصروف تھا۔ کویت کی آزادی کے بہانے عراق عظیم کو تباہ و برباد اور اسرائیل کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی خاطر سعودی حکمراں فہد کی دعوت پر پوری دنیا کی سپر طاقتیں اپنے قہرمانی اور جدید ترین ٹکنالوجی قوتوں کے ساتھ 28 ملکوں کو لے کر عرب کی مقدس سرزمین پر ڈیرہ ڈال چکی تھیں۔ خائن الحرمین فہد یہود و نصاریٰ کی فوج کو ان کی تمام آلائشوں شراب و خنزیر اور فاحشہ عورتوں کے ساتھ اس مقدس سرزمین پر بلا چکا تھا جس کے لیے حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

"اَخْرِجُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى مِنْ جَزِيْرَةِ الْعَرَبِ۔"

ترجمہ:۔ یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔

الغرض سارا عالم "الکفر ملۃ واحدۃ" کی بنیاد پر ایک طرف، بیچ میں لٹکی ہوئی عرب کی منافق ریاستیں بھی اسی طرف، کچھ سیاسی طاقتیں نیمے دروں نیمے بروں کی منزل میں تھیں اور کچھ دانم و لے نہ گویم کا مظاہرہ کررہی تھیں۔ ایسے نازل حالات میں جب ہر چہار سو عراق کے تعلق سے ایک پُرہول سنّاٹا، ایک ہیبت ناک خاموشی اور ایک پُرسکوت بےچینی طاری تھی۔ ایسے عالم میں آل انڈیا تبلیغ سیرت تحفظ حرمین، مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت اور عراق کی حمایتِ حق کا جذبہ لے کر میدانِ عمل میں اُتری اور سیّدنا غوثِ اعظم محی الدین جیلانی کی محبت کا سرمایہ لے کر برسات کے خطرناک تیور کو نگاہ میں رکھتے ہوئے عراق کی حمایت کا فیصلہ کرلیا گیا۔

جو سر دے کر تیرا سودا خریدے
خدا دے عقل وہ عاقل ہے یاغوث

(اعلیٰ حضرت)

عراق کی حمایت کے فیصلے کی خبر بمبئی میں عراقی قونصل خانہ میں پہنچی تو پورا عملہ حیرت زدہ ہوگیا۔ مولانا محمد فروغ القادری نے جو کم سنی کے باوجود کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں، جو بیک وقت بہترین مقرر اور ایک اچھے صاحبِ قلم ہیں اور جدید عربی اہلِ زبان کی طرح لکھتے، بولتے اور پڑھتے بھی ہیں۔ اور جو پہلے تبلیغ سیرت بمبئی کے جوائنٹ سکریٹری بھی تھے۔ (اس وقت موصوف ڈربن افریقہ میں اپنی بہترین صلاحیتوں سے اسلام وسنّیت کا اجالا پھیلا رہے ہیں)۔ قونصل خانے کے ایک ذمے دار آفیسر الحاج محمد علی العثمان کو فون پر یہ اطلاع دی تو وہ خود حیرت ومسرت سے رو پڑے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا: برادرِ عزیز! کیا کچھ لوگ ایسے ہیں جو ہمیں کویت کے مسئلے میں حق پر سمجھتے ہیں؟ مولانا نے جواب میں فرمایا کہ ہندوستان کے کروڑوں لوگ سمجھتے ہیں کہ اس مسئلے میں عراق ہی حق پر ہے۔ لیکن اپنے اندر ایسے نازک ترین ماحول میں اظہار کا حوصلہ نہیں پاتے۔ انگلیاں اُٹھنے کے ڈر سے کوئی تنظیم آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر پاتی کہ اس کے پیچھے سیکڑوں، لاکھوں لوگ چل پڑیں۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت مخلص مسلمانوں پر مشتمل ایک ایسے عظیم دینی پیشوا اور کروڑوں کے مقتدیٰ کی تنظیم ہے۔ جو مجاہدِ ملّت اور مجاہد اعظم ہند تھا۔ جو زندگی بھر غوث الاعظم محی الدین جیلانی کی محبت کا بیمار رہا اور اس کی آخری سانس بھی یاغوث پر ٹوٹی ہے۔ وہ زندگی بھر مفتی اعظم کے اس شعر کی عملی تفسیر بنا رہا۔

یہ آنکھیں یہ سر ہے، یہ دل یہ جگر ہے
جہاں چاہو رکھو قدم غوثِ اعظم

ان کی حیرت حق بہ جانب تھی کہ اب تک گندم نما جَو فروشوں کی جو بھیڑ ان کے گرد تھی وہی سعودی عرب میں ہندوستان کے وہابیوں کے نمائندہ وترجمان بن کر ریال کی آل بنے تھے۔ عراق میں یہ قادری سنّی بن جاتے تھے اور سعودی عرب میں وہابی سلفی۔ گویا گنگا گئے تو گنگا رام، جمنا گئے تو جمنا داس۔ لیکن جب وقتِ امتحان آیا تو سارے گنہگار چہرے بے نقاب ہوگئے۔ اب تک ہندوستان کے جو اصحابِ جبہ ودستا المصدقون فی الهند للعراق تھے۔ خلیج کی جنگ نے ان کے چہرے سے منافقت کا نقاب نوچ کر پھینک دیا کہ

دو رنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا
سراسر موم ہو یا سنگ ہوجا

آخر کار کئی صبر آزما اور ہمت شکن مرحلوں سے گزرنے کے بعد آل انڈیا تبلیغ سیرت نے مرکزی صدر حضرت علّامہ محمد

عاشق الرحمان قادری کی قیادت میں 6 ستمبر1990ء بروز سنیچر خلیج عرب میں امریکی فوجی مداخلت اور سعودی حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اور اسلام دشمنی کے خلاف ایک عظیم الشان مظاہرے کا اعلان کرہی دیا۔

جولوگ تبلیغ سیرت سے واقف ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرف سے باخبر ہیں کہ پورے ملک میں یہی تنہا اہلِ سنّت کی وہ تنظیم ہے جوسعودی نجدی حکمرانوں کے خلاف احتجاجی جلوس نکالنے میں ماہر مانی جاتی ہے۔ ماضی میں تبلیغ سیرت نے نجدیوں کے خلاف بڑے بڑے تاریخی مظاہرے برپا کیے ہیں، جس میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ شامل ہوئے ہیں۔ تبلیغ سیرت کے ذمہ داروں کو اس حقیقت کا اچھی طرف احساس تھا کہ اس طرح کا اعلان ہوتے ہی بمبئی میں سفید پوش سیاسی، نیم سیاسی، مذہبی، نیم مذہبی، سعودی دلال شدید ردعمل کے طور پر سرگرم عمل ہو جائیں گے۔ ایمان فروش یہ نجدی ایجنٹ زندگی کے تمام شعبوں میں بڑی بڑی حیثیتیں لیے گھسے پڑے ہیں۔ تبلیغ سیرت کے ذمہ داران تمام دشواریوں کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکے تھے۔

امریکہ اور سعودیہ کے خلاف جلوس نکالنے میں ہمیں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اس کی صرف ایک چھوٹی سی مثال دے کر گزر جاؤں گا۔ جلوس کے لیے پرمیشن یعنی سرکاری اجازت نامہ جو بسا اوقات اتنا غیر اہم ہوتا ہے کہ صرف اپنے پولیس اسٹیشن یا صرف ایم برانچ کو اطلاع کر دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ اسے نجدیوں کے سیاسی اثر ورسوخ نے اہم بنا دیا ہے۔ گویا تبلیغ سیرت جلوس نہیں نکال رہی تھی بلکہ نجدی حکومت کی راجدھانی ریاض پر قبضہ کرنے جارہی تھی۔ اسے جنتا دل اور کانگریس کے وقار کا مسئلہ بنا دیا گیا۔ لیکن نجدی اس میں بھی کامیاب نہ ہوسکے کہ اس وقت تک تبلیغ سیرت کی سیاسی جڑیں بھی بہت گہری ہو چکی تھیں۔ جوں جوں ستمبر قریب آتا جارہا تھا سعودی لابی میں گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ جلوس روکنے کے لیے اپنے تمام حربے جب وہ آزما چکے تو آخر میں اپنی آخری اوقات پر اُتر آئے یعنی روپے سے خریدنے کی کوشش وہ بھی ان لالہ رخوں کے ذریعے جن کی ایک مسکراہٹ پر دل کی دنیا زیر وزبر ہو جاتی ہے اور خرمنِ عقل وخرد بغیر دھوئیں کے جلنے لگتا ہے۔ اتنی لمبی رقم پیش کی گئی کہ اس کو پانے کے بعد دونسلوں کا بیڑا پار تھا۔ لیکن چونکہ تبلیغ سیرت پہلے غوثیتِ کبریٰ کی اس چوکھٹ پر بک چکی تھی جہاں شاہانِ زمانہ تک جھولیاں پھیلائے لرزیدہ قدم اور آنسو بھری آنکھیں لیے کھڑے رہتے ہیں۔ اس لیے شیطانِ رجیم کے پیروؤں کی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی اور تبلیغ سیرت اس کڑے امتحان سے بھی سرخرو و کامیاب نکلی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالك۔

جب تک بکے نہ تھے کوئی پوچھتا نہ تھا
تم نے خرید کر ہمیں انمول کردیا

قدم قدم پر مخالفتوں، رکاوٹوں اور کچھ اپنوں کی ناعاقبت اندیشیوں اور خاموش زمین دوزیوں کے باوجود علماء ومشائخ اہل سنّت کی قیادت میں وہ تاریخی مظاہرہ ہوا۔ حالات کی برہمی اور موسم کی ناسازگاری کے باوجود وہ احتجاجی جلوس خلیج میں

امریکی فوجی مداخلت اور ملّت اسلامیہ کے غدار خائن الحرمین فہد بن عبد العزیز کی ناعاقبت اندیشی وملّت فروشی کے خلاف ایک زبردست صدائے احتجاج کی حیثیت رکھتا تھا اور فہد کی اسلام دشمنی کے خلاف سوادِ اعظم اہل سنّت و جماعت کی بے چینیوں کا نمائندہ وترجمان تھا۔ جس کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کیے گئے اور جس کی اثرخیزی کی دھمک نے کئی براعظموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ایک تاریخی میمورنڈم کو بمبئی سے چل کر دلی میں دنیا کے تمام سفارت خانوں بالخصوص سعودیہ، امریکہ، فرانس، برطانیہ، جرمنی وایران وغیرہ کو دیا گیا۔ برصغیر کے ممالک تو الگ رہے، مشرقِ وسطیٰ کو بھی جانے دیجیے۔ براعظم یورپ، براعظم امریکہ، براعظم افریقہ کے بڑے بڑے تقریباً 100 اخبارات نے اسے نمایاں جگہ دی اور اکثر بڑے اخبارات نے فرنٹ پیج یعنی صفحۂ اوّل پر مع تصویر اسے چھاپا اور دنیا بھر کی اہم نیوز ایجنسیوں نے اپنی نشریات کے تمام زبانوں میں اسے براڈ کاسٹ کیا۔

وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی، بی بی سی لندن وغیرہ نے اسے ہر زبان کے نشریے میں پوری دنیا کو آگاہ کیا۔ اور آزادی کے بعد پہلی بار حیرت انگیز طور پر ہندوستان کے قومی پریس نے اس عظیم مظاہرہ کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ ؎

جنوں میں شرط ہے ہر وقت چاک دامنی
نگار موسم گل کا نہ انتظار کرو

اس کے ساتھ پورے بمبئی ومضافات میں فخرِ ہندوستان خطیب اعظم حضرت علّامہ سیّد محمد ہاشمی میاں اشرفی جیلانی مرکزی جنرل سکریٹری آل انڈیا تبلیغ سیرت کی قیادت میں مسلسل 10 دن تک ہفتہ تحفظ حرمین منایا گیا۔ پھر 20 اکتوبر 1990ء کو تبلیغ سیرت کی طرف سے وائی ایم سی گراؤنڈ بمبئی نمبر 8 میں ایک ایسی عظیم تاریخی تحفظ حرمین کانفرنس منعقد کی گئی جس کی کوئی دوسری مثال بمبئی کی مذہبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس عظیم کانفرنس میں بہ نفسِ نفیس خود عراق کے سفیر محترم ڈاکٹر عبد الودود شیخلی اور بمبئی میں واقع قونصل خانہ عراق کا پورا عملہ شریک ہوا۔ سفیر محترم نے اپنے طویل عربی خطاب میں عراق کے حقیقی موقف کو واضح کیا۔ اس تاریخی کانفرنس کے ذریعے پوری دنیائے انسانیت بالخصوص پورے عالمِ اسلام کو خطاب کیا گیا۔ امریکہ کی دہشت گردیوں، چیرہ دستیوں اور غنڈہ گردیوں کے خلاف دنیائے انسانیت کی ضمیر کو جھنجھوڑا اور انسانیت کو آواز دی گئی۔ اردو، انگریزی، عربی تینوں زبانوں میں خطاب کیا گیا۔ خصوصاً شہزادۂ غوث الوریٰ خطیب اعظم حضرت علّامہ سیّد محمد ہاشمی میاں اشرفی جیلانی کے خطابِ نایاب نے تو رنگ وآہنگ کا موسم بدل دیا۔ امریکہ، سعودیہ، اسرائیل، کویت کا وہ تاریخی پوسٹ مارٹم کیا جو خاص انھیں کا حصّہ تھا۔ جنگ کے دوران تو اس کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹ نے پورے ملک کے شہر ودیہات میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ خود بمبئی قونصل خلنے صدر عراق کو اس کی بڑی تفصیلی رپورٹ بھیجی، مظاہرہ کے تعلق سے ان کے الفاظ یہ تھے:

"ھذہ المظاھرۃ والتّجمعُ کبریٰ فی العالم۔"

تبلیغ سیرت کی یہ انقلابی آواز پوری دنیا میں سب سے پہلی موثر آواز تھی جو عراق کی حمایت میں امریکہ کی عالمی دہشت گردی سے بے خوف اور سعودی پیٹرڈالر سے بے نیاز ہو کر اٹھی تھی۔

کیا دبے جس پہ حمایت کا ہو پنجہ تیرا
شیر کو خطرے میں لاتا نہیں کتا تیرا

اس کانفرنس اور جلوس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اسے عراقی ٹیلیویژن نے انٹرنیشنل چینل پر پورے عالمِ عرب کو مسلسل سولہ دن تک دکھایا اور اس کی ویڈیو وآڈیو کیسٹ دنیا بھر میں پھیلائی گئیں جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اور عراق کے خلاف غلط فہمیوں کی دھند کافی حد تک چھٹ گئی۔

داد وستائش، انعام وصلہ سے بے نیاز آل انڈیا تبلیغ سیرت کی ان خدمات کو سرکار غوثیت مآب نے قبول فرمایا اور انعام میں جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد اپنی بارگاہ میں اپنے شایانِ شان بلا کر وہ عزت ووقار عطا فرمایا کہ جس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کا یہ اعزاز وسعادت حاصل ہے کہ پورے ملک میں اسی کے افراد نے عراق عظیم کو جنگ سے صرف چار دن پہلے بڑی تفصیل کے ساتھ دیکھا ہے اور جنگ کے فوراً بعد بھی جنگ سے صرف چند دن پہلے اس طور پر کہ جو 9، 10، 11 جنوری 1991ء کو بغداد شریف میں عالمی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی، علماء ومشائخ، فقہاء، دانشور، اہلِ سیاست و صحافت غرض ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ وغیرہ کے درجنوں ممالک سے تقریباً دو ہزار مندوبین نے شرکت فرمائی۔

ہندوستان سے اس عظیم کانفرنس میں شرکت کے لیے حکومت بغداد کی طرف سے آل انڈیا تبلیغ سیرت کو دعوتِ خصوصی ملی جس میں راقم الحروف (مولانا وارث جمال قادری) کے علاوہ تبلیغ سیرت کے مزید چار افراد حضرت پیر طریقت سیّد مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی، خطیب الہند حضرت علّامہ غلام عبد القادر علوی براؤں شریف، مولانا اطہر حسین رضوی اور الحاج رشید طیب صاحب حیدرآباد سے رہنمائے دکن کے ایڈیٹر سیّد وقار الدین اور دہلی سے ممبر پارلیمنٹ مسٹر م افضل، پیر ضامن نظامی کے صاحبزادے محترم سراج مدنی، نوجوان اسٹوڈنٹ مسٹر محمد یونس صدیقی اور ڈاکٹر سیّد حسین دہلوی نے شرکت کی۔

اس کانفرنس میں شرکت کے لیے تبلیغ سیرت پر تعداد کی پابندی نہیں تھی بے سان وگمان اچانک دہلی سے فرسٹ سکریٹری مسٹر عبد السلام بمبئی تشریف لائے، ان کے ساتھ ڈاکٹر کاظم الراوی بھی تھے اور انھوں نے خوش خبری دی کہ جنوری میں منعقد ہونے والی اس کانفرنس میں تبلیغ سیرت کو ہر حال میں شرکت کرنا ہے۔ تبلیغ سیرت کے کتنے افراد جانا چاہیں گے ان کے نام لکھ دیجیے تاکہ ان کے ٹکٹ وویزے کا بندوبست کیا جاسکے۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ جس وقت وہ لوگ بمبئی میں افرادِ تبلیغ سیرت سے ملنے آئے تھے، میرے اور عبد الرشید بھائی اور حضرت مثنیٰ میاں کے علاوہ تمام لوگ بمبئی سے باہر تھے۔ ہم نے یہاں پر کئی ذمہ داروں کے ناموں کی فہرست دی تھی مگر وقت کی تنگی بروقت پاسپورٹ کی تکلیف اور وقت پر اطلاع نہ

پہنچ سکنے کی وجہ سے بھی کئی اہم ذمہ دار جانے سے رہ گئے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے افراد کا انتخاب ان کے حسنِ خدمات کی بنیاد پر ان بے حد گنہگار و منافق چہروں کی جگہ پر ہوا تھا جو ضمیر فروشی کے بازار میں اپنے جبہ و دستار کی قیمت لگواتے ہیں اور حالات کے پیچ و خم کی بنیاد پر جن کے سجدوں کی سمت بدلتی رہتی ہے۔ اسلام وسنّیت کے یہی مجرم سعودی عرب میں وہابی وسلفی بن کر وہاں کے اربابِ اقتدار کو اپنے دامِ تزویر میں لے کر مختلف فرضی مدوں کے نام پر اور کبھی ہندوستان کے غریبوں، بیواؤں، یتیموں کے نام پر اور کبھی فسادات کے نام پر اور زیادہ تر ہندوستان کی سنّیت وقادریت کی بیخ کنی کے نام پر کروڑوں ریال لاکر یہاں پر مختلف ناموں سے اپنے عشرت کدے تعمیر کررہے تھے اور یہی غارت گرِ دین وایمان جب عراق پہنچتے تو بہت بڑے سنّی وقادری بن جاتے۔ سرکار غوثِ کبریٰ کی بارگاہ میں جب جبین عقیدت خم کرتے اور ان کے تعلق سے اپنے مصنوعی احترام کا جو مظاہرہ کرتے تو اسے دیکھ کر عوام تو الگ رہے خود حضرت نقیب الاشراف صاحب سجادہ حضرت یوسف گیلانی بھی ان کے ظاہری فریب سے بے پناہ متاثر ہوتے۔ یعنی سعودی عرب میں یہی ہندوستانی وہابیت کے نمائندہ وترجمان ہیں اور عراق میں یہی ظالم ہندوستانی کے سنّیت وقادریت کے نمائندے وترجمان بنتے ہیں۔ الحمدللہ اس معرکۂ عظیم کے سبب آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جدوجہد نے ان کے گنہگار چہروں کو بے نقاب کیا اور عالمی سطح پر یہ دن کے اجالے میں ہر جگہ ننگے ہوگئے۔

بالخصوص بمبئی قونصل خانہ عراق سے لے کر دہلی سفارت خانہ تک جہاں پر یہ "مصدق فی الھند للعراق" تھے اور عراقی وزارتِ اوقاف جس کے سالانہ مہمانِ خصوصی بنتے تھے اور خانقاہِ قادریہ (یعنی آستانہ غوثِ اعظم) میں جہاں پر یہ سنّیت وقادریت کا میک اپ کر کے نقیب الاشراف آستانہ غوث الاعظم کی آنکھوں میں دھول جھونکتے تھے۔ نیز وہاں کے بڑے بڑے جامعات اور کلیۃ الصدام کی قدآور علمی شخصیات پر ان کی قرار واقعی مذہبی حیثیت کو نہ صرف ظاہر بلکہ دستاویزی ثبوت کے ساتھ یہ ثابت کیا گیا کہ ہندوستان میں سوادِ اعظم اہل سنّیت کے یہی سب سے بڑے نمائندے ہیں۔

عراق اور جارڈن میں تقریباً ہر جگہ فتاویٰ رضویہ "الدولة المكية جدّ الممتاز "مجاہد ملّت کا حرفِ حقانیت "الاجازاة المدينة بعلماء البكة والمدينة" وغیرہ وغیرہ کے مجلدات پیش کیے گئے اور وہاں پر اصحابِ علم وفضل پر یہ ثابت کیا گیا کہ ہندوستان میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کہلانے کے مستحق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کے متبعین ہی ہیں۔

عراق جنگ سے پہلے:

4 جنوری 1991ء کی شب میں بمبئی سانتا کروز ائیر پورٹ سے روانہ ہوکر رات بارہ بجے ہم دہلی پہنچ گئے۔ وہاں پر ہوائی اڈے سے قریب ہی سنٹور ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ صبح پانچ بجے سفارت خانہ کے فرسٹ سکریٹری مسٹر عبد الحمید سلوم اپنے عملے کے ساتھ دو گاڑیاں لے کر ہوٹل پہنچے اور ہم سبھوں کو لے کر اندرا گاندھی انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر پہنچے۔ چونکہ

بمبئی میں دن بھر کی مسلسل کوششوں کے باوجود ہم لوگوں کا امیگریشن نہیں ہوسکا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے سفارت خانہ عراق کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔

ایک دھڑکا یہ بھی لگا ہوا تھا کہ جو کام دن بھر کی کوششوں سے نہ ہوسکا، وہ عین وقت پر چند ساعت میں کیسے ہو جائے گا؟ لیکن ہم غوث الاعظم قطبِ ربّانی محبوبِ سبحانی کے فیض و عطا سے مایوس نہیں تھے۔ دھڑکنیں ضرور بے ترتیب تھیں لیکن اُمیدیں قوی تر۔ اس موضوع پر فرسٹ سکریٹری جب امیگریشن آفیسر سے بات چیت کر رہے تھے تو ہم سب ؎

الٰہی خیر گردانی، بحق شاہ جیلانی

کا وِرد کر رہے تھے۔ امیگریشن کا مسئلہ عام حالات میں زیادہ اہم نہیں ہوتا مگر چونکہ وہ جنگ چھڑنے کا وقت تھا۔ حکومت تو خود ہی کویت اور عراق میں پھنسے ہوئے ایک لاکھ 75 ہزار ہندوستانیوں کو جنگی پیمانے پر لا رہی تھی پھر اپنے شہریوں کو وہاں جانے کی اجازت کیسے دیتی۔ بڑی سختی کے ساتھ تمام سرکاری آفسوں میں یہ حکم پہنچ چکا تھا کہ عراق کے لیے کوئی امیگریشن ہرگز نہ دیا جائے۔

سرکارِ غوثیت مآب کی کرم فرمائیوں کے قربان کہ صرف 5 منٹ کے اندر اندر پلک جھپکتے ہی وہ کام ہوگیا۔ دھند و کہر کافی پڑنے کی وجہ سے اردنی ائیر ویز کا طیارہ وقت سے کئی گھنٹے تاخیر سے اُڑا۔ مسلسل ساڑھے چھ گھنٹے پرواز کے بعد 4 بجے اردن کی راجدھانی عمان کے انٹرنیشنل عالیہ ائیر پورٹ پر اُترے جہاں پر عراقی وزارتِ اوقاف کا ایک وفد ہمارے استقبال کے لیے پہلے ہی سے موجود تھا۔ عمان سے عراقی ائیر ویز میں عراق جانا تھا۔ اپنے شیڈول سے کافی تاخیر کی وجہ سے عراقی طیارہ جاچکا تھا اس لیے ہمیں ایک رات اور نصف دن عمان میں ٹھہرنے کا موقع ملا۔ ائیر پورٹ سے قریب ہی ہوٹل عالیہ میں ہمیں ٹھہرایا گیا۔ ائیر پورٹ اور ہوٹل دونوں ہی مملکتِ ہاشمی کے بادشاہ شاہ حسین کی چہیتی ملکہ جو بہت پہلے مرحومہ ہوچکی ہیں عالیہ کے نام سے موسوم ہے۔ عمان کا ہوائی اڈہ جدید ترین سہولتوں سے آراستہ اور بہت خوبصورت ہے۔ قدم قدم پر مسافروں کے لیے آرام اور سہولت میسر ہے اور ہوٹل عالیہ تو سادگی و بانکپن کا عجیب امتزاج لیے ہے۔ انتہائی صاف ستھرا، نفاست و نزاکت کا آئینہ تمثال اس کی سادگی و پُرکاری میں ملکہ عالیہ کی طرف انتساب غالباً ملکہ کی ذوقِ نفاست کا لحاظ رکھا گیا۔ ہوٹل میں کمرہ بُک ہوجانے کے بعد ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا خاصی تاخیر سے وہیں ہوٹل ہی میں کھایا چونکہ ہم لوگ ٹرانزٹ ویزے پہ تھے اس لیے رات کا کھانا ہوٹل سے نہیں بلکہ اپنے پاس سے کھانا تھا اس لیے پروگرام یہ بنا کہ عمان شہر دیکھنا چاہیے۔ جو وہاں سے 43 کلومیٹر دور ہے اور کھانا شہر ہی میں کھایا جائے گا۔ ہوٹل کے سامنے ہی بس اسٹاپ ہے۔ ہم لوگ جوں ہی بس اسٹاپ پر پہنچے، بس آ گئی۔ ہم بس میں بیٹھ گئے۔ بس میں ایک سکھ صاحب مل گئے۔ وطن سے دور دیارِ غیر میں اپنا کوئی ہم وطن مل جاتا ہے تو کتنی خوشی ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جو اس نازک مرحلے سے گزر چکے ہیں۔ ہمیں آپس میں اُردو میں باتیں کرتے دیکھ کر وہ مچل اُٹھے اور جوں ہی انھیں معلوم ہوا کہ ہم ہندوستانی ہیں وہ اور زیادہ

خوش ہوئے۔ انھوں نے بڑی مخلصانہ پیشکش کی کہ ہم عمان شہر کے ہر اہم مقام پر آپ کو لے چلیں گے۔ ان کی وجہ سے بڑی آسانیاں ہوگئیں۔

اردن کی راجدھانی میں:۔

عمان شہر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی، اپنے سج دھج جدید طرزِ تعمیر اور محلِ وقوع کے اعتبار سے بڑا ہی خوبصورت شہر ہے۔ نہایت ہی صاف شفاف شاہراہیں، وسیع و کشادہ سڑکیں، شہر ہی میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بنی ہوئی خوبصورت ترین عمارتیں، کسی ہل اسٹیشن کا منظر پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ ہر طرف چہل پہل، بھرا بازار اور سپر مارکٹیں۔ وہاں کے لوگ اپنے شہر سے بھی زیادہ خوبصورت، کریم النفس، وسیع الاخلاق، بڑی بڑی عالی شان و تاریخی مساجد نمازیوں سے بھری ہوئی جنھیں دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی۔ رات گئے تک ہم اندرونِ شہر کو دور دور تک دیکھتے رہے۔ موسم کافی سرد تھا۔ جب ہم لوگ تھک گئے تو الحاج رشید طیب صاحب نے اصرار کر کے سبھوں کو کھانا کھلایا۔ پھر وہیں سے ٹیکسی پکڑی اور واپس ہوٹل آگئے۔ واپسی میں ٹیکسی والے سے کرایہ طے کرتے وقت کچھ مشکلات پیش آئیں کہ وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ ہمارے بہترین انگریزی داں الحاج رشید طیب اور حضرت مثنیٰ میاں صاحب قبلہ اور ہم اس کی طرح محاورے و استعارے والی عربی اس کی طرح نہیں بول پا رہے تھے۔ وہ دس اردنی دینار مانگ رہا تھا اور ہم لوگوں کے پاس اردنی دینار صرف سات بچے تھے۔ میں آگے کی سیٹ پر اس کی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ بدقت تمام اس کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ بھائی ہم عراق کی اس عالمی کانفرنس میں صدام حسین کے مہمان بن کر جا رہے ہیں جو بغداد شریف میں تین دن بعد ہو رہی ہے۔ عراق اور صدام حسین کا نام سن کر جیسے اسے کرنٹ لگا گیا ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور بہت خوش ہوا۔ کہنے لگا کہ اب مجھے کرایہ بھی نہیں چاہیے۔ لیکن جب اس نے ہمیں عالیہ ہوٹل کے گیٹ پر چھوڑا تو سات دینار کے علاوہ رشید بھائی نے اسے دس ڈالر بھی دیئے وہ حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دُعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا۔

عمان ائیر پورٹ سے باہر ہوتے ہی یہ معلوم ہوگیا تھا کہ یہاں سے اسرائیلی حکومت کی سرحد بالکل قریب ہے۔ اور بیت المقدس صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ تیز رفتار ٹیکسی سے ایک گھنٹے میں، ہم تڑپ کر رہ گئے کہ اس قدر قریب پہنچ کر بھی ہم زیارت سے محروم جا رہے ہیں۔ یہی تو وہ مقدس مقام ہے جہاں سے میرے آقا کو معراج عطا ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا قبلہ اوّل جس کی طرف رُخ کر کے میرے آقا و مولیٰ ﷺ نے 17 مہینے نماز ادا فرمائی، تب سے لے کر اب تک سارے مسلمانوں کا قبلہ اوّل بیت المقدس ہے۔ جس کے لیے ارشادِ ربّانی ہے:

"سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ۔" (اَلْاٰیة)

ترجمہ:۔ پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے بندے (محمد ﷺ) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔ جس کے گرداگرد

ہم نے برکتیں دے رکھی ہیں۔ ؎

نمازِ اسریٰ میں تھا یہی سر عیاں ہو "فی اوّل آخر ...!

کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر جو سلطنت پہلے کر گئے تھے

لَا تشد الرحال الا الی ثلثۃ مساجد میں داخل یہ تیسری مسجد جس کے ہم بالکل قریب کھڑے تھے اور اسی کی سمت آنکھوں میں حسرت لیے دیکھ رہے تھے۔ آہ سعودی نجدی حکمرانوں کی بدولت یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ فلسطینیوں کو اُجاڑنے میں، انھیں بے وطن کرنے میں اور بیت المقدس کو یہودیوں کے قبضے میں دے دینے میں یہی سب سے بڑے مجرم اور مشرقِ وسطیٰ میں یہودی حکومت کے سب سے بڑے خاموش مددگار ہیں۔ قاتلھم اللہ انا یوفکون۔ چونکہ اس پورے خطے پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ حالات انتہائی گرم تھے۔ وہاں کی زیارت کی کوئی بھی کوشش خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھی۔

"یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ۔"

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

دلِ بے نیاز پیشہ کے اضطراب کو تھپکیاں دی گئیں۔ حالات کی برہمی کا حوالہ دیا گیا اور قلبِ نامراد کو سمجھایا گیا کہ ابھی تیرے نامرادی کے دن پھرے نہیں ہیں۔ ؎

قسمت کی خوبی دیکھیے، ٹوٹی کہاں کمند

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

عمان سے بغداد کی طرف:۔

اگلے روز بغداد کے لیے روانگی تھی جہاں پر ہمیں 9، 10، 11 جنوری 1991ء کو ہونے والی اسلامی کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ اس کانفرنس کی دہشت پوری عیسائی دنیا پر سوار تھی اور مغربی میڈیا بالخصوص بی بی سی لندن تمام زبانوں کی نشریات کے ذریعے پوری دنیا کو بوکھلائے ہوئے تھا کہ جنگ سے صرف پانچ دن پہلے ہی پورے عالمِ اسلام کے دل و دماغ علماء، فقہاء، مشائخ کو عراق میں بلا کر امریکہ اور پوری عیسائی دنیا کے خلاف صدام حسین فتویٰ جہاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سے وہ اس لڑائی کو کفر و اسلام کی جنگ میں بدلنا چاہتے ہیں اور اگر دنیائے اسلام کے علمائے کرام، مفتیانِ عظام نے جہاد کا فتویٰ دے دیا تو پھر ایک بار مشرقِ وسطیٰ میں نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کی تاریخ دہرائی جائے گی۔ اسلام اور عیسائیت کا معرکۂ کارزار پھر گرم ہوگا زنگی و ایوبی کے جانشین پھر ایک بار اسلام کی عظمت و شوکت کا غلغلہ بلند کریں گے۔

اس کانفرنس کے انعقاد نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں اور عرب منافقین حکومتوں کی نیندیں حرام کردی تھیں۔

اسلام کے فتویٰ جہاد کی اہمیت سے پوری دنیا واقف ہے۔ اسی لیے پوری دنیا میں اس کانفرنس کا ہنگامہ برپا تھا۔ ساری دنیا سے اخباری رپورٹر، کیمرہ مین، نیوز ایجنسیاں بغداد کی طرف اُمڈ پڑی تھیں۔

6 جنوری کو ہم عالیہ ہوٹل سے دوپہر میں عالیہ ائیر پورٹ پہنچے۔ کاغذی خانہ پُری اور قانونی مراحل سے گزرنے کے بعد ہم عراقی طیارے میں سوار ہونے کے لیے لائن میں کھڑے ہو گئے۔ سیکورٹی بڑی سخت اور چیکنگ کا حال یہ تھا کہ ماچس اور لائٹر کے پتھر تک کو دیکھا جاتا تھا۔ موسم بھی سرد تھا۔ ہم نے اپنے گرم اوور کوٹ پر آل انڈیا تبلیغ سیرت کا ایک بڑا خوبصورت بیج لگا رکھا تھا جس پر نمایاں طور پر لکھا ہوا تھا:

"اَخْرِجُوا الْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَب۔"

بیج پر لکھی ہوئی اس مشہور حدیث کا اثر ہم اردن ائیر پورٹ پر دیکھ چکے تھے۔ عرب بالخصوص سرکاری آفیسران اسے دیکھ کر مؤدب ہو کر سر جھکا لیتے اور مرحبا اھلاً وسہلاً کہتے ہوئے سر جھکاتے ہوئے چند قدم پیچھے ہٹ جاتے۔

جہاز کی سیڑھی کے آخری زینے پر جب ہم پہنچے تو ہمارے آگے دو تین لمبے تڑنگے انگریز کھڑے تھے جن کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ سیکورٹی آفیسر بھی ایک وجیہہ وشکیل بارعب عراقی تھا۔ اس کی نگاہ اچانک دھوپ میں چمکتے ہوئے ہمارے بیج پر پڑی۔ اس نے بڑے جھٹکے کے ساتھ ان انگریزوں کو اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے میری طرف لپکا اور جوں ہی اس کی نظر بیج پر لکھے ہوئے الفاظِ حدیث پاک پر پڑی۔ احتراماً سر جھکاتے ہوئے مرحبا اہلاً وسہلاً السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہوئے میرے لیے اس سخت بھیڑ میں راستہ بنایا اور میرے پیچھے جتنے بھی تھے انھیں بھی بغیر چیکنگ آگے جانے کا اشارہ دے دیا۔

جہاز میں بیٹھنے کے بعد اب ہم ان عقابوں کی سرزمین کے جلد دیکھنے کے لیے بہت بے چین تھے جو دنیا بھر سے یکہ و تنہا لڑنے کے لیے کمرِ ہمت باندھ چکے تھے۔ عراق کے غازیوں ومجاہدوں نور الدین زنگی وصلاح الدین ایوبی کے جانشینوں کو جلد دیکھ لینا چاہتے تھے جو پوری دنیا کی باطل قوتوں سے ٹکرانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

باطل سے ڈرنے والے اے آسماں نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

خدا خدا کر کے عراقی طیارے نے اُڑان بھری، صبر آزما انتظار کے بعد بالآخر ہم بغداد ائیر پورٹ پر چار بجے دن میں پہنچ گئے۔

بزرگانِ دین کی سرزمین

جن لوگوں نے عراق نہیں دیکھا ہے یا عراق کو نہیں پڑھا ہے انھیں اس کا کم ہی اندازہ ہوگا کہ عراق کی سرزمین پورے عالمِ اسلام کے لیے کتنی اہم ہے۔

نبییّن، صدیقین، شہداء، صالحین، ائمۂ مجتہدین، بزرگانِ دین صحابہ اور تابعین کی کتنی بڑی تعداد اس مقدس سرزمین

پر آرام فرما ہے۔ اسی مقدس سرزمین پر کربلا ہے، نجف ہے کاظمین ہے، کوفہ ہے، بصرہ ہے، بغداد ہے، موصل ہے، مدائن ہے، سلمان پاک ہے وغیرہ وغیرہ۔ جہاں پر اسلام کی مایہ ناز ہستیاں اور بڑی قدآور شخصیتیں جلوہ فرما ہیں۔ بغداد ائیر پورٹ پر مختلف وزارتوں کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے بڑے والہانہ انداز میں ہمارا استقبال کیا اور اپنے خلوص و اپنائیت اور اسلامی اخوت کا زبردست مظاہرہ کیا اور اس انداز میں ہمارا خیر مقدم کیا جس کا کوئی تصور بھی ہم لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا۔

آج کا بغداد:۔

آج کا بغداد ماضی کے بغداد سے مختلف ہے۔ تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی وسیع وعریض صاف وشفاف سڑکوں کا جال انتہائی دیدہ زیب اور جدید ترین بلڈنگوں، ہوٹلوں اور بے حد خوبصورت بڑی بڑی برجوں کا شہر، مسجدوں، قبوں اور گنبدوں کا شہر۔ الف لیلوی بغداد کے داستان طراز اگر آج کے بغداد کو دیکھ لیتے تو ان کے قلم کے رنگ و آہنگ کا موسم بدل جاتا۔ بغداد میں سب سے زیادہ چونکا دینے والی چیز وہاں کے لوگوں کا سکون واطمینان تھا جبکہ ساری دنیا اس متوقع یقینی جنگ سے سانس روکے ہوئے انھیں کے لیے اضطراب میں مبتلا تھی۔ اس وقت ان کے چہرے پر سکون واطمینان کا اجالا بڑا حیران کن تھا۔ معمر اور بوڑھے تو الگ رہے خواتین کے چہرے پر طمانیت وسکون کا اجالا حیرت انگیز مسرت کا باعث تھا۔

جنگ کے تعلق سے پوچھے جانے پر ان کا جواب ہوتا کہ ہم عربی ہیں، خاص کر عراقی جنگ کی حالت میں رہنا ہماری قومی عادت ہے۔ صدیوں سے اس سرزمین پر جنگ ہی لڑی جاتی رہی ہے اور سچ پوچھیے تو عراق کی زمین ہزاروں برس پہلے سے جنگ کی آماجگاہ ہے۔ اس سرزمین کے تعلق سے بڑی بڑی اساطیری اور دیومالائی کہانیاں وابستہ ہیں۔ جنگ اور پرانی تہذیبوں کا سرچشمہ عراق ہے۔ آشوریوں، کلدانیوں، حمورابیوں، ایرانیوں، زیادہ ترقدیم تہذیبوں اور تمدنوں کے چشمے وہیں سے پھوٹے اور وہیں پر خشک بھی ہوئے۔ بابل ونینوا کی تہذیب اور کسرائے عجم کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔

کچھ نقش تیری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بےسر و ساماں سہی ویراں نہیں ہے

اپنے جواب میں عراقی بڑے فخر سے یہ بھی کہتے کہ یہ نبیوں کی سرزمین ہے۔ بڑے بڑے صحابہ، تابعین، شہداء اور اولیائے اُمّت یہاں پر موجود ہیں۔ یہ حضرت علی، حضرت امام حسین اور حضرت شیخ عبدالقادر کی سرزمین ہے۔ ہمیں اللہ تبارک وتعالی کی مدد اور ان تمام بزرگانِ دین کی روحانیت پر پورا بھروسہ ہے۔

امریکہ خود بھی ایک سپر پاور ہے اور اس نے دنیا کی ساری سپر طاقتوں اور چھوٹی بڑی حکومتوں کو اپنی مدد کے لیے بلا بھی لیا ہے۔ ساری دنیا کی طاقتیں ایک چھوٹے سے ملک کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے ایک ہو چکی ہیں اور اکیلا وتنہا عراق اپنے رب کی مدد اور بزرگوں کی روحانیت کے سہارے ایک طرف۔ لیکن ہم باطل کے اتنے بڑے اجتماع سے ہرگز نہیں ڈرتے۔ ان شاءاللہ عراقی مسلمان اپنے خون سے اسلام کی نئی تاریخ لکھیں گے اور جنگ کے وقت ہم دنیا میں عربوں کا

وقار اور مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کریں گے۔ ہمیں اللہ کی مدد، اپنے ایمان دار لیڈر کی مجاہدانہ قیادت پر پورا بھروسہ ہے۔ وہ ہر روز اپنے خطاب سے ایمان وشہادت کی نئی نئی لذتوں سے آشنا کرتا رہتا ہے۔ جنگ کے وقت ہمارا قائد بش اور فہد کی طرح محل میں سخت حفاظتی پہرے میں چھپ کر نہیں بیٹھے گا بلکہ اپنے مجاہدوں کے ساتھ وہ محاذِ جنگ پر ان کے شانہ بشانہ ہوگا۔

عراق کے غازیوں، مجاہدوں اور شہیدوں کو سلام انھوں نے پوری دنیا سے اپنے کیے ہوئے وعدے کو پورا کر دکھایا۔ نہایت اعزاز کے ساتھ ائیر پورٹ سے بغداد کے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل ''المنصور میلیا'' لایا گیا۔ ہوائی اڈے سے ہوٹل تک ہماری گاڑی کے ساتھ ملٹری کی گاڑی بھی حفاظت میں ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

غوثِ اعظم کی بارگاہ میں

ہوٹل میں غسل وغیرہ سے فراغت کے بعد پورا وفد بصد ہزار تڑپ عصر کی نماز کے بعد قطبِ ربّانی، غوثِ صمدانی، محبوبِ سبحانی محی الدین جیلانی سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی بغدادی حسنی حسینی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہِ قدس میں پہنچا۔ اللہ اللہ ان کا آستانہ عرش آشیاں قلم کو یارا نہیں کہ اس کی شوکت وحشمت کا نقشہ کھینچ سکے۔ وہ مقدس احاطۂ پاک جس میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے۔ اسی میں آپ کی پرشکوہ مسجد جامع قادریہ جو بڑی روحانی کشش رکھتی ہے اور اسی میں لنگر خانہ وغیرہ اس کا مین گیٹ یعنی صدر دروازہ دیکھ کر پورا کارواں حیرت زدہ رہ گیا۔ اس قدر پرشکوہ، پرعظمت، بارعب بلند اور دیدہ زیب کہ بے ساختہ میرے لب پر جاری ہوگیا۔

ٹوپیاں تھام کے خاک درِ والا دیکھو

موسم اتنا سرد کہ ہمارا وجود موسم کا ایک حصّہ بنتا جارہا تھا۔ والہانہ تڑپ اور مواجہ اقدس میں حاضری کی تمنّا موسم پر غالب آ گئی۔ لب پہ اعلیٰ حضرت شہیدِ محبت امام احمد رضا بریلوی کے وہ اشعار جو عشق ومحبت کی گہرائیوں میں ڈوب کر سیّدنا غوثِ اعظم کی شان میں عرض کیے ہیں برابر جاری اور آنکھوں سے اشکوں کا سیلِ رواں۔

پیرِ طریقت حضرت مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی تو باقاعدہ ہچکیاں لے رہے تھے۔ یوں ہر مقدس آستانے پر ان کی رقّت بڑی قابلِ رشک ہوتی لیکن جب اپنے جدِ کریم غوث پاک کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو اکثر بے حال ہو جاتے۔

نقیب الاشراف کی خدمت میں

اعلیٰ حضرت نے سرکار والا تبار کی علوئے مرتبت میں حدائقِ بخشش میں جو کچھ عرض کیا ہے، اس کی عظمت، اہمیت اور حقیقت کا اندازہ وہیں پر صحیح معنوں میں ہوتا ہے۔ بے شک انھیں کو یہ حق پہنچتا ہے جو یہ کہیں ؎

میری قسمت کی قسم کھائیں سگانِ بغداد
ہند میں رہ کے بھی دیتا رہوں پہرا تیرا

کافی دیر تک حاضری کی سعادت حاصل کرنے کے بعد ہم باہر نکلے۔ صدر دروازہ کے بالکل عین مقابل خانقاہِ معلّٰی ہے، جس میں نقیب الاشراف حضرت سید یوسف گیلانی اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت سید احمد ظفر گیلانی رونق افروز ہوتے ہیں۔ فاتحہ خوانی کے بعد ہم ان کی خدمت (خانقاہِ قادریہ) میں حاضر ہوئے۔ جہاں پر خوش قسمتی سے حضرت نقیب الاشراف حضرت سید یوسف گیلانی اور ان کے برادر خورد حضرت احمد ظفر گیلانی کی زیارت نصیب ہوگئی۔ حضرت سید احمد ظفر گیلانی سے صرف چند ہفتوں پہلے بمبئی میں ملاقات ہوچکی تھی۔ جب وہ اور خطیب جامع مسجد قادریہ حضرت سید عبدالوہاب تومہ بمبئی تشریف لائے تھے۔ ان کی کئی صحبتیں بھی یہاں ہمیں نصیب ہوئی تھیں۔ بمبئی میں متعدد اہم دعوتوں پر شرفِ معیت بھی حاصل کرچکا تھا۔ تاج محل ہوٹل میں کئی نشستوں کا بھی شرف حاصل ہوا تھا۔ یہاں کے حالات ہم سے سنتے رہے اور وہ عراق کے حالات بتاتے رہے۔

ایک روز تو ہوٹل میں اتنی دیر تک ساتھ بیٹھنے کا شرف حاصل رہا کہ دوپہر کا کھانا بھی انھیں کے ساتھ کھانے کی عزت حاصل کی۔ بمبئی میں ان کی تشریف آوری پر آل انڈیا تبلیغ سیرت نے ہوائی اڈّے پر تاریخی استقبال کیا تھا۔ وہ مہمان و میزبان دونوں کے لیے تاریخی بن گیا اور آگری پاڑہ بمبئی نمبر ۸ میں انھیں جو استقبالیہ دیا گیا تھا اس موقع پر سنّی مسلمانوں نے غوث پاک کی اولاد کی زیارت کے لیے اپنی عقیدت وجذبات کا جو بے مثال مظاہرہ کیا تھا، اسے وہ زندگی بھر فراموش نہیں کرسکیں گے۔ اور پھر عراق کے لیے تبلیغ سیرت کی شاندار مخلصانہ خدمات کا ایک شاندار ریکارڈ ان کے علم میں تھا۔ دیکھتے ہی فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور مرحبا اھلاً وسہلاً کہتے ہوئے ہر ایک کو گلے لگایا۔ رخسار پر بوسہ دیا اور مہمان نوازی کا روایتی مظاہرہ کیا۔

حضور سیدنا غوث پاک کے اصل مزار شریف کے چاروں طرف چاندی کی جالی لگی ہوئی ہے اور پائنتی میں ایک چاندی کا دروازہ، جس میں دو قفل لگے ہوئے ہیں۔ ایک خانقاہ شریف کی طرف سے اور ایک وزارتِ اوقاف کی طرف سے۔ بابِ رحمت خاص اپنے وقت پر ہی کھلتا ہے۔ کبھی عالمِ اسلام کی کسی اہم ترین شخصیت کے لیے کھل گیا تو کھل گیا، نہیں تو وہ بھی نہیں۔ اور تقریباً وہاں کے اہم مقدس مقامات کا یہی حال ہے۔ قبر شریف کی جالی ہی تک ہاتھ پہنچتا ہے۔ بس یہاں ہندوستان کی طرح نہیں کہ جب اور جس انداز میں چاہیں قبر شریف تک پہنچ کر چومیں۔

پیر طریقت حضرت سید مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی صدر تبلیغ سیرت مہاراشٹر نے حضرت نقیب الاشراف کی خدمت میں اپنی اور پورے وفد کی طرف سے انگریزی زبان میں عرض کیا کہ ہم لوگ پہلی بار بڑی تڑپ لے کر حاضر بارگاہ ہوئے ہیں۔ ہمارے لیے خاص بابِ رحمت کو کھول دیا جائے۔ آپ نے اس درخواست کو قبول فرمایا اور کہا کہ چونکہ ایک کنجی اس کی وزارتِ اوقاف میں رہتی ہے۔ وہاں سے اجازت اور کنجی منگانی پڑے گی۔ آپ لوگ پرسوں بعد نمازِ عشاء فوراً تشریف لے آئیں۔ کانفرنس کے شیڈول کے مطابق ہمارے پاس صرف دو دن تھے۔ انھیں دو دنوں میں ہم کو عراق کے تمام اہم ترین مقدس مقامات کی زیارت کرنی تھی۔ کربلا شریف و نجف اشرف بھی جانا تھا۔ اندرونِ بغداد اور اس کے اطراف و

جوانب قصبات ومضافات بھی دیکھنا تھا۔

عراقی عوام میں گھل مل کر ان سے جنگ کے پس منظر میں ان کی جذباتی کیفیات کے ساتھ معاشی بائیکاٹ کے اثرات بھی دیکھنا تھا کہ تقریباً چھ ماہ سے امریکہ نے اپنی خانہ زاد ملازمہ مجلس اقوام متحدہ کے ذریعے پوری دنیا سے عراق کا معاشی بائیکاٹ کررکھا تھا۔ اورتادمِ تحریر جنگ بندی کے باوجود تقریباً دو برس ہو گئے عراق کی معاشی ناکہ بندی جاری ہے۔

۷ رجنوری ۱۹۹۱ء کو ہمارا وفد ہوٹل المنصور میلیا سے نکل کر باب الشیخ پہنچا۔ حضور غوث پاک کی نسبت سے وہ پورا محلہ باب الشیخ کہلاتا ہے۔ بغداد شریف میں کہیں سے بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر گاڑی والے کو صرف باب الشیخ کہہ دیجیے، وہ سرکار غوث پاک کے یہاں لاکر آپ کو اُتار دے گا۔ بغداد میں کرائے کی گاڑیاں عام طور پر وہیں سے ملتی ہیں۔ ہم لوگوں نے اندرونِ بغداد کی تمام اہم زیارتوں اور سلمان پاک جو بغداد سے پچاس ۵۰ رکلومیٹر دور مدائن میں ہے، ان تمام زیارتوں کے لیے ایک پرائیویٹ ائیر کنڈیشن گاڑی پچاس دینار میں طے کر کے پہلے قادسیہ مدائن کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

بغداد سے قادسیہ کی طرف جاتے ہوئے وہ علاقہ بڑا سرسبز وشاداب نظر آیا۔ عام طور سے باجرے اور جوار کی فصلیں کھڑی نظر آئیں۔ پورے راستے میں ہر تھوڑی دور کے بعد ایک ٹیلہ نظر آتا۔ ڈرائیور سے معلوم ہوا کہ یہ سب ائیر کرافٹ گنس ہیں جس کے نشانے کی زد میں آنے والا ہوائی جہاز فوراً نیچے آجائے گا اور اس کے کنارے تھوڑی تھوڑی دور پر فوجی اسٹین گنیں لیے مستعد کھڑے تھے۔ جیسے ہی ہماری گاڑی پہلے فوجی کے پاس پہنچی اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈرائیور کے بغل میں بیٹھا تھا۔ گاڑی رکتے ہی ہم نے سلام کرتے ہوئے عربی زبان میں کہا کہ ہم ہندوستان سے مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے آئے ہیں اور زیارت کے لیے سلمان پاک جارہے ہیں۔ اتنا سنتے ہی وہ فوجی دو قدم پیچھے ہوا اور مرحبا اہلاً وسہلاً کہتا ہوا ہاتھ سے جانے کا اشارہ دے دیا۔ آگے جگہ جگہ مستعد فوجی ملے لیکن دور ہی سے خیر مقدمی انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر آگے گزرنے کا اشارہ دیتے رہے۔ غالباً پہلے فوجی نے واکی ٹاکی کے ذریعے آگے والوں کو باخبر کردیا تھا کہ ہندی مہمانوں کی گاڑی ہے۔

گاڑی کے مالک جو خود گاڑی چلارہے تھے وہ حسنی اور اشرافِ عرب سے تھے۔ ڈرائیور کی عام روایات سے الگ ہٹ کر انتہائی کریم النفس اور وسیع الاخلاق راستے بھر اسلام کے عسکری تاریخ پر وہ اپنی وسیع معلومات کا اچھا مظاہرہ کرتے رہے چونکہ میں خود بچپن سے تاریخ کا ایک طالب علم ہوں اور اس لیے میں ان سے گفتگو کافی دلچسپی سے کررہا تھا اور ان کے وسعت مطالعہ پر اٹیک کررہا تھا ہمارے یہاں مدارسِ عربیہ سے جو عام طور پر طالب علم دستارِ فضیلت کا طرہ لے کر نکلتے ہیں۔ علی العموم وہ تاریخ اسلام سے ناواقف ہوتے ہیں جس میں غلطی تنہا انہیں کی نہیں بلکہ اس موجودہ نصابِ تعلیم کی بھی۔ تاریخ اسلام، حساب، جغرافیہ سے باقاعدہ طالب علم کو پردہ کرایا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ علوم جو دین ودنیا کی ضرورت ہے ہمارے موجودہ نصاب کے محرمات سے ہیں۔

قادسیہ میں:

ہمیں وہ سلمان پاک (قدیم مدائن) لے جارہے تھے جہاں جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسی، حضرت حذیفہ یمانی، حضرت عبداللہ بن جعفر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین آسودہ خاک ہیں۔ ہم نے ان سے مقامِ قادسیہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ جگہ کہاں ہے جہاں پر ہمارے اسلاف نے ایرانی مجوسیوں سے کفر واسلام کی سب سے بڑی جنگ لڑی ہے جس میں ایرانیوں کے کس بل نکل گئے تھے۔ اس معرکۂ عظیم نے عجم میں اسلام کے فاتحانہ داخلے کا موقع وحوصلہ عطا کیا تھا اور کفر کے ظلمت کدوں کو اپنے سروں کے چراغ سے روشن کر کے اسلام کی حقانیت کو زندۂ جاوید اور معتبر بنایا تھا۔ میرے بھائی! ہم اس مقدس سرزمین کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی زیارت سے ہم اپنی آنکھوں کو شادکام کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری اس گفتگو سے وہ بہت خوش ہوئے اور جوش میں آ کر جنگِ قادسیہ کی تاریخ اس طرح دہرانے لگے جیسے کہ اس جنگ کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ دورانِ گفتگو انھوں نے کہا کہ ہم ضرور آپ کو اس مقام پر لے جائیں گے۔ وہ سلمان پاک سے بالکل قریب ہے صرف دو تین کلومیٹر بس گویا کہ سلمان پاک قادسیہ کے راستے میں پڑتا ہے۔ میں نے کہا، آپ پہلے وہیں لے چلیں وہاں کے بعد ہم سلمان پاک حاضر ہوں گے۔

چنانچہ سب سے پہلے ہم وہیں پہنچے۔ اس وسیع وعریض مقدس سرزمین کو حکومت عراق نے ایسی یادگار میں تبدیل کر دیا ہے جسے دیکھ کر انسان ششدر رہ جاتا ہے (میرا یہ سفرنامہ پڑھنے والے جسے اللہ توفیق دے عراق جانے کی تو وہ سلمان پاک حاضر ہوتے وقت اسے ضرور دیکھیں)

اس پورے ایریا کو گھیر کر ایک شاندار میوزیم کی شکل دے دی گئی ہے۔ اسے دیکھنے کی فیس اس وقت ایک دینار فی ٹکٹ تھی۔ ٹکٹ لے کر ہم لفٹ میں داخل ہوئے۔ پہلی منزل پر جوں ہی لفٹ نے ہمیں چھوڑا، ہلکی ہلکی موسیقی کی دھن میں قادسیہ کی تاریخ عربی زبان میں دہرائی جانے لگی۔ پہلی منزل پر کھڑے ہو کر جب زمین کی طرف دیکھا تو حیرت کو مسلسل جھٹکے لگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چودہ سو سال قبل ہم محاذِ جنگ پر کھڑے ہو کر اس معرکۂ کارزار کو دیکھ رہے ہیں۔ نیچے ایک گھوڑے کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ اپنے رفیق دیرینہ مولانا قاری اطہر حسین رضوی کو پکارتے ہوئے کہا: ارے مولانا وہ گھوڑا دیکھیے بھلا وہ کیسے باہر نکلے گا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ دیر تک نگاہیں جمائے رہنے کے باوجود معلوم ہوا کہ یہ حقیقی زندہ گھوڑا نہیں ہے بلکہ گھوڑے کا مجسمہ ہے۔ جو زین اور سوار سے چھٹکارا پا کر اپنے فطری انداز میں کھڑا ہے۔

کفر واسلام کے اس معرکۂ عظیم کو زندہ جاوید بنانے نیز عراقی مسلمانوں کے لہو کو گرم رکھنے کے لیے عراقی حکومت نے آرٹ کا وہ عظیم الشان نمونہ پیش کیا ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیے۔ وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ عراقی آرٹ ہے۔

ہمارے اس وفد میں بمبئی کے مشہور دین دار مخیر سیٹھ الحاج رشید طیب بھی تھے جو آل انڈیا تبلیغ سیرت کے کیشیر ہیں۔

وہ بار بار ہمارا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ حضرت اس سے پہلے بھی بغداد شریف آچکے ہیں۔ سلمان پاک میں حاضری بھی دے چکے ہیں لیکن اس جگہ اتنی اہم چیز کو پہلی بار دیکھا۔ میں نے انھیں بتایا کہ ٹیکسی ڈرائیور ٹورسٹ کو عام طور پر انھیں مقامات پر لے جاتے ہیں جو مقاماتِ مقدسہ کی فہرست میں ہوتے ہیں۔ عراق کی سرزمین تاریخ کا ایک بڑا خزانہ ہے چونکہ میں عہد طفلی سے تاریخ کا طالب علم ہوں، تاریخ میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اگر وقت نے ساتھ دیا تو بہت کچھ آپ دیکھیں گے۔ وہاں سے واپس ہوتے ہوئے ہم نے ایوانِ کسریٰ کا تذکرہ کیا۔ گاڑی کے مالک نے مسکراتے ہوئے کہا چلا لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھتے چلیں۔ وہیں قریب میں وہ بھی واقع ہے۔ ہم نے قریب سے ایوانِ کسریٰ کو دیکھا جو کھنڈرات کی شکل میں آئینۂ عبرت بنے ہوئے تھے۔ ایوانِ کسریٰ کو عراقی حکومت نے ایک تاریخی یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کے لیے اچھے انتظام کر رکھے ہیں۔ اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی طاقت کسریٰ ایران جس کا صدر مقام مدائن کا وہی ایوانِ کسریٰ تھا جسے ہم اپنی انھیں آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ موجودہ امریکہ سے بھی بڑی طاقت جس سے دنیا کی ہر طاقت لرزہ براندام تھی۔ روم کا قیصر بھی! دنیا کی سب سے بڑی مستحکم اور ٹھوس حکومت جس کے شوکت وحشمت، سطوت و جبروت اور قہر وجلال سے پوری دنیا دم بخود تھی۔ مگر وہ بھی عرب مسلمانوں کے استقامت وعزیمت اور جذبۂ ایمانی کے آگے نہ صرف سرنگوں بلکہ ریزہ ریزہ ہوگئی۔ ہم ایوانِ کسریٰ دیکھتے رہے اور زباں پر تلک الایام نداولھا بین الناس جاری تھا۔ ؎

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

ایوانِ کسریٰ دیکھنے کے بعد ہم سلمان پاک حاضر ہوئے۔ بڑے وسیع وعریض اور عظیم الشان احاطے میں ایک بڑی شاندار اور فن تعمیر کی شاہکار مسجد اور اسی احاطۂ پاک میں بڑے عالیشان تین الگ الگ گنبدوں میں بڑے ہی مشہور اصحابِ رسول آرام فرما ہیں۔ حضرت سلمان فارسی، حضرت حذیفہ یمانی، حضرت عبداللہ بن جعفر یہ تینوں اتنے بڑے جلیل القدر اصحابِ رسول ہیں کہ ان کے فضائل ومناقب اور خدمات اسلام پر اگر گفتگو کی جائے تو مستقل ایک کتاب ہوجائے گی۔

جلیل القدر اصحابِ رسول ﷺ

حضرت سلمان فارسی:

مداین کی طرف جلیل القدر اصحابِ رسول کی بارگاہ میں!

مداین شہر کبھی ایرانی شہنشاہیت کا پایۂ تخت تھا اور ایرانی شہنشاہ جو کسریٰ کہلاتے تھے، اس شہر میں رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں دریائے دجلہ اس شہر کے درمیان سے گذرتا تھا۔ دریا کے مغربی حصے کو بہرہ شہر اور مشرقی حصے کو مداین کہا جاتا تھا اب دریائے دجلہ وہاں سے دور ہٹ گیا اور مداین اس کے مشرقی حصے میں آباد ہے۔ ایرانی بادشاہوں نے مداین کے بہتر آب و ہوا اور شاندار محل وقوع کے سبب اس کو اپنا دار الحکومت قرار دے رکھا تھا اور اس میں ایک زبردست اور کافی مستحکم قلعہ تعمیر کیا تھا

جو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ مگر حضور سیدنا محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلاموں نے ایرانی شہنشاہیت کو بے سروسامانی کے عالم میں اپنے پائے حقارت سے روندتے ہوئے دنیا کو ان کے ظلم واستبداد سے ہمیشہ کے لیے نجات دلادی۔

ہم نے بغداد مقدس کے باب الشیخ جو گاڑی کرائے پر لی تھی اس کے مالک ایک حسنی سید تھے۔ جو خود گاڑی چلا رہے تھے۔ وہ کافی شریف النفس تھے اور اپنے سینے میں وہ تاریخ کا ایک بڑا ذخیرہ بھی رکھتے تھے۔ مداین، جس کا نام حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے نام کی مناسبت سے "سلمان پاک" ہے، بغداد شریف پچاس کلومیٹر کی مسافت پر ہے میں نے ان سے عربی زبان میں سوال کیا کہ مقام قادسیہ اور ایوانِ کسریٰ سلمان پاک سے کتنی دوری پر ہے۔ انھوں نے کہا فقط تین کلومیٹر۔ میں نے کہا: یا اخی الکریم! آپ ہمیں پہلے وہیں لے چلیں۔ ہم مقام قادسیہ کے ساتھ کسریٰ کے اس ایوان کو دیکھنا چاہتے تھے، جو پوری دنیا میں اپنے زمانے میں طاقت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ موجودہ امریکہ وروس سے بھی بڑی طاقت! جس ایوان کے چودہ کنگورے حضور پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ولادت کی شب گر گئے تھے۔ جو اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ اب ایرانی شہنشاہیت کا آفتاب زیادہ دنوں تک اپنی چمک دمک نہیں دکھا سکتا۔ صرف چودہ بادشاہوں کے بعد ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا اور اس کی ایک ہزار سالہ عظمت وجلال کی تاریخ قصۂ پارینہ ہو کر رہ جائے گی۔ چنانچہ حضور پاک آقائے کائنات سیدنا محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصالِ ظاہری کے بعد صرف پندرہ برسوں کے اندر اندر ہی ان کے باوفا غلاموں کا راستہ کوئی صحرا، کوئی پہاڑ، کوئی دریا، کوئی سمندر نہ روک سکا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایرانی شہنشاہیت کے آخری ناقابلِ تسخیر قلعے کو فتح کر کے کسریٰ کے سطوت وجبروت کا پرچم ہمیشہ کے لیے ایسا اُتارا کہ دوبارہ پھر اس پر اُن کے اقتدار کا پرچم کبھی نہ لہرا سکا۔ اس وقت سے لے کر آج وہ شہر (جو ایک قصبہ ہو کر رہ گیا) مسلمانوں کے تصرّف میں چلا آرہا ہے۔ مداین جو اَب حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے نام سے "سلمان پاک" ہو چکا ہے۔ وہاں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے ایک جامع مسجد آتی ہے۔ اس پر ایک عظیم الشان گیٹ بنا ہوا ہے، جس کی پیشانی پر بڑے جلی حرفوں سے لکھا ہوا ہے:

سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلِ الْبَيْتِ

اس جامع مسجد کے احاطے میں تین جلیل القدر صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مزارات ہیں:

(۱) حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۲) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۳) حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

ایران کے مشہور شہر اصفہان میں ایک زمین دار اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آباواجداد آتش پرست تھے۔

آپ کا مجوسی نام ''مابہ'' تھا، مگر آپ مجوسی خاندان میں صالح فطرت کے ساتھ پیدا ہوئے۔ اور سَعَدَ مَنْ سَعَدَ فِي بَطْنِ امّہ کے مطابق آتش پرستی سے متنفر ہو کر ملک شام چلے گئے، اور وہاں عیسائی علما کی صحبت ملنے کے بعد عیسائی مذہب اختیار کرلیا۔ اور شام وعراق کے متعدد زاہد اور درویش صفت علما کی صحبت میں رہنے لگے۔ ان کا وقت پورا ہونے کے بعد وہ انھیں کی ہدایت پر دین عیسوی کے علما کی خدمت اختیار کرتے ہوئے بالآخر عموریہ کے ایک بڑے نصرانی عالم کی خدمت میں پہنچے اور بڑی عقیدت ومحبت سے دن رات ان کی خدمت میں لگے رہے۔ جب ان کا آخری وقت آپہنچا تو آپ نے آب دیدہ ہو کر اس نصرانی عالم سے پوچھا: اب تک میں اتنے اتنے عالموں کی صحبت میں رہا۔ اب آپ کے بعد دین حق کی تلاش میں کس کی خدمت میں جاؤں؟ وہ نیک دل عیسائی عالم، جو مذہب عیسائیت کا بہت بڑا راہب بھی تھا، اس نے بڑی صاف گوئی سے جواب دیا: اب میں تمہیں کسی ایسے راہب وعالم کا پتہ بتانے سے بالکل قاصر ہوں، جو بالکل صحیح اور حق راستے پر ہو۔

البتہ میں تمہیں ایک بڑی خوش خبری کے طور پر جو مجھے آسمانی کتابوں سے معلوم ہوئی ہے وہ یہ کہ آخری نبی کے ظہور کا زمانہ بالکل قریب آچکا ہے۔ جو دین ابراہیمی پر ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ اب تک وہ ظہور فرما بھی چکا ہو۔ وہ سرزمین عرب کے پہاڑی سے گھرے شہر میں پیدا ہو کر عرب ہی کی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کرے گا جو کھجوروں سے گھرا ہوگا۔ اس کا امتیازی واضافی وصف کھجوروں کی جھرمٹ ہوگا۔ اگر تمہارے لیے اس نبی کے پاس پہنچنا ممکن ہو تو ہر حال میں اس تک ضرور پہنچنا۔ اور سنو اس کے نبی ورسول ہونے کی تین علامتیں ہوں گی کہ وہ صدقہ کا مال نہیں کھائے گا۔ دوسری علامت یہ ہے کہ وہ ہدیہ بخوشی قبول کریں گے۔ تیسری یہ کہ ان کے شانوں کے درمیان مہر نبوت ہوگی۔

چنانچہ اس نصرانی عالم کے انتقال کے بعد حضرت سلمان فارسی ایک قافلے کے ہمراہ عرب کی طرف روانہ ہو گئے۔ مگر قافلے کے ظالم ہمراہیوں نے راستے ہی میں ایک بے حد سنگ دل یہودی کے ہاتھوں آپ کو غلام بنا کر بیچ دیا۔ وہ چیختے چلّاتے رہے کہ میں غلام نہیں بلکہ آزاد ہوں، مگر ان کی کون سنتا؟ وہ یہودی مدینہ طیبہ کا رہنے والا تھا۔ وہ انھیں اپنے غلام کی حیثیت سے سیدھا مدینہ منورہ ہی لے آیا۔ آپ نے اس زمین کو کھجوروں سے گھرا پایا تو انھیں ایک سکون میسر آیا کہ چلو غلام ہی کی حیثیت سہی، اپنی منزل کے بہت قریب تو آ گیا۔ چنانچہ اس یہودی کی غلامی میں اس کے کام کرتے کرتے ایک طویل مدّت ہو گئی۔ ایک دن ایک درخت پر چڑھ کر اُس درخت کا کچھ کام کر رہے تھے اور ان کا یہودی آقا اسی درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ کہ اسی درمیان کوئی عزیز آیا اور آتے ہی کہنے لگا: خدا بنی قیلہ یعنی انصار کو غارت کرے کہ قبا میں ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ بڑی ہی عزت واحترام وعقیدت کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔ جو مکّہ سے آیا ہوا ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا آخری نبی ورسول ہے۔

حضرت سلمان فارسی خود فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی اور ایسا لگا کہ خود کو روک نہیں پا رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیڑ سے اپنے یہودی آقا کے اوپر ہی گر پڑوں۔ جیسے تیسے کر کے وہ درخت سے اُترے اور پورا واقعہ معلوم

کرنا چاہا۔ مگر جواب میں یہودی نے ایک سخت طمانچہ مارتے ہوئے کہا کہ اپنے کام سے کام رکھ۔ --- حضور پاک ﷺ کی بارگاہ میں فوری طور پر پہنچنے کی جو تمنا تھی وہ دل ہی دل میں رہ گئی ؎

دل میں چوٹ تھی دبی ہائے غضب ابھر گئی
پوچھو تو آہ سرد سے ایسی ہوا چلائی کیوں

مگر شام تک وہ اپنے یہودی آقا کے کام سے فراغت کے بعد تھوڑی سی پونجی لے کر وہ قبا حضور کی بارگاہ میں پہنچے اور اپنی تھوڑی پونجی کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ صدقہ ہے آپ کے لیے۔ جسے آپ نے قبول نہ فرمایا۔ اور مستحق صحابہ کو لینے کی اجازت دے دی۔ حضرت سلمان پر آپ کی نبوت ورسالت کی پہلی علامت ظاہر ہو چکی تھی۔

جب آپ قبا سے مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو حضرت سلمان دوبارہ حاضر خدمت ہوئے اور کچھ پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ ہدیہ ہے۔ آپ نے اسے فوراً قبول فرمالیا۔ یہ حضرت سلمان کے لیے دوسری علامت تھی۔ اب آخری علامت یعنی مہر نبوت کا دیدار باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ حضرت سلمان چند روز کے بعد پھر حاضر بارگاہ ہوئے۔ اس وقت آپ صحابہ کرام کے ساتھ جنت البقیع میں تھے۔ انھوں نے آتے ہی سلام پیش کیا اور تیسری علامت دیکھنے کے لیے پشت انور کی طرف بیٹھے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کا منشا سمجھتے ہوئے پشت مبارک سے چادر ہٹادی۔ حضرت سلمان نے مہر نبوت کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔ آپ نے تلاشِ حق کے لیے جو طویل، پُر مشقت سفر کی ابتدا کی تھی، دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ جس ظہورِ قدسی کے انتظار میں غریب الوطنی سے لے کر غلامی تک نہ جانے کتنی صعوبتیں مصیبتیں اور مشقتیں جھیلیں آج وہی منزلِ مقصود ان کے نگاہوں کی جنت بن چکی تھی۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی عمر کے تعلق سے تین روایتیں ملتی ہیں۔ ایک سو بیس ۱۲۰ سال، ساڑھے تین سو ۳۵۰ سال، پانچ سو ۵۰۰ سال۔ مگر حضرت شیخ محقق علامہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تین سو پچاس ۳۵۰ اور اکثر کے نزدیک دوسو پچیس ۲۲۵ سال ہے۔ اور حضرت شیخ نے دوسری روایت ہی کو صحیح تسلیم کیا ہے (مدارج النبوۃ اردو، جلد دوم ص ۱۲۰/۲۲، ادبی دنیا، دہلی) حقیقت حال کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انھوں نے اپنی آدھی عمر تلاشِ حق میں لگادی۔ ایک طویل ترین اور پُر مشقت جدو جہد کا ثمرہ جب نگاہوں کے سامنے آیا تو صبر وضبط کا وہ باندھ ٹوٹ گیا، جو جانے کب سے ان کے دل میں دبا ہوا تھا۔ وہ خود کو روک نہ سکے۔ ان کی آنکھیں ساون بھادوں ہوگئیں۔ آگے بڑھ کر مہرِ نبوت کا بوسہ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ حضور آقائے کائنات ﷺ جب ان کی شدتِ گریہ کا احساس ہوا تو اپنے سامنے بلا کر اس شدت کے ساتھ رونے کا سبب دریافت کیا۔ انھوں نے آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ اپنی پُر مشقت اور صبر آزما سرگذشت سنائی اور آپ کے روبرو کلمۂ شہادت پڑھ کر ایمان لے آئے۔

آپ ﷺ کی عبرت ناک سرگذشت سن کر بھی بہت متاثر ہوئے اور اس غریب الوطنی میں اسلام کے لیے ان

کی پُرمشقت جدوجہد پر جو تاریخی صلہ عطا فرمایا اس پر دنیا کی نعمتیں عظمتیں قربان کی جا سکتی ہیں۔ آپ نے حضرت سلمان کے لیے ارشاد فرمایا:

سَلْمَانُ مِنَّا اَھْلِ الْبَیْتِ

ایک طرف عزت وتکریم اور علومرتبت کا یہ مقام! کہ حضور آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں اپنے اہلِ بیت یعنی خاندانِ نبوت میں داخل کرلیا۔ یہ صحابیت کے ساتھ ایک ایسا شرف ہے جس میں آپ کا کوئی شریک وسہیم نہیں۔ آپ ہزارہا ہزار صحابۂ کرام کے لیے قابلِ رشک ہو گئے۔ لیکن ان تمام عظمت واحترام کے باوجود یہودی کی غلامی سے اب تک آزادی نصیب نہ ہوئی تھی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان سے فرمایا کہ یہودی آقا کو کچھ رقم دے کر آزادی حاصل کرلو۔ جب حضرت سلمان نے یہودی کی غلامی سے آزادی کی بات کی تو اس نے آپ کو آزاد کرنے کی ایسی کڑی شرائط لگائیں جو تقریباً ناقابلِ عمل تھیں۔ وہ یہ کہ چالیس اوقیہ سونا اور تین سو کھجور کے درخت لگا اور جب ان پر پھل آجائے تب تم آزاد ہو گے۔ سونا تو خیر جیسے تیسے کر کے ہو جاتا مگر تین سو کھجور کے درخت اور ان پر پھل آنا تو تقریباً ناقابلِ عمل تھا کہ کھجور کو بڑا ہونے میں ایک طویل عرصہ چاہیے اور پھل آنا یہ بھی بڑا صبر آزما تھا کہ کھجور پر پھل آنے میں بہت طویل عرصہ لگتا تھا۔

چونکہ آزادی ان کے نصیب میں تھی جو سرکار ﷺ کے ایک معجزے کی شکل میں ظاہر ہوئی کہ سرکار دوعالم ﷺ کی ترغیب کے پیش نظر حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے دینی بھائی اور شرفِ صحابیت سے مشرف حضرت سلمان کے لیے کھجور کے تین سو پودوں کا انتظام کر دیا۔ حضرت سلمان نے ان کھجور کے پودوں کے لیے تین سو گڑھے کھودے، جب گڑھے تیار ہو گئے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنا دستِ نبوت ورسالت ان تمام کھجوروں کو لگایا اور اس میں خیر وبرکت کی دُعا بھی کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ کھجور کے پودے جڑ پکڑ لیے اور تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئے۔ جب کھجور کے پیڑ بڑے ہو گئے تو ایک سال کے اندر اندر درختوں پر پھل آ گئے۔ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا کھلا ہوا معجزہ تھا۔ حضرت سلمان کی آزادی کی سب سے مشکل ترین شرط پوری ہو گئی۔ اب رہ گئی چالیس اوقیہ سونا؟ اس کی ادائیگی بھی معجزہ کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ وہ یوں کہ کہیں سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایک ٹکڑا سونا آ گیا، جو بظاہر چالیس اوقیہ ہرگز نہیں تھا۔ مگر اسے یہودی کو دینے کے لیے جب تولا گیا تو پورے چالیس اوقیہ نکلا۔ اور یوں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہودی کی غلامی سے آزادی نصیب ہوئی۔

غلامی ہی کی وجہ سے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ حضور پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کا پہلا غزوہ غزوۂ احزاب تھا، جسے جنگ خندق بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کے مشوروں سے خندق کھودی گئی، جس کی وجہ سے کفارِ قریش کو یہاں بھی ناکامی ہوئی اور مسلمان فتح یاب ہوئے۔ جس کی

من وجہِ کریڈٹ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو جاتی ہے۔ سرکار ختمی مرتبت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصالِ ظاہری کے بعد آپ مسلسل جہاد میں اکابر صحابہ کے ساتھ مصروف رہے۔ خاص کر حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں جب ایران پر باقاعدہ لشکر کشی ہوئی تو آپ نے ایک بڑے سالار کی حیثیت سے اس میں نمایاں حصّہ لیا۔ ہزاروں بہادرانِ عرب آپ کی زیر کمان جنگ کرتے۔ ایران پر مکمل فتح کے بعد آپ نے مداین کو اپنا مستقر بنالیا۔ ایک زمانے تک آپ وہاں کے گورنر بھی رہے لیکن اپنی گورنری کے زمانے میں بھی اتنی سادگی سے رہتے تھے کہ انھیں دیکھنے کے بعد کوئی گورنر سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں مداین میں ہوئی اور وہیں آپ کی تدفین ہوئی۔ آپ کی قبر شریف پر حدیث پاک کے یہ الفاظ جگمگا رہے ہیں:

سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلِ الْبَيْتِ

اور یہ بھی آپ کے نامِ پاک کی برکت ہی کہیے کہ ایرانی شہنشاہیت کے نقطۂ عروج کا جو صدر مقام مداین ہے، وہ اب سلمان پاک سے بدل گیا ہے۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ

آپ کا اسمِ گرامی حذیفہ، کنیت ابوعبداللہ، لقب صاحب السِّر تھا۔ آپ قبیلہ بنوغطفان سے تھے۔ آپ خود مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آپ کے والدین نے بھی اسلام قبول کرلیا تھا۔ اسلام تو انھوں نے اپنے والدین کے ساتھ اپنے وطن ہی میں قبول کرلیا تھا۔ اس کے بعد حضور پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ ہوئے۔ اتفاق سے یہ وہی نازک وقت تھا جب حضور پاک ﷺ جنگ بدر کے لیے تیاریاں کررہے تھے اور آپ سے مقابلہ کرنے کے لیے کفارِ قریش کا لشکر مکّہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ بے سان وگمان راستے میں کفارِ قریش کے لشکر سے آپ کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ انھوں نے حضرت حذیفہ کو ان کے والد کے ساتھ گرفتار کرلیا۔ اور انھیں اس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک ان دونوں نے اس کا معاہدہ نہیں کرلیا کہ تم جنگ میں ہمارے خلاف حضرت محمد (ﷺ) کا ساتھ نہیں دو گے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس معاہدے کا علم ہوا تو انھیں جنگ بدر میں شرکت سے روک دیا، کہ معاہدے کی پابندی لازم ہے، خواہ وہ کفارِ قریش ہی کیوں نہ ہوں۔ (صحیح مسلم کتاب الجہاد باب الوفا بالعہد و مسند احمد، جلد ۵ و مستدرک حاکم جلد ۳)

اس کے علاوہ تمام جنگوں میں آپ نے شرکت کی، خصوصاً جنگ خندق میں تو آپ نے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں بہت اہم اور نازک ترین ذمے داریاں عطا فرمائیں اور انھوں نے تمام ذمے داریوں کو بڑی جرأت وشجاعت اور تدبیر ودانش کے ساتھ ادا فرمائی۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے انھیں مسلمانوں کی مردُم شماری کی ذمے داری بھی سپرد کی، جسے آپ نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ آپ کی مردُم شماری کے مطابق اس وقت

مسلمانوں کی تعداد صرف پندرہ سو تھی۔ (صحیح مسلم، کتاب الایمان)

صحابۂ کرام کے درمیان آپ کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ حضور ﷺ نے ان سے بہت ساری راز کی باتیں بتا رکھی تھیں۔ منافقین کی تعداد اور ان کے نام بھی آپ کو بتا دیئے تھے۔ اسی لیے آپ کا لقب "صاحب السِّر" پڑ گیا۔ یعنی حضور ﷺ کے رازدار۔ یہاں تک کہ حضرت سیدنا عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے آپ سے قسم دے کر پوچھا کہ میرا نام منافقین کی فہرست میں شامل تو نہیں۔ حضرت حذیفہ نے انھیں یقین دلایا کہ نہیں، آپ کا نام ان منافقین کی فہرست میں شامل نہیں۔ (کنز العمال، جلد ۱۳) حضور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی احتیاط کا حال یہ تھا کہ کوئی جنازہ کی نماز اس وقت تک نہیں پڑھتے تھے، جس میں حضرت ابو حذیفہ الیمان شریک نہیں ہو جاتے۔ جب حضرت حذیفہ جنازے کی نماز میں شامل ہوتے تو آپ بڑے سکون و اطمینان سے نمازِ جنازہ پڑھتے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ مسلسل مصروفِ جہاد رہے۔ عراق و ایران کی فتوحات میں آپ نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ایران کی فتح عظیم کے بعد حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے آپ کو مداین کا گورنر مقرر فرمایا۔ آپ نے اس ذمے داری کو بھی بڑی سادگی اور ذمے داری کے ساتھ انجام دیا۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بڑی بڑی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا۔ آپ کا ایک اضافی حسن یہ بھی تھا کہ آپ کا شمار اس زمانے کے علمائے کبار میں سے تھا۔ آپ نے قادسیہ ہی کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور آخر تک آپ وہیں رہے۔

حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے ٹھیک چالیس روز بعد ۳۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ قدیم مداین میں آپ کی آخری آرام گاہ ہے، جو آج "سلمان پاک" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ جن صحابیوں کی قبروں کی منتقلی کا واقعہ پیش آیا، ان میں سے ایک آپ اور دوسرے حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہیں، جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ

یہ مدینہ منورہ کے مشہور ترین قبیلے بنو خزرج سے تھے۔ ان کی اہمیت و عظمت و انفرادیت کے لیے اتنا اشارہ ہی کافی ہے کہ یہ وہی عبداللہ بن جابر ہیں، جن کے یہاں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعوت ہوئی تھی، جس میں عبداللہ بن جابر کا حضور ﷺ ضیافت کے لیے ایک بکری کا ذبح کرنا، پھر ان کے دونوں بچوں کا شہید ہونا، پھر حضور پاک کے معجزہ کے طور پر ان بچوں کا زندہ ہو جانا ـــــــ اسی دعوت کی بدولت حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہ بہت مشہور ہو گئے۔ جن کی آخری آرام گاہ قدیم مداین میں حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مزار کے احاطے میں ہے۔

اس عظیم الشان گراؤنڈ میں داخل ہونے اور نکلنے کے دو بہت بڑے بڑے دروازے ہیں جو اتنے پُرشکوہ ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جس کے اندر داخل ہونے سے قلبِ اصحابِ رسول ﷺ عظمتوں سے معمور ہو جاتا ہے۔

چونکہ اب تک کسی صحابی رسول کی بارگاہ میں حاضری کی ہماری یہ پہلی سعادت تھی، اس لیے سخت سرد موسم کے باوجود ہم سب لوگوں نے وضو کیا اور تینوں سرکاروں میں حاضر ہوئے۔ وہاں سے واپسی میں ہم نے بغداد مقدس کے تمام اہم مزارات پر حاضری دی حضرت معروف کرخی، حضرت سری سقطی، حضرت جنید بغدادی، حضرت بہلول دانا، حضرت یوشع بن نون، حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہ، حضرت امام قاضی ابو یوسف، حضرت امام موسیٰ رضا کاظمین شریف، حضرت امام غزالی، حضرت شیخ عمر سہروردی وغیرہ وغیرہ۔ ہر جگہ ان مقاماتِ مقدسہ کو شاد و آباد پایا۔

قبروں کی منتقلی کا ایک حیرت انگیز و ایمان افروز واقعہ

حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہم کے مزارات کی منتقلی کا بڑا عجیب وغریب، حیرت انگیز اور ایمان کو جلا بخشنے والا واقعہ رونما ہوا۔ جس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دی۔ اور کائنات میں جس کی شہرت کی دھوم مچی اور جس واقعۂ صادقہ کو دیکھ کر ہزارہا غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ کہ واقعی اسلام ہی دینِ حق ہے۔

یہ واقعہ ۱۹۲۹ء کا ہے۔ اُس وقت عراق میں جمہوریت نہیں بلکہ بادشاہت تھی۔ حضرت حذیفہ وحضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہم کے مزارات جامع سلمان کے احاطے میں نہیں تھے بلکہ وہاں سے کافی فاصلے پر دریائے دجلہ کے کنارے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں بادشاہِ وقت نے خواب دیکھا کہ حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت عبداللہ بن جابر رضی اللہ عنہم فرمارہے ہیں کہ اے بادشاہ! ہماری قبروں میں پانی آرہا ہے۔ لہٰذا ہمیں یہاں سے کہیں اور جگہ منتقل کردو۔ لیکن بادشاہ نے اسے صرف ایک خواب سمجھ کر نظرانداز کردیا۔ پھر اس بادشاہ نے اس پاکیزہ خواب کو مسلسل کئی بار دیکھا، جس سے اس کو تشویش ہوئی اور اسی زمانے میں عراق کے کسی بزرگ عالم وجید ترین عالم دین نے بھی اسی نوعیت کا خواب دیکھا۔ چنانچہ بادشاہ عراق نے اس وقت کے بزرگ وجید ترین علما کو جمع کر کے اپنا خواب بیان کیا۔ چنانچہ کافی بحث وتمحیص کے بعد یہ طے پایا گیا کہ ان مبارک قبروں کو کھول کر دیکھا جائے۔ اگر خواب کے مطابق واقعی ان کے مزارات میں پانی آرہا ہے تو انھیں وہاں سے منتقل کردیا جائے۔ چونکہ یہ معاملہ قرونِ وسطیٰ کے دو عظیم اصحابِ رسول ﷺ قبروں کے کھولنے کا واقعہ تاریخ کا پہلا واقعہ تھا، اس لیے اس کے لیے حکومت عراق نے بڑا زبردست اہتمام کیا اور عالمی سطح پر اس کی زبردست تشہیر کی تاکہ بڑی تعداد میں لوگ اس میں شرکت کریں۔

چنانچہ تاریخ مقررہ پر نہ صرف عراق بلکہ دوسرے ملکوں سے بھی مخلوقِ خدا کا اس قدر اژدھام ہوا کہ حکومت دنگ رہ گئی، کہ اس وقت اس خلقت کے اژدھام کو کنٹرول کرنے اور انھیں دانہ پانی کا بھی مسئلہ سامنے آگیا۔

مگر آفریں اس عہد کی بادشاہت پر کہ اس نے بڑی ہمت مردانہ کے ساتھ حالات کا سامنا کیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں آنے والے ہر ہر فرد کو یہ منظر دکھایا جائے اور کوئی محروم نہ رہ جائے۔

چنانچہ بڑی بڑی اسکرینیں دور تک فٹ کی گئیں، تاکہ جو لوگ قبروں کے پاس اژدھام کی وجہ سے نہ پہنچ سکیں وہ کم از

کم اس منظر کو اسکرین کے پردوں پر تو دیکھ لیں۔ اس طرح یہ مبارک قبریں کھولی گئیں اور ہزاروں، لاکھوں انسانی سیلاب نے اس حیرت انگیز و ایمان افروز منظر کو اپنے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھا کہ تیرہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی دونوں اصحابِ رسول کے جسدِ خاکی جوں کے توں صحیح وسالم اور تروتازہ ہیں۔ مزار مبارک طے شدہ منصوبے کے مطابق پہلے ہی حضرت سلمان فارسی کے عظیم الشان گراؤنڈ میں تیار کرلیا گیا تھا اور وہاں تک لے جانے کے لیے ان مقدس اجسام کو جنازے پر رکھا گیا اور اس میں لمبے لمبے بانس باندھے گئے، تاکہ ہزار ہا ہزار افراد کو کاندھا دینے کی سعادت میسّر آجائے۔ اس وقت کسی غیر ملکی فرم کے ذریعے اس پورے عمل کی عکس بندی کی گئی تھی۔ اس ایمان افروز منظر کو ہزاروں غیر مسلموں نے بھی دیکھا اور اس سے متاثر ہو کر ہزار ہا غیر مسلم اسلام کی آغوش میں داخل ہو گئے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ ﴿فصلت: ۵۳﴾

ہم ان کو آفاق اور خود ان کے وجود میں اپنی نشانیاں دکھادیں گے تاکہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہی دین یعنی اسلام (ہی) حق ہے۔

بابل کے کھنڈرات:

دوسرے دن صبح ہی ہم لوگ ہوٹل سے باب الشیخ پہنچے، وہیں پر دو پرائیویٹ گاڑیاں اسّی (80) دینار فی گاڑی کرایے پر لی گئیں۔ اس دن ہم پانچوں کے علاوہ سیّد پیر ضامن نظامی کے فرزند جناب سراج مدنی اور حیدرآباد کی مشہور شخصیت محترم سیّد وقار الدین صاحب بھی ساتھ میں تھے۔ سب سے پہلے ہم بابلون پہنچے۔ دنیا کی قدیم ترین تہذیب بابل اور اس کے کھنڈرات بابل کا قلعہ اور اس کی اہم یادگاروں کو ایک میوزیم کی شکل دے دی گئی ہے۔ وہیں پر چاہِ بابل کو بھی دیکھا قصّہ ہاروت ماروت جو قرآن میں مذکور ہے۔ وہ کنواں آج بھی موجود ہے۔ اس کنویں پر ایک عظیم الشان عمارت بنی ہوئی ہے جس کی دیواروں کی چوڑائی تین تین میٹر ہے۔ ایک چھوٹے منہ کا کنواں جو لکڑی کے ڈھکن سے بند رہتا ہے۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور خوب توانا اور قدآور تھے ان پہلوانوں نے اسے پکڑ کر کنوئیں سے الگ اُٹھا کر رکھ دیا۔ کافی گہرا و تاریک۔ اندر اسی زمانے کی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔

حضرت ایوب علیہ السّلام کا مزار

وہاں سے ہم انتہائی پُرفضا اور قدرتی مناظر سے اپنی آنکھوں کو سیراب کرتے ہوئے حضرت ایوب علیہ السّلام کے مزار شریف پر پہنچے جو ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب بڑے پُرفضا مقام پر ہائی وے کے کنارے واقع ہے۔

جدید شہر بابل کے قریب ہم ایک ایسے عظیم الشان و باعظمت پیغمبر کی بارگاہ میں حاضر ہو رہے تھے جس کی جلالتِ شان کا تذکرہ قرآنِ مجید کی 4 سورتوں میں کیا گیا۔ جس کے صبر و رضا کے تذکرے سے آسمانی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ خود قرآنِ مجید کی سورۃ نساء، سورۃ انعام، سورۃ انبیاء اور سورۃ ص میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے صبر و رضا، توکل اور مناقب

درجات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ یہ ہم سبھوں کی خوش نصیبی تھی کہ مولی عزوجل نے ان کی بارگاہ میں ہمیں حاضری کی سعادت بخشی۔ پانی کا وہ چشمہ جس میں آپ نے غسل صحت فرمایا تھا اور آج بھی زائرین بطورِ تبرک اس میں نہاتے ہیں۔ اور چشمہ کے متعلق ایک روایت بھی مشہور ہے کہ اس میں نہانے والا تمام بیماریوں سے شفا پا جاتا ہے۔ وہ چشمہ ان کے مزار کے پاس نہیں البتہ وہاں پر معلوم یہ ہوا کہ وہ جدید شہر بابل میں ہے وقت کی کمی نے جانے کا موقع نہیں دیا۔

نجفِ اشرف میں:

وہاں سے سیدھے کوفہ پہنچے۔ کوفہ کی جامع مسجد جو بڑی تاریخی حیثیت رکھتی ہے جہاں پر عین نماز میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت ہوئی تھی۔ وہیں پر حضرت امام مسلم بن عقیل کا بڑا عظیم الشان مزار شریف ہے۔ حضرت امام مسلم کے قبے ہی میں مختار ثقفی کی بھی قبر ہے۔ وہاں پر موجود شیعہ مرد وعورت زائرین کو اس کی قبر کی طرف جانے کے لیے ترغیبیں دیتے رہتے ہیں حالانکہ مسلمانوں کو وہاں ہرگز نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ وہ بہت بڑا شاطر، بدمذہب، بے دین وگمراہ ہو گیا تھا۔ قاتلین امام عالی مقام سے انتقام اس کی سیاسی ضرورت تھی۔ امامِ عالی مقام سے محبت کے تحت نہیں۔ حضرت امام مسلم کے بالمقابل ایک چھوٹے سے خوبصورت قبے میں ہانی بن عروہ کا بھی مزار ہے۔ ان دونوں مزارات پر حاضری کے بعد ہم لوگ کوفہ کی جامع مسجد میں اس جگہ کو دیکھا جہاں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ اس مقدس مقام کو سونے سے آراستہ وپیراستہ کر دیا گیا۔ زائرین اس کی زیارت کر کے حضرت علی کی مظلومیت اور آپ کی بے رحمانہ شہادت کو یاد کرتے ہیں۔ وہاں سے نکل کر ہم لوگ نجف کی طرف چلے۔ نجف اور کوفہ دونوں بہت قریب قریب ہیں۔

اب ہم باب مدینۃ العلم علی مرتضیٰ شیرِ خدا جن کے لیے مسلمانوں کا یہ عقیدہ بن چکا ہے کہ ؎

شاہِ مرداں، شیرِ یزداں قوت پروردگار
لافتیٰ اِلّا علی لاسیف اِلّا ذوالفقار

کے درِ دولت پر حاضر ہو رہے ہیں۔ ان کے عدیم النظیر روضے کی سج دھج کو دیکھ کر عقل حیران ہے چشمِ تمنّا دیدۂ حیرت میں بدل چکی ہے۔ زبان کو طاقت وقلم کو یارا نہیں کہ اس کی شوکت وعظمت، رفعت وبلندی اور اس کے بے مثال طرزِ تعمیر کا نقش کھینچ سکے۔ پس اپنے تصورات کی پرواز کو بلند کرتے جائیے آپ کی قوتِ پرواز بلندی کے جس انتہا پر پہنچ کر تھک جائے وہیں وہیں اس کی شوکت وعظمت کی ابتدا ہوگی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے پہاڑ زمین کا سینہ چیرتے پھاڑتے آئے اور ان کے چوکھٹ فقر وغیرت وتوکل واستغناء پہ سرنگوں ہو گئے کہ اپنی زندگی میں کبھی اپنی بارگاہ میں آپ نے باریاب نہ ہونے دیا تو بعد شہادت ہمیں اپنے قدموں پہ جگہ دے کر عزت بخش دیں۔ اسے دیکھ کر عظمت خدادا کو عقیدتوں کا خراج عقیدت پیش کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

ہم تمامی لوگ دیر تک باچشمِ پُرنم فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ ان کی موجِ سخاوت سے دین ودنیا کی خیرات مانگتے رہے۔ اپنے

اورتمام دوست واحباب بالخصوص افراد تبلیغ سیرت کے لیے دین ودنیا کی سعادتیں مانگتے رہے۔

کربلائے معلّٰی میں

اب ہم وہاں سے نکل کر ان کے فرزند ارجمند نور دیدہ مصطفی جگر گوشۂ فاطمہ زہرا، شہزادۂ گلگوں، مظلوم نینوا، سیّد الشہداء حسین اعظم شہید کربلا کی بارگاہ میں پہنچے جن کے بارے میں خواجۂ خواجگان شہنشاہِ ہندوستان حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے ایک حقیقت صادقہ کو اشعار کے قالب میں ڈھالتے ہوئے یوں عرض کیا ہے ؂

شاہ است حسین بادشاہ است حسین　　　دین است حسین دین پناہ است حسین

سر داد نہ داد دست در دست یزید　　　حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

ہم مغرب سے پہلے کربلائے معلی پہنچ گئے۔ موسم اتنا سرد تھا کہ اس سے زیادہ سرد کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ گرم کپڑوں میں ملبوس ہونے کے باوجود جب ائیر کنڈیشن گاڑی سے اُترے تو کپکپاہٹ سے بدن قابو میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم سبھوں نے وضو کیا۔ اس کی کیفیت نہ پوچھیے۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ سخت سرد موسم میں برف کے دریا سے گزر کر ہم بارگاہِ امام عالی مقام میں پہنچے۔ تصور میں تو 14 سو سال کا کربلا تھا لیکن جس کربلا کو ہم دیکھ رہے تھے وہ عراق کا بڑا خوبصورت شہر تھا۔ اسی خوبصورت شہر میں دو بڑے ہی عظیم الشان فلک بوس روضے سر اُٹھائے، سینہ تانے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ بالکل ایک ہی طرح کے دونوں روضے ایک سیّدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اور دوسرا آپ کے برادرِ جان نثار اور تاریخ وفا کے سردار حضرت عباس علمبر دار کا۔ اللہ اللہ ان دونوں روضوں کی تصویر کھینچنا قلم کی طاقت سے باہر اور زبان سے اس کی خوبیوں کو بیان کرنا ممکن ہی نہیں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانانِ جنّت کے سردار کا جنّتی محل زمین پر اُتار دیا گیا ہے۔ اسی حرمِ پاک کے اندر آپ کے فرزند ارجمند حضرت علی اکبر، ننھا شیر خوار شہید بےنظیر حضرت علی اصغر اور پتیانے گنج شہیدان کی شکل 72 شہداء کی اجتماعی آرام گاہ یہ سارے جاں نثاروں کے کندہ نام! چودہ سو سالہ مظلومیت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس سخت جان لیوا موسم، حاضرین کی اس قدر بھیڑ اور اسی بھیڑ میں کھڑے ہم چند مسافروں، غریب الوطن آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ، خاندانِ نبوت پر تمام تر مظالم کے تصور کے ساتھ! وہاں سے نکل کر ہم میدانِ وفا کے شہسوار محسن اہل بیت حضرت سیّدنا عباس علمبر دار کی بارگاہِ قدس میں حاضر ہوئے۔ مواجہ اقدس میں حاضری کے وقت نگاہ السلام علیک یا قمر بنو ہاشم پر پڑی۔ بےشک وہ بنو ہاشم کے چاند ستارے اور سورج سبھی کچھ تھے۔ اہل بیت نبوت کی پیاس بجھانے کے لیے اعدا و اشقیا کے نرغے کو چیرتے ہوئے دریائے فرات میں داخل ہو گئے۔ شدت پیاس کے عالم میں چلو میں پانی لے کر جو پینا چاہا بھائی اور بچوں کی پیاس یاد آ گئی، پانی پھینک دیا۔ مشکیزہ بھرا لے کر خیمہ اطہر کی طرف چلے۔ جس بازو پر مشکیزہ تھا ظالموں نے اسے کاٹ دیا۔ پھر اسے دانتوں سے پکڑا۔ اہل بیت کی پیاس کے تصور دونوں کٹے ہوئے بازو کا درد بھول گئے۔ بالآخر شیطانوں، لعینوں، بدکرداروں، ظالموں نے مشکیزہ پر تیر برسایا۔ آہ ان کی

بارگاہ میں حاضری کے وقت سارے مناظر چودہ سو برس کے نگاہوں میں پھرنے لگے۔ سلام ہوتم پر اے بنو ہاشم کے چاند۔ سلام ہوتم پر اے بزمِ وفا کے تاجدار۔ سلام ہوتم پر اے اہل بیت کے غم خوار۔

عوام میں جوشِ جہاد

ہم تاریخی مقامات اور زیارتوں کے لیے بہت دور تک چلے۔ قادسیہ، مدائن، بابل نینوا، کوفہ، نجف اشرف، کربلائے معلیٰ، ایوبیہ وغیرہ وغیرہ۔ ہم وہاں لوگوں سے ملے۔ جنگ کے پس منظر میں ان کے احساسات جاننا چاہا۔ ان کی بے نیازی اور اطمینان دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ وہ امریکہ کیا دنیا کی کسی بھی طاقت سے مرعوب نہیں۔ ابھی تک وہ ایران سے زمین کے لیے لڑ رہے تھے۔ ایک طویل زمانے کے بعد وہ دین کے لیے لڑنے جا رہے تھے۔ امریکہ اور پوری دنیا کی طاغوتی طاقتوں سے ان کی سعی جنگ نہیں، جہاد تھا۔ یہودیوں سے بیت المقدس اور نجدیوں سے حرمین طیبین کی بازیابی و بحالی کے لیے وہ جنگ کرنے جا رہے تھے۔ عراقی فوج اور عوام کے دلوں میں مجاہد اعظم صدام حسین نے ایک بامقصد جنگ کی اہمیت کو اُتار دیا تھا، ان کے دلوں میں اسلامی جذبے اور جہاد کی ایسی اسپرٹ بھر دی تھی کہ وہ قبل از وقت جذبۂ جہاد میں سرشار نظر آ رہے تھے۔

بغداد شریف کے شاہراہوں اور چوراہوں پر جنگی نعرے اور جہاد کے فضائل پر قرآن و حدیث پر مشتمل بڑے بڑے بینر لگے ہوئے تھے۔ اور اس طرح کے نعرے بھی "نحن نقاتل بعزیمہ اجدادنا" ہم اپنے آباء و اجداد کی عزیمتوں کے ساتھ لڑیں گے۔

عراق کے خواص کا ذکر ہی کیا عام شہریوں کے چہروں پر سکون و اطمینان، عزیمت و استقامت، عزم و حوصلہ کا جو اجالا پھیلا ہوا تھا۔ تحیر بہ خیر مسرت کا باعث تھا۔ تقریباً ہر شخص جنگ کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا کہ ؎

رہِ جہاد میں ذکر شکست کیا معنی
مالِ مردِ مسلماں شہید یا غازی

معاشی بائیکاٹ کا بظاہر کوئی خاص اثر نہیں دکھائی دے رہا تھا کیونکہ عراق بہت حد تک خوراک کے مسئلے میں خود کفیلی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ عراق کی سرزمین دیگر عرب ممالک کی سرزمین کی طرح صرف صحرا اور ریگستان ہی پر مشتمل نہیں بلکہ وہاں تو گنگا جمنا کی طرح دو اہم دریا بہہ رہے ہے دجلہ و فرات۔ قابلِ کاشت زمین بھی بہت ہے۔ ہمارے اپنے ملک کی طرح کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ اور عراق کی کھجوریں تو پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ بغداد کے تمام بازار اور سپر مارکیٹیں ویسے ہی آباد ہیں جیسے وہ پہلے تھیں۔ ہر سو چہل پہل اور گہما گہمی کا وہی جلوۂ ہزار رنگ! الف لیلوی بغداد اپنی تمام تر رعنائیوں، دلآویز، سحر طرازیوں کا جلوۂ نو بہار لیے، قصّوں کہانیوں اور روایتی دل فریبیوں سے معمور بغداد اپنی تمام تر حشر آفرینیوں کے ساتھ۔ البتہ دواؤں کی کمی کا جگہ جگہ احساس ہوا۔ عراقی عوام کو امریکہ کے مقابلے میں اپنی فتح کا یقین کامل تھا۔ غازی یا شہید کے علاوہ وہ کوئی بات سوچنے کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ ایک عام آدمی کے اندر ایسی مثبت تبدیلی آ گئی، وہ یقین کی

اس منزل میں داخل ہو چکا تھا کہ اب پہلے ہی کی طرح پورے عالمِ اسلام کی رہنمائی پھر بغداد کو کرنی ہے۔ اہلِ بغداد خود ہارون رشید کا بغداد دیکھنے کے لیے بے چین تھے۔

ہندوستان کی عزت

ہم جہاں بھی گئے وہاں کے عوام نے ہم ہندوستانیوں کی قدر پاکستانیوں سے زیادہ کی۔ انھیں جیسے ہی معلوم ہوتا کہ ہم ہندوستان سے بغداد کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے ہیں تو مرحبا اہلاً وسہلاً کہتے ہوئے وہ اپنی آنکھوں کو فرشِ راہ کر دیتے۔ ہمارا یہ احساس بلاوجہ نہیں تھا۔ یہ بات بطورِ خاص نوٹ کی گئی کہ حکومت پاکستان نے اپنے بڑے رزاق امریکہ اور چھوٹے رزاق سعودیہ کی خوشنودی میں خلیج کی جنگ میں جو فوج بھیجی تھی عوامی سطح پر بھی اس کا کافی اثر لیا گیا۔

عراقی عوام ہم ہندوستانیوں کو اس لیے بھی کافی عزت دے رہے تھے کہ ہمارے ملک نے سیکولر ہونے کے باوجود اپنی کوئی فوج نہیں بھیجی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں 90 فیصد سنّی مسلمان ہیں لیکن حکومت میں عمل دخل اور وہاں کے میڈیا پر قبضہ صرف 10 فیصد غیر سنیوں کا ہے۔ عملی طور پر حکومت پاکستان 90 فیصد سنیوں کو دوسرے درجے کا شہری سمجھتی ہے۔ حکومت پاکستان ایسا نہ کرے تو سعودی عرب اور اس کے زیر اثر عرب ریاستوں کی زکوٰۃ، خیرات، صدقات، عطیات سب پاکستان پر بند ہو جائے۔ شاید پاکستان کی حکومت انھیں صدقات وخیرات پر ٹکی بھی ہے۔ اسی لیے وہاں 10 فیصد کلمہ گویوں کو 90 فیصد سنیوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔

قاتلهم الله انا یوفکون۔

مقاماتِ مقدسہ کی زیارتوں کے درمیان وزارتِ اوقاف و اطلاعات ونشریات کے بڑے آفیسران افراد تبلیغ سیرت سے ملنے برابر دن میں تین تین بار آتے رہے۔ لیکن ہم اس سے زیادہ اہم کام میں مصروف تھے۔ ہم لوگوں نے پورے طور پر کوشش کی کہ عراقی عوام کی زندگی اپنے طور پر دیکھی جائے۔ بالخصوص جنگ کے موضوع پر ان کے احساسات معلوم کیے جائیں۔

الحمدللہ! عمومی سروے سے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ وہ عالمِ اسلام کی قیادت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکے ہیں۔ اور اپنے اسلاف کے نقشِ قدم کو نشانِ منزل بناتے ہوئے اور عالمِ عرب اور پورے عالمِ اسلام کی آبرمندانہ بقا کے لیے وہ سروں کا چراغ روشن کرنے کے لیے آمادہ ہو چکے ہیں۔

اندھیری رات ہے روشن کرو سروں کے چراغ
جہاں تلک کہ ستم کی سیاہ رات چلے

اہلِ عراق یقین کی اس منزل پہ پہنچ چکے ہیں کہ یہ جنگ حقیقتاً کفر واسلام کی جنگ ہے اور یہ معرکہ، معرکۂ صلیب و بلال ہے۔ پورا عالمِ کفر الکفر ملة واحدہ کی بنیاد پر امریکی ویہودی کافروں کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو چکا تھا۔ آلِ سعود کا

کفر ونفاق بھی اُن پر واضح ہو چکا تھا۔ ان کی صیہونیت نوازی یہودیت پروری بے نقاب ہو چکی تھی۔ سارے عرب عوام کے دل وہ اپنی مٹھی میں لے چکے تھے۔ ان کی دُعاؤں کی سوغات سے اپنے دامن کو بھر چکے تھے۔ بقیہ عرب ریاستوں کے منافق سربراہ امریکہ کی غلامی کو اپنا ایمان بنا چکے تھے۔ کچھ خاموش تماشائی تھے اور کچھ اپنی بے بسی پر آنسو بھی نہیں پار ہے تھے۔ یمن اپنا اخلاقی تعاون پیش کرر ہا تھا البتہ اردن کے سربراہ شاہ حسین خونِ ہاشمی کی انفرادیت کا عظیم الشان مظاہرہ کر رہے تھے اور اپنے عمل سے خون رسول ہاشمی کی عظمتوں کو عقیدتوں کا خراج ساری دنیا سے وصول کرر ہے تھے۔ عراق کے جیالے نورالدین زنگی وایوبی کے جانشین عرب کے ان غلام حکمرانوں کو مکھی، مچھر اور پسّو سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ وہ اپنے مدمقابل صرف امریکہ، برطانیہ، فرانس اور دنیا کی ساری قہرمانی طاقتوں کو سمجھتے تھے۔ شہید یا غازی ہونے کے علاوہ کوئی تیسری بات ان کے ذہن میں نہیں تھی۔

صدام حسین کی مقبولیت

عراقی عوام اپنے قائد مجاہد اعظم صدام حسین کو دیوانگی کی حد تک چاہتے تھے۔ (اور آج بھی دیوانگی کا وہی عالم ہے) کہ انھیں کانفرنس کے ایام میں ایک روز وہ صرف تھوڑی دیر کے لیے اپنے عوام کے سامنے آئے تو انھیں ایک جھلک دیکھنے کے نہیں بلکہ ان کی زیارت کے لیے جس دیوانگی کا مظاہرہ کیا گیا اسے دیکھ کر دنیا کے درجنوں مما لک کے مندوبین دنگ رہ گئے۔ فرطِ عقیدت سے عراقی عوام نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ جو ان تک نہیں پہنچ سکتے تھے وہ ان کی گاڑی ہی کو چوم رہے تھے۔ خواتین نے اپنے اپنے بچوں کو اپنے سروں پر اُٹھا رکھا تھا کہ ہمارے بچے کے سر پر سے مجاہد اعظم کی انگلیاں ہی مس ہو جائیں۔

قوم کا سلام لینے کے لیے جب وہ بار بار اپنے ہاتھ لہراتے ہوئے پیشانی تک لے جاتے تو ان کے ہاتھ کی ہر جنبش اور انداز کی ہر گردش پر عراقی عوام قربان ہونے لگتے اور والہانہ طور پر رقص کرتے ہوئے ایک کورس کی شکل میں گاتے

صدام نحن معك۔

اپنے ملک میں صدام حسین کی محبوبیت کبریٰ دیکھ کر ہمیں اپنے ملک کے لیڈروں کی شکل میں بادشاہ وشہنشاہ اور مہاراجے بہت یاد آئے کہ صبح صبح اخبارات میں ان کا تھوبڑا دیکھ کر قاری کے چہرے کا جغرافیہ بدلنے لگتا ہے۔ صرف کچھ ہی کو چھوڑ کر بقیہ تمام لیڈروں، وزیروں کا نام سن کر ہی طبیعت بگڑنے لگتی ہے اور منہ کے زاویے بدلنے لگتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ہر دور میں ہندوستان کی سیاسی قیادت نے اپنے عوام کا زبردست استحصال کیا۔ ہر انتخاب کے بعد بھکمری، مہنگائی، بے روزگاری اور فسادات کا گراں قدر تحفہ ہندوستانی عوام کی جھولی میں پڑتا رہا اور ہر قیادت نے اپنے عوام کے منہ سے آخری لقمہ تک چھین لینے کی پوری کوشش کی۔ صدام حسین نے خلوص اور دیانت کے ساتھ عراقی عوام کی خدمت کر کے ان کا دل جیتا ہے۔ عراق کے تمام لوگ چاہے وہ سنّی ہوں یا شیعہ یا کسی دوسرے فرقہ کے، صدام حسین پر جان چھڑکتے ہیں اور

ان کے اشارہ پر بڑے سے بڑے دشمن سے ٹکرا سکتے ہیں۔

کانفرنس میں شرکت

9 جنوری 1991ء کو صبح 10 بجے پروگرام کے مطابق تمام لوگوں کو زبردست حفاظتی انتظام کے ساتھ کانفرنس ہال قصر المؤتمر (جو الرشید ہوٹل کے بالکل قریب ہے) پہنچا دیا گیا۔ کانفرنس کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ افتتاحی تقریر میں عراق کے وزیرِ اعظم محترم طٰہٰ یٰسین رمضان نے کانفرنس کی غرض وغایت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس کے بعد اردن کے وزیرِ اوقاف سیّد ابراہیم زید گیلانی نے جہاد و فلسفۂ جہاد پر بڑی زوردار ولولہ انگیز تقریر فرمائی گویا کہ انھوں نے اپنے خطاب کے ذریعے بعد میں آنے والے مندوبین کو جہاد پر تقریر کا موضوع دے دیا۔ اس کے بعد غیر ملکی مندوبین میں سب سے پہلے صدر جمعیۃ علمائے پاکستان قائد اہل سنّت حضرت علّامہ شاہ احمد نورانی کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ موصوف نے عربی زبان میں عربوں ہی کے لہجے میں بڑی رواں، پُرکشش، پُرمغز، جامع تقریر فرمائی۔ اسلوبِ بلاغت اور زبان کا آہنگ ایسا تھا کہ دورانِ خطاب عربوں کو بھی نہیں محسوس ہوا کہ کوئی عجمی ہم سے مخاطب ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف ممالک سے مندوبین آتے رہے اور درپیش مسائل میں اپنے نقطہائے نظر پیش کرتے رہے۔

الجہاد، الجہاد:

جب حرکت جہادِ اسلامی فلسطین کے بانی وسربراہ حضرت شیخ سعد بیوض تمیمی (جو ایک دراز قد، دراز ریش بڑے وجیہہ وشکیل بزرگ عالمِ دین اور مجاہد تھے) مائک پر آئے تو انھوں نے اپنے ولولہ انگیز خطابِ نایاب سے کانفرنس ہال میں نئی جان ڈال دی۔ خائن الحرمین فہد بن عبد العزیز، مصر کے صدر حسنی مبارک، شام کے فرمانروا حافظ الاسعد کا سخت محاسبہ کرتے ہوئے انھیں اسلامی مفاد کا غدار بتایا۔ انھوں نے آنسوؤں کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں بارگاہ رسالت میں استغاثہ پیش کرتے ہوئے کہا:

"یارسول اللہ انت قلت لاتشد والرحال الا الی ثلثة مساجد فاما الحرمین هو فی قبضة السعود و بیت القدس هو فی قبضة الیهود فیا محمداه و یاغوثاه این اشد الرحال۔"

ترجمہ:۔ یارسول اللہ! آپ نے فرمایا ہے کہ تین ہی مسجدوں کی طرف قصد سفر کرو۔ مسجد نبوی، مسجد حرام، مسجد اقصیٰ تو مسجد نبوی ومسجد حرام نجدیوں کے قبضے میں ہے اور مسجد اقصیٰ یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ تو پھر اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اے فریاد رس اب ہم کہاں جائیں؟

قلب کے اضطراب اور روح کی بے چینی کے ساتھ یہ بھرائی ہوئی آواز جیسے ہی ہال میں گونجی سارا ہال بے چین ہوگیا۔ دنیا کے ہزاروں آدمیوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال میں ہر طرف سے "الجہاد، الجہاد کے نعرے لگنے لگے۔ مرد تو مرد وہاں میں موجود فلسطینی لڑکیاں جذبات سے بے قابو ہوئی جارہی تھیں۔ اس طرح پہلے ہی دن پوری کانفرنس کا رُخ جہاد

کی طرف مڑ گیا۔ پہلی بار ہم لوگ دیدۂ حیرت کے ساتھ عربی اسالیب بلاغت کا روایتی عظیم الشان مظاہرہ دیکھ رہے تھے، چودہ سو برس پہلے ہم ایک واقعہ کو یاد کر کے چشمِ پُرنم کے ساتھ اعلیٰ حضرت کا یہ شعر پڑھتے رہے ؎

ترے آگے یوں ہیں دَبے لَچے فصحا عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زباں نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

ایک بجے اجلاس کا اختتام ہوا۔ سرکاری گاڑیاں ہمیں لے کر المنصور ہوٹل واپس ہوئیں۔ اس کے بعد تمام اجلاس عراق کے سب سے بڑے فائیو اسٹار ہوٹل الرشید کے وسیع و عریض اور جدید سہولت سے آراستہ و پیراستہ ہال میں ہوتے رہے۔

پانچ ہزار مصری لڑکیاں

تین بجے کے اجلاس میں الجزائر کے ایک نابینا خطیب نے عربی زبان میں خطاب کیا۔ نفسِ موضوع پر فصاحت و بلاغت اور طلاقت لسانی کا بڑا شاندار مظاہرہ کیا۔ دورانِ خطاب انھوں نے مصر پر امریکی فوجیوں کے جنسی تسکین کے لیے پانچ ہزار مصری لڑکیوں کو بھیجنے کا الزام لگایا چونکہ اس کانفرنس ہال میں مصری مندوبین بھی تھے پوری دنیا کے سامنے مصری ناموس کی دھجیاں اُڑتے برداشت نہیں کر سکے۔ اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو کر وہ صدائے احتجاج بلند کرنے لگے کہ بغیر کسی ثبوت کے آپ کو پوری دنیا کے سامنے مصریوں کو اس انداز میں ذلیل و رسوا نہیں کرنا چاہیے۔ آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔ کچھ دیر کے لیے پورے ہال میں ہڑبونگ مچ گئی۔ اس قضیے کو لے کر بڑی گرما گرمی شروع ہو گئی۔ وہ نابینا خطیب و متشرع عالمِ دین اپنے موقف میں ذرا بھی نرم نہیں ہوئے بلکہ اپنی باتوں کا ثبوت دینے کے لیے تیار تھے۔ بڑی مشکل سے معاملہ کو رفع دفع کیا گیا۔ ہم لوگ ہندوستان کے اخبارات میں پہلے ہی یہ خبر پڑھ چکے تھے کہ حکومتِ مصر نے اپنے ملک سے جو پانچ ہزار حسینانِ مصر کو عرب کی اس مقدس سرزمین پر جہاں قرآن اُترا تھا خائن الحرمین شاہ فہد کی مرضی پر امریکی فوجیوں کی عیاشی کے لیے بھیجا یہ افواہ نہیں بلکہ اس میں صداقت ہے جس کی صدائے بازگشت پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

آہ فہد کی خباثت نے وہ دن دکھلایا کہ اہلِ اسلام کو اس طرح کی سننی پڑیں۔ حسنی مبارک اور فہد کی غیرت و حمیت کہاں مر چکی تھی۔ ان ظالموں کو اگر اسلام اور اہلِ اسلام سے کسی طرح کا درد نہیں تھا تو اہل اسلام کی حرمتوں کو اسلام دشمنوں کے ہاتھوں اس انداز میں ذلیل و رسوا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

جہادِ مقدس

الجزائر کے اس خطیب نے پوری کانفرنس کو ہلا کر رکھ دیا، خود بھی روتے تھے، اس کے ساتھ ہی تمام لوگوں کی پلکیں نم آلود تھیں۔ دوسرے دن کے اجلاس میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے نمائندے خطیب الہند حضرت علّامہ غلام عبد القادر علوی

(شہزادۂ شعیب الاولیاء شاہ محمد یار علی قدس سرہٗ العزیز) نے عربی زبان میں ایک جامع تقریر فرمائی اور انگریزی زبان میں قدرے تفصیل کے ساتھ بڑی مدلل اور معرکتہ الآراء تقریر کی جس میں اصل موضوع سے پہلے ہندوستان میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی نمائندہ تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کے تعارف اہلِ سنّت کے تشخص اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی عظمت نیز ان کی اسلامی خدمات پیش کی گئیں۔ تین دن کی بحث و تمحیص لمبی و نرم و گرم تقریروں کے بعد حرمین طیبین کی بحالی اور بازیابی بیت المقدس کی بنیاد پر امریکہ کے خلاف اس جنگ کو جہادِ مقدس قرار دے دیا گیا۔

پورا عراق دفاعی تیاریوں میں مصروف اور الرٹ تھا۔ عراق کے تمام اہم مقامات پر بڑی کثرت کے ساتھ ائیر کرافٹ گنیں فٹ تھیں، عمارتوں، ہوٹلوں، بلڈنگوں کی چھتوں پر عراقی مجاہدین جدید ترین اسلحوں کے ساتھ بمبار طیاروں کو گرانے کے لیے ہمہ دم مستعد تھے۔ ان تمام تیاریوں کے باوجود عراقیوں کے چہروں پر سکون و اطمینان کا اجالا بڑا حیران کن تھا۔ امریکہ اور پوری دنیا کے مقابلے میں انھیں اپنی فتح کا یقین کامل تھا۔

عوام میں اطمینان

یوں تو جنگ و جدال اور بات بات میں جان پر کھیل جانا ایک عرب کی فطرت میں داخل ہے۔ ''موت لازم، خوف مافی'' تو ان کا مقولہ ہے۔ خاص کر اہلِ عراق تو ہمیشہ سے سخت لڑاکو اور جنگ جو واقع ہوئے ہیں عراق کی سرزمین تو پانچ ہزار برس سے زاید آگ اور خون ہی دیکھتی آرہی ہے۔ ایک طرح سے حالتِ جنگ میں رہنا ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی ہے ایک اور اچھی عادت ان میں جو دیکھی گئی وہ یہ کہ عام طور پر ذخیرہ اندوزی کی عادت ان میں نہیں۔ معاشی ناکہ بندی اور حالتِ جنگ کے باوجود مارکیٹ میں اشیاء ضروریہ کی کوئی کمی نہیں اور نہ ہی کسی ضروری چیز کے حصول کے لیے لمبی لائن جبکہ ہمارے یہاں ہندوستان میں ہر چیز کی ذخیرہ اندوزی ہماری قومی عادت بن چکی ہے۔ آئے دن اشیاء ضروریہ کے حصول کے لیے ہمہ وقت قلّت اور اتنی لمبی لمبی لائن ہوتی ہے کہ آدمی وجود سے عدم اور عدم سے وجود میں چلا آئے مگر لائن اپنی جگہ قائم و دائم رہتی ہے۔ مثلاً امریکہ عراق جنگ سے پہلے ہمارے یہاں کیروسین (گھاسلیٹ) کی وہ مصنوعی قلّت پیدا کی گئی کہ ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے چھوٹے شہر میں اس کے لیے وہ ہاہا کار مچی کہ فی لیٹر پندرہ روپے میں مٹی کا تیل بک گیا اس پر طرہ یہ کہ اتنی گراں قیمت دینے کے باوجود آدمی کو اسے حاصل کرنے کے لیے میدانِ کارزار میں اُترنا پڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امریکہ اور اس کے اتحادی عراق کے بجائے ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ صرف اس لیے کہ یہاں کے لیڈر ہی ملک و قوم کے لیے مخلص نہیں، یہاں کے لیڈر عوامی مفاد کے دشمن، بددیانت اور خائن ہیں تو الناس علی دین ملوکھم کے مطابق عوام بھی انھیں راستوں پر چل کھڑے ہوتے ہیں جن راستوں سے خائن بددیانت اور چور لیڈر ہو کر گزرتے ہیں۔

الحمدللہ! معاشی ناکہ بندی کے باوجود بغداد کی تمام مارکٹیں ضروری چیزوں سے بھری پڑی تھیں، البتہ دودھ اور دوا کی کمی کا احساس اسی وقت ہو گیا تھا۔

صدام حسین کی آمد

تین روزہ کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں دنیائے انسانیت کے ہیرو، فخرِ ایشیا، فرزندِ اسلام مجاہدِ اعظم غازی صدام حسین مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے کانفرنس ہال میں تشریف لائے۔ انھیں دیکھ کر دنیا بھر سے آئے ہوئے مندوبین کے چہروں پر فخر و مسرت کا اجالا پھیل گیا۔ احتراماً تمام ممالک کے مندوبین نے کھڑے ہو کر ان کی پذیرائی کی۔ انھوں نے آتے ہی دنیا کے تقریباً تمام اہم ممالک کے مندوبین کا پُرخلوص شکریہ ادا کیا اور تمام مندوبین کے ممنونِ کرم ہوئے کہ ایسے عالم میں آپ لوگوں نے ہماری دعوت کو قبول فرما کر پریشانیاں اور تکلیفیں اُٹھاتے ہوئے یہاں تشریف لائے اور اسلام کی سربلندی کے لیے آپ حضرات نے عراقی عوام اور عراقی مجاہدین کو حوصلہ بخشا اور اپنے اپنے ملک کے عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ حق و باطل کی جنگ میں ہم عراق کے ساتھ ہیں۔ مسئلۂ فلسطین کے حل اور بیت المقدس کی بازیابی کے بغیر اس مسئلہ کے تصفیہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر جنگ ہوئی تو ہمیں فتح کا یقین ہے۔ ہماری مسلح افواج کو جنگ کا عملی تجربہ ہے جبکہ امریکی فوجیں جنگ کی کتاب پڑھ کر جنگ کرنے آئی ہیں۔ آخر میں انھوں نے مخلصانہ و مودبانہ اپیل کی کہ بیت المقدس کی آزادی کے لیے فتویٰ جہاد جاری کیا جائے۔

بغداد سے واپسی

11 جنوری 11ء کو ہماری بغداد سے روانگی عمل میں آئی۔ ہمیں اردن کی راجدھانی عمان ہوتے ہوئے ہندوستان آنا تھا اس لیے کہ اقوامِ متحدہ کی پابندی کے تحت عراقی فضائیہ کا کوئی طیارہ بین الاقوامی ہوائی پٹی پر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ بغداد چھوڑتے وقت ہم نے اس مقدس شہر کو بار بار مڑ کے دیکھا۔ وہاں کے اہلِ محبت کو بار بار دیکھا کہ چار دن کے بعد یہاں کا منظر ہی کچھ اور ہونے والا تھا۔ ہوائی اڈے کے اندر داخل ہوتے وقت پھر چاروں طرف بڑی حسرت کی نظر ڈالی اور روئے زمین کے اس بے حد خوبصورت شہر کے لیے اندیشوں میں دل ڈوب گیا کہ امریکہ عراق جنگ اب یقینی ہو چکی ہے۔ جنگ کو ٹالنے کی تمام کوششیں رائیگاں ہو چکی ہیں۔

امریکی وزیرِ خارجہ جیمس بیکر اور عراقی فارن منسٹر طارق عزیز کی گفتگو جنیوا میں ٹوٹ چکی ہے۔ امریکہ نے تیل کی لالچ میں اندھا ہو کر پوری دنیا کو جنگ کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ صدام حسین پر بین الاقوامی دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ مفاہمت کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ فخرِ عرب اور فرزند ایشیاء نے عربوں کی غیرت و وقار اور آبرومندانہ بقا کا سودا کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اقوامِ متحدہ کا جنرل سکریٹری اور بش کا غلام ڈیکولیا بغداد تک دوڑ دھوپ کر رہا ہے اور پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا ہے کہ دیکھو اس جنگ کو روکنے میں انسانی ادارہ اقوامِ متحدہ کتنا مخلص ہے۔ کویت چھوڑنے کے لیے اخلاقیات کے تمام ضابطے اور انسانیت کے سارے حوالے اور درد کے سارے رشتے اور دھونس کے تمام حربے صرف عراق کے لیے استعمال ہو رہے ہیں لیکن اسی خطے میں اسی طرح کے مسئلے کے لیے اسرائیل کو تمام ضابطوں سے آزاد

چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور صیہونیت کے عفریت کو مظلوم فلسطینیوں کا خون چوسنے کے لیے سعودی عربیہ کی مرضی سے ہر طرح کی پابندی سے الگ تھلک رکھا گیا ہے۔ کویت کی آزادی تو ایک بہانہ ہے۔ حقیقتاً پوری دنیا کی کفری طاقتوں کو الکفر ۃ ملۃ واحدہ کی بنیاد پر ایک ہو کر اسلام کی ایک عظیم ابھرتی ہوئی طاقت کو فنا کے گھاٹ اُتارنا ہے۔ اگر صدام بن نرم بھی پڑ جاتے اور 15 جنوری تک کویت چھوڑ دینے کا اعلان بھی کر دیتے تب بھی امریکہ کسی نہ کسی عنوان اور حیلہ سے ہر حال میں لڑتا، اکیلا تو وہ عراق کا بال بھی ٹیڑھا نہیں کر سکتا ہے اور نہ تنہا آج ہی اس کے اندر یہ دم ہے کہ عراق کا کچھ بگاڑے مگر ایک بدترین اتفاق و نفاق نے اسے جو یہ موقع فراہم کیا کہ پوری دنیا کی طاقت کو اس کے پشت پر لا کر کھڑا کر دیا۔ ایسے سنہرے موقع کو اسے ہر حال میں کیش کرنا ہے۔ امریکہ اسرائیل کو ہر طرح سے محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ پورے مشرقِ وسطیٰ میں ایک سعودی عربیہ ہی اسرائیل کا خیر خواہ ہے لیکن اس کے اندر عسکری توانائی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اسرائیل کے لیے حقیقی خطرہ صرف عراق ہے۔

سعودیہ کی احسان فراموشی

سعودیہ اور عراق کے حق میں عراق کے خلاف یکطرفہ پروپیگنڈہ کرنے والے اور ایران و عراق جنگ کے وقت عراق کی مالی امداد کا رونا رونے والے اس حقیقت کو کیوں بھول جاتے ہیں کہ اگر عرب ممالک نے عراق کی مالی مدد کی تو اس پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ جیسے وہ اپنی عیاشی پر لاکھوں کروڑوں روپے خرچ کرتے ہیں تو اس سے کہیں زیادہ اہم ان کی جان و مال و حکومت اور عشرت کدوں کے تحفظ کا معاملہ تھا۔ وہ ایران سے اُٹھنے والے ''خمینی انقلاب'' سے خوفزدہ ہو کر عراق کو مالی امداد دے رہے تھے۔ ''اسلامی حکومت'' کے نام پر اُٹھنے والا ''شیعہ انقلاب'' ان عیاش اور بزدل حکمرانوں و ہوس پرست شیخوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا۔ وہ مالی امداد دے کر عراق پر احسان کا رڈار رکھتے ہیں اور جس نے اپنے لاکھوں نوجوانوں کی قربانی دے کر انھیں تحفظ دیا اس کا کوئی احسان نہیں؟ یہ عراق کی بے مثال جانی و مالی قربانیوں ہی کا انعام ہے جو عرب ریاستیں اور ان کے بزدل حکمرانوں کا شبستانِ حرم محفوظ ہے ورنہ درمیان میں اگر عراق نہ حائل ہو جاتا تو ایران سے اُٹھنے والا ''شیعہ انقلاب'' راستے کی تمام رکاوٹوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو پامال کرتا ہوا سیدھا مکّہ معظّمہ و مدینہ منورہ ہی پہنچ کر دم لیتا۔ پھر عرب کا صحرا نئے طوفان، نئے حوادث، نئی تباہی، نئی بربادی اور نئے ہنگامے سے دوچار ہوتا پھر وہ شاخ ہی نہیں ہوتی جس پر آج یہ نشیمن بنائے بیٹھے ہیں۔

ایران و عراق جنگ اور اس کی خبروں پر نظر رکھنے والے اس حقیقت سے باخبر ہوں گے کہ جنگ کے دوسرے ہی سال صدام حسین نے سعودیہ اور کویت کی امداد کو ناکافی قرار دیتے ہوئے ان حکمرانوں سے کہا کہ ہم درمیان سے ہٹ جاتے ہیں تم اور ایران سمجھو اس پر دونوں ممالک کے بزدل و عیاش حکمران منہ کے بل گر پڑے کہ ''اے صدام حسین! آگ، خون، ہلاکت و بربادی کے اس سیلابِ بلا کو روکنا تمہارے ہی جگر کی بات ہے۔ تم لڑائی جاری رکھو ہم اپنی امداد بڑھا رہے ہیں۔'' اس حقیقت سے پتہ چلا کہ عراق تنہا اپنے لیے نہیں بلکہ ان عرب ریاستوں بالخصوص مکّہ و مدینہ کو ایرانیوں کے دست برد سے

بچانے کی جنگ لڑ رہے تھے۔

جنگ سے پہلے

بغداد سے روانہ ہوتے وقت بہت سے لوگ حالات کی برہمی سے اندیشوں، وسوسوں، مایوسیوں اور بددلی کے شکار تھے کہ جنگ یقینی بن چکی ہے۔ پوری دنیا ایک طرف اور تنہا عراق ایک طرف اللہ کی رحمت و نصرت پر یقین و اعتماد کی دولت کے سہارے۔ کیا دنیا کا یہ خوبصورت ترین شہر اور اس کے بے حد خوبصورت لوگ جنگ کے بعد بھی اسی حالت میں دیکھنے کو ملیں گے۔ ان لوگوں کا یہ احساس کچھ غلط بھی نہیں تھا کہ پوری دنیا کی سپر طاقتیں کویت کے بہانے عراق کو صفحۂ ہستی سے بالکل مٹا دینے کے لیے اپنے جدید ترین اسلحوں اور ٹیکنالوجی حربوں کے ساتھ عراق عظیم کو گھیر چکے ہیں مگر انھیں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہیں یقین تھا کہ غیبی امداد، عراقیوں کی جوش، جہاد اور وہاں کی مقدس سرزمین پر آرام فرما انبیاء و رسل، صحابہ و تابعین، شہداء و صالحین بالخصوص شاہِ مرداں، شیر یزداں، قوتِ پروردگار حضرت علی مرتضیٰ صاحبِ ذوالفقار، شہزادۂ گلگوں قبا، سیّد الشہداء حسین اعظم شہید کربلا، قطب ربّانی محبوبِ سبحانی غوثِ اعظم محی الدین جیلانی شیخ عبد القادر حسنی و حسینی بغدادی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی روحانیت کے بدولت یہ مقدس شہر اور اس میں رہنے والے لوگ جنگ کے بعد بھی ایسے ہی رہیں گے۔ خدا علیم و خبیر ہے۔ انھیں کچھ لوگوں میں یہ راقم الحروف محمد وارث جمال قادری بن الحاج محمد منیف قادری یار علوی بھی تھا اور الحمدللہ مولیٰ عزوجل نے اپنے محبوبِ دو عالم اور عراق کے مقدس نفوسِ قدسیہ کے صدقے میں ہماری خوش عقیدگی اور عقیدے دونوں کی لاج رکھ لی۔ آگ کو طوفانوں اور بلاکتوں و بربادیوں کے بگولوں سے گزرنے کے بعد بھی بغداد سلامت رہا اور جنگ کے بعد فوراً عراقیوں کے شاداب پر جوش اور قوت عمل سے بھرپور چہروں پر دلفریب اور حیات بخش مسکراہٹیں دیکھنے کو ملیں اور بغداد شریف کو جس حال میں جنگ سے چار دن پہلے دیکھ کر گئے تھے جنگ کے بعد بھی اسے اسی طرح سرسبز و شاداب، ہرا بھرا اور آباد دیکھا جس کی تفصیلات آگے آرہی ہیں۔

اردن کی راجدھانی میں

واپسی میں ہم ایک بار پھر اردن کی راجدھانی عمان واپس آئے وہاں پر ہمیں ایک بار پھر ہوٹل عالیہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہندوستان کے لیے ہمارا جہاز چونکہ دوسرے دن تھا اس لیے ہمارے پاس اتنا وقت تھا کہ ہم عمان کو بڑے اطمینان سے دیکھ سکیں۔ چنانچہ ہم لوگ تھوڑی دیر آرام کر کے ہوٹل سے نکل کھڑے ہوئے۔ باہر آ کر پرائیویٹ گاڑی پکڑ کر عمان شہر میں پہنچے۔ یہاں پر ہم لوگوں سے ملے۔ دکانوں، چائے خانوں، مسجدوں میں گئے۔ جنگ کے پس منظر میں ان کے احساسات معلوم کرنے لگے کیونکہ پوری دنیا میں اردن ہی عراق کے ساتھ رہا اور اہل اردن کی ہمدردیاں عملی طور پر عراق کے ساتھ تھیں۔ یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ اہل اردن کی سوچ وہی تھی جو اہل عراق کی تھی اردن والوں کے دلوں میں صدام حسین کی چاہت کا جذبہ دیوانگی کی سرحدوں کو چھو رہا تھا، بالخصوص وہاں پر مقیم فلسطینی تو صدام حسین کا نام سنتے ہی بڑے جذباتی ہو

جاتے اورفہد کولعن طعن شروع کر دیتے۔ شہر سے ہوٹل واپسی ایک فلسطینی ٹیکسی ڈرائیور کی ٹیکسی میں ہوئی۔ میں آگے اس کے بازو میں بیٹھا ہوا مسلسل اس سے جنگ کی صورتِ حال پر گفتگو کر رہا تھا۔ کیونکہ ایک عام آدمی کے احساسات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ میں نے دورانِ گفتگو اس سے پوچھا، میرے بھائی! آخر آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ اس نے پورے جوش و خروش سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب دیا

"یا اخی الکریم ان الشاب الاردنیہ والفلسطینیہ لا یریدون الا الحرب من الامریکہ۔"
ترجمہ:۔ اردنی اور فلسطینی جوان امریکہ سے صرف جنگ چاہتے ہیں۔

میں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی قہرمانی قوتوں اور جدید ٹکنالوجی اسلحوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسی صورت میں آپ لوگ ان سے کیسے لڑسکیں گے۔ اس نے میری طرف زخمی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اور مجھے مسلمان ہونے کا احساس دلاتے ہوئے پوچھا؛ یا اخی انت مسلم؟" اے میرے بھائی! آپ مسلمان ہیں؟ میں نے "نعم الحمدللہ۔" کہتے ہوئے کہا کہ ہاں میں بحمدہٖ تعالیٰ مسلمان ہوں۔ اس پر اس نے الم تر کیف فعل ربك باصحٰب الفیل" کی تلاوت کی کہ اللہ تعالیٰ نے ابرہہ کی ہاتھیوں کی فوج کو معمولی حقیر چڑیوں وابابیلوں سے کیسے تباہ و برباد کیا۔ ہم لوگوں نے بڑے خلوص کے ساتھ دُعا کی مولیٰ ان بے کسوں کے عقیدے کی لاج رکھنا۔

دہلی میں

دوسرے روز اردن ائیرویز کے ذریعے ہم دہلی پہنچے جہاں پر سفارت خانہ عراق کے بڑے بڑے آفیسر ہم لوگوں کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔ تمام مندوبین کو انھوں نے گلے لگاتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مرحبا ابلاً وسہلاً کہا اور اپنی گاڑیوں میں بیٹھا کر ہمیں ہمارے اصرار پر جن پتھ ہوٹل لائے ورنہ وہ پھر ہمیں اسی اعلیٰ درجے کے ہوٹل سنٹور میں ٹھہرانے کے لیے بضد تھے۔ دوسرے دن سفیر محترم ڈاکٹر عبدالودود شیخلی نے اپنے عالی شان مکان پر ہم تمام افراد تبلیغ سیرت کو عصرانہ دیا اور بڑی دیر تک عراق کے حالات اور کانفرنس کے تعلق سے گفتگو فرماتے رہے۔ دوروز دہلی میں رہ کر ہم لوگ انڈین ائیرلائنز سے بمبئی واپس آگئے۔ یہاں پر عراق کے تعلق سے ایک ہنگامہ عالم برپا تھا۔ ویکلی اخبارات نے اپنے ایڈیشن روک رکھے تھے تاکہ وہاں کی جنگی کیفیت کا آنکھوں دیکھا حال لکھیں۔ صبح سے رات گئے تک لوگوں کا اژدھام لگا رہتا۔ اخبارات نے الگ نیند حرام کر رکھی تھی۔ ہر ایک بے چین تھا۔ ساری دنیا شدید قسم کے اضطراب میں مبتلا تھی اور جن کے لیے سارا عالم بے قرار تھا۔ ان کا ہم سکون واطمینان اور چین وقرار اپنے ماتھے کی آنکھوں سے دیکھ کر آرہے تھے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

عراق جنگ میں

15 جنوری 1991ء امریکی دھمکی اور وارننگ کی آخری تاریخ تھی۔ وہ تاریخ گزرتے ہی جنگ چھڑ جانی تھی۔ ساری دنیا دم بخود تھی۔ جنگ رُک جانے کے لیے کسی معجزہ کی منتظر! یا صدام حسین کے امریکہ کے آگے جھکنے کی خبر۔ مگر ان میں سے کچھ نہیں ہوا۔ پوری دنیا تو 15 تاریخ کو دیکھ رہی تھی مگر عراقی مجاہدین پندرہ سے پہلے ہی تیار تھے۔ کیونکہ انھیں مغربی سامراج کے قول وفعل کا کوئی اعتبار نہیں تھا وہ تو کویت کو قبضہ کرنے کے بعد ہی سے ہمہ وقت مستعد وتیار تھے۔

جوں ہی گھڑی کی سوئی نے بارہ کے ہندسے کو پار کیا پوری دنیا کی سپر طاقتیں اپنے قہرمانی اسلحوں اور آگ اگلنے والے خوفناک طیاروں سے بغداد پر ٹوٹ پڑیں۔ انسانی تاریخ کی سب سے عجیب وغریب اور خوفناک جنگ چھڑ گئی۔ ایک طرف پوری دنیا کی جابر طاقتیں دوسری طرف پونے دو کروڑ کی آبادی رکھنے والا تنہا عراق اللہ کی نصرت، ناقابلِ تسخیر عزم وحوصلہ اور تقریباً پوری دنیائے انسانیت کی ہمدردیوں اور سارے عالم کے مسلمانوں کی پُرخلوص دُعاؤں کے سہارے باطل کے قہرمانی قوتوں سے ٹکرا گئے۔ دنیا کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دورانِ جنگ عراقی مجاہدین نے جس عزیمت واستقامت اور حیرتناک بہادری کا مظاہرہ کیا۔ اس کی کوئی مثال تاریخ حرب وضرب میں نہیں ملتی۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

امریکہ اور اس کے بزدل اتحادی جو جنگ کو صرف چند گھنٹوں میں ختم کر دینے کا دعویٰ کر کے میدان میں اُترے تھے اور جنھیں اپنی فضائی برتری پر بڑا غرور تھا۔ دنیا نے دیدۂ حیرت کے ساتھ دیکھا کہ یہ غرور واستکبار کی مصنوعی چٹانیں عراقی مجاہدین کے عزم وحوصلہ اور جذبۂ حریت سے ٹکرا کر کس طرح پاش پاش ہوئیں۔ خاص کر الخبزی کے معرکۂ عظیم نے باطل طاقتوں کے کس بل نکال دئیے۔ حیرت ودہشت سے دنیا بھر کے زاغ وزغن (جو عراق کو مردہ ہاتھی سمجھ کر اسے نوچنے اور کھسوٹنے آئے تھے) بڑے احساسِ بے بسی کے ساتھ عراق کے عقابوں کی قوتِ پرواز دیکھ رہے تھے۔ امریکی شیطان بس کی قیادت میں غدارِ اسلام فہد کے عملی تعاون سے پوری دنیا کے عفریتوں سے جو معرکۂ کارزار برپا ہوا اس کے ایک ایک منٹ اور ایک ایک لمحے سے پوری دنیا واقف ہے۔ خلیج کی اس تاریخی جنگ نے امریکہ اور اس کے جدید ٹکنالوجی ساز و سامان کے تعلق سے سارے گمان توڑ دئیے اور پوری دنیا پر اس کی ٹکنالوجی برتری کی قرار واقعی حیثیت ظاہر ہوگئی۔

صدّام زندہ باد

ایک چھوٹے سے ملک نے پوری دنیا سے مقابلہ کرتے ہوئے نہ یہ کہ صرف اپنا دفاع کیا بلکہ دورانِ جنگ امریکہ کو جوابی حملے کے ذریعے ایسی مسلسل چوٹیں پہنچائیں جنہیں امریکہ اور اس کے بزدل اتحادی کبھی بھول نہیں سکتے۔ اس کے اسکڈ میزائل کے قہرمانیوں سے پوری دنیا انگشت بدنداں تھی اور امریکہ اسرائیل، سعودیہ حواس باختہ ہوگئے۔ عراقی میزائل کے خوف سے جانے کتنے یہودی عورتوں کے حمل ساقط ہوگئے۔ بہت سارے کمزور دل کے یہودی تو صرف خوف ودہشت

سے مر گئے اور ایک ہزار یہودی تو اسکڈ میزائل کے زد میں آ کر جہنم رسید ہوئے۔ دورانِ جنگ ایک لاکھ یہودی تل ابیب چھوڑ کر بھاگ گئے۔ الخبز ی، الجبیل، ریاض، طہران، تل ابیب، الحیفہ اور اسرائیلی ری ایکٹر تباہ و برباد ہو گیا اور عراق کی طرف سے یہ جوابی حملے اس عمل جارحیت کے جواب کے طور پر تھے جو حجازِ مقدس کی مقدس سرزمین سے غدارِ اسلام خائن الحرمین فہد بن عبدالعزیز نے ابولہب و ابوجہل، عتبہ و شیبہ کے چیلوں کو جمع کر کے عراق کی مقدس سرزمین اور اہل عراق کو کلی طور پر تباہ و برباد کر دینے کی کوشش کی تھی۔ فہد نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے ایک 14 ہزار مرتبہ بمبار جہازوں اور راکٹوں کی اڑانیں بھرائیں۔ ان جہازوں اور راکٹوں سے ایک لاکھ آٹھ ہزار ٹن بم عراق پر گرائے گئے جس میں چھ ایٹم بم وہ تھے جو جاپان کے ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے گئے تھے، جنھیں جوہری کہا جاتا ہے۔ (ایٹم بم) جو امریکی درندوں کا انتہائی وحشیانہ پن تھا وہ ایٹم بم انسانی نسل کشی کے لیے انتہائی تباہ کن ہوتا ہے۔ اس طرح کی تمام تر تباہیوں کا ذمہ دار صرف فہد بن عبدالعزیز ہے۔ یہ ایک لاکھ آٹھ ہزار ٹن بم عراق کی آبادی میں اس کے جوانوں، مردوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں پر گرائے گئے۔ یہ حوصلہ اور اعصاب شکن جنگ صرف چند گھنٹوں اور چند دنوں تک نہیں محدود رہی بلکہ مسلسل 39 دن تک بڑی گھمسان کی جنگ چلتی رہی۔ پوری دنیا سانس روکے ہوئے خلیج کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ جنگ جدید ٹکنالوجی اور عقیدے کی تھی جس میں ایمان نے فتح پائی اور جدید ٹکنالوجی عارضی طور پر ایک مورچہ جیت کر پوری جنگ ہار چکی تھی۔ اس جنگ کے اختتام پر ایمان و عقیدے نے فتح پائی۔ ملائکہ نے شہیدوں کی ارواح کو خوش خبری سنائی۔ مجرموں، ظالموں، انسانیت دشمنوں نے شیطان کی چاہت کے مطابق اس کی خوب خدمت کی۔ عراقی مجاہدین ایمان باللہ اور اس کی قدرت پر جمے رہے اور پوری مدافعت کے ساتھ ایمان کا راکٹ ضلالت و گمراہی اور شیطانی مراکز پر گراتے رہے۔ اور اگر امریکہ ایران کی خاموش مدد سے عراقیوں کے اندر بغاوت نہ کرا دیتا تو صحرائے عرب مردود امریکیوں کا تاریخی اور یادگار قبرستان ثابت ہوتا۔ روس کی غداری سے جو عظیم بغاوت عراق میں برپا ہوئی اس کی کوئی دوسری مثال جنگ کے دوران انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اگر کوئی اور سربراہِ مملکت ہوتا تو بھاگ کر کسی دوسرے ملک میں پناہ لے لیتا یا خودکشی کر لیتا مگر آفریں ہے فولادی اعصاب کے مالک صدام حسین اور ان کے غازیوں پر کہ اس قدر بگڑے حالات میں بھی وہ ثابت قدم رہے اور عظیم بغاوتوں کو پلک جھپکتے ایسا کچلا جس سے پوری دنیا ایک بار پھر انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی۔ کرد باغیوں اور شیعہ شرپسندوں کو وہ عبرت ناک سزا دی کہ اب ان کی کئی نسلیں بغاوت کے تصور ہی سے لرز اُٹھیں گی۔ اے کاش! دورانِ جنگ عراق میں بغاوت نہ ہو گئی ہوتی تو آج عراق دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوتی مگر۔

اے بسا آرزو کہ کاک شدہ

امریکہ کا قبرستان

جنوبی عراق میں صرف ایک دن کی لڑائی میں اتحادیوں کو وہ زبردست نقصان ہوا تھا کہ میڈیا پر نظر رکھنے والوں کے

کانوں میں آج بھی اردن کے شاہ حسین کے یہ الفاظ جو عمان ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئے تھے عین جنگ بندی کے دن کہ ''جنوبی عراق امریکہ کا قبرستان بن گیا۔''

جنوبی عراق میں ایک دن کی جنگ میں اسّی ہزار آدمی مارے گئے جس میں عراق کا نقصان بہت ہی معمولی تھا۔ ناقابلِ ذکر کی منزل میں تقریباً تمام نقصانات امریکیوں ہی کے ہوئے۔ کہاں تو امریکہ عراق کی بغاوتوں کو کامیابی کے نشے میں جنگ بندی کی باتیں سننے کے لیے نہیں تیار تھا۔ صرف ایک دن کی زمینی لڑائی میں یکطرفہ شدید جانی نقصان سے بش حواس باختہ ہو گیا۔ ایک گھنٹہ پہلے جو پوری دنیا کی اپیل ٹھکرا رہا تھا اپنی فوج کا یہ حشر دیکھ کر ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اچانک جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ جنگ کے دوران تمام مغربی میڈیے اور سامراجی وصیہونی ذرائع ابلاغ صرف یکطرفہ جھوٹی خبریں ہی نشر کرتے رہے اپنی ہر طرح سے برتری اور عراق کی مکمل بربادی کی من گھڑت داستان سے پوری دنیا کے مسلمانوں کو مایوس، بددل اور شکستہ خاطر کیے ہوئے تھے حالانکہ مغربی میڈیا کے اس جھوٹ افتراء، کذب کا جیتا جاگتا تردید تو خود عراق اور بغداد کا محفوظ رہنا ہی ہے۔ ظالموں، بزدلوں اور انسانیت دشمنوں نے تو اپنی طرف سے عراق کو مکمل برباد کر دینے کی کوشش میں کوئی کسر باقی نہیں لگا رکھی تھی۔ عراق پر ان کی جتنی پروازیں ہوئیں، جتنے بم برسائے گئے اور جس انداز میں اہلِ عراق پر آگ کے دریا انڈیلے گئے عراق کی جگہ اگر کوئی دوسرا ملک ہوتا تو وہ اب تک سمندر کا ایک حصّہ بن چکا ہوتا۔

جنگ کے بعد

اس یکطرفہ جھوٹی خبروں اور افواہوں کو سن کر ہندوستان کا مسلمان بھی بڑا بددل مایوس اور پریشان تھا کیونکہ پوری دنیا کی طرح ہندوستانی مسلمانوں نے بھی عراق کی حمایت کا بڑا پُرجوش مظاہرہ کیا تھا۔ دنیا میں سب سے پہلا جلوس آل انڈیا تبلیغ سیرت کی قیادت میں ہندوستانی مسلمانوں نے بمبئی ہی میں نکالا تھا۔ مسلمانوں کی اسی بددلی اور مایوسی کو دیکھتے ہوئے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ذمہ داروں نے یہ طے کیا کہ ایک وفد بغداد شریف جا کر ان کے دُکھ درد میں شریک بھی ہو جائے۔ پُرسشِ احوال کے ساتھ ان کی تعزیت بھی کرے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اخلاق وتعاون کا یقین بھی دلائے۔ دنیا بھی کی سپر طاقتوں سے تن تنہا لڑنے اور عراق کی ایک ایک انچ زمین کو اپنے قبضے میں برقرار رکھنے پر انھیں مبارکباد بھی پیش کرے اور مغربی میڈیا کے مطابق بغداد و عراق کے دوسرے اہم ترین شہروں کی تباہی و بربادی کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ کر یہاں کے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ بھی کر دے۔ چنانچہ 15 اکتوبر 1991ء کو آل انڈیا تبلیغ سیرت کا ایک وفد مرکزی جوائنٹ سکریٹری الحاج رشید طیب اور مہاراشٹر تبلیغ سیرت کے جنرل سکریٹری مولانا قاری اطہر حسین رضوی پر مشتمل بمبئی سے دہلی پھر وہاں سے عمان اور عمان سے بائی روڈ سفر کی سختیاں جھیلتا ہوا بغداد پہنچا۔

اہلِ بغداد بالخصوص عراقی حکام کو جب یہ معلوم ہوا کہ ہندوستان سے وہاں کے مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کا ایک وفد اپنے خرچ پر موسم اور راستے کی سختیاں جھیلتا ہوا اہلِ عراق کی خیریت، شہداء کی تعزیت اور ہمارے دُکھ

درد میں شریک ہونے آیا ہے تو عوام اور خواص دونوں نے تبلیغ سیرت کے اس وفد کی راہوں میں اپنی آنکھیں بچھا دیں اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ہندوستانی مسلمان عراق کے متعلق مغربی میڈیا کی پھیلائی ہوئی جھوٹی خبروں وافواہوں سے بہت پریشان ہیں اور اہلِ عراق کی پریشانیاں، ان کے نقصانات اور بروقت انسانی ضرورتوں سے باخبر ہونا چاہتے ہیں۔ عراق کے تعلق سے ہندوستانی مسلمانوں کے اس پاکیزہ جذبات کو سن کر عراقی حکام بہت خوش ہوئے۔ پھر تو تبلیغ سیرت کے اس وفد کو عراق کے قابلِ ذکر اہم شہروں کے سروے کے لیے انھوں نے تمام آسانیاں اور سہولتیں فراہم کیں۔ ہمارے وفد نے پندرہ دن رہ کر وہاں کے تمام اہم قابلِ ذکر شہروں اور اس کے نقصانات کو بہت ہی قریب سے دیکھا۔ وہاں کے تفصیلی حالات کا جائزہ لیا۔ اقتصادی ناکہ بندی سے اہل عراق کو جو پریشانیاں لاحق تھیں اور جس کربِ مسلسل سے وہ گزر رہے تھے اس کا بڑی باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور اس کی ایک تفصیلی رپورٹ تیار کی۔ اسی سفر میں تبلیغ سیرت کے حسنِ خدمات سے متاثر ہو کر .. اس خالص مذہبی تنظیم سے اسلام وسنیت کی نشر و اشاعت اور دینی علوم کے فروغ اور غریب ہندوستانی مسلمانوں کی اعلیٰ مذہبی تعلیم نیز عقائد حقہ کی تبلیغ کے لیے چند اہم معاہدے وزارتِ اوقاف نے کیے جسے حکومتِ بغداد نے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بہت نمایاں طور پر نشر کیا۔ آپ اسی نمبر میں اسے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

عراق سے واپسی کے بعد وہاں کے حالات پر مشتمل آل انڈیا تبلیغ سیرت نے جو رپورٹ تیار کی اسے اقوامِ متحدہ کے جنرل سکریٹری اور دنیا کے دیگر ممالک کی بڑی بڑی تنظیموں، حقوقِ انسانی کے لیے کوشاں اداروں، سربراہانِ مملکت اور دنیا بھر کے سفارت خانوں کو بھیجا۔ انسانی واسلامی بنیادوں پر ان کے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ اس رپورٹ کو ہندوستان کی انٹرنیشنل ایجنسی یو۔ این۔ آئی نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے ادارے سے ریلیز کیا اور ہندوستان کے قومی پریس نے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا بالخصوص انگریزی اخبارات نے نمایاں طور پر اپنے قیمتی صفحات پر پیش کیا۔

عالمی اسلامی کانفرنس

اکتوبر 1991ء میں تبلیغ سیرت کا یہ وفد از خود گیا تھا لیکن دسمبر 1991ء میں حکومت عراق کی وزارتِ اوقاف کی طرف سے جنوری 1992ء میں منعقد ہونے والی عالمی اسلامی کانفرنس منعقدہ 17، 18، 19، 20 جنوری کے لیے آل انڈیا تبلیغ سیرت کو خصوصی دعوت نامہ ملا۔

سالِ گزشتہ کی طرح ایک بار پھر آل انڈیا تبلیغ سیرت کو صبح سعادت نے آواز دی۔ بغداد شریف سے بلاوا آیا۔ کربلائے معلیٰ و نجف اشرف نے اپنی طرف کھینچا۔ حضور سیّدنا غوث الاعظم نے اپنے غلاموں کو اپنے حضور میں طلب فرمایا۔ مجاہد ملّت حضرت علّامہ حبیب الرحمٰن قادری کا جذبۂ سوزِ دروں رنگ لایا۔ ایک بار پھر تبلیغ سیرت نے آرزوؤں کی بارات سجائی۔ 13 جنوری 1992ء کو دن گزار کر رات میں 31 خوش نصیب افراد پر مشتمل کاروانِ محبت سوئے بغداد جادہ پیما ہوا۔ عقیدے اور جدید ٹکنالوجی کی جنگ میں عقیدے کی برتری کو عالم پر آشکارا کرنے والے غازیوں، مجاہدوں،

شہیدوں کوخراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے عقابوں کے نشیمن کی طرف پرواز کرنے کی سعادتِ سرمدی حاصل ہوئی۔ یہ عراق کے غازیوں، مجاہدوں اور شہیدوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے جو پوری دنیا میں اسلامی بیداری کی لہر پیدا ہوئی۔ یہ ان کے جذبوں کی تڑپ اور مقدس لہو ہی کا صدقہ ہے کہ روسی دیو استبداد افغان مجاہدین کے جذبہ حریت کے آگے سرنگوں ہو گیا اور سندھ کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر اسلامی بیداری کی نئی لہر سے اسلام دشمن طاقتوں کی ابھی سے نیند حرام ہو رہی ہے۔ مدراس، کرناٹک، بہار، بنگال، اتر پردیش، مہاراشٹ کے تمام افراد تبلیغ سیرت بمبئی میں اکٹھا ہوئے۔ راقم الحروف محمد وارث جمال قادری مرکزی نائب صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت کے علاوہ پیر طریقت حضرت سیّد مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی، پیر طریقت حضرت مولانا سیّد شمس الحق صاحب بنگلور، ناگور شریف، مدراس کے سجادہ نشین حضرت سیّد کامل میاں صاحب، سیتامڑھی بہار سے حضرت مولانا قاری اطہر حسین صاحب، دیناج پور بنگال سے مفتی محمد سلیم اختر صاحب، بنگلور کرناٹک سے سیٹھ عزیز احمد و بشیر احمد خاں و مولانا احمد اللہ خاں صاحب، امروہا (مرادآباد) سے مولانا قاری عرفان احمد صاحب، غازی پور یوپی سے حضرت مولانا فیض احمد فیض صاحب، بمبئی سے الحاج رشید طیب عالی جناب سیٹھ خان بہادر، سیٹھ فاروق احمد سونا پور، جناب معین الدین شیخ اجمیری خالد قریشی، اقبال قریشی، مقصود احمد پاٹکا، محمد ہارون اور مولانا عبدالسمیع صاحب وغیرہ وغیرہ تمام لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل کر ماہم شریف قطب کوکن حضرت مخدوم فقیہی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔

عشاء کی نماز اور فاتحہ خوانی کے بعد 10 بجے ہم وہاں سے نکل کر تھوڑی دیر میں سہارا ائیر پورٹ پہنچے ہر طرح کے قانونی مراحل سے گزرنے کے بعد ہم بمبئی ائیر ویز کے فلائٹ نمبر 727 پر سوار ہوئے۔ طیارے کی اڑان کا وقت ایک بجے شب میں تھا۔ اس لیے طے یہ تھا کہ فجر کی نماز صنعاء (یمن کی راجدھانی) میں پڑھی جائے گی لیکن یمنی طیارہ کافی تاخیر سے اڑا ڈھائی بجے شب میں۔ کئی گھنٹے پرواز کے بعد صبح کاذب ہی میں طیارے نے لینڈ کیا۔ ہم لوگ صنعاء سمجھ کر اترنے کی تیاریاں کرنے لگے کہ ایر ہوسٹس نے بتایا یہ صنعاء نہیں۔ صنعاء یہاں سے 45 منٹ کی پرواز ہے۔ یہ ایک ڈومسٹک ہوائی اڈہ ریان ہے، طیارہ میں پٹرول ختم ہو گیا ہے اس لیے طیارے کو یہیں لینڈ کرنا پڑا۔ سوئے اتفاق کہ اس ہوائی اڈے پر بھی پٹرول نہیں تھا کافی انتظار کے بعد جب ہم لوگ نیچے اترے تو صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ سبھوں نے حوائج ضروریہ سے فراغت کے بعد وضو کیا اور وہیں ہوائی پٹی پر نماز باجماعت ادا کی گئی۔ خلاف توقع موسم بہت خوشگوار تھا۔ نماز پڑھ کر کچھ لوگ ہوائی جہاز کا بلنکٹ (کمبل) بچھا کر وہیں لیٹ گئے اور بہت سارے لوگ وقت گزاری کے لیے اِدھر اُدھر پھیل گئے۔

اسی جہاز پر ہمارے ساتھ حیدرآباد کے مندوبین بھی تھے۔ رہنمائے دکن کے مالک و ایڈیٹر سیّد وقار الدین صاحب اور خطیب دکن حضرت مولانا سیّد کاظم پاشا صاحب اوّل الذکر بغداد شریف کے پہلے سفر میں بھی ساتھ تھے اور آخر الذکر دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں ہمارے جونیر ساتھی بھی رہ چکے ہیں۔ موصوف سے فراغت کے 21 برس بعد اتنی تفصیل سے ملاقات ہوئی تھی۔ بمبئی سے یمن، یمن سے اردن، پھر اردن سے بغداد شریف تک بڑی تفصیلی ملاقات اشرفیہ کے ایامِ طفلی کی صحبتیں پھر سے

تازہ ہوگئیں۔ موصوف نسباً قادری، جید عالم اور دکن کے ایک نامور خطیب بھی ہیں، انتہائی بااخلاق کریم النفس۔

مبارک ملک یمن

نصیبے کی ارجمندی ہی کہیے کہ ہم اس ملک کی فضاؤں میں چہل قدمی کر رہے تھے جس کے لیے ارشادِ نبوت (ﷺ) ہے:

"اللهم بارك لنا في شامنا و في يمننا۔"

ترجمہ:۔ اے اللہ! ہمارے شام اور ہمارے یمن میں برکتیں نازل فرما۔

یہ دُعائے خصوصی اس لیے بھی ہے کہ شام اور یمن کے لوگوں نے اسلام کی قبولیت کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھولنے میں زیادہ تاخیر نہیں کی تھی۔ ریان ایر پورٹ ایک چھوٹا سا ڈومسٹک ہوائی اڈہ ہے۔ اپنے مختصر وجود کے ساتھ وہاں پر زندگی کی علامتیں بھی بہت مختصر ہیں۔ ہوائی اڈہ کے اردگرد دور تک آبادی کا نام ونشان تک نہیں۔ نیچے زمین او پر آسمان درمیان میں صحرا کی وسعتیں ائیر پورٹ کے رن وے پر کھڑا ہوا ایک یمنی طیارہ اور اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہم چند بے قیمت انسان! ہم غریب الوطنوں کی وجہ سے وہاں کا سکوت مسلسل عارضی طور پر ٹوٹ چکا تھا۔ ریگزار سے نغمے ابلنے لگے تھے۔ صبح کا سہانا وقت حد نگاہ تک صحرا کی لامحدود وسعتیں اس پر بادِ صبا کے خوشگوار جھونکے یہ سب طبیعت کو بوجھل ہونے سے بچائے ہوئے تھیں۔ کافی دیر کے بعد پٹرول کی گاڑی آئی۔ سب لوگوں نے اپنی اپنی سیٹیں سنبھال لیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے طیارے نے رن وے چھوڑ دیا۔

ایک گھنٹے کے اندر ہم لوگ یمن کی راجدھانی صنعاء کے انٹرنیشنل ہوائی اڈے پر پہنچ گئے۔ صبح 10 بجے جب ہم صنعاء ائیر پورٹ پر پہنچے تو وہاں پر معلوم ہوا کہ اردن کے لیے یہاں سے ہوائی جہاز دوسرے دن شام کے وقت ہے۔ خوشی بھی ہوئی کہ چلو ہم عرب کے ایک قدیم ملک اور اس کی راجدھانی کو کسی حد تک دیکھ لیں گے جس کا ذکر قرآنِ مجید میں مختلف انداز میں بار بار آیا ہے:

"اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ۔"

ترجمہ:۔ کیا تم نے نہ دیکھا کہ تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیسا کیا۔ وہ ارم حد سے زیادہ طول والے کہ ان جیسا شہروں میں پیدا نہ ہوا۔ (پارہ 30)

"لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِىْ مَسْكَنِهِمْ آيَة۔" (السباء پارہ 22)

"بے شک سبا کے لیے ان کی آبادی میں نشانی تھی۔"

اور کبھی تبع حمیری کا ذکر کرتے ہوئے:

اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اَهْلَكْنَاهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ۔ (دخان پارہ 25)

"کیا وہ بہتر ہیں یا تبع کی قوم اور جو ان سے پہلے تھے ہم نے انھیں ہلاک کر دیا۔ بے شک وہ لوگ مجرم تھے۔"

یمن کے بادشاہوں کو تبع کہا جاتا تھا۔ یہ تبع حارث بن جمال حمیری تھے۔ یہی وہ تبع ہیں جنھوں نے ایک خط حضور ﷺ کے نام لکھ کر مدینہ منورہ کے لوگوں کو تاکید کی تھی کہ نسلاً بعد نسلٍ یہ خط نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے جب ہجرت کی اور مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان پر سرکار کو حضرت ابویعلیٰ نے وہ خط پیش کیا۔

یمن ہی عرب کی وہ سرزمین ہے جہاں عربی زبان پیدا ہوئی۔ یعرب بن قحطان بن عامر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح علی السلام یمن کا پہلا بادشاہ جس نے عربی زبان میں سب سے پہلے گفتگو کی۔ وہ عربی زبان کا موجد ہے۔ عرب اسی کے نام سے مشتق ہے۔ گویا پورا عرب، عرب کہلانے میں یمن ہی کا رہین منت ہے۔

وہاں پر ہم ٹرانزٹ ویزے پر تھے اور حکومت یمن کے مہمان بھی! موتمر عالمی اسلامی بغداد کا ڈیلیگٹس ہونے کی وجہ سے روایتی طور پر خیر مقدم بھی ہوا۔ کاغذی خانہ پُری و قانونی مراحل سے گزرتے ہوئے سرسری طور پر ہمارا کسٹم بھی ہوا۔ کسٹم آفیسر ایک نوجوان خاتون تھیں جو سرتا پیر سخت شرعی حجاب میں ملبوس تھیں حتیٰ کہ ہاتھوں اور پیروں پر بھی دستانے تھے۔ ہمارے یہاں کی طرح چہرے سے ہٹانے اور گرانے والا برقعہ نہیں تھا کسی بھی گوشے سے ہلکی سی رونمائی کے لیے بھی کوئی گنجائش نہیں تھی بس پلکوں کی جگہ پر پلکوں ہی کے برابر حجاب میں جگہ بنی ہوئی تھی، حجاب کامل میں ملبوس انتہائی چاق و چوبند ہم انھیں کے حصے میں پڑے دو تین منٹ ہی میں چھٹی پا گئے کیونکہ ایک مختصر سی اٹیچی پورے سفر میں کل کائناتِ سفر تھی جس میں دو جوڑے کپڑے ایک گرم شال، ایک درجن عطر کی شیشیاں اور چند پاکٹ وِلس سگریٹ یہی اپنے سفر کا سرمایہ! غالب نے تو کہا تھا کہ ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

مگر یہاں تو یہ بھی نہیں اللہ بس! باقی ہوس کی منزل سے گزر رہے تھے۔ اس قدر سخت پردے کے عالم میں بھی وہ اپنے فرائض منصبی کو بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھیں۔ پورا وفد ان کے کاموں کو حیرت و مسرت کے ساتھ دیکھ دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کر رہا تھا کہ ایک یہ خاتون ہیں کہ جو اتنے بڑی پوسٹ پر ہوتے ہوئے بھی اس قدر شرعی حرمتوں کا احترام اور ایک ہمارے یہاں کی خاتونِ خانہ ہیں کہ جنھیں بے حجاب ہونے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔ کسی بھی جہت سے ان کے جلوۂ حسن کی حشر سامانیوں کی نمائش ہونی چاہیے۔ اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ تمام قانونی مراحل سے گزر کر ہم ہوائی اڈہ سے باہر آئے۔ یمنی ایرویز بس کے ذریعے ہمیں الروضہ ہوٹل لے جایا گیا۔

الروضہ:۔ قدیم یمن کے محلے میں ایک وسیع و عریض ایریا میں بنا ہوا الروضہ ساڑھے تین سو سالہ قدیم پتھر کی بنی ہوئی ایک تاریخی عمارت ہے جو اپنے قدیم طرزِ تعمیر میں عجیب انفرادیت لیے ہوئے ہے کسی بھی روم میں کوئی پنکھا نہیں

ہے، کوئی اے، سی نہیں۔ اس کے باوجود کمرہ ہمیشہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ اس بلند ترین عمارت میں کوئی لفٹ نہیں۔ پرانے زمانے کی سیڑھیاں اور ایک منزلہ سے دو منزلہ تک اتنی بلندی کہ فی زمانہ بلڈنگوں کے مقابلے میں دوگنا سے بھی زیادہ۔ اگر کسی ضعیف یا موٹے آدمی کو پانچ منزلہ پر جانا ہو تو اس کی چھٹی ہی سمجھیے۔

پیر طریقت حضرت سیّد مثنیٰ میاں صاحب قبلہ کو چوتھے منزلے پر کمرہ ملا۔ کاؤنٹر پر جا کر حضرت کی ضعیفی کی طرف اشارہ کر کے کمرہ بدلوایا گیا۔ وہیں پر ایک لطیفہ یہ ہو گیا کہ ہم لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی میں اس کوشش میں تھا کہ سب اپنی اپنی جگہوں پر فٹ ہو جائیں پھر جا کر اپنا کمرہ الاٹ کراؤں۔ کچھ تو پہلے سے پُر تھے۔ حیدر آباد کے لوگوں کو لے کر پچاس ہو گئے۔ سبھوں کو بڑے قاعدے سے کمرہ مل گیا، میں خود بے کمرہ رہ گیا۔ سوچا کہ کوئی حرج نہیں کسی کے بھی کمرے میں زمین پر بستر ڈال دوں گا لیکن جب تبلیغ سیرت کے ایک سرگرم متحرک وفعال رکن جناب معین الدین شیخ اجمیری کو معلوم ہوا کہ مولانا سب کے انتظام میں لگے رہے اور ہوٹل میں کمرہ ہی ختم ہو گیا تو انھیں بڑا تعجب ہوا کہ صدر صاحب ہی کو کمرہ نہیں ملا۔ حالانکہ میں اس وقت بمبئی تبلیغ سیرت کے صدر کے بجائے مرکزی نائب صدر ہو گیا تھا فالحمد للہ علیٰ ذالک وہ مجھے لے کر کاؤنٹر پر پہنچے اور بڑی ملائمت سے کہا کہ جناب یہ ہمارے جماعت کے پریسیڈنٹ ہیں اور انھیں کو کمرہ نہیں ملا۔ اس نے بڑی حیرت سے کہا کہ مسٹر پریسیڈنٹ اب تک کہاں تھے جب میں لوگوں کو کمرہ الاٹ کر رہا تھا۔ انھوں نے کہا یہ خود اِس دیکھ بھال میں تھے کہ کس کس کو کمرہ ملا۔ وہ اس بات پر خوش ہوا کہ یہ اپنے ساتھیوں کے دیکھ بھال میں تھے۔ پھر ایک کمرہ جو خصوصی طور پر بچا رکھا تھا اسے میرے نام الاٹ کیا۔ یمنی تو یوں ہی رقیق القلب اور نرم دل ہوتے ہیں۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ یہ پورا وفد بغداد شریف کے مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے جا رہا ہے تو وہ دیدہ و دل فرشِ راہ ہو گئے کہ عرب کا بچہ بچہ عراق اور اہل عراق اور صدر صدام حسین پر قربان ہونے کا جذبہ رکھتا ہے، سوائے نجدی طواغیت اور چند عافیت کوش بزدل عیاش شیوخ کے۔

ہم لوگ ہوٹل میں اپنی ضروریات سے فراغت کے بعد یمن کی راجدھانی صنعاء (سبا) کو دیکھنے کے لیے نکلے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہم لوگوں کو ٹورسٹ سمجھ کر یمن کے قدیم محلوں میں لے کر چلے گئے، عجیب وغریب طرز کی عمارتیں، پتلی پتلی گلیاں، پرانے قلعے اور اس کے در و دیوار مجموعی طور پر وہ ماحول کسی اساطیری کہانی کا حصّہ معلوم ہو رہے تھے۔

مزاراتِ صحابہ:۔ یمن میں بڑے بڑے تاریخی مقاماتِ مقدس، زیارت گاہیں، مزاراتِ انبیاء وصحابہ، مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبل اور خیر التابعین حضرت اویس قرنی بھی وہیں ہیں۔ ملکہ سبا بلقیس بھی وہی کی اور شدّاد کی جنّت بھی وہیں پر۔ ابرہہ الاشرم ہاتھیوں کا لشکر لے کر کعبہ کو ڈھانے والا بھی وہی کا تھا اور تبع حمیری بھی وہیں کے بادشاہ تھے جو صدیوں پہلے ہی محض آسمانی کتابوں کی رہنمائی میں حضور ﷺ ایمان لا چکے تھے۔ الغرض یمن تاریخ کا ایسا خزانہ ہے جو اپنی نوعیت میں منفرد اور بے مثل ہے۔

ملکہ بلقیس یمن کے مشہور بادشاہ شراحیل کی پوتی اور بداد جو اپنے بھائی منذر کے بعد یمن کا حکمراں ہوا اس کی بیٹی تھی۔ باپ کے بعد یمن کی حکمراں بنی بڑی بہادر، شجاع اور بے حد خوبصورت، اس کی حکومت بہت مضبوط تھی، اس کی فوج میں ایک ہزار سالار اور ہر سالار کے زیر کمان دس ہزار سپاہی۔ اس کا تختِ شاہی اسّی (80) گز لمبا اور اسّی گز چوڑا جو پورے سونے کا تھا۔ جس میں یاقوت، زمرد اور موتی جڑے ہوئے تھے۔ قرآنِ مجید نے جس کے تخت کے لیے فرمایا: وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ۔ ''اور اس کا تخت بہت بڑا ہے۔ یہ ملکہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر ایمان لائی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے نکاح بھی کیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی خواہش پر آصف برخیا نے پلک جھپکتے یہ تخت حاضر کر دیا تھا۔ ملکہ بلقیس کا واقعہ تاریخ عالم میں بہت مشہور ہے۔ قرآنِ مجید کے 22 ویں پارہ سورۂ سباء میں اور اس کے علاوہ قرآنِ مجید ہی میں مختلف مقامات پر آپ کا ذکر ہے۔ ایک طرح سے وہ یمن کی شناخت بن چکی ہیں اور آج بھی راجدھانی صنعاء میں کسی بھی بورڈ پر نظر ڈالیے تو صنعاء کے بریکیٹ میں (سبا) ضرور لکھا ملے گا۔

تبع حمیری:۔ یہ ملک کلی کرب کا بیٹا اور تبع اکبر اقرن بن شمر کا پوتا تھا جو شاہانِ یمن کی تاریخ میں تبع اوسط کہلایا۔ نام سعد اور کنیت ابو کرب تھی۔ زبردست عالم و دانا اور علمِ نجوم کا ماہر، بڑا اولوالعزم بہادر اور باحوصلہ تھا۔ اس نے شرق و غرب میں اپنی فتوحات کا جھنڈا بلند کیا۔ ہندوستان وارم پر حملے کیے۔ ان سے لڑائیاں لڑیں وہ بت پرست تھا۔ یمن اور عرب کے تمام باشندے علی العموم اس کے دین پر تھے کہ الناس علی دین ملوکھم۔ مگر مدینہ منورہ (جو پہلے یثرب کہلاتا تھا) اور اس کے اطراف کے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دین یہودیت پر قائم تھے۔ تبع اپنے پورے فاتحانہ جاہ و جلال اور شاہانہ تمکنت کے ساتھ جب سرزمین حجاز سے گزرا تو اس نے مکّہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کی زیارت کی، اسے دیبا کا غلاف پہنایا۔ پھر مدینہ پہنچ کر اس کا محاصرہ کرلیا اور یہودیوں سے جنگ شروع کر دی۔ مسلسل ایک ہفتے تک جنگ ہوتی رہی۔ اہلِ مدینہ دن بھر جنگ کرتے اور رات کو تبع کے لشکر میں کھجوریں مفت بھیجتے تھے یعنی دن بھر لڑائی کرتے، رات بھر میزبانی۔ ان کے اس حسنِ سلوک پر تبع کو شرم و غیرت آئی کہ ایسے فیاض لوگوں سے لڑنا ٹھیک نہیں۔ اس نے لڑائی بند کر دی اور گفتگو کرنے کے لیے اہلِ مدینہ کو بلایا۔ کعب و اسد نامی دو یہودی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے دورانِ گفتگو بادشاہ سے کہا کہ آپ اس شہر کو کبھی نہیں برباد کر سکتے کہ یہ مقدس شہر نبی آخر الزماں ﷺ ہجرت گاہ بننے والا ہے۔

تبع خود ہی عالم، فاضل اور علومِ نجوم کا بہت بڑا جانکار تھا۔ اس نے ان یہودی عالموں سے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے توریت پڑھ کر دین حنیف اور ظہورِ نبی آخر الزماں کی کیفیت بتائی۔ تبع نے غور سے سنا اور پھر دین موسیٰ علیہ السلام کو قبول کرلیا۔ اسی وقت پیغمبر آخر الزماں حضرت سیّدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آیا۔ مدینہ کو آباد چھوڑ دیا اور ایک خط حضور کے نام لکھ کر انھیں یہ ہدایت کی کہ یہ ہمارا خط ہے۔ وہ جب ظہور فرمائیں خواہ میری زندگی میں یا میری وفات کے بعد اسے حفاظت سے حضور نبی آخر الزماں ﷺ پہنچایا جائے۔ حضور ﷺ

شانِ اقدس میں تبع حمیری نے اس وقت جو قصیدہ کہا تھا تبرکاً اس کے دو شعر یہاں پیش ہیں ۔

شھدت علی احمد انه رسول من الله بار النسم

فلو مد عمری الی عمره لکنت وزیرا له وابن عم

ترجمہ:۔ میں نے احمد (ﷺ) کے لیے گواہی دی ۔ وہ خدائے زندہ کے رسول ہیں ۔ اگر میری عمران کے ظہور تک ہوتی تو میں ان کا وزیر اور ابن عم بنتا۔

چنانچہ وہ وہیں سے یمن لوٹ گیا۔ اس کا لشکر دن رات کی لڑائیوں سے تنگ آچکا تھا لہٰذا اسے شہید کر دیا گیا اس نے یمن پر تین سو ساٹھ سال حکومت کی۔

تبع، تحقیق جدید کے مطابق حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی قادر، جبار، صاحبِ قوت ہوتے ہیں ۔ اسلامی تاریخ میں لفظ سلطان انھیں معنوں میں رواج پایا۔ قرآنِ مجید میں قوم تبع کا ذکر دو بار آیا ہے ۔ پہلی مرتبہ سورۂ ق اور دوسری مرتبہ سورۂ دخان میں ۔ دونوں جگہ قوت و عظمت، جبروت و سطوت اس کی طرف اشارہ ہے ۔ یمن کے ہر بادشاہ کو تبع نہیں کہتے ہیں بلکہ جس کی بادشاہت پر یمن کے حمیر حضر موت کے تمام طبقے متفق ہوتے وہی تبع کہلاتا۔

حارث والیش یمن کا پہلا تبع تھا جو ایک نامور فاتح تھا جس کے قلمرو میں بہت سے ممالک تھے یہاں تک کہ ہندوستانی حکمراں بھی اسے خراج دیتے تھے ۔ یہ حارث والیش ملکہ بلقیس کے داداؤں میں سے تھا۔

شدّاد اور اس کی جنّت شدّاد جس نے خیالی جنّت بنائی تھی ۔ یہ عاد کا بیٹا تھا جس کا تذکرہ قرانِ مجید کے تیسویں پارہ سورۂ الفجر میں ہے: الم تر کیف فعل ربك بعاد۔ (کیا تم نے نہ دیکھا تمہارے رب نے عاد کے ساتھ کیسا کیا) یہ حضرت نوح علیہ السلام کا پڑپوتا تھا۔ شدّاد بن عاد بن عوص بن ارم بن سام بن نوح (علیہ السلام) یہ اپنے باپ عاد کے بعد بادشاہ بنا۔ دنیا کا بہت بڑا بادشاہ۔ دو سو ستّر 270 بادشاہ جس کے باج گزار اور فرماں بردار تھے ۔ یہ اللہ کا بہت بڑا نافرمان، ناشکرا اور سرکش بندہ تھا۔ اللہ نے اس کی ہدایت کے لیے پیغمبر بھیجا مگر اس نے سرکشی کی اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ایک جنّت بنانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس نے دنیا بھر کے بادشاہوں کو حکم دیا کہ اپنے اپنے ملکوں سے سونا چاندی، جواہرات لے کر حاضر ہو جاؤ۔ وزیروں کو حکم دیا کہ یمن کے اندر اتنے بڑے علاقے پر وہ جنّت تیار کیا جائے ۔

صدر الافاضل فخر الاماثل حضرت علّامہ سیّد نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہٗ العزیز الم تر کیف فعل ربک بعاد کے تحت تفسیر خزائن العرفان میں فرماتے ہیں:۔

”زور و قوت اور طول قامت میں عاد کے بیٹوں میں شداد بھی ہے جس نے دنیا پر بادشاہت کی اور تمام بادشاہ اسی کے مطیع ہو گئے ۔ اس نے جنّت کا ذکر سن کر دنیا میں جنّت بنانی چاہی اور اسی ارادہ سے ایک شہر عظیم بنایا جس کے محل سونے چاندی کی اینٹوں سے تعمیر کیے گئے اور زبرجد و یاقوت کے ستون اس کی عمارتوں میں نصب ہوئے ۔ اور ایسے ہی فرش

مکانوں اور رستوں میں بنائے گئے۔ سنگ ریزوں کی جگہ آبدار موتی بچھائے گئے۔ ہر محل کے گرد جواہرات پر نہریں جاری کی گئیں قسم قسم کے درخت حسن تزئین کے ساتھ لگائے گئے۔ (تین سو سال میں جب یہ جنّت بن کر تیار ہوئی) تو شداد اپنے اعیانِ سلطنت کے ساتھ اس کی طرف روانہ ہوا۔ جب ایک منزل کا فاصلہ باقی رہ گیا تو آسمان سے ایک ہولناک آواز آئی جس سے اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا (کوئی بھی اس جگہ تک نہ پہنچ سکا۔ سب کے سب جہنم رسید ہوئے اور اس جگہ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی نگاہوں سے چھپا دیا)۔ امیر المؤمنین حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں حضرت عبداللہ بن قلابہ صحرائے عدن میں اپنے گم شدہ اونٹ کو تلاش کرتے ہوئے اس شہر میں پہنچے اور اس کی تمام زیب و زینت دیکھی اور کوئی رہنے بسنے والا نہ پایا۔ تھوڑے سے جواہرات لے کر وہاں سے چلے آئے۔ یہ خبر جب حضرت امیر معاویہ کو ہوئی تو انھوں نے عبداللہ بن قلابہ کو بلا کر حال دریافت کیا۔ انھوں نے تمام قصہ سنایا امیر معاویہ نے جب کعب احبار کو بلا کر دریافت کیا کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا شہر ہے۔ انھوں نے فرمایا: ہاں، جس کا ذکر قرآن میں بھی آیا ہے۔ یہ شہر شداد بن عاد نے بنایا تھا۔ وہ سب عذابِ الٰہی سے ہلاک ہو گئے ان میں کوئی بھی باقی نہ رہا۔ آپ کے زمانے میں ایک مسلمان سرخ رنگ، کبود چشم، قصیر القامت جس کی ابرو پر ایک تل ہوگا اپنے اونٹ کی تلاش میں (اس میں) داخل ہوگا۔ پھر عبداللہ بن قلابہ کو دیکھ کر فرمایا! بخدا وہ یہی ہے۔"

عدن:۔ یمن کا مشہور شہر ہے اور صحرائے عدن یمن کا مشہور صحرا۔ عدن کے موتیوں کی شہرت تو آفاقی ہے۔ خود اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

دندان لب و زلف سب اس شہہ کے فدائی ہے لعل یمن درعدن مشک ختن پھول

صنعاء کے قدیم محلے کو ہم گھوم پھر کر دیکھتے رہے تاریخی عمارتیں، ترکوں کی بنائی مسجدیں اور قلعہ، جب طبیعت بوجھل ہونے لگی تو ہم ٹیکسی پکڑ کر وہیں سے ہوٹل واپس آ گئے۔

دوسرے دن ٹریولر چیک بینک میں جمع کر کے اس کا ڈالر لینا تھا۔ بہت سارا وقت اسی میں ضائع ہو گیا۔ جتنا بڑا قافلہ تھا، اسی کے اعتبار سے وقت بھی لگا۔ ایک بجے تک ہمیں ہوٹل چھوڑ دینا تھا۔ دوپہر کا کھانا یا تو ائیر پورٹ یا ہوائی جہاز میں کھانا تھا۔ یمن ائیر لائنز کی گاڑی اپنے وقت پر ہمیں لینے ہوٹل پہنچ گئی۔ ہم لوگ یمن ائیر پورٹ پر آ گئے۔ جنھیں کھانے کی خواہش تھی انھوں نے ائیر پورٹ پر کھانا کھالیا اور جنھیں نہیں تھی وہ پلین کے انتظار میں بیٹھے رہے۔

مقدس فضاؤں میں:۔ 15 جنوری 1992ء کو ہم یمن سے اردن کے لیے روانہ ہو گئے۔ ہم لوگ تو اپنے وقت سے ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے، مگر وہاں طیارہ اپنے وقت سے کافی لیٹ تھا۔ عصر کی نماز بھی وہیں پڑھی گئی۔ بعد نمازِ عصر ہم لوگ ہوائی جہاز میں سوار ہوئے، سورج ڈوبنے سے آدھا گھنٹہ قبل طیارے نے صنعاء کا رن وے چھوڑ دیا۔ جب تک اجالا پھیلا رہا، پہاڑیوں کا بڑا عجیب و غریب و حیران کن سلسلہ ہوائی جہاز سے نیچے دیکھنے کو ملا اور روئی کے گالے کی

طرح بادلوں کے بڑے بڑے پہاڑ اُڑتے نظر آتے رہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک پلین سمندر کے حدود میں نہ داخل ہو گیا۔ اس چھوٹی سی عمر میں ملک و بیرونِ ملک کا بارہا ہوائی سفر کیا مگر صنعاء سے ہوائی جہاز اُڑنے کے بعد جو مناظر دیکھے اس سے پہلے کبھی نہیں۔ عقل اس وقت تک دیدۂ حیرت بنی ہوئی تھی جب تک سمندر نے اس پر تاریکی کی چادر نہیں ڈال دی۔

طیارہ اُڑتا رہا۔ ہم نے بھی چہرہ کو کھڑکی سے ہٹالیا اور بغداد کے تصور میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر کے بعد جہاز میں اعلان ہوا کہ اب ہم سعودی عربیہ کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ ہمارا طیارہ سطحِ زمین سے 33 ہزار فٹ کی بلندی پر اُڑ رہا ہے۔ کچھ ہی دیر میں جدہ شہر آرہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد نیچے جدہ شہر کی دور تک پھیلی ہوئی روشنیاں دکھائی دیں کچھ ہی دیر بعد پھر عربی ہی میں اعلان ہوا کہ اب مدینہ منورہ آرہا ہے۔ آہ! اناؤنسر نے کون سا نام لیا کہ پورے جہاز میں ہلچل مچ گئی۔ مضرابِ الفت پر مطرب نے کون سا نغمۂ درد چھیڑ دیا کہ سب بسمل نظر آنے لگے۔ کیا عربی، عجمی سبھوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ ابھی ذہنی طور پر مدینہ منورہ کے استقبال کے لیے سنبھل ہی رہے تھے کہ اتنے میں وہ کعبہ مقصود نظروں کے سامنے آہی گیا۔ پائلٹ جو ایک عربی مسلمان تھا یقیناً کسی صحابی یا عاشقِ رسول ہی کی اولاد تھا جو 33 ہزار فٹ سے غیر محسوس طور پر طیارہ کو بہت نیچے اتارا، اتنا نیچے کہ بادلوں سے بھی نیچے کر دیا اور اتنا آہستہ کہ محسوس ہو رہا تھا کہ اب جہاز رک جائے گا۔ مولیٰ عزوجل اس پائلٹ کو دنیا و آخرت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ اس نے ہم لوگوں کے گنہگار وجود کو اس شہر مقدس اور مدینۂ محبت سے اتنا قریب کر دیا کہ ہم لوگوں نے آنسوؤں کے ساتھ مسجد نبوی شریف کی زیارت کی مدینہ کے در و بام، گلیاں و کوچے، سڑک و محلے دیکھے اپنے آقا و مولیٰ پر درود و سلام بھیجتے رہے۔ اس پورے عرصے میں نظریں گنبد خضرا تلاش کرتی رہیں، مسجد نبوی کے بلند مینارے روشنیوں سے جگمگاتے نظر آئے۔

جہاز میں حیدرآباد اور ہم تمام افراد تبلیغ سیرت کو ملا کر پچاس آدمی تھے جن میں زیادہ تر زیارتِ مدینہ منورہ سے اب تک محروم تھے۔ راقم الحروف محمد وارث جمال قادری کا شمار بھی انھیں ہجراں نصیبوں میں ہوتا ہے اور جو اس رشکِ جنّت کو دیکھ چکے تھے ان کی تڑپ بھی کم نہیں تھی کہ اس شہدِ نایاب کو چکھنے کے بعد ھل من مزید کی منزل سے گزر رہے تھے۔ ہم تو ان میں سے ہیں جو پانچ سال کی عمر سے سنتے سناتے اور گنگناتے آئے ہیں ؎

دکھا دے یاالٰہی وہ مدینہ کیسی بستی ہے
جہاں پر رات دن مولیٰ تیری رحمت برستی ہے

آرزوؤں کی جنّت جوں ہی پائلٹ کے کیبن سے یہ ملکوتی نغمہ گونجا، مدینہ آرہا ہے۔ سارے جہاز کے مسافر کیا عربی کیا عجمی سب چونک پڑے۔ سبھوں کے دلوں کی خوشگوار دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں اور ہم میں سے ہر شخص چشمِ تمنّا لیے آرزوؤں کی بارات سجائے اپنی قسمت پہ نازاں اپنی اپنی سیٹیں چھوڑ کر جہاز کی کھڑکیوں سے سر لگائے زمین کی سمت

دیکھنے لگا۔ مسرتوں کے ہیجان انگیز تلاطم اور آرزوئے شوق کی گہما گہمی میں یہ تمنّا لیے ۔

سوکھے دھانوں پہ میرے ابرِ کرم ہو جائے
چھائے رحمت کی گھٹا بن کے تمہارے گیسو

ابھی ہم اپنی چشمِ تمنّا کو جہاز کی کھڑکیوں سے لگائے سانس روکے انتظار ہی میں تھے کہ اتنے میں رحمتوں کا سویرا ہوگیا۔ بہاروں کی رُت بدل گئی، خوش بختیوں کا اُجالا ہوگیا۔ نصیبوں کو ارجمندیاں مل گئیں۔ کائناتِ عشق و محبت کی راجدھانی مدینہ منورہ نظروں کے سامنے آ گیا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چادرتن گئی۔ تقریباً پورا جہاز خاص کر ہم ہندوستانی ہجراں نصیب آنسوؤں کے ساتھ ہاتھ باندھے کھڑے ہوگئے اور

الصلوٰۃ والسلام علیك یارسول اللہ۔ الصلوٰۃ والسلام علیك یانبی اللہ۔ الصلوٰۃ والسلام علیك یاحبیب اللہ۔

کی سوغاتِ محبت پیش کرنے لگے۔

ہاں ہاں وہی مدینہ ہماری گنہگار مگر خوش نصیب آنکھوں سے بہت قریب تھا اور ہم خواب میں نہیں بلکہ کھلی ہوئی جاگتی آنکھوں سے اس حقیقت صادقہ کو دیکھ رہے تھے جس کے گلی کوچوں کو جنّت پر ترجیح دی گئی اور جس کے کانٹوں کو پھولوں پر برتری ملی جس کے ریگزاروں پر جنّت کی بہاروں کو نثار کیا گیا۔ جس کے خزاں پر چمن زاروں کی رعنائیاں قربان کردی گئیں اور جس کی آرزوؤں کے لیے جنّت کی آرزوؤں کو محبت کے نہاں خانے سے رخصت کردیا گیا۔ بھیگی ہوئی پلکوں سے اس شبستانِ محبت کے لیے آرزوؤں اور حسرتوں کی تڑپ تو دیکھیں ۔

آرزوئے جنّت الماویٰ بروں کردن ز دل
جنتم ایں بس کہ بر خاک درت ماویٰ کنم

(علامہ جامیؔ)

یہ نہیں کہ خلد نہ ہو نکو وہ نکوئی کی بھی ہے آبرو
مگر اے مدینہ کی آرزو جسے چاہے تو وہ سماں نہیں

(امام احمد رضاؔ)

خاکِ طیبہ از دو عالم خوشتر است
اے جنگ شہرے کہ دروے دلہ است

(اقبالؔ)

ان کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر کریں

(امام احمد رضاؔ)

پھول تو پھول میری آنکھوں میں
دشت طیبہ کے خار پھرتے ہیں

(امام احمد رضاؔ)

حسرت میں خاک بوسی طیبہ کی اے رضاؔ
ٹپکا جو چشم مہر سے وہ خون ناب ہوں

(امام احمد رضاؔ)

سیر گلشن کون جائے دشت طیبہ چھوڑ کر
سوئے جنّت کون دیکھے در تمہارا چھوڑ کر

(حسنؔ بریلوی)

فضائی زیارت کے اسی خاص واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بمبئی میں اہلِ سنّت کے نامور خطیب اور آل انڈیا تبلیغ سیرت کے رکن خصوصی حضرت مولانا فیض احمد فیض خطیب وامام شیخ مصری درگاہ وڈالا، جو حسنِ اتفاق اور نصیبے کی ارجمندی کہیے کہ وہ اس مقدس سفر میں ساتھ تھے پوری ایک نعت بارگاہِ رسالت میں پیش کی جس کا ایک شعر بطورِ خاص پیش ہے ۔

میں گزر گیا فضا سے تیرا در نہ چوم پایا
میں کبھی نہ آگے بڑھتا اگر اختیار ہوتا

خدا کا لاکھ لاکھ اور کروڑ ہا کروڑ شکر واحسان کہ اس نے تبلیغ سیرت کی خدمت کا صلہ اس انداز میں دیا کہ اس سے بہتر کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مدینہ پاک کی زیارت ہوگئی اب یہ حسرت تو لے کر نہیں مریں گے کہ مدینہ نہیں دیکھا۔

عمان میں :- تقریباً دس بجے ہم مملکت ہاشمی اردن کے انٹرنیشنل ائیر پورٹ عالیہ عمان پر پہنچے۔ بارش وہی فوراً رکی تھی۔ رن وے پر جگہ جگہ پانی نظر آرہا تھا۔ موسم تو یونہی سرد تھا۔ برسات نے دو چند کر دیا۔ جہاز سے اترتے وقت سرد موسم نے مزاج پرسی کی۔ موسم کی قہرمانیت زبانِ حال سے کہہ رہی تھی ۔

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

عالیہ ائیر پورٹ یہ مملکت ہاشمی کے فرمانروا محترم شاہ حسین کی چہیتی بیوی ملکہ عالیہ کے نام سے منسوب ہے۔ یہ ملکہ بہت قابل بیدار مغز اور فرض شناس خاتون تھیں۔ شاہ حسین کے کئی بچوں کی ماں اور ان کی زندگی میں داخل ہونے والی سب

سے چہیتی ملکہ بہت پہلے ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ ہوائی اڈہ بہت ہی خوبصورت جدید ترین تقاضوں اور تمام تر سہولتوں سے آراستہ و پیراستہ اسی میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی! ملکہ عالیہ کے نام سے اسے منسوب کرتے وقت غالباً مرحومہ کا ذوقِ نفاست پیش نظر تھا۔

عمان ائیر پورٹ پر عراقی وزارتِ اوقاف کے آفیسران ہمیں لینے کے لیے پہلے ہی سے موجود تھے بالخصوص مسٹر اسامہ نے وہاں قدم قدم پر اپنا زبردست اخلاقی و منصبی تعاون پیش کیا۔ عمان ائیر پورٹ سے ہمیں کاغذی خانہ پُری کے بعد فوراً نکل جانا تھا۔ ہوائی اڈے سے باہر حکومت عراق کی گاڑی ہمیں لینے کے لیے پہلے سے کھڑی تھی لیکن ائیر پورٹ پر تھوڑی سی تکلیف ہوگئی اور اسی میں کافی وقت لگ گیا کہ خلافِ توقع اردنی حکومت نے ویزا فیس لگادی اور وہ بھی توقع سے زیادہ۔ 31 آدمیوں کے لیے نوسو (900) ڈالر جو ہندوستانی 28 ہزار روپے ہوتے تھے جبکہ ہمیں یمن کی طرح وہاں رکنا بھی نہیں تھا ورنہ جس طرح ہم لوگوں نے بمبئی میں عراق و یمن کا ویزا لیا تھا، اردن کا بھی لیتے حالانکہ یہ وہی اردن ہے کہ گزشتہ اسی جنوری کے مہینے میں ہم وہاں گئے تھے ایک رات اور ایک دن وہاں رہے بھی لیکن اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں ہوا تھا۔ ہم لوگوں کو حیرت بھی ہوئی کہ اردنی حکومت ایسا اس بار کیوں کر رہی ہے جبکہ ہمیں رکنا بھی نہیں ہے۔

محترم الحاج رشید طیب صاحب پوچھنے کے لیے آئے کہ حضرت کیا کیا جائے۔ آفیسران کا کہنا ہے کہ یہ ہمارا قانون ہے کہ آپ کو ویزا فیس دینی پڑے گی۔ الحاج رشید طیب آل انڈیا تبلیغ سیرت کے مرکزی سکریٹری اور خازن بھی تھے اور ہیں۔ باہمی مشورے سے انھوں نے تبلیغ سیرت کی طرف سے جماعت ہی کے فنڈ سے نوسو ڈالر جمع کر دیا۔ لیکن حیدرآبادی مندوبین اَڑ گئے کہ ہمیں دینا ہی نہیں ہے یہ تو ظلم ہے۔ اس وفد کے ذمہ داروں نے کہا کہ مولانا آپ لوگ بھی نہ دیں ساتھ میں مل کر احتجاج کریں، انھیں اپنے فیصلے کو بدلنا ہی پڑے گا لیکن اس وقت تک ہم لوگ اپنی فیس اجتماعی طور پر جمع کر چکے تھے۔ ہم لوگ تو پندرہ ہی منٹ میں نمٹ گئے، ساری تاخیر حیدرآباد والوں کی وجہ سے ہو رہی تھی وہ آخر تک اَڑے رہے اور انھوں نے ویزا فیس نہیں جمع کی۔ اس طرح انھوں نے ایک بڑی خطیر رقم بچالی۔ ایک غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق حکومت عراق نے بعد میں ان لوگوں کی فیس اپنی طرف سے جمع کر دی۔ واللہ اعلم بالصّواب

بغداد کی جانب

قانونی جھمیلوں کو جھیلتے ہوئے ہم خدا خدا کر کے ائیر پورٹ سے باہر نکلے۔ ائیر پورٹ کے اندر موسم کی برہمی کا احساس نہیں ہو سکا لیکن باہر نکل کر بس تک پہنچنے اور سوار ہونے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ اسی مختصر لمحے سے یہ اندازہ ہوا کہ موسم کس قدر سرد اور جان لیوا ہے۔ بلجیم کی بنی ہوئی بے حد پُرشکوہ آرام دہ بس میں بیٹھ کر قدرے سکون ہوا۔ بس میں ہیٹر لگا ہوا تھا لیکن موسم کی قہرمانیوں نے اسے بھی نہیں کے برابر کر رکھا تھا۔ ہم بلا تاخیر اردن سے روانہ ہوگئے۔ عزت، عظمت، شہرت، کرامت اور شرف مجد والے اس مقدس شہر بغداد کی طرف جو آج بھی پوری دنیا کے لیے مرکزِ توجہ بنا

ہوا ہے جس کی عزیمت و استقامت، جرأت و ہمت پر پوری دنیا انگشت بدنداں ہے۔ اردن کی راجدھانی عمان سے بغداد کی مسافت ایک ہزار کلومیٹر ہے۔ اس پوری مسافت کے دوران میں بس صرف دو جگہ رکی، ایک اردن کے بارڈر پر اور ایک عراق کی سرحد پر۔ دونوں جگہ ویزا پاسپورٹ کے تقاضوں کا جو کورم تھا اسے پورا کرتے ہوئے بس آگے بڑھی۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا، اب ہم دن کی روشنی میں اپنے خوابوں کی سرزمین کو دیکھ رہے تھے۔ بائی وے روڈ سے دور دور تک آبادیاں کم ہی نظر آتی تھیں، بہت دور چلنے کے بعد اکا دکا آبادی نظر آجاتی۔ ہم لوگ بہت متجسس ہو کر عقابوں کی اس سرزمین کو دیکھتے گزر رہے تھے جس پر تقریباً پوری دنیا کے زاغ و زغن نے حملہ کر دیا تھا۔ ہمیں دور دور تک جنگ کے اثرات نظر نہیں آئے۔ ہاں جب ہم بغداد کے قریب پہنچے تو ایک بہت بڑا برج (پل) کچھ ٹوٹا نظر آیا جس کے مقابل دوسرا برج تقریباً مکمل ہو رہا تھا اور اسی پر سے ہماری گاڑی گزر رہی تھی۔

بس سے بائی روڈ سفر کرتے ہوئے ہمیں مسلسل گیارہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اب بغداد قریب ہوتا جا رہا تھا۔ بھیڑ اور دنبوں کے بڑے بڑے ریوڑ چرتے نظر آنے لگے تھے، کھجوروں کے باغات اور آبادیاں بھی نظر آنے لگی تھیں۔ بغداد جوں جوں قریب ہو رہا تھا دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ عراقی بارڈر سے لے کر راجدھانی بغداد تک جگہ جگہ چیک پوسٹ قائم تھے۔ ہر چیک پوسٹ پر لاریوں اور گاڑیوں کی طویل قطاریں لگی ہوئی تھیں جو سخت چیکنگ کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔

یوں تو عراق کے اطراف میں جتنے پڑوسی ممالک اور ان کی سرحدیں ہیں سبھوں کے بارڈروں سے بڑی بڑی شاہراہیں بغداد سے ملی ہوئی ہیں لیکن ہم جس شاہراہ سے گزر رہے تھے وہ شاہراہِ اردن تھی۔ عمان سے بغداد کی طرف اور بغداد سے عمان کی طرف بڑی بری لوڈڈ گاڑیاں 22،22 ٹائروں ولی جب کسی چیک پوسٹ سے گزرتے ایک ایک دو دو کلومیٹر لمبی لائن میں کھڑی ملتیں۔ اور جوں جوں تاخیر ہوتی لائنیں لمبی ہوتی اور بغداد کی طرف سے بڑے بڑے تیل کے ٹینکر نکلتے دیکھتے۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد 22،22 ٹائروں پر مشتمل بڑے بڑے ٹینکر بغداد شریف کی طرف سے آتے ملتے تھے لیکن ان کی منزل کہاں ہوتی اس سے ہم لوگ بے خبر تھے۔ کسی بھی چیک پوسٹ پر نہ تو ہماری بس روکی جاتی اور نہ اس کے لیے کسی طرح کی کوئی تاخیر ہوتی جوں ہی گاڑی چیک پوسٹ پر پہنچتی فوجی قریب آتے۔ جیسے ہی عربی ڈرائیور انھیں یہ بتاتا کہ یہ مؤتمر اسلامی کا وفد ہے جو ہندوستان سے آرہا ہے ان کے چہرے کِھل جاتے، آنکھوں میں چمک بڑھ جاتی اور بڑی محبت سے السلام علیکم مرحبا ابلاً وسہلاً مرحبا کہتے ہوئے بلا کسی تاخیر گزر جانے کا اشارہ کرتے۔

اب ہم بغداد کے مضافات میں داخل ہو رہے ہیں۔ آبادیاں شاد و آباد نظر آرہی ہیں۔ جوں جوں بغداد مقدس قریب آتا جا رہا تھا ہماری بے قراریاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ دلِ نیاز پیشہ کا اضطراب ایسا تھا کہ لگتا تھا کہ بغداد اور آگے ہی کھسکا جا رہا ہے۔ ہم بے چین تھے یہ دیکھنے کے لیے کہ ٹھیک ایک سال پہلے ہم بغداد مقدس کو جس حال میں چھوڑ گئے تھے اس حالت میں کتنی تبدیلی آئی۔ دنیا بھر کے بزدلوں، نامردوں، اسلام دشمنوں اور ساری سپر طاقتوں نے 39 دنوں تک مسلسل

بغداد پر آگ کا سمندر انڈیلا۔ تباہیاں، بربادیاں اور بلاکت خیزیاں مسلط کیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ اور میڈیے نے پوری دنیا کے مسلمانوں کے حوصلوں کو پست کرنے کے لیے عراق کی تباہی و بربادی کی داستانیں جو پھیلا رکھی تھیں اس کی قرار واقعی حیثیت کیا ہے۔

خدا خدا کر کے اب ہماری بس بغداد شریف میں داخل ہو رہی ہے۔ جس کی ساری حسیات جیسے آنکھیں بن گئی ہوں۔ الحمد للہ رب العلمین ہماری بس جس جس مقام سے گزر رہی تھی وہاں وہاں پر جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد والے بغداد میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دل تشکر کے جذبات سے لبریز اور آنکھیں نم تھیں کہ اللہ جل جلالہٗ نے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے وطفیل میں اور اولیاء کاملین بالخصوص سیّدنا غوثِ اعظم شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی کی برکتوں سے مسلمانوں کے عقیدوں اور ان کے حسنِ عقیدت کی لاج رکھ لی۔

کیا دبے جس پہ حمایت کا ہو پنجہ تیرا
شیر کو خطرے میں لاتا نہیں کتّا تیرا
بادلوں سے کہیں رکتی ہے کڑکتی بجلی
ڈھالیں چھٹ جاتی ہیں اٹھتا جو ہے تیغا تیرا

مردِ مجاہد صدام :۔

اب ہماری گاڑی دجلہ پر بنے ہوئے اس تاریخی برج سے گزر رہی ہے، دورانِ جنگ جس کے ٹوٹ جانے کا بڑا شہرہ تھا۔ ظالم مسلسل آٹھ دن کی بمباری سے اس کا ایک حصّہ توڑ سکے تھے۔ یعنی جسیر جمہوریہ جس کو عراقی جیالوں نے اتنی تیزی سے بنایا اور جس کی تکمیل میں خود عراق کے ناقابلِ تسخیر قائد صدام حسین عملاً حصّہ بھی لے رہے تھے اور اس کی نگرانی بھی فرما رہے تھے۔ یہاں تک کہ بنانے والے مستریوں کو مسالے کا برتن اپنے ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر پکڑایا ہے۔ پوری دنیا کی سپر طاقتوں کو جتنا دن اسے توڑنے میں لگا عراقیوں نے اسے اس سے کم دنوں میں دوبارہ ایسا بنا دیا کہ جیسے وہ کبھی ٹوٹا ہی نہیں تھا۔ یہ عراقیوں کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ وہ اس پر جتنا چاہیں فخر کریں۔

ہمیں 15 جنوری 1992ء کی ابتدائی شب ہی کو بغداد پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن جگہ جگہ پرواز میں غیر معمولی تاخیر کی وجہ سے ہم 16 جنوری 1992ء کو دوپہر میں بارہ بجے کے بعد بغداد شریف پہنچے۔ بس ہمیں لے کر بغداد کے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل المنصور میلیا پہنچی۔ ہوٹل میں وزارتِ اوقاف کے بڑے بڑے آفیسران اور کانفرنس کے ذمہ داروں نے والہانہ استقبال کیا۔ تمام لوگوں سے مرحبا اہلاً وسہلاً کہتے ہوئے پُرتپاک مصافحہ ومعانقہ کیا۔ روانگی سے دس دن پہلے ہی باہمی مشورے کے بعد تبلیغ سیرت کے بے حد متحرک وفعال سکریٹری محترم الحاج رشید طیب نے دہلی میں سفارت خانہ عراق کو تمام مندوبین کے ناموں کی فہرست ٹیلیکس کے ذریعہ بھیج کر ایک خصوصی گزارش کی تھی کہ چونکہ ہمارا وفد 13 آدمیوں پر مشتمل

ہے۔ بغداد شریف ہوٹل کے روم بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں جن میں دو یا تین بیڈ لگ سکتے ہیں۔ ہمارے وفد کو ایک ایک روم میں دو دو یا تین تین کر کے ٹھہرایا جائے۔ وہاں پر بھی ہم لوگوں نے وہی گزارش کی۔لیکن ان لوگوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ پیشکش آپ لوگوں نے ہماری آسانیوں کے لیے کیا ہے۔آپ حضرات کے اس خلوص کا شکریہ۔ ہمارا یہ ہوٹل بہت بڑا ہے اور آپ کے وفد کا ہر آدمی ہمارے لیے محترم ہے۔ہم ہر ایک کو حسب سابق الگ الگ روم میں ہی ٹھہرائیں گے۔ چنانچہ تمام مندوبین کو مستقل الگ الگ روم الاٹ کیا گیا۔

چونکہ ایک سال پہلے بھی ہمیں اسی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا اس لیے وہ جگہ قدرے مانوس بھی تھی اور جانی پہچانی بھی! اس ہوٹل میں ٹھہرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں سے غوثِ اعظم کا آستانۂ کرم بے حد قریب ہے۔ چہل قدمی کے انداز میں جائیں تو 20 منٹ لگیں۔ اپنے روم سے باہر نکل کر لابی میں آئیں تو وہیں سے گنبد پاک کی زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی کرتے رہیں۔ اس ہوٹل کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ پورے ہوٹل بھی روم کی پچھلی گیلری کا قد آدم سے بھی اونچا کانچ کا دروازہ تازہ ہوا کے لیے کھولیں گے نیچے دریائے دجلہ بہتا نظر آئے گا۔ وہی عظیم الشان اور تاریخی دریا جس کے لیے کہا گیا ہے کہ۔

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
رکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

ہوائی جہاز اور بس کے طویل سفر سے ہم لوگ تھک کر چور ہو چکے تھے۔ اپنے اپنے کمروں میں ہم لوگوں نے جا کر غسل اور حوائج ضروریہ سے فراغت کے بعد ہوٹل کے نیچے ہی ہال میں ہم سب نے اکٹھا کھانا کھایا۔ اپنے اپنے کمروں میں نمازِ ظہر پڑھ آرام کرنے لگے۔ ہوٹل ہی میں عصر کی نماز پڑھ کر قطب ربّانی محبوبِ سبحانی محی الدین سیّدنا و مرشدنا شیخ عبد القادر جیلانی حسنی و حسینی کی بارگاہ میں حاضری کے لیے ہم لوگ چل پڑے۔

غوثِ اعظم کی بارگاہ میں:۔

ہم لوگوں میں بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جن کی سرکار غوثیتِ کبریٰ کی بارگاہِ عظمت پناہ میں پہلی حاضری تھی۔ ان کی تڑپ و طلب قابلِ دید تھی اور جو لوگ اس مرحلۂ شوق و عقیدت سے گزر چکے تھے ”وہ ایک بار دیکھا ہے مگر بار بار دیکھنے کی آرزو ہے“ کی منزل سے گزر رہے تھے۔

اب ہم سرکار غوثیت مآب کے آستانۂ عظمت و جلال پہ حاضر ہیں۔ انتہائی پُرشکوہ و بلند ترین صدر دروازہ پورے کا پورا چاندی کے پترے اور اس پر دیدہ زیب نقش و نگار! جس پر نظر پڑتے ہی خود بخود زبان پہ جاری ہو گیا۔

ٹوپیاں تھام کے خاکِ در والا دیکھو

اس بارگاہ کی جبروت، سطوت، شان و شوکت اور عظمت و جلال کو پہلی بار دیکھنے والے آئینہ حیرت بنے دم بخود تھے۔

تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت شہیدِ محبت، عبقری الشرق سیّدنا امام احمد رضا بریلوی نے محبت صادقہ کی زبان میں اپنے دیوان حدائق بخشش میں جتنا اور جو کچھ سرکارِ والا کی شان میں کہا ہے، عرض کیا ہے، اپنی تڑپ پیش کی ہے، ان کی عظمتوں کا جو عظیم الشان خطبہ پڑھا ہے، آپ کی بے پایاں رفعتوں کو، عقیدتوں اور محبتوں کا جوز بردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ان کی حیثیت اور اہمیت وہیں پر زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ سرکار غوثیت کبریٰ کی محبت کے سمندر میں جب وہ ڈوبے تو اس بحر ناپید کنار سے کبھی نکل ہی نہ سکے اور پھر ان کے بعد کوئی دوسرا گویا کہ انھیں نظر ہی نہیں آیا۔

کون نظروں میں جنچے دیکھ کے تلوا تیرا

بے شک انھیں کو یہ حق ہے کہ جو اس طرح سے کہیں کہ۔

میری قسمت کی قسم کھائیں سگانِ بغداد
ہند میں رہ کے بھی دیتا رہوں پہرہ تیرا

قطب ربّانی حضرت سیّدنا غوث الاعظم جیلانی سے محبت کی جلوہ سامانی تو ملاحظہ ہو۔

تیری سرکار میں لاتا ہے رضؔا اس کو شفیع
جو میرا غوث ہے اور لاڈلا بیٹا تیرا
اے رضؔا یوں نہ بلک تو نہیں سیّد تو نہ ہو
سیّدِ جیّد ہر دہر ہے آقا تیرا

رشک بلبل ہے رضؔا لالۂ صد داغ بھی ہے
آپ کا واصف و ذاکر بھی ہے عبد القادر

رضؔا کے سامنے کی تاب کس میں
فلک وار اس پہ تیرا ظل ہے یاغوث

کہا تو نے کہ جو مانگو ملے گا
رضؔا تجھ سے تیرا سائل ہے یاغوث

اے رضا چیست غم از جملہ جہاں دشمن تست
کردہ ام مامن خود قبلۂ حاجاتے را

اعلیٰ حضرت نے صدہا عقیدت مندانہ اشعار کے ذریعہ نہ صرف اپنی شیفتگی کا مظاہرہ فرمایا ہے بلکہ غوثِ اعظم کے ہر فدائی کے دل کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔

بارگاہِ قدس میں مغرب وعشاء کی نماز پڑھ کر ہم وہاں سے واپس اپنے ہوٹل آئے۔ رات میں طے یہ ہوا کہ فجر کی نماز کے بعد اندرونِ بغداد کی اہم ترین زیارتوں کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ جمعرات 16 جنوری کو ہم بغداد پہنچے تھے دوسرا دن جمعہ تھا۔ بعد نمازِ جمعہ کانفرنس کا آغاز تھا۔ جمعہ کے وقت تک زیارتیں کی جائیں اور غوث پاک کی مسجد جامع قادریہ یا جامع امامِ اعظم میں جمعہ کی نماز ادا کی جائے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق فجر کی نماز کے بعد جوں ہی ہوٹل سے باہر نکلنا شروع ہوئے مؤتمر اسلامی کے ذمہ داروں نے بڑی محبت کے ساتھ روک دیا کہ آپ لوگ طویل سفر سے تو یونہی تھکے ہیں جمعہ کے وقت تک اور تھک جائیں گے۔ بعد نمازِ جمعہ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہے جس کو کما حقہ آپ لوگ اٹینڈ نہیں کر پائیں گے بات ہم لوگوں کی سمجھ میں بھی آ گئی اور ہم لوگ واپس اپنے اپنے کمروں میں آ گئے وہاں پر مؤتمر عالمی اسلامی کا شیڈول اور نظام الاوقات ہی ایسا ہوتا کہ ازابتدا تا انتہا کہیں آنے جانے یا کچھ لینے دینے کا کوئی وقت ہی نہیں نکل پاتا ہے سوائے حضور غوث پاک کی بارگاہ میں حاضری کے کہ وہ کانفرنس ہال اور ہوٹل دونوں سے قریب پڑتا ہے۔ اس لیے عام طور پر مندوبین دو تین دن پہلے یا تین چار دن بعد تک رک کر عراق کے مقاماتِ مقدسہ کی زیارتیں کرتے ہیں۔

عراق کی سرزمین مقدس زیارت گاہوں کا خزانہ ہے، اتنی زیارت گاہیں شاید ہی کسی اور ملک میں ہوں۔ اس اعتبار سے بھی عراق دنیا کا خوش نصیب ترین ملک ہے کہ حضرات انبیاء ومرسلین، اجلۂ صحابہ وتابعین، جلیل القدر اولیاء امّت وائمہ مجتہدین بالخصوص خاندانِ نبوت کے تقریباً تمام چشم وچراغ اور اہلِ بیت اطہار کی غالب ترین اکثریت عراق ہی کی سرزمین پر آرام فرما ہے۔ اور خود بغداد صدیوں تک پورے عالمِ اسلام کا اخلاقی، روحانی اور سیاسی مرکز تھا جس کے جلال وجبروت سے پوری دنیا انگشت بدنداں، دنیا کی ساری حکومتیں، بادشاہتیں، مسلم یا غیر مسلم ریاستیں اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرتے وقت بغداد کے تیور کو نگاہوں میں رکھنے پر مجبور تھیں۔

پوری دنیا کی حکومتیں اپنے کمزور اور پڑوسی حکومتوں پر بے جا ظلم وستم اور ان کو ناجائز طور پر دبانے سے پہلے بغداد کے تصور سے سہم جایا کرتی تھیں۔ آج امریکہ جس انداز میں سُپر مین اور دنیا کی سب سے بڑی سُپر طاقت بن کر پوری دنیائے انسانیت کا بقلم خود چودھری بنا ہوا ہے۔ یہ صرف چند دن سے ہوا ہے اور صرف چند ہی دن تک اور رہے گا۔ امریکہ کا موجودہ جاہ وجلال، صدیوں پر مشتمل بغداد کے جاہ وجلال وتمکنت کا عشر عشیر بھی نہیں۔ صدیوں کے سفر میں بغداد کے اُجڑنے بسنے آباد وبرباد ہونے کی داستان تو آج تاریخِ عالم کا ایک بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔

کچھ نقش تیری یاد کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویران نہیں ہے

جامع امام اعظم میں:۔

محترم محمد علی العثمان جو یہاں بمبئی میں قونصل خانۂ عراق کے نائب قونصل جنرل تھے۔ چند ماہ پیشتر ہی حکومت بغداد کی طلبی پر انڈیا سے عراق منتقل ہو چکے ہیں، انتہائی کریم النفس، بااخلاق، بامروت اور شریف النفس ہیں، انھوں نے بغداد شریف میں اپنی محبت کا قدم قدم پر ثبوت پیش کیا۔ تقریباً وہ روزانہ ہوٹل میں ملاقات کے لیے تشریف لاتے، بڑی اپنائیت خلوص اور محبت کے ساتھ ملتے اور ہر بار دعوت کی پیشکش کرتے لیکن ہم لوگوں کی بے پناہ مصروفیتوں کو دیکھتے ہوئے زیادہ اصرار نہیں کر پاتے تھے۔

کانفرنس کی مصروفیتوں میں ہم ان کے درِ دولت پر حاضری سے محروم رہے۔ انھوں نے جیسے ہی سنا کہ ہندوستان کا وفد آگیا ہے وہ صبح ہی اپنی خوبصورت کار لے کر ہوٹل آ گئے۔ مؤتمر اسلامی کے نظام الاوقات کے مطابق تمام مما لک کے مندوبین کو جمعہ کی نماز جامع قادریہ باب الشیخ یا جامع امام اعظم محلہ اعظمیہ میں ادا کرنی تھی۔ تمام مندوبین کے لیے سرکاری گاڑیاں حفاظتی انتظام کے ساتھ وقت سے پہلے ہی تیار کھڑی تھیں۔ محترم الحاج علی العثمان نے مخلصانہ پیشکش کی کہ آپ لوگ میری گاڑی سے امام اعظم چلیں۔ ہم خود لے کر چلیں گے اور لا کر چھوڑ بھی جائیں گے اور پھر اسی گاڑی سے آپ لوگوں کو کانفرنس ہال میں چھوڑ جائیں گے۔ ہم لوگوں نے جامع امام اعظم میں جانے آنے کی پیشکش تو شکریے کے ساتھ قبول کر لی مگر کانفرنس کے لیے معذرت کر لی کہ ہم وہاں سرکاری گاڑی میں اپنے بقیہ ساتھیوں کے ساتھ ہی جائیں گے۔ چنانچہ ہم، الحاج رشید طیب اور مولانا اطہر حسین رضوی ان کی گاڑی میں بیٹھ کر جامع امام اعظم جمعہ کی نماز کے لیے گئے۔ ہم لوگ وہاں وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ الحاج علی ہمیں سیدھے جامع امام اعظم کے خطیب و امام کی خدمت میں لے کر پہنچے۔ ہم لوگوں کا انھوں نے بڑے احسن طریقے پر تعارف اور عراق کے لیے آل انڈیا تبلیغ سیرت کی خدمات کا ذکر کیا۔ موصوف نے پُرتپاک اور والہانہ انداز میں مرحبا اہلاً و سہلاً کہتے ہوئے نہ صرف مصافحہ بلکہ معانقہ بھی فرداً فرداً سبھوں سے فرمایا۔ پُرسشِ احوال کے بعد قہوہ پیش کیا۔

وہاں پر ان کی شان و عظمت، اندازِ رہائش اور حکومت کا مثالی انتظام و انصرام دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ اللہ اللہ علمائے دین کا یہ اعزاز و اکرام۔ وہاں سے اُٹھ کر ہم لوگ فخر عجم رشکِ عرب امام الائمہ سراج الامتہ حضرت امامِ اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مرقد انور پر حاضر ہوئے جو اسی مسجد کے ایک گوشے میں آرام فرما ہیں۔ بہت عالی شان تربت انور ان کے شایانِ شان! ہم لوگ دیر تک ان کی بارگاہِ کرامت اور دربارِ علم و فضل میں فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ مسلکاً ہم لوگ خود حنفی ہیں۔ اپنے امام کی بارگاہ میں یہ ہماری دوسری حاضری تھی۔ بے حد وسیع و عریض اور عظیم الشان مسجد! جسے بار بار دیکھنے کے بعد بھی

آنکھیں سیراب نہ ہوسکیں۔ ہم لوگ امامِ اعظم کی بارگاہ سے نکل کر مسجد میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی جگہ لے کر بیٹھ گئے۔

بغداد شریف کی اہم مساجد میں منبر بڑی بلندی پر ہوتا ہے۔ 22 سیڑھیاں چڑھنے پر ایک کشادہ چبوترہ نما منبر ہوتا ہے۔ یہ حال غوثِ اعظم کی مسجد جامع قادریہ کا بھی ہے۔ مسلمانوں کے اس عظیم اژدہام میں خوش قسمتی سے منبر کے بالکل سامنے بیٹھنے کو جگہ مل گئی۔ اردن کے ایک بڑے وجیہہ وشکیل مہمان خطیب نے ایک معرکۃ الآراء فصیح وبلیغ اور بڑا ہی جذباتی خطبہ دیا جو کفر واسلام اور حالیہ معرکۂ صلیب وہلال کے اصول ومبادی پر مشتمل تھا۔

ولولہ انگیز خطبہ

امریکہ عراق جنگ کی چند جھلکیاں بھی اس میں پیش کیں۔ ایک گھنٹہ سے زیادہ طویل عربی خطاب اس قدر اثر انگیز تھا کہ پورا مجمع ہل گیا۔ کیا عربی کیا عجمی سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھی۔ دورانِ خطاب انھوں نے بتایا کہ جب عراق کا میزائل اسرائیل کی راجدھانی تل ابیب پر گرتا تھا تو فلسطینی مارے خوشی کے رقص کرنے لگتے، یہ خوشی انھوں نے چالیس برس بعد دیکھی تھی۔ اتنے طویل عرصہ کے بعد انھوں نے یہودیوں کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو دیکھے تھے۔ ان کی چیخ و پکار، آہ وزاری، نالہ وشیون اور احساسِ بے بسی فلسطینیوں کے لیے ایسی تاریخی مسرت ثابت ہورہی تھی جو ان سے سنبھل نہیں پارہی تھی۔ چالیس سال سے زائد عرصے سے تو وہ اپنی ہی آہیں، آنسو، سسکیاں اور کراہیں سن رہے تھے۔ ان مظلوموں کی بستیاں اسرائیلی درندوں کی شکارگاہ بنی ہوئی تھیں کہ جب چاہے بے خطا جانوں کے شکار سے اپنی دل بستگی کا سامان تیار کرلیتے۔ اب تک اسرائیل عربوں کو مار رہا تھا۔ مصر وشام ولبنان واردن کون سا پڑوسی ملک ہے جس کی اس نے بری طرح سے مرمت نہیں کی ہے۔ آج زندگی میں وہ پہلی بار پٹ رہا تھا، بری طرح سے عراقی مجاہدین کے ہاتھوں اس کی مرمت ہورہی تھی۔ پورے اسرائیل میں ہاہاکار مچی تھی۔ خوف سے نہ جانے کتنی عورتوں کے حمل ساقط ہوگئے۔ کتنے بغیر مارے مرگئے۔ ایک لاکھ یہودی تل ابیب چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہائے رے گردشِ ایام اس بری طرح سے مارے جانے کے باوجود اسے رونے کی اجازت نہیں تھی۔ دنیا کی ساری سُپر طاقتیں انتہائی بے بسی کے عالم میں اسرائیل کے غم میں شریک تھیں اور اسے برابر صبر کی تلقین کررہی تھیں اور صبر کی اتنی بڑی بڑی قیمتیں دے رہی تھیں جس کے لیے وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

بعد نمازِ جمعہ ہم الحاج علی العثمان کی گاڑی سے اپنے ہوٹل المنصور میلیا آگئے۔ ہوٹل میں کھانا کھایا اور کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے لیے نکل پڑے۔

افتتاحی اجلاس

17 جنوری 1992ء کو 3 بجے دن میں ہم تمام مندوبین سرکاری گاڑیوں کے ذریعے جامعۂ مستنصریہ پہنچے، جہاں

چار روزہ مؤتمر اسلامی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہونے جا رہا تھا۔ ہم لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہال بھر گیا۔ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ پورے ہال میں ہلچل مچ گئی۔ زبردست سیکورٹی اور بڑے بڑے کرنلوں و جرنلوں کے جلوس میں عراق کے مشہور و محبوب ترین سیاسی رہنما حضرت عزت ابراہیم تشریف لائے جنھیں اس عظیم و تاریخی کانفرنس کا افتتاح کرنا تھا۔ ان کے تشریف لاتے ہی دنیا بھر کے کیمرہ مین، ٹی وی، ریڈیو اور تمام ایجنسیاں حرکت میں آگئیں۔ اسٹیج کے آس پاس صرف بڑے بڑے فوجی آفیسر دکھائی دے رہے تھے اور ان کا حفاظتی دستہ تو بہت ہی چاق و چوبند تھا، خود ان کا وجود تو بہت مختصر دکھائی دے رہا تھا۔ فوجی وردی میں ملبوس دبلا پتلا انتہائی دھان پان عراقی کمانڈ و قونصل اور قواۂ مسلح کے بھی نائب صدر، صدام حسین کے دست راست اور عراق کے دوسرے نمبر کی سب سے اہم ترین شخصیت عراقی عوام اور خواص دونوں کے دلوں میں ان کے لیے بڑے احترام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ انھیں عراق کا دماغ کہا جاتا ہے۔ عراق میں ان کی درویشی کے چرچے ہیں۔ بڑی پابندی کے ساتھ سرکار غوثیت کبریٰ کی بارگاہ میں ان کی حاضری ہوتی ہے۔ کوئی بھی اہم فیصلہ لینے سے قبل وہ سرکار غوثِ اعظم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔

جس وقت وہ کانفرنس کے افتتاح کے لیے اسٹیج پر تشریف آور ہوئے پورا ہال گوش بر آواز ہو گیا۔ تلاوتِ قرآنِ مجید کے بعد ایک بڑا زبردست اور معرکتہ الآراء افتتاحی خطاب فرمایا۔ آپ کے بعد دوسری تقریر اردن کے سابق وزیرِ اوقاف شیخ ابراہیم زید گیلانی کی ہوئی ان کے بعد ترکی کے نمائندے محترم عثمان سراج سابق مشیر حکومت ترکی کی تقریر ترکی زبان میں ہوئی۔ ساتھ ساتھ عربی میں اس کا ترجمہ بھی پیش کیا جاتا رہا۔ پانچ بجے پہلے دن کا افتتاحی اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ کانفرنس ہال سے نکل کر ہم لوگ سیدھے آستانہ غوث الوریٰ پر پہنچے۔ وہیں پر عصر اور مغرب کی نمازیں ادا کی گئیں۔ اس کے بعد ہم ہوٹل پہنچے۔

جامعہ مستنصریہ میں صرف افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ بقیہ سارے اجلاس بغداد شریف کی سب سے بہترین و مشہور فائیو اسٹار ہوٹل الرشید کے عظیم الشان اور پُر شکوہ ہال میں منعقد ہوئے۔ روزانہ کانفرنس اپنے پہلے سے بنے ہوئے نظام الاوقات کے مطابق ہوتی رہی۔ روزانہ تین اجلاس ہوتے تھے۔ صبح نو بجے سے شروع ہو کر 12 بجے دوپہر تک، دوپہر میں کھانا، استراحت اور نمازِ ظہر کے بعد دوسرا اجلاس 3 بجے شروع ہوتا تھا۔ تین سے 5 بجے تک دوسرا اجلاس، پانچ سے ساڑھے پانچ بجے تک وقفہ جس میں چائے نوشی اور نماز، پھر ساڑھے پانچ بجے تیسرا اجلاس شروع ہو کر ساڑھے آٹھ بجے ختم ہوتا تھا۔ افتتاحی اجلاس کے پہلے ہی دن بعد نمازِ مغرب وزارتِ اوقاف کے ایک آفیسر ہوٹل میں تشریف لائے کہ وزیرِ اوقاف عبد اللہ فاضل تبلیغ سیرت کے ذمے داروں سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کو لینے کے لیے مجھے بھیجا ہے۔ میں گاڑی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ چنانچہ فوری طور پر ہم، حضرت مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی، مولانا اطہر حسین اور الحاج رشید طیب ان کی قیام گاہ پر پہنچے۔ بڑا پُر تپاک اور والہانہ خیر مقدم فرماتے ہوئے عرب مہمان نوازی کا مظاہرہ فرمایا۔ ہر ایک سے

معانقہ فرمایا۔ دورانِ ملاقات فرمانے لگے کہ پوری دنیا کی فائل میرے پاس موجود ہے لیکن ان فائلوں کے انبار میں تبلیغ سیرت کی فائل پہلے نمبر پر ہے۔ جنگ سے پہلے اور جنگ کے دوران اور جنگ کے بعد تبلیغ سیرت نے جو کچھ عراقیوں کے لیے کیا ہے اسے اہل عراق کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے۔ ہم عراقی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ شکر گزار ہیں۔

ہندوستان کی عزت افزائی

انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ صبح کے اجلاس کی چیئر مین شپ تبلیغ سیرت کو پیش کی۔ یہ ایک بڑا اعزاز تھا ہندوستان کے لیے۔ چنانچہ تبلیغ سیرت کی نمائندگی کرتے ہوئے پیر طریقت حضرت مثنیٰ میاں صاحب قبلہ صدر مہاراشٹر تبلیغ سیرت نے مسند صدارت کو زینت بخشی۔ فالحمدللہ علی ذالک۔ اسی درمیان میں کسی ضرورت سے کانفرنس ہال سے باہر نکلا تو دہلی، حیدر آباد اور پاکستانی مندوبین نے مجھے چاروں طرف سے گھیر کر مبارکباد دینے لگے کہ آپ کی جماعت کے حسنِ خدمات کی بدولت تقریباً تمام عالمِ اسلام سے آئے ہوئے مندوبین کے درمیان اللہ نے ہندوستان کو بڑا اعزاز عطا فرمای۔ یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ اس صبح کے اجلاس میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بے حد متحرک، فعال اور گونا گوں صلاحیتوں کے حامل نمائندے محترم الحاج رشید طیب سکریٹری آل انڈیا تبلیغ سیرت نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ انگریزی میں وہ مقالہ پڑھا جو اردو زبان میں تیار کیا گیا تھا۔ جس کا انھوں نے انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے پڑھا۔ وہاں پر انگریزی سے عربی، فرانسیسی اور عربی سے انگریزی، فرانسیسی کے لیے ترجمے کی مشین ہے۔ زیادہ تر وہاں پر عربی ہی میں تقریریں ہوتی ہیں۔ جوں ہی انھوں نے انگریزی میں پہلا جملہ نکالا تمام عربوں اور ان لوگوں نے جن کی زبان عربی تھی دھڑا دھڑ اپنے اپنے کانوں میں ترجمے کی مشینیں لگالیں۔ یہ پہلا مقالہ تھا کہ جس پر ایوان میں نعرے لگے تھے اور جس نے کانفرنس کا رُخ بدل دیا تھا۔ پہلی بار ایران کی شیعہ قیادت کی عین حالتِ جنگ میں غدارانہ رول پر کڑی تنقیدیں اور خائن الحرمین فہد بن عبدالعزیز کی اسلام فروشی، استعمار پروری اور یہودیت نوازی اور پوری دنیائے وہابیت کی قرار واقعی حیثیت کو اس عالمی اسٹیج پر رکھا تھا۔ ہر طرف سے صدائے تحسین و مرحبا بلند ہو رہی تھی۔ اور یہ پہلا خطاب تھا جس میں گرم گرم تقریروں کے بجائے عمل پر زور دیا گیا تھا اور اس کے لیے کچھ لائحہ عمل بھی پیش کیا گیا تھا۔ مقالہ کے اختتام پر تقریباً پانچ منٹ تک اسٹیج سے اس پر تبصرہ ہوتا رہا۔ اس خطاب نے تو ایران و سعودیہ پر آنے والے مندوبین کو حقیقت کہنے پر بے جھجک کر دیا۔ وہاں کے تمام عربی اخبارات نے اسے خصوصیت کے ساتھ دوسرے ہی دن شائع کر دیا۔ بغداد ٹیلی ویژن نے انٹرنیشنل چینل پر اس کا ایک ایک حرف پیش کیا۔ تبلیغ سیرت، ہندوستان میں سوادِ اعظم اہل سنّت و جماعت اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی پر بھی گفتگو کی گئی۔

وہابیت برہنہ

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ان دو دوروں سے عالمی سطح پر اہلِ سنّت کو بڑا فروغ ملا۔ ہندی اور پاکستانی وہابی اب تک سوادِ

اعظم اہلِ سنّت و جماعت کو بریلویت کے خول میں لپیٹ کر پیش کرتے تھے۔ عالمِ اسلام میں خود کو اہلِ سنّت کے نام سے متعارف کراتے تھے اور سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کو بریلویت کے نام سے۔ ان وہابیوں دیوبندیوں کی پوری کوشش سازش تھی جس میں سعودی حکومت پوری طرح شامل تھی کہ دنیا بھر کے خوش عقیدہ سنّی مسلمانوں کو بریلویت سے موسوم کر دیا جائے اور بریلویت کو قادیانیت کی طرح غیر مسلم قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں پاکستان کے ایک خبیث وہابی احسان الٰہی ظہیر نے ''البریلویت'' نامی ایک گندی کتاب عربی میں لکھی اور پورے عالمِ عرب و عالمِ اسلام میں سعودی عرب نے اسے پھیلایا۔ خدا بھلا کرے جانشین مفتی اعظم حضرت علّامہ اختر رضا ازہری مدظلہ العالی کا کہ اب سے چند سال قبل حج کے موقع پر ظالم نجدی سعودیوں نے محض اہلِ سنّت کا ایک مقتدا ہونے کے جرم میں جب آپ کو گرفتار کر کے نجدی قاضی کے پاس لائے تو اس نے پوچھا کہ آپ بریلوی ہیں۔ تو آپ نے اسے جواب دیا تھا کہ میں اہلِ سنّت کا ایک فرد ہوں۔ بریلی میرا وطن ہے۔ آپ کے اس تاریخی جواب نے وہابیوں کے اس خطرناک منصوبے کو کسی حد تک کمزور کر دیا تھا۔ لیکن وہ اپنی کوششوں میں برابر لگے رہے۔ یہاں تک کہ خلیج کے اس معرکۂ صلیب و ہلال نے ان کے منصوبے کو الٹ دیا۔ وہابیت پوری دنیا میں ننگی ہو گئی۔ توحید کے ٹھیکیدار بے نقاب ہو گئے۔ توحید کے پردے میں تثلیث کی غلامی اور اسلام دشمنی پورے عالم پر آشکارا ہو گئی۔ واضح رہے کہ عرب میں صرف مٹھی بھر نجدیوں کے علاوہ سارا عالمِ عرب سنّی ہے اور پورا عالمِ اسلام شیعوں اور وہابیوں کی ایک مختصر تعداد کے علاوہ سنّی صحیح العقیدہ ہے۔

سنّیت کا بول بالا

عراق اور امریکہ کی اس جنگ سے سب سے بڑا فائدہ اسلام اور سنّیت کو ہوا ہے۔ پوری دنیا میں اسلامی بیداری کی لہر پیدا ہو گئی۔ افغانستان آزاد ہو گیا۔ روس کی چھ مسلم ریاستیں آزاد ہوئیں اور ان کے آزاد ہوتے ہی پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا ہو رہا ہے اور بہت جلد دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا نام اسلام ہوگا۔ جو صدقہ ہوگا عراقی غازیوں اور شہیدوں کے مقدس لہو کا۔ خلیج کی اس جنگ نے منافقت اور وہابیت کے چہرے سے نفاق کے نقاب کو تار تار کر دیا۔ اہلِ سنّت کو عالمی سطح پر فروغ و استحکام ملا۔

خدا گواہ ہے کہ اہلِ سنّت کے عالمی فروغ ہی کے لیے تبلیغ سیرت کے افراد نے جنگ سے پہلے ان لمحوں کے حصول کے لیے بڑی قربانیاں دیں کہ جن پر صدیوں کی تعمیر کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ بے شک ہم نے اس قیمتی لمحے کو کیچ کیا جس پر صدی ناز کرتی ہے کہ ایک لمحے کی خطا پوری صدی کے لیے سزا بن جاتی ہے۔

لمحوں نے خطا کی تھی صدیوں نے سزا پائی

ہماری واپسی کا ٹکٹ کنفرم ہو چکا تھا، ہمیں 22 جنوری 1992ء کو اردن سے یمن فلائی کرنا تھا۔ بغداد سے عمان پہنچنے کے لیے ہمیں ایک ہزار کلومیٹر بس کے ذریعے راستہ طے کرنا تھا اس لیے ہمیں 21 جنوری کی صبح ہی اردن کے لیے نکل پڑنا

تھا اس لیے ہم لوگوں نے کانفرنس کے ذمہ داروں سے دورانِ کانفرنس زیارتوں کے لیے اجازت چاہی۔ انھوں نے خوشی سے نہ صرف اجازت بلکہ سرکاری گاڑی، سکورٹی، راستے میں کھانے پینے کے پورے انتظام کے ساتھ ایک ذمہ دار آفیسر کو بھی ساتھ بھیجا۔ چونکہ سرکاری بس میں قدرے تاخیر تھی اور اپنے ساتھیوں میں سے بھی کچھ تاخیر سے نکل رہے تھے اس لیے ان تمام لوگوں کو سرکاری بس کے لیے چھوڑ کر ہم دس آدمی صبح ہی صبح 8 بجے باب الشیخ پہنچ گئے، جہاں پر بغداد سے باہر جانے کے لیے گاڑیاں اور کاریں ملتی ہیں۔

ہمارے ساتھ پیر طریقت حضرت مثنیٰ میاں صاحب، مولانا فیض احمد فیض، مولانا مفتی سلیم اختر، مولانا اشرف رضا نوری، معین الدین شیخ اجمیری، خان بہادر سیٹھ، خالد قریشی، اقبال قریشی، فاروق احمد سیٹھ تھے۔ ہم لوگ ڈھائی سو روپے دینار میں ایک چھوٹی سی پرائیویٹ بس کرائے پر لے کر زیارتوں کے لیے نکل پڑے۔

مزارات پر حاضری

سب سے پہلے ہم حضرت امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دونوں بچوں حضرت ابراہیم و محمد کے مزار پر پہنچے۔ یوں تو فرات کی لہروں پر دو یتیموں کا فسانۂ درد والم بچپن سے پڑھتے، سنتے اور اہلِ محبت کو سناتے آئے ہیں کہ کوفہ میں حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کے بعد ان کے بے خطا و بے قصور بچوں کو محض ابن زیاد سے انعام و اکرام کی لالچ میں حارث نامی ایک شقی القلب، بے رحم اور بدبخت ازل نے کس بے دردی کے ساتھ شہید کیا اور ان بن باپ کے بچوں پر قیامتیں کس کس انداز میں ٹوٹیں۔ خاندانِ نبوت کے ان نوشگفتہ پھولوں کو وقت کے بے رحم ہاتھوں نے کس طرح مسل و کچل ڈالا۔ بغداد شریف سے کربلا جاتے ہوئے دریائے فرات کے کنارے کھجوروں کی جھرمٹ میں مسیّب نام کا ایک گاؤں ہے۔ کربلا شریف سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر خوش نصیبی سے آج ہم لوگ انھیں کے ننھی ننھی تربت پر کھڑے تھے 14 سو سال قبل کے فسانۂ درد والم کا سارا منظر نگاہوں میں گھومنے لگا۔ ان کی مظلومیت و بے بسی اور بے رحمانہ شہادت کے تصور سے آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ دیر تک فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ ان بچوں کے شایانِ شان بڑی خوبصورت تربت اور اس پر شاندار عمارت اور اس کا داخلی گیٹ تو بڑا ہی دیدہ زیب ہے، باہر نکل کر بس پر بیٹھے۔ پڑوس میں آباد گھروں سے خواتین نے آدھی گونی تازہ کھجوروں کی غیر ملکی مہمان سمجھ کر تحفتاً ایک آدمی کے ہاتھ بھجوائی جسے کافی اصرار کے بعد شکریے کے ساتھ قبول کرلیا گیا۔

ہم وہاں سے آگے بڑھے۔ فوراً دریائے فرات آ گیا جس پر ایک بہت خوبصورت اور مضبوط پل بنا ہوا تھا۔ دریا کی چوڑائی کے حساب سے کافی بڑا۔ ہم لوگ پل سے گزرتے ہوئے دریا کی خاموش موجوں کو دیکھ رہے تھے۔ بڑا صاف و شفاف دریا بہہ رہا تھا۔ چودہ سو برس قبل دشتِ غربت اور میدانِ کرب و بلا کا وہ نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگا کہ یہی وہ بدقسمت دریا تھا جس کا پانی مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ آنکھوں کے تاروں، علی مرتضیٰ کے راج دلاروں اور فاطمہ زہرا

کے جگر پاروں پر شدتِ پیاس کے عالم میں بند کر دیا گیا تھا اور اپنے اپنے مقدس لہو سے اسلام کی تطہیر کرتے وقت العطش العطش کہتے ہوئے ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہیں تاجدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

مسیّب گاؤں سے نکل کر دریائے فرات سے گزرتے ہوئے اب ہم امام عون میں حاضر ہو رہے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کے نورِ نظر، زینب کبریٰ بنت فاطمہ زہرا بنت رسول اللہ ﷺ کے پارۂ جگر، علی و فاطمہ کے راحتِ قلب و نظر، حضرت امام عون و محمد کی آخری آرام گاہ ہے جو بغداد سے کربلا جاتے وقت بائیں ہاتھ پر کربلا سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وہ امام عون کے نام سے ایک اچھی خاصی آبادی پر مشتمل ہے اور بڑی چہل پہل ہے۔

کربلائے معلّیٰ

کم از کم اسلام کی تاریخ میں نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ میں ایسی کوئی دوسری مثال نہیں کہ ایک بہن نے اپنے دو چھوٹے چھوٹے انتہائی خوبصورت جگر کے ٹکڑوں کو از خود اپنے نانا جان کے دین کی تطہیر اور اس کی حفاظت کے لیے بھائی کے قدموں پر قربان کر دیا ہو۔ بڑا اعظیم الشان اور حیرت ناک ایثار جس کی پوری تاریخ اسلام میں یقیناً کوئی دوسری مثال نہیں۔ بڑا فرحت بخش مقام ہے۔ پانی، استنجا، وضو سب کا انتظام ہے۔ وہاں کی زیارت اور فاتحہ خوانی کے بعد ہم آگے بڑھے۔ اب ہم کربلائے معلّیٰ کے حدود میں داخل ہو رہے ہیں۔ کربلا شہر سے باہر چیک پوسٹ قائم ہے۔ سخت چوکسی ہے۔ عراقی فوجی بہت مستعد ہیں کہ صرف کچھ دن پیشتر کربلا عظیم بغاوتوں کی سخت منزل سے گزر چکا تھا۔

جوں ہی ہماری گاڑی چیک پوسٹ کے پاس پہنچی فوجی قریب آئے۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ یہ مؤتمر اسلامی کا وفد ہے۔ احتراماً قدرے سر جھکاتے ہوئے مرحبا اہلاً و سہلاً کہتے ہوئے گاڑی گزر جانے کا اشارہ دے دیا۔ اب ہم دنیا کے اس عظیم اور تاریخی شہر میں داخل ہو رہے ہیں جو دنیا کے کروڑوں انسانوں کا مرکزِ عقیدت ہے۔ جہاں چودہ سو سال پہلے اسلام ہم جوں جوں آگے بڑھ رہے تھے ہمارا جذبۂ شوق بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ روڈ کی دونوں طرف دُکانوں، مکانوں، بلڈنگوں پر سے عظیم بغاوتوں اور اس کے استحصال کے اثرات دکھائی دے رہے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے شہرِ تمنّا، قبلۂ اوّل اور کعبۂ مقصود کے سامنے کھڑے تھے۔

اللہ اللہ کہاں جگر گوشۂ فاطمہ زہرا، نور دیدۂ علی مرتضیٰ، ضیائے چشم مصطفیٰ سردار آلِ عباء حضرت سیّد الشہداء حسین اعظم شہید کربلا اور کہاں ہمارا گنہگار وجود۔ یہ نصیبے کی ارجمندی اور سرا سران کا ہی کرم ہے کہ انھوں نے اپنی بارگاہ میں بلایا۔ اپنی مقدس چوکھٹ چومنے کی سعادت بخشی۔ ان کے روضے کی شوکت و حشمت، جلال و تمکنت اور جبروت و سطوت دیکھ کر پورا قافلہ حیرت زدہ ہے اور عقل انسان دنگ! یا اللہ دنیا ہی میں یہ انعام شہادت کہ آج وہ دشتِ غربت و میدانِ نینوا، وہ دشت

کرب و بلا جہاں کبھی ریگزار ہی ریگزار تھے، آج وہ رشکِ چمن بنا ہوا ہے۔ جنّت کی بہاریں قربان ہو رہی ہیں۔ اتنا عظیم الشان روضہ اور اس پر سونے کا ایسا زبردست کام! ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سونے کا پہاڑ زمین کا سینہ چیر کر امام عرش مقام کے قدموں میں آ لگا ہو کہ اے ابن رسول اللہ! مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے کر میری عزت بڑھا دیجیے۔

ان کی شوکت ان کی ہیئت سے یہاں دنیا ہے دنگ
ان کی عزت ان کی رحمت سے وہاں عقبیٰ ہے دنگ
اللہ اللہ یہ بلندی یہ عروج و ارتقاء
انبیاء بھی دنگ ہیں اور طائر سدرہ بھی دنگ
یہ سمایا ہے تیری نظروں میں سیّد آج کون
آنکھ ہے حیران، دل ششدر! تیرا چہرہ ہے دنگ

(محدث اعظم ہند)

امامِ عالی مقام کی بارگاہ میں

یہ ہماری اور حضرت مثنیٰ میاں صاحب کی دوسری اور بقیہ ساتھیوں کی پہلی حاضری تھی۔ جن کی پہلی حاضری تھی ان کی سرخوشی کا ایک عجیب عالم تھا اور جو اس مرحلۂ شوق سے گزر چکے تھے، ''وہ ایک بار دیکھا ہے بار بار دیکھنے کی آرزو'' کی منزلِ محبت سے گزر رہے تھے۔ دل کی کیفیت کیسے بیان کی جائے۔ السلام علیک یا ابن رسول اللہ کہتے ہوئے ان کے مواجہہ اقدس میں حاضر ہوئے۔ اندر ہمیشہ بھیڑ ہی لگی ہوتی ہے۔ آنسوؤں، سسکیوں، کراہوں کا بڑا عجیب وغریب سماں رہتا ہے۔ درود وسلام، قرآنی سورتیں پڑھتے رہے، بار بار فاتحہ خوانی کرتے رہے اور محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی کے منقبت کے اشعار بھیگی پلکوں کے ساتھ پیش کرتے رہے۔

امام و خاتم آلِ عبا سلام علیک   برادرِ حسن مجتبیٰ سلام علیک
قرار بخش دلِ مرتضیٰ سلام علیک   ضیائے چشم رسولِ خدا سلام علیک
سرور خاطر خیر النساء سلام علیک

اسی حرمِ خاص میں آپ کے ایک پہلو میں آپ کی جوانی حضرت علی اکبر اور آپ کے جگر کا ٹکڑا ننھا شہید حضرت علی اصغر، دوسرے پہلو میں آرام فرما ہیں۔ پائینتی کی طرف آپ کے عظیم جاں نثاروں کی اجتماعی قبر گنج شہیداں کی شکل میں موجود ہے جس پر ہر ایک کے نام کندہ ہیں اور آپ کے پائینتی میں ہی حضرت قاسم بن حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی اپنے عظیم چچا حضرت امام حسین پر بڑی بے جگری کے ساتھ اپنی جان نثار کر کے آسودۂ خاک ہیں۔ جب ہم لوگ امامِ عالی مقام کی بارگاہِ عظمت و کرامت سے واپسی کے لیے باہر نکل رہے تھے تو ہمارے بقیہ ساتھی جو سرکاری بس میں

تھے وہ بھی آ گئے جن کے ساتھ وزارتِ اوقاف کے ایک بڑے آفیسر بھی تھے۔ ہم وہاں سے نکل کر حضرت عباس علمبردار کے روضہ کی طرف چلے جو حضرت امام عالی مقام کے روضہ کے ٹھیک سامنے ہے۔ پہلے دونوں روضوں کے درمیان کافی عمارتیں اور مکانات تھے لیکن جنگ کے بعد دونوں روضوں کے درمیان کی عمارتیں اور اردگرد کی ساری بلڈنگیں ہٹا دی گئیں اور پہلے ہی کی طرح میدان کر دیا گیا جس سے ان کی شان وشوکت، خوبصورتی اور دلآویزی میں کافی اضافہ ہو گیا۔ دونوں بھائیوں کے روضوں کا کلس آسمان سے باتیں کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ باطنی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ظاہری آرائش و زیبائش دلوں کے ساتھ نگاہوں کو بھی مسخر کر لیتی ہے۔ آپ کا روضۂ اطہر بھی بڑا پُرشکوہ اور عالیشان ہے اسے بھی دیکھ کر آدمی حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اندر مواجہہ اقدس میں جب حاضر ہوں اور بے حد خوبصورت مزار کے اوپری حصے پر نظر ڈالیں تو اس پر لکھا نظر آئے گا السلام علیک یا قمر بنی ھاشم۔

حقیقتاً آپ خاندانِ بنو ہاشم کے چاند تھے۔ آپ حضرت امام عالی مقام کے بھائی تھے جو حضرت علی کی دوسری حرم حضرت ام بنین کے بطن سے ہیں یہ خود اپنی والدہ ماجدہ سے چار بھائی تھے جو میدانِ کربلا میں سب کے سب اپنے عظیم ترین بھائی حضرت امام عرش مقام حسین اعظم شہید کربلا کے قدموں پہ قربان ہو گئے۔ حضرت عباس نے اپنے مقدس لہو سے دشت کربلا میں عشق ووفا کی جو تاریخ رقم کی ہے وہ واقعاتِ کرب وبلا کی خونین داستان میں ایک زرین باب ہے۔ ہم لوگ بڑی دیر تک ان کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرتے رہے۔

اوّل وقت میں ظہر کی نماز ہم لوگوں نے حرم امامِ عالی مقام ہی میں ادا کر لی تھی۔ وہیں سے نکل کر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تھے۔ چنانچہ وہاں سے نکل کر ہم لوگ نجف اشرف کے لیے چل دیئے۔

مولائے کائنات کی بارگاہ میں

ظہر کی نماز پڑھ کر ہم کربلائے معلی سے نکلے۔ کربلا سے جو شاہراہ نجف جاتی ہے اس کے بائیں طرف تو آبادی اور کہیں ہریالی و باغات بھی نظر آئے لیکن دائیں طرف تا حدِ نگاہ صحرا اور ریگستان زمین سے آسمان ملا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ صحرا کا سراب تو بار بار پڑھا تھا لیکن دیکھا دوسری بار تھا کہ ہمارا کربلا اور نجف کا دوسرا سفر تھا۔ صاف وشفاف اور انتہائی نفیس روڈ پر گاڑی کی رفتار بھی اچھی تھی اس کے باوجود گاڑی دیر تک چلتی رہی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کربلا و نجف کے درمیان فاصلہ ایک سو کلومیٹر کا ضرور ہوگا۔ عصر کی نماز سے کافی پہلے ہم نجف شرف پہنچ گئے۔

علم وشجاعت ایک جگہ جمع نہیں ہوتے اور جب وہ کسی محسوس پیکر میں جمع ہو جاتے ہیں تو وہ۔

شاہِ مرداں شیرِ یزداں قوتِ پروردگار

لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

ہوتا ہے۔ "انا مدینتہ العلوم و علی بابہا۔" (الحدیث)

اسم گرامی علی ابن ابی طالب بن ہاشم بن مطلب بن عبد مناف۔ کنیت ابو الحسن، ابو تراب اور لقب شیر خدا اور حیدرِ کرار تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا اسم گرامی بھی فاطمہ تھا۔ آپ نجیب الطرفین ہاشمی و مطلبی ہیں۔ مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے حقیقی چچا زاد بھائی اور آپ کے پروردۂ نعمت تھے بچپن ہی میں آپ نے حضرت علی کو اپنی کفالت میں لے لیا تھا۔ بعثت نبوی سے 10 سال پہلے خاص خانۂ کعبہ میں آپ پیدا ہوئے۔ اسی لیے آپ کو مولودِ کعبہ بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کو یہ شرف و کرامت حاصل ہے کہ آپ جگر گوشۂ مصطفیٰ بنت نبی فاطمہ زہرا کے شوہر، حسنین کریمین حضرت امام حسن مجتبیٰ و امام حسین شہید کربلا و زینب کبریٰ کے والد ماجد ہیں۔ حضرت عثمان غنی کی مظلومانہ و بے رحمانہ شہادت کے تین دن بعد چوتھے خلیفہ کی حیثیت سے آپ نے مسند خلافت کو زینت بخشی اور اہلِ مدینہ کے بے حد اصرار پر وہ کانٹوں بھرا تاج پہنا۔ 17 رمضان 40ھ کو کوفہ کی جامع مسجد میں عین فجر کی نماز کے وقت ایک بد بخت ازلی عبد الرحمٰن بن ملجم کے ہاتھوں زہر آلود تلوار سے شہید ہو گئے۔ آپ کی شہادت پر چوتھی برحق خلافت راشدہ کا اختتام ہو گیا۔ آپ نے حضرت فاطمہ زہرا کی وفات کے بعد مختلف اوقات میں آٹھ شادیاں کیں۔ ان کے علاوہ متعدد لونڈیاں بھی تھیں جن سے 17 لڑکیاں اور چودہ لڑکے ہوئے۔ آپ کی آخری آرام گاہ نجف اشرف میں ہے، نصیبے کی ارجمندی کہیے کہ ہم اس باب العلم، کان ولایت، معدن سخاوت اور پیکر شجاعت کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ اللہ اللہ آپ کے روضے کی سج دھج اس کی عظمت و رفعت، قلم کو یارا نہیں، زبان کو حوصلہ نہیں کہ اس عظمت خداداد کی عظمتوں، شوکتوں، رفعتوں کا نقشہ کھینچ سکے۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں کسی بھی مذہب کے پیشوا کی ایسی آخری آرام گاہ نہیں جس میں اتنا سونا لگا ہو کہ اس مقدار سونے سے دنیا کی کسی بھی حکومت کی بگڑتی ہوئی معیشت سنبھالی جا سکتی ہے۔ اس کی کیفیت بھی بیان کی جائے تو کیسے؟ بس چشمِ تصور میں جتنی بلندیاں، اچھائیاں، دلآویزیاں، رعنائیاں، عمارت اور عظیم مقبرے کے تعلق سے جو تقدس و زیبائیاں ہو سکتی ہیں وہ سب کچھ اس دنیا کے عظیم روضے میں ہیں۔

ہم لوگ صدر دروازے سے اس عظیم الشان احاطے کے اندر داخل ہوئے۔ بائیں جانب طہارت خانہ و وضو خانہ بنا ہوا ہے۔ استنجاء و وضو سے فراغت کے بعد جوں ہی آگے بڑھے، دیدۂ حیرت کو ایک جھٹکا لگا۔ آپ کے روضے کی سج دھج، شان و شوکت دیکھ کر عقلِ انسانی حیران ہو جاتی ہے۔ بے پناہ انسان اژدھام میں اپنے خوشگوار ولولوں پر قابو پاتے ہوئے مواجہہ اقدس میں حاضر ہو گئے۔ مزار شریف کے چاروں طرف سونے کی جالی لگی ہوئی ہے۔ مردوں اور عورتوں کا اژدھام ہے۔ ہم نے چاروں طرف جالیوں پر خوب عطر لگایا۔ جالیوں میں عطر لگاتے وقت ایک طرف سے ہاتھ پھیل جاتے ہیں۔ زائرین اس خوشبو کو تبرک سمجھ کر ہاتھ آگے کر دیتے ہیں۔ جن ہاتھوں میں عطر لگ جاتا ہے وہ دُعائیں دیتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ عراق کے تمام اہم ترین مزارات پر تقریباً یہی کیفیت ہے۔ بارگاہِ غوثیت کبریٰ میں بھی یہی حال ہے۔ البتہ خواتین اپنا ہاتھ آگے کرتے وقت ہتھیلیوں پر کپڑا لپیٹ لیتی ہیں۔ پھر ناک کے ذریعے اس خوشبو کو اپنے مشامِ جاں میں اتارتے ہوئے بہت

پُرخلوص دُعائیں دیتی ہیں۔ ہم لوگ علم و ولایت کے شہنشاہ، شجاعت و عدالت کے تاجدار کی بارگاہ میں خمیدہ سر ہاتھ باندھے بھیگی پلکوں کے ساتھ کھڑے کھڑے دیر تک فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ اپنی اپنی قسمتوں پر ناز کرتے رہے۔ ان کی بارگاہ میں انھیں کے سامنے ہاتھ باندھے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت شہیدِ محبت سیّدنا امام احمد رضا بریلوی کی منقبت کے یہ اشعار بہت کیف پیدا کرتے ہیں۔

مرتضیٰ شیر حق اشجع الاشجعین ساقی شیر و شربت پہ لاکھوں سلام
اصل نسل صفا وجہ وصلِ خدا باب فضلِ ولایت پہ لاکھوں سلام
شیر شمشیر زن شاہِ خیبر شکن پرتو دست قدرت پہ لاکھوں سلام

اوران کی بارگاہِ ناز میں انھیں کے فرزند ارجمند حضور محدث اعظم ہند کچھوچھوی کی یہ مستی رنگ وآہنگ کے نہ جانے کتنے موسم پیدا کرتی ہے۔

نعرۂ یاعلی لگا کر ہم دور کرتے ہیں سارے رنج والم
کیوں نہ سارا جہاں کہے رستم دستِ سیّد میں ہے علی کا علم
حیدریم قلندرم مستم بندۂ مرتضیٰ علی ہستم

اندر کافی وقت گزار کر جب ہم باہر صحن میں نکلے تو حکومتِ عراق کے بڑے بڑے آفیسران نے فوجی وردی میں ملبوس آگے بڑھ کر پُرتپاک خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ کربلا سے تشریف لا رہے ہیں اور مؤتمر اسلامی کے ہندوستانی مندوبین ہیں۔ ہمیں اوپر سے حکم ملا ہے کہ ان سب کے کھانے کا بندوبست کیا جائے۔ لہٰذا آپ حضرات کھانا تناول فرما کر ہی رخصت ہوں۔ ہم نے ان کی پُرخلوص پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ بے شک ہم مؤتمر اسلام کے ہندوستانی مندوبین ہیں لیکن ہمارے پاس وقت کی بڑی کمی ہے اور ابھی کافی زیارتیں باقی رہ گئی ہیں۔ ہم آپ سب کا اور آپ کے بڑوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت چاہتے ہیں۔ ہم اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ زیارتوں میں صرف کرنا چاہتے ہیں، ہمارے بقیہ ساتھی سرکاری گاڑی میں یہاں کچھ دیر بعد پہنچ جائیں گے۔ آپ ان کے کھانے کا بندوبست کیے رہیں۔ انھوں نے ہماری معذرت کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا اور چند قدم مشایعت میں چل کر پُرجوش مصافحہ کے بعد رخصت کیا۔ ہم وہاں سے نکل کر کوفہ کی جانب چل پڑے۔

کوفہ کی جامع مسجد میں

کوفہ اور نجف دونوں بہت قریب گویا کہ ایک دوسرے سے تقریباً ملے ہوئے لگتے ہیں۔ کوفہ میں داخل ہونے سے پہلے ہم نجف کے عام قبرستان میں پہنچے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ ایک قبے میں حضرت ہود و حضرت صالح علیہم السلام کا مرقد انور ہے۔ وہاں ہم حاضر ہوئے۔ ایک عام سا قبہ ہے۔ حاضری نہ ہونے کے برابر ایک خوب موٹی عورت وہاں پر مجاور ہے۔ کچھ

سفرناموں میں بھی یہی بات ہے۔ حالانکہ طبقاتِ ناصری کے مطابق حضرت ہود علیہ السلام کا مزار حضر موت میں ہے جو ملک یمن کے حدود میں سعودی بارڈر پر ہے۔ اس مقام کا نام ہی بنی ہود ہے اور اس نام کی وہاں پر شہرت ہے اور یہی صحیح ہے۔ ابھی چند ماہ ہوئے عراقی ٹکنیشن نے حضر موت کے مقام پر تیل نکال لیا ہے جس سے سعودی حکمرانوں کو گھبراہٹ ہے کہ یمن سعودیہ کے مقابلے میں کافی نشیب میں ہے۔ ہم وہاں سے کوفہ کی جامع مسجد میں آئے۔

کوفہ :۔ عرب مسلمان جب فتح کے جھنڈے گاڑتے ہوئے عرب کے ریگزاروں سے نکل کر شام و روم اور ایران کے مرغزاروں میں پہنچے تو جہاں جس کو اچھا لگا وہیں آباد ہو گئے۔ چونکہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے دور میں بہت کافی فتوحات ہوئے، ان مفتوحہ ممالک میں عربوں کی نوآبادیاں بھی کثرت سے ہوئیں۔ اس لیے فاروقِ اعظم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو حکم دیا کہ کوفہ جو پہلے عراق کے ایک قدیم فرمانروا کا پایۂ تخت رہ چکا ہے اس کو پھر سے آباد کیا جائے اور نئے سرے سے اس میں چالیس ہزار آدمیوں کے بیک وقت رہنے کے مکانات تعمیر کیے جائیں۔ اس شہر کا نقشہ خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنایا جس میں اس بات کا التزام رکھا کہ وسیع شاہراہیں اور شہر میں ایسی کشادہ سڑکیں ہوں جو چالیس ہاتھ سے لے کر بیس ہاتھ چوڑی ہوں۔ جامع مسجد اتنی بڑی بنائی گئی کہ جس میں بیک وقت40 ہزار آدمی نماز پڑھ سکیں۔ اس شہر میں بڑے بڑے فوجی مستقر اور چھاؤنیاں اور بڑی بری سرکاری عمارتیں بنائی گئیں۔ اس شہر کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں ہی بڑی عزت و عظمت اور بے پناہ شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ایک طرح سے حضرت عمر ہی اس عظیم شہر کے بانی ہیں، خود فاروقِ اعظم اسے ''راس الاسلام'' فرمایا کرتے تھے۔ علمی حیثیت سے بھی یہ شہر ہمیشہ بڑی اہمیت کا حامل رہا۔ علماء، فقہاء، محدثین، متکلمین کا یہ مرکز رہا۔ امامِ اعظم ابوحنیفہ، امام نخعی، امام حماد، اماشعبی وغیرہ وغیرہ اسی شہر کے آفتابِ فضل و کمال ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اسے اپنا پایۂ تخت بلاوجہ نہیں بنایا تھا۔ یہ شہر روز بروز پھیلتا، پھولتا بڑھتا اور پھلتا رہا۔ کوفہ کی وسعت اور عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حضرت امام مسلم نے اپنے ہاتھ پر امام عرش مقام شہید کربلا کے نام کی بیعت لینا شروع کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلمانوں نے آپ کے ہاتھ پر حضرت امام حسین کی اجتماعی بیعت کی لیکن کوفیوں کی خمیر میں وفا نام کا کوئی عنصر حضرت علی کی شہادت کے بعد نہیں رہ گیا۔ ماضی کا اتنا عظیم اسلامی شہر جو عالمگیر شہرت کا حامل تھا، آج سمٹ کر رہ گیا ہے۔ رونقیں دم توڑ چکی ہیں۔ در و دیوار پر وحشت برس رہی ہے۔ چہل پہل، نور و نکہت کا دور دور تک پتہ نہیں۔ ایک پُرہول سناٹا، ایک وحشتناک ویرانی، کوفہ ہی کی جامع مسجد میں حضرت علی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس مسجد کے قریب اپنے مکان میں شہادت پائی۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہ کوئی مخلص نہ رہے۔ حضرت امام مسلم بن عقیل کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی کچھ کم شرمناک نہیں۔ بالخصوص شہزادۂ رسول اللہ حضرت امام عالی مقام اور ان کے شہزادگان خدامان جاں نثاراں اور ان کی اہلِ بیت کے

ساتھ اس شہر غدار کے باشیوں نے جو سلوک کیا جس کی مثال انسانی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ چہ جائیکہ اسلامی تاریخ میں۔
یہ خاندانِ نبوت اور چمن زارِ فاطمہ زہرا کے پھولوں سے گستاخی کی نحوست ہے جو آج کوفہ اس حشر کو پہنچا۔ میں دو بار کوفہ گیا حضرت امام مسلم کے مزار اور حضرت ھانی بن عروۃ کے مزار پر گیا مگر طلب کے باوجود ہم نے وہاں کسی طرح کھانا پینا حتیٰ کہ چائے تک سے پرہیز کیا۔ خواہش کے باوجود دل نے گوارا نہ کیا، ضمیر آمادہ نہ ہوا کہ اس شہر کا بھی کچھ کھا پی لیا جائے۔ جس شہر کے بدبختانِ ازلی نے خاندانِ نبوت پر کھانا پینا بند کر دیا تھا۔
پہلے سفر میں میرے ساتھ محب گرامی شہزادۂ شعیب الاولیاء حضرت علاّمہ عبد القادر علوی بھی تھے۔ کچھ کھانے پینے کی انھوں نے خواہش ظاہر کی لیکن میں نے بڑے ادب سے عرض کیا اس شہر بے وفا کا کچھ نہ کھائیے نہ پیجیے۔ خواہش کے باوجود انھوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔

امام مسلم کے آستانے پر

اپنے اس دوسرے سفر میں بھی ہم کوفہ پہنچے۔ کوفہ کی جامع مسجد جو آج بھی بہت وسیع و عریض ہے اس کے صدر دروازے سے تو وہی پرانی شان وشوکت ٹپکتی ہے۔ چاروں طرف تو شہر پناہ کی طرح بڑی بلند فصیل نما دیوار ہے لیکن اندر بڑا ویرانہ سا لگتا ہے۔ مین گیٹ سے اندر جائیے۔ وسیع ترین صحن کے بعد مسجد پڑتی ہے وہ محراب جہاں پر حضرت علی پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا اسے سونے کی جالی اور پترے سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ ہم لوگوں نے کوفہ کی جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھی۔ کچھ لوگوں نے مسجد کے بائیں جانب جہاں حضرت امام مسلم اور انھیں کے بالکل سامنے حضرت ہانی بن عروہ کے مزار ہیں، وہاں نماز پڑھی۔ ہم جب اس دوسرے سفر میں حاضر ہوئے تو حضرت امام مسلم کے عظیم الشان روضے کی تزئین کا کام اختتام پر تھا۔ بے حد خوبصورت اور عظیم الشان روضہ ہے۔ اس پر بے اندازہ سونا ہی سونا نظر آتا ہے۔ دنیا ہی میں یہ انعام شہادت! آخرت کے انعام کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا رب انھیں کیا کیا عطا فرمائے گا۔
حضرت مسلم بن عقیل بن ابو طالب بن ہاشم، حضرت امام حسین کے سگے چچا زاد بھائی تھے۔ اہلِ کوفہ کے پیہم اصرار و اشتیاق پر انھیں پہلے بھیجا کہ میرے نام پر اہلِ کوفہ سے بیعت لو، اور کوفہ کی صحیح صورتِ حال کا پتہ لگا کر مجھے آگاہ کرو۔ چنانچہ آپ اپنے عظیم بھائی کے حکم پر کوفہ تشریف لائے، ساتھ میں اپنے دو چھوٹے چھوٹے بچے جو خاندانِ نبوت کے بڑے خوبصورت گل بوٹے تھے، انھیں بھی لائے۔ ان کے اور ان کے بچوں کے ساتھ اہلِ کوفہ نے جو سلوک کیا وہ داستانِ کربلا کا بڑا خونچکاں باب بن چکا ہے بالخصوص ان کے بچوں اور ان بے خطا جانوں کی مظلومیت اور ان کی داستانِ عجیب وغریب سن کر پتھر دل بھی پگھل جاتا ہے۔ اسی دن فرات کی لہروں پر ان یتیموں کے مدفن کی بھی زیارت کر لی تھی۔ اب ان کے عظیم باپ کی آرام گاہ میں حاضر تھے۔ وہاں کافی دیر تک فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ حکومتِ عراق اس کی آرائش وزیبائش پر بے اندازہ روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ سامنے ہی ہانی بن عروہ کا بھی مزار ہے جو ایک خوبصورت گنبد میں ہے یہ کوفہ میں آخر

وقت تک حضرت امام مسلم کے وفادار اور جاں نثار رہے اور انتہائی اولوالعزمی اور ثبات قدمی کے ساتھ آپ نے اپنی جان قربان کردی مگر ابن زیاد کے آگے نہیں جھکے۔ اسی انعامِ شہادت کی بدولت آج وہ بھی ابد الآباد تک زندۂ جاوید بن چکے ہیں۔ امام مسلم رضی اللہ عنہ کے بے حد خوبصورت حرم کے ایک گوشے میں مختار ثقفی کی بھی قبر ہے۔

مختار ثقفی

حضرت امام حسین کی شہادتِ عظمیٰ کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۃ المسلمین بنے۔ مکّہ معظمہ، مدینہ منورہ اور حجاز کے لوگوں نے آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور پورے حجاز میں عبداللہ بن زبیر کا اثر غالب ہوگیا۔ اسی زمانے میں قبیلہ بنو ثقیف کے ایک گمنام مگر انتہائی تیز وطرار عالی دماغ شخص مختار بن ابی عبید ثقفی کو قسمت آزمائی کا حوصلہ پیدا ہوا مگر اس جیسے معمولی آدمی کا کسی بڑے سہارے کے بغیر کامیاب ہونا مشکل تھا۔ یہ شخص انتہائی ابن الوقت تھا۔ پہلے تو حضرت عبداللہ بن زبیر کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اپنے عظیم مقصد کے لیے سہارا بنانا چاہا لیکن وہ جس قدر بہار، اولوالعزم، صاحب عزیمت و استقامت تھے، اسی قدر بالغ النظر اور بے حد ہوشیار تھے۔ اس لیے وہاں اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اسی زمانے میں توابین کی تحریک بھی قائم ہوئی (یعنی حضرت امام عالی مقام کے خونِ ناحق کا انتقال لینے والی جماعت)۔ اپنے جوڑ توڑ سے وہ اس میں شامل ہوگیا۔ تحریک کے بااثر لوگوں کے مختلف لڑائیوں میں کام آجانے کے بعد وہ خود اس کا سربراہ بن گیا۔ اس تحریک کو موثر بنانے کے لیے اس نے امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سرپرستی کی درخواست کی۔ آپ اس کی مکاریوں سے باخبر تھے آپ نے نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کا پردہ بھی فاش کردیا کہ یہ شخص صرف لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اہلِ بیت سے محبت کا ڈھونگ کررہا ہے ورنہ اسے اہلِ بیت سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ سے مایوس ہوکر حضرت محمد بن حنفیہ جو دوسری محل سے حضرت علی مرتضیٰ کے بیٹے حضرت امامِ عالی مقام کے بھائی اور حضرت امام زین العابدین کے چچا تھے، ان کی رجوع ہوا۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مشورے کے بعد کہ وہ دونوں اس وقت سیاسی حالات کے پیہم دباؤ سے حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اس پر اعتماد نہ کرتے ہوئے اس کی سرپرستی قبول فرمائی مگر ساتھ ہی اپنا ایک آدمی لگادیا کہ تم ہمیشہ اپنی آنکھیں کھلی رکھنا اور ہمیں حالات سے باخبر رکھنا، یہ آدمی قابلِ اعتماد نہیں۔ مختار ضرورت سے زیادہ تیز ثابت ہوا۔

ادھر عبداللہ بن زبیر سے اپنے تعلقات برقرار رکھے کہ اگر اس تحریک میں خاطر خواہ کامیابی نہ ملے تو عبداللہ بن زبیر کا دروازہ اس کے لیے کھلا رہے۔

وہ عراق آیا۔ اہل عراق کے دلوں میں قاتلین امامِ عالی معام کے انتقام کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا اس جذبے کا فائدہ اٹھا کر اس نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ میدانِ کربلا کے ایک ایک مجرم کو اس نے عبرتناک سزا دی۔ خولی، شمر ذی الجوشن، عمر بن سعد، حرملہ و دیگر اہم ترین مجرموں کے سر کات کر وہ امام محمد بن حنفیہ کی خدمت میں بھیجتا رہا۔ جس پر شبہ ہوتا کہ

یہ بھی کسی نوعیت سے خاندانِ نبوت کا مجرم ہے اسے بے دریغ قتل کرا دیتا۔ صرف دس سال کے اندر اندر مختار ثقفی کے ہاتھوں تمام مجرمین کربلا اپنے کیفر کردار تک پہنچ گئے حتیٰ کہ عبداللہ بن زیاد جو داستانِ کربلا کا یزید کے بعد سب سے بڑا ہیرو تھا، اسے بھی عبرتناک انجام تک پہنچایا۔ اپنی انھیں بے پایاں کامیابیوں سے اس کا دماغ اور زیادہ خراب ہوا۔ اس وقت اس کی قوت وشوکت بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اہل بیت کی محبت کی آڑ میں طرح طرح کے فتنے اور بدعقیدگی کو عقیدے میں داخل کر کے اپنی الگ حکومت کا سودا اس کے سر میں سمایا۔ انجام کار حضرت عبداللہ بن زبیر کے عامل بصرہ حضرت مصعب کے ہاتھوں مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔

آخر وقت تک اس نے ہار نہیں مانی۔ قصر امارت سے نکل کر بری بے جگری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا، اس کی قبر بھی حضرت امام مسلم کے گنبد ہی میں ہے۔ حضرات شیعہ وہاں ضرور دُعا فاتحہ کے لیے ہجوم لگائے رہتے ہیں لیکن اہل سنّت حضرات جو اس کے حال سے باخبر ہیں وہ صرف امام مسلم ہی کی بارگاہ میں حاضر ہو کر لوٹ آتے ہیں۔ وہاں جانا نہیں چاہیے اور جان کر کوئی جاتا بھی نہیں۔

حضرت یونس علیہ السلام

کوفہ کی جامع مسجد میں ہم لوگ عصر کی نماز پڑھ کر کوفہ ہی میں مقامِ حضرت یونس علیہ السلام کی زیارت کے لیے چلے جو دریائے فرات کے کنارے موجود ہیں۔ کچھ لوگوں نے کوفہ میں آپ کی آرام گاہ لکھا ہے جو غلط ہے۔ آپ کا مزارِ پُرانوار عراق کے مشہور شہر موصل میں ہے جو بغداد سے چار سو کلومیٹر دور ہے البتہ کوفہ میں لب فرات وہ مقام ہے جہاں مچھلی نے اللہ کے حکم سے آپ کو اپنے پیٹ سے اگلا تھا۔ ہم لوگ عصر کی نماز کے بعد پہنچے۔ گاڑی کے مالک نے جو ایک اشرافِ عرب سے تھے، اس مقام پر لے جا کر گاڑی کو روکا اور بتایا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر آپ مچھلی کے پیٹ سے نکلے تھے۔ سامنے ہی دریائے فرات بہہ رہا ہے لیکن اس مقام کی کھدائی ہو رہی تھی۔ شاید عراقی حکومت اس پر کوئی شایانِ شان یادگار تعمیر کرانا چاہ رہی ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام اللہ کے ایک بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں۔ قرآنِ مجید میں آپ کا ذکر چھ سورتوں اور اٹھارہ آیات میں آیا ہے۔ آپ حضرت ہود علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کا زمانہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام کے درمیان ہے۔ آپ اہلِ نینویٰ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے تھے جو حضرت ہود علیہ السلام کے بعد پھر خدا کے باغی نافرمان ہو گئے تھے۔ مسلسل چالیس سال تک آپ انھیں پیغامِ حق اور خدا کی وحدانیت، اپنی نبوت کی دعوت دیتے رہے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ الٹا آپ کا مذاق اڑاتے، مخالفتیں کرتے اور پیہم اذیتیں دیتے رہے۔ آپ ان سے مایوس، بددل اور ناراض ہو کر انھیں بددعا دے کر وہاں سے نکل گئے۔

جواں حوصلہ خاتون

اس کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام کے مزار پر حاضری دی۔ مزار شریف کے گراؤنڈ کے باہر بھی پانی کا نل لگا ہوا

ہے۔ہم سب وہیں وضو کررہے تھے۔وہ راستہ بھی تھا۔اتفاق سے کچھ خاتون وہاں سے گزررہی تھیں۔نل پر حضرت مثنیٰ میاں صاحب قبلہ بھی وضو فرمارہے تھے۔ان کے نورانی وجیہہ،شکیل اور بزرگ چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ سب رک گئیں۔ ایک کی گود میں بڑا ہی خوبصورت لڑکا تھا۔عراقی مرد وعورت بچے تو یوں ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔وہ کھلے دیہاتی آب وہوا کا بچہ بڑا پیارا لگتا تھا۔انھوں نے اپنے بچے کو مثنیٰ میاں قبلہ کے آگے کرتے ہوئے عربی میں بڑے ادب کے ساتھ دُعائے خصوصی کی گذارش کی کہ اے شیخ دُعا فرمادیں کہ ہمارا یہ بچہ بڑا ہو کر فوجی بن جائے تا کہ اپنی قوم اور مذہب کی حفاظت کرے۔اس کی اس خواہش پر حضرت مثنیٰ میاں قبلہ آبدیدہ ہو گئے۔دیر تک بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر دُعائے خصوصی کرتے رہے اور اپنی جیب سے کچھ عراقی دینار نکال کر بچے کو بطور تبرک عطا فرمایا۔جسے بڑی خوشی،احترام وعقیدت سے قبول کیا گیا۔اس خاتون کے اس قدر عظیم اور مقدس جذبے سے ہم سبھوں کو بڑی خوشی ہوئی کہ یہ زندہ قوم کی حوصلہ مند مائیں ہیں جو آج بھی اپنے بچوں کو اس لیے جوان کرتی ہیں کہ اپنے قومی وملّی وقار پر قربان کرسکیں۔فالحمد للہ رب العالمین۔

سلمان پاک

20 جنوری 1992ء کو آخری اجلاس تھا۔طے ہوا تھا کہ آخری اجلاس کے تمام سشن میں شرکت کی جائے گی۔پہلے پروگرام یہ تھا کہ 21 جنوری 1992ء کو بعد نمازِ مغرب بغداد سے عمان کے لیے روانہ ہو جائیں گے کہ دوسرے دن 22 جنوری کو عمان سے یمن کی فلائٹ کنفرم ہو چکی تھی۔ایک ہزار کلومیٹر کا فاصلہ بذریعہ بس طے کرنا تھا کہ اچانک پروگرام میں تبدیلی یہ ہو گئی کہ بجائے 21 جنوری شام بعد نمازِ مغرب کے بارہ گھنٹے قبل صبح 6 بجے نمازِ فجر ہی نکل جانا ہے۔یہ صرف احتیاطی پیش بندی کے طور پر تھا کہ خدانخواستہ اگر یہ پلین مس ہو گیا تو پھر چار دن کے بعد دوسری فلائٹ یمن کے لیے تھی۔چنانچہ دوپہر کے اجلاس کے بعد کانفرنس ہال ہی سے باب الشیخ آئے اور وہیں سے اعلیٰ درجے کی ایک پرائیوٹ ایرکنڈیشن کا 80 دینار میں کرایہ طے کر کے اندرونی بغداد اور سلمان پاک (قدیم قادسیہ) جو بغداد سے 50 کلومیٹر ہے۔ان تمام اہم ترین زیارتوں کے لیے صرف 80 دینار میں گاڑی مالک خوشی خوشی راضی ہو گیا۔

حضرت معروف کرخی

ہم باب الشیخ سے پہلے حضرت معروف کرخی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔حضرت معروف کرخی یہ پیشوائے قدسیاں اور مقتدائے طریقت کے سلسلۃ الذہب کے گوہر آبدار ہیں۔آپ عیسائی والدین کے بیٹے تھے۔آپ حضرت امام علی بن امام موسیٰ رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور انھیں کے دست حق پرست پر شرفِ بیعت سے مشرف بھی ہوئے۔ایک طویل زمانے تک آپ نے حضرت داؤد طائی کی خدمت میں بڑے بڑے عبادات و ریاضات ومجاہدات کیے۔کافی دنوں کے بعد جب آپ وطن لوٹے تو والدین بھی آپ کی برکتوں سے مسلمان ہو گئے۔

آپ کے مراتب، درجات، مناقب اتنے زیادہ ہیں کہ ان کے علوئے مرتبت پر بہت کچھ عرض کیا جاسکتا ہے۔ تنگ دامانی درمیان میں حائل نہ ہوتی تو تفصیل سے حالات ضرور پیش کرتا۔ ایک خوبصورت سی مسجد کے ایک گوشے میں بڑا ہی خوبصورت آپ کا مزار ہے۔ مزار شریف تک پہنچنے کے لیے ایک خوبصورت قبرستان سے گزرنا پڑتا ہے۔ ایک طرح سے وہ ایک قبرستان ہی ہے۔ وہاں پر استنجا خانہ، وضو، غسل کے لیے ٹھنڈے گرم پانی کا بھی انتظام ہے۔ یہ آستانہ بغداد شریف میں بڑا مرجع خلائق ہے۔ ہم لوگ باوضو حاضر بارگاہ ہوئے مرقد انور کی جالیوں میں خوب عطر لگایا اور دل لگا کر فاتحہ خوانی کی پھر وہاں سے ہم لوگ روانہ ہو کر حضرت جنید بغدادی و حضرت سری سقطی کی بارگاہ کی طرف چل دیئے۔

حضرت جنید بغدادی

حضرت معروف کرخی کے یہاں سے نکل کر ہم سیّد الطائفہ حضرت جنید بغدادی اور ان کے ماموں و مرشد حضرت شیخ ابوالحسن سری سقطی رضی اللہ عنہما کی بارگاہ میں حاضری کے لیے چلے جو وہاں سے قریب ہی ہے اور کافی مشہور بھی ہے۔ دونوں ماموں بھانجے پیر و مرید ایک قبے کے اندر آرام فرما ہیں۔ دونوں مزارات بالکل متصل دائیں طرف ایک پُرشکوہ مسجد، مزارات کے گرد بے حد خوبصورت جالیاں لگی ہوئی ہیں، کہ بس انھیں دیکھا کیجیے۔

حضرت سری سقطی

یہ بغداد شریف ہی کے نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے مسلم الثبوت بزرگ ہیں۔ بغداد میں سب سے پہلے حقائق، دقائق اور توحید کے اسرار، رموز کا ذکر آپ ہی نے شروع کیا۔ یہ حضرت معروف کرخی کے مرید اور حضرت جنید بغدادی کے ماموں و مرشد ہیں۔ آپ نے حضرت حبیب راعی سے ملاقات کا شرف حاصل کیا ہے۔ آپ ایک بڑے اچھے تاجر اور بڑے عابد و زاہد تھے۔ خود سیّد الطائفہ فرماتے ہیں کہ میں نے عبادت میں آپ سے کامل کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کی عظمت شان کا اندازہ اس سے لگائیں کہ آپ حضرت سیّد الطائفہ سیّدنا جنید بغدادی (جن پر شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت، ولایت، صداقت سب ناز کرتی ہے) کے پیر و مرشد ہیں۔

حضرت جنید بغدادی کے تعلق سے کچھ عرض کرنا آفتاب کو چراغ دکھانا ہے۔ مشائخ کبار انھیں سیّد الطائفہ، اربابِ فضل و کمال، سلطان المحققین، طاؤس العلما کہتے ہیں۔ تصوف اور طریقت کے تقریباً تمام تر سلسلے آپ کے نام سے زینت پاتے ہیں۔ الغرض ان کے عہد میں بغداد کے آسمان کے نیچے مجموعی حیثیت سے اتنا بڑا صاحبِ فضل و کمال، اتنا بڑا متقی و پرہیزگار، اتنا بڑا عالم و فاضل کوئی دوسرا نہیں تھا۔ یہ ہماری انتہائی خوش نصیبی تھی کہ ہم دوسری بار ان کی بارگاہِ عظمت میں حاضر تھے۔ جی بھر کے ان کے مزار شریف کی جالیوں پر عطر لگایا۔ اپنے اپنے ساتھیوں اور تمام افرادِ تبلیغ سیرت اپنے دوست و احباب بلکہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کے لیے خوب خوب دعائیں مانگیں۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

حضرت جنید بغدادی کے آستانہ ہی پر حضرت یوشع بن نون علیہ السلا جو بنی اسرائیل کے زبردست اور اولوالعزم پیغمبر ہیں۔ یہی یوشع بن نون ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھانجے ہیں اور قرآنِ مجید کے سورۂ کہف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کے دوران جس نوجوان کا تذکرہ دوجگہ آیا ہے یہ وہی حضرت یوشع بن نون ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد چالیس برس بعد اللہ نے آپ کومنصب نبوت سے سرفراز فرمایا۔ مشہور عابد، زاہد، مستجاب الدعوات اسرائیلی بزرگ بلعم باعور کا معاملہ بھی انھیں کے ساتھ پیش آیا تھا۔

حضرت بہلول دانا

ان کا مزار شریف اور حضرت بہلول دانا (جو عہد ہارون رشید کے بہت مشہور، معروف مجذوب بزرگ گزرے ہیں۔ ہارون رشید کی محبوب ترین ملکہ زبیدہ کے ہاتھوں جنّت کا محل بیچنے والے یہی بہلول دانا ہیں۔) ایک جگہ دونوں کے مزارات ہیں لیکن دونوں کے دروازے الگ الگ ہیں اور اسی احاطے میں بہلول دانا کی دیوار سے متصل بلکہ دونوں کی ایک ہی دیوار کہیے، گرونا نک کا چلّہ بھی ہے۔ ان سب کی کنجیاں حضرت جنید بغدادی کے آستانے کے خادم کے پاس رہتی ہیں۔ گاڑی ڈرائیور عام طور پر پہلے وہیں لے جاتے ہیں اور وہیں سے واپس ہوجاتے ہیں۔ زائرین گاڑی ڈرائیور سے کہیں کہ آپ ان آستانوں کی کنجیاں لے کر ہمیں وہاں کی بھی زیارت کرائیے۔ ہم تو متعدد بار حاضر ہو چکے ہیں مگر ہمارے بعض اہم ساتھی جو دوسرے گروپ کے ساتھ تھے عدم علم کی بنیاد پر وہاں نہ پہنچ سکے جس کا انھیں بڑا قلق رہا۔

ملکہ زبیدہ

مشہور عباسی خلیفہ ہارون رشید کی مشہور عالم ملکہ زبیدہ خاتون جو اپنی فہم وفراست، حسن وجمال، تدبر ودانش مندی، بزرگانِ دین سے خوش عقیدگی اور انسانیت نوازی میں بڑی شہرت رکھتی ہیں۔ اہم اور تاریخی خواتین میں زبیدہ کا نام رہتی دنیا تک جگمگاتا رہے گا۔ نہر زبیدہ کا ذکر جب تک تاریخ کی کتابوں میں زندہ ہے، روئے زمین پر اس کے وجود کا کچھ بھی حصہ باقی رہے گا زبیدہ خاتون زندہ رہیں گی۔

ایک سال حج کے وقت مکّہ میں حاجیوں اور اہلِ مکّہ کے لیے پانی کی قلت جو دیکھی تو اس عظیم خاتون نے بغداد واپس آکر دریائے دجلہ سے ایک عظیم نہر نکال کر (جو پندرہ سو میل لمبی ہے) ہمیشہ کے لیے حاجیوں کے لیے پانی کے مشکلات کو ختم کردیا اس کی انھیں نیکیوں کی بنیاد پر ہم لوگ ان کے مقبرے پر بھی پہنچے۔ ان کا مقبرہ بغداد ریلوے اسٹیشن کے قریب جو قبرستان ہے، اسی میں ہے۔ مزار پر بڑا ہی خوبصورت، دیدہ زیب اور عجیب وغریب طرز کا گنبد بنا ہوا ہے جس کے انگ انگ سے نسائیت ٹپکتی ہے اور زبانِ حال سے اس کی تعمیر یہ کہتی ہے کہ بنوانے والے نے اس کے مسالے میں اپنی محبت کا عنصر بھی وافر مقدار میں ملا دیا ہے۔ ہم لوگ اس خوش نصیب خاتون کی بخشش ومغفرت کے لیے فاتحہ خوانی اور دُعائیں کرتے رہے۔

گاڑی مالک کی شرافت وسعادت دیکھتے ہوئے ہم نے اپنی زیارتوں کی ترتیب اسی پر چھوڑ دی۔ چنانچہ ہمیں وہ جنید بغدادی کے یہاں سے لے کر سیدھے سلمان پاک پہنچا جہاں پر حضرت سلمان فارسی، حضرت حذیفہ یمانی، حضرت عبد اللہ بن جعفر مشہور ترین صحابۂ کبار کے مزارات ہیں۔ یہاں ہماری دوسری لیکن ہمارے ساتھیوں کی پہلی حاضری تھی۔ سلمان پاک کے عظیم الشان احاطے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا کہ ہم یہاں ظہر کی نماز پڑھ کر باہر گاڑی پر آپ کا انتظار کریں گے۔ اسی احاطے میں بڑی پُرشکوہ مسجد سلمان بھی ہے اور اس کے پیچھے کی طرف استنجا خانہ، وضو وغسل کا نہ سب کچھ موجود ہے۔ ہم لوگوں نے نماز پڑھ کر تمام اصحابِ رسول کی بارگاہ میں حاضری دی۔ باہر نکلے تو سبھوں کو کھانے کی خواہش تھی۔ ہم نے ڈرائیور سے کسی ہوٹل کے لیے رہنمائی چاہی کہ حسنِ اتفاق سے وہ رہتا بھی وہیں تھا۔ بڑی خوشی سے وہ ہمیں وہیں سامنے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ مالک سے خصوصی تعارف کرایا اور حسب فرمائش تازہ گرم کھانا بنا کر پیش کیا۔ ہم نے اسے بھی کھانے میں شامل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر بڑے شکریے کے ساتھ معذرت چاہی کہ ہم روزہ سے ہیں۔

شیخ سہروردی

جب ہم وہاں سے فارغ ہو گئے تو وہ ہمیں سلمان پاک سے سیدھے لے کر واپس حضرت شیخ الشیوخ شیخ عمر شہاب الدین سہروردی کی بارگاہِ عالی میں پہنچے جو ایک مستقل سلسلۂ طریقت یعنی سلسلۂ سہروردیہ کے امام ہیں۔ جن کے فضائل و مناقب ودرجات کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔

عوارف المعارف کے مصنف شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی اور حضرت جلال الدین تبریزی جیسے عظیم المرتبت اولیاء کرام کے پیر ومرشد اور خود حضور سیّدنا غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صدقہ اور سرکار غوثیت کبریٰ کی نگہہ ولایت کے شاہکارِ اعظم ہیں۔

ایک خوبصورت مسجد کے گوشے میں بڑا ہی خوبصورت شایانِ شان مقبرہ جس پر خوبصورت و پُرشکوہ گنبد، اندر بڑا پُرسکون ماحول اور بڑا روحانی کیف، اسی گنبد کے ایک گوشے میں مشہور عباسی خلیفہ معتصم باللہ یا مستعصم باللہ کی بھی قبر ہے، جسے دیکھ کر بے ساختہ زبان پہ جاری ہو گیا۔

برمزارِ ما غریباں نے چراغ نے گلے

اور وہیں ایک طرف حیاتِ ابدی کی تمام تر بہاریں پورے جمال وکمال کے ساتھ موجود تھیں۔

شیخ عمر ہی کی بارگاہ میں ہمارے ساتھیوں کا دوسرا گروپ بھی مل گیا جس میں ادارۂ شرعیہ بمبئی کے مفتی مولانا اشرف رضا و مولانا عرفان احمد صاحب خطیب وامام مسافر خانہ مسجد وغیرہ تھے۔ ان کی گاڑی کا مالک ہماری گاڑی کے مالک کا حقیقی بھائی تھا، وہ دونوں بھی آپس میں مل کر بہت خوش ہوئے۔ پھر وہیں سے دونوں گاڑیاں ساتھ میں حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے یہاں حاضری دینے کے لیے چل پڑیں۔ جو وہاں سے قریب مسلمانوں کے ایک قبرستان میں ہے۔ ان کے مزار

پر ایک خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے۔قبرستان کے عام راستے سے گزرتے ہوئے جب ان کے مزار کے احاطے کے صدر دروازے میں پہنچیں گے تو عام طور پر وہ بند ملے گا۔ دروازہ بند دیکھ کر واپس نہیں جانا چاہیے بلکہ جالیوں سے اندر آواز دینا چاہیے مولانا برزنجی نام کے ایک امام وہاں رہتے ہیں۔ہم لوگ تین بار وہاں جا کر لوٹے۔ یہ باتیں تو اس شریف النفس ڈرائیور نے بتائیں کہ جب یہ پھاٹک بند ملے تو جالیوں سے بلند آواز میں اندر پکاریئے۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔اندر سے علّامہ برزنجی تشریف لائے اور مرحبا اہلاً وسہلاً کہتے ہوئے بڑے پُرتپاک انداز میں ملے۔

امام غزالی

نام محمد، لقب حجۃ الاسلام اور شہرت امام غزالی سے ہے۔فلسفہ، کلام، منطق وغیرہ کے امام تھے۔فلسفۂ یونان کے مقابلے میں فلسفۂ غزالی مستقل ایک فلسفہ ہے۔فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ یونان و باطل ادیان کے آمیزش سے الگ تھلگ کیا۔ آخری عمر میں تصوف کی طرف جب مائل ہوئے تو امامِ تصوف ہو کر رہ گئے۔ کیمیائے سعادت، احیاء العلوم، مکاشفۃ القلوب وغیرہ درجنوں عالمگیر شہرت کی حامل کتابیں یادگار چھوڑیں۔روئے زمین پر امام غزالی کے بعد پھر کوئی دوسرا غزالی اب تک پیدا نہیں ہوا۔

عصر کی نماز ہم نے امام غزالی کے مرقد انور کے پاس پڑھی وہاں سے نکل کر ہم کاظمین پہنچے۔ جہاں پر حضرت امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور آپ کے پوتے حضرت امام محمد جواد تقی بن امام رضا بن امام موسیٰ کاظم کے مزارِ پُرانوار ہیں۔خاندانِ نبوت کے ان عظیم ترین شہزادوں کی نسبت ہی سے اسے کاظمین کہتے ہیں۔انھیں کی نسبت سے بغداد کے بہت مشہور محلہ کا نام بھی کاظمیہ ہے۔سوق الکاظمیہ وہاں کی مشہور اور سستی مارکیٹ بھی ہے۔ان شہزادگانِ عالی وقار کے روضے کی سج دھج کا عالم یہ ہے کہ۔

ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے

بغداد شریف کے اندر اتنا عظیم الشان اتنا پُرشکوہ، اتنا عریض اور بے نظیر روضہ جہاں سونا ہی سونا نظر آتا ہو کوئی دوسرا نہیں گلشن زہرا کے پھولوں کی یہ سج دھج تو ہونی ہی چاہیے۔

کیا بات رضا اس چمنستانِ کرم کی　　　زہرا ہے کلی جس میں حسین اور حسن پھول

حضرت امام قاضی ابو یوسف

حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عظیم الشان و پُرشکوہ روضہ پاک کے سامنے حضرت امام قاضی ابو یوسف کا مزارِ پُرانوار اور آپ کے نام سے موسوم جامع امام ابو یوسف ہے۔ حضرت قاضی ابو یوسف علیہ الرحمہ فقہ حنفی کے ایک بڑے زبردست امام، امامِ اعظم ابوحنیفہ کے جلیل القدر شاگرد، عہدِ عباسی کے قاضی القضاۃ اور بڑے ہی صاحبِ فضل و کمال بزرگ ہیں۔فقہ حنفی کی تدوین وترتیب اور عالمِ اسلام کے زیادہ تر ملکوں میں اسے عملاً نافذ کرنے میں آپ کی خدمات

بہت نمایاں ہیں۔

یوں تو حضرت امامِ اعظم کے سیکڑوں شاگرد تھے جو سب اپنی اپنی جگہوں پر مہہ ونجوم تھے لیکن تلامذہ کے اس ہجوم میں حضرت امام ابو یوسف، حضرت امام محمد، حضرت امام زفر کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اصحابِ فضل و کمال کی تاریخ میں یہ حضرات امامِ اعظم ابو حنیفہ کی جلالتِ علمی کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔ حضرت امامِ اعظم کو بھی ان پر ناز تھا۔ بہت سارے اجتہادی مسائل میں انھوں نے اپنے استاذ سے اختلاف بھی کیا۔ اور دلائل و براہین کی روشنی میں اپنے عظیم ترین استاذ سے اپنے موقف کی تائید بھی حاصل کی۔ حق واضح ہوجانے کے بعد امامِ اعظم نے اپنے شاگردوں کے موقف کو قبول بھی فرمای۔ دعائیں بھی دیں، تحسین بھی فرمائی۔ چونکہ ہم سب خود حنفی المذ ہب ہیں، اس لیے فقہ حنفی کے ایک عظیم امام کی بارگاہِ عالی میں حاضری کے وقت دلوں کی کیفیت بھی بڑی عجیب تھی۔

ان کے مرقد انور پر ایک ایسا جھومر لگا تھا کہ اس طرح کا جھومر اب تک ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے ساتھ تبلیغ سیرت کے سرگرم رکن جناب معین الدین شیخ اجمیری بھی تھے جو مقاماتِ مقدسہ کی تصویر کے لیے کیمرہ ساتھ میں لیے تھے انھوں نے فوراً اسے کیمرہ کی آنکھوں میں محفوظ کرلیا۔

صالح نوجوان

ہمیں جانا تو اور جگہوں پر بھی تھا۔ کچھ مارکیٹنگ بھی کرنی تھی۔ وہ ہمارا آخری دن بھی تھا۔ دن کا آخری حصہ بھی۔ ہماری گاڑی کا مالک روزے سے تھا اس کے معلق معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ روزہ ہی رکھتا ہے۔ بڑا نورانی چہرہ، نوجوان باریش۔ ہم نے پوچھا کہ افطار کہاں کروگے۔ اس نے کہا کہ ہمارا ایک گھر بغداد میں بھی ہے اگر آپ لوگ اجازت دے دیں تو ہم آپ لوگوں کو جہاں کہیں چھوڑ آئیں اور افطار گھر پر کرلیں۔ چنانچہ ہم لوگ وہیں سے اپنی قیام گاہ المنصور میلیا آئے۔ 80 دینار کے بجائے 100 دینار دیتے ہوئے کہا کہ یہ 20 دینار نذرانہ ہے خوش ہوکر دُعائیں دیتا ہوا بڑی اپنائیت کے ساتھ رخصت ہوا۔

ہوٹل میں مغرب کی نماز پڑھی اور ٹیکسی کر کے ہم پھر سوق الکاظمیہ آئے۔ بغداد میں یہ ایک اچھی اور معتدل مارکیٹ ہے۔ سوق المنصور تو بڑے لوگوں کی مارکیٹ ہے۔ الرشید بھی غنیمت ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور عام طور پر باہر کے لوگوں کو خریداری کے لیے انھیں مارکیٹوں سے خریداری کا مشورہ دیتے ہیں۔ اسے اپنے یہاں بمبئی کا بھنڈی بازار سمجھیے۔ سوق الکاظمیہ سے چند ضروری چیزیں لے کر ہم سیدھے حضور سیّدنا غوث پاک کے آستانۂ کرم پر پہنچے۔ ہماری نصیبے کی ارجمندی کہیے کہ مرقد انور کا خصوصی دروازہ تبلیغ سیرت کے لیے خصوصی طور پر ایک بار پھر کھل رہا تھا 1 بجے کا وقت مقرر تھا۔ پیر طریقت حضرت مثنّی میاں اشرفی جیلانی پورے مزار شریف کے لیے ایک بڑا خوبصورت غلاف لے کر گئے تھے اور ساتھیوں کے پاس مرقد انور پر پیش کرنے کے لیے چادریں تھیں۔ وقت پر تو ہم بھی پہنچ گئے تھے لیکن آستانہ شریف کے باہر کچھ تبرکات لینے میں

وقت لگ گیا۔ پچھلے مارکیٹ سے نکل کر روڈ پر کھجور کی ایک بڑی ڈکان ہے۔ وہاں پر کھجوریں اچھی ملتی ہیں۔ میں دو سال سے وہیں پر خریدتا ہوں۔

میں نے گیارہ دینار کا کھجور خریدا کہ اس پر مواجہہ اقدس کے اندر فاتحہ پڑھوں گا اور اسی کو ہندوستان میں دوست و احباب کے لیے لے جاؤں گا۔ دُکاندار کو جب میں دینار دینے لگا تو اس نے مجھے غور سے نیچے سے اوپر تک دیکھا اور عربی زبان میں پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

غوث کا کرم

میں نے کہا کہ میں مؤتمر اسلامی میں شرکت کے لیے ہندوستان سے آیا ہوں۔ صبح ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہندوستان لوٹ جاؤں گا۔ ہندوستان کا نام سن کر وہ بہت زیادہ خوش ہوا۔ پیسہ واپس کر دیا۔ میں نے دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے دیا تو اس نے سرکار غوث پاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ شیخ گیلانی کے صدقے میں آپ ہماری طرف سے یہ تحفہ قبول فرمالیں اور جب ہندوستان جائیں تو ہماری طرف سے ہندوستان کے تمام مسلمان بھائیوں کو سلام وتحیات پیش کریں۔ اس تحفۂ محبت کو قبول کرنے کے لیے بہت بڑا وسیلہ پکڑا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور بھاگتا ہوا جب اندر آیا تو عوامی بھیڑ کو روکنے کے لیے وہ اہم دروازہ بند ہو چکا تھا جس کے اندر سیّدنا سرکار غوث اعظم آرام فرما ہیں۔ میں دھک سے رہ گیا۔ لیکن اندر سے ہمارے ساتھیوں کی آنکھیں جالیوں سے نگراں تھیں۔ جوں ہی چوکھٹ کے قریب پہنچا اندر سے دروازہ تھوڑا سا کھلا مجھے اندر لے کر فوراً اندر سے بند کر دیا گیا۔ مرقد انور سے پرانا غلاف اور چادریں اتاری جا چکی تھیں۔ نیا غلاف اور نئی نئی چادریں پیش ہو رہی تھیں۔ خواص کے اس اہم اجتماع میں میرے آقا نے مجھے بھی اپنے قدموں میں کھڑے ہونے کی جگہ عطا فرمادی۔ ہمارے سب ساتھی اپنے نصیبے کی سرفرازی پر نازاں تھے۔ تمام لوگ تقریباً اس عظیم اعزاز پر آل انڈیا تبلیغ سیرت کے شکر گزار تھے اور بڑی رقّت قلب کے ساتھ تبلیغ سیرت کے فروغ کے لیے دُعائیں والتجائیں کر رہے تھے۔

حضرت مولانا مفتی اشرف رضا، حضرت مثنیٰ میاں، حضرت مولانا اطہر حسین رضوی، الحاج رشید طیب، حضرت مولانا احمد اللہ خاں عزیزی اور سیٹھ بشیر احمد خاں (بنگلور)، مولانا فیض احمد فیض، مفتی سلیم اختر، مولانا عرفان احمد وغیرہ پر بڑی رقّت طاری رہتی تھی۔ بنگلور کے عزیز احمد سیٹھ تو تبلیغ سیرت کے انتہائی ممنونِ کرم تھے کہ اس جماعت کے طفیل مولیٰ عزوجل نے وہ عزت وتوقیر اور بارگاہِ غوثِ اعظم میں وہ قربِ خاص عطا فرمایا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مقام ومرتبہ، یہ سرفرازی وسربلندی روپے پیسے سے نہیں ملتی بلکہ یہ تو خاص سلطانِ عالم سیّدنا سرکار غوثیت کبریٰ کی عطائے خسروانہ ہے۔

طلب کا منہ تو کس قابل ہے یا غوث　　مگر تیرا کرم کامل ہے یا غوث!

ہم سب کافی دیر تک (کہ یہ آخری حاضری ہے) حاضر بارگاہ رہے۔ کسی طرح جی ہی نہیں بھرتا تھا، مقدس جالیوں

کو چومتے، آنکھوں سے لگاتے اور خوب عطر پاشی کرتے رہے۔ وہیں پر تو دلوں کے سارے درد جاگ اُٹھتے ہیں۔ بے چینیاں کروٹیں بدلنے لگتی ہیں اور تمنّائیں نا آسودگی کی لذتوں کے نئے نئے مراحل میں داخل ہو جاتی ہیں۔ اشکبار آنکھوں سے کپکپاتے ہونٹوں سے اپنے آقا کی چوکھٹ کو چومتے ہوئے باہر نکلے تو دیکھا کہ بھائی معین الدین شیخ اجمیری ایک خوبصورت وجیہہ باشرع نوجوان کو لیے میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ انھوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ تبلیغ سیرت کے نائب صدر مولانا وارث جمال قادری ہیں۔ انھوں نے مرحبا اہلاً وسہلاً کہتے ہوئے گلے لگالیا، بڑا پُرتپاک مصافحہ کیا اور ہمیں لیے ہوئے سیدھے لنگر خانہ میں پہنچے۔ غوثِ اعظم کے لنگر خانہ کے وہ ناظم تھے۔ انتہائی صالح متقی و پرہیز گار نوجوان۔

غوث کا لنگر

بار بار کی حاضری کے باوجود مجھے اب تک لنگر خانہ کے کھانے کی سعادت حاصل نہیں ہوسکی تھی۔ میں نے اس تبرک کے لیے اپنی خواہش کا اظہار کیا، حالانکہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ وہاں کا دستور ہے کہ دوپہر میں یخنی پلاؤ اور رات میں گوشت روٹی دیتے ہیں۔ یہ لنگر عام ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ سال میں ایک دن بھی ناغہ نہیں ہوتا۔ روزانہ عام دنوں میں بارہ فربہ تندرست دنبہ ذبح ہوتے ہیں۔ انھوں نے پہلے لنگر خانے کی عمارت، اس کے گوڈاؤن اور رات ہی میں ذبح ہوتے ہوئے دنبے دکھائے اس کے بعد وہ گوشت روٹی لے کر آئے۔ ہم تو صرف چند لقموں کی امید لگائے ہوئے تھے لیکن یہاں تو پورا کئی آدمیوں کا کھانا آ گیا۔ اسی درمیان حضرت مثنیٰ میاں قبلہ بھی تشریف لے آئے، کہنے لگے بیٹا بڑے خوش نصیب ہو کہ اتنی رات گئے بھی لنگر شریف مل گیا۔ حضرت بھی خوش ہو کر بیٹھ گئے ناظم مطبخ خوش ہو کر اِدھر اُدھر سے روٹیاں اور گوشت لاتے رہے۔ ہم سبھوں نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا۔ ناظمِ مطبخ نے بتایا کہ عین جنگ کے دوران جب کچھ دنوں کے لیے چاول کی بڑی قلّت ہوگئی تھی اور پورے بغداد میں کہیں چاول نہیں ملتا تھا اس وقت پورا گوڈاؤن چاول سے بھرا تھا۔ ہزاروں بورے چاول، لنگر کا کوٹہ بڑھا دیا گیا۔ دونوں وقت شہر کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد آستانۂ غوث پاک کا کھانا کھاتی تھی۔ گویا سرکار غوث پاک نے پورے شہر کی میزبانی قبول فرمائی۔ ایک داتا کا دربار تھا اور دونوں وقت کھانے والوں کا اژدھام، وہاں سے فارغ ہو کر ہم سیدھے اپنے ہوٹل آ گئے کہ صبح ہی ہمیں روانہ ہو جانا تھا۔

مقاماتِ مقدسہ

سرزمین عراق تو مقاماتِ مقدسہ کا خزانہ ہے۔ اسلام کی بڑی بڑی نامور ہستیاں اور کئی پیغمبرانِ عظام وہاں آرام فرما ہیں۔ کوفہ، بصرہ، موصل، نینوا، کربلا، نجف، قادسیہ، سلمان پاک، سامرہ وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے یہاں صرف انھیں مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں ہم خود حاضر ہوئے۔

21 جنوری کی صبح میں ہمیں ہوٹل چھوڑ دینا تھا۔ صبح 9 بجے ہی بس ہوٹل میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ بڑی عالیشان، دیدہ

زیب اور آرام دہ بس! ہم لوگوں نے وزارتِ اوقاف کے ذمہ داروں سے کہا کہ یہاں سے ہماری بس باب الشیخ جائے گی۔ ہم بغداد شریف کو الوداع کہنے سے پہلے پھر سرکار غوثِ اعظم میں حاضر ہونا چاہتے ہیں صرف چند منٹ کے لیے، وہ سب راضی ہو گئے۔ ہوٹل سے نکلتے نکلتے گیارہ بج گئے۔ چند منٹ میں ہم باب الشیخ پہنچ گئے۔ جیسے ہی ہم لوگ بڑے گیٹ کے قریب پہنچے اُدھر سے حضرت سیّد عبدالوہاب صاحب خطیب و امام جامع قادریہ تشریف لا رہے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے اور سبھوں کو لے کر بارگاہِ غوثِ اعظم میں پہنچے۔ فاتحہ خوانی کرتے ہوئے جو انھوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو انوار برسنے لگے۔ بڑی رقّت کے ساتھ ہم لوگوں کے لیے ہندی مسلمانوں بلکہ سارے عالمِ اسلام کے لیے انھوں نے بڑی پُرخلوص دعائیں مانگیں۔ کہاں بس صرف پانچ منٹ کے لیے رکی تھی اور کہاں تقریباً آدھا گھنٹہ مواجہہ اقدس ہی میں لگ گئے۔ وہاں سے نکل کر سامنے خانقاہِ قادریہ ہے، وہاں حضرت نقیب الاشراف سیّد یوسف گیلانی وسیّد احمد ظفر گیلانی سے ملنے کے لیے پہنچ گئے۔ حضرت نقیب الاشراف کو جب معلوم ہوا کہ ہم لوگ الوداعی ملاقات کے لیے حاضر ہوئے ہیں تو شہزادگانِ غوث الوریٰ نے ہم میں سے ہر ایک کو گلے لگاتے ہوئے مصافحہ فرمایا اور خصوصی دعاؤں سے نوازتے ہوئے رخصت فرمایا۔ وہاں سے رخصتی بڑی رقّت انگیز تھی۔ تقریباً 12 بجے آستانۂ غوث الوریٰ سے ہماری بس واپسی کے لیے روانہ ہوئی۔ تمام عراقی آفیسروں نے بڑے خلوص کے ساتھ اس معذرت کے ساتھ رخصت کیا کہ اگر خدمت میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو تو معاف فرمائیں۔

واپسی کا سفر

21 جنوری 1992ء کو 12 بجے بغداد سے نکل کر عمان تک ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے رات 12 بجے عمان پہنچے۔ بس ہمیں لے کر عالیہ ہوٹل پہنچی۔ رات بے حد سرد تھی۔ حکومتِ عراق کے ذمہ دار پہلے ہی سے استقبال کے لیے موجود تھے۔ پہنچتے ہی انھوں نے اس عالیشان ہوٹل میں کمرہ بک کرائے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں منتقل ہو گئے، اس کے بعد کھانا کھا کر عشاء کی نماز پڑھی اور سو گئے۔ رات ہی میں ہمیں بتا دیا گیا تھا کہ ٹھیک 11 بجے ائیر پورٹ کی گاڑی لینے کے لیے ہوٹل آجائے گی صبح آٹھ بجے معین الدین شیخ اجمیری نے بتایا کہ ابھی ایک ٹیکسی ڈرائیور سے معلوم کر کے آئے ہیں کہ یہاں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مرقد انور بہت قریب ہے، آنے جانے میں ایک گھنٹہ لگے گا۔ وہ لے جانے کے لیے تیار ہے۔

ہم لوگ دل مسوس کر رہ گئے کہ کاش یہی بات رات ہی کو معلوم ہو گئی ہوتی تو اوّل وقت فجر پڑھ کر وہاں حاضری کے لیے روانہ ہو جاتے اور اپنے وقت پر واپس بھی ہو جاتے۔ لیکن صرف احتیاط کے پیشِ نظر کہ خدانخواستہ اگر کہیں گاڑی ہی راستے میں خراب ہو گئی تو پلین مِس ہو جائے گا، اس کے بعد وہاں سے چار دن بعد پلین تھا اور پھر ایک اولوالعزم پیغمبر کی بارگاہ میں اتنی رواں دواں حاضری بھی مناسب نہیں سمجھی گئی۔ اگر مولیٰ عزوجل کو منظور ہوا تو آئندہ ضرور کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

چنانچہ وہاں کی حاضری کا ارادہ منسوخ کر کے ہم لوگ عالیہ ہوٹل سے ۱۱ بجے چل کر عمان کے عالیہ ائیر پورٹ پر آ گئے۔ تمام قانونی مراحل سے گزرنے کے بعد ہم عمان سے روانہ ہو کر یمن کی راجدھانی صنعاء پہنچے۔ اتفاق سے یمنی ایرویز کی کوئی گاڑی ائیر پورٹ سے ہوٹل لے جانے والی موجود نہیں تھی۔ ائیر پورٹ کے حکام نے فوراً پرائیوٹ گاڑیوں کا انتظام کیا اور مغرب کی نماز کے وقت ہم یمن کے بے حد خوبصورت اور عالیشان ہوٹل حدا میں پہنچے۔ یمنی حکومت عراق سے واپسی میں کافی اعزاز کے ساتھ پیش آئی۔ رات کے کھانے میں بھی بڑا اہتمام کیا۔ ہوٹل کا سارا عملہ بڑا مؤدب تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے انھیں اس کے لیے خصوصی ہدایت دی گئی ہو۔ یہ سب صدقہ تھا حضور سیّدنا غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا۔ کہ سرکار نے اپنے ملک کے لیے تبلیغ سیرت کی پُرخلوص خدمات کو قبول فرمایا۔ اپنا بابِ رحمت وا کیا۔ غلاموں کے طویل فہرست میں ہم لوگوں کو بھی جگہ عطا فرمائی اور خاص اپنے مواجہہ اقدس میں کھڑے ہونے کی سعادت بخشی۔ اپنی مقدس چوکھٹ کو چومنے کا اعزاز عطا فرمایا ورنہ اپنی حیثیت ہی کیا تھا۔ اپنی مثال تو بس یوں سمجھیے کہ ؎

بنا ہے شہر کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

حدا ہوٹل میں مغرب کی نماز پڑھ کر مقامی ٹورسٹ کے آفس میں پہنچے کہ صبح اوّل وقت میں فجر کی نماز کے بعد اگر کوئی گاڑی مل جائے تو ہم لوگ یمن کے اہم تاریخی مقامات اور مقدس مقامات کی زیارتیں کرتے بالخصوص مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبل اور خیر التابعین حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

ہمارے پاس دوسرے دن 3 بجے تک ٹائم تھا کہ 3 بجے ہمیں یمن کے صنعاء ائیر پورٹ پر پہنچنا تھا اس دوران ہم جہاں تک پہنچ سکتے تھے وہاں پہنچتے۔ ٹورسٹ آفس میں معلوم ہوا کہ یہاں کے تمام مقدس و تاریخی مقامات شہر سے کافی دور واقع ہیں۔ 180-120 کلومیٹر سے کوئی کم نہیں اور پھر راستہ بڑا ٹیڑھا میڑھا بلند و پُر پیچ پہاڑیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ کوئی گاڑی 40 کلومیٹر کی رفتار سے زیادہ ان راستوں پر نہیں چلتی۔ بہت جلدی کرنے پر بھی شام چھ بجے سے پہلے واپسی ممکن ہی نہیں۔ تما ساتھی دل مسوس کر رہ گئے۔ یہ سوچ کر خاموش ہو گئے کہ چلو نصیبے نے اگر یاوری کی تو کوئی نہ کوئی موقع ضرور ہاتھ آئے گا۔

چنانچہ ہم لوگ اپنے اپنے کمروں میں کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ صبح ناشتے کے بعد صنعاء شہر دیکھنے کے لیے نکل کھڑے ہوئے کچھ لوگوں کو چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں بھی لینی تھیں۔ اس بار ہم نے صنعاء شہر کو بڑے قریب سے دیکھا۔ کافی اچھا شہر ہے اور ایک ملک کے کیپٹل کو جس طرح ہونا چاہیے اس طرح صنعاء یمن کی راجدھانی ہے۔ وہاں کے لوگ بھی کافی با اخلاق، نرم دل، نرم خود کھائی دیئے۔ جس بھی دُکان میں یا شوروم میں گئے مؤتمر عالمی اسلامی کا بیج دیکھ کر وہ بچھ جاتے۔ اہل عراق اور اس کے قائد مردِ آہن صدام حسین کے لیے وہاں کے عوام میں عقیدت و محبت کا بڑا

شدید جذبہ پایا گیا۔ کپڑے وغیرہ کی مہنگائی اپنے ہندوستان ہی کی طرح ہے۔ البتہ الکٹرونک سامان کافی سستا ہے۔ ہندوستانی سکّہ اور یمنی سکّہ تقریباً برابر ہے۔ ہندوستان کے لیے بھی وہاں کے عوام میں اچھے جذبات پائے گئے۔ چونکہ ہمیں دوپہر ہی میں حدا ہوٹل چھوڑ دینا تھا کہ وہاں سے ائیر پورٹ کافی دور ہے۔ تیز رفتار گاڑی ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت لے لیتی ہے اس لیے ہم لوگ جلد ہوٹل واپس آ گئے۔

ایک بجے حکومت یمن کی گاڑی ہمیں لینے ہوٹل پہنچ گئی۔ ہم لوگ ظہر کی نماز پڑھ کر تیار بیٹھے تھے۔ فوراً بس پر بیٹھ کر ائیر پورٹ آ گئے۔ ہم لوگ دوپہر کا کھانا بغیر کھائے چل دیئے تھے اس لیے ساتھیوں نے ائیر پورٹ کے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ محترم الحاج رشید طیب نے وہاں پر میزبانی کا فریضہ انجام دیا۔ **فجزاہُ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔**

23 جنوری 1992ء کو عصر کی نماز پڑھ کر ہم یمنی ائیرویز کے اسی فلائٹ نمبر 727 پر سوار ہوئے جس پر ہم بمبئی سے یمن آئے تھے۔ اور یہی طیارہ ہمیں یمن سے اردن بھی لے گیا تھا۔ اسے حسنِ اتفاق ہی کہیے کہ طیارے میں عملے کے افراد بھی وہی تھے۔ اسی لیے انھوں نے طیارے میں ایسی خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا جس میں شناسائی کی جھلکیاں بھی تھیں۔ طیارے میں معلوم ہوا کہ یہ پھر ریان ائیر پورٹ پر اترے گا کہ اس میں وہاں کے مسافر بھی بیٹھے تھے۔ بڑی کوفت ہوئی کہ ایک گھنٹہ سے زیادہ پھر یہ لیٹ ہوگا کہ جہاز پر بیٹھنے کے بعد ایک ایک لمحہ بھاری معلوم ہوتا ہے اور مسافر اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور جلد سے جلد اپنی منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے بے قرار ہوتا ہے۔ لیکن خدا کا شکر کہ طیارہ واپسی میں وہاں نہیں رکا اور وہاں پر اترنے والے مسافر بھی ہمارے ساتھ بمبئی تک آئے اور پھر اسی طیارہ سے واپس ہوئے۔ ہم لوگ جب بمبئی سہار اائیر پورٹ پر اتر کر ترین چینل سے باہر نکلے تو رات کے بارہ بج رہے تھے **فالحمد للہ رب العٰلمین۔**

بڑے غور سے سُن رہا تھا زمانہ
تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

☑☑☑☑☑☑

تاریخ عزیمت

بھگوان کا آدمی

راجڈا جی! اس جماعت کا فاؤنڈر اتنا مہان تھا، اتنا مہان! کہ پھر میری آنکھوں نے اتنا مہان انسان نہیں دیکھا۔ (میڈم (یعنی وزیر اعظم اندرا گاندھی) کا داؤں دنیا کے ہر آدمی پر چل گیا مگر اس پر ان کا کوئی داؤں نہیں چلا۔ بڑی حسرت کے ساتھ کہا کرتی تھیں یشپال میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں، ملاقات کی کوئی صورت پیدا کرو۔ میڈم اور ان کے درمیان رابطے کی کڑی میں ہی تھا، وہ ہندو باڑہ راؤ کی مسجد میں ٹھہرا کرتے تھے۔ جب میں ان سے کہتا کہ میڈم آپ سے ملنا چاہتی ہیں، تو وہ ہنس کر کہتے میں اس سے مل کر کیا کروں گا۔ لیکن وہ تو آپ سے ملنا چاہتی ہیں، آپ جہاں فرمائیں گے وہ خود چل کر ملنے آئیں گی۔

لیکن میں اس سے نہیں ملنا چاہتا ہوں، تم جو ہو، اسے جو کچھ کہنا ہوتا تھا تمہارے ذریعے کہلاتی ہے کیا یہ کافی نہیں؟

راجڈا جی! آپ نے میڈم کا جاہ وجلال تو دیکھا ہی تھا۔ بڑے بڑے افلاطون اور طرم خاں قسم کے لوگ کس طرح ان کے سامنے بھیگی بلّی بنے رہتے۔ اسٹیٹس کے گورنر و چیف منسٹر اور دنیا کے طاقتور ممالک کے سفراء تک کئی کئی دنوں تک انتظار کے لائن میں ہوتے، تب جا کر کہیں تھوڑی دیر کے لیے میڈم کے دربار میں پہنچ پاتے۔

مگر بھارت کی اسی پوتر دھرتی پر ایک شخص ایسا بھی تھا جس سے ملنے اور اسے دیکھنے کی انھیں حسرت تھی اور اس سے ملنے کے لیے وہ کوشاں بھی رہا کرتی تھیں، مگر وہ شخص ان سے کبھی ملنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔

فقیر رہگذر جب اپنا دامن جھاڑ کر اُٹھا
تماشا دیکھتے ہی رہ گئے اہلِ کرم کہتے تو کیا کہتے

جب وہ کسی معاملے میں (یعنی قومی وملّی مسئلے میں) بہت سخت ہو جاتے تو میڈم مجھے فوراً بلاتیں اور کہتیں، یشپال تم فوراً جاؤ اور کسی طرح اسے اس معاملے میں نرم کرو، سمجھاؤ، میری مجبوریاں اس کے سامنے رکھو، اگر وہ نرم نہیں ہوا تو میرے لیے پریشانیاں بہت بڑھ جائیں گی۔ میں آکر اس مسئلے میں میڈم کی طرف سے باتیں کرتا، معاملے کی اونچ نیچ سمجھاتا۔ میڈم کی طرف سے گذارش کرتا، ان کی مجبوریاں سامنے رکھتا، بنتی اور منت وسماجت کرتا۔ جسے سن کر کبھی خاموش ہو جاتے اور کبھی غصے میں جھڑک دیتے۔ ڈر، خوف، گھبراہٹ، لالچ، جھوٹ، فریب یہ کس چڑیا کا نام ہے جیسے کہ وہ جانتا ہی نہ ہو۔ وہ تو ایک دیوتا تھا دیوتا! جب تک وہ دلی میں رہتے، میں روزانہ اشنان کر کے ان کے درشن کرنے جاتا، پھر اس کے بعد مندروں کو جاتا۔ وہ دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتا تھا، نہ دبتا تھا، نہ کوئی خوف ولالچ اسے اپنی جگہ سے ہلا سکتی تھی۔ بھگوان کا دیا ہوا اس کے پاس بہت کچھ تھا بلکہ وہ خود صاحبِ اسٹیٹ تھا۔ راجڈا جی! وہ تو اس دنیا کا آدمی ہی نہیں تھا بلکہ وہ بھگوان کا آدمی تھا بھگوان کا! غالباً ۱۹۹۱ء کی بات ہے کہ ہم یعنی راقم الحروف محمد وارث جمال قادری رضا جامع مسجد پھول گلی سیّد ابوالھاشم

اسٹریٹ ممبئی کے خطیب وامام مولانا سیّد سراج اظہر رضوی، میرے رفیق دیرینہ باتھ اصلی سیتا مڑھی بہار کے مولانا قاری اظہر حسین رضوی اور ہندوستانی سیاست کے ایک بڑے دبنگ قدآور اور جنتا دل کے بانی لیڈر رتن سنگھ راجڈا ساؤتھ ممبئی، جو اب آنجہانی ہو چکے ہیں، دلی پارلیمنٹ ہاؤس کے ایک پُرسکون گوشے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہم لوگ جب بھی جاتے اور راجڈا صاحب ہوتے، جو اکثر ساتھ ہوتے تو پارلیمنٹ ہاؤس لے کر ضرور جاتے اور چائے اسی خاص گوشے میں بیٹھ کر پی جاتی۔ ان کا کہنا تھا کہ دس سال تک یہ گوشہ راجڈا کارنر سے مشہور تھا کہ اپنا سالہ ایم پی پیریڈ میں اپنے دوست واحباب کے ساتھ یہیں بیٹھ کر چائے پیتے۔ اس جگہ سے وہ بہت مانوس تھے چنانچہ وہ پارلیمنٹ ہاؤس میں اس جگہ علی العموم اپنے احباب کے ساتھ بیٹھتے۔ ابھی ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ اسی درمیان ایک شخص پرانی وضع کی قمیض اور ڈھیلا سفید ازار پہن کر پشت پر ایک جھولا لیے داخل ہوا۔ راجڈا صاحب نے اس آنے والے کی طرف میری توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا، مولانا وارث جمال صاحب! یہ شخص جو ابھی پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل ہوا ہے اسے آپ جانتے ہیں؟ میں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا آپ نے یشپال کپور کا نام سنا ہے۔ میں نے چونکتے ہوئے کہا راجڈا صاحب! اس نام کو بھلا ہم جیسے لوگ نہیں جانیں گے تو کون جانے گا۔ آپ اسی یشپال کپور کی بات کر رہے جو ہندوستان کی سب سے طاقتور ترین وزیر اعظم جس کے سامنے اچھی اچھی زبانوں میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی تھی، بڑے بڑے قدوالے بونے نظر آنے لگتے مگر یشپال کپور ایسے عالم میں اندرا گاندھی کی آنکھ، کان اور زبان ہوا کرتا تھا۔ خاص کر اقلیتوں کے معاملے میں غالباً اندرا گاندھی کے زمانے میں اقلیتی امور کا انچارج بھی وہی تھا۔

اچھا تو آپ یشپال کپور کو اس حد تک جانتے ہیں، تو پھر یہ وہی یشپال کپور ہے جس کو دور سے آپ اس حد تک جانتے ہیں، تو کیا آپ لوگ اس سے ملنا پسند کریں گے۔ ہم تینوں نے اک زبان ہو کر کہا کہ ضرور ضرور ہم ایسے آدمی سے ملنا اور اسے قریب سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

رتن سنہ راجڈا نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دی، یشپال کپور یہاں آؤ۔ اس نے خود اپنا رخ ہم لوگوں کی طرف کرتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم لوگوں کے قریب آیا۔ ہم لوگ حیرت وشوق سے اس شخص کو اپنی طرف آتا دیکھنے لگے جو کبھی اندرا گاندھی کا اعتماد ہونے کے سبب ہندوستانی سیاست کدے کا ایک مردِ آہن ہوا کرتا تھا۔ جس کا ایک جنبشِ لب قد آوروں کو بونا اور بونوں کو قد آور بنا دیتی تھی۔ ایم ایل اے وایم پیز کا ذکر ہی کیا، بڑے منسٹران و چیف منسٹران و گورنر صاحبان وغیرہ کو بھی اسے ناراض کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ جب وہ ہم لوگوں کے قریب آیا تو آداب کرتا ہوا سب سے پہلے رتن سنہ راجڈا سابق ایم پی کا پیر تین بار چھوا، پھر ہم لوگوں سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا۔ راجڈا صاحب نے ہم لوگوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یشپال جانتے ہو تم کس سے مل رہے ہو۔ یہ خدا کے بندے لوگ ہیں (علماء کرام کے لیے راجڈا صاحب کی یہ خاص اصطلاح تھی)

خدا کے بندے تو آپ لوگ بھی ہیں۔ کہنے لگے نہیں نہیں، جس طرح آپ لوگ خدا کے بندے اس طرح ہم لوگ

کیسے خدا کے بندے ہو سکتے ہیں۔ یشپال کپور تم جانتے ہو یہ کون لوگ ہیں۔ یہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے مولانا لوگ ہیں، کانگریس کا بیڑہ غرق کرنے میں جن کا بڑا ہاتھ ہے ورنہ اکیلے جنتا دل کے بس کی بات نہیں تھی۔

میرٹھ ملیانہ اور بھاگل پور میں فسادات کے بہانے مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور اجتماعی نسل کشی نے انسانیت کے دردمند طبقے کو لرزا دیا تھا۔ علماء دین مسلمانوں کے تعلق سے جن پر سب سے زیادہ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ خود بہت بے چین تھے۔ ممبئی و مضافات ممبئی و بھیونڈی وغیرہ کے سنّی علماء کرام و ائمۂ مساجد نے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بینر تلے ایک سنّی ریلیف کمیٹی قائم کی، جس میں لاکھوں روپیے کے اسباب اور روپیے جمع کر کے مظلومین تک پہنچائے۔ جس میں نمایاں خدمت حضرت علّامہ ظہیر الدین قادری صدر دار العلوم محمدیہ، مولانا عبد القدوس کشمیری، مولانا سیّد سراج اظہر رضوی، مولانا قاری غیاث الدین مینارہ مسجد وغیرہ نے انجام دیے۔ دار العلوم محمدیہ کے اساتذہ و علماء کرام اور اس کے سربراہِ اعلیٰ و بانی اشرف العلماء حضرت علّامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی وغیرہ نے بڑا مرکزی کردار ادا کیا، خود عارفِ حق حضرت ٹوپی والے بابا صاحب قبلہ سرپرست آل انڈیا تبلیغ سیرت زندگی میں پہلی بار اپنے محلے میں مخیر مسلمانوں کے پاس بھاگل پور، سیتامڑھی، سہسرام، میرٹھ و ملیانہ کے مظلومین کے لیے نکلے۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے پرچم تلے علماء کرام و ائمۂ مساجد مذکورہ مقام تک بہت بڑے پیمانے پر امداد مظلومین و مستحقین تک پہنچائے۔ ان مذکورہ مقامات پر فسادات میں پولیس و پی اے سی کی ننگی جارحیت اور کانگریس حکومت کی معنی خیز خاموشی ہی نہیں بلکہ کھلی چھوٹ پر مسلمانوں کے قلوب بہت زخمی تھے، خصوصاً سنّی علماء دین و ائمۂ مساجد و عمائدین شہر بہت بے چین کہ اسی درمیان پارلیمنٹ کے الکشن کا اعلان ہو گیا، یہ نومبر ۱۹۸۹ء کے آخری عشرے میں پڑا۔ مسلمانوں کی کانگریس سے برہمی کو دیکھ جنتا دل ہائی کمان کے مشورے سے ساؤتھ ممبئی حلقے کے ایم پی جناب رتن سنہ راجڈا جو جنتا دل کے بانی لیڈروں میں تھے، انھوں نے ممبئی کے سنّی علماء کرام سے رابطہ قائم کیا۔ راجڈا صاحب ایک بلند کردار، بے داغ، حساس اور حقیقتاً ایک سیکولر لیڈر تھے۔ اس سے پہلے بھیونڈی فساد پر مسلمانوں پر ٹوٹے اک طرفہ مظالم پر انھوں نے پارلیمنٹ کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ہر نازک موقع پر ان کی آواز مظلوموں کی حمایت میں سنی جاتی رہی، اس لیے ان کے لیے مسلمانوں کے دلوں اور خود مسلمانوں کی مذہبی قیادت میں نرم گوشے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے کانگریس کے خلاف ممبئی کی مذہبی قیادت سے مدد مانگی تو سنّی علماء کرام و ائمہ مساجد فوراً تیار ہو گئے اور تقسیمِ ملک کے بعد پہلی بار اجتماعی طور پر سنّی علماء و مشائخ اپنی اپنی مساجد و خانقاہوں، درگاہوں اور گوشۂ تنہائی سے باہر نکلے اور اشرف العلماء حضرت علّامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی کی قیادت میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے پلیٹ فارم سے کانگریس کے خلاف بڑی زبردست اور موثر تحریک چلائی گئی، جس سے کانگریس کے ظلم کی کشتی ڈبونے میں ایک بڑی کامیابی ملی اور کانگریسی ظلم و بربریت کے بڑے بڑے بت اوندھے منہ گر گئے اور کانگریس ایک تاریخی ذلّت و رسوائی اور شکست و ریخت سے دوچار ہوئی، جس کے بعد پھر آج تک اسے سیاسی استقرار نصیب نہیں ہوا۔ جس کی ایک بڑی تفصیل ہے، سر دست اس کی یہاں گنجائش نہیں اور اس پورے طویل عمل میں خاکسار راقم الحروف وارث جمال قادری اپنے علماء

کے شانہ بشانہ رہا اور شروع سے تبلیغ سیرت سے جڑا رہا۔ اور یہیں سے آل انڈیا تبلیغ سیرت پھر ایک بار نئے سرے سے سیاسی پارٹیوں کی نگاہوں میں آئی۔ جنتا دل تو بہت جلد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر بکھر گیا، مگر رتن سنہ راجڈا پوری قوت سے ہمارے ساتھ جڑے رہے۔ انھیں علماء اہلِ سنّت کی خدمات کا احساس تھا اور اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ جب بھی کسی ملّی مسائل میں کچھ مشکلات پیش آتے تو پوری قوت کے ساتھ راجڈا صاحب سامنے آتے۔ خصوصاً شہادتِ بابری مسجد کے بعد ممبئی میں پھوٹ پڑنے والے فساد میں انھوں نے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ایک بڑا کردار ادا کیا۔ اور جب کبھی کسی قومی و ملّی مسئلے میں دلی کے سیاسی گلیاروں میں جانے کی ضرورت پیش آئی تو اپنے خرچ پر فوراً وہ تیار ملے، اس میں کبھی سستی نہیں کی۔

چنانچہ اس وقت بھی ہم لوگ ایک ملّی مسئلے میں دلی آئے ہوئے تھے اور حسب دستور راجڈا صاحب ساتھ تھے۔ حسنِ اتفاق کہ پارلیمنٹ ہاؤس میں یشپال کپور سے ملاقات ہوئی اور عند الملاقات جوں ہی راجڈا صاحب نے تبلیغ سیرت کا نام لیا وہ چونک سا گیا اور اپنے کندھے سے جھولا اتار کر ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا، مولانا صاحب! اس نام کی ایک جماعت کو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں، کہیں یہ وہی جماعت تو نہیں ہے جس کے فاؤنڈر اڑیسہ کٹک کے ایک بہت بڑے عالم مولانا حبیب الرحمٰن صاحب تھے اور وہ دلی جب آتے، باڑہ ہندو راؤ کی مسجد میں ٹھہرتے تھے۔ تو کیا آپ لوگ انھیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی جماعت آل انڈیا تبلیغ سیرت کے آدمی ہیں؟ یہ سن کر ہم سبھوں کا چہرہ خوشی سے کھل گیا اور ہم لوگوں نے اک زبان ہو کر کہا، ہاں ہم لوگ انھیں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ (جو مسلمانوں میں مجاہد ملّت کے نام سے مشہور ہیں) کی جماعت آل انڈیا تبلیغ سیرت کے آدمی ہیں۔ یہ سن کر یشپال کپور بھی بہت خوش ہوئے اور ہم سبھوں سے وہ فرداً فرداً ہاتھ ملانے لگے اور کہا تو پھر آپ لوگ بھی مہان ہی ہوں گے کہ یہ جس آدمی کی جماعت ہے اتنا بڑا اور مہان انسان میں نے دیکھا ہی نہیں۔

پھر وہ راجڈا صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے ماضی کی یادوں میں کھوسا گیا اور حضور مجاہد ملّت علیہ الرحمہ کے تعلق سے مسلسل بولتا ہی رہا اور ہم سب ہمہ تن گوش! ایسا لگا کہ ہم لوگوں سے زیادہ حضور مجاہد ملّت کو تو یہی بندہ جانتا ہے اور آخر میں اس کے ٹیپ کا بند یہ تھا، جانتے ہیں راجڈا جی کہ ایسا کیوں؟ اس لیے کہ وہ اس دنیا کا آدمی ہی نہیں تھا بلکہ ''بھگوان کا آدمی تھا، بھگوان کا آدمی۔'' یہ کہتا ہوا اپنا جھولا اٹھایا اور چل دیا۔ راجڈا صاحب بڑی حیرت و حسرت سے اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے اور جب حیرت کا طلسم ٹوٹا تو ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے، آپ لوگوں نے یشپال کپور کی باتیں سنیں، کتنی حیرت انگیز باتیں کر رہا تھا۔ یہ اپنا ملک بھی کتنا مہان ہے کہ ایسے ایسے خدا کے بندے یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ تو مولانا صاحب! کیا واقعی اس جماعت کا فاؤنڈر ایسا ہی تھا جیسا کہ ابھی یشپال کپور نے بتایا۔ ہم نے کہا راجڈا صاحب یشپال کپور نے ان کے متعلق جو کچھ بتایا وہ اپنے اعتبار سے وہ تو اس سے کہیں زیادہ اونچی چیز تھے، ہم جیسے لوگ تو ان کی عظمتوں کا اور چھور ہی بتا سکتے۔

مولانا صاحب! کیا وہ ممبئی کبھی نہیں آئے۔

وہ بار بار ممبئی آئے اور آتے رہتے تھے، کبھی کبھی تو ایک ایک ماہ رہ جاتے۔ تو آخر میں کہا تھا جوان کے درشن نہیں کرسکا، یشپال کپور ہی بڑا خوش نصیب تھا کہ وہ اشنان کر کے روزانہ ان کے درشن کو جاتا۔ راجڈا صاحب اس وقت ہم لوگوں سے آپ کی ملاقات نہیں تھی ورنہ ایک بار مل کر آپ ان سے ہمیشہ ملنے کی تڑپ رکھتے۔ ؎

اک دانش نورانی اک دانش برہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

اسی وقت مولانا سراج اظہر صاحب نے بڑی تاکید سے کہا تھا کہ مولانا اس ملاقات کی تفصیل آپ لکھ لیں ورنہ کہیں بھول نہ جائیں اور جب کبھی یہ تذکرہ نکلتا وہ پوچھتے اس واقعے کو آپ نے لکھا کہ نہیں۔

اسمِ گرامی محمد حبیب الرحمٰن۔ لقب مجاہد ملّت اور یہی لقب بمنزلہ علم ہو کر رہ گیا

مجاہد ملّت بولنے کے بعد محمد حبیب الرحمٰن بولے بغیر آپ سمجھ میں آجاتے ہیں اور مولانا حبیب الرحمٰن کما حقہٗ اسی وقت سمجھ میں آتے، جب مجاہد ملّت آپ کے نام کے ساتھ لگایا جائے۔ مذہباً سنّی، مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ ۸ر محرم الحرام ۱۳۲۳ھ مطابق ۲ر مارچ ۱۹۰۴ء بروز دوشنبہ مبارکہ بمقام دھام نگر ضلع بالیسر (اڑیسہ) پیدا ہوئے، والد محترم کا نام عبد المنان اور دادا کا نام مظہر الحق تھا۔ آپ صرف دو بھائی تھے محمد حبیب الرحمٰن، محمد مجیب الرحمٰن۔ صرف چار سال کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ تعلیم و تربیت و پرورش آپ کے چچا محترم عبد الدیان مرحوم کے ہاتھوں ہوئی۔ جب کچھ بڑے ہوئے تو کٹک کے ایک انگلش اسکول میں آپ کا ایڈمیشن کر دیا گیا، چونکہ انگریزی تعلیم میلانِ طبع کے خلاف تھا اس لیے آٹھویں کلاس سے آگے بات نہیں بڑھی۔ اس کے بعد دینی تعلیم کا انتظام گھر ہی پر کیا گیا۔ علاقائی طور پر جو قابلِ ذکر اساتذہ تھے ان کی خدمات حاصل کی گئی، مقامی اساتذہ اپنے مبلغ علم کے اعتبار سے جہاں تک تعلیم دے سکتے تھے دیے۔ چونکہ طبیعت رخاذ تھی اسے بحر ذخار چاہیے تھا اس لیے مزید تعلیم کے لیے دار الخیر اجمیر شریف، دار العلوم معینیہ عثمانیہ میں حضرت صدر الشریعہ بدر الطریقہ فقیہِ اعظم حضرت علامہ مفتی محمد امجد علی صاحب قبلہ مصنف بہارِ شریعت کی خدمت میں پہنچے۔ ۹ر برس تک وہاں حضرت صدر الشریعہ و دیگر کامل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ وہاں آپ کے رفقاء درس میں صدر العلماء امام النحو حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی شارح بخاری، محدث اعظم پاکستان حضرت مولانا سردار احمد خان، امین شریعت مفتیٔ اعظم کانپور حضرت مولانا رفاقت حسین، حافظ ملّت حضرت مولانا حافظ عبد العزیز مرادآبادی، حضرت علامہ یزدانی برادرِ اصغر حضرت شیخ العلماء علامہ غلام جیلانی اعظمی، علامہ قاضی شمس الدین جعفری، مصنف قانونِ شریعت حضرت علامہ محمد سلیمان بھاگل پوری قدست اسرارھم تھے۔

راقم الحروف وارث جمال قادری کو حضرت محدثِ اعظم پاکستان اور علامہ یزدانی کو چھوڑ کر بقیہ سبھی نفوسِ قدسیہ کی زیارت کی سعادت حاصل ہے۔ ان میں دو حضرات سے شرفِ تلمذ دینی بھی حاصل ہے، حضرت صدر العلماء اور حضور حافظ ملّت۔ حضرت علامہ جعفری کو امتحان دینے کی سعادت اور حضور مجاہد ملّت کی بارگاہ سے طویل شرفِ حضوری حاصل رہی۔ فلحمد للّٰہ رب العلمین۔

استاذی الگریم صدر العلماء حضرت علامہ میرٹھی کبھی کبھی بڑے فخر سے درسگاہ میں فرمایا کرتے تھے، لائے زمانہ میرے ساتھیوں کا جواب! پھر فرداً فرداً ہر ایک کا نام اور ان کی جلالت شان بتاتے مگر حضرت مجاہد ملّت کا نام نہ لے کر صرف مجاہد ملّت فرماتے۔ پھر آپ کا بڑے والہانہ انداز میں خصوصی ذکر فرماتے کہ ایک بڑا رئیس زادہ تھا مگر انداز فقیرانہ تھا، دل بڑا درد مند پایا تھا، ان سے میری دوستی تھی۔ فرماتے تھے پورے ۹ / برس کے عرصے میں صرف تین اسباق ناغہ ہوئے، وہ بھی مجاہد ملّت کی دوستی میں! وہ کہتا جیلانی آج کلکٹریٹ کا گھیراؤ کرنا ہے اور تمھیں میرے ساتھ رہنا ہوگا اور کبھی کمشنری کا گھیراؤ کرتا اور دوستی کی وجہ سے کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ دینا پڑتا تھا۔ جب کوئی مظلوم اس کے سامنے آکر رو دیتا کہ میرے ساتھ ایسا ظلم ہوا ہے اور جب تصدیق سے بات ثابت ہو جاتی کہ واقعی اس مظلوم کے ساتھ ایسی زیادتی ہوئی ہے تو اس وقت تک وہ انگریز کلکٹر و کمشنر کا پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک کہ انصاف نہ دلوا دیتا۔ بس انھیں کی مروت و دوستی میں پورے ۹ / برس کے عرصے میں صرف تین اسباق ناغہ ہوئے تھے۔ اس وقت میرے رفقاء درس میں پیر طریقت حضرت علامہ سیّد محمد اشرف کلیم جائسی وعلامہ مفتی محمد فاروق بریلی شریف وغیرہ تھے۔

اجمیر شریف سے فراغت کے بعد آپ استاذ الکل، صدر الافاضل فخر الاماثل سند الحکماء سلطان العلوم سیّد المفسرین حضرت علامہ مفتی سیّد شاہ محمد نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں مرادآباد پہنچے اور آپ نے حدیث وطب یونانی تکمیل فرمائی۔ فراغت کے بعد استاذ محترم حضور صدر الافاضل کے حکم پر جامعہ نعیمیہ ہی میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ خالصاً لوجہ اللہ تعالیٰ عزوجل آپ کی حسنِ خدمات سے نہ صرف جامعہ نعیمیہ بلکہ شہر واطراف وجوانب میں آپ کی دھوم مچ گئی۔

جامعہ نعیمیہ کا اپنا ایک تعلیمی بجٹ تھا، اسی کے اعتبار سے طلبا کو داخلہ ملتا۔ اس زمانے میں جامعہ نعیمیہ کی بڑی دھوم تھی۔ اس کی تعلیمی شہرت سن کر دور دور سے طلبا آجاتے اور مدرسہ کا کوٹا پورا ہو جاتا تو بادلِ ناخواستہ جامعہ ان سے معذرت کر لیتا۔ بقول حضرت علامہ قاری عبد الرب قادری حبیبی مرادآبادی، داخلہ کے لیے آنے والے طلبا کو جب اداروں کی طرف سے جواب مل جاتا تو بڑی مایوسی کے عالم میں وہ جانے لگتے، تو انھیں حضرت مجاہد ملّت اپنے پاس بلاتے اور ان کا جائزہ لیتے۔ ان میں جسے جوہر قابل پاتے کہ یہ پڑھ کر دین وسنیت کے لیے قیمتی سرمایہ بن سکتا ہے تو اسے اپنے ذاتی خرچ پر روک لیتے۔ اس طرح کے طلبا کی تعداد تیس تیس اور کبھی چالیس تک بھی پہنچ جاتی۔ شہر کے ہوٹل مالکان کو بلا کر ان کے حوالے کر دیتے کہ انھیں دونوں وقت بہتر سے بہتر کھانا دیا جائے اور مہینہ پورا ہونے پر آکر اپنا حساب لے لیا کرو۔ چونکہ انھیں معلوم کہ حضرت نہ صرف رئیس اعظم بلکہ صاحبِ اسٹیٹ بھی ہیں، اس لیے بے جھجھک ان طلبا کو بڑے عزت واحترام سے دونوں وقت کھانا پیش کرتے اور مہینہ پورا ہونے پر اپنا حساب لے کر جاتے، اور یہ مبارک سلسلہ برسوں اس وقت تک چلتا رہا جب تک آپ وہاں منصب تدریس پر جلوہ گر تھے۔

خود حضرت مولانا قاری عبد الرب علیہ الرحمہ نے اپنے انتقال کے چند سال پہلے اپنی یتیمی اور اپنی والدہ کی مظلومیت اور پھر ہمیشہ کے لیے سرکار مجاہد ملّت کے قدموں میں آنے کی تفصیل جو راقم الحروف وارث جمال قادری کو بتائی وہ بڑی

دلگداز ہے۔ اجمیر مقدس میں عرسِ پاک کے موقع پر جاڑے کی یخ بستہ طویل رات میں ایک چھوٹا سا کمرہ جہاں آپ کے تلمیذ ارشد، پیر طریقت محترم حضرت مولانا قاری عبد الرب قادری حبیبی بانی مدرسہ فیاض العلوم پکسراوان رائے بریلی بھی تھے، عشا کے بعد سے جو شروع ہوئے تو رات سسکیوں و کراہوں میں گذار دی۔ حضور مجاہد ملّت کی کرم گستریوں، نوازشوں اور آپ کے الطاف و کرم، جود و عطا، دردمندی و غم گساری و دلنوازی اور جمال و جلال کی ایسی داستان جو صرف بھیگی پلکوں سے سنی و پڑھی جا سکتی ہے۔ جب فجر کی اذان ہوئی تو اس کا پہلی بار تجربہ ہوا کہ جاڑے کی طویل رات اتنی مختصر بھی ہو سکتی ہے۔

جامعہ نعیمیہ دیوان بازار، مرادآباد میں اپنے ایثار و قربانی کی ایک تاریخ مرتب ہی کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آپ کے استاذِ جلیل اور مرشد بیعت حضرت علامہ عبد الکافی صاحب علیہ الرحمہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد کے صدر المدرسین تھے، دارالعلوم سبحانیہ الٰہ آباد اس زمانے میں ملک کے اہم ترین دینی اداروں میں ایک بڑا مشہور و عالیشان ادارہ تھا، جس میں منصب تدریس کے لیے جگہ پا جانا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ حضرت علامہ عبد الکافی کے انتقال کے بعد حضور صدر الافاضل کی اجازت کے بعد اپنے استاذِ محترم کی خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے الٰہ آباد تشریف لے گئے اور اس عظیم دینی درسگاہ کے منصب صدر المدرسین کو اپنے وجود سے زینت بخشی۔ مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں آپ کے علم و فضل کا سورج سوا نیزے پر چمکا اور دین و سنیت کے دامن میں جانے کتنے لعل و گہر ڈال دیے۔ شمس العلماء حضرت علامہ نظام الدین الٰہ آبادی، مفتیٔ اعظم اڑیسہ حضرت علامہ سیّد عبد القدوس بھدرکی، حضرت علامہ الحاج جاگیردار نعیم اللہ خاں الٰہ آبادی، حضرت مولانا معین الدین سلطان پوری، حضرت مولانا سیّد عبد الحیٔ اجمیری، خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی وغیرہ علیہم الرحمۃ والرضوان آپ ہی کی جلالت علمی کے شاہکار ہیں۔ اور شاہکار بھی ایسے کہ جس سے ایک زمانہ فیض یاب ہوا۔ ؎

کچھ نقش تیری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و سامان سہی ویران نہیں ہے

حضرت علامہ عبد الکافی، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں، شیخ المشائخ ہم شبیہ غوث جیلانی حضرت سیّد علی حسین اشرفی میاں اشرفی جیلانی، خلیفۂ اعلیٰ حضرت، قطب مدینہ حضرت علامہ ضیاء الدین مہاجر مدنی قدست اسرارہم سے مختلف سلاسل طریقت میں اجازت و خلافت عطا ہوئی مگر قادریت کا غلبہ بہت زیادہ تھا یہاں تک کہ چھ جمادی الاولیٰ ۱۹۸۱ء باندی والی مسجد ممبئی نمبر ۳ میں آپ کی روح مقدس جب قفس عنصری سے پرواز ہوئی تو آخری کلمات جو زبان پر جاری تھے وہ یہ تھے یا اللہ! یا رسول اللہ! یا غوث اعظم!

آپ کا وجودِ با مسعود مظلوموں، مجبوروں، ستم رسیدہ انسانوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے اللہ کا ایک بڑا انعام تھا۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بقا کے لیے بہت حساس و فکر مند تھے۔ یہ رباعی آپ کے بے چینیوں کی مظہر ہے، جو خود آپ ہی کی ہے۔ ؎

فکر کہ کیسے رہیں گے ہند میں ان سے کیا مطلب جواب ہیں سندھ میں

ہاتف غیبی نے دی مجھ کو صدا — سر بہ کف رہنا پڑے گا ہند میں

آپ نے مسلمانوں کی آبرومندانہ بقا، اس کے تحفظ اور دستوری حقوق کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ بقول بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ اعظمی

"سیّد التارکین، مجاہد ملّت حضرت مولانا الحاج حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار اور مقبول بندوں میں سے اور اسلام کے نام آور اصحابِ عزیمت فرزندوں میں سے تھے۔

حق و صداقت کی حمایت کے لیے کبھی انھوں نے ہمراہیوں کا انتظار نہیں کیا بلکہ یکہ و تنہا نکل پڑتے اور راہ کے تمام مصائب و آلام اور قید و بند کو مردانہ وار جھیلتے۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت انھیں کی قائم کردہ ایک تحریک تھی اور پورے ہندوستان میں اس کی ایک شان و پہچان تھی۔ مکتوب محررہ ۲۸ / مارچ ۲۰۰۲ء۔" (پیغام تہنیت برائے حج کانفرنس مجلہ ص ۱۷)

آپ کی پہلی گرفتاری انگریزوں کے دورِ حکومت میں برٹش سامراج کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کے سبب ہوئی، مگر آزاد ہندوستان میں مسلمانوں پر کانگریسی حکومت کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے اور ان مظالم کے خلاف تحریک چلانے کے سبب ۱۹۵۶ء میں پہلی گرفتاری اور حکومت کی طرف سے آپ پر مقدمہ قائم ہوا۔ پھر آپ کی گرفتاری و آپ پر مقدمہ بازی کا سلسلہ ۱۹۵۶ء سے جو شروع ہوا تو ایمرجنسی ۱۹۷۵ء میں ختم ہوا۔ انتیس (۲۹) سال کا طویل عرصے کا زیادہ تر حصہ جیل میں گذرا۔ قید و بند کی صعوبتوں اور جیل کے در و دیوار دونوں ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔

۱۹۷۵ء میں نندنی ست پتی کی کانگریسی حکومت نے جب آپ کو گرفتار کیا تو بڑی سختی برتی اور جیل میں آپ کے ساتھ یعنی کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک مذہبی مقتدا کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جو چوروں، قاتلوں، ڈاکوؤں کے ساتھ بھی نہیں کیا جاتا۔ جس کا ایک اندازہ اس سے لگائیے، جیل میں سخت بیمار ہونے پر جب آپ کو اسپتال لایا گیا تو اسپتال میں بھی آپ کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔

چراغ لالہ میں جلتا رہا یہ خون بہار
یہ اور بات ہے گلوں میں روشنی نہ ہوئی

اور یہ سلوک صرف اس لیے کہ یہ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کی بات کیوں کرتا ہے۔ بات بات میں ان کے دستوری حقوق کا حوالہ کیوں دیتا ہے۔ نہرو، پٹیل، گاندھی و دیگر بڑے بڑے کانگریس کے سیاسی بتوں کو تنقید سے بالاتر کیوں نہیں سمجھتا ان کے آگے دن کی روشنی میں نیاز سجود کیوں نہیں لٹاتا، یہ اور کانگریسی ملاؤں کی طرح حکومت سے اپنے منہ بھرائی کی قیمت بطور خیرات کیوں نہیں لیتا؟ ایم ایل سی اور ایک عدد راجیہ سبھا سیٹ کے لیے اپنے ضمیر کو تھپکیاں دے کر کیوں نہیں سلا دیا، جیسا کہ ابو الکلام آزاد اور صنادید جمیعۃ کر رہے تھے، اس لیے کہ وہ اول و آخر ایک بندۂ مومن تھے اور بندۂ مومن کی شان تو یہ ہے کہ

بندۂ مومن کا دل خوف و رجاء سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

جبکہ کانگریسی مولانا آزاد اوران کی جمیعۃ کے تعلق سے حضرت اکبر الہ آبادی کے احساسات کچھ یوں تھے۔

یہ کانگریسی ملّا تم کو بتاؤں کیا ہیں
نہرو کی پالیسیوں کا اردو میں ترجمہ ہیں

۱۹۷۹ء میں عقائد ومعمولاتِ اہلِ سنّت کے تحفظ میں آپ کو آخری بار گرفتار مدینہ شریف میں سعودی نجدی حکومت نے کیا اور قید کر کے جیل میں ڈالا اور آپ پر اس بڑھاپے میں بے پناہ تشدد کیا۔ پورا پورا دن دھوپ میں آپ کو کھڑا کیا جاتا رہا مگر آپ کو اپنے موقف سے ذرہ برابر ہلا نہ سکے حتیٰ کہ حج کیے بغیر جبراً ہندوستان واپسی گوارا کرلیا۔ مگر نجدی حکومت کے جبر واستبداد کے آگے جھکے نہیں، جس کا ہنگامہ پوری دنیا میں ہوا۔

جتنی دبی ہے اتنی ہی ابھری ہے بارہا
اللہ رکھے اس کی عجیب شان بان ہے

۳۲ سال قبل غالباً ۱۹۷۲ء میں میرے والدین کریمین (اللہ ان کے سایۂ عاطفت کو میرے اوپر دراز تر فرمائے، حج وزیارت حرمین طیبین کی سعادت بخشی۔ وہ بھی حضرت شیخ العلماء علامہ غلام جیلانی اعظمی وحضور مجاہد ملّت کی رفاقت میں بحری جہاز کے ذریعے جب حج وزیارت روضۂ رسول کے لیے چار ماہ سے زیادہ لگتے تھے جس میں مشقت بھی کافی جھیلنا پڑتا تھا۔ حقیقت میں اس حج کا لطف ہی کچھ اور ہوتا اور اس کی برکات وسعادتوں کا کیا پوچھنا۔ آج کی طرح نہیں کہ ادھر گئے ادھر آئے، کب گئے کب آئے۔ اہلِ محلہ میں کسی کو پتہ چلا اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوا۔ میرے والد ماجد الحاج ملّا محمد حنیف قادری یار علوی خلیفۂ حضور مجاہد ملّت و بانی مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا کی روایت کے مطابق اس سال ہند وپاک کے جید علماء کرام کا بڑا ہجوم تھا۔ حضرت شیخ العلماء قبلہ چونکہ تنہا تھے اور بہت کمزور وضعیف، اس لیے میرے والدین کے ساتھ ہی تھے۔ میرے والد حضرت کی جلالت شان و بزرگی کے پیشِ نظر خوب وسیع وعریض کمرہ لیے ہوئے تھے، حالانکہ میری والدہ حضرت علیہ الرحمہ کی بیٹی کی منزل میں تھیں مگر اللہ اکبر! احترامِ شریعت وحرم اتقاء کا یہ عالم کہ حضرت میری والدہ ماجدہ کے لیے اسی کمرے میں خوب موٹے و دبیز کپڑے کا پردہ لگوا کر گویا کہ ایک الگ کمرہ بنوا دیا تھا۔ جبکہ آج حج کمیٹی کے ذریعے حجاجِ کرام جب حج کرنے جاتے ہیں، جن میں علماء کرام وائمۂ مساجد و پیرانِ کرام کی بھی ایک بڑی تعداد ہوتی ہے وہاں مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ میں حج کمیٹی حجاجِ کرام کے لیے جو کمرہ الاٹ کرتی ہے اس میں محرم نامحرم سب ایک ساتھ اور ایک لائن میں سوتے ہیں، فقیر قادری کی آنکھوں نے یہ منظر وہاں بار بار دیکھا ہے۔ میں نے یہاں کے حج کمیٹی کے ذمہ داروں سے جب اس کا احتساب کیا، ان کا جواب تھا کہ کیا کروں حاجی اپنی بیوی کے ساتھ اسی طرح رہنا چاہتا ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا حج کمیٹی حاجی کے ساتھ ہمیشہ اپنا قانون چلاتی اور جبراً وقہراً حاجی کو اسے ماننا ہی پڑتا ہے تو وہ قانون کیوں نہیں چلاتی کہ ایک ہی کمرہ سہی کم ازکم مردوں عورتوں کے درمیان کپڑے کی دیوار تو حائل کر دیں۔

بیچارہ حاجی اپنی دانست میں گیا تھا گناہوں سے پاک صاف ہونے، معلوم ہوا کہ الٹا گناہوں سے لد پھند کر آیا ہے

کہ مکہ شریف میں اگر ایک نیکی ایک لاکھ ہے تو ایک گناہ بھی ایک لاکھ کے برابر۔

عصر کی نماز کے بعد مکہ شریف میں حضرت شیخ العلماء صاحب قبلہ علیہ الرحمہ سے ملاقات کے لیے تقریباً روزانہ ہندوستان و پاکستان کے جید علماء کی تشریف آوری میرے والد محترم کی قیام گاہ پر ہوتی تھی۔ علماء کرام کی ضیافت کالی چائے لیموں کے ساتھ ہوتی تھی۔ جس میں پاکستان سے حضرت علامہ عبد المصطفےٰ ازہری بن حضرت صدر الشریعہ، جن کے ساتھ پاکستانی علماء کی بھیڑ ہوتی۔ حضور مجاہد ملّت، حضرت علامہ ارشد القادری، حضرت مولانا سیّد محمد مدنی میاں، مولانا ہاشمی میاں وغیرہ وغیرہ ان علماء کرام کی خدمت کی سعادت وہ بھی حرم الٰہی میں میرے والدین کریمین کو مہینوں حاصل رہی، فللحمد للہ رب العلمین۔ اس زمانے میں سعودی حکمرانوں کا جاہ وجلال پورے عروج پر تھا۔ وہاں جمہوریت نہ اس وقت تھی اور نہ ہی آج بلکہ بادشاہت تھی اور آج بھی امریکہ کے طفیل یہ بادشاہت وہاں برقرار ہے اور بادشاہت میں بادشاہ کی مرضی وزبان ہی قانون ہوا کرتا ہے۔ میرے والد محترم بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے کتنا بڑا قلب وجگر اور جوہر استقامت حضور مجاہد ملّت کو عطا فرمایا تھا وہیں پر دیکھنے کو ملا۔ بے خوفی و بے جگری اور عزیمت و استقامت کس چیز کا نام ہے یہ زندگی میں پہلی بار میں نے حرم کعبہ میں دیکھا۔

جب پہلا جمعہ مبارکہ آیا تو آپ نے ہم سبھوں کو وہابی عقیدے والے امام حرم کے پیچھے نماز جمعہ پڑھنے سے روک دیا۔ جب حرم شریف میں جمعہ کی نماز ختم ہوئی تو اس کے فوراً بعد ہی حضور مجاہد ملّت نے حضرت علامہ ارشد القادری صاحب سے حکماً فرمایا، ارشد! جمعہ کے لیے اذان پڑھو۔ ہم میں سے جس نے حضرت کا یہ حکم سنا، سب دم بخود رہ گئے۔ خود حضرت شیخ العلماء قبلہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گئے اور علامہ ارشد القادری کے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی بات ہو کر رہ گئی۔ جب دوسری بار حضرت نے فرمایا ارشد! میں نے تم سے اذان پڑھنے کے لیے کہا ہے۔ پھر تو علامہ ارشد القادری نے اپنی ہمت وسعادت دونوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے جمعہ کے لیے حرم کعبہ میں اذان پڑھی، حضرت مجاہد ملّت نے بلند آواز سے جمعہ کا خطبہ دیا۔ پھر باقاعدہ جمعہ کی جماعت حرم شریف میں ہی قائم ہوئی۔ حضرت نے بڑے اطمینان وسکون کے ساتھ امامت فرمائی۔ جمعہ پڑھنے والوں میں حضرت شیخ العلماء کے علاوہ مولانا سیّد مدنی میاں، مولانا ہاشمی میاں وغیرہ بھی تھے۔ حضرت نے جب سلام پھیرا تو بھی لوگ اپنی جگہوں سے فوراً ہٹ کر اِدھر اُدھر ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے تلووں کے نیچے کی زمین بھیگی ہوئی تھی، مگر حضرت مجاہد ملّت کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ اسی جگہ سنت ونفل سب پڑھنے لگے۔ دوسرا جمعہ آتے آتے یہ خبر سنّی حلقوں تک پہنچی کہ اہلِ سنّت وجماعت حجاج کرام حضور مجاہد ملّت کی امامت میں حرم کعبہ ہی میں الگ جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، اس لیے دوسرے جمعہ کو بہت لوگوں نے حضور مجاہد ملّت کی امامت میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ علماء کرام کی تعداد بھی کافی ہونے لگی، تیسرے جمعہ کو سنیوں کا ایک زبردست اژدھام جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے اکٹھا ہو گیا۔ پھر پورے خشوع وخضوع کے ساتھ حضرت کی امامت میں پڑھی گئی۔ الگ جمعہ کے اس اہتمام واژدھام سے سعودی حکومت میں کافی بے چینی وگھبراہٹ پیدا ہوئی۔ چوتھا جمعہ کرنے سے پہلے حضور مجاہد ملّت کو یہ سرکاری حکم نامہ ملا کہ

آپ مکہ مکرمہ چھوڑ فوراً مدینہ منورہ چلے جائیں۔ مدینہ شریف کا پروانہ پاکر حضرت خوش ہو گئے کہ سرکار نے بہت جلد اپنے قدموں میں بلالیا۔ مگر جاتے جاتے اس کا قلق واحساس تھا کہ شاید اب چوتھا جمعہ حرم شریف میں سنیوں کا نہ ہو سکے۔ چوتھا جمعہ کرنے سے قبل حضرت مدینہ منورہ چلے گئے۔ پھر کسی نے الگ جمعہ پڑھنے پڑھانے کی ہمت ہی نہیں کی۔

آپ نے دین وسنیت کی جیسی عظیم الشان خدمات انجام دیں اس کی دوسری کوئی مثال دیکھنا تو درکنار سننے کو بھی نہیں ملتی۔ تقسیمِ ملک کے بعد دلی جب مسلمانوں سے زیادہ خالی ہوگئی، خاص کر سنّی علماء ومشائخ سے۔ اہم ترین شخصیات میں صرف ایک ہستی معتبر نے بالقصد دلی نہیں چھوڑی جبکہ اس کا پورا خاندان چلا گیا۔ وہی دلی میں سنیت کی نشانِ منزل بھی تھی اور اس کا قیمتی سرمایہ بھی اور مسلمانوں کے لیے ڈھارس بھی! حضرتِ اقدس بابرکت علامہ الحاج مفتی مظہر اللہ صاحب قبلہ علیہ الرحمۃ والرضوان خطیب وامامِ مسجد فتح پوری چاندنی چوک، ان کے علاوہ اگر کوئی اور بھی شخصیت تھی تو وہ تصلب فی الدین کی علامت کے طور پر نہیں بلکہ اسے تو انھیں زاغ وزغن نے گھیر رکھا تھا جو عدوئے دین وایمان اور مسلمانوں میں مسلمانوں کے تعلق سے نہرو کی پالیسیوں کے ترجمان تھے۔ زندگی بھر وہ انھیں میں گھرے بھی رہے اور انھیں میں خوش بھی رہے، آخری وقت میں یہی فتنہ ان کے گھر میں گھس کر گھر ہی بہالے جانا چاہا تو اپنے گھر اور اس کے کچھ رسومات کے تحفظ کے لیے ایک آدھ تیر چلایا بھی تو اس سے کیا۔

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری عمر میں کیا خاک مسلمان ہوں گے

حضور مجاہد ملّت نے جب دیکھا کہ دلی خوش عقیدہ مسلمانوں سے تقریباً خالی ہوگئی، بچے کچے کچھ ہی گھر رہ گئے ہیں اور حال یہ ہے کہ ان گھروں میں جاکر میلاد شریف پڑھنے والا نہیں مل رہا ہے، تو آپ نے عشق وعقیدت اور دینی وایمانی روایت مسلمان گھروں میں باقی رہ جانے کے تعلق سے دلی میں سنیت کی جان حضرت علامہ مفتی مظہر اللہ صاحب قبلہ سے بات کی کہ اگر آپ اپنی مسجد فتح پوری میں ایک کمرہ عنایت فرمادیں تو فقیر اپنے ذاتی خرچ پر آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جانب سے مستقل ایک عالم دین رکھ دوں جو بغیر نذرانے کے مسلمانوں کے گھروں، محفلوں اور محلوں میں میلاد شریف پڑھے۔ حضور مجاہد ملّت کی اس تجویز وایثار سے مفتی صاحب قبلہ بہت خوش ہو گئے اور اسی وقت اس کارِ خیر کے لیے اپنی مسجد میں ایک کمرہ عنایت فرمادیا تاکہ حضرت مجاہد ملّت کا مقرر کردہ میلاد خواں عالمِ دین اس میں رہے۔

حضرت مجاہد ملّت نے اس مقدس وبابرکت فریضے کی ادائیگی کے لیے اپنے مرید وخلیفہ وتلمیذ ارشد و پروردۂ نعمت حضرت مولانا الحاج قاری عبد الرب صاحب قبلہ علیہ الرحمہ مرادآبادی کو ٹھہرایا اور تاریخی مسجد فتح پوری حضرت مفتیٔ اعظم دہلی سے یہ اعلان کرایا کہ یہاں ایک عالمِ دین مستقل طور پر میلاد شریف بغیر کسی نذرانے کے پڑھنے کے لیے رہتے ہیں۔ لہٰذا مسلمان اپنے گھروں، محلوں اور محفلوں میں ان سے میلاد شریف پڑھوائیں۔ حضرت مولانا عبد الرب صاحب مسلسل ۱۰ ر برس تک دلی میں میلاد شریف پڑھتے اور عشق وعقیدت کی محفلوں کو گرماتے رہے اور دلی اسی وقت چھوڑا جب دلی میں میلاد

شریف پڑھنے اور لوگ ہو گئے۔

حضور مجاہد ملّت مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمہ چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے ایک اولوالعزم پُرجوش اور عظیم مقتدا کی حیثیت سے اُبھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے اکنافِ ہند میں ان کے وجودِ بامسعود کے فیضان کا اُجالا پھیل گیا۔ اعیانِ امّت نے جس اعتماد کے ساتھ آپ کے فرقِ اقدس پر قیادت کا بارِ عظیم رکھا، اس اعتماد کی بجا طور پر آپ نے لاج رکھی۔ ملک و بیرونِ ملک کسی بھی جگہ آپ نے سوادِ اعظم کو مایوس نہیں کیا۔ آئے دن قید و بند کی صعوبتیں بھی آپ کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکیں۔ آپ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور ان کے اوپر آئے دن مظالم اور فسادات کی آڑ میں ان کی تباہی و بربادی اور حرمت و ناموس کی پامالی پر بہت حساس تھے، جس کے لیے وہ زندگی بھر آبلہ پا رہے۔ وہ مسلمانوں کی عزت و توقیر اور آبرومندانہ بقا کے لیے ایسے افراد تیار کرنا چاہتے تھے جو انھیں کی طرح بے خوف، باہمت اور قوتِ فرماں روا کے سامنے بھی بے باک ہوں۔

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

وہ ایک ایسی جماعت چاہتے تھے کہ جس کا عزم یہ ہو کہ۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک کہ ستم کی سیاہ رات چلے

جس کے لیے انھوں نے خاکسارِ حق کی ایک جماعت تیار کی تھی، جس کا ہر فرد انھیں اپنے بچے کی طرح عزیز تھا۔ جو جلد ہی انھیں کی طرح اقتدارِ وقت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی اور جہاں کہیں بھیانک فساد ہوتے وہ اخبار کی سرخیوں میں ضرور نظر آتی۔

۲۲ رسال قبل جب اس ملک کا ماحول آج کی طرح ہندتوا اور ہندو احیا پرستی کی آنچ میں نہیں جھلسا تھا اور مسلمانوں کے حق میں اتنا بے رحم، سنگین اور مایوس کن نہیں تھا جیسا کہ آج ہے۔ آنے والے اسی کل کے لیے وہ بہت بے چین تھے اور مسلمانوں کے قوتِ بازو کو مضبوط کر دینا چاہتے تھے اور مستقبل میں مسلمانوں کا حال وہ جو دیکھ رہے، وہی اپنی قوم کے خواص واعیان کو دکھانا چاہتے تھے۔ مگر وہ خواص اس بھیانک کل کو نہیں دیکھنا چاہتے تھے یا انھیں دیکھنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ انھیں اس کے لیے اپنی طرح کے افراد و ساتھی کی ضرورت تھی مگر وہ دستیاب نہیں تھے۔ جس کے لیے کبھی کبھی وہ تنہائیوں میں پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے اور اعلیٰ حضرت کا یہ شعر سسکیوں و کراہوں کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔

ساتھی ساتھی کہہ کے پکاروں ساتھی ہو تو جواب آئے
پھر جھنجلا کر سر دے پٹکوں چل رے مولیٰ والی ہے

آخر عمر میں جب قویٰ مضمحل، اعصاب کشیدہ اور آئے دن جیل میں قید و بند کی صعوبتوں سے وہ تقریباً ٹوٹ سے گئے، پھر بھی ہمت نہیں ہاری۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے روح و جسم تو وہ پہلے سے تھے ہی، خاکسارانِ حق کے امیر بھی ہوئے اور اس پر پوری توجہ اور اپنی بچی کھچی توانائیاں صرف کر دیں اور اپنے تمام وسائل و ذرائع کو بے دریغ اس پر خرچ کرنے

لگے۔آرایس ایس کے مقابلے میں نہ سہی آنسو پوچھنے کی حد تک مسلمانوں میں بھی ایک نیم عسکری تنظیم خاکسارانِ حق کے نام سے تھی۔آہنی بیلچہ جس کی شناخت تھی اوراس کا قانونی ہتھیار بھی! خاکساروں کے ہاتھوں سے یہ ہتھیار کوئی چھین بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے قانونی تحفظ حاصل تھا،مگر افسوس ان کے بعد اس نیم عسکری تنظیم کے لیے ایسا کوئی قائدنہیں مل سکا جو انھیں بکھرنے سے بچا کر مزید توانائیاں عطا کرسکتا۔آج آرایس ایس، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، ہندومہاسبھا،شیوسینا جیسی فسطائی تنظیموں کے تیور اوران کی انتہاپسندی کو دیکھتے ہوئے مجاہدملت کے خاکسارانِ حق کی بڑی شدید ضرورت ہے، جن کے پاس جذبہ ہے، کچھ کرسکنے کی حسرت ہے اور کچھ کرگذرنے کا حوصلہ ہے۔مگر حالات نے انھیں بے دست وپا کر رکھاہے، ذرائع واسباب سے وہ تہی دست ہیں اور جنھیں اللہ تعالی نے اپنے فضل وعطا سے بہت کچھ عطا کررکھاہے اور کچھ کر گذرنے کی لیاقت وصلاحیت بھی اور ساتھ ہی ذرائع واسباب بھی مگروہ اپنی کھال میں مست اوراپنی کنج عیش سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتے۔ان کے گرد جو حال کے اُجالے ہیں وہ انھیں مستقبل کے اندھیروں میں جھانکنے نہیں دیتے۔آج ان کے خاکسار ملک کے مختلف حصوں میں ٹکڑیوں کی شکل میں بکھرے ہوئے، دھیرے دھیرے وہ کم سے کم ہوتے جارہے ہیں مگر اب تک انھیں کوئی ایسا قائدنہیں مل سکا جوانھیں نئی توانائی دے کرایک بار پھر انھیں مثبت سمت عطا کردیتا۔

حضور مجاہدملت ہندوستانی مسلمانوں کے جس کل کے لیے بےکل تھے، وہ کل ان کی زندگی میں اتنا جلدی آجائے گا، سوچا بھی نہیں گیا تھا۔میرٹھ وملیانہ، بھاگل پوران کے بعد ہی رونما ہوا۔شہادتِ بابری مسجد کا سانحہ اوراس کے ردِعمل میں مسلمانوں کی اجتماعی بربادیاں اور حرمت وناموس کی ناقابلِ یقین پامالیاں ان کے بعد ہی ہوئیں۔ابھی ۲۰۰۲ء بھاجپائی حکومت کے سپہ سالار اورآرایس ایس کے مایۂ نازسپوت ہندوستانی موشے دایان نریندرمودی اپنی سرکاری سینا کے ذریعے گجراتی مسلمانوں کا جو اجتماعی قتلِ عام اور مسلمانوں کو برباد کرنے کی جونئی نئی تکنیک وحکمت عملی اختیار کی ہے اس نے ۵۵ر سالہ ریکارڈ توڑ دیا ہے اور گجرات میں مسلمانوں کی آہوں کا دھواں تو ابھی تھما بھی نہیں اوران کے اجتماعی بربادیوں کی راکھ بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی ع

آسماں راحق بود گرخوں بہ بارد برزمین

مگراس قیامت کے باوجود ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہماری مذہبی قیادت اپنے گوشۂ عافیت اور خودساختہ حصار بندیوں سے باہر نہ نکل سکی بلکہ دن رات وہ اپنے شجرِ انا میں ٹھنڈا پانی ڈالنے ہی میں مصروف ہے۔ ؎

بہنے لگی پرواز پھر تیرے خیالوں کی
جو درد دبا تھا وہ اب درد جواں ہوگا

ایمرجنسی ۱۹۷۵ء کے آغاز میں جب جماعت اسلامی پر پابندی لگی، آپ ممبئی آئے اور آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جانب سے ایک شدید احتجاج کیا۔ہانڈی والی مسجد میں مجھے بلوایا اور الگ لے جا کر کہنے لگے مولوی صاحب سنا کہ تم لکھنا جانتے ہو تو ایسا کرو ایک خط آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے وزیراعظم اندرا گاندھی کے نام اس مفہوم کا اپنے طور پر لکھ کر

ابھی ابھی میرے سامنے لاؤ۔ میں نے ادب کے ساتھ عرض کیا، حضور یہ جماعت اسلامی تو وہابیوں کی جماعت ہے، اس کے لیے ہمیں اور آپ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت، بھگتنے دیجیے انھیں، کیا اچھا ہوا جو حکومت نے پابندی لگادی کچھ تو زور کم ہوگا ان کا اور آپ ہیں کہ پوری جماعت کے ساتھ اس کے لیے احتجاج کرنے جارہے ہیں۔ مسکرا کر فرمانے لگے مولوی صاحب! ابھی بچے ہو وقت تمھیں سمجھا دے گا۔ ہمارا یہ احتجاج جماعت اسلامی کے لیے کم، خاکسارانِ حق اور آل انڈیا تبلیغ سیرت کے تحفظ کے لیے زیادہ ہے۔ اگر اس منزل میں حکومت کو روکا نہیں گیا تو اس کے بعد خاکسارانِ حق کی باری آئے گی، پھر تبلیغ سیرت کی گردن میں پھندا ڈالا جائے گا۔ مولوی صاحب! خاکسارانِ حق حکومت کی نگاہوں میں بہت زیادہ کھٹکنے لگی ہے اور بڑے بڑے جغادری لیڈروں کی زبانوں پر اب اس کا نام آنے لگا ہے۔ ابھی فیروز آباد فساد میں جو پی اے سی سے کنٹرول نہیں ہورہا تھا بلکہ وہ جانبدارانہ رول ادا کررہی تھی، اسے خاکسارانِ حق نے کنٹرول کیا اور پی اے سی کو جانبداری برتنے سے بزورِ طاقت روک دیا، جس سے مسلمانوں کو بڑا تحفظ ملا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اس پر خاکسارانِ حق کا شکریہ ادا کرنے، شاباشی دینے کے بجائے آل انڈیا ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے فیروز آباد فساد کا ذمہ دار خاکسارانِ حق کو ٹھہرایا۔ جس پر ہمارے کان اسی وقت کھڑے ہوگئے تھے، لہٰذا ایسی صورت میں جماعت اسلامی کے لیے حکومت کے خلاف احتجاج اور ضروری ہوجاتا ہے ورنہ ایک ایک کرکے سبھی جماعتوں پر حکومت پھندا کستی جائے گی۔

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

ابھی شہادتِ بابری مسجد کے بعد چار غیر کانگریسی حکومت کو برخواست کرتے ہوئے مرکز کی کانگریسی حکومت نے آر ایس ایس کے ساتھ صرف بیلنس برابر کرنے کے لیے جماعت اسلامی پر پابندی لگائی جس پر کسی طرف سے کوئی آواز نہیں اٹھی۔ چونکہ اس سے پہلے مجاہد ملّت کے رہنما اصول ہمارے سامنے تھے اس لیے ممبئی تبلیغ سیرت کے صدر کی حیثیت سے آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جانب سے جماعت اسلامی کے حق میں حکومت کے خلاف بڑا شدید احتجاجی بیان دیا ہم نے، جس کو ممبئی کے اخبارات نے سرخیوں کے ساتھ شائع کیا۔ جس کے بڑے خوشگوار ردِعمل مرتب ہوئے۔ حالانکہ اس وقت تک جوان کے اپنے تھے وہ حالات کے بگڑے ہوئے تیور سے خوفزدہ تھے۔ میرے احتجاج کے کئی دنوں کے بعد مسلم پرسنل لابورڈ کی جانب سے علی میاں ندوی اور جمعیۃ العلماء کی طرف سے اسعد مدنی صاحب کا بیان آیا۔ جن کی میرے بیان کے بعد جماعت اسلامی کی نگاہ میں اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ دلی سے جماعت اسلامی کا ہائی کمان ایک وفد کی شکل میں ممبئی آکر آل انڈیا تبلیغ سیرت کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ آج تک اس کے لیے تبلیغ سیرت کے ممنون و مشکور ہیں۔

غزالان تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
وہ دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

☑☑☑☑☑☑

چراغِ لالہ کو جس نے دیا جگر کا لہو!

عزیمت واستقامت، صبر وتحمل، کردار وعمل، زہد واتقاء، علم وفضل، اخلاق واخلاص، تواضع وانکساری اور جہد مسلسل کا پیکر! اکابر واساتذہ تو الگ رہے کثیر التلامذہ ہونے کے باوجود اپنے عظیم المرتبت رفیقانِ درس ومعاصرین کے سامنے اپنے تمام تر کثیر الجہتی وقد آوری کے باوجود سراپا ادب واحترام!

جیسے امام النحو شارح بخاری حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی، مناظر اعظم حضرت علامہ سردار احمد خاں محدث لائل پوری، امام التارکین مجاہد ملّت حضرت علامہ مفتی محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی، سلطان المناظرین حضرت علامہ مفتی شاہ رفاقت حسین اشرفی حامدی، امام المنطق حضرت علامہ محمد سلیمان اشرفی بھاگل پوری، شمس العلماء حضرت علامہ مفتی شمس الدین رضوی جعفری جونپوری، بادشاہِ عالم وفضل سلطان الواعظین حضرت علامہ عبد المصطفیٰ مجددی اعظمی علیہم الرحمۃ والرضوان۔

دہلی میں دین وسنیت وحقانیت کے بلند مینار! استاذ المحدثین، امام الکاملین، شیخ الکل حضرتِ اقدس بابرکت سیدنا شیخ عبد العزیز محدث دہلوی کے بعد تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر اور چودھویں صدی ہجری کے نصف اول میں دور بہت دور تک اتنا کثیر التلامذہ وتلامذہ نواز وفیض رساں شخصیت اگر کوئی نظر آتی ہے تو وہ ہے آپ کی ذات ستودہ صفات!

مراد میری جن سے استاذی الکریم، معمارِ سنیت، استاذ العلماء، جلالۃ العلم حضرتِ اقدس بابرکت علامہ ابو الفیض الحاج الشاہ الحافظ المفتی محمد عبد العزیز محدث مرادآبادی ثم مبارکپوری علیہ الرحمہ والرضوان ہیں۔ ؎

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

اور تلامذہ بھی کیسے؟ جو خود اپنے وجود میں ایک جہانِ علم وفضل تھے اور جن کے فیضان کا سلسلہ بھی بہت دور تک پہنچا! اور جن کی شہرت وناموری کا شہرہ کئی براعظموں تک پہنچا۔

جیسے امام الحکمت روحِ اشرفیہ حضرتِ اقدس علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب قبلہ بلیاوی ثم مبارکپوری، اشرف العلماء پیر طریقت حضرت بابرکت علامہ الحاج الشاہ سیّد محمد حامد اشرف اشرفی جیلانی بانی وسربراہ وشیخ الحدیث دار العلوم محمدیہ ممبئی، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب مبارکپوری، شیخ الاساتذہ سند المحققین حضرت علامہ مفتی بدر الدین قادری رضوی، صاحبِ تصانیف کثیرہ حضرت اقدس بابرکت پیر طریقت علامہ سیّد رکن الدین اصدق نالندہ بہار، سلطان القلم بانی مدارسِ کثیرہ حضرت علامہ ارشد القادری جمشید پور، شیخ الاسلام مفسر قرآن حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی

کچھوچھوی، پیر طریقت حضرت اقدس بابرکت سیّد مجتبیٰ اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی، شارح بخاری فقیہ النفس حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی، مبلغ اعظم افتخارِ اہلِ سنّت حضرت علامہ قمر الزماں اعظمی جنرل سکریٹری ورلڈ اسلامک مشن لندن، حضرت اقدس بابرکت علامہ شمس الھدیٰ بیت الانوار گیا بہار، حضرت اقدس بابرکت مولانا تجمل الھدیٰ بیت الانوار گیا بہار، پیر طریقت حضرت بابرکت علامہ سیّد عبدالحق اعظمی ثم اجمیری، شیخ الادب قاضی شریعت حضرت علامہ محمد شفیع قریشی مبارکپوری، استاذ جلیل حضرت علامہ ظفر ادیبی مبارکپوری، محبوب العلماء حضرت علامہ محبوب اشرفی اعظمی احسن المدارس کانپور، حضرت علامہ الحاج عبد المصطفیٰ کوثر امجدی، فخر القراء حضرت علامہ محمد عثمان اعظمی، صوفی باصفا حضرت علامہ صوفی نظام الدین بستوی تدریس الاسلام امرڈوبھا، لسان العصر حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی، شاعر اسلام صاحبِ زبان و قلم حضرت علامہ الحاج محمد صابر القادری نسیم بستوی، پیر طریقت حضرت بابرکت علامہ سیّد شمس الضحیٰ غازی پوری، شیخ القرآن حضرت علامہ عبداللہ خاں عزیزی دار العلوم علیمیہ جمداشاہی، حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ اعظمی شیخ الحدیث وسربراہ دار العلوم امجدیہ گھوسی اعظم گڈھ، پیر طریقت حضرت علامہ سیّد اظہار اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی، پیر طریقت خطیب الاسلام حضرت علامہ سیّد کمیل اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی، مفکر ملّت حضرت علامہ محمد حنیف قادری یارعلوی براؤں شریف، حضرت علامہ حکیم فضل الرحمٰن شرر مصباحی مبارکپوری، حضرت علامہ ڈاکٹر شکیل احمد قریشی اعظمی، پیر طریقت حضرت مجتبیٰ اشرف کچھوچھوی، شارح بخاری فقیہ النفس حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی، حضرت علامہ محمد محبوب اشرفی اعظمی، حضرت علامہ عبد المصطفیٰ کوثر امجدی، فخر القراء حضرت علامہ محمد عثمان اعظمی، حضرت علامہ محمد میاں کامل سہسرامی، حضرت علامہ محمد احمد شاہدی غازیپوری، حضرت مولانا صوفی نظام الدین بستوی، حضرت علامہ غلام ربانی فائق اعظمی، حضرت علامہ خادم رسول گیاوی، مولانا سیّد محمد ہاشمی کچھوچھوی جیلانی، علامہ سیّد اصغر الجھری، حضرت علامہ قاری عثمان اعظمی، مولانا وجیہہ الدین پیلی بھیتی، علامہ مفتی ثناء اللہ امجدی، حضرت علامہ مفتی ظفر احمد نعمانی پاکستان، حضرت علامہ رضاء المصطفیٰ پاکستان، حضرت علامہ قاری مصلح الدین قندھار، حضرت مولانا عبد الغفار بنگلہ دیش، حضرت مولانا جلیش محمد نیپال، حضرت مولانا جلال الدین نوری بغداد شریف، مولانا عبد الکریم ترکی، مولانا محبوب خدا بخش ماریشس، مولانا ممتاز احمد اشرف القادری امریکہ، مولانا قاری محمد اسمٰعیل انگلینڈ، حضرت علامہ افتخار احمد مدینہ منورہ، مولانا قطب الدین نعیمی گونڈوی، راقم الحروف خاکسار محمد وارث جمال قادری یارعلوی اور میرے بڑے بھائی مولانا محمد عارف مصباحی کو بھی شرفِ تلمذ کی نعمت حاصل ہے۔
سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شاگردوں میں یہ صرف چند اسماء ہیں۔ ناموں کی ترتیب کسی فضیلت کی معیار پر نہیں بلکہ جیسے جیسے ناموں نے حافظے پر دستک دی قلم برداشتہ لکھتا گیا۔ اشرفیہ مبارکپور سے میری فراغت کی عمر نصف صدی سے زائد ہے۔

مدرسہ اشرفیہ مبارکپور سے لے کر دار العلوم اشرفیہ اور پھر الجامعۃ الاشرفیہ تک کا سفر بڑا طویل، صبر آزما اور کانٹوں بھرا ہے، جس کی ایک بڑی تفصیل ہے۔ اس راہِ محبت میں حضرتِ اقدس بابرکت علامہ حافظ مفتی محمد عبد العزیز نے ہندوستان کے سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کو ایک منفرد و بے مثال جامعہ از ہر دینے کے لیے پتھر کا جگر کیسے پانی کیا، درد کے صحرا

کس طرح عبور کیا، اور آگ کے دریا کو ڈوب کر کیسے پار کیا اس کو دیکھنے والی آنکھوں نے قریب سے دیکھا اور کانوں نے بہت غور سے سنا۔ مگر لکھا کم گیا، کہ بہت ساری حقیقتیں صرف محسوس کرنے کے لیے ہوتی ہیں کہ ع حسابِ دوستاں در دل کتابے

ع آفریں باداے ہمت مردانہ تو

حضور حافظ ملّت محسنِ دنیائے سنیت پر بہت کچھ لکھا گیا، اس تعلق سے بہت کچھ سنا و سنایا گیا اور یہ سلسلہ یوں ہی جاری و ساری رہے گا۔ کروڑوں دلوں میں ان کی عقیدت و احترام کا چراغ جلتا رہے۔ لاکھوں دل و نگاہ ان کی دلآویز و باعظمت شخصیت کے حضور مؤدب رہیں گے۔

آپ کی ذات ستودہ صفات کے تعلق سے کچھ عرض کرنا ان کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت کے سوا کچھ نہیں۔ وہ بھی اس جذبے کے تحت جو حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ سید الکونین میں عرض کیا تھا کہ ۔

مَا اِن مَدَحتُ محمدًا بِمُقَالَتِی

لکن مدحت مقالتی بمحمد

اے پیکرِ نور! ہم نے اپنے کلام سے آپ کی تعریف نہیں کی بلکہ آپ کے نامِ پاک سے اپنے کلام کو سنوارا ہے۔ (تا کہ اس نامِ پاک کی برکت سے ہمارے کلام کو عزت و احترام حاصل ہو جائے۔

بے شک اپنے استاذ کریم حضور حافظ ملّت کے اس ذکرِ جمیل سے ہمارے قلم کو عزت و شرف اور ہمارے مقالات کے اس مجموعہ کا وزن بڑھ جائے تا کہ یہ بھی اربابِ دین و دانش کے دلوں میں اپنی جگہ بنا سکے۔ کہ ہمارے اپنے وجود کی کوئی حیثیت اور اس کی کوئی عزت و توقیر ہے تو انھیں نفوسِ قدسیہ کے قدموں میں ہے الگ سے کچھ نہیں۔ ۔

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

قابلِ ذکر شخصیات و رجال میں:

کچھ لوگ عظمتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور کچھ عظمتیں کسب کرتے ہیں۔ ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد مقامِ بلند پر پہنچتے ہیں۔ میرے استاذی الکریم کا تعلق اس دوسری قسم سے تھا کہ وہ عظمتیں و بلندیاں لے کر نہیں پیدا ہوئے، بلکہ انھوں نے اپنے رب کے فضل سے عظمتیں و بلندیاں کسب کی ہیں۔

۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء بروز دوشنبہ مبارکہ ضلع مرادآباد کے مشہور قصبہ بھوجپور میں پیدا ہوئے۔ گھرانہ مذہبی تھا۔ آپ کے جدِ کریم ملّا عبد الرحیم نے امام المحدثین حضرت مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی علیہ الرحمہ والرضوان کے نام پر آپ کا نام عبد العزیز اس یقین و امید پر رکھا کہ اس نام کی برکت سے میرا یہ بیٹا ایک بڑا و بلند پایہ عالمِ دین بنے گا۔ اور انھیں کی طرح دین کا ایک بڑا خادم! جب قدرت اپنے کسی بندے کو اپنے بندۂ خاص کے زمرے میں شامل کرنا چاہتی تو اس کے سرفرازی و سربلندی کے لیے ابتدا ہی سے ایسے حالات پیدا کرتی جس کے مطابق چل کر وہ بڑی بلندیاں حاصل کر لیتا ہے۔

میری مشاطگی کو کیا ضرورت حسن معنی کی
کہ قدرت خود کیا کرتی ہے فطرت کی حنابندی

حضور حافظ ملّت کی ولادت ایک خالص مذہبی گھرانے میں مختلف تعلیم مراحل سے گذر جانے کے بعد اعلیٰ مذہبی تعلیم کی تحصیل کے لیے اساتذہ بھی ملے تو کاملین زمانہ کے امام اور استاذی الکل اور اپنے اپنے مقام پر حرفِ آخر! جیسے صدر الافاضل، فخر الاماثل سیّد المفسرین، امام الہند حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی حکیم سیّد نعیم الدین مرادآبادی، صدر الشریعہ بدر الطریقہ استاذ الکل حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی محمد امجد علی قادری رضوی، حضرتِ اقدس بابرکت علامہ عبد العزیز خاں فتح پوری اشرفی وغیرہ وغیرہ علیہم الرحمۃ والرضوان۔

رفقائے درس: حضور حافظ ملّت قدس سرہ العزیز کے رفقاء درس اپنی جگہ علم وفضل، شرف ومجد اور تبحر علمی کے ماہ تمام و بدرِ کامل تھے اور ہر ایک اپنے وجود میں ایک عظیم دانشکدہ! اور اپنی اپنی جگہوں پر اپنے رفقاء درس کے لیے ادب واحترام کا پیکر!

جیسے شارح بخاری امام النحو صدر العلماء حضرتِ اقدس بابرکت علامہ سیّد غلام جیلانی اشرفی محدث میرٹھی علیہ الرحمہ، شیخ الحدیث والتفسیر جامع شریعت وطریقت حضرت علامہ ابوالفضل محمد سردار احمد محدث لائل پور پاکستان، امام التارکین مجاہد اعظم سنوسی ہند حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی رئیس اڑیسہ، سلطان المناظرین، امام المتکلمین امین شریعت حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین اشرفی علیہ الرحمہ، خیر الاذکیا حضرتِ اقدس بابرکت علامہ غلام یزدانی اعظمی علیہ الرحمہ برادرِ اصغر حضرت شیخ العلماء علامہ غلام جیلانی گھوسوی اعظم گڈھ یوپی۔ فقیہ اجل شمس العلماء حضرت علامہ قاضی شمس الدین احمد رضوی جعفری جونپوری مصنف قانونِ شریعت علیہ الرحمہ، جامع معقولات ومنقولات، امام المنطق حضرت علامہ محمد سلیمان بھاگل پوری اشرفی علیہ الرحمہ، ابوالمحاسن حضرتِ اقدس بابرکت علامہ محمد محسن فقیہ شافعی بھیونڈی مہاراشٹر علیہ الرحمہ، حافظ ملّت علیہ الرحمہ کے اساتذہ کی ایک جھلک دیکھ لیا۔ ہزاروں تلامذہ میں سے صرف چند کی عظمتوں و جلالتوں کو بھی ملاحظہ فرمالیا۔ اپنے زمانے کے بے مثل و بے مثال اور شکوہِ علمی کے محسوس پیکروں کو رفقاء درس کی شکل میں بھی ملاحظہ فرمالیا۔ انھیں سے ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا!

کی کیفیت وکمیت کا اندازہ لگائیے۔ جہاں آپ کثیر التلامذہ تھے، وہاں اور قدآور عظیم المرتبت اساتذہ کے درمیان تلامذہ نوازی کا ایک بڑا حسن لیے ہوئے تھے علی رؤس الاشہاد اپنے تلامذہ کی تعریف وتوصیف ان کی عزت وتکریم اور ہر گام پر ان کی حوصلہ افزائی اور لوگوں کے دلوں میں ان کا احترام پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اسی لیے آپ کے تلامذہ بھی آپ پر اپنی جانیں چھڑکتے تھے اور آپ کی عزت ووقار کے لیے قربان ہونے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اپنے استاذ محترم حضرت صدر الشریعہ حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی کے حکم پر خدمت دین کے لیے جب پہلی بار مبارکپور تشریف لائے، آپ کی تشریف آوری کے بعد جیسے ہی تعلیمی سلسلہ شروع ہوا اور جماعت اہلِ سنّت کی نئے سرے

سے ایک معیاری درسگاہ کے قیام کی خبر اطراف و جوانب میں مشہور ہوئی تو اہلِ سنّت کے حریفوں میں اس خبر سے بڑی بے چینی پھیل گئی اور مدرسہ کو بند کرانے اور حضور حافظ ملّت کو مبارک پور سے باہر کا راستہ دکھانے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں خرچ کر دیں اور پورے ملک میں پھیلے ہوئے ان کے جتنے ایں قدر سے لے کر آں قدر شخصیتیں تھیں وہ سب آتی رہیں اور جاتی رہیں۔ خود استاذ کریم درسگاہ میں اس واقعہ کو کبھی کبھی بیان بھی کرتے کہ مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے وہابیہ، دیابنہ اور غیر مقلدین نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ پہلے پہل انھوں نے ایک بڑا جلسہ کیا جس میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے خلاف بڑا زہر اگلا اور سنّی معتقدات پر بڑے گھناونے حملے کیے۔

دوسرے دن اہلِ سنّت و جماعت کا جلسہ ہوتا، جس میں وہابیہ، دیابنہ، غیر مقلدین کا بڑا اشد یدردّ ہوتا۔ اور حقیقی اسلام کے مقابلے میں جو وہ نیا دین قائم کرنا چاہتے تھے، ان کی قرار واقعی حیثیت اور ان کے کفر وضلالت سے عوام کو حقائق کے اجالے میں لایا جاتا۔ ان کے مصنوعی اسلام اور اسلام کے مقابلے میں ایک نئے دین کی حقیقت سے بے خبری کی پرت اُترتی گئی اور مبارک پور اور اس کے قرب و جوار کے عوام و خواص حضور حافظ ملّت کو روشنی کا ایک بلند مینار یقین کرتے ہوئے آپ کے حلقۂ عقیدت و محبت میں شامل ہوتے گئے۔ یہ سلسلہ دس بیس دن نہیں بلکہ مسلسل چار ماہ تک چلتا رہا۔ ایک رات وہابیہ، دیابنہ کا جلسہ ہوتا اور اہلِ سنّت و جماعت کے خلاف جو ہفوات و خرافات بکتے، دوسری شب اہلِ سنّت و جماعت کے بہت بڑے جلسے میں اس کی بخیہ دری کر دی جاتی۔ وہابیہ حافظ ملّت کے مقابلے میں مشرق و مغرب اور جنوب و شمال کی ساری طاقتیں لے آئے، مگر وہ سب خائب و خاسر، ذلیل و رسوا ہوئے اور حافظ ملّت حضرت علامہ حافظ عبد العزیز کی عظمت و جلالت کا ڈنکا بجتا رہا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پورا مبارک پور اور قرب و جوار کے مسلمان حضور حافظ ملّت کے حلقۂ اطاعت و محبت میں داخل ہو گئے اور حریفوں کے ساتھ صرف ایک ٹکڑی اور مٹھی بھر افراد ہی رہے اور اس جہاد باللسان کے معرکۂ عظیم میں حضور حافظ ملّت تن تنہا اپنے تلامذہ کے ساتھ ناقابلِ تسخیر چٹان بنے رہے۔ اپنے اساتذہ و اکابرین کی مدد تو بڑی بات اپنے جلیل القدر و عظیم المرتب رفقاء درس جیسے حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی اشرفی، سلطان المناظرین علامہ مفتی شاہ رفاقت حسین اشرفی مفتئ اعظم کانپور، قافلہ حق کے سپہ سالار حضور مجاہد ملّت حضرت شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی وغیرہ کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی۔ آپ کے حسنِ تدبر کو ہزاروں سلام! کہ اسی معرکہ آرائی کے دوران آپ کے استاذ کریم جن کے حکم پر آپ خدمت دین کا جذبہ لے کر مبارک پور آئے تھے وہ مبارک پور سے متصل سکٹھی میں تشریف لائے اور کئی دن رہ گئے۔ مگر ایسے موقعہ پر تلمیذ ارشد اپنے استاذ کریم سے ملنے نہیں گیا اور نہ استاذ ہی نے قدم رنجہ فرمایا۔ بس حضرت قبلہ سے دعا کی درخواست کے ساتھ سلام بھجوانے ہی پر اکتفا کیا اور مخالفین کی نگاہیں لگی ہوئی تھی، شاگرد استاذ سے ملنے جاتا ہے کہ نہیں اور جب انھیں اپنے ذرائع سے معلوم ہو گیا کہ ایسے نازل موقع پر شاگرد استاذ سے نہیں ملا تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ یہ شخص ناقابلِ تسخیر ہے۔ اور جب حریفوں کے خیمے اکھڑ گئے، ان کے تنبو قنات زمین بوس ہو گئے اور اس فیلڈ کے سارے پہلوان چاروں خانے چت ہو گئے۔

توعزیمت واستقامت کے عظیم پیکر حضرت علامہ حافظ عبد العزیز صاحب قبلہ اپنے عظیم المرتبت استاذ گرامی حضرت اقدس بابرکت علامہ امجد علی اعظمی سے ملنے ان کے درِ دولت پر گھوسی گئے اور مبارک پور میں عدم ملاقات کی توضیح پیش کرتے ہوئے عذر خواہی کی کہ اس دوران اگر میں آپ سے ملاقات کر لیتا تو مخالفین کے حوصلے بڑھ جاتے کہ عبد العزیز کے پاس علم کی جو بھی دولت تھی وہ خرچ کر کے خالی ہو چکا ہے، اس لیے اپنے استاذ سے مدد لینے پہنچ گیا۔ اور اس مناظرے کا سلسلہ ابھی اور چلتا! استاذ گرامی وقار نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ یہ حقیقت میں سمجھ گیا تھا ورنہ تم نہیں آئے تھے ملاقات کے لیے تو میں خود چل کر ملاقات کرتا۔ بہر حال تمہارے اس حسنِ تدبر نے حریفوں کے حوصلوں کو توڑ دیا۔

حضرت خود فرماتے تھے مسلسل چار ماہ تک رات بارہ بجے تک تقریر کرتا اور صبح حسب مقررہ ساری کتابیں پڑھاتا۔ یعنی رات میں تقریر اور دن میں درسگاہ۔ یہ تھی آپ کی خدمت دین اور خدمت علمِ دین اور خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کا اعلیٰ ترین نمونہ جس کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں دل ونگاہ ان کے حضور مؤدب ہو گئے اور ان کے قلوب دینی لذتوں سے آشنا ہوئے۔

اپنے تلامذہ میں دو شخصیتوں کا ذکر خاص طور پر کرتے، ایک حضرت علامہ ارشد القادری اور دوسرے مفکر ملّت حضرت علامہ محمد حنیف قادری براؤں شریف کا۔

فرماتے تھے میری زندگی میں تلامذہ تو بہت آئے مگر ان دونوں کی طرح پھر ان کے بعد ان جیسا کوئی اور طالب علم نہیں ملا۔ ارشد القادری کو تو تم سب جانتے ہو کہ وہ کیسے ہیں۔ محمد حنیف قادری کا نام میں نے حرکت وعمل کی مشین رکھا تھا اور سوچ رکھا تھا کہ فراغت کے بعد اسے اشرفیہ ہی میں رکھوں گا مگر اسے مدرسہ فیض الرسول کے بانی حضرت صوفی شاہ محمد یار علی صاحب نے اپنے ذاتی خرچ پر اسے اپنے دار العلوم کے لیے پڑھایا تھا کہ وہ ایک غریب باپ کا بیٹا تھا۔ میں کبھی اسے بھول نہیں سکا، وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔

رئیس الاتقیاء حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی کا براؤں شریف سے علیٰحدگی کے بعد تو اتنے عظیم ادارے فیض الرسول براؤں شریف کے عملاً وہی سب کچھ ہو گئے۔ ناظمِ اعلیٰ، منیجر وارا کین ان کے سامنے مدِّ فاضل بن ہو گئے۔ فیض الرسول کے ہر شعبے میں انھیں کا حکم جاری وساری ہوتا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انھیں بھی وہاں سے ہٹنا پڑا۔ بڑے بڑے مدارس ان کے لیے جال پھیلائے ہوئے تھے حتیٰ کہ اشرفیہ مبارکپور بھی خواہاں تھا، مگر آپ نے چند در چند وجہوں سے دار العلوم تدریس الاسلام امرڈوبھا کو ترجیح دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک متوسط درجہ کے ادارے کو ملک کے بڑے بڑے دینی اداروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ اپنے وصال سے کچھ سال پہلے وہ ممبئی آئے، ان کا بار بار ممبئی آنا ہوتا اور جب بھی آتے مجھ سے میری آفس واقع دوٹانکی ممبئی نمبر ۴ خود سے چل کر آتے۔ میں بھی ان سے حضور حافظ ملّت اور حضور شعیب الاولیاء کی نسبتوں کے حوالے سے کافی احترام وعقیدت سے پیش آتا تھا۔ ان کی علالت کی خبر پا کر میں کر لا ان کی قیام گاہ پر پہنچا، ملاقات ہونے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے، میں آپ کو شدت سے یاد کر رہا تھا، اچھا ہوا کہ آپ آ گئے۔ میں حضرت کی دلجوئی کے لیے کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ دورانِ گفتگو ذکر چل پڑا حضور حافظ ملّت کا، دورانِ ذکر تلامذہ

پر ان کی کرم نوازیوں کا ذکر چل پڑا۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ حضرت آپ کے بارے میں ایسا ایسا فرمایا کرتے تھے، آپ اور علامہ ارشد القادری صاحب کے بارے میں۔ اپنے تعلق سے حضرت حافظ ملّت کے ان کلمات کو سن کر آبدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے مولانا آپ کو بھی تو ان کی شاگردی کی عزت ملی ہے، آپ کو تو اندازہ ہوگا کہ حضور حافظ ملّت کس پائے کے تھے۔ بے شک ان کے تلامذہ خاص دیوانگی کی حد تک ان سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ انھیں چند لوگوں میں میرا بھی نام ہے، حضرت کے لیے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میں فیض الرسول براؤں شریف کے لیے گورکھپور گیا ہوا تھا۔ کام کے درمیان ہی حافظ ملّت کے لیے بے چین ہو گیا، مجھے ایسا لگا حضور حافظ ملّت کو میری شدید ضرورت ہے اور آپ میرا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر میری بے چینی وحشت کی شکل اختیار کرنے لگی اور میں سب کام چھوڑ کر بغیر براؤں شریف اطلاع دیے میں مبارکپور کے لیے نکل پڑا۔ اور جب میں بھاگم بھاگ وہاں پہنچا تو واقعی حضرت میرا شدت سے انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خوش ہو کر فرمانے لگے تم آ گئے مجھے تمہاری شدید ضرورت ہے۔ اور یہ وقت تھا جب تحریک الجامعۃ الاشرفیہ اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اس تعلق سے حضور حافظ ملّت کو میری شدید ضرورت تھی، یہاں تک کہ میں گھر بار، بیوی بچوں اور فیض الرسول کو بھول کر پندرہ دن مبارکپور رہ گیا۔ یہاں گھر والے مدرسہ والے سب پریشان تھے کہ آخر کہاں چلا گیا، کوئی خیر و خبر کوئی اطلاع نہیں۔ اور جب میں براؤں شریف پہنچا تو اردو، ہندی اخبارات میں دینے کے لیے تلاشِ گمشدہ کا اشتہار تیار تھا۔

تمام تلامذہ خاص میں حضور حافظ ملّت کو علامہ ارشد القادری پر بڑا فخر تھا۔ یوں تو تمام وہ تلامذہ جنھوں نے درس و تدریس، وعظ و تبلیغ اور خدمت دین متین کے لیے کافی جدوجہد کی وہ باعث صد افتخار تھے۔ جیسے امام الحکمت حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب، بدر العلماء حضرت علامہ بدر الدین صاحب، اشرف العلماء حضرت علامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی، حضرت علامہ قمر الزماں خاں اعظمی، حضرت علامہ سیّد کمیل اشرف اشرفی جیلانی، حضرت علامہ سیّد رکن الدین اصدق، علامہ کامل میاں سہسرامی، حضرت اقدس علامہ محمد خلیل کچھوچھوی، مگر علامہ ارشد القادری من کل الجہات ع کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور! کی منزل میں تھے۔ حضرتِ والا کی بارگاہ میں حضرت علامہ ارشد القادری کی پذیرائی کا عالم یہ تھا کہ اگر کبھی دورانِ درس حضرت کی درسگاہ میں پہنچ جاتے تو ان کے لیے حضرت درسگاہ میں کھڑے ہو جاتے، پھر مسند پر اپنے برابر جگہ دیتے، یہ حقیقت میری آنکھوں دیکھی ہے۔

فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ملّا عبد الحکیم سیالکوٹی علیہ الرحمہ کو ان کے علم و فضل اور ان کے حسنِ خدمات اور بے پناہ تبحر علمی کے سبب بادشاہِ وقت انھیں ہیرے جواہرات کے برابر تولا کر ان کا صدقہ اتارا کرتے تھے۔ اگر میرے پاس اتنی وسعت ہوتی تو میں ایک پلڑے میں ہیرے جواہرات رکھتا اور دوسرے پلڑے میں ارشد القادری کو، پھر ہیرے جواہرات سے تولا کر اسے ارشد القادری کا صدقہ اتار کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔ براؤں شریف مشرق کی طرف کم و بیش اٹھارہ کلومیٹر شمال مشرقی یوپی کا مشہور شہر ہانسی ہے جو سدھارتھ نگر کی جگہ ضلع ہوتے رہ گیا۔ پل کے اس طرف ہانسی اور اس

طرف نرکٹھا نام سے ایک بڑی آبادی ہے، جس میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے، جس میں غریبوں کی ایک بڑی تعداد بستی تھی۔ انھیں میں ایک غریب مسلمان حضور حافظ ملّت کا مرید بھی رہتا۔ نصف صدی سے زیادہ دن کی بات ہے نام یاد نہیں رہ گیا، وہ اپنے گھر میں ہاضمولے کا چورن بناتے اور اس کو لے کر گاؤں گاؤں بازار بازار بیچتے تھے۔ وہ براؤں شریف چورن بیچتے ہوئے آجاتے اور بڑی کڑک آواز سے اپنے بنائے چورن کا ایک قصیدہ خوانی کرتے، جس کو نہیں لیتا ہو وہ بھی لے لیتا۔

وہ غریب سال بھر میں بڑی پابندی کے ساتھ ایک بڑا جلسہ کرتا، جس میں خصوصی خطاب حضور حافظ ملّت کا ہوتا۔ اس زمانے میں بڑے یا چھوٹے جلسوں کے لیے آج کی طرح چندے کا رواج نہیں تھا۔ اس جلسے کا نہ کوئی اشتہار چھپتا نہ بڑا عالیشان اسٹیج، بس جب انھیں اپنے مرشد حضور حافظ صاحب قبلہ سے تاریخ مل جاتی تو گاؤں گاؤں اور بازار بازار گھوم گھوم کر چورن بھی بیچتے اور اپنے جلسہ کا اعلان بھی اپنے مخصوص لب و لہجے میں کرتے۔ وقت مقررہ پر ہر جانب سے دور و نزدیک سے مسلمان خوب جمع ہوتے۔ براؤں شریف مدرسہ سے بھی لوگ راتوں رات اتنی دور چلے جاتے۔ ایک بار ہم بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ راتوں رات براؤں شریف سے چل کر اس جلسے میں شریک ہوئے ہیں۔

ایک چھوٹی سی چوکی، اس پر ایک معمولی سی کرسی، روشنی کا انتظام بھی کافی محدود، فرش بھی ناکافی، آدھا مجمع زمین پر، فرش پر بیٹھتا اور آدھے سے زیادہ کھڑے ہو کر سنتا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد حضرت اپنے اسی غریب مرید کے گھر پر قیام فرماتے۔ صبح جب چلنے لگتے تو اپنے میزبان سے رات کے اس جلسے پر کتنا خرچ ہوا، پھر جو بھی خرچ وہ بتاتا اسے اپنے جیب سے نکال کر دے دیتے۔ نہیں نہیں کرنے کے بعد پھر سمجھاتے تم ایک غریب آدمی ہو، سال بھر ایک بار دین وسنیت کی یہ خدمت جو تم کرتے ہو یہ بہت بڑی بات ہے، اور پھر چلتے۔ وہ زادِ سفر کے نام پر کچھ پیش کرنا چاہتا تو وہ بھی نہیں لیتے جبکہ اس زمانے میں مبارکپور سے ہانسی پہنچنے کے لیے تین بسوں کو بدلنا پڑتا تھا۔ اور یہ پروگرام ہر سال ہانسی کے نرکٹھا میں ہوتا اور حضور حافظ ملّت بڑے بڑے پروگرام پر اسے ترجیح دیتے۔ اس طرح ایک بڑی آبادی کی دین وسنیت کو حضور حافظ ملّت کے اس جذبۂ ایثار و اخلاص نے بچالیا۔

حضرت حافظ ملّت کا یہ کردار آج کے پیرانِ طریق اور مقررین، واعظین وخطبا کے لیے باعث تقلید ہے۔ اور ان کے لیے درسِ عبرت بھی! اور یہی حقیقت میں خدمت دین متین ہے! حضور حافظ ملّت کی بارگاہ میں ان کے ایک معمولی شاگرد کی جانب سے یہ صرف ایک نذرِ عقیدت ہے اور بس! ع گر قبول افتد زہے عز و شرف! ورنہ ان کی عظمت و کرامت اور ان کے صبر و تحمل کے تعلق سے میرے پاس عرض کرنے کو بہت کچھ ہے مگر اس وقت میری آنکھیں قلم کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہیں۔ ؎

ان کا سایہ اک تجلی نقشِ پا ان کا چراغ
وہ جدھر گزرے ادھر ہی روشنی ہوتی گئی

☑☑☑☑☑☑

صاحبِ دیدۂ بینا تیری عظمت کو سلام

معمارِ ملّت، مصدرِ فیوض برکات، پیکرِ صبر و صداقت، استاذ العلماء حضرتِ اقدس بابرکت علامہ حافظ مفتی عبد العزیز محدث مرادآبادی ثم مبارکپور علیہ الرحمہ والرضوان کے ارشد تلامذہ کی پہلی صف میں ایک بڑا نام، ایک بڑا چہرہ، ایک بڑی شخصیت! درسگاہوں پر جس کے شکوہِ علمی کا دبدبہ، جس کے حزم و اتقا، تصلب و تفرد، اخلاص و عمل اور مخصوص انفرادیت کا آوازہ۔ خود اعتمادی، خدا اعتمادی، توکل و استغناء، اصول و ضابطہ، خلوص وللّٰہیت! ادب و حسنِ ادب، شرافت و سعادت و بے نفسی کی پاکیزہ خوشبو! الحُبُّ فی اللّٰہ وَالبُغض فی اللّٰہ اور حُبِّ رسول کی چھٹکی چاندنی، نہ صرف پورے ملک کے دینی و علمی حلقوں بلکہ بیرونِ ملک کے تقریباً تمام علمی و دینی و مذہبی حلقوں میں دور بہت دور تک اس کے علمی، قلمی، فکری فیضان کا اُجالا پھیلا ہوا ہے۔ اس کے اخلاص فی الدین و تصلب فی الدین، عقیدہ فکر کے محاذ پر گمرہی و بے دینی کے سامنے ایک مضبوط باندھ بنا ہوا ہے۔

معاصرین زمانہ تو الگ رہے، خود ان کے اساتذہ کرام اور اساتذہ کرام کے رفقاء درس ہوں یا مرشدانِ گرامی یا دیگر اکابر اہلِ سنّت! سبھوں کے دلوں میں آپ کے لیے نہ صرف جگہ تھی بلکہ والہانہ پذیرائی کے ساتھ احترام بھی! اور خود آپ اپنے بڑوں بالخصوص اپنے اساتذہ کرام و اساتذہ کی منزل میں آنے والی تمام شخصیات کی بارگاہ میں سراپا ادب و نیاز تھے۔ اور ان کی تعظیم و تکریم اپنے اساتذہ ہی کی طرح کرتے تھے۔

اور اپنے ہم زمانہ معاصرین علماء دین میں جسے علمِ دین و خدمت دین متین اور دین و سنیت کی ترویج و اشاعت میں مخلص و کوشاں پاتے، ان کے لیے بچھ جاتے۔ انھیں بہت عزت و احترام دیتے۔ خواہ ان کا تعلق شعبۂ درس و تدریس ہوتا، یا شعبۂ تصنیف و تالیف سے۔ شعبۂ وعظ و تبلیغ سے یا شعبۂ رشد و ہدایت سے یا میدانِ مناظرہ سے! جیسے اشرف العلماء حضرتِ اقدس بابرکت علامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی، خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی، بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان اعظمی، رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری، مولانا عاشق الرحمٰن الہ آبادی، علامہ مفتی نظام الدین مرادآبادی، علامہ شعبان علی نعیمی، علامہ قمر الزماں اعظمی، مجاہد سنیت، مردِ بے باک مولانا عبد القدوس کشمیری وغیرہ وغیرہ۔ وہ نہ کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے اور نہ ہی کسی سے مرعوب ہوتے۔ شخصیت چاہے جتنی بھاری بھر کم ہو ان کی اپ حیثیت عرفی چاہے جتنی بلندیوں کا نمود لیے ہوئے ہو۔ اگر وہ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت مجدد دین وملّت آیۃٌ من آیات اللّٰہ حضرت مولانا شاہ امام احمد رضا قادری سنّی حنفی محمدی کے عطا کردہ معیارِ حق سے سرمو انحراف پاتے، ارادۃً یا سہواً اس کا احتساب ضرور کرتے اور اس کی شرعی گرفت فرماتے۔

ان کے سامنے مسئلہ حق میں نہ کسی کی تیزی و طراری کام آتی اور نہ بقراطی و طلاقت لسانی! وہ مولیٰ تعالیٰ کے اس فرمان

یاایھا الذین آمنوا لِما تقولون مالا تفعلون الخ پر سختی سے عمل پیرا تھے۔

ان کا سارا علمی سرمایہ کسبی تھا وہبی نہیں، مطالعہ بہت وسیع اور مشاہدہ بہت گہرا۔ اپنے زمانے میں علومِ امام احمد رضا پر سب سے بڑے اتھارٹی! اخلاص فی الدین تصلب فی الدین یہی ان کی شناخت تھی اور معاصرین کے درمیان یہی طرۂ امتیاز!۔

انھیں جانا انھیں مانا نہ رکھا غیر سے کام
للہ الحمد میں دنیا سے مسلمان گیا

یہ تھے زبدۃ الاتقیا، شیخ الاساتذہ استاذ الفقہا، سندالمحققین، بدرالکاملین، فخرالمدرسین حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی شاہ بدرالدین احمد قادری رضوی صدیقی مصنف سوانح امام احمد رضا خاں بریلوی۔

حضرت بدرالعلماء کی ولادت ۸ ۱۳۴۸ھ مطابق ۱۹۲۹ء ننہال حمید پور میں ہوئی۔ تعلیم کے ابتدائی مراحل سے گذر کر مدرسہ انوارالعلوم قصبہ جین پور ضلع اعظم گڈھ میں داخلہ لیا۔ یہ آپ کی سعادت ہی تھی، وہاں پر ایک ایک خدارسیدہ صاحبِ تقویٰ بزرگ عالمِ دین حضرت مولانا محمد خلیل صاحب کچھوچھوی علیہ الرحمہ کے زیر سرپرستی ونگرانی میں درسِ نظامی کی ابتدائی کتابوں کا آغاز ہوا۔ مسلسل چار سال وہاں زیر تعلیم رہے، وہاں پر آپ نے ایک مثالی طالب علم کا گہرا نقش چھوڑ کر انھوں نے دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور میں داخلہ لیا۔ پھر اپنی سخت محنت، بھرپور جدوجہد، اپنے حسنِ اخلاق وحسنِ عمل وحسنِ سعادت اور شرافت نفس سے اساتذہ کرام کے دلوں میں اپنی جگہ اور طلباء اشرفیہ میں اپنا ایک مقام بنالیا۔ اس وقت اشرفیہ میں قابل ترین اور اصحابِ فضل وکمال اساتذہ کرام تھے۔ استاذ العلماء، جلالۃ العلم حضرت مولانا حافظ عبدالعزیز مرادآبادی، صدر المدرسین وشیخ الحدیث دارالعلوم اشرفیہ، شیخ العلماء علی الاطلاق، شیخ الادب بالاتفاق استاذ علماء المتجرین حضرت مولانا غلام جیلانی اعظمی اور آپ کے تلمیذ ارشد، بادشاہِ علم وفن، سلطان الواعظین حضرت مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی، محقق عصر امام الحکمت حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی، شیخ القراء حضرت مولانا قاری محمد یحییٰ ناظمِ اعلیٰ دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور علیہم الرحمۃ والرضوان۔

۱۰ رشعبان المعظم ۱۳۷۱ھ مطابق ۵ رمئی ۱۹۵۲ء دستارِ علم وفضل سے نوازے گئے اور دارالعلوم اشرفیہ نے سند فضیلت سے سرفراز فرمایا۔

خود ہی فرماتے ہیں استاذ کریم حضور حافظ ملّت کے مشورے کے مطابق ایامِ رمضان کی تعطیل گذار کر شوال ۱۳۷۱ھ دارالعلوم اشرفیہ مبارکپور حاضر ہوا اور تدریسی مشق کے لیے ادارہ ھذا کے طلباء کو ۲ ررجب ۱۳۷۲ھ تک عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھاتا رہا۔

پھر حضور حافظ ملّت نے مجھے ضلع بلیا کے ایک گاؤں کٹواری بھیجا۔ پھر وہاں سے حضور حافظ ملّت کے حکم پر انجمن معین الاسلام بستی شہر میں آئے اور ڈھائی برس تک وہاں کے طلبا کو تعلیم دینے کے بعد مستعفی ہونے کے چار ماہ بعد، حضرتِ اقدس

بابرکت حضور شعیب الاولیاء مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قادری چشتی بانی فیض الرسول براؤں شریف نے اپنے دار العلوم فیض الرسول کے لیے براؤں شریف بلایا اور تقریباً اٹھارہ سال تک وہاں بحیثیت صدر المدرسین رہے۔ جب حضور شیخ العلماء حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی علیہ الرحمہ بحیثیت شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول میں تشریف لائے تو تلمیذ ارشد نے اپنے عظیم المرتبت استاذ کے لیے اپنی مسند چھوڑنا چاہا مگر استاذ کریم حضرت شیخ العلماء اپنے شاگرد رشید حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی کو اس منصب سے ہٹنے نہیں دیا اور آپ کی صلاحیتوں کے پیشِ نظر آپ پر مکمل اعتماد کیا۔ اور حضرت قبلہ نے بھی ہر حال میں اپنے استاذِ کریم کے اعتماد پر پورے اترے، آپ کے اشارے کو اپنے لیے حکم سمجھا اور ہمیشہ بڑی نیازمندی کے ساتھ بحیثیت صدر المدرسین نہیں بلکہ ایک شاگرد نیاز پیشہ ہی کا انداز باقی رکھا۔ اس وقت براؤں شریف میں جید ترین اساتذہ کرام کا اجتماع تھا۔ حضرت علامہ محمد یونس نعیمی اشرفی، حضرت علامہ حکیم نعیم الدین صدیقی رضوی، حضرت علامہ محمد صابر نسیم بستوی، حضرت علامہ محمد حنیف قادری، فقیہ ملّت حضرت علامہ مفتی حافظ جلال الدین احمد امجدی، جس میں ہر ایک اپنی جگہ مکمل استاذ تھا۔ اور یہ سب حضرت شیخ العلماء قبلہ کے تلامذہ در تلامذہ کی منزل میں تھے۔

حضرت سارے اساتذہ کے نام کے ساتھ صرف مولوی لگاتے تھے۔ مولوی امجدی، مولوی صدیقی، مولوی نعیمی، مولوی محمد حنیف وغیرہ مگر جب حضرت کو بلانا ہوتا یا ان کو مخاطب کرنا ہوتا تو فقط بدر الدین ہی کہتے، نہ مولوی نہ مولانا۔

اور لفظ بدر الدین میں جتنی محبتیں اور شفقتیں ہوتیں اس کو صرف محسوس ہی کیا جاسکتا تھا۔ اور حضرت قبلہ بھی اپنے محسن و کریم استاذ کے اس پُر شفقت انداز پر اپنے استاذ کے لیے دار العلوم اشرفیہ کے بدر الدین بن جاتے۔ بایں فضل و کمال دار العلوم فیض الرسول میں وہ اپنے استاذ کے حضور میں وہ ایک باادب وسعادت مند شاگرد ہی رہے۔ مِمَّنْ سَبَقَتْ لَهُمُ الْحُسْنٰى۔

میں راقم الحروف وارث جمال اپنے عہد طالب علمی کا ایک بڑا حصہ براؤں شریف میں گذارا اور بحیثیت طالب علم ان کے قدموں میں شاگرد ہی نہیں بلکہ خادم کی بھی حیثیت تھی اور میں ان کے مزاج میں دخیل بھی تھا۔ مجھ سے فرماتے تھے عزیزم سلمہٗ یہ جو بدر الدین ہے نا، یہ اشرفیہ مبارکپور میں بہت محنت کرتا تھا۔ مؤدب وسعادت مند بھی تھا، وہ طالب علمی میں بہت خوش خط تھا۔ جب میں دار العلوم اشرفیہ میں مدرس تھا تو مولوی، عالم، فاضل الہ بورڈ سے امتحان اور ان طلبا کے امتحان کی تیاری بھی میرے ذمہ تھی اور اس زمانے میں امتحان دینے کا سینٹر الہ آباد تھا۔ اس وقت پروفیسر شبیر حسن غوری جو ایک زبردست عالم بھی تھے، وہ طلبا کے امتحان کے نگراں ہوتے تھے۔ ایک سال جب میں بدر الدین کی جماعت کو امتحان دلانے کے لیے الہ آباد لے گیا (غالباً) اس وقت سوالات وجوابات عربی زبان میں ہوتے تھے۔

غوری صاحب ہر طالب کی نگرانی بڑی سختی کے ساتھ کرتے اور چل چل کر ہر طالب تک پہنچتے مگر وہ جب بدر الدین کے ٹیبل پر آتے تو وہیں رک جاتے اور کافی دیر تک اس کو لکھتا ہوا دیکھتے رہتے، پھر مسکراتے ہوئے میرے پاس آتے اور فرماتے، مولانا آپ نے اس شاگرد پر کافی محنت کی ہے۔ وہ اتنا اچھا لکھتا ہے اور تحریر بھی اتنی پاکیزہ اور صاف وستھری ہے

اس کو تحریر پر بھی نمبر ملنا چاہیے۔
آپ کی خطاطی لکھنؤ کے مشہور خطاط مرزا قیصر کی خطاطی کو بھی مات دیتی تھی۔ حضرت قبلہ اس کی خطاطی کی فنی اصلاح بھی کرتے تھے۔
حضور شیخ العلماء قبلہ علیہ الرحمہ اپنے تلمیذ ارشد پر کس قدر اعتماد کرتے تھے کہ اگر کوئی فتویٰ تصدیق کے لیے لایا جاتا تو حضور والا اپنے تمام تر علمی تبحر کے باوجود اس پر تصدیق میں جب تک حضرت کا نام نہیں دیکھ لیتے دستخط نہیں کرتے، جبکہ ان کے تلامذہ کی طویل فہرست میں وقت کے امام غزالی و رازی و بادشاہِ علم و فن کی اچھی خاصی تعداد کھڑی نظر آتی ہے۔ ایک بار ہم لوگ حضرت کی درسگاہ میں سبق پڑھ رہے تھے۔ دورانِ درس ایک دیہاتی ہاتھ میں ایک استفتاء اور اس کا جواب لیے آپہنچا اور کہنے لگا حضرت صاحب اس پر دستخط کر دیجیے۔ حضرت نے دورانِ درس ہی اسے لے کر دیکھا تو اس میں حضرت بدر العلماء کا دستخط نہیں دیکھا، تو حضرت نے کہا ارے خدا کے بندے! سیدھے یہیں کیوں آگئے۔ کہنے لگا حضرت یہاں تو آپ ہی سب سے بڑے مولانا ہیں اس لیے پہلے آپ دستخط کریں گے تب تو دوسرے مولانا صاحبان دستخط کریں گے، تو حضرت نے اس دیہاتی سے فرمایا کہ پہلے جا کر اس پر بدر الدین کی دستخط لے کر آؤ۔ وہ حضرت کی بات نہیں سمجھ پایا۔ جب اسے کشمکش میں پایا تو ایک طالب سے فرمایا تم اسے بدر الدین کی درسگاہ تک پہنچا دو اور ساتھ ہی بدر الدین کے بارے میں اسے بتا بھی دو۔
جب وہ چلا گیا تو مسکرا کر فرمانے لگے، بدر الدین اس کے کہنے سے دستخط کر دے گا۔ وہ اس دیہاتی سے کہے گا کہ اس فتویٰ کو یہیں چھوڑ دو اور اتنے دن کے بعد آکر لے جانا۔ پھر ہم لوگوں سے حضرت کے بارے میں بڑی مسرت کے عالم میں فرمانے لگے، بدر الدین کی نگاہیں بڑی تنقیدی ہیں، اور کسی بھی مسئلے میں تحقیق و تنقید اس کی فطرت کا ایک حصہ ہے۔ اگر کسی فتوے پر اس کا دستخط ہے تو میں ایک سرسری نگاہ ڈال کر اس کے دستخط پر اعتماد کرتے ہوئے دستخط کر دیتا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ اس سے دینی معاملے میں چوک نہیں ہو سکتی!
اسی طرح ایک بار ہم لوگ فقیہ ملّت حضرت مولانا مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ کی درسگاہ میں کافیہ پڑھ رہے تھے تو ایک دیہاتی دورانِ درس درسگاہ میں سر اٹھا کے چلا آیا اور پڑھانے کے دوران ہی زور زور سے کہنے لگا کہ اے مولانا صاحب! یہاں پر بڑے مولانا صاحب کون ہیں۔ حضرت بدر العلماء علیہ الرحمہ کو وہاں بڑے صاحب ہی کہا جاتا بلکہ حلقہ فیض الرسول میں دور و نزدیک بڑے مولانا ہی کہا جاتا اور جب بھی لفظ بڑے مولانا کا اطلاق ہوتا اس سے مراد آپ ہی کی ذات ہوتی۔
حضرت مفتی صاحب قبلہ نے زور دے کر فرمایا، تم کو ان سے کون سا کام پڑ گیا جو تم بڑے مولانا کو پوچھتے ہو۔ تو وہ شخص دیہاتی زبان و دیہاتی لب و لہجے میں کہنے لگا، ہمار لڑکوا ان کے یہاں اتنے دنوں میں صرف دو پنّا پڑھا ہے جبکہ تہرے یہاں (یعنی آپ کے پاس) بیس پنّا پڑھا ہے، تو بڑے مولانا تو آپ کو ہونا چاہیے، وہ دو پنّا پڑھا کر کیسے بڑے مولانا ہو گئے۔
حضرت مفتی صاحب قبلہ بڑی حیرت سے کہنے لگے، ارے بدھو تو آیا کہاں سے، تجھ کو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ

تمہارا لڑکا ان کی درسگاہ میں بیٹھنے کے لائق تو ہوا۔ یہی کیا کم تھا یہ تو بہت بڑی بات ہوگئی کہ تمہارا لڑکا اتنے دنوں میں ان سے دو ورق تو پڑھ لیا۔ ان کا دو ورق پڑھا دینا ہم لوگوں کے بیس ورق پر بھاری ہے۔ یہ قیمتی احساس حضرتِ والا کے تعلق سے وہاں کے اساتذہ کرام کا تھا۔ اساتذہ فیض الرسول سے مراد حضور شیخ العلماء قبلہ کے علاوہ جو اساتذہ کرام تھے۔ آپ کی ذات اپنے علمی تبحر میں کنز الدقائق و بحر الحقائق تھی۔ تمام اساتذہ، تلامذہ در تلامذہ کی منزل میں تھے۔ چونکہ فیض الرسول میں حضرت شعیب الاولیاء کی حیاتِ ظاہری میں اس کے آپ کے فرزند ارجمند خانقاہ فیض الرسول کے سجادہ نشین و دار العلوم کے ناظمِ اعلیٰ حضرت خلیفۃ صاحب کے طویل دورِ نظامت تک وہاں کے اساتذہ ملازم نہیں تھے۔ بلکہ عملاً وہی حاکم اور دار العلوم کی تعلیم و تعمیر کے ذمہ دار بھی تھے اور ہر ایک حتی المقدور اپنے قامت کے اعتبار سے فیض الرسول کو ہمہ جہت نئی بلندیوں تک لے جانے کے لیے رات دن کوشاں رہتے۔ اور اس تعلق سے سب سے بڑی ذمہ داری حضرت بدر العلماء کی تھی اور وہ اپنے منصب جلیل سے بہت اوپر اٹھ کر دن رات ایک کیے ہوئے تھے۔ وہ اور فیض الرسول ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے۔ ان کے بغیر فیض الرسول اور فیض الرسول کے بغیر ان کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ فیض الرسول ہی میں آ کر آپ کو کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ کہ فیض الرسول کو نئی بلندیوں تک لے جانے اور پورے ملک میں اس انفرادیت کا حامل بنانے میں ان کے راستے میں کوئی اسپیڈ بریکر نہیں تھا۔ بانی ادارہ حضور شعیب الاولیاء کو ان پر پورا اعتماد تھا اور حضرت استاذِ محترم اپنے مشفق و کرم فرما کے اس اعتماد کو دن بدن مضبوط کرتے رہے، حتیٰ کہ اپنی عمر کے آخری پڑاؤ پر جب خانقاہ فیض الرسول و دار العلوم فیض الرسول کی رجسٹری فرمائی تو اس میں آپ کو بھی شامل کیا۔ جہاں خانقاہ و دار العلوم کے ارکان میں اگر اپنے فرزند ارجمند حضرت سیدنا خلیفۃ صاحب اپنے دوسرے بلند اقبال صاحب زادے محمد فاروق اور اپنے مخلص و معتمد و اہم ترین مریدوں جیسے سیٹھ محمد یوسف رئیس نانپارہ، بابو محمد شفیق، بابو شار، بھتیجے دفتری محمد اسحاق کا نام تھا، وہیں پر بدر الدین احمد قادری کا بھی نام تھا۔ قابلِ ذکر خانقاہوں اور دینی اداروں میں یہ خصوصیت خانقاہ و دار العلوم فیض الرسول ہی کو حاصل تھی کہ ایک ایسا مدرس جو نہ مرید تھا اپنے خاندان کا نہ گاؤں و قرب و جوار کا تحصیل و ضلع کا بھی نہیں۔ اسے ایک عظیم ادارہ و ایک عظیم خانقاہ کی حاکمِ اعلیٰ باڈی کا رکن خصوصی ہو۔ صدر المدرسین و ناظمِ تعلیمات کے ساتھ ہی ساتھ وہ ادارہ و خانقاہ کا رکن بھی ہو۔ یہ امتیاز، یہ خصوصیت اور یہ اعزاز وہبی نہیں کسبی تھا۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

یہیں پر آپ کی صلاحیتوں کو جلا ملی اور یہیں سے آپ کا علم فیض بخش عام و خاص ہوا۔ ہم نے اپنے ایک طویل مقالے میں جو بارہ سال پہلے اپنے استاذ کریم حضرتِ اقدس بابرکت امام النحو شارح بخاری حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی محدث میرٹھی کی بارگاہ میں بطورِ خراجِ عقیدت لکھا تھا۔ جو کتاب مستطاب صدر العلماء محدث میرٹھی حیات و خدمات۔ بڑے سائز کے پندرہ سو صفحات سے زائد دو ضخیم جلدوں میں آپ کے فرزند نسبتی حضرت علامہ حافظ محمد ایوب اشرفی شمسی نے

اپنی ترتیب و اہتمام میں ادارہ ترویج و اشاعت مسجد نور الاسلام بولٹن (یو کے) سے شائع فرمایا کہ ہم تلامذہ و اہلِ عقیدت کے سروں کو اپنے احسانات سے بوجھل کرتے ہوئے ہمیشہ کے لیے ممنون و مشکور کرلیا۔ فجز اہ اللہ احسن الجزاء۔

یہ بات نصف صدی پہلے کی ہے، ایک دن حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ اپنی درسگاہ میں اہل اللہ اور بزرگانِ دین کے فیضانِ نظر پر گفتگو فرمارہے تھے کہ وہی علم چلا پاتا ہے اور وہی فیض بخش عام و خواص ہوتا ہے جس پر کسی بزرگ و اہلِ دل کی نگاہ کیمیا اثر پڑجائے۔ اور فیضانِ نظر کی مثال میں خود کو پیش کیا ہے۔ ایک صاحبِ دل، ایک صاحبِ نظر کیمیا اثر اور ایک ولی کامل حضرتِ اقدس بابرکت سیّد شاہ حافظ محمد ابراہیم صاحب قادری قدس سرہ سراوہ شریف میرٹھ یوپی متوفی ۱۳۱۷ھ جن کی بارگاہ میں راقم الحروف وارث جمال کو حاضری و فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل ہے۔ آپ کی درسگاہ میں فیضانِ نظر کے واقعات میرے مضمون کتاب کی جلد اول کے ۶۰۴ سے لے کر صفحہ ۶۰۷ تک پھیلا ہوا ہے۔

ان کے روحانی فیوض و برکات، تصرفات و کرامات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں، آج غلام جیلانی جو کچھ ہے سب انھیں کا فیضانِ نظر ہے۔ دیکھو! میں نہ پیر ہوں، نہ فقیر ہوں، نہ امیر ہوں، نہ رئیس ہوں، نہ خطیب ہوں بلکہ میں ہوں اور یہ مدرسہ اور اس کی چار دیواری۔ خدا کے فضل و کرم سے تحدیث نعمت کے طور پر کہتا ہوں کہ میری دھمک کہاں نہیں۔ علم و فضل کی وہ کون سی مجلس ہے جہاں غلام جیلانی کا تذکرہ نہ ہو، آنکھیں بند کر کے میرا جوڑ ہند و پاک میں تلاش لو۔ مگر یہ سب کچھ میرا اپنا کمال نہیں، بلکہ یہ صدقہ ہے، عطا ہے، ایک صاحبِ دل درویش کامل کی ایک نگاہ کا۔ جو سراوے شریف میں آسودہ خاک ہے۔

نہ تخت و تاج میں نہ لشکر و سپاہ میں ہے جو بات مردِ قلندر کی اک نگاہ میں ہے

اس وقت درسگاہ میں میرے رفیقانِ درس میں سے مولانا سیّد کلیم جائسی، مولانا مفتی محمد فاروق بریلوی، مولانا محمد شاہد سنبھلی، مولانا صوفی عبدالعزیز اجاگر پوری بستوی اور میرے بڑے بھائی مولانا محمد عارف مصباحی بھی تھے۔ حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے فیضانِ نظر کے ضمن میں میں نے اسی وقت حضرت اقدس، بدرِ شریعت کے تعلق سے یہ لکھا تھا کہ

کچھ اس نوعیت کا معاملہ شیخ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری رضوی صدر المدرسین مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر یوپی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ حضرتِ اقدس علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری رضوی کے علم و فضل کی دھمک، ان کے تصلب فی الدین کا شہرہ، ان کے کردار و عمل کی دھوم یہ سب صدقہ ہے، عطیہ ہے، کرم اور فیضانِ نظر ہے۔ حضور شعیب الاولیاء حضرت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قادری چشتی قدس سرہ العزیز بانی دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کا۔ حضور شعیب الاولیاء کے کرم کی برسات اور ان کے فیضانِ نظر کا سحاب علامہ پر ٹوٹ کر برسا اور ان کے سارے وجود کو جل تھل کر گیا۔

اخذ و اثر پذیری اور اپنی سعادتوں سے اس ابر کرم کو جذب بھی کیا۔ ان کا علم چمکا، چلا پایا، فیض بخش خواص و عوام ہوا۔ برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش اور نیپال کی کم ہی دینی درسگاہیں اور مکاتب ایسے ہوں گے جہاں ان کے علم کا فیضان نہ پہنچا

ہو۔تعمیر ادب کے پانچ حصے، فیض الادب اول، دوم، جواہر المنطق، عروس الادب، تعمیر قوائد و وجوہ اعراب اور سوانح اعلیٰ حضرت کے حوالے سے تو ایشیا سے لے کر یورپ و امریکہ و افریقہ تک جہاں جہاں اعلیٰ حضرت کے عشق وعقیدت کی شمع جل رہی ہے، ان کے فضل وکمال اور عشق رسول کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور ان کی بزمِ محبت سجی ہوئی، وہاں وہاں حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری ایک سند وحوالہ کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں۔ جو سرتا سر فیضانِ حضور شعیب الاولیاء، عاشق محبوبِ کبریا حضرت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قدس سرہ العزیز کا۔

مولوی ہرگز نہ شد مولانا روم | تا غلام شمس تبریزے نہ شد

میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا وہ یعنی حضور شعیب الاولیاء مولانا ہی نہیں مولاناؤں کے باپ دادا تھے۔ بدرالدین کی تربیت انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔ وہ حضرت شاہ صاحب بانی فیض الرسول سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ آپ کے دل میں حضرت کے لیے بڑا احترام تھا اور یہ احترام وعقیدت یکطرفہ نہیں تھا، اساتذہ فیض الرسول میں حضرت شاہ صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ صاحبِ اثر ورسوخ حضرتِ والا ہی تھے۔ آپ کی ہر بات سنی جاتی، مانی جاتی اور اس پر عمل کیا بھی جاتا۔ دارالعلوم فیض الرسول کو تعلیمی طور پر سنوارنے سجانے، اسے مخصوص انفرادیت دینے اور ملک کے بڑے بڑے دینی اداروں کی پہلی صف میں جگہ دینے میں زیادہ تر حضرت علیہ الرحمہ ہی کا خونِ جگر شامل ہے۔ کچھ نامساعد حالات کے سبب اپنے آبائی وطن راؤت پار ضلع گورکھپوری کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر براؤں شریف ہی کو اپنا وطن بنالیا تھا، وطناً وہ گورکھپوری سے بستوی ہو گئے، مگر گورکھپوری سے بستوی ہونا بھی راس نہیں آیا۔ فیض الرسول براؤں شریف جن کی حیات کا بڑا قیمتی حصہ وہاں گذرا، وطن اصلی سے ان کے لیے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ براؤں شریف ان کی شناخت بن چکی تھی فیض الرسول کے حوالے ہی سے اور فیض الرسول میں رہ کر اپنے دینی وعلمی وقلمی ودرسی خدمات سے دور دور تک جانے مانے اور پہچانے گئے۔ تمام دینی درسگاہوں اور علماء عصر کے دلوں میں ان کا علمی دبدبہ وشہرہ وہیں سے قائم ہوا۔ ان کی مخصوص انفرادیت کا سکہ وہیں سے رائج ہوا۔ ان کا تفرد اور اخلاص فی الدین وتصلب کا آوازہ وہیں بلند ہوا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا بلکہ کسی بھی کے وہم وگمان و حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا، لازم وملزوم، صفت وموصوف بھی ایک دوسرے سے الگ ہو سکتے ہیں؟

مگر ان کی تقدیر میں ابھی ایک اور ہجرت لکھی تھی، وطن ثانی سے وطن ثالث کی طرف شدِ رحال کرنا تھا۔ تقدیر بھی کیسے کیسے گل کھلاتی ہے، خانقاہی سیاست بھی بڑی عجیب وغریب اور کبھی کبھی بہت بے رحم ہو جاتی ہے۔

گہہ بر طارم اعلیٰ نشینم | گہہ بر پائے پشت خود نہ بینم

بہر حال آپ نے ایک ہجرت اور کی اور ایک شدِ رحال اور فرمایا! وہ بھی بڑی بے سروسامانی کے عالم میں۔

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ چمن ہم تو سفر کرتے ہیں

وطن سے بے وطن ہونا کوئی اس سے پوچھے جو اس مرحلے سے گذرا ہو۔ بے وطنی کے درد کا اندازہ تو وہی کر سکتا جو منزل سے گذرا ہو۔

خاک وطن از ملک سلیماں خوشتر
خار وطن از سنبل و ریحاں خوشتر

(حافظ شیرازی)

بدر العلماء حضرت علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رضوی کو درد کی اس منزل سے دو بار گذرنا پڑا۔

قافلہ درد کا اس رات کی تاریکی میں
منزل ضبط کا رہ رہ کے پتہ مانگے ہے

بہر حال بدر العلماء اور فیض الرسول یہ مستقل ایک موضوع ہے جو باب نہیں کتاب چاہتا ہے۔

بدر العلماء کا فیض الرسول سے شدرِ حال یہ دوسرا موضوع اپنے تمام تر جذباتی پس منظر کے ساتھ اس کے لیے بھی ایک مستقل کتاب چاہیے۔

ان کی حیات کا تیسرا موضوع ''بدر العلماء اور مدرسہ غوثیہ'' اپنے تمام تر پس منظر و پیش منظر کے ساتھ بڑی وسعت لیے ہوئے ہے۔ اس تعلق سے مجھے کسی کا شرمندہ احسان نہیں ہونا ہے کہ ان تمام حالات اور اس خانقاہی سیاست کا ایک حصہ میں بھی تھا، فیض الرسول کی خانقاہی سیاست میں گلے گلے تک! میں کوئی عام سا طالب علم نہیں تھا، بلکہ اپنی پشت پر ایک بڑا پس منظر لیے ہوئے، جس کی ایک بڑی تفصیل ہے۔ سب سے پہلے اس خانقاہی سیاست کا شکار میں خود ہوا۔ پہلی بجلی مجھی پہ گری، نزلہ عضو ضعیف پر اترا اور مجھے بادلِ ناخواستہ آنسوؤں اور سسکیوں کے ساتھ براؤں شریف چھوڑنا پڑا۔ میں نے صرف فیض الرسول نہیں چھوڑا بلکہ وہاں اپنا بہت کچھ چھوڑ کر آنا پڑا، جن کی یادوں سے ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکا۔

پیشانی حیات پر کچھ ایسے بل پڑے
ہنسنے کو جی چاہا تو آنسو نکل پڑے

حیات نے وفا کی، میری آنکھوں نے قلم کا ساتھ دیا تو حضور بدر العلماء کے تعلق سے یہ تینوں موضوع میری نگاہوں میں ہیں۔ مجھے کسی کی بھی پرواہ نہیں ہوگی کہ کتنی پیشانیوں پر کتنی سلوٹیں پڑتی ہیں۔ کون خوش ہوتا ہے اور کون ناراض؟ حضرتِ والا کی بارگاہ میں میرے یہ معروضات بطور خراجِ عقیدت ہے۔ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے ان کے لیے کم اور اپنے لیے زیادہ! یہ ان کے ذکر جمیل کی ایک جھلک ہے تا کہ میرے قلم کو ان کے ذکر کا شرف مل جائے اور میرے مجموعہ کے وزن و وقار میں اضافہ ہو جائے۔ اور عند ذکر الصالحین تنزل الرحمہ کی برکتیں بھی حاصل ہو جائیں۔

آنکھوں میں اک نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گذرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

تحقیق حق

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

ایک مشہور کہاوت ہے کہ درخت اپنے پھل، اُستاذ اپنے شاگرد، اور پیر اپنے مرید سے پہچانا جاتا ہے۔ تو آج میں ایک ایسے شجرِ عظیم کے تعلق سے کچھ عرض کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جس کی شاخوں نے آسمان کی بلندیوں کو چھو لیا اور جس کے پھگوں کی خوشبو سے ایک عالم مشک بار رہوا۔ اور ایک ایسے اُستاذ علی الاطلاق کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ جس کے تلامذہ کے علمی فیضان نے کائنات کی وسعتوں کو بھر دیا۔ ایک ایسے مرشدِ کامل کی بات کرنا چاہتا ہوں کہ جس کے مسترشدین کے کردار و عمل اور ان کے خدمت دین نے اس کی کاملیت پر مہر ثبت کر دی ہے۔

میری مراد حضور صدر الافاضل، فخر الاماثل اُستاذ العلما، شمس الحکما، سید العرفا امام المفسّرین حضرت علامہ مفتی سیّد الشاہ محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ میرے اُستاذ محترم حضور سیدی وسندی وآقائی، شہرستانِ علم وفضل کے تاجدار صدر العلماء حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی قدس سرہ العزیز ہم خوش بختوں سے دورانِ درس وتدریس تحدیث نعمت اور فخر ومباہات کے طور پر عالمِ سرخوشی میں کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ

''لائے زمانہ میرے ساتھیوں کا جواب''

یہ مولوی سردار احمد (۱)، یہ مولوی یزدانی (۲)، یہ مولوی رفاقت حسین (۳)، یہ قاضی شمس الدین (۴)، یہ مولوی سلیمان (۵) بھاگل پوری، یہ حافظ صاحب (۶) اور مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن (۷)

اور مجھے تو تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو آنکھیں بند کر کے برصغیر ہندو پاک میں میرا جوڑ تلاش کر لو۔ مجاہد ملت کا ذکر بڑے شوق سے کرتے کہ بڑا رئیس زادہ تھا مگر مزاج فقیرانہ تھا۔ نو ۹ برس دار الخیر اجمیر شریف میں صرف تین اسباق اس کی دوستی

---

(۱) محدثِ اعظم پاکستان حضرت علامہ سردار احمد صاحب قبلہ قادری رضوی لائل پوری علیہ الرحمہ

(۲) علامہ غلام یزدانی شیخ الحدیث منظر اسلام بریلی شریف، شیخ العلما علی الاطلاق حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی۔ شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کے برادرِ اصغر۔

(۳) سلطان المناظرین امین شریعت مفتی اعظم کان پور حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین صاحب علیہ الرحمہ

(۴) شمس العلماء علامہ قاضی شمس الدین جعفری جون پوری مصنف قانون شریعت علیہ الرحمہ

(۵) امام المعقولات حضرت علامہ سلیمان بھاگل پوری علیہ الرحمہ

(۶) جلالۃ العلم حضور حافظ ملت حضرت علامہ حافظ عبد العزیز محدّث مراد آبادی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

(۷) امام التارکین حضور مجاہد ملت حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری رئیس اعظم اڑیسہ علیہ الرحمہ

میں ناغہ ہو گئے تھے، وہ بھی کسی مظلوم کی دادرسی کے لیے کبھی کمشنری کا گھیراؤ کرتا تھا، کبھی کلکٹر کا اور جب تک متعلق افراد کو انصاف نہیں دلا دیتا چین سے نہیں بیٹھتا۔ مجھے اپنے ساتھ کبھی کبھی گھسیٹ لیتا کہ جیلانی تمہیں ساتھ چلنا ہے۔ پھر جیسے وہ دورِ ماضی کے دُھندلکوں میں گم ہو جاتے، پھر بڑے ہی طنطنے کے ساتھ فرماتے کہ جب زمانے کے پاس میرے ساتھیوں کا جواب نہیں! تو پھر وہ میرے اساتذہ کا جواب کہاں سے لاسکتا ہے؟ جانتے ہو ہمارے اساتذہ کو؟

''حضور صدر الافاضل اور حضرت صدر الشریعہ ہمارے استاذ تھے۔ پورے برصغیر ہندو پاک میں ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ علم و فضل کے ایسے آفتاب و ماہتاب تھے کہ ان کے زمانے نے ان کا مثل نہیں دیکھا۔'' تم کلامہٗ

اور ہم جو کسی نہ کسی جہت سے ان کی عظمتوں کے امین و وارث اور باقیات اخلاف کہلائے ہماری بھی نظیر زمانے نے نہیں دیکھا۔ ہم بے نظیر ہیں اکابر فراموشی میں، ہم بے مثال ہیں اپنی جمود و بے حسی میں ہمارا کوئی جواب نہیں، ناشکری و احسان ناشناسی میں ہم باکمال ہیں۔ خود پرستی، خودنمائی و باہمی قدروں کی پیمائش میں ہمارا کیا کہنا، ہم چوں دیگرے نیست کے مظاہرے میں ہم فنکار ہیں۔ رُشد و ہدایت کے پاکیزہ سلسلے کو خاندانی تجارت گاہ بنانے میں ہم ہنر مند ہیں۔ پتھر کو پارس اور پارس کو عام پتھر بنانے میں ہم استاذ ہیں۔ اپنی ذات و مفاد کے لیے مصنوعی عقیدت کے بڑے بڑے سومنات بنانے میں ہماری اس ہنر مندی نے وقت کے آذروں کو بڑی بڑی بے بسی میں مبتلا کر رکھا ہے ہمیں یہ حق ہے کہ ہم ڈاکٹر اقبال کو جھوم جھوم کر پڑھیں ؎

میراث میں آئی ہے ہمیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

آہ! کیسی کیسی ہمالیائی شخصیتیں ہماری بے حسی، جمود اور خودنمائی کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ اور ان کے بے کراں وجود کی تمازت پر ہم نے خود ہی ٹھنڈی دھول ڈال رکھی ہے اور ان کی عظمتوں پر نااہلی کی ایسی دبیز چادریں تان رکھی ہیں کہ ان کی شعاعِ نور کی جگمگاتی کرنیں باہر نہ نکل سکیں، اسلاف و اکابر فراموشی کی فہرست مختصر نہیں ہے۔ مگر اس میں سر دست دو شخصیتیں جو اپنے زمانے کے اعاظم رجال و کاملین وقت کے مرجع و مقتدیٰ تھیں، ان کے ساتھ ہمارا سلوک بڑا بے رحمانہ، ہماری بے حسی بڑی سنگ دلانہ اور ہمارا اغماض و سکوت بڑا مجرمانہ ہے۔

ان میں ایک عظیم و بے پناہ خصوصیات کی حامل شخصیت شیخ الانام، حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا خاں ابن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی کی ہے۔ وہ صرف اس لیے نہیں کہ بڑے تھے، ایک بڑے باپ کے بیٹے اور ان کی عظمتوں کے وارث و جانشین تھے بلکہ یہ نسبت متصل نہیں نہ بھی حاصل ہوتی تو بھی اپنے ذاتی فضل و کمال و جمال و تمکنت میں اتنے بڑے تھے کہ کاملین وقت کے دل و نگاہ احتراماً خمیدہ ہوتے۔ ان کی مظلومیت کی دردناکی اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ آج بھی ان کے اخلاف حقیقی میں ایسی ایسی قدآور و بلند آہنگ شخصیتیں موجود ہیں کہ ان کا جنبش ابرو ہی بہت کچھ کر سکتی

ہے اور کچھ تو ایسی عظمتیں اور تقدس لیے ہوئے ہیں۔ اور ان کی بارگاہ کی رفعتوں کا عالم یہ ہے کہ ۔

حریم ناز کی رفعت ارے معاذ اللہ

عرض لرز کے پکاری کہ نا رسا ہوں میں

اور دوسری بے کراں و ہمہ جہت شخصیت حضور صدر الافاضل، فخر الاماثل، سیّد المفسّرین حضرت علامہ مفتی سیّد شاہ نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ہے۔ جن کی پوری زندگی کارناموں ہی سے عبارت ہے۔ جنھیں ان کی بعد کی نسلوں تک ہم جو اُن کے اخلاف تھے پہنچا نہ سکے۔ ان کے نمایاں اوصاف میں ایک بڑا وصف یہ بھی تھا کہ وہ اعلیٰ حضرت امام المسلمین سیدنا امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے اعتماد اور آپ کے لیے سرمایۂ افتخار بھی تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک اعاظم رجال کے درمیان صدر الافاضل کا لقب آپ کے فرقِ اقدس پر خود امام عشق و محبت نے اپنے دست محبت سے سجایا تھا جو آگے چل کر آپ کے نام کا علم ہو گیا۔ صدر الافاضل کہنے کے بعد ان کی شخصیت کی معرفت کے لیے سیّد نعیم الدین کہنا ضروری نہیں رہ گیا۔ البتہ مولانا سیّد نعیم الدین کے امتیاز کے لیے صدر الافاضل لگانا ناگزیر ہو گیا اور کیوں نہ ہو یہ لقب اس بارگاہِ عالی سے عطا ہوا تھا جو مولیٰ عز وجل اور اس کے محبوب ﷺ جناب میں محبوبیت کبریٰ کی اس منزل پر فائز ہے کہ وہ تو وہ ہیں جو اُن کا نام خلوص و عقیدت سے لیتا رہتا ہے وہ بھی آفاقی ہو جاتا ہے۔ اور حضرت صدر الافاضل تو اعلیٰ حضرت کی زندگی ہی میں ان کے کاروانِ محبت کے ہراول دستے کے سالار تھے۔ اور آپ کے بعد آپ ہی کے پاکیزہ مشن کے فروغ میں لگے رہے اور آپ کے پاکیزہ مسلک حبّ رسول کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار اعلیٰ حضرت کے بعد مرجع عوام و خواص ہو گئے۔ اور برصغیر کے سوادِ اعظم کا بوجھ بھی آپ ہی کے مضبوط و توانا کاندھوں نے اُٹھایا۔ ایسی نابغۂ روزگار ہمہ جہت اور جامع الصفات شخصیت جو اپنی خدمات کے حوالے سے ہماری محسن بھی تھی، اس کے ساتھ ہم انصاف نہ کر سکے جسے ہماری محرومی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

کچھ اس طرح کے جمود اور ایسی ہی بے حسی تو ہم نے نصف صدی سے زیادہ اعلیٰ حضرت امام عشق و محبت کے ساتھ روا رکھی تھی اور اسی طرح کی ٹھنڈی دھول ان کے بے کراں وجود پر بھی ڈال رکھی، حاسدین و مانعین اغیار و دشمنانِ دین کا کوڑا کرکٹ الگ سے اس پر مستزاد۔

بھلا ہو مولیٰ تعالیٰ خانوادۂ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ کا کہ بیس سال قبل انھوں نے اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے حیات و خدمات و کارناموں پر ایک مبسوط، ضخیم اور تاریخ ساز نمبر امام احمد رضا نمبر نکال کر جدید دانش کدوں و دانشوروں تک چکا چوند کیا۔ اور آپ کی ذات پر نصف صدی سے زائد جمائی ہوئی اغیار کی دھول کو صاف اور اپنوں کی بے حسی کی چادر کو تار تار کیا۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء اسی وقت بلکہ اس سے کچھ قبل ہی مملکت خداداد میں بھی مجلس رضا، لاہور کے ذریعے اعلیٰ حضرت پر کام کا آغاز ہو چکا تھا، جو آگے چل کر اتنا زور پکڑا کہ موجِ دجلہ بن گیا۔ وہاں کے مخلصین اور اہلِ محبت نے وہ کام

کیا کہ زمانہ دنگ رہ گیا۔ اوراس چراغ سے اتنے چراغ جلے کہ جن اُجالوں سے کائنات روشن ہوگئی۔ جن کا بول بالا ہوا، باطل کا منہ اُتر گیا، حقیقت کا چہرہ آئینہ ہوا، جھوٹ رُسوا ہوا، نصف صدی سے زائد کی نہ صرف محرومیوں کا ازالہ ہوا بلکہ اپنی اجتماعی بے حسی کے کفّارہ سے بھی سوا ہوگیا۔ اور حقیقت کا سورج سوا نیزے پر آ کر ایسا چمکا کہ جس کی چمک سے تمام براعظم روشن ہوگئے۔ فللحمد علی ذٰلك۔

ان سے نگاہ ملتے ہی زندگی یوں سنور گئی
عنصر گمشدہ کوئی جیسے کہ ہاتھ آگیا

حضور صدر الافاضل کے اخلاف میں یوں تو برصغیر ہند و پاک کا پورا سوادِ اعظم ہے جن کی گردنوں پر ان کے بے پایاں احسانات کے بوجھ ہیں۔ قومی، ملکی، مذہبی، سیاسی وہ کون سا میدان ہے جسے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے لالہ زار اور اسے سوادِ اعظم کے لیے مستنیر نہ کیا ہو۔ هل جزاء الاحسان الّا الاحسان کے طور پر کیا سوادِ اعظم کے دامن میں ان کے لیے کوئی متاعِ گراں ہے جسے ہم ان کی بارگاہِ عظمت میں تحسین وخراجِ عقیدت کے طور پر پیش کرسکیں؟

اس کے بعد تلامذہ واہلِ اِرادت ہیں جن کی فہرست مختصر نہیں ہے۔ جو بڑی حیثیتوں اور وجاہتوں کے حامل تھے اور ہیں مگر باستثنا بعض وہاں بھی سنّاٹا ہے۔

ایسے بھی راز ہیں خمار ہوتے نہیں جو آشکار
اپنی ہی مشکلیں نہ دیکھ ان کی بھی بے بسی سمجھ

البتہ جامعہ نعیمیہ جو حضور صدر الافاضل کی قائم کردہ اہلِ سنّت و جماعت کی ایک مشہور و مرکزی درسگاہ ہے، جو بحمدہٖ تعالیٰ اسباب و ذرائع اور وسائل بھی رکھتی ہے۔ اس نے بھی ان سے اغماض وچشم پوشی برتی۔ اس کے علاوہ ان کے نام اور ان کی ذات سے منسوب ایک درجن سے زائد قابلِ ذکر اِدارے اور بھی ہیں، جو اگر چاہتے تو اس آفتابِ فضل وکمال کو (حالات نے جس پر ٹھنڈی دھول ڈال رکھی ہے) اور اس گنج ہائے گراں مایہ کی تمازت کو سوا نیزے تک لاسکتے تھے، مگر چند محدود اور لمحاتی کوششوں کے سوا اِس محاذ پر ایک طویل سکوت اور ایک مضمحل بے حسی رہی، آخر ایسا کیوں؟

اس کیوں کی تفصیل میں آج نہیں تو کل جانا ناگزیر ہوگا ہی اور جس دن ایسا ہو گیا تو صورتِ حال کچھ اس طرح ہوگی کہ

گذرتا ہے ہر شخص چہرہ چھپائے
کوئی راہ میں آئینہ رکھ گیا ہے

چودھویں صدی ہجری کی ایک عظیم، عبقری اور ہمہ جہت شخصیت جس کا مثل زمانے نے کم دیکھا، جس کی علمی، دینی، ملّی، قومی، سیاسی خدمات کی ایک درخشاں تاریخ ہو، اس سے نئی نسل واقف نہیں۔ حضور صدر الافاضل کی انھیں عظمتوں کے عرفانی نقوش کو اُجاگر کرنے اور ان کے فیوض و برکات کو نئی نسل تک پہنچانے کے لیے ان کی پاکیزہ نسبت و ارادت اور ان

کی ذات سے عقیدت کا نمود لیے کچھ حضرات سامنے آئے اور ۱۹۹۲ء میں بڑی دھوم دھام سے جامعہ نعیمیہ عتیق المدارس (تلسی پور، گونڈہ، یوپی) میں صدر الافاضل کانفرنس وسیمینار کیا۔

بڑی تعداد میں مشاہیر اہلِ قلم نے اس میں شرکت فرمائی اور اس طرح سے پہلی بار آپ کی حیات وخدمات و کارناموں پر ایک مثبت کوششوں کا آغاز ہوا۔ اس خبر سے مسرّت ہوئی تھی کہ چلو تاخیر سے سہی کام کا آغاز تو ہوا۔ اور اب ان طویل محرومیوں کا ازالہ ہوجائے گا۔ جو اَب تک ان کی ذات سے روا رکھی گئی تھیں۔ مگر آٹھ سال کا ایک طویل عرصہ گذر جانے کے بعد بھی وہ تمام مقالے تا ہنوز کتابی شکل میں منظرِ عام پر نہیں آسکے۔

ہندوستان میں غالباً نئی نسل کا میں ہی پہلا آدمی تھا جس نے بائیس ۲۲ رسال قبل حضور صدر الافاضل پر ''سلطان العلوم'' کے عنوان سے قلم اُٹھایا تھا جو خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ کے مؤقر جریدہ ماہ نامہ ''پاسبان'' الہٰ آباد میں نمایاں طور پر شائع ہوا تھا۔ جسے ملاحظہ فرما کر جماعت اہلِ سنّت کے ایک متحرک وفعال شخصیت حضرت العلام عبد المبین مدظلہ العالی نے دو مکتوب لکھے اور میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی کہ اس موضوع کو آپ زبان وقلم دے دیں ہم مٹیریل فراہم کریں گے اور پھر بمبئی تشریف لا کر اپنی ملاقات کی سعادت بھی بخشی اور مجھے تیار کرتے رہے۔

لیکن نئی نئی تجارتی اور جماعتی ذمے داریوں نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس کے بعد ہی میں نے اعلیٰ حضرت کے ترجمۂ پاک کے تعلق سے ایک مستقل کتاب ''انوارِ کنز الایمان'' لکھی تو اس میں صاحبِ ترجمہ کے ساتھ ہی صاحبِ تفسیر خزائن العرفان پر چودہ صفحات پر مشتمل ایک مضمون شاملِ اشاعت کیا۔ جو اسی زمانے میں چھپی اور تقسیم بھی ہوئی۔

ابھی چند سال قبل ایک مشہور ترین ادارے کے ایک ممتاز عالمِ دین اور مفتی جن سے ہمارے والد ماجد کا اور خود میرا بھی بڑا اقرب تھا، نہ معلوم کس جذبے کے تحت اور کیوں حضور صدر الافاضل کی ذات کی نفی اپنے زبان وقلم سے کی۔ تو مولیٰ تعالیٰ نے مجھے ہی اس کے دفاع کی توفیق بخشی، جس کی وجہ سے حضرتِ والا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے حضور صدر الافاضل کے تعلق سے اپنے خیالات سے رجوع وانابت کی توفیق بخشی۔ فللحمد علیٰ ذالک۔

چند دنوں قبل عزیزم مولانا بدر عالم نعیمی سلمہٗ جو مدرسہ فیض العلوم بڑھیا (ضلع سدھارتھ نگر) کے حوالے سے (کہ موصوف پڑھ چکے ہیں) پہلے ہی سے عزیز ہیں۔ وہ اپنی ہی طرح ایک نوجوان عالمِ دین مولانا نور محمد صاحب نعیمی کو لے کر اُستاذ العلماء حضرت علامہ مفتی شعبان علی نعیمی مدظلہ العالی کے حوالے سے ''تنظیم افکار صدر الافاضل بمبئی'' اور اس کے تحت ایک منصوبہ جس پر وہ بہت حد تک عمل پیرا بھی ہو چکے تھے، لائے، جس میں ''مسائل خزائن العرفان'' کی شکل میں ایک ایسی متاعِ گراں مایہ کی کتابت شدہ ایک ضخیم ومبسوط سرمایۂ دین وایمان بھی تھا جسے دیکھ کر ایک خوش گوار حیرت بھی ہوئی۔ ایک عجیب سا سرور طاری ہوگیا۔ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے ترجمۂ پاک کنز الایمان کے حاشیہ پر حضور صدر الافاضل نے بے مثل تفسیر فرماتے ہوئے سیکڑوں مسائل بیان فرمائے ہیں، اِسے کتابی شکل دی ہے۔ اس بے کراں تفسیر میں جابجا

سیکڑوں مسائل آپ نے بیان فرمائے ہیں اسے فقہی ترتیب پر ایک کتاب کی حیثیت دی گئی ہے۔ جس میں اکیس ۲۱ر ابواب قائم کیے گئے ہیں اور آخری باب ''حظر واباحت'' میں اڑتالیس موضوعات قائم کیے گئے ہیں۔ اس پر اس کا حسن و ترتیب وتہذیب سبحان اللہ! بے شک یہ عزیزم مولانا نور محمد نعیمی صاحب کا ایک ایسا دینی وعلمی کارنامہ ہے جو اُن کی کمسنی کو بے اعتبار کیے ہوئے ہے۔ جسے فضل ربی اور فیضانِ صدر الافاضل کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ نقش اوّل کی عملی تفصیل سامنے رکھ کر کہا کہ ہم اتنا سب کچھ کر چکے ہیں، اسے پریس کے حوالے کرنے جا رہے ہیں۔ جس کے لیے آپ کے مشورے، ہدایت اور چند کلمات کی ضرورت ہے۔ اور اب جو بھی تاخیر ہوگی وہ چند تاثرات وآرا کے حصول میں!

یہ مٹھی بھر بے زاد وراحلہ مخصین حضرت علامہ مفتی شعبان علی نعیمی صاحب قبلہ کی سرپرستی میں بڑی خاموشی سے ایک مثبت سمت چل پڑے ہیں، بغیر کسی شور و بلند آہنگ دعوے کے۔ مولانا نور محمد صاحب نعیمی اور ان کے دست راست تنظیم کے ایک متحرک رُکن مولانا بدر عالم نعیمی اور خوش نویس عزیزم مولوی محمد رضوان القادری سلمہٗ نے اپنے منصوبے کے نقش ثانی کی جو تفصیل پیش کی ہے جس پر وہ بہت حد تک کام بھی کر چکے ہیں، تو آنکھوں کی چمک اور بڑھ گئی اور دل سے دعا نکلی کہ مولیٰ تعالیٰ ان مٹھی بھر افراد کی ان مثبت اور عظیم کوششوں کو حضور صدر الافاضل سے اب تک کی جانے والی بے اعتنائیوں کا کفّارہ بنادے اور پورے سوادِ اعظم کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ بھی۔

جتنے بھی میکدے میں ہے ساقی پلادے آج
ہم تشنہ کام زہد کے صحرا سے آئے ہیں

☑☑☑☑☑☑

اے صبحِ سعادت زجبینِ تو ہویدا

ملک کی آزادی کے ساتھ، اس کی تقسیم کا بھی سانحہ عظیم پیش آیا، جس میں ہندوستانی عوام ہی نہیں خواص اہلِ سنّت غالب ترین اکثریت ہجرت کے نام پر ترکِ وطن کرگئی۔

ملک کی تقسیم کا جھوٹا اور بے جا الزام لگا کر ہندوستان میں رہ جانے والے کروڑوں مسلمانوں کی زندگیوں کو بہت تلخ اور ان کا جینا حرام کردیا گیا۔ حالانکہ تقسیمِ ملک مسلمانوں پر تھوپا گیا، اصل ذمہ دار بڑے بڑے کانگریسی ہندو لیڈر ہیں نہ کہ مسلمان! یہ موضوع ایک طویل بحث کی متقاضی ہے اس پر ملک میں جگہ جگہ بڑے سیمنار ہونے چاہیے۔ جس میں ہندو مسلمان کی بڑی بڑی غیر جانبدار علمی شخصیتوں کی شرکت ہو۔

تقسیم ملک کے ردعمل میں مسلمانوں پر جو زیادتیاں اور ظلم وستم کا سلسلہ شروع ہوا وہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا۔ جس سے مسلمان خوف وہراس میں مبتلا ہوگئے اور ساری توانائی اپنی بقا وسلامتی میں لگادیے۔ ان کے خوف وہراس کا عالم یہ تھا کہ اگر وہ کوئی دینی و مذہبی اجلاس کرتے تو پہلے انھیں انتظامیہ کو یہ یقین واطمینان دلانا پڑتا کہ خالص مذہبی جلسہ ہوگا، اس میں دین ومذہب کی باتیں کی جائیں گی، سیاست سے اس کا کچھ لینا دینا نہیں ہوگا۔ اور اس جلسے کے پوسٹر پر نیچے ایک پٹی لگانی پڑتی کہ یہ ایک مذہبی اجلاس ہے، سیاست حاضرہ سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس تلخ وخاردار وصبر آزما تفصیل میری کتاب ’’آل انڈیا تبلیغ سیرت، ایک تحریک، ایک تاریخ‘‘ میں دیکھی جاسکتی ہے جو بہت پہلے شائع ہوکر ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم ہوچکی ہے۔

حاملین فکر ونظر اور اربابِ فضل وکمال کی غالب ترین اکثریت کے شدرِحال کے بعد اس ملک میں چند ہی شخصیتیں ایسی رہ گئیں جو یہاں رہ جانے والے کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں کی آخری امید، باعث تسکین اور ان کے درد کی درماں تھیں!۔

امید کہ مدھم سی ایک لو ہو تو پیاری ہے　　یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

ان شخصیتوں کی ایک اجمالی فہرست ص:۲۰ پر

آئینۂ حسنِ خوباں، ہم شبیہہ غوث جیلانی نظر کردہ و پروردہ سہ محبوباں، مجدد سلسلہ اشرفیہ حضرت اقدس بابرکت علامہ سیّد شاہ علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی، امام الہند سیّد المفسرین صدر الافاضل حضرت علامہ حکیم سیّد نعیم الدین مرادآبادی، شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت علامہ مفتی شاہ حامد رضا بریلوی، صدر اہلِ سنّت، محدثِ اعظم ہند حضرت علامہ سیّد محمد کچھوچھوی، ملک العلماء حضرت علامہ ظفر الدین بہاری، صدر الشریعہ حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی مصنف بہارِ شریعت، شیر بیشۂ اہلِ

سنّت ابوالوقت حضرت علامہ سیّد ہدایت رسول رام پوری، پیشوائے قدسیان حضرت علامہ مصطفےٰ رضا خاں بریلوی مفتئ اعظم ہند، مفسرِ اعظم حضرت علامہ ابراہیم رضا خاں جیلانی میاں بریلوی، وقارِ اہلِ سنّت حضرت علامہ مفتی سیّد آلِ مصطفےٰ قادری برکاتی مارہروی، مناظرِ اعظم حضرت علامہ حشمت علی لکھنوی، خلیفۂ اعلیٰ حضرت اقدس بابرکت علامہ سیّد سلیمان اشرف صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ وتلمیذ ارشد حضرت علامہ ہدایت جونپوری، محسن ملّت تلمیذ اعلیٰ حضرت حضرت علامہ حامد علی فاروقی رائے پوری، برہانِ ملّت خلیفۃ وتلمیذ اعلیٰ حضرت علامہ مفتی برہان الحق جبلپوری، سنوسی ہند امام التارکین مجاہد ملّت حضرت علامہ مفتی شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی حامدی اشرفی، شیخ الاسلام حضرت علامہ مفتی عبدالقدیر بدایونی تلمیذ صدر الافاضل حضرتِ اقدس بابرکت علامہ سیّد شاہ مختار اشرف اشرفی جیلانی سرکارکلاں کچھوچھہ مقدسہ، شہر یار علوم وفنون، امام النحو شارح بخاری حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی محدث میرٹھی اشرفی، حضرتِ اقدس بابرکت علامہ عبدالحفیظ حقانی مفتئ اعظم آگرہ، سلطان المناظرین، امام المتکلمین حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتہ شاہ رفاقت حسین حامدی اشرفی، بادشاہِ علم وفضل، سلطان الواعظین حضرت علامہ عبد المصطفےٰ اعظمی، جلالۃ العلم پیکر اخلاص وعمل حضرت علامہ حافظ عبد العزیز محدث مرادآبادی ثم مبارکپوری، شعیب الاولیاء حضرت صوفی شاہ محمد یار علی بانی فیض الرسول براؤں شریف، حضرتِ اقدس بابرکت صوفی شاہ محمد تیغ علی سرکاہی شریف، بہار وغیرہ وغیرہ قدست اسرارہم۔

پھر انھیں نفوسِ قدسیہ کی سرپرستی اوران کی دعاؤں کی چھاؤں میں ایک جماعت اور میدانِ عمل میں اُتری۔ شمس العلماء غزالی دوراں، حضرت علامہ مفتی نظام الدین الہ آبادی، تلمیذ ارشد حضور مجاہد ملت! اور آپ کے نامور فرزند معنوی جن کے نام کی نسبت آپ کے نام کا علم بن گیا۔

پاسبانِ ملّت خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق نظامی الہ آباد، رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری جمشید پور، مجاہد دوراں حضرت سیّد مظفر حسین کچھوچھوی ایم پی، فصیح اللسان حضرت علامہ ابوالوفا فصیحی غازیپوری، شیخ الاسلام حضرت علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی، حضرت مولانا سیّد اسرار الحق کوٹا راجستھان وغیرہ وغیرہ۔ انھیں شخصیتوں کے جلو میں ایک اور پاکیزہ نام اپنے تمام تر حسنِ ادب کے ساتھ بڑی خاموشی کے ساتھ اپنی جگہ بنا رہا تھا، جو آگے چل کر سیرت وسوانح کے محاذ پر بڑا مطلع انوار ثابت ہوا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر بڑے باپ کے بیٹے، بڑے بیٹے کم بن پاتے ہیں مگر یہ بیٹا تو الولد سر لابیہ کا مظہر اتم ثابت ہوا۔ راقم الحروف وارث جمال قادری اور ان کے درمیان ایک پاکیزہ قدرِ مشترک ہے کہ مجھے ان کا استاذ بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قدرِ فرق مراتب کے ساتھ! کہ وہ شہر یار علوم وفنون، فخر اشرفیت شارح بخاری امام النحو حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی محدث میرٹھی کے تلامذہ خاص کی اگلی صفوں میں ہیں اور مجھے پچھلی صف میں بیٹھنے کی سعادت میسر ہوئی اور اس پچھلی صف میں میرے ساتھ علامہ سیّد کلیم اشرف جائسی اور علامہ مفتی محمد فاروق بریلوی بھی تھے۔

پہلی بار سیرت وسوانح کے محاذ پر بڑی خاموشی کے ساتھ ایک ایسی کتاب لے کر طلوع ہوئے جس نے صرف اکابرین بلکہ معاصرین کو نہ صرف چونکایا بلکہ تحسین وآفرین کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہندوستان میں وہ کتاب کیا شائع ہوئی کہ اہلِ علم اور علمی حلقوں میں خوشگوار مسرت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لی گئی، پاکستانی علمی حلقوں میں بھی خوب خوب پذیرائی ہوئی۔ علمی حلقوں میں ہر طرف سے مانگ بڑھنے کی وجہ سے انھیں وہاں خود بڑی تعداد میں چھاپنا پڑا۔

پچاس برس کے اندر اندر وہ کتاب حوالہ وآخذ کی ایسی لاجواب کتاب ثابت ہوئی، بعد کے تذکرہ نگاروں نے اس کی اتباع کی، ڈھائی سو کتابوں ومقالوں میں اس کا حوالہ دیا گیا، خواص کے ایک بڑے طبقے نے اس سے استفادہ کیا۔ ''تذکرہ علماء اہلِ سنّت'' جس کی دوسری جلد کے لیے تاکیدی فرمائش کرنے والوں میں پیشوائے قدسیاں حضور مفتئ اعظم ہند، سنوسی ہند مجاہد اعظم حضرت علامہ مفتی محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی رئیس اڑیسہ، سلطان العلوم شارح بخاری امام النحو حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی محدث میرٹھی اور خود ان کے عظیم المرتبت والد ماجد و پیر ومرشد حضرت امین شریعت علامہ مفتی شاہ رفاقت حسین حامدی اشرفی جیسی نفوسِ قدسیہ ہیں۔ سیرت وسوانح کے محاذ پر ایک بڑے خلا کو پُر کرنے والی شخصیت وحید العصر حضرت علامہ حافظ مفتی محمود میاں قادری حامدی اشرفی رفاقتی بن سلطان المناظرین امین شریعت حضرت علامہ شاہ مفتی رفاقت حسین کی ذات ہمایوں تھی نور اللہ مرقدہ مطاب شراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

مدت کے بعد پیدا ہوتے ہیں ایسے لوگ
مٹتے نہیں ہیں دہر سے جن کے نشاں کبھی

تذکرۂ علماء اہلِ سنّت کی دو جلدوں کے بعد آپ کا قلمی سفر پورے تسلسل کے ساتھ جا رہا ہے جو نصف صدی سے بھی زیادہ مدت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور ان کی ہر کتاب، ہر تالیف، ہر تذکرہ حقائق ومعلومات کا ایک جہاں حیرت خیز لیے ہوئے ہے، چاہے وہ سوانح رفاقتی ہو، یا تذکرہ علماء اہلِ سنّت کے سلسلۃ الذہب کی مزید تین مبسوط جلدیں ''پاکان امّت'' حضرت اقدس بابرکت دریائے فیض وکرامت سیّدنا سیّد آلِ رسول مارہروی کی حیات وخدمات اور ان کی عظمت وجلالت پر مشتمل کتاب ''حضرت شاہ آلِ رسول احمدی مارہروی'' یا ''مخدوم الاولیا محبوبِ ربانی'' یا ''اہلِ سنّت میں افتراق کے المناک واقعات'' ان کا سینہ بے کینہ حقائق ومعلومات کا بحر ذخار تھا، ان کا ذوقِ مطالعہ کثرتِ مطالعہ، حسنِ مطالعہ، وسعت اطلاع اور غضب کا قوتِ حافظہ پر صرف حیرت اور ساتھ ہی ساتھ اس پر رشک ہی کیا جا سکتا ہے، ان کی ایک معرکۃ الآرا تالیف ''سوانح رفاقتی'' جو بظاہر ان کے عظیم المرتبت والد ماجد حضرت شاہ مفتی رفاقت حسین علیہ الرحمہ کی سوانح حیات ہے۔ مگر یہ کتاب کثیر الجہات حیثیت کی حامل ہے گویا وہ ایک طرح سے حقائق ومعلومات کا خزانہ ہے۔ وہ تنظیموں کی تاریخ بھی ہے اور اپنے اپنے وقت کے عظیم المرتبت شخصیات ورجال پر اور ان کے حسنِ خدمات اور ان کے اثر ورسوخ وفیض

رسائی کا آئینہ جمال وکمال بھی ہے۔

آل انڈیا سنّی کانفرنس، آل انڈیا تبلیغ سیرت، آل انڈیا سنّی جمیعۃ العلماء، جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی شریف، خلافت کمیٹی، جمیعۃ العلماء یوپی، بہار، گجرات وغیرہ کی علاقائی تنظیمیں ان کی کارگزاریاں، ہر تنظیم کی کمیت، کیفیت، عروج و زوال، اضمحلال و استقامت سب کا لیکھا جوکھا سب موجود، حضور اشرفی میاں اشرفی جیلانی کی حیات و خدمات اور سلسلہ اشرفی کو دنیا بھر میں پہنچانے کے لیے ان کی عالمی جدو جہد اور اس کی عالمگیر مقبولیت و اثر آفرینی کا پرتو جمال وجلال کتاب ''مخدوم الاولیاء محبوبِ ربانی'' کے مطالعہ کے بعد یہ احساس شدید تر ہوجاتا ہے کیسی کیسی باکمال اور فیض رساں شخصیتیں مجدد سلسلہ اشرفیہ کے دامن کرم سے وابستہ تھیں۔ ؎

آنکھوں میں اک نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گذرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی

اور تذکرہ علماء اہلِ سنّت کے سلسلے کی آخری تین ضخیم ومبسوط جلدیں پاکانِ امّت نے ہم جیسے نیم باخبروں کو حیرت و مسرت سے ہمکنار کیا۔ پاکانِ امّت جو علماء آخرت و اولیاء امّت کی حیات وخدمات وان کے قابلِ تقلید حسنِ خدمات اپنے حسنِ عقیدت اور جذبہ احترام کے پیش نظر سیرت وسوانح کا جو عظیم وتاریخی گلدستہ تیار کیا ہے اس کا صلہ تو ان نفوسِ قدسیہ کے ارواحِ طیبہ کی بارگاہ سے یقیناً مل چکا ہے۔ رب قدیر ان کی تربت انور پر دن رات رحمت ونور کی بارش برسائے۔ اور ان کے علمی، فکری، قلمی اور روحانی وارث اور ان کے عظمتوں کے امین حضرت علامہ محمد عامر اشرف اشرفی رفاقتی کو باپ و دادا کے پرچم عظمت مزید بلند کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کے علم میں، فضل میں، عمر میں برکتیں اور ان کے درجات کو فزوں تر فرمائے۔ ؎

سر سے تا پیر گلابوں کا شہر لگتا ہے
باوجود بھی اسے چھوتے ہوئے ڈر لگتا ہے

☑☑☑☑☑☑

سینے میں قلزم لیے قطرہ کا قطرہ رہا

شیخ العلماء علی الاطلاق، شیخ الادب بالاتفاق، شیخ المعقولات والمنقولات، شیخ الفقہ والوصول فنونِ عقلیہ وعلومِ نقلیہ کا امام وقت! استاذ الکاملین، سند المحققین، استاذ العلماء حضرتِ اقدس بابرکت علامہ غلام جیلانی اعظمی علیہ الرحمہ نے برصغیر ہند کے بڑے علمی وعربی دانشکدوں میں اپنے تبحر علمی اور اپنی یکتائی و بے نظیری کا انمٹ نقوش چھوڑ کر! حضور شعیب الاولیاء بانی فیض الرسول کی خصوصی دعوت پر جب دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کی درسگاہ کو اپنے فیض رساں وجودِ مسعود سے زینت بخشی تو بانی ادارہ حضور شعیب الاولیاء حضور مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قادری چشتی، نقش بندی، سہروردی قدس سرہ العزیز کی شفقتوں، محبتوں اور ان کی بارگاہ میں اپنی قدر افزائی اور والہانہ پذیرائی دیکھ خوشگوار حیرت سے دو چار ہوئے، اس لیے کہ اس سے قبل وہ جہاں بھی رہے علی العموم کل ذی نعمۃ محسود کے پیشِ نظر وہ بڑے صبر آزما مراحل سے گذرے تھے۔ اس لیے انھوں نے یہ عزم کرلیا تھا کہ عمر کے اس آخری پڑاؤ میں یہی میری آخری منزل ہوگی چنانچہ انھوں نے اسے سچ کر کے دکھایا۔ بڑے بڑے مرکزی اداروں کی طرف سے لمبی لمبی پیشکش پر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے، حضور شعیب الاولیاء کی شفقتوں، کرم گستریوں کی ٹھنڈی چھاؤں کیا ملی! کہ انھوں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر دار العلوم فیض الرسول کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، اپنے تہ در تہ ہمہ جہت وجودِ حیرت پر سادگی، خاکساری، فروتنی، تواضع وانکساری کی دبیز چادر ڈال کر حضور شعیب الاولیاء عاشق محبوب کبریا کی ''ذاتِ اقدس'' کو اپنی عقیدت واحترام کا مرکز ومحور بنالیا۔ وہاں کے اجلہ اساتذہ کرام جو سب کے سب تلامذہ کے زمرے میں تھے، آپ کی تمام اولاد وامجاد، اعزہ واقارب، حضرت خلیفہ صاحب قبلہ، حضرت منیجر صاحب سیٹھ محمد یوف رئیس نان پارہ، علامہ غلام عبد القادر علوی، علامہ محمد اسماعیل علوی ہاشمی، مولانا غلام غوث علوی، اراکین ادارہ ودیگر اربابِ بست وکشاد نے اپنے اپنے دل ونگاہ حضور شیخ العلماء کے حضور مؤدب کرلیا۔ پھر تو آپ نے بھی انھیں اپنے سینہ بے کینہ سے ایسا لگایا اور انھیں ایسی شفقت ومحبت اور چاہت دی کہ محسوس ایسا ہوتا تھا کہ سب انھیں کے وجودِ با مسعود کا ایک حصہ ہیں۔ اور یہ چاہت، یہ اپنائیت، یہ محبت ایک طرفہ نہیں تھا۔ ؎

چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو صرف آواز ہی آواز ہے

آپ کی عظمت وجلالت، تبحر علمی، فضل وکمال اور آپ کی یکتائی و بے نظیری کا اندازہ لگانے کے لیے علمی وروحانی دنیا کے ان قد آوروں، مسلم الثبوت وفیض رساں شخصیات ورجال کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیں جنھیں ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔

(۱) سلطان المناظرین حضرت علامہ مفتی سردار خاں محدثِ اعظم پاکستان

(۲) بادشاہِ علم وفن حضرت علامہ عبد المصطفےٰ صاحب اعظمی
(۳) غزالی دوراں حضرت علامہ مفتی سیّد احمد سعید کاظمی امروہوی پاکستان
(۴) احسن العلماء حضرت علامہ سیّد مصطفےٰ حیدر حسن خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ شریف
(۵) شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی
(۶) رئیس الاتقیاء شیخ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی مدرسہ غوثیہ بڑھیا
(۷) اشرف العلماء حضرت علامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی بانی وسربراہ دار العلوم محمدیہ ممبئی
(۸) علامہ ضیاء المصطفےٰ اعظمی شیخ الحدیث وسربراہ دار العلوم امجدیہ گھوسی اعظم گڈھ
(۹) حضرت علامہ قاری رضاء المصطفےٰ پاکستان
(۱۰) حضرت علامہ مفتی محمد احمد صاحب جہاں گیر بہار
(۱۱) خطیب الاسلام حضرت سیّد کمیل اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھہ مقدسہ
(۱۲) حضرت مولانا سیّد اظہار اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھہ مقدسہ
(۱۳) شیخ الاسلام حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی جانشین حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھہ مقدسہ
(۱۴) حضرت علامہ نعیم الدین صدیقی رضوی شیخ الحدیث تنویر الاسلام امرڈوبھا برادرِ اصغر علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری
(۱۵) حضرت علامہ تحسین رضا خاں صاحب شیخ الحدیث دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف
(۱۶) حضرت علامہ ریحان رضا رحمانی میاں مہتمم دار العلوم منظر اسلام بریلی شریف
(۱۷) مفسر قرآن حضرت علامہ عبد اللہ خاں عزیزی جمداشاہی
(۱۸) فرزندار جمند حضرت غلام ربانی صاحب فائق شیخ الحدیث دار العلوم غوثیہ ہبلی کرناٹک
(۱۹) حضرت علامہ محمد احمد مشاہدی جاج مئو کانپور یوپی
(۲۰) حضرت علامہ کامل میاں سہسرامی بہار
(۲۱) حضرت محمد صابر القادری نسیم بستوی
(۲۲) حضرت علامہ سبطین رضا بریلی شریف
(۲۳) حضرت علامہ مفتی صوفی نظام الدین صاحب مدرسہ تنویر الاسلام امرڈوبھا
(۲۴) خواجہ علم وفن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین پورنیہ بہار
(۲۵) حضرت علامہ محمد ہاشم صاحب جامعہ نعیمیہ مرادآباد
(۲۶) حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب بسڈیلہ

(۲۷) حضرت علامہ مفتی قدرت اللہ رضوی دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف
(۲۸) حضرت علامہ غلام عبد القادر علوی سر براہِ اعلیٰ دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف
(۲۹) حضرت علامہ محمد اسماعیل علوی ہاشمی شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول
(۳۰) حضرت علامہ غلام غوث علوی دار العلوم سکینہ دھوراجی سوراشٹر گجرات
(۳۱) حضرت علامہ صوفی محمد صدیق صاحب بھیرہوا نیپال
(۳۲) حضرتِ اقدس بابرکت برادرِ اصغر حضرت علامہ غلام یزدانی صاحب شیخ الحدیث دار العلوم منظر اسلام بریلی شریف و بانی مدرسہ شمس العلوم گھوسی اعظم گڈھ۔
(۳۳) امام الحکمت روح اشہر حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف مبارکپور کو بھی شرفِ تلمذ حاصل ہے۔
(۳۴) راقم الحروف محمد وارث جمال قادری یار علوی کو نہ صرف شاگردی بلکہ خادمِ خصوصی کا بھی شرف حاصل ہے۔
سیکڑوں تلامذہ میں یہ صرف چند نام ہیں۔ آپ کے پورے تلامذہ کا احصاء ایک دشوار امر ہے۔

غالباً ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب میں مدرسہ اسلامیہ عربی اندر کوٹ میرٹھ میں زیر تعلیم تھا۔ علامہ مفتی محمد فاروق بریلی شریف، علامہ سیّد کلیم اشرف جائسی میرے رفیقانِ درس تھے۔ ایک دوران درس استاذ کریم شارح بخاری امام النحو حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی اشرفی محدث میرٹھی علیہ الرحمہ پوچھ لیا کہ حضور دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کے شیخ الحدیث جو آپ کے ہم نام ہیں کیا وہ بھی آپ کے رفیقانِ درس میں سے ہیں۔ مسکرا کر فرمانے لگے ارے جمال میاں! وہ تو بہت اونچی حیثیت کے ہیں، جب ہم لوگ طالب علم تھے تو وہ استاذ تھے، وہ فرنگی محل لکھنؤ کے فارغ تھے، بڑا اونچا علمی مقام ہے ان کا، البتہ ان کے برادرِ اصغر حضرت مولانا غلام یزدانی ہمارے رفیق درس اور یہ مولانا غلام یزدانی اپنے برادرِ اکبر کے شاگرد بھی تھے۔

بعد میں جبکہ ان کے تلامذہ کرام کی فہرست پر جب نظر پڑی جس میں حضرت مناظر اعظم علامہ سردار خاں محدثِ اعظم پاکستان و حضرت علامہ غلام یزدانی شیخ الحدیث دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف کے پر نظر پڑی تو علامی میرٹھی علیہ الرحمہ کی بات یاد آ گئی کیونکہ علامہ محمد سردار خاں محدثِ اعظم پاکستان بھی علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے رفیقانِ درس میں تھے۔

آپ کے علمی تبحر اور حیرت انگیز تدریسی صلاحیتوں سے انکار ممکن ہی نہیں۔ آپ ان چند گنے چنے افراد میں سے تھے جن کی کمیابی ہر زمانے اور ہر عہد میں رہی۔ آپ کے علمی فضل و کمال، جامعیت و قاموسیت، درک و نظر اور چند در چند علوم و فنون مہارتِ تامہ کا اندازتو کچھ وہی اربابِ فضل اور اصحابِ فکر و فن لگا سکتے ہیں کہ جنھیں علوم و فنون کے اس قطب مینار کو قریب سے دیکھنے کا موقع میسر آیا ہو یا جنھیں علم کے اس بحر بیکراں سے چند چھینٹے نصیب ہوئے ہوں۔

حضرت شیخ العلماء علامہ الحاج غلام جیلانی اعظمی کی ذات میں اخلاق و محبت کا ایک شہر آباد تھا، حسنِ عقیدت کا ایک سیل رواں تھا۔ بزرگانِ دین سے حسن عقیدت اور ان سے وارفتگی شوق کا عالم قابلِ دید تھا۔ علم و فضل کے اعلیٰ منصب پر ہونے کے باوجود تواضع وانکساری، حلم و مروت، انکساری و بردباری، چھوٹوں پر شفقت و محبت اس دور میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور

تھا۔ بزرگانِ دین سے والہانہ عقیدت کا عالم یہ تھا کہ ان کا حسنِ عقیدت ع حبّ درویشاں کلید جنت است، کے مترادف تھا۔

افاضلِ فیض الرسول میں سب سے قدآور اور اپنے زمانے کے علامہ دہر و وحید العصر شخصیت حضرت علامہ مفتی قدرت اللہ رضوی تلمیذ ارشد حضرت شیخ العلماء رقم طراز ہیں:

وہ اپنی جماعت میں شیخ الادب مشہور تھے۔ تو وہ بلا شبہ شیخ الادب تھے اور علم وادب کے اقسام اثنا عشر علمِ نحو وصرف، علمِ لغت وانشاء، علمِ معانی و بیان و بدیع، علمِ عروض وقوافی اور علمِ اشتقاق ورسم الخط وغیرہا میں مہارت اور ان کے جزئیات پر وسیع نظر رکھتے تھے۔ جس پر بعض شروح وحواشی شاہد عدل ہیں۔ مختصر المعانی، بڑی ہی مختصر اور جامع شرح تصنیف فرمائی تھی جسے سامنے رکھ کر مختصر المعانی کا سمجھنا وسمجھانا بہت آسان ہوجاتا ہے اور ۱۳۹۰ھ میں رسالہ 'متن الکافی' فی العروض القوافی کی مبسوط اور نہایت عمدہ شرح لکھی۔ 'فصولِ اکبری' کے شروح میں رسالہ لاھیہ کی ابھی حال ہی میں بہت تحقیقی اور مبسوط شرح لکھ کر اسے بالکل آسان فرمادیا ہے۔ عربی ادب کی مشہور کتب 'المجتنیٰ'، منشورات اور دیوانِ متنبی' کے بیش بہا حواشی لکھے اور دیوانِ متنبی جسے عربی زبان کا معجم اللغات کہنا بے جا نہ ہوگا، اس کے تو اتنے اشعار ازبر تھے گویا آپ اس کے حافظ تھے۔ اور عربی عبارتوں کا ترجمہ تو اتنا عمدہ وبہترین کرتے تھے کہ طبیعت پھڑک اٹھتی تھی۔

آپ صرف شیخ الادب ہی نہیں بلکہ شیخ المعقولات والمنقولات بھی تھے اور علم حدیث وتفسیر اور علمِ کلام، فقہ واصولِ فقہ کے ساتھ ہی فنونِ عقلیہ، منطق وفلسفہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ''منقولات''، ''مسلم الثبوت'' اور شرح عقائد نسفی جیسی معرکۃ الآرا کتابیں آپ کے قیمتی حواشی سے مزین ہیں۔ ''شرح عقائد'' تقریباً سبھی مشکل مقامات کو آپ نے بیش بہا حواشی سے سہل ترین بنا دیا ہے۔ معقولات میں ''ملا حسن'' ''شرح ہدا الحکمت للخیر آبادی'' ''ہدیہ سعیدیہ'' اور ''متن حکمت العین''، جیسی اہم ترین کتابوں پر آپ نے حواشی لکھے۔ ۱۳۹۵ھ ''حمد اللہ'' جیسی منطق کی معرکۃ الآرا کتاب کی مشہور و پیچیدہ بحث ''وجود رابطی'' کی مبسوط شرح اسی (۸۰) سے زائد صفحات پر تصنیف فرمائی۔ ''شرح تہذیب'' کی الجھی ہوئی بحث ''المعلم اذا کان اِذعَاناً للنیۃ فتصدیق وَاِلّا فتصور''۔ ۱۳۸۲ھ میں آپ کی خدمت میں پہنچا تو سولہ (۱۶) پر مشتمل ''ملا جلالی وحواشی میر زاہد وغیرہ کے حوالہ جات سے مزین ایک تحقیقی شرح لکھ ڈالی، جو مدرسین کے لیے گویا گوہر نایاب ہے۔ منطق کے ایک بڑے پیچیدہ مسئلے ''فصل الجوھر جوھر'' کی وضاحت میں بہت ہی مفید اور تحقیقی مضمون پر مشتمل ایک رسالہ تیار فرمایا۔ ''شرح تہذیب'' کے خطبے کی ایک مکمل جامع اور مبسوط شرح بہت عرصہ پہلے ہی لکھ چکے تھے جس کی نقل آپ کے بعض مخصوص تلامذہ کے پاس موجود ہے۔ قطبی کے ابتدائی دشوار مباحث اور اخیر تصدیقات کے الجھے ہوئے مسائل کی بڑی شرح لکھی۔ مارہرہ مطہرہ میں تدریس کے ایام میں حضرت تاج العلماء صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کی خواہش پر ''شفا شریف'' امام قاضی عیاض علیہ الرحمہ کا بہترین سلیس اور عام فہم ترجمہ لکھا جو آج بھی 'خانقاہِ مارہرہ' میں محفوظ ہے۔ فن اصول حدیث میں کچھ دنوں پہلے ''مقدمہ صحیح مسلم'' کی شرح لکھنی شروع فرمائی تھی اور اس کا کافی حصہ لکھ بھی چکے تھے، لیکن کثرتِ کار اور علالت ونقاہت نے اسے پورا نہیں ہونے دیا۔

حق تو یہ ہے کہ آپ کے بارے میں شیخ المشائخ شعیب الاولیاء، عارف باللہ حضرت صوفی شاہ محمد یار علی صاحب قبلہ علیہ الرحمہ رضوان کی زبانِ فیض ترجمان سے نکلا ہوا لفظ! ''شیخ العلماء'' حرف بحرف سچ ثابت ہوا، بے شک وہ اپنے دور کے علی الاطلاق شیخ العلماء تھے۔ اس (علمی) جاہ وجلال وفضل وکمال کے باوجود عجز وانکسار اور فقر وتصوف کے غلبہ کے باعث آپ نے بڑی گمنامی کی زندگی بسر فرمائی اور اپنے آپ کو اس مشہور شعر کے مصداق بنالیا۔ ؎

آنانکہ بکنج عافیت بنستند   دندان سگ ودہان مردم بستند

(ماہنامہ فیض الرسول براؤں شریف شمارہ اپریل ومئی ۱۹۷۷ء شیخ العلماء نمبر ص:۴۹۔۵۰)

بے کراں علمی شخصیت کا ایک اجمالی جائزہ

ولادت : ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء

مولود ومسکن: محلہ کریم الدین پور قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڈھ یوپی

تعلیم گاہیں: مدرسہ اشرفیہ مبارکپور۔ دار العلوم منظر اسلام بریلی شریف، مدرسہ عثمانیہ اجمیر شریف، مدرسہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ۔

آپ کے اساتذہ کرام: شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت علامہ شاہ حامد رضا خاں بریلی شریف، صدر الشریعہ حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی، حضرت مولانا رحم علی منگلوری، آثار السلف حضرت علامہ عبد الباری فرنگی محلی، حضرت علامہ قطب میاں فرنگی محلی، حضرت علامہ عنایت احمد فرنگی محلی۔

وہ نفوسِ قدسیہ جنھوں نے آپ کو اجازت وخلافت سے سرفراز فرمایا:

حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظم، پیشوائے قدسیاں حضرت علامہ مصطفےٰ رضا خاں مفتیٔ اعظم ہند بریلوی، حضرت تاج العلماء مارہرہ شریف، عزیز الاولیاء حضرت صوفی شاہ عبد العزیز چشتی ابو العلائی۔

وہ درسگاہیں جہاں پر آپ نے تدریسی خدمات انجام دیں:

دار العلوم اشرفیہ مبارکپور، مدرسہ مظہر اسلام بریلی شریف، مدرسہ محمدیہ امروہہ، احسن المدارس قدیم کانپور، مدرسہ محمدیہ ویلور (مدراس)، مدرسہ قادریہ برکاتیہ مارہرہ شریف، جامعہ عربیہ ناگپور، آخری درسگاہ دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف ۱۳۷۹ھ مطابق ۱۹۶۷ء۔

سفر حج وزیارت : ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۷۲ء

وصال ۶ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ یوم جمعہ مبارکہ صبح سات بج کر ۳۵ منٹ پر

آخری آرامگاہ قصبہ گھوسی متصل مزار حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب
لعل گردد، در بدخشاں یا عقیق اندر یمن

منظرنامه

ایران کی غدّاری

مسجد حرام اور تمام مقاماتِ مقدسہ کو اغیار کے قبضے سے نجات دلانا ہی دنیا بھر کے مسلمانوں کی تمنّا اور آرزو ہے۔۔!
فولادی عزائم اور آہنی اِرادوں کے مالک صدر صدّام اور عراقی عوام تمام عالمِ اسلام کے دل کی دھڑکن بن چکے ہیں

بندۂ مومن کا دل خوف و رِجا سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

حالیہ معرکۂ صلیب وہلال کے غیر متوقع نتیجے سے لوگوں کے ایک بڑے طبقے میں مایوسی اور بد دلی پھیلی ہوئی ہے کہ یہی کرنا تھا تو عراق کویت کو ۱۵ر جنوری سے پہلے ہی خالی کر دیتا۔ ۳۸ر دنوں تک پوری جاں بازی کے ساتھ فضائی معرکہ کا کامیاب دفاع کرتے ہوئے پوری دنیا سے اپنی عظمتوں کا خراجِ تحسین لیا، پھر زمینی حملے میں اچانک اتنی جلد پسپا کیوں ہو گیا؟ جبکہ اس کی زمینی جنگ کی قہرمانیوں سے امریکہ اور اس کے اتحادی لرزہ براندام تھے۔ جس کا وہ ایک ہلکا سا مظاہرہ "الخبزی" میں دیکھ چکے تھے۔ جس کی وجہ سے پوری دنیا کو یقین ہو گیا تھا کہ زمینی معرکے میں صحرائے عرب امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا قبرستان بن جائے گا لیکن چوبیس گھنٹوں میں جو اس کے برعکس ہوا اِس سے پوری دنیا سکتے میں آگئی اور خاص کر کے دنیا بھر کے مسلمانوں پر بجلی بن کر گری کیوں کہ ہر مسلمان آزادیِ بیت المقدس و بازیابیِ حرمین طیبین کی بنیاد پر عراق کی فتح کا تمنائی تھا اور اس کے لیے ہر امکانی قربانی دینے کے لیے تیار تھا لیکن اہلِ نظر اور اہلِ بصیرت اس باوقار واپسی کو شکست نہیں قرار دے رہے ہیں، حالات و واقعات اور اسلام کی حربی تاریخ پر جن کی نظر گہری ہے، وہ اس جنگ کو عراقی مجاہدین کا ایک عظیم کارنامہ سمجھتے ہیں۔

مغربی نیوز ایجنسیوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں کی دُھند چھٹے گی تو اس حقیقت سے پردہ اُٹھے گا کہ یہ انہونی کیوں ہوئی؟ سر دست حالات و واقعات اور قرائن کے تجزیے سے بظاہر اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ عراقی قیادت سے ایک چوک یہ ضرور ہوئی کہ جس جنگ کو اس نے اللہ اکبر کے پرچم تلے اسلام کے نام سے شروع کیا تھا اس کے لیے اس نے دشمن اسلام روس پر ایک لمحے کے لیے ہی سہی اعتماد کیوں کیا، جبکہ الکفر ملة واحدہ کے کلیہ سے بے خبر نہیں تھی۔ جس کی سزا اسے کچھ نہ کچھ تو ملنا ہی چاہیے تا کہ مستقبل قریب میں جب کبھی وہ اس طرح کی مقدس جنگ شروع کرے تو پہلے اپنی صفوں سے کالی بھیڑوں کو نکال باہر کرے اور صرف اللہ رب العزت کی مدد اور اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ کرے۔

روس اور ایران کی غداری

روس اور ایران نے عین وقت پر اپنا بن کر جس طرح پشت پر خنجر مارا ہے اور سلطان ٹیپو کی طرح غیروں کے بجائے

اپنوں کے ہاتھوں جس طرح عراقی مجاہدین نے دھوکا کھایا ہے اس کی تفصیلات کسی نہ کسی طرح دنیا کے سامنے آہی جائے گی۔

امریکی بحریہ کو پورے طور پر تباہ و برباد کردینے والے میزائل بردار جہاز اور موت کا رقص پیش کرنے والے شہیدے دستے کو اپنائیت کے جال میں اُلجھا کر بڑی خوب صورتی کے ساتھ بے دست و پا کردیا گیا اور اس طرح شیطان بزرگ امریکہ کا زبانی رٹ لگانے والے ملک ایران نے آٹھ سالہ جنگ کا بدلہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ لے لیا اور ہر سال اسلامی اتحاد کے ہفتہ وحدت منانے والی نام نہاد قیادت نے اپنے چہرے سے نقاب اُلٹایا۔

بخیر تم کو عجب تیر بے کماں زوئی

عراقی عوام نے دشمنانِ اسلام و اعدائے دین و عرب منافقین کے نرغے میں دنیا کے ۳۰ ملکوں کے عظیم قہرمانی قوتوں وسُپر طاقتوں کی عسکری توانائیوں کو جس انداز میں للکارا ہے اور مسلسل ۳۸ دنوں تک دنیا بھر کے بزدلوں، نامردوں، بے شرموں و انسانیت کے ذلیل ترین مجرموں کی بے رحمانہ جارحیت کے خلاف عزیمت و استقامت، شجاعت و شہامت، بے خوفی و بے جگری کا جو عظیم الشان مظاہرہ کیا ہے کیا تاریخ حرب و ضرب میں اس کی کوئی دوسری مثال مل سکتی ہے؟

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

مسلمانوں کا وقار:

عراق کے غازیوں اور شہیدوں نے اپنے مقدس لہو اور آہنی عزم و استقلال سے ایک نئی تاریخ مرتب کی ہے اور پوری دنیا میں مسلمانوں کے گرے ہوئے وقار کو جس انداز میں بلند کیا ہے نیز موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عربوں کی عسکری تاریخ کو جس انداز میں دہرایا ہے اس کے لیے وہ پوری ملّتِ مسلمہ کی طرف سے شکریہ اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

عالمی دہشت گرد شیطانِ اعظم امریکہ جس کی ٹیکنالوجی اور سائنسی قوتوں سے پوری دنیا سہمی ہوئی تھی کہ جب امریکہ، نیویارک میں بیٹھ کر ایک بٹن دبائے گا تو اس کا ایک دشمن ملک ختم ہوجائے گا اور دوسرے بٹن پر دوسرا ملک۔ اس کے اس مصنوعی ٹیکنالوجی کا بھانڈا کھڑی دوپہر میں بیچ چوراہے پر پھوٹ گیا۔ اس کی انانیت کے سومناتھ پر عراقی مجاہدین محمود غزنوی بن کر ایسے ٹوٹے کہ اس بتِ سامری کا سارا سحر ہی ٹوٹ گیا۔ جیسا کہ انجزی پر عراقی قبضہ اور اتحادیوں کی شکست فاش سے ظاہر ہے کہ انجزی کو اتحادی بزورِ قوت واپس نہ لے سکے جبکہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے بعد عراق نے کویت ہی کی طرح اسے بھی خالی کردیا تھا۔ اسی لیے اس شرمناک ذلّت پر مجرم انسانیت بش امریکہ کی محفوظ ترین پناہ گاہ قصرِ ابیض میں بیٹھ کر اپنی بوٹیاں نوچتا کہہ رہا تھا: اے کاش! مجھے کوئی صدام کا سر لاکر دے دیتا۔

ارضِ فلسطین پر اب تک امریکہ اسرائیل کی آڑ میں تمام عرب ممالک کی آئے دن برابر پٹائی اور ٹھکائی کیے رہتا تھا اور عالم یہ تھا کہ رونے بھی نہیں دیتا تھا۔ بیالیس برس کے عرصے میں کسی عرب ملک کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کو الٹ جواب دیتا چہ جائیکہ مقابلہ۔ اور اگر کسی نے ہاتھ پاؤں ہلایا بھی جیسے مصر، تو اس کا وہ حشر کیا کہ اسے بقیہ عرب ممالک کے لیے

سامانِ عبرت بنا دیا اور بیت المقدس اور مسئلہ فلسطین پر ایسی زبردست ٹھنڈی ریت ڈال دی کہ دنیا اسے بھول گئی۔ البتہ جب کبھی اپنے جذبۂ ظلم وستم کی تسکین کے لیے بے خطا مظلوم فلسطینی جانوں کا شکار کرتا اور ان کی چیخ فضائے بسیط کا سینہ چیرتے ہوئے تیسری دنیا کے کانوں تک پہنچتی تو کسی کونے سے انسانی ہمدردی کے طور پر ایک کمزور آواز اُٹھ جاتی کہ اسرائیل (امریکہ) کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ عراق نے اسی اسرائیل (امریکہ) کو دنیا کے تقریباً ۲۸ ممالک کے مشترکہ بے رحمانہ وجارحانہ دفاع کے دوران ایسا تہس نہس کیا کہ اس کو بھوسہ نکل گیا اور کویت سے واپسی تک تہران، ریاض، تل ابیب، حیفہ کو بدستور اپنے میزائلی حملوں سے تہس نہس کرتا رہا۔ حتیٰ کہ اسرائیل کے ایٹمی ری ایکٹر کو بھی نہیں بخشا اور یہ سب ایسے عالم میں ہوا کہ ان کی حفاظت کے لیے چھ لاکھ سے زائد اتحادیوں کا لشکر جرار اپنے افسانوی اسلحوں کے ساتھ موجود تھا اور ہمیشہ کے لیے اسرائیل کی چیرہ دستیوں کا کس بل نکال دیا اور ستم بالائے ستم یہ کہ ہر بار کی پٹائی اور توڑائی پر دوڑ کر امریکہ اس کے آنسو پونچھتا کہ ”بیٹا! صبر کرو، وقت بڑا نازک ہے۔“

کھسیانی بلّی:

دیکھتے ہی دیکھتے چٹکیوں میں عراق کا کام تمام کر دینے کی دعوے دار دنیا بھر کی سُپر طاقتیں اور ان کے بزدل اتحادی جب رات دن کی مسلسل ہزار ہا ہزار ٹنوں کی بمباری عراقی افواج کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور نہ ان کے شجاعت وشہادت میں کسی طرح کا لوچ لا سکے تو جنگی اُصولوں کو پامال کرتے ہوئے عورتوں بچوں، بے قصور شہریوں اور عبادت گاہوں پر اس قدر بم برسائے کہ بغداد کے علاوہ کوئی اور سرزمین ہوتی تو کب کا راکھ کا ڈھیر بن چکی ہوتی۔

عراق کی سرزمین انبیا، صلحا، صحابہ، شہدا، اولیا، اتقیا، اصفیا، ابدال، اوتاد، اغواث، غوث اعظم، امام اعظم، شہید اعظم کی مقدس سرزمین ہے۔ یہ انھیں نفوسِ قدسیہ کی روحانیت کی جلوہ سامانیاں ہیں کہ اس قدر بے رحمانہ، وحشیانہ، بزدلانہ بمباری کے باوجود بغداد کا وجود صفحۂ ہستی پر برقرار اور جوں کا توں رہ گیا۔ ورنہ ظالموں، اسلام دشمنوں، نجدی درندوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر باقی نہ لگا رکھی تھی۔ فالحمد للہ ربّ العٰلمین۔ بے قصور عورتوں، بچوں اور بے قصور شہریوں پر بمباری صرف اس لیے تاکہ عراقی حکومت ہماری بات مان لے اور اس لیے بھی کہ شہری اپنی بربادی پر اپنی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور اس لیے بھی کہ عراقی فوجوں پر جب ان کی بہادری نہیں چل سکی تو کھسیاہٹ اور جھلّاہٹ میں نہتے شہریوں پر اپنی بہادری دکھانے لگے تاکہ دنیا یہ دیکھ لے کہ ہم کتنے بڑے تیس مار خاں ہیں۔

پوری دنیا دیکھ رہی تھی امریکہ کا غلام اِدارہ اقوام متحدہ بھی اپنی اندھی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ طاقت کے استعمال کی قرارداد، کویت کی بازیابی کے لیے نہ کہ عراق کی بربادی کے لیے۔ صرف دو تین ممالک کے علاوہ پوری دنیا مجرمانہ طور پر خاموش رہی۔ کسی کے منہ سے اتنا بھی نہ نکل سکا کہ بات کویت کی آزادی کی تھی تو عراق کیوں برباد کیا جا رہا ہے؟ اور تو اور حد یہ کہ برصغیر میں اسلام کا ٹھیکہ اور پٹہ لیے پھرنے والی پاکستانی حکومت بھی کفر واسلام کے اس معرکہ میں صلیبیوں کے اتحاد

میں پورے طور پر شریک رہی۔

فہد کی شیطانیت:

صدام حسین نے کویت پر قبضہ کے بعد مغربی سامراج کی ناجائز اولاد سعودی حکمرانوں اور ان کے حمایتیوں کے سامنے ایک پرپوزل رکھا کہ بیت المقدس مسلمانوں کو، فلسطین کے بے گھر لوگوں کو ان کے گھر واپس دے دیئے جائیں، ہم تیل سے مالامال کویت واپس کردیں گے۔ لیکن خادم الحرمین کا مصنوعی لبادہ اوڑھنے والے خائن الحرمین فہد ابن عبدالعزیز نے اس عظیم ایمانی پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے بیت المقدس پر ایک بزدل بھگوڑے اور عیاش بادشاہ کی بحالی عیاشی کو ترجیح دی اور بیت المقدس کی آزادی کی شرط ماننے سے انکار کردیا۔ اور عراق کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے بہانے یہود ونصاریٰ اور اسلام دشمن ناپاکوں کی فوج کو اس مقدس خطّے میں بلا ہی لیا، جس کے لیے حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکماً فرمایا تھا: خرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب۔

ترجمہ: یہود ونصاریٰ کو جزیرۂ عرب سے نکال دو۔

یہاں ہندوستان میں کچھ عربی درس گاہیں جو سعودی خیرات وزکوٰۃ پر چلتی ہیں، ان کے اربابِ بست وکشاد وشیوخانِ جبّہ ودستار اس خالص غیر اسلامی وفعل حرام کے جواز کے لیے کتاب وسنّت کی تاویلات تشریحات میں ایسی ایسی دور کی کوڑیاں لائے کہ اکبر بادشاہ کے درباری ابوالفضل وفیضی کی روحیں بھی شرمندہ ہوگئیں۔۔۔۔ دنیا نے عالمِ حیرت میں دیکھا کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کی خاطر بلائی جانے والی فوجیں سعودی بادشاہ کے اشارۂ ابرو پر اسلام دشمن طاقتیں کویت کے بجائے عراق پر ٹوٹ پڑی..... تو پوری دنیا کا مسلمان بے چین ہوگیا۔ آزادیٔ بیت المقدس وبازیابیٔ حرمین طیبین کی بنیاد پر سارے مسلمان اس معرکۂ عظیم کو کفر واسلام کی جنگ یقین کرتے ہوئے عراق کی فتح ونصرت کے لیے مضطرب ہوگئے۔ حتیٰ کہ ان آزاد خیال صحافیوں نے بھی جو کل تک کویت کی بنیاد پر عراق کے خلاف اپنے صفحات بڑی فراخ دلی کے ساتھ سیاہ کررہے تھے، اسے اسلام وکفر کا معاملہ قرر دیتے ہوئے ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں

کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے اخبارات کے قیمتی صفحات عراقی مجاہدین کی حمایت میں وقف کردیا۔

اسعد کا دوغلاپن:

ہندی مسلمان اپنی دین پسندی کے باعث پوری دنیا سے زیادہ بے چین تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ روزے رکھ کر عراق کی فتح کے لیے دعا مانگتے رہے۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کا تو کہنا ہی کیا تھا دیوبندی عوام بھی اسے معرکۂ صلیب وہلال یقین کرکے دن رات مصروفِ دعا تھے، البتہ ان کی بڑی بڑی درس گاہوں کے بڑے بڑے ذمے دار حضرات جیسے علی میاں ندوی، منت اللہ رحمانی، اسعد مدنی جیسی سطح کے لوگ جنگ شروع ہونے سے پہلے ارضِ مقدس میں امریکی ویہودی

افواج کی آمد پر اس کے جواز کے لیے کتاب وسنّت کے حوالے سے نئی نئی تاویلیں کر رہے تھے اور دورانِ جنگ جمہور مسلمین کا رُخ دیکھ کر ایسے خاموش ہوگئے کہ جیسے اس موضوع پر لب کشائی ہی جرم ہو۔

البتہ مؤخر الذکر یعنی اسد مدنی صاحب اپنے ابن الوقتی، ضمیر فروشی کا عالمی ریکارڈ قائم کر رہے تھے۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے جذباتی رُخ کو عراق کی حمایت میں دیکھتے ہوئے یہاں کے اردو اخبارات میں خلیج کی صورتِ حال پر بہت بچ بچ بیان دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ عام مسلمانوں کی خوشنودی کے لیے دارالعلوم دیوبند میں احتجاجاً امریکی بُش کا پُتلا بھی جلایا گیا۔ دوسری طرف سعودی حکومت کی راجدھانی ریاض سے شائع ہونے والے ایک مشہور عربی ہفت روزہ ''الدعوۃ'' مورخہ ۱۹ر رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۶ر جنوری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں یہودیوں اور نصرانیوں سے کفر و اسلام کی جنگ لڑنے والے عظیم مجاہد صدام حسین کو کافر، ملحد اور بے دین قرار دے رہے تھے، جس کی تفصیل تحقیق اور اصل عربی عبارت ہفت روزہ ''ہمارا قدم'' تاریخ اشاعت ۸ تا ۱۴ر مارچ ۱۹۹۱ء صفحہ پانچ کالم نمبر ۶، ۷، ۸ میں دیکھیے۔ ان تمام قلابازیوں سے پتہ یہ چل رہا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے سربراہِ اعلیٰ کا سمتِ قبلہ حالات کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور اپنے مادّی منفعت کے لیے جب جسے چاہا کافر، مرتد قرار دے دیا ؎

اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ
جو بات کہیں فخر وہی بات کہیں ننگ

عراقی مجاہدین وشہدا کا خون ان شاءاللہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ انہی کی قربانیوں کی بدولت مرا ہوا مسئلہ فلسطین و بیت المقدس زندہ ہوگیا۔ اور ان شاءاللہ بہت جلد قبلہ اوّل یہودیوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوگا۔ فلسطینی آباد ہوں گے اور صیہونی و امریکی ایجنٹ سعودی حکمران برباد ہوں گے۔ ان شاءاللہ تعالیٰ (۸ر مارچ ۱۹۹۱ء)

ایران کی شرارت:

دنیا کے تیس ممالک سے تاریخ کی سب سے خطرناک جنگ لڑنے والا تنہا عظیم عراق لڑائی بند کرنے پر اس وقت مجبور ہوا جب دنیا بھر کی سُپر طاقتیں میدانِ جنگ کے بجائے انڈر گراؤنڈ سازشوں اور بغاوتوں میں کامیاب ہوئیں اور بغاوتوں کی تکمیل اس ایرانی شیعہ قیادت کے ہاتھوں ہوئی جو انقلاب ایران کے روزِ اوّل سے شیطان بزرگ امریکہ کا زبانی وظیفہ بڑے زور وشور سے پڑھ پڑھ کر پورے عالم اسلام کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ آٹھ سالہ جنگ کے فاتح عراق نے نہایت فراخ دلی کے ساتھ ایران کے جیتے ہوئے بہت بڑے بڑے علاقے اور ایک لاکھ جنگی قیدیوں جس کے لیے اس نے بہت بڑی قربانیاں دی تھی، بلا کسی شرط کے واپس کر دیا، تا کہ ماضی کے تلخیوں کو بھلا کر برادرانہ جذبے کو فروغ دیا جا سکے۔ ایران نے بھی بظاہر عراق کے اس عظیم تاریخی قدم کا خیر مقدم تحیر خیز مسرّت کے عالم میں کیا، جس سے نہ صرف عراق بلکہ تمام عالمِ اسلام کو یہ اُمید بندھ گئی تھی کہ خلیج کی جنگ میں ایران کا کردار بڑا مثبت اور تاریخی ہوگا۔ بے شک خلیج کی جنگ میں ایران کا

کردار تو اتنا تاریخی رہا کہ اتنا تو پورے اتحادی ممالک کا بھی نہیں رہا کہ وہ سب مل کر ۴۳/ دن کے زبردست فضائی معرکوں میں عراقی فوج کا کچھ نہ بگاڑ سکے جتنا اکیلے ایران نے شیطان بزرگ امریکہ کے اشارے پر عراق کے فوجیوں اور شہریوں میں بغاوت کرا کے انجام دیا اور عراق سے آٹھ سالہ جنگ میں شکست کا بدلہ بڑی خوب صورتی کے ساتھ لے لیا۔ عراق کی سُنّی حکومت کو تہس نہس کر کے وہاں پر شیعہ حکومت قائم کرنے کے زعم میں اپنے شیطان بزرگ امریکہ کا ایجنٹ و دلال بننا بھی بڑے خلوص کے ساتھ گوارہ کرلیا۔ ان احمقوں نے یہ سمجھا تھا کہ عراق پوری دنیا سے تنہا لڑ کر بے دَم ہو چکا ہے اور یہی سنہرا موقع ہے کہ اپنے چہرے سے تقیہ کا نقاب اُتار کر عراق کی سُنّی حکومت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے لیکن۔۔۔ع

اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا

صدام حسین اور اُن کے جانباز ہمیشہ مردِ میدان تھے۔ انھوں نے پوری قہرمانی قوتوں کے ساتھ باغیوں کا کس بَل نکال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ساری بغاوتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ باغی خواہ شیعہ رہے ہوں یا سُنّی یا عیسائی۔ واضح رہے کہ کُرد باغیوں میں ایک بڑی تعداد عیسائیوں کی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ و برطانیہ کے پیٹ میں کُرد باغیوں کے لیے مروڑ ضرورت سے زیادہ پیدا ہوئی ورنہ انسانیت کا یہی دردِ زہ ان کے اندر شیعہ باغیوں کے لیے کیوں نہیں اُٹھا؟ صرف کُرد باغیوں کے لیے یہ اہتمام کیوں؟

ع بیا بیا عراقی توز خاصگاں مسائی

ایرانیوں اور شیعوں کے جذبات کے احترام میں حکومت بغداد نے مقاماتِ مقدسہ پر جو سیکورٹی اور کڑی چھان بین لگا رکھی تھی اسے بالکل ختم کر دیا، اور یہی ان کی غلطی تھی۔ منصوبہ بند طریقے سے ایرانی ایجنٹ زیارتوں کے بہانے بڑی تعداد میں عراق کے اندر گھس آئے اور جنگ کے خطرناک اور نازک لمحات کے درمیان وہاں کی شیعہ آبادی کو اپنی حکومت قائم کرنے کا سبز باغ دکھا کر انھیں حکومت عراق کے خلاف گمراہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ بغاوتیں ایسے عالم میں ہوئیں جبکہ عراق اس جنگ کو اللہ کے نام شروع کر چکا تھا اور سارا عالمِ اسلام اسے معرکۂ صلیب و ہلال قرار دے چکا تھا۔ حد یہ کہ ایرانی عوام نے بھی اسے کفر و اسلام کی جنگ قرار دیتے ہوئے عراق کی حمایت میں زبردست عوامی مظاہرے کیے۔ تقیہ کے نقاب میں چھپے ہوئے جب انھیں اپنی قیادت کا گھناؤنا چہرہ نظر نہیں آیا، تو عراق کے صدر صدام حسین تو بہرحال ان سے دور تھے۔ بے شک اہلِ تشیع کا اتنا بڑا جانی نقصان اجتماعی طور پر شاید ہی تاریخ کے کسی دور میں ہوا ہو۔۔۔ لیکن اس کے لیے صدام حسین نہیں بلکہ ایران کی شیعہ قیادت مجرم ہے۔ عراق کی اندرونی بغاوتوں اور اس کے ردِعمل میں ہونے والی تباہی و بربادی کی اصل مجرم یہی ایرانی قیادت ہے۔ بغاوتوں کے ردِعمل میں ہونے والی تباہی پر احتجاج و مظاہرہ صرف ایرانی حکومت کے خلاف ہونا چاہیے نہ کہ صدام حسین کے خلاف۔

بغاوتوں کے کچلنے میں صرف مجرم ہی نہیں مارے گئے ہوں گے بلکہ بے قصور لوگ بھی اس کی لپیٹ میں یقیناً آئے ہوں گے، جن سے پوری دنیائے انسانیت کو ہمدردی ہے اور ہونی چاہیے۔ بے قصوروں کی تباہی کی ذمے دار بھی ایرانی

حکومت ہے جس کی سزا ایرانی قیادت کو ملنی چاہیے۔ مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کے لیے فرضی آٹھ آٹھ آنسو بہانے والے مجلس علما وخطبا کے فرضی صدر نشین جناب موسوی اُس وقت کہاں تھے جب اتحادیوں کی زبردست بمباری سے کربلائے معلّٰی شعلوں کے نرغے میں تھا۔ اس وقت ان کے آنسوؤں کا سوتا خشک ہو گیا تھا اور ان کی زبان وقلم پر تالے کیوں پڑ گئے تھے؟

بالفرض اگر مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی خدانخواستہ ہوئی بھی تو اس کے لیے حقیقی ذمے دار ایرانی قیادت اور مقامی شیعہ ہیں۔ ایک چور یا ڈاکو کسی مسجد میں گھس جائے تو کیا اسے اس لیے چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ مسجد میں پناہ لے چکا ہے۔ باغی تو ان سے بھی بڑا مجرم ہے۔ کوئی بھی حکومت اپنے خلاف بغاوت کو برداشت نہیں کر سکتی ہے اور خاص کر وہ حکومت جس کو مکمل طور سے تباہ کرنے کے لیے دنیا کی ساری بڑی طاقتیں ایک طرف ہو چکی ہوں۔

خود ایرانی حکومت نے اپنے ملک کے کُردسنیوں پر بغاوت کے نام پر ظلم وستم کا وہ کون سا انداز ہے جو انھیں تباہ و برباد کرنے کے لیے نہیں اپنایا اور آج بھی وہاں کی مذہبی حکومت نے تناسب آبادی کے اعتبار ہی سے سہی کُردسنیوں کو کتنے انسانی و مذہبی حقوق دے رکھے ہیں؟ مذہبی رواداری اور حقوق کی بات تو الگ رہی ان کے ساتھ تو اچھوتوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کے لیے تو انقلاب ایران سے پہلے ہی کا ایران غنیمت تھا جبکہ عراق میں جمہوری قدروں کی بنیاد پر شیعہ حضرات کی ناز برداری کی جاتی رہی، جسے ہم نے اپنی آنکھوں سے عراق میں جا کر دیکھا۔ خود انقلاب ایران کے چار سال بعد تک مسلسل فوج کے بڑے بڑے دل و دماغ کو غداری اور بغاوت کے نام پر قتلِ عام کراتے رہنے والے خمینی صاحب کے بارے میں کیا کہا جائے گا، گویا روزانہ جب تک کئی درجن سر نیزے پر نہیں چڑھ جاتے تھے خمینی صاحب کا ناشتہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود نہ تو وہ ظالم وجابر، خوں خوار، وحشی اور قاتل ٹھہرائے گئے اور نہ ہی ان کے احترام میں شیعہ حضرات کے نزدیک کوئی فرق آیا۔

اپنا بلڈ صاف کرنے کے نام پر مسلسل چار سال تک فوج کے اعلیٰ دماغ کا خون بہانے والے خمینی ویسے کے ویسے ہی اپنی قوم میں آیت اللہ روح اللہ بنے رہے اور کہیں سے ان کے خلاف کسی شیعہ نے احتجاج نہیں کیا، گویا ؎

رِند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

پھر ان سے بھی زیادہ باغی، غدار اور وطن دشمن افراد کے ساتھ محترم صدام حسین کے اس سلوک کے خلاف احتجاج و مظاہرہ کیوں؟ صرف چند امریکی غلام حکمرانوں کے علاوہ ساری دنیا کے مسلمان جس جنگ کو کفر و اسلام کی جنگ قرار دیں ایسی مقدس جنگ کے دوران بغاوت کرنے والے مجرموں کے حامیوں اور ہمدردوں اور ان کی حمایت میں مظاہرہ کرنے والوں کو اسلامی فقہ پر بھی ایک نظر ڈال لینا چاہیے کہ ان کا یہ فعل کہاں تک درست ہے؟ باغیوں سے ہمدردی تو بڑی چیز ہے۔ اسلامی فقہ ان کا نمازِ جنازہ پڑھنے کی بھی اجازت دیتی ہے۔۔۔؟

☑☑☑☑☑☑

بوسنیا: عالمِ اسلام کو آواز دے رہا ہے!

اسپین کی تاریخ کو دوہرانے کے شیطانی منصوبہ کو ناکام بناؤ!

اپنے ہی علاقہ کویت وعراق کے قبضہ سے تڑپ اُٹھنے والے بوسنیا میں ہونے والے خون خرابے پر کیوں خاموش ہیں؟

افغانستان کے اندرونی معاملات میں ناجائز مداخلت اور شیطانی جارحیت کا مظاہرہ کرنے اور عراق پر طاغوتی حملے کے وقت غداری کے نتیجے میں روس کا کوہِ پیکر اور ہمالیائی وجود پاش پاش ہوگیا اور اس طرح چھ مسلم ریاستیں کمیونزم کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہوگئیں۔۔۔دنیا کے نقشے پر چھ مسلم ریاستوں کا اضافہ ہوا جنھیں دنیا کے تمام ممالک نے بحیثیت ملک تسلیم کرلیا۔ روس کو ٹوٹتے بکھرتے دیکھ کر یوگوسلاویہ میں کچھ علاقائی طاقتوں نے زور پکڑا۔ اسی میں بوسنیا وہرزگونیا بھی مسلم اکثریت پر مشتمل ایک علاقہ ہے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بھی ایک چھوٹی سی مسلم ریاست کی آزادی کا اعلان کردیا۔ اس گہرائی میں اُترے بغیر اور اس حقیقت صادقہ کا کماحقہٗ اِدراک کیے بغیر کہ یورپی برادری (جو خیر سے مسیحیت کی دعوے دار بھی ہے) اپنے درمیان کسی بھی مسلم ریاست کا وجود خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو برداشت نہیں کرسکتی۔ جو قوم پانچ سو سال سے اسپین (اندلس) کے فتح کا جشن اجتماعی طور پر اب تک مناتی آرہی ہے اس کے نزدیک تو اس کا تصور بھی جرم ہے۔

پانچ صدی پیشتر ۱۲ ربیع الاوّل ۸۹۷ھ کو اسپین (اندلس) میں مسلمانوں کے عظمت وجلال کا آفتاب عالم تاب جو ڈوبا تھا اس کا جشن فتح اسپین کے ساتھ مل کر پورا یورپ آج بھی منا رہا ہے۔۔۔اور۔۔ابھی حال ہی ایک قدیم تہذیب کے اہم مرکز بارسلونا میں جو اولمپک کا کھیل منعقد ہوا تھا، جس میں ساری مہذب دنیا بھی ٹوٹ پڑی تھی اور تاریخی حیثیت سے بے خبر چند مسلم ممالک بھی شریک ہوگئے تھے۔ یہ اسی جشن پنج صدی کا حصہ تھا جو ہر سال اس موقع پر کسی نہ کسی نوعیت سے اسپین میں مسلسل منا رہا ہے۔ یورپی برادری جسے اپنی تہذیب یافتہ ہونے کا احساس بڑا شدید تر ہے۔۔۔اور۔۔۔انسانی قدروں کی علم برداری کی بھی دعوے دار ہے۔ وہ بارسلونا میں غرناطہ کا جشن فتح منانے میں اس قدر مصروف تھی کہ نہ تو اسے افریقہ کے قحط کے مارے بیچارے عوام یاد رہ گئے اور نہ عراق میں دودھ، دوا کی قلت سے روتے بلکتے، جان دیتے بچے اور نہ ہی بوسنیا وہرزگونیا کے مظلوموں کی دردناک چیخیں ہی سنائی دیں۔ بچوں، بوڑھوں، لڑکیوں، عورتوں کا وحشیانہ قتل، نسل کشی، عصمتوں کی تاراجی بھی یہ دیکھتی اور سنتی رہی۔

اندلس (موجودہ اسپین) میں پانچ سو سال پیش تر وہاں صدیوں پرانے مسلم اقتدار کے خاتمے پر وہاں سے مسلمانوں کی بے دخلی پر جس وحشیانہ انداز میں مظالم ڈھائے گئے اور جس انداز میں انسانیت کی تذلیل کی گئی، مذہبی تعصّب میں جس درندگی کا مظاہرہ کیا گیا، وہ جو تاریخ کا ایک سیاہ باب بن چکا ہے۔ وہ غالباً مغرب کے ایامِ جاہلیت کا دور تھا۔ مگر آج بوسنیا

میں مسلمانوں کی بے دخلی کے لیے پانچ سو سال کی وہ ایامِ جاہلیت کی تاریخ کیوں دہرائی جارہی ہے؟ مسلمانوں پر مظالم و درندگی کا وہی باب پھر سے کیوں کھول دیا گیا؟۔۔۔آج بزعمِ خویش یورپ تہذیب جدید وفروغ یافتہ تمدن کا بانی اور انسانی قدروں کا علم بردار ہے تو پھر بوسنیا و ہرزگونیا میں انسانی قدریں پامال کیوں ہورہی ہیں؟ انسانی نسل کشی کیوں ہورہی ہے؟ مسلمانوں کو ان کے وطن سے نکالنے کے لیے ایسی جگر خراش درندگی کیوں کی جارہی ہے؟ عفت مآب بہنوں، بیٹیوں کی عصمتوں کا جنازہ کیوں نکالا جارہا ہے؟ عصر جدید کے ان چکاچوند اُجالوں میں پانچ سو سال قبل ایامِ جاہلیت کی تاریکی کا یہ دوردورہ۔ الامان والحفیظ۔

مغربی سامراج پہلے کی طرح دنیا کے کمزور ممالک بالخصوص مشرقی وسطیٰ اور ایشیا کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ مگر ذرا مہذب انداز میں پہلے یہ براہِ راست مقبوضہ ممالک کی مسندِ اقتدار پر خود بیٹھتے تھے اور اب انھیں میں سے کسی فرد کو اپنا ایجنٹ یا غلام بنا کر اقتدار اس کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے آقا کی جنبش ابرو کا پابند رہ کر اپنے ملک کا مفاد سامراج کے قدموں میں ڈالے رہتا ہے تب تک اپنے ملک کا حاکم رہتا ہے۔۔۔اور۔۔۔جوں ہی ذرا سی غفلت ہوئی کسی نام نہاد بغاوت یا انقلاب کے ذریعے اسے اُٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ پر پھر کوئی نیا مہرہ لے آیا جاتا ہے اور پھر اس نافرمانی کی سزا میں معزول شدہ غلام حکمراں پر عوامی عدالت میں مقدمہ چلا کر اسے سزا دی جاتی ہے۔ برصغیر میں بنگلہ دیش اور پاکستان اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ روس جیسے عظیم ملک کا سربراہ میخائل گورباچوف آئی اے کا ایجنٹ ہوسکتا ہے؟ ہندوستان کے سابق وزیر اعلیٰ مرارجی ڈیسائی پر سی آئی اے کے ایجنٹ ہونے کا الزام لگ سکتا ہے، جس کے لیے موصوف اپنی صفائی میں بہت ہاتھ پاؤں مار چکے ہیں۔ عرب ممالک میں امریکہ کے غلام حکمرانوں کے نام لینے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی، جو اسلام کی عظمتوں کو بھی کلنک کا ٹیکہ لگوا چکے ہیں۔ شیطان بزرگ امریکہ کا دن رات سوتے جاگتے اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن پر وظیفہ پڑھنے والی ایرانی قیادت کا موجودہ سربراہ کیا امریکہ کا آدمی ہوسکتا ہے؟ جیسا کہ ابھی حالیہ خلیج کی امریکہ وعراق جنگ میں وہ قدم قدم پر امریکہ غلامی کا عملی ثبوت دے چکا ہے۔

موجودہ پاکستانی سربراہ نواز شریف اور بنگلہ دیش کی خاتون وزیر اعظم خالدہ ضیا امریکہ کے وفاداروں میں بڑا بلند و معتبر مقام رکھتے ہیں۔ اوّل الذکر اگر امریکی قیادت کے آگے مستقل حالتِ رکوع میں ہیں تو محترمہ خالدہ ضیا نے اپنے تمام تر سحر بنگال کی سحر آفرینی کے باوجود اپنی سیاسی زلفوں کو امریکہ کے قصر ابیض کے مضبوط کھونٹے سے باندھ رکھا ہے۔ یہ دونوں اسی وقت تک اپنے اپنے ملکوں میں حکمراں رہیں گے جب تک امریکہ کے حضور رکوع و سجود میں ان کا خشوع وخضوع برقرار رہے گا۔ یہ اور ان جیسے بہت ترقی پذیر ممالک کے سربراہ مغربی سامراج بالخصوص امریکہ کے غلام ہیں۔ ان کے سیاسی سجدہ کا سمت اپنے آقا کے جنبش ابرو کے مطابق بدلتا رہتا ہے اور وہ جنھوں نے مغربی سامراج کی غلامی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالنے سے انکار کر دیا، اور برابری کی سطح سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کیں، ان سے زندگی کے تمام حقوق چھین لینے کے لیے اپنی تمام تر توانائیاں صرف کر دیں۔ جیسے عراق عظیم اور اس کے قائد مجاہد حریت، بطلِ عظیم،

اسلام کے مردِ غازی، فرزند ایشیا سید صدام حسین حفظہ اللہ کہ ان پر کویت میں جارحیت کا بہانہ بنا کر (حالانکہ کویت صدیوں سے تاریخی اور تہذیبی، لسانی، معاشرتی، مذہبی اور جغرافیائی اعتبار سے بھی عراق کا حصہ تھا، جسے مغربی سامراج نے ہی ترکی خلافت کے بندر بانٹ کے وقت عراق سے نکال کر ایک ڈیڑھ اینٹ کی ریاست بنا کر وہاں اپنا ایک غلام اور اپنا تابع فرمان مہرہ بٹھا دیا ہے) پوری دنیا کی سُپر طاقتیں، جدید ترین شیطانی قوتوں کے ساتھ ٹوٹ پڑیں اور مسلسل ۳۹ر دنوں تک اہلِ عراق پر آگ کا سمندر اُنڈیلتے رہنے کے باوجود اُن کے جذبۂ جواں مردی کچلنا درکنار ذرا سا نرم بھی نہ کر سکے۔۔۔اور۔۔۔آج جنگ بندی کے ڈیڑھ سال بعد تک وہ عراق کی اقتصادی ناکہ بندی اپنے غلام اِدارہ اقوام متحدہ کے ذریعے صرف اس لیے برقرار رکھے ہوئے ہیں اور پوری دنیا کے ذریعے اہلِ عراق پر دانا پانی بند کیے ہوئے ہیں کہ عراق امریکی جلال و جبروت کے آگے جھک جائے۔ مگر ان شاءاللہ شیطان بُش کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا۔ یہ حسرت اپنے سینے میں لیے بُش بہت جلد گمنام موت مر جائے گا مگر صدام حسین اور عراق کے مردانِ غازی کا قہقہہ پوری دنیا میں گونجے گا اور بُش کے اعصاب پر سوار ہو کر زندگی بھر اس کا تعاقب کرے گا۔

آج امریکہ، برطانیہ، فرانس عراقی باغیوں کی ہمدردی کے دردِ زہ میں مبتلا ہو کر عراق کو کئی زون میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک آزاد ملک عراق جو اقوام متحدہ کا رُکن اور ناوابستہ تحریک کا ممبر بھی ہے، اس کے باغیوں کی اس انداز میں حوصلہ افزائی پر تیسری دنیا جو خاموش ہے اس خاموشی کی قیمت دینی پڑے گی۔ عراق کسی طرح سے جھیل ہی لے گا کہ وہ بہت سخت جان واقع ہوا ہے۔ جب اس نے دنیا کے ۲۸ ملکوں کو جھیل لیا تو وہ اسے بھی جھیل لے گا۔ مگر خاموش تماشائی اپنی خیر منائیں۔ سعودی حکمراں اپنے یہاں باغیوں کا الگ زون، ایران میں مجاہدین خلق کے لیے الگ زون، پاکستان سندھ کے لیے الگ زون، ہندوستان کشمیر، پنجاب اور آسام کے لیے الگ زون، اپنے اپنے ملک میں باغیوں کے تحفظ کے لیے بنانے کو تیار رہیں۔ عراق میں یہ تجربہ اگر کامیاب ہوا تو ان ممالک میں بھی دیر سویر یہی ہوگا۔

امریکہ آئے دن اقوام متحدہ کی قراردادوں کو عراق میں سختی کے ساتھ نافذ کرنے کے لیے طاقت کے استعمال کی دھمکیاں دیتا ہے اور اس خطے میں اسرائیل کو اقوام متحدہ کی درجنوں قراردادوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دینے پر خاموش ہے۔ اقوام متحدہ پر یونہی انسانی اِدارہ ہونے کی تہمت لگی ہوئی ہے۔ اس کا دوہرا کردار پوری انسانی برادری کو دعوتِ فکر دے رہا ہے کہ اس ادارے کا نام اب اقوامِ یورپ رکھ دیا جائے۔ اقوام متحدہ کی مردانگی کا حال تو ایک طرف یہ ایک عظیم مسلم قوت عراق کو فنا کے گھاٹ اُتارنے کے لیے اسے ایک معمولی بہانہ چاہیے تھے لیکن ۲۵ لاکھ مسلمانوں کی نسل کشی اور انھیں اپنے وطن سے جبراً بے دخلی پر صرف وہاں تک ریلیف پہنچانے ہی تک دل چسپی رکھتا ہے۔ بوسنیا کے مسلمانوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے یورپ میں ایک مسلم ریاست کے قیام کی بات کی۔ ان کا یہ جرم اتنا بڑا نہیں کہ یورپی برادری مل کر انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔ بوسنیا کے مسلمانوں پر ظالم سربیائی فوجوں کی درندگی کو آج جدید ترین ذرائع ابلاغ نے نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے۔ پھر اقوام متحدہ یہاں نامرد کیوں ہو گیا؟ پوری دنیا میں انصاف کے ٹھیکے دار امریکہ کو سانپ سونگھ گیا۔

برطانیہ، فرانس سب اندھے کیوں ہوگئے اور سب سے حیرت مسلم حکمرانوں بالخصوص عرب حکومتوں کے رویے پر پر ہے۔ کیا ہو گیا شام کو، مصر کو، ترکی کو؟ کہاں مر گئے پاکستان، بنگلہ دیش، سبھوں کا خون سفید کیوں ہو گیا؟ بوسنیائی مسلمانوں کے درد کو اپنا درد کیوں نہیں سمجھا گیا؟ کویت پر عراقی قبضے سے بے چین ہو جانے والی حکومتیں اور کویت کو آزاد کرانے کی اپنی اپنی فوجیں بھیجنے والی طاقتیں اب بوسنیا کے مظلوموں کے بارے میں کیوں خاموش ہیں؟ درجنوں ممالک پر مشتمل عالمِ اسلام اپنے ان مظلوم بھائیوں کے لیے کب اُٹھے گا؟ کیا اسپین کی طرح جب آخری مسلمان تک کو بھی بے دخل کر دیا جائے گا، تب مرثیہ پڑھنے کے لیے ان کا جمود ٹوٹے گا۔ تیسری دنیا بھی مجرمانہ طور پر خاموش ہے۔

انسانی قدروں کا علم بردار ہمارا عظیم جمہوری ملک ہندوستان بھی خاموش ہے۔ حالانکہ یہ تو دنیا کے ہر مظلوم کا ساتھی تھا۔ کیا موجودہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے اپنے پیش روؤں کی پالیسی بدل کر ظالموں کے اس اندازِ ستم پر خاموش رہ کر رضا مندی کی مہر لگا دی ہے؟ اگر ہندوستان عالمی مسائل سے یوں نظریں چراتا رہا اور امریکہ کی خوش نودی میں اپنی دیرینہ روایتوں انحراف کرتا رہا تو تیسری دنیا کے لیے اس کا بھاری بھر کم وجود بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

مشرقِ وسطٰی اور ایشیائی ممالک کو معلوم ہونا چاہیے کہ اگر مغربی عفریت کا اجتماعی مقابلہ نہ کیا گیا تو مغربی سامراج کے دیو استبداد کے پنجے میں آہستہ آہستہ پہلے کی طرح سارے ممالک آجائیں گے۔

اس وقت تاریخ کے مردِ آہن صدام حسین اور ان کے عظیم ملک عراق کے عظمت مآب عوام مغربی سامراج کی ننگی جارحیت کے سامنے سینہ سپر ہو کر ہر طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں۔ اگر مغربی عفریتوں کے مقابلے میں وہ تنہا ہی رہ گئے تو پھر یکے بعد دیگرے تیسری دنیا کی خیریت مغربی سامراج کی مرضی پر منحصر ہوگی اور وہ جب اور جہاں چاہیں گے بوسنیا کی تاریخ دہرا دیں گے۔ کیوں کہ یہ سرخ و سفید سامراج اندر سے سخت کالا اور بڑا ہی بدبودار ہے۔

اختتام پر ایک حیرت کا جھٹکا اور برداشت کرتے چلیں۔ وہ یہ کہ امریکہ عراق جنگ میں کھربوں ڈالر کا جنگی خرچ برداشت کرنے والا سعودی عرب روس کی اقتصادی حالت کو درست کرنے کے لیے زکوٰۃ کے فنڈ سے چار کروڑ ڈالر کی امداد کرنے والے فہد بن عبد العزیز سعودی کنگ حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے بوسنیا کے مسلمانوں کو (جو قتل ہونے سے کسی طرح بچ گئے ہیں اور بھوک پیاس سے ہڈیوں کا پنجر ہو گئے ہیں اور بی بی سی لندن کی اطلاع کے مطابق بھوک مری میں کپڑے تک کھانے لگے ہیں) ان مظلوموں کو شاہ فہد نے ایک لاکھ ڈالر دینے کا اعلان کیا ہے۔۔۔ اب پتہ نہیں کہ ان کی یہ عظیم ریلیف بوسنیائی مسلمانوں کو پہنچتی ہے یا سربیائی ظالموں کو۔۔۔ جبکہ سعودیہ و دیگر عرب ریاستوں کے صدقات و عطیات و زکوٰۃ پر انحصار کرنے والا ملک پاکستان اب تک ارملین ڈالر عطیہ اور بیس ملین ڈالر قرض کی پیش کش کر کے بلغراد سے سفارتی تعلقات بھی توڑ چکا ہے اور اپنے یہاں سے بلغرادی سفیر کو نکال بھی چکا ہے۔ نام نہاد خادم الحرمین سے تو یہ بھی نہیں ہوسکا ؎

اے نامراد! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہوسکا!

☑☑☑☑☑☑

ہمیں کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

خوشامدوں میں نہیں عظمت وفا یارو
اگر ضمیر ہے زندہ تو آؤ سچ بولیں

سعودی (نجدی) حکومت نے سعد الحصین نامی ایک بدترین خلائق کے ذریعے سعودی مملکت کے ایک مشہور اخبار "الدعوۃ" بابت ۹ رشعبان ۱۳۹۷ھ ہجری مطابق ۲۵ رجولائی ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں گنبد خضرا شریف کے ڈھانے سے متعلق ایک تجویز رکھی، یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا عالمِ اسلام سورہا ہے یا بیدار؟ ارضِ حجاز پر سعودی حکمرانوں کا جب سے غاصبانہ قبضہ ہوا ہے، ان کے اہم ترین منصوبوں میں سب سے اہم منصوبہ روضۂ رسول کا ڈھانا ہے۔ روزِ اوّل ہی سے سعودی حکومت اسی فکر میں ہے مگر اب تک اسے کوئی مناسب وقت نہ مل سکا۔ تیل کی دولت سے مالامال ہوکر دُنیا کے مختلف ملکوں میں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے امدادی سینٹر قائم کیے، کروڑ ہا کروڑ ریال تبلیغی چلت پھرت اور خیرات کی شکل میں اپنے مسلک کے اداروں کو دے کر ہر ملک میں اپنا ہمنوا بنانے کی مہم شروع کی۔ عالمی سطح پر بھی یہ سیال سونا بہت اہم ثابت ہوا اور عالمی سیاست میں ایک بے حد موثر رول ادا کیا۔ سعودی حکومت کی انھیں کامرانیوں نے اسے یہ حوصلہ بخشا کہ اب وہ کام کر گذرنا چاہیے جس کے لیے کروڑوں ریال پانی کی طرح بہایا گیا ہے، پھر بھی اسے ایک خوف تھا اور یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ دولت سے خریدا ہوا ضمیر کہاں تک ہمارے لیے کارآمد ہوسکتا ہے۔ اسی لیے پہلے اس نے اپنی ناپاک تجویز کے ذریعے گنبد خضرا سے عالمِ اسلام کے جذباتی وابستگی کی شدت جانچنا چاہا کہ راست اقدام کردینے سے کہیں ایسا نہ ہو کہ عالمِ اسلام پوری طاقت کے ساتھ میرے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔

خدا کا شکر و احسان ہے کہ مسلمانانِ عالم نے پوری بیداری کا ثبوت دیا۔ اس تجویز کے خلاف ایشیا سے یورپ تک ایک طوفان اُٹھ گیا۔ پھر تو سعودی حکومت کے خلاف نفرت و بیزاری اور غیظ و غضب کے اظہار کا نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہوگیا، جس نے سعودی "پاگل کتوں" کو بہت جلد یہ احساس دلایا کہ روضۂ رسول کے ساتھ کسی طرح کی بے حرمتی بے حد خطرناک اور ہلاکت خیز ہے۔

اس خصوص میں برصغیر کے ممتاز روحانی پیشوا مجاہدِ ملّت حضرت علامہ الحاج الشاہ "محمد حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ" (رئیس اڑیسہ) صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت الہ آباد و بانی "کل ہند خاکسارانِ حق" نمایاں طور پر پیش پیش رہے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مختلف شہروں میں احتجاجی جلسے، جلوس، تار، ٹیلیفون، رجسٹری وغیرہ کے ذریعے اس ناپاک تجویز کے خلاف غم و غصّہ، غیظ و غضب اور نفرت و بیزاری کا اظہار کرایا۔ خصوصاً "آل انڈیا تبلیغ سیرت" کی صوبائی باڈی نے آپ کے حکم پر عروس البلاد ممبئ عظمیٰ میں حضرت علامہ الحاج الشاہ سیّد محمد حامد اشرف اشرفی جیلانی صدر دار العلوم محمدیہ کے زیر

قیادت ایک عظیم الشان تاریخی جلوس نکالا۔ جس کی گونج نہ صرف پورے ملک بلکہ دُنیا کے متعدد مما لک میں سنائی دی۔

ممبئی کی تاریخ میں سانحۂ مسجد اقصیٰ کے احتجاجی جلوس کے بعد اس کی نظیر نہیں ملتی۔ سعودی خیرات پر پلنے والے ہندوستانی وہابیوں نے اس احتجاجی جلوس کو ناکام بنانے کے لیے بڑی جدوجہد کی اور بڑی بے دردی کے ساتھ سعودی ریال کو پانی کی طرح بہایا۔ جلوس کا تو وہ کچھ بگاڑ نہ سکے البتہ اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ سادہ لوح مسلمانوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان کے بقلمِ خود ایمان و اسلام کا جائزہ لیا۔

سُنّی جمعیۃ العلماء کی صوبائی باڈی نے بھی اپنی بعض مصلحتوں کے پیشِ نظر اپنے مقدور بھر عملاً اس تاریخی جلوس کا بائیکاٹ کیا۔ اپنوں اور غیروں کی مخالفت سے تبلیغ سیرت کی مقامی باڈی شکستہ خاطر ہوئی۔ ایسے عالم میں ایک مردِ درویش[1] آگے بڑھا اور اپنی مادی و روحانی توانائیوں سے تبلیغ سیرت کی مقامی باڈی کے حوصلوں کو دوچند کر کے جلوس کو انتہائی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کیا۔

سعودی انٹلی جنس بیورو کے دفتر میں یہ بات خاص طور پر نوٹ کی گئی کہ ہندوستان میں جہاں جہاں احتجاجی جلسے جلوس اور سعودی حکومت کے خلاف ہنگامہ داروگیر برپا ہوا، اکثر و بیشتر مقامات پر اس کے سرخیل مجاہد ملّت مولانا محمد حبیب الرحمٰن صاحب ہی ہیں۔ مجاہد ملّت مملکت سعودیہ کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ چار بار حج و زیارت کی دولت سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ نجدیوں کی بدعقیدگی کی بنا پر ہر بار اپنی الگ نماز و جماعت قائم کی۔ کبھی نجدی امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھی۔ اس صورتِ حال پر وہابی ملاؤں اور قاضیوں نے جب بھی آپ کا گھیراؤ کیا، علمی جبروت اور آپ کے استقامت وعزیمت کے سامنے عاجز و درماندہ اور دم بخود ہو کر رہ گئے۔ مگر اپنی خفت مٹانے کے لیے کوئی نہ کوئی معمولی سزا دے دیتے۔ کبھی جماعت کرنے سے روک دیا، کبھی حرم شریف میں فرض نماز پڑھنے سے روک دیا اور کبھی صرف دو رکعت نفل ہی پڑھنے کی اجازت دی۔

مگر گنبد خضرا کے انہدام کے مسئلے پر سعودی عرب کے خلاف آپ کے غیظ و غضب کا آتش فشاں پھٹ پڑا نتیجۃً ہندوستان میں سعودی عرب کے خلاف احتجاج و مظاہرے کا طویل سلسلہ شروع کر دیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی غیرت جھنجھوڑ کر ان کے ایمان کو توانائیوں کی نئی حرارت سے آشنا کیا۔ نجد کے ہندی ایجنٹوں نے پل پل کی خبریں پہنچائیں۔

چنانچہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں پانچویں بار[2] جب حج و زیارت کی نیت سے حجازِ مقدس کے خطۂ پاک دار الامن میں داخل ہوئے تو سعودی خیرات پر پلنے والے ایک ہندی وہابی کی مخبری پر آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔

---

[1] عارفِ حق حضرت ٹوپی والے بابا کی ذاتِ گرامی مراد ہے۔ راقم الحروف سے متعدد بار بچشمِ نم فرمایا، مولوی صاحب میں سمجھتا تھا کہ سُنّی وہابی کا مسئلہ یہ مولویوں کے آپسی جھگڑے ہیں، لیکن آج مجھے معلوم ہو گیا کہ وہابی واقعی اللہ تعالیٰ کے پیارے کے دشمن ہیں۔

[2] یوں تو حضرت مجاہد ملّت صاحب قبلہ اب تک کل چھ حج فرما چکے ہیں۔ پہلا حج شریف مکہ کے عہد میں کیا تھا اور اس وقت امام حرم کے پیچھے نماز ادا فرمائی تھی کیونکہ اس وقت امام سُنّی صحیح العقیدہ تھے۔ چار حج جبری اخراج سے پہلے نجدیوں کے دور میں کیے اور جبری اخراج کے بعد چھٹا حج ۱۴۰۰ء میں کیا۔ چھٹے حج کے لیے یکم ذی الحجہ ۱۴۰۰ء کو نیازمندوں کے کثیر تعداد نے ممبئی سنتا کروز ایئرپورٹ پر آپ کو رخصت کیا۔ محمد وارث جمال قادری

نجدی درندوں نے حرم اور دار الامن تک کا لحاظ نہ کیا، اس ضعیف و ناتواں اور عمر رسیدہ مجاہد سے بھر پور انتقام لیا۔ سعودی حکومت کا فرماں روا خالد آپ کی آمد کی خبر سے پاگل ہو گیا۔ چنانچہ وقت کے سب سے بڑے فرعون، نمرود اور یزید شاہ خالد کے حکم کے مطابق حضرت مجاہد ملّت پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے اور حج سے دو روز قبل براہِ جدہ و کراچی جبراً آپ کو ہندوستان بھیج دیا گیا۔

۸/ ذی الحجہ ۱۳۹۹ھ مطابق ۲۹/ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو آپ ممبئی واپس آ گئے۔ اسلام کی تاریخ میں اس نوعیت کے ظلم کی مثال نادر و نایاب حد تک کمیاب ہے قاتلھم اللہ یوتی یؤفکون۔ جوں ہی یہ خبر عالمی پریس کو ریلیز ہوئی، دنیا ایک بار پھر چیخ اٹھی اور سعودی عرب پر لعنت و ملامت، نفرت و حقارت کی ہر طرف سے بوچھار پڑنے لگی۔ علاقائی، ملکی اور عالمی سطح کے اخبارات نے اس افسوسناک سانحے کی بھر پور مذمت کی اور حضرت مجاہد ملّت سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد خانۂ کعبہ کا وہ حادثۂ فاجعہ پیش آیا جس نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو دم بخود کر دیا۔ مشرقی و مغربی نیوز ایجنسیاں بیک وقت چیخ پڑیں مگر نجدی درندوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ بڑے اطمینان کے ساتھ حرمِ محترم کو اپنا شکار گاہ سمجھ کر انسانی جانوں کا شکار کھیلتے رہے۔ دُنیا نے دیکھ لیا کہ نجد کے بادشاہ اور نجدیوں کو اسلام سے ذرہ برابر ہمدردی نہیں۔ وہ بھیڑیے اسلام کے ازلی دشمن ہیں اور وہ اسلام کی آڑ میں صرف اپنے عشرت کدے برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ اسلام اور قرآن سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہ پہلے کبھی تھا اور نہ ہی آج!

ان کے ناقص نظامِ جاسوسی کا حال بھی دُنیا پر کھل گیا کہ وہ ظالم اپنی تمام تر توانائیاں عشرت کدوں کی تعمیر اور اپنے خانہ ساز مذہب کے فروغ ہی میں صرف کرتے ہیں، ورنہ کیا وجہ ہے کہ لاکھوں انسانوں کے ہجوم میں ایک نحیف و نزار، ضعیف و ناتواں انسان تو نظر آ گیا مگر ڈیڑھ ہزار کی تعداد میں اسلحہ بردار خون آشام بلوائی کعبۃ اللہ کی حرمتوں کو اپنے بوٹوں سے روندتے ہوئے چلے گئے اور سعودی محکمۂ خفیہ کی آنکھ بہ گئی۔

اس راز کو فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

☑☑☑☑☑☑

آئینۂ رضویات

امام احمد رضا ایک جہانِ حیرت

بریلی کے جواب نے علمائے رامپور کو ایک نئی صورتِ حال سے دو چار کر دیا، سرآمدِ روزگار علما میں فکر و تشویش کی ایک لہر تازہ دوڑ گئی۔

ریاست رامپور کے والی نواب کلب علی خان کے اِستفتا کا یادگارِ سلف حضرت مولانا ارشاد حسین مجددی نے جواب لکھا، جس کی تصدیق رامپور کے مشاہیر علما نے فرمائی۔

بریلی میں خاتم المحققین حضرت مولانا نقی علی خان کے علم و فضل کا شہرہ بلند تھا۔ اس فتویٰ پر آپ کے دستخط کے حصول کے لیے وہ بریلی بھیجا گیا۔ خلافِ اُمید بریلی کے تحقیقی جواب نے ان حضرات کے علم و تحقیق کی بساط ہی اُلٹ دی۔

دستی جواب لانے والے کو بلایا گیا۔ یہ جواب جو تم بریلی سے لائے ہو، یہ خود مولانا نقی خان صاحب کا لکھا ہوا تو نہیں ہے، کسی گمنام آدمی نے لکھا ہے۔ البتہ ان کی تصدیق ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ آیا مولانا نے اس جواب کو یوں ہی سرسری نگاہ ڈال کر دستخط کیا تھا یا بہت غور سے پڑھا تھا، پھر دستخط کیا؟

حضور والا انھوں نے اس فتوے کو دیکھا، پھر جا کر دستخط کی اور مہر لگائی۔

صورتِ حال کی تفصیل بیان کرو؟

جب میں رام پور سے یہ لفافہ لے کر مولانا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور انھیں پیش کیا تو آپ نے ایک نظر دیکھ کر فرمایا کہ بازو کے کمرے میں ایک مولوی صاحب بیٹھے ہیں، انھیں کو لے جا کر دے دو۔ جو کچھ لکھنا ہوگا لکھ دیں گے۔ آپ کی نشاندہی پر جب میں اُس کمرے میں پہنچا تو وہاں کسی مولوی صاحب کو نہ پا کر پھر واپس مولانا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی: حضورِ عالی! اُس کمرے میں تو کوئی مولوی صاحب نہیں ہیں، البتہ ایک صاحبزادے تشریف فرما ہیں۔ آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ہاں! ہاں! بھائی وہی صاحبزادے مولوی صاحب ہیں، آج کل اس طرح کا کام وہی کرتے ہیں۔

چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق میں جا کر یہ لفافہ انھیں پیش کیا۔ انھوں نے اسے کھول کر ایک نظر دیکھا، پھر کہنے لگے اگر آپ کو فوری جواب کی ضرورت ہے تو کچھ دیر ٹھہرنا پڑے گا۔ آپ باہر چل کر اطمینان سے بیٹھے، میں آپ کو بلالوں گا۔

کافی دیر بعد وہ کمرے سے نکلے اور جو کچھ انھوں نے لکھا تھا اسے مولانا نقی علی خان کو پیش کیا۔ آپ نے کافی غور و خوض سے اسے ملاحظہ فرمایا۔ اس کے بعد دستخط کر کے مہر لگائی۔ لفافے میں بند کر کے مجھے دیا۔ میں نے ویسے ہی آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر دیا۔ تو گویا کہ ایک طرح سے یہ انھیں کا فتویٰ ہے۔

جواب لکھنے والے نے یادگارِ سلف حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب قبلہ کی کوہِ پیکر شخصیت سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اس بات کا بھی احساس نہیں کیا کہ ان کی حمایت و تصدیق میں سرآمد علما کی بڑی تعداد میں دستخطیں و مہریں ثبت ہیں۔

ارے بھائی! کسی مسئلے میں علما کا اختلاف یہ کوئی نئی بات تو نہیں۔ تحقیقاتِ علمیہ کا دروازہ نہ کل بند تھا اور نہ آج ہی بند ہے۔ اس میں بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے بعینہٖ یہ فتویٰ نواب تک پہنچنا چاہیے۔ آخر وہ بھی صاحبِ علم و فضل ہیں۔ خانوادۂ خیر آبادی سے نسبت تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ دونوں فتوؤں میں جو واضح فرق ہے اسے وہ بھی تو محسوس کرے گا۔ ان میں کے ایک سنجیدہ عالم نے مشورہ دیا۔ چنانچہ کافی تأمل اور غور و فکر کے بعد استفتا اور دونوں جوابوں کو نواب کے حضور پیش کر دیا گیا۔

نواب صاحب نے بڑے غور سے پہلے مجددی صاحب کے جواب کو ملاحظہ فرمایا، ساتھ ہی معاصر علمائے رام پور کے تصدیقات پر بھی نظر ڈالی اور ایک آسودہ سانس لی۔

مگر جب اُس نے بریلی کا جواب پڑھنا شروع کیا تو اس کی پیشانی پر بَل پڑنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں پڑھتا گیا حیرت و استعجاب بڑھتا گیا اور جب پورا جواب پڑھ چکا تو حیرت نے اضطراب کی شکل اختیار کر لی، فوراً خادمِ خاص کو آواز دی۔ مولانا ارشاد حسین صاحب کو سلام پیش کرو اور تشریف آوری کے لیے عرض کرو۔

طبیبِ عشق سے پوچھا زلیخا نے علاج اپنا
کہا واجب ہے تجھ کو صورتِ یوسف کا دَم بھرنا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ نواب صاحب! بندے کو آپ نے یاد فرمایا ہے؟

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! خوش آمدید مرحبا اھلاً وسہلاً۔ زہے نصیب، تشریف آوری کی زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

کوئی بات نہیں، یہ تو آپ کی محبت ہے۔ ویسے بندے کو یاد فرمائی کی زحمت کیوں فرمائی گئی ہے؟

بات کچھ عجیب سی ہو گئی ہے، کہتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی ہے۔

بے تکلف ارشاد فرمائیں، ہم جیسے درویشوں کے لیے اتنا تکلف کیوں؟

بات کچھ یوں ہے کہ چند دن پہلے میری طرف سے آنجناب کے خدمت میں ایک استفتا ارسال کیا گیا تھا، جس کا آپ نے جواب بھی مرحمت فرمایا، ساتھ ہی جلیل القدر علمائے رام پور کی تصدیقات سے وہ فتویٰ مزین بھی تھا۔ مزید تصدیق کے لیے میری خواہش کے مطابق اسے بریلی بھی بھیجا گیا۔ استفتا ان کی بلند پایہ شخصیت کی اہمیت کے پیشِ نظر ایسا کیا گیا کہ ان کی جلالتِ علمی ایک امرِ مسلم ہے۔

بے شک مولانا نقی علی خان ایک بے پناہ علمی شخصیت کے حامل، عالمِ باعمل اور ایک سچے عاشق رسول بزرگ ہیں۔ ہندوستان میں ابھی ان جیسے بزرگوں کا دَم بہت غنیمت ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اسلاف کی سچی یادگار ہیں۔

لیکن حضور والا! وہاں کے جواب نے تو ایک نئی صورتِ حال سے دو چار کر دیا ہے۔ خود ملاحظہ فرمالیں۔

یہ کہہ کر استفتا مع جوابات سامنے رکھ دیا۔ استفتا اور بریلی کے جواب کو حضرت مولانا نے بڑی گہری نظروں سے ملاحظہ فرمایا۔

پھر ایک آسودہ سانس لیتے ہوئے فرمایا: قبلہ نواب صاحب! وہی صحیح ہے جو بریلی سے لکھ کر آیا ہے۔

یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ بڑی حیرت ہو رہی ہے، کہیں کسرِ نفسی سے تو نہیں کام لے رہے ہیں آپ؟

یہ کسرِ نفسی نہیں، بلکہ فراخ دلی کے ساتھ اظہارِ حقیقت ہے۔ فتویٰ نویس مولوی احمد رضا خان کے نام سے کان آشنا تو نہیں، لیکن ان کی بلند پایہ تحقیقاتِ علمیہ سے انکار ممکن نہیں۔ اس پر مستزاد مولانا نقی علی خان سلمہٗ کی تصدیق نے اس تحقیق کو اعتبار کی اعلیٰ ترین سند عطا فرما دی ہے۔

لیکن حضور کی جلالتِ علمی کا آفتاب بھی تو اپنی جگہ مسلّم ہے، یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ جس کی بارگاہِ فضل و کمال سے لوگ اپنی تحقیقات کو اعتبار کی سند سے مزین کریں، جس کی علمی عظمتوں شکوہوں کے سامنے جانے کتنی گردنیں خم ہوں، کیا یہ بات عجب نہیں کہ اس کی علمی تحقیق ایک گمنام مولوی کی تحقیق سے فروتر ہو۔

قبلہ نواب صاحب! آپ تو ذی علم آدمی ہیں۔ مستزاد برآں خیر آبادی خانوادے سے نسبت تلمذ کا شرف بھی آپ کو حاصل ہے۔ کیا "الانسان مرکب من الخطاء والنسیان" ایک ٹھوس حقیقت نہیں؟ میں بھی ایک انسان ہوں، خطا چوک مجھ سے بھی ہو سکتی ہے۔ چلیے آپ سے چوک ہوگئی۔۔۔۔ مگر آپ کے جواب پر تصدیق کے لیے جو یہ نامی گرامی علمائے کرام کے ناموں کی ایک طویل فہرست مع مواہیر ثبت ہیں، کیا ان سب سے اجتماعی غلطیاں سرزد ہوئیں؟

ان حضرات نے دستخط کرتے وقت اپنی تحقیقات و معلومات سے زیادہ اعتماد میری ذات پر کیا کہ مجددی نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ صحیح ہی ہوگا۔ ان سے اجتماعی خطا میری علمی قدر و شہرت پر اعتبار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ جبکہ مولوی احمد رضا سلمہٗ نے میری شہرت سے زیادہ اپنی ذات پر اعتماد کیا۔ جو کسی بھی ذمے دار شخصیت کے لیے ناگزیر ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مولانا احمد رضا خان نے اعتبار کے اس پرانے پیمانے کو توڑ کر تحقیق کی لاج رکھ لی۔ اور اس جرأتِ اظہار پر مولانا نقی علی خان جیسی بزرگ شخصیت نے حوصلہ افزائی کی مہر لگا دی اور یہی ہونا چاہیے ؎

تمھیں نے جرأتِ اظہارِ شوق دی ورنہ
مجال کیا تھی ہماری کہ آرزو کرتے

حضور والا! اس حقیقت پسندانہ جرأتِ اظہار پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ اپنی کسی چوک کو اور وہ بھی اپنے چھوٹوں کے مقابلے میں بطیّب خاطر قبول کر لینا، یہ آپ کی بڑائی ہے۔ آپ کی قدر اور احترام میرے دل میں اور بڑھ گیا۔ مولیٰ عزوجل آپ کے سایۂ عاطفت کو تادیر ہم پر سلامت رکھے۔

آپ کے اس فراخ دلانہ انتہائی جرأت مندانہ اظہارِ حقیقت اور ایک گمنام آدمی کی بلند پایہ تحقیقات کو ایسے انداز میں سندِ اعتبار نے میری آتشِ شوق کو ہوا دے دی ہے کہ ایسی علمی شخصیتوں سے تعارف اور ان کی نیاز حاصل کی جائے۔

وحشتیں بڑھتی گئیں میرا جنوں تازہ ہوا
اب کسی کی یاد کی شدت کا اندازہ ہوا

بے حد قریبی رشتے دار کے ذریعے جب نواب رام پور کا دعوت نامہ مولانا احمد رضا خان کو ملا تو آپ والد محترم کی

اجازت سے رام پور تشریف لائے۔

نواب نے والہانہ پذیرائی کی۔ کمسنی اور چہرۂ زیبا پر آغاز سبزہ دیکھ کر تحیر خیز مسرت کے ساتھ مرحبا کہا۔ اور بڑی محبت کے ساتھ اپنی پلنگڑی پر بٹھالیا۔ لوازماتِ میزبانی کے بعد نواب صاحب نے کہنا شروع کیا۔ ماشاءاللہ! سبحان اللہ! اس کمسنی کے عالم میں فقہ میں دِرک اور دینیات میں جو کمال آپ نے حاصل کرلیا، اس پر وقت کی بیکراں علمی شخصیتوں نے آپ کی تحقیقاتِ علمیہ کو اعتبار کی سند بھی مرحمت فرمادی ہے۔ یہ بہت بڑی بات اور تاریخی نوادرات سے ہے۔

میری خواہش ہے کہ جہاں آپ نے دینیات میں اس درجہ کمال حاصل کرلیا ہے، وہیں معقولات میں بھی ایک انفرادیت قائم کرلیں۔ آپ کی خوش بختی سے مجاہد حریت امام المعقولات حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے فضل وکمال کے امین ان کی علمی جلالت کے شاہکار اعظم خیر آبادی خانوادے کی شمع فروزاں اور معقولات کے امام برحق حضرت مولانا عبدالحق خیر آبادی کی شمع حیات روشن ہے۔ آپ ان سے منطق وفلسفہ کی بلند پایہ کتابیں پڑھ لیں تاکہ دینیات کی طرح معقولات میں بھی آپ کی علمی جلالت کو عظمت واعتبار کی سند مل جائے۔

ان کی ذات والاصفات سے نسبتِ تلمذ ہی ایک بڑا اعزاز ہے۔ ابھی یہ ذکرِ جمیل چل ہی رہا تھا کہ حسنِ اتفاق سے اس مجلسِ خاص میں حضرت مولانا عبدالحق (۱) صاحب تشریف لے آئے۔

---

۱) محقق جلیل، علامۂ دہر، محقق عصر، امام الحکمۃ، شمس العلماء، تاج الحکماء حضرت مولانا عبدالحق خیر آبادی بن مجاہد حیرت امام المعقولات حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی دہلی میں ۱۲۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی دلی میں سررشتہ دار ریزیڈنٹ عوام رعایا میں ہر دل عزیز حکام و دربارِ شاہی میں معزز و با اقتدار تھے۔ فرزندانِ ارجمند کی ولادت پر تحائف وہدایا کے انبار لگا کر لاکھوں روپے نذرانے میں پیش ہوا۔ ہر چہار جانب اصحابِ فضل و کمال کے سطوت وجبروت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ ہر طرف علم وادب کے چرچے تھے۔

والد ماجد نے تربیت کے ساتھ ہی تعلیم وتدریس کا سلسلہ بھی شروع کردیا۔ ہاتھی و پالکی پر آتے جاتے وقت بھی درس دیتے اور پڑھاتے رہتے۔ سولہ سال کی عمر میں تمام درسیات منقول ومعقول سے فارغ التحصیل کردیا۔ خود مولانا کا آبائی وطن خیر آباد بھی علم وادب کا گہوارہ تھا، شاہی دور میں کمشنری رہ چکا ہے۔ ہندوستان کے مردم خیز قصبوں کے صف اوّل میں شمار رہا ہے۔ خیر آباد، دہلی کی علمی صحبتوں نے کم عمری میں مرتبۂ کمال کو پہنچادیا۔ علامہ فضل حق خیر آبادی جب حاشیہ قاضی مبارک لکھ رہے تھے کہ درمیان میں کسی ضرورت سے اُٹھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے مولانا عبدالحق (جو ابھی زیر تعلیم تھے) کہیں سے پہنچ گئے۔ علامہ نے جہاں پر قلم روکا تھا، وہیں سے آگے اسی بحث کو ایک صفحہ لکھ کر چلے گئے۔ اُس وقت آپ کی عمر صرف چودہ ۱۴ سال تھی۔ حضرت علامہ کے دریافت کرنے پر جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور اسے بعینہٖ باقی رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار وگیر میں دہلی ہی میں تھے، باپ کی گرفتاری پر لکھنؤ پہنچ کر پیروی کی۔ جزیرۂ انڈمان چلے جانے کے بعد کچھ عرصہ خیر آباد ہی رہے، پھر نواب ٹونک کی دعوت پر ٹونک چلے گئے۔ دو سال وہیں قیام فرمایا۔

فضل وکمال اور درس وتدریس کا شہرہ ملک وبیرونِ ملک تک پھیل چکا تھا۔ طالبانِ شوق ہر چہار جانب سے کشاں کشاں پہنچ رہے تھے۔ علمی جلالت کا غلغلہ سُن کر گورنمنٹ نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے لیے خدمات حاصل کرلیں۔ کلکتہ کی ہوا ناموافق ثابت ہوئی۔ نواب کلب علی کے بے حد اصرار پر رام پور تشریف لائے۔ نواب نے شاگردی اختیار کی اور تعظیم وتکریم کا حق ادا کردیا۔ اُنیس سال تک رام پور میں حاکم مرافعہ اور پرنسپل مدرسہ عالیہ رہے۔ گراں قدر مشاہرے کے علاوہ نواب آئے دن بڑی بڑی رقمیں نذرانے میں پیش کرتا رہا، مگر مولانا کے شاہانہ داد ودہش کے لیے یہ سب ناکافی ہوتے۔

شہنشاہ امیر تیمور نے جو قدر افزائی علامہ سعد الدین تفتازانی کی کی، وہی عزت وتوقیر نواب کلب علی خان نے مولانا کی فرمائی۔ (باقی حاشیہ آگے)

(حاشیہ جاری) حضرت شاہ بخش اللہ تونسوی سے شرف بیعت حاصل کی۔ آخر وقت میں والد ماجد کی طرح تصوف کی طرف پوری توجہ مبذول فرمائی۔ خیر آباد ہی میں ۲۳ رشوال ۱۳۱۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ احاطہ مخدوم شیخ سعد میں اپنے دادا مولانا فضل امام اور اُستاذ الاساتذہ ملا اعلم سندیلوی کے پاس مدفون ہوئے۔ مولانا کی رحلت سے ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ ملک و بیرونِ ملک کے اسلامی مدارس پر سوگوار سناٹا چھا گیا۔ خود خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی نے اپنے مدرسہ اظہریہ میں ایک ہفتہ تعطیل رکھی اور سوگ منایا۔ ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل و جرائد نے مقالات، قصیدے اور تعزیت نامے لکھے۔ عالم اسلام نے آپ کے وصال کو پورے طور پر محسوس کیا۔ ہر طبقے میں آپ کی رحلت پر ایک جاں گسل خموشی طاری ہوگئی۔ اُستاذ وقت امیر مینائی نے تاریخ وفات کہی ؎

شمس العلما ظلمت دہر — چوں تیر زابر تیرہ برجست

برلوح مزار امیر بنویس — آرام گہ امام وقت است

۱۳۱۶ھ

موصوف اکابر و اسلاف کی نادر یادگار تھے۔ ایک ذاتِ واحد میں کمالات غریبہ و اوصاف عجیبہ کا جمع ہو جانا مولانا کی ذات بابرکت کا خاصہ تھا۔ بقول لسان الملک ریاض خیر آبادی۔۔۔ زمانہ تو صورتِ ظاہری کا معاوضہ ہی نہیں ادا کر سکتا۔ وہ نورانی چہرہ، وہ خندہ روئی، زندہ دلی، وہ سراپا علم، وہ رعب کمال، وہ شانِ ادب، وہ فضل و جلال ؎ تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

وقات و تمکنت، جرأت اظہار، استغنا، نازک مزاجی، نوابانہ طمطراق، نفاست، نزاکت، دریا دلی، سیر چشمی، حق گوئی، صداقت شعاری یہ سب آپ کی خصوصیات سے ہیں۔۔۔ دور دراز سے تاجر آپ کی داد و دہش، قدردانی، منہ مانگی قیمت کا شہرہ سُن کر آپ کے پاس آتے۔ اگر کبھی کسی نے اپنی چیز کی قیمت وہی مانگی جس حساب سے عام لوگوں کو دیتا ہے اور اس کا اظہار بھی کر دیا۔ تو فوراً واپس کر دیتے۔ آپ کی زندگی کے بے شمار واقعات بھرے پڑے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر کسی دریا دل بااختیار حکمراں کے دربار کا نقشہ سامنے آجاتا تھا۔ خود ہی فرماتے ہیں تاجر ہمارا نام سُن کر آتے ہیں، منہ مانگے دام نہ پائیں تو کاہے کو کوئی آئے۔ لوگوں میں یہ چرچا تو ہے کہ نوابوں کے مانند ایک بوریہ نشین ملائے مکتبی بھی ایسا ہے جو امرا کی طرح دل رکھتا ہے ؎

جن کے دم سے تھی شہر کی رونق — کیا ہوئے وہ کدھر گئے چہرے

اب ایسے لوگ کہاں جو اپنی علمی وجاہت، عالمانہ طمطراق اور اپنی عزتِ نفس کے تحفظ کے لیے بڑی سے بڑی شخصیتوں کو خاطر میں نہ لائیں۔ آج علما اور ذی علم علما کی اکثریت نے بھی اپنے علمی پندار اور عالمانہ وجاہت و طمطراق کو اہل ثروت و دولت کے سامنے گروی رکھ دیا ہے۔ اس دور میں شیخ الاساتذہ رئیس المحققین حضرت علامہ بدرالدین احمد قادری کے برادر خورد مکرم محتشم ذوالمجد والفضل والجاہ والکرم شمس الحکماء سند المحققین حضرت علامہ محمد نعیم الدین صدیقی گورکھ پوری ہیں۔

(ان کی علمی جلالت، عالمانہ طمطراق، استغنا، جرأت اظہار، حق گوئی و صداقت شعاری، ان کا علمی فضل و کمال، ان کی نفاست، نزاکت، فطری نازک مزاجی، نوابانہ خوبو) بہت حد تک حضرت مولانا عبدالحق خیر آبادی کی جھلک ملتی ہے۔ آپ کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ ایک قتل کے سلسلے میں آپ کے ایک شاگرد مولانا ابوالبرکات احمد ٹونکی پر الزام لگا دیا گیا۔ وہ مولانا عبدالحق خیر آبادی کے پاس ہی تھے۔ شہر کوتوال وارنٹ گرفتاری لے کر مولانا کے پاس پہنچا۔ جب آپ کو صورتِ حال معلوم ہوئی، تو مولانا نے قہر و جلال کے عالم میں کوتوال کی خوب خبر لی اور ساتھ نواب صاحب کو بھی خوب خوب نوازا کہ اکیلا کیوں چلا آیا۔ اس کو بھی ساتھ لاتا تو مزہ آجاتا کہ ایک طالب علم پر جرأت کیسے کی۔ کوتوال طیش میں بھرا ہوا نواب کے پاس پہنچا اور سارے الفاظ دہرا دیا۔ نواب صاحب مولانا کے ناز بردار، قدرداں تھے۔ الٹے کوتوال پر برس پڑے کہ مولانا نے میری توہین نہیں کی بلکہ تو نے کی۔ تو ایسے شخص کے پاس گیا ہی کیوں، جو نواب کو بھی بُرا بھلا کہہ سکتا ہے۔ اس توہین کا صرف تو ذمے دار ہے کہ ؎

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی — اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

شوقِ عقیدت کا تقاضا ہے کہ بس کہتے جائیے اور خوف و طوالت دامن کھینچتا ہے کہ بس رُک جائیے ورنہ ان کی زندگی پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ؎

ایک کنکر پھینک کر دیکھو ذرا تالاب میں — کس قدر موجیں اٹھیں گی سینۂ بیتاب میں

مولانا صاحبِ تصانیف بزرگ تھے۔ آپ کی کتابیں داخل نصاب بھی ہیں۔ حاشیہ قاضی مبارک، حاشیہ غلام یحیٰ، حاشیہ حمد اللہ، حاشیہ میر زاہد، امور عامہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ، شرح مسلم الثبوت، شرح کافیہ، شرح سلاسل الکلام، جواہر غالیہ، رسالہ تحقیق تلازم، زبدۃ الحکمۃ وغیرہ وغیرہ مولانا کے تحریر کا یہ حال ہے کہ شرح کو متن سے اس طرح ملاتے ہیں کہ ذرا بھی تسلسل بیان میں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود شارح ہی ماتن ہے اور یہ کہ متن و شرح نہیں بلکہ مسلسل کتاب ہے۔

رچ بس گیا ہے ذہن میں ناصر کسی کا روپ — اب کیا کریں گے پھر کوئی شہکار دیکھ کر

وہ عجیب پھول سے لفظ تھے ترے ہونٹ جن سے مہک اُٹھے
میرے دشت باغ میں دور تک کوئی باغ جیسے لگا گئے

زہے نصیب! مرحبا ابلاً وسہلاً! بڑے موقع سے قدم رنجہ فرمایا آپ نے۔ یہ مولوی احمد رضا سلمہٗ ہیں۔ مشہور بزرگ مولانا رضا علی خان کے پوتے، مولانا نقی علی خان بریلوی کے بلند اقبال صاحبزادے جنھوں نے اس کمسنی ہی میں دینیات میں بڑا کمال حاصل کرلیا ہے۔ اپنے وقت کے بزرگ ترین علما اور یگانۂ روزگار شخصیتوں نے ان کی علمی جلالت کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور ان کی بلند پایہ تحقیقات کو اعتبار کی سند سے نوازا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ انھیں معقولات کی اہم اور بڑی بڑی کتابیں پڑھا دیں تا کہ منقولات کے ساتھ ساتھ معقولات میں بھی زبردست ملکہ حاصل ہوجائے اور اس میدان میں بھی ان کی انفرادیت کا سکّہ دلوں پر بیٹھ جائے کہ ؎

وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

مولانا عبدالحق خیر آبادی جن کی شکوہ علمی اور تبحر کا غلغلہ برصغیر ہند سے نکل کر دور دراز ممالک تک پھیل چکا تھا اور جس کا انھیں احساس بھی تھا۔ اسی احساسِ برترک کا نتیجہ تھا کہ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ دنیا میں با کمال حکما کی تعداد صرف ڈھائی ہے، ایک والد مرحوم (یعنی علامہ فضل حق خیر آبادی)، دوسرے بحر العلوم فرنگی محلی مولانا عبد العلی لکھنؤ اور نصف بندہ عبدالحق۔ جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) میں ایّامِ اسیری کے دوران کسی نے مجاہد حریت علامہ فضل حق خیر آبادی سے پوچھا:

حضور والا! اپنے پیچھے آپ نے ہندوستان میں عظیم یادگار کے طور پر کیا چھوڑ کے آئے ہیں؟ صرف دو چیزیں۔ حاشیہ مبارک اور عبدالحق۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا اپنے عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے۔ اور ان کے کمالاتِ علمی کے صحیح جانشین۔ بڑے بڑے رؤسا، اُمرا، نوابین، راجے مہاراجے آپ کی دل جوئی میں لگے رہتے تھے اور اُنھیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کبیدہ خاطر نہ ہوجائیں ؎

بڑا نازک تعلق ہے دلوں کا نہ ہوجائے کوئی خاطر کبیدہ

ایسی صاحبِ کرامت و عظمت ہستی جسے اپنی شخصی عظمتوں، رفعتوں، بلندیوں و علمی رُتبوں کا نہ صرف احساس بلکہ اس کا پندار بھی ہو۔ بھلا وہ ایک کمسن و نوخیز نوجوان (کہ کس کی مَسیں ابھی بھیگ ہی رہی ہوں اور چہرے کا سبزہ شباب کی ابتدائی دہلیز کی طرف اشارہ کررہا ہو) کو خاطر میں لاسکتا ہے۔

نواب کی دل دہی کے لیے ایک نگہ غلط انداز ڈالتے ہوئے بڑے سرسری طور پر انتہائی خشک لہجے میں دریافت فرمایا: میاں صاحبزادے! اب تک منطق میں تم نے کون سی کتاب پڑھی ہے؟

حضور والا: قاضی مبارک (حیرت و استعجاب کے ساتھ) کیوں صاحبزادے! کیا تم نے تہذیب پڑھ لی ہے؟

حضور والا! کیا آپ کے یہاں قاضی مبارک کے بعد تہذیب پڑھائی جاتی ہے؟

اس حاضر جوابی نے بلند پیشانی پر سلوٹوں کو نمایاں کردیا۔

صاحبزادے اس وقت آپ کا مشغلہ کیا ہے؟

درس دیتا ہوں، فتویٰ نویسی اور کتابیں لکھتا ہوں۔

کس موضوع پر لکھتے ہو؟

''دینی ضرورت کے پیش نظر جس بھی موضوع پر لکھنا پڑ جائے، ویسے فقہ میرے قلم کا جولان گاہ، اسلام کے اندر در آئے ہوئے فتنوں کا استیصال میرا مشغلہ، فتنۂ عظیم وہابیت کا رَدوقدح میرا خاص موضوع ہے۔''

اوہ! تو گویا تم بھی میرے خبطی بدایونی (۱) کی طرح ہو، وہ بھی رات دن ان وہابیوں کے پیچھے ڈنڈے لیے پڑا رہتا ہے۔

حضور والا! ردِ وہابیت اگر خبط ہے تو اس کا باقاعدہ آغاز حضور کے والد گرامی قدر حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی ہی نے فرمایا ہے اور اسمٰعیل دہلوی کے رَد میں ایک معرکۃ الآرا کتاب ''تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ'' تحریر فرمائی ہے، جس میں انبیاو مرسلین واولیائے کاملین کی بارگاہ کے گستاخ و بے ادب کو بڑے ہی دوٹوک انداز میں کافر و مرتد، بے دین لکھا ہے اور اسمٰعیل دہلوی کو قال المرید المرتد کے الفاظ سے یاد کیا ہے اور اس پر شرعی حکم نافذ کرتے ہوئے فرمایا: ''قائل ایں کلام لا طائل از روئے شرع مبین کافر و بے دین است۔ ہر گز مومن و مسلم نیست و حکم او شرعاً قتل و تکفیر است۔'' یعنی اس بے ہودہ کلام کا قائل (اسماعیل دہلوی) شریعت غرا کے نزدیک بے شک کافر و مرتد ہے، ہر گز مومن و مسلمان نہیں اور اس کے بارے میں شرعی حکم یہ ہے کہ اس کی گردن ماردی جائے اور اسے کافر قرار دیا جائے اور اس حکمِ شرعی کی تصدیق وتائید دہلی (جو اس وقت عالم میں انتخاب تھا) کے سترہ جلیل القدر علما و مشائخ و محدثین زمانہ نے فرمائیں۔

ارے میاں صاحبزادے! ہمارے مقابلے میں تمہاری حاضر جوابی کا حال یہی رہا تو تم پڑھ چکے اور ہم پڑھا چکے۔

حضور والا! اتنی جسارت بجا بھی اس لیے کرسکا ہوں کہ مجھے شاگردی کا رشتہ ہی نہیں قائم کرنا ہے کہ آپ کی درسگاہ کی حاضری میں بسا اوقات اپنے بزرگوں کے حق میں (جن کے لیے دل میں بے حد احترام ہے) ایسے جملے بھی سننا پڑیں گے جس کو عام حالات میں ہم سُن ہی نہیں سکتے ؎

تیرا کمال کہ پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں
غزال شوق! کہاں کا اسیر ایسا تھا

یہ اُس شخص کا آغاز شباب تھا جس کا وجودِ مسعود اصحابِ فضل و کمال کی تاریخ میں ایک جہانِ حیرت ثابت ہوا۔

کائناتِ ارضی کبھی اہلِ کمال سے خالی نہیں رہی۔ ارسطو، افلاطون، سقراط، فارابی، البیرونی، ابن سینا، ابن رُشد، نیوٹن، کیپلر، گلیلیو، غزالی، رومی، رازی، خیام وغیرہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ذکر سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں اور خود یہ لوگ انسانی تاریخ، تہذیب انسانی، انسانی تمدن، انسانی معاشرہ، سیاست مدن، فنونِ ارتقا اور تہذیب الاخلاق پر بایں طور

---

۱) اشارہ تاج الفحول محبّ الرسول حضرت مولانا فضل رسول بدایونی کی طرف ہے۔ یہ آپ کے رفیق درس امام المعقولات مجاہد حریت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے شاگرد تھے۔ (محمد وارث جمال قادری)

اثرانداز ہوئے کہ آج تک ان کے نقوش سے تاریخ کے صفحات فروزاں ہیں ؎

کچھ نقش تیری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سروساماں سہی ویران نہیں ہے

مگر چودھویں صدی ہجری کی ابتدا ہی میں برصغیر ہند سے تاریخ کی سطح پر ایک ایسا نام مطلع انوار بن کر اُبھرا جو علما، فقہا، عقلا، حکما، فلاسفہ اور متکلمین کی فہرست میں اپنا بلند نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کر کے گل سر سبد بنتا ہے۔

اس کی ذات ستودہ صفات سے علوم وحقائق کے اتنے سوتے پھوٹے جن سے فکر وآ گہی کے ہر شعبے سیراب ہوئے۔ منقولات ومعقولات میں ایسے حیرت ناک کارنامے انجام دیئے کہ جن کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ علما محققین، فقہا ومحدثین کے لیے وہ کعبۂ آرزو تو تھے ہی، دورِ جدید کے دانشوروں، فلاسفروں اور سائنس دانوں کے لیے ان کے پیکر علمی کا معقولاتی پہلو کم حیرت ناک نہیں۔ اپنی تصنیفات میں نظریۂ کشش ثقل، نظریۂ اضافیت، نظریۂ حرکت زمین پر جب فاضلانہ بحث کرتے ہوئے اپنا موقف ثابت کرتے ہیں تو وجدان پکار اُٹھتا ہے کہ

اِک دانش نورانی اِک دانش بُرہانی
ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

اور جب قدیم وجدید فلسفیوں کی طرف رُخ کرتے ہوئے فلسفیوں اور سائنس دانوں کی تحقیقات وتخلیقات کا ناقدانہ جائزہ لے کر ان کی علمی گرفت کرتے ہیں، مثلاً ابن سینا، شہرستانی، نظام معتزلہ، نجم الدین علی ابن محمد القزوینی، شمس الدین محمد بن مبارک، میرک، بخاری، امام غزالی عبدالرحمٰن بن احمد الایجی، سعدالدین بن مسعود تفتازانی، نصیرالدین بن جعفر بن محمد طوسی، عبداللہ بن عمر بیضاوی، ملّا محمد جون پوری، آئزک نیوٹن، البرٹ آئن اسٹائن، وغیرہ وغیرہ۔ تو ایک منصف مزاج صاحبِ بصیرت انسان پکار اُٹھتا ہے ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء بغير حساب۔

جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

ہندوستان کے مشہور شہر بریلی (روہیل کھنڈ) میں اللہ تعالیٰ نے اس رجلِ عظیم کو پیدا کیا کہ جس کے علمی کارنامے پر اربابِ علم ودانش کی تاریخ حیران ہے۔ آپ نسبتاً پٹھان (یوسف زئی)، مذہباً سُنّی، مسلکاً حنفی، مشرباً قادری تھے۔ شہر بریلی کے ایک خوش حال، متمول اور علمی گھرانے میں ۱۰ رشوال المکرّم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ رجون ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے ؎

احمد ہندی رضا ابن نقی ابن رضا

علوم عقلیہ ونقلیہ کے تحصیل کا یہ عالم کہ چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآنِ مجید ختم کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں درسِ نظامی کی مشہور کتاب ''ہدایۃ النحو'' کی شرح لکھی۔ دس سال کی عمر میں ''مسلم الثبوت'' پر حاشیہ لکھا۔ چودہ سال کی عمر میں اپنے والد گرامی حضرت مولانا نقی علی خان صاحب قبلہ سے جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ حاصل کر کے دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ اسی سال دارالافتاء کی ذمے داری سپرد کی گئی۔ ۲۲ رسال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ آفتابِ شریعت وطریقت حضرت

مولانا سید آلِ رسول مارہروی سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ اور اُسی وقت مرشدِ کامل نے اجازت وخلافت اور توجۂ خصوصی سے سرفراز فرمایا۔

۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں والد ماجد کے ہمراہ حج بیت اللہ و زیارتِ نبوی کے لیے حاضر ہوئے۔ یہی وہ مبارک سفر تھا جس میں آپ کے علم وفضل کا آفتاب پورے طور پر چمکا۔ عرب و عجم، حل و حرم، مصر و حجاز، بلادِ مغرب بالخصوص حرمین طیبین کے بزرگ ترین علما و مشائخ نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور احترام و عقیدت سے اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں۔ پھر اجازت وخلافت اور سندوں کے حصول کا جلد نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسی مبارک سفر میں علمائے مکّہ معظّمہ کی گذارش پر علمِ غیب رسول محترم ﷺ کے تعلق سے ایک عظیم اور تاریخی کتاب بخاری کے عالم میں ساڑھے آٹھ گھنٹوں میں ''الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ'' عالمِ وجود میں آئی، جس نے علمائے حرمین طیبین کو انگشت بدنداں کر دیا۔

مصطفیٰ جانِ رحمت ﷺ کے علوم پر ایسے شہ پارے و گوہر ہائے آبدار سامنے آئے جس نے حرمین طیبین کے جلیل القدر علما و مشائخ کو حیرت زدہ کر دیا۔

علمائے حجاز نے جس قدر و منزلت عقیدت و محبت، عزت و احترام کا عظیم الشان مظاہرہ کیا، اس کی کوئی دوسری مثال اس عہد سے لے کر آج تک دیکھنے اور سننے میں نہیں آئی۔ جس کا اندازہ ''حسام الحرمین'' اور ''الدولۃ المکیہ'' پر لکھی جانے والی تقریظوں سے ہوتا ہے۔ اس سفر میں محافظ کتب خانہ حرم حضرت علامہ سید اسماعیل خلیل مکّی نے آپ کو چودھویں صدی کا مجدّد کا خطاب دیا۔

تفقہ فی الدین کا یہ عالم کہ تقریباً بارہ ہزار صفحات پر مشتمل بارہ ضخیم جلدوں میں ''فتاویٰ رضویہ'' علمائے حرم کے استفسار پر "الکفل الفقیہ الفاھم فی قرطاس احکام الدراھم" (بہ زبانِ عربی)، دو ضخیم جلدوں میں جد الممتار حاشیہ ردالمحتار (بہ زبانِ عربی) میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کو عطا فرما کر اپنی فقہی بصیرت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا، جس پر فقیہانِ اسلام کو حیرت و استعجاب بھی ہے اور فرحت و مسرّت بھی۔

عربی زبان میں آپ کے فتاویٰ کے صرف چند اوراق دیکھ کر مکّہ شریف کے عالم جلیل مولانا سید اسمٰعیل خلیل بے ساختہ پکار اُٹھے "واللہ اقول والحق اقول انہ لو رآھا ابو حنیفۃ النعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ لقرت عینہ ولجعل مؤلفھا من جملۃ الاحباب۔"(۱) بخدا میں بالکل سچ کہتا ہوں کہ اگر حضرت امام اعظم ابوحنیفہ اس فتویٰ کو ملاحظہ فرماتے تو آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور صاحبِ فتویٰ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کو اپنے شاگردوں میں شامل کر لیتے۔

یوں تو آپ کی زندگی کارناموں سے عبارت ہے۔ ہر لحظہ، ہر آن کارنامے ہی کارنامے ؎

---

(۱) اس طرح کے متعدد واقعات کے لیے میری کتاب ''انوار کنز الایمان'' کا مطالعہ کریں۔ (محمد وارث جمال قادری)

ہر آن نیا طور نئی برق تجلّی

ہمہ دانی، ہمہ جہتی، مذہبی، سیاسی، علمی، فقہی اور مجددانہ کارنامے! جو اپنی وسعت، تنوع، مضامین کی بلندی، جودت فکر اور تعداد کی کثرت کے لحاظ سے ایک پوری اکیڈمی کی صد سالہ خدمات پر بھاری ہیں۔ ایک متحرک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا جو کام تھا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے تنہا انجام دے کر اپنی ہمہ گیر و ہمہ صفت جامع و تابندہ شخصیت کے انمنٹ نقوش چھوڑے۔ وہ کون سا موضوع اور کون سا فن ہے جو اس عبقری الشرق کے رواں و سیّال قلم سے سیراب نہیں ہوا۔ تفسیر، حدیث، اُصولِ حدیث، فقہ، اُصولِ فقہ، لغت، فرائض، کلام، عقائد، تجوید، تصوف، افکار، اوفاق اخلاق، تعبیر، تاریخ، سیر، مناقب، فضائل، اسماء الرجال، جرح وتعدیل، نحو، صرف، منطق، ادب، زیجات، جبر وتکسیر، مثلث ارثما طیقی، لوگارثم، فلسفہ، ہندسہ، حساب، نجوم، توقیت، غرضِ انسانی، فضل وکمال کے پیکر مجسم نے جس سمت رُخ کیا علوم و آگہی اور معارف وحقائق کے چشمے اُبلنے لگے۔ یہ ان کی عظیم ترعلمیت کی گیرائی و گہرائی ہی تو ہے کہ آج ایشیا سے لے کر یورپ اور افریقہ سے لے کر براعظم امریکہ تک جدید علمی دانش کدے آپ کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔

برصغیر ہندو پاک میں پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، جبل پور یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، افریقہ میں ویل یونیورسٹی، یورپ میں نیو کاسل یونیورسٹی، لندن یونیورسٹی، لیڈن یونیورسٹی، امریکہ میں برکلے یونیورسٹی، کولمبیا یونیورسٹی۔۔۔ یہ وہ جدید علمی دانش گاہیں ہیں جہاں پر امام احمد رضا بریلوی کے منقولاتی و معقولاتی پہلو پر کسی نہ کسی انداز میں کام ہوا اور ہو رہا ہے۔

بے ہودہ گوئی و ہرزہ سرائی و بدنام کرنے کے تمام ہتھکنڈوں کے باوجود آپ کے علم وفضل کا آفتاب پورے علمی تمازت کے ساتھ جگمگا رہا ہے اور کائنات بھر کے دانشوروں کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے ؎

جس قدر ہم نے مٹائے تیری یادوں کے نقوش
دل بے تاب نے اتنا ہی تجھے یاد کیا

آپ کے تمام کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ ترجمۂ قرآن پاک کنز الایمان ہے، جسے ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء کو محبت رسول میں ڈوب کر علم و ادب اور عشق و ادب کا شاہ کار بنا دیا۔ جس سے سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کی آنکھیں ٹھنڈی، جگر تازے اور جانیں سیراب ہوئیں۔ ایمان کو نئی حلاوت اور زبان کو ادب کی نئی چاشنی ملی اور ساتھ ہی بصد ناز اردوئے معلّیٰ بھی جھوم اُٹھی ؎

خندہ گل جنبش لب بوئے گل تقریر ہے

اس شہید محبت اور کشتۂ تیغ نگاہِ مصطفےٰ نے جس اندازِ محبت میں آنکھیں بند کر کے یہ ترجمہ محبت، اہلِ محبت کو دیا ہے وہ داستانِ محبت بھی بڑی عجیب ہے۔

اُلٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگانِ عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لیے

تراجم کے ان ہجوم میں جو فضیلت و برتری اور شانِ امتیاز ترجمہ قرآن پاک ''کنز الایمان'' کو حاصل ہے وہ اہلِ علم، اہلِ ذوق، اہلِ ادب، اہلِ محبت پر اظہر من الشّمس ہے۔

کسی بھی زبان کے لب ولہجہ، حسن وبیان، اسالیب بلاغت کو جس حد تک ترجمہ میں سمویا جاسکتا ہے، عروج کی اس انتہا پر ''کنز الایمان'' کی انفرادیت اپنی مثال آپ ہے۔

یوں تو کہنے کو اردو زبان میں ترجمے بہت ہیں مگر ایسا ترجمۂ قرآن جو صرف قرآن سے کیا گیا ہو، جو میزانِ عشق پر نپا تُلا ہو، جس کے ہر نازک مقام پر ادب واحتیاط، حزم واتقا، فکر ودانش، حرمت وتعظیم کے ساتھ ہی سرچشمۂ محبت ہی محبت ہو، وہ صرف مجددِ اعظم سیدنا امام احمد رضا بریلوی کا ترجمہ کردہ قرآنِ مجید ''کنز الایمان'' ہے۔

جس طرح قرآن کی فصاحت و بلاغت، لسانیاتِ عرب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، یوں ہی اردو تراجم میں کنز الایمان اردو ادب کا دُرِ شاہوار ہے۔ سو برس کا طویل عرصہ اردو ادب کو کہاں سے کہاں لے گیا۔ اس عرصے میں نمایاں ترقی کی طرف اردو ادب نے نہ صرف تیزی کا مظاہرہ کیا بلکہ بلندی کی طرف جانے میں جست لگائی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کو اردو ترقی کا دورِ جدید کہا جاسکتا ہے۔ مگر تقریباً سو سال کے بعد آج بھی ترجمۂ قرآن ''کنز الایمان'' اردو زبان وادب کا نمائندہ وترجمان بنا ہوا ہے۔ اس ترجمے کی معنوی خوبیاں تو الگ رہیں، بلاغت زبان اور حسنِ ادب کا حال یہ ہے کہ وہ ترجمہ کل بھی اردو ادب کے ذوق نمود کی علامت بنا ہوا تھا اور آج ہندوستانی ادب کدے کا قیمتی سرمایہ ہے، جسے فاضل بریلوی کی زندہ کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اب رہ گئیں معنوی خوبیاں تو اس سے قرآن علوم کا ماہر، حقائق قرآن کا عارف، معارفِ قرآن کے غوامض، مشکل، محکم، متشابہ، تاویل، تفسیر، ناسخ، منسوخ پر نگاہ رکھنے والا دیدہ وار اور علوم کے بیکراں بحر کا تہہ نشیں ہی انوار وتجلیات، حقائق ومعارف اور اسرار وحکمت کی موتیاں چن سکے گا۔ اس ترجمے میں علمِ کلام کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھائی گئی ہیں۔ جبر وقدر، منصب نبوت ورسالت اور ذاتِ الوہیت جیسے نازک مقامات کو ادب و احتیاط، عقیدت ومحبت، حزم واتقا کے گل بوٹوں سے جس سلیقے اور قرینے سے سجایا گیا ہے، یہ کام کسی ایسے مقبول بارگاہِ حق اور عاشقِ رسول کا ہے جس کے پاس علمِ لدنی کا خزانہ ہے ؎

اللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضانِ محبت عالم سہی عرفانِ محبت عام نہیں

☑☑☑☑☑☑

امام احمد رضا بریلوی
اور تحریکِ ندوہ

مولای صل وسلم دائماً ابداً علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کی تہہ در تہہ و پہلو دار شخصیت اور آپ کی ذات جامع الصّفات کے کسی نہ کسی علمی گوشے، فکری زاویے، دینی خدمات، ملّی کارنامے، اسلامی شوکت و عظمت کے لیے ان کے سوزِ دروں اور ان کے عشق کی بے چینیوں پر کوئی نہ کوئی نئی تحقیق، نئی تلاش، نئی جہت اور نئی نئی بلندیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔ چھوٹی بڑی کتابیں، مقالہ جات سے مبسوط و ضخیم مجلّدات اور تاریخی نمبروں کا ایک تسلسل ہے جو رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ اللہ اکبر

کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

آپ کے علمی، دینی، ملّی، فکری اور تجدیدی کارناموں کا ایک طورِ سینا ہے جس کی چوٹی تک دنیاے علم و فضل اپنی تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک پہنچ نہیں سکی ہے۔

آپ کے انھیں روشن و تجدیدی کارناموں میں ایک بڑا و تاریخی کارنامہ "تحریکِ ندوہ" کا ردّ و استیصال اور اس فتنۂ عظیم کا قلع قمع اور اس سیلابِ بلا پر ایک مضبوط، ناقابلِ شکست و ریخت و تاریخی باندھ باندھنا ہے۔

تحریکِ ندوہ کی مضرت رسانیوں اور اسلام کے نام پر اہلِ ندوہ کی بوالعجبیوں سے اسلامیانِ ہند خصوصاً سوادِ اعظم اہلِ سُنّت و جماعت کو بچانے کے لیے اپنے رفقا، اہلِ محبت، خلفا و تلامذہ و جیّد ترین معاصرین علما بالخصوص حاملِ قوتِ قدسیہ حضور تاج الفحول حضرت علامہ شاہ عبد القادر بدایونی بن سیف اللہ المسلول حضرت علامہ شاہ فضلِ رسول کی سرپرستی و معیت میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

رُخِ زیبا کے جلووں سے دلِ تاریک روشن ہے
تیری یادوں کے پھولوں سے میرا صحرا بھی گلشن ہے

وہابیت کی گندی کوکھ سے جتنے بھی مذہبی و سیاسی فتنے و باطل تحریکیں پیدا ہوئیں، مضرت رسانیوں اور اسلام کے روشن چہرے کو داغ دار کرنے میں "مجلس ندوۃ العلما" کو بھی ایک خصوصی امتیاز حاصل تھا۔ اس لیے اس عہد کے اساطینِ اُمّت، جلیل القدر علما و مشائخ بالخصوص حضور تاج الفحول بدایونی اور اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سُنّت بریلوی نے اس کے ردّ و استیصال اور اس کی پامالی میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا اور اس تعلق سے کسی سُستی و غفلت کو قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ اس کے لیے وہ ہم

وقت تازہ دم ومستعدر ہے۔اورہر آن وہر لمحہ بے چین !اور ساتھ اپنے رب کے حضور فریاد کناں! ؎

تو فرستا دی بما روشن کتاب　　　می کند بابا با حکایت خطاب
از طفیلِ آں صراط مستقیم　　　قوتِ اسلام راہ دہ اے کریم
بہر اسلامے ہزاراں فتنہا　　　اک مہ وصد داغ فریادا اے خدا

واضح رہے کہ ندوۃ العلما اور دار العلوم ندوۃ العلما دو الگ الگ چیزیں ہیں اور دونوں کی الگ الگ حیثیتیں ہیں۔ موجودہ دار العلوم ندوۃ العلما ایک معروف علمی ادارہ ہے، جو مجلس ندوۃ العلما کے ملبے پر لفظ دار العلوم کے اضافے کے ساتھ اسی نام سے معرضِ وجود میں آیا۔ یہ خالص ایک تعلیمی ادارہ ہے جو عربی زبان وادب کے ساتھ مسلکِ دیوبند کا ایک بڑا حامی اور برصغیر ہند میں شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی، سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل دہلوی کے عقیدہ ومسلک کا نمایندہ و ترجمان ہے۔ جو چودہ سو سالہ قدیم وحقیقی اسلام سے قدم بہ قدم متصادم ہے۔

ہم یہاں جس ندوۃ العلما کا ذکر کر رہے ہیں وہ کوئی علمی ادارہ نہیں بلکہ ''مجلس ندوۃ العلما'' کے نام سے ایک تحریک تھی، جو ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں اُتر پردیش کے مشہور صنعتی شہر کانپور میں قائم ہوئی۔ ابتداً تاسیسِ ندوہ کا علمائے اہلِ سُنّت نے خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کیا بلکہ اس کے تاسیسی اجلاس منعقدہ ۱۳۱۱ھ کانپور میں علمائے اہلِ سُنّت بالخصوص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی، کہ اس کے صدر نشین استاذ العلما حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی تھے، جب کہ ناظمِ اعلیٰ مولانا سید محمد علی مونگیری تھے اور ندوۃ العلما کے بظاہر جو اغراض ومقاصد تھے وہ بڑے تعمیری تھے، مگر یہ ظاہری مقاصد ہاتھی کے دکھاوے والے دانت کے مانند تھے۔ حقیقی مقصد تقیہ کے نقاب میں تھا، جس کے ظاہر ہونے میں زیادہ تاخیر نہیں ہوئی۔ ان کے حقیقی مقاصد کا خلاصہ ولب لباب جو تھا وہ مختصراً یہ کہ شرکتِ کلمہ وشرکتِ قبلہ کی بنیاد پر جتنے بھی اہلِ کلمہ ہیں وہ سب ایک ہیں خواہ وہ رافضی ہو یا نیچری، وہابی ہوں یا قادیانی۔ جس میں کسی کی نہ تکفیر کی جاسکتی ہے اور نہ ہی تفسیق۔ سب کے سب ایک خدا کے بندے، ایک نبی کے اُمتی، سب کا قبلہ کعبہ، سب کی مذہبی آسمانی کتاب قرآن، سب کے سب ایمان میں برابر۔ اب اگر کوئی اس میں سے کسی طبقے یا فرقے کی تکفیر وتفسیق کرے یا اسے دین سے خارج مانے یا جہنمی جانے وہ خود کافر وبے دین، فاسق وفاجر جہنمی ہے اور خارج از اسلام ہے۔ غضب بالائے غضب یہ کہ سب دجل وفریب اور سادہ لوح مسلمانوں کی آنکھوں میں جو دھول جھونک رہے تھے وہ اہلِ سُنّت وجماعت کے نام اور اسی پلیٹ فارم سے، کہ اس وقت بھی پورے برصغیر ہند میں تقریباً سُنّی ہی سُنّی تھے جو سب کے سب حنفی المذہب تھے۔ برٹش حکومت کی تمام تر پشت پناہی، امداد وتعاون وخیر خواہی کے باوجود علیٰ رؤس الاشہاد انھیں غیر سُنّی ظاہر کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ البتہ نوابانِ اودھ کی حکومت کے باعث اودھ میں جو بھی شیعہ تھے وہ اپنے آپ کو شیعہ کہتے تھے۔ رہ گئے وہابی، دیوبندی وغیرہ، اُن کا حال بقول حضرت اجمل سلطانپوری یہ تھا کہ

وہابی سے پوچھو کہ تم ہو وہابی   تو فوراً کہیں گے نہیں تو، نہیں تو

اور یہ حال نصف صدی پہلے کا تھا۔ اسی لیے اہلِ سُنّت کے نام سے اس تحریک کو چلانا اور اس کے لیے اہلِ سُنّت و جماعت کا پلیٹ فارم استعمال کرنا ان کی مجبوری تھی۔ چنانچہ اپنی اس تحریک کے لیے صدر جو بنایا تھا وہ بھی جماعتِ اہلِ سُنّت کے ایک بزرگ ونامور عالمِ دین جن کے تلامذہ بھی اس وقت بڑا علمی قد اور بڑی حیثیت لیے ہوئے تھے۔ یعنی استاذ العلما حضرت مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی۔ اور ناظمِ اعلیٰ مولانا سید علی مونگیری جن کی سُنّیت وحنفیت کی شہرت تھی۔ علماے اہلِ سُنّت بالخصوص حضور تاج الفحول بدایونی وامام اہلِ سُنّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی کا ندوہ کے تعلق سے حسّاس و بے چین ہونے کا سبب اہلِ ندوہ کا وہ طرزِ عمل اور دامِ تزویر تھا جو سادہ لوح مسلمانوں کو فریب دینے کے لیے انھوں نے سُنّیت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ تا کہ ندوہ کا پلیٹ فارم اہلِ سُنّت کا پلیٹ فارم سمجھا جائے۔ جس طرح آج کے موجودہ ماحول میں وہابیہ مقلدین وغیر مقلدین نے اہلِ سُنّت و جماعت کو بریلویتے کے خول میں محبوس کر دیا ہے اور وہابیہ مقلدین یعنی دیوبندیوں نے خود کو اہلِ سُنّت و جماعت کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کر دیا ہے اور بڑے دھڑلّے کے ساتھ خود کو اہلِ سُنّت و جماعت کہنے لگے ہیں۔

اپنی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے اور خوفِ خدا و شرمِ رسول سے بے نیاز ہوتے، ان کے دامِ فریب کا انداز ملاحظہ ہو۔ وہابیوں، دیوبندیوں، نیچریوں اور ندویوں کے امام الہند فرماتے ہیں:

"ندوۃ العلما کے اجتماع سے مجھے روشن خیال علما کی جو حالت منکشف ہوئی (کیونکہ منتسبین ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حسنِ ظن تھا) اس سے طبیعت کو اور زیادہ مایوسی ہوئی اور طبقۂ علما کی طرف سے سخت وحشت پیدا ہوگئی۔ مخالفینِ ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اور کر رہے ہیں ان کی نسبت تو یہ خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں ہیں مگر جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے، اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ پانچ چھ مہینے ان کی سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا اس لیے اندرونی حالات بالکل میرے سامنے تھے۔ مَیں نے دیکھا بالکل چالاک، دنیا داروں کی سی کارروائیاں جاری ہیں اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عیاریاں کی جاتی تھیں۔ میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے مشورہ کیا کہ مجلس وعظ میں کیونکر ان کو اظہارِ جوش وخروش کرنا چاہیے اور کیونکر آخر میں نالہ وبکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہوگئی۔ اس کے بعد واعظ نے جوں ہی مثنوی کی ایک حکایت شروع کی، دوسرے صاحب معاً کھڑے ہو کر چال بازوں کی حرکتیں شروع کر دیں۔ اس سے مجلس میں بڑی رقّت طاری ہوگئی اور اس قدر آہ وبکا ہوا کہ اس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اس طرح کی بیسیوں باتیں مَیں روز دیکھتا تھا۔" [۳]

مجلس ندوۃ العلما کے اصل مقصد کو سمجھنے اور اس کا اندازہ لگانے کے لیے کہ اہلِ ندوہ اُمتِ مسلمہ کو کہاں لے جانا چاہتے

تھے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک حضور تاج الفحول علامہ شاہ عبد القادر بدایونی قدس سرہ العزیز کے ان گراں قدر مکتوبات میں دیکھیں، جو انھوں نے اپنے معاصرین اعیانِ اہلِ سُنّت کو لکھا۔

واضح رہے کہ مکتوباتِ شریف تو کافی طوالت لیے ہوئے ہیں، ہم یہاں ضروری اقتباسات ہی نقل کریں گے۔ حضرت اقدس مولانا محمد عادل صاحب کانپوری علیہ الرحمہ کے نام اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''مجلس ندوۃ العلما جس نام سے تجویز ہوئی نہایت محبوب ہے اور شرکتِ علمائے اہلِ سُنّت موجب برکت۔ مگر روئیداد مطبوعہ میں جو سالِ گذشتہ مشتہر ہوئیں اس میں بعض مقاصد ایسے اجمال وابہام کے ساتھ بیان کیے گئے کہ جس سے انحصار حقیقت ونجات کا مدار مذہبِ اہلِ سُنّت پر نہیں رکھا ہے۔ اس میں روافض ونیچریہ وغیرہ مقلدین کی بڑی تائید ہے۔ اس بنا پر مولوی احمد رضا خاں بریلوی نے ناظم صاحب سے بکمالِ عاجزی کہ شانِ دین داری ہے، واسطے اصلاحِ بیان مقاصدِ مذکورہ کے اور تبدیل صورت روداد آئندہ کے بار بار گذارش کیا۔ لیکن ناظم صاحب اپنے خیالات کے مطابق ان کی عرض کو قبول نہیں فرمایا۔''

پھر قدرے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید اسی مکتوب میں فرماتے ہیں:

''یہ تو ظاہر ہے کہ جناب ناظم صاحب (یعنی مولانا محمد علی مونگیری) سُنّی حنفی مشہور ہیں، پھر کس طرح دل سے نجات و حقیقت کو مذہب اہلِ سُنّت میں منحصر نہ جانتے ہوں گے اور روافض ونیچریہ کو کافر فی بعض المسائل ومبتدع وگمراہ فی بعض المسائل نہ جانتے ہوں گے۔ ہاں کسی مصلحت سے اگر اخفا پر عمل فرماتے ہوں تو دوسری بات ہے۔''

پھر آگے چل کر اسی مکتوب میں فرماتے ہیں:

''پھر کس واسطے خواہ مخواہ اپنی روداد کی سخن پروری کر کے مولوی احمد رضا خاں صاحب وغیرہ اتقیائے اہلِ سُنّت کے خارج کرنے کو ان اشقیا بے دین کے شامل نہ کرنے پر ترجیح دی جاتی ہے۔''

پھر اپنے طویل مکتوب کے اختتام پر یوں رقم طراز ہیں:

''اور اگر خدانہ خواستہ فی الواقع ناظم صاحب موافق بیان روداد کے سب فرق مدعیانِ اسلام کے ناجی اور اہلِ حق اور اسلامی بھائی ہیں اور واجب التعظیم والمحبت ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور رودادِ سابق کو قابلِ تغیر وتبدیل نہیں جائز جانتے تو اس کا کوئی علاج نہیں۔ بہر حال آپ بھی ایک بار تکلیف فرما کر ثواب اصلاح ما بین علمائے اہلِ سُنّت کا حاصل فرما لیجیے۔ اگر چہ تکلیف ہوگی لیکن اس کے جواب دو قطعہ سے مشرف فرمائیے۔ اگر ناظم صاحب کو مذہب اہلِ سُنّت پر رحم آ گیا تو میں ضرور حاضر ہو کر پوری خدمت ندوہ کی بجالاؤں گا۔''

فقط والسلام فقیر عبد القادر عفی عنہ [۴]

حاملِ قوتِ قدسیہ حضور تاج الفحول محب الرسول حضرت اقدس بابرکت مولانا شاہ عبد القادر بدایونی علیہ الرحمۃ اعلٰی

حضرت امام اہلِ سُنّت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کے نام اپنے مکتوب میں اہلیانِ ندوہ کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

مولانا الابجل الاجل الاکرم مولانا احمد رضا خاں زاد مجدھم

بعد سلام مسنون نیاز مشحون واضح ہو۔ احقر چندروز ہوئے وارد سکندر آباد ہوا۔ جناب مولانا مفتی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں فوراً حاضر ہوا۔ بعد قدرے مکالمہ کے اقرار فرمایا کہ فی الواقع ناظم صاحب سے غلطی اور خلافِ مصلحت کا ظہور ہوا۔ بیانات روداد مشتمل برخدشات ہیں۔ ان کو لکھا جائے گا کہ وہ ان کی اصلاح فرمائیں گے۔ اس کے جواب میں گذارش کیا گیا، اگر اصلاح موقوف رکھی گئی انعقادِ جلسہ پر تو متضمن فسادِ عظیم ہے۔ اور اہلِ سُنّت کو جو خدشے ہیں اس کا طے ہونا اس جلسے میں جس میں مجتہدانِ شیعہ و نیچریہ، وہابیہ ارکان قرار دیئے جائیں گے، ہرگز مقصور نہیں ہے۔ بلکہ لازم ہے کہ اولاً قبل انعقادِ جلسہ کے اشاعتِ مذہب اہلِ سُنّت کی بذریعہ فتاویٰ علمائے اہلِ سُنّت ہو جائے۔ پھر اگر ارکانِ جلسہ کو پابندی ہمارے مذہب کی منظور ہو تو ہم شریک ہوں ورنہ احتراز کریں تاکہ وقت انعقادِ جلسہ احتمال وقوعِ جنگ وجدال کا نہ رہے۔ اس کو پسند فرمایا، جس کی بنا پر سوالات وجوابات لکھوا کر مَیں نے تصحیح ثبت کر کے ان کی خدمت میں پیش کر دی۔ آج ملاقاتِ ثانیہ میں مولوی صاحب نے دستخط ومہر سے جواب کو مشرف فرمایا۔ جن کی نقل مرسل خدمت ہے۔ اعیان وحاضرین اپنی مجلس کے مواجہہ میں مولوی صاحب نے فرمایا کہ بیانِ ناظم بہت بے جا ہے۔ یہ حکم ناظم صاحب کا کہ مسائلِ نزاعیہ کے جواب میں سکوت رہے، نہایت خراب ہے۔ ملخصاً فقیر عبدالقادر عفی عنہ ۵

حضور تاج الفحول بدایونی اپنے اور اپنے والد گرامی سیف اللہ المسلول حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کے تلمیذ ارشد حضرت اقدس بابرکت علامہ حافظ قاری سید شاہ عبدالصمد چشتی مودودی حافظ بخاری صدر مجلس علمائے اہلِ سُنّت پھپھوند شریف کے نام اپنے ایک طویل مکتوب میں ندوہ کی بابت فرماتے ہیں:

"بہ جناب مکرمی و معظمی مولوی حافظ سید شاہ عبدالصمد صاحب زاد عنایاتھم، بعد سلام مسنون و نیاز مشحون کے گذارش ہے کہ میں ایک مدت سے علیل رہتا ہوں لیکن باوجود علالت کے مجلس مبارکہ معراج شریف جو بمقام اٹاوہ منعقد تھی حاضر ہو گیا تھا۔ علاوہ وہاں کی برکت حاضری کے آپ کی خدمت کے شرف کا بھی حاصل ہونا خیال میں تھا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ آپ اٹاوہ میں تشریف لائے نہ خانقاہ پھپھوند میں رونق افروز ہیں۔ بلکہ واسطے ہدایت دیگر مقاماتِ بعیدہ کو تشریف لے گئے ہیں۔ اپنی محرومی پر افسوس آیا۔ اس وقت موجب تکلیف دہی ایک امرِ دینی ہے۔ وہ یہ کہ کتاب مطبوع روئیداد جلسہ ندوۃ العلماء جو بمقام لکھنؤ منعقد ہوا تھا کہ مقصد اس ندوہ کا یہ ہے کہ جو لوگ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ پڑھتے ہیں اور بجانب کعبہ شریف نماز پڑھتے ہیں ان کو اپنا دینی بھائی ٹھہرایا جائے اور نزاعاتِ مذہبی سے قطع نظر کیا جائے۔ شیعہ، نیچریہ وغیر مقلدین وہابیہ کے نزاعات کو مانند نزاعاتِ حنفیہ و شافعیہ وغیرہم کے سمجھنا چاہیے۔ یہ خلاصہ ہے اصل مقصدِ ندوہ کا۔" (پھر دوسطر بعد)

پھر جب حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی آپس میں ایک قرار دیئے جاتے ہیں اور اسلامی بھائی شمار کیے جاتے ہیں تو پھر دوسرے فرق جو مدعیانِ اسلام ہیں وہ کیوں نہیں بھائی بھائی قرار دیے جائیں گے۔فقط''

چونکہ یہ مضمون سراسر خلاف مذہب اہلِ سُنّت ہے اور قیاس اختلاف مسائل فروع اختلافیہ صحابہ کرام پر جو درمیان مذاہب اہلِ سُنّت کے ہے خلافِ عقاید روافض و وہابیہ و نیچریہ کا کرنا قیاس مع الفارق ہے اور نیز منکر ضروریاتِ دین اگر کلمہ کا اقرار کرے اور نماز ہمارے قبلہ کی طرف پڑھے بالاجماع کافر قطعی ہے۔ منتظمین ندوہ کی تقریر پر یہ اجتماع باطل ٹھہرتا ہے اور فی الحقیقت یہ فساد ایک بڑا کید روافض کا ہے۔ واسطے ابطالِ خلافتِ حقہ جناب حضرت امیر المؤمنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کہ انھوں نے اس قوم کو جو باوجود ایمان و وحدانیتِ حق سبحانہ و رسالتِ جناب سید المرسلین ﷺ کے اور اقرارِ فرضیتِ نماز کا انکار فرضیتِ زکوۃ سے کرتے تھے، مرتد و کافر کا حکم ٹھہرا کر حکمِ جہاد کا فرمایا تھا۔ اس تقدیر فاسد پر وہ لوگ مسلمان بھائی تھے، اُن کو مرتد و کافر ٹھہرا کر حکم قتل کا دینا خلافِ حق ٹھہرا۔ معاذاللہ من ذالك۔

حضور تاج الفحول بدایونی علیہ الرحمہ کے ان مکتوباتِ گرامی سے مجلس ندوۃ العلما کے حقیقی مقاصد اور اُن کے مضمرات و مضرات کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اور اس عہد کے علمائے اسلام، مشائخ عظام، اساطینِ اُمت بالخصوص حضور تاج الفحول اور اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت کی بے چینیوں کا پس منظر اور ندوہ کے خلاف ان کی استقامت اور جہد و پیہم کی وجہ بھی۔

بے شک یہ مجلس ندوۃ العلما دین حق کے لیے اکبر بادشاہ کے فتنۂ دین الٰہی سے بھی (بہ فرق حالات) ایک بڑا و زبردست فتنہ تھا۔

خیر اکبر تو علم سے بے بہرہ ایک بادشاہ تھا، جس کو اپنی بے علمی و جہالت کے سبب دین کی اتنی خبر نہیں تھی۔ وہ تو اپنی بادشاہت کے استحکام، ہندو اکثریت کی خوش نودی و اپنی ہردل عزیزی کے لیے اسلام و کفر کو بغل گیر کرانے کے لیے کوشاں تھا۔ حق و باطل، کفر و اسلام، نور و ظلمت کو ایک صف میں کھڑا کر کے انھیں ایک جیسا منوانے پر مصر تھا۔ جس کے لیے علماء سوء کے تعاون سے ایک نئے دین کی راہ نکال کر اس کا نام دین الٰہی رکھا۔ جس کی سرکوبی کے لیے اللہ کے ایک برگزیدہ بندے شیخ احمد سرہندی مجدّد الف ثانی اپنے مٹھی بھر رفقا اہلِ محبت کو لے کر آگے بڑھے اور دین کے لیے اپنی عزیمت و استقامت سے ایک عظیم شہنشاہیت کو سرنگوں کیا، جو تاریخ دعوت و عزیمت کا ایک مستقل عنوان بنا۔ جس کی طرف شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

وہ ہند سے سرمایہ ملت کا نگہبان | اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار

شیخ سرہند کی انھیں عظیم دینی خدمات، ملّی کارناموں اور دین کے لیے ان کی کفن بردوشی، اسلام کی سربلندی کے لیے ان کی جاں نثاری، اوروں کی طرح رخصت کے بجائے عزیمت اور خدا کی راہ میں اپنی جان کی پرواہ نہ کرنے کو دیکھ کر علم و فضل کے ایک بلند مینار حضرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی نے انھیں مجدّد الف ثانی کا خطاب دیا۔ جس کی نوبت چار دانگ عالم

میں بجی اور یہ لقب ان کے فرق اقدس پر ایسا ہی سجا جو قیامت تک لیے آپ کے نام کا علم ہو کر رہ گیا۔ اب عالم یہ ہے کہ حضرت شیخ احمد بغیر مجدّد الف ثانی کے سمجھ میں نہیں آتے۔ ان کی مقبولیت و محبوبیت کا عالم یہ ہے کہ ہر زمانے میں ان کی عظمت کا گراف سوا نیزے پہ رہا۔ ذالك فضل الله يعطيه من يشاء بغير حساب۔

بندہ مومن کا دل خوف ورجاء سے پاک ہے
قوت فرماں روا کے سامنے بے پاک ہے

اگر دیکھا جائے تو فتنۂ ندوہ دینِ حق کے لیے فتنۂ دین الٰہی سے زیادہ مضر و خطرناک تھا کہ دینِ الٰہی اسلام کے مقابلے میں ایک نیا دین تھا، جو ایک بے علم شہنشاہ نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے قائم کیا تھا۔ عام مسلمان بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہی لوگ اس کے قریب جاتے جس کو دنیوی یا سیاسی مراعات چاہیے۔ گویا دین کے بدلے با مقصد دنیا طلبی جگ ظاہر تھا۔ اور اس بلا میں گرفتاراں جانے میں نہیں ہوتے بلکہ خوب سوچ سمجھ اور جان بوجھ کر اسے اپناتے۔ اور اس سلسلے میں ہر طرح کا تجاہل صرف عارفانہ ہوتا۔ مگر یہاں تو اس کے کرتا دھرتا بڑے بڑے نام والے علامتہ الدہر تھے۔ عوام کی زبان میں چار آنکھ والے تھے، بلکہ اس میں کوئی کوئی قابلیت میں تو آٹھ آنکھ والے کے برابر تھا۔ جیسے علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید محمد علی مونگیری، مولانا ابوالکلام آزاد (جن کی ندوہ سے وحشت کی کہانی ابھی پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں) وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ فتنہ بظاہر اسلام کے مقابلے میں نہیں بلکہ اسلام کے نام پر شرکتِ کلمہ طیبہ اور شرکتِ قبلہ کی اساس پر دامِ ہمرنگ لیے ہوئے قال اللہ وقال الرسول کی صدائے زمزمہ نواز لیے ہوتے۔

ندوہ کی ہولنا کی کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ ندوہ کے ایک جلسے میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں مولانا ابراہیم آروی نے تمام ضروریاتِ دین اور اس کے مسلّمہ اصولوں کو پامال کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اسلام کے لیے صرف لا الہ ہی کافی ہے اور صرف لا الہ الا اللہ کو نجاتِ آخرت کے لیے کافی قرار دیا۔ شرکائے اجلاسِ خصوصی یعنی ذمہ دارانِ ندوہ نے اس خطاب پر اسے خوب داد و تحسین سے نوازا۔ جس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سادہ لوحی کی بنیاد پر جو علما شریک ہوا کرتے تھے، وہ لاحول پڑھتے ہوئے اُٹھ آئے کہ ”چلیے یہاں سے تو رسالت بھی تشریف لے گئی“۔ جیسے مولانا عبدالوہاب صاحب لکھنوی ے وغیرہ اس کے علاوہ بھی بہت سارے واقعات ہیں جس کے ذریعے دینِ حق کو مسخ کیا جا رہا تھا۔

بہکی ہوئی دانش سے جہالت بہتر
دھوکے کی محبت سے عدارت بہتر

یہی وہ مضمرات اور دینِ حق کے لیے مضرت رسانیاں اور خطرناک عوامل تھے جس کے پیشِ نظر دینِ حق کے مجدّد دو اہلِ سُنّت کے امام مولانا شاہ احمد رضا خاں نے مجلس ندوۃ العلما کے خلاف کمر ہمت کسی اور میدانِ عمل میں اُترے اور اس کے لیے با قاعدہ ایک لائن آف ایکشن تیار کیا۔ حضور تاج الفحول بدایونی کی سرپرستی ۸ میں اس عہد کے اساطینِ اُمت،

اعاظم رجال و اعیانِ اہلِ سُنّت پر مشتمل مجلس علمائے اہلِ سُنّت کے نام سے ایک محاذ قائم کیا جس کی تشکیلی میٹنگ بریلی شریف میں آپ کے درِ دولت پر ہوئی اور صدارت کے لیے حضور تاج الفحول بدایونی کی معذرت (وہ بھی بڑھتی عمر، بیماری و جسمانی کمزوری کے سبب) کے بعد آپ کے تلمیذ ارشد حضرت اقدس بابرکت حضرت علامہ حافظ قاری مفتی سید عبدالصمد مودودی چشتی حافظ بخاری پھپھوند شریف کا انتخاب عمل میں آیا اور مجلس علمائے اہلِ سُنّت پوری تب و تابِ جاودانہ کے ساتھ مجلس ندوۃ العلما کے دینی و ایمانی مضرت رسانیوں کے خلاف میدان میں اُتری۔

خود امام اہلِ سُنّت مجدّ دِ دین وملت نے نصف درجن سے زاید کتابیں ندوہ کے ردّ و استیصال میں تصنیف فرمائیں اور پچاس سے زاید کتب و رسائل آپ کی نظرِ ثانی کے بعد مطبع اہلِ سُنّت بریلی شریف سے شائع ہوئے۔ جو بڑے پیمانے پر مسلمانوں تک پہنچائے گئے۔ ندوہ کے خلاف ایک طویل قصیدہ بھی عربی زبان میں نظم فرمایا اور ''حقائق نما برؤس ندوۃ العلما'' کے عنوان سے ستر ۷۰ سوالاتِ قاہرہ ندوہ کے اربابِ حل و عقد سے کیے، جس کے جواب سے صنادیدِ ندوہ تاحیات عاجز رہے اور سوالات کے بوجھ سے اپنی کمروں کو دوہرا کیے ہوئے قبر میں پہنچ گئے۔ جس کی طرف اپنے طویل قصیدہ ''چراغِ انس'' میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میرے ستر سوال کا قرضہ　　نہ ادا ہو سکا، محب رسول
نہ ادا ہوا گرچہ محشر تک　　ڈھیل انھیں دے قضا محب رسول
بیسیوں اعلان پر بھی ہٹ نہ سکا　　گھونگٹ ان مکھڑوں کا محب رسول

ندوہ کے خلاف جہاں امام اہلِ سُنّت نے جہاد بالقلم فرمایا، وہیں اس کی سرکوبی میں جہاد باللسان کے لیے بھی ہمیشہ تازہ دم رہے اور صرف ''مجلس علمائے اہلِ سُنّت'' قائم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ علاج بالمثل کے طور پر اسی طرز پر ایک تحریک بھی ''جدوہ'' کے نام سے شروع کی جو ندوہ کے خلاف مسلسل سرگرم رہی اور جگہ جگہ اس کے لیے موتِ احمر کا پیغام بر بنی رہی۔

آپ کے ایک محبوب مرید خلیفہ مخیر اعظم نواب عبدالوحید صاحب رئیس پٹنہ نے ندوہ کی سرکوبی کے لیے اپنے جیبِ خاص سے پچاس ہزار روپے خرچ کیے اور جگہ جگہ اہلِ خیر نے اس فتنے سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اپنے دلوں کے ساتھ تجوریوں کے منہ بھی کھول رکھے تھے۔ تنہا برٹش دور کا پچاس ہزار کا آنکڑا، اس زمانے کے کروڑ کی حد کے قریب ہوگا۔

فجزاھم اللہ تعالیٰ جزاء کثیرا

ندوۃ العلما کی دجل فریبیوں کے خلاف اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت کی بے چینیوں کے نقطۂ عروج کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اہلیانِ ندوہ کی تلبیسیت پر ایک بڑا اقدام اُٹھاتے ہوئے اس معاملے کو حرمین طیبین (زاداللہ شرفاً واجلالاً) کے جلیل القدر علما و مشائخ و مفتیانِ کرام کی بارگاہ میں پیش کیا اور وہاں سے جو شرعی حکم حاصل ہوا اسے ''فتوی الحرمین برجف ندوۃ

المبین‘‘ کے نام سے کتابی شکل میں شائع فرما کر ملک بھر میں پھیلایا۔

ایسا ہر گز نہیں ہوا کہ علماے اہلِ سُنّت بالخصوص حضور تاج الفحول بدایونی و اعلیٰ حضرت بریلوی پر جوں ہی ندوہ کے مفاسد اور دین حق کے لیے اس کی مضرت رسانیاں اور اس کا زہر ہلاہل ہونا ظاہر ہوا۔ تو فوراً کمر کس کر میدان میں اُتر گئے۔

بے شک ندوہ کے تدارک کے لیے فوری طور پر ضرور لگے مگر اس کی ابتدا اہلیانِ ندوہ وذمہ داران وارباب بست و کشادانِ ندوہ سے کیا۔ مجلس ندوۃ العلما سے الگ ہونے کے بعد ابتداً ذمہ دارانِ ندوہ سے ان کے مفاسدِ دینی پر بڑی نرمی و ملائمت سے گفتگو کی گئی۔ کافی دل سوزی سے افہام وتفہیم کی کوشش بلیغ کی گئی انزلو الناس علی منازلهم کے پیش نظر اصحاب ندوہ میں جو قابلِ ذکر شخصیات ورجال تھے، ان کے علمی مقام ومرتبے اور عرفی حیثیتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے مخلصانہ، عاجزانہ گزارش اور التجاے پیہم نیز ان سے دین وسُنّیت پر رحم کرنے اور مفاسدِ ندوہ پر نظر ثانی کرنے اور ان سے توبہ ورجوع کی تمام تر کوششوں اور اتمامِ حجت کی ہر منزل سے گزرنے کے بعد جب یہ یقین کامل ہو گیا کہ اہلِ ندوہ لایعودون کی منزل میں داخل ہو کر ختم الله علی قلوبهم کے مصداق ہو گئے ہیں پھر مسلمانوں کو ان کی گمرہی، بے دینی وغارت گری سے بچانے کے لیے پوری تب وتابِ جاودانہ کے ساتھ میدان میں اُترے اور پھر اس وقت تک چین وسکون سے نہیں بیٹھے، جب تک اُسے فنا کے گھاٹ نہیں پہنچا دیا اور اس فتنۂ عظیمہ سے مسلمانوں کو نجات نہیں دلا دی۔

جزاک اللہ چشم باز کردی = مرا باجان جاں ہمراز کردی

پس کروڑہا کروڑ رحمتیں نازل ہوں اے امیر کارواں تمہاری اور تمہارے ان عظیم المرتبت وجلیل القدر رفقا، محبّین، خلفا وتلامذہ کی ارواحِ طیبہ پر جنھوں نے پوری پامردی واستقامت کے ساتھ تمہارا دست وبازو بن کر اللہ کے مقدس دین اسلام کو باطل کی آمیزش سے محفوظ کیا اور دین وسُنّیت کے روشن وبے غبار چہرے کو غبار آلود نہیں ہونے دیا۔ ورنہ خدانخواستہ بہائیت، بابیت اور مہدویت کو بھی جگہ دینی پڑتی کہ ان کا بھی کلمہ وقبلہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے اور کلا اله الا الله محمد رسول الله ﷺ اور قبلہ نماز کی بنیاد پر مسلمانوں کے دینی بھائی ٹھہرتے اور یہ اتنی بڑی سازش اور ایک زبردست کید روافض تھا۔ مگر قربان جائیے حضور تاج الفحول اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی فراستِ ایمانی پر کہ اسلام دشمنوں کی اتنی دور سے چلنے والی چال اور اسلام کے خلاف اس بھیانک سازش کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اس کے خلاف میدانِ عمل میں اُتر پڑے اتقو فراسة المؤمن انما ینظر بنور الله. مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ؎

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

یہ انھیں نفوسِ قدسیہ اور بندگانِ بے ریا کی کوششوں اور ان کی عزیمت واستقامت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی کی جلوہ سامانی ہے کہ آج لاکھوں قادیانی اپنے کلمہ، درود، قبلہ وکعبہ وقرآن کے باوجود دائرۂ اسلام سے باہر ہیں۔ اُن پر حج وغیرہ بند،

حدودِ حرم میں ان کا داخلہ غیر مسلموں ہی کی طرح ممنوع، صرف مذہبی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ سرکاری سطح پر وہ پورے عالمِ اسلام میں غیر مسلم ہی ہیں۔ ان کے نماز، روزہ، کلمہ، درود، قبلہ و کعبہ، قرآن الغرض ان کا کوئی حوالہ قابلِ قبول نہیں۔ اور ان کا کوئی قدرِ مشترک محلِ نظر! یوں ہی بابی، بہائی، مہدوی اپنے کفر و طغیان میں قادیانیوں سے قدرِ مشترک رکھتے ہیں۔ جان توڑ کر مسلمانوں میں شامل و داخل ہونے کی ان کی ہر کوشش ناکام، نامراد و مردود۔ اور ان کا ہر قدرِ مشترک ناقابلِ قبول۔ وہ مسلمانوں کا سا نام رکھنے، کلمۂ طیبہ پڑھنے، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، تلاوتِ قرآن کے باوجود ختمِ نبوت کے معنیٔ متواترہ و عقیدۂ حقہ کے انکار کے سبب کافر و مرتد و بے دین ہیں۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے اُن کا ہر استدلال باطل اور ہر دعویٰ کاذب اور ہر دلیل جھوٹی۔

قادیانیوں، بہائیوں، بابیوں، مہدویوں کے تعلق سے حضور صدر الافاضل فخر الاماثل سید المفسرین امام الہند حضرت علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہ العزیز کے علمی خزانۂ عامرہ سے چند حقایق اختصار کے ساتھ پیش ہیں، تاکہ ندوہ کے خلاف علمائے حق کی بے چینیوں کا پس منظر سمجھنے میں آسانی ہو۔

حضور صدر الافاضل ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں:

”قادیانی مرزا (غلام احمد قادیانی) کی نبوت کا قائل، ختمِ نبوت کے معنیٔ متواترہ کے منکر ہونے کے سبب کافر ہے۔ اب وہ بہائی ہو گیا تو بہائی ہونے کے سبب اُس کا کفر اُٹھ نہیں گیا، جب تک کہ وہ اپنے کفر سے توبہ نہ کرے اور ختمِ نبوت کے معنیٔ متواترہ کو تسلیم نہ کرے۔ حضور ﷺ نبوت کے بعد کسی نئے نبی کے آنے کے خیال سے تائب نہ ہو۔ اور تمام کفریات سے بیزاری کا اظہار کر کے نئے سرے سے اسلام نہ لائے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ بہائی ہو جانا اس کو کفر سے پاک نہیں کر سکتا بلکہ وہ اب بھی گندے کفر میں مبتلا ہے۔ مرزا (غلام احمد قادیانی) نے جس قسم کا دین ایجاد کیا اور ضلالت کی جو راہیں اختیار کیں وہ سب اس کی طبع زاد نہیں ہیں، (بلکہ) اس نے اپنے زمانے کے قبل کے بے دینوں، دجالوں سے بہت کچھ اخذ کیا اور ان سب کا پس خوردہ جمع کر کے ایک دوکان لگائی۔ انھیں میں سے بہائی فرقہ بھی ہے۔ تو قادیانی سے بہائی ہو جانا ایک ہی سلسلے کے کفریات میں گشت لگانا ہے۔ ان سبھی دجالوں کی مکاریاں ختمِ نبوت کے معنیٔ متواترہ کے انکار کو اپنا اصول بنانے سے چلتی ہیں۔ ۸۴۵ھ میں جون پور (یوپی) میں سیّد محمد نام کا ایک شخص پیدا ہوا، جس کے باپ کے نام سیّد خاں تھا اور ماں کا بی بی آقا ملک۔ اس شخص نے اپنے ماں باپ کا نام بدل کر حضور سید کونین ﷺ کے والدین کریمین کے نام پر اپنے باپ کا نام عبد اللہ اور ماں کا آمنہ رکھا اور خود کو مہدی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جب اس کے ماں باپ کے جاننے والوں نے اعتراض کیا تو اس نابکار نے حضور پاک ﷺ کے والد ماجد کا نام عبد اللہ ہونے سے انکار کیا اور یہ مکر گڑھا کہ حضور ﷺ کا اسم گرامی محمد عبد اللہ ہے ابن کا لفظ راویوں کی غلطی سے زاید ہو گیا، **لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم**۔ اس شخص کے معتقدین اس کی مہدویت کی تصدیق کو فرض اور اس کا انکار کفر جانتے تھے۔ جس

طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے معتقدین اس کے گھر والوں پر ''اہلِ بیت'' اور اس کی بیوی کو اُم المومنین کہکر کاشانۂ نبوت ﷺ نقل اُتارتے ہیں۔ اس سے قبل میر سیّد محمد جونپوری کے یہاں خلفاے راشدین پانچ، صدیق دو ۲، مبشر بالجنۃ بارہ ۱۲، اور چوہتر ۷۴ فرقے تھے۔ اس نے بھی اپنے یہاں جنگِ بدر، فاطمہ حسین سب تھے۔ (معاذ اللہ) فرقۂ مہدویہ کے لوگ اپنے گرو میر سیّد محمد کو خلفاے راشدین (بلکہ) تمام انبیا و مرسلین سے افضل اور مقام و مرتبے میں حضور ﷺ کے ہمسر مانتے اور اسے حضور پاک ﷺ کے برابر ٹھہراتے تھے اور اس کو مفترض الطاعۃ سمجھتے تھے۔ شریعتِ طاہرہ کے احکام کا ناسخ اور اسے صاحبِ شریعت جدید مانتے تھے اور اس پر وحی آنے کے معتقد بھی تھے۔ اس کے رسالہ ''ام العقائد'' کے مطابق اس کی وحی کچھ یوں ہے قال الامام المھدی ﷺ علمت من اللہ بالواسطۃ جدید الیوم قل انی تابع محمد رسول اللہ محمد مھدی الزمان وارث نبی الرحمن عالم علم الکتاب والایمان مبین الحقیقۃ والشریفۃ والرضوان۔

اس وحی شیطان کی زبان و مضمون بھی قابلِ دید ہے۔ یہ شخص بلاواسطہ اللہ سے اخذ علوم کا مدعی تھا۔ ہند میں بھی وحی کا دعویٰ کرتا تھا اور نئے نئے احکام کا نزول بتاتا تھا۔ زکوٰۃ میں بھی بہت قطع و برید کی تھی اس کے عقائد فاسدہ و مکاید کاسدہ کہاں تک بیان کیے جائیں۔ علماے عرب و عجم و فضلاے مکہ و مکرمہ نے ان لوگوں کے تعلق سے کفر و قتل کے فتوے دیئے اور شاہانِ اسلام نے انھیں سزائیں دیں اور ہلاک کر دیا۔ پھر اس قسم کا کفر ایران سے پیدا ہوا۔ ۱۸۱۹ء میں شیراز ایران میں ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام مرزا علی محمد تھا۔ اس کو باب کہا گیا۔ اس کے معتقدین اور اس پر ایمان لانے والے بابی کہلاتے ہیں۔ یہ شخص یعنی مرزا علی محمد باب بھی مہدی ہونے کا مدعی تھا۔ خود کو مثلِ یحییٰ علیہ السلام اور ایک دوسرے شخص کو جس کا لقب اس نے خود من یظھر اللہ جل ذکرہ رکھا تھا، اس کو مثلِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتا تھا۔ چنانچہ بہاء اللہ کی تعلیمات کے صفحہ ۷ پر مرزا علی محمد باب کا یہ قول موجود ہے کہ میں یحییٰ ہوں۔ مرزا علی محمد باب نے پیغمبری کا بھی دعویٰ کیا اور اس نے اپنی علیحدہ شریعت بنائی تھی۔ بہاء اللہ کی تعلیمات میں اس کا یہ قول موجود ہے: ''مَیں نے جو شریعت لکھی ہے اس پر عمل کرنے کا حکم تم کو اسی وقت ملے گا جب کہ من یظھر اللہ ظاہر ہوگا اور شریعت میں جس بات کو وہ پسند کرے گا، اس پر عمل کرنے کا حکم دے گا اور جس کو وہ ناپسند کرے گا اس کو تم مت کرنا۔''

چنانچہ طہران میں سب سے پہلے مرزا حسین علی نامی شخص اس پر ایمان لایا۔ مرزا علی محمد باب نے اس کو بہاء اللہ کا لقب دیا۔ مرزا حسین علی عرف بہاء اللہ نے دعویٰ کیا و من یظھر اللہ ہے جس کی علی محمد باب نے بشارت دی ہے اور جس کی راہ میں انھوں نے جان فدا کی وہ مَیں ہی ہوں۔ من یظھر اللہ میرا ہی لقب ہے۔ اس پر ایمان لانے والے بہائی کہلائے۔ وہ خبیث بھی خدا کی طرف سے بالواسطہ علم ملنے اور مبعوث من اللہ کا مدعی تھا۔ اس نے اپنی نبوت کا سکّہ جمانے کے لیے ختمِ نبوت کا انکار کیا۔ اس نے احکامِ شرع کو بھی درہم برہم کیا اور شریعت میں نئی نئی راہیں نکالیں۔ اس نے نکاح و طلاق

کے مسئلے میں بھی بے ہودہ گوئی کی اور گانے بجانے کو بھی حلال کیا، تقیہ اس گروہ کے دستور کا ایک حصہ ہے۔

اتنے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور بہاء اللہ ختمِ نبوت کے معنیٰ متواترہ کے انکار میں شریک ہیں۔ رسالت و وحی کے دعوے میں شریک ہیں۔ مثلِ مسیح کے دعوے اور تبدیلی احکامِ شرع میں بھی دونوں شریک ہیں۔ دونوں کے دونوں کافر ہو گئے۔ بہاء اللہ خود بھی رسول بنتا ہے اور اپنے اوپر وحی آنے، بے واسطہ اللہ سے علم پانے کا مدعی ہے اور مرزا علی محمد باب کو بھی پیغمبر مانتا ہے۔ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کرتا ہے۔ خود وہ کتنے کفروں میں مبتلا ہوا اور اپنے متبعین کو بھی کیا۔"

یقیناً اس کے متبعین اور اس کی تصدیق کرنے والے سب کافر و مرتد اور خارج از اسلام ہیں۔ یہ قادیانیت، بہائیت، بابیت اور مہدویت کے تعلق سے حضور صدر الافاضل سید المفسرین حضرت علامہ مفتی سید شاہ نعیم الدین مراد آبادی کے ارشادات کا خلاصہ و نچوڑ ہے، جو فتاویٰ صدر الافاضل کے صفحات ایک سو گیارہ تا ایک سو سولہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ جسے ادارہ افکارِ صدر الافاضل نے شائع کیا ہے۔

اسلام کے نام پر ان خارج از اسلام فرقوں اور ان ائمۂ تلبیس کے اجمالی تذکرے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ تحریکِ ندوہ کا ردّ و استیصال اتنا کیوں ضروری تھا؟ اور حضور تاج الفحول بدایونی اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی اور اس دور کے جلیل القدر علمائے اہلِ سُنّت اس فتنے کی سرکوبی کے لیے اتنے بے چین کیوں تھے؟ اس کے پامال کے لیے اتنی بے دریغ قربانیاں کیوں دیں؟ اس راہِ عزیمت و استقامت میں ہمہ وقت تازہ دم کیوں رہے؟ اپنی دیگر اہم ترین دینی و ملّی ذمہ داریوں کی تکمیل کے درمیان اسے ترجیح کیوں دی؟ . . کل ندوہ کے اس سیلابِ بلا پر اگر مضبوط باندھ نہ باندھا گیا ہوتا اور اسلام کے آہنی حصار میں اپنے مذموم مقاصد کے پیشِ نظر نقب لگانے میں یہ کامیاب ہو جاتے تو کیا آج حکومتِ پاکستان قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے پاتی؟ کیا ان پر حج وغیرہ بند ہو سکتا تھا؟ کیا قادیانی کی حیثیت سے حدودِ حرم میں داخلے سے انھیں روکا جا سکتا تھا؟ عالمی سطح پر قادیانیوں کی دعوت و تبلیغ اور جگہ جگہ کیا ان کے مراکز سے انکار کیا جا سکتا ہے؟ آج بھی برصغیر سے باہر داعیانِ اسلام اور مبلغینِ اہلِ سُنّت کو جگہ جگہ ان سے بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب کہ ان کے ہاتھوں میں بھی وہی قرآن، وہی کلمہ اور قبلہ ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ان کا تسبیح و مصلّی، ان کا قبلہ و کعبہ، ان کا کلمہ و قرآن نہ آج کام آ رہا ہے اور نہ کل کام آئے گا۔ اور ان کے لیے لاملئن جھنم تو وعدۂ ازل ہے ہی۔

لاملئن جھنم تھا وعدہ ازلی عبث نہ منکروں کو بد عقیدہ ہونا تھا

بے شک اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت مولانا شاہ احمد رضا قادری سُنّی حنفی محمدی کا عزم و استقلال، تصلّب فی الدین، اخلاص وللّٰہیت، فراستِ مومن، غیرتِ عشق اور جرأتِ مومنانہ نے برصغیر ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر فتنے کا سدّ باب کیا۔ فتنہ خواہ سیاسی نوعیت لیے ہوئے ہو یا مذہبی، تحریکِ ہجرت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ترکِ گاؤکشی وغیر

میں ان کی فراستِ ایمانی کا سورج اپنے نصف النہار پر نظر آتا ہے۔ جسے دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ

اک دانشِ نورانی اک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

آپ کے پیش نظر ایک مقدس نصب العین الحبّ فی الله والبغض فی الله یعنی اللہ کے لیے دوستی اللہ کے لیے دشمنی۔ یہی پوری زندگی کا محور تھا، یہی ان کا مقدس نصب العین اور یہی معیارِ حق و باطل۔اشداء علی الکفار ورحماء بینهم کا محسوس پیکر۔اس کے لیے نہ کسی ستایش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ۔

من لذت درد تو بداماں نہ فردشم
کفر سر زلف تو بایماں نہ فردشم

آپ کا اخلاص فی الدین، اخلاص فی العمل مسلمانوں کے دین، ایمان کی حفاظت اور ان کے صلاح وفلاح کا جذبۂ بے کراں ہر شے سے بالاتر تھا۔ اللہ و رسول جل وعلیٰ وصلی المولیٰ تعالیٰ کی بارگاہ میں آپ کے حزم واحتیاط کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بارگاہِ رسالت سے آپ کی شدید وابستگی اور غیرتِ عشق کی دھوم تو فرش سے عرش تک مچی ہوئی تھی اور ان کی سوزشِ عشق کا شہرہ تو ہر سو تھا ؎

جلی جلی بُو سے اس کی پیدا ہے سوزشِ عشق چشم والا
کبابِ آہو میں بھی نہ پایا مزہ جو دل کے کباب میں ہے
کروں تیرے پہ جاں فدا نہ بس ایک جاں دو جہا فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا کروں کیا کروروں جہاں نہیں

اس لیے جب اسلام اور دین وسُنّیت کے خلاف کوئی اور فتنہ رونما ہوتا، خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی تو اس کی سرکوبی کے لیے فوراً کمر بستہ ہو جاتے اور یہ آپ کے اخلاصِ بے پایاں اور حسنِ نیت کے برکات وثمرات ہی تھے کہ آپ کے جلیل القدر تلامذہ وخلفا کی بات ہی کیا، اہم ترین دینی وعلمی وروحانی شخصیات ورجال جو اعاظم رجال ومعاصرین زمانہ تھے، وہ تمام حضرات اس فتنے کو کچلنے کے لیے آپ کے دست و بازو اور ہراول دستہ بن جاتے۔ ان کے عشق واخلاص اور وفا کی خوشبو سے اپنی اپنی مشامِ جاں کو معطر کر کے من انصاری الی الله کا عملی جواب ہو جاتے ؎

دستک میں کوئی درد کی خوشبو ضرور تھی
دروازہ کھولنے کے لیے گھر کا گھر اُٹھا

اس لیے اعلیٰ حضرت کے عہد میں فتنہ سازوں کو کسی فتنے سازی سے پہلے اس کو بار بار سوچنا پڑتا تھا کہ امام احمد رضا بریلوی کی نگاہِ غضب اور ان کے احتساب سے بچنے کی صورت کیا ہوگی؟ اہلِ فتنہ ہندستان میں رونما ہونے والے تمام

مذہبی، سیاسی اور قومی فتنوں کا حشر دیکھ چکے تھے کہ وہ احمد رضا کے حوصلوں سے ٹکرا کر کیسے بے دم ہوئے۔

یہ رضا کے نیزے کی مار ہے کہ عدو کے سینے میں غار ہے
کسے چارہ جوئی کا وار ہے کہ وار وار سے پار ہے

۱۳۱۸ھ میں اعلیٰ حضرت نے عربی زبان میں ایک سو ستّر اشعار پر مشتمل ایک طویل قصید لکھا جو پٹنہ میں منعقدہ تین روزہ تاریخی اجلاس جو مجلس ندوۃ العلما کی اصلاح کے لیے تھا، جس میں پانچ سو علما و مشائخ و ارباب فضل و کمال نے شرکت فرمائی۔ اس عظیم تاریخی اجلاس کی اہمیت مزید فزوں تر ہوگئی کہ اعلیٰ حضرت نے خصوصی شرکت فرمائی اور اس میں اپنا تاریخی قصیدہ ''آمال الابرار و آلام الاشرار'' پیش کیا۔ جس میں علما و مشائخ اہلِ سُنّت کا تعارف پیش کرتے ہوئے سرفہرست اپنے ممدوح کریم حضور تاج الفحول محب الرسول حضرت علامہ شاہ عبدالقادر بدایونی کا ذکر رکھا۔ اس عظیم و تاریخی اجلاس میں حضور تاج الفحول بن سیف اللہ المسلول حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کے فرزند اکبر و جانشین حضرت علامہ شاہ عبدالمقتدر بدایونی علیہ الرحمہ نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے لیے چودھویں صدی کے مجدّد کا اعلان فرمایا، جس کی تائید و توثیق اسی اجلاس میں پانچ سو علمائے اہلِ سُنّت و مشائخ کرام نے فرمائی۔ جس کے بجا طور پر آپ مستحق تھے۔

تیری شمع حق نما میں ہے وہ زور آزمائی
کہ ہزار آندھیوں میں نہ بجھی نہ جھلملائی

کتنی عجیب بات ہی نہیں بلکہ مقامِ حیرت ہے کہ آپ کے تمام روشن و تجدیدی کارناموں میں جو کارنامہ سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہو، جس کی انجام دہی کے دوران آپ کے سر زیبا کو تاجِ مجدّدیت پہنایا گیا۔ وہ تاجِ کرامت جس کے لیے مبعوث کا اطلاق ہو، جس منصبِ جلیلہ کے لیے حدیث پاک کے الفاظ یہ ہوں ان اللہ یبعث علی راس کل مأتہ الخ۔ وہی کارنامہ (یعنی تحریکِ ندوہ کے خلاف آپ کا جہاد بالقلم واللسان! اور اس کے خلاف آپ کے کلکے نامے) اہلِ تحقیق و تبصرہ کے لیے قابلِ اعتنا ہی نہیں اور نہ ہی ایسا بڑا و قابلِ ذکر کارنامہ جس کے لیے ریسرچ اور تحقیق کے گھوڑے دوڑے جائیں اور اسے بھی قابلِ توجہ سمجھا جائے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے
ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے

اس وقت ہر چہار سو ملک و بیرون ملک کی بہت ساری یونی ورسٹیوں و جدید دانش کدوں کے دروازے درجنوں کے حساب سے کھلے ہوئے ہیں، جن میں آپ کی حیات و خدماتِ علمی و دینی پر اہلِ تذکرہ و تحقیق سرگرم عمل ہیں۔ محققین اور اسکالرس کا کارواں در کارواں آپ کی حیات کے کسی نہ کسی گوشے پر کوئی نہ کوئی تمغۂ امتیاز پی ایچ ڈی، ایم ایڈ، ایم فل، ڈی لٹ وغیرہ کی شکل آئے دن حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس تعلق سے اربابِ تحقیق کی ایک طویل فہرست سکونِ قلب و نظر و باعثِ

فرحت ومسرّت بنی ہوئی ہے۔ حد یہ کہ آپ کے مطبوع وغیر مطبوع خطوط کو کتابی شکل میں جمع کر دینا بھی ایک بڑا علمی کارنامہ سمجھا جانے لگا ہے اور اس پر پی ایچ ڈی کی شکل میں جو تمغۂ امتیاز ہے، اس پر تذکرہ وتبصرہ بہر سو خوب ہے۔ مگر ہائے رے گردشِ ایام کی بے مہری! آپ کی حیات کے جس رخ پر اعزازات وتمغات کے ڈھیر ہونا چاہیے، اُس رخ پر اس قدر پُر اسرار سکوت اور ایسا جاں گسل سناٹا ۔

جو بات معتبر تھی وہ سر سے گذر گئی
جو حرف سرسری تھا وہ دل میں اتر گیا

میرے سامنے اس وقت پوکھریرا، بہار کا پیغامِ رضا کا خصوصی شمارہ بابت مارچ ۲۰۰۷ء ہے۔ جس میں صاحبزادہ حضرت مولانا سید وجاہت رسول قادری، ایڈیٹر معارفِ رضا کراچی کا ایک مقالہ بعنوان ''امام احمد رضا اور انٹرنیشنل جامعات'' شاملِ اشاعت ہے، جس میں ۳۳ر یونی ورسیٹیوں وجامعات کے ناموں کی ایک فہرست ہے جہاں امام احمد رضا کی حیات وخدمات کے حوالے سے تحقیقی مقالات لکھے جاچکے ہیں یا پی ایچ ڈی کی جاچکی ہے۔ جو گزشتہ ۲۵ رسالوں میں اعلیٰ حضرت کی حیات وخدمات پر تحقیقاتی وتصنیفاتی پیش رفت کی ایک اجمالی رپورٹ ہے۔ اسی خصوصی شمارہ میں سالنامہ ''معارفِ رضا'' کراچی کے حوالے سے ۱۱ رصفحات پر ایک طویل فہرست ہے جس میں اعلیٰ حضرت پر تحقیق کرنے والے ریسرچ اسکالرز کے نام، موضوع، نگران کے نام، یونی ورسٹی کا نام، پتہ پھر اسکالر کا مکمل پتہ الغرض ایک تفصیلی رپورٹ ہے، جسے بڑی محنت سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس فہرست میں اعلیٰ حضرت پر پی ایچ ڈی، ایم فل، ایم ایڈ، ڈی لٹ کرنے والے سب شامل ہیں۔ مگر وہ طویل فہرست جو بڑے سائز پر باریک قلم سے ۱۱ رصفحات پر مشتمل ہے اس میں بھی یہ عنوان نظر نہیں آیا، بار بار خوردبین والا چشمہ لگا کر دیکھنے کے باوجود۔

کتنی حیرت وافسوس کی بات ہے کہ تحریکِ ندوۃ العلما کے خلاف آپ کا یہ کارنامہ تمام دینی کارناموں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ دینی ایمانی کارنامہ ہے جس کی تکمیل کے درمیان برصغیر ہند کی عظیم ترین دینی شخصیت اور سیکڑوں اعاظم رجال نے آپ کے سرزیبا پر تاجِ مجددیت رکھا تھا مگر اہلِ تحقیق واسکالرز اسی کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ آخر ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے لائن میں کھڑے ہونے والوں کو بھی آپ کی حیات کا یہ تابناک پہلو نظر نہیں آرہا ہے۔ درجنوں کی تعداد میں پی ایچ ڈی کر کے تمغۂ امتیاز جو حاصل کر چکے انھیں بھی یہ عنوان نظر نہیں آیا۔ آخر اہلِ تحقیق اس موضوع سے کتراکیوں رہے ہیں؟ اس عظیم موضوع پر کوئی تحقیقی وتفصیلی گفتگو کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ اس سے دامن کیوں بچایا جارہا ہے؟

ضرور کوئی کمی ہے جو اے دلِ بے تاب　　　حدیث شوق انھیں ناگوار گذری ہے

میں پورے درد واخلاص کے ساتھ محققین، ناقدین، اربابِ دین ودانش اور اصحابِ قلم سے اپیل کرتا ہوں کہ آپ حضرات اعلیٰ حضرت امام اہلِ سُنّت مجدّدِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی کے اس عظیم کارنامے کو اپنی تحقیقات کا

عنوان ضرور بنائیں۔ خدانخواستہ کسی وجہ یا عصبیت کے سبب یونی ورسٹیوں میں تحقیق کے لیے یہ عنوان نہ مل سکے تو بھی ہمت نہیں ہارنا ہے۔ پورے صغیر میں پھیلے ہوئے ہمارے یہ بڑے بڑے دینی ادارے وعربی دانش کدے، یونی ورسٹیز کی سطح پر اس نوعیت کے اور بھی بہت سارے عنوان کے لیے چیئر کھولیں اور یونی ورسٹی سطح کے مساوی نوعیت کا تمغۂ امتیاز دیں اور اس پر اخراجات کے لیے مالی حوصلہ افزائی بھی کی جائے۔ تحقیقاتی ادارے اور اکیڈمیاں بھی اس خصوص میں اپنی توجہ مبذول کریں۔ نہ صرف اعلیٰ حضرت بلکہ ان کے علاوہ وہ سارے علمائے اعلام جو اپنے اپنے زمانے میں اعاظم رجال تھے۔ جنھوں نے دین وسُنّیت کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور اپنے وقت میں علم وفضل کے دریا بہائے ہیں۔ اُن کی حیات وخدمات، کارناموں پر ریسرچ کی جائے۔ آج نئی نسل حق سے بہت کم واقف ہے، وہ بھی ان کی حیاتِ طیبہ سے روشنی حاصل کرے۔ ہمارے دینی ادارے، دانش کدے اور جامعات کو اس طرف سنجیدگی کے ساتھ سوچنا اور اس پر عمل کرنا ہوگا۔ حضور صدر الافاضل، حضور صدر الشریعہ، حضرت حجۃ الاسلام، حضور مفتی اعظم ہند، حضرت پیر جماعت علی محدث علی پوری، حضرت علامہ سید دیدار علی، علامہ سیّد سعید احمد کاظمی، حضرت شاہ احمد نورانی، علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی، حضرت پیر کرم شاہ ازہری، حضرت علامہ فیض احمد اویسی، حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی، حضور حافظِ ملّت، حضرت مولانا خیر الدین دہلوی والد ماجد ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا ارشاد احمد مجدّدی رام پوری، حضرت علامہ عبدالحق بن علامہ فضل حق خیرآبادی، حضرت مولانا ہدایت رسول جونپوری، حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری، ملک العلما علامہ ظفر الدین بہاری، حضور مجاہد ملّت علامہ شاہ حبیب الرحمن قادری، حضرت عبدالسمیع صاحب انوارِ ساطعہ، صاحبِ تصانیفِ کثیرہ حکیم الامت حضرت علامہ مفتی احمد یار خان نعیمی، حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، حضرت مولانا ابوالنور محمد بشیر کوٹلوی وغیرہ وغیرہ یہ تمام کے تمام سوادِ اعظم اہلِ سُنّت وجماعت کے قیمتی سرمایے اور اپنے اپنے زمانے میں دین وسُنّیت کے محسنین میں سے تھے۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کا تقاضہ بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی کہ ان کی حیات وخدمات پر ریسرچ وتحقیق کی جائے اور ان کی خدماتِ دینی وملّی وعلمی سے روشناس کرایا جائے تا کہ موجودہ نسل کو اس کا احساس ہو کہ ہر زمانے میں سوادِ اعظم کا دامن گراں قدر شخصیات ورجال سے مالامال تھا۔

یہ ہے دامن یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر علیہ توکلت والیہ اُنیب۔

مأخذ و مراجع

۱ سب کے سب حنفی المذہب بلا کثر حکم الکل کے پیش نظر کہا گیا ورنہ جنوبی ہند مالابار (کیرالا) وغیرہ اور یہاں مہاراشٹرا کے علاقہ کوکن میں شافعی المذہب ہیں، جن کی تعداد حنفیوں کے مقابلے کم اقل قلیل، از: وارث جمال۔

۲ اس موضوع پر راقم الحروف (وارث جمال) نے ''کیا اسلام میں بریلوی کوئی فرقہ ہے؟'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن مزید حقایق اور حضور مفتیِ اعظم ہند علیہ الرحمہ کے قولِ فیصل کے ساتھ منظر عام پر آ رہا ہے۔

۳ آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی، ص

۴ ماہ نامہ مظہر حق: بدایوں کا تاج الفحول نمبر، ص ۴۸۵۔ ۴۸۷

۵ ماہ نامہ مظہر حق: بدایوں کا تاج الفحول نمبر، ص ۴۸۸

۶ ماہ نامہ مظہر حق: بدایوں کا تاج الفحول نمبر، ص ۹۲۔ ۶۹۱

۷ حضرت عبد الوہاب فرنگی محلی رئیس الاحرار حضرت مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی کے پیر و مرشد اور حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے والد گرامی۔

۸ اس وقت حضور تاج الفحول عمر کے آخری پڑاؤ میں داخل ہو چکے تھے جبکہ اعلیٰ حضرت اس وقت جوان تھے۔ حضور تاج الفحول کے عظیم دینی و علمی کارناموں و اخلاص فی الدین کے سبب اعلیٰ حضرت آپ کی بارگاہ میں بڑے مؤدب تھے اور ساتھ بہت زیادہ اخلاص رکھتے تھے اور ہمیشہ بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان کی عظمتوں کے معترف رہے اور آپ کی مدحت میں ہمیشہ رطب اللسان۔ اردو زبان میں طویل قصیدہ ''چراغ انس'' اور عربی زبان میں ایک طویل ترین قصیدہ ۱۷۰ اشعار پر مشتمل ''آمال الابرار و آلام الاشرار'' کے نام سے، جس میں سر فہرست حضور تاج الفحول کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کے علم و کلام کے موضوع پر ان کی عظیم عربی تصنیف ''المعتقد المنتقد'' پر ''المستند المعتمد'' کے نام پر جو تاریخی حاشیہ لکھا ہے، اس میں حضور تاج الفحول کی بارگاہ میں اپنی عقیدتوں کا وہ یوں خراج پیش فرماتے ہیں: **وقد اتدب للرد علیهم علماء اهل السنه من الاقطار الهندیه و کان مقعد جمهم ابن المصنف العلام محب الرسول تاج الفحول خاتم المحققین مولانا الشاه عبدالقادر البدایونی قدس سرها۔**

ہندستان کے اطراف و جوانب کے علمائے اہلِ سُنّت ان کا (یعنی اہلِ ندوہ) رَدّ کیا، جن کے مقتدا حضرت مصنف (علامہ فضل رسول) کے فرزند ارجمند محب رسول تاج الفحول خاتم المحققین مولانا شاہ عبد القادر بدایونی تھے۔

امام اہلِ سُنّت نے حضرت علامہ فضل رسول بدایونی کی دینی خدمات اور وہابیت کے خلاف ان کی قلمی معرکہ آرائیوں سے متاثر ہو کر عربی زبان میں دو طویل قصیدے ''مدائح فضلِ رسول'' و ''حمائدِ فضل رسول'' ۱۳/۳۱۳ اشعار پر مشتمل نظم فرمایا۔ حضور تاج الفحول کی ذات سے جو انھیں والہانہ وابستگی تھی ضمناً ان کے ذکر سے خود کو روک نہ سکے۔ فرماتے ہیں **ثمّ الدعاء فرجع غنیاً غانماً و اقصد سمی البغدادی العالم العلامه العلم الّذی ذکراه فاتحة** بکل اب دعا ختم ہوئی وہاں سے مالا مال واپس ہو اور سرکار بغداد کے ہم نام (یعنی حضرت عبد القادر بدایونی) کی بارگاہ میں حاضری دے جو عالم، علامہ اور بزمِ علما کے سردار ہیں، جن کی شہرت کی خوشبو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔

☑☑☑☑☑☑

الامام احمد رضا بين المدح والقدح

مولائ صلی وسلم دائمًا ابدًا　　علی حبیبك خیر خلق کلهم

عصرِ جدید کی قاموس المشاہیر اور شخصیات ورجال کے تذکرے کسی ایسی شخصیت سے اب تک آشنا ہی نہیں جس کی مدح وقدح، تعریف وتنقیص، توصیف وتعریض، تکریم وتوہین اور اس کے ہمہ جہت وجود کی نفی واثبات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی کی طرح کی گئی ہو۔ جہاں آپ کی خداداد عظمتوں کو خراجِ تحسین وعقیدت پیش کرنے والوں کی ایک طویل فہرست[1] ہے (اور فہرست بھی کیسی؟ عرب وعجم، حل وحرم کی بلند قامت، کوہِ پیکر ومشاہیرِ عالم شخصیتوں کی) وہیں آپ کی توہین وتنقیص بلکہ تذلیل اور آپ کی شانِ اقدس میں ہرزہ سرائی، بیہودہ گوئی اور آپ کی بے کراں وہمہ جہت وہمہ داں شخصیت کی نفی کرنے والوں کا بھی ایک طبقۂ خاص ہے۔ جس کی ریشہ دوانیوں، بیہودہ گوئیوں، ہرزہ سرائیوں کا سلسلہ بھی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں آپ کے قصیدہ خوانوں اور آپ کی عبقری وبے پناہ محترم ذات کو خراجِ تحسین وعقیدت پیش کرنے والوں اور آپ کی مدحت سراؤں کا ایک بڑا مبارک ومربوط سلسلہ ہے جو براعظم ایشیا، براعظم یورپ، براعظم امریکہ، براعظم افریقہ تک پھیلا ہوا ہے۔ وہیں آپ کے ہجوخواہوں، اذیت کوشوں اور کردار کشی کرنے والوں کا ایک مختصر مگر بڑا منظم طبقہ بھی ہے۔ جس نے پیٹروڈالر کے ذریعہ بڑی چابک دستی کے ساتھ آپ کی کردار کشی کی ایک تحریک چلا رکھی ہے۔ بے شک اصحابِ فضل وکمال وارباب فکروفن جہاں آپ کے شکوہِ علمی، فکر اسلامی، استقامت فی الدین اور حبِّ رسول پر انگشت بدنداں ہیں وہیں آپ کے حاسدین، مانعین، معاندین اور ظالمین نے بھی جرح وقدح، بہتان وافتراء، دجل وفریب، دروغ گوئی، مذمت واذیت کا کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہ رہنے دیا۔

الزام تراشی کی ضرورت نہ تھی لوگو!　　دینے کو سزا جرم محبّت ہی بہت ہے

اور یہ سلسلہ ان کے عہد ہی سے چل پڑا تھا۔ اور اسی وقت سے آپ کے وجود کی نفی اور آپ کو مسلم امہ سے الگ تھلگ کرنے کی جان توڑ کوشش کی گئی۔ جس کے لیے زبان وقلم اور ذرائع ابلاغ کا استعمال ناجائز طور پر بڑی بے دردی کے ساتھ ہوا۔ آپ کے مخالفین ومعاندین ابتدا ہی سے آپ کے خلاف کذب وافتراء ومن گھڑت الزامات کا جو سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس کے تعلق سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خود ہی فرماتے ہیں۔

"عوام مسلمین کو بھڑکانے اور دن دھاڑے ان پر اندھیری ڈالنے کو یہ چال چلتے ہیں کہ علماء اہلِ سنّت کے فتاویٰ تکفیر کا کیا

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے الدولۃ المکیہ عربی (اعلیٰ حضرت بریلوی) حسام الحرمین (اعلیٰ حضرت بریلوی) الاجازات المتینۃ لعلماء البکۃ والمدینۃ (مولانا حامد رضا خاں بریلوی) فاضل بریلوی علماء حجاز کی نظر میں (پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد) امام احمد رضا اربابِ علم ودانش کی نظر میں (مولانا یٰسین اختر مصباحی) انوار رضا۔ ناشر: ضیاء القرآن۔ معارف رضا۔ ادارہ تحقیقاتِ امام احمد رضا کراچی وغیرہ وغیرہ۔

اعتبار یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر کافر کہہ دیتے ہیں۔ ان کی مشین میں ہمیشہ کفر کے فتوے چھپا کرتے ہیں۔'' (حسام الحرمین)

اور پھر الزام لگا کر خاموش نہیں بیٹھے بلکہ ہٹلر کے دستِ راست گوئلز کے قول کو کہ ''ایک جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔'' دانتوں سے پکڑ لیا اور اسے بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ دہراتے رہے۔ اور جھوٹ وافتراء کے اس ڈھول کو اپنا فریضۂ منصبی سمجھ کر بڑی بے شرمی کے ساتھ نسلاً بعد نسلٍ بیٹھے رہے۔ ڈھولیں پھٹتی رہیں بنتی رہیں ہاتھ تھکتے رہے اور ٹوٹتے رہے اس کی جگہ فوراً تازہ دم نئے ہاتھ اور مہیّا ہوتے رہے اور اس خصوص میں ان کا ہر آدمی ناول نویس اور اخبار نویس سے لے کر شیخ وقت وشیخ الجامعہ، رئیس التحریر وحضرت العلام تک اس حمام میں بے لباس نظر آئے۔ یاللعجب امام احمد رضا کی دشمنی میں بے لباس ہونے والوں کو اپنی اپنی حیثیتیں یاد نہ رہ گئیں۔ عبدالرزاق ملیح آبادی کے ذکر آزاد ورئیس احمد جعفری کے آزادئ ہند سے لے کر مولانا عبدالحئی ومولانا ابوالحسن علی ندوی کہ نزہتہ الخواطر ہو یا الشہاب ثاقب ہو یا اشد العذاب یا ابھی حالیہ عربی تصنیف البریلویہ یہ سب امام احمد رضا بریلوی کے مخالفین ومعاندین کی وہ دستکاریاں ہیں کہ ان میں مکروفریب، کذب وافتراء، دروغ وبہتان کا سورج سوا نیزے پر دکھائی دے رہے ہیں۔

کانٹوں سے کہو ہوشیار رہیں نورانی وہ سب چہرے ہیں
پہلے پھولوں کو ڈستے ہیں پھر بادِ صبا بن جاتے ہیں

ایک طرف تو مخالفین ومعاندین تھے اور ہیں اور دوسری طرف حاسدین ومانعین تھے اور ہیں جو اپنے ہو کر بھی آنکھیں بچا کر کوئی نہ کوئی تیر چھوڑ دیتے ہیں جو معاندین ومخالفین واعداء دین کو نادانستگی میں وٹامن فراہم کرتے ہیں۔ یہ وہ چوٹ ہوتی ہے جو بڑی منفرد اور بڑی کسک لیے ہوتی ہے۔

ہم کو چمن کے کانٹوں سے کوئی گلہ نہیں
پھولوں نے کردیا مرے دامن کو تار تار

یہ جو اپنے ہیں، حسد نے جن کے نورِ بصیرت پر چادر ڈال رکھی ہے آؤ ان کے لیے امام احمد رضا کے طریقے ہی کو اپنائیں۔

اک طرف اعدائے دیں، ایک طرف ہیں حاسدین
بندہ ہے تنہا شہا تم پہ کروروں درود
کردو عدو کو تباہ، حاسدوں کو رُوبراہ
اہلِ ولا کا ہو بھلا تم پہ کروروں درود

اور جب ان کے عہد ہی میں آپ سے حسد وعناد نقطۂ عروج کی طرف بڑھنے لگا تو پھر اپنے آقا ومولیٰ حضور غوثیت کبریٰ جن کی حرمت وناموس کا دم وہ زندگی بھر بھرتے رہے۔

میری قسمت کی قسم کھائیں سگانِ بغداد
ہند میں رہ کے بھی دیتا رہوں پہرہ تیرا

ان کی بارگاہِ قدس میں وہ فریادی ہوئے اور اپنے زخمِ دل کے لیے اپنے سرکار کی خاکِ قدم کو مرہم بنالیا۔

خدارا مرہم خاکِ قدم دے — جگر زخمی ہے دل گھائل ہے یاغوث
عدو بددین مذہب والے حاسد — تو ہی تنہا کا زورِ دل ہے یاغوث
حسد سے ان کے سینے پاک کردے — کہ بدتر دق سے بھی یہ سل ہے یاغوث
دیا مجھ کو انہیں محروم چھوڑا — مرا کیا جرم حق فاصل ہے یاغوث
عطائیں مقتدر غفّار کی ہیں — فقط بندوں کے دل میں غل ہے یاغوث

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جہاں ان کے ثنا خوانوں کی فہرست میں اپنے بیگانے، عقیدہ ومسلک سے اختلاف رکھنے والوں کی بلند قامت شخصیتیں بڑی تعداد میں نظر آتی ہیں، وہیں بدخواہوں اور اذیت کوشوں میں بھی اپنے وبیگانے دونوں نظر آتے ہیں۔ اوپر کے استغاثے کا یہ شعر کہ۔

عدو بددین مذہب والے حاسد — تو ہی تنہا کا زورِ دل ہے یاغوث

اس حقیقت کی طرف مشیر ہے۔

برصغیر ہندوپاک سیاسی ونیم سیاسی بردہ فروشوں، مذہبی ونیم مذہبی سوداگروں ونیشنلسٹ دلالوں نے آپ کے خلاف کردارکشی بلکہ آپ کی ہمہ جہت وجود کی نفی کے لیے بڑی زبردست مہم چلائی۔ اور آپ کو تاریخ کی برگزیدہ شخصیتوں کی فہرست سے نکالنے کی بڑی کوششیں کی اور ایڑی چوٹی کا زور لگادیا کہ قاموس المشاہیر میں کوئی کہیں جگہ نہ مل سکے۔ مگر۔

کھلنا کہیں چھپا بھی ہے چاہت کے پھول کا — لی گھر میں سانس اور گلی تک مہک گئی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذات سے بغض وعناد، حسد وعداوت اور عشق وعقیدت، ادب واحترام اور آپ کے وجودِ بامسعود کی نفی واثبات کی ناکام وکامیاب کوششوں کا اصل محور کیا ہے؟ اس انداز میں آپ کی مدح وقدح، تعریف وتنقیص کیوں کی گئی ایک محیر العقول اور قدسی صفات ذات اتنی متنازعہ فیہ کیوں بنادی گئی؟ اور ایک ہمالیائی وجود کو حیرت انگیز طور پر کیوں نظرانداز کیا گیا؟

اس کے بظاہر تین اسباب ہیں۔

(۱) علمی فکری توانائیوں اور دینی وملّی اولوالعزمیوں کی جولان گاہ میں آپ کے بے مثل انفرادیت!

(۲) احقاقِ حق وابطالِ باطل میں امامت کبریٰ کا منصب بلند!

(۳) عشق رسول وحبِّ آلِ رسول میں آپ کی یکتائی وبے نظیری!

یہی وہ حقیقی مدار اور یہی وہ بنیادی اینٹیں ہیں جس پر اس عبقری الشرق اور امامِ عشق ومحبّت کی قصرِ عظمت تعمیر ہوئی۔ جس کے گرد اہلِ محبّت پروانوں کی طرح جمع ہوگئے۔ اور پورا سوادِ اعظم اور ان کا دل ودماغ آپ کے حضور خمیدہ سر ہوگیا۔ اور آج اکنافِ عالم میں ربع مسکوں پر شرق سے غرب تک حل وحرم تک نت نئے فتنوں کی آماجگاہ میں حق کی شناخت اور معیارِ

حق آپ کی ذات قرار پائی! اور یہی حقیقی اسباب ہیں آپ کی ذات سے عداوت وخشونت، حسد وطعن اور نفرت و بیزاری کا بھی۔

بے شک تعریف وتوصیف، مدح وثنا اور جرح وتنقید، توہین وتنقیص کے اصل محور یہی ہیں۔

لہٰذا آپ کی ذات سے بے پناہ احترام وعقیدت اور سوادِ اعظم کی شدید وابستگی کو اور ساتھ ہی آپ سے خشونت و عداوت، حسد وجلن اور نفرت وبیزاری کے اسباب کو اس پس منظر میں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حالات نگاہوں کے سامنے ہوں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی ذات سے سوادِ اعظم اہلسنّت وجماعت کے عوام وخواص کی شدید وابستگی و بے پناہ احترام وعقیدت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اپنی جبینِ عقیدت وہیں خم کرتا ہے، جس سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے اور انسان متاثر کسی حسن سے ہی ہوتا ہے۔ خواہ حسن داخلی ہو یا خارجی، ظاہری ہو یا باطنی۔ اس نظریے سے جب ہم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کو دیکھتے ہیں تو وہاں حسن ہی حسن نظر آتا ہے۔ ہر طرف حسن کی چاندنی چھٹکی نظر آتی ہے۔ اندر کا حسن، باہر کا حسن، ان کے علم وفضل کا حسن، ان کے اخلاص فی الدین کا حسن، ان کے ملّی تڑپ کا حسن، ان کے قومی درد کا حسن، ان کے عشقِ رسول کا حسن، ان کے حبِّ آلِ رسول کا حسن، ان کے فنا فی غوث الاعظم کا حسن، ان کے رُخِ زیبا کا جمال اور ان کا ذاتی فضل وکمال دیکھنے والی آنکھیں تو اب نہیں رہ گئی ہیں البتہ مفتیٔ اعظم مولانا مصطفےٰ رضا خاں کی شکل میں ان کے جمال وکمال کے آئینۂ تمثال کو دیکھنے والے تو ابھی لاکھوں کی تعداد میں باحیات ہیں۔ ہاں ہاں وہی آئینہ حسن وخوباں جو فضل وکمال، حسن وجمال، جاہ وجلال میں الولد سرّ لابیہ کا مظہر اتم تھا ع

وہ جدھر گذرے خدائی ساری اس کی ہوگئ!

دونوں شخصیتوں کو دیکھنے والی خوش بخت آنکھوں کا فیصلہ ہے کہ شہزادۂ اصغر یعنی حضور مفتیٔ اعظم ہند اپنے عظیم المرتبت والد گرامی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے ہم شکل تھے۔ جبکہ برادرِ اکبر حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خاں فضل وکمال میں اپنے والد ماجد اعلیٰ حضرت کے صحیح جانشین ہونے کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز حسن وجمال سے مالا مال تھے۔ انھیں دیکھنے والی آنکھوں کا بیان ہے کہ ان کا حسن وجمال کرامت کی منزل میں تھا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ لاہور کا مناظرہ جو مشہور گستاخِ رسول مولوی اشرف علی تھانوی اور ان کے حوارین کے ساتھ طے تھا۔ اس میں علماء اہلسنّت کی امامت وقیادت کرتے ہوئے جب آپ خود تشریف لائے، تو مولوی اشرف علی صاحب کو سامنے آنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ سامنا کرنے سے ہمیشہ گریز پا رہے۔ چنانچہ آپ نے اہلِ محبّت سے فرمایا کہ جاؤ مولوی اشرف علی سے کہہ دو کہ وہ آکر صرف مجھے دیکھ لیں، وہ ایمان لے آئیں گے کہ یہ کسی جھوٹے کا چہرہ نہیں ہوسکتا۔ مگر مولوی صاحب اس کی بھی ہمّت نہ کرسکے۔ گویا اعلیٰ حضرت کے فرزند اکبر اور ان کی عظمتوں کے وارث وجانشین حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں حسن وجمال کے ایسے آئینہ تھے کہ انہیں اولین نظر میں دیکھنے والے خود آئینۂ حیرت بن جاتے تھے۔

گل ہو مہتاب ہو، آئینہ ہو خورشید ہو میرؔ
اپنا محبوب وہی ہے جو ادا رکھتا ہے

یوں امام احمد رضا اپنے وجود میں ایک جہانِ حیرت تھے۔ اسی جہانِ حیرت کی ایک جھلک دیکھ کر ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو کہنا پڑا کہ سُنا کرتا تھا کہ علمِ لدنی کوئی چیز ہے آج آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اور اگر ان تمام اوصاف و کمالات سے صرفِ نظر بھی کرلیا جائے تو ان سے محبّت اور ان کی بارگاہ میں احترام و عقیدت کے لیے یہی وصف خاص بہت کافی ہے کہ وہ نہ صرف ایک عاشقِ رسول بلکہ فنافی الرسول تھے۔ جس کا برملا اعتراف ان کے معاندین ومخالفین کو بھی ہے اور ان کے حاسدین و مانعین کو بھی۔ ؎

جان ہے عشقِ مصطفےٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزہ نازِ دوا اُٹھائے کیوں
پیشِ نظر وہ نوبہار سجدے کو دل ہے بےقرار
روکیے سر کو روکیے ہاں یہی امتحان ہے

بریلی شریف جو ایک عالمگیر مرکز عقیدت و محبّت ہے اس کی حقیقی وجہ ہے کہ وہ مرکز حبّ رسول ہے۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر با و نہ رسیدی تمام بولہبی است

بریلی شریف جو سوادِ اعظم اہلسنّت و جماعت کا ایک عالمگیر مرکز عقیدت و محبّت ہے۔ وہ اعلیٰ حضرت کے وجودِ بامسعود کی بدولت کہ ان کی ذات ہی مرکز حبّ رسول تھی اور ان کا مسلک بھی حبّ رسول ہے۔ اور حق و باطل کے درمیان نشانِ امتیاز بھی آپ کی ذات ہے، عشق و عرفان کے ساتھ ساتھ ان فتنہ ہائے حشر کے ہجوم میں امام احمد رضا ایک کسوٹی اور پرکھ کے مترادف تھے۔

یہ جو سارے عالم میں بریلی کا غلغلہ، اس کا شہرہ، اس کا آوازہ گونج رہا تو کسی یونیورسٹی، جامعہ و دارالعلوم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ سارے عالم میں بریلی کی خوشبو جو پھیلی اس کا جو غلغلہ بلند ہوا وہ صرف اور صرف اعلیٰ حضرت امامِ عشق و محبّت سیّدنا امام احمد رضا بریلوی کے وجودِ مسعود کی برکتوں سے بےشک ان کے وجودِ حیرت میں بیک وقت بڑی بڑی یونیورسٹیاں، جامعات و دانشکدے گم تھے۔

سارے جہان میں بریلی کی گونج اور اس کی مشک بوئی صرف اعلیٰ حضرت کے علم و عرفان، عشق و وجدان کی بدولت ہے۔ ؎

ہے مجھ سے گریباں گل صبح معطّر
میں عطر نسیم چمنِ بادِ صبا ہوں

ان سے کروڑہا کروڑ لوگوں نے، ان کی بارگاہ میں عرب و عجم، حل و حرم کے علماء و مشائخ اور اربابِ فضل و کمال نے

احترام وعقیدت پیش کیا، کہ وہ خود ہی سراپا محبّت، سراپا ادب اور مجسّم احترام تھے۔ ان کے رگ و پے سے محبّت کے چشمے اُبلتے تھے۔ وہ سرتاپا عشق ہی عشق تھے۔ ان کا مسلک ہی محبت تھا۔ محبّتِ رسول! زندگی بھر اسی کے لیے جیے اور اسی پر چلے۔ اور اسی پر خاتمہ بالخیر بھی ہوا۔

کروں تیرے نام پہ جاں فدا نہ بس اک جہاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا کروں کیا کروروں جہاں نہیں

ان کا مسلک وہی حبّ رسول ہے جو آج مسلکِ اعلیٰ حضرت سے پہچانا جاتا ہے۔ جس پر مخالفین ومعاندین، منکرین و مانعین، حاسدین وظالمین نے جانے کیسے کیسے حاشیے چڑھائے اور چڑھاتے ہیں اور چڑھاتے رہیں گے۔ ان کے مسلکِ محبّت کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

دشمنِ احمد پہ شدّت کیجیے ملحدوں کی کیا مروت کیجیے
مثل فارس زلزلے ہو نجد میں ذکر آیاتِ ولادت کیجیے
غیظ میں جل جائیں بے دینوں کے دل یارسول اللہ کی کثرت کیجیے
کیجیے چرچہ انہیں کا صبح و شام جانِ کافر پر قیامت کیجیے
شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب اس بُرے مذہب پہ لعنت کیجیے
بیٹھتے بیٹھتے حضورِ پاک سے التجا و استعانت کیجیے
یارسول اللہ دہائی آپ کی گوشمال اہلِ بدعت کیجیے

ان کی محبت اور مسلک کا ایک رُخ یہ بھی ہے:

سَر سوئے روضہ جھکا پھر تجھ کو کیا دل تھا ساجد نجد یا پھر تجھ کو کیا
بیٹھتے اٹھتے مدد کے واسطے یارسول اللہ کہا پھر تجھ کو کیا
بےخودی میں سجدۂ در یا طواف جو کیا اچھا کیا پھر تجھ کو کیا
ان کو تملیک ملیک الملک سے مالک عالم کہا پھر تجھ کو کیا
ان کے نامِ پاک پر سب جان و مال نجد یا سب تجد یا پھر تجھ کو کیا
نجدی مرتا ہے کہ کیوں تعظیم کی یہ ہمارا دین تھا پھر تجھ کو کیا
دیو تم سے خوش ہے تو ہم کیا کریں ہم سے راضی ہے خدا پھر تجھ کو کیا

اہلسنّت وجماعت ہمیشہ چار طریقوں پر ہوتے چلے آئے ہیں۔ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، اہلسنّت کے چاروں راستے و طریقے برحق ہیں۔ امام احمد رضا مجتہدین کے تمام تر اوصاف کے باوجود وہ امام اعظم ابوحنیفہ کے ہی مقلد اور خود مذہب حنفیت کے ایک بڑے امام تھے۔ وہ سوادِ اعظم اہلسنّت و جماعت کے ایک عظیم مقتدیٰ امامِ اعظم ابوحنیفہ کے ایک بہت

بڑے مؤید ومقلد اور طریقت میں حضور سیّدنا غوث الاعظم کے طریقے پر سنّی مشرباً قادری تھے۔ اہلِ باطل نے جب بڑے بڑے القابات کے ساتھ حنفیت کی چادر اوڑھ کر مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہا، تو اسی حنفیت کی صیانت کے لیے اسے امام احمد رضا کی نسبت دینی پڑی۔ گویا کہ دوسرے لفظوں میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ جو حنفیت امام احمد رضا کے حوالے سے سامنے آئے وہی حق ہے، وہی مقبول ہے اور اسی کی اللہ کے نزدیک قرار واقعی حیثیت ہے۔ اور جو حنفیت دیوبند سے ہو کر آئے مردودِ بارگاہ و مردودِ خلائق ہے۔ کہ دیوبندیت خدا اور سول سے بغاوت کا دوسرا نام ہے۔ ؎

مومن وہ ہے جو ان کی عزت پہ مرے دل سے
تعظیم بھی کرتا ہے نجدی تو مرے دل سے

اور اب اہلِ حق کی اصطلاح میں اہلِ حنفیت پوری حفاظت و صیانت کے ساتھ مسلکِ اعلیٰ حضرت سے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔ لہٰذا اس دورِ فتن میں جب بھی مسلکِ اعلیٰ حضرت بولا جائے گا تو اس سے مراد مسلکِ امامِ اعظم ابوحنیفہ ہی ہوگا تا کہ وہ دیوبندیت کی آمیزش سے پاک و محفوظ رہے۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ امام احمد رضا مذہباً سنّی، مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری ہیں۔ اس کے علاوہ مسلکِ اعلیٰ حضرت پر کوئی اور حاشیہ مردود و نامقبول ہے۔ جو عناد و حسد کے شاخسانے کے سوا کچھ نہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہ تھی محبّت اور اہلِ محبّت کی باتیں۔ اب رہ گئیں امام احمد رضا سے عداوت و خشونت، حسد و جلن اور نفرت و بےزاری، ان کی کردار کشی اور ان کی شخصیت کی نفی کی باتیں اور مسلمانوں کو ان سے بہت دور کرنے کی سازشیں۔ اور اس کے لیے ان پر بے سروپا الزامات و بہتانات کہ ان کی کتابیں پڑھنا ناجائز و حرام، وہ مروجہ بدعات و رسومات کے مجوز علمبردار بلکہ موجود کتابوں کا علم و تحقیق سے کوئی علاقہ نہیں، ان کی تصنیفات میں صرف میلاد قیام، نذر و نیاز، فاتحہ چہلم عرس، گیارہویں، نداء یا، غیر اللہ پر اور حاضر و ناظر جیسے فروعی مسائل پر زور۔

وہ بہت سخت مزاج لڑاکو اور شدّت پسند تھے۔

انھوں نے ہندوستان میں کفر و فسق کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا۔

وہ ہر اصلاحی تقریر کے دشمن تھے۔

وہ مسلمانوں کو کافر کہنے میں بہت بے باک تھے اور بات بات پر کفر کے فتوے لگایا کرتے تھے۔

وہ رسول اللہ کے علم کو علمِ الٰہی کے برابر مانتے تھے۔

وہ دشمنی خصومت میں بہت ہی سخت اور اپنی ذات و اپنے علم پر بے جا غرور میں مبتلا تھے۔

تفسیر و حدیث میں معمولی علم رکھتے تھے۔

اورمسلمانوں کو یہ باور کرانے کی بھرپور اور منظم کوششیں کی گئیں کہ وہ مکفر المسلمین تھے۔ (العیاذ باللہ)
اور بریلی میں انہوں نے کفر کی سازشیں نصب کر رکھی تھیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اوران سارے معاملات کا جو سب سے بڑا المیہ ہے، وہ یہ کہ اس خصوص میں ایں قدر سے آں قدر تک سب کے سب بے ستر ہو گئے۔ یہ بازاری باتیں اور بے بنیاد الزامات و بہتانات اگر صرف سڑک چھاپ افسانہ و ناول نویس و اخباری کالم نگار و ڈرامہ نویس ہی تک ہوتی تو اس کے وہ اثرات ہی نہ مرتب ہوتے مگر امام احمد رضا کی دشمنی میں اندھے ہو کر بغیر کسی ہدف کے تیر چلانے والوں میں ایسے چہرے شامل ہیں جن کی حیثیت عرفی ایک مخصوص حلقے میں مسلّم ہے جو وقت کے شیخ الاسلام بھی کہلائے اور مفکر اسلام، مورخِ اسلام بھی۔ جن کی سنجیدگی و متانت و صلح جوئی و صلح کل کا ڈھنڈورا پیٹا گیا، اور اصحابِ قلم، اصحابِ تصنیف و تالیف اور اصحابِ زبان و بیان کی فہرست میں جنہیں جگہ دی گئیں۔ اور جنہیں قلم کے مزدور اور زبان و بیان کی روٹی کھانے والے بڑے فخر سے علامہ زمن، مفکر اسلام، شیخ الاسلام، مورخِ اسلام جیسے خطابات سے نوازتے رہے۔ مگر یہی لوگ امام احمد رضا پر جب زبان و قلم کو حرکت دینے پر آئے، تو دیانت، متانت، سنجیدگی، شائستگی، تہذیب و شرافت کا لباس اتار کر شارعِ عام پر بھری دوپہر میں ننگے ہو گئے۔ یہ سوچ اور اپنی حیثیت عرفی کا لحاظ کیے بغیر کہ جب ہمارے اس جھوٹے مکر بہتان، افتراء اور من گھڑت الزامات کا پردہ چاک ہوگا، تو ہم کہاں ہوں گے۔ امام احمد رضا کی دشمنی میں نہ تو احساسِ مذمت باقی رہ گیا اور نہ ہی پاسِ وقار۔

تالیاں پٹتی ہیں بازار میں تیرے پیچھے!
تجھ کو احساسِ مذمت ہے نہ کچھ پاسِ وقار

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے خلاف کردار کشی کرنے والوں نیشنلسٹوں، سیاسی بردہ فروشوں، قوم کے سوداگروں، اخبار ناول افسانہ و نامہ نگاروں کی صف میں شانہ سے شانہ ملائی ہوئی یہ شخصیتیں اور ان کے نام کیسے اور کتنے عجیب لگتے ہیں۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد ٹانڈوی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، مورخِ اسلام مولانا عبدالحئی حسنی، مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا احسان الٰہی ظہیر وغیرہ وغیرہ رہ گئے حال کے ایں قدر تو ان کا ذکر ہی کیا یہ اساطین امّت وہابیہ و دیابنہ ہیں جو محاسبۂ آخرت سے بے نیاز ہو کر اتنی نچلی سطح پر اُتر آئے! اور اس کے لیے ایک عالمگیر زبان جو کتاب و سنّت اور فقہ و تفسیر کی بھی زبان ہے یعنی عربی زبان کو بھی استعمال کیا، تا کہ اس زبان کے ذریعے عالمی سطح پر انہیں مذہبی دہشت گرد بنا کر پیش کیا جائے! ؎

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اعلیٰ حضرت کے خلاف محاذ بنانے والے سیاسی بردہ فروشوں، اقتدارِ وقت کے دلالوں، چڑھتے سورج کے پجاریوں اور ان کی کردار کشی کو پیشہ آبائے سپہ گری بنانے والوں کے ان اقدام کو اسی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ جیسا کہ اوپر میں نے ذکر کیا۔

یعنی احقاقِ حق و ابطالِ باطل میں امامتِ کبریٰ کا منصب بلند! وغیرہ وغیرہ۔ اس پس منظر سے آگاہ ہونے اور صحیح حالات کے ادراک کے لیے اس عہد کے حالات وواقعات کا جاننا بہت ضروری ہے۔قومی، مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حالات۔

اس وقت برصغیر ہندوپاک سیاسی، قومی، مذہبی فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

اعلیٰ حضرت کے عہد سے بہت پہلے ہی سیاسی فتنے مذہبی ٹائٹل لگا کر سر اُٹھا چکے تھے۔جس کی سرکوبی کے لیے شیرِ حق مجاہدِ حریت حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی علماء وفقہا، محدثین ومتکلمین کی ایک مقدس جماعت لے کر میدان میں اُتر چکے تھے۔مگر چونکہ وہ فتنے برطانوی استعمار کے سیاسی بطن سے تولد ہوئے تھے اس لیے حکومت برطانیہ کی عظیم قوت اسے توانائی فراہم کررہی تھی۔ان فتنوں کو مستقل زندگی دینے اور مسلمانوں کے شیرازے کو منتشر کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے شیرانِ حق کی اس مقدس جماعت کے اندر خوف وہراس پھیلا کر انھیں تتر بتر کردیا۔سب سے پہلے ان کے قائد وسالار کو قید بامشقّت میں ڈال کر جزیرۂ انڈمان (کالا پانی) بھیج دیا۔علامہ فضل حق خیرآبادی کے ایک رفیق کو طرح طرح کے ہراسمنٹ کے ذریعہ میدان سے ہٹادیا گیا، تاکہ وہ فتنے جڑ پکڑلیں، تاکہ ان سے انتشار بین المسلمین کا کام لیا جاسکے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے دور میں ہندوستان اس طرح کے فتنوں کا دنگل بن چکا تھا۔انہیں تمام فتنوں کی سرکوبی کے لیے مولیٰ عزوجل نے اسی اجلِ عظیم (امام احمد رضا) کا انتخاب فرمایا تھا۔چنانچہ آپ نے مولیٰ عزوجل کی دی ہوئی توفیق سے اس طرح کے تمام فتنوں کو استیصال فرمایا اوران کی مکمل سرکوبی فرمائی۔

تحریکِ مواخاتہ، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ہجرت، تحریکِ ترکِ گاؤکشی، تحریکِ خلافت، مسئلہ قومیت، تحریکِ ندوہ، تحریکِ وہابیت، تحریکِ نیچریت وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ سیاسی ونیم مذہبی فتنے تھے جو مغربی استعمار و ہندو سامراج کی خوفناک سازش کا نتیجہ تھے۔اور جس کی حقیقی قیادت اور باگ ڈور دشمن کے ہاتھ میں تھی۔امام احمد رضا کا سیاسی ومذہبی وقومی شعور وبالغ نظری اور سب سے بڑھ کر ان کی فراستِ مومن پوری طرح چاق وچوبند تھی۔وہ ایک عظیم دانائے راز تھے۔ان کی فراستِ مومن اپنے زمانے سے بہت آگے، زمان ومکان کی موٹی دیواروں اور دبیز پردوں کو چیر کر دیکھتی تھی۔

اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله۔فراستِ مومن سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ؎

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق اک دانائے راز آید بروں

پورے برصغیر کے مسلمان اس طرح کے حالات ومعاملات میں صرف بریلی شریف کی طرف دیکھتے تھے کہ اعلیٰ حضرت کی ذات دین وسنّیت وقوم وملّت کے عظیم محافظ کی حیثیت لیے ہوئے تھی۔آپ کا وجودِ با مسعود سیاسی بردہ بروشوں، اقتدارِ وقت کے دلالوں، (نیشنلسٹوں) نیم مذہبی، نیم سیاسی کاروباریوں کے راستے کی سب سے بڑی چٹان تھی جسے ہٹانا تو بڑی بات تھی، ہلا بھی نہیں سکتے تھے۔اور نہ انہیں کسی قیمت پر خریدا جاسکتا تھا کہ بہت پہلے سے مع اہل خانہ میں اب وجد بغداد شریف قطبِ ربانی محبوبِ سبحانی محی الدین جیلانی سیّدنا غوث الاعظم پیرانِ پیر دستگیر کی مقدس چوکھٹ پہ بک چکے

تھے۔اور اپنی نقدِ جاں ان کے قدموں میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے اپنے گلے میں اپنے آقا کی غلامی کا پٹہ ڈال لیا تھا۔اور اپنے اس غلامی پر زندگی بھر وہ مفتخر و نازاں تھے۔

تجھ سے در، در سے سگ اور سگ سے ہے مجھ کو نسبت | میری گردن میں بھی ہے دُور کا ڈورا تیرا
اس نشانی کے جو سگ ہیں نہیں مارے جاتے | حشر تک میرے گلے میں رہے پٹّہ تیرا
میری قسمت کی قسم کھائیں سگانِ بغداد | ہند میں رہ کے بھی دیتا رہوں پہرا تیرا
بدسہی، چور سہی، مجرم و ناکارہ سہی | اے وہ کیسا ہی سہی ہے تو کریما تیرا

جناح واقبال جب دوقومی نظریئے کی سرحد ادراک تک بھی نہ پہنچے تھے اس سے بہت پہلے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بسترِ علالت سے ''المحجۃ المؤتمنہ فی ایات الممتحنہ'' کے ذریعے مسلمانوں کو یہ پیغام دے چکے تھے کہ امّتِ رسول (ﷺ) مستقل ایک قوم ہے جس کا ابولہب کی قوم سے کوئی تعلق نہیں۔

اور یہ پیغام ہندوستان کے مسلمان اچھی طرح سے ذہن نشین کر کے دلوں کے نہاں خانوں میں محفوظ بھی کر چکے تھے۔

چنانچہ وقت آنے پر مسلمانوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ بے شک امّتِ رسول مستقل ایک قوم ہے۔ اعلیٰ حضرت سیّدنا امام احمد رضا کی دینی حمیت، قومی غیرت اور سیاسی بصیرت نے اقتدارِ وقت کے دلالوں، ملّتِ اسلامیہ کے سوداگروں کی تمام چالیں اُلٹ دیں۔ وہ اپنا ہی لہو چاٹتے رہ گئے۔ انہیں جب کچھ اور نہیں ملا تو آپ کے خلاف بہتان و افتراء، دجل و فریب، کذب و افترا کے پہاڑ کھڑا کرنا شروع کر دیئے۔

رہ گئی مذہبی فتنوں کی بات تو اس کی تفصیل بڑی دردناک ہے۔ دو جملوں میں! یہ تمام مذہبی فتنے سیاست ہی کی کوکھ سے نکلے ہوئے ہیں جو مغربی سامراج کی دین ہیں۔ آپ کے عہد میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی فتنہ خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو پنپ نہیں سکا۔ کلکِ رضا کے سامنے وہ بے دم ہو چکے تھے۔

کلکِ رضا ہے خنجر خونخوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شرّ کریں

برصغیر ہند ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ اسلام، صدرِ اسلام و مرکز اسلام مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ تک میں آپ کے علم و فضل اور عشق و اخلاص کی دھوم تھی۔ بقول حضرت صدر الافاضل مفسر قرآن علامہ سیّد نعیم الدین مرادآبادی:

''موجودہ صدی میں دنیا بھر کا ایک مفتی تھا۔ جس کی طرف تمام عالمِ اسلام کے حوادث و وقائع استفتاء کے لیے رجوع کیے جاتے تھے۔ ایک قلم تھا جو دنیا بھر کے فقہ کے فیصلے دے رہا تھا۔ وہیں تمام بدمذہبوں کے جواب بھی لکھتا تھا۔ اہلِ باطل کی تصانیف کا بالغ ردّ بھی کرتا تھا۔ اور زمانہ بھر کے سوالوں کا جواب بھی دیتا تھا۔''

یہی وجہ تھی کہ پورے برصغیر کا مسلمان اپنے مذہبی و دینی معاملات میں صرف بریلی شریف کی طرف دیکھتا تھا، جو وہاں سے فیصلہ ہو جاتا اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا۔ متحدہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے دلوں پر پورے ادب و احترام

کے ساتھ امام احمد رضا کا قبضہ تھا۔ اس لیے جدھر وہ رُخ کرتے ادھر ہی پورا برصغیر چل پڑتا۔ اعلیٰ حضرت کا ایک جنبشِ قلم ساری بساط اُلٹ دیتا تھا۔ اس صورتِ حال سے امام احمد رضا کے حریف بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ اور رات دن اسی سوچ وفکر میں لگے رہتے کہ مولانا احمد رضا خاں سے کیسے دور کیا جائے۔

چنانچہ بڑے منظم اور منصوبہ بند طریقے سے بیک وقت کئی محاذوں پر آپ کے خلاف تحریک چلائی گئی۔ کردار کشی کی تحریک اور آپ کے خلاف کذب وافتراء، دجل وفریب، بہتانات والزامات کا کاروبار جنگی پیمانے پر پھیلایا گیا۔ اور ایسی ایسی بے سروپا باتیں آپ کی ذات سے منسوب کردی گئیں جس کا دور دور سے آپ سے کوئی علاقہ ہی نہیں تھا۔ اور اس کے لیے زبان وقلم اور پریس کا ناجائز استعمال بڑی بے دردی کے ساتھ کیا گیا۔ اور ہٹلر کے دستِ راست گوئلز کے اس فارمولے پر بڑی سختی سے عمل کیا گیا کہ۔

"ایک جھوٹ کو اتنی بار دہراؤ کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔"

دینی، مذہبی، سیاسی رہنمائی اور احقاقِ حق وابطالِ باطل کا جو فریضہ آپ نے انجام دیا، اس کی پاداش میں باطل قوتوں، اقتدارِ وقت کے دلالوں اور ملّی سوداگروں نے آپ کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنالیا تھا۔ اور اس امامِ برحق کے خلاف اندر سے باہر تک سینہ سپر ہوگئے اور آپ کے خلاف وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے جو انسانی امکان میں تھا۔ آپ کے خلاف فرضی لٹریچروں کا طوفان کھڑا کردیا گیا، حد یہ کہ آپ کے نام کو مذہبی دہشت گردی کی علامت قرار دے دیا گیا۔ اور آپ کی حیرت انگیز کوہ پیکر قدآور علمی ودینی شخصیت کو طرح طرح کے الزامات سے ڈھک دینے کی پوری کوشش کی گئی۔ اور اس کے لیے اردو زبان کے ساتھ ان زبانوں کو بھی استعمال کیا گیا، جو عالمگیر اور آفاقی ہیں، کیونکہ آپ کی شخصیت بھی ایک عالمگیر وآفاقی شخصیت تھی۔ خصوصاً عربی زبان کو، اس زبان میں آپ کے خلاف ضخیم کتابیں لکھی گئیں اور اسے پوری دنیا میں مفت تقسیم کیا گیا، جیسے احسان الٰہی ظہیر پاکستان کی "البریلویہ" وغیرہ۔ پھر یہ کوشش اندر اندر اس حد تک ہوگئی کہ سوادِ اعظم اہلسنّت وجماعت کو بریلویت کے عنوان سے قادیانیت کے طرز پر خارج از اسلام کردیا جائے۔ جس میں سعودی عرب کو ایک کلیدی کردار ادا کرنا تھا۔ جس کے لیے زمین ہموار کرنا شروع کردی گئی تھی۔ اور اس کے لیے بعض عرب ریاستوں کے کثیر الاشاعت عربی مجلّے اس طرح کے مضامین چھاپنے شروع کردئیے تھے۔ خارج از اسلام فرقوں جیسے وہابی، بہائی، مرزائی، یعنی وہابیت، بہائیت، قادیانیت کے بعد البریلویت کا نمبر آچکا تھا۔ یہ تو کویت پر عراق قہرِ الٰہی بن کر نہ نازل ہوگیا ہوتا اور سعودی عرب کویت وغیرہ اپنے بقا کی جنگ میں نہ مصروف ہوجاتے تو اب تک اس محاذ پر کچھ نہ کچھ ہوچکا ہوتا۔ قاتلھم اللہ انّٰی یوفکون۔

یہ سب کیوں اور کس لیے! اس کی تفصیل وتحقیق کے لیے اس عہد کے حالات کا جاننا بہت ضروری ہوجاتا ہے۔ اسلام کے خلاف سیاسی ونیم سیاسی ومذہبی فتنوں کا پس منظر، اور اس کے برخلاف امام احمد رضا بریلوی کا جہاد بالقلم اور ان کے خلفاء تلامذہ اہلِ محبّت (جو بڑی بڑی حیثیتوں کے حامل تھے) ان کی بے مثال قربانیاں اور اس راہِ محبّت میں ان کی عزیمت و

استقامت! اس کا علم بھی ضروری ہے۔ اعلیٰ حضرت کے خلاف ان محرکات اور مذہبی و سیاسی، قومی فتنوں کی تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں[1] کی طرف رجوع کریں۔

بے شک یہ موضوع ایسا ہے جس پر ایک مبسوط کتاب کی ضرورت ہے۔ یہ مختصر سا مقالہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ دیدۂ بینا رکھنے والے باصلاحیت اور اہلِ قلم سے مؤدبانہ التماس ہے کہ اس کوچۂ محبّت میں ضرور قدم رکھیں اور اس موضوع پر اپنے نگارشات پیش کریں۔ میری خود بھی خواہش ہے کہ مولیٰ عزوجل میرے ہی وقت میں اتنی برکت عطا فرمادے اور میری ہمہ جہت مصروفیات سے اتنا وقت و توفیق عطا فرمادے کہ میں خود اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کرسکوں۔

اب ہم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان کی مدح و قدح، تعریف و تنقیص، تنقید و تعریض پر مشتمل ان شخصیتوں کے اظہارِ خیال کا اقتباس پیش کریں گے جو اپنی اپنی صفوں میں بہت نمایاں و ممتاز ہیں۔ جو اظہارِ عقیدت بھی ہے اور اظہارِ حقیقت بھی! جو جرح و تنقید بھی ہے اور تعریف و تنقیص بھی!

جس کی ابتدا ہم مکہ معظّمہ (زاداللہ شرفاً واجلالاً) سے کررہے ہیں۔

مکہ معظّمہ کے فقیہِ جلیل حضرت مولانا سیّد اسمٰعیل خلیل محافظ کتب خانہ حرم اعلیٰ حضرت کے ایک فتوے کے صرف چند اوراق ملاحظہ فرما کر پھڑک اُٹھے اور فرمایا:

"واللہ اقول والحق اقول لورأھا ابو حنیفۃ النعمان رضی اللہ عنہ قرت عینہ و جعل

تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ۔ فضل حق۔ علامہ مجاہد اعظم، سیف الجبار۔ فضل رسول بدایونی، علامہ تنزیہ الرحمٰن عن شائبۃ الکذب والنقصان۔ احمد حسن کانپوری۔ مولانا، امتناع النظیر۔ فضل حق علامہ (مجاہد اعظم)

[1] حسام الحرمین علی منحر الکفر والمین۔ احمد رضا خاں۔ امام و مجدد۔ المعتمد المستند احمد رضا خاں۔ امام و مجدد، انفس الفکر فی قربان البقر۔ احمد رضا خاں۔ امام و مجدد، فتوی الحرمین برجف ندّۃ المین۔ احمد رضا خاں۔ امام و مجدد۔ سوانح اعلیٰ حضرت بدرالدین احمد قادری۔ محقق و علامہ۔ فتاویٰ رضویہ جلد ششم۔ احمد رضا خاں۔ امام و مجدد۔ المحبۃ الموتمنہ فی آیات الممتحنہ، امام احمد رضا خان۔ امام و مجدد؛ فاضل بریلوی اور ترکِ موالات۔ محمد مسعود احمد۔ ڈاکٹر و پروفیسر، تحریک آزادی ہند، والسواد الاعظم، محمد مسعود احمد، ڈاکٹر و پروفیسر؛ خون کے آنسو۔ مشاق احمد نظامی۔ علامہ؛ تاریخ شناولیاں۔ سید مراد مورخ؛ امتیاز حق۔ راجہ غلام محمد مبصر۔ سید احمد شہید کی صحیح تصویر، وحید احمد مسعود بدایونی، پروفیسر: رسالہ ترکِ گاؤکشی؛ خواجہ حسن نظامی۔ مولانا؛ تحقیق حقائق بالاکوٹ؛ شاہ حسین گردیزی، محقق۔ انوارِ کنزالایمان؛ محمد وارث جمال قادری۔ مولانا؛ زلزلۃ :ارشد القادری؛ علامہ۔ اسبابِ زوالِ مسلم : حسنین رضا خاں بریلوی، مولانا۔ انوارِ رضا :ادارہ ضیاء القرآن پاکستان۔ اختلاف بین المسلمین اور اس کا پس منظر۔ محمد وارث جمال قادری۔ مولانا۔ اتحاد بین المسلمین : عبدالستار خاں نیازی؛ مولانا۔ امام احمد رضا اور ردّ بدعات و منکرات :یلٰسین اختر مصباحی۔ مولانا۔ اسبابِ زوالِ مسلمان در ملک ہندوستان :سیّد چندا حسین اشرفی، علامہ و شیخ طریقت؛ الطاری الداری لہفوات عبدالباری۔ احمد رضا خاں؛ امام و مجدد، حضور مفتیٔ اعظم۔ شمس التواریخ :سیّد چندا حسین اشرفی :علامہ و شیخ طریقت۔ الصمصام القاضب لراس المفتر علی اللہ الکذب :سیّد برکات احمد ٹونکی۔ حکیم و مولانا۔ عجالت الراکب فی امتناع کذب الواجب : محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا و مفتی۔ فاضل بریلوی اور امورِ بدعات :فاروق القادری۔ پروفیسر؛ اعلاء کلمۃ الحق۔ مہر علی شاہ گولڑوی۔ شیخ طریقت مرشد کامل و علامہ؛ الفتوحات الصمدیہ۔ مہر علی شاہ گولڑوی۔ شرح تحفۂ محمدیہ ردّ فرقہ مرتدیہ :سیّد اشرف علی گلشن آبادی۔ مولانا؛ ازالۃ الشکوک والوہام: فخرالدین الہ آبادی۔ حکیم و مولانا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مولفھاتہ من جملۃ الاصحاب۔"[1]

بخدا! میں بالکل سچ کہتا ہوں کہ اگر امامِ اعظم ابوحنیفہ اس فتوے کو ملاحظہ فرماتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں۔ اور وہ صاحبِ فتویٰ (یعنی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کو) اپنے تلامذہ واصحاب میں شامل فرما لیتے (یعنی امام قاضی ابو یوسف، امام محمد، امام زفر کی صف میں)۔

حضرت صدر الافاضل:۔ علم فقہ میں جو تبحر و کمال حضرت ممدوح کو حاصل تھا اس کو عرب و عجم، مشارق و مغارب کے علماء نے گردنیں جھکا کر تسلیم کر لیں۔ تفصیل تو ان کے فتاویٰ دیکھنے پر موقوف ہے مگر اجمال کے ساتھ دو لفظوں میں یہ سمجھیے کہ موجودہ صدی میں دنیا بھر کا ایک مفتی تھا، جس کی طرف تمام عالمِ اسلام کے حوادث و وقائع استفتاء کے لیے رجوع کیے جاتے تھے۔ ایک قلم تھا جو دنیا بھر کے فقہ کے فیصلے دے رہا تھا۔ وہی تمام بدمذہبوں کے جواب بھی لکھتا تھا۔ اہلِ باطل کے تصانیف کا بالغ ردّ بھی کرتا تھا۔ اور زمانہ بھر کے سوالوں کا جواب بھی دیتا تھا۔ اعلیٰ حضرت کے مخالفین کو بھی تسلیم ہے کہ فقہ میں ان کی نظیر آنکھوں نے نہ دیکھی۔[2]

حضرت محدثِ اعظم ہند:۔ اللہ تعالیٰ کا ایک مقبول بندہ اور رسولِ پاک کا سچّا نائب علم کا جبلِ شامخ اور عملِ صالح کا اسوۂ حسنہ، معقولات میں بحرِ ذخّار، منقولات میں دریائے ناپیدا کنار، اہلِ سنّت کا امام، واجب الاحترام اور اس صدی کا بالاجماعِ عرب و عجم مجدد، تصدیق میں صدیق اکبر کا پَرتو، باطل چھانٹنے میں فاروقِ اعظم کا مظہر، رحم و کرم میں ذوالنورین کی تصویر، باطل شکنی میں حیدری شمشیر، روایت فقہ و درایت میں امیر المومنین اور سلطنت قرآن و حدیث کا مسلّم الثبوت وزیر المجتہدین اعلیٰ حضرت علی الاطلاق، امام اہلسنّت فی الآفاق، مجدد مائۃ حاضرہ موید ملّت طاہرہ واعلم العلماء عند العلماء وقطب الارشاد فی لسان الاولیاء مولانا وفی جمیع الکمالات اولٰینا فانی فی اللہ و باقی باللہ عاشق کامل رسول اللہ مولانا الشاہ احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ ورضی اللہ عنہ وارضاہُ۔ تیرہویں صدی کی یہ واحد شخصیت تھی جو ختم صدی سے پہلے علم و فضل کا آفتاب ہو کر اسلامیات کی تبلیغ میں عرب و عجم پر چھا گئی اور چودھویں صدی کے شروع ہی میں پورے عالمِ سلامی میں اس کو حق و صداقت کا مینارہ نور سمجھا جانے لگا۔ میری طرح سے سارے حل و حرم کو اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کے فضل و کمال کی گہرائی اور اس کے علمِ راسخ کے کوہِ بلند کو آج تک کوئی پامال نہ کر سکا۔[3]

اب ہم ان حضرات کے خیالات و آرا و تاثرات پیش کر رہے ہیں، جو اعلیٰ حضرت امامِ اہلسنّت سے عقیدہ و مسلک میں اختلاف رکھتے ہیں۔ اور کچھ نہ صرف اختلاف بلکہ عناد بھی رکھتے ہیں۔ جیسے ابوالحسن علی ندوی مگر اپنی اپنی صفوں میں قابلِ ذکر و خصوصی اہمیت کے حامل اور ممتاز مانے جاتے ہیں۔ یوں تو ایسے حضرات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ مگر ہم یہاں

---

[1] الاجازات المتینۃ لعلماء البکۃ المدینۃ، مطبوعہ لاہور پاکستان، ص ۲۵۸ :۔

[2] انوارِ رضا، ص ۶۸۴ : مطبوعہ لاہور، پاکستان۔

[3] مجددِ اعظم ص ۲ :۔ ۳، ماہنامہ تجلّیات ناگپور۔ خطبۂ صدارت بر جشن مجدد اعظم از: محدثِ اعظم در شہر ناگپور، ماہ شوال المکرم ۱۳۷۹ھ۔

صرف چند ہی کا ذکر کریں گے۔ وہ بھی اختصار کے ساتھ تا کہ موضوع زیادہ پھیلنے نہ پائے۔

مولوی نظام الدین فقیہ احمد پوری:۔ یہ وہابی فاضل تفقہ میں کافی درک رکھتا تھا اور اپنے معاصرین علماء دیو بند میں سے کسی کو تفقہ میں اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا۔ اور حقیقت بھی یہ تھی کہ علماء دیو بند میں اس کے زمانے میں کوئی اس لائق تھا بھی نہیں، جو اس سے دعویٰ ہمسری کرسکتا۔

امامِ علم المیراث سراج الفقہا حضرت علامہ سراج احمد صاحب علیہ الرحمہ ساکن قصبہ مکھن پور بیلہ ضلع رحیم یار خاں ریاست بہاول پور پاکستان کی اسی وہابی فاضل مُلّا نظام الدین سے ملاقات ہوگئی۔ اب آگے حضرت موصوف ہی سے سماعت فرمائیں۔

''مولوی نظام الدین فقیہ احمد پوری وہابی جو تفقہ میں اپنے ہم عصر علماء دیو بند وغیرہ میں اپنے جیسا کسی کو فائق نہیں سمجھتا تھا۔ فتاویٰ رشیدیہ کے اس فتوے پر کہ ''صحیح حدیث کے مقابلے میں قولِ فقہاء پر عمل نہ کرنا چاہیے۔'' اس کے سامنے میں نے رسالہ "الفضل الموهبی فی معنی اذا صح الحدیث فهو مذهبی۔" مصنفہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ابتدائی اوراق منازل حدیث کے سنائے تو اس نے کہا کہ یہ سب منازل حدیث مولانا احمد رضا کو حاصل تھے۔ ''افسوس میں مولانا کے زمانہ میں رہ کر بے خبر و بے فیض رہا۔'' پھر میں نے اس وہابی عالم کو رسائل رضویہ سے چند فقہ میں جوابات سنائے تو کہنے لگا ''علامہ شامی اور صاحب فتح القدیر مولانا احمد رضا کے شاگرد ہیں۔ یہ تو امامِ اعظم ثانی معلوم ہوتا ہے۔''

مشہور مؤرخ اور ممتاز صاحبِ قلم مولانا عبدالحیٔ حسنی رائے بریلوی نے علماء ہند کے حالات پر مشتمل ایک تاریخ عربی زبان میں "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر" کے نام لکھی، جو کافی مبسوط اور کئی جلدوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی کتاب کی آٹھویں جلد میں ''المفتی احمد رضا البریلوی'' کے عنوان سے کئی صفحات پر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ اصولی طور پر یہ کتاب مولانا عبدالحیٔ صاحب ہی کی ہے مگر اس کو نئے سرے سے نئی ترتیب و تکمیل اور تزئین میں ان کے صاحبزادے مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ہاتھ زیادہ ہے۔ خاص کر اعلیٰ حضرت کے تذکرے میں آپ کے فنکارانہ ہاتھوں نے کافی مہارت دکھائی ہے۔ اور ''چہ دلاور دزدے بر کف چراغ دارد۔'' کی جلوہ سامانیوں کا مظاہرہ بڑی بے شرمی کے ساتھ کیا ہے۔ ع

ارے تجھ کو کھائے تپ سقر ترے دل میں کس سے بخار ہے

مولانا عبدالحیٔ صاحب چونکہ ایک مؤرخ تھے اور انہیں اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کا احساس تھا۔ اس لیے اعلیٰ حضرت کے حالات لکھتے وقت انہوں نے اپنے عقیدہ و مسلک کو سدِّ راہ نہیں ہونے دیا۔ اور یہی ایک مورخ کا فریضۂ منصبی بھی ہے بخلاف صاحبزادے علی میاں ندوی کے جو اپنے باپ کی شہرت و ناموری کو زینہ بنا کر علمی حلقوں تک پہنچے اور وقت و حالات اور قحط الرجال نے انہیں اپنی جماعت کے اندھوں میں کانا راجہ بنا دیا۔ آپ کے اندر وہابیت کے جراثیم بہت زیادہ ہیں اور اسی مقدار میں تعصّب و عناد و بے ضمیری، بددیانتی کے امراض نے آپ پر سخت حملہ کر رکھا ہے اور آں جناب ایک لاعلاج

مریض کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت آپ امام الوہابیہ فی الہند ہیں۔ حالیہ معرکۂ خلیج کے قبل آپ کے دونوں ہاتھوں میں موتی چُور نہیں بلکہ سیاسی سونے کے لڈو ہوا کرتے تھے۔ خلیج کی عربی ریاستوں اور حکومتِ ہند نے آنجناب کو بڑی حیثیت دے رکھا تھا۔ مگر معرکۂ عراق و امریکہ نے اس طرح کے تمام بازیگروں کے چہروں کو دن کے اُجالے میں بے نقاب کر دیا ہے۔ عرب ریاستوں میں آپ کی مصنوعی قرار واقعی حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہ گئی۔ جس کی وجہ سے حکومتِ ہند نے بھی آپ کو راندۂ بارگاہ قرار دے دیا ہے۔ جس میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کی مساعیٔ جمیلہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور اب تو کرب انگیز تنہائیوں اور مایوس و ناکام حسرتوں کے ہجوم میں مضطرؔ خیر آبادی ہی کام آرہے ہوں گے۔ ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی بھی کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ و روپ بگڑ گیا مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو خزاں چمن سے گذر گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی آکے شمع جلائے کیوں
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں میں تو بے کسی کا مزار ہوں

چنانچہ نزہۃ الخواطر میں اعلیٰ حضرت کے تذکرے کے ضمن میں ایک سازش کے تحت آپ نے بڑی گندگی پھیلائی ہے۔ اور جن لوگوں نے ان کے قلم کی بلندیاں ملاحظہ کی ہیں وہ ان کی پستی و دیانت و ذلالت پر حیران ہیں۔ اپنے نامور والد کے برعکس وسیع النظری، فراخ دلی، وضع داری، رواداری کے قریب بھی پھٹکے نہیں آپ! انصاف و دیانت اور تاریخ و وقایہ نگاری کے مسلّمہ اصولوں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ پامال کیا ہے۔ باپ بیٹے دونوں کا انداز ملاحظہ ہو۔ مولانا عبدالحئی فرماتے ہیں:

''شیخ العالم المفتی احمد رضا بریلوی بن نقی علی بن رضا علی الخ۔''

ابتدائی مضمون میں آپ کا مختصر نسب نامہ ولادت، وطنیت ابتدائی حالات تحصیل علم کے تذکرے کے بعد آپ کی تعلیمی فراغت اور خداداد صلاحیتوں کی ایک جھلک پیش کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

حتی برع فی العلم وفاق اترانہ فی کثیر من الفنون لاسیما الفقہ والاصول۔ یہاں تک کہ وہ تعلیم سے فارغ ہوئے اور بیشتر علوم وفنون پر انہوں نے مہارت حاصل کی۔ خصوصاً فقہ و اصول میں اپنے معاصرین پر فوقیت لے گئے۔

یہ اظہارِ حقیقت مضمون کے ابتدائی حصّے کے ہیں جس میں بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس نامور و حقیقت پسند مؤرخ و صاحبِ طرز و صاحبِ قلم مولانا عبدالحئی صاحب اس زمانے کے سارے اہل کمال پر اعلیٰ حضرت کی علمی فضیلت و برتری کو

ظاہر کیا۔

اب ذرا اعلیٰ حضرت کے زمانہ کے نامور علماء کی ایک بے حد مختصر فہرست کو ملاحظہ فرماتے چلیں۔

حضرت علامہ عبدالحق خیرآبادی بن حضرت فضل حق خیرآبادی۔

ابوالحسنات مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی

مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی

مولانا شاہ ارشاد حسین مجددی رام پوری

تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر بدایونی

استاذ العلماء مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری

استاذ العلماء حضرت مولانا لطف اللہ علی گڑھی

مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری

مولانا احمد حسن کانپوری

مولانا عبدالباری فرنگی محلی

مولانا وصی احمد محدث سورتی

دیوبندی علماء کی فہرست

مولانا رشید احمد گنگوہی

مولانا محمد قاسم نانوتوی

مولانا خلیل احمد انبیٹھوی

مولانا اشرف علی تھانوی

مولانا علی احمد محدث سہارنپوری

مولانا نذیر حسین دہلوی

مولانا انور شاہ کشمیری

مولانا محمد یعقوب نانوتوی

مولانا محمود الحسن دیوبندی

نواب صدیق حسن قنوجی۔ وغیرہ وغیرہ

پھر کمسنی میں آپ کی حج وزیارت اور وہاں (یعنی مکہ معظّمہ و مدینہ منورہ) علماء ومشائخ کا آپ کے ساتھ غیر معمولی اعزاز واکرام وحیرت انگیز پذیرائی، پھر ہندوستان واپسی اور پھر یہاں پر آپ کی علمی مشغولیت کا تذکرہ کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

"وسافر حرمین الشریفین عدۃ مراۃ وذاکر علماء الحجاز فی بعض المسائل الفقهیه والکلامیه والف بعض الرسائل اثناء اقامته واجاب عن بعض مسائل التی عرضت علی علماء الحرمین وعجبوا بغرارۃ علمہ وسعۃ اطلاعہ علی المتون الفقهیه والمسائل الاختلافیه وسرعۃ تحریر ذکائہ۔

اورانہوں نے حرمین شریفین کا سفر متعدد بار کیا۔ دورانِ قیام وہاں پر بعض فقہی وکلامی مسائل پر علماء حجاز سے مذاکرہ بھی کیا۔ اور وہیں پر چند کتابیں بھی مرتب فرمائیں نیز علماء حرمین کی خدمت میں پیش شدہ بعض سوالوں کا جواب بھی لکھا۔ جسے پڑھ کر حضرات (یعنی حرمین شریفین کے جلیل القدر علماء ومشائخ) ان کی علمی گہرائی، اختلافی مسائل وفقہی متون پر دسترس اور آپ کی سرعت تحریر اور ذکاوت طبع سے حیرت میں پڑ گئے۔

مولانا عبدالحیٔ صاحب نے جن حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی تفصیل کافی طویل ہے، جس کے لیے الگ سے ایک مقالہ درکار ہے۔ مولانا موصوف کے پیش کردہ حقائق بغیر کسی تبصرے کے بات آگے بڑھ رہی ہے کہ وقت وصفحات کی تنگی دونوں دامن گیر ہے۔

بے شک مولانا عبدالحیٔ صاحب نے ایک غیر جانبدار مورخ کی طرح مؤرخانہ فراخ دلی ووسعت قلبی کا مظاہرہ تونہیں کیا ہے مگر اس راہ میں اپنے مسلک وعقیدہ کو سدِّ راہ بھی نہیں ہونے دیا ہے۔ اور اعلیٰ حضرت کے خلاف ایک زبردست و تاریخی بغض وحسد وعناد کے گھٹا ٹوپ اندھیرے اور آپ کے خلاف کذب وافترا، دجل وفریب کے وادیٔ ظلامت میں مدھم سی امید کی لَو ہی بڑی غنیمت ہے کہ۔

اُمید کی مدھم سی اک لَو ہو تو پیاری ہے
یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

ویسے بھی علمائے ہند کے حالات پر مشتمل نزہۃ الخواطر کے یہ غیر معمولی مجلدات اعلیٰ حضرت کے تذکرے کے بغیر ادھورے ونامکمل ہوتے۔ اپنے مؤرخانہ مقاصد کی تکمیل ہی کے لیے سہی تعصب وعناد کے گھٹن سے پُر ماحول میں حقائق وہ بھی تلخ وبے رحم حقائق کی ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی تو تعصب وعناد اور کردار کشی کے اس لنکا میں کوئی تو تراپن گز کا نکلا۔[1]

مگر صاحبزادے میاں ابوالحسن علی ندوی سے اپنے والد بزرگوار (جن کی شہرت ونا موری کو میاں جی اپنی شہرت کا زینہ بنایا) سے اتنا بھی سچ اور حقیقت کی اتنی چھوٹی سی کھڑکی کھلی نہیں دیکھی گئی۔ ان کی پُر تعصب رگِ وہابیت پر چوٹ پڑی، تلملا اُٹھے اور اس مقدس تذکرے کو اپنی طرف سے الحاق کرتے ہوئے یوں طلوع ہوئے:

"كان متشددا فى المسائل الفقهيه والكلاميه متوسعا ومسارعا فى التكفير قد حمل لواء التكفير والتفريق فى ديار الهند فى عصر الآخر۔"

وہ فقہی وکلامی مسائل میں متشدد تکفیر کے دائرہ کو (بات بات میں) پھیلانے والے اور اس معاملہ میں جلد باز واقع ہوئے تھے۔ آخر عمر میں انہوں نے ہندوستان میں تکفیر وتفریق کا جھنڈا بلند کر رکھا تھا۔

آہ! کتنے بڑے جھوٹ کا پہاڑ ظالم نے کھڑا کر دیا۔ اور پھر چند قدم آگے بڑھ کر سمندر سے بھی بڑا جھوٹ گڑھا۔

"وكان يعتقد بان رسول الله صلى الله عليه وسلم كان يعلم الغيب علما كليا۔"

---

[1] ایک کہاوت ہے کہ لنکا میں سب باون گز کے۔

اوران کا عقیدہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ غیب کا کلّی علم رکھتے ہیں۔

"کبرت کلمۃ تخرج من افواھم الا کذبا. فلعنۃ اللہ علی الکٰذبین۔"

یہ سراسر کذب و افترا ہے۔ انہوں نے اس تعلق سے اپنا عقیدہ اپنی معرکۃ الآراء و تاریخی تصنیف الدولۃ المکیۃ (عربی) میں ظاہر کردیا ہے۔ اور وہ بھی حرمین طیبین کے جلیل القدر علماء و مشائخ کے سامنے۔ اور اپنی اردو تصنیف ابناء المصطفٰے و خالص الاعتقاد میں بھی علمِ غیب کے تعلق سے اپنا عقیدہ بیان فرمایا ہے۔

"علمِ ذاتی اللہ عزوجل سے خاص ہے اس کے غیر کے لیے محال۔ جو اس میں سے کوئی چیز اگرچہ ایک ذرہ سے کمتر غیرِ خدا کے لیے مانے وہ یقیناً کافرو مشرک ہے۔" (خالص الاعتقاد)

"علمِ الٰہی ذاتی ہے اور علمِ خلق عطائی، وہ واجب، یہ ممکن، وہ قدیم یہ حادث، وہ نامخلوق یہ مخلوق، وہ نامقدور یہ مقدور، وہ ضروری البقاء یہ جائز الفنا۔" (ابناء المصطفٰے)

"اگر تمام اہلِ علم اگلوں، پچھلوں سب کے علوم جمع کیے جائیں تو ان کو علومِ الٰہیہ سے وہ نسبت نہ ہوگی جو ایک بوند کے دس لاکھ حصّوں سے ایک حصّے کو دس لاکھ سمندر سے۔" (خالص الاعتقاد)

"ہم نہ علمِ الٰہی سے مساوات مانیں اور نہ غیر کے لیے بالذات جانیں اور عطائے الٰہی سے بعض علم ہی ملنا مانتے ہیں نہ کہ جمیع۔" (خالص الاعتقاد)

كان عالمًا متبحرا كثير المطالعته واسع الاطلاع له قلم سيال و فكر حامل فى التاليف۔ الخ۔

مولانا عبدالحیٔ وہ ایک متبحر عالم تھے۔ جن کی معلومات وسیع اور مطالعہ بہت زیادہ تھا۔ وہ ایک رواں دواں قلم اور تصنیف و تالیف میں جامع فکر کے حامل تھے۔ اپنے تذکرہ نویسوں کے مطابق وہ پانچ سو کتابوں کے مصنف تھے۔ والد گرامی کے اس اعترافِ عظمت نے میاں صاحبزادے کو برافروختہ کردیا۔ اور اپنے والد کو تو کچھ نہ کہہ سکے البتہ ان کے مضمون میں اتصالاً الحاق کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

كان قوى الجدل شديد المعارضة شديد الاعجاب بنفسه وعلمه قليل الاعتراف بمعاصريه ومخالفيه شديد العناد والتمسك برائه۔

وہ بڑا جنگجو سخت لڑاکا اور اپنے علم و دولت پر بے حد مغرور تھا۔ اپنے ہمعصروں مخالفوں کا کم ہی اعتراف کرتا تھا، انتہائی بغض رکھنے والا ہٹ دھرم تھا۔ (ابوالحسن علی ندوی)

چنانچہ اس پورے طویل مضمون کو میاں صاحبزادے ندوی نے اپنے تعصب و عناد سے داغدار کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ جو اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ جب انسان محاسبہ آخرت سے بے خوف ہوجاتا ہے، تو وہ اپنے وقت کا علی میاں ندوی بن جاتا ہے۔ قاتلھم اللہ انی یوفکون۔ ایک علی میاں ہی نہیں بلکہ اعلیٰ حضرت کے خلاف پورے آوے کا آوا ہی

خراب ہوچکا ہے۔ (الاماشاء اللہ) اس موضوع پر امامِ اہلسنّت کی سب سے عظیم وجلیل کتاب الدولتہ المکیہ (عربی) جو علمائے حرمین کے سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے عربی زبان میں آپ کی عظیم تصنیف جس نے سب سے پہلے علماء حرمین سے آپ کا غاچانہ تعارف کرایا۔ وہ الکفل الفقیه الفاهم فی احکام قرطاس الدراهم ہے۔ اول اول دنیائے عرب میں انہیں دو کتابوں کی وجہ سے آپ کے علمی کمالات کا سورج سوا نیزے پر چمکا۔ اوراحترام وعقیدت میں حرمین طیبین کے جلیل القدر علماء ومشائخ نے اپنی گردنیں اعلیٰ حضرت کے بارگاہِ علم وفضل میں خم کردیں۔

حرم والوں نے مانا تم کو اپنا قبلہ و کعبہ

اب ہم اسی صف سے ایک اور شہادت پیش کررہے ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے جب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا مطالعہ شروع کیا تو انھوں نے تعصب اور عناد کے چشمے کو قریب بھی نہیں رکھا تھا۔ اور وہ ہیں پروفیسر ڈاکٹر محی الدین الوانی جو بیس (۲۰) برس زائد سے ازہر یونیورسٹی قاہرہ مصر میں استاذ رہ چکے ہیں اور اس وقت ایک اطلاع کے مطابق وہ مدینہ یونیورسٹی (سعودی عرب) میں استاذ ہیں۔ موصوف مسلکاً اہلِ حدیث (غیر مقلد) ہیں۔ علماء ازہر اور برصغیر ہندو پاک کے علماء کے درمیان ان کی علمی شخصیت بہت متعارف ہے۔ انہیں بیک وقت کئی زبانوں پر عبور حاصل ہے، خاص کر اردو، عربی، انگریزی اور ملیالم پر مگر حقیقت پسند و وسیع النظر، وسیع القلب عالم ہیں۔ علی میاں ندوی، حسین احمد ٹانڈوی اور احسان الٰہی ظہیر کی طرح تنگ دل، تنگ نظر، تنگ ظرف، بہتان طراز، افترا نگار اور کذب وفریب کے اسپ تازی کے شہسوار ہیں۔ موصوف نے پچیس برس پہلے جامعہ ازہر ہی میں اعلیٰ حضرت پر ایک طویل مقالہ عربی زبان میں لکھا تھا۔ جو صوت الشرق قاہرہ کے شمارہ فروری ۱۹۷۰ء میں شائع ہوچکا ہے۔ مقالہ تو کافی طویل ہے، یہاں ہم اس کے چند اقتباس پیش کررہے ہیں۔

"بعد مولانا احمد رضا بریلوی رحمة الله علیه من طلیعه علماء الهند المسلمین الذین ساهموا مساهمة فعالته فی خدمت العلم والدین واللغة العربیه فی انحاء مثبت القارة الهندیه وله صفحات ولجیدة فی تاریخ نشر العلوم العربیه واسلامیه فی ربوعها وقد وضع مولفاته عدیدة فی التفسیر والحدیث والفقه وعلمه الکلام والتصوف وغیرها من علوم الاسلامیه کما انه مولفا فی فروع الادب من صرف وبلاعته وشعر وانشاء وقد صنفا یضا فی علوم العقلیه کالمنطق وعلمه الهیة والحساب والحکمة الطبعة وغیرهما۔"

جن علماء ہند نے مروجہ علومِ دینیہ واسلامیہ اور لغت عربیہ کی خدماتِ جلیلہ میں اعلیٰ درجے کا حصہ لیا، ان میں مولانا احمد رضا خاں کا نام سرِ فہرست ہے۔ علومِ دینیہ اسلامیہ اور لغت عربیہ کی آراستگی میں آپ کا ایک شاندار ریکارڈ ہے۔ آپ نے جس طرح علمِ فقہ، تفسیر، کلام، تصوف وغیرہ علوم وفنون میں تصنیفات فرمائی ہیں۔ اس طرح آپ کی بہت سی تصانیف ادب مثلاً صرف بلاغت شعر وانشاء میں بھی ہیں نیز علومِ عقلیہ مثلاً منطق، ہیئت، فلسفہ وغیرہ علوم پر بھی آپ نے قلم اٹھایا۔

پھر اعلیٰ حضرت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"وجدیه باالذ کران مولانا احمد رضا خان قد امتاز عن کثیر من اترانه معاصریه العلماء فی الجمع بین العلوم النظریه والعمیه ومما یدل علی مهارته فی الریاضیات والحساب والجبر وغیرها ان عالم الریاضی شهر الدکتور ضیاء الدین و کیل جامعه علی کره الاسبق وامثاله کانوا یذهبون الیه لحل بعض المشکلات العویصه فی المسائل الحسابیه الهندسه۔"

یہ مسلّمہ حقیقت قابلِ ذکر ہے کہ مولانا احمد رضا خاں علوم عقلیہ ونقلیہ کے جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ہمعصروں وہم چشموں میں امیازی شان کے مالک تھے۔ ریاضی، حساب، الجبرا علوم میں ان کی مہارتِ تامہ کا یہ جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسے شہرت یافتہ ریاضی داں جیومٹری اور حساب کے مشکل ترین الجھنوں کو سلجھانے میں ان کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔

آپ کے شعر وادب پر تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"قدیما قیل ان التحقیق العلم الاصیل والخیال الذهنی الخصیب لا یجمعان فی شخص واحد ولکن مولانا احمد رضا قد برهن علی عکس هٰذه النظریه التقلیدیه فکان شاعر اذا خیال وخصیب وتشهد ذالك دوانیه الشعریه باللغات الفارسیة والارویةِ والعربیه۔"

"پرانی کہاوت ہے کہ ایک فرد میں دو چیزیں (ایک ساتھ) جمع نہیں ہوتی ہیں۔ تحقیقاتِ علمیہ ونازک خیال (یعنی شاعر) لیکن مولانا احمد رضا کی ذات اس تقلیدی نظریہ کے عکس پر بہترین دلیل ہے۔ آپ عالم محقق ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین نازک خیال شاعر بھی تھے۔ جس پر آپ کے عربی فارسی اردو دیوان شاہد ہیں۔"

آپ کی تصنیفاتِ جلیلہ وتالیفاتِ عظیمہ کا تذکرہ اس انداز میں کرتے ہیں:

"ویبلغ مجموع مولفاته مابین محظوظ ومطبوع حوالی الف کتاب فی مختلف اللغات۔

اردو، عربی، فارسی میں آپ کی تصنیفات وتالیفات ہزار سے زیادہ ہیں۔

وله مولفات خمسین فنا من الفنون العدیده ومن اغرب هٰذه الفنون اللتی الف فیها مولانا احمد رضا علم الدیجات وعلم الجبر والمقابلة وعلم طبقات الارض۔

مولانا احمد رضا کی تصنیفات پچاس فنون میں سب سے زیادہ نادر علمِ زیجات ہے۔ (وہ جدول جس سے ستاروں کی چال پہچانی جاتی ہے) اور جبر ومقابلہ وعلمِ طبقات الارض ہے۔

مولانا کوثر نیازی سابق وزیر اطلاعات ونشریات حکومتِ پاکستان ایک زبردست ونامور عالم وفاضل اور ریاضی میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے دستِ راست اور مولانا انور شاہ کشمیری شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے ہونہار تلامذہ سے

تھے۔ علمی دنیا میں ان کا قد کافی نمایاں تھا۔ آخر عمر میں وہ امام احمد رضا کی طرف متوجہ ہوئے، اب کم وبیش دو برس پہلے اپنے انڈیا کے آخرے دورے پر یہاں کی ایک مقامی تنظیم نے مہاراشٹر کالج بلاسس روڈ ممبئی میں ایک روزہ پروگرام رکھا تھا۔ اس عصری دانشکدہ میں اربابِ علم وفضل کے درمیان انہوں نے اعلیٰ حضرت کی حیات وخدمات وکارنامے اوران کے علم و فضل پر ایک تاریخی خطاب فرمایا جس کو دوسرے دن بڑے بڑے اردو اخبارات نے بڑی بڑی سرخیوں میں شائع کیا۔ دورانِ خطاب وہ اعلیٰ حضرت کی شاعری پر آئے تو جیسے ان پر وجد وکیف کا عالم طاری ہو بالخصوص آپ کے تاریخی ومشہور سلام ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' پر آئے تو جیسے علم وفضل کے دریا بہار رہے ہوں۔ بڑی خوداعتمادی ووالہانہ عقیدت اور پورے دعوے کے ساتھ انہوں نے فرمایا کہ مولانا احمد رضا کا یہ سلام عجم کا قصیدہ بردہ ہے۔ پھر اس کے بعد ان کے کئی مقالے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا پر نگاہوں سے گذرے اس وقت میرے سامنے ان کا ایک مقالہ موجود ہے۔ اس سے صرف دو مختصر اقتباس پیش ہے۔ عنوان ہے **امام العلماء امام ابو حنیفہ ثانی**۔

قرطاس وقلم سے میرا تعلق دو چار سال نہیں بلکہ نصف صدی کی بات ہے۔ اس دوران وقت کے بہت بڑے بڑے اہلِ علم وقلم مشائخ وعلماء کی صحبت میں بیٹھ کر استفادہ کرنے کا موقع ملا اوران کے درس میں شریک رہا۔ زندگی میں میں نے اتنی روٹیاں نہیں کھائیں جتنی کثیر تعداد میں کتابیں پڑھی ہیں۔ میری اپنی ذاتی لائبریری میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔ وہ سب مطالعہ سے گذری ہیں۔ اس سب مطالعہ کے دوران امام احمد رضا کی کتب نظر سے نہیں گذری تھیں۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ علم کا خزانہ پالیا ہے اور علم کا سمندر پار کرلیا ہے۔ علم کی ہر جہت تک رسائی حاصل کرلی ہے۔ مگر جب امام اہلسنّت کی کتابیں مطالعہ کیں اوران کے علم کے دروازے پر دستک دی اور فیض ہوا تو اپنے جہل کا احساس واعتراف ہوا۔ یوں لگا کہ ابھی تو میں علم کے سمندر کے کنارے کھڑا سیپیاں چن رہا تھا، علم کا سمندر تو امام کی ذات ہے۔ امام کی تصانیف کا جتنا مطالعہ کرتا جاتا ہوں عقل اتنی ہی حیران ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ امام احمد رضا حضور نبی کریم ﷺ کے معجزوں میں سے ایک معجزہ ہیں۔ جسے اللہ تعالیٰ نے اتنا وسیع علم دے کر دنیا میں بھیجا کہ علم کی کوئی جہت ایسی نہیں جس پر امام کو مکمل دسترس حاصل نہ ہو۔ اوراس پر کوئی تصنیف نہ لکھی ہو۔ یقیناً آپ سرکارِ دوعالم ﷺ کے علوم کے صحیح جانشین تھے۔ ایک طرف مولانا کوثر نیازی کا یہ اعتراف جس کا علمی قد اور جس کی شہرت وناموری اور جس کا فہم وادراک اور زبان وادب علی میاں ندوی سے کہیں زیادہ ہے۔ دوسری طرف علی میاں کے تعصب وعناد کا یہ چشمہ بھی ملاحظہ ہو۔

"**کان قلیل العلم فی الحدیث والتفسیر**۔" تفسیر وحدیث میں وہ معمولی علم رکھتے تھے۔ اپنے اس مقالے میں وہ ایک جگہ (مولانا کوثر نیازی) یوں رقم طراز ہیں۔

''فقہ حنفیہ میں ہندوستان میں دو کتابیں مستند ترین ہیں۔ ان میں ایک فتاویٰ عالمگیریہ ہے، جو دراصل چالیس علماء کی مشترکہ خدمت ہے جنہوں نے فقہ حنفیہ کا ایک جامع مجموعہ ترتیب دیا۔ دوسرا فتاویٰ رضویہ ہے جس کی انفرادیت یہ ہے کہ جو

کام چالیس علماء نے مل کر انجام دیا، وہ اس مردِ مجاہد نے تنہا کر کے دکھایا۔ اور یہ مجموعہ فتاویٰ رضویہ عالمگیریہ سے زیادہ جامع ہے۔ اور میں نے جو امام ابوحنیفہ ثانی کہا ہے وہ صرف محبت یا عقیدت میں نہیں بلکہ فتاویٰ رضویہ کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آپ اس دور کے ابوحنیفہ ہیں۔ آپ کے فتاویٰ میں مختلف علوم وفنون پر جو بحث کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر بڑے بڑے علماء کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"[1] (افکارِ رضا سہ ماہی ممبئی دسمبر ۱۹۹۵ء، رجب المرجب ۱۴۱۵ھ ص: ۶۔ ۷)

ڈاکٹر اقبال: ہندوستان کے دورِ آخر میں اُن جیسا طباع ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ میں نے ان کے فتاویٰ سے یہ رائے قائم کی ہے۔ ان کے فتاویٰ ان کی ذہانت، فطانت، جودتِ طبع، کمال فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحّرِ علمی کے شاہد عادل ہیں۔ یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور وفکر کے بعد کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں کسی قسم کی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑتی بایں ہمہ ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خاں اپنے دور کے امامِ اعظم ابوحنیفہ ہوتے۔[2]

تمام تر فضل وکمال کے اعتراف کے باوجود بایں ہمہ ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اور اسی شدّت کی زیادتی سے وہ وقت کے ابوحنیفہ ہوتے ہوتے رہ گئے۔ اعلیٰ حضرت کے خلاف کردار کشی کی جو مہم چلائی گئی اس کا سب سے زیادہ اہم رُخ یہی تھا کہ انہیں مسلمانوں سے اور مسلمانوں کو ان سے دور کیا جائے چنانچہ اعلیٰ حضرت کا پہلے ایک خاکہ تیار کیا گیا۔ پھر کذب وافتراء، دجل وفریب، الزامات، اتہامات کے رنگ بھرے گئے۔ اور اس رُخ پر سب سے زیادہ محنت کی گئی کہ وہ مکفر المسلمین تھے؛ تکفیرِ مسلمین میں بے باک تھے۔ بات بات میں کفر کا فتویٰ لگا دیتے تھے، ان کی زندگی کا مشن ہی کافر گری تھا۔ اور اس پر بڑے منظم پیمانے پر عالمی سطح میں محنت کی گئی اور عالمی رابطے کی زبانوں کو بھی استعمال کیا گیا۔ اور اس جھوٹ من گھڑت اور بے بنیاد چیز کو اتنی بار دہرایا گیا کہ وہ سچ جیسا معلوم ہونے لگا۔ اس کے مصنفین ومورخین، اہلِ سیرت، اہلِ تذکرہ کی ایک ٹیم بھی تیار کی گئی۔

حد یہ کہ ناول نگاروں، افسانہ نویسوں تک کی خدمات حاصل کی گئیں۔ فحش، بیہودہ اور جنسی ادب کے نام سے غلاظت نگار قلم بھی اعلیٰ حضرت کے خلاف اس مہم پر لگ گئے۔ "میں جب جوان تھا" جیسی ناول لکھنے والے بھی اعلیٰ حضرت کے خلاف قلم اٹھانے لگے۔ اللہ اللہ آبی مینڈک کو بھی زکام!

الغرض ایک جھوٹ کو اتنی بار دہرایا گیا کہ حقیقت افسانہ اور افسانہ حقیقت سے بدل کر رہ گیا۔ جس کی لپیٹ میں ہمہ شما کی بات ہی کیا ہے، ڈاکٹر اقبال جیسے دیدہ ور بھی آ گئے۔ جس کی صرف ایک مثال ہی پر اکتفا کروں گا ورنہ اس موضوع پر اتنے روئی کے پہاڑ کھڑے کیے ہیں، جو دیکھنے میں ہمالیہ لگتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد کے بھونپو عبدالرزاق ملیح آبادی کی بھی ایک چاندماری ملاحظہ ہو:

---

[1] افکارِ رضا ممبئی دسمبر ۱۹۹۵ء ص ۶۔ ۷

[2] انوار رضا ص ۶۸۴ : مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز لاہور پاکستان۔

”یاد رہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب اپنے اور اپنے معتقدوں کے سوا دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر بلکہ ابوجہل و ابولہب سے بڑھ کر اکفر سمجھتے ہیں۔[1]

ہائے رے گردشِ ایام! اور واہ رے پٹر ڈالر کی کرامت کل تک جو لوگ دن رات فصل کاٹتے تھے اور اسی پیشے کو اپنی سیاسی معاشی زادِ راحلہ بنائے ہوئے تھے وہ آج مسلمانوں کے امام بنا دیئے گئے۔ امام احمد رضا خاں حاشا وکلا ہرگز ہرگز مکفر المسلمین نہیں، ان کے احتیاط کا تو عالم یہ تھا کہ انہوں نے مقتول و مذبوح اسمٰعیل دہلوی کے کفر پر بھی کفِ لسان اختیار فرمایا۔ جس پر ان کے اکابر و بزرگ حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی اور ان کے ہمعصر جلیل القدر رفقاء، جو محدثین و متکلمین امامِ زمانہ تھے، انہوں نے اسمٰعیل دہلوی کا کافر، بے دین، زندیق اور اس کے قتل پر تکفیر کا حکم لگایا ہے[2]۔

مکفر المسلمین تو عبدالوہاب نجدی تھا۔ اسمٰعیل دہلوی تھا۔ رشید احمد گنگوہی تھا۔ لیکن یہی مجرمین اسلام آج شیخ الاسلام، مجاہد اعظم اور شہید اعظم اور جانے کیا کیا بن گئے۔ بے شک آج پٹرو ڈالر نے کتاب التوحید، تقویۃ الایمان، حفظ الایمان، فتاویٰ رشیدیہ، صراطِ مستقیم وغیرہ کی کفر و شرک سازی کو ایمان بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہی ظالم مکفر المسلمین تھے۔ البتہ امامِ اہلسنّت اعلیٰ حضرت مجدد دین و ملّت تو مکفر المرتدین تھے۔

بات تو یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے عشق رسالت کی گرمی سے ان کے فنا فی الرسول ہونے سے ان کے مخالفین مانعین ظالمین سخت خوفزدہ تھے۔ وہ اپنے عہد کے قافلۂ عشق و محبت کے سپہ سالار تھے۔ اسی وصفِ خاص اور اسی عشق رسول کو انہوں نے کفر سازی و تکفیر مسلمین میں بے باکی کا نام دے دیا تھا۔ وہ اپنے محبوب کریم کی محبت میں اتنا سرشار تھے کہ ان کی بارگاہِ نازک میں ہلکی سے ہلکی بھی سوءِ ادبی انہیں بے چین کر دیتی تھی۔ ڈاکٹر اقبال صاحب بھی تو اسی محبتِ رسول کی بے چینی کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔

اگر ہے عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی!
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

غالب خستہ جان نے بھی تو کچھ اس طرح فرمایا ہے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اور یہ عشق ہی کی تو صدائے سامعہ نواز ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
دگر باد نہ رسیدی تمام بولہبی است

---

[1] ذکر آزاد۔ مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی۔
[2] تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ ص ۲۴۷ :۔ المجمع الاسلامی مبارکپور۔

تمام دشمنانِ اسلام خواہ خارجی ہوں یا داخلی ان کا سب سے بڑا قدرِ مشترک کلمہ، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ وغیرہ ہیں، ان سبھوں کا قدرِ مشترک ذاتِ رسول ہے۔ اسی پر حملہ، اسی پر قدغن، اسی کی تحقیر، اسی کی اہانت ہے۔ یہ تاریخی تسلسل ہے۔ اسلام کی ابتدا سے لے کر آج تک ایسا ہی ہو رہا ہے۔ زمانہ اس کا گواہ ہے۔

اعلیٰ حضرت کے عہد سے کچھ پہلے ہی سے یعنی علامہ فضل حق خیر آبادی کے زمانہ ہی میں انگریزوں اور ان کی گماشتوں، ایجنٹوں اور مسلم نما پادریوں نے اسلام پر جتنی اٹیک لگائی ہے۔ وہ نماز اور روزے پر نہیں صرف ذاتِ رسول کہ اسلام جس سے ملا ہے اسی کو داغدار اور مجروح کر دو تا کہ اسلام خود ہی داغدار اور مجروح ہو جائے۔ چنانچہ ذاتِ پاکِ رسالت پر حملوں کا دفاع جس انداز اور جس توانائی اور جس تب و تابِ جاودانہ سے امام احمد رضا نے کیا ہے۔ اس کی کوئی دوسری مثال دور دور تک نہیں ملتی۔ ان کے اسی تاریخی دفاع کو تکفیر مسلمین قرار دے دیا گیا انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

بے شک اعلیٰ حضرت ذاتِ رسالت کی دفاع میں بہت سخت تھے اشدّآء علی الکفار کی عملی تفسیر جو عین مطلوبِ ایمان ہے۔ اسی مقصودِ ایمان کو ڈاکٹر اقبال شدت قرار دیتے ہیں، کہ یہی اگر درمیان میں نہ ہوتی تو وہ اپنے زمانہ کے امامِ اعظم ابو حنیفہ ہو جاتے۔ لاَ حول ولا قوۃ الا باللہ جبکہ اسی شدّتِ ایمانی نے انہیں اپنے کو ابو حنیفہ و غوثِ اعظم کا نائب اکبر بنایا۔ اگر یہی چیز نہ ہوتی تو نہ وہ اپنے زمانے کے امامِ اعظم ابو حنیفہ بن سکتے تھے نہ ہی غوث اعظم کے نائب اکبر۔

ڈاکٹر صاحب نے شدّت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ شدّت تو عین مقصودِ اسلام ہے۔ پھر وہ شدّت ان کے لیے لیکن کیسے بن گئی۔ حالانکہ وہ خود لذّت آشنائی کی منزل پر فائز المرام ہیں اور اس مرحلہ شوق و محبت سے وہ گذرے بھی ہیں۔ وہ اس حقیقت کو اپنے شعر کے قالب میں کیوں ڈھالتے کہ ؎

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است چہ بےخبر ز مقامِ محمّد عربی است
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اور جب حضور ﷺ محبت کو مسلمانوں کے دلوں سے خالی کرایا جانے لگا۔ وہ بھی مسلم نما ہاتھوں سے تو دل پر ہاتھ چلا گیا کہ ؎

دردلِ مسلم مقامِ مصطفٰے است آبروئے ما ز نامِ مصطفٰے است

ذاتِ پاکِ رسول سے ڈاکٹر صاحب کی بے پناہ وابستگی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ مگر جب بات صاحبِ لولاک ﷺ کے دین پاک کی آ گئی تو انہیں پھر کوئی مصلحت روک نہ سکی اور نہ ہی اپنے حلقۂ محبّت کے ان بہت سارے قابلِ ذکر افراد کے جذبات کی پرواہ کی، جو ہر حال میں غالب کے طرفدار ہی تھے۔ اور نہ یہی دیکھا کہ بات کس کے خلاف جا رہی

ہے اور وہ کس منصب و مقام کا ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے تو محبتِ رسول کا ایک جرعہ ہی پاسکے، اس پر ان کے محبتِ رسول کی حرارت کا یہ عالم! پھر اندازہ لگائیے اس کی محبّت کی وارفتگی کا جس کے پاس عشق رسول کا لنگر تھا۔ جو نہ صرف عاشقِ صادق بلکہ فنا فی عشق الرّسول تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنے وجودِ حیرت کی بدولت پورے اسلام کا مرجع تھا۔ بقول حضرت صدر الافاضل:

"(امام احمد رضا) دنیا بھر کا ایک مفتی تھا، جس کی طرف عالمِ اسلام کے حوادث و وقائع استفتاء کے لیے رجوع کیے جاتے تھے۔ ایک قلم تھا جو دنیا بھر کے فقہ کے فیصلے دے رہا تھا۔ وہی تمام بدمذہبوں کے جواب بھی لکھتا تھا، اہلِ باطل کے تصانیف کا بالغ ردّ بھی کرتا تھا۔ زمانہ بھر کے سوالوں کا جواب بھی دیتا تھا۔"

جبکہ ڈاکٹر صاحب نہ عالمِ دین تھے، نہ فقیہ اجل تھے، نہ قاضی شہر تھے نہ مفتیٔ اعظم تھے۔ نہ فقیہ عالمِ اسلام تھے۔ اس کے باوجود دین جمیعۃ العلماء ہند اور دار العلوم دیوبند کے صدر حسین احمد ٹانڈوی کی طرف سے دین کی ایک غلط تعبیر پر وہ خاموش نہ رہ سکے۔ اور بڑی سختی کے ساتھ اس مصنوعی شیخ الاسلام کو دین کے مسئلے میں اسے اس کی حیثیت یاد دلائی۔

تو پھر وہ (اعلیٰ حضرت) گندم نما جو فروشوں، دین و ایمان کے ڈاکوؤں، عشق و محبت کے رہزنوں، تقدیس الٰہی و تنقیص رسالت پناہی کے مجرموں، عظمتِ انبیاء و اولیاء کے دشمنوں اور اسلام کے داخلی و خارجی حملہ آوروں کے خلاف خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا فریضہ ایمانی ایسی شدّت کیوں بن گیا۔ جس کی وجہ سے وہ امامِ اعظم ابوحنیفہ ہوتے ہوتے رہ گئے۔

اسی طرح تصوف کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب اپنے اہل محبّت سیّد فصیح اللہ کاظمی کے نام ۱۴ر جولائی ۱۹۱۶ء کو ایک خط لکھا تھا:

"تصوف کے متعلق میں خود لکھ رہا ہوں میرے نزدیک حافظ کی شاعری نے بالخصوص اور عجمی شاعری نے بالعموم مسلمانوں کی سیرت اور عام زندگی پر نہایت مذموم اثر کیا۔ اسی واسطے میں ان کے خلاف لکھا ہے۔ مجھے امید تھی کہ

نوٹ: ڈاکٹر اقبال صاحب کے اس بایں ہمہ شدّت پر میں نے اپنی کتاب انوار کنز الایمان میں بڑی تفصیل مذہبی فتنوں کے تاریخی پس منظر میں ایک تفصیل بحث کی ہے جو دس سال پہلے مکتبہ غوثیہ ممبئی سے شائع ہو چکی ہے۔ محمد وارث جمال قادری۔

لوگ مخالفت کریں گے اور گالیاں دیں گے۔ لیکن میرا ایمان گوارہ نہیں کرتا کہ حق بات نہ کہوں شاعری میرے ذریعۂ معاش نہیں ہے کہ میں لوگوں کے اعتراض سے ڈروں[1]۔

تصوف کے تعلق سے اپنے جن جذبات کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے اپنے مکتوب میں کیا وہ اس کے لیے مامور من اللہ نہیں تھے۔ نہ دینی امام و پیشوا تھے کہ ایسا لکھنا ان کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ پھر بھی انہوں نے جو کچھ لکھا اپنی سمجھ سے

---

[1] خطوطِ اقبال ص ۱۲: محررہ ۱۴ر جولائی ۱۹۱۶ء بحوالہ تاریخ تصوف از ڈاکٹر محمد اقبال۔

من رای منکم منکرا الخ کے تحت لکھا۔

جبکہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا مجدد وقت تھے، مصلح امّت تھے، عظیم پیشوا تھے، دَور کے امامِ اعظم ابوحنیفہ وحضور غوث پاک کے نائب اکبر تھے۔ دینی مسائل اور دینی ضرورتوں میں پورے عالمِ اسلام کے مرجع تھے اور پورے عالمِ اسلام کے عظیم روحانی پیشوا بھی تھے۔ عرب وعجم، حل وحرم میں آپ کے علم وفضل کا ڈنکا بجتا تھا اور آپ کے فضل وکمال کا سورج سوا نیزے پہ چمکتا تھا۔ ایسے عالم میں آپ کے ارشادات وفرمودات جوعین تقاضائے دین ایمان ہیں۔ عین تقاضائے شریعت وطریقت تھا۔ وہ شدّت کیونکر ہوگئی اور شدّت بھی کیسی؟ کہ جس نے انہیں وقت کا امامِ اعظم نہیں ہونے دیا۔ ہم بروقت یہ فیصلہ دینے سے قاصر ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کو مقامِ مدح میں شمار کریں یا وضع میں!

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ
اے اسیرانِ چمن میں نوگرفتاروں میں ہوں

یہ موضوع تو بہت تفصیل طلب ہے اور اس کے لیے الحمدللہ میرے پاس میٹریل بھی وافر مقدار میں موجود ہے۔ مگر میری مصروفیات کی ہمہ جہتی اور ممبئی کی مشینی زندگی اس پر مستزاد ہے۔ حضرت مولانا بالفضل مولانا رحمت اللہ صدیق صاحب جن کے اخلاص پیہم نے وقت نکالنے پر مجبور کیا اور جنہوں نے پورے مستعدی کے ساتھ سر پر کھڑے رہ کر مضمون سپردِ قلم کرایا۔ اور مجھے اتنا بھی نہیں موقع ملا کہ میں اسے نظرِ ثانی کرسکوں۔ نوک وپلک کی درستگی الگ رہی! نوک وپلک کی خامیاں میری طرف کردیں اور اس کا حسن مولانا محترم کے جذبۂ اخلاص کی نذر کردیں۔

مولای صلّ وسلّم دَائمًا ابدًا
علی حبیبك خیر خلق کلهم

☑☑☑☑☑☑

فکرِ رضا کو غیروں تک پہنچایا جائے!

اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مجددِ دین وملت، شیخ الاسلام والمسلمین، معجزۃ من معجزات سید المرسلین سیدنا اما احمد رضا بریلوی اور آپ کے حیرت انگیز علمی وفکری اور جاوداں کارناموں پر (اپنوں کے افسوس ناک تغافل، سستی، تن آسانی اور کاہلی کے سبب) ٹھنڈی دھول اور ایک عالمی ومنظم سازش کے تحت اعاظم رجال کی صفوں اور قاموس المشاہیر کی فہرست سے خارج کردیا گیا، اور وہ چند مشتِ خاک جو اس عبقری الشرق کی بارگاہِ علم وفضل میں خوشہ چینی کے بھی اہل نہیں تھے، فرضی تذکروں، من گھڑت تاریخوں، بددیانت صحافت اور قلم کی خرید وفروخت کے ذریعے انھیں افلاک بنادیا گیا اور دنیا کو یہ باور کرادیا گیا کہ اندھوں کی اس بڑی بستی میں یہی چند کانے راجہ ومہاراجہ ہیں۔ اور بس! ہائے رے گردشِ ایام! رات کو دن، سفید کو سیاہ اور اندھیرے کو اُجالا بنادیا گیا۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتادو قاعدہ　　　اے اسیرانِ چمن میں نو گرفتاروں میں ہوں

حاسدین، مانعین، ظالمین، کاذبین ومکذبین اور اعدائے دین نے مسلسل پچاس سالہ دن ورات کی سخت ترین کوششوں اور اَن تھک کردار کشیوں کے بعد مطمئن ہوکر سانس لی کہ برصغیر ہند میں احمد رضا بریلوی کی شکل میں جو آفتابِ فضل وکمال تھا اسے کذب واِفترا، دجل وفریب کی وادیِ ظلمات میں، پنہائیوں اور گہرائیوں کے تحت الثریٰ میں اس طرح سے دفن کردیے ہیں کہ اس کے وجود کی تمازت تو الگ رہی، اس کی ایک جھلک بھی باہر نہیں آسکتی قاتلھم اللہ انّٰا یوفکون۔

فطرت ان کی خام خیالی پہ مسکرا رہی تھی اور قدرت ان کے ہمہ جہت وجود کے تاریخی نمود کا فیصلہ کرچکی تھی۔ چنانچہ دنیا نے کھلی آنکھوں سے یہ نظارہ کرلیا کہ سبیلِ نور کی طرح حقیقت کا دائرہ کیسے پھیلتا ہے، اور فضل وکمال کے سورج کا سوا نیزے پر چمکنا کس کو کہتے ہیں؟ ذٰلك فضل اللہ یوتیہ من یشاء بغیر حساب۔ رب العزت جل جلالہٗ نے اپنے بندۂ خاص امام احمد رضا کے بے کراں وجود کی ہمہ جہت اُجالوں سے کائناتِ علم وفضل کو چکاچوند کرکے جہانِ رضا کو سرخوشی و سرمستی سے مالامال کردیا۔ فلحمدللہ رب العٰلمین۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے امام اہلِ سنّت کے خلاف مکر وفریب اور کردار کشی کے تمام تار وپود اور کذب وافترا کی ہری بھری ساری کھیتیوں کو حقیقت کے بے رحم سورج کی تیز شعاؤں میں جلا ڈالا۔ بالآخر اس حقیقت کا برملا اعتراف کرنا ہی پڑا؎

جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون

یہاں ہندوستان میں اس امرِ عظیم کا بنیادی وتاریخی کریڈٹ اور ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند کا سہرہ خانوادۂ

اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ کے سر بندھتا ہے۔

آج سے تقریباً ۲۵ ر برس پہلے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے تلمیذ رشید اور خلیفۂ اجل محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی کے اخلاف یعنی صاحبزادگان ونبیرہ زادگان واہلِ محبت نے کمر ہمت کسی کہ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے روشن و عظیم اور جاوداں کارناموں پر حاسدین، مانعین اور اعدائے دین نے جو دھول دھبّہ اور کوڑا کباڑا ڈال رکھا ہے، اسے ہٹایا اور صاف کیا جائے اور اغیار کی بنائی فرضی وقلمی تصویر کو حقائق کے تیز آنچ میں جلا دیا جائے اور اس آئینۂ جمال و کمال کو جدید دانش کدوں میں بھی ایک چیلنج کی حیثیت سے پیش کردیا جائے کہ صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے! تا کہ اعلیٰ حضرت اپنے تمام تر فضل و کمال، جاہ وجلال اور پوری جرأتِ مومنانہ کے ساتھ دلوں کے نہاں خانوں میں پوری عقیدت و محبت کے ساتھ جلوہ افروز ہوجائیں ۔ اُٹھ میرے دھوم مچانے والے

چنانچہ پوری تندہی، جفاکشی و دیانت داری سے اس کارِ عظیم کو انجام دیا۔ اور اپنے ماہ نامہ "المیزان" کے امام احمد رضا نمبر اور اس نمبر کے اجرا کے لیے امام احمد رضا کانفرنس کے ذریعے ایک کارنامہ انجام دیا فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء من جماعۃ اھل السنۃ۔

اس عظیم ومبسوط اور تاریخی نمبر نے یہاں ہندوستان میں کالجوں، یونیورسٹیوں اور بڑے بڑے دانش کدوں کے دروازے امام اہلِ سنّت پر ریسرچ وتحقیق کے لیے کھول دیئے اور احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان پر کام کرنے کے لیے نئی جہتیں اور نئی سمتوں کے لیے یہ خصوصی نمبر بڑا ممد ومعاون ثابت ہوا۔ اور پہلی بار اجتماعی طور پر جدید دانش کدوں کے عظیم دانش وروں شاز اور جامعات کے اصحابِ فضل و کمال نے امام عشق ومحبت کی ذات اور ان کی جہات وخدمات علمی، فکری اور دینی کارناموں کو بڑی سنجیدگی کے ساتھ بحث وتحقیق کا موضوع بنایا۔ اور آج فکر رضا کی ترویج واشاعت اور ان پر کام کرنے کے لیے یہ نمبر ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کی ملک وبیرونِ ملک میں بڑی پذیرائی ہوئی اور خاص کر مملکت خداداد میں تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وہاں بڑے ہی خوب صورت و باوقار انداز میں اس کی خصوصی اشاعت "انوارِ رضا" کے نام سے ہوئی۔ فلحمد للہ رب العٰلمین۔ بے شک یہ خانوادۂ اشرفیہ کا ایک ایسا تعمیری کارنامہ ہے کہ اس سے پہلے جہانِ عالم میں جہانِ رضا کے لیے اس کی طرح کوئی دوسری مثال تھی اور نہ ہے۔ اس نمبر کا ایک خوب صورت ایڈیشن چندسال قبل ماہ نامہ قاری دہلی نے بھی شائع کیا اور آج بھی اس کی مانگ برقرار ہے۔

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

ادھر مملکتِ خداداد پاکستان میں قادر وتوانا رب العزت جل جلالہ نے اپنے ایک ناتواں بندے اور ایک بوڑھے وجود (۱) میں سیکڑوں نوجوانوں کی توانائیاں، عزم وحوصلہ اور استقامت اور اپنی ذات پر بے پناہ توکّل کی دولت ودیعت فرما

---

۱) مراد اس سے حکیم اہلِ سنّت محترم ومکرم حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمہ کی ذات ہے۔ اور چراغِ محبت سے مرکزی مجلس رضا لاہور مراد ہے، جس کے گرداگرد انھوں نے اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کی حیات وخدمات پر کام کرنے والوں کی ایک پُرخلوص جماعت تیار کردی ہے اور آج بھی فکر رضا کو جوت جل رہی ہے، اس میں سب سے بڑا حصہ انہی کا ہے۔ دین وسنیت کے اسی بےلوث خادم بوڑھے مگر پُرعزم مجاہد حکیم موسیٰ امرتسری کا۔

کراسے عزم واستقلال اور ہمت وحوصلہ کا ایک ناقابلِ تسخیر جہاں بنا کر اسی کے ہاتھ ایک چراغِ محبت سرِ راہ جلایا، بادِ مخالف اور گرم حالات کی تیز وتند آندھیوں میں بھی اسے محفوظ رکھا۔ اور آج اسی چراغِ محبت سے برصغیر ہند وپاک، یورپ وامریکہ وافریقہ میں سیکڑوں چراغ جل اُٹھے اور جلتے ہی جارہے ہیں۔

جہانِ رضا کے لیے اس مقدس چراغ کی عطا ہیں: پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، جن کا وجود با مسعود دنیا جہاں بھر کے اہلِ محبت کی محافل محبت میں عنوانِ محبت بنا ہوا ہے۔ اور یہ بلند وبالا ناموراور دین وسنّیت کے لیے مخلص شخصیتیں جہانِ رضا کو میسر آئی ہیں تو اسی چراغِ محبت کے حوالے سے۔ علامہ قاضی عبدالنبی کوکب، علامہ غلام رسول سعیدی، علامہ عبدالحکیم شرف قادری، پروفیسر شیر محمد اعوان، پروفیسر منیر الحق کعبی، محترم علامہ پیرزادہ اقبال احمد فاروقی، علامہ محمد منشا تابش قصوری اور ایک متنازعہ مگر بہت مشہور صاحب علم شخصیت پروفیسر طاہر القادری ان کے علاوہ اور بھی بہت سی قابلِ احترام و نامور شخصیتیں ہیں جن کا نام بروقت مستحضر نہیں۔

ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی، جہانِ رضا لاہور، رضا فاؤنڈیشن لاہور، رضا اکیڈمی لاہور، سنّی رضوی سوسائٹی ساؤتھ افریقہ، تحریک فکر رضا بمبئی، ادارۂ صدر الافاضل بمبئی، رضا اکیڈمی بمبئی، رضا دار الاشاعت بریلی شریف، دار القلم دہلی، حجازِ جدید وقاری دہلی۔۔۔اسی چراغِ محبت کی صدائے بازگشت ہیں۔

اور آج تو اعلیٰ حضرت پر کام کرنے والوں کا ایک کاروانِ محبت تیار ہوچکا ہے۔ حضرت علامہ محمد احمد مصباحی بھیروی، علامہ عبدالمبین نعمانی، علامہ یٰسین اختر مصباحی، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم مصباحی، مولانا مبارک حسین مصباحی، مولانا عارف اللہ مصباحی، مولانا محمد فروغ القادری، علامہ قمر الزماں اعظمی، علامہ قمر الہدیٰ مصباحی، مولانا بدر عالم مصباحی، مولانا انوار احمد اندوری اور گرد کارواں محمد وارث جمال قادری۔ الغرض یہ فہرست بہت طویل ہے۔ کہاں تو ایک وقت وہ تھا کہ اہلِ سنت و جماعت میں ایک مستقل جمود اور سناٹے کا عالم تھا اور آج برصغیر ہند وپاک میں قلم کا سیلِ رواں موجِ دجلہ بنی ہوئی ہے۔ مگر فلحمد للہ علیٰ منہ واحسانہ۔

فکر رضا کو ہر محفل اور ہر طبقۂ فکر تک پہنچانے کے لیے ہمیں پا بہ رکاب ہی رہنا ہے۔ ہمیں مطمئن نہیں ہونا ہے اور نہ اس نیت سے پیچھے مڑ کر دیکھنا ہے کہ اس محاذ پر اب بہت کچھ ہوچکا ہے۔ ہماری یہ تمام اجتماعی وانفرادی کوششیں اور یہ ساری ترکتازیاں ان کے ہمہ جہت وجود کے سرحد ادراک ہی تک پہنچی ہیں۔ یقین جانیں ہمارے مقصد زریں کا سدرۃ المنتہیٰ ابھی بہت دور ہے۔ اس راہِ محبت میں ایک منزل پر پہنچ کر فوراً دوسری منزل تک اس عزم کے ساتھ چل پڑنا ہے کہ

جنوں کی خیر ہو بھیجا ہے پھر بہاروں نے
سلام میرے گریباں کے تار تار کے نام

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا جہاں ایک زبردست عالم دین، فقیہ، متکلم سوادِ اعظم کے ایک عظیم روحانی مقتدا اور مشہور عاشق رسول تھے، وہیں انھیں تاریخ، تنقید، نحو، لغت، عروض، ادبیات، سیاسیات، اقتصادیات، معاشیات، عمرانیات کے

ساتھ علوم وفنونِ عقلیہ پر بھی حیرت ناک عبور تھا۔ وہ علومِ قدیمہ وجدیدہ کے مجمع البحرین تھے۔اور بعض علوم تو انھوں نے خود ہی ایجاد فرمائے۔ ان علوم عقلیہ کے حوالے سے بھی ہمیں ہمہ وقت اس مہم کے لیے تازہ دم رہنا ہے۔اس راہِ محبت میں میرا خود ایک چھوٹا سا تجربہ ہے، جو صرف اس نیت سے سپردِ قلم ہے کہ یہ کسی اور کے بھی کام آجائے۔

میرے مخلص دیرینہ محترم مولانا محمد اسمٰعیل عزیزی اعظمی جو اِن دنوں فیملی کے ساتھ لندن کے قریب کسی شہر میں سکونت پذیر ہیں۔ ان کے خالہ زاد بھائی محترم اشتیاق احمد رضوی جو ان دنوں جوزف پیٹر کالج، مجگاؤں بمبئی ۱۰ میں انگلش کے ٹیچر تھے۔ کافی سنجیدہ، متین، بُردبار اور وجیہہ۔ وہ مجھ سے بڑی محبت رکھتے تھے اور تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن وہ بڑی پابندی کے ساتھ مجھ سے ملنے دوٹانکی آیا کرتے تھے۔ وہ بھی ان دنوں خدا کے فضل وکرم سے مع فیملی بحرین مستقل سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔ وہاں بھی اسی مقدس پیشے سے وابستہ ہیں۔ وہاں کے کسی جدید دانش کدہ میں پروفیسر ہیں اور جب بھی اپنے وطن انڈیا آنا ہوتا ہے تو اسی محبت ونیازمندی کے ساتھ وہ ضرور ملنے آتے ہیں۔

یہ ان دنوں اردو زبان وادب کے مشہور محقق، شاعر وادیب عالی جناب کالی داس گپتا رضؔا کی بچّی کے ٹیوٹر بھی تھے۔ وہ جب بھی تشریف لاتے، گپتا رضا صاحب کا تذکرہ بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ اس وقت تک میں ان سے بالکل نا آشنا تھا، جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بیس سال کینیا افریقہ میں رہ کر غالباً جلد ہی اپنے وطن ہندوستان میں مستقل رہنے کے لیے آئے تھے۔

اشتیاق صاحب جب بھی آتے گپتا رضا صاحب کا تذکرہ کہیں نہ کہیں سے ضرور نکال لیتے۔ کبھی ان کی تصنیفات پر ایوارڈوں کا تذکرہ کرتے، کبھی اُن کے ادبی ذوق اور کبھی فکری بلندیوں کا۔ ان کے نام کے ساتھ رضؔا تخلص نے مجھے اس طرف متوجہ کیا۔ میرے استفسار پر انھوں نے گپتا صاحب کا غائبانہ تعارف بڑی گرم جوشی کے ساتھ کرایا۔ میں نے اعلیٰ حضرت کے دیوان ’’حدائق بخشش‘‘ کے دو حصّے جو اُس وقت میرے پاس موجود تھے، انھیں دیتے ہوئے کہا: اسے اپنی طرف سے گپتا صاحب کی خدمت میں نظر پیش کریں۔ انتہائی غیر معیاری کاغذ وکتابت وطباعت جسے دیکھ کر ذوقِ لطیف مکدّر ہو جائے، اس پر کتابت کی غلطیاں بڑی فیاضی کے ساتھ مستزاد۔ اس وقت اسی طرح کے ہی نادر نسخے دستیاب ہوا کرتے تھے۔ کِیا بھی کیا جاسکتا تھا۔ میں نے انھیں تاکید کی، اسے پڑھنے کے بعد وہ جو بھی تبصرہ کریں، اس سے مجھے آگاہ کریں۔ چنانچہ یہ خدمت انھوں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دی اور دوسری بار جب مجھ سے اپنی عادت کے مطابق ملنے تشریف لائے تو انھوں نے کہا: گپتا صاحب تو کتاب پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔ البتہ اس کی شکل وصورت پر افسوس کر رہے تھے۔ میں نے کہا: اشتیاق بھائی! آپ ان سے میرے لیے کچھ وقت لے لیں۔ میں فوراً ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا: میں کوشش تو کروں گا مگر بزی بہت رہتے ہیں وہ۔

پھر ایک روز وہ بہت خوش خوش آئے کہ چلیے مولانا! انھوں نے صرف ۱۵ ؍ منٹ کا وقت دیا ہے۔ پھر دبی زبان سے کہا کہ ٹائم کا خیال رہے۔ وہ لوگ ٹائم کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ میں نے کہا: اشتیاق بھائی! فکر نہ کریں۔ میں اس معاملے

میں خود ہی بڑا حسّاس ہوں۔

پھر وہ مجھے لے کر بمبئی کے اے کلاس کے ایریا جو سمندر کے کنارے واقع ہے، نیپنسی روڈ پر واقع جل درشن بلڈنگ میں ان کے وسیع و عریض فلیٹ میں پہنچے۔ گپتا صاحب نے دل نواز تبسّم کے ساتھ خوش گوار موڈ میں خیر مقدم کیا۔ اور مہمان نوازی کی اعلیٰ قدروں کا مظاہرہ کیا۔ ان کے وسیع و عریض ڈرائنگ روم کو دیکھ خوش گوار حیرت ہوئی کہ ڈرائنگ روم کم ایک خوب صورت لائبریری زیادہ تھی۔ دیواریں خوب صورت الماریوں کا شوکیس، ان میں اردو کے مجلدات سجے ہوئے، جن میں ۴۰۰ر اردو شعرا کے دواوین تھے۔ جنھیں دیکھ کر گپتا صاحب کی علم دوستی، اردو نوازی اور اعلیٰ ذوق کا پتہ چلتا تھا اور یہ تو بہت برسوں کی بات ہوگئی، اب تو ان کے ذخیرۂ علم و ادب میں اور اضافہ ہوا ہوگا۔

آداب میزبانی کے خوش گوار مرحلے سے گزرنے کے بعد گپتا صاحب متعلقہ موضوع پر خود ہی آگئے۔ پہلے تو انھوں نے میرے سامنے محترم اشتیاق صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی مہربانیوں و نوازشوں سے مجھے دیوان حدائق بخشش دستیاب ہوا اور میں ایک اساتذہ کی صف کے بڑے شاعر کے کلام سے شرف یاب ہوا۔ پھر اس کی کتابت و طباعت پر افسوس ظاہر کیا کہ اتنا اونچا کلام اور اس کے ساتھ یہ سلوک! سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے فرمانے لگے۔ جوں ہی مولانا احمد رضا خاں کا یہ دیوان مجھے ملا، میں نے پڑھنا شروع کیا۔ اس کی ظاہری صورت سے کوفت ہونے کے باوجود میں اسے پڑھتا گیا۔ حیرت و استعجاب اور سرخوشی کے ایک عجیب کیف کے عالم میں! اور ساتھ ہی افسوس بھی ہو رہا تھا کہ ایسے باکمال اور اساتذہ کے صف اوّل کے شاعت سے اب تک میں ناواقف کیوں رہا؟ پھر مجھے اپنی کتابوں کے شوکیس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا: مولانا! اس ذخیرے میں صرف ۴۰۰ر کتابیں اور دواوین شعرائے قدیم و جدید اور ان کی تاریخ و تذکرے پر مشتمل ہیں، جنھیں میں بالاستیعاب دیکھ و پڑھ چکا ہوں مگر مجھے سخت حیرت و افسوس ہے کہ ان تمام تذکروں میں کہیں بھی اتنے عظیم و باکمال شاعر کا تذکرہ نہیں۔ مجھے بڑی حیرت ہے کہ آخر ایسا ہوا کیوں؟ پھر ایک کتاب جو سب سے آخر میں میرے پاس آئی تھی ''خم خانہ جاوید'' ڈاکٹر ظہور الحسن شارب کی، اسے میں نے اس اُمید پر اُٹھایا کہ شاید اس میں مولانا مرحوم کا تذکرہ مل جائے۔ مگر اس میں بھی حسن رضا بریلوی مرحوم کے تذکرے کے ضمن میں صرف اتنا ملا کہ حسن بریلوی مرحوم نعت گوئی میں اپنے بڑے بھائی مولانا احمد رضا خاں کے شاگرد تھے۔ پھر گپتا صاحب مولانا حسن رضا خاں بریلوی کے تذکرے میں ڈوب گئے کہ وہ ایک باکمال شاعر تھے، مجھے تو ان سے غایت درجے کا انس ہے۔ جس کی ایک خاص وجہ بھی ہے کہ وہ میرے اُستاد بھائی بھی ہوتے ہیں۔ مجھے بھی بالواسطہ اس باکمال اور باعث صد افتخار ذات سے نسبتِ تلمذ حاصل ہے۔ جس بارگاہ سے مرحوم مولانا حسن رضا خاں کو حاصل تھا یعنی فصیح الملک حضرت داغ دہلوی۔ اس پاکیزہ نسبت سے وہ میرے اُستاد بھائی بھی ہوئے۔ اس لیے ان سے اُنسیت اور ان کے حالات سے آگاہی میرے لیے ایک فطری تقاضا بھی تھا۔ مولانا حسن رضا بریلوی براہِ راست تلمیذ رشید تھے حضرت داغ کے، جبکہ مجھے حضرت جوش ملسیانی کے واسطے سے حضرت داغ دہلوی سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔

پھر انھوں نے حدائق بخشش کے چند مقامات سے نعتیہ اشعار سنائے اور اس پر بھر پور عالمانہ تبصرہ کرتے رہے جو انھیں کا حصّہ تھا۔ داغ، غالب، امیر مینائی جیسے اُستاد شعرا کی مشکل زمین اعلیٰ حضرت کی نعت کا تقابلی جائزہ لیتے اور سر دُھنتے رہے کہ مولانا احمد رضا خاں نے کمال کر دیا۔ غزل کی مشکل زمین پر اشعار وہ بھی نعتیہ اشعار، جہاں دونوں طرف سخت حد بندی! اور خاص کر ایک رُخ تو انھوں نے بہت سراہا، وہ یہ کہ مختصر طبع آزمائی یہ بہت دُشوار ہے۔ اس زمین پر طبع آزمائی اور کامیاب طبع آزمائی صرف خواجہ میر درد کا خاصا رہا ہے۔ مگر یہاں تو خواجہ میر درد بھی پانی بھرتے نظر آرہے ہیں۔ مختصر بحروں میں اتنی شاندار طبع آزمائی اتنی سُبک خرامی اور بھر پور معنویت کے ساتھ!

پھر وہ حدائق بخشش کو ہاتھ میں لے کر مختصر بحروں میں اعلیٰ حضرت کی نعت بڑے ہی وجد و کیف کے عالم میں جھوم جھوم کر سناتے اور اس پر عالمانہ تبصرہ کرتے رہے۔

''سب سے اوّل، سب سے آخر''۔ مولانا! یہ ایک مصرعہ مکمل ہو گیا اور دو لفظوں میں پورا شعر یوں مکمل ہوتا ہے۔ ''ابتدا ہو، انتہا ہو'' حد کر دی مولانا مرحوم نے ایجاز کی پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے: مولانا! آپ تو عالم فاضل ہیں، ہم جیسے لوگ بھی اس شعر کی تشریح کرنے بیٹھ جائیں تو صفحات کے صفحات بھر جائیں!

میں نے مقررہ وقت کے پیش نظر کئی بار بساطِ کلام کو سمیٹ کر اجازت لینی چاہی۔ مگر انھوں نے اُٹھنے نہیں دیا۔ فرمایا: بھول جائیے، دیئے ہوئے وقت کو کہاں روز ایسی مجلس میسر ہوگی۔

پھر اسی نعت کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پڑھنے لگے ؎

سب بشارت کی اذاں تھے تم اذان کا مدّعا ہو
سب تمہارے در کے رستے ذاتِ حق تک تم رسا ہو
سرِ مکتوم ازل میں درِ مکنون خدا ہو

سرِ مکتوم ازل پر ان کی تشریح سے میں خود بھی بہت محظوظ ہوا، اور اسلامیات پر ان کے وسعتِ مطالعہ کا معترف بھی اور جب وہ نعت کے اس شعر پر پہنچے اُٹھے اور اس کی اتنی بار تکرار کی کہ جیسے گراموفون کی سوئی ایک جگہ پر رُک گئی ہو۔

سب تمہاری ہی خبر تھے تم مؤخر مبتدا ہو

اور پھر جب مؤخر مبتدا کی نحوی ترکیب کی اور اس پر روشنی ڈالی، تو میں عش عش کر رہا تھا اور ان کی وسعتِ اطلاع کو خراجِ تحسین پیش کر رہا تھا۔

اعلیٰ حضرت کی اس صنعتِ ایجاز پر ان کی خصوصی دل چسپی دیکھ مجھے حوصلہ ہوا اور میں نے عرض کیا۔ جنابِ عالی! ابھی اس صنعت پر جو آپ نے روشنی ڈالی، اس سے میری بھی معلومات میں قدرے اضافہ ہوا۔ تو پھر ایک صنعت کی طرف اور آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ اور اپنے استفادے کی غرض سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی اس لائبریری میں رکھے ہوئے ان سیکڑوں دواوین میں اس کی کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے؟ (چونکہ انہی دنوں میں اپنی تصنیف ''امام شعر

وادب'' سے تازہ تازہ فارغ ہوا تھا، اس لیے شعر و سخن کی اصناف اور صنائع بدائع بہت حد تک مستحضر تھیں) میں نے صنعتِ اتصال تربیعی کا ذکر کیا اور پھر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں کے کلام میں یہ صنعت بھی پائی جاتی ہے۔ اور مثال میں فارسی زبان کی وہ منقبت جو آپ نے محبوبِ سبحانی قطب ربانی، غوثِ صمدانی، محی الدین گیلانی حضرت سیدنا و مرشدنا، مولانا شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں عرض کیا ہے ؎

جات بالا تر ز وہم جائہا　　جائہا خود ہست بہر پائے ہا

پائے ہا چہ بود کہ سر با زیر پات　　پات ہم کے چوں فرود آئی ز جات

میں نے کہا: یہ صنعت اتصال تربیعی کی ایک اعلیٰ مثال ہے جو امام احمد رضا بریلوی کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ شعر و ادب کے موضوع پر چونکہ آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اس لیے میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کے علم میں کوئی صاحبِ دیوان شاعر ایسا ہے جس کی یہاں یہ صنعت بھی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا کہ مجھے اس وقت کوئی صاحب دیوان شاعر ایسا نہیں یاد آرہا ہے کہ جس کے یہاں یہ صنعت ہو، البتہ اس صنعت پر اردو زبان کی ایک مثال مجھ سے سُن لیجیے، مگر واضح رہے کہ شاعر گمنام ہے اور صاحبِ دیوان نہیں! پھر انھوں نے اسی صنعت پر ایک نفیس کلام پیش کیا۔ جو کافی عرصہ گذر جانے کی وجہ سے نہ وہ شاعر یاد رہ گیا اور نہ ہی اس کا کلام۔ پھر روئے سخن نعتیہ شاعری کی طرف اور آگے بڑھا اور انھوں نے جان محمد قدسی علیہ الرحمہ کے اس مطلع کو کافی سراہتے ہوئے کہا ؎

مرحبا سیدی مکّی مدنی العربی

دل و جاں بعد فدایت چہ عجب خوش لقبی

محمد جان قدسیؔ گپتا صاحب محمد جان ہی کہتے تھے، کی یہ نعت ایسی مشہور ہوئی کہ دلی اور اس کے اطراف کے ڈیڑھ سو مشہور شعرا نے اس پر تضمین کہی، جو اس نام سے ایک کتاب کی شکل میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ میں اس کتاب کا نام بھی بھول چکا ہوں۔ اے کاش! مجھے اس وقت اگر یہ ذرا بھی احساس ہوتا کہ اس علمی و ادبی ملاقات کو مجھ قلم بند بھی کرنا پڑے گا تو میں اس کے جزئیات تک قلم بند کر لیتا، اگر ایسا ہو گیا تو اس علمی و ادبی مذاکرے کو ایک مبسوط مقالے کی شکل دی جا سکتی تھی۔

اس کے کچھ ہی دنوں بعد یہاں بمبئی میں ادارہ ''المیزان'' کی طرف سے ایک عظیم، تاریخی اور مبسوط امام احمد رضا نمبر کی تیاریاں شروع ہو گئیں، جسے خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اُس وقت کے مشہور صاحبِ قلم محترم مکرم حضرت علامہ محمد احمد مصباحی مبارک پوری مرحوم ابن بحر العلوم علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ اعظمی کی خصوصی خدمات حاصل کی گئیں۔ انھیں ایام میں ایک روز علامہ مصباحی مجھ سے ملنے تشریف لائے اور انھوں نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ خانوادۂ اشرفیہ سرکار اعلیٰ حضرت پر ایک عظیم و تاریخی نمبر نکالنے جا رہا ہے۔ جس کے لیے خطوط متعین ہو چکے ہیں۔ اس کا ایک خاکہ تیار ہو چکا ہے۔ اس کے لیے مجھے خصوصی طور پر مبارک پور سے بلوایا گیا ہے۔ اور اس کام کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ مگر وہ محفل میرے لیے بڑی اجنبی و نامانوس ہے۔ میں بڑی تنہائی و بوریت محسوس کرتا ہوں۔ کبھی کبھی جیلانی میاں صاحب کام کی دیکھ

ریکھ کے لیے آجاتے ہیں، تو چہرے پر رونق آجاتی ہے ورنہ وہی بے نام سی اُداسی وتنہائی۔ وہاں اپنے ہم جنسوں کی صورت کبھی کبھی ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اگر آپ میرا ساتھ دے دیں تو ایک بڑا کام ہوجائے گا، ورنہ میں یہ تنہائی نہیں جھیل پاؤں گا۔ اگر میں چلا گیا تو یہ کام التوا میں پڑ جائے گا۔ میں نے انھیں ڈھارس بندھائی اور یقین دلایا: چلیے! میں قدم بہ قدم آپ کے ساتھ ہوں۔ پھر میں بالالتزام جب تک کام مکمل نہیں ہوگیا بعد نمازِ عشاء سے لے کر رات ایک کبھی دو بجے تک ہم لوگ بھڑے رہتے اور اس نمبر کی ترتیب اور اس کے نوک و پلک سنوارنے میں مصروف رہتے۔ علامہ سید جیلانی میاں اپنے متحرک وفعال ساتھیوں کے ہمراہ نمبر کی طباعت، مضامین کی حصول یابی اور امام احمد رضا کانفرنس کی تیاریوں اور ان مراحل کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں مصروف تھے۔

یٰسین انصاری مرحوم جو اسی سال غریق رحمت ہوئے ہیں، یہ حضور مفتی اعظم کے مرید تھے۔ انھوں نے اس نمبر اور کانفرنس کے سلسلے میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ مدن پورہ کی اہم ترین شخصیت میں ان کا شمار تھا۔ تنہا اپنی ذات میں وہ ایک انجمن تھے اور ان کا دماغ ہر دم بیدار رہتا تھا۔

اس سارے ہنگامۂ شوق کے انتظامیہ کی حقیقی باگ ڈور انھیں کے ہاتھوں میں تھی۔ حالات کی نبض پر بڑی مہارت کے ساتھ انھیں انگلیاں رکھنا آتا تھا۔ اس کارِ عظیم کے لیے علامہ سید جیلانی میاں کے مشورے سے مولانا مصباحی صاحب ایک بلند معیار مقرر کر چکے تے۔ میرے ذمے انھوں نے یہ ٹیڑھا و نازک کام سپرد کیا تھا کہ جو بھی مقالہ غیر معیاری پائیں، اس پر بڑی بے دردی سے قلم چلا دیں۔ ہمیں لکھنے والوں کی دل جوئی ہی کو صرف نہیں دیکھنا، بلکہ سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کو اسلامیانِ ہندو پاک کے دانش کدوں، جامعات اور لائبریریوں کو ایک قیمتی تاریخی و دستاویزی سرمایہ بھی دینا ہے۔ اس کے باوجود اس تاریخی نمبر میں کچھ مضامین ایسے بھی شامل ہوگئے جو مولانا مرحوم کے مقرر کردہ بلند معیار سے قدرے کم ہیں۔ اور یہ شاخسانہ ہے مولانا کی فطری نرم روئی، نرم خوئی، نرم دلی کے سبب خیالِ خاطر احباب کا۔ میں نے انھیں مسترد کرنے کے لیے قلم چلانے سے پہلے مولانا کی طرف دیکھا تو بڑی دھیمی ومیٹھی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ برسوں ہوئے مولانا اپنے رب کی بارگاہِ رحمت میں آرام فرما ہیں مگر سچ یہ ہے کہ عظیم نمبر کے حسنِ ترتیب، اس کی آراستگی اور اسے تاریخی و دستاویزی بنانے میں مولانا محمد احمد مصباحی مرحوم کا خونِ جگر شامل ہے۔ انھیں نہ تو نام ونمود کی طلب تھی، نہ ستائش کی تمنّا، نہ داد وتحسین کی پرواہ۔ انھیں ایک عظیم کام کرنا تھا، سو وہ کر گزرے **ذٰلك فضل الله يعطيه من يشاء بغير حساب**۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت خانوادۂ اشرفیہ کچھوچھہ مقدسہ بالخصوص خانوادۂ محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی کا ممنون ومشکور واحسان مند ہے کہ انھوں نے ''المیزان'' کے امام احمد رضا نمبر کے ذریعے جو عظیم علمی، تاریخی وتعمیری کارنامہ انجام دیا ہے، وہ آج بھی بے مثال ہے اور جہانِ رضا کے لیے ایک بڑا سنگ میل بھی!

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس نمبر کے لیے میں نے مولانا مصباحی سے مشورہ کیا تھا کہ ''المیزان'' کی طرف سے ایک رجسٹرڈ خط کالی داس گپتا

رضا کے پاس جائے، جس میں ان سے امام احمد رضا پر ایک مقالہ کی فرمائش ہو۔علامہ مصباحی صاحب نے پوچھا کیا گپتا صاحب اعلیٰ حضرت سے متعارف ہیں؟ میں نے جواب میں اپنی تفصیلی ملاقات کا تذکرہ کر دیا اور بتا دیا کہ گپتا صاحب سے میرے مراسم بھی ہیں۔ یہ سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور کہا: مولانا! اگر انھوں نے اعلیٰ حضرت پر کوئی مقالہ لکھ دیا تو اس سے اِس نمبر کا وزن بڑھ جائے گا۔ میں فوراً ان کی خدمت میں ایک رجسٹری مکتوب بھیج رہا ہوں۔ چنانچہ ادھر میں نے مولانا مصباحی صاحب سے خط لکھوایا اور اُدھر میں نے براہِ راست گپتا رضا صاحب سے خصوصی گذارش کی اور اس انداز میں محبانہ اصرار کیا کہ انھوں نے خوش ہو کر لکھنے کا وعدہ فرمالیا۔ بالآخر وہ خوب صورت مقالہ زینت نمبر ہوا، جس کا عنوان ''مولانا احمد رضا خاں بحیثیت شاعر'' ہے۔جس کی اشاعت بار بار ہوئی اور برصغیر ہندو پاک کے علاوہ پورے جہانِ رضا میں اسے سر آنکھوں سے لگایا گیا۔ بے شک یہ جہانِ رضا میں جہانِ رضا کے لیے ایک خوب صورت اور شاندار اضافہ ہے۔ اس مقالے میں جگہ جگہ میرے ساتھ اس ادبی مذاکرے کی صدائے بازگشت بھی ہے۔

اردو زبان وادب کے نامور محقق، ادیب، نقّاد، شاعر و مصنف جناب کالی داس گپتا رضا آج بھی بقیدِ حیات ہیں اور اردو ادب کی خدمت میں مصروف۔ اب تو وہ دنیائے ادب کے لیے یہاں ہندوستان میں ایک تبرک کی حیثیت اختیار کر گئیں، مگر پھر بھی ان کا علمی، ادبی، قلمی سفر جاری ہے۔ اعلیٰ حضرت پر جو مقالہ انھوں نے سپردِ قلم فرمایا تھا اسے اپنی ایک تصنیف ''سہو وسراغ'' میں بھی شاملِ اشاعت کر چکے ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ایک عظیم مصنف کی طرف سے ایک یادگاری تحفہ کے طور پر محفوظ ہے۔ گپتا رضا صاحب نعت کے بھی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ ان کی نعتوں کا ایک مجموعہ ''اُجالے'' بہت پہلے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ ایک ملاقات میں انھوں نے بتایا تھا کہ افریقہ سے انتقالِ مکانی کے وقت میرے بہت سارے مسودے ادھر سے اُدھر ہو گئے اور میری نعتوں کی ایک بیاض بھی کہیں کھو گئی۔ ورنہ نعتوں کا یہ مجموعہ ''اُجالے'' اچھا خاصا ضخامت لیے ہوتا۔ ان کا نعتیہ کلام فکری طہارت کے ساتھ ہی اخلاص وعقیدت میں ڈ ﷺ ہوا ہے۔

یہ ہے دامن، یہ گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

☑☑☑☑☑☑

تراجم قرآن کے درمیان ترجمۂ کنز الایمان کی انفرادیت

قرآنِ مجید یہ اللہ تعالیٰ کی وہ مقدس وعظیم کتاب ہے جو صبحِ قیامت تک کے لیے تمام دنیائے انسانیت کے لیے ایک مکمل دستورِ زندگی اور ضابطۂ حیات ہے، جو ہمیشہ کے لیے ہر ترمیم وتصرف سے بہت بلند تر ہے۔ جس میں تمام علوم اوّلین و آخرین جمع کر دیے گئے، جسے اپنے آخری رسول اور اپنے محبوب ترین بندے حضور آقائے کائنات، روحِ کائنات، باعث تخلق کائنات حضور سیّدنا محمد عربی ﷺ نازل فرمایا۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ۔ (اے محبوب) ہم نے تم پر یہ کتاب اُتاری (جس میں) ہر شئے کا خوب روشن بیان ہے۔ یعنی ازل سے لے کر ابد تک، زمین سے لے کر آسمان تک، تحت الثریٰ سے لے کر عرشِ اعظم تک کی ہر شئے، ہر ذرہ، ہر قطرہ، ہر شوشہ، ہر گوشہ کا نہایت واضح، صاف اور روشن بیان ہے۔ پھر خود ہی اس کتابِ جلیل کی تعلیم اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کو دی: الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا ما کان و ما یکون کا بیان انھیں سکھایا۔

قرآنِ مجید کے نزول وتعلیم کا یہ سلسلہ تیئس (۲۳) برس کا احاطہ کیے ہوئے یعنی تنزیل وتعلیم قرآن ۲۳ برس میں مکمل ہوا۔ اور جس دن تنزیل قرآن کی تکمیل ہوئی اسی دن سے حضور ﷺ اپنے رب کی عطا وتوفیق سے عالمِ ما کان و ما یکون ہوئے۔ اور تمام امورِ غیبیہ وعلومِ غیبیہ آپ کے احاطہ علوم میں آ گئے۔

اور کوئی غیب کیا تم سے نہاں ہو بھلا
جب نہ خدا ہی چھپا تم پر کروروں درود

روئے زمین پر انبیاء ومرسلین کے بعد سب سے افضل واشرف ترین جماعت! جماعت صحابہ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ اجمعین) ہے جن کو خود احکامِ الٰہی و قرآنِ مجید کی تعلیم حضور آقائے کائنات ﷺ نے دی۔ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ چونکہ حضرات صحابہ نے براہِ راست بارگاہِ رسالت سے تعلیم پائی تھی اس لیے انھیں قرآن فہمی میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ یونہی تابعین عظام حضرات صحابہ سے فیض یاب ہوئے اس لیے قرآن کے حقائق ودقائق، رموز ونکات، تفسیر وتعبیر سمجھنے میں انھیں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس کے بعد اسلام کے اثر ونفوذ کا دائرہ وسیع تر ہو گیا اور دنیا کا بڑا حصہ اس کے زیر اثر آ گیا۔ اسلام کی برکتوں کے فیضان سے بڑی کثرت کے ساتھ عجمی اسلام میں داخل ہوئے جن کی زبان عربی نہیں تھی۔ نئے نئے حالات اور نئی نئی

ضرورتوں کے پیشِ نظر اسلافِ امّت اور علماء ربانین اور خدا کے برگزیدہ مخلص بندوں نے امّت مسلمہ کی سہولت و آسانی کے لیے قرآن میں نظر و استدلال، اجتہاد و استنباط وغیرہ کی ضرورت محسوس کی۔ جس کے نتیجے میں تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، اصولِ حدیث، نحو، صرف، عقائد و کلام، معانی و بیان، بلاغت و اسماء الرجال وغیرہ وغیرہ علومِ اسلامیہ کا ایک گراں قدر ذخیرہ دنیا کے سامنے آیا۔

جس سے معلوم ہوا زمانہ رسالت کے بعد ہی سے قرآن کی تفہیم، اس کے معانی و مطالب، قوانین، اصول، ارشادات و ہدایات کو عام کرنے کی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ ان کوششوں کو نقطۂ عروج اس وقت ملا جب اسلام کی انقلاب آفریں موجوں نے آدھی دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اسلام کی یہ انقلاب آفریں موجیں جہاں جہاں بھی پہنچیں ایشیا، یورپ، افریقہ، وغیرہ ہستی کے زلف برہم کو سنوارا، حیات کا چہرہ نکھارا، نیم جاں سسکتی انسانیت کو زندگی کا گرم گرم لہو عطا کیا جس کی بدولت کروڑہا کروڑ لوگ اسلام کی رحمتوں کے سائبان میں پناہ لیا۔

اسلام کی یہی قدآور اور انقلاب آفریں موجیں سبب بنیں قرآن کے معانی و مطالب، تفاسیر و تراجم کو کائنات بھر کی زبانوں میں پھیلانے کا۔ اور بحمدہٖ تعالیٰ دنیا کی تمام قابلِ ذکر زبانوں بلکہ محدود علاقائی زبانوں میں بھی قرآن کے تراجم موجود ہیں۔

چنانچہ عہدِ رسالت ہی سے مبلغین اسلام کی پُرخلوص کوششوں اور جذبۂ جہاد کی برکتوں کے فیضان نے اس عظیم ملک کو اپنے آغوشِ رحمت میں لیا۔ جس کے سبب یہاں سے کفر و شرک، جہالت کی تاریکیاں کافور ہوئی اور صدیوں کے جور و استبداد اور غیر انسانی برہمنی نظام کے وزنی چٹان تلے سسکتی کراہتی، آہ و فغاں کرتی انسانیت کو نجات ملی اور کروڑہا کروڑ شودر آتماؤں کو امن و شانتی میسر آئی۔ ؎

اے آمدنت باعث آبادی ما   ذکر تو بود زمزمہ شادی ما

اس طویل صبر آزما سفر میں اسلام اور مسلمانوں کو غیر معمولی رکاوٹوں اور سنگین تصادم کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حقیقت کے باوجود بیشتر کہ مزاحم قوموں نے اختلاف کے ساتھ ساتھ قبولِ حق کے لیے اپنے دل کے دروازے بھی کھول رکھے تھے اور اسلام کی حقیقت صادقہ اور اس کی برکتیں واضح ہو جانے کے بعد اسلام میں داخل بھی ہوئی۔ اذا جاء نصر اللہ والفتح وَرَأیت الناس یدخلون فی دین اللہ افواجًا کا جابجا زبردست مظاہرے ہوئے فلحمدللہ رب العٰلمین

اسلام کا مقابلہ دو طرح کی طاقتوں سے تقریباً ہر جگہ یکساں رہا۔ ایک طاقت کھل کر سامنے آتی رہی اور مختلف محاذوں پر اسلام و مسلمانوں کا زورِ بازو آزماتی رہی۔ اور ایک طاقت نے دامِ ہمرنگ کو اختیار کر کے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

ہندوستان میں بھی قدم قدم پر کچھ اسی نوعیت کے مرحلے پیش آئے۔ جب اسلام نے تمام تر مخالفتوں اور تصادم کے

باوجود یہاں زور پکڑ لیا اور پورا ہندوستان اس کے آغوشِ رحمت میں آ گیا۔ اور کھل کر مقابلہ آرائی کی قوت دم توڑ گئی تو اسلام کو نقصان اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت وشوکت اور جاہ واقبال کو فنا کرنے کی خفیہ طاقتیں عام ہمرنگ میں سرگرمِ عمل ہوئی۔ مگر اسلام کی آبرو سلامت! اس کا فیضان ہی کچھ ایسا رہا کہ اس کی حفاظت وصیانت میں اصحابِ سیف وقلم کی مبارک جماعتیں ہمیشہ کمربستہ رہیں، جن کی برکتوں سے گمراہیوں اور بے دینیوں کو زیادہ سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ علماء حق کی بصیرت اوران کا سیف قلم وزبان اسلام کے آہنی حصار کے چاروں طرف ہمیشہ چاق وچوبند رہا۔؎

بہر خواہی کہ جامہ می پوش   مَن انداز قوت رامی شناسم

علمائے حق کی انھیں بےلوث قربانیوں کی وجہ سے آج حق وباطل کے امتیاز میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ خصوصاً قرآنِ مجید کی طرف علمائے ربانیین نے خاص توجہ دی اور اس کی تفسیر پر کڑی نگاہ رکھی۔ کیضل بہ کثیرا ویھدی بہ کثیرا کے مطابق اہلِ حق کا مرکز استدلال تو قرآن تھا ہی! باطل نے بھی اپنی تباہ کاریوں، گمراہیوں اور فسوں طرازیوں کے لیے قرآن ہی کو سامنے رکھا۔ ماضی بعید میں خوارج، معتزلہ، قدریہ، جبریہ، خلق قرآن وغیرہ کی مثالیں سامنے ہیں۔

متحدہ ہندوستان میں حضرت علامہ شیخ وجیہہ الدین گجراتی علیہ الرحمہ (دسویں صدی کا نصف آخر) سے پہلے کوئی صاحبِ تفسیر نظر نہیں آتا، البتہ آپ کے بعد مفسرین کی ایک مناسب تعداد سامنے آتی ہے۔ قرآن کی تفسیر کے بعد اس کے ترجمے پر بھی کافی دھیان دیا گیا۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے کہ قرآنِ مجید کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام قابلِ ذکر زبانوں میں ہوا۔ خصوصاً دنیا کی مشہور ترین زبان انگریزی میں بہت سے ترجمے ہوئے جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں نے حصہ لیا۔

(۱) الیکزنڈر روس کا ترجمہ ۱۶۴۹ء میں پہلی بار لندن سے شائع ہوا۔ دوسری اور تیسری بار ۱۶۸۸ء، ۱۸۰۶ء میں امریکہ سے شائع ہوا۔

(۲) جارج پہلی مرتبہ ۱۷۳۴ء میں مترجم کے مقدمہ کے ساتھ لندن میں شائع ہوا جو اس قدر مقبول ہوا کہ پے در پے چھبیس (۲۶) ایڈیشن چھپتا رہا۔ صرف امریکہ میں وہ ترجمہ آٹھ بار چھپا۔ سرڈانسن روسی کے مقدمے کے ساتھ ۱۹۱۳ء میں بھی ہوئی اور اس کی آخری اشاعت ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔

(۳) روڈویل کا ترجمہ ۱۸۶۱ء میں پہلی بار لندن سے شائع ہوا اور مسلسل آٹھ ایڈیشن چھپتا رہا۔

(۴) اے۔ایچ پامر کا ترجمہ پہلی آکسفورڈ یونیورسٹی دو جلدوں میں ۱۸۸۰ء میں شائع کیا اور یہی ترجمہ ۱۹۰۰ء، ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں لندن سے شائع ہوا۔

(۵) محمد پک تھال عیسائی دنیا کا پہلا صاحب قلم ہے جس نے اسلام قبول کیا اور میر نظام حیدر آباد کی خواہش پر قرآنِ مجید کا انگریزی ترجمہ کیا جو لندن و نیو یارک سے حسب ترتیب ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔

(۶) ۱۹۰۵ء عبدالحکیم کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۷) محمد علی قادیانی کا ترجمہ ۱۹۱۶ء، ۱۹۲۰ء پھر ۱۹۲۹ء لاہور سے شائع ہوا۔
(۸) ۱۹۳۰ء میں غلام سرور کا ترجمہ آکسفورڈ یونیورسٹی نے شائع کیا۔
(۹) ۱۹۱۳ء میں مرزا ابوالفضل اور ۱۹۳۵ء میں عبداللہ یوسف کا ترجمہ لاہور سے شائع ہوا۔
(۱۰) لاطینی زبان میں سب سے پہلے قرآنِ مجید کا ترجمہ ۱۵۴۳ء میں سوئزرلینڈ سے شائع ہوا۔
(۱۱) ڈچ زبان میں قرآن کا ترجمہ سب سے پہلے ۱۹۴۱ء میں ہیمبرگ سے شائع ہوا۔
(۱۲) روسی زبان میں سب سے پہلے قرآن کا ترجمہ سینٹ پیٹرس برگ سے شائع ہوا۔
(۱۳) جرمن زبان میں سب سے پہلے قرآنِ مجید کا ترجمہ مشہور جرمن مصلح پروٹسٹنٹ فرقے کے بانی مارٹن لوتھر نے کیا۔ اسی ترجمے سے متاثر ہو کر اس نے عیسائیت کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ یہ مذکورہ بالا ترجمے صرف انگریزی، لاطینی، ڈچ، روسی اور جرمن زبان کے ہیں۔
(۱۴) ایم انڈر یوڑ ورائٹر نے ۱۶۴۷ء میں فرانسیسی زبان میں قرآنِ مجید کا ترجمہ کیا۔
(۱۵) سندھی زبان میں قرآن کا ترجمہ ۲۷۰ھ میں الور کے راجہ مہراق بن رائق کی خواہش پر ایک عراقی نے کیا۔
(۱۶) تلنگی میں نارائن راؤ ایم ایل ٹی اور ملیالم میں ایس ایس کرشنا راؤ بی اے نے کیا۔
(۱۷) مراٹھی میں حکیم صوفی میر یعقوب، گجراتی میں حاجی غلام علی حاجی اسمٰعیل، بنگالی میں نعیم الدین کا ترجمہ، عبرانی میں یعقوب حسن اسرائیل کا ترجمہ، چینی میں چن چا کے ۱۹۳۱ء میں کیا اور یونانی زبان میں ۱۹۳۱ء میں جو پٹیالی نے کیا۔ (بحوالہ ماہنامہ پاسبانِ محدثِ اعظم نمبر و روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی مؤرخہ یکم جنوری ۱۹۸۰ء)

ان کے علاوہ علاقائی، ملکی اور عالمی سطح پر بولی جانے والی اور بھی زبانیں جیسے فرانسیسی، پرتگیزی، اطالوی، ہسپانوی، سواحلی، فرنچ، انڈونیشین، ملایائی، اردو، فارسی، ہندی، گورکھی وغیرہ وغیرہ میں کثرت سے قرآنِ مجید کے ترجمے ہوئے۔ غالباً اور کسی الہامی کتاب کے متعلق اس طرح کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ قطع نظر اس کے کہ یہ تراجم اہلِ حق کے معیار پر پورا اُترتے بھی ہیں یا نہیں۔ نیز ان ترجمہ نگاروں نے ترجمے کا حق ادا کیا بھی یا نہیں؟

ہندوستان میں سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ''فتح الرحمٰن'' کے نام سے قرآنِ مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ حضرت شاہ صاحب کے بعد فارسی زبان نے ہندوستان سے جب رخت سفر باندھا تو آپ کے صاحبزادے حضرت شاہ رفیع الدین نے اردو زبان میں قرآنِ مجید کا لفظی ترجمہ کیا۔ اس کے بعد آپ کے بھائی شاہ عبد القادر نے اردو زبان ہی میں ایک با محاورہ ترجمہ کیا۔ اس حیثیت سے ان دونوں حضرات کو اردو ترجمہ نگاروں میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔

ان کے بعد ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ شائع ہوا۔ ڈپٹی صاحب کو اپنے خول کے اندر ہی رہنا چاہیے، مترجمِ قرآن کہلوانے

کے شوق میں قرآن فہمی کے لیے بغیر زادہ راحلہ اور توفیق الٰہی کے بغیر ہی میدان میں اُتر پڑے، نتیجتاً سخت ٹھوکر کھائی۔ اپنے مافی الضمیر کو جس طرح چاہا ترجمے میں سمویا اور اپنے نیچری خیالات کو اسلامی معتقدات میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ اس لمبے چوڑے بے ربط وغیر مانوس ترجمہ سے قرآن کا منشاو مراد تو سمجھ میں نہیں آیا، البتہ ڈپٹی صاحب کا منشاو مراد اس سے خوب سمجھ میں آتا ہے۔ ادھر شاہ عبد القادر و شاہ رفیع الدین کا ترجمہ فتنۂ عظیم وہابیت کے دست برد سے محفوظ نہ رہا نیز زبان و بیان کی قدامت اس سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرنے میں سدِ راہ بنی۔ انھیں دشواریوں اور گمراہیوں کے پیشِ نظر ملّت اسلامیہ کو صحیح وشستہ باادب ایمانی ترجمے کی شدید ضرورت ہوئی۔

اللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

مولیٰ عزوجل صدر الشریعہ، بدر الطریقہ فقیہ اعظم حضرت علامہ مفتی شاہ محمد امجد علی قدس سرہ العزیز مصنف بہارِ شریعت کی تربت پر دن رات رحمت و نور کی بارش فرمائے کہ آپ ہی نے اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت، مجدد دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان کو ترجمۂ قرآن کا احساس بڑی شدت کے ساتھ دلایا۔ بالآخر آپ کے مسلسل اصرار و پُرخلوص کوششوں سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کا ترجمۂ قرآن کنز الایمان منصۂ شہود پر آیا۔

یوں تو آپ کی پوری زندگی کارناموں ہی سے عبارت ہے، مگر آپ کے تمام علمی کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ ترجمۂ قرآن پاک ''کنز الایمان'' ہے، جسے ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں امامِ اہلِ سنّت نے سوادِ اعظم کو عطا فرمایا۔ یہ صرف ترجمۂ قرآن ہی نہیں بلکہ عشق و محبت اور علم و ادب کا ایک شاہکار بھی ہے۔ اس پاک و بے عیب ترجمے سے سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی آنکھیں ٹھنڈی، جگر تازے اور جانیں سیراب ہوئیں۔ ایمان کو نئی حلاوت اور زبان کو ادب کی نئی چاشنی ملی اور ساتھ بصد ناز اردوئے معلیٰ بھی جھوم اٹھی۔ اس شہید عشق و وفا اور کشتۂ تیغ نگاہِ مصطفیٰ (ﷺ) نے جس اندازِ محبت میں آنکھیں بند کر کے یہ ترجمہ محبت، اہلِ محبت کو دیا وہ داستانِ محبت بھی بڑی عجیب ہے۔ حضرت صدر الشریعہ سے ترجمۂ قرآن کا وعدہ تو کرلیا گیا، مگر اہم ترین علمی و دینی مصروفیات کے سبب ترجمۂ قرآن کے لیے الگ سے نہ تو کوئی وقت تھا اور نہ ہی موقع! مگر جب فقیہ اعظم کے اصرار میں شدت ہوئی تو آپ نے فرمایا: مولانا! میرے پاس ترجمۂ قرآن کے لیے الگ سے کوئی وقت نہیں اس لیے آپ جب بھی کوئی موقع دیکھیں قیلولہ کے وقت، عصر کے بعد یا سونے کے وقت تو قلم و کاغذ لے کر آجایا کریں۔

چنانچہ ایک دن صدر الشریعہ علیہ الرحمہ قلم و کاغذ لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہو گئے۔ پھر اسی دن سے اس اہم ترین دینی کام کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ طریقہ یہ تھا کہ آپ قرآنِ مجید کا ترجمہ زبانی طور پر بولتے جاتے تھے اور صدر الشریعہ اسے لکھتے جاتے تھے تفسیر و حدیث اور بغیر کسی لغت کو دیکھے بغیر، آپ برجستہ ترجمہ ارشاد فرماتے۔ اس کے بعد حضرت صدر

الشریعہ دیگر سر برآوردہ علماء کرام کے ساتھ اس ترجمہ کو اہم تفاسیر کی کتابوں سے ملاتے تو حیرت زدہ رہ جاتے کہ اعلیٰ حضرت کا وہ فی البدیہہ ترجمۂ قرآن تفاسیر کی کتب معتبرہ کے عین مطابق ہوتا۔

ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُعْطِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ.

تراجم قرآن کے موجودہ ہجوم میں جو فضیلت و برتری اور شانِ امتیاز ترجمۂ پاک کنزالایمان کو حاصل ہے۔ وہ اہلِ ایمان، اہلِ علم، اہلِ ذوق، اصحاب زبان وادب اور اہلِ محبت پر اظہر من الشّمس ہے۔

کسی بھی زبان کے لب ولہجہ، اسالیب بلاغت، حسنِ انشاء و بیان کو جس حد تک ترجمہ میں سمویا جاسکتا ہے، عروج کی اس انتہا پر کنزالایمان کی انفرادیت بے مثال ہے۔ یوں تو کہنے کو اردو زبان میں ترجمے بہت ہیں مگر ایسا ترجمۂ قرآن جو صرف قرآن سے کیا گیا ہو، جو میزانِ عشق پر نپا تلا ہو، جس کے ہر نازک مقام پر ادب و احتیاط، حزم و اتقاء، فکر و دانش، حرمت و تعظیم کے ساتھ ہی سر چشمۂ محبت ہی محبت ہو وہ مجددِ اعظم امام احمد رضا بریلوی کا ترجمۂ قرآن کنزالایمان ہے۔

جس طرح قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اسلوبِ بیان، لسانیاتِ عرب کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، یونہی اردو تراجم میں کنزالایمان ایوانِ ادب اردو کا جھومر! تقریباً نوے (۹۰) برس کا طویل عرصہ اردو ادب کو کہاں سے کہاں لے گیا۔ اس طویل عرصے میں نمایاں ترقی کی طرف اردو ادب نے نہ صرف تیزی کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ بلندی کی جانب میں جست پر جست لگائی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کو اردو ترقی کا دورِ جدید کہا جاسکتا ہے، مگر تقریباً نوے (۹) برس کے بعد آج بھی ترجمۂ پاک کنزالایمان اردو زبان وادب کا نمائندہ و ترجمان بنا ہوا ہے۔ اس ترجمے کی معنوی خوبیاں تو الگ رہیں، بلاغت زبان وادب اور حسنِ انشاء کا حال یہ ہے کہ یہ ترجمہ کل بھی اردو ادب کے ذوقِ نمود کی علامت بنا ہوا تھا اور آج بھی ہندوستانی ادب کدے کا ایک قیمتی سرمایہ اور مذہبی ادب کی آبرو! جسے امامِ اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت کی زندہ کرامت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

اب رہ گئیں معنوی خوبیاں تو اس سے قرآنی علوم کا ماہر، حقائق قرآن کا عارف، معارفِ قرآن کے غوامض، مشکل، محکم، متشابہ، تاویل، تفسیر، ناسخ، منسوخ، نگاہ پر رکھنے والا دیدہ ور اور علوم قرآنی کے بے کراں بحر کا تہہ نشین انوار و تجلیات، حقائق و معارف اور اسرار و حکمت کی موتیاں چُن سکے گا۔ اس ترجمے میں علمِ کلام کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھائی گئی ہیں، جبر و قدر، منصب نبوتِ رسالت اور ذاتِ الوہیت سے نازک مقامات، ادب و احتیاط، عقیدت و محبت، حزم و اتقاء کے گل بوٹوں سے جس سلیقے و قرینے کے ساتھ سجایا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ عظیم کسی ایسے مقبولِ بارگاہ حق اور عاشق رسول کا ہے جس کے پاس علم لدنی کا خزانہ ہے۔

چھانٹا وہ دل کہ جس کی ازل میں نمود تھی
پسلی پھڑک اٹھی نگہہ انتخاب کی

اور بقول علامہ غلام رسول سعیدی[1] پاکستان:

اگر امام رازی اسے (یعنی ترجمہ کنز الایمان کو) دیکھ پاتے تو بے اختیار آفریں کہتے، ابن عطار جبائی کے سامنے یہ ترجمہ ہوتا تو شاید اعتزل سے توبہ کر لیتے خامہ تصوف سے جس طرح اعلیٰ حضرت نے آیت کے بطن کو ترجمہ میں ڈھالا ہے غزالی ہوتے تو دیکھ کر وجد کرتے، ابن عربی شادکام ہوتے اور سہروردی دعائیں دیتے، ترجمہ کے ضمن میں جو فقہی نگینے لائے ہیں، اگر امام اعظم پر پیش کیے جاتے تو یقیناً مرحبا کہتے اور اگر ابن عابدین (شامی) اور سیّد طحطاوی کے سامنے یہ فقہی آبگینے ہوتے تو اعلیٰ حضرت سے تلمذ کی آرزو کرتے۔

اب ہم ترجمہ قرآن کنز الایمان کی انفرادیت ایک مختصر گفتگو پر اپنی بات ختم کر دیں گے جسے ملاحظہ فرما کر یہ احساس شدید تر ہو جائے گا کہ اگر تراجم کی دنیا میں ''کنز الایمان'' کا وجود نہ ہوتا تو ترجمہ نگاری کے محاذ پر ایک عظیم خلا کا احساس ناگزیر ہو کر مستقل سوہانِ روح بنا رہتا۔

عام مترجمین نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا جو اردو میں ترجمہ کیا ہے اسے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔ (حضرت شاہ عبد القادر)

(۲) شروع کرتا ہوں ساتھ نام اللہ بخشش کرنے والے مہربان کے۔ (حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی)

(۳) شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے۔ (عبد الماجد دریابادی)

(۴) شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔ (اشرف علی تھانوی)

(۵) شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (محمود الحسن دیوبندی)

(۶) شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (فتح محمد جالندھری)

بسم اللہ میں با حرفِ جار کا متعلق مقدر ہے جسے عام مترجمین اشرع سے تعبیر کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا ترجمہ نگاروں نے متن قرآن کی عبارت سے پہلے اپنے فرض کردہ لفظ 'اَشْرَعُ' کا ترجمہ لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان مترجمین حضرات نے اپنے ترجمے کی ابتدا کلمۂ قرآن سے نہیں کی بلکہ اپنے مقدر لفظ اشرع سے ترجمہ کی پہل کی جبکہ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت اپنے ترجمے کی ابتدا ان عام مترجمین کی روش سے الگ ہٹ کر اپنے ترجمہ کی ابتدا کلمۂ قرآن سے کی ہے۔

اعلیٰ حضرت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحم والا۔

اعلیٰ حضرت نے اپنے ترجمہ کی ابتدا کلمۂ جلالت یعنی اللہ سے کر کے عام مترجمین کے مقابلے ترجمہ کنز الایمان کی انفرادیت کو دوبالا کیا۔

---

[1] مقدمہ محاسن کنز الایمان از پروفیسر شیر محمد اعوان، ناشر مجلس رضا لاہور پاکستان

حضورِ پاک، صاحبِ لولاک علیہ الصلوۃ والسلام کی ذاتِ پاک سے آپ کی والہانہ عقیدت ومحبت اور آپ کی شدید وابستگیٔ رسول ﷺ اپنے تو اپنے غیروں نے بھی بہت سراہا اور کھلے الفاظ میں اس حقیقت صادقہ کا اعتراف کیا ہے کہ فنافی الرسول کا جولنگر مولانا احمد رضا خاں کے پاس ہے اس کا عشرِ عشیر بھی فنا فی الرسول کے دعویداروں کے یہاں نہیں ملتا ہے۔ چنانچہ اپنے ترجمۂ قرآن میں وہ جگہ جگہ اپنے عشق ومحبت کا چراغ جلاتے نظر آتے ہیں۔ ہر مقام پر آپ نے آقائے دوجہاں ﷺ حرمت ومحبت کو پورا پورا ملحوظ رکھا ہے۔ قرآنِ مجید میں جہاں کہیں رب العلمین نے اپنے محبوب رحمت اللعالمین کو خطاب فرمایا، ترجمہ کرتے وقت اس میں عظمت ومحبت کو سمودیا ہے۔ اَلَمْ تَرَ سورۂ فیل کی پہلی آیت کے شروع کا ترجمہ عام مترجمین نے کیا ہے ''کیا تو نے نہ دیکھا''، مگر شہید محبت کی نگاہِ عشق کا تیور ملاحظہ فرمائیے ''اے محبوب کیا تم نے نہ دیکھا''۔ اسی طرح قرآنِ مجید کے لفظ قُلْ کا ترجمہ عام طور پر کہہ، کہو۔ کہہ دیجیے کیا گیا۔ مگر آپ نے اظہارِ شانِ رسالت کے طور پر ان مقامات پر جہاں جہاں رسولِ پاک بندوں سے مخاطب ہیں بالالتزام یوں ترجمہ کیا ہے، تم فرماؤ۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ کا ترجمہ یوں کرتے، اے محبوب جب تم مسلمانوں سے فرماتے تھے۔ (سورۂ آلِ عمران، پ:۴)

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى۔ (سورۂ نجم پ:۲۷) کا ترجمہ عام ترجمہ نگاروں نے یوں کیا ہے،

(۱) قسم ہے تارے کی جب گرے۔ (شاہ رفیع الدین)
(۲) قسم ہے (مطلق) ستارہ کی جب وہ غروب ہونے لگے۔ (اشرف علی تھانوی)
(۳) تارے کی قسم جب وہ غائب ہونے لگے۔ (فتح محمد جالندھری)
(۴) قسم ہے تارے کی جب گرے۔ (محمود الحسن دیوبندی)

آیت مذکور میں النجم سے کیا مراد ہے، اس میں اربابِ تفسیر کے متعدد اقوال ہیں۔

چنانچہ مفسرین نے نجم سے ثریا مراد لیا، کچھ نے نجوم، کچھ نے قرآن اور کچھ مفسرین نے نجم سے ذات سرورِ کائنات مراد لیا۔ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت نے انھیں مفسرین کی تاویل کو اختیار فرماتے ہوئے آیۂ مذکور کا یوں ترجمہ فرمایا:

''اس پیارے چمکتے تارے محمد کی قسم جب یہ معراج سے اُترا۔''

الغرض اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت سراپا عشق ومحبت مجددِ دین وملّت نے اپنے ترجمے میں عشق کے اتہام شوق کو کسی مقام پر جانے نہیں دیا۔ عشق کے اسی فیضان نے عرفان کے ان منزلوں تک پہنچا دیا جہاں کسی اور ترجمہ نگار کی رسائی نہیں ہوتی۔ فلحمد للہ رب العلمین۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ (سورۂ رحمٰن، پ:۲۷)

(۱) رحمٰن نے سکھایا قرآن پیدا کیا آدمی سکھایا اس کو بولنا۔ (شاہ رفیع الدین دہلوی)

(۲) رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا (پھر) اس کو قوتِ گویائی سکھائی۔ (اشرف علی تھانوی)

(۳) رحمٰن نے سکھایا قرآن بنایا آدمی پھر سکھایا اس کو بات کرنا۔ (محمود الحسن دیوبندی)

اب اس شہید محبت کا بھی ترجمہ ملاحظہ فرمالیجیے اور دیکھیے کہ اس کی بصیرت دریائے علم سے کیسے کیسے گوہرہائے آبدار لے کر نکلتی ہے۔

"رحمٰن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا، انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا ما کان وما یکون کا بیان انھیں سکھایا۔" ترجمے کا رنگ دیکھ رہے۔ امام محی السنہ بغوی نے اسی آیت کے تحت تفسیر معالم التنزیل میں، حضرت علامہ شیخ احمد صاوی نے اپنے تفسیر صاوی میں، صاحب تفسیر خازن نے تفسیر خازن میں اسی آیہ کے تحت، علامہ اسمٰعیل حقی نے روح البیان میں اسی آیت کے تحت اس آیۂ کریمہ میں یہاں انسان سے حضورِ پاک ﷺ اور علّمہ البیان سے علمِ ما کان وما یکون مراد لیا ہے۔ فلحمد للہ رب العٰلمین۔

اسی طرح اگر قرآن کے تراجم پر تحقیقی و تفصیلی نگاہ ڈالی جائے تو محاسن کنز الایمان اور اس کی انفرادیت پر ایک مبسوط جلد تیار ہوسکتی ہے۔

پس رحمت وانوار کی بارش حضور صدر الشریعہ کے قبر انور پر کہ جن کی پُرخلوص کوششوں سے مسلمانوں کو یہ عظیم نعمت ملی اور امامِ اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان کے اس علمی و دینی فیضان سے امّت مسلمہ صبح قیامت تک فیضیاب ہوتی رہے گی۔

وَمَا توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

☑☑☑☑☑☑

انوارِ کنزالایمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

نحمدہٗ ونصلّی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وآلہ الفخیم۔

میرا قلم یوں تو بارہا حرکت میں آیا لیکن آج ایک ایسے موضوع پر اُٹھ رہا ہے کہ ؎

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت، امام اہلِ سنت، قاطع کفر و بدعت، مجددِ دین وملت، شہید محبت، واقفِ رموزِ شریعت، عالمِ اسرارِ حقیقت، مطلع انوارِ طریقت، ماحی بطلان و بدعت، شمس العارفین، بدرالکاملین، سندالواصلین، قدوۃ السالکین، زبدۃ المتکلمین، رئیس الکاملین، افتخار المحدثین، خاتم المحققین، معجزۃ من معجزات، سیدالمرسلین، شیخ طریقت، نازشِ شریعت، عارفِ حقیقت، قدوۃ الاولیاء، مفخر اصفیا، خیرالازکیا، سیدالفقہا، سیدنا و مولانا امام احمد رضا خاں بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات تاریخ کی وہ گراں قدر، فقید المثال، محیر العقول، جامع الصفات عبقری اور عہد آفریں شخصیت ہے، جس کی مثال پانچ صدی پیشتر تک دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ ادعائے محض نہیں بلکہ اس کے شواہد و نظائر ہیں۔

کائناتِ ارضی اہلِ کمال سے کبھی خالی نہیں رہی۔ ارسطو، افلاطون، سقراط، فیثا غورث، بطلیموس، دی مقراطیس، فارابی، البیرونی، البتانی، ابن سینا، ابن رشد، ابن افلح، ابن ماجہ، ابن طفیل، محقق طوسی، نیوٹن، کپلر، گلیلو، ابواسحٰق، ابوالقاسم، غزالی، رومی، رازی، خیام وغیرہ۔ یہ تاریخ کی وہ قد آور شخصیتیں ہیں جن کے ذکر سے تاریخ کی زلفیں سنواری گئیں اور جن کے اسماء نے تاریخ انسانی کو نئے نئے عنوان اور خود جنھوں نے دنیا کو مختلف فلسفۂ حیات عطا کیے۔ یہ لوگ انسانی تاریخ، انسانی تہذیب، انسانی تمدن، انسانی معاشرت، فنون ارتقا اور تہذیب الاخلاق پر بایں طور پر اثر انداز ہوئے کہ آج تک ان کے نقوش تاریخ کے صفحات پر فروزاں ہیں ؎

کچھ نقش تری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سروساماں سہی ویراں نہیں ہے

مگر چودھویں صدی ہجری میں تاریخ کی سطح پر ایک ایسا نام اُبھرتا ہے جو علما، فقہا، عقلا، حکما، فلاسفہ اور متکلمین کی فہرست میں بہت تیزی کے ساتھ اپنا نمایاں، منفرد اور ممتاز مقام حاصل کر کے اہلِ کمال کی تاریخ کا گلِ سرسبد بنتا ہے۔

ہندوستان کے مشہور شہر بریلی (روہیل کھنڈ) میں اللہ عزوجل نے اس رجلِ عظیم کو پیدا کیا جس کے علمی کارناموں سے اربابِ علم و دانش کی تاریخ حیران ہے۔

علمی، ادبی، مذہبی، اخلاقی، روحانی، سیاسی، معاشرتی، ادبی، ریاضی، ارضیاتی، فلکیاتی، مادّی، سائنسی، غرض کمالاتِ انسانی کے ہر چہار جانب اپنی تمام تر انفرادیت کے ساتھ امام احمد رضا جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔

جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

آپ نسباً پٹھان (یوسف زئی) مسلکاً حنفی اور مشرباً قادری تھے۔ شہر بریلی کے ایک خوش حال، متمول اور علمی گھرانے میں ۱۰ ارشوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ ارجون ۱۸۵۶ء کو پیدا ہوئے۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

آپ کا اسم گرامی "محمد"، تاریخی نام "المختار"، اور جد محترم مولانا رضا علی صاحب علیہ الرحمہ نے احمد رضا رکھا اور اسی نام سے مشہور بھی ہوئے۔ آگے چل کر بالالتزام اپنے نام کے ساتھ عبدالمصطفےٰ لکھنا شروع کیا اور اس ادائے محبت کو تاحیات باقی رکھا۔ شعر و سخن میں اپنا تخلص رضاؔ اختیار فرمایا۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کا یہ عالم کہ چار سال کی عمر میں ناظرہ قرآن مجید ختم کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں درسِ نظامی کی مشہور کتاب "ہدایۃ النحو" کی شرح لکھی۔ دس سال کی عمر میں "مسلم الثبوت" پر حاشیہ لکھا۔ ۱۴ رسال کی عمر میں اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خاں صاحب سے علوم عقلیہ و نقلیہ حاصل کر کے دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوئے۔ اسی سال مسندِ افتا کی ذمے داری سپرد کی گئی۔ اس سے محسوس ہوا کہ آپ کا علم محض کسبی نہ تھا بلکہ خدائے وہّاب نے اس حد تک نوازا تھا جسے علم لدنّی کہا جاسکتا ہے ۲۲ رسال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے ہمراہ آفتابِ شریعت، ماہتابِ طریقت، عارفِ حق حضرت مولانا سید شاہ آلِ رسول مارہروی علیہ الرحمہ سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ اسی وقت آپ کو پیر و مرشد نے توجہ اتحادی اور اجازت و خلافت سے نوازا۔

آپ نے اپنے شیخ طریقت کی مدح میں ایک منقبت فارسی زبان میں تحریر فرمایا، جس کا مطلع ہے ؎

خوشا دلے کہ دہندش ولائے آلِ رسول
خوشا سرے کہ کنندش فدائے آلِ رسول

۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء میں والد ماجد مولانا نقی علی خاں علیہ الرحمہ کے ہمراہ حج بیت اللہ اور زیارتِ بارگاہِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سرفراز ہوئے۔ اس سفر میں حرمین شریفین کے اکابر علما مثلاً مفتی شافعیہ سید احمد زینی دحلان اور مفتی حنفیہ عبدالرحمٰن سراج وغیرہ علیہم الرضوان سے حدیث، تفسیر، فقہ، اُصولِ فقہ میں سندیں حاصل کیں۔ اسی سفر میں بعد نماز مغرب ایک روز امام شافعیہ مولانا حسین بن صالح علیہ الرحمہ بغیر کسی سابقہ تعارف کے آپ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے۔ گھر لے جا کر دیر تک آپ کی منور پیشانی دیکھتے رہے ؎

بالائے سرش زہوش مندی | می تافت ستارۂ بلندی

کے نمایاں آثار نے بے حد متاثر کیا۔ فرطِ مسرت نے لب وا کیے اور بے ساختہ زبان سے نکلا إِنِّي أَجِدُ نُورَ اللّٰهِ فِي هٰذَا

الْجَبِیْنِ۔ بے شک میں اس پیشانی میں اللہ کا نور پاتا ہوں۔

پھر موصوف نے بڑی تکریم فرمائی اور صحاح ستّہ کی سند اور سلسلۂ قادریہ کی اجازت اپنے دستخط خاص سے عطا فرما کر آپ کا نام ''ضیاء الدین احمد'' رکھا۔ پھر آگے چل کر حقیقۃً آپ دین کی ایسی ضیا ثابت ہوئے کہ جس کے انوار سے عرب و عجم، حل وحرم جگمگا اُٹھے ؎

اے صبح سعادت ز جبیں تو ہویدا

۱۳۲۳ھ میں دوسری بار حج بیت اللہ شریف اور زیارتِ نبوی کے لیے روانہ ہوئے۔ یہی وہ مبارک سفر تھا جس میں آپ کے علم کا آفتاب پورے طور پر چمکا۔ عرب وعجم، حل وحرم کے اکابر علماء نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بلادِ مغرب بالخصوص حرمین طیبین کے عمر رسیدہ اور بزرگ ترین علماء ومشائخ نے آپ کے حضور احترام وعقیدت سے اپنی اپنی گردنیں جھکا دیں۔ پھر اجازت وخلافت اور سندوں کے حصول کا نہ رُکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی مبارک سفر میں علمِ غیب رسول پر آپ کے قلم سے وہ تاریخی کتاب ''الدولة المكيه بالمادة الغيبية'' عالم موجود میں آئی، جس نے علمائے حرمین کو انگشت بدنداں کر دیا۔ حقائق ومعلومات کے وہ گوہرہائے آبدار سامنے آئے جس نے علمائے حرمین کو محوِ حیرت بنا دیا۔ علمائے حجاز نے جس قدر ومنزلت، عقیدت ومحبت اور عزت واحترام کی نگاہوں سے دیکھا اس کا صحیح اندازہ حسام الحرمین اور الدولة المکیہ پر لکھی جانے والی تقاریظ جلیلہ کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ اسی سفر میں حضرت علامہ سید محمد اسمٰعیل خلیل مکی محافظ کتب خانہ حرم نے آپ کو چودھویں صدی ہجری کے مجدد کا خطاب دیا۔ آپ کی عظمتِ خداداد کو عقیدتوں کا خراج اس طور پر دیا۔

''اگر اس کے حق میں کہا جائے کہ وہ اس صدی کا مجدد ہے تو بلاشبہ حق وصحیح ہے۔''

اسی مبارک سفر میں دیوبندیوں کے اکابر علماء کے بارے میں (اہانتِ خدا و رسول جل جلالہٗ وصلی المولیٰ تعالیٰ علیہ وسلم کے جرم میں ان سے ہر طرح کی اتمام حجت کے بعد) حرمین طیبین کے جلیل القدر علماء ومشائخ سے وہ آخری فیصلہ حاصل کیا جو ''حسام الحرمین'' کے نام سے ان کے سروں پر ایک لٹکتی ہوئی تلوار ہے، جس نے برصغیر کی مذہبی تاریخ میں ایک جلی عنوان کا اضافہ کیا۔

۱۳۳۰ھ/۱۹۱۱ء میں نگاہِ عشق ومحبت سے علم وادب کا ایک شاہکار ترجمۂ قرآن پاک دنیا کے سامنے پیش کیا، جو ہر طرح سے نادر، اچھوتا، منفرد، بے مثل اور دیگر مترجمین کی عام سطح سے بالاتر ہے۔

تَفَقُّه فِي الدِّيْن کا یہ عالم کہ تقریباً بارہ ہزار صفحات پر مشتمل بارہ ضخیم جلدوں میں مسائلِ فقہیہ کا خزانہ بنام ''فتاویٰ رضویہ'' سوادِ اعظم اہلِ سنت کو عطا فرما کر اپنی فقہی عبقریت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا، جس پر دنیائے فقہ کو حیرت واستعجاب بھی ہے اور فرحت ومسرت بھی۔ آپ اپنے اقران میں بادشاہِ علوم وشہنشاہِ فقہ تھے۔ مشہور صاحبِ قلم ملّا ابو الحسن علی صاحب ندوی وہابی ''نزهة الخواطر'' جلد ہشتم میں آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

واشتغل بالعلم على والده ولازمه مدة طويلة حتى برع في العلم وفاق أقرانه في كثير

من الفنون لا سیما فی الفقه والاصول۔ یعنی مولانا احمد رضا عرصۂ طویل تک اپنے والد سے پڑھتے رہے یہاں تک کہ علم میں ان کا پایہ اونچا ہوا اور کثیر فنون میں خصوصاً فقہ و اُصولِ فقہ میں اپنے معاصرین علماء سے بڑھ گئے۔

یہی ندوی صاحب دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں و یندر نظیرہ فی عصرہ فی الاطلاع علی الفقه الحنفی و جزئیاته۔ یعنی مولانا احمد رضا اپنے زمانے میں فقہِ حنفی اور اس کے جزئیات کے علوم میں بے مثل تھے۔ (نزہۃ الخواطر، جلد ہشتم)

امام علم المیراث، سراج الفقہاء حضرت علامہ سراج احمد علیہ الرحمہ ساکن قصبہ مکھن بیلہ ضلع رحیم یار خاں، ریاست بہاول پور، پاکستان سے ایک وہابی فاضل ملّا نظام الدین احمد پوری کی ملاقات ہوئی۔ یہ وہابی فاضل اپنے معاصرین علمائے دیوبند میں کسی کو تفقہ میں اپنا ہمسر نہیں سمجھتا تھا۔ اب آگے کا واقعہ حضرت سراج الفقہاء کے زبانِ قلم سے سنیے۔ موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی نظام الدین فقیہ احمد پوری وہابی جو تفقہ میں اپنے ہم عصر علمائے دیوبند وغیرہ میں اپنے آپ جیسا کسی کو فائق نہیں جانتا تھا۔ فتاویٰ رشیدیہ کے اس فتویٰ پر کہ "حدیث صحیح کے مقابل قولِ فقہا پر عمل نہ کرنا چاہیے" اس کے سامنے میں نے رسالہ "افضل الموهبی فی معنی اذا صح الحدیث فهو مذهبی" مصنفہ اعلیٰ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ابتدائی اوراق، منازلِ حدیث کے سنائے، تو اس نے کہا: یہ سب منازلِ حدیث مولانا احمد رضا کو حاصل تھے! افسوس میں مولانا کے زمانے میں رہ کر بے خبر، بے فیض رہا۔

پھر میں نے اس وہابی عالم کو رسائلِ رضویہ سے چند مسائل فقہ کے جوابات سنائے تو کہنے لگا کہ علامہ شامی اور صاحب فتح القدیر، مولانا احمد رضا کے شاگرد ہیں۔ یہ تو امام اعظم ثانی معلوم ہوتا ہے۔

(سوانح سراج الفقہا، مطبوعہ مرکزی مجلس رضا، لاہور، ص ۳۴)

حضرت علامہ سراج احمد علیہ الرحمہ نے محسنِ اہلِ سنت جناب حکیم محمد موسیٰ امرتسری، صدر مرکزی مجلس رضا، لاہور کے نام دو مکتوب روانہ فرمائے تھے جو "سوانح سراج الفقہاء" کے آخر میں شاملِ اشاعت ہیں۔ علامہ موصوف کی مذکورہ بالا تحریر ان کے مکتوب سے ماخوذ ہے۔

مکّہ معظّمہ کے فقیہ جلیل حضرت مولانا سید اسمٰعیل بن حضرت مولانا سید خلیل رحمہما اللہ تعالیٰ کا اعلیٰ حضرت کے فتاویٰ کے چند اوراق جو عربی زبان میں تھے انہیں ملاحظہ فرما کر اپنے تأثر کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

والله اقول والحق اقول لو رأها ابو حنیفة النعمان رضی الله تعالیٰ عنه لا قرت عینهٗ و لجعل مؤلفها من جملة الاصحاب۔

بخدا میں بالکل سچ کہتا ہوں کہ اگر حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اعلیٰ حضرت کے اس فتویٰ کو ملاحظہ فرماتے تو حضرت امام اعظم کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں اور صاحبِ فتویٰ اعلیٰ حضرت کو اپنے شاگردوں میں شامل کرتے۔

(الاجازاۃ المتینه، مطبوعہ لاہور، پاکستان، ص ۲۵۸)

اب آخر میں ہم ناظرین کی معلومات میں اضافے کی خاطر مشہور فلسفی و شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کا اعلیٰ حضرت کی فقیہانہ حیثیت پر شہد آمیز و زہر آلود تبصرہ ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر صاحب اعلیٰ حضرت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ہندوستان کے دورِ آخر میں ان جیسا طباع ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔ میں نے ان کے فتاویٰ سے یہ رائے قائم کی ہے اوران کے فتاویٰ ان کی ذہانت، فطانت، جودتِ طبع، کمالِ فقاہت اور علوم دینیہ میں تبحر علمی کے شاہد عادل ہیں۔ مولانا ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے ہیں اس پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں۔ یقیناً وہ اپنی رائے کا اظہار بہت غور و فکر کے بعد کرتے ہیں۔ لہٰذا انہیں اپنے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ میں کسی قسم کی تبدیلی یا رجوع کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بایں ہمہ ان کی طبیعت میں شدت زیادہ تھی۔ اگر یہ چیز درمیان میں نہ ہوتی تو مولانا احمد رضا خان گویا اپنے دور کے امام ابوحنیفہ ہوتے۔''

(فاضل بریلوی اور ترکِ موالات، ص ۱۶، مصنفہ پروفیسر مسعود احمد ایم اے پی ایچ ڈی، مطبوعہ لاہور)

اس مقام پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ڈاکٹر صاحب کے زیر نظر تبصرہ کا آخری حصہ ڈاکٹر صاحب کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کا آئینہ دار ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب ہندوستان میں دشمنانِ رسول وہابیوں دیوبندیوں نے اللہ رب العزت جل جلالہ اور سرکار اعظم شہنشاہِ دوعالم پیارے مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں طرح طرح کی گستاخیاں اور گالیاں کتابوں میں لکھ کر شائع کیں اور مسلمانوں کا دین وایمان برباد کرنا شروع کیا تو حمایتِ حق کی خاطر اعلیٰ حضرت نے ان سے قلمی جہاد فرمایا۔ دلائل و براہین سے ان کے عقائدِ کفریہ و اقوالِ باطلہ کے دھوئیں اُڑا دیئے۔ آپ کا قلم مبارک ایک طرف دشمنانِ خدا اور رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سروں پر قہر الٰہی کا کوڑا بن کر برستا رہا اور دوسری طرف مسلمانوں کے دلوں میں تقدیس الٰہی، عظمتِ مصطفےٰ و محبت رسول کا چراغ روشن کرتا رہا۔ جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

امکانِ کذبِ الٰہی کا فتنہ غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں میں سب سے پہلے پیشوائے وہابیہ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے کھڑا کیا۔ پھر عرصۂ دراز کے بعد اعلیٰ حضرت کے زمانے میں رہنمائے دیابنہ مولوی رشید احمد گنگوہی اور ان کے تلامذہ نے دوبارہ اس ایمان سوز فتنہ کو جگایا۔ میرٹھ کے ایک سنّی نے اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں مسئلہ امکانِ کذب کے بارے میں استفتاء کیا۔ اعلیٰ حضرت نے اس فتنہ کے استیصال کے لیے مدلل فتویٰ سُبْحٰنَ السُّبُّوْح لکھ کر مسلمانوں کے قلوب تقدیسِ الٰہی کے انوار سے بھر دیے اور معتقدین امکانِ کذب کے منہ میں حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْل ٹھونس کر ان کی بولتی بند کردی۔

شیخ وہابیہ مولوی رشید احمد گنگوہی و مولوی خلیل احمد انبیٹھی نے اپنی کتاب ''براہینِ قاطعہ'' میں ایک بے اصل روایت کی آڑ لے کر مسلمانوں میں یہ بد اعتقادی پھیلائی کہ سرکار مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیوار کے پیچھے کی بھی خبر نہیں۔ پھر اُسی کتاب میں شیطان لعین کے لیے پوری زمین کا علم محیط تسلیم کرتے ہوئے صاف صاف اقرار کیا کہ شیطان کے علم کی یہ وسعت نص (قرآن وحدیث) سے ثابت ہے لیکن رسولِ اکرم کے لیے یہ وسعتِ علم کسی آیت وحدیث سے ثابت نہیں۔ لہٰذا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے یہ وسعت علم یعنی زمین کا علم محیط ماننا ایسا شرک ہے جس میں ایمان کا کوئی حصہ نہیں۔

ناظرین! وہ رسول اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جن کو ربّ العلمین جل جلالہٗ نے براہِ راست تعلیم دی اور جن پر قرآنِ مجید جس کی شان کُل شئی کا تبیان ہے اُتار کر زمین و آسمان، عرش و کرسی، لوح و قلم وغیرہ سارے ما یکون و ما کان کا علم عطا فرمایا ایسے رسول کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کے علم پاک کو اتنا گھٹانا کہ سرکار کو دیوار کے پیچھے کی خبر نہیں اور سرکار کے مقابلے میں شیطان کو اتنا بڑھانا کہ اس کو ساری زمین کا علم حاصل ہے، کیا یہ سرکار کی شان میں کھلی گالی نہیں؟ کیا اس گالی کو کوئی بھی مسلمان برداشت کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں! اعلیٰ حضرت نے اپنی متعدد تصانیف انباء المصطفےٰ، الدولۃ المکیہ، خالص الاعتقاد وغیرہ میں براہین قاطعہ کے اِن کفری عقائد اور ان جیسے دوسرے اقوالِ باطلہ کی تردید فرمائی اور قرآنِ مجید کی آیات، حدیث شریف کے ارشادات سے ثابت کیا کہ سرکار کو بہ تعلیم الٰہی زمین و آسمان وغیرہ سارے جہان کا علم محیط حاصل ہے۔

پیشوائے وہابیہ مولوی قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیو بند نے اپنی کتاب ''تحذیر الناس'' میں خاتم النبیین بمعنی آخر الانبیا کا انکار کرتے ہوئے خاتم النبیین کا ایک نیا معنیٰ خاتم ذاتی گڑھا اور اپنی کتاب کے ذریعے مسلمانوں میں اپنے اس باطل عقیدہ کی اشاعت کر کے فتنۂ انکارِ ختم نبوت کی نیو جمائی۔ اعلیٰ حضرت نے رسالۂ مبارکہ جزاء اللہ عدوّہ بإبائه ختم النبوۃ تحریر فرما کہ اس کفری فتنہ کی کمر توڑ دی اور منکرین ختم نبوت کا سر قلم کر دیا۔

مذکورہ بالا پیشوایانِ وہابیہ اور ان کے ہم عقیدہ متبعین کے بارے میں مسلمانوں کو یہ جاننے کی سخت ضرورت پیش آئی کہ یہ لوگ شرعی نقطۂ نگاہ سے کیا ہیں اور بارگاہِ رسالت کے وفادار غلاموں کو عظمت مصطفےٰ کے ان گستاخ دشمنوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس دینی ضرورت کے پیش نظر اعلیٰ حضرت نے فتویٰ جاری فرمایا، جس کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ بالا پیشوایانِ وہابیہ اور ان کے ہم عقیدہ حضرات بارگاہ رسالت میں کھلی گستاخی کے سبب اور عقیدۂ دینیہ ضروریہ کے انکار کے باعث بحکم شریعتِ اسلامیہ کافر و مرتد، بے دین، خارج از اسلام ہیں۔ ان لوگوں سے نکاح بیاہ کا رشتہ قائم کرنا، ان کے پیچھے نماز پڑھنا، ان کے جنازہ کی نماز پڑھنا، ان سے بیعت ہونا، ان سے میل جول رکھنا یہ سب اُمور حرام ہیں۔

ان احکام شرعیہ کی اشاعت پر وہابی دیوبندی، نیچری، ندوی، صلح کلّی سب بوکھلا اُٹھے۔ قرآن و حدیث کو طاق پر رکھ کر انھوں نے اعلیٰ حضرت کے خلاف ایک طوفانِ عظیم برپا کر دیا اور عام مسلمانوں کو بھڑ کانے کے لیے رسالوں، اخباروں، کتابوں، درسگاہوں، مسجدوں، خانقاہوں، بازاروں میں اس بات کا خوب پروپیگنڈہ کیا کہ مولانا احمد رضا خاں بہت ہی سخت مزاج قسم کے عالم ہیں۔ بات بات پر کفر کا فتوی دیتے ہیں۔ اپنے اور اپنے معتقدین کے سوا دنیا میں کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ چنانچہ قائدِ وہابیہ مولوی ابوالکلام آزاد کے داہنے باز و عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب ''ذکرِ آزاد'' صفحہ نمبر ۱۲۱ میں اعلیٰ حضرت کے خلاف بہتان طرازی کا جوہر دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔۔یاد رہے، مولانا احمد رضا خاں صاحب اپنے سوا اور اپنے معتقدوں کے سوا دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر بلکہ ابو جہل و ابولہب سے بھی بڑھ کر اکفر سمجھتے تھے۔۔۔''

مادرِ ندویت کے ہونہار فرزند رئیس احمد ناول نگار اپنی کتاب ''آزادیٔ ہند'' صفحہ ۱۸۹ میں خالص سفید جھوٹ کا مجسمہ تیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۔۔۔مولانا احمد رضا بریلوی نے مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے خلاف بہتر وجوہ پر مشتمل کفر کا فتویٰ دیا۔۔۔''

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔ اِن دریدہ دہن مصنّفین کے بہتانوں کا کوئی ٹھکانا ہے قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ط

افسوس ہزار افسوس کہ ڈاکٹر سر اقبال جیسا دیدہ ور فاضل بھی نیچریوں، ندویوں، وہابیوں، دیوبندیوں کے تحریری، زبانی جھوٹے پروپیگنڈوں کے جال میں ایسا پھنسا کہ اسے اپنی ذمے دارانہ حیثیت بھی یاد نہ رہ گئی اور اعلیٰ حضرت کے خلاف شدّتِ بیجا کا الزام لگاتے ہوئے یہ کہہ گیا کہ ''مگر بایں ہمہ مولانا احمد رضا کی طبیعت میں شدّت زیادہ تھی۔''

مولوی، ملّا، پروفیسر، ماسٹر، لیڈر، ایڈیٹر سب پر واضح رہے کہ علی العموم شدّت دو طرح کی ہوتی ہے۔ شدتِ ایمانی، شدتِ نفسانی۔ ڈاکٹر صاحب کے زیرِ نظر تبصرہ میں شدّت سے مراد شدّتِ نفسانی ہے کیونکہ یہی شدت قابلِ جرح وتنقید ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے کو مسلمان کہلا کر شدّتِ ایمانی پر اعتراض نہیں کرسکتا۔ قرآن مجید نے صحابہ کرام کی مدح وستائش کرتے ہوئے ان کی شان یوں بیان فرمائی ہے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ، یعنی پیارے مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلام صحابہ کافروں پر شدّت والے ہیں۔

جسم کے سڑے عضو کو ڈاکٹر کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دیتا ہے تاکہ بقیہ جسم خراب ہونے سے بچ جائے۔ خوں ریز ڈاکو کو جج پھانسی کے تختۂ موت پر لٹکا کر اس کی زندگی ختم کر دیتا ہے، تاکہ پبلک کی جان، ان کا مال، ڈاکو کے شر سے محفوظ ہو جائے، تو کیا کوئی صاحبِ ہوش انسان ڈاکٹر اور جج کی اس کارروائی پر اعتراض کرسکتا ہے؟

گستاخانِ بارگاہِ الوہیت ورسالت کے خلاف اعلیٰ حضرت نے جو فتاویٰ صادر فرمائے وہ صرف تقاضائے تقدیس الٰہی، تقاضائے عظمت رسالت، تقاضائے محبت رسول وحفاظتِ دینِ مسلمین کی خاطر تھے۔ ان فتاویٰ کو شدتِ نفسانی سے کیا تعلق؟ یہ امر کتنا حیرت انگیز ہے کہ بصیرت ایمانی کے نادار اعلیٰ حضرت کے فتوائے تکفیر پر تو بہتانوں کا طوفان کھڑا کرتے ہیں مگر دشمنانِ رسول کے مسلسل ارتکابِ توہین سے اُن کو کوئی دُکھ نہیں پہنچتا اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى الْمُشْتَكٰى۔

اور اگر تقاضائے محبتِ رسول، تقاضائے دین وایمان، تقاضائے احکام شریعت کو پورا کرنا قابلِ تنقید وجرح ہے تو آئیے اعلیٰ حضرت کی پیدائش سے تقریباً بتیس سال پہلے گستاخِ رسول کے خلاف ہندوستان کے اکابر علمائے اسلام کی کارروائی ملاحظہ فرمائیے۔

پیشوائے وہابیہ ودیابنہ ملّا محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی نے ابنِ عبد الوہاب نجدی کے رسالہ ''کتاب التوحید'' عربی کی اردو میں تلخیص شروع کی جو ۱۵ر محرم ۱۲۴۰ ہجری کو مکمل ہوئی۔ اس تلخیص کا نام انھوں نے ''تقویۃ الایمان'' رکھا۔ اس کتاب میں ملّائے دہلوی نے شفاعت کا انکار کرتے ہوئے سرکار مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ کلمات لکھے تھے۔ ایک سنّی مسلمان نے شفاعت سے متعلق ''تقویۃ الایمان'' کی طویل عبارت نقل کر کے استفتاء مرتب کیا اور

علمائے دین سے مولوی اسمٰعیل دہلوی اوران کی قابل اعتراض عبارت کے بارے میں حکم شرعی دریافت کیا۔حضرت مولانا شاہ محمد فضل حق خیر آبادی تلمیذ ارشد حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہما الرحمہ نے مذکور بالا استفتاء کے جواب میں ایک مدلل فتویٰ بنامتحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغوی ۱۸ ررمضان شریف ۱۲۴۰ھ کومرتب فرمایا،جس کے آخر میں مولوی اسمٰعیل دہلوی کے مطابق یہ فتویٰ صادر فرمایا۔

"۔۔۔قائل ایں کلام لاطائل ازروئے شرع مبین بلاشبہ کافرو بے دین ست ہرگز مومن ومسلمان نیست۔"

(تحقیق الفتویٰ،شائع کردہ مکتبہ قادریہ،لاہور،ص ۲۳۴)

یعنی اس بے ہودہ عبارت کا قائل (ملّا اسمٰعیل دہلوی) بحکم شریعت اسلامیہ بے شبہہ کافراور بے دین ہے، ہرگز مومن ومسلمان نہیں۔۔۔"

حضرت اس فتویٰ پر دہلی کے سترہ علمائے اسلام نے تصدیقی دستخط ثبت فرمائے ہیں،جن کے اسمائے گرامی "تحقیق الفتوی" میں شاملِ اشاعت ہیں۔ان مُصَدِّقِین علماء کی صف میں حضرت مولانا شاہ مخصوص اللہ وحضرت مولانا شاہ محمد موسیٰ کی ذات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ دونوں علماء حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے پوتے،حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے شاگرداور بھتیجے نیز مولوی اسمٰعیل دہلوی کے چچازاد بھائی ہیں۔

مولوی ابوالکلام آزاد کے والد گرامی مولانا خیرالدین صاحب اور مولانا موصوف کے نانا حضرت مولانا منورالدین دہلوی شاگرد حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے مولوی اسمٰعیل دہلوی اور وہابیوں کی تردید ومخالفت میں اپنی قیمتی عمر کا بیشتر حصہ صَرف فرمایا۔

مشاہیر علمائے ہند کے اُستاذ حضرت مولانا شاہ فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ نے وہابیوں اور ملّا اسمٰعیل دہلوی کی تردید وتفضیح میں متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔کیاان اکابر علمائے اسلام کوبھی تنقید وجرح کانشانہ بنایاجائے گا؟ کیاان پر بھی شدتِ نفسانی کاالزام لگایاجائے گا؟

پھرڈاکٹرصاحب نے اعلیٰ حضرت کی ذات پر شدتِ بیجا کاالزام لگا کرخاموشی اختیار نہ فرمائی بلکہ آگے بڑھ کرانھوں نے اعلیٰ حضرت کے بارے میں وہ فیصلہ بھی سنادیاجس کامنصب ان کوہرگز حاصل نہیں تھا۔ملاحظہ ہوڈاکٹرصاحب کافیصلہ

"اگرمولانااحمدرضاخاں کی طبیعت میں زیادہ شدت نہ ہوتی تووہ گویااپنے دور کے امام ابوحنیفہ ہوتے۔"

افسوس اورصدافسوس کہ پہلے ڈاکٹرصاحب نے اعلیٰ حضرت کی شدتِ ایمانی کوشدتِ نفسانی بتاکراپنی تنگ نظری کا ثبوت دیاتھااوراب اعلیٰ حضرت کے بارے میں خلافِ واقعہ یہ مہمل،بے جوڑ قضیہ شرطیہ بول کراپنی کوتاہ فکری بھی واضح کردی۔

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹرصاحب اردو،فارسی کے قادرالکلام شاعر،مشہور فلسفی،برطانوی انگلش قانون کے اعلیٰ بیرسٹر،صوفیانہ سخن کے کہنہ مشق چربہ سازدانایانِ سیاست کے اُستاذ تھے،مگر بایں ہمہ نہ وہ فقیہ تھے،نہ فقہی خدمات سے ان کوواسطہ پڑا

تھا، اس لیے یہ جسارت آمیز خلافِ واقعہ فیصلہ ڈاکٹر صاحب کے منصب کے منافی ہونے کی وجہ سے لائق اعتنا نہیں۔

رہا یہ امر کہ اعلیٰ حضرت کیا واقعی ''نعمانِ زمانہ'' تھے؟ تو فتاویٰ رضویہ کی صرف جلد اوّل ہی کی فقہی موتیاں چمک چمک کر کہہ رہی ہیں کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا اپنے زمانے کے ضرور امام ابو حنیفہ تھے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

پھر جس شہنشاہِ فن کے فقہی کارنامے عرب سے ہندوستان تک گونج رہے ہوں اور جس سے فقہائے مکہ نے نوٹ کے بارے میں احکام شرعیہ حل کرنے کے لیے کفل الفقیہ الفاھم لاحکام القرطاس والدراھم تصنیف کرایا ہو اور جس کے بارے میں موافق و مخالف علما سب بیک زبان گواہی دے رہے ہوں کہ وہ اپنے زمانے میں تمام فقیہوں پر فائق ہے تو اس کے نعمانِ زمانہ ہونے میں شک کا کیا موقع ہے؟ اگر کوئی دانش مندرات کی تاریکی میں سونے کو پیتل کہہ دے تو سونے کا قصور نہیں۔ تاریکی کے باعث نگاہِ دانش مند کی دھوکا ہو گیا۔

۱۳۳۹ھ میں بسترِ علالت سے المحجة المؤتمنة فی آیاتِ الممتحنة کی شکل میں وہ تاریخی فتویٰ صادر فرمایا جس نے سیاسی حلقوں میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ ملک میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ بساطِ سیاست پر مسلم جذبات کو مہرہ بنانے والے سیاسی بازیگر بدحواس ہو گئے۔ پھر تو آپ کے خلاف شور و شر اور بہتان و افترا کا طوفان کھڑا کر دیا۔ بگڑے ہوئے حالات اور مسلم قوم کی اندھی جذباتیت سے آپ کو اپنے اس فتوے کی اہمیت کا احساس تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ مسلمانوں کے جذباتیت کا استیصال کرنے والے سیاسی بازیگر میرے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔ سچی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے وقت اگر حالات کے بگڑے تیور سے خوف زدہ ہو جاتے تو ایک مجدد اور غیر مجدّد میں فرق ہی کیا رہ جاتا۔ ایک عالم دین، مفتی، فقیہ اور مجدد کی حیثیت سے یہ دیکھے بغیر کہ فیصلہ دوست کے حق میں جاتا ہے یا دشمن کے! زمانہ اور حالات کے بگڑے ہوئے تیور کی پروا نہ کرتے ہوئے وہی صحیح اور برحق فیصلہ نافذ کر دیا۔ جو اسے خدا اور رسول جل جلالہٗ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ سے عطا ہوا تھا اس کی نظر صرف اور صرف خدا و رسول پر تھی۔ اسے حالاتِ حاضرہ کے طوفان سے کوئی بحث نہیں تھی۔ کمالِ فقاہت، نوری بصیرت اور انتہائی اخلاقی جرأت سے وہی فیصلہ نافذ کیا جو اسلام کا عین مطلوب تھا۔ دنیا کا کوئی خوف اسے اظہارِ حق سے باز نہ رکھ سکا۔ بالآخر جب جذبات کا خروش مدھم پڑا، جنون کا طوفان تھما، حالات نے کروٹ لی اور تلخ حقائق سامنے آئے تو وہی سب کچھ سچ ثابت ہوا جو آپ نے فرمایا تھا وہی عین حقیقت ہوئی جس پر پہلے سے آپ نے مہر تصدیق ثبت کی تھی۔ انجام وہی سامنے آیا جس سے مسلمانوں کو خبردار کرنے میں آپ نے بڑی دل سوزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ ڈاکٹر اقبال و جناح جیسے دانشوروں نے اس فتویٰ کی روشنی میں اپنے سیاسی کردار کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ اسی فتوے کی روشنی میں مسلمانوں نے اپنے گوہر مراد کا رُخ پہچانا۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم و مولانا شوکت علی مرحوم کو آگے چل کر آپ کے محبوب و معتمد اور جلیل القدر خلیفہ صدر الافاضل حضرت مولانا نعیم الدین مراد آبادی کے ہاتھوں دانستہ و نادانستہ گناہوں، قومی و سیاسی خرابات و آلودگیوں سے توبہ کی دولت نصیب ہوئی

اس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

اعلیٰ حضرت کے علمی، فقہی اور مجددانہ کارنامے وسعت، تنوع، مضامین کی بلندی، جودتِ فکر اور تعداد کی کثرت کے لحاظ سے ایک پوری اکیڈمی کے صد سالہ خدمات پر بھاری ہیں۔ ایک متحرک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا جو کام تھا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے تنہا انجام دے کر اپنی ہمہ گیر و جامع و تابندہ شخصیت کے انمٹ نقوش چھوڑے۔ آپ ایک بلند پایہ فقیہ، محدث، مفتی، ماہر علم ریاضی، منطقی اور عظیم فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ سخن فہمی اور سخن سنجی میں اپنی مثال آپ تھے۔ شاعری آپ کے لیے وجہ امتیاز نہ ہوسکی بلکہ اردو نعتیہ شاعری آپ کی وجہ سے نئی نئی جہتوں سے آشنا ہوئی۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، قطعات، رباعیات، تشبیہات، استعارات، اقتباسات، غرض ہر صنف سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی ہے اور حق یہ ہے کہ ہر ایک کا حق ادا کر دیا ہے۔ خود ہی فرماتے ہیں ؎

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلّم
جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

''قاموس المشاہیر'' کے مطابق پانچ صدی تک اربابِ علم و دانش کی ''عالمی تاریخ'' کسی ایسے فرد کو دُنیا کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے ۲۵؍فنون سے بھی زائد کتابیں دنیا کو دی ہوں۔

عزت و کرامت، شرف و بزرگی، فضیلت و امامت کا یہ تاج ہندوستان کے مقدر میں تھا۔ اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی کے ذریعے اللہ جل مجدہٗ نے ''اہلِ کمال'' کے ''عالمی تاریخ'' میں وہ اعزاز عطا فرمایا جس پر وہ بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔ جتنے علوم و فنون پر آپ نے کتابیں لکھی ہیں، اتنے علوم کا نام جاننے والے ہی اب خال خال رہ گئے ہیں۔

اعلیٰ حضرت کیا نہ تھے؟ عالم اسلام کے ایک بڑے مفکر، شرائع اسلام کے منفرد ماہر فقہی جزئیات کے عبقری اور بے شمار متون و شروح پر مبصرانہ استحضار رکھنے والے فقید المثال مفتی، بے مثل مناظر، عظیم المرتبت متکلم، نادرِ روزگار فقیہ، ماہر فلکیات، جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اُصول، غرض تفسیر حدیث، اُصولِ حدیث، فقہ، اُصول فقہ، لغت فقہ، کلام و عقائد، فرائض، تجوید، تصوّف، اذکار، اوفاق، اخلاق، تعبیر، تاریخ، سیر، مناقب، فضائل، اسماء الرجال، ادب، نحو، صَرف، زیجات، جبر و مقابلہ، جفر و تکسیر، مثلث، ارثما طیقی، لوگارثم، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، حساب، نجوم، توقیت وغیرہ غرض اِکسٹھ علوم و فنون میں وقت کے سب سے بڑے مجدّد نے ایک ہزار سے زائد کتب و رسائل تصنیف فرمائے ؎

اِک دانش نورانی، اِک دانش برہانی
ہے دانشِ برہانی حیرت کی فراوانی

آپ اپنے عہد کے صاحب بحر الرائق تھے۔ انگریزی میں ''جینئس'' اور اصطلاحِ فقہا میں ''فقیہہ نفس'' کہنا آپ کی علمی جبروت کے پیش نظر مبالغہ نہ ہوگا۔

آپ نے اپنا سنِ ولادت اس آیت کریمہ سے نکالا تھا:

اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ

۱۲ ھ ۷۲

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرما دیا ہے، اور اپنی طرف کی روح سے ان کی مدد فرمائی۔

اور وفات سے قبل ہی الہامی طور پر اس آیت سے اپنا مادۂ تاریخ وفات نکالا:

وَیُطَافُ عَلَیْهِمْ بِاٰنِیَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ ط

شریعت وطریقت، معرفت، حقیقت، ولایت اور علم کا یہ آفتاب ۲۵ رصفر المظفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۲۸ را کتوبر ۱۹۲۱ء دو بج کر ۳۸ رمنٹ پر غروب ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔

فرش سے ماتم اُٹھا جب تم چلے سوئے جناں
عرش پہ دھومیں مچیں لو آ گیا فخر زمن

یہ ہماری جماعت کی انتہائی بے حسی ہے کہ وہ آج تک امام احمد رضا فاضل بریلوی کی پوری کیا، آدھی کتابیں بھی دنیا کے سامنے پیش نہ کرسکی اور جو چھپ بھی گئی ہیں ان میں اکثر نایاب کی حد تک کمیاب ہیں۔ ہماری مذہبی قیادت جس کا یہ کام تھا مجرمانہ غفلت کا شکار ہو کر محوِ خواب ناز ہے۔ تعطل و جمود اور تن آسانیوں کے برف سے اس کا پورا وجود ڈھک چکا ہے۔ اپنی فضیلت کا خطبہ پڑھانے اور اپنے قد کی پیمائش ہی سے اسے فرصت نہیں۔ دیکھیے یہ اپنے فرائض منصبی سے کب عہدہ برآ ہوتی ہے۔ منظم طور پر آج تک کوئی ملک گیر کوشش ایسی نہیں ہوئی جس کے ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے۔ جذبۂ عقیدت جزوی طور پر چند کوششیں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں، جنھیں اپنی بساط کی حد تک غنیمت ہی کہا جا سکتا ہے۔

ایسی جامع الصّفات شخصیت اگر اہلِ یورپ کو میسر آجاتی تو اب تک اکسٹھ ۶۱ رعلوم وفنون پر مشتمل ہزار ہا ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے ان نقوشہائے جگر کے تراجم درجنوں زبان میں ہو چکے ہوتے۔ پھر نئے سرے سے ''قاموس المشاہیر'' کی ترتیب میں ردو بدل کیا جاتا ؎

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

امام اہلِ سنّت فاضل بریلوی پر مذہبی رنگ ہی غالب رہا۔ وہ عالمِ دین کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے۔ اس لیے دوسری حیثیتیں اس تابناک رُخ کے سامنے دب سی گئیں اور خود آپ نے بھی دیگر علوم وفنون کی حیثیت ثانوی قرار دے رکھی تھی۔ آپ کی زندگی کا تمامتر حاصل قرآن اور سنّت رسول ہی تھا۔ آپ کے تمام علمی کارناموں میں ایک بڑا علمی و ادبی کارنامہ آپ کا ترجمۂ قرآن ''کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن'' ہے، جس کا جواب دنیا کی تقریباً کسی بھی زبان میں نہیں۔ آپ کے اس نادرِ روزگار ترجمے پر صدر الافاضل فخر الاماثل اُستاذ العلما حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہٗ

العزیز نے ''خزائن العرفان'' کے نام سے ایک تفسیر لکھی ہے، جو ترجمے ہی کی طرح بے مثال ہے۔ اس تفسیر نے ترجمے کی افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ جس سے قرآن کا منشا و مراد سمجھنے میں کافی آسانی ہوئی۔ قرآن کے اشارات و کنایات، ارشادات و فرمودات، قصص و واقعات اور شانِ نزول کو بڑے دلکش انداز میں کمالِ تحقیق کے ساتھ پیش کیا ہے۔ صاحبِ تفسیر حضرت صدرالافاضل اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے جلیل القدر خلیفہ اور بارگاہِ عالی کے مقرب و معتمد علیہ تھے۔ دیوانگی کی حد تک آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔ اسی حسنِ عقیدت نے ''کنزالایمان'' کو ''خزائن العرفان'' سے مرصّع کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر آپ کے حالات بھی پیش کر دیئے جائیں تا کہ مفسّر اعظم کی جلالتِ علمی کا آفتاب نئی نسل پر بھی نمایاں ہو جائے۔

مختصر خاندانی حالات

مفسّر اعظم حضرت صدرالافاضل علیہ الرحمہ کے اجداد مشہد سے شہنشاہِ ہند حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے عہدِ مسعود میں ہندوستان تشریف لائے۔ قدرشناس شہنشاہ نے بڑی پذیرائی کی، مناسب عہدوں پر فائز المرام کرکے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں۔ جو نسلاً بعد نسلٍ آپ تک بھی کسی حد تک پہنچیں۔ آپ کے والد ماجد سید حکیم معین الدین نزہت بن سید امین الدین راسخ اپنے عہد کے بہترین شاعروں میں سے تھے، جن کا لقب اُستاذ الشعرا تھا۔ شروع شروع میں آپ قاسم نانوتوی بانیٔ دارالعلوم دیوبند کے مرید تھے، جس نے ختم نبوت کے مضبوط قلعے میں نقب زنی کی ناپاک، مذموم اور بے ہودہ کوشش کی۔ بارگاہِ رسالت کے اس گستاخ کا جرم جب آپ پر واضح ہوا تو اس کی بیعت فسخ کر کے سرکار اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے مرید ہوئے اور یہ شعر کہا ؎

پھرا ہوں میں اس گلی سے نزہت ہوں جس میں گمراہ شیخ و قاضی
رضائے احمد اسی میں سمجھوں کہ مجھ سے احمد رضا ہوں راضی

ولادت: ۱۳۰۰ھ میں آپ پیدا ہوئے۔ اسم شریف محمد نعیم الدین رکھا گیا۔ آگے چل کر صدرالافاضل اور اُستاذ العلماء کے لقب سے یاد کیے گئے۔ اوّل الذکر لقب کی تو اتنی شہرت ہوئی کہ اس کے آگے اصل نام دب سا گیا۔ شاعری میں آپ نے نعیم تخلص اپنایا۔

۴ رسال کی عمر میں بڑی دھوم دھام سے بسم اللہ خوانی کی رسم ادا ہوئی اور آٹھ سال کی عمر میں بہترین حافظ گئے۔ فارسی زبان کی تحصیل اپنے والد ماجد سے کی۔ طب اور درسِ نظامی کی متوسط کتابیں مولانا ابوالفضل احمد صاحب سے پڑھیں۔ بقیہ نصاب کی تکمیل بالخصوص منطق و فلسفہ، اقلیدس اور دورۂ حدیث کی تکمیل عالمِ ربانی حضرت مولانا گل محمد صاحب قدس سرہ السّامی سے کی۔ اُنیس ۱۹ رسال کی عمر میں جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کی۔ ایک سال تک فتاویٰ نویسی کی مشق کی۔ ۱۳۲۰ھ میں مدرسہ امدادیہ، مراد آباد میں جلیل القدر علما و مشائخ کے مقدس ہاتھوں سے صرف بیس ۲۰ رسال کی عمر میں دستارِ فضیلت کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ اس موقع پر آپ کے والد گرامی مولانا سیّد حکیم معین الدین

نزہتؔ نے دستار بندی کی تاریخ تحریر فرمائی ؎

ہے میرے پسر کو طلبا پہ وہ تفضّل سیّاروں پہ رکھتا ہے جو مریخ فضیلت
نزہتؔ نعیم الدین کو یہ کہہ کے سنا دے دستارِ فضیلت کی ہے تاریخ فضیلت

صرف بیس ۲۰ رسال کی عمر میں آپ صاحبِ تصنیف ہو گئے۔ کمسنی ہی میں آپ کا قلم اس قدر سیّال ہو چکا تھا کہ کسی کہنہ مشق و دیدہ ور صحافی کا شبہ ہوتا۔ قلم کی پختگی اور حسنِ انشاء کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ ابوالکلام آزاد کے مشہور زمانہ اخبار ''الہلال'' و ''البلاغ'' میں آپ کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہتے۔ فتنۂ عظیم دیوبندیت کی ابتدا میں اوّل اوّل بڑی گرم جوشی تھی۔ ہوٹلوں، سڑکوں، پارکوں، چوراہوں، خلوتوں اور جلوتوں کی نشستوں میں زیادہ تر علمِ غیب رسول ہی پر بحث ہوتی۔ وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے صرف بیس سال کی عمر میں آپ نے وہ کتاب تصنیف فرمائی جو آج بھی علمِ غیب کے موضوع پر ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے ؎

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن خوبیِ یار کا جواب کہاں

علمِ غیب کے موضوع پر آپ کی معرکتہ الآرا کتاب ''اَلْکَلِمَةُ الْعُلْیَا لِاِعْلَاءِ عِلْمِ الْمُصْطَفٰی'' کی علمی اور عوامی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی اور جب یہ کتاب امام اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کی گئی تو آپ بہت شاداں و فرحاں ہوئے اور فرمایا ماشاء اللہ بڑی عمدہ اور نفیس کتاب ہے۔ اس قدر نوعمری میں اتنے احسان دلائل کے ساتھ اتنی بلند پایہ کتاب مصنف کے ہونہار ہونے پر دال ہے۔

اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں :

جودھ پور کے محمد ادریس نامی ایک فتنہ پرور وہابی نے اخبار ''نظام الملک'' میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں اپنے نوزائیدہ مسلک کے مطابق قدوۃ الاولیاء، خیر الاذکیاء مجددِ اعظم سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر نازیبا الزامات اور آپ کی شان میں بے حد گستاخیاں کیں۔ سلطان العلوم حضرت صدر الافاضل کو اس بے ہودہ مضمون سے بہت دُکھ ہوا۔

اعلیٰ حضرت کی زیارت سے آپ اب تک مشرّف نہ ہوئے تھے مگر آپ کی بلند پایہ تصانیف پڑھ پڑھ کر اپنے نہاں خانۂ دل میں آپ کی عقیدت و محبت کا چراغ جلائے ہوئے تھے۔ آپ نے عالمِ جلال میں اس مضمون کا مدلل رَد اسی شب میں لکھ کر جواب کے طور پر شائع کیا۔ پھر تو جواب اور جواب الجواب کا باقاعدہ سلسلہ چل پڑا۔ امام اہلِ سنّت فاضل بریلوی کے لاکھوں دیوانوں میں سے کسی نے آپ کی توجہ اخبار مذکور کی طرف مبذول کرائی۔ آپ نے مراد آباد اپنے ایک عقیدت مند حاجی محمد اشرف صاحب کو لکھا کہ اخبار نظام الملک کی ایک ماہ کی اشاعت پہنچا دیجیے۔ حسب الارشاد حاجی صاحب نے اخبار مذکور کو آپ کی بارگاہ میں پیش کر دیا۔ اعلیٰ حضرت اسے ملاحظہ فرما کر بہت خوش ہوئے۔ صاحبِ مضمون کے متعلق استفسار پر حاجی صاحب نے بتایا: یہ مرد آباد کے ایک ذہین ترین اور صاحبِ صلاحیت نوجوان فاضل ہیں۔ جن کی عمر ابھی

صرف ۲۰ رسال ہے۔ اعلیٰ حضرت کے حکم پر جب حاجی صاحب صدر الافاضل کو لے کر بریلی حاضر بارگاہ ہوئے تو امام اہلِ سنّت نے حضرت فاضل مراد آبادی کو اُٹھ کر گلے سے لگالیا اور اس انداز میں پذیرائی فرمائی کہ ہمیشہ کے لیے آپ کی بارگاہ کے ہو کے رہ گئے ؎

تقریب محبت کی کیا خوب وہ ساعت تھی
جس وقت ہوا مجھ سے وہ ماہِ جبیں واقف

خود حضرت صدر الافاضل فرماتے تھے کہ میرا بستر اعلیٰ حضرت کی زیارت کے لیے کبھی کھلا ہی نہیں۔ لازمی طور پر میں ہر پیر اور جمعرات کو بریلی حاضر بارگاہ ہوتا۔ یوں تو آپ کی پوری زندگی ایک جہادِ مسلسل ہے مگر آپ کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی تھی کہ آپ امام اہلِ سنّت کے معتمد علیہ تھے۔ اعلیٰ حضرت کو آپ پر اس قدر اعتماد تھا، جہاں کہیں بھی مناظرہ ہوتا، کفّار، مشرکین، ملحدین، آریہ، دہریہ، وہابیہ، دیابنہ، روافض، خوارج، قادیانی، غیر مقلدین، منکرین حدیث وغیرہ سے ہر اہم مقام پر اپنی جگہ آپ کو بھیجتے۔ اور آپ نے ہر نازک مقام پر امام اہلِ سنّت کی بجا اعتماد کی لاد رکھی۔ اعلیٰ حضرت کی دعاؤں کے سائے میں رخصت ہوتے اور رحمتِ پروردگار کی جلو میں فتح و کامرانی پر پرچم لہراتے ہوئے واپس تشریف لاتے۔ مناظرہ میں آپ کی حیثیت اتھارٹی کی تھی۔ ہندو پنڈتوں، سناتن دھرمیوں، آریہ سماجیوں سے خصوصاً آپ نے کامیاب مناظرے فرمائے۔ مدمقابل ہمیشہ خائب و خاسر، ذلیل و رُسوا ہوا۔

قومی سیاست میں حصّہ:

یوں تو آپ کی پوری زندگی ہنگاموں اور معرکہ آرائیوں سے عبارت ہے مگر ترکی خلافت کی بربادی اور مقاماتِ مقدسہ سے بے دخلی پر ”اسلامیانِ ہند“ کے فطری اضطراب و بے چینی، جذباتی و ہیجانی کیفیات کے پیش منظر میں جو فتنے رونما ہوئے اسے دبانے میں ایک نمایاں رول ادا کیا۔ ترکِ موالات، خلافت کمیٹی، نان کو آپریشن، ترکِ گاؤ کشی وغیرہ فتنوں نے جب اپنی مکمل ہلاکت خیزیوں کے ساتھ رونما ہو کر برصغیر کے مسلمانوں کو اپنی تباہ کاریوں کی لپیٹ میں لے کر بہالے جانا چاہا، تو آپ نے اعلیٰ حضرت کے شانہ بشانہ علمی، عملی اور قلمی جہاد فرما کر لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کو ان فتنہائے عظمیٰ سے محفوظ فرمایا۔

وہی ہے بندہ حُر جس کی ضرب ہے کاری ۔۔۔ نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری
ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش ۔۔۔ قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

اس وقت قومی سیاست ایک دلدل تھی کہ جو اس میں گرا، نیچے ہی کی طرف دھنستا چلا گیا۔ اچھے اچھے قد آوروں کے کَس بل نکل گئے اور اس خطرناک دھارے میں بڑے بڑے صاحبِ جبہ و دستار بہہ گئے۔ یہ شعر ؎

عمریست کہ بہ آیات و احادیث گذشت
رفتی و نثار بت پرستی کردی

بھی تو ہندوستان کے ایک عظیم صاحبِ جبہ و دستار کا ہے۔ آثار السلف علامہ عبد الباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا عبد الماجد بدایونی، خواجہ حسن نظامی وغیرہ کا حشر سامنے ہے۔ مگر اللہ اکبر! قومی سیاست کے دلدل اور خطرناک دھارے سے آپ صاف نکل گئے مگر جیب و دامن پر کہیں نمی نہیں نظر آئی ؎

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا

امام اہلِ سنّت فاضل بریلوی کے نمائندہ خاص ہونے کی وجہ سے مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے آپ کے سامنے توبہ کی۔ علی برادران اپنی سیاسی و قومی خطاؤں سے آپ کے حضور تائب ہوئے۔ مولانا شوکت علی نے خود توبہ کے لیے دولت کدہ پر حاضری دی، جبکہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم سے خود دِلی جا کر ان کے دولت کدے پر توبہ کی دولت سے سرفراز کیا۔[1] ہزاروں سیاست گزیدہ آپ کے دم سے شفایاب ہوئے۔ پنڈت دیانند سرسوتی اور اس کے بے حد متعصّب، فسادی، دشمنِ اسلام چیلے لالہ منشی رام، شردھانند کی فتنۂ عظیم تحریک شدھی و سنگٹھن کے باعث لاکھوں مسلمان مرتد ہوئے **العیاذ باللہ العظیم**۔ خصوصاً صوبہ یوپی کا مسلمان جس کے نشانے کا ہدف بنا۔ ان لاکھوں بدنصیبوں کو پھر واپس اسلام کے اندر لائے بلکہ ایک لاکھ پچاس ہزار ہندوؤں کو اسلام کی دولتِ لازوال عطا فرمایا اور اس فتنے کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے میں جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی، شبیہ غوثِ اعظم حضرت مولانا سید علی حسین اشرفی، امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری، مولانا قطب الدین برہمچاری و دیگر علمائے حق کے ساتھ آپ نے نمایاں حصہ لیا۔

آپ کی علمی و دینی، قومی اور سیاسی خدمات کا احصا ایک امر دشوار ہے۔ یہ چند سطور صرف خراجِ عقیدت کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

اُڑائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

برصغیر ہند و پاک کے ممتاز اصحابِ قلم سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور حضرت صدر الافاضل کی مبسوط سوانح حیات جدید سوانحی تقاضوں کے پیش نظر مرتب فرما کر سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت پر احسان فرمائیں۔

اس خصوص میں برصغیر کے بزرگ علما جو حقائق و معلومات کے ''انسائیکلو پیڈیا'' ہیں، ان کی سُستی، کاہلی، تن آسانی کے پیش نظر ہم بالکل مایوس ہیں۔ نئی نسل کا صاحبِ ذوق طبقہ اگر ان سے چاہے تو معلومات وافرہ حاصل کرسکتا ہے۔ وہ نوجوان علما بھی قابلِ اعتنا نہیں جنھوں نے دورِ طالب علمی میں صرف وعظ کی مروجہ کتابوں کو ''حرزِ جاں'' بنائے رکھا۔ ان سے کسی بات کی اُمید کرنا بیل سے دودھ دوہنے کے مترادف ہے۔ اور وہ حضرات جو تن آسان نہیں، وہ صرف اسی موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں جنھیں دنیا ہی میں آخرت کے حصّے کی بھی ضرورت ہے۔ ؎

---

[1] تفصیلی واقعات کے لیے ''حیاتِ صدر الافاضل'' از مولانا غلام معین الدین نعیمی ملاحظہ کیجیے

لہجے میں میرے تلخ حقیقت کی آنچ ہے
یہ آنچ تیرا پھول سا چہرہ نہ جلا دے

حکیم الامت حضرت علامہ مولانا احمد یار خاں صاحب نعیمی، تاج العلماء حضرت علامہ مولانا سید غلام جیلانی میرٹھی، حضرت مولانا بدرالدین احمد صاحب رضوی وغیرہ کے ہم بے حد احسان مند ہیں کہ ان نفوسِ قدسیہ نے غیروں کے آگے ہمیں شرمندہ ہونے سے بچالیا۔ اور ہماری آنے والی نسلوں کو باطل طاقتوں کے نمائشی علم کے احساس سے بچالیا۔ سوادِ اعظم اہل سنت کا وہ دماغ جو پوری دل سوزی کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہے، حالات کے بگڑے ہوئے تیور کچھ کرنے نہیں دیتے۔ باطل طاقتیں چند پیشہ ور رنگروٹوں کو آگے کرکے مناظرے کے نام پر ہمارے بہترین دل ودماغ کو اُلجھائے ہوئے ہیں اور خود اپنا اطمینان سے بیٹھ کر تعمیر کی شکل میں تخریب کی نئی نئی جہتیں تلاش کرنے میں مصروف ہیں فَاِلَی اللّٰہِ مُشْتَکٰی۔

تحریری سرمایہ:

ہنگاموں سے بھر پور زندگی گذارنے کے باوجود حضرت صدر الافاضل نے تحریری سرمایہ بھی وافر مقدار میں چھوڑا۔
اطیب البیان رد تقویة الایمان، الکملة العلیا لاعلام علم المصطفٰے، التحقیقات لدفع التلبیسات، کشف الحجاب، السوط العذاب، کتاب العقائد، زاد الحرمین، آداب الاخیار، سیرتِ صحابہ۔

سوانح کربلا وغیرہ آپ کی قلمی یادگار اور آپ کے علمی تبحر کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے لیے ایک مؤقر جریدہ پندرہ روزہ ''السواد الاعظم'' جاری فرمایا۔ جس کے ہر شمارے میں قوم کا درد خونِ جگر بن کر روشنائی کی شکل میں پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

تفسیر خزائن العرفان:

یوں تو آپ کی ہر تصنیف وتحریر سرمایۂ افتخار ہے لیکن ان سب میں آپ کا عظیم تر سرمایہ وہ تفسیر ہے جو ''خزائن العرفان'' کے نام سے آپ نے امامِ اہلِ سنت کے ترجمۂ قرآن ''کنز الایمان'' کے حاشیے پر تحریر فرمائی ہے۔ اردو زبان میں اس سے قبل کوئی تفسیر ایسی نظر نہیں آتی جو اس کے مقابلے میں پیش کی جاسکے۔

دیوبند جو اپنے اُلٹے سیدھے تراجم کی نمائش کے لیے مشہور ہے، وہ بھی اس طرح کے جوہر کمیاب کا مثل پیش کرنے میں آج تک قاصر ہے۔ البتہ آپ کے تلمیذ رشید اور آپ کی بارگاہ کے فیض یافتہ حکیم الامت حضرت علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمۃ والرضوان نے ''کنز الایمان'' کے حاشیے پر آپ ہی کے انداز میں ایک تفسیر ''نور العرفان'' کے نام سے پیش کی ہے، جسے دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکل پڑتا ہے کَمْ تَرَكَ الْاَوَائِلُ لِلْاَوَاخِرِ ۔ یہ بھی دراصل آپ ہی کے جلالتِ علمی کی ایک عظیم شاہکار ہے، کیوں کہ پھل اپنے درخت اور اُستاذ اپنے شاگرد سے پہچانا جاتا ہے۔ چند قدم آگے بڑھ کر تفسیر نعیمی، مرآۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، جاء الحق وغیرہ دیکھنے پر حکیم الامت علامہ مفتی احمد یار خان سے قبل حضرت

صدرالافاضل کی بارگاہ میں قلمِ عقیدت کا خراج دینے کے لیے جھک جاتا ہے ؎

فروغِ شمع تو قائم رہے گا روزِ محشر تک
مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

اور یہ سب دراصل فیضان ہے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی کا جن کے ''آسمانِ علم وادب'' پر علم کے نہ جانے کیسے کیسے کہکشاں آباد تھے۔

امام اہلِ سنّت کے ترجمۂ قرآن ''کنزالایمان'' کے ساتھ حضرت صدرالافاضل کی تفسیر ''خزائن العرفان'' کو جو آفاقی شہرت ملی وہ صرف اس لیے نہیں کہ وہ ترجمۂ پاک ''کنزالایمان'' کے ساتھ شائع ہوئی ہے بلکہ وہ بذاتِ خود اتنی گونا گوں خوبیوں پر مشتمل ہے کہ جسے دیکھ کر علما، طلبہ، عوام اور خواص نے آگے بڑھ کر سروں پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا اور دل کی خوش گوار دھڑکنوں میں جگہ دی۔ اور ''کنزالایمان'' کے حاشیے پر جس انداز میں دادِ تحقیق دی ہے اور جو نفیس پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اسے دیکھ کر وجدان جھوم جھوم اُٹھتا ہے۔ ترجمہ وتفسیر دونوں باہم ایسے ہم آہنگ اور مربوط ہیں کہ ایک دوسرے سے الگ کر کے وہ حلاوت، لطافت، چاشنی اور معلومات وافرہ حاصل نہیں کی جاسکتی جو اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس تفسیر نے ترجمہ کی افادیت اور اس ترجمے نے تفسیر کی تفہیم میں ایک دوسرے کی معاونت کی۔ علما اور خواص اس ترجمہ سے تفسیر ''خزائن العرفان'' کے بغیر فائدہ تو اُٹھا سکتے ہیں مگر اس حقیقت کو بہرحال تسلیم کرنا پڑے گا کہ ترجمۂ پاک ''کنزالایمان'' کو عوامی مقبولیت کی جانب پیش رفت کرنے میں ''خزائن العرفان'' نے ایک مؤثر رول ادا کیا۔ ''کنزالایمان'' برصغیر کے اصحابِ قلم نے کسی حد تک چند کوششیں کی ہیں۔ محبوب الملت مفتی محبوب علی خاں صاحب لکھنوی، شیخ الاساتذہ علامہ بدرالدین احمد قادری، شیخ الاسلام مولانا سید محمد مدنی اشرفی جیلانی کچھوچھوی، محقق عصر مولانا جلال الدین احمد امجدی مفتی فیض الرسول براؤں شریف، علامہ غلام رسول سعیدی، مولانا اختر رضا ازہری، پروفیسر شیر محمد اعوان.... یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کنزالایمان کو سمجھنے اور سمجھانے میں پُرخلوص کوششیں کیں۔ اِن حضرات کی یہ مساعی جمیلہ حرفِ آخر نہیں! رات جوں جوں گہری ہوتی جائے گی، آسمانوں پر ستاروں کی چمک دمک اور کہکشاں کا جمال بڑھتا جائے گا۔ ہمارا علم جتنا گہرا اور وسیع ہوتا جائے گا ''آسمانِ علم وادب'' پر ''کنزالایمان'' کی تابانی اسی اعتبار سے بڑھتی جائے گی ؎

مختصر اتنا کہ دو حرفوں سے بن جاتا ہے دل
اور طویل اتنا کہ اس میں دو جہاں کا راز ہے

مگر تفسیر ''خزائن العرفان'' سے متعلق علامہ غلام رسول سعیدی کی معرکۃ الآرا شاہ کار تصنیف ''توضیح البیان لخزائن العرفان'' کے علاوہ غالباً اب تک کوئی قابلِ ذکر کوشش نہیں ہوئی اور یہ کوشش بھی ازخود نہیں بلکہ حالات پیداوار ہے، جس کے لیے ہم بہرحال شکرگذار ہیں۔

ہم اور ہماری حیثیت ہی کیا کہ ہم سلطان العلوم کی اس بے مثل تفسیر پر کوئی تبصرہ کریں جو امام اہلِ سنّت فاضل بریلوی

کا معتمد علیہ تھا۔ فَھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ کے طور پر ہمارے جذبۂ عقیدت کا بھی تو کچھ تقاضا ہونا چاہیے تھا۔ اسلامیانِ برصغیر ہندو پاک کے اس عظیم محسن کی روح کی بارگاہ میں ہمارے قلم کا خراج ایک ملّت کے زندہ افراد کے زندہ ضمیر اور اس کے جذبۂ وفا شناسی کی علامت سمجھا جائے گا ؎

حسن فروغِ شمع سخن دور ہے اسد　　　پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

حدیث:

علمِ حدیث میں آپ کو بے پناہ عبور تھا۔ آپ وقت کے ایک بہترین محدث تھے۔ حدیث، متنِ حدیث، سندِ حدیث، راویانِ حدیث، حدیث کے اقسام اور اسماء الرجال پر آپ کی نظر بہت گہری تھی۔ حدیث شریف کے درس کا انداز اتنا مؤثر، منفرد اور دل نشین تھا کہ عالمِ خیال میں آپ تلامذہ کو لے کر بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہوجاتے۔ اور معقولات میں تو امامِ فن کا مقام حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ایک نمایاں وصف یہ بھی تھا کہ سخت قسم کے علمی اُلجھاوے اور پیچیدگیوں کو اس انداز میں پیش کرتے کہ عوام بآسانی سمجھ لیتے اور خواص حیران رہ جائے۔ میدانِ مناظرہ میں آپ کے دلائل اتنے حوصلہ شکن ہوتے جس سے مخالف کا کس بل نکل جاتا اور فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ کا مصداق ہوجاتا۔

علم ہیئت:

آبروئے علم وفن سیدنا اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے بعد طبقۂ علما میں اس فن کی سروری کا تاج آپ ہی کے سرِ انور پر رکھا گیا۔ اس فن میں آپ کی کاملیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ نے متعدد کرۂ فلکی تیار کرائے تھے، جس میں ثوابت اور سیارگان کو چاندی کے نقطوں سے واضح فرمایا تھا۔ علمِ ہیئت پڑھاتے وقت وہ کرّہ سامنے رکھ کر آپ زمین پر بیٹھے بیٹھے طلبہ کو آسمان کی سیر کرادیا کرتے تھے۔

فتاویٰ نویسی

اُنیس ۱۹ رسال کی عمر میں آپ نے علومِ عقلیہ ونقلیہ کی تحصیل سے فراغت پائی۔ اس کے بعد مکمل ایک سال تک فتاویٰ نویسی کی مشق کرتے رہے۔ اعلیٰ حضرت نے جس کے کمسنی کی اولین کوشش کو سراہا ہو، وہ دورِ عروج میں اس کی تابندہ صلاحیتوں کا عالم کیا رہا ہوگا!! اکنافِ ہند میں آپ کے فتوؤں کی گونج تھی۔ یہ کس قدر دُکھ کی بات ہے کہ پس ماندگان کے افسوس ناک تغافل نے اس قیمتی فتاویٰ کے مجموعہ کو ''غالباً'' اب تک زیورِ طبع سے محروم رکھا گیا۔

حکمت:

آپ ایک کامیاب طبیب بھی گذرے ہیں۔ طب کی کتابیں باقاعدہ طور پر آپ نے مولانا حکیم ابوالفضل (مرحوم) سے پڑھیں۔ اس فن میں آپ کو دِرک بھی اچھا تھا۔ دینی مشاغل سے اگر کچھ موقع میسر آتا تو وہ حکمت کے ذریعے خدمتِ خلق میں گذرتا۔

شاعری:

آپ ایک بے حد حسّاس اور نازک طبع شاعر بھی تھے۔ ذوقِ شاعری آپ کو وراثۃً ملا تھا۔ والد ماجد وقت کے مشہور شاعر تھے، جن کا لقب ہی اُستاذ الشعرا تھا۔ آپ کے دادا مولانا امین الدین راسخ اپنے عہد کے مشاہیر شعرا میں سے تھے۔ آپ کے پردادا کریم الدین آزاد ملک الشعرا ثر کی کے اُستاد تھے۔ غرض آپ خاندانی شاعر تھے۔ ''ریاضِ نعیم'' کے نام سے آپ کا دیوان بھی شائع ہو چکا ہے۔ مگر آپ نے مجازی راہِ سخن سے الگ ہٹ کر اپنے ''عروسِ فکر'' کو زلف ثنائے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک محدود رکھا اور شعرا کی طرح بھی ہوئے ہیں۔ ہجر و وصال سے بھی گذرے ہیں۔ زلف و رُخسار، ابرو مژگاں کی باتیں بھی کی ہیں۔ مر مٹنے کی تمنا بھی ظاہر کی ہے۔ کوئے یار کے طواف کے لیے مضطرب بھی ہوئے ہیں۔ حسرت زدہ تمناؤں کے لیے دل پر اضطراب سے دھواں بھی اُٹھا ہے مگر یہ سب صرف اس خواجۂ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے تھا، جس کے بارے میں حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کیف وسرور کے عالم میں جھوم جھوم کر کہا ہے

وَاَجْمَلَ مِنْکَ لَمْ تَرَقَطُّ عَیْنِیْ   وَ اَکْمَلَ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّاً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ   کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

''ریاضِ نعیم'' کے گلہائے رنگا رنگ سے ایک نعت کے صرف چند بند ملاحظہ ہوں

اے زائر کوئے نبی اتنا تو کرے اے مہرباں   اہلِ مدینہ کو سنا حال نعیم خستہ جاں
مایوسیوں کی کثرتیں ناکامیوں پر حسرتیں   تنہائیوں کی وحشتیں، اندوہ و غم کی داستاں
شدت پہ ہے دوران سرزوروں پہ ہے دردِ جگر   خوں رو رہی ہے چشم تر پھنکر ہوا ہے دل کتاں
ہم کیا کہیں حال تباہ ہم سے ہوئے بے حد گناہ   بے شک ہیں ہم نامہ سیاہ نادم ہیں اب ہم بے گماں
رَبِّی ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا تُبْنَا اِلَیْکَ رَبَّنَا   فَاغْفِرْلَنَامَاقَدْمَضٰی بخش اے رحیم بے کساں
یَا اَھْلَ طَیْبَۃَ اُنْظُرُوْا اَحْوَالَنَا ثُمَّ اذْھَبُوْا   عِنْدَالشَّفِیْعِ وَاشْفَعُوْافِی حَضْرَتِہِ الْجِنَانِ
قُوْلُوْالَہٗ خَیْرَالْوَرٰی اِرْحَمْ عَلٰی مَنْ عَصٰی   جَاءَ اِلَیْکَ تَائِبًا در گذر از جرم آں
راہِ مدینہ دور ہے بندہ بہت رنجور ہے   اور حاضری منظور ہے امداد سلطانِ جہاں

وفات:

۱۸/ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ/ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۴۸ء بروز جمعہ مبارکہ شب میں بارہ بج کر ۲۵/ منٹ پر وہ علم وفضل کا آفتاب غروب ہو گیا۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

آپ کی ولادت کا تاریخی مادہ ''غلام مصطفےٰ'' (۱۳۰۰ھ) اور سنِ وصال ''غلام رسول'' (۱۳۶۷ھ) ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
وہ دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

اُجالوں کے سفیر

حجۃ الاسلام عظمت وجلالت کے بلند وروشن مینار

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب   یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

اس مبنی برحقیقت شعر کو حقیقت کا لباس پہنا دیا ہے، پٹنہ بہار کے عزیز گرامی قدر مولانا ڈاکٹر امجد رضا امجد نے ایک عظیم علمی ودستاویزی وتاریخی مجموعہ بنام حجۃ الاسلام نمبر جو آٹھ سو صفحات سے زیادہ ضخیم ہے۔ اسے زبان وادب کے حاملین اور اہلِ علم واہلِ قلم کی گردنوں پر جو فرضِ کفایہ کا ایک بڑا بوجھ تھا اسے اپنے خصوصی معاونین اور۔۔۔ کی مدد سے اسے اتار کر انھیں ممنون ومشکور اور حضور حجۃ الاسلام کی ذات غایت درجہ اخلاص وعقیدت رکھنے والوں کو شاداں وفرحاں کردیا۔

جزاک اللہ چشم باز کردی
مرا باجان جاں ہمراز کردی

کہ انھوں نے رضویات کے ایک محجوب باب کو کافی نمایاں کردیا جو اپنے زمانے میں اتنا روشن، اتنا مستنیر اتنی عظمتیں وبلندیاں اور ایسی تب وتاب جاودانہ لیے ہوئے تھا کہ متحدہ ہندوستان من کل الجہات دور بہت دور تک خود اپنی جواب آپ تھا۔ ان کی بے کراں وبے پناہ شخصیت پر وقت وحالات اور سب سے بڑھ کر ہماری اجتماعی غفلت وبے حسی نے ٹھنڈی دھول ڈال رکھی تھی، اس آئینہ حسنِ خوباں وآئینۂ حق نما تاریخ وتذکرہ نے بھی آنکھیں پھیر رکھی تھیں۔

بے حسی کی زود فصلیں روز ہی کٹتی رہیں
آبرو کا ایک دانہ جانے کس خوشے میں تھا

بحمدہٖ تعالیٰ اب ایک اور بڑی وکامیاب کوشش پروفیسر ڈاکٹر علامہ سعید احسن قادری یونانی میڈیکل کالج پونا مہاراشٹر نے اپنے بے پناہ مشفق وکرم فرما حضرت مولانا الحاج الشاہ عبد الرحیم خاں قادری رضوی بانی وسربراہ جامعۃ العرفان گونڈی ممبئی جو اپنے حسن خدمات، حسنِ عمل اور حسن خدمات دین وعلمِ دین کے حوالے خود ہی ایک موضوع ہیں ان کی سرپرستی اور پُرخلوص عملی تعاون اس عظیم فریضہ وکوشش میں کامیاب وسرخرو ہوئے جس پر انھیں حق پہنچتا ہے کہ بطورِ تحدیثِ نعمت کے یہ کہیں کہ

نازم بعمرے خویش کہ کارے کردم!

یہاں آپ کی عبقریت پر خود اعلیٰ حضرت سند اجازت وخلافت نشینی کا تذکرہ کرنا ہے جو حجۃ الاسلام نمبر عربی میں ص: ۱۰۱ سے شروع ص:۸ تک پھیلا ہوا ہے۔

پہلے ڈاکٹر وپروفیسر علامہ سعید احسن صاحب نے طویل علمی زندگی گذاری۔ ڈاکٹر وپروفیسر ہوکر پوری زندگی عالمِ دین

ہیت کذائی میں گزاری اور آج بھی ان کی سادگی سے بظاہر یہ نہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اندر سے ۔۔ کمیاب ہے۔انھیں جون 2019ء پونا پمپری مہاراشٹر سے فکرِ رضا کے علمی گوشے کے عنوان سے ایک علمی و دستاویزی مجلّہ بڑے سائز تین سو صفحات سے زائد پر مشتمل علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ایک بہترین ریکارڈ قائم کیا۔اور سر کردہ اہلِ قلم مقالات کو پیش کر کے اس نمبر کو بڑا وقیع و دستاویزی بنا دیا۔ یہاں ہندوستان میں اعلیٰ حضرت عظیم ترین شخصیت ماہنامہ المیز ان کے امام احمد رضا نمبر کے بعد اتنا وقیع مجلّہ کم از کم میری نگاہوں سے نہیں گزرا۔ اگر مقالہ جات کے عنوانات اور ان کے مالہ و ماعلیہ پر گفتگو کی جائے تو بجائے خود ایک مقاملہ تیار ہو جائے اس کا ہر مقالہ بڑا ہی گرانقدر ہے۔فجز اھم اللہ احسن ال۔۔۔

آپ کی جلالت اور علوِ مرتبت کے وہ عربی زبان طویل سند جو اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مجد دِ دین وملّت نے اپنا جانشین و خرقہ خلافت پہناتے وقت دیا، وہی خرقہ خلافت جو آپ کو آپ کے مرشد برحق سیّد آلِ رسول مارہروی کی بارگاہ سے عطا ہوا۔جس کے لیے آپ کے دعا کہ زبان تھی دو جہاں خادم آل الخ اور اپنا عمامہ مبارکہ ان کے سرِ اقدس پر رکھا اور سند سجادہ نشینی جو ایک تاریخی والہامی سند تھی عربی زبان میں سے ترجمہ حاضرین مجلس کو سنایا۔

جس کو مشہور تذکرہ نویس حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین مفتیٔ اعظم کانپور نامور فرزند حضرت علامہ مفتی محمود احمد رفاقتی زیب سجادہ خانقاہِ رفاقتیہ اسلام پورہ مظفر پور بہار کم وبیش اکیس برس پہلے اپنی تاریخی و دستاویزی کتاب اہلِ سنّت میں افتراق المناک واقعات پوری عربی سند سے ترجمہ پیش کیا اور حضورِ والا کو کئی نسخے ایک ساتھ بذریعہ خاکسار راقم الحروف ارسال فرمایا۔حضورِ والا نے وہ کتاب حالات کی نزاکت کے ساتھ بطور ایک چیلنج تحریر فرمائی تھی جسے پڑھ کر ایک خوشگوار حیرت و مسرت طاری ہو جاتی ہے۔جس کے بہر حال مفید و مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ اسی تاریخی و الہامی سند سجادہ و جانشینی سے اردو ترجمہ مولانا امجد رضا امجد کے تاریخی و دستاویزی حجۃ الاسلام نمبر حضورِ والا علامہ رفاقتی کے نام ایک چشم کشا مقالے کے ساتھ پھر ایک بار شائع ہوا جو اس نمبر کے ص ۱۰۴ سے شروع ہو کر ص:۱۰۸ تک وہ بھی باریک قلم سے پھیلا ہوا ہے۔اور یہ کہ اعلیٰ حضرت نے اپنا بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ایک رسم ۔۔۔ادا فرمائی جیسا کہ ایک طویل زمانے سے ایسا ہوتا چلا آیا۔ بلکہ رب تعالیٰ کی مشیت جو براہِ راست آپ کے قلم پر القا ہوا۔

☑ ☑ ☑ ☑ ☑ ☑

صدر العلماء حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی

مولایَ صلِّ وسلم دائماً ابداً　　　　علیٰ حبیبك خیر الخلق کلھم

کروڑوں شکر واحسان ہے اس عائم الاحسان خدائے ذوالجلال کا جس نے اپنے فضل سے مجھے یہ توفیق وسعادت بخشی کہ میں اس ذاتِ گرامی مرتبت کے تعلق سے اپنے جذبات واحساسات پیش کروں جس کے شکوہ علمی کا دبدبہ پورے برصغیر ہند و پاک پر تھا۔ جو کاملین کی سند ومتبحرین زمانہ کا امام تھا۔ اپنوں اور غیروں کی مجالس و دانش کدوں میں جو مسلم الثبوت اور جس کے علم وفضل کا سکّہ رائج الوقت تھا۔ جو زندگی بھر خدمتِ علمِ دین اور اس کی ترویج واشاعت میں لگا رہا۔ علم جس کی ریاست اور کتابیں جس کے ریاست کی خزانہ تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو علم وفن کے اس بحر بیکراں تک پہنچے اوران کی درسگاہ میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا۔ قابلِ مبارک باد ہیں وہ آنکھیں جنھیں اس کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان آنکھوں کو یہ حق ہے کہ وہ فخر سے کہیں کہ ؎

نازم بہ چشم خویش کہ روئے تو دیدہ است

اور جنھیں زیارت کی بھی سعادت حاصل نہیں وہ علم وفضل کے اس کوہِ طور کو بشیر القاری فی شرح البخاری، بشیر الناجیہ فی شرح الکافیہ، بشیر الکامل فی شرح مأتہ عامل، البشیر شرح نحومیر وغیرہ میں دیکھ سکتے ہیں اور بشیر القاری فی شرح البخاری میں تو ان کے جلالت علمی کا سورج سوا نیزے پر دکھائی دیتا ہے۔ جلد اوّل جو تقریباً تین سو جہازی سائز کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، جسے صرف سات احادیث کریمہ کے ترجمہ وتشریح پر ختم کردیا ہے ذٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُعْطِيهِ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَاب۔

تو وطوبیٰ وما قامت یار　　　　فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

صدر العلماء، شیخ الاساتذہ، سند المحققین، فخر المدرسین، امام النحو حضرت اقدس بابرکت علامہ مفتی الحاج الشاہ سیّد شاہ غلام جیلانی علیہ الرحمۃ والرضوان متولد ۱۸؍۱۳ھ ۱۹۷۸ء متوفی ۱۹؍ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ بن مولانا سیّد غلام فخر الدین بن مولانا حکیم سیّد سخاوت حسین۔ یہ اپنے وقت کے جید ومتبحر علمائے دین ودانش کے درمیان ایک امتیازی شان کے مالک اور کاملینِ وقت میں صدر ہر جا کہ نشیند صدر است کے مصداق تھے۔ جمال وزیبائی، وجاہت اور سراپا ایسا کہ آدمی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔ بڑا سر، اسی کی مناسبت سے بلند کشادہ چمکتی ہوئی پیشانی کے نیچے بڑی بڑی روشن آنکھیں اور پُرنور چہرہ، حسین پر گھنی ولمبی داڑھی، پہلی بار دیکھے تو دیکھتا رہ جائے اور دل بے اختیار کھنچتا چلا جائے اور بے ساختہ زبان پر جاری ہوجائے ؎

تیری نسلِ پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

اپنے وقت کے عظیم مبلغ جن کے دست حق پرست پر لاکھوں ہندو اسلام لائے اور شدّھی تحریک کے وقت جماعت اہلِ سنّت کے ایک عظیم مبلغ و داعی و روحانی مقتدا کی حیثیت سے متحدہ ہندوستان کی مذہبی قیادت میں ایک بلند مقام حاصل کیا۔ کفر و شرک کے نشیمن پر وہ بجلی بن کر گرتے رہے۔ کفر و شرک کے مذہبی قیادت کے پاس جس کی للکار کا کوئی جواب تھا۔ کفر کے ٹھیکے داروں، شرک کے پنداروں کو جس نے ہمیشہ احساسِ بے بسی کی زنجیر میں جکڑ کر رکھا۔ حضرتِ اقدس بابرکت، پیر طریقت، حضرت مولانا سید شاہ قطب الدین برہچاری خلیفہ و مرید شیخ المشائخ حضرت اشرفی میاں تلمیذ رشید استاذ العلماء حضرت مولانا لطف اللہ علی گڈھی علیہ الرحمہ آپ کے حقیقی چچا تھے۔ جنھوں نے اپنے ہونہار بھتیجے سیّد غلام جیلانی کو مراد آباد لے جا کر جامعہ نعیمیہ میں داخل کرایا اور انھیں حضور صدر الافاضل کے حوالے کیا۔ گویا ؎ ایں خانہ ہمہ آفتاب است کے مترادف تھا۔

بے شک درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ یوں ہی پھل بھی اپنے درخت سے پہچانا جاتا ہے۔ تو آئیے ان بلند قامت درختیوں کا جائزہ لیں جس میں ایسے تاریخی پھل لگے جن سے سارا عالم مشکبو ہوا یعنی اساتذۂ کرام۔

صدر الافاضل، فخر الاماثل، امام الہند، اُستاذ العلماء، سیّد المفسرین حضرت علامہ مفتی سیّد نعیم الدین مراد آبادی۔ صدر الشریعہ، بدر الطریقہ، اُستاذ الکل، فقیہ اعظم علامہ مفتی امجد علی (مصنف بہارِ شریعت)، اُستاذ جلیل حضرت علامہ عبد الحیٔ افغانی تلمیذ رشید حضرت علامہ حکیم برکات احمد ٹونکی۔ حضرت علامہ عبد العزیز خاں فتح پوری۔ حضرت علامہ عبد اللہ خان افغانی۔ حضرت علامہ سید حامد حسین اجمیری۔ حضرت علامہ امتیاز احمد انبیٹھوی۔ حضرت علامہ سید غلام علی اجمیری۔ والد ماجد حضرت مولانا سید محمد مہدی میاں بیت النور جھالرہ اجمیر شریف۔ تلمیذ رشید حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی علیہ الرحمہ۔ صدر المدرسین مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا پوسٹ کھنڈسری ضلع بستی یوپی۔ آخر الذکر یعنی علامہ سید غلام علی اجمیری کا تذکرہ بطور خاص حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دار الخیر اجمیر شریف میں میرے ایک شفیق اُستاذ تھے جنھوں نے خارجِ وقت اپنے گھر پر بطور خاص مجھے سبقاً سبقاً شرح چغمینی پڑھایا ہے۔ جن کا اسم گرامی سید غلام علی تھا۔ (قدست اسرارہم)

اصحاب الرحیل۔ اب ان رفیقانِ درس کی فہرست پر بھی ایک نگاہ ڈالیں جو اس راہِ محبت و استقامت یعنی حصولِ تعلیم میں آپ کے قدم بہ قدم تھے۔ جو آگے چل کر سوادِ اعظم کے قائد و رہنما اور اپنے زمانے میں اساطین اُمت قرار پائے۔ جن کے حسنِ خدمات سے آج پورا عالم مشکبو ہے اور جن کے فیضانِ علم و فضل نے کئی بر اعظموں کو اپنے لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ خود علامہ میرٹھی کبھی کبھی عالمِ سرخوشی میں فرمایا کرتے تھے لائے زمانہ میرے ساتھیوں کا جواب۔ پھر ان میں سے ہر ایک کا نام بڑی محبت سے لیا کرتے تھے اور سبھوں کے نام کے آگے یہ مولوی فلاں، یہ مولوی فلاں مگر حضور مجاہدِ ملت کا نام نہ لے کر بالالتزام مجاہد ملت ہی فرمایا کرتے تھے۔ ان کے تذکرے پر آپ کا چہرہ فرطِ مسرّت سے تمتما جاتا ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ ایک بڑا رئیس زادہ تھا مگر دل فقیروں کا پایا تھا۔ غریبوں اور مظلوموں کے لیے اُس کا دل دھڑکتا رہتا تھا۔ ۹ رسال کے طویل عرصے میں دار الخیر اجمیر میں صرف تین اسباق ناغہ ہوئے۔ وہ بھی مجاہد ملت کی دوستی میں۔ کسی مظلوم

کی دادرسی کے لیے کبھی وہ کمشنری کا گھیراؤ کرتا، کبھی کلکٹر کا۔ کہتا جیلانی! تمہیں بھی ساتھ میں رہنا ہے۔ اور میں دوستی کی خاطر ان کے ساتھ گھسٹتا رہتا۔ اسی کی خاطر پورے نو سال کے عرصے میں تین اسباق ناغہ ہوئے، مگر وہ بندہ انگریز کلکٹر و کمشنر یا متعلقہ آفیسر کا اس وقت تک پیچھا نہیں چھوڑتا جب تک مظلوم کی دادرسی نہ ہوجاتی۔ نہ کسی سے دبتا تھا، نہ ڈرتا تھا۔ خوف نام کی کوئی چیز اس کے دل میں جیسے تھی ہی نہیں۔ ہمارے ساتھ ایک حافظ صاحب بھی تھے، جو ہم تمام ساتھیوں کو بہت پیارے تھے۔ سنجیدہ، باادب وسعادت مند۔ ہم تمام ساتھی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ اتنا بڑا کام کرگیا کہ دنیا دیکھتی رہ گئی۔ ہمیں اس پر فخر ہے۔ اس تذکرے پر ہم گومگو کی کیفیت میں ہوتے تو مسکرا کے فرماتے، اچھا تم سمجھے نہیں۔ ارے وہی جن کو تم حافظ ملت کہتے ہو۔ دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے شیخ الحدیث۔ ایک جگہ بیٹھ کر بڑی خاموشی کے ساتھ ایسے افراد تیار کردیئے جنھوں نے دین وسنیت کا بڑا کام کیا۔ فرداً فرداً سب کا تذکرہ کرنے کے بعد ایک خاص کیفیت کے عالم میں فرماتے: یہ ہمارے ساتھی ہیں۔ جب ان کا کوئی جواب زمانے کے پاس نہیں تو پھر ہمارے اساتذہ کا جواب کیا ہوسکتا؟ جانتے ہمارے اساتذہ کو حضور صدرالافاضل اور حضرت صدرالشریعہ ہمارے استاذ تھے، جن کے مثل ان کے زمانے میں نہیں دیکھا۔

مضت الدھور وما آیتن بمثلہ　　　　وَلَقد اتی فعجزت عن نظرائہٖ

حضرت صدر العلماء علیہ الرحمہ کے قابلِ ذکر رفیقانِ درس میں مجاہد ملت حضرت علامہ مفتی محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، محدثِ اعظم پاکستان حضرت علامہ سردار احمد صاحب قبلہ لائل پوری، امین شریعت حضرت علامہ رفاقت حسین صاحب قبلہ مفتی اعظم کانپور، شمس العلماء حضرت علامہ قاضی شمس الدین صاحب قبلہ جعفری جون پوری مصنف قانونِ شریعت، حافظ ملت حضرت علامہ مفتی عبدالعزیز محدث مرادآبادی، الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، خیر الاذکیا حضرت علامہ غلام یزدانی صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم منظر اسلام بریلی شریف، برادرِ اصغر حضرت علامہ غلام جیلانی صاحب اعظمی، شیخ المعقولات حضرت علامہ محمد سلیمان اشرفی بھاگل پوری قدست اسرارھم جیسی نابغۂ عصر ذواتِ قدسیہ تھیں ،جن کے علمی کارناموں کا آوازہ اور جن کے فضل وکمال کا شہرہ شرق سے غرب تک ہوا۔

سیکڑوں تلامذہ میں صرف چند حضرات کو ملاحظہ فرمائیں، جن کے علمی، فکری، دینی، ملّی، سیاسی کارناموں، خدمات اور قربانیوں کی ایک تاریخ ہے۔ اور جن کے کارناموں کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہے۔

قائد اہلِ سنّت، سفیر اسلام، مبلغ اعظم حضرت علامہ شاہ احمد نورانی جن کے حیات وخدمات وکارناموں پر مشتمل وصال کے ایک سال کے اندر ایک سو کتابیں منظر عام پر آئیں، وہ بھی قابلِ ذکر اہلِ قلم کی جانب سے۔ خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ عارف اللہ میرٹھی، خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی، شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی، حضرت علامہ نصر اللہ افغانی، یہ وہ تلامذہ ہیں جو اپنے رب کے جوارِ رحمت میں آسودہ خاک ہیں۔ بقید حیات میں قابلِ ذکر تلامذہ علامہ محمد عاشق الرحمٰن الہٰ آبادی سابق صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، علامہ سید کلیم اشرف جائسی، علامہ انور علی، میرے

بھائی مولانا محمد عارف مصباحی مقیم بمبئی، مفتی محمد فاروق سنبھلی اور راقم الحروف محمد وارث جمال قادری کو بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔

فلحمد للہ رب العٰلمین و شکر الہٗ علیٰ شرف التلمذ۔

آپ کے درس گاہ کی خصوصیت:

آپ کے درس وتدریس کی جو انفرادیت تھی جس کا بڑا شہرہ تھا کہ درس وتدریس ہی آپ کی زندگی اور خدمت علم دین ہی آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ گویا یہی آپ کا پیشہ آبائے سپہ گری تھا۔ تو پھر ایسی پُرعظمت درسگاہ کے تعلق سے جو کہا جائے یا جو سوچا جائے سب کم ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ اپنے تلامذہ کے دلوں میں بزرگانِ دین و اولیائے کرام کی عظمت وجلالت کا اُتارتے تھے۔ ان کے تصرفات و کرامات پر مشتمل کوئی نہ کوئی واقعہ یا کرامت ضرور بیان کرتے تھے تاکہ آگے چل کر علم انھیں گمراہ یا مغرور نہ کردے۔ اپنے تلامذہ کے فکر ونظر کی تطہیر کے لیے فرمایا کرتے تھے۔ وہی علم جلا پاتا ہے اور وہی فیض بخش عام وخاص ہوتا ہے جس پر کسی اللہ والے کی نظر کیمیا اثر پڑ جائے ؎

مولوی ہر گز نہ شد مولانا روم　　　تا غلام شمس تبریز نہ شد

صاحبِ علم اپنے علم پر اِترائے نہ اور علم کی گرمی کو جسم پر نہ بلکہ دل پر مارے اور علمائے دیوبند کی طرح اپنے علم پر نہ مغرور ہوئے اور نہ ہی اِترائے اور ان لوگوں کی صف میں شامل نہ ہوئے جن کے لیے کہا گیا فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔ اپنے علم پر مغرور ہو کر انبیا و اولیا کی عظمتوں پر کمند نہ ڈالنے لگے۔ اس لیے حضرتِ والا جہاں اپنے تلامذہ کو علم سے سیراب کرتے، وہی پر اس کا بھی انتظام کرتے تھے کہ یہ علم اسے مغرور نہ بنا دے۔

فرماتے تھے یہ علمائے دیوبند کوئی معمولی علم والے نہ تھے، نہ ہی گھسیارے تھے بلکہ ان میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک علم والے تھے مگر ان کے علم نے انھیں ڈس لیا۔ فائدہ کے بجائے اُلٹا نقصان پہنچایا۔ ان کے علم ہی کی نحوست سے اُمتِ مسلمہ کو بھی بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ ان کو ان کے غرورِ علم نے کھالیا، اور اپنے غرورِ علمی ہی کے سبب یہ راندۂ درگاہ ہوئے۔ انبیا و مرسلین کی عظمتوں پر کمند ڈالا، اولیا کرام و بزرگانِ دین کی تحقیر وتذلیل کی اور ان کا احترام اُٹھا دیا۔ خصوصاً اپنے پیر ومرشد کی شدید توہین اور ان کی بے ادبی کی اور اپنے علم کے زعم میں ان ظالموں نے احترام مرشد اُٹھا کر فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ کے مصداق ہوئے۔ یہ ظالم ایک طرف تو ان کے مرید و صاحب اجازت وخلافت تھے اور دوسری طرف عقیدہ و مسلک اور معمولاتِ اہلِ سنّت میں ان سے منحرف اور ان کے مسلکِ حق کے باغی۔ کسی فکری و اعتقادی مسئلے یا معمولاتِ اہلِ سنت میں اگر پیر ومرشد قبلہ رُخ ہیں تو یہ ظالم اپنی پشت قبلہ کی طرف کیے ہوئے ہیں۔ جیسے فیصلہ ہفت مسئلہ اور جب اس بوالعجبی پر کسی دیدۂ حیرت نے سوال کیا۔ میاں! یہ کیا؟ حضور قبلہ پیر ومرشد کہاں کھڑے ہیں! اور تم لوگ کہاں پائے جا رہے ہو؟ اس پر وہ ظالم ہنس کر جواب دیتے ہم قبلہ پیر ومرشد سے طریقت میں بیعت ہیں۔ رہ گئی شریعت تو یہ پیر ومرشد سے زیادہ جانتے ہیں۔ ؎

تکبر عزازیل را خوار کرد　　　بزندان لعنت گرفتار کرد

توجس طرح تکبر اور نخوت نے ابلیس کو ذلیل وخوار کر کے راندۂ درگاہ کر دیا، اسی طرح یہ ظالم اپنے غرورِ علمی کے سبب راندۂ درگاہ ہوئے ؎

بھکی ہوئی دانش سے جہالت بہتر
دھوکے کی محبت سے عداوت بہتر

ڈاکٹر اقبال کی روح کو سلام، بڑی صحیح نباضی فرمائی ؎

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

فرماتے تھے اللہ والوں کے منہ سے جو لفظ نکل جائے خواہ لغت اس کی مخالفت کرے یا موافقت، بظاہر بے معنیٰ ہی کیوں نہ ہوں، وہ اپنا ایک اثر رکھتا ہے اور جس تعلق سے وہ جملہ نکلتا ہے اسے پورا ہونا ہے۔

اس تعلق سے پھپھوند شریف (جو یوپی میں ایک مشہور روحانی آستانہ ہے، جو حافظ بخاری حضرت علامہ سید عبدالصمد چشتی علیہ الرحمہ کی وجہ سے کافی شہرت ملی، اور اب تو وہاں آپ کے جانشین یادگارِ سلف حضرت سید اکبر میاں صاحب قبلہ مدظلہ العالی کی خصوصی توجہ سے ایک بڑا دینی ادارہ بھی قائم ہو چکا ہے جو خانقاہی ماحول میں دین پاک مصطفےٰ ﷺ اشاعت میں مصروف ہے۔اللھم زدفزد۔

وہاں پر ایک درویش تھے، جو بظاہر بے پڑھے لکھے تھے مگر مخلوقِ خدا اپنی حاجتوں کے لیے انھیں گھیرے رہتی تھی۔ وہیں پر ایک مسلمان سرکاری ملازم بھی رہتے تھے۔ برسوں سے جن کی ترقی رُکی ہوئی تھی۔ ان کے بعد میں جو ملازم ہوئے وہ ان سے بہت آگے نکل گئے مگر وہ بیچارے بہت قابل ہونے کے باوجود ایک ہی جگہ پر چپک کر رہ گئے تھے۔ جس کے لیے وہ اکثر فکرمند بھی رہتے تھے۔ اپنی بیوی کے بار بار توجہ دلانے پر وہ بھی بادلِ نخواستہ اس درویش کے پاس پہنچے اور اپنی موجودہ صورتِ حال گوش گذار کرنے کے بعد ترقی کی دعا کی درخواست کی۔ اس خدا رسیدہ بندے نے کہا: جلیا حیؔ یا قیؔ پڑھتے رہنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چونکہ یہ سرکاری افسر پڑھے لکھے بہت قابل تھے۔ اپنی قابلیت سے انھوں نے یہ سمجھا: میاں کو یا حیؔ یا قیّوم بتانا چاہیے مگر چونکہ وہ پڑھے لکھے نہیں ہیں، اس لیے قیوم کو قیؔ کہہ دیا۔ چنانچہ انھوں نے آ کر بڑی پابندی کے ساتھ یا حی یا قوم کا وِرد شروع کر دیا۔ کامل ایک ماہ پڑھتے رہے مگر معاملہ جوں کا توں رہا۔ ایک ماہ کے بعد پھر اُس درویش کے پاس پہنچے اور اپنی کیفیت بتائی۔ انھوں نے پھر بڑے جھٹکے کے ساتھ وہی دہرایا کہ جلیا حیؔ یا قیؔ پڑھتے رہنا۔ مگر اُن کی قابلیت قی کی جگہ قیوم ہی پڑھاتی رہی۔ مگر ڈھاک کے وہی تین پات۔ بات جہاں تھی وہیں رہی۔ نیک اور بزرگوں کی عقیدت مند بیوی کے سمجھانے اور حوصلہ دلانے پر ایک بار پھر پہنچے اور کہا میاں صاحب! تین ماہ گئے مگر میں جہاں کا تھا وہیں پر ہوں۔ درویش بڑے غور سے اس کو دیکھتے ہوئے جھنجلا کر کہا تو پڑھتا کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا: یا حی یا قیوم۔ انھوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا اور میں نے تمھیں کیا بتایا تھا؟ یا حی یا قی۔ جھلا کر کہا نیا حی یا قی پڑھتے

رہنا خدا بھلا کر دے گا۔ اس نے دل میں کہا: تین ماہ **تقیوم** پڑھا، اس بار قی پڑھ کر دیکھتے ہیں۔ وہاں سے واپس آ کر حسب معمول درویش کے بتائے ہوئے **وظیفیا حی یاقی** پڑھنا شروع کیا۔ ابھی تیسرا دن ہی ہوا تھا کہ اس کی ترقی کا حکم نامہ اسے مل گیا۔ بڑا حیران ہوا۔ پھر بیوی کو دعائیں دیتے ہوئے بڑی نیاز مندی اور اخلاص کے ساتھ درویش کی خدمت میں شکریے کے لیے حاضر ہوا۔

نہ دیکھ اِن خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اسی نوعیت کا ایک واقعہ دہلی کا ایک مشہور بزرگ (دہلی میں جن کا آستانہ آج بھی مرجع خلائق ہے) حضرت سید حسن رسول نما کے ایک عالم دین مرید کا بھی ہے۔ جسے سید محمد ذوقی کے ملفوظات میں ان کے مرید و خلیفہ کیپٹن واحد بخش سیال مترجم ''مراۃ الاسرار'' نے ''تربیت العشاق'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہاں بھی بیوی ہی کے کہنے و مجبور کرنے پر اپنے بیوی کے حوالے سے اپنی غربت و افلاس کا دُکھ بڑی ندامت کے ساتھ پیر و مرشد کے حضور عرض کیا۔ آپ نے فرمایا مولوی صاحب! اتنے زمانے سے یہاں آپ آتے جاتے ہیں، اپنی عُسرت و تنگ دستی کا کبھی ذکر نہیں کیا؟

حضور! آج بھی عرض نہیں کرتا، مگر بیوی نے بہت مجبور کر دیا ہے کہ ہمیں جاہ و حشمت تو نہیں مگر کم از کم گھر کا چولھا تو جلتا رہے۔ فاقے کی نوبت تو نہ آئے۔

آپ کو اپنے مرید مخلص پر بڑا رحم آیا اور فرمایا: مولوی صاحب! بعد نمازِ عشاء **یَابَاب** پڑھتے رہیے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے گا۔ مگر مرید مخلص عالم و فاضل بھی تھے۔ اس لیے ان کی قابلیت نے انھیں یہ سمجھایا کہ حضور قبلہ پیر و مرشد کی زبانِ مبارک سے غالباً **یَاوَهَاب** کی جگہ **یَابَاب** نکل گیا ہے کیا **یَاوَهَاب** کے معنیٰ اے بہت عطا فرمانے والے، جبکہ باب کے معنی یہاں دروازہ کے ہوتے ہیں۔ جس کا یہاں کوئی محل نہیں۔ بس وہ اپنی قابلیت سے تین ماہ تک **یَاوَهَاب**, **یَاوَهَاب** کا وِرد کرتے رہے مگر حالات جوں کے توں رہے۔ غربت و افلاس کا شکنجہ ان کے گرد کستا رہا

ہمارے گھر کے دیواروں پہ ناصر　　　اُداسی بال کھولے سو رہی ہے

بیوی کے بہت زیادہ ناراض ہونے پر کہ تم کیسا وظیفہ لے کر آئے ہو، جس کا کچھ بھی اثر نہیں۔ جاؤ دوسرا وظیفہ پوچھ کر آؤ۔ تین ماہ بہت ہو گئے۔ تین ماہ کے بعد جھجکتے ہوئے بارگاہِ مرشد میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کیا کہ حضور حالات پہلے جیسے ہی ہیں۔ آپ نے تعجب سے پوچھا کہ مولوی صاحب! میں نے تمھیں کچھ پڑھنے کے لیے بتایا تھا۔ عرض کیا جی حضور! میں بڑی پابندی سے تین ماہ سے پڑھ رہا ہوں۔ پوچھا کیا پڑھ رہے ہو؟ **یَاوَهَاب**۔ میں نے کیا بتایا تھا؟ **یَابَاب**۔

پیر و مرشد نے ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا جائیے **یَابُوَیْب** پڑھتے رہیے۔ مولوی صاحب اپنی قابلیت کے سبب بڑے پریشان ہوئے کہ یا اللہ! باب تو کوئی معنی بھی رکھتا ہے مگر بُوَیْب تو کلمۂ تصغیر ہے، جو بے معنی ہے۔ اب کیا کروں؟ مگر مولوی صاحب عالم و فاضل ہونے کے باوجود احترامِ مرشد میں خاموش رہے کہ با ادب با نصیب، بے ادب بے نصیب۔

بعد نمازِ عشاء حسب معمول جب وہ وظیفہ کرنے بیٹھے تو ایک بار پھر باب و بوییب کے کش مکش میں مبتلا ہو گئے کہ باب پڑھوں کہ بوییب؟ اتنے میں پیر و مرشد کی سرگوشی کرتی ہوئی آواز کان میں آئی کہ پڑھیا بوئیب۔ چنانچہ فوراً انھوں نے یا بوییب پڑھنا شروع کر دیا۔ حسب معمول وہ رات کو کافی دیر تک پڑھتے رہے اور جب صبح ہوئی تو بادشاہ کا خصوصی قاصد ایک غریب و مفلس کا نام و پتہ پوچھتا ہوا ان کے غربت کدے کے دروازے پر دستک دی۔ اور اُسی دن وہ شاہی اتالیق مقرر ہوئے۔ پھر تو ہر طرف حیرت زدہ تکتا کیا ہے؟ مسلسل تین ماہ جو ایک بامعنیٰ کلمہ یا وہاب سے حاصل نہیں ہوا، وہ ایک بے معنیٰ کلمہ یا بوییب پڑھنے سے ایک ہی رات کا یا پلٹ ہو گئی ؎

درِ پیر مغاں میخانہ عشق و محبت ہے
یہاں ہے زہد و تقویٰ آپ کا مے نوش ہو جانا

اولیا اللہ و بزرگانِ دین کی عظمت و جلالت اور ان کی عقیدت و محبت کو تلامذہ کے دلوں میں راسخ کرنے کے لیے درسگاہ میں اپنا یہ واقعہ بھی سنایا کرتے تھے کہ اسے کہتے ہیں فیضانِ نظر۔

فیضانِ نظر:

میرٹھ شہر سے قریب سراوے ایک مقام ہے جو پسنجر ٹرین سے تین اسٹیشن کے فاصلے پر ہے۔ متعلقہ اسٹیشن پر اُتر کر تین کوس یعنی چھ میل پیدل چلنا پڑتا ہے۔ یہ بات نصف صدی کے پہلے کی ہے، ہوسکتا ہے اب کچھ ترقی ہو گئی ہو۔ وہاں پر ایک اللہ کے ولی آسودہ خاک ہیں، جو سراوے کے حافظ صاحب سے شہرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے اہلِ محبت کی دعوت اور ان کے اصرار پر کبھی کبھی میرٹھ شہر میں تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے۔ جب مدرسہ عربیہ اسلامیہ اندر کوٹ کی بڑی دھوم تھی۔ وہ مدرسہ کم کسی نواب کی حویلی زیادہ لگتی تھی۔ پرانے طرز کی بڑی مستحکم تعمیر! نیچے بڑے تہہ خانے جو گرمیوں میں موجودہ ایئر کنڈیشن کا لطف و سکون دیتے تھے۔ تیس اساتذہ اور پانچ سو طلبا کا ہجوم ہوا کرتا تھا۔ استاذی الکریم حضرت علامہ میرٹھی صاحب قبلہ فرماتے تھے کہ میں اسی زمانے سے اس مدرسہ اسلامیہ عربی اندر کوٹ کا صدر المدرسین ہوں۔ انھیں ایام میں سراوے شریف کے حافظ صاحب میرٹھ تشریف لائے۔ ایک سرکاری ملازم جو امین تھے، دین دار، دین پسند اور بزرگوں کے بڑے عقیدت مند مسلمان چہرے پر داڑھی اور اسلامی وضع قطع کے ساتھ رہتے تھے۔ انھوں نے میری توجہ ان کی طرف بڑے اصرار کے ساتھ مبذول کرائی کہ شروع شروع میں تو میں احسن طریقے سے ٹالتا رہا۔ مگر آئے دن جب ان کا مؤدبانہ و مخلصانہ اصرار بڑھا تو محض ان کی دل جوئی اور اپنی جان چھڑانے کی خاطر ان کے بتائے ہوئے پتے پر جو حافظ صاحب کی قیام گاہ تھی، جا پہنچا۔ پہلی نگاہ جو اُن پر پڑی تو طبیعت مکدّر ہو گئی کہ ناحق آ گئے کہ لباس ان کا یوں ہی معمولی سا تھا۔ وہ بھی صاف ستھرا نہیں۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اسلام نے تو صفائی ستھرائی کا حکم دیا ہے۔ النظافة نصف الایمان۔ صفائی کو آدھا ایمان قرار دیا ہے اور یہ کیسے بزرگ ہیں جو اسلام کے اس تاکیدی تعلیم کو نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔ چونکہ اُس وقت جوان تھے، جوانی کے تقاضوں کے پیش نظر بڑے عالمانہ کروفر اور بڑے

سج دھج کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس جذبے کے ساتھ کہ جس محفل میں پہنچوں جانِ محفل نظر آؤں۔ تنہا نظر آؤ نگاہوں کا مرکز بن جاؤ گویا ع ہر آن نیا طور، نئی برقِ تجلی۔

بڑی بے دلی کے ساتھ سلام کیا۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے مسکرائے اور خنداں لبی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ میاں صاحبزادے! ایک مولوی صاحب کسی صاحبِ دل سے ملنے گئے۔ مولوی صاحب نوجوان تھے، شاندار عالم تھے۔ بہت خوب صورت بہت وجیہہ تھے،، بالکل تمہاری اس طرح بے خبر سے وہ آلِ رسول بھی تھے، ہاشمی شرافت ونجابت کے آئینہ دار، جمال وزیبائی کے شاہکار، ظاہری سج دھج اور کروفر ایسا کہ بس دیکھا کیجیے ؎

مصحف رُخ کسی کا ہے کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے تو بس فال نکالی جائے

عالم بھی بڑے زبردست تھے۔ ان کا علم وفضل جوانی ہی میں مسلّم ہو چکا تھا۔ تھے بھی تمہاری طرح بڑے بانکے سجیلے، طرح دار۔

میاں اہلِ دل کا معاملہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے۔ ظاہری رکھ رکھاؤ اُن کے یہاں نہیں ملے گا کیوں کہ تزکیۂ نفس اور صفائی قلب پر وہ توجہ زیادہ دیتے ہیں۔ ظاہر ٹپ ٹاپ کی وہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ خدا رسیدہ بندے واہلِ دل اپنا علم بھی دل پر مارتے ہیں، جسم پر نہیں۔ کہ انھیں ظاہری رکھ رکھاؤ سے کچھ لینا دینا ہی نہیں ہوتا۔ مولوی صاحب کی نگاہ جیسے ہی اس اللہ والے پر پڑی تو ان کی طبیعت ہی کھٹی ہو گئی اور بہت مایوس ہوئے کہ اس اہلِ دل کے بدن پر ظاہری رکھ رکھاؤ نہیں تھا۔ لباس بھی بہت معمولی۔ لگے سوچنے کہ یہ کیا خاک بزرگ ہوں گے جنھیں صفائی ستھرائی کا خیال ہی نہیں جبکہ اسلام صفائی و ستھرائی پر کافی زور دیتا ہے۔ ناحق ملنے آگئے ؎

دلوں کی بات نگاہوں کے درمیان پہنچی
کہاں چراغ جلا روشنی کہاں پہنچی

وہ بولتے جاتے تھے اور میں احساسِ ندامت سے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ ان کا ایک ایک جملہ میرے کتابی علم پر نشتر لگا رہا تھا۔ ابھی سلسلۂ کلام جاری ہی تھا کہ میں بلبلا اُٹھا: بس کیجیے حضور! میرے خطراتِ قلبی کو اب مزید آئینہ نہ دکھائیں۔ میں سخت شرمندہ و نادم ہوں۔ مجھے معاف فرمادیں۔ میں ہی وہ حرماں نصیب ہوں جس کے فاسد خیالات آپ پڑھ رہے ہیں۔ میں آپ کا گنہ گار ہوں۔ میری آنکھوں سے ندامت کے آنسو جاری ہو گئے ؎

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے تھے جو میرے عرقِ انفعال کے

آپ فرمانے لگے: میاں صاحبزادے! تم ناحق ہلکان ہونے لگے۔ آخر تم نے اسے اپنے اوپر کیوں قیاس کر لیا؟ ارے میں تو ایک واقعہ بیان کر رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا: بے شک حضور! آپ ایک بہت صحیح واقعہ بیان کر رہے ہیں۔ مگر

صاحبِ واقعہ کے روبروآپ اللہ ورسول کے لیے مجھے معاف کردیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔آپ نے آگے بڑھ کر مجھے سینے سے لگالیااور ہمیشہ کے لیے اپنا اسیر بنالیا۔اپنی عقیدت ومحبت کا قیدی۔سووہ دن ہے اور آج کا دن، میں کبھی اُن کے تصوّر سے خود کو جدا نہیں کرسکا ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دین بت کدہ تصورات

جب تک وہ میرٹھ میں رہتے مدرسہ کے اوقات کے سوا سارا وقت انھیں خدمات میں حاضر رہتا اور جب وہ سراوے شریف ہوتے تو جمعرات کو آدھا وقت ملا، پڑھا کر سیدھے اسٹیشن پہنچتا وہاں سے ٹرین پکڑ کر متعلقہ اسٹیشن پر اُترتا، پھر وہاں سے چھ میل پیدل چل کر سراوے پہنچتا۔جمعرات کی شب اور جمعہ کا پورا دن انھیں کے خدمت میں گذارتا جب تک وہ باحیات رہے میرے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔انھوں نے بھی مجھے خوب خوب آزمایا۔کبھی گرمیوں میں اطلاع بھجواتے، صدر صاحب شہر سے تھوڑا برف بھجوادیں۔کبھی موسم سے اعتبار سے کسی پھل کی خواہش کی اطلاع ملتی اور میں تیس مدرسین کا صدر ہوکر درسگاہ سے اُٹھ کر سیدھے برف کے کارخانے جاتا وہاں سے برف کی ایک پوری بڑی سِل خریدتا۔ اسے اُٹھا کر اپنے سر پر رکھتا پیدل اسٹیشن جاتا جبکہ اسٹیشن شہر سے کافی فاصلے پر ہے برف کی سِل لیے لیے کھڑکی سے خود ہی ٹکٹ خریدتا اور وہاں سے پسنجر ٹرین پکڑ کر سراوے جانے والے اسٹیشن پر اُترتا پھر وہاں سے چھ میل پیدل برف کی سِل سر پر لیے ان کی بارگاہ میں پہنچتا۔ مجھے برف کی بڑی سِل سر پر رکھ کر پیدل آتے دیکھ کر فرماتے: ارے مولوی صاحب! یہ تم نے کیا غضب کردیا۔ارے تم اتنے بڑے عالم ہو، سیدزادے ہو۔اتنے بڑے مدرسے کے صدرالمدرسین ہو۔ برف کی اتنی بڑی سِل لے کر اپنے سر پر وہ بھی پیدل آئے ہو۔اور پھر میں نے تو تھوڑا سا برف کے لیے کہلوایا اور تم برف کی اتنی بڑی سِل اُٹھا لائے۔ وہ بھی خود اگر لانا تھا تو ایک مزدور یا کوئی اور آدمی ساتھ میں لے آتے۔یہی حال میرا پھل پہنچانے کا بھی ہوتا۔ پورا ٹوکرا پھگوں کی منڈی سے خریدتا اور یوں اپنے سر پر رکھ کر ان کی بارگاہ میں پیدل پہنچتا۔وہ مجھے کافی دنوں تک یوں ہی آزماتے اور جب انھوں نے محسوس کرلیا کہ میرے نفس کی کافی اصلاح ہوچکی ہے اور مجھے اپنی عقیدت ومحبت راسخ، مستحکم، پُریقین اور غیر متزلزل پایا۔پھر تو مجھ پر انھوں نے فیض وعطا اور نوازشات کے دروازے کھول دیے۔مجھے بھی ان کی ذات سے ایک خاص لگاؤ اور ان کی روحانیت پر نہ صرف اعتمادِ کامل بلکہ ایک طرح سے ناز ہوگیا کہ ان کے ہوتے ہوئے میں نے اپنے مقابل کسی بھی بڑی طاقت کو خاطر ہی میں نہیں لایا۔یہاں تک کہ اس نواب کو بھی نہیں جس کا میں ایک ملازم تھا اور پورا اِدارہ جس کے رہین منت تھا۔ان کے روحانی فیوض و برکات وتصرفات وکرامات کو بڑی تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے کے بعد فرماتے۔آج غلام جیلانی جو کچھ ہے، سب انھیں کا فیضان نظر ہے۔میرے آزمانے میں ایک سے بڑھ کر ایک صاحبِ فضل وکمال تھے اور آج بھی موجود ہیں۔خود میرے ساتھی کیا معمولی عظمتوں کے مالک ہیں۔ یہ مولوی سردار احمد (محدثِ اعظم پاکستان)، یہ قاضی شمس الدین (صاحبِ قانونِ شریعت)، یہ مولوی رفاقت حسین (امین شریعت مفتی

اعظم کانپور)، یہ مولوی سلیمان (امام المعقولات بھاگل پوری)، یہ حافظ صاحب (حضور حافظ ملت اشرفیہ مبارک پور)، اور یہ مجاہد ملت (امام التارکین علامہ حبیب الرحمٰن رئیس اڑیسہ صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت) ہے اِن کا ہے اس زمانے میں کوئی جواب؟ جن میں ہر ایک اپنی جگہ پر خود ہی سند ہے، خود ہی حوالہ۔ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا: دیکھو! نہ پیر ہوں نہ فقیر ہوں۔ نہ امیر ہوں، نہ رئیس ہوں، نہ خطیب ہوں۔ بلکہ میں ہوں اور یہ مدرسہ اور یہ چہار دیواری۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے، تحدیث نعمت کے طور پر میری دھمک کہاں نہیں۔ علم و فضل کی وہ کونسی مجلس ہے جہاں پر غلام جیلانی کا تذکرہ نہ ہو۔ آنکھیں بند کر کے میرا جوڑ برصغیر ہند و پاک میں تلاش کرلو۔ مگر یہ سب کچھ میرا اپنا کمال نہیں بلکہ یہ صدقہ ہے، عطا ہے ایک صاحبِ دل کا، ایک صاحبِ نگاہ کا، ایک درویش کامل کا، جو سراوے شریف میں آسودۂ خاک ہے۔ ؎

نہ تخت و تاج نے لشکر سپاہ میں ہے
جو بات قلندر کی ایک نگاہ میں ہے

اس وقت اس مجلسِ خاص میں میرے ساتھ میرے رفیق درس علامہ سید کلیم جائسی، علامہ مفتی محمد فاروق سنبھلی، مولانا صوفی عبدالعزیز اجاگر پوری بستوی، مولانا محمد عارف مصباحی مقیم بمبئی، مولانا لعل محمد، ناوی درگاہ گونڈہ، مولانا محمد شاہد سنبھلی وغیرہ بھی تھے۔

کچھ اسی نوعیت کا معاملہ شیخ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری رضوی صدر المدرسین مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا، ضلع سدھارتھ نگر یوپی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری کے علم و فضل کی دھمک، ان کے تصلب فی الدین کا شہرہ، ان کے علم و عمل، کردار و عمل اور استقامت کی دھوم یہ سب صدقہ، عطیہ کرم اور فیضانِ نظر حضور شعیب الاولیاء شاہ محمد یار علی قدس سرہٗ العزیز بانی دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف یوپی کا۔ حضور شعیب الاولیاء کے کرم کی برسات اور ان کے فیضانِ نظر کا سحاب علامہ پر ٹوٹ کر برسا اور ان کے سارے وجود کو جل تھل کر گیا۔ اخذ و اثر پذیری اور ابدی سعادتوں نے اس ابر کرم کو اپنے اندر جذب بھی خوب کیا۔ ان کا علم چمکا، جلا پایا، فیض بخش عوام و خواص ہوا۔ برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش نیپال کی کم ہی دینی درسگاہیں اور مکاتب ایسے ہوں گے جہاں ان کے علم کا فیضان نہ پہنچا ہو۔ تعمیر ادب کے پانچ حصے، فیض الادب اوّل و دوم، جواہر المنطق، عروس الادب، تعمیر قواعد، وجوہ اعراب اور سوانح اعلیٰ حضرت کے حوالے سے تو ایشیا سے لے کر یورپ و امریکہ و افریقہ تک جہاں جہاں اعلیٰ حضرت کے عشق و عقیدت کی شمع جل رہی ہے ان کے فضل و کمال اور عشقِ رسول کی چاندنی چٹکی ہے، ان کے محبت کی بزم سجی ہے۔ وہاں وہاں حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری ایک سند و حوالہ کی حیثیت سے تشریف فرما ہیں۔ جو سر تا سر فیضان ہے عاشقِ اعلیٰ حضرت حضور شعیب الاولیاء شاہ محمد یار علی قدس سرہٗ العزیز کا۔

علامہ میرٹھی کے درسگاہ کی انفرادیت:

جس زمانے کی یہ بات ہے اُس زمانے میں آج کی طرح اساتذۂ فن کا قحط نہیں تھا اور نہ وہ دور ہی قحط الرجال کا تھا۔

ایک سے بڑھ کر ایک آج علما کی بہتات بلکہ شئی اکثر یرخص کے مطابق علما کی فون ظفر موج جدھر دیکھیے موجیں مارتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک خطیب دوراں۔ اہلِ قلم کا بھی اب قحط نہیں رہا۔ پیروں کی بہتات کی طرف نگاہ ڈالیں تو کش مکش میں پڑ جائیں کہ اس زمانے میں مرید کم، پیر ہی پیر نظر آتے ہیں۔ علمائے دین کی صفوں میں بھی بہتات ہے۔ اگر کمی ہے تو مدرس کی، استاذِ کامل کی۔ ہزاروں کی بھیڑ میں شاید دو تین مل جائیں۔ آہ علمائے دین کے ہجوم میں یہی جو خاصے کی چیز تھی یعنی اساتذۂ فن اور مدرسین، اب وہ کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو آگے چل کر نایاب ہوجائیں گے۔ پھر تو انھیں ڈھونڈو چراغِ رخِ زیبا لے کر۔ آخر کیوں؟ یہ ایک غور طلب معاملہ ہے، جو تفصیل چاہتا ہے۔ دو لفظوں میں صف علما میں یہی سب سے زیادہ قابلِ قدر ہیں اور یہی مظلوم بھی یہی سب سے زیادہ ہیں۔ اگر ان کی مظلومیت کی طرف خصوصی توجہ نہ کی گئی تو دنیا سے علم ہی اُٹھ جائے گا۔ کہ یہی علم کی آبرو بھی ہیں اور دین کی پناہ بھی۔ ہاں تو میں اس زمانے کی درسگاہ کی بات کررہا ہوں جس میں درسگاہ کے شہہ سوار ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ مجمع البحرین حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی ان کے تلمیذ ارشد، حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، امام الحکمت حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب مبارک پوری، علامہ مفتی شریف الحق، بحر العلوم مفتی عبدالمنان اعظمی، علامہ ضیاء المصطفیٰ اعظمی، علامہ ظفرادیبی، علامہ قاضی شمس الدین جونپوری، علامہ غلام مجتبیٰ اشرفی، علامہ مفتی حبیب اللہ نعیمی، علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری وغیرہ وغیرہ جن میں ہر ایک کی انفرادیت مسلم، ہر ایک کا انداز جدا، ہر ایک الگ۔ سبحان اللہ! جو درسگاہ کی آبرو بھی تھے اور علم کی زینت اور دین کی پناہ بھی۔ مگر وہ جو کہا گیا ہے کہ ؎

یوں تو ہیں دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا اندازِ بیاں اور

ان کی باکرامت و بافیض درسگاہ کی جو بات تھی اس کا کماحقہ اندازہ تو انھیں باصلاحیت حضرات کو ہوسکتا ہے جنھیں اس دریائے علم وفن سے ایک جرعہ نصیب ہوگیا ہے۔ اس درسگاہ کا ایک حسن جو میں نے محسوس کیا وہ یہ کہ طلبا کے سوالات بظاہر خواہ کتنے ہی معمولی کیوں نہ ہوں اگر حضور والا کو محسوس ہوجاتا کہ طالب علم مطمئن نہیں ہے تو پھر یہ نہیں دیکھتے کہ سوال کتنا معمولی ہے اور اس کندۂ ناتراش کو مطمئن کرنے میں کتنا وقت لگے گا۔ سوال بار بار دہرا کر لاکھ اپنی غبی الذہنی کا مظاہرہ کیجیے مگر وہاں نہ غصہ ہے، نہ جھنجھلاہٹ بلکہ اس طالب علم پر خصوصی توجہ اور بڑھ جاتی (خود راقم الحروف محمد وارث جمال قادری اس تجربے سے گذر چکا ہے)۔

ہم حضرت قبلہ سے شرح مأتہ عامل، بشیر الکامل کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ بحث تھی معرب کی۔ جس کا آخر عوامل کے اختلاف سے بدل جائے وہ معرب ہے۔ میں نے عرض کیا حضور! معرب کی یہی تعریف کیوں؟ اس کے علاوہ کوئی دوسری تعریف کیوں نہیں ہوسکتی؟ آپ نے اس پر روشنی ڈالی۔ ایک بار، دو بار، جب تیسری بار سمجھایا اور پوچھا کہ بات سمجھ میں آئی؟ میں نے نہایت صفائی کے ساتھ تیسری بار پھر عرض کردیا۔ حضور! میں مطمئن نہیں ہوسکا۔ میرے بغل ہی میں میرے

رفیق درس حضرت سید کلیم میاں جائسی بھی تھے۔ چونکہ وہ ساتھیوں میں کافی ذہین تھے اس لیے ان کے نزدیک یہ سوال بہت معمولی تھا۔ وہ بار بار کان میں سرگوشی کرتے ہوئے جھنجھلا رہے تھے کہ جمال میاں! اس میں کیا رکھا ہے؟ یہ تو بہت چھوٹی سی بات ہے۔ کیوں سبھوں کو پھنسا رکھا ہے آپ نے۔ چلیے کمرے میں، آپ کو اس کی دلیل حصر سمجھا دیتا ہوں۔ لیکن یہ سُنی ان سُنی کرتے ہوئے حضرت کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ ہماری تیسری بار بے اطمینانی ظاہر کرنے پر اساتذۂ کرام کی عام روش کے خلاف نہ تو ناراض ہوئے، نہ جھنجھلائے بلکہ اس کے برعکس بڑی خوشی ظاہر کی اور مسکراتے ہوئے چابیوں کا ایک گچھا مجھے پکڑا دیا اور فرمایا: جمال میاں! میرا حجرہ کھول کر ڈیسک پر تحریر سنیت ہے۔ اسے اور سامنے الماری میں حاشیہ عبدالغفور، اس کے بازو میں خیالی ہے۔ وہ سب اُٹھا لاؤ۔ حسب الارشاد جب میں ساری کتابیں لے کر آیا تو انھیں میں حضرت ڈوب گئے۔ کلیم میاں صاحب سرگوشی کرنے لگے: چلو آدھے گھنٹے کی اور چھٹی! کافی دیر کے بعد جب حضرت نے سر اُٹھایا تو چہرہ مسرت سے تمتمایا ہوا تھا۔ سنو جمال میاں! پھر پانچ منٹ بڑی نفیس وضاحت کی تو کلی طور پر مطمئن ہو گیا۔

دراصل بات یہ تھی کہ ہدایت النحو کمسنی ہی میں پڑھ لیا تھا۔ ہمارے ہدایت النحو کے استاذ حضرت مولانا صوفی محمد صدیق صاحب بھیرہوا راج نیپال جو اُس زمانے میں مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر یوپی کے صدر المدرسین تھے، انھوں نے معرب کی تعریف میں جو دلیل حصر سمجھا دیا تھا وہ ذہن میں مرتسم ہو چکی تھی۔ میں امام النحو کی بارگاہ سے اس کی تائید یا تردید چاہتا تھا۔ تردید تو نہیں رہی تھی مگر واضح طور پر اس کی تائید بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ مگر آخری بار جب حضرت نے روشنی ڈالی تو خوشی کے ساتھ اس کا اطمینان ہو گیا۔ ہم نے بہت پہلے معرب کو جو سمجھا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ دورانِ درس علمائے دیوبند کی علمیت وقابلیت کا احتساب کرتے ہوئے ان کا علمی افلاس پیش کر کے یہ پڑھتے ہوئے کہ کبرت کلمۃ من افواھم لا یقولون الا کذبًا ہنس پڑتے۔ تو ان نامی گرامی علم دانوں کی بے علمی پر ہم لوگوں کو ترس آنے لگتا۔ اور جب خطبا و واعظین پر تنقید فرماتے تو ایسا لگتا کہ اس طبقے میں اگر کوئی طبقہ گیا گذرا اور زمین کے سینے پر بوجھ ہے تو بس یہی طبقہ۔ اس وقت یہ احساس بڑا شدید تر ہو جاتا کہ پڑھ لکھ کر سب کچھ بن جاؤ مگر واعظ وخطیب نہیں۔

حضرت علامہ میرٹھی کا وفورِ علم:

۲؍ مئی ۲۰۰۳ء کو بعد نمازِ مغرب مسجد ٹھکر کالونی، کرلا ممبئی جماعت اہلِ سنت کے ایک بزرگ عالمِ دین اور سرزمین بہار کی مشہور علمی ودینی شخصیت پیر طریقت حضرت علامہ سید رُکن الدین اصدق ایڈیٹر جامِ شہود بہار نے دورانِ گفتگو حضرت امام النحو علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے وفورِ علمی پر ایک واقعہ بیان کر کے ہمیں خوشگوار حیرت سے دوچار کیا۔ عالمِ سرخوشی میں کہنے لگے مولانا وارث جمال صاحب! میری ان خوش نصیب آنکھوں نے حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کا دیدار کیا ہے۔ بات ان کے وفورِ علمی پر ہونے لگے اور ذکر نکل آیا بشیر الکامل کا۔ فرمانے لگے: الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں میرے ہم سبق مولانا عبدالرحمٰن پورنوی تھے جو پوری جماعت میں کافی ذہین تھے۔ ان کی ذہانت وفطانت کا احساس اساتذۂ کرام کو بھی تھا۔ ایک روز دورانِ سفر امام الحکمت، رازیِ وقت حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کے سامنے بشیر

الکامل کے اس مقام کو رکھ دیا جہاں پر حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ نے صاحبِ شرح جامی حضرت علامہ جامی کے موقف کے خلاف اپنا ایک الگ موقف اختیار کیا تھا۔ حافظ عبد الرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمہ اشرفیہ کی روح اور اپنے استاذِ محترم حضور حافظ ملت کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے، خود حضور حافظِ ملت اپنے تلمیذ ارشد کو بڑے فخر و احترام سے امام الحکمت فرمایا کرتے تھے۔ اپنے زمانے میں وہ امام علم وفن تھے۔ ہست و ریاضی میں بھی انھیں دستگاہ تھی۔ اس فن میں آپ حضور ملک العلماء حضرت علامہ ظفر الدین صاحب قبلہ علیہ الرحمہ تلمیذ رشید اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے۔ اشرفیہ مبارک پور کے سارے بالغ نظر تلامذہ ان کے حضور بہت مؤدب تھے اور آپ کی ذات سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اساتذۂ کرام کے دلوں میں بھی آپ کا بڑا احترام تھا۔ خود راقم الحروف وارث جمال قادری کو جہاں حضرت علامہ میرٹھی، حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی، مفتی بدر الدین احمد قادری، بحر العلوم علامہ مفتی عبد المنان اعظمی، علامہ ظفر ادیبی کے درسگاہ میں بیٹھنے کی سعادت اور ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے وہیں حضور امام الحکمت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ آپ درس وتدریس کے میدان میں اللہ ربّ العزت کی عطا سے وہ مجمع البحرین حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی، شیخ الادب و شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف و امام النحو حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی کے قدم بہ قدم تھے۔ شکل وصورت اور جثہ تو بس یوں ہی تھا۔ اجنبی تو انھیں عالم ہی نہیں سمجھ پاتا، مگر وہ علم کے بحر بیکراں تھے۔ ان کی درسگاہ کی ایک ہیبت تھی اور وہاں تلامذہ کے سر ہی نہیں دل بھی جھکے رہتے تھے۔ بے شک ہم خود کو بہت خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ ہمیں ایسی ذواتِ قدسیہ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے فالحمد للہ علیٰ ذالك۔

تمہاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا ہے سرمایہ

آج فتاویٰ رضویہ شریف کی ابتدائی پانچ ضخیم جلدیں جو دنیا بھر کے اہلِ علم کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کی خوش گوار دھڑکن بنی ہوئی ہے اس کی تسوید، تبویض اور اشاعت انھیں کے خونِ جگر کا رہین منت ہے۔ اور اس راہِ محبت و استقامت میں بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ ان کے معاون تھے۔

مولوی عبید الرحمٰن صاحب بشیر الکامل کے اس مقام کو حضور حافظ جی قبلہ کے سامنے رکھتے ہوئے عرض کیا کہ حضور! یہاں ہم کس کے موقف کو مانیں؟ حضرت علامہ جامی یا حضرت علامہ میرٹھی کے موقف کو؟

بڑوں کی بڑی باتیں۔ فرماتے ہیں مولوی عبید الرحمٰن سلمہٗ حضرت علامہ میرٹھی چونکہ اُس وقت پورے برصغیر ہندو پاک میں اس فن کے امام ہیں، میری یہ مجال نہیں کہ اس پر اُنگلی رکھوں۔ ہم لوگوں کی خوش قسمتی سے حضور والا ابھی باحیات ہیں۔ دونوں موقف کو حضور والا کی بارگاہ میں رکھ کر انھیں سے کوئی فیصلہ لے لو۔ آہ! یہ تھا بڑوں کا حسنِ ادب! اپنے بڑوں کی بارگاہ میں۔

مولوی عبید الرحمٰن صاحب نے دونوں موقف کو بڑی تفصیل کے ساتھ لکھ کر بذریعہ ڈاک میرٹھ حضرت قبلہ کی خدمت اقدس میں بھیجا۔ دس دن میں جواب آ گیا۔ آغاز میں مولوی عبید الرحمٰن کو بڑی دعائیں دیتے ہوئے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا کہ اس دور میں اتنی جستجو بڑی خوش آئند ہے۔ اللھم زد فزد۔

پھر بڑی تفصیل و تحقیق سے اپنے موقف کی تائید میں سترہ ائمۂ نحو کے اقوال، ان کی اصل عبارات مع جوابات پیش فرما کر لکھتے ہیں کہ جب اس فن کے سترہ ائمہ اسلام حضرت علامہ جامی قدس سرہ السامی کے موقف کے خلاف ہیں تو میں یہاں ان کے موقف کو کیونکر اپنا سکتا تھا۔ حضرت کی بارگاہ سے بذریعہ ڈاک آیا ہوا جواب ہم حضرت حافظ جی قبلہ کے سامنے رکھا گیا تو آپ نے اسے ملاحظہ فرما کر خود ہی سناٹے میں آ گئے کہ حضور والا تو اس میدان میں ہم لوگوں کے وہم و گمان سے بھی آگے ہیں۔

استاذی الکریم حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے تعلق سے تو میری یادوں کی زنبیل اتنی بھری ہوئی ہے کہ پچاس صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔ محترم حافظ ایوب اشرفی فرزند نسبتی علامہ میرٹھی کا میں نے صرف شکر گزار بلکہ احسان مند ہوں کہ انھوں نے جہاں اپنے اخلاصِ پیہم سے مجھے قلم اٹھانے کے لیے تیار کیا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ صفحات پیش کیے، وہیں وقت بڑا مختصر دیا۔ ایسے وقت انھوں نے مجھ سے فرمایا جبکہ میں اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کی ہماہمی میں تھا۔ صرف پندرہ دن رہ گئے تھے اور شہر میں اونٹ بدنام کے مطابق مجھے اس اس کا اہتمام بھی کرنا تھا۔ خدا کا لاکھ لاکھ و کروڑہا کروڑ شکر و احسان ہے کہ اس فریضے سے سبک دوش ہوا۔ بمبئی کی تاریخ میں وہ ایک مثالی و تاریخی شادی تھی۔ میرے استاذ محترم حضرت بحر العلوم علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ متعان اللہ بطول حیاتہ نے اس کبر سنی و کمزوریِ صحت کے باوجود اپنے فرزند معنوی پر ایک بڑا احسان کرتے ہوئے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ نکاح کی مناسبت سے ایک مختصر یادگار خطاب فرمایا او نکاح خوانی کی عزت سے سرفراز فرمایا۔ بمبئی سے چالیس کلومیٹر دور ممبرا کوسہ میں۔ آزاد میدان میں سنّی دعوتِ اسلامی کے اجتماع کے باوجود قابل ذکر علمائے کرام و ائمہ مساجد کی ایک بڑی تعداد اور وی آئی پیز کی بھیڑ دیکھ کر حضور والا اپنے شاگرد کی مذہبی و سیاسی و سماجی گرفت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بڑی دعائیں دیں۔ اس خصوص میں شکر گذار ہوں حضرت کے فرزند ارجمند، آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور عصائے پیری حضرت مولانا شکیب ارسلان و حضرت علامہ معین الحق علیمی صدر دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کا کہ ان حضرات کی خصوصی توجہ اور سعادت سے حضرت قبلہ کی شرکت ممکن ہوئی۔ یہ حضرات حضورِ والا کے میمنہ و میسرہ کی حیثیت سے تشریف لائے۔ اپنی بچی کی شادی میں حضرت بحر العلوم کی شرکت خصوصی نے اس تقریب میں چار چاند لگا دیئے اور اس پر آج بھی میں اتنا خوش ہوں کہ ؏ بنازم خویش کہ کارے کردم!

اعلیٰ حضرت پر حضرت کا ایمانِ کامل:

اعلیٰ حضرت مجددِ دین وملت سیدنا امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان جس دین وسنّیت کی اپنے زبان وقلم سے بے مثال خدمت کی اور مذہبی فتنوں کی آماجگاہ میں بڑی جاں سوزی کے ساتھ مذہب اہلِ سنت و جماعت کی حفاظت و

صیانت اور عشقِ رسول کی تبلیغ اور اپنے کارناموں سے "امام اہلِ سنّت" علی الاطلاق ومجددِ اعظم فی الآفاق ہوئے۔ اس دین وسنیت پر آپ کا ایمان کتنا کامل اور یقین کتنا محکم تھا اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں۔

میرٹھ شہر کی سنّیت بھی گلابی تھی اور وہاں کی دیوبندیت کا حال بھی بڑا عجیب تھا۔ وہ لوگ بڑی پابندی کے ساتھ نیاز فاتحہ بھی کرتے تھے اور مولود شریف بھی سنتے تھے۔ اس کے لیے مدرسہ اسلامیہ عربی اندر کوٹ کے طلبا کے لیے آئے دن دعوت بھی کرتے تھے۔ بزرگوں کے مزارات پر حاضری بالخصوص کلیر شریف کے عرس میں بڑے جوش وخروش سے شرکت کرتے۔ عرس کے موقع پر دارالعلوم دیوبند کا بھی وہاں کیمپ لگتا تھا۔ ان معمولاتِ اہلِ سنّت پر عمل پیرا ہونے کے باوجود ان کی وابستگی دیوبند سے تھی اور دارالعلوم دیوبند کو اپنا ادارہ سمجھتے تھے۔ ویسے بھی دارالعلوم دیوبند اپنے آغاز سے لے کر تیس برس تک وہ اپنے معمولات وطریقۂ کار میں اہلِ سنّت کے طریق پر گامزن تھے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی ومؤسس قادری سلسلے کے مشہور علاقائی بزرگ اور حضرت حاجی امداد اللہ مکّی علیہ الرحمہ کے مرید وخلیفہ حضرت صوفی سید عابد حسین قادری علیہ الرحمہ تھے۔ حضور صوفی سید عابد حسین صاحب علیہ الرحمہ کا مسلک ومشرب وہی تھا جس کی قیادت وامامت بدایوں و بریلی، مارہرہ مطہرہ وکچھوچھہ مقدسہ کے علما ومشائخ فرماتے تھے۔ جس میں نمایاں حیثیت بریلی شریف کو حاصل ہے۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند تیس برس تک اپنے بانی ومؤسس کے طریقے یعنی طریقۂ اہلِ سنّت ہی پر گامزن تھا[1] اور کون جانے دیوبند کا خانہ ساز مذہب بطور تقیہ عوام کے سامنے دیوبندیت (جو اسلام کے مقابلے میں مستقل ایک مذہب ہے) کا اظہار ویسے کرتے رہے ہوں جیسا کہ میرٹھ کے دیوبندیوں کا طریقہ رہا۔ آخر اب تک اسلام کے اندر، اسلام کے نام پر جتنے بھی فرقہائے باطل پیدا ہوئے ہیں انھوں نے افرادی قوت تو سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت ہی سے حاصل کی ہے۔ اسی پاک مذہب پر شب خون مارا۔ عوام کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اوّل اوّل وہ یہی طریقہ اپناتے۔ جب تک ان کی ذہن سازی تقیہ بازی کے ذریعے نہیں کر لیتے، اپنے وہابیت ودیوبندیت کا اظہار نہیں کرتے۔ کلمہ ونماز کے نام پر تبلیغی جماعت کی چلت پھرت اور ان کا چلّوں پر زور دینا یہ ذہن سازی ہی کے لیے ہوتا ہے۔ اور جب وہ چلّے کے جال میں پھنسا لے جاتے ہیں تو بڑی خوب صورتی کے ساتھ ذہن سازی کے ذریعے کل تک معمولاتِ اہلِ سنّت جو ایمان کا ایک حصّہ تھے، وہی سب بدعت، ناجائز وحرام ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے بڑے پیشوا امام الوہابیہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب مدرسہ فیض عام کان پور یوپی انڈیا میں اپنایا۔ شروع شروع میں انھوں نے سنّی مسلمانوں کے گھروں میں خوب نیاز فاتحہ، میلاد شریف پڑھا اور جب بتدریج ذہن سازی کے ذریعے کچھ لوگوں نے اپنا ہم نوا وحمایتی بنا لیے۔ تو بڑی بے شرمی کے ساتھ اپنا چولہ بدل دیا کہ نہیں بھائی! یہاں تو اب وہابی رہتے ہیں۔ جو نیاز فاتحہ، میلاد نہیں کرتے اور نہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ میلاد و فاتحہ کے لیے کہیں اور جائیے۔

---

[1] اس تعلق سے ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم اُستاذ جامعہ ملیہ دہلی کی مشہور کتاب "دارالعلوم دیوبند کا بانی کون؟" ملاحظہ فرمائیں۔ وارث جمال قادری

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

میرٹھ کی سنّیت بھی کس قدر گلابی تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیں۔ دورانِ تعلیم درسگاہ میں ایک دن استاذی الکریم حضرت علامہ میرٹھی نے فرمایا کہ آج ایک رئیس کی دعوت پر ان کے گھر پہنچا تو وہ پُرتپاک انداز میں ملے اور کہنے لگے کہ اے کاش! صرف دس منٹ پہلے آپ آگئے ہوتے تو بہت اچھا ہوتا کہ سنیت وہابیت کا مسئلہ جو کئی نسلوں سے سوہانِ روح بنا ہوا ہے اور آئے دن اس سلسلے جھگڑے و اختلاف ہوتے رہتے ہیں۔ آپ کے آنے سے صرف دس منٹ قاری طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند اُٹھ کر گئے ہیں۔ اگر آپ دس منٹ پہلے آگئے ہوتے تو دونوں کی ملاقات ہوجاتی اور اس نازک مسئلے کا کوئی حل ضرور نکل آتا، کہ جہاں قاری طیب صاحب وہابیوں کے سب سے بڑے عالم ہیں، وہیں آپ جماعت اہلِ سنّت کے بڑوں میں ہیں۔ میں نے ان سے کہا: ارے بھائی! ہم دونوں کی ملاقات سے اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے وہ بھی صرف دس منٹ میں اگر قاری صاحب چاہیں تو۔ ابھی تو وہ شہر ہی میں ہوں گے۔ انھوں نے بڑی حیرت سے کہا: ہاں! ابھی وہ شہر ہی میں ہیں مگر اس مسئلے کا حل صرف دس منٹ میں کیسے نکل سکتا ہے جو کئی نسلوں سے میدانِ کارزار بنا ہوا ہے اور آئے دن کے لیے مباحثہ، مناظرہ، مجادلہ تک ہوتا رہتا ہے۔ اس کا حل دس منٹ میں کیسے؟ میں نے بڑے اطمینان کے ساتھ ان سے کہا کہ اگر واقعی قاری طیب صاحب خلوصِ دل سے اختلاف کو اگر ختم کرنا چاہتے ہیں تو بے شک وہ دس منٹ میں ختم ہوسکتا ہے۔ وہ اس طور پر کہ آپ ہم دونوں کو ہزاروں لوگوں کے سامنے بٹھا کر آدھا آدھا سیر سنکھیا زہر گھول کر ہم دونوں کو ایک ساتھ دیں اور ہم عوام کے ساتھ اپنے اپنے حصے کا زہر اس اعلان کے ساتھ پئیں کہ حق جس کے ساتھ ہے، یہ زہر اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر حق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے ساتھ ہے تو مجھے کچھ نہیں ہوگا اور اگر حق علمائے دیوبند کے ساتھ ہے تو قاری طیب صاحب کو کچھ نہیں ہوگا۔ میری اس تجویز سے وہ گھبرا گئے۔ نہیں حضرت! ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو بڑی خطرناک بات اور پھر قانوناً جرم بھی ہے۔ حکومت بھی ایسا نہیں کرنے دے گی۔ فقیر نے فوراً دوسری تجویز پیش کردی کہ ہم دونوں کو میرٹھ کے گھنٹہ گھر کی بلندیوں پر کسی طرح سے چڑھا دو، ہم اس اعلان کے ساتھ زمین پر کودیں کہ جس کا مذہب حق ہوگا اسے بالکل چوٹ نہیں آئے گی اور باطل کا تیا پانچہ ہوجائے گا۔ وہ رئیس پھر گھبرا گئے۔ ارے نہیں صاحب! یہ تجویز بھی بڑی خطرناک ہے۔ فقیر نے فوراً تیسری اور آخری تجویز پیش کی، میرٹھ کے فلاں میدان میں (حضرت نے میدان کا نام لیا تھا مگر نام یاد نہ رہا) ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ فقیر اپنے اہل وعیال کو لے آتا ہے اور قاری طیب بھی اپنے اہل وعیال کو لے کر آجائیں اور مباہلہ ہوجائے۔ تھوڑی ہی دیر میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے سامنے حق ظاہر کردے گا اور آئے دن کے اختلافات ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائیں گے۔ وہ رئیس صاحب میری اس تجویز سے بہت خوش ہوگئے اور کہا: ہاں! یہ کوئی بات ہوئی۔ میں قاری صاحب سے مل کر یہ تجویز ان کے سامنے رکھ کر آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔ میں نے چلتے چلتے بطور پیش گوئی کہا: یہ بھی سن لیجیے کہ قاری طیب اس پر بھی کبھی تیار نہیں ہوں گے۔

کچھ دنوں کے بعد وہ ملے اور بڑی ندامت سے کہنے لگے حضرت! میں نے بڑی کوشش کی کہ قاری طیب صاحب آپ کی تجویز مان لیں مگر آپ کی پیش گوئی کے مطابق وہ اس پر بھی تیار نہیں ہوئے۔ اُلٹا مجھے ہی سمجھاتے رہے کہ ان سب چکروں میں آپ نہ پڑیں۔ میں نے کہا بھائی! اب تو آپ کی آنکھیں کھلنی چاہیے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ اعلیٰ حضرت بریلوی کی طرف یا علمائے دیوبند کی طرف؟ میں نے جرأت سے عرض کیا: حضور! اگر قاری طیب صاحب تیار ہو جاتے تو کیا واقعی آپ سنکھیا زہر پی لیتے؟ آپ نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے فرمایا: جمال میاں! بے شک! میں تو آج بھی تیار ہوں اور اس زہر سے میرا کچھ نہیں بگڑتا کہ میرا نہ صرف ایمان بلکہ اطمینان ہے کہ جس دین وسنیت پر ہم قائم ہیں یہی حق ہے۔ پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زہر خورانی کا واقعہ بڑی تفصیل سے بتاتے ہوئے فرمایا جب اس زہر ہلاہل سے انھیں کچھ نہیں ہوا تو میں بھی انھیں کا غلام ہوں۔ اسی مذہب حقہ کے لیے اتنا بڑا اقدم اٹھاؤں گا، تو مجھے کچھ نہیں ہوگا۔

جی چاہتا ہے آئیں حقائق کی دھوپ میں
سایہ فگن سروں پہ انا کا شجر بھی ہے

بیعت وارشاد:

سراوے شریف کے حافظ صاحب قبلہ علیہ الرحمہ سے آپ کی عقیدت و وابستگی جس منزل پر تھی گذشتہ صفحات کے مطالعہ سے اس کا ایک اندازہ ہو چکا ہوگا، اس میں آپ کا حسنِ ادب اور عقیدت و احترام تو آپ ملاحظہ ہی کر چکے ہیں مگر بیعت جسے کہتے ہیں اس میں آپ کی دقت نظر غیر معمولی تھی۔ عقیدت واحترام اپنی جگہ مگر نقد جان کی سپردگی ایک الگ چیز! بیعت کی حقیقت یہ ہے کہ ؎

بک گئے جس کے ہاتھوں بک ہی گئے
یہ نہیں ہے تو رسمِ بیعت کیا

یہاں تو دست مرشد کے مقابلے میں دستِ خضر ثانوی چیز ہوتی ہیں۔ یہاں تو مخدوم بہار حضرت یحیٰ منیری کے مرید کا کردار ہی رہنما بنتا کہ دریا میں ڈوب رہا ہے، حضرت خضر دستگیری کے لیے تیار کھڑے مگر ہاتھ حضرت خضر کے ہاتھ میں اس لیے نہیں دے رہا ہے کہ ''وہ ہاتھ تو یحییٰ منیری کو دے چکا تھا''

آخر کار بکے تو ایسے ہاتھوں پر جو اُن کے علم وفضل، علوئے مرتبت اور بلند قامت شخصیت کے شایانِ شان تھا۔ جس کے دامن سے وابستہ اعاظم رجال کا ایک ایسا سلسلۃ الذہب تھا جو اُن کے زمانے میں کسی اور کو میسّر نہیں تھا، اور تو اور ہیں اس حسنِ خوباں کو دیکھ کر تو وقت کا مجددِ اعظم بھی تحسین و مرحبا کہہ اُٹھتا ہو ؎

اشرفی اے رخت آئینہ حسن خوباں
اے نظر کردۂ پروردۂ سہ محبوباں

مرشد کی بارگاہ کی بلندیوں کا اندازہ کرنے کے لیے مسترشد کی نیازمندیاں ہی کافی تھیں، ملاحظہ ہو:

"قدوۃ السالکین، زبدۃ العارفین، ملجیٰ و ماویٰ بے کساں، مرجع و ملاذ کاملاں، اشرف المشائخ سیدنا و مولانا الشاہ سید علی حسین اشرفی کچھوچھوی قدس سرہٗ القوی کے دست حق پرست پر بریلی شریف میں بموقع عرسِ رضوی ۱۹۲۲ء (میں) شرفِ بیعت حاصل ہوا۔ اور دارالخیر اجمیر شریف میں ۱۲ر ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ خلافت سے نوازا تھا۔ خلافت نامہ کے ساتھ ایک کلاہ اور ایک استعمال شدہ جبّہ بھی عطا فرمایا۔ جس کے متعلق اہلِ خانہ کو وصیت کردی تھی کہ میرے کفن میں شامل کردیا جائے، کیوں کہ بزرگانِ دین کے ملبوسات شاملِ کفن کرنا مسنون ہے۔" (دیباچہ بشیر القاری، ص۱۷)

مجددِ سلسلۂ اشرفی شیخ المشائخ حضرت سید علی حسین اشرفی جیلانی سے بیعت اور پھر مرشد کامل کی بارگاہ سے اجازت و خلافت حاصل کرکے اس سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی بن گئے، جس میں بڑے بڑے اصحابِ فضل وکمال وارباب شرف و مجد شامل ہیں۔ جن کی یکتائی و بے نظیری اور جن کی امامت وقیادت وسیادت کا دبدبہ آج بھی دلوں پر قائم ہے۔

صدر الافاضل، فخر الاماثل، امام المفسرین، سلطان المناظرین، سید المتکلمین، حضرت علامہ سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، شیخ الانام حجۃ الاسلام، امام العلماء، آیۃ من آیات اللہ حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد حامد رضا خان بن اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا خان بریلوی، قطب مدینہ سلطان المشائخ حضرت علامہ مفتی ضیاء الدین مہاجر مدنی، مبلغ اسلام عبقری الشرق حضرت علامہ مفتی محمد عبد العلیم صدیقی میرٹھی، امام التارکین سلطان العلماء حضور مجاہد ملت مفتی شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی رئیس اعظم اُڑیسہ وصدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، معمارِ اعظم جلالۃ العلم حضور حافظ ملت محدث مرادآبادی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، سلطان المناظرین امین شریعت حضرت علامہ مفتی سید رفاقت حسین صاحب مفتی اعظم کانپور، امام المعقولات حضرت علامہ محمد سلیمان بھاگل پوری، مبلغ اعظم حضرت مولانا قطب الدین برہمچاری، فخر العارفین حضرت علامہ فاخر الہ آبادی، مخزنِ اسرار معقول ومنقول حاوی فروع واُصول مطلع العلوم مجمع الفہوم، عالم باعمل، فاضل بے بدل، منبع الاخلاق، مصدر الاحسان، شیخ الاساتذہ، سند المحققین، تاج العلماء، امام النحو، صدر العلماء سیدی وسندی واُستاذی حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی قدست اسرارہم۔۔۔ یہ وہ اعیانِ اہل سنت واساطین امت ہیں جن کی مثال زمانہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ایسے کاملین کا اعتراف ورجوع اوران کی بارگاہ سے وابستگی شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں اشرفی جیلانی کی عظمتوں کی شہیر ہے ؎

کہ جن کے رُتبے ہیں سوا ان کے سوا مشکل ہے،

اور اسی سے ان کے چمن زار ہستی کا اندازہ ہوتا ہے ؎

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

سلسلۂ بیعت وارشاد:

بے شک آپ ایک مرشد کامل کے مسترشد کامل تھے اوراس بارگاہ سے اجازت وخلافت بھی حاصل تھی اورخود علم و فضل، شرف ومجد کے ایسے بلند منصب پر تھے کہ جانے کتنے پیرانِ طریق ان کے قدموں تک پہنچنے ہی کواپنی معراج سمجھتے تھے۔ بیعت وارشاد (پیری مریدی) کے لیے جس جوہر گراں مایہ اور اوصافِ حمیدہ کی ضرورت تھی ان سے وہ آراستہ و پیراستہ تھے۔علم وفضل ایسا کہ جس کی نوبت رہتی دنیا تک بجتی رہے گی۔شرف ومجد ایسا کہ اس خصوص میں بھی وہ گل سرسبد تھے۔جمال وزیبائی ایسی کہ ؎

ذکر جب بھی غزالانِ چمن کا نکلا　　　بات پہنچی وہ تیری قامت زیبائی تک

وجاہت وجلالت شان ایسی کہ ؎

تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

یکتائی وبے نظیری کا عالم یہ ہے کہ ؎

وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

تو پھر آپ نے اس کوچے میں قدم کیوں نہیں رکھا، جب کہ ان کے ساتھ "مریداں پرانند" والی بات بھی نہیں تھی!

بات یہ تھی کہ جس کا معیارِ علم وفضل اتنا بلند ہو کہ سیکڑوں قابل ذکر تلامذہ میں سے صرف چند کو ہی اپنی سند دی ہو کہ بعد کے تلامذہ خاص کو بھی اپنے سندِ علمی کے معیار کے لائق نہیں سمجھا۔عمر کی آخری سانس تک وہ درس وتدریس ہی سے وابستہ رہے۔ برسوں بڑی عرق ریزی کے ساتھ انھیں پڑھایا مگر دستارِ فضیلت کے لیے بریلی شریف، جامعہ نعیمیہ مرادآباد یا دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کے لیے مشورہ دے کر انھیں رخصت کردیا اور جب متعلقہ اِداروں کو یہ حقیقت معلوم ہوتی کہ یہ حضرت صدرالعلماء کی بارگاہ سے آیا ہے تو خوش ہوکر اس انداز میں پذیرائی کرتے کہ گویا ؎ بیابیا عراقی توز خاصگان مائی

تو جو اپنے تلامذہ کو صرف اس احساس کے تحت اپنی سند علمی نہ دے کہ وہ ہماری سند کا متحمل نہیں، وہ بھلا پیری مریدی کیسے کرسکتا تھا؟ کہ یہ پیشہ بساطِ سیاست کی طرح کل، بل، چھل چاہتا ہے اور یہی ہنر ان کے پاس نہیں تھا۔وہ اپنے گردوپیش دیکھ رہے تھے کہ ؎

قُم باذن اللہ جو کہتے تھے وہ رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

قطب عالم حضور مفتی اعظم ہند بریلوی علیہ الرحمہ جو علم وفضل کے ساتھ ہی اقلیم روحانیت کے بھی تاجدار ہیں، اس تعلق سے ان کے محسوسات بھی کچھ اسی نوعیت کے ہیں ؎

ہے صفائے ظاہری کے ساز و ساماں خوب خوب
جس کا باطن صاف ہو وہ باصفا ملتا نہیں
ہے ریاکاروں کا شہرہ اور ریاکاری کی دھوم
بوریائے فقر بھی اب بے ریا ملتا نہیں

جس زمانے کے یہ محسوسات ہیں اس زمانے کا عام مسلمان بھی خوفِ خدا، دین پسندی اور پرہیزگاری میں (آج کل جو خاصانِ خدا کا نمود لیے ہوئے ہیں) ان سے کہیں زیادہ تھی اور اب عوام کی تو بات ہی کیا جب خواص ہی خوفِ خدا اور فکر آخرت کو ثانوی چیز سمجھنے لگے۔ جس طرح ایک دنیادار خوفِ خدا سے بے نیاز ہوکر حصولِ دنیا کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے، اسی طرح آج کے طبقۂ خاص کی اکثریت لباسِ خضر میں اہلِ دنیا کو پچھاڑنے کے لیے تمام ترکل، بَل، چھل اپنائے ہوئے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر وہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہی دین داری ہے تو پھر دنیاداری کس چڑیا کا نام ہے ؎

اس راز کو فاش کردے اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

اس طبقۂ خاص میں جو ابتری پیدا ہو چلی تھی اس کے لیے ڈاکٹر اقبال کی بے چینیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ؎

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی — گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ — مانند بتاں بجتے ہیں کعبے کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیرانِ حرم کا — ہر خرقہ سالوس میں بیٹھا ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے اسے مسند ارشاد — زاغوں کے تصرف میں عقابوں کا نشیمن

علامہ دہر وفرید عصر کی آخری آرام گاہ:

نصف صدی تک اپنے علم وفن سے تشنگانِ علومِ اسلامیہ کو سیراب کرنے والا اور اپنے بعد بھی مدارسِ دینیہ کے طلبا و اساتذہ کی عقدہ کشائی ہی نہیں بلکہ ان پر احسان کرنے کا وہ آفتابِ فضل وکمال ۱۹ ذی قعدہ ۱۳۹۹ھ غروب ہوکر میرٹھ ہی کی سرزمین پر نواب میرٹھ کے ایک خصوصی قبرستان میں آسودہ خاک ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مضت الدهور وما أتين بمثله
ولقد اتى فعجزت عن نظرائه

تشکر و اِمتنان:

سیدی وسندی واُستاذی الکریم حضرت اقدس بابرکت علامہ مفتی الشاہ السید غلام جیلانی میرٹھی کی پُرعظمت بارگاہ میں ایک مختصر سی قلم برداشتہ نیازمندیاں ہیں، تنگی وقت کے سبب نظر ثانی کا موقع نہیں مل سکا کہ ایسے نازک موقع پر مجھے حضرت

مولانا حافظ محمد ایوب اشرفی نے آمادہ کیا جب کہ میری اکلوتی بیٹی کی شادی میں صرف ۱۵؍دن رہ گئے تھے۔ چونکہ حضور والا کے تعلق سے کوئی قابل ذکر تحریر کو مقالے یا کتاب اب تک نگاہ سے نہیں گذری تھی، جس کا بڑا قلق تھا۔ جس کا اظہار میں نے حضرت مولانا سید انور چشتی پھپھوند شریف و حضرت مولانا اُسید الحق صاحب ازہری (جو حضرت علیہ الرحمہ کے نواسے ہیں) بھی کیا تھا۔ یہ قرض تو مجھ پر بھی تھا کہ ان کے سیکڑوں تلامذہ کی طویل فہرست میں میرا بھی نام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی شدید مصروفیات و اُلجھنوں کے باوجود انھیں ایام میں قلم اُٹھانے کی سعادت حاصل ہوئی، جس پر اپنے رب کا بڑا شکر گزار ہوں۔ اور غالباً اسی کی برکت بھی ہے کہ میری بچی کی شادی بڑی تاریخی شادی ہوئی۔ بڑی عزت و آبرو خیریت کے ساتھ اس عظیم مرحلے سے میں سرخرو و کامیاب ہوا۔ فالحمد للہ ربّ العلمین۔

علمائے کرام، مشائخ عظام، سیاسی وسماجی قائدین و عمائدین شہر کے ازدہام میں اُستاذی الکریم بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ مبارک پوری مدظلہ العالی نے نکاح خوانی کی عزت سے سرفراز فرمایا اور دُلہا دُلہن کو اپنی دُعاؤں سے نوازا۔

اس مختصر سے عقیدت نامے میں اگر کوئی کمی نظر آئے تو اسے میری ذات کی طرف منسوب کر دیں اور کوئی حسن محسوس کریں تو اسے حضرت علیہ الرحمہ کی روحانیت اور آپ کے فرزند نسبتی محترم و مکرم مولانا محمد ایوب صاحب اشرفی سنبھلی کے اخلاصِ بے کراں کی طرف منسوب فرمائیں، جو اس وقت حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے حوالے سے ہم سب کے محسن ہیں۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت پر عموماً اور ہم سب فرزندانِ معنوی و صلبی پر جو فرض و قرض تھا انھوں نے حضرت کی روحانیت کی مدد اور اللہ تعالیٰ کے فضل و عطا سے اُتارا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم سعادت ان کے حصے میں عطا فرمائی۔ بہر حال یہ ایک کارنامہ ہے جو انھوں نے انجام دیا۔ دیر آید درست آید کے مطابق جہاں حضرت کے تعلق سے کچھ نہیں تھا، وہاں یہی بہت کچھ ہے اور ان شا اللہ تعالیٰ حضرت کے حیات و خدمات کے بہت سارے گوشے سامنے آئیں گے۔ ہم سبھوں کی طرف سے محترم و مکرم حافظ و قاری مولانا محمد ایوب صاحب سنبھلی مقیم انگلینڈ بے پناہ مبارک باد و شکریے اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔ مولیٰ عزوجل اپنے حبیب رؤف و رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے دنیا و آخرت کی سرفرازیاں عطا فرمائے۔ آمین

☑☑☑☑☑☑

سلطان المناظرین حضرت علامہ مفتی عتیق الرحمٰن نعیمی

سلطان المناظرین فخر المتکلمین استاذ العلماء حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی عتیق الرحمٰن نعیمی علیہ الرحمہ سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے اعاجم رجال کی طویل فہرست میں آپ ایک نمایاں، منفرد و ممتاز شخصیت کے حامل تھے اور جہالت کے اس طویل و تاریک ایام میں جب جنازہ پڑھانے والے بھی بمشکل دستیاب تھے اور دور تک وہ امید کی ایک کرن تھے۔

امید کی مدھم سی اک لو ہو تو پیاری ہے یہ ایک کرن تنہا ظلمات پر بھاری ہے

ذاتی و شخصی وجاہت و جلالت کے ساتھ ہی ساتھ آپ کا شمار اہلِ دولت و ثروت میں بھی ہوتا تھا۔ زمین و جائیداد کے معاملے میں وہ اپنے علاقے کے بڑے رئیسوں میں تھے۔ غیر منقسم بستی و گونڈہ و بہرائچ نیپال کی سرحدوں اور اندرونِ نیپال کے مذہبی و دینی حلقے ان کے وجودِ با مسعود سے مستنیر تھے۔ ع

ہزاروں رحمتیں ہوں اے امیرِ کارواں تم پر

ان کا خاندان وہابیت و غیر مقلدیت کی آماجگاہ تھا، دور و نزدیک تمام اعزا و اقارب علی العموم وہابی غیر مقلد تھے۔ عمر کے ابتدائی کئی قیمتی سال انھیں وہابی غیر مقلدین کے نام نہاد ادارہ میں ضائع ہوئے اور پھر جب قدرت نے دستگیری کی، انھیں کانپور، مرادآباد، میرٹھ کے سنّی اداروں تک پہنچایا، جہاں انھیں اہلِ سنّت و جماعت کے جید اساتذہ میسر آئے۔ پھر جا کر کہیں ان پر علم و آگہی کی حقیقت آشکارا ہوئی، پھر حضور صدر الافاضل فخر الاماثل استاذ العلماء سیّد المفسرین امام الہند حضرت علامہ سیّد محمد نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمہ والرضوان کی بارگاہِ علمی تک پہنچے اور پھر آپ سے شرفِ بیعت کی دولت نے آپ پر شعور اور ادراک، حق و باطل کے دریچے وا کر دیے اور علم و آگہی کو نئی پرواز! اور ساتھ ہی عشق و وجدان اور ایمان کو نئی حلاوت و چاشنی ملی۔ جس کی روشنی میں انھوں نے اپنے آبائی و خاندانی مسلک، وہابیت و غیر مقلدیت کا احتساب اور اس کا ناقدانہ جائزہ لیا۔

جس میں انھیں ہر جہت سے قبح ہی قبح اور دجل و فریب نظر آیا۔ جس سے آپ کو اس نوزائیدہ مسلک سے بڑی وحشت ہوئی۔ پھر بڑی ثبات قدمی سے انھوں نے وہابیت و غیر مقلدیت سے سنّیت و حنفیت کی طرف شذ رحال فرمایا۔ پوری ثبات قدمی کے ساتھ اسی کو حرزِ جاں بنایا۔ پھر تو انھوں نے پورے جذبۂ ایمان اور حوصلے کے ساتھ اس دشمنِ اسلام تحریک وہابیت و غیر مقلدیت کو اپنے گھر و خاندان ہی نہیں بلکہ پورے علاقے سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے کمرِ ہمت کسی۔ اور اس تحریک باطل کے بڑے بڑے سورماؤں کو چاروں شانے چت کیے اور ان کی ہیکڑی کو ختم کیا۔ اور اس راہِ محبت میں وہ زندگی بھر آبلہ پا رہے۔ اور آخری عمر تک ان کے اس تب و تاب جاودانہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

راقم الحروف وارث جمال قادری نے ان کی بارہا زیارت کی ہے لمحاتی ہی سہی، ان کی پاکیزہ صحبت کا شرف حاصل کیا۔ اپنے علم وفضل کے ساتھ ہی وہ مثنوی مولانا روم کے گویا ایک طرح کے حافظ تھے۔ وہی مثنوی مولانا روم جس کے لیے کہا گیا۔

مثنوی مولوی معنوی ہشت قرآں درزبانِ پہلوی

ان کے زمانے میں مثنوی مولانا روم پڑھنے اور اس کی تعبیر وتشریح کا حق انھیں کو تھا۔

غیر مقلدیت جو اسلام کے نام پر ایک دھبہ اور اسلام دشمنی کا دورِ حاضر میں ایک بڑا چہرہ بھی۔ اس کا اندازہ علامہ سیّد محمد ذوقی صاحب سردلِ براں کے اس قول سے لگایا جائے جس کو ان کے محبوب مرید وخلیفہ کیپٹن واحد بخش سیال، مترجم مرآۃ الاسرار شیخ عبدالرحمٰن چشتی، سیّد محمد ذوقی کے ملفوظات ''تربیت العشاق'' میں ذکر کیا ہے۔ چونکہ ذوقی صاحب کا خاندانی بیک گراؤنڈ بھی غیر مقلدیت تھا، اس لیے اس طرح کے سوال وجواب بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

سوال: حضور غیر مقلدین حضرات جو فی زمانہ اپنے کو (اہلِ حدیث) میں کہلانے لگے ہیں ان کے بارے میں حضور کا کیا خیال ہے؟

سیّد محمد ذوقی کا دوٹوک جواب:

اِن کا کفر قریش مکّہ کے کفر سے بڑھا ہوا ہے۔ (تربیت العشاق مرتب کیپٹن واحد بخش سیال)

دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر یوپی جس کا علمی فیضان نہ صرف پورے ملک بلکہ بیرونِ ملک دنیا کے کئی براعظموں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے سب سے پہلے بحیثیت عالمِ دین کلیدی مدرس آپ ہی تھے۔ مظہر شعیب الاولیاء، مجاہد دین وسنّیت حضرتِ اقدس بابرکت مولانا صوفی محمد صدیق احمد قادری چشتی ضیائی، ناظمِ اعلیٰ دارالعلوم فیض الرسول وسجادہ نشین خانقاہ فیض الرسول، پیر طریقت عارفِ حقیقت، قطب وقت خلیفۂ شعیب الاولیاء حضرت پیر عبدالمتین صاحب قبلہ ڈھلمؤ شریف، مولوی نورالحق صاحب برادرِ اکبر حضرت علامہ نسیم بستوی ایڈیٹر ماہنامہ فیض الرسول، مولوی محمد عمر صاحب براؤنی، حاجی عبدالمصطفیٰ خاں ناظمِ اعلیٰ مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھا۔ آپ کے ابتدائی تلامذہ خاص میں سے تھے۔

ہماری اجتماعی غفلت، بے حسی واکابر فراموشی کے قابلِ ذکر فہرست میں آپ کا اسمِ گرامی بھی ہے۔ اس فہرست میں اور بھی بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ جیسے شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت حامد رضا خاں بریلوی شہزادہ اکبر اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت، شیخ العلماء علی الاطلاق، شیخ الادب بالاتفاق حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی (جن کے ارشد تلامذہ میں غزالی دوراں علامہ سعید کاظمی پاکستان، بادشاہِ علم وفضل حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ اعظمی، احسن العلماء حضرت علامہ سیّد حیدر حسین مارہروی، سندالمحققین حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری رضوی، حضرت علامہ مفتی قدرت اللہ رضوی، شیخ القرآن حضرت علامہ عبداللہ خاں عزیزی، علامہ غلام ربانی، حضرت علامہ غلام عبدالقادری علوی، حضرت علامہ غلام غوث علوی (راقم الحروف وارث جمال قادری وغیرہ وغیرہ) گویا ؏

سینے میں قلزمِ لیے قطرہ کا قطرہ رہا

آپ کے مرشد کامل حضور صدر الافاضل استاذ العلماء امام الہند حضرت علامہ سیّد نعیم الدین مرادآبادی ہماری جمود و اجتماعی غفلت اور طویل عرصے تک احسان ناشناسی کے شکار تھے اور اس آئینہ حسنِ خوباں کے وجودِ حیرت کی ہمہ جہت تمازت جو کبھی سوا نیزے پہ ہوا کرتی وہ بھی کہرآلود ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ تو بھلا ہو عزیزم مولانا نورمحمد نعیمی صاحب فتاویٰ صدر الافاضل کہ چند سال پہلے جب وہ ممبئی میں تھے، اپنے سلسلے کے پُرخلوص ساتھیوں کے ساتھ افکارِ صدر الافاضل کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اسی کے ذریعے آپ کی بے کراں و ہمہ جہت شخصیت پر پڑے ہوئے گرد و غبار کو صاف کر کے قدرے حال کے اُجالوں میں لانے کی ایک بھرپور کوشش کی۔ جسے آپ کی عظمت وجلالت وحیرت انگیز فضل وکمال کے مقابلے صرف اشک شوئی ہی کہا جاسکتا ہے ع

جن کے رتبے ہیں سوا۔ان کے سوا مشکل ہے

بہرحال ان کے اس قابلِ ذکر کوششوں سے ہماری اجتماعی غفلتوں، بے حسیوں اور احسان ناشناسیوں کو ایک آئینہ تو ضرور دکھایا۔

بے حسی کی زرد فصلیں روز ہی کٹتی رہیں
آبرو کا ایک دانا جانے کس خوشے میں تھا

عزیزم گرامی قدر فاضل نوجوان مولانا کلام اظہر سلمہٗ استاذ مدرسہ امداد العلوم مٹہنا ضلع سدھارتھ نگر یوپی ہماری دعاؤں وشکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حضرت سلطان المناظرین پر قلم اُٹھایا تو اپنی بساط کی حد تک قلم اُٹھانے کا حق ادا کر دیا۔ موصوف نے پوری ملّت کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

موصوف دار العلوم منظر اسلام کے افاضل میں سے ہیں اور حضرت اقدس علامہ مفتی اختر رضا ازہری علیہ الرحمہ دست گرفتہ بھی۔ آپ مدرسہ امداد العلوم مٹہنا جوان کا ابتدائی مادرِ علمی بھی تھا، اسی میں استاذ ہیں۔

درس وتدریس کے ساتھ ہی آپ کافی متحرک وفعال اور زود نویس صاحبِ قلم بھی ہیں اور ساتھ ہی شاعر بھی۔ پورے ملک وبیرونِ ملک کے قابلِ ذکر شخصیات ورجال سے ان کا مضبوط ومستقل رابطہ بھی ہے۔ مدرسہ امداد العلوم کے افاضل میں ان کی ہمہ جہت علمی حیثیت کافی نمایاں ہے۔ وہ اپنے مادرِ علمی میں استاذ کی حیثیت سے اس ادارے کے لیے ایک متاعِ گراں مایہ بھی۔ مولیٰ تعالیٰ انھیں اپنے انھیں ترک تازیوں کے ساتھ تادیر سلامت رکھے اور سلطان المناظرین حضرت علامہ مفتی عتیق الرحمٰن نعیمی علیہ الرحمہ کی روحانیت ان کی دستگیری فرمائے، آمین۔

دعا گو وطالب دعا محمد وارث جمال قادری صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی

۲۳، ربیع الآخر ۱۴۴۳ھ/ ۲۹ رنومبر ۲۰۲۱ (پیر)

☑☑☑☑☑☑

مجاہد ملّت اوران کی قامت زیبائی

امام التارکین وسیّد التواضعین سرکار مجاہد ملّت حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی متولی رؤفیہ اسٹیٹ دھام نگر اڑیسہ علیہ الرحمہ برصغیر ہند کے ان اعاظم رجال واساطین امّت سے تھے جن کے وجود کے فیضان و برکات سے متحدہ ہندوستان کا گوشہ گوشہ مستنیر و مستفیض تھا اور جن کی حکمرانی کا سورج کروڑ ہا کروڑ دلوں میں ہمیشہ سوا نیزے پہ رہا۔ آپ نے اپنی امارت وریاست اور علمی فضل وکمال پر سادگی کی دبیز چادر اوڑھ رکھی تھی۔ والیٔ ریاست ہونے کے باوجود وہ ایسے درویش عالمِ دین تھے جن پر علم وفضل کی ریاست اور ادائے درویشی کو بیک وقت ناز تھا۔ صاحبِ طبقاتِ کبریٰ حضرت امام عبدالوہاب شعرانی کی طرح اربابِ شریعت وعلمائے دین نے انہیں صف کا امام سمجھا اور اربابِ طریقت واہلِ سلوک ومعرفت نے انہیں اپنے طبقے کا مقتدیٰ جانا۔

لیس علی اللہ بمستنکرٍ ان یسجمع العالم فی واحدٍ

وہ ایسے دور میں ایک مسلّم الثبوت مذہبی قائد ورہنما کی حیثیت سے اُبھرے جب برصغیر ہند میں صف بہ صف قدآور، عظیم علمی، دینی، روحانی شخصیات موجود تھیں

۔جن کا تنہا وجود کئی اداروں، انجمنوں اور جماعتوں پر حاوی ہوا کرتا تھا۔ان کی عظمت وجلالت اوران کی طرف عوام وخواص کا ۔۔۔ ورجوع اوران کی مقبولیت کا گراف کبر فی موت الاکابر کا رہین منت نہیں تھا بلکہ بڑے بڑوں کے درمیان وہ ایسے بڑے تھے کہ ؏ وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے۔

مغلِ اعظم شہنشاہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر کے جانشینوں کی نااہلی نیز تلك الایام نداولھا بین الناس کے باعث جب ہندوستان میں مسلمان سیاسی ادبار کے شکار ہوئے اور انہیں ہر طرف سے خوف وہراس اور زوال وذلّت نے آگھیرا۔ ایسے نازک ترین حالات ورستاخیز ماحول میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے وہ اکابر اور مذہبی، دینی، ایمانی، روحانی، مقتدیٰ۔ پورا برصغیر جن کے وجود کی برکتوں سے مصدر فیوض وبرکات، معدن انوار وتجلیات اور مخزن رشد وہدایت بنا جن کے علم وفضل کا دبدبہ اور جن کی عظمت وشوکت وروحانیت کا شہرہ عرب وعجم، حل وحرم میں ہوا۔ انھوں نے بروقت امۃ مسلمہ کو سہارا دیا اور ایک صدی سے زائد زوال پذیر امّت کو سنبھالے رکھا صرف اہلِ سنّت وجماعت ہی کے افراد اس لیے کہ وہ جماعتیں جو انتشارِ امّت اور وحدتِ اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کا باعث ہوئیں وہ تو اپنی اپنی ولادت کے دردِزہ کی منزلوں سے بھی بہت دور تھیں!

حضرت شیخ غلام علی نقشبندی، حضرت شاہ احمد سعید مجددی، حضرت شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی جنگِ آزادی کے پہلے ورق مجاہد حریت حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی، حضرت علامہ فضل رسول بدایونی، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی، حضرت

مولانا خیر الدین دہلوی، بحر العلوم حضرت علامہ عبد العلی فرنگی محل، حضرت شاہ منور الدین دہلوی، حضرت علامہ مفتی ارشاد احمد رام پوری، حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی، حضرت علامہ غلام دستگیر قصوری، مولانا رضا علی خاں بریلوی، مولانا کفایت علی کافی، مفتی عنایت احمد کاکوروی، مجاہد اعظم مولانا احمد اللہ شاہ مرادآبادی، مولانا فیض احمد عثمانی، مولانا وہاج الدین مرادآبادی، مولانا عبد الجلیل علی گڑھی، حضرت علامہ مفتی نقی علی خاں بریلوی، حضرت سیّد آلِ رسول مارہروی، حضرت سیّد ابوالحسین احمد نوری، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی، صدر الافاضل حضرت سیّد نعیم الدین مرادآبادی، شیخ المشائخ حضرت شاہ علی حسین اشرفی، علامہ ہدایت رسول لکھنوی، حضرت علامہ سیّد مقبول کشمیری، حضرت علامہ ہدایت اللہ خاں جونپوری، حضرت مولانا سیّد دیدار علی محدث الوری، حضرت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، حضرت علامہ سیّد غلام مہر علی گولڑوی، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا، مبلغ الاسلام علامہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی مہاجر مدنی، حضرت علامہ ضیاء الدین مہاجر مدنی، استاذ العلماء مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا عبد الحیٔ فرنگی محل، مولانا غلام قادر لاہوری، علامہ سیّد سلیمان اشرف بہاری، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں، محدث اعظم ہند مولانا سیّد محمد کچھوچھوی، ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری، علامہ مصطفیٰ رضا خاں، حضور شعیب الاولیاء شاہ محمد علی، عظیم ملّت علامہ مفتی شان عظیم الدین گجراتی وغیرہ قدست اسرارھم جیسی با کمال انوارِ قدسیہ کی حامل شخصیات ورجال کی جو جماعت حامل ووارث وامین ہوتی۔ جیسے سیّد العلماء حضرت علامہ سیّد آلِ مصطفیٰ مارہروی، علامہ سردار احمد محدث لائل پوری، مولانا سیّد احمد ابو البرکات، شیخ العلماء علامہ غلام جیلانی اعظمی، صدر العلماء علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی، امین شریعت علامہ مفتی رفاقت حسین، حافظِ ملّت مولانا شاہ عبد العزیز مرادآبادی، تاج العلماء علامہ سیّد اولادِ رسول مارہروی، حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی، حضرت علامہ مفتی اجمل شاہ سنبھل، حضرت علامہ انوار اللہ صاحب حیدرآبادی، علامہ مفتی غلام جان ہزاروی، حکیم الامت علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی، علامہ عمر الدین ہزاروی، تاج العلماء حضرت علامہ محمد عمر نعیمی، شیخ الاسلام علامہ مفتی عبد القدیر بدایونی، حضرت علامہ مفتی مظہر اللہ دہلوی، علامہ مجبی سیتامڑھی، علامہ ابو النور محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، قائد اہلِ سنّت علامہ شاہ احمد نورانی، حضرت علامہ عبد الستار خاں نیازی، مولانا حشمت علی خاں پیلی بھیت، محدث دکن حضرت علامہ سیّد ابو الحسنات عبد اللہ شاہ نقشبندی وغیرہ۔ یہ وہ صف بہ صف سوادِ اعظم اہلِ سنّت اکابر اور اپنے وقت کے اساطین امّت تھے اور یہ وہی اربابِ فضل کمال واصحاب دین ودانش تھے جن پر سوادِ اعظم کو ناز تھا۔ یہی تمام اسلامی علوم وفنون کے پیکر بھی تھے، انہیں کے چمک دمک سے برصغیر کا گوشہ گوشہ منور تھا۔

ان کا ایک بڑا حسن ان کا اخلاص وعمل اور امّتِ مسلمہ کی نگہداری و پاسداری تھا جن کی تبلیغ وتدریس وُرشد وہدایت، بیعت وارشاد، بحث ومناظرہ اور تقریر وتحریر خالص خدمت دین کے لیے تھا۔ رضائے رب ومحبوبِ رب جن کے ہمیشہ پیشِ نظر الحب فی اللہ والبغض فی اللہ جن کا قیمتی سرمایہ! آج کی طرح سب کچھ کمرشیل نہیں تھا۔ صاحبِ تذکرہ امام التارکین سرکار مجاہد ملّت حضرت علامہ مفتی شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی کی عظمت وجلالت اور ان کی یکتائی و بے نظیری اور انفرادیت کا سکہ رائج الوقت ایسے اصحابِ فضل وکمال وارباب دین ودانش کے درمیان تھا، جب ہر سمت اُجالا ہی اُجالا

تھا۔ جدھر نگاہ ڈالیے کوئی نہ کوئی عظمت کا مینار نظر آجاتا۔ آج کی طرح قحط رجال نہیں تھا، وہ نابیناؤں میں بینا نہیں تھے بلکہ وہ دیدہ وروں اور بیناؤں کے درمیان دیدۂ بینا رکھتے تھے۔

اک دانش نورانی اک دانش برہانی　　　ہے دانش برہانی حیرت کی فراوانی

بے شک وہ بندگانِ خدا کے لیے اللہ کی ایک بڑی نعمت تھے۔ وہ ایک ایسے فقیر تھے دولت جن کی کنیز! وہ ایسے درویش تھے امارت جن کی دربان! وہ ایسے متبحر عالم کہ علم کی ریاست جن پر نازاں اور عارف ایسے کہ موت جس پر فرحاں! علم و فضل، عزیمت و استقامت اور مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ان کی ولایت پارسائی، ہمہ گیری، جہاں گیری کا شہرہ! قدر مردم بعد مردن کے برعکس ان کی حیات ہی میں ہوا۔

جس کا مقصد زیست دین کی سرفرازی اور مسلمانوں کی سربلندی تھا۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلمان میں اسی لیے ہوں غازی

ان کے زندگی کا ایک بلند نصب العین تھا۔

جس کا نصب العین تھا اعلانِ حق تبلیغ حق
زندگی تھی جس کی شرع مصطفیٰ کی آئینہ

انھوں نے اس حقیقت صادقہ کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔

یہ وزارتیں یہ ریاستیں سبھی چار دن کی ہیں چاندنی
مجھے اس فقیر کی شان دے کہ زمانہ جس کی مثال دے

چنانچہ امارت و ریاست پر فقیری و درویشی کو ترجیح دی اور اسلام کی سربلندی کے لیے پوری ریاست قربان کردی۔ اور تارکین امارت و ریاست کی صف میں ایک امتیازی مقام پا کر ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گئے۔

میں نہیں کہتا کہ تم ایسا کرو　　　ان کی سیرت آئینہ ہے آئینہ دیکھا کرو

خلوص وللّٰہیت اور الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کل بھی کامیاب تھا اور آج بھی اس جوہر خاص کی کمیابی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قطب عالم حضور مفتئ اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خاں بریلوی کو اپنے گردوپیش دیکھ کر یہ کہنا پڑا۔

ہیں صفائے ظاہری کے سازوساماں خوب خوب　　　جس کا باطن صاف ہو وہ باخدا ملتا نہیں
ہے ریا کاروں کا شہرا اور ریا کاری کی دھوم　　　بوریا کا فقر بھی اب بے ریا ملتا نہیں

ان کا زمانہ اور ان کا ماحول علمی و دینی تو آج کے اعتبار سے بڑا غنیمت تھا، ہر طرف بڑے ہی بڑے تشریف فرما تھے اور ایک دوسرے کی عظمتوں کا اعتراف بھی کرتے تھے اور باہم ایک دوسرے کو تسلیم بھی کرتے تھے۔ مگر وہ آج ماحول نہیں آج تو صرف کبرنی موت الاکابر ہی کا معاملہ ہے جتنے چھوٹے چھوٹے ایں قدر تھے بڑوں کی موت نے انہیں آں قدرو

بڑا بنا دیا ہے ان کی بڑائی میں ان کا اپنا دخل اور اپنی صلاحیتیں کم بڑوں اور اصحابِ فضل و کمال کی عدم موجودگی کی کارفرمائی زیادہ ہے، اس لیے وہ اپنے علاوہ کسی کو تسلیم بھی نہیں کرتا، اور اگر کہیں تسلیم و نیازمندی نظر آتی ہے تو وہ علی العموم من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کا شاخسانہ زیادہ ہوتا ہے۔

حضور مجاہد ملّت کا ایک نمایاں وصف جو انہیں ان کے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے وہ ان کا **اخلاص فی الدین و اخلاص فی العمل** کے ساتھ پہلو میں ایک دلِ دردمندانہ بھی تھا، جو ہر مظلوم کے لیے دھڑکتا رہتا، بالخصوص مسلمانانِ ہند کی مظلومیت اور فسادات کے بہانے ان کی بربادیوں پر ان کی بے چینیوں کو کبھی قرار نہیں ملا۔ مسلمانانِ ہند کی آبرو مندانہ بقا اور دین وسنّیت کے سرفرازی کے لیے میدانِ عمل میں وہ ہمیشہ سربکف رہے۔ خود فرماتے تھے۔

فکر کی کیسے رہیں گے ہند میں ۔۔۔ ان سے کیا مطلب کہ جو ہیں سندھ میں
ہاتف غیبی نے دی مجھ کو صدا ۔۔۔ سربکف رہنا پڑے گا ہند میں

چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے ایک اولوالعزم پُرجوش اور ایک عظیم مذہبی رہنما کی حیثیت سے اُبھرے۔ اس وقت کی مذہبی و دینی و ملّی رہنماؤں نے امت مسلمہ کی قیادت کا جو بارِ عظیم آپ کی کندھوں پر رکھا اور آپ پر اعتماد کیا، آپ نے اس اعتماد کی بجا طور پر لاج رکھی۔ ملک و بیرونِ ملک نازک ترین حالات میں بھی آپ نے اس اعتماد کی لاج رکھی۔ آئے دن کی قید و بند کی صعوبتیں بھی آپ کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کرسکیں۔ قوم وملّت کی سرفرازی، شوکت اسلام اور مسلمانوں کی آبرومندانہ بقا کے لیے جو قربانیاں آپ نے دیں، دور دور تک اس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ سوادِ اعظم کے تشخص اور عقائد اہلِ سنّت کے تحفظ میں رخصت و مصلحت کو کبھی آپ نے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا۔ بلکہ ہند میں سرمایہ ملّت کے نگہبان حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی اتباع میں عزیمت واستقامت ہی کا مظاہرہ کیا۔ جس پر ۱۹۷۹ء میں مدینہ طیبہ میں حرمِ مدینہ کے وہابی امام کے پیچھے نماز نہ پڑھنے اور اہلِ سنّت کے موقف پر ثابت قدم رہنے کی پاداش میں آپ کی گرفتاری، بے پناہ تشدد، پھر حج کے بغیر حج سے دو روز قبل جبری واپسی کا واقعہ شاہد عدل۔

تقسیمِ ملک کے بعد اصحابِ بصیرت، والیانِ امارات وریاست وارباب ذرائع واسباب وحاملین کردار وعمل کی غالب ترین اکثریت ہجرت کے نام پر ترکِ وطن کر گئی، تقسیمِ ملک کا سارا الزام مسلمانوں کے سر رکھ کر یہاں رہ جانے والے ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں پر آبرومندانہ بقا کے تمام دروازے بند کر کے اس سرزمین کو فساد کی آڑ میں مسلمانوں کے مذہب و مدفن سے بدل دیا گیا۔

(حالانکہ ملک کا بٹوارہ مسلمانوں پر تھوپا گیا یہاں کے جاہ پرست ہندو برہمنوں نے محض اپنے اقتدار کے لیے مادرِ وطن کو خود ہی ٹکڑے ٹکڑے کیا اور الزام مسلمانوں کے سر رکھا جو خود ایک مستقل بحث ہے)

تحریکِ پاکستان میں پیش پیش چونکہ علماء اہلِ سنّت ہی تھے اور تقسیم کے بعد حالات کی سنگینی اور ماحول کے بگڑے تیوروں نے بچی کھچی مذہبی قیادت کو خاصا محتاط بنا دیا، بلکہ یوں کہیے کہ بگڑے حالات اور انتظامیہ کی ملی بھگت سے مسلسل

مسلم کش فسادات نے مذہبی فعال قیادت کوخوف زدہ و نڈھال کر دیا تھا، اس لیے اس نے خالص مذہب کا گوشہ عافیت تلاش کرلیا۔ بیعت وارشاد، رشد وہدایت، درس وتدریس، وعظ وتبلیغ ہی تک خود کومحدود کرلیا۔ اور جب کبھی چھوٹا بڑا اجتماع کے لیے اعلانات واشتہارات کیے تو نمایاں طور پر یہ لکھنا نہیں بھولے کہ یہ خالص مذہبی جلسہ ہے، سیاست سے جس کا کوئی تعلق نہیں۔ تاکہ اربابِ اقتدار کو یہ اطمینان رہے کہ ہم کوئی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائیں گے چاہے کتنی بڑی قیامت گذر جائے ہم چپ رہیں گے۔ مَنۡ سَکَتَ نَجٰی کو ہم سے زیادہ کون سمجھے گا۔ ہم نے خدا کے بندوں کو خدا کے سپرد تو کر ہی دیا ہے تو بھلا اس سے بڑا محافظ حقیقی اور کون ہوسکتا ہے۔ ایسے ہمارا کام دعا کرنا ہے سو وہ ہم کر ہی رہے ہیں، یہ ہمارا فریضہ منصبی ہے جس سے ہم غافل نہیں ہیں۔ سنّی علماء نے سیاست کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اس کے دروازے اپنے آپ پر خود ہی بند کر لیے جس کا بڑا نقصان ہوا۔ مٹھی بھر افراد مذہبی قیادت کا لبادہ اوڑھ کر مسلمانوں کے قائد ورہنما بن گئے۔ مسلمانوں کے ٹھکرائے ہوئے ہیں، اقتدار وقت کے سامنے مسلمانوں کے نمائندہ بن کر جماعتی سطح پر کافی توانا ہو گئے جس کا بڑا فائدہ ان کے خانہ ساز مذہب کا ہوا۔

سیاست شجر ممنوع نہیں بلکہ شجر مطلوب ہے

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ تو علماء کو سیاست سے دور کرنے کے لیے ایک سازش کے تحت سیاست کو شجر ممنوع بنایا گیا اور اسے مسلمانوں کو باور کر دیا گیا۔ ورنہ انگریزوں کے دور میں اپنے وقت کے جید ترین علمائے دین کا قبضہ سرکاری دفتروں پر کیوں ہوتا اور مشاہیر واکابر علماء سرکاری ملازمتوں میں کیوں آتے؟ ایک طرح سے انگریز حکومت کی مشینری ان کے دم پر تھی۔ حضرت علامہ فضل امام خیر آبادی صدر الصدور دہلی، حضرت علامہ مفتی صدر الدین آزردہ صدر الصدور دہلی، علامہ مفتی عنایت احمد کاکوروی منصب وصدر بریلی، حضرت علامہ فضل رسول بدایوں سررشتہ دار کلکٹری صدر دفتر سہسوانی، علامہ مفتی انعام اللہ گوپامئوی قاضی دہلی ووکیل سرکار الہ آباد، استاذ العلماء حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی سررشتہ دار اینڈ ونئی دہلی، صدر الصدور لکھنؤ، مہتمم حضور تحصیل اور مولوی غلام قادر گوپامئوی ناظر سررشتہ دار عدالت دیوانی تحصیلدار کوڑگاؤں وغیرہ وغیرہ۔ یہ اپنے زمانے کے عدیم النظیر علماء دین ومفتیانِ شرع متین تھے۔ حکومت کی باگ ڈور جن کے ہاتھوں میں تھی۔ زیادہ دور نہ جائیے پس ایک نظر حضور صدر الافاضل استاذ العلماء سیّد المدرسین حضرت علامہ مفتی سیّد نعیم الدین مرادآبادی جو اپنے بڑے میں مرجع علماء وملجائے اکابر ہیں اس تعلق سے ان کی دلسوزی پر ایک نگاہ ڈالتے چلیں، اس وقت کے علماء واکابر کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں، میں عرض کروں گا کہ علمائے دین وپیشوانِ اسلام اب قدم اٹھائیں۔ گوشۂ تنہائی سے نکلیں اس لیے نہیں کہ انہیں جاہ ملے یا منصب ملے، اس لیے نہیں کہ حکومت کا مزہ حاصل کریں فقط اس لیے کہ دین کی حفاظت ہو، اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے خلاف پیش آنے والی تجاویز وہ روک سکیں! اور مسلمانوں کے مستقبل کو وہ خطرے سے محفوظ رکھ سکیں، جو قانون ایک دفعہ پاس ہو جاتا ہے اگر اسمبلی میں علماء کا بھی کوئی عنصر ہوتا تو شاردا کا قانون پاس نہ ہوسکتا تھا۔

مسلمانوں کے ممبران پہلے روز بیدار کردیئے جاتے لیکن قانون پاس ہونے کے بعد جو کوششیں کی گئیں۔ وہ اس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں، طبقہ علماء کا سیاسیات اور ملکی نظریات کی طرف اغماض کرنا مسلمانوں کو ضرر پہنچانا ہے اس وقت گول میز کانفرنس اجلاس کررہی ہے ہندوستان کے لیے دستورِ حکومت کی تجویز ہے ہر فرقے کے نمائندے وہاں پہنچ گئے ہیں سب نے اپنے مطالبات کا ایک مسودہ مرتب کرلیا ہے ہر ایک اپنے مقاصد کا ایک نقشہ نظر کے سامنے رکھتا ہے لیکن ہمیں یہ شکایت ہے اور بجا شکایت ہے کہ ہمارے طبقہ علماء نے آج تک اس کی طرف التفات نہ کیا جو جو مسودے تجویز ہوئے اس پر نظر نہ ڈالی اور نہ یہ دیکھا کہ اسلام اور مسلمین پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے؟ اور اسلام کی حفاظت اور مسلمانوں کی فلاح اور مذہب کی تحفظ حرمت کے لیے کیا امور ضروری ہیں؟ جن کا موجودہ تجویزوں میں اضافہ ہونا چاہیے اور کون چیزیں قابلِ احتراز ہیں جن کی مدافعت لازم ہے؟

ہندوستان کے تمام طبقۂ علماء اس سرے سے اُس سرے تک ساکت وخاموش ہیں! انہوں نے اس پر نظر ہی نہیں ڈالی کیا حیثیت دین سے یہ ضروری امر نہیں؟

گذشتہ کو چھوڑیئے، آئندہ کے لیے مستعد ہوجائیے اور جلدتا یک نظر ڈالیے کہ دنیا کیا کررہی ہے؟ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے کیا کیا تجویزیں درپیش ہیں؟ ان کے کیا نتائج ہوں گے؟ ضروریات کا اقتضا کیا ہے؟ پہلے جو کچھ لائے ہو اس سے ایک اجتماعی شکل میں اپنے نمائندوں کو باخبر کیجیے، پچھلی غفلت قابلِ افسوس ہے۔ لیکن ابھی اور غفلت رہی تو کام قبضے سے باہر ہوجائے گا۔ جس طرح ممکن ہو صورتِ حال پر اطلاع پانے کے بعد ایک مسودہ تجاویز مرتب کیجیے، خواہ جلسوں یا ڈال کے ذریعے اس پر دوسرے علماء کی رائیں حاصل کرکے ایک نقشہ عمل مرتب فرمائیے! کونسلوں کی کاروائیوں کو بھی دیکھیے اور ممبرانِ کونسل کو جس امر میں توجہ دلانے کی ضرورت ہو انہیں زور کے ساتھ توجہ دلائیے۔ یہ بھی دیکھیے ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں میں کیا ہورہا ہے؟ آپ کو جلد سے جلد مستعد ہوجانا چاہیے، اگر جماعت علماء اس طرح میدانِ عمل میں آ گئی تو ان شاء اللہ عزیز اسلام اور مسلمین کی بہت بڑی حمایت ہوسکے گی۔

ستم یہ ہے کہ جاہل عالم نما عالم بن کر میدان میں آئیں اور ان کی تعداد سے دنیا کو دھوکہ دیا جائے اور ان کی خودرائی و نفس پرستی کو علماء کی رائے قرار دیا جائے اور علماء کا پورا طبقہ ساکت وخاموش بیٹھا یہ سب کچھ دیکھا کرے۔ خدا اس کے منہ میں زبان ہو نہ زبان میں حرکت نہ ہاتھ میں قلم اور نہ قلم میں جنبش! اب آپ کا یہ تقاعد زہدو انکساری کی حد سے گذر کر غفلت و تغافل کے دائرے میں آ گیا ہے اور اس اندازِ سکوت سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب آپ اس عقیدہ کو چھوڑ دیجیے آپ کے فرائض ایک مسجد میں وعظ کہہ کر یا ایک حلقہ میں درس دے کر یا خلوت خانے میں فتویٰ لکھ کر ادا ہوجاتے ہیں اور آپ کو اس پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے؟ اور بدخواہانِ اسلام تحریک کے لیے کیا کیا تدابیر عمل میں لارہے ہیں؟ یقیناً یہ آپ کا فرض ہے اور آپ سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا اٹھیے اور اپنے فرض ادا کیجیے۔

(السواد الاعظم مرادآباد شمارہ رجب المرجب ۱۳۴۹ھ ۱۹۳۰ء (بحوالہ ماہنامہ کنز الایمان، دہلی شمارہ مارچ ۲۰۰۴ء)

یہ دردمندانہ گذارش یہ مخلصانہ التجا علمائے کرام کی بارگاہ میں کس کی ہے؟ یہ اس عظیم ہستی کی ہے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے بعد من کل الجہات زمانے میں جس کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔

دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں آج مسلمانانِ ہند جس نازک ترین اور کربناک دور سے گذر رہے ہیں ایسی حالت تو اس وقت نہ تھی تو کیا علمائے دین کا یہ فرض نہیں بنتا کہ حضور صدر الافاضل کے مذکورہ بالا بے چینیوں پر سنجیدہ ہو جائیں، اسلام اور مسلمان دشمن طاقتوں نے ایک سازش کے تحت ہی موجودہ سیاست کا چہرہ بگاڑا ہے اور اس سیاسی ماحول کو اتنا پراگندہ کیا ہے کہ علمائے دین اس گلیارے میں اپنے تقدس کے پیشِ نظر قدم ہی نہ رکھیں؟ جس میں وہ کامیاب رہے کیونکہ حاملین کردار و عمل اور جید ترین علماء سے تو ہر زمانے کی حکومت خوف زدہ رہی، کہ ان کافروں سے مومن ہمیشہ اور ہر محاذ پر بیدار رہتا ہے۔

کہ الفوا فراسۃ اللہ المومن فانہ ینظر بنور اللہ۔

حضور مجاہد ملّت حضرت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری کی اپنے معاصرین و اعاظم رجال کے درمیان ایک بڑی انفرادیت یہ بھی تھی کہ وہ حضور صدر الافاضل کے فیض یافتہ تھے اور قومی و ملّی بے چینیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے انہوں نے سیات کو شجرہ ممنوعہ کبھی نہیں سمجھا بلکہ ہر دور کی سیاست پر کڑی نگاہ رکھی۔ انھوں نے کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنائی اور نہ کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہوئے۔ موجودہ سیاسی پراگندگی سے وہ بہت دور رہے۔

مگر جب مسلمانوں کے فلاح و بہبود کی بات آئی تو اپنی شرطوں پر سیاسی پارٹیوں کا اخلاق تعاون بھی کیا۔ اور جب کبھی سیاسی دروازے سے اسلام اور مسلمانوں پر کوئی زر پڑی وہ خاموش نہیں تھے بلکہ پوری قوت کے ساتھ اس کے خلاف میدانِ عمل میں اترے۔ انہوں نے اپنی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کو لے کر اسلام اور مسلمان دشمن قوتوں کو ہمیشہ للکارا اور اس سے تعلق سے اقتدار وقت کی آنکھوں میں ہمیشہ آنکھیں ڈال کر دائرہ عمل ہی تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں بالخصوص مذاہب باطلہ کے ردّ و استیصال ہی کو آخری منزل نہ سمجھ لیں بلکہ مسلمانوں کے سلگتے مسائل اور ہندو مسلم فسادات کے نام پر ان کی یکطرفہ بربادیوں پر عملاء خاموش نہ رہیں بلکہ پوری قوت کے ساتھ اقتدارِ وقت و اربابِ حکومت کو اس طرف متوجہ کریں۔

علمائے دین کی زرف نگاہی اور ان کے فراست مومن کے سامنے ہمہ شمہ کی بات تو بات ہی کیا؟ ان کے مقابلے یہ پروفیسر، لکچرر، دانشور، ڈاکٹر، انجینئر، منسٹر وغیرہ تو عوام ہی ہیں۔

خیر سے جب وہ واقعی عالم دین ہو نہ کہ عالم نما! جیسا کہ فی زمانہ عالم کے نام عالم کے لباس میں جاہل نیم خواندہ ہی علی العموم میدان میں ہیں۔ انہیں کو دیکھ کر عوام اور سیاسی پارٹیاں حقیقی علما کا بھی وزن اور معیار ذہن میں رکھتی ہیں۔

☑☑☑☑☑☑

مبلغِ اسلام: شخصیت کا اجمالی جائزہ

مغلیہ دور کے تیسرے بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کے نورتنوں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کے علم وفضل، ذہانت وفطانت، دانائی وزیرکی، عاقلی وفرزانگی کا بڑا شہرہ تھا۔ خیر وہ تو ایک دنیا کا بادشاہ تھا جس کے حدودِ سلطنت کی ایک حد تھی۔ اکبر بادشاہ کے صدیوں بعد ایک اور بادشاہ پیدا ہوا مگر اس کی بادشاہت کی نوعیت الگ تھی اور اس کی بادشاہت کی کوئی حد متعین نہیں تھی، علوم وفنون کا بادشاہ! جس کے زمانے کے اصحابِ فضل وکمال اور اربابِ علوم وفنون اس کی سرحدِ ادراک تک نہ پہنچ سکے اور اس بے کراں بحیرۂ عرب کے ساحل کو نہ پا سکے۔ مزید برآں عشقِ رسالت کا تاجِ سرمدی سے اس کے سر کو زینت بخشی گئی، بے پناہ عشقِ رسول وحبِّ بیت کے سبب وہ دنیا بھر کے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کے دلوں کا حکمراں بن گیا اور کروڑوں باوضو دل ونگاہ اس کے حضور ہمیشہ کے لیے مؤدب ہو گئے۔ اس بادشاہ کا نام ہے:

امام اہلِ سنّت مولانا احمد رضا خاں بریلوی

اس شہنشاہِ علوم وفنون و بادشاہِ دین وعلمِ دین کے بھی نورتن تھے۔ سیّد المفسرین صدر الافاضل علامہ سیّد نعیم الدین مرادآبادی، فقیہِ اعظم صدر الشریعہ علامہ امجد علی، قطب مدینہ حضرت علامہ ضیاء الدین مہاجر مدنی، حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا بریلوی، ملک العلماء علامہ ظفر الدین بہاری، ابوالوقت علامہ سیّد ہدایت رسول، علامہ پروفیسر محمد سلیمان اشرف بہاری، محدثِ اعظم ہند علامہ سیّد محمد کچھوچھوی، مبلغِ اسلام حضرت علامہ عبد العلیم صدیقی۔ یہ امامِ اہلِ سنّت کے وہ نورتن تھے کہ ہر ایک اپنے وجودِ حیرت میں خود ہی ایک ایک کائنات تھے۔

صاحبِ تذکرہ حضرت مبلغِ اسلام ہی کو لے لیجیے۔ اربابِ فضل وکمال کے درمیان جو خصوصی امتیاز وانفرادیت آپ کو حاصل تھی ان کے عہد سے لے کر آج تک دنیا کے کئی براعظموں میں ان کی کوئی دوسری مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ اگر ہے تو لائی جائے۔

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن　　　　خوبیِ یار کا جواب کہاں

حضرت مبلغِ اسلام کا آبائی وطن میرٹھ ہے۔ آپ کے والدِ ماجد حضرت مولانا عبد الحکیم جوشؔ میرٹھی ۱۸۰۸ء میں میرٹھ ہی میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے زمانے کے ایک ممتاز عالمِ دین، نامور خطیب اور شہرت یافتہ نعت گو شاعر تھے۔ ایک طویل عرصے تک شاہی مسجد میرٹھ کے خطیب رہے۔ اپنے زمانے میں علاقائی حد تک وہ مرکزِ رُشد وہدایت بھی تھے، ان کا سینہ محبتِ رسول (ﷺ) کا مدینہ تھا۔ دیارِ محبوب کے تصور میں ڈوبے رہتے تھے۔ آپ کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ آپ کے انتقال کے ۱۴ سال قبل آپ کا چودھواں اور آخری وتاریخی بچہ پندرہ رمضان المبارک ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء کو پیدا ہوا جو آپ کی پیش گوئی کے مطابق ایک زبردست عالمِ دین اور اپنے زمانے میں دنیا کا سب سے بڑا مبلغِ اسلام بنا۔ اس

زمانے سے لے کر آج تک اسلامی شخصیات ورجال میں کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔

آپ سات بھائی بھی تھے اور بہنیں بھی سات تھیں۔ سات بھائیوں میں پانچ عالمِ دین تھے۔ عالمِ دین بھی کیسے! اپنے زمانے کے نامور عالمِ دین! آپ کے بڑے بھائی مولانا احمد مختار صدیقی میرٹھی علیہ الرحمہ کا شمار اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے نامور خلفاء میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ عنفوانِ شباب آنے سے پہلے ہی سایۂ شفقتِ پدری سے محروم ہوگئے۔ قدرت جس کی ارجمندی کا فیصلہ کرلیتی ہے یتیمی و بے سروسامانی اس کی ارجمندی کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔ دنیا کی اہم ترین شخصیات ورجال کی فہرست میں یتیموں کی ایک بڑی تعداد ملے گی۔

برصغیر ہند بزرگانِ دین وعلمائے ربانیین کی برکتوں کے فیضان سے پہلے ہی مالامال تھا۔ عالمِ اسلام بالخصوص مشرقِ وسطیٰ اسلام کی ضیاپاشیوں سے ہمیشہ سے مستنیر رہا۔ اسلام کی ابدی صداقتوں اور اس کی برکتوں کے فیضان سے ہر سو اُجالا ہی اُجالا تھا اس لیے تبلیغِ دین کے لیے آپ نے اپنا رُخ دنیا کے ان ممالک اور خطوں کی طرف کیا جو آفتابِ اسلام کی ضیا باریوں سے علی العموم محروم تھے۔ یہ راستہ آسان نہیں تھا، یہ وادی بڑی پُرخار تھی بلکہ یوں کہیے کہ

اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

مگر آپ نے اپنے پُرعزم حوصلوں، بے پناہ حوصلوں، بے پناہ ذہانتوں اور خداداد صلاحیتوں سے سنگلاخ چٹانوں میں راستہ بنایا اور اس راہِ محبت میں آپ خود ہی قافلہ تھے اور خود سالارِ قافلہ بھی۔ جگہ جگہ آپ نے اسلام کے ابدی وآفاقی پیغام کو پہنچایا اور دنیا بھر کے تمام ممالک کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی اور اس کے لیے قرآنِ مجید کی عطا کی ہوئی حکمتِ بالغہ کو اپنایا۔ غیر مسلموں بالخصوص انگریزوں میں اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کو ان کے ذہن سے دور کیا اور اسلام کے خلاف ان کے عصبیت زدہ ذہنوں کو صاف کیا اور اسلام کے پیغامِ امن ومحبت کے اثرات کو باقی رکھنے کے لیے نئی نئی زمینوں پر نئی نئی بنیادیں قائم کیں۔ آپ دنیا کی بہت ساری زبانیں جانتے تھے بلکہ یوں کہیے کہ آپ ماہرالسنہ تھے۔ آپ جہاں بھی گئے اسلام کے پیغام کو وہاں سے لوگوں کی زبان میں پہنچایا۔ علم وفضل، اخلاص وعمل کے ساتھ آپ کی ہمہ دانی، ہمہ گیری یہ ایک ایسا وصفِ خاص تھا جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں کسی کسی ہی کو عطا فرماتا ہے **اللہ یعطی من یشاء بغیر حساب**۔ آپ ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۵۱ء مسلسل دنیا بھر کا دورہ کرتے رہے اور اسلام کا پیغام پھیلاتے رہے۔ جہاں بھی گئے ہوا کے دوش پر نہیں گئے کہ آج گئے کل چلے آئے بلکہ جہاں گئے وہاں اس وقت تک رہے جب تک آپ نے وہاں رکنے کی ضرورت محسوس کی اور وہاں سے واپس آنے کے بعد دین کا کام رک نہ جائے اس لیے جگہ جگہ اسلامی مراکز اور دینی سینٹر قائم کیے۔ آپ نے تنہا اتنا کام کو جو ایک کثیر جماعت مل کر بھی نہیں کر پاتی۔ آپ جہاں بھی گئے اپنی یادوں کے نقوش چھوڑ کر آئے۔ آج ان ممالک میں دین وسنّیت کے جو بھی مراکز قائم ہیں خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہوں وہ مبلغِ اسلام حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں۔

آپ کا طریقۂ تبلیغ بڑا مؤثر اور دل پذیر ہے۔ آپ کو فرمانِ الٰہی: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔(سورۂ آلِ عمران: ۱۱۰)(تم بہتر ہوان سب اُمتوں میں جولوگوں میں ظاہر ہوئیں، بھلائی کا حکم دیتے ہواور برائی سے منع کرتے ہو۔) کے پیشِ نظر اپنی داعیانہ حیثیت کا بڑا شدید احساس تھا اور اسی احساسِ شدید نے انہیں زندگی بھر بے چین رکھا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا بھی بڑا پاس تھا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَالَا تَفْعَلُوْنَ ۔(سورۂ صف: ۲،۳) اے ایمان والو! کیوں کہتے ہووہ جو نہیں کرتے، کتنی سخت ناپسند ہے اللہ کو وہ بات کہ وہ کہو جو نہ کرو۔

اس لیے آپ کا کردار وعمل اس حکمِ الٰہی کے عین مطابق ہے جو ایک داعی کے لیے ضروری ہے ورنہ اس کا پیغام ہواؤں میں اُڑ جائے گا۔ خود ہی فرماتے ہیں:

”قرآن ہم پر زور دیتا ہے کہ ہم ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ بھی کریں، اگر ہم خود نیک اعمال کرتے ہیں تو پھر ہم کی دوسروں کو تبلیغ بھی کرسکتے ہیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے بطور نمونہ نہیں رکھ سکتے تو ہم ان سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ ان باتوں کو مانیں جو ہم ان سے کہہ رہے ہیں۔“ (ماہنامہ پیامِ حرم، جمد اشاہی بستی، جنوری ۲۰۰۹ء)

آپ آیۂ کریمہ: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ کی عملی تفسیر تھے اور آیت مقدسہ: اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۔(سورۂ نحل: ۱۲۵) اپنے رب کی راہ کی طرف بلاؤ پکی تدبیر اور اچھی نصیحت سے اور ان سے اس طریقے پر بحث کرو جو سب سے بہتر ہو) کی روح کو انہوں نے بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا اور تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کے لیے قرآنِ مجید نے جس حکمتِ بالغہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے پورے یقین واعتماد کے ساتھ اپنایا اور اشاعتِ دین کے لیے اسے لازم سمجھا اور تبلیغِ دین کے لیے اسی کو اپنا رہنما اصول بنایا جس پر وہ زندگی بھر عمل پیرا رہے، جس کی وجہ سے ہر چہار جانب سے کامرانیوں نے ان کے قدم چومے۔ تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام کے لیے وہ جس قدر مخلص و پُرجوش تھے اس دور میں تو اس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ آج برصغیر ہندو پاک کے علماء و واعظین اور صرف نام کے مفتیانِ دین نے آیۂ مقدسہ اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ الآیہ کو عملاً تقریباً منسوخ ہی سمجھ لیا ہے یا اس فرمانِ الٰہی کی روح کو سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ دین وسنّیت کی تبلیغ واشاعت کا جو طریقۂ کار اختیار کرلیا گیا ہے اس کے بے حد مضر اثرات تو دن رات کا مشاہدہ ہے۔ بدمذہبیت کا غیر معمولی پھیلاؤ غیر محسوس طور پر ہمارے طریقۂ تبلیغ کا بھی رہینِ منت ہے۔ حضرت مبلغِ اسلام اپنے یورپ و افریقہ و دیگر ممالک کے تبلیغی دوروں کا پہلے سے ایک جامع منصوبہ بناتے اور پھر اس کے لیے ہر طرح کی تیاری کرتے تب کہیں جا کر وہ عازمِ سفر ہوتے۔

مصطفیٰ بازار ممبئی میں ۱۰ محرم الحرام کو بعد نمازِ ظہر آپ کے عرس کا ایک تاریخی جلسہ بہت زمانے سے بالالتزام منعقد ہوتا ہے جس میں علماء و عوام مسلمین کی بڑی بھیڑ ہوتی ہے۔ محترم الحاج شمس الحق علیمی مرحوم بانی مدرسہ علیمیہ جمد اشاہی جو حضرت کے بڑے مخلص، جاں نثار مرید تھے انہوں نے اپنے احباب بالخصوص حاجی رفیق اللہ وارکانِ جماعتِ علیمیہ کے پُرخلوص تعاون سے اپنے گاؤں جمد اشاہی میں حضرت کے نام سے مدرسہ علیمیہ قائم کیا جس نے آج دار العلوم کی شکل میں

دینی مدارس کے درمیان بہت بلند مقام بنالیا ہے بلکہ یوں کہیے کہ الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور کے بعد صرف تعلیمی میدان میں اہلِ سنّت کی آبرو بنا ہوا ہے فالحمدللہ رب العالمین۔ مصطفیٰ بازار ممبئی کے اس تاریخی اسٹیج پر از خود علما کی بڑی تعداد بارگاہِ علیمی میں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے آتی ہے۔ راقم الحروف وارث جمال قادری ۱۹۷۲ء سے بالالتزام اس تاریخی اجلاس میں شرکت کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ چند سال قبل اسی تاریخی اجلاس میں استاذی الکریم یادگارِ سلف حجۃ الخلف استاذ الاساتذہ بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی علیہ الرحمہ خصوصی خطاب فرما رہے تھے۔ اس وقت محترم شمس الحق علیمی باحیات تھے۔ حضرت بحر العلوم کی زیارت اور ان کے خطاب میں انسانی سروں کا تاحدِ نگاہ ایک سیلاب تھا۔ درجنوں علماء اسٹیج اور اس کے اطراف گوش برآواز تھے۔ حضرت بحر العلوم تھے اور ان کا اپنا ایک فطری انداز، جس کے لیے وہ مشہور تھے۔ تقریر کے دوران شمس الحق علیمی مرحوم کے ایک خط کے حوالے سے فرمانے لگے کہ حضرت کا ایک خط پاکستان سے اپنے ایک بے حد مخلص و جاں نثار مرید محترم شمس الحق علیمی صاحب کے نام آیا جس میں حضرت مبلغِ اسلام نے لکھا تھا:

"بیٹا، شمس الحق! الحمد للہ رب العلمین چار ہزار روپے کا انتظام ہو گیا ہے۔ (واضح رہے کہ چار ہزار برٹش دور کا) تم چند جوڑے میرے پہننے کے لیے کپڑے اور ایک شیروانی بھیج دو جسے پاتے ہی میں سفرِ یورپ و افریقہ کے تبلیغی دوروں پر نکل جاؤں گا۔"

اللہ اکبر! یہ تھا حضرت مبلغِ اسلام کی تبلیغ کا انداز کہ آپ جہاں بھی جاتے کسی کے بھروسے نہیں جاتے تھے بلکہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جو چیزیں دیارِ غیر میں بنیادی ہوتیں اسی کو لے کر جاتے اس لیے کہ جہاں کے لیے ان کا رختِ سفر ہوتا وہاں آپ کا کوئی جاننے والا نہیں ہوتا اور نہ آپ کسی کو جانتے۔ ایسا نہیں کہ بس دو چار کپڑے اٹیچی میں رکھے اور ائیر پورٹ پہنچ گئے اور چند گھنٹوں میں ہواؤں کے دوش پر اپنی منزل پر پہنچ گئے اور پھر وہاں مرحبا اهلا وسهلا کہنے والوں کی ایک بھیڑ آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیتی جیسا کہ فی زمانہ ہو رہا ہے بلکہ آپ کا زیادہ تر غیر ملکی سفر پانی کے جہاز سے ہوتا تھا۔ وہ جہاز جس ملک کے جس ساحل پر لنگر انداز ہوتا تو آپ کپتان سے وہاں کی تاریخ روانگی معلوم کرتے کہ یہ جہاز کتنے دنوں ٹھہرے گا، ہفتہ پندرہ دن یا بیس دن۔ پہلے بنے بنائے منصوبے کے مطابق آپ جہاز سے اُتر کر اس شہر میں چلے جاتے اور وہاں تبلیغِ دین میں بڑی حکمتِ بالغہ کے ساتھ حالات کے پیشِ نظر مصروف رہتے اور جہاز کی روانگی کے دن جب شہر سے واپس آتے تو نمناک آنکھوں کے ساتھ الوداع کہنے والوں کی ایک بھیڑ ہوتی جو آپ کی کوششوں سے نئے نئے مسلمان ہوئے ہوتے جو جوشِ احترام و عقیدت میں آپ کو چھوڑنے آتے۔ یہی حال پورے سفر میں ہوتا جہاں جہاں جہاز لنگر انداز ہوتا تھا۔ جہاز کا کپتان بڑا متاثر ہوتا۔ بقول حضرت بحر العلوم، جہاز کا کپتان کہتا تھا کہ ہمارے اس جہاز میں ایک عجیب مسافر بھی ہے جو کسی بھی ملک کے ساحل پر جہاز سے اُتر کر تنہا شہر میں جاتا ہے اور چند دنوں کے بعد واپس آتا ہے تو شہر ساتھ لے کر واپس آتا ہے۔ تبلیغِ دینِ متین و اشاعتِ اسلام کے لیے آپ جہاں بھی جاتے کسی پر بوجھ نہیں بنتے بلکہ اپنا بوجھ خود ہی اُٹھاتے، جس کے لیے وہ پوری تیاری کے ساتھ جاتے۔ آپ بھری ہوئی جیب اور بھری ہوئی پیٹیاں اور اٹیچیاں

لے کر جاتے اور جب واپس آتے تو خالی ہاتھوں اور خالی پیٹیوں کے ساتھ آتے۔

آپ نے تو افریقہ کے ان تاریک ترین علاقوں میں اسلام کی شمع جلائی ہے جہاں تہذیب کی ہلکی روشنی بھی نہیں پہنچی تھی۔ آپ ان علاقوں میں بھی گئے ہیں جہاں کے مرد تو مرد عورتیں بھی مادرزاد برہنہ رہتیں اور یہی ان کی معاشرت تھی۔ آپ نے مادرزاد ننگوں کو دیکھ کر معاذ اللہ، استغفر اللہ اور لاحول ولا قوۃ پڑھتے ہوئے آنکھیں بند نہیں کیں بلکہ ان کے قریب گئے، انہیں اپنے قریب کیا اور بڑی حکمت و دانائی کے ساتھ ان کے سینوں میں اسلام کی قندیل جلائی پھر انہیں کپڑا پہنایا، اس طرح وہ انسانی معاشرے کا حصہ بنے۔ ان کے اسی اخلاص کی برکت ہے کہ آج دنیا کے جس حصے کے مذہبی حلقوں میں آپ کا نام لیا جائے، سر ہی نہیں دل و نگاہ احترام میں جھک جاتے ہیں۔ آج دیارِ غیر میں بالخصوص یورپ و افریقہ جو بھی دین وسنیت کی فیلڈ ہے اور دین وسنیت کا اُجالا پھیل رہا ہے وہ آپ ہی کی بے لوث قربانیوں کا رہینِ منت ہے۔

فنا کے بعد بھی باقی ہے شانِ رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے امیرِ کارواں تم پر

آج بھی تبلیغی قافلے جاتے ہیں، تقدس مآب شخصیتیں بھی تبلیغِ دین کے نام پر شدرحال (سفر) کرتی رہتی ہیں مگر اس کے ثمرات واثرات علی العموم صرف یک طرفہ ہوتے ہیں۔ خالی ہاتھ اور خالی اٹیچیاں لے کر جانے والے حرمِ قدس کے وہ مسافر جب واپس آتے ہیں تو ھٰذا من فضل ربی کا اشتہار ہوتے ہیں اور تیزی سے بڑھتا ہوا معاشی حجم دیدۂ حیرت بن جاتا ہے۔

مبلغِ اسلام حضرت علامہ عبد العلیم صدیقی علیہ الرحمہ کی پوری زندگی کارناموں سے بھری ہوئی ہے۔ ان کی ایک ایک سانس اللہ کے دین کی اشاعت میں گزری۔ انہوں نے جو کچھ قربانیاں راہِ حق میں دیں وہ اللہ کی خوشنودی اور اس کے محبوب کی رضا کے لیے، اس کا صلہ دنیا دے بھی نہیں سکتی۔ وہ دنیا سے خالی ہاتھ نہیں گئے بلکہ اپنے رب کی بارگاہ میں پیش کرنے کے لیے ان کے پاس اتنا سب کچھ تھا کہ جب وہ اپنے رب کے حضور پیش ہوئے ہوں گے تو رحمتِ پروردگار نے جھوم کر پوچھا ہوگا ''بتا تیری رضا کیا ہے؟''

آپ نے اپنے بعد اس پاکیزہ مشن کو جاری رکھنے کے لیے جگہ جگہ جو اسلامی مراکز اور دینی وتبلیغی سینٹر قائم کیے وہ آج بھی مصروفِ عمل ہیں۔ آپ کے بعد اس پاکیزہ مشن کے سربراہ کے طور پر آپ کے فرزندِ ارجمند قائدِ اہلِ سنّت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے اُفق پر ایسے نمایاں ہوئے جو الولد سر لابیہ کے مظہرِ اتم ثابت ہوئے۔

آپ کی عظمتوں اور رفعتوں کے وارث وجانشین حضرت علامہ شاہ احمد نورانی کے تعلق سے ہم جیسے بے بضاعت کا کچھ عرض کرنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مانند ہے، صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس دورِ قحط الرجال میں انسانی عظمتوں، اس کے کردار وعمل کی بلندیوں کا جو بھی بلند معیار مقرر کیا جاسکتا ہے، وہ اس سے بلند تر تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ پورے عالمِ

اسلام بشمولیت ہندوستان من کل الجہات ان کا کوئی ثانی نہیں تھا تو بے جا نہ ہوگا اور نہ ہی مبالغہ۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وراثت میں باپ کی عظمتیں بھی بیٹے کو مل جائیں۔ زیادہ تر لوگ تو پدرم سلطان بود ہی کا نعرہ بلند کرتے ہیں مگر یہاں تو بحمدہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے۔ عظیم باپ کے عظیم بیٹے نے نہ صرف اپنے بزرگ ترین باپ کی نہ صرف ساکھ اور اس کی پگڑی سلامت رکھی بلکہ ان کی عظمتوں کو چار چاند لگا دیے۔ ان کے تاریخی ورثے بالخصوص ان کی علمی، دین اور تبلیغی وراثت کو اوجِ کمال بخشا۔ جس طرح دنیا ان کے عظیم والد گرامی کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہی بیٹے یعنی علامہ شاہ احمد نورانی کا مثل بھی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

وہ کتنے عظیم تھے ہم جیسے لوگ تو صرف تصور ہی کر سکتے ہیں۔ فقیر وارث جمال قادری کو بغداد شریف کی عالمی کانفرنس منعقدہ ۹۲۔۱۹۹۱ء میں کئی دنوں تک قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی، گلے لگنے اور دست بوسی کا بھی شرف حاصل ہوا۔ ان کے قامتِ علمی ہی نہیں بلکہ قامتِ زیبائی کا عالم یہ تھا کہ وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے۔

مبلغِ اسلام کی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی کی علمی، دینی، ملّی، فلاحی اور تبلیغی خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے جس کی خوشبو ملک و بیرونِ ملک دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کی صاحبزادی جب تولد ہوئیں تو اس وقت آپ مکۃ المکرمہ میں تھے۔ بیت اللہ شریف ہی میں یہ خبر سنی اور وہیں دعا کی کہ مولا! میری اس بیٹی کو تو اپنے فضل سے دین کی خادمہ و مبلغہ بنا۔ یہ دعا آپ کی قبول ہوئی اور یہ دعا قبول ہونی ہی تھی کہ حرمِ الٰہی جائے اجابت ہے ہی۔ اور پھر دعا کرنے والا بھی تو بندگی کی اس منزل میں تھا کہ

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی کی علمی، دینی، فلاحی، ملی اور تبلیغی خدمات پر باقاعدہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری کی جا سکتی ہے۔ ان کے کارناموں کا احاطہ کرنا بھی بڑا کام ہے۔ بے شک علامہ شاہ احمد نورانی اور ان کی ہمشیرہ ڈاکٹر فریدہ احمد صدیقی اپنے بزرگ ترین والدِ گرامی کی ایسی کرامت ہیں جو اپنی مثال خود آپ ہیں۔ اگر مبلغِ اسلام حضرت علامہ شاہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے خاندان کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے ان کے جدِ اعلیٰ سے لے کر حضرت مولانا شاہ انس نورانی تک تو ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کی صداقت اس پورے خاندان پر پورے طور پر صادق آئے گی اور ایسے ہی خاندان کے لیے کہا جائے گا کہ

أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ

ایک باکمال باپ کا عدیم النظیر بیٹا جس کا مثل اس کے زمانے نے نہ دیکھا۔ آدھی سے زیادہ دنیا زیرِ قدم اور استغنا و بے نیازی کا یہ عالم کہ پوری زندگی کرائے کے ایک مکان میں گزار دی۔ اپنے عظیم والد کے عملی درس کو ایسا از بر کر لیا کہ پھر اس کے بعد سکون کی ایک سانس لینے کی فرصت نہ ملی۔ بے شک انہیں اپنے والد، اپنے قائد، اپنے رہنما کا دیا ہوا سبق ایسا یاد ہوا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے بھولے نہیں۔

☑ ☑ ☑ ☑ ☑ ☑

حضور اشرف العلماء: ایک تجزیاتی مشاہدہ

دامن نگہ تنگ وگل حسن تو بسیار　　گل چین توازتنگیِ داماں گلہ دارد

اشرف العلماء، شیخ الاساتذہ، مخدوم المشائخ حضرتِ اقدس بابرکت پیر طریقت علامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی بانی وشیخ الحدیث وسربراہ دار العلوم محمدیہ ممبئی بندگانِ خدا بالخصوص سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے لیے انعامِ الٰہی تھے اور ممبئی میں سوادِ اعظم کے لیے سرمایہ صد افتخار بھی! سیادت، سعادت، علم وفضل، شرف وبزرگی تو جیسے ان کے مقدس پیشانی سے ہمہ وقت طلوع ہوتی رہتی، ان کی محبوبیت کبریٰ کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ان کے جلوسِ جنازہ پر انسانوں کا جو ازدحام تھا اسے دیکھ کر آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کم از کم دینی، مذہبی قائد کے وصال پر انسانی سروں کا ایسا اُمڈتا ہوا سیلاب ممبئی کے آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا! اور نہ ہی پرنٹ میڈیا نے کسی اور شخصیت کے ساتھ اتنا زبردست خصوصی اعتناء کیا۔ ذالک فضل اللہ یعطیہ من یشاء بغیر حساب۔ آپ کا تعلق اس عظیم اور مقدس خانوادے سے تھا جس کے لیے اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کے عقیدے کی زبان یہ ہے:

تیری نسل پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

آپ کے کس کس حسن کا ذکر کیا جائے اور کن کن اداؤں پر قربان ہوا جائے! جمال وزیبائی میں اگر تقدس کی آمیزش ہو جائے تو وہ دوآتشہ ہو جاتی ہے مگر جب کسی حسنِ فروزاں پر تقدس کا غلبہ ہو جائے تو پھر قوتِ تسخیر کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ اشرف العلماء حضرت سیّد حامد اشرف کی شخصی وجاہت اور ان کی جمال وزیبائی، دلکشی ورعنائی میں تقدس کی آمیزش اور اس کا غلبہ تونسل درنسل ان کی جاگیر تھی۔

جن آنکھوں نے مجدد سلسلہ اشرفیہ قطب المشائخ مرجع العلماء، ہم شبیہ غوث جیلانی حضرتِ اقدس بابرکت سیّد علی حسین اشرفی جیلانی اور ان کے فرزند ارجمند تلمیذ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت حضرتِ اقدس سراپا خیر وبرکت علامہ سیّد شاہ احمد اشرف جیلانی پیر ومرشد حضور محدثِ اعظم ہند کو دیکھا ہے یا ان کو دیکھنے والوں سے سنا ہے وہ میرے دعوے کی تصدیق کریں گے۔ اعلیٰ حضرت مجدد دین وملّت نے ہم شبیہ غوث جیلاں کو دیکھ یوں ہی نہیں کہہ دیا تھا۔

اشرفی اے رخت آئینہ حسن خوباں
اے نظر کردہ پروردۂ سہ محبوباں

ان کے حسنِ فروزاں کا عالم یہ تھا کہ جو انھیں دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ چلتا ہوا مسافر چلتے چلتے رک جاتا، دیکھتا پھر چلتا،

پھر مڑ مڑ کر دیکھتا۔ اور کبھی سفر کے لیے کسی مصروف ترین ریلوے اسٹیشن پر ٹرین پکڑ نے پہنچتے تو مسافروں کی بھیڑ قدرت کا ایک شاہکار دیکھنے کے لیے ان کے گرد بھیڑ لگا دیتی۔ اس حسنِ ظاہر میں تقدس کی آمیزش کتنی تھی؟ یا اس پر غلبہ کس قدر تھا؟ اس کا اندازہ ان اعاظم رجال اور سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی گراں مایہ شخصیات پر ایک نظر ڈالیں جن کا فضل و کمال، عظمت و جلال اور عبقریت و انفرادیت مسلّم ہے۔ اور جن کے ذکر کے بغیر اصحابِ فضل و کمال کی تاریخ ہی نامکمل رہے گی۔

صدر الافاضل فخر الاماثل سیّد المفسرین امام الہند حضرت علامہ سیّد نعیم الدین مراد آبادی، حجۃ الاسلام شیخ الانام حضرت علامہ حامد رضا خاں بریلوی، قطب مدینہ حضرت علامہ مفتی ضیاء الدین مہاجر مدنی، مبلغ اسلام حضرت علامہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی، صدر العلماء امام النحو حضرت سیّد غلام جیلانی میرٹھی، امینِ شریعت سلطان المناظرین حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین مفتیٔ اعظم کانپور، امام التارکین حضور مجاہد ملّت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی، حضور حافظ ملّت مولانا شاہ عبد العزیز مراد آبادی، امام المعقولات حضرت علامہ محمد سلیمان بھاگل پوری، حضرت علامہ سیّد ابو الحسنات صاحب، حضرت علامہ فاخر الہ آبادی، حضرت علامہ قطب الدین برہم چاری، عم محترم علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی علیہم الرحمہ وغیرہ وغیرہ جن کی یکتائی و بے نظیری کا دبدبہ آج بھی دلوں پر قائم ہے۔ اور یہ وہ آفتابِ فضل و کمال ہیں جن کی نظیر پھر دنیا نے نہیں دیکھی۔ یہ اس آئینہ حسنِ خوباں کے خلفاء مجاز ہیں ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت میں ایک اور ہستی بے کراں اسی زمانے میں گذری ہے جن کی وجاہت جمالی و دلکشی اور حسنِ فروزاں کا شہرہ دور دور تک تھا اور بقول حضرت علامہ غلام آسی برادرِ اکبر حضرت علامہ ارشد القادری ان کا حسن و جمال تو ان کی کرامت تھی! جن کی شخصیت کے اثر و نفوذ کا عالم بھی بڑا عجیب تھا۔ ان کا ایک واقعہ بڑا مشہور ہے کہ ایک امتِ دیابنہ کے مشہور گستاخِ رسول جناب مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ ماعلیہ سے لاہور میں ایک مناظرہ طے ہوا۔ آپ وقتِ مقررہ پر لاہور پہنچ گئے۔ پہنچے تو جناب گستاخِ رسول بھی لیکن وہ اسٹیج پر آپ کا سامنا کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاسکے اس لیے نیاز مندوں کے کافی اصرار کے باوجود وہ اسٹیج پر نہیں آئے۔ کافی انتظار کے بعد جب آپ پر صورتِ حال منکشف ہوئی تو اپنے اہلِ محبت سے فرمایا کہ مولوی صاحب (یعنی تھانوی صاحب) سے جا کر کہہ دیجیے کہ وہ مناظرہ نہ کریں، اگر صرف مجھے دیکھ لیں ایمان لے آئیں گے کہ کسی جھوٹے کا چہرہ ایسا نہیں ہوسکتا۔

چند فقروں میں عرضِ حال ادیب   اس قدر اختصار کیا کہنا

وہ حسنِ فروزاں وہستی بے کراں وجلوۂ شانِ خدا شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا خاں بن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں علیہما الرحمہ کی ذات والاصفات تھی فتبارك الله احسن الخالقین۔ حضور اشرف العلماء اسی آئینہ حسنِ خوباں (یعنی حضور اشرفی میاں) کے پوتے تھے۔ حسنِ باطن کے ساتھ حسنِ ظاہر کا کچھ تو حصہ اپنے دادا سے لیا ہوگا۔ الولد سر لابیه بھی تو ایک آفاقی حقیقت ہے۔

مشہور کلیہ ہے: باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ان کا ادب بھی دیکھا ہے اور حسنِ

ادب! حضور اشرف العلماء کو دیکھنے جاننے اور ملنے کی میری خود ہی کی عمر تیس برس کی ہے۔ تیس برس خود ایک بڑی مدت ہوتی ہے اور یہ تیس برس میں انھیں مسلسل دیکھتا رہا، ملتا رہا، سنتا رہا، کہتا رہا اور ان کے ساتھ چلنے اور ملنے اور کام کرنے کی عزت حاصل کرتا رہا۔ ان سے جب بھی ملا علی العموم گل خنداں پایا۔

لب نازک پہ تبسم کا نمود		شاخ پر پھول کھلا ہو جیسے

قطب عالم حضور مفتیٔ اعظم ہند علامہ مصطفیٰ رضا خاں بریلوی کی زیارت سے یہ آنکھیں سرشار ہیں۔ ہم نے جب بھی ان کی زیارت کی اور چہرۂ زیبا کی طرف دیکھا تو ان کے لب ہائے ناز خصوصیت کے ساتھ آنکھوں کی حسیات کو اپنی طرف کھینچ لیتے اور میر تقی میر کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے۔

نازکی ان کے لب کی کیا کہیے		پنکھڑی ایک گلاب کی سی ہے

اور یہ حال ان کے اسی سالہ بڑھاپے کا تھا کہ اگر نظر پڑ گئی تو جم کر رہ گئی، قدم رک گئے اور دل بے اختیار ان کی طرف کھنچ گیا، متاعِ دل نذر کرنے والوں میں کوئی تخصیص نہیں ہوتی اپنے پرائے مسلم غیر مسلم ان کی جمال و دلکشی قامت زیبائی پر دیدۂ حیرت کا عالم بڑا عجیب ہوتا۔ ع تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں، یہ عالم تھا ان کے اسی سالہ بڑھاپے کا تو پھر عنفوانِ شباب کا تو صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ اور اس حسنِ خداداد میں تقدس کی آمیزش ہی نہیں بلکہ اس کا غلبہ تھا کہ وہ اپنے زمانے کے سیّد المتقین تھے، امام المتکلمین تھے اور خلائق کے سب سے بڑے مرجع! وہ تیری شمع حق نما میں ہے وہ زور آزمائی۔ کہ ہزار آندھیوں میں نہ بجھی نہ جھلملائی۔

آپ کا حسنِ ادب:۔ غالباً ۱۹۶۹ء کی بات ہے کہ اشرفیہ مبارکپور سے ساداتِ کچھوچھہ مقدسہ کی قانونی بالادستی ختم ہو گئی۔ اس وقت راقم الحروف وارث جمال قادری کا اشرفیہ میں آخری سال تھا۔ حضور حافظ ملّت اپنے مخلص و وفادار تلامذہ واہلِ محبت کے ساتھ اشرفیہ کو ایک تحریک کی شکل دینے کے لیے آگے بڑھے۔ اس راہِ عزیمت و استقامت میں روحِ اشرفیہ امام الحکمت حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب، رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری صاحب، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب، مفکرِ ملّت حضرت علامہ محمد حنیف قادری، شیخ الادب حضرت علامہ محمد شفیع صاحب مبارکپوری، استاذ القریٰ حضرت علامہ قاری محمد عثمان مبارکپوری ناظم اعلیٰ دار العلوم اشرفیہ۔ حضرت علامہ علی احمد صاحب مبارکپوری، حضرت علامہ قمر الزماں اعظمی، حضرت بیکل اتساہی بلرام پوری وغیرہ وغیرہ اور اہلِ مبارکپور اس مرحلہ شوق راہِ محبت میں حضور حافظ ملّت کے دست و بازو بنے ہوتے تھے، ساداتِ کچھوچھہ مقدسہ کی عظمت و اہمیت اور ان کی خدمات سے انکار ممکن نہیں کہ اشرفیہ مبارکپور کی بنیادی اینٹ تو وہی ہیں اور اشرفیہ کی اینٹ اینٹ پر ان کے خدمات کا نقش ہے۔ جو اپنے نام اشرفیہ سے بھی ظاہر ہے۔ ہم یہاں کسی بحث میں نہ پڑتے ہوئے کہ ایک تکلیف دہ تذکرہ ہے اور اتنا ذکر کرنا مجبوری ہے کہ اشرف العلماء کا ہمیں عظمت و کردار دکھانا ہے۔ ایک عظیم ادارے سے بالادستی ختم ہونے کا غم! یہ ساداتِ کچھوچھہ کے لیے ایک بڑا اجتماعی سانحہ تھا جس کے سبب اشرفیہ مبارکپور کی اس وقت کی قیادت اور ساداتِ کرام کے درمیان دوریاں و تلخیاں بہت

زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ حد یہ کہ احترام کی جو فضا تھی وہ یکطرفہ اُٹھ چکی تھی، کچھوچھہ مقدسہ کی ساری قابلِ ذکر شخصیتیں حضور حافظ ملّت اور ان کے اعوان و انصار سے کافی دوریاں بنائے ہوئے تھیں۔ ایسے نازک ایام اور مشکل گھڑی میں حضور اشرف العلماء نے اعتدال و توازن اور ادب و احترام کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور اپنے استاذِ کریم حضور حافظ ملّت کی بارگاہ میں پہلے ہی کی طرح مؤدب رہے، ملنے جلنے، احترام و پذیرائی میں ذرا بھی فرق آنے نہیں دیا۔ ایک بڑے خاندان جس میں وقت کے اعاظم رجال بھی ہوں اور جس کی خاندانی عظمتیں، شوکتیں اور حشمتیں ہوں اور جس کا اپنا بڑا تاریخی پس منظر بھی ہو ایک جذباتی مسئلے پر ان سبھوں کو سنبھالنا اور اپنے استاذ کی بارگاہ میں حسب دستور مؤدب رہنا، یہ حضور اشرف العلماء کے لیے تلوار کی دھار پر چلنا تھا، اور انھوں نے تلوار کی اس دھار پر چل کر بتا دیا کہ ع بر کف جام شریعت بر کت سندان عشق، کیا ہوتا ہے۔

شہید راہِ مدینہ پیر طریقت حضرت سیّد مثنیٰ میاں صاحب اشرفی جیلانی جنھوں نے اپنی عمر کی آخری پڑاؤ پر یہاں ممبئی میں بڑا عروج حاصل کیا۔ ساداتِ کچھوچھہ و بسکھاری میں جن کے حسنِ اخلاق کا شہرہ تھا اور واقعی وہ ایک کریم النفس تھے، وارث جمال قادری کا ان کی بارگاہ میں بڑا قرب تھا۔ غازیٔ ملّت مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں کبھی کبھی کہا کرتے تھے: ارے مولانا وارث جمال انوار المشائخ پر تنہا آپ ہی کا حق رہے گا کہ ہم خاندان کے لوگوں کے لیے بھی کچھ چھوڑیں گے۔ وہ اکثر فرمایا کرتے کبھی اپنی مجلس میں اور کبھی مجھے مخاطب کرتے ہوئے بیٹا استاذ کا ادب و احترام تو کوئی میرے ماموں سے سیکھے (یعنی حضرت سیّد حامد میاں صاحب قبلہ) پھر ہنستے ہوئے فرماتے اور کبھی سیریس ہو کر کہتے کہ اشرفیہ کے مسئلے میں سارا خاندان ایک طرف اور ماموں جان ایک طرف اپنے استاذ حافظ ملّت صاحب کے لیے خاندان کا کوئی دباؤ قبول نہیں کیا اور پہلے ہی کی طرح وہ اپنے استاذ کا ادب و احترام کرتے رہے اور ہمیشہ بڑی نیازمندی سے ملتے رہے۔ اور تو اور وہ انھیں ایک بڑا ولی نہ صرف سمجھتے رہے بلکہ حضرت حافظ ملّت کی ولایت پر انھیں یقین کامل تھا۔ آخری تک ماموں نے استاذی و شاگردی کا رستہ بڑے احسن طور پر نبھایا۔

وہ ممبئی میں ایسے وقت تشریف لائے خود سے نہیں آئے، بلائے گئے بلکہ ایک بڑے مقصد کے لیے بھیجے گئے۔ دار العلوم اشرفیہ مبارکپور ان کا مادرِ علمی تھا، اسی عظیم علمی دانش کدے سے انھوں نے فضیلت کی دستار بھی لی! خوشا نصیب! وہیں استاذ بھی ہوئے استاذ بھی کیسے؟ ایک منفرد استاذ! ممتاز استاذ! قابلِ ذکر استاذ! شیخ الاسلام حضرت علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی اور غازیٔ ملّت مولانا سیّد محمد ہاشمی اور ان جیسوں کے استاذ!

ایک بار بر سبیلِ تذکرہ مسکراتے ہوئے فرمانے لگے مولانا وارث جمال! یہ جو ہاشمی ہے نا! یہ اپنے دورِ طالب علمی میں بہت ذہین تھا، اتنا ذہین کہ میں خود اس کی ذہانت سے متاثر تھا سبقاً سبق کافیہ تک مجھ سے پڑھا کاش دو تین ہی سال مجھ سے اور پڑھ لیتا تو وہ میدانِ خطابت کی طرح میدانِ علم و فضل کا بھی مردِ میداں ہوتا! اہلِ ممبئی پر جلالۃ العلم حضور حافظ ملّت علیہ الرحمہ کا یہ احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے اپنے دستارِ علم و فضل کا ایک قیمتی ہیرا ممبئی والوں کو دے دیا۔ وہ بھی ایسے وقت میں کہ

ممبئ میں حضور سیّد العلماء حضرت علامہ سیّد آلِ مصطفٰے قادری برکاتی علیہ الرحمہ کے فضل وکمال، عظمت وجلال، شوکت و اقبال اوران کی مقبولیت کا گراف سوا نیزے پہ تھا، درجنوں اصحابِ فضل وکمال اور جید علماء پران کا وجودِ مسعود بہت بھاری تھا، دلوں پر حکمرانی وگردن پہ طاعت نہاون پڑھا کرتا تھا، سنا کرتا تھا، مگر خدا کی قسم! لاکھوں دلوں پر حکمرانی اوران کے حضور ہزاروں خمیدہ سروں کو دیکھا گیا۔ میری طرح ہزاروں نے دنیائے سنّیت کے اس رجل رشید کو کھڑک کی چٹائی پر بیٹھ کر لاکھوں کروڑوں دلوں پر حکمرانی کرتے ہوئے دیکھا ہے جسے دنیا سیّد آلِ مصطفٰے کہتی تھی جو اپنے وجود میں بیک وقت بریلی بھی تھا، کچھوچھہ بھی، بدایوں بھی تھا اور مارہرہ بھی! برصغیر ہند میں تنہا اس کا وجود سوادِ اعظم سے عبارت تھا ذالك فضل الله یعطیه مَن یشاء بغیر حساب!

مَضت الدهور وما اُتین بمثله ولقد اتی فعجرت عَنْ نظرائه

اس زمانے میں ایک جملہ زبان زدعوام تھا، ممبئ آلِ مصطفٰے کی۔ ان کے وجود نے ممبئ کی دینی، مذہبی اور ملّی وسعتوں کو بھر دیا تھا۔ ان کی ذات سے عوام وخواص کی وابستگی اوران سے حسنِ عقیدت اور دیوانگی کا عالم یہ تھا کسی بھی قومی، ملّی، دینی، مذہبی مسئلے میں وہ اپنا رخ جدھر کرتے وہی مسلمانانِ ممبئ کا جہت قبلہ ہوجاتا۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کا کہنا ہی کیا غیر سنّی طبقہ بھی اپنا رخ اسی طرف کرنے پر مجبور ہوجاتا، صرف ممبئ ہی کی حد تک نہیں بلکہ پورے ملک میں ان کے شوکت و اقبال کا سکّہ رواں دواں تھا۔ پورے ملک میں دینی وتبلیغی وروحانی اسفار کے لیے ان کا بستر ہمیشہ بندھا رہتا، وہ ہر میدان کے شہسوار تھے اور ہر میدان میں ان کی یکتائی وبے نظیری مسلّم! اسی اعتبار سے مصروفیت بھی بہت زیادہ تھی، پورے ملک میں دین وسنّیت کو کب اور کہاں ان کی ضرورت ہے؟ زمانے نے ان کو وہاں موجود پایا۔ جس شاہانہ ودرویشانہ وعالمانہ و قائدانہ شان وشوکت اور جس بےنیازانہ کروفر سے انھوں نے زندگی گذاری ان سے پہلے اہلِ ممبئ نے ایسی کوئی دوسری مذہبی شخصیت نہیں دیکھا۔ مرتضٰی شہزاد پوری نے ایک شعر میں ان کا یوں سراپا کھینچا ہے ؎

شان سے آئے رہے اور شان ہی سے چل دیے
ممبئ سے سوئے جنت سیّد آلِ مصطفٰے

وارث جمال قادری ان خوش نصیبوں میں ہے جنھوں نے ان کی زیارت کی، ان کی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی، انھیں سنا، دیکھا، ان کے ساتھ چلا، ان کی مجلسوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا، ان کی صحبتیں اٹھائیں، ان سے استفادہ کیا اور ان سے ان محفلوں میں بھی بیٹھنے کا شرف حاصل کیا جن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ؎

ان کی محفل میں بیٹھنے والے آدمی بےنظیر ہوتے ہیں

حضور حافظ ملّت علیہ الرحمہ ایک انتہائی بالغ نظر دوربیں، جہاں بین اور مستقبل بیں اور گردوپیش پر نظر رکھنے والے اور حالات کے نبض پر انگلی رکھنے والے ایک عظیم دینی وملّی رہنما تھے، جن کی اصابت فکر اور مستقبل بینی مسلّم تھی۔ وہ ایک عظیم عالمِ دین ومعمارِ سنّیت تھے، وہ حضور سیّد العلماء کی بے پناہ دینی وملّی وجماعتی مصروفیات کو دیکھ رہے تھے کہ حضورِ والا کا

ایک قدم ٹرین کے اندر ہے ایک باہر۔ اپنی گونا گوں صفات اور اعلیٰ ترین قائدانہ جوہر کے سبب پورے برصغیر ہند کے مسلمانوں کی ضرورت بنے ہوئے ہیں گویا ایک انار اور ہزاروں بیمار! وہ اس بات کو بھی شدت سے محسوس کررہے تھے وہ ممبئ جو عروس البلاد کہلاتا ہے، جو اپنے وجود میں خود ایک ملک ہے! خلاصہ ہندوستان ہے، معیشت کی راجدھانی ہے، وہ ممبئ جو سنی مسلمانوں کا شہر کہلاتا ہے وہاں اہلِ سنّت کی ایک بھی دینی و مرکزی درسگاہ نہیں! درسگاہ کی اہمیت و افادیت سے بھلا ان سے زیادہ ان کے زمانے میں کون سمجھتا تھا، وہ بھی موقع کے منتظر تھے حالات پر نگاہ رکھے ہوئے تھے چنانچہ جوں ہی ممبئ سے کسی جوہرِ قابل کی طلب ہوئی، آپ نے اپنی حکمت ودانائی کے ترکش کا قیمتی تیر یعنی حضرت علامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی کو ممبئ بھیج دیا۔ انھوں نے اپنے تلمیذ ارشد میں وہ صلاحیتیں محسوس کرلی تھیں جو ممبئ کی شدید دینی ضرورت تھی۔ حضور حافظ ملّت نے صرف انھیں ایک عدد مسجد کی امامت کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ ان کے پیشِ نظر وہ عظیم دینی مقاصد کار فرما تھے کہ ممبئ سے عظیم شہر کو جس کی ضرورت تھی یعنی ایک بڑی مرکزی دینی درسگاہ کا قیام اور اس کے ذریعے دین وسنّیت کی مستقل و پائیدار خدمت و تبلیغ! چنانچہ حالات کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے کے بعد اپنے استاذِ گرامی جلالۃ العلم حضور حافظ ملّت کے علمی منصوبوں کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے دار العلوم محمدیہ کو ممبئ کی ایک مشہور تاریخی اور بڑی وسیع باؤلا مسجد میں قائم کردیا۔ مقامی مخلصین واہلِ محبت کے علاوہ بھیونڈی کے حضرت علامہ حامد فقیہ صاحب مرحوم آپ کے دست و بازو بنے دار العلوم محمدیہ کی ترقی و استحکام میں مولانا مرحوم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں!

دار العلوم محمدیہ نے بتدریج بڑی خاموشی کے ساتھ ممبئ کے مذہبی و دینی حلقوں پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ دار العلوم محمدیہ سے قبل کسی مسجد کے امام کے لیے یوپی و بہار سے رابطہ قائم کیا جاتا تھا مگر بحمدہ تعالیٰ جلد ہی دار العلوم محمدیہ نے اس عظیم دینی ضرورت کے لیے مسلمانانِ ممبئ کو انتظار کی زحمتوں سے بچالیا۔ ممبئ کی 80 فیصد مساجد میں اپنے امام پہنچادیے، جو دار العلوم محمدیہ سے فارغ ہیں۔ اس سے پہلے ممبئ میں کوئی بھی دینی ادارہ نہیں تھا۔ اگر کسی گلی کوچے میں کچھ تھا بھی تو جز وقتی، و بھی ناظرہ قرآنِ مجید وکلمہ درود کی حد تک۔ اور بس! بھیونڈی میں کبھی دار العلوم محمدیہ ہوا کرتا تھا جو حضرت علامہ عبد المصطفےٰ اعظمی کے بعد بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔ دار العلوم محمدیہ سے تحریک پا کر بہت بعد میں کچھ ادارے قائم ہوئے جیسے کرلا میں دار العلوم محبوبِ سبحانی، ممبرا میں دار العلوم اشرفیہ غریب نواز، ملاڈ اسکواٹر کالونی میں دار العلوم غریب نواز، قلابہ میں دار العلوم حنفیہ، سوناپور ممبئ میں دار العلوم قادریہ، جوگیشوری میں دار العلوم برکاتیہ وغیرہ، یہ سب بہت بعد کے دینی ادارے ہیں۔ اور اب تو اتنے ادارے اور دار العلوم و مدرسے ہوگئے ہیں کہ ان کے اعداد وشمار کے لیے باقاعدہ رجسٹر بنانا ہوگا۔ جن میں باستثناء چند کے علاوہ دینی سے زیادہ معاشی ضرورت ہیں جن کی باگ ڈور خالص اہلِ دنیا کے ہاتھوں ہے۔ حضور مجاہد ملّت نے ۱۹۷۸ء میں دینی وملّی ضرورتوں کے پیشِ نظر ممبئ میں عارفِ حق حضرت ٹوپی والے بابا کے پُر خلوص تعاون سے تبلیغِ سیرت کو قائم فرمایا جبکہ اسے آل انڈیا سنی جمعیۃ العلماء و مسلم متحدہ محاذ سے بھی اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ ہندوستان کے تقریبا تمام صوبوں میں ہندوستان سے مراد یہاں شمالی ہندوستان خصوصا بہار، بنگال، اڑیسہ، اتر پردیش، مدھیہ پردیش

وغیرہ میں کافی متحرک وفعال تھی۔ ممبئی میں چونکہ سنیوں کی ایک مرکزی تنظیم سنی جمیعۃ العلماء تھی اس لیے تبلیغ سیرت کی یہاں ضرورت نہیں محسوس کی گئی تھی مگر حضور سیّد العلماء علیہ الرحمہ کے بعد وہ بات نہیں رہ گئی جو ہونی چاہیے تھی۔ لہٰذا آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام یہاں کی دینی وملّی ضرورت بن گئی۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے قیام کے وقت بہت ساری ابرو کی کمانیں کھڑی ہوگئیں۔ اغیار کو وہ تکلیف نہیں ہوئی جو یہاں اپنوں کو ہوئی جس کی کچھ خاص وجہیں تھیں جس کے ذکر کے لیے یہ نمبر متحمل نہیں کہ ع جو سچ کہوں گا تو پھیلے گا انتشار بہت۔

ایسے عالم میں قابلِ ذکر شخصیات ورجال میں حضور مجاہد ملّت کی پکار پر قولاً وعملاً لبیک کہنے والوں میں سب سے نمایاں واہم ترین شخصیت حضور اشرف العلماء کی تھی جو تنہا نہیں بلکہ پورے دار العلوم محمدیہ کے ساتھ تبلیغ سیرت کی سرپرستی وتعاون کے لیے آگے بڑھے۔

پھر جب آل انڈیا تبلیغ سیرت نے کسی دینی وملّی تحریک کی قیادت کے لیے آپ کی طرف دیکھا، آپ نے کبھی مایوس نہیں کیا بلکہ پوری جرأتِ مومنانہ کے ساتھ آگے آئے، اگر میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے حوالے سے ان کے قومی، ملّی ودینی خدمات کی تفصیلات میں جاؤں تو اس عظیم وتاریخی مجلّے کی آدھی ضخامت تو میں ہی لے لوں گا۔ حضور اشرف العلماء کے حسنِ خدمات اور ان کی عظمت وجلالت اور علماء ومشائخ کے درمیان ان کی یکتائی وبے نظیری کے تعلق سے میرا ذخیرہ معلومات قابلِ رشک حد تک بھرا ہوا ہے۔

اشرف العلماء علیہ الرحمہ کی علمی، دینی، ملّی خدمات سے الگ ہٹ کر قومی وسیاسی خدمات بھی ہیں۔ ان کی بے حد خاموش طبیعت کے پیشِ نظر ان کی اس خدمات کو دیکھ کر بڑی خوشگوار حیرت ہوتی ہے۔ سیاست علماء کے لیے شجرِ ممنوعہ بنا دیا گیا تھا۔ ان سے پہلے سیاست حاضرہ پر لب کشائی سوادِ اعظم کی صفوں میں چند انفرادی شخصیات کے سوا ممنوع ومعیوب سمجھا جاتا تھا۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے علاوہ ہماری جتنی بھی مذہبی تنظیمیں تھیں ان کے منشور میں سیاست حاضرہ سے لاتعلقی غیر مقبول اصول ہوتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد مذہبی مقتدا میں صرف حضور مجاہد ملّت ہی نے مسلمانوں کے مفاد میں اپنی شرطوں پر کسی سیاسی پارٹی کی حمایت کی ہے۔ رہ گئے مجاہد دوراں حضرت علامہ سیّد مظفر حسین کچھوچھوی وحضرت مولانا سیّد اسرار الحق کوٹہ راجستھان ومولانا عبید اللہ خاں اعظمی وغیرہ تو انھوں نے باقاعدہ ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت کسی نہ کسی سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کی، اس کے لیے الیکشن لڑ کر پارلیمنٹ میں پہنچے اور سلیکٹ بھی ہوئے لیکن ان کی شہرت وتذکرہ سیاسی قائدین کی حیثیت سے ہوا۔ لیکن خالص دینی، مذہبی شخصیت جس کا میدانِ عمل اپنی مسجد اور اپنے دار العلوم تک ہی ہو! وہ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے بے چین ہو کر سود وزیاں سے بے نیاز ہو کر جب اپنی مسجد کے حجرے سے نکلتا ہے تو اس کے جلو میں سیکڑوں علماء وائمہ مساجد اپنی اپنی مسجدوں سے باہر نکل کر اس حکومت کو سزا دینے کے لیے آپ کے قدم بہ قدم ہو جاتے ہیں جس نے مسلمانوں پر مظالم ڈھائے۔ ۱۹۷۹ء کے آخر میں میرٹھ وملیانہ وبھاگل پور میں مسلمانوں کی عظیم تباہی وبربادی واجتماعی قتل کے ردِعمل میں پہلی بار اجتماعی طور پر علماء اپنی مسجدوں سے باہر نکلے۔ اور پوری

جرأتِ رندانہ کے ساتھ کانگریس کے خلاف آپ کی قیادت میں میدانِ عمل میں اترے، جس کا نتیجہ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور اب تک دیکھ رہی ہے کہ اس پارٹی کو پھر کبھی استحکام نصیب نہیں ہوا۔

چنانچہ مسلمانوں کے دلوں میں جس قدر معزز و محترم خالص مذہبی خدمات کے حوالے سے وہ پہلے تھے، مسلمانوں ہی کے لیے جب وہ مسجد سے باہر نکلے تو اس احترام میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ بلکہ مسلمانوں کے لیے آپ کے سوزِ دروں اور بے چینیوں کو دیکھ کر دلوں میں احترام وعقیدت مزید بڑھ گیا۔ آج علمائے اہلِ سنّت کی مہاراشٹر کی سیاست میں جو بھی پکڑ ہے وہ آپ ہی کی دین ہے۔ وہ پورے ملک بالخصوص ممبئی میں وہ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے ایک عظیم دینی مقتدا اور اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی کے پاکیزہ مسلک کے زندگی بھر داعی رہے۔ بے شک ممبئی میں ان کا قائم کردہ دار العلوم محمدیہ اہلِ سنّت کی سب سے بڑی وعظیم دینی درسگاہ اور اعلیٰ حضرت کے مسلک حبِّ رسول کی ترویج واشاعت کا ایک بڑا مرکز ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقہ وطفیل حضرت سیّد حامد اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ کے اس عظیم علمی ودینی یادگار کو باقی وسلامت رکھے اور اس کے موجودہ اربابِ حل وعقد و اربابِ بست وکشاد کے دلوں میں دار العلوم کی تعمیر وترقی کا وہی جذبہ وتڑپ واخلاص عطا فرمائے جو اس کے بانی کے دل میں تھا بلکہ ان سے بھی فزوں تر فرمائے۔ آمین بجاہ سیّد المرسلین۔

وہ جس مقصد کے لیے ممبئی تشریف لائے اس کی تکمیل فرمائی، وہ پوری طرح اپنے مقصد میں بڑے مخلص رہے علمِ دین مصطفےٰ کی ترویج واشاعت ان کا سب سے بڑا مقصد اور دین وسنّیت کی سرفرازی وسربلندی ان کا ٹارگیٹ اور انھیں ان عظیم مقاصد سے بڑا والہانہ لگاؤ ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے عشق تھا۔ جس کے لیے پوری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔ وہ ممبئی کے سب سے بڑے عالمِ مطاع ومخدوم تھے۔ آخری عمر کئی سالوں سے ایسے بیمار تھے کہ دوسروں کے کندھوں پر چلنے پر مجبور تھے مگر ایسے عالم میں اپنے آخری وقت بخاری شریف کا درس نہیں چھوڑا اور اسی عالمِ معذوری میں انھوں نے جو اتباعِ سنّت رسول فرمائی اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایسے عالم سنت نبوی کی اتباع گویا کہ ایک کرامت تھی جو مسلسل ان سے صادر ہو رہی تھی اور سب کا نصیبہ نہیں ہوتا۔

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ ان کا کرم ہے جسے دیوانہ بنالیں

☑☑☑☑☑☑

شیخ الاسلام حضرت علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی کی انفرادیت

مولای صل وسلم دائمًا ابدًا
علی حبیبك خیر الخلق کلّھِم

سیّدی استاذی الکریم امام النحو شارح بخاری حضرتِ اقدس بابرکت علامہ الحاج سیّد غلام جیلانی میرٹھی قدس سرہٗ العزیز کے فرزند نسبتی حضرت مولانا حافظ محمد ایوب اشرفی سنبھلی مقیم بولٹن انگلینڈ ۱۹ر دسمبر 2013ء کو صبح 10ر بجے میرے آفس یو پی اسٹیل مارٹ دوٹانکی ممبئی نمبر4 تشریف لاکر مجھے اپنی ملاقات کی عزت بخشی۔ موصوف سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ خود مجھے بھی ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا کہ ان کے نام اور کام کی خوشبو علمی، دینی و مذہبی حلقوں میں پہلے سے پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے میرے استاذِ کریم حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے علمی و دینی حیات و خدمات اور ان کے فضل وکمال اور عبقریت پر پندرہ سو صفحات پر مشتمل دو ضخیم و خوبصورت جلدوں میں ایک عظیم و تاریخی دستاویز علمی دنیا کے سامنے پیش کر کے ہم تلامذہ و اہلِ محبت کو ہمیشہ کے لیے احسان مند کرلیا ہے۔ اس تعلق سے توفیق ایزدی اور حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کی روحانیت اور دستگیری بھی ان کے ساتھ تھی اور ہے۔ انھوں نے اپنے وطن اصلی سنبھل ضلع مرادآباد یوپی میں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے کوئی محل تو نہیں بنا سکے مگر انھوں نے اپنے پدرِ نسبتی حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ کے قصرِ عظمت وجلالت کو علمی دنیا تک پہنچانے کی ایک کامیاب کوشش کی، جس کی خوشبو برصغیر ہند و پاک، یورپ، امریکہ افریقہ کے مذہبی، دینی و علمی حلقوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اللھم زد فزد۔ ع ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند۔ اس مرحلۂ شوق کو طے کرنے کے بعد انھوں نے شیخ الاسلام حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی کی عظیم وجلیل قرآنِ مجید کی تفسیر، تفسیر اشرفی جو ۱۰ جلدوں میں تقریباً چھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ حرفاً حرفاً اس کی پروف ریڈنگ کی، جو خود ایک بڑا ازہرہ گداز عمل ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ وہ تفسیر پوری تب وتابِ جاودانہ کے ساتھ چھپ کر منظر عام پر آبھی گئی اور بتدریج علمی حلقوں تک پہنچ بھی رہی ہے۔

اس کے بعد اب وہ اپنے مرشد بیعت و اجازت شیخ الاسلام حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی کی حیات و خدمات اور ان کے علمی، دینی، فکری اور تبلیغی خدمات پر ایک عظیم و مبسوط دستاویز منظر عام پر لانے کے لیے کمربستہ ہو چکے ہیں اور اس سلسلے میں وہ کافی پیشرفت بھی کر چکے ہیں۔ ہماری یہ ملاقات اسی سلسلے کی کڑی تھی جس میں انھوں نے حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں صاحب کے تعلق سے ایک مقالے کی فرمائش، وہ بھی ایسے وقت میں کی جبکہ میری دونوں آنکھوں میں موتیا اُترا آیا ہے اور مسلسل بیماری نے مجھے زیادہ دیر تک بیٹھنے کے لائق نہیں چھوڑا۔ چونکہ ان کا اصرارِ پیہم،، اخلاصِ

بے پایاں اور سوزِ دروں ایسا نہیں تھا جسے نظر انداز کیا جا سکے، اس لیے اپنی تمام معذوریوں اور مجبوریوں کے باوجود چند صفحات کے لیے وعدہ کرلیا۔ اس لیے سوغاتِ محبت میں اگر کہیں سے حسن نظر آئے تو یہ حضرت مولانا موصوف کے اخلاص کی برکتیں ہوں گی اور جو کمی نظر آئے وہ میری معذوریوں کے سبب۔ مولیٰ تعالیٰ ان کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے، انھیں نظر بد سے بچائے اور ان سے اپنے دین متین کا کام یوں ہی لیتا رہے آمین۔

شیخ الاسلام، مفسر قرآن، گلِ گلزارِ اشرفیت وگل باغِ نبوت، مبلغ دین وسنّیت حضرتِ اقدس بابرکت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی جانشین حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی برصغیر ہند کے ان چند اہم ترین اعاظم رجال میں سے ایک ایسے رجل رشید ہیں جن سے مجھ جیسے مشکل پسند وارث جمال قادری کو بھی ایک گونہ عقیدت ہے۔ ؎

زباں پہ بارِ الٰہا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

عزت وشہرت، احترام وعقیدت، عالمگیر مقبولیت و پذیرائی نے وقت سے پہلے ہی آپ کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ عظمتوں، رفعتوں اور بلندیوں نے ہر زمانے میں ملک و بیرونِ ملک میں آپ کا والہانہ اور تاریخی استقبال کیا اور آگے بڑھ کر قدمِ نازک کا بوسہ لیا۔ ؎

رفعتیں تیرے نام سے منسوب
عظمتوں نے تجھے سلام کیا

حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اس لیے بڑے نہیں ہیں کہ اب بڑے اور اعاظم رجال نہیں رہے جبکہ کچھ اشخاص و رجال کی بڑائیاں صرف کَبّرَنِی مَوْتُ الاکابر کی رہین منت ہیں اور بس! جبکہ آپ کے ساتھ ایسا ہرگز نہیں، بلکہ آپ اس وقت بھی نمایاں اور اخص المخصصین میں آپ کا شمار تھا۔ جب صف بہ صف اکابر و اساطین امّت اور جلیل القدر صف اوّل کے علماء ومشائخ موجود تھے۔

وہ اپنے اساتذہ وشیوخ و اکابر کی نگاہوں میں نہ صرف پسندیدہ بلکہ محترم تھے، اس لیے نہیں کہ وہ ایک سیّدزادے اور حضور محدثِ اعظم ہند کے فرزند ارجمند تھے اور ان کے جانشین تھے۔ بے شک ان کا یہ اضافی حسن بھی معمولی نہیں، بلکہ یہ حسنِ اضافی ان کے حسنِ ذاتی پر مستزاد ہے، جو انھیں اپنے علمی فضل وکمال، کردار وعمل، حسنِ تقویٰ وحسنِ اخلاق سے حاصل ہے۔ جس کے سبب آپ نے عوام وخواص کے دل ونگاہ میں محبوبیت کبریٰ حاصل کی اور آج برصغیر ہند و پاک، براعظم یورپ و امریکہ وافریقہ کے لاکھوں عوام وخواص کے مرکزِ عقیدت اور ان کے دلوں کی دھڑکن بن چکے ہیں۔ اور یہ محبوبیت کبریٰ انھیں آسانی سے حاصل نہیں ہوگئی۔ ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کی صاحب ہم نے
دردِ دل کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

معاصرین علماء ومشائخ کی تو بات ہی کیا! شباب کی ابتدائی دہلیز سے لے کر عمرِ طبعی کے اس پڑاؤ تک ہر زمانے میں وہ اپنے اکابر و بزرگ ترین علماء و مشائخ کے منظورِ نظر ہی نہیں بلکہ مرکزِ توجہ تھے۔ اتنے حسنِ ذاتی وحسنِ اضافی کے باوجود کبر و نخوت کا کوئی شائبہ نہیں۔ فکر و فن کی گیرائی اور علم کی گرمی کا کوئی مظاہرہ نہیں۔ ھُمْ رِجَالٌ فَنَحْنُ رِجَال کا کوئی دعویٰ نہیں۔ عمر کے ساتھ اپنے چھوٹوں پر شفقت، ان سے اخلاق ومحبت، تواضع وانکساری اور کریم النفسی کا ایک جہانِ حیرت لیے ہوئے۔ اپنے مخاطب کے لیے لب ولہجے میں اتنی نرمی، پاکیزگی، شائستگی اللہ اکبر! اپنے مخالفین وناقدین کے لیے بھی وہ نرم دم گفتگو اور بڑے شائستہ لب ہیں، کتنے ہی آہوئے رمیدہ اور غزالِ شوق ان کے نرم دمِ گفتگو کے اسیر ہوئے۔

تیرا کمال کہ پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں
غزالِ شوق کہاں کا رمیدہ ایسا تھا

کل ذی نِعمۃٍ مَحْسُوْدٌ کے مطابق آپ سے حسد بھی بہت زیادہ کیا گیا اور اس خصوص میں آپ تنہا نہیں۔ دنیا کے ہر اہم ترین شخصیت و رجال اس مرحلے سے گذرے ہیں جس کے لیے تاریخ کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ہر دور میں اہم ترین شخصیات کو حاسدین نے اپنے نشانے پر رکھا۔ اس کے لیے ایک منصوبہ بند طریقے سے آپ کی ذات کو پہلے متنازعہ بنایا گیا اور بڑے منفی انداز میں پروپیگنڈہ بھی کیا گیا جس کا کچھ قابلِ ذکر لوگ بھی شکار ہوئے۔

چنانچہ یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے ''قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید کے مصداق''

سرکار مجاہد ملّت حضرتِ اقدس علامہ الحاج الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی رئیس اڑیسہ سابق صدر آل انڈیا تبلیغ سیرو بانی دارالعلوم حبیبیہ الہ آباد یوپی کے وصال کے بعد ہی سے یہاں ممبئی میں مشہور بزرگ حضرت ٹوپی والے بابا صاحب جن کو حضور مجاہد ملّت کی ذات سے شدید وابستگی اور بے پناہ محبت تھی اور دونوں ایک دوسرے پر وارفتہ تھے اور باہم ایسا اخلاص نہ دیکھا گیا اور نہ ہی سنا۔

چنانچہ وہ بڑے تزک واحتشام سے ہر سال ممبئی میں عرسِ مجاہد ملّت کیا کرتے، قرآن خوانی، مولود خوانی اور زبردست لنگر عام کے ساتھ۔ مستان تالاب گراؤنڈ پر ایک بڑی تاریخی کانفرنس بھی کرتے جس کے مقررِ خصوصی حضرت مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں اشرفی جیلانی ہوا کرتے اور مہمانِ خصوصی بالالتزام رئیس الاتقیاء شیخ الاساتذہ، سند المحققین حضرت علامہ شاہ مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی صدر المدرسین مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر یوپی وخلیفۂ اعظم حضور مفتیٔ اعظم ہند و مصنف ''سوانح اعلیٰ حضرت امام احمد رضا'' ہوا کرتے۔ وہ حضرت ٹوپی والے بابا کے خصوصی مہمان ہوا کرتے تھے۔ حضرت مولانا عبدالقدوس کشمیری کی مسجد ہانڈی والی سیفی جوبلی اسٹریٹ ممبئی نمبر ۳ میں قیام پذیر ہوتے۔ مولانا کشمیری ان کی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہا کرتے تھے۔

میری (یعنی وارث جمال قادری کی) موجودگی میں ایک دن حضرت علامہ علیہ الرحمہ سے مسجد ہی میں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے، حضرت مولانا مدنی نے اعلیٰ حضرت کی شان میں بڑی گستاخی کی اور اپنے باپ کے ترجمۂ قرآن کو اعلیٰ

حضرت کے ترجمۂ کنز الایمان سے بہتر لکھا ہے۔ دورانِ گفتگو حضرت شیخ الاسلام کا ذکر کرتے وقت لب ولہجہ شائستہ نہیں رہ گیا۔ جس سے حضرتِ والا کو جلال آ گیا کہ مولانا کشمیری! یہ کس لب و لہجے میں آپ بات کر رہے ہیں توبہ کیجیے۔ یہ نہ بھولیے وہ سیّد زادے ہیں جن کا احترام واجب ہے۔ غالباً آپ ان کے اس مضمون کی بات کر رہے ہیں جو انھوں نے اپنے والد گرامی حضور محدثِ اعظم ہند کے ترجمے کے تعلق سے لکھا ہے جو المیزان کے امام احمد رضا نمبر میں شائع ہوا ہے، تو کیا آپ نے وہ مضمون پڑھا ہے؟ جس پر وہ خاموش رہے۔ فرمانے لگے اس کا مطلب کہ آپ نے وہ مضمون پڑھا ہی نہیں صرف کسی سے سنا ہے اور صرف سنی سنائی بات پر ایک آلِ رسول کا احترام بھی اٹھا دیا آپ نے۔ تو مجھ سے سنیے وہ مضمون میں نے بہت غور سے پڑھا ہے، اس کے کچھ حصے تو مجھے آج بھی یاد ہیں۔ وہ لکھتے ہیں آپ نے یعنی محدثِ اعظم ہند نے اپنا ترجمۂ قرآن اعلیٰ حضرت کے ترجمۂ قرآن کے بہت بعد میں کیا، اس لیے ترجمہ کرتے وقت اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ان کے سامنے تھا لہٰذا آپ کو اس کی معنوی خوبیوں کا اپنے ترجمہ میں سمونے کا موقع مل گیا۔

گویا وہ یعنی علامہ سیّد محمد مدنی میاں دوسرے معنوں میں بہ بانگ دہل یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اے لوگو! میرے والد ماجد کے ترجمہ قرآن میں جو بھی ہیرے، موتی، جواہر، زمرد، پکھراج نظر آئیں وہ سب ترجمۂ کنز الایمان کی دین اور اس کی برکتیں ہیں۔ اور آپ سنی سنائی باتوں پر ان کے تعلق سے یہ احساسات رکھتے ہیں جبکہ آپ ایک ذمہ دار آدمی ہیں۔ آپ جیسے شخص کو کسی اہم معاملے میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ پھر حضرت قبلہ، حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں صاحب اور ان کے علم وفضل پر گفتگو فرماتے رہے اور اس مقالے کو سراہتے رہے۔

میرے علم میں ان کے زمانے سے لے کر آج تک ان سے بڑا کوئی رضوی نہیں تھا۔ اپنے مرشد اعظم حضور مفتیٔ اعظم کے مرید مخلص اور خلیفۂ اعظم اور مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف کے سب سے بڑے وفادار اور رضویت کے سرخیل حضرت مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی جو حضرت علامہ مدنی میاں صاحب قبلہ سے کافی سینئر اور عمر میں کافی بڑے بھی تھے۔ برصغیر ہند و پاک کی تمام درسگاہوں میں جن کی دھمک اور زبردست درسگاہی شہرت تھی اور سوانح اعلیٰ حضرت کے مصنف کی حیثیت سے تو لاکھوں سنّی مسلمانوں کے دلوں میں ان کی زبردست عقیدت واحترام تھا اور ہے۔ یہ احساسات وجذبات تھے اپنے زمانے میں سب سے بڑے سنّی رضوی عالمِ دین کے حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں کے لیے، وہ بھی ایسے وقت میں جب ان کے خلاف منفی پروپیگنڈے کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس واقعے کا میں عینی شاہد ہوں۔ اب تو نہ حضرت علامہ بدر الدین صاحب قبلہ علیہ الرحمہ ہی ہیں اور مولانا کشمیری، دونوں اپنے رب کی جوارِ رحمت میں جاچکے ہیں۔ حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی کا نہ میں مرید نہ خلیفہ نہ وہ میرے استاذ ہیں، نہ استاذ زادے، نہ پیر ہیں نہ پیر زادے، نہ میں ان کا کسی طرح کا احسان مند!

زندگی کے اس طویل سفر میں میری ان سے ملاقات بھی چند بہت مختصر ولمحاتی ہیں جو منٹ پر تو مشتمل ہے گھنٹے پر نہیں۔ گفتگو کے اختتام پر یہ واضح کرتا چلوں کہ حضرت علامہ بدر الدین احمد قادری علیہ الرحمہ کی اس گفتگو کے بعد مولانا کشمیری صاحب نے حضرت سیّد مدنی میاں صاحب کے تعلق سے اپنی ندامت بھی پیش کیا اور اپنے سابقہ رویے پر حضرت قبلہ سے

معذرت بھی! اور پھر بڑے احترام سے وہ نام لینے لگے تھے۔

مناسب معلوم ہوتا کہ حضرت شیخ الاسلام کے اس مقالے کے وہ حصے یہاں پیش کردوں جس کی بنیاد پر آپ کو متنازعہ بنانے کا آغاز ہوا۔

"حضرت کے اس ترجمہ سے پہلے امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مبارک ترجمہ کنز الایمان ہمارے سامنے آچکا تھا، جس نے قرآن فہمی کے سارے باطل اسکولوں کی دھجیاں اُڑادی ہیں اور ملّت اسلامیہ پر ابرِ رحمت بن کر سایہ گستر رہا۔ لیکن ہمارے اس مجدد کی جملہ تصانیف کی طرح یہ ترجمہ بھی علماء کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا اور اس سے علماء ہی صحیح فائدہ اُٹھا سکے۔ میں نے حضرت کے ترجمے سے تقابل کرتے ہوئے جا بجا کنز الایمان کے ترجموں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے سمجھنے کے لیے کس قدر بالغ نگاہی کی ضرورت ہے۔ حضرت نے چونکہ امام احمد رضا کے ترجمہ کرنے کے بہت بعد ترجمہ فرمایا ہے اور ترجمہ فرماتے وقت ان کا ترجمہ آپ کے سامنے تھا لہٰذا آپ کو اس کی ساری معنوی خوبیوں کو اپنے ترجمہ کے اندر سمونے کا موقع مل گیا۔"

(محدثِ اعظم ہند اور تفسیر و ترجمہ قرآن از علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی بحوالہ ماہنامہ جامِ نور، محدثِ اعظم نمبر اپریل 2011ء ص: ۱۵۴)

حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی کا علم وفضل اور ان کے فکر وفن کا جمال وجلال، ان کی شخصیت کی دل پذیری ودلآویزی، ان کے حسن وسیرت کا جمال ودلکشی، ان کا اخلاق ومحبت، تواضع وانکساری کا اندازہ کرنا ہو تو چند ساعت ان کی مجلسِ علمی میں بیٹھ جائیے یا ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ان کی تحقیقاتِ علمی وفکری واعتقادی کا مطالعہ کرلیا جائے تو اندازہ ہوگا ایک مختصر وجود میں علم وفضل اور فکر وفن کا کتنا بڑا سمندر موجود ہے۔

فریضۂ دعوت وتبلیغ، دین کامل، اسلام کا تصورِ الٰہ اور مودودی صاحب، اسلام کا نظریہ عبادت اور مودودی صاحب، دین واقامت دین، ویڈیو اور ٹی وی کا شرعی استعمال، تعلیم دین وتصدیق جبرئیل امین، محبت رسول روحِ ایمان، انما الاعمال بالنیات، نظریہ ختمِ نبوت اور تحذیر الناس، مقالاتِ شیخ الاسلام، امام احمد رضا اور اردو تراجم کا تقابلی مطالعہ، سیّد التفاسیر معروف بہ تفسیر اشرفی پانچ ہزار سے زائد صفحات پر ۱۰ جلدوں میں وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام حقائق صادقہ کے باوجود ان کے اندر ایسی خاموشی اور منکسر المزاجی ہے گویا ع سینے میں قلزم لیے قطرہ کا قطرہ رہا۔ ایک زمانہ ایسا بھی تھا کہ آپ کے علمی خطاب کی بڑی دھوم تھی۔ علماء ومشائخ اور اربابِ علم ودانش کے وہ خصوصی خطیب ہوا کرتے تھے۔ ساداتِ کرام تو تاریخ کے ہر دور میں مظلوم رہے، جن کی مظلومیت سے ہر دور اور زمانے کی تاریخ بھری ہوئی ہے۔ ان کے ساتھ بھی کچھ کم نہیں ہوا۔ ؎

جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا التِيَامُ
وَلَا يلْتَامَ مَا جَرَحُ السان

کے مطابق زبان وقلم کے نیزوں سے اتنی اذیت دی گئی کہ وہ حالات سے برداشتہ خاطر ہو کر ایک طرح سے گوشہ گیر

ہوکر نایاب کی حد تک کمیاب ہوکر مزید گراں تر ہو گئے، ہم جیسوں کی پہنچ سے بھی بہت دور! ؎

ہم آج آئے ہیں زخمِ جگر دکھانے کو
فسانۂ دلِ دہشت زدہ سنانے کو

اب تو عوامی جلسوں کی بات ہی کیا، خصوصی اجلاس میں بھی نہیں شرکت فرماتے۔ اے کاش! آج بھی اگر ان کے نام کا اعلان ہو جائے تو ان کے دیدار کے لیے ہر طرف سے انسانی سیلاب امڈ پڑے گا۔

تقریباً ربع صدی پیشتر ان کے دو خطاب سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک کھیڑا میں جو بڑودہ (گجرات) کے پاس ایک جگہ ہے۔ وہاں ایک عظیم تاریخی کانفرنس ''محدثِ اعظم ہند کانفرنس'' منعقد ہوئی تھی۔ اتنی عظیم کانفرنس میں شرکت کا میرا پہلا اتفاق تھا اور انسانوں کا اتنا بڑا سیلاب بھی پہلی بار دیکھا تھا اور لاکھوں مسلمانوں کا ان سے عقیدت و احترام، شدید جذباتی وابستگی اور دیوانگیِ شوق کا عملی مظاہرہ بھی دیکھا! گویا زبانِ حال سے لاکھوں انسانوں کا یہ سیلاب کہہ رہا تھا۔ ؎

جتنی بھی میکدے میں ہے ساقی پلادے آج
ہم تشنہ کام زہد کے صحرا سے آئے ہیں

اس کانفرنس میں آپ نے ایک گھنٹہ خطاب فرمایا۔ سامعین پر سکوت کا ایسا عالم طاری تھی جیسے کہ وہ سانس روکے ہوئے آنکھوں سے سن رہے ہوں۔

اسی سے کچھ آگے پیچھے دوسرا تاریخی خطاب مستان تالاب ناگپاڑہ ممبئی نمبر 8 آل انڈیا تبلیغ سیرت کے تاریخی اجلاس عرسِ مجاہدِ ملّت میں حضرت ٹوپی والے بابا صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کی خصوصی دعوت پر تشریف لائے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام کو سننے کے لیے ممبئی و مضافات ممبئی کے علماء و مشائخ و ائمہ مساجد اپنے وجود سے اس تاریخی گراؤنڈ کو بھر دیا تھا۔ سامعین میں زیادہ یہی نظر آرہے تھے۔ وسیع و عریض اسٹیج پر تشریف لانے کے لیے بار بار اپیل پر بھی سامنے زمین پر فرش پر بیٹھے خواص اہلِ سنّت اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہوئے کہ انھیں خطاب کے ساتھ ان کا دیدار بھی کرنا تھا۔ ان کے خصوصی خطاب کا عنوان تھا نماز!

بے شک انھوں نے اس موضوع کا حق ادا کر دیا تھا۔ ان کے بعد اس موضوع پر ایسا کوئی خطاب نہیں سنا گیا۔ دورانِ خطاب مجمع کی خود فراموشی کا عالم یہ تھا کہ جسم کی ساری حسّیات گویا آنکھیں بن گئی ہوں اور کان سے کم آنکھوں سے زیادہ سن رہے تھے اس رات۔ ع کسی کی آنکھ کا جادو تیری زبان میں ہے، کا مشاہدہ کھلی ہوئی آنکھوں سے کیا جا رہا تھا۔ ؎

کچھ نقش تیری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویران نہیں ہے

کچھ کم و بیش ستائیس (۲۷) برس قبل ڈین ہاگ ہالینڈ سے شیخ الاسلام جانشین محدثِ اعظم ہند حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی کے پاس ایک استفتا آیا۔ جس میں تین سوالات تھے اور انھیں سوالوں میں ایک سوال

ویڈیواورٹی وی کے استعمال کے تعلق سے بھی تھا۔حضرت علامہ موصوف نے اپنے مبلغ علم،فہم وادراک اوراپنی تحقیق کے مطابق ایک تاریخی جواب قلمبند فرمایا، پھرا سے ملک وبیرونِ ملک کے اہم ترین دارالافتاء اورقابلِ ذکر علمی ودینی شخصیات رجال کی خدمتوں میں تصحیح وتائید یااصلاح فکرونظر کے خیال سے بھیجا۔

ابتداًجن قابلِ ذکر شخصیتوں اورمفتیانِ کرام نے حضرت علامہ مدنی میاں کے فتووں کی تائید وتصدیق کی،وہ یہ ہیں۔

(1) آبروئے دین وسنّیت،غزالی دوراں حضرت علامہ سیّد سعید احمد کاظمی علیہ الرحمہ پاکستان۔

(2) فقیہ عصر شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور۔

(3) حضرت علامہ مفتی عزیزالرحمٰن صاحب دارالعلوم شاہ عالم احمدآباد، گجرات۔

(4) حضرت علامہ مفتی شفیق احمد شریفی دارالعلوم غریب نوازالہ آباد یوپی۔

(5) حضرت علامہ مفتی عبدالواحد صاحب ادارہ شرعیہ پٹنہ (بہار)

ان میں اوّل الذکر شخصیت یعنی حضرتِ اقدس علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نے تصدیق وتصویب کے علاوہ ایک بڑامسرت بخش وحوصلہ افزادعانامہ بھی ارسال فرمایااورساتھ ہی رئیس المحققین کاخطاب بھی!

حضورِ والاکے ارشاداتِ عالیہ یہ ہیں:

’’میں ہرسہ فتاویٰ میں آپ سے متفق ہوں، بالخصوص ویڈیو وٹی وی کے بارے میں جس عرق ریزی سے جناب نے تحریر فرمائی اور پھرجس خوبصورتی سے ان حقائق کی روشنی میں جائز وناجائزصورتوں میں امتیاز کرتے ہوئے فتویٰ قلمبند فرمایا ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔‘‘

انہی دنوں مرکزی دارالافتاء بریلی شریف سے اسی موضوع پر ایک احتسابی تحریر علامہ سیّد محمد مدنی میاں صاحب کو دستیاب ہوئی۔جس میں بقول علامہ مدنی میاں، فقیہانہ اسلوبِ بیان وعالمانہ طرزِنگارش کے بجائے مجادلانہ ومعاندانہ رنگ زیادہ تھے۔سوالات جو بھی تھی، نگارشات جیسی بھی تھیں، اسلوبِ بیان جتنا بھی صبرآزما ہو، جواب بہرحال علامہ سیّد مدنی میاں صاحب نے لکھ لیے تھے۔مگراسے ابھی حضرت علامہ ازہری صاحب کی خدمت میں بھیجا نہیں تھا۔انھیں اوروں کے جوابات کابھی انتظار تھا کہ وہ بھی آجائیں تاکہ نفی واثبات کی صورت میں شرح وبسط کے ساتھ گفتگو مکمل کرکے متعلقہ افراد کی خدمت میں بھیجا جائے،خاص کرمرکزی دارالافتاء بریلی شریف کو! جس میں قدرے تاخیر ہوئی۔غالباًاتنی تاخیر کوحضرت علامہ اختر رضا ازہری صاحب نے دین میں حرج سمجھااوروہ علامہ مدنی میاں صاحب کے جوابات کازیادہ انتظار نہ کرسکے اور پوری بحث کوعوام وخواص کے سامنے لے آئے جبکہ حضرت علامہ مدنی میاں کی طرف سے اس تعلق سے ان کی کوئی تحقیق نہ چھپی تھی اورنہ منظر عام پرآئی تھی۔

صالح قدروں کے زوال اورمسلم معاشرہ کے ابتذال واخلاقی گراوٹ کے پیشِ نظریہ مسائل ایسے نہیں تھے کہ اسے منظر عام پرلایاجائے اورخواص کے ساتھ عوام کی نظروں میں بھی آتے۔بحث مکمل ہوئے بغیراس موضوع کوعلماء دین و

اربابِ علم وفضل کے دائرے سے باہر آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ بحث کے نتیجے وعلیہ الفتویٰ کو عوام کے سامنے لانے کے بجائے پوری بحث ہی عوام کے سامنے لے آیا گیا۔

پہلی بار حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں ازہری صاحب کی زیر نگرانی نکلنے والے ماہنامہ سنّی دنیا بریلی شریف کے شمارہ نومبر ۱۹۸۵ء، دسمبر ۱۹۸۵ء اور جنوری ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں حضرت علامہ ازہری صاحب کے جوابات چھپے۔

ہم جیسے نامحرموں کو بھی یہ اطلاع سنّی دنیا ہی سے ہوئی کہ اس طرح کا کوئی موضوع بھی علماء دین ومفتیانِ شرع متین کے درمیان زیر بحث ہے، فَیَا لِلعَجَب!

بہرحال پہلی بار یہ نازک موضوع خواص کی مجلسِ خاص سے نکل کر عوام تک آیا۔ پھر تو پوسٹر و ہینڈ بل اور ماہناموں کے ذریعے ایک معرکۂ خاص کا آغاز ہوا۔ اور اس تعلق سے ایک سلسلۂ نامحمود چل پڑا۔ حالات کی نزاکتوں کے پیشِ نظر بالآخر حضرت شیخ الاسلام رئیس المحققین حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی صاحب نے بائیس (۲۲) ابواب پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بنام ویڈیو اور ٹی وی کا شرعی استعمال لکھی جو ابتدا ہی سے مسئلے کی تنقیح اور اس وقت کے تمام جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ نفسِ موضوع پر تکنیکی، تنقیحی، شرعی اور تفصیلی گفتگو کے علاوہ تین سو پندرہ (۳۱۵) صفحات پر مشتمل اس کتاب کا بڑا حسن اس کا فقیہانہ اسلوب تھا، جو ادب، تہذیب، شائستگی، متانت وسنجیدگی، دلنشینی ودلپذیری اور شرافت نفس کی ایک شاندار روایت لیے ہوئے تھا۔ مقامِ اختلاف میں اپنے مدِّ مقابل کے لیے اس کے خاندانی علمی وجاہتوں اور ذاتی فضل وکمال کی تمازت کو مدھم نہ ہونے دینا، اس دورِ نفسا نفسی میں ایک تاریخی قابلِ تقلید مثال ہے جو خاندانِ نبوت کے شایانِ شان بھی ہے۔ اس عظیم وتاریخی وعلمی کارنامے پر یہاں ہندوستان میں اعزاز واکرام، تحسین ومرحبا کے بجائے ان کے پاکیزہ اور مقدس وبابرکت وجود کو ہدفِ ملامت بنایا گیا۔

حالانکہ آج اسلامی چینلوں پر خاص کر کیو ٹی وی اور مدنی چینل کے ذریعے اسلام کی ترویج واشاعت اور دین وسنّیت کی جو عالمگیر اور بے حد مؤثر تبلیغ ہو رہی اور علماء ومشائخ اہلِ سنّت ومفتیانِ دین متین جو بے جھجک و بے خوف اسلامی چینلوں پر جو دین کی خدمت کر رہے ہیں اس کی حیرت انگیز اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔ آج بدمذہبیت ان چینلوں کی مقبولیت اور اس کی عالمگیر اثر پذیری سے نہ صرف حیران و پریشان بلکہ خوف زدہ ہے۔ اور یہ سب عطا ہے، فیضان ہے، دین ہے اس عظیم وتاریخی فتوے اور کتابِ مستطاب ''ویڈیو اور ٹی وی کا شرعی استعمال'' کا جو شیخ الاسلام رئیس المحققین حضرت علامہ مفتی سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی ربع صدی سے زائد اس تاریخی، علمی وفکری جرأتِ اظہار کا! جس کے سبب آپ کو سنگسار کرنے کی کوشش کی گئی، آپ کا خاندانی وقار مجروح کیا گیا، آپ کے خلاف ایک طوفان کر دیا گیا اور حالات کو سنگین بنا کر وقت کے ہر لمحے کے ہاتھ میں اتنی سنگ بے حسی پکڑا دی گئی کہ ہم جیسے قلندر کو اس موضوع پر زبان کھولنے کے لیے بارہ برس سے زیادہ عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ اس زمانے میں احترامِ سادات اٹھا دیا گیا، خاندانِ نبوت کی بے توقیری عام کر دی گئی۔

انھیں بھی توڑ لیا اب کے گل فروشوں نے
وہ پھول جن کو بہاروں کی آبرو کہیے

وقت کی برہمی کے آگے اچھے اچھوں کا زہرہ آب تھا۔ جانبداری اور غالب کی طرفداری کے الزام کے خوف سے بڑی شخصیتیں بھی مہر بہ لب تھیں گویا۔

آج ہر لمحے کے ہاتھوں میں سنگ بے حسی
اپنا غم کہنے سے پہلے دیر تک سوچا کیے

چنانچہ اپنا غم اور اپنا درد ظاہر کرنے کے ان لمحوں کے انتظار میں مجھے بارہ برس لگ گئے کہ جن لمحوں میں معقول وغیر جانبدار صداقتوں کی پذیرائی ہو سکے۔ کہ اسی اثنا (یعنی پندرہ برس پہلے) ''مملکت خداداد'' سے حضرت مولانا سیّد صابر حسین شاہ بخاری صاحب کی ایک کتاب ''احترامِ سادات اور امام احمد رضا بریلوی'' مجھ تک پہنچائی گئی، جو اس وقت کے حالات کے لیے سوکھے دھانوں پر ابرِ کرم کے مترادف تھا۔ میں نے ایک نشست میں پوری کتاب پڑھ لی۔ کتاب پڑھ کر مجھے بے حد مسرت ہوئی، سیّد موصوف کے لیے دل سے دعائیں نکلیں! اور اسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا کہ یہ کتاب علماء اہلِ سنّت تک بڑی تعداد میں پہنچانی ہے۔ چنانچہ اسی وقت قلم برداشتہ چوالیس (۴۴) صفحات پر ایک طویل وتاریخی مقدمہ بہ عنوان

تومرا اخراب کردی بایں سجدہ ریائی

لکھ کر کتاب کو حضور مجاہد ملّت کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے کثیر تعداد میں چھپوا کر علماء دین وارباب علم و دانش تک تحفۃً پہنچایا۔ اسے صرف علمی حلقوں ہی تک محدود رکھا کہ سارے ابخرات انھیں کے اندر تھے۔ عوام اہلِ سنّت تو صرف حیران وشکستہ دل تھے البتہ ساداتِ کرام کی بے حرمتی وبے توقیری پر ملول خاطر!۔

شیشۂ دل شکستہ آنکھیں نم
جی رہے ہیں کس اہتمام سے ہم

مولیٰ عزوجل کا کروڑوں احسان کہ اس نے میرے اخلاص وجذبے کو بڑے اندازِ میں پذیرائی بخشی۔ ماحول پُرسکون وخوشگوار ہوا اور احترامِ سادات پھر سے بحال ہوا۔ اور خواص اہلِ سنّت وجماعت کے دلوں میں حضرت علامہ سیّد مدنی میاں صاحب کے لیے درد جاگے۔ پس سلام ہو حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں کی تاریخی وعلمی جرأت کو، سلام ان کے تاریخی صبر واستقامت کو اور سلام ان کے اس عظیم گوشہ گیری کو جس کی کوکھ سے جلدوں میں تقریباً چھ ہزار صفحات پر مشتمل 'تفسیر اشرفی' ہے جس سے اہلِ علم کی آنکھیں ٹھنڈی، روح سرشار اور ایمان نئی لذتوں سے آشنا ہوا۔

کٹی رات حرف و حکایات میں
سحر ہوگئی بات کی بات میں

☑☑☑☑☑☑

سیّدالمشائخ حضرت وامق بریلوی

اگر ہستی سراسر باد گیرد
چراغ مقبلاں ہرگز نہ میرد

ہر دور اور ہر زمانے کی تذکرہ و تاریخ میں دو طرح کی شخصیتیں ملتی ہیں، ایک وہ جو اس جہانِ رنگ و بو میں عظمتیں لے کر پیدا ہوئیں۔ جن کے لیے یوں فرمایا گیا مَنْ سَعَدَ سَعَدَ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ ۔ اور دوسری وہ جنھوں نے اس جہانِ خاکی میں عظمتیں خود کسب کیں اور اس راہِ محبت میں انھوں نے جانے کتنے پتھروں کا جگر پانی، کتنے درد کے صحرا کو عبور اور کتنے آگ کے دریا کو ڈوب کر پار کیا، تب جا کر وہ کہیں اپنے رب کی بارگاہ میں سرخرو و سرفراز ہوئے ؎

جلیل آسان نہیں آباد کرنا گھر محبت کا
یہ ان کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

اور جب بندے کو مولیٰ نے آزمالیا کہ میرے بندے نے میرے قرب، میری محبت اور میری رضا کے حصول کے لیے اپنے نفس کو میری رضا کے قربان گاہ پر چڑھا رکھا ہے تو وہ خوش ہو کر اس بندے پر اپنے فضل و عطا و رحمتوں کے دروازے کھول کر اسے اپنا خاص و مقرب بندہ بنا لیتا ہے، جیسا کہ حدیث قدسی لا یزال عِبادِیْ یَتَقرّب اِلَیَّ بِاالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَحبَبْتُہٗ الخ شاہد ہے۔ پھر تو اس طرح کی کسبی عظمتوں میں وہبی کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

ذالك فضل الله مَنْ یشاء بغیر حساب ۔ ع ان کے رتبے ہیں سوا۔ ان کے سوا مشکل ہے۔ یوں تو حافظ رحمت علی خاں روہیلہ سردار کا روہیل کھنڈ چھ اضلاع پر مشتمل ہے۔ بریلی، مرادآباد، رام پور، پیلی بھیت، شاہ جہاں پور، بدایوں، ان میں ہر ایک کی شہرت و عظمت اپنی جگہ مسلّم! انہیں چھ شہروں میں ایک شہر جو دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ جو نہ صرف ضلع بلکہ کمشنری بھی ہے اور پورے ضلع کا صدر مقام بھی۔ جو پہلے بانس بریلی کہلایا، پھر صرف بریلی، پھر اور آگے چل کر نہ صرف پورے عالمِ اسلام بلکہ دنیا کے کئی براعظموں میں بریلی شریف سے مشہور و معروف ہوا۔ اور اب تو بغیر لفظ شریف کے بریلی ادھورا سا لگتا ہے۔

بریلی شریف جس کی شہرت و عظمت، شرف و بزرگی کے کئی اسباب و وجوہ ہیں۔ جس کی سب سے بڑی وجہ سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی چند قدآور و بلند قامت شخصیات و رجال کا اس شہرِ محبت میں پیدا ہونا اور اسی میں آسودۂ خاک ہونا بھی ہے۔

جن کی عاقلی، دانائی، فرزانگی، علم و فضل، فکر و فن اور فراستِ مومن کا آوازہ دور دور تک بلند ہوا۔ اور اس شہرِ محبت کی فراستِ مومن کو ایک حقیقت صادقہ کی شکل میں دنیا نے پذیرائی بھی خوب کی۔ یہ وہی شہر ہے جس میں قطب شہر حضرت سیّد

جلال الدین عرف شاہ دانا ولی ۱۳۱۷ھ مطابق ۱۳۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں حضرت شاہ نیاز بریلوی کی روحانیت کا آفتاب چمکا، جس کی کرنیں دور بہت دور تک پہنچیں۔ اور اسی شہر محبت میں ایک اور نام جو اپنی کمیت وکیفیت وانفرادیت میں ایک کافی بڑا نام اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مجدد دِین وملّت شاہ احمد رضا خاں بریلوی کا بھی، جن کے نام کی برکت سے بریلی شریف کا نام چہار دانگ عالم میں گونجا۔ جن کے عشق ووفا کی خوشبو نے دنیا کے سارے براعظموں کو اپنے لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ ع کوچے کوچے میں مہکتی ہے یہاں بوئے قمیص۔

اسی شہر محبت سے وابستہ ایک اور بڑا نام شیخ الانام حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا خاں اور ان کے برادرِ عزیز مفتیٔ اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں کا بھی ہے۔

انہیں اصحابِ فضل وکمال اور اربابِ عشق وعرفان وصاحبانِ دین ودانش کے درمیان ایک اور بڑا نام جس نے بریلی شریف کی شرف وعظمت وانفرادیت کو چار چاند لگائے۔ جس کی ذاتِ والاصفات اس وقت ہمارا عنوانِ سخن ہے۔ حضرتِ اقدس بابرکت علامہ سیّد فدا علی وامق بریلوی کی ہے جو نہ صرف علم وفضل، فکر وفن بلکہ روحانیت کے بھی تاجدار ہیں۔ بزمِ سادات میں وہ نجیب الطرفین سیّد ہیں یعنی حسنی وحسینی! جس کی طرف امامِ عشق ومحبت بارگاہِ غوثیت کبریٰ میں عرض گذار ہیں۔ ؎

تو حسینی حسنی کیوں نہ محی الدین ہو
اے خضر مجمع بحرین ہے چشمہ تیرا

یعنی حسنی وحسینی ہونا نہ صرف شرف ومجد بلکہ ساداتِ کرام کے مقدس ہجوم میں ایک بڑی انفرادیت بھی ہے۔ والد ماجد کی طرف سے ۳۳ واسطوں سے آپ کا سلسلۂ نسب حضور سیّدنا غوث الاعظم تک پہنچتا ہے اور والدہ ماجدہ کی طرف سے ۴۰ واسطوں سے۔ بے شک یہ فضل وشرف سادات ہے جو اللہ عزوجل اپنے کروڑوں بندوں میں کسی کسی کو عطا فرماتا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
نہ بخشد خدائے بخشندہ

حضرت علامہ سیّد وامق علی بریلوی علیہ الرحمہ کی ولادت ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں ہوئی اور وصال ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۵ء میں بریلی شریف میں ہوئی اور تدفین خانقاہِ وامقیہ نشاطیہ اشرفیہ (جو قلب شہر حضرت شاہ دانا کی خانقاہ کے قریب ہی ہے) میں تدفین ہوئی۔ آپ کے معاصرین میں اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت، استاذِ زمن علامہ حسن رضا خاں بریلوی، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں بریلوی، حضرت علامہ وصی احمد محدث سورتی، مولانا عبدالحیٔ لکھنوی فرنگی محلی، مولانا عبدالحق ابن علامہ فضل حق خیر آبادی وغیرہ جیسی یکتائے روزگار شخصیتیں تھیں، جن کی یکتائی وبے نظیری کا غلغلہ ہر چہار جانب تھا۔

آپ کے پیر ومرشد مجدد سلسلہ اشرفیہ ہم شبیہ غوثِ جیلاں شیخ المشائخ حضرتِ اقدس سراپا خیر وبرکت شیخ طریقت، حضرت شاہ علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی تھے، جو اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کے پیر ومرشد حضرت سیّد آلِ رسول مارہروی

کے آخری خلیفۂ اجازت وخلافت تھے۔ سلطان الاولیاء حضرت خواجہ نظام الدین کی بارگاہ میں جنھیں دیکھ کر وقت کے مجدد و امام سیّدنا امام احمد رضا بریلوی پکار اٹھے ؎

اشرفی اے رخت آئینہ حسنِ خوباں
اے نظر کردۂ پروردۂ سہ محبوباں

اسی 'آئینۂ حسنِ خوباں' نے حضرت علامہ وامق بریلوی کو بریلی شریف ہی میں ایک مجلس خاص میں ان کے اندر حضور سیّدنا غوث اعظم کی خوشبو محسوس فرما کر قریب بلایا اور اپنے دست اقدس پر ان کی بیعت لے کر اسی وقت خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا۔ والد گرامی حضرت علامہ سیّد مردان شاہ قادری سے سلسلۂ عالیہ قادریہ میں اجازت وخلافت تھی۔ اس طرح سے یہ سلسلۂ طریقت قادری وچشتی کا ایک خوبصورت سنگم بن گیا۔

حضور اشرفی میاں علیہ الرحمہ کی خلافت واجازت کے حوالے سے آپ اس سلسلۃ الذہب میں داخل ہیں جس میں حضور صدر الافاضل فخر الاماثل سیّد المفسرین امام الہند علامہ سیّد محمد نعیم الدین مرادآبادی، شیخ العرب والعجم قطب مدینہ خلیفۂ اعلیٰ حضرت، حضرت ضیاؤ الدین مہاجر مدنی، مبلغ اسلام حضرت علامہ عبد العلیم صدیق میرٹھی مدنی خلیفۂ اعلیٰ حضرت بریلوی، شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا بریلوی، سرکار مجاہد ملّت حضرت علامہ مفتی حبیب الرحمٰن قادری عباسی رئیس اعظم اڑیسہ وسابق صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، شارح بخاری امام النحو استاذی الکریم حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی محدث میرٹھی، حکیم الامت حضرت علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی، مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت علامہ سیّد ابو البرکات اشرفی، حضرت علامہ مفتی عبد الرشید اشرفی ناگپوری، مناظر اعظم حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین اشرفی وغیرہ۔

آپ اپنے زمانے میں سرخیل علماء تھے، بیسیوں علوم وفنون پر دسترس حاصل تھا۔ پانچ زبانوں پر مہارت تھی۔ عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، آپ ایک صاحبِ دیوان شاعر بھی تھے اور اس صنف میں بھی آپ کی امامت وسیادت مسلّم تھی۔

کہا جاتا ہے کہ علم وفضل ونازک خیالی (یعنی شاعری) ایک جگہ بہت ہی کم جمع ہوتی ہے، مگر آپ کی ذات میں یہ دونوں صفتیں پورے کمال کے ساتھ موجود تھیں۔ جہاں ایک طرف آپ ایک زبردست عالمِ دین، مترجم قرآن، مفسر قرآن، وہیں بلند پایہ صفِ اوّل کے شاعر بھی تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے، دونوں زبانوں میں سلاست و روانی اور صنائع وبدائع کا برجستہ استعمال۔ ع

"تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں" کے مترادف

فارسی زبان میں اپنا تخلص زایر اور اردو زبان میں وامق اختیار فرمایا اور یہ وامق تخلص تو ایک طرح سے آپ کے نام کا علم ہو کر رہ گیا کہ حضرت علامہ سیّد فدا علی بریلوی بغیر وامق بریلوی کے سمجھ میں نہیں آئیں گے۔

آپ کی شاعری کا تمام تر سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔ آپ نے اپنی شاعری کو مجازی وروایت محبوب کے لب و رخسار، ابرو ومژگاں، زلف وکاکل سے ہرگز آلودہ نہیں کیا بلکہ آپ کی شاعری کا دائرہ صرف اور صرف حضور سرورِ کائنات،

محبوبِ کائنات، آقائے کائنات، روحِ کائنات، اصلِ کائنات، وجہِ کائنات حضور سیّدنا محمد عربی صلی المولیٰ تعالیٰ علیہ وسلم کے گرد ہی گھومتا ہے۔ ؎

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہاں کی جان ہے تو جہان ہے

اس لیے آپ نے اپنے نعتیہ دیوان کا نام ہی ''توصیف سرکارِ عرب'' رکھا گویا کہ آپ کی شاعری کا اوّل و آخر مقصد امامِ اہلِ سنّت کی زبان میں ؎

ثنائے سرکار ہے وظیفہ قبول سرکار ہے تمنا
نہ شاعری کی ہوس نہ پرواروی تھی کیا کیسے قافیے تھے

تین سو نعتوں پر مشتمل یہ دیوان جس میں اچھی خاصی تعداد طویل طویل نعتوں کی بھی ہے جس کا ہر شعر عشق رسول میں ڈوبا اور محبت رسول میں سرشار!

اس دیوان کی ایک حیرت انگیز انفرادیت یہ بھی ہے کہ اس پورے دیوان میں کہیں بھی اسمِ رسالت پاک نہیں پائیں گے۔ شاید نہیں بلکہ اس کا اتہام والتزام اس لیے کیا گیا ہے کہ کہیں بے وضو یہ نام پاک زبان پر نہ آجائے۔ ؎

ہزار ہا بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

خاکِ بریلی تیری عظمت کو سلام! کہ تیری مٹی ہی عشق رسول کے خمیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ تحقیقی سوانح جو آپ کے ہاتھ میں ہے ایک ایسے عظیم محقق کی ہے جو بہت پہلے ہی اپنے تحقیقی کارناموں کی بدولت اجالوں میں آگئے ہیں اور حلقۂ علم و ادب نے بڑے احترام سے ان کی پذیرائی کی جو نہ صرف ایک جید عالم، زبردست انشاء پرداز، مایۂ ناز خطیب بھی اور محقق دوراں ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کے تحقیقی قلم نے علم و ادب کے کئی گل بوٹے سجائے ہیں۔

(۱) امام احمد رضا خاں کی عربی زبان و ادب ریسرچ و تحقیق صفحات ۳۱۰، اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری۔
(۲) المتقی المجمود من ادب المسعو د
(۳) المحادثۃ العربیہ
(۴) ثنائے مصطفےٰ اشرف انبیاء۔
(۵) امام احمد رضا خاں کی عربی شاعری۔
(۶) امام احمد رضا خاں کی فارسی شاعری
(۷) امام احمد رضا اور سائنس

ان کے علاوہ محترم علامہ ڈاکٹر محمود حسین بریلوی صدر شعبہ عربی بریلی کالج، بریلی کے پچاس سے زائد علمی و تحقیقی مقالات

زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں، جس کی اربابِ علم و دانش و اصحابِ ذوق و ادب نے خوب خوب پذیرائی بھی کی ہے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے راد و رسَن کہاں

اور اب یہ کتاب ''سوانح والا جاہ مولوی فدا علی وامق رحمۃ اللہ علیہ'' ۱۴۳۵ھ
اسی نامور محقق کا ایک اور تحقیقی شاہکار ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی نام آور محقق جب کسی شخصیت کو اپنا موضوع بنائے تو وہ شخصیت بھی تو غیر معمولی ہوگی۔

شخصیت بھی بریلی کی، محقق بھی بریلی کا، خانقاہِ وامقیہ نشاطیہ اشرفیہ بھی بریلی میں! صاحبِ کتاب جنھیں صَاحِبُ الْبَیْتِ یَدْرِیْ مَا فِی الْبَیْتِ کی منزلِ آگہی بھی حاصل ہے، کتنے حسنِ اتفاق اکٹھا ہو گئے۔ اس پر حضرت علامہ کا حسنِ ترتیب اتنی چشم کشا اور قابلِ تقلید ہے کہ ع تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں۔

فجزاھم اللہ اَحسن اجزاء۔

مولیٰ تعالیٰ ان کا سایہ اہلِ سنّت و جماعت کے سروں پر تادیر سلامت اور انھیں آفاتِ روزگار سے محفوظ و مامون!

بڑی ناشکری و ناسپاسی ہوگی کہ ایسے قیمتی و تاریخی موقع پر خانقاہِ وامقیہ اشرفیہ کے جواں سال ولی عہد و جانشین، پیرِ طریقت بابرکت سراپا اخلاق و اخلاص، کشادہ دست، کشادہ قلب حضرت سیّد محمد اسلم میاں صاحب قبلہ قادری چشتی نظامی وامقی بریلوی مدظلہ العالی کے حسنِ خدمات کا شکریہ نہ ادا کریں، جن کی کاوشوں سے یہ تحقیقی سوانح منظرِ عام پر آ رہی ہے۔ بے شک اس کے لیے وہ پورے حلقہ اشرفیہ وامقیہ کی دعاؤں، مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں اور اب تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اپنی خانقاہِ معلیٰ کو اس نہج پر لانے جا رہے ہیں جسے دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکل جائے، ؎

خوشا مسجد، مدرسہ، خانقاہے
کہ دروے بود قیل و قال محمد

اور اگر ہوا، اور ایسا ہی ہوگا ان شاء اللہ المولیٰ تعالیٰ تو ان بزرگوں کی روحانیت ان کے عزائم کی تکمیل میں دستگیری ضرور فرمائے گی۔ بے شک یہ کام بڑا بھی ہے اور مشکل بھی! مگر ؎

مشکلے نیست کہ آساں نہ شود
مرد باید کہ ہراساں نہ شود

اب ہم آپ کے اور تحقیقی سوانح کے درمیان دیر تک حائل نہیں رہنا چاہیے لیجیے اسے آنکھوں سے لگائیے، دل و نگاہ میں بسائیے، مصنف علام اور ناشر دونوں کو دعائیں دیجیے۔

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ وھو حسبی ونعم الوکیل نِعْمَ المولیٰ ونعم

☑☑☑☑☑☑

فقیہ ملّت حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد امجدی

مَنَّ عَلَیۡنَا رَبَّنَا اِذۡ بَعَثَ مُحَمَّدًا　　　　اَیَّدَہٗ بِاَیۡدِہٖ اَیِّدۡنَا بِاَحۡمَدًا
اَرۡسَلَہٗ مُبَشِّرًا اَرۡسَلَہٗ مُمَجِّدًا　　　　صَلُّوۡا عَلَیۡہِ دَائِمًا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ سَرۡمَدًا

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں! میں اسی لیے ہوں نمازی

اپنے اپنے دور میں ائمہ علم وفن نے علمِ فقہ کی جوتعریفیں کی ہیں وہ سب سر آنکھوں پر! مگر برصغیر ہند کے علی الاطلاق فقیہ اعظم اور فخرِ اعظم، رشکِ عرب حضرت سیّدنا امام اعظم ابوحنیفہ کے نائب اکبر! اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت، مجدد دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی نے جوفقہ کی تعریف کی ہے وہ تمام تعریفات کا عطرِ مجموعہ! امام اہلِ سنّت کے الفاظ میں ’’مقاصد شریعت کے ادراک کا نام فقہ ہے۔‘‘

یعنی شریعت ہم سے کیا چاہتی ہے؟ اس کا ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ اسی کے جاننے کا نام فقہ ہے اور اس کا جاننے والا فقیہ! یوں ہی فتوے پوچھنے والے کو مستفتی، جواب دینے والے کو مفتی اور نفسِ جواب کو فتویٰ کہا جاتا ہے۔ فقہ، فقیہ، تفقہ، فقاہت یہ الفاظ جب نظروں سے گذرتے ہیں یا دورانِ گفتگو ان کا استعمال عمل میں آتا ہے تو اس کے پس منظر میں ماضی قریب کی تین اہم ترین شخصیات ورجال کا محسوس پیکر دل ودماغ کو مسخر اور فکر ونظر کو معطر کرتا چلا جاتا ہے۔

(۱) یادگارِ سلف، حجۃ الخلف، استاذ العلماء، استاذ نا الکریم حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ علیہ الرحمہ اعظمی مبارکپوری سابق شیخ الحدیث الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، صاحبِ فتاویٰ بحر العلوم، (چھ ضخیم جلدوں میں)

(۲) مرجع الفقہا، فقیہ النفس، شارح بخاری، نائب مفتیٔ اعظم ہند حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ سابق صدر مرکزی دار الافتاء الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور اعظم گڑھ یوپی، انڈیا۔

(۳) صاحبِ تصانیف کثیرہ، فخر الاساتذہ، ممتاز الفقہا، فقیہ ملّت حضرت علامہ الحاج مفتی جلال الدین احمد امجدی بستوی علیہ الرحمہ سابق مفتی فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر یوپی وبانی مرکز تربیت افتاء وبانی دار العلوم امجدیہ ارشد العلوم اوجھا گنج ضلع بستی یوپی۔

اس وقت ہماری گفتگو کا مرکز یہی تیسری اور آخری شخصیت حضرت ’’فقیہ ملّت‘‘ کی ذاتِ والاصفات ہے اور یہ پاکیزہ لقب تو ایک طرح سے آپ کے نام کا علم ہوکر رہ گیا ہے، یعنی علمی، دینی، مذہبی حلقوں میں بطور تذکرہ یا حوالہ اگر صرف حضرت ’’فقیہ ملّت‘‘ ہی کہہ دیا جائے تو اس سے مراد آپ کی ذاتِ ستودہ صفات ہی ہوگی فلحمد اللہ علی ذالك۔ ع

کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

قبل ازیں! آپ کی ہمہ جہت شخصیت پر ہم اپنی گفتگو آگے بڑھائیں

ایک عظیم ترین علمی، دینی، فکری شخصیت کے احساسات وجذبات سے آگاہ کرتا چلوں۔ جو اپنے علمی، فکری اور جماعتی ترکتازیوں اور سحر انگیز قلم کے حوالے سے پوری دنیا میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔ جہاں پہنچا دین وسنّیت کے قلعے کے قلعے تعمیر کرا دیے اور ہر طرف دھوم مچا دی۔ دنیا کے کئی براعظم میں جس کے کارناموں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے، جو اپنے بزرگوں اور سر پرستوں کی بارگاہ کا معتمد علیہ! اور سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے لیے نشانِ نصرت تھا۔ بڑے بڑے معاصر علماء اہلِ سنّت جس کی حاضر دماغی پر حیران! اور مخالفین دم بخود! اپنے تو الگ رہے غیروں کے لیے بھی ع مستند تھا اس کا فرمایا ہوا۔

خصوصاً میدانِ مناظرہ میں تو اس کی یکتائی و بے نظیری مسلم تھی۔ یعنی رئیس القلم، سلطان المناظرین، استاذ الاساتذہ، بانی مدارسِ کثیرہ حضرت علامہ ارشد القادری فاتح جمشید پور، بہار جو حقیقت میں ع قلم گوید کہ من سلطان جہانم! کا محسوس پیکر تھے، جو حسنِ اتفاق سے حضرت ''فقیہ ملّت'' کے بڑے کرم فرما، شفیق اور محسن استاذ تھے۔ حضرت علامہ ارشد اپنے تلمیذ ارشد کے لیے رقم طراز ہیں:

عزیز گرامی قدر حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد امجدی دامت برکاتہم کو خداوند کریم نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے، وہ بلند پایہ راسخ العلم مدرس بھی ہیں اور حاضر دماغ بالغ نظر مفتی بھی! خوش بیان نکتہ رس خطیب بھی ہیں اور فکر انگیز حقائق نگار مصنف بھی! اور ساری خوبیوں کے ساتھ متواضع، شریف النفس اور عالمِ باعمل بھی! ان کے بے شمار تلامذہ ان کے علم و فضل، ان کے دینی تصلب اور ان کی تقویٰ شعار زندگی کے آئینہ ہیں۔ کئی سو علماء میں تنہا آپ کی ذات ہے جس نے شاگردی واستاذی کا رشتہ نبھایا اور اب تک نباہ رہا ہے ورنہ نئی نسل کی خودسری واحسان فراموشی خدا کی پناہ! خدائے قدیر آپ کو اسلاف کا مظہر بنادے۔ آپ کو میں اپنی نجات اخروی کی پونجی سمجھتا ہوں، میں سیاہ کار کا سیاہ کار رہا مگر آپ نے مرضیاتِ الٰہی کو پالیا، آپ کی ذات سے جو دین کو تقویت پہنچی وہ میرے لیے باعث افتخار ہے (ارشد القادری، جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی 16-2-84ء بحوالہ انوارِ فقیہ ملّت، مرتب مفتی اختر حسین قادری، فقیہ ملّت اکیڈمی)

یہ احساسات وجذبات ہیں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی آبرو اور زبان وقلم کے بادشاہ حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے جو اپنے ایک جلیل القدر تلمیذ ارشد کے لیے قلم بند فرمائے ہیں۔ بے شک یہ چند سطور پر مشتمل ایک متن ہے جس کی شرح میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

اب آئیے اس آئینۂ حسن خوباں کے لیے ایک شاگرد کے بھی احساسات وجذبات اور حسنِ عقیدت کی سوغات ملاحظہ فرمالیں جس نے اپنی کتاب ''فقہ وبانی فقہ وفقہ حنفی'' بطور اھداء کے پیش کیے ہیں۔ واضح رہے کہ وہ کتاب رمضان المبارک ۱۴۳۷ھ میں دہلی سے شائع بھی ہو چکی ہے۔

صاحبِ تصانیف کثیرہ، ممتاز الفقہاء، فخر الاساتذہ حضرتِ اقدس بابرکت، فقیہ ملّت حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد

امجدی بستوی بانی مرکز تربیت افتاء و دار العلوم امجدیہ ارشد العلوم اوجھا گنج ضلع بستی یوپی و سابق مفتی فیض الرسول براؤں شریف! ملک و بیرونِ ملک جن کے فتاویٰ کی بڑی دھمک اور جن کے محققانہ قلم کا بڑا وزن تھا۔ جن کی مثالی فقاہت اور سوزِ دروں نے فیض الرسول کے دار الافتاء کو ہمالیائی عظمت و وقار اور ہمہ گیر مرکزیت بخشی اور دیکھتے ہی دیکھے اسے ملک کے قابلِ ذکر دار الافتاء کے درمیان ایک امتیازی شان عطا کی اور علمی و فقہی دنیا کو کئی مجلدات بخشا۔ چند در چند خصوصیات و تفردات میں ان کی ذات "ینذر نظرہ فی عصرہ" کے مصداق تھی۔ ہم اور ہمارے جیسے جانے کتنے گھروں میں دین و علمِ دین کا اُجالا انھیں کی فیضانِ ذات کی بدولت ہے۔

چونکہ فقہ ہی زندگی بھر ان کا میدانِ عمل رہا، اس لیے فقہ اور فقہ حنفی پر مشتمل یہ حقائق انھیں کی بارگاہِ کرم میں بطور نذرِ عقیدت پیش ہیں۔ مولیٰ عزوجل ان کے تربت انور پر شب و روز انوار کی بارش فرمائے۔ دین و علمِ دین کی جو عظیم و تاریخی خدمات انھوں نے انجام دی ہیں، اپنے کرم کے شایانِ شان انھیں اجرِ عظیم عطا فرمائے! (تشنۂ توجہ و نیاز آگیں محمد وارث جمال قادری یارعلوی ۲۸ رشعبان المعظم ۱۴۳۷ھ مطابق ۵ رجون ۲۰۱۶ء)

بے شک یہ بھی ایک متن ہے جن خوش نصیب آنکھوں نے ان پاکیزہ و باعمل اور قابلِ رشک زندگی کو مسلسل قریب سے برسوں دیکھا ہے، انھیں ہمارے اس متن کی تفصیل سمجھنے میں کوئی جھجک نہیں ہوگی، اسے مبالغہ کے بجائے حقیقت پر محمول فرمائیں گے۔

آپ کے جذبۂ اشاعت دین وسنّیت، اخلاص فی الدین، اور قدم قدم پر شریعت مطہرہ کا التزامِ شوق! اور اس پر عملی مظاہرہ، جس کے پیش نظر آپ کی ذاتِ والاصفات اس حقیقت صادقہ کے مصداق تھی:

مَنْ صَلّٰی خَلْفَ عَالِمٍ تَقِيٍّ فَكَأَنَّمَا خَلْفَ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ۔

یعنی جس نے کسی متقی و پرہیزگار عالمِ دین کے پیچھے نماز پڑھی گویا اس نے کسی نبی و رسول کے پیچھے نماز پڑھی۔ ؎

میں آئینہ ہوں وہی بولتا ہوں جو سچ ہے
میں آدمی کی طرح جھوٹ بولتا ہی نہیں

خیر میں تو نہ صرف ایک شاگرد بلکہ ان کا ممنون ہی نہیں بلکہ احسان مند بھی ہوں کہ میرے والد ماجد الحاج ملا محمد منیف قادری یارعلوی بانی و مینجر مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر یوپی، جو آپ کے ایک طویل اور دیرینہ رفیق ہیں انھوں نے حضورِ والا کے تاکیدی مشوروں سے مجھے عالمِ دین بنایا فالحمد للہ رب العلمین۔

مگر معاصرین زمانہ میں جو بڑی شخصیتیں علمی، دینی، مذہبی و فقہی وجاہتیں لیے ہوئے تھیں اور ہیں۔ وہ بھی آپ کی تقویٰ شعار زندگی اور آپ کی علمی و فقہی و تدریسی بصیرت پر رطب اللسان تھیں اور ہیں۔ جیسے حضرت علامہ ارشد القادری، فقیہ النفس حضرت مفتی شریف الحق امجدی، جانشین صدر الشریعہ حضرت علامہ ضیاء المصطفےٰ اعظمی، محقق مسائل جدیدہ حضرت مفتی نظام الدین رضوی، مولانا ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم دہلی وغیرہ وغیرہ اس تعلق سے مزید تفصیل دیکھیے مفتی اختر حسین علیمی کی

کتاب انوارِ فقیہ ملّت میں۔

حضرتِ والا بنیادی طور پر تین عظیم شخصیتوں سے نہ صرف متاثر بلکہ ان سے والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ جن میں پہلی ذات اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت مولانا شاہ امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان کی تھی۔ اعلیٰ حضرت کی کتابوں بالخصوص فتاویٰ رضویہ شریف پر بڑی گہری نظر تھی۔ اپنے تمام فتاویٰ میں زیادہ تر فتاویٰ رضویہ ہی کو سامنے رکھا، اسی طرز کو اپنایا اور اس سے استفادہ بھی خوب فرمایا۔ خود فقیر راقم الحروف وارث جمال قادری کا تجربہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت سے عقیدت ومحبت کے لیے کسی غیر کے رہینِ منت ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ آپ اعلیٰ حضرت کو پڑھتے جائیں ان کی عقیدت ومحبت کے بحرِ ناپیدا کنار میں ڈوبتے چلے جائیں گے۔ ان کی خداداد عظمتوں، رفعتوں، شوکتوں اور ان کے حبِّ رسول کے بحیرۂ عرب کو دیکھ کر عقیدتوں ومحبتوں کا خراج دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

امامِ اہلِ سنّت کی کتابوں کو نہ صرف آپ نے پڑھا بلکہ اسے اپنی دھڑکنوں میں بسایا، اپنے دل ونگاہ کو ان سے معطر و منور کیا، اسی لیے اعلیٰ حضرت کی ذاتِ اقدس سے آپ کو عقیدت ومحبت بھی بہت زیادہ تھی۔ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کی اتباع میں وہ گستاخانِ بارگاہِ رسالت کے لیے ان کے دل میں کسی طرح کا کوئی نرم گوشہ نہیں تھا اور اظہارِ حق کے لیے کبھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہر طرح کی مصلحت ومداہنت کو ہمیشہ اپنے پاؤں کی ٹھوکر پر رکھا۔ ؎

جس کا نصب العین تھا اعلانِ حق تبلیغ حق
زندگی جس کی تھی شرعِ مصطفےٰ کی آئینہ

کتبِ اعلیٰ حضرت وفتاویٰ رضویہ کے علاوہ فقہ حنفی کا ایک بڑا ذخیرہ آپ کے پاس تھا اور اس پر بڑی عمیق نظر بھی۔ مثلاً فتاویٰ عالمگیری، شامی، درمختار ردالمحتار، شرح فقہ اکبر، بحر الرائق، فتاویٰ قاضی خاں، فتاویٰ تاتارخانیہ، فتاویٰ حدیقہ، تنویر الابصار، ہدایہ، وقایہ، خلاصۃ الفتویٰ، الاشباہ والنظائر وغیرہ وغیرہ۔

کاربہ کثرت کے سبب فقہی جزئیات نوکِ زبان!

بے شک میدانِ فقہ میں آپ کا قلم بڑا سیال تھا، مگر استفتا کے جواب میں کافی محتاط!

جسے حق سمجھا اس کے اظہار میں کسی طرح کی کوئی سستی کی نہ تغافل برتا۔ اور اس راہِ استقامت میں نہ کسی رخصت کا سہارا لیا، نہ تاویل کا، چاہے وہ سجدۂ تعظیمی کا مسئلہ رہا ہو یا مسجد میں نمازِ جنازہ کا، تعزیہ داری کا مسئلہ یا اور کوئی شریعت غرّہ کے خلاف آپ وقت حالات کی نزاکتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، ہمیشہ عزیمت کا مظاہرہ کیا اور اس تعلق سے انھوں نے حضرت سیّدنا شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ والرضوان کے نشانِ پا کو اپنی نشانِ منزل قرار دیا۔ ؎

یہی ہیں جن کے سونے کی فضیلت ہے عبادت پر
اِنھیں کی شان کو زیبا نبوت کی وراثت ہے
انھیں کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی
انھیں کا کام ہے دینی مراسم کی نگہبانی

دوسری اہم ترین ذاتِ ستودہ صفات، علم وفضل، درس وتدریس کا کوہِ ہمالہ! اور فقہ کا ''انسائیکلوپیڈیا'' حضرت علامہ

ہدایت اللہ خاں جونپوری کے تلمیذ ارشد، خلیفۂ اعلیٰ حضرت حضرت علامہ مفتی امجد علی اعظمی مصنف بہارِ شریعت (۴ جلدوں میں)، حضرت شارح بخاری علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی اور حضور حافظ ملّت کے حوالے سے راقم الحروف وارث جمال قادری کے دادا استاذ!

یہی آپ کے مرشد بیعت تھے جن کی ذاتِ اقدس سے آپ کو بڑی والہانہ عقیدت ومحبت تھی۔ آپ کے نام کے ساتھ ''امجدی'' کا لاحقہ اس پاکیزہ نسبت ہی کا شاخسانہ ہے اور یہ لفظ امجدی تو آپ کے نام کا ایک جز بن چکا ہے اور آپ کی امتیازی شناخت بھی! گویا حضرت فقیہ ملّت کا پورا نام ''جلال الدین احمد امجدی'' ہے۔؎

میری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر میرا ماہِ تمام آہی گیا

تیسری اہم ترین بارگاہ! حضور شیخ المشائخ، شعیب الاولیاء، عاشق محبوب کبریا حضرتِ اقدس بابرکت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قادری چشتی (بانی دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف سدھارتھ نگر، یوپی) کی تھی۔ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت سے جن کا قدرِ مشترک صرف عشق رسول تھا۔

براؤں شریف میں اساتذہ فیض الرسول کا مشاہرہ بہت ہی کم تھا مگر حضور شعیب الاولیاء علیہ الرحمہ کی علماء نوازی، قدر دانی، دلجوئی، ناز برداری نے اساتذہ فیض الرسول کو آپ کی عقیدت ومحبت کا اسیر بنا رکھا تھا۔ وہاں علماء فیض الرسول کو حضرت خلیفہ صاحب قبلہ کی حیات تک مدرسہ کا ملازم نہیں سمجھا گیا، نہ دورونزدیک سے انھیں یہ محسوس ہونے دیا کہ آپ ملازم ہیں۔ بلکہ حضرات اساتذہ کرام ہی فیض الرسول کے داخلی وخارجی معاملات کے گویا ایک طرح سے مالک تھے۔ یہ حقائق راقم الحروف کے دیدہ ہیں شنیدہ نہیں اور ع قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید کے مطابق ہے۔ خود حضرت فقیہ ملّت علیہ الرحمہ کو اس زمانے میں کئی اداروں سے بڑے بڑے مشاہروں کے ساتھ پیشکش کی گئی۔ حتیٰ کہ ممبئ تک سے پیشکش کی گئی مگر آپ نے فیض الرسول کے مقابلے میں کسی بھی پیشکش کو قبول نہیں فرمایا۔ انھوں نے ممبئ کی پیشکش کے جواب میں لکھا:

پچاس روپئے جو ہمیں براؤں شریف سے ملتے ہیں وہ ہماری ضرورت کے لیے کافی ہوجاتے ہیں، ہم حضرت شعیب الاولیاء کا آستانہ فیض الرسول چھوڑ کر ممبئ نہیں آئیں گے۔ اس طرح اپنی خودنوشت سوانح حیات جو آپ کی معرکتہ الآراء کتاب ''خطباتِ محرم'' میں شاملِ اشاعت ہے۔ رقم طراز ہیں:

اس درمیان دور ونزدیک کے بڑے بڑے اداروں سے اونچا درجہ اور بہت زیادہ مشاہرہ پیش کیا گیا، مگر ہم نے شعیب الاولیاء جیسے محسن کا آستانہ چھوڑنا کسی قیمت پر گوارا نہ کیا۔ (خطباتِ محرم، ص:۴۸۰)

یہی نہیں بلکہ حضور شعیب الاولیاء سے آپ نے اپنی عقیدت ومحبت کا اظہار بھی فرمایا ہے۔ آپ نے حضور شعیب الاولیاء کی بارگاہ میں کئی کتابیں بطور نذرِ عقیدت پیش کی ہیں۔ اپنے سب سے عظیم فقہی کارنامے فتاویٰ فیض الرسول کا انتساب بھی آپ کی طرف کیا ہے۔

انتساب کے عنوان سے رقم طراز ہیں:

شعیب الاولیاء شیخ المشائخ حضور سیّدنا شاہ محمد یار علی صاحب قبلہ لَقَدْ رضی المولیٰ تعالیٰ عنہ بانی دار العلوم اہلِ سنّت فیض الرسول کے نام جن کی شخصیت اتباعِ شریعت کی ایسی آئینہ دار تھی کہ تقریباً پچاس سال تک نماز باجماعت تکبیر اولیٰ کا اہتمام فرمایا۔ (فتاویٰ فیض الرسول، ج: دوم، ص: ۳۰)

جہاں آپ اپنے اساتذہ کرام واکابر اہلِ سنّت کی بارگاہ میں مؤدب تھے اور ان کے نقشِ قدم کو اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھتے تھے، وہیں اپنے تلامذہ کو سرفراز و سربلند دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے اور جو ان کے معیارِ انتخاب پر پورا اترتا اسے مزید خوب سے خوب تر دیکھنا چاہتے اور اس پر فخر کرتے، جس کی متعدد جھلکیاں ''مکتوباتِ فقیہ ملّت'' (مرتب مفتی شاہد علی مصباحی) میں ملتی ہیں۔

ناچیز وارث جمال قادری کی تمام تحریروں اور کتابوں کا باقاعدہ فائل رکھتے تھے خصوصاً میرے وہ تمام مضامین جو میں نے بہ زبانِ حکایت لکھے جیسے مجمع البحرین، اندازِ مسیحائی، متھرا کا پنڈت، دیوتا کی شکتی، شہزادی وغیرہ وغیرہ۔ بھیگی پلکوں کا بوجھ کے نام سے کتابی شکل میں مکتبہ قادریہ دہلی سے اس وقت سے لے کر اب تک مسلسل چھپ رہی ہیں اور آج وہ کتاب میرے قلم کی امتیازی شناخت بن گئی ہے۔ میرے یہ تمام مضامین علی العموم (استقامت ڈائجسٹ) کانپور میں مسلسل چھپے، حضرت قبلہ اپنے اہلِ محبت جو اہلِ علم ہوتے یا ان کے وہ تلامذہ جو آپ سے زیادہ قریب ہوتے انھیں میرے مضامین کا فائل دکھا کر فخراً فرماتے دیکھیے یہ میرے شاگرد ہیں جو بہت اچھا لکھتے ہیں اور میں ان کے تمام مضامین کی فائل بہت سنبھال کر رکھتا ہوں اور ان کے لیے دعا بھی کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں ان کے قلم کو اور سیال و رواں کردے۔

ایک بار اپنے کسی اہلِ محبت کو استقامت ڈائجسٹ کانپور کے کئی شمارے جو اپنے پاس بطور فائل رکھے ہوئے تھے، دکھا رہے تھے اور میں ممبئی سے اپنے وطن بڑھیا گیا ہوا تھا جو براؤں شریف سے چھ میل کے فاصلے میں جانب شمال واقع ہے۔ جہاں ایک بڑا دینی مدرسہ ہے اور وہیں پر حضرت اقدس بابرکت رئیس الاتقیاء، سند المحققین حضرت علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رضوی آسودۂ خاک بھی ہیں (علیہ الرحمہ والرضوان)

چنانچہ اپنی دیرینہ عادت کے مطابق میں براؤں شریف حاضر ہوا اور حضور مفتی صاحب قبلہ کی بارگاہ میں حاضری دی۔ اس حسنِ اتفاق پر مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان صاحب سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمانے لگے یہی مولانا وارث جمال قادری ہیں جن کا ذکر ابھی ابھی میں آپ سے کر رہا تھا اور الحمدللہ یہ میرے شاگرد ہیں۔

پھر انھیں صاحب کے سامنے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے مولانا وارث جمال! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا اور آج پھر تاکیداً کہہ رہا ہوں، اسے آپ میرا حکم بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے آپ نے شہزادی کے عنوان سے حضرت شاہ شجاع کرمانی پر، دیوتا کی شکتی کے عنوان سے حضرت علامہ قطب الدین برہمچاری پر، مجمع البحرین کے نام سے حضرت امام طحاوی

پر اور اندازِ مسیحائی کے عنوان سے حضرت سلطان الاولیاء اور حضرت امیر خسرو پر لکھا ہے، اسی انداز اور اسی زمین میں حضرت شاہ صاحب (یعنی حضور شعیب الاولیاء) پر لکھ دیں۔

میں نے عرض کیا کہ حضور سرکار شعیب الاولیاء پہلے ہی سے میری نگاہ میں ہیں، میں صرف اس کوشش میں ہوں کہ ان بلند پایہ بزرگانِ دین و اولیاء کرام کے ذریعے جب میرا قلم سند اعتبار حاصل کرے تو پھر حضرت شاہ صاحب قبلہ پر قلم اٹھاؤں۔ اس پر بڑے پُرشفقت انداز میں فرمایا، مولانا وارث جمال آپ کا قلم سند اعتبار حاصل کر چکا ہے، اب مزید تاخیر نہ کریں، مجھے بڑی شدت سے انتظار ہے۔ آپ اسی زمین پر یعنی بہ زبانِ حکایت حضرت شاہ صاحب قبلہ بانی فیض الرسول پر ضرور لکھیں۔

چنانچہ اس کے بعد ہی میں نے حضورِ والا کے حکم پر دو طویل قسطوں میں ''بھیگی پلکوں کا بوجھ'' کے عنوان سے استقامت ڈائجسٹ میں لکھا جو بہت نمایاں طور پر اس میں شائع ہوا۔ اور پھر اسی نام سے ہم نے اپنے بزبانِ حکایت لکھے ہوئے تمام مضامین کو کتابی شکل دے کر پہلی بار انجمن رضائے مصطفےٰ بڑھیا سے شائع کیا۔

بے شک کچھ لوگ عظمتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں اور کچھ اپنے رب کے فضل وعطا سے عظمتیں کسب کرتے ہیں۔ ان کے پاس ''پدرم سلطان بود'' کوئی فرضی ڈگری نہیں ہوتی۔ حضرت فقیہ ملّت علیہ الرحمہ کی عظمتیں، سربلندیاں، کامرانیاں کسب کردہ ہیں۔ وہ ایک غریب مگر دین دار، دین پسند نمازی والدین کے بیٹے تھے اور اپنے غریب گھر کی اوّل و آخر پونجی! اپنے منزلِ مراد تک پہنچنے کے لیے ایک آگ کا دریا عبور کرنا تھا جو انھوں نے ڈوب کر پار کیا۔

یہ عشق نہیں آساں تو جس کو سمجھتا ہے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کر جانا ہے

حضرت فقیہ ملّت ایک طویل پُرمشقت دلگداز اور تاریخی جدوجہد کے بعد اپنی منزلِ مراد تک پہنچ گئے اور اپنے کسب کردہ عظمتوں کے سبب حیات کی تمام سعادتیں، نعمتیں، برکتیں ان کے وجودِ بامسعود میں جمع ہوگئیں، تو اب ان کی ذات سے خود کو منسوب کرنے میں فخر محسوس کیا جانے لگا۔ استاذ ہے تو اپنے نسبت استاذی پہ نازاں۔ اور اپنے شاگرد کو اپنی آخرت کی پونجی اور بخشش کا ذریعہ مانتا ہے اور شاگرد ہے تو اپنے نسبت تلمذ کو ایک بڑی سعادت سمجھتا ہے اور کوئی رفیق دیرینہ جو ہم نوالہ و ہم پیالہ تو اپنے اس دیرینہ رفاقت کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہے۔

حضرت فقیہ ملّت علامہ مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ کی پوری زندگی دین و علمِ دین و خدمت علمِ دین و استقامت علی الدین کے حوالے سے پوری تابانی لیے ہوئے ہے۔

ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُعْطِيهِ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَاب

نہ حسنے غایت دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

مفتی اعظم راجستھان جن کی خدمات کی دھمک پورے ملک میں

سرِ بزم تصور آج جانے کون آیا ہے
میرے فکر و نظر کا گوشہ گوشہ جگمگایا ہے

برصغیر ہند کا وہ تاریخی خطہ جو راجپوتانہ، مارواڑ، میواڑ سے مشہور تھا راجگانِ ہند کے قدیم دور میں بھی اس کی بڑی اہمیت رہی جس کی اپنی قدریں اور روایات رہیں اور قدرت کی نوازشات بھی اس خطے کے ساتھ بطورِ خاص تھیں کہ اسی خطۂ ارض میں وہ مقدس مقام بھی ہے جس کے تصور ہی سے کروڑوں دل ونگاہ مؤدب ہوجاتے اور جن کی شہرت وعظمت کا غلغلہ ملک کی سرحدوں سے دور بہت دور نکل کر سارے براعظموں تک پہنچ چکا ہے اور جس کی برکتوں کے فیضان نے پورے برصغیر ہند (متحدہ ہندوستان یعنی پاکستان، بنگلہ دیش، برما، سری لنکا وغیرہ) کو اپنے آغوشِ رحمت میں لیے ہوئے ہے یعنی اجمیر مقدس جو سات صدیوں سے اسلام کے عالمگیر وآفاقی پیغام کا ایک بڑا مرکز بنا ہوا ہے۔

سلطان الہند، عطائے رسول سیّدنا خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رضی اللہ عنہ سے کچھ کم وبیش سو(۱۰۰) سال قبل اس مقدس زمین کو یہ شرف وسعادت بھی حاصل ہے کہ اس کی آغوش میں سلطان الشہدا ءحضرت سیّد سالار مسعود غازی نے اپنی حیات کی پہلی سانس لی ہے یعنی اجمیر شریف ہی آپ کا مقامِ ولادت ہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد ہندوستان کی جب صوبہ جاتی تقسیم ہوئی تو راجگانِ ہند کے اسی خطے کو راجستھان کے نام سے ایک مستقل صوبہ قرار دے دیا گیا۔ یہ راجستھان اپنی جغرافیائی حیثیت اور اپنی کمیت وکیفیت ونوعیت میں بڑی انفرادیت رکھتا ہے اور پورے ملک میں اس کی ایک امتیازی شان ہے۔ راجستھان کے اہم شہروں میں ایک بہت سرسبز وشاداب خوشحال شہر جودھپور بھی ہے، جہاں دارالعلوم اسحاقیہ کی شکل میں علم وادب اور عظمت دین مصطفےٰ کے در وبام جگمگا اٹھے ہیں، اور یہ سب برکتیں ہیں ایک پیکر حرکت وعمل اور ایک بے ریا درویش عالمِ دین کا جس کے عشق واخلاص اور سوز دروں نے ایک عالم کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ ؎

خاکی ونوری نہاد بندہ مولیٰ صفات — ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل — اس کی ادا دلفریب اس کی نوا دلنواز
نرم دل گفتگو گرم دم جستجو — رزم ہو یا بزم ہو پاک دل وپاکباز

مذہبی قیادت کے فقدان اور اس دورِ قحط الرجال میں جہاں ہر طرف ہوا وہوس، ریا ونمود ہی کی حکمرانی ہو، اخلاص وحسنِ نیت ظل ھما ہوکر رہ گئے ہوں بقول قطب عالم حضور مفتیٔ اعظم ہند

صفاتِ ظاہری کے ساز و سامان خوب خوب
جس کا باطن صاف ہو وہ باصفا ملتا نہیں
ہے ریاکاروں کا شہرہ اور ریاکاری کی دھوم
بوریائے فقر بھی اب بے ریا ملتا نہیں

ایسے دورِ نفسانفسی اور عالمِ ریاونمود میں کوئی مردِ بے ریا ایک چراغِ محبت میں اخلاف ووفا کا روغن جلا کے سرِ گذرر رکھ کر اپنے وجود کو دوائے دل کی دوکان بنا ڈالے تو اس کے ثمرات وحاصلات واثر پذیری کا جو عالم ہوگا اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔

یہ کام کسی عام آدمی کا نہیں، اسے تو کوئی مردِ مومن اور لذت آشنا عارف ہی انجام دے سکتا ہے کہ

ع بڑی چیز ہے لذت آشنائی۔

وہ لذت آشنا عارف اور مردِ مومن مفتیٔ اعظم راجستھان حضرت علامہ اشفاق حسین نعیمی مدظلہ العالی ہیں۔ بے شک آپ نے عزم، حوصلہ، عزیمت و استقامت، خوداعتمادی وخدااعتمادی کی بدولت اہلِ راجستھان پر آبرومندانہ بقا کے کئی دروازے کھول دیے ہیں اور ان کی تعمیر وترقی کی نئی نئی جہتیں متعین کردی ہیں۔ حضرتِ والا اپنے کردار وعمل، اخلاق و اخلاص اور حسنِ خدمات کے سبب پورے راجستھان کے مسلمانوں کے مرکز عقیدت ہی نہیں بلکہ مرکز امید بھی ہیں۔ شہر جودھپور ہی نہیں بلکہ پورے راجستھان کے دینی، مذہبی اور ملّی حلقوں کی جان! مسندِ علم وفضل کی آبرو اور دین وسنّیت کے لیے فتح ونصرت کی نشانی ہیں۔ جن کی خاموش علمی، دینی، ملّی خدمات کی دھمک پورے ملک میں محسوس کی جاتی رہی ہے اور جن کا وجودِ مسعود کارناموں سے عبارت ہوکر رہ گیا ہے۔ ذرہ یوں ہی آفتاب نہیں ہوا اور نہ ہی قطرہ آسانی سے گہر ہوا۔ ایک طویل جدوجہد حالات کے جانے کتنے صحرا اور کتنے پتھروں کے جگر پانی کرنے کے بعد ہی ریگزاروں میں ابرِ کرم کے سوتے پھوٹے ہیں۔ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کار کشا کارساز

ایسی شخصیتیں بڑی کمیاب ہوتی ہیں جو بندوں کے لیے خالص اللہ کا انعام ہوتی ہیں۔

ہمیں اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی کہ قدرِ مردم بعد مردن کی روایات کے برعکس آپ کے اہلِ عقیدت اور خوش نصیب اہلِ ارادت ومحبت آپ کے اعزاز اور اعترافِ خدمت وعظمت میں ایک بڑا تاریخی جشن برپا کرنے جارہے جس کی اس راہِ محبت میں ایک سنگ میل کی حیثیت ہوگی۔ میں ان سب کو اس کارِ عظیم کے لیے ہدیۂ تہنیت ومبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب رؤف ورحیم ﷺ کے طفیل ان کے اس اخلاص وعقیدت کو قبول فرمائے اور دنیا و آخرت دونوں میں اس کا صلۂ عظیم فرمائے - ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے پیش نظر یہ بہت ضروری تھا۔

اور اس خبر نے مسرت کو دوبالا کردیا کہ ۲۵ ر فروری ۲۰۰۷ء مطابق ۶ ر صفر المظفر ۱۴۲۸ھ اس عظیم وتاریخی جشن

مسرت میں حضرتِ اقدس بابر کت علامہ الحاج الشاہ محمد اشفاق حسین نعیمی مفتیٔ اعظم راجستھان کے ساٹھ سالہ دینی، مذہبی، ملّی، فکری عمل، تعمیری، تنظیمی کارناموں اور آپ کی حیات و خدمات اور زندگی کے تمام تر گوشوں پر مشتمل ایک ضخیم تاریخی و دستاویزی مجلہ بھی منصۂ شہود پر آئے گا۔ فلحمد للہ رب العٰلمین۔ ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ میں شکر گزار و دعا گو ہوں عزیز گرامی قدر محترم مولانا الحاج قاری محمد عرفان صابری سلمہ استاذ مدرسہ اجمل العلوم سنبھل کا جنھوں نے اس تعلق سے فون پر صاحبزادہ والا تبار محترم الحاج محمد معین الدین صاحب شہزادۂ مفتیٔ اعظم راجستھان سے ہماری گفتگو کرائی اور ہماری توجہ اس طرف مبذول فرمائی۔ پھر تو انھوں نے دلی سے مسلسل فون پر رابطہ قائم رکھا اور اس طرح سے مختصر ہی سہی اپنی نیازمندیوں کی سوغات لے کر اس بزمِ محبت میں شریک ہو گیا۔ خواہ اس کی مثال خریدارانِ حضرت یوسف علیہ السلام میں اس ضعیفہ کی سی ہی کیوں نہ ہو جو مٹھی بھر جَو لے کر حضرت یوسف کو بازارِ مصر میں خریدنے آئی تھی۔

مجھے اپنی بے خبری پر افسوس ہے، اگر وقت سے پہلے مجھے اطلاع مل جاتی تو پھر میری نیازمندیاں ایک قابلِ ذکر مقالے کی صورت اختیار کر لیتیں۔ مجھ جیسے مشکل پسند اپنے حال میں مست رہنے والے بے نیاز آدمی کو بھی آپ کی ذات سے غائبانہ عقیدت تھی اور ہے، جس کا اپنا ایک پس منظر ہے۔ مجھے حضرت صدر الافاضل فخر الاماثل سید المفسرین استاذ العلماء امام الہند حضرت علامہ مفتی سیّد نعیم الدین مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذاتِ والا صفات سے غایت درجے کی عقیدت ہے، صرف اس لیے نہیں کہ استاذی الکریم حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی و حضور حافظ ملّت علیہما الرحمہ کے حوالے سے میرے دادا استاذ ہوتے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اسلامیانِ ہند بالخصوص سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت پر ان کے جو بے پایاں احسانات ہیں اسے تو کسی طرح اتارا ہی نہیں جا سکتا۔ میرے نزدیک اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مجدد دین وملّت سیّدنا امام احمد رضا بریلوی کے بعد پورے برصغیر ہند و پاک میں اتنی کثیر الجہات اور قدآور کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی۔ قلم سے میرا بڑا پرانا تعلق ہے، جس کی عمر ۳۵ برس سے زائد ہے۔ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے بعد سب سے زیادہ آپ کی شخصیت کو ہم نے عنوانِ سخن بنایا ہے، حضور صدر الافاضل پر میرے لکھنے کا آغاز ۳۲ سال قبل سے ہے۔ اور آپ یعنی مفتیٔ اعظم راجستھان حضور صدر الافاضل کے مرید نہیں بلکہ مراد ہیں۔ جامعہ نعیمیہ سے علمی نسبت نہ رکھتے ہوئے ایسی نعیمی ہیں جس کی کوئی دوسری نظیر اس زمانے میں نہیں ملتی۔ آپ عطائے صدر الافاضل ہیں اور اپنے استاذِ محترم اجمل العلماء حضرت علامہ اجمل شاہ صاحب کے علم و فضل کے محسوس پیکر بھی! اس دورِ پُرآشوب میں جب مذہبی قیادت نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔ نفسا نفسی، باہمی قدروں کی پیمائش کی ہوڑ میں اپنے سوا کوئی تسلیم ہی نہیں، اپنے وجود کے سوا کوئی موجود نظر نہیں آتا تو کیا یہ کسی کرامت سے کم ہے کہ ایسے ماحول میں بھی آپ مسلم الثبوت و متفق علیہ ہیں اور تمام مشربانِ طریقت کے سنگم! اور سبھوں کے علی الاطلاق مقتدا و رہنما! قادری، چشتی، نقشبندی، سہروردی، ابوالعلائی، رضوی، اشرفی سبھوں کے دلوں میں آپ کا احترام ہے۔ ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مجھے بھی حضورِ والا کی زیارت کی لمحاتی سعادت حاصل ہے۔ غالباً ۱۹۹۲ء کی بات ہے خلیج میں امریکہ وعراق کی پہلی جنگ کے بعد آپ ممبئی تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں مینارہ مسجد کی مشہور تاریخی ومرکزی مسجد میں حضرت مولانا حافظ قاری غیاث الدین صاحب مرادآبادی خطیب وامام تھے۔ میرے مولانا سے دوستانہ مراسم تھے اور بحمدہ تعالیٰ آج بھی قائم ہیں اگرچہ وہ اب ممبئی میں نہیں رہتے۔ جب کبھی کاروباری مصروفیات سے وقت نکال کر اس طرف نکلنا ہوتا تو مولانا قاری غیاث الدین صاحب سے ضرور ملاقات کرتا۔ اپنے اسی دیرینہ روایت کے پیشِ نظر ان سے ملنے مینارہ مسجد پہنچا۔ جیسے ہی ان کے حجرے میں قدم رکھا، وہ فرطِ مسرت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور عالمِ سرخوشی میں فرمانے لگے، لیجیے حضور آپ جن کا تذکرہ کررہے تھے اور جن سے جاکر ملاقات کی بات کررہے تھے، وہ خود ہی تشریف لے آئے۔ تو کیا یہی مولانا وارث جمال قادری ہیں، یہ فرماتے ہوئے آپ ایک جھٹکے سے کھڑے ہوگئے اور فرطِ مسرت سے گلے لگایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر مولانا غیاث الدین صاحب سے فرمانے لگے کہ مولانا آپ نے انھیں کیوں زحمت دیا، ہم نے تو آپ سے یہ کہا تھا کہ میں خود چل کر انھیں مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔ مولانا موصوف صفائی پیش کرنے لگے، حضور ہم نے انھیں بلایا نہیں، انھوں نے خود ہی کرم فرمائی کی ہے اور مولانا کبھی کبھی ازخود تشریف لایا کرتے ہیں۔

آپ کے اس اندازِ پذیرائی اور والہانہ شفقت اور مولانا کے اس مؤدبانہ انداز سے مجھے اندازہ ہوا کہ ضرور کوئی گرانقدر شخصیت ہے۔ مجھے گومگو کی کیفیت میں دیکھ کر گویا ہوئے، غالباً آپ حضرت سے واقف نہیں، یہی مفتیٔ اعظم راجستھان حضرت علامہ مفتی اشفاق حسین نعیمی صاحب قبلہ ہیں۔ یہ سنتے ہی میرے چودہ طبق روشن ہوگئے اور اس ساعت سعید کو دعائیں دینے لگا، جس ساعت میں نے مینارہ مسجد جانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس وقت تک ہم نے حضورِ والا کی زیارت کی سعادت حاصل نہیں کی تھی، البتہ آپ کی شہرت وعظمت کے تذکرے بہت سن رکھے تھے اور غائبانہ آپ سے عقیدت رکھتا تھا۔ اس انکشاف سے میری خوشی دیدنی تھی، میں نے دوبارہ مصافحہ کیا اور دست بوسی کی سعادت حاصل کی!۔

تقریب محبت کی کیا خوب وہ ساعت تھی
جس وقت ہوا مجھ سے ماہ جبیں واقف

اسی درمیان کچھ ناگوری اہلِ عقیدت پھولوں کا ہار لیے حضورِ والا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے وہ سب ہاران سے لے کر میرے گلے میں ڈالتے ہوئے فرمایا، ہم نہیں آج ان پھول کے ہاروں کا مستحق یہ نوجوان ہے۔ پھر دعائیں دیتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا مولانا وارث جمال صاحب! عراق کی حمایت میں آپ نے جو بڑا جرأت مندانہ تاریخی قدم اٹھایا ہے یہ پورے سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی طرف ایک فرضِ کفایہ ادا کیا ہے جس کی کماحقہ جزا تو اللہ جل شانہٗ ہی دے سکتا ہے، ہم بوڑھے تو صرف دعائیں ہی دے سکتے ہیں۔ حضور سیّدنا غوثِ اعظم کے مقدس شہر اور ان کے عظیم ملک عراق کے لیے آل انڈیا تبلیغ سیرت کی خدمات وقربانیاں بڑی تاریخی نوعیت کی ہیں۔ پھر اس کے مضمرات اور

روشن پہلو پر دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔ حضورِ عالی کی پُرخلوص دعاؤں اور بھرپور حوصلہ افزائی سے دل کو بڑی تقویت اور حوصلوں کو نئی توانائی ملی اور یہ لگا کہ ع نازم بعمرے خویش کہ کارے کردم! آپ کا اشارہ عراق اور کویت کے اس قضیے کی طرف تھا جب عراق نے ۱۹۹۰ء کے آخر میں کویت کو عراق کا ایک حصہ قرار دیتے ہوئے اس پر قبضہ کرلیا اور اسے عراق کا ۹۱ واں صوبہ قرار دے دیا۔ جس پر پوری دنیا دنگ رہ گئی اور عراق کے تعلق سے اپنی سانسیں روکے ہوئے تھی۔ عراق کے تعلق سے پوری دنیا میں سناٹا طاری، ایک بھی آواز ایسی نہیں تھی جو اس کی حمایت میں ہو۔ ایسے عالم میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے عراق کی حمایت میں میدان میں اُتری اور آندھیوں کی زد پر (فقط اور فقط حضور سیّدنا غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی محبت میں) عشق وعقیدت کا چراغ جلایا۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کی عراق کی حمایت میں یہ پہلی آواز تھی، جس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دی۔ عراق کی حمایت میں پہلا عظیم تاریخی جلوس ممبئی سے نکالا گیا، جس کو نہ صرف ہندوستانی میڈیا نے بھرپور کوریج دیا بلکہ دنیا کے اسی (۸۰) بڑے اخبارات نے پہلے ہی دن فرنٹ پیج پر دنیا کی ایک بڑی خبر کی حیثیت سے نمایاں طور پر چھاپا اور ساری دنیا کی نیوز ایجنسیوں نے اپنی ہر زبان کے نشریے میں اسے نمایاں جگہ دی فلحمد للہ علی ذالك۔ خود عراق ایک سال تک مسلسل اپنے سرکاری ٹی وی چینل سے اسے پوری دنیا کو دکھاتا رہا۔ اور عراقی حکومت نے آل انڈیا تبلیغ سیرت سے ایک تعلیمی معاہدہ کیا اور معاہدہ بھی اس انداز کا، جس طرح ایک حکومت کسی حکومت سے کرتی ہے۔ اس کے بعد ہی سے ہندوستان کے سنّی طلباء کے لیے بغداد کے اہم تعلیمی اداروں میں داخلہ آسان ہوا۔ اور جہاں عربی زبان کا قحط تھا بحمدہٖ تعالیٰ آج اپنے یہاں فاضلانِ بغداد کی ایک اچھی خاصی تعداد ہوگئی ہے۔

قابلِ ذکر شخصیاتِ رجال میں حضرت مفتیٔ اعظم راجستھان ہی کی وہ واحد ذات تھی جس نے نہ صرف ہمارے اس قدم کی تائید وحمایت کی تھی بلکہ اس کی بڑی تحسین وستائش، پذیرائی وحوصلہ افزائی کی تھی اور اپنی خصوصی دعاؤں سے نوازا تھا اور ایک حوصلہ افزا تحریر تہنیت ومبارکباد پر مشتمل جامعہ نعیمہ مرادآباد سے آئی تھی اور بس! بقیہ ملک کی قابلِ ذکر وقابلِ احترام وقدآور شخصیتیں بالکل خاموش تھیں، اور اپنوں کی یہ خاموشی بڑی معنیٰ خیز تھی! ؎

بادِ نسیم آج بہت خوسگوار ہے
شاید ہوا کے رخ پہ کھلی زلفِ یار ہے

مولیٰ عزوجل اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں حضور مفتیٔ اعظم راجستھان کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے اور ان کی برکتوں کے فیضان ملک گیر ہی نہیں بلکہ عالم گیر کردے۔ آمین بجاہ سیّد المرسلین۔ قلتِ وقت کے سبب یہ قلم برداشتہ نیاز مندیاں ہیں، اس امید کے ساتھ کہ ع

شاہا چہ عجب بود گر نوازند گدارا

☑☑☑☑☑☑

محسنِ ملّت اور ان کی سیاسی بصیرت

اپنے اسلاف اور محسنوں کو یاد کرنا، ان کے کارناموں کو زندہ رکھنا، انھیں دہراتے رہنا، ان کے افکار و عمل، عزیمت و استقامت اور سوزِ دروں کو نسلاً بعد نسلٍ منتقل کرتے رہنا، یہ زندہ قوموں کی علامت اور جذبۂ احسان مندی اور شکر گزاری کی روایتِ دیرینہ ہے اور پھر وہ شخصیتیں جو اپنے علمی فضل و کمال اور افکار کی بلندیوں کے ساتھ ہی ساتھ یقین محکم، عمل پیہم اور سرتا سر اخلاص اور جہد مسلسل کے محسوس پیکر ہوں، جن کا تب و تاب جاودانہ قوم و ملت اور دینِ حق کی سرفرازی کے لیے وقف رہا ہو اور جو اس حقیقتِ صادقہ کی عملی تفسیر ہوں۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں اور اسی لیے ہوں غازی

تو ایسی صورت میں ان کی حیات و خدمات اور ان کی قومی، ملّی، سماجی کارکردگی، ان کے علمی اور دینی کارنامے، ان کی عاقلی دانائی و فرزانگی، عزیمت و استقامت اور ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز کو پوری تفصیل کے ساتھ اُجاگر کرنا اور اسے جاوداں بنائے رکھنا ان کے اخلاف پر فرض ہوتا ہے، تاکہ ان کے نقوشِ قدم کو دلیل راہ بنایا جا سکے اور ان کے اُجالوں سے اپنی تمام تر غفلت، سُستی، تن آسانی، کاہلی، بے عملی، دون ہمتی، خود غرضی اور مفاد پرستی کی تاریکیوں کو دور کیا جا سکے۔

مقامِ مسرّت ہے کہ سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کی ایک نابغہ روزگار گراں مایہ اور بلند قامت شخصیت حضرتِ اقدس بابرکت علامہ حامد علی فاروقی الہٰ آبادی ثم رائے پوری علیہ الرحمہ کے اخلاف پورے جوشِ عقیدت اور ھل جزاء الاحسان الا الاحسان کے جذبے کے تحت یہی کارنامہ انجام دینے جا رہے ہیں اور پورے سوادِ اعظم کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ بھی! جس کے لیے وہ ہمارے بے پناہ شکریے، مبارک باد اور خصوصی دعاؤں کے مستحق ہیں ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

بے شک آپ کی بے کراں شخصیت اور اس کی ہمہ جہتی پر وقت و حالات اور ہماری اجتماعی غفلت و بے حسی و اکابر فراموشی نے ٹھنڈی دھول ڈال رکھی ہے۔

اس فہرست میں آپ کی ذات تنہا نہیں بلکہ اور بھی بڑی دبنگ، اولوالعزم قدآور اور عبقری شخصیتیں ہماری اجتماعی بے حسی، احسان ناشناسی، خود غرضی اور بے رحمانہ تغافل کی شکار ہیں۔

امام اہلِ سنّت، مجاہد حریت، صاحب لوئے احقاقِ حق، حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی سیف اللہ المسلول حضرت علامہ فضل رسول بدایونی، شیر بیشۂ اہلِ سنت حضرت علامہ ہدایت رسول لکھنوی، شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا

خان بریلوی، صدرالافاضل فخر الاماثل اُستاذ العلماء، حضرت علامہ سید نعیم الدین مراد آبادی، ملک العلماء، حضرت علامہ سید ظفر الدین بہاری، بابائے سیاست حضرت مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہاری، حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی، حضرت مولانا خیر الدین دہلوی (والد ماجد ابوالکلام آزاد)، حضرت علامہ خواجہ سید عبدالصمد مودود چشتی حافظِ بخاری، حضرت مولانا انوار اللہ حیدر آبادی، محدثِ اعظم بہار حضرت علامہ احسان علی مظفر پوری، مفتی اعظم کان پور حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین مظفر پوری، حضرت علامہ عبدالمصطفےٰ مجددی اعظمی، امام النحو حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی، خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی، مجاہد دوراں علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی، تحریک اشرفیہ کے محرکِ وروحِ اشرفیہ امام الحکمت حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف بلیاوی وغیرہ وغیرہ (فہرست کافی طویل ہے) یہ وہ سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کے گنج گراں مایہ واسلامیانِ ہند کی بلند قامت شخصیات و رِجال ہیں جو مسلمانانِ ہند کی مشترکہ امانت اور پورے ملک کے مسلمان بالخصوص علمائے کرام و داعیانِ اہلِ سنّت جن کے اخلاف و پس ماندگان ہیں جو ہماری اجتماعی غفلتوں وسرد مہریوں، مشربانہ عصبیت اور جماعتی حد بندیوں کے شکار ہیں۔ ھَل جزاء الاحسان الا الاحسان کے طور پر بھی ہم کچھ کرنہیں سکتے۔ ان کی حیات وخدمات، علمی، دینی اور ملّی کارناموں کو کما حقہ دنیا کے سامنے رکھ نہیں سکے۔ ان میں کچھ تو ایسے مظلوم ہیں کہ نئی نسل کے سامنے ان کا تعارف تک نہیں پیش کر سکے اور اگر ان نفوسِ قدسیہ میں سے کسی پر جزوی طور پر کچھ ہوا بھی ہے تو شخصیت کی بلند قامتی کے مقابلے صرف آنسو پونچھنے کے مترادف! جسے رسمِ شبیری کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا ؎

زمانہ ہم سے جو برہم دکھائی دیتا ہے
ہماری باتوں میں کچھ دَم دکھائی دیتا ہے

دشمنانِ اسلام اور اعدائے دین متین نے بڑی خاموشی کے ساتھ ایک منصوبے و سازش کے تحت دین وسیاست کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا، پھر بتدریج اس کے روشن چہرے کو داغ دار کیا، اُس کی پاکیزگی کو آلودگی اور اس کی طہارت کو نجاست زدہ کیا تا کہ اہلِ دین و دانش و اربابِ فضل و کمال اور جلیل القدر علما و مشائخ کو اس سے دور رکھا جا سکے اور علما و مشائخ اپنے وقار، علم وفضل کے سبب اس کوچے کی طرف رُخ ہی نہ کریں لاتقوا مواقع التھم کے پیشِ نظر اپنے منصب کی پاکیزگی انھیں ہر دَم ملحوظ خواطر رہے۔

بے شک سیاست ایک صاف ستھری ٹھنڈی میٹھی جھیل کے مانند تھی، جسے مفاد پرست اہلِ دنیا و دشمنانِ دین نے گدلے میلے اور گندے پانی کے جوہڑ سے بدل دیا، تا کہ ہم اپنی من مانی کر سکیں اور اسے ملک وملت کی خدمات کے بجائے ایک خالص کاروبارِ حیات بنا سکیں۔ اسلام دشمن قوتیں ذہین و بالغ ترین علمائے دین سے ہمیشہ خائف رہیں کہ ان کی مومنانہ فراست ہمیشہ بیدار رہتی ہے لاتقوا فراسۃ المومن فانہ ینظر بنور اللہ۔

اس طرح اس گوہر مطلوب ومقصود وشجر محمود ومطلوب کو علما ومشائخ واہلِ دین کے لیے شجر غیر مطلوب وشہر ممنوع بنانے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ؎

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حالانکہ یہ جو لفظ سیاست ہے، یہ تو خود ہی عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہی تدبیر وانتظام کے ہیں۔ فلسفہ کے ابتدائی اسباق بھی تہذیب الاخلاق، تدبیر منزل اور سیاستِ مدنی سے شروع ہوتے ہیں۔ علمائے دین کا سیاست سے کنارہ کش ہونے کے سبب اسلام اور خود مسلمانوں کو کتنے عظیم وناقابلِ تلافی نقصانات سے گذرنا پڑا ہے اس کے لیے ایک ایسی معتبر ہستی کی شہادت پیش کروں جس کے علمی، دینی، ملّی، فکری، اور سوزِ دروں کے حضور ہزاروں لاکھوں خواص کے دل ونگاہ مؤدب ہیں۔

صدر الافاضل، فخر الاماثل، اُستاذ العلماء، سند الحکماء، امام الہند، سید المفسرین حضرت علامہ مفتی سید محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ آج سے ۷۷ رسال قبل جب ملک آزاد بھی نہیں ہوا تھا، حضراتِ علما ومشائخ کی جناب میں اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے آپ نے تب سینہ سوزاں واخلاصِ بے پایاں کو رکھتے ہوئے یوں فرمایا تھا:

''میں عرض کروں گا کہ علمائے دین وپیشوایانِ اسلام اب قدم اُٹھائیں اور گوشۂ تنہائی سے نکلیں! اس لیے نہیں کہ انھیں جاہ ملے یا منصب ملے، اس لیے نہیں کہ حکومت کا مزہ حاصل کریں۔ فقط اس لیے کہ دین کی حفاظت ہو، اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو خطرہ سے محفوظ رکھ سکیں۔ جو قانون ایک بار پاس ہوجاتا ہے پھر اس کے خلاف کامیابی حاصل کرنا بہت دُشوار ہوجاتا ہے۔ اگر اسمبلی میں علما کا بھی کوئی عنصر ہوتا تو شاردا قانون پاس نہ ہوسکتا اور مسلمانوں کے ممبر پہلے ہی دن بیدار کردیئے جاتے۔ طبقۂ علما کا سیاست اور ملکی نظام کی طرف سے اغماض کرنا مسلمانوں کو ضرر پہنچاتا ہے۔ (ملخصاً)

گذشتہ جو چھوڑیئے! آئندہ کے لیے مستعد ہوجائیے اور جلد تر ایک نظر ڈالیے کہ دنیا کیا کررہی ہے؟ مسلمانوں کے مستقبل کے لیے کیا تجویزیں درپیش ہیں؟ ان کے کیا نتائج ہوں گے؟ ضروریات کا اقتضا کیا ہے؟ (ملخصاً)

ستم یہ ہے کہ جاہل عالم نما عالم بن کر میدان میں آئیں اور ان کی تعداد سے دنیا کو دھوکہ دیا جائے اور ان کی خودرائی و نفس پرستی کو علما کی رائے قرار دیا جائے اور علما کا پورا طبقہ ساکت خاموش بیٹھا یہ سب دیکھا کرے، نہ اس کے منہ میں زبان ہو نہ زبان میں حرکت، نہ ہاتھ میں قلم، نہ قلم میں جنبش۔ اس اندازِ سکوت سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

اب آپ اس عقیدہ کو چھوڑ دیجیے کہ آپ کے فرائض ایک مجلس میں وعظ کہہ کر یا ایک حلقہ میں درس دے کر یا ایک خلوت خانے میں فتویٰ لکھ کر ادا ہوجاتے ہیں اور آپ کو اس پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے؟ اور بدخواہانِ اسلام تخریب کے لیے کیا کیا تدابیر عمل میں لارہے ہیں؟ یقیناً یہ آپ کا فرض ہے اور آپ سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اُٹھیے اور اپنے فرض کو ادا کیجیے۔'' (السواد الاعظم، مراد آباد، شمارہ رجب المرجب ۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء، ص ۶،

۷،بحوالہ مقالاتِ صدرالافاضل۔مولانا نورمحمد نعیمی)

یہ اُس زمانے کی بات ہے کہ جب ہندوستان تقسیم سے دو چار نہیں ہوا تھا اور ملک آزادی کی نعمت سے ابھی دور ہی تھا۔ اُس وقت پورے برصغیر ہند میں مسلمانوں کی ایک حیثیت اور اہمیت تھی ، اگرچہ اس وقت متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کُل آبادی ۸ یا۹ کروڑ سے زیادہ نہیں تھی اور آج تقسیم ملک کے بعد بیس کروڑ کی تعداد کے باوجود ہندوستان میں کوئی مقام نہیں۔عملاً وہ دوسرے اور کہیں کہیں تیسرے درجے کے شہری کی حیثیت رکھتے ہیں،جس کی ایک بڑی وجہ ملک میں مسلم ومخلص قیادت کا فقدان اور قابلِ ذکر وصاحبِ صلاحیت علمائے دین کی سیاستِ حاضرہ سے اختیاری بے دخلی بھی ہے اور سب سے بڑھ کر ابوالکلام آزاد اور جمعیۃ العلماء ہند کی ضمیر فروشی ،ملّت فروشی اور اسلامیانِ ہند کے اجتماعی مفاد سے غداری ہے کہ انھوں نے اپنی مفاد اور چند روزہ پُرتعیش زندگی کی خاطر کانگریسی قیادت کی خوشنودی اور جی حضوری میں مسلمانوں کے لیے کئی ایسی زمین ہی ہندوستان میں نہیں چھوڑی جس پر وہ کھڑے ہوسکیں یا کوئی استحکام حاصل کرسکیں۔ بیس کروڑ ہونے کے باوجود ہمارا کوئی وزن ہی نہیں ،اس ملک میں جوسرتاسر دین ہے وہ ابوالکلام آزاد اور چند مٹھی بھر اقتدار کے دلالوں کا۔

بے شک سیاست کوئی آسان چیز تو تھی نہیں بلکہ ایک بے حد دُشوار اور زہرہ گداز عمل ہے،ان میں ہما شما کا گزر ہی نہیں۔ بڑے قابل، باہمت، صاحبِ صلاحیت اور قدآور افراد ہی اس کوچے میں قدم رکھ سکتے تھے۔یہ ایک ایسی وادی تھی جس میں پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں پر چلنا ہوتا تھا۔ اس میں وہی لوگ چل سکتے تھے جو گھر کو آگ لگادے، وہ میرے ساتھ چلنے کے مصداق ہوئے۔

سیاست کا یہ چہرہ اس وقت کے لیے تھا جب سیاست اخلاص ونیک نیتی کے ساتھ خدمتِ خلق سے عبارت تھی اور آج تو سیاست کسی اور ہی چیز کا نام ہوکر رہ گئی ہے اور اس کے اجزائے ترکیبی میں کیا کچھ نہیں داخل ہوگیا، یہ اب کسی پر چھپا نہیں۔اس لیے سیاسی رہنماؤں کا عوام میں وہ احترام نہیں رہ گیا جو ہونا چاہیے۔

آزادی سے قبل، آزادی کے وقت اور آزادی کے کچھ دنوں بعد تک سیاست اور اہلِ سیاست کا عوام وخواص میں بڑا احترام تھا اور یہ احترام دوطرفہ تھا۔ان سیاسی رہنماؤں میں ملک وملت اور عوام کے لیے اخلاص تھی بھا اور عوامی عدالت میں انھیں جواب دہی کا احساس بھی۔ اگرچہ ایسے مخلصین کی تعداد زیادہ تو نہیں تھی مگر جو بھی تھی ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جیسے حسرت موہانی آزادی کے بعد جب ممبر آف پارلیمنٹ ہوئے تو بھی ان کی سادگی وقلندری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ریل کے عوامی ڈبے میں سفر کرتے، دلّی میں فتح پوری مسجد کے ایک حجرے میں جھولا رکھتے ، پھر وہاں سے پیدل پارلیمنٹ ہاؤس جاتے اور کبھی کبھی جیب میں ڈیڑھ روپے نہیں ہوتے کہ وہ پارلیمنٹ کی انٹری فیس دے سکیں۔ ایک بار دیر تک پارلیمنٹ کے دروازے پر کھڑے رہے، جیب میں ڈیڑھ روپے نہیں تھے۔راجہ محمود آباد نے آ کر انٹری فیس جمع کی تو پارلیمنٹ داخل ہوئے مگر جب وہ کسی بلک کی حمایت یا مخالفت پر بولنے کھڑے ہوتے تو ممبرانِ پارلیمنٹ انھیں سننے کے لیے گوش برآواز

ہوجاتے، اور جب وہ کسی بل کی مخالفت یا حمایت میں دلائل دیتے تو خود کو قد آور سمجھنے والے اپنے کو بونا محسوس کرتے اور زبان دان بے زبان ہوجاتے۔ پارلیمنٹ ہاؤس نے بارہا ان کے سامنے پنڈت جواہر لال نہرو اور ابوالکلام آزاد جیسے زبان دانوں کو حالتِ بے بسی میں دیکھا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے، آج کے مقابلے اس زمانے میں سیاسی افراد بہت کم تھے اور پارٹیاں صرف دو۔ یہی وجہ ہے کہ وطن کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے ہندوستان کی سیاست کے منظر نامے پر صرف دو پارٹیاں تھیں: کانگریس اور مسلم لیگ۔ دونوں کا مقصد انگریزوں کی غلامی سے ملک کو آزاد کرانا اور ایک جمہوری حکومت کی تشکیل، جب کہ مسلم لیگ کا مقصد اور اس کا ٹارگیٹ وطن کی آزادی کے ساتھ دوقومی نظریے کی بنیاد پر ایک اسلامی ریاست کا قیام بھی تھا۔ حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل کے پیشِ نظر علمائے اہلِ سنت کا کاررواں در کارواں آزادیِ وطن کے لیے کفن بر دوش تھا۔

ان دوسیاسی پارٹیوں سے الگ ہٹ کر سیکڑوں ہزاروں لوگ اپنے اپنے طور پر بھی آزادیِ وطن کے لیے سروں کا چراغ جلائے ہوئے تھے۔ ان کو ان سے کچھ غرض نہیں تھی کہ حکومت کس کی بنتی ہے؟ کیسی بنتی ہے؟ کون بناتا ہے؟ اقتدار کے مسند پر کون بیٹھتا ہے؟ ان کو تو بس ایک ہی مقصد تھا: وطن کی آزادی اور غلامی کی زنجیروں کو اُتار کر پھینکنا۔ مگر وہ جو اہلِ سیاست تھے، وہ آزادی کے ساتھ حکومت اور حصولِ اقتدار بھی ان کے پیشِ نظر تھا، جس میں وہ کافی ماہر اور سیاست کے پیچ و خم سے خوف واقف تھے۔ انھیں بڑے بڑے جغادری لیڈروں اور سیاسی سورماؤں کے شانہ بشانہ بے حد قابلِ احترام علما و مشائخ کی ایک بڑی تعداد تھی جنھوں نے حصولِ آزادی اور حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل کے لیے اپنی کشتیاں جلادی تھیں۔ بنارس کی سنّی کانفرنس جس کی بہترین مثال ہے، جس میں پانچ ہزار صرف علما و مشائخ پورے ملک سے شریک ہوئے تھے۔ ان میں نمایاں نام مفتی اعظم ہند علامہ مصطفےٰ رضا خاں بریلوی، صدر الافاضل علامہ سید محمد نعیم الدین مرادآبادی، صدر الشریعہ علامہ امجد علی اعظمی، محدثِ اعظم ہند حضرت سید محمد کچھوچھوی، امیر ملت حضرت پیر جماعت علی محدث علی پوری، شیخ المشائخ حضرت شاہ علی حسین اشرفی، مولانا ابوالحسنات حضرت سید محمد قادری، تاج العلماء مولانا محمد عمر نعیمی، مجاہد ملت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری، حافظ ملت مولانا شاہ عبدالعزیز مبارک پوری، سلطان الواعظین مولانا عبدالمصطفےٰ اعظمی، آبروئے اہلِ سنّت حضرت مولانا حامد علی فاروقی رائے پوری علیہم الرحمۃ والرضوان وغیرہ وغیرہ۔

غرض علمائے اہلِ سنت ہزاروں کی تعداد میں حصولِ آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حضرت مولانا محمد علی جوہر، حضرت مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، حضرت علامہ سید سلیمان اشرف بہار صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مولانا برہان الحق جبل پوری، حضرت مولانا انوار اللہ حیدرآبادی، حضرت علامہ یار محمد بندیالوی، یہ سب جماعت اہلِ سنت ہی کے میر کارواں ہیں۔ ملک وملت کے لیے جن کی قربانیاں حیران کن ہیں۔ وطن کی آزادی کے لیے فیصلہ کن مرحلے میں علمائے اہلِ سنّت کو قربانی دینی چاہیے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء جو آزادیِ وطن کی خشتِ اوّل تھی، جس کی امامت وقیادت وسیاست مجاہد حریت حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی،

حضرت مولانا سید احمد اللہ شاہ مدراسی، حضرت مولانا شاہ رضا علی خاں بریلوی (جدِ کریم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا)، علامہ مفتی عنایت احمد کاکوروی، حضرت مولانا امام بخش صہبائی، حضرت علامہ مفتی صدر الدین آزردہ، مفتی مظہر کریم دریابادی، علامہ فضل رسول بدایونی، مفتی انعام اللہ گوپامئوی، مولانا قاضی فیض اللہ کشمیری، مفتی لطف اللہ گڑھی وغیرہ نے کی۔ ان کے اخلاف اوران کی عظمتوں کے وارث وامین تو یہی علمائے اہلِ سنّت ہی تھے۔

حضرت اقدس علامہ حامد علی فاروقی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک روشن کڑی اور اپنے گونا گوں وجود حیرت میں کثیر الجہات بلندیاں اور فراست مومن کی جلوہ سامانیاں لیے ہوئے جس کا وجودِ بامسعود بر کف جام شریعت بر کف سندان عشق کاایک بڑاخوب صورت امتزاج تھا۔

آپ بیک وقت مسلمانوں کے جہاں ایک عظیم دینی و مذہبی رہنما تھے، وہیں سیاسی مقتدیٰ بھی اور جنگ آزادی میں وہ ابوالکلام آزاد کے شانہ بہ شانہ نہیں بلکہ ان سے کئی قدم آگے شہید آزادی حضرت مولانا محمد علی جوہر کے شانہ بہ شانہ تھے۔ قید و بند کی صعوبتوں میں ان کے ساتھ ساتھ تھے۔ ہماشما کی تو بات ہی کیا، ہم دیکھ رہے ہیں کہ اپنے زمانے میں جو دین و سنّیت کا فروغ اور ملتِ بیضا کی سرفرازی کے لیے تاحیات جن کی آبلہ پائی اور شوریدہ سری ناقابلِ انکار حقیقت رہیں، ایسی گراں مایہ شخصیتیں جو دین وسنیت کا تشخص اور سوادِ اعظم کا سرمایۂ افتخار تھیں اور ہیں، ان کا اعتراف ورجوع اور علامہ حامد علی فاروقی کی بارگاہ میں ان کا خراجِ تحسین وعقیدت اہم ترین شخصیات و رِجال کے درمیان آپ کی عظمت وجلالت سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

مجددِ سلسلۂ اشرفیہ مرجع العلماء شیخ المشائخ حضرت سید علی حسین اشرفی، حضور احسن العلماء، علامہ مصطفےٰ حیدر حسن صاحب، مجاہد دوراں علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی، قائد اہلِ سنت رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری، خطیب مشرق پاسبانِ ملت حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی علیہم الرحمہ، شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد مدنی اشرفی جیلانی، حضرت علامہ مفتی عبدالحلیم ناگپوری وغیرہ وغیرہ۔

وقت کی قلت اور خوفِ طوالت مانع نہ ہوتا تو سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کی ان بلند قامت شخصیات و رِجال کے احساسات وجذبات اور طویل تحسین وعقیدت نامے ضرور شامل کرتا، جو محبت میں تڑپنے کا ثبوت چاہنے والوں کے لیے دیدۂ تر کے مترادف ہوتا۔

یہ جان کر تحیر خیز مسرت ہوتی ہے کہ تاجدارِ علوم وفنون عبقری الشرق مجددِ اعظم اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری کی بارگاہ سے شرفِ تلمذ، نسبت ارادت کے ساتھ ہی انھیں اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔ اس خصوص میں تو وہ حضور محدثِ اعظم پاکستان علامہ سردار احمد، علامہ حشمت علی خان لکھنوی، علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی، حضور مجاہد ملت علامہ مفتی حبیب الرحمن قادری، حضور حافظ ملت علامہ عبدالعزیز مبارک پوری، حضور امین شریعت علامہ مفتی رفاقت حسین کانپوری جیسی بلند پایہ شخصیات کے لیے باعث رشک تھے۔ حسنِ عقیدت کے ساتھ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کی زیارت ہی کسی

نعمت کبریٰ سے کم نہیں۔ چہ جائے کہ براہِ راست ان کی شاگردی کا ''یہ رُتبہ ملا جس کو مل گیا''۔

دوسری طرف مجاہدین آزادی کے اس صف میں کھڑے تھے، جس صف میں مولانا جوہر علی کھڑے نظر آتے ہیں۔ مذہبی، علمی دنیا میں قامت زیبائی کی انفرادیت کے ساتھ آپ کا سیاسی قد کتنی بلندی لیے ہوئے تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ تقسیم ملک کے بعد حکومت وآئین سازی میں پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم سیاست داں قدم قدم پر آپ کے مشورہ کے طالب تھے، مگر کتنی عجیب بات ہے کہ پانی میں رہتے ہوئے ان کے جیب ودامن میں کہیں نمی نظر نہیں آئی۔ وہ نہ صرف یہ کہ سیاستِ حاضرہ کے قریب رہے بلکہ اس میدان میں وہ باقاعدہ اُترے، سیاست کو صرف چھوا اور سونگھا ہی نہیں بلکہ اسے اوڑھا، بچھایا اور چکھا بھی مگر اس میں ڈوبے نہیں۔ ابوالکلام آزاد، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا ظفر علی خان وغیرہ کی طرح ''ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد'' کے مصداق نہ ہوئے بلکہ انھیں اپنی دینی، علمی، مذہبی حیثیت کے ساتھ اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلق سے انھیں بارگاہِ ذوالجلال میں جواب دِہ ہونا ہے۔ یہ اُن پر اُن کے رب کا خصوصی فضل اور ان کے مرشد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا فیضان اتم تھا کہ علم وفضل کے بڑے بڑے پہلوان لڑکھڑا گئے، وہاں علامہ حامد علی فاروقی ثابت قدم رہے۔

تحریک ہجرت، تحریک خلافت، تحریک ترکِ موالات، تحریک نان کوآپریشن، تحریک ترکِ گاؤ کشی وغیرہ میں بڑے بڑے نامی گرامی قسم کے علما نے جو ٹھوکریں کھائیں اور بڑی لغزشیں کی تھیں، اس پر اُن کے اُستاذ ومرشد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا شرعی احتساب بھی سامنے تھے، جس نے ان کو شرعی حرمتوں کی پامالی سے محفوظ رکھا ۔

یہ فیضانِ نظر ہے کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

صف بہ صف اکابر واساطین اُمت جو زینت فرش گیتی ومصابیح الارض تھے، ان کے درمیان آپ کا جو مقام ورُتبہ تھا وہ تو مجددِ اعظم کی نسبتِ تلمذ ونسبتِ بیعت وإجازت اور ان کے خصوصی فیضان سے ظاہر تھا۔ رہ گیا سیاسی میدان تو اس میں بھی آپ کی قامت زیبائی اقتدارِ وقت کے دلالوں، دریوزہ گروں، بہروپیوں اور ملت فروشوں کے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد سے کچھ سوا ہی تھا۔ یہ آپ کی فراستِ مومن ہی تھی کہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کی جدوجہد ''کرو یا مرو'' کی منزل میں داخل ہوگئی، تو آپ نے آگے بڑھ کر مجاہدین کی اگلی صف میں اپنے لیے جگہ بنائی، پھر آگے چل کر آپ نے علاقہ مدھیہ پردیش سے چھتیس گڑھ جو آج خود ایک صوبہ ہے، مسلمانوں کی طرف سے ''بھارت مت چھوڑو'' تحریک کی قیادت کی اور کامل جدوجہد وجاں فشانی کے ساتھ اس تحریک کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ جب ملک آزاد ہو گیا، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنے اپنے ٹارگیٹ حاصل کر لیے تو دیگر علمائے اہلِ سنّت ومشائخ کرام کی طرح منزل پر پہنچنے کے بعد اپنی مسجدوں، درگاہوں اور خانقاہوں تک محدود ہو کر نہیں رہ گئے، بلکہ پوری تب وتاب جاودانہ کے ساتھ میدانِ عمل میں جمے رہے اور بڑی جواں مردی واستقامت کے ساتھ ہجرت کے نام پر مسلمانوں کی بھگدڑ رکو روکتے رہے۔

تقسیم ملک کے نتیجے میں پورے ملک میں مسلمانوں کے خلاف آتش فشاں پھٹ چکا تھا، تمام ملک ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ خصوصاً شمالی ہند کے لوگ سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہے تھے، اپنے قیمتی اثاثے کو کوڑیوں کے دام بیچ کر ہزاروں لوگ اپنا سب کچھ چھوڑ کر صرف اپنی جانوں کو لے کر بھاگ رہے تھے کہ کسی طرح سے جان ہی بچ جائے۔ مسلمانوں کے سر پر تقسیم ملک کا بڑا الزام رکھ کر انھیں تباہ و برباد کیا جانے لگا، حالانکہ تقسیم ملک کی اصل ذمے دار کانگریس کی ہندو قیادت تھی، جس میں پنڈت نہرو، سردار پٹیل آگے آگے تھے۔ ایک کو ہندوستان کا وزیر اعظم بننا تھا اور دوسرے کو وزیر داخلہ۔ اگر ملک تقسیم نہیں ہوتا تو اتنی بڑی کرسی تک پہنچنا ان کے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ ملک اگر تین طبقوں میں بٹتا تو اس کرسی کے لیے ان سے کہیں زیادہ قابل اور اہم لوگ موجود تھے۔ یہ مستقل ایک بحث ہے کہ ملک کی تقسیم کے اصل ذمے دار مسلمان تھے یا کانگریسی ہندو! مگر تفصیلی بحث کا جو نچوڑ نکلے گا اس میں ملک کی تقسیم کا اصل ذمے دار کانگریس کی ہندو قیادت ہوگی۔ بہر حال جو بھی ہو لیکن قیامت مسلمانوں پر ٹوٹی۔ ایسے رستاخیز ماحول میں مسلمانوں کو سنبھالنا، انھیں روکنا، دلاسا دینا، ڈھارس بندھانا، ان کے آنسو پونچھنا آسان کام نہیں تھا، مگر آپ نے بڑی بالغ نظری اور دل سوزی کے ساتھ پاکستان جانے والوں کو روکا، انھیں مخاطب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

اعلیٰ حضرت سیدنا امام احمد رضا نے بہت پہلے فرمایا تھا، دشمن ہمارے لیے تین باتیں چاہتا ہے:

۱) سب سے پہلے ہماری موت کہ معاملہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

۲) اور اگر یہ نہ ہو سکے تو جلا وطنی

۳) اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو آخر میں عاجز و مجبور بنانا چاہے گا۔

ایک بار تم نے ہجرت کر کے دیکھ لیا مگر اس میں سوائے بربادی کے کچھ ہاتھ نہ آیا، آج پھر تم یہاں سے جا رہے ہو مگر جانے سے پہلے سوچو، سمجھو پھر کوئی فیصلہ کرو۔ بھارت کی زمین پر ہم نے صدیوں حکومت کی ہے، دہلی کے لال قلعہ کی بلند پیشانی ہماری عظمتوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ایسی حالت میں یہاں سے پاکستان چلے جانا سوائے بربادی کے کچھ نہیں۔

تم کہاں جا رہے ہو؟ خواجہ کی دھرتی تمھیں آواز دے رہی ہے، مخدوم سمناں کا آستانہ تمھیں آواز دے رہا ہے، تمہارے اجداد کی ہڈیاں تمھیں پکار رہی ہیں، خواجہ کا آستانہ چھوڑ کر تم کہاں جاؤ گے؟ سرکار اعلیٰ حضرت کے فیضان سے بھاگ کر تم کیسے جی سکو گے؟ مخدوم پاک کا سایہ چھوڑ کر تمھیں کہاں چین ملے گا؟ الخ

(ہفت روزہ ہمارا اقدام، دہلی۔ ۷ / جنوری ۱۹۹۱ء)

الغرض آپ نے مسلمانوں کو روکنے کے لیے رات دن ایک کر دیا، انھیں طرح طرح سے سمجھایا۔ آپ کی دل سوزی رنگ لائی اور علاقہ چھتیس گڑھ اُجڑنے سے بچ گیا۔

تقسیم ملک کے بعد پورے ملک کے لیے آئین تشکیل دینے اور دستور بنانے کا وقت آیا تو ملک کے تمام حصوں سے بڑے بڑے دانشور، اربابِ سیاست و اصحاب الرائے کو بلایا گیا۔ اس کے لیے علاقہ چھتیس گڑھ سے خصوصیت کے ساتھ

علامہ حامد علی فاروقی صاحب کو بلایا گیا۔ تمام ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے دستوری حقوق کے لیے آپ سے مشورے لیے گئے۔ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ قانون پر بھی آپ کی بڑی گہری نظر تھی۔ آپ کے قیمتی مشوروں سے پنڈت جواہر لال نہرو کافی متاثر ہوئے۔ چنانچہ ۱۹۵۱ء میں جب مسلمانوں کے لیے ان کے شرعی قانون کے مطابق آئین اور عائلی قانون بنانا ہوا تو دیگر بڑے بڑے اہم لیڈروں کے ساتھ خصوصی طور پر آپ کو رائے پور چھتیس گڑھ سے الہٰ آباد، آنند بھون میں بلوایا گیا اور مسلمانوں کے لیے آئین سازی میں آپ سے مشورے اور مدد طلب کی گئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو آپ سے بے حد متاثر تھے اور آپ کی قابلیت پر انھیں بڑا اعتماد تھا، اس لیے وہ اپنے ہر اہم سیاسی جلسوں میں آپ کو اپنے آگے آگے رکھتے تھے، کیوں کہ اُس زمانے کے جلسوں میں انسانی سیلاب لانے کے لیے علامہ فاروقی کا نام کافی ہوا کرتا تھا۔ حضرت علامہ پر پنڈت نہرو کے اعتماد کا عالم یہ تھا کہ جب ۱۹۵۲ء میں پھول پور الہٰ آباد سے الیکشن لڑے تو محسنِ ملّت ہی کو اپنا الیکشن انچارج بنایا تھا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی کے بعد اس کی تعمیر و تشکیل، سیاسی ایوان اور مسلم نمائندگی میں انھیں لوگوں کا نام کیوں سامنے بار بار آرہا ہے؟ امام الہند، شیخ الاسلام وغیرہ۔ بالخصوص ابوالکلام آزاد کے نام کا سیاسی غلغلہ، مولانا آزاد یونیورسٹی، مولانا آزاد لائبریری، مولانا آزاد مالیاتی کارپوریشن وغیرہ پارلیمنٹ ہاؤس میں بڑے دبنگ لیڈروں کے ساتھ مولانا آزاد کا فوٹو، جس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک کی آزادی میں ہندو کانگریسی لیڈروں کے ساتھ صرف مولانا آزاد نے ہی مسلمانوں کی طرف سے سب سے بڑی قربانی دی ہے، صرف وہی قید و بند کی صعوبتوں سے گذرے ہیں، صرف وہی جان ہتھیلی پہ لیے ہوئے تھے اور تنہا وہی اپنے حوارین کے ساتھ مسلمانوں کے قائد و عظیم رہنما تھے، بقیہ علمائے دین و دانشور خاموش تماشائی یا الجواب صحیح کی منزل میں تھے۔ بابائے سیاست علامہ سید فضل الحسن حسرت موہانی، مولانا شوکت علی، علامہ حامد علی رائے پوری، علامہ سید نعیم الدین مرادآبادی، محدثِ اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی، علامہ سید سلیمان اشرف بہاری، مجاہد ملت حضرت علامہ محمد حبیب الرحمٰن قادری، حافظ ملت مولانا حافظ عبدالعزیز مرادآبادی ثم مبارک پوری، حضرت علامہ سید انوار اللہ حسینی حیدرآبادی، علامہ مفتی محمد مظہر اللہ دہلوی، علامہ مفتی برہان الحق جبل پوری، حضرت علامہ ہدایت اللہ لکھنوی، تاج العلماء حضرت مولانا سید محمد میاں مارہروی، قطب عالم حضور مفتی اعظم ہند بریلوی، حضرت علامہ حشمت علی خاں لکھنوی۔ آپ نے تو مسلم لیگ کے تعلق سے اپنے موقف بہت واضح طور پر بیان کرتے ہوئے سخت الفاظ میں اس سے اپنی برأت بھی ظاہر کی ہے۔ آخر الذکر کا عالم یہ تھا کہ جس شہر میں پہنچ جاتے، مسلم لیگ کا تعزیہ ٹھنڈا ہوجاتا اور وہاں اس کے صرف مرثیہ خواں ہی رہ جاتے۔

کیا مؤرخین آزادی و کانگریسی قیادت کو عظمت و عزیمت کے یہ بلند مینار نظر نہیں آئے؟ سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے یہ قائدین جو کروڑہا ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندہ و ترجمان تھے، کیوں نظر انداز کیے گئے؟ ذرائع ابلاغ نے بھی انھیں نظر انداز کیا یا کرایا گیا، جب کہ تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے، ان کو سنبھالنے، ان

کے زخموں پر مرہم رکھنے، ان کی دل جوئی وڈھارس بندھانے میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں مگر سارا سہرا اقتدارِ وقت کے دلالوں، ضمیر وملت فروشوں کے امام الہند اور ان کے ہاں میں ہاں ملانے والے چند حواریوں کے سر باندھ دیا گیا اور ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کے دستوری حقوق کو نظر انداز کر کے ان کے حقوق کی جوز کوۃ بنتی تھی، اس کا ایک حقیر حصہ سرکاری نوازشات کی شکل میں ان کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ یہ انعام تھا جو کروڑوں مسلمانوں اور ان کے باقیات جو آج بیس کروڑ کی تعداد میں ہیں، ان کے اجتماعی مفاد سے غداری کا۔

انھوں نے اپنے الفاظ کے جادو، سیاسی داؤ پیچ اور اگر مگر سے اسلامیانِ ہند کا جو عظیم نقصان کیا، کانگریس کی ہندو قیادت کے اشارے پر اس کی خوشنودی اور اپنے جاہ ومنصب اور چند روزہ حیاتِ مستعار کو پُر تعیش بنانے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ وہ وشواس گھات کیا جو بنگال میں جعفر اور میسور میں صادق کر چکے تھے۔ مگر ان دونوں جگہوں میں ایک بڑا واضح فرق یہ تھا کہ وہ خالص دنیادار تھے، انھوں نے حصولِ دنیا کی کوشش دنیاوی لباس میں کی۔ علم وفضل کی کوئی سند ان کے ساتھ تھی اور نہ ہی امام الہند کو کائی طغرہ ان کے پاس تھا نہ ہی وإِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاء کے صفت سے متصف تھے، نہ ہی ان کے پاس ابوالکلام آزاد کی طرح کوئی لباسِ خضر تھا، نہ کوئی روشن وتابناک مذہبی گراؤنڈ! نہ ہی ان کے ہاتھوں میں کلام اللہ کی تفسیر کا قلم۔ ان حالات وخصوصیات کے پیش نظر مسلمانوں کے اجتماعی اور سیاسی مفادات کے تعلق سے امام الہند کے جرم کی سنگینی کئی گنا اِن گنہ گاروں سے زیادہ بڑھ جاتی ہے، جن کے بارے میں ڈاکٹر اقبال کو کہنا پڑا تھا کہ ؎

جعفر از بنگال صادق از دکن
ننگِ ملت ننگِ دیں ننگِ وطن

یہ ایک تفصیل وتحقیق طلب بحث ہے، سرِ دست صرف دو مثالیں دے کر آگے بڑھ جاؤں گا۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے ساڑھے تین کروڑ مسلمانوں کو سیاسی سرگرمیوں سے روکنے اور کانگریس سے مسلمانوں کو سیاسی سرگرمیوں سے روکنے اور کانگریس سے مسلمانوں کی غیر مشروط وفاداری کے لیے گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ پٹیل کے اشارے پر مولانا آزاد نے کمر ہمت کسی اور مسلمانوں کو سیاسی موت کی تلقین اور کانگریس کی غیر مشروط غلامی کے لیے لکھنؤ میں مسلمانوں کی ایک کنونشن بلائی، اس پر ایک گھر کی شہادت ملاحظہ ہو۔ اس بدترین صورتِ حال اور تلخ ترین حقیقت پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلم مجلس اُتر پردیش کے سابق رُکن خصوصی اور موجودہ ممبر آف پارلیمنٹ مشہور سماجی شخصیت جناب ارشد صدیقی اعظمی کے والد محمد الیاس اعظمی یوں رقم طراز ہیں:

''اپنی بزدلانہ بھگدڑ کو ہجرت کا مقدس نام دے کر انھوں نے باصلاحیت افراد کے پورے کھیپ کی بھگدڑ کا جو جواز تلاش کرلیا۔ رہی سہی کسر مولانا آزاد نے اس وقت پوری کردی جب انھوں نے ۱۹۴۸ء میں ''لکھنؤ کنونشن'' کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی اجتماعی سیاست سے توبہ کرادی۔ اس طرح ''مسلم ماس کنڈیکٹ'' کا تتمہ اس ہاتھ سے لکھوایا گیا جس کی انگلیوں میں کلام اللہ کی تفسیر کی روشنائی لگی ہوئی تھی ؎

تسبیح توڑنے میں خود ان کا ہاتھ ہے
جو آج کہہ رہے ہیں کہ دانے بکھر گئے

(پیامِ زندگی، ص ۱۸، از محمد الیاس اعظمی، بحوالہ آل انڈیا تبلیغ سیرت ایک تاریخ، ص ۲۸)

اسی کی تائید میں مزید ایک بڑی اہم شہادت ملاحظہ ہو:

''اسی زمانے میں کانگریسی حکومت کے اشارے پر ایک آزاد مسلم کانفرنس لکھنؤ میں بلائی گئی، مولانا آزاد اس میں پیش پیش تھے اور ان کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ زعما بھی اس کانفرنس میں شریک ہوکر ذہنوں کی تبدیلی کی تلقین کریں اور مسلمانوں کو حالات کے مطابق بدل جانے پر آمادہ کریں۔ یوپی مسلم لیگ نے پانچ افراد پر مشتمل ایک وفد مولانا آزاد سے گفت وشنید کے لیے ترتیب دیا، اس گفت وشنید کی داستان مولانا حسرت موہانی کے ۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء کے روزنامچے سے پیش کی جاتی ہے:

''آج صبح دس بجے ناشتہ خوری واخبار بینی سے فارغ ہوکر کل کے فیصلے کے مطابق ہم پانچ نمائندے رضوان اللہ، حسرت موہانی، ذاکر علی، فاروق اور نفیس الحسن ۱۱ر بجے کے قریب کارلٹن ہوٹل ابوالکلام صاحب سے بات چیت کرنے پہنچے۔ مختصر گفتگو ہی کے دوران معلوم ہوگیا کہ میں نے جلسۂ مشاورت میں جو بدگمانیاں مولانا ابوالکلام کی نیت کے متعلق ظاہر کی تھیں وہ خود ان کے زبانی بھی تحقیق ہوگئی۔ انھوں نے صاف صاف اقرار کیا کہ آج کی کانفرنس کا صرف ایک مقصد ہے، وہ یہ کہ تمام مسلم اِدارے سیاسی حیثیت سے ختم ہوں، کل فرقہ وارانہ جماعتیں کانگریس میں مدغم ہوجائیں۔ اس پر ہم لوگ یہ کہہ کر چلے آئے، تو ہم لوگوں کی شرکت بالکل بے کار ثابت ہوئی۔ دورانِ گفتگو چلتے چلتے ایک فقرہ میں نے ابوالکلام کے متعلق چست کردیا، جس سے ان کی ساری کارستانیوں پر پانی پھر گیا اور جس سے وہ انتہا درجہ بھنّائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ۱۸۵۷ء میں برٹش گورنمنٹ کی بدگمانیاں رفع کرنے کی غرض سے جس طرح سے سرسید نے مسلمانوں کو صرف تعلیمی اور سماجی اُمور پر زور دینے اور سیاسی وفاداریٔ برطانیا کی تلقین کی تھی، اسی طرح ۱۹۴۷ء میں آپ کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کو بلاشرط وفاداری سکھاتے ہیں اور اسلامی اِداروں کو سماجی اُمور کے لیے محدود کردینے کے درپے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔''

(مقدمہ کلیاتِ حسرت موہانی، ص ۶۴، مطبوعہ فرید بک ڈپو، ممبئ)

بغیر کسی تبصرہ کے آگے بڑھیں اور مولانا آزاد کی ضمیر فروشی اور مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کا ایک نظارہ اور دیکھیں۔

''مجھ سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا خواہش مند نہ ہوگا کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہوں لیکن مسلمان سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ وہ اگر معاملے کو اس صورت میں دیکھ کر قدم اُٹھانا چاہتے ہیں (یعنی اقتدار میں شرکت کی شرط پر) تو بہتر ہے کہ شرکت کا نام ان کی زبان پر نہ آئے۔ اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیں تو صرف اس لیے کہ انھیں اپنے اوپر بھروسہ، اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انھیں بھروسہ دلایا ہے۔ بلاشبہ میں آرزومند ہوں کہ مسلمان میدان میں

اُتریں لیکن میں تمھیں اس طرح میدان میں دیکھنا چاہتا ہوں جس طرح ایک بہادر، بے خوف آدمی میدان کی طرف رُخ کرتا ہے، خود اعتمادی سے سر اُٹھا ہو، عزم و یقین سے سینہ تنا ہو، وہ میدان کے خطروں سے بے خبر نہیں ہوتا۔ یہ خطرے ہر طرف سے نہیں آسکتے ہیں مگر وہ جانتا ہے کہ خطروں کے لیے اسے دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا، خود ہی اپنی ہمت و پامردی پر اعتماد کرنا ہے لیکن اگر وہ اس طرح سے میدان میں نہیں اُتر سکتے اور ساتھیوں سے شرطیں منوانے کی فکر میں ہیں تو میں بلا تامّل اپنی ساری آرزوؤں سے دست بردار ہو جاؤں۔''

اس سے زیادہ برصغیر کے ۹ کروڑ مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کا نسخہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ کانگریس میں شامل ہوجائیں لیکن ان کی کوئی بھی شرط نہیں مانی جائے گی۔ یہ بات ایک دو آدمی کی نہیں تھی نو کروڑ مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ تھا۔ جسے مولانا آزاد ذرہ برابر بھی اہمیت نہیں دینا چاہتے تھے، کیوں کہ ایسا کرنے سے گاندھی و پنڈت جواہر لال نہرو کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا۔ کیسی عجیب بات ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو خطرے سے بچانے کے ولیے کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنے کی بات کرتا ہے، اس سے زیادہ خود غرضی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے؟

(مولانا آزاد اور مسلمان۔ ابراہیم اشک، ص ۴۰، بحوالہ سہ ماہی الکوثر، سہسرام، شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء)

ملک کے بٹوارے کے بعد مولانا آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم بنائے گئے۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ان کی بات سنتے اور مانتے بھی تھے۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد کا بڑا احترام بھی کرتے تھے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو تعلیمی پسماندگی سے باہر نکالنے کے لیے مولانا آزاد بڑا اہم رول ادا کر سکتے تھے لیکن بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ سرسیّد کے سر پر کسی حکومت کا سایہ نہیں تھا لیکن قوم کے لیے جذبہ صادق اور خلوص ایسا تھا کہ بغیر کسی وزارت کے تمام ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کردی۔ مولانا جوہر کی کوششوں سے جامعہ ملیہ کی بنیاد پڑی لیکن مولانا آزاد کے دور میں وہ زبان جس کی وجہ سے مولانا آزاد صحافت اور ادب میں جانے گئے، سیاست میں مانے گئے، وہی زبان اردو تعلیمی مدرسوں سے بے دخل ہوتی رہی اور مولانا آزاد خاموش تماشائی کی طرح اپنی وزارت کی کرسی سے چپکے رہے۔ اُردو کو پہلے گاؤں سے بے دخل کیا، پھر قصبوں اور پھر شہروں سے۔ رام پور، بھوپال، ٹونک، علی گڑھ، بریلی، امروہا، جاورہ اردو کے مراکز سمجھے جانے والے نہ جانے کتنے ہی مرکز ایسے اُجڑے کہ دوبارہ بسنے کا نام نہیں لیا۔ مولانا آزاد ہندوستان کے وزیر تعلیم امام الہند بنے بعد دیگرے اردو مراکز کے اُٹھنے والے ان جنازوں پر فاتحہ پڑھتے اور سگریٹ کا دھواں اُڑاتے رہے۔ قوم کی اصلاح کرنے والا وہ مولانا ابوالکلام آزاد جو کانپور کے شہیدوں کے لیے تڑپ اُٹھتا تھا، ان کی برسیاں منانے کے لیے مسلمانوں کو للکارتا تھا، ان کے مرثیے پڑھنے کے لیے آواز دیتا تھا، سیاست کے گہرے غاروں میں نہ جانے کہاں سو گیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی بڑھتی جارہی ہے، ان کی زبان، تہذیب و تمدن، سماجی و سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ ہندوستان میں ان کی وفاداری کا ثبوت یہ مانا جاتا ہے کہ وہ سلمان رشدی جیسے ملعون کی تعریف کریں، تسلیمہ نسرین کے نام پر قصیدہ خوانی کریں، بابری مسجد کی شہادت کو جائز

قرار دیں، سول کوڈ کو خوشی سے مان لیں، ورنہ نسل درنسل چلی آرہی قربانیوں کو بے کار سمجھا جائے گا۔ یہ سب مولانا آزاد کی رہنمائی نے ہمیں دیا ہے، جسے ہمیں ہی نہیں ہماری آنے والی وطن پرست نسلوں کو بھگتنا ہے۔ ایک انسان کی خود غرضی کتنی نسلوں کو تباہ کرتی ہے، یہ اس سے ظاہر ہے۔

(مولانا آزاد اور مسلمان، از ابراہیم اشک، سہ ماہی الگوثر سہسرام، شمارہ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۰ء، ص ۴۴)

''مسٹر ابوالکلام آزاد جن کا شمار صف اوّل کے مسلم کانگریسی لیڈروں میں ہوتا تھا انھوں نے ناگپور کیمپ کی مسجد میں جمعہ پڑھایا اور خطبہ میں جہاں خلفائے اربعہ واہلِ بیت کی تعریف کی جاتی ہے، ان کی جگہ گاندھی کی تعریف کی اور انھیں ستودہ صفات کہا۔'' (فتاویٰ رضویہ، جلد ششم، ص ۱۱)

''میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے، جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد واتفاق نہ کرلیں۔ یہ اعتقاد قرآنِ مجید کے نصِ قطعی پر مبنی ہے۔'' (خطباتِ آزاد، ص ۷۴، بحوالہ جہانِ مفتی اعظم، مطبوعہ رضا اکیڈمی، از مولانا تطہیر احمد مصباحی، ص ۸۰۳)

''مسلمانوں کو اپنے حقوق کے تحفظات کے لیے گورنمٹ برطانیہ کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ انھیں برادرانِ وطن (ہندوؤں) کی طرف دیکھنا چاہیے، ان سے بدگمان نہیں رہنا چاہیے بلکہ جوق درجوق کانگریس میں شریک ہونا چاہیے۔ کانگریس کے ہاتھوں میں ان کے حقوق بالکل محفوظ ہیں۔'' (ارمغانِ آزاد، از: ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ص ۱۷۵)

قرآن کا انکار کرتے ہوئے کانگریس کی ہندو قیادت کی خوشنودی اور ہندوؤں میں ہر دل عزیزی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف راغب کرنے کے لیے جمعیۃ اہلِ حدیث کانفرنس منعقد ۱۹۴۳ء کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ:

''اسلام اور مسلمانوں کا حریف اگر کوئی ہوسکتا ہے تو عیسائی مذہب اور عیسائی قوم ہے، دوسرا کوئی نہیں۔''

(خطباتِ آزاد، ص ۲۴۹، بحوالہ جہانِ مفتی اعظم، ص ۸۰۲، مولانا تطہیر احمد مصباحی)

حالانکہ بصیرت سے محروم اس امام الہند مفسرِ قرآن کی کیا بصارت بھی زائل ہوگئی تھی جسے قرآنِ مجید کا یہ واضح فرمان دکھائی نہیں دیا؟

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۔ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۔ (چھٹا پارہ، سورۂ مائدہ، رکوع ۱۰)

''ان میں تم بہت کو دیکھو گے کہ کافروں سے دوستی کرتے ہیں کیا ہی بُری چیز ہے اپنے لیے خود آگے بھیجی یہ کہ اللہ پر ان کا غضب ہوا اور وہ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔''

پھر اسی پارہ ورکوع میں ایک آیت کے بعد یوں ارشاد ہورہا ہے:

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ج وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً

لِلَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔

''ضرور تم مسلمانوں کا سب سے بڑھ کر دشمن یہودیوں اور مشرکوں کو پاؤ گے اور ضرور تم مسلمانوں کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان کو پاؤ گے جو کہتے تھے ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس لیے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں اور یہ غرور نہیں کرتے۔''

سچ ہے کہ ع خدا جب دین لیتا ہے تو عقلیں چھین لیتا ہے

چند روز حیاتِ مستعار اور منصب و جاہ کے لیے نہ تو اپنے علم و فضل کو دیکھا اور نہ ہی اپنے خاندان کی عظمتوں کو! اپنے عظیم ترین والد ماجد حضرت علامہ خیر الدین کی عظمت و جلال اور ان کے علم و فضل اور پورے عالمِ اسلام میں ان کی بلند قامتی کا بھی کچھ خیال نہیں کیا۔ یہ تو وہی مثال ہوئی کہ ؎

وہ شخص کہ قد جس کا ان سب سے بڑا تھا
دیکھا تو وہی غیر کے قدموں میں پڑا تھا

یہ حال ہے ہندوستانی مسلمانوں کے صف اوّل کے قائد اعظم ابوالکلام (مادر پدر) آزاد کا۔ اب ذرا اسی ٹولی کے دوسرے صف کے خود ساختہ مسلم قائدین اور سیاسی ایوان میں مسلمانوں کے خود ساختہ نمائندگان اور ان کی جماعت کا تفصیل میں نہ جاتے ہوئے اس کی چند جھلکیاں پیش کریں گے، تاکہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ یہی حکومت کی آنکھوں کے تارے، راج دُلارے اور کانگریسی حکومت اور اس کے صنادید کے دل و نگاہ کے تسکین کے ساماں کیوں؟

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ع سر میدان کفن بر دوش دارم

کے مصداق صرف ابوالکلام آزاد اور جمعیۃ العلماء ہند کے شیخ الہند و شیخ الاسلام مولانا محمود الحسن و حسین احمد مدنی ہی تھے بلکہ سیکڑوں و ہزاروں علما و مشائخ آزادیِ وطن کی خاطر اپنی جانوں کو ہتھیلی پہ لیے ہوئے تھے اور پھانسی کے پھندوں کو چوم کر ''من از سرِ نو زندہ کنم دار و رسن'' کی عملی تفسیر تھے مگر اس طبقۂ خاص نے آزادیِ وطن کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر شرعی حرمتوں کا احترام بھی ملحوظ رکھا، مخلوق کی خوشنودی پر خالق کی خوشنودی و رضا مندی کو مقدم جانا، اپنے موقف یعنی حصولِ آزادی پر استقلال و استقامت کے ساتھ دامنِ اعتدال کو ہاتھوں سے نہیں جانے دیا۔ انھیں گاندھی، نہرو، پٹیل اور جناح کے بجائے اللہ و رسول (جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضا و خوشنودی مطلوب تھی۔ ہزار سالہ محکوم رہنے والی ہندو اکثریت کے لیڈران آزادی کے بعد اپنی حاکمیتِ اعلیٰ کے آرزو مند تھے تو انھیں ہزار سالہ پُر شکوہ بادشاہت کے وارثوں کو جو دس کروڑ کی تعداد میں تھے، انھیں محکومت اور دوہری غلامی سے بچانے کے لیے مسلمانوں کے سچے اور مخلص قائدین اور علما و مشائخ مسلمانوں کی محکومیت کو کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ ہندوستان کے علما و مشائخ اور پیرانِ کرام نے اس خصوص میں بڑا مؤثر کردار ادا کیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی غیر مشروط غلامی سے بچانے کی بھر پور کوشش کی۔ دوسری طرف مولانا ابوالکلا آزاد اور جمعیۃ العلماء کے مٹھی بھر افراد تھے جو تقسیم ملک کے بعد میدان خالی پا کر خوب کھیل کھیلے، کیوں کہ تقسیم ملک اور

تشکیل پاکستان کے بعد اصحابِ بصیرت اور حاملین کردار و عمل جن میں بڑے بڑے اُمرا، رؤسا، نوابین، والیانِ ریاست، اہلِ دولت وثروت اور اصحابِ اثر و نفوذ بالخصوص قدآور اور اہم ترین علما و مشائخ کی غالب ترین اکثریت ہجرت کے نام پر ترکِ وطن کرگئی۔ انتقالِ مکانی کے وقت پورے ملک میں مسلمان ہلاکت و بربادی سے گذرے اور رہ جانے والے مسلمان جس آگ وخون کے دریا میں ڈوبے، کروڑوں اربوں کی اِملاک تباہ و برباد ہوئے، لاکھوں عفّت مآب عورتوں کی حرمت و ناموس پامال ہوئے۔ حالات کی برہمی کے پیش نظر رہ جانے اور کسی بھی قیمت پر اپنا وطن ہندوستان نہ چھوڑنے والے شخصیات و رجال بہت برداشتہ خواطر ہوئے۔ ان عظیم ہلاکتوں اور بربادیوں کے پیش نظر خوف زدہ بھی ہوگئے۔ کیوں کہ آزادیِ وطن کے ساتھ ایک حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل کے لیے سب سے زیادہ پُرجوش وکفن بردوش جلیل القدر علمائے اہلِ سنّت ومشائخ اہلِ سنّت و پیرانِ عظام ہی تھے جن کا علمی و روحانی و ایمانی رشتہ براہِ راست یا بالواسطہ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مولانا شاہ احمد رضا محدث بریلوی سے تھا۔ کئی نسبتوں اور حوالوں سے امام احمد رضا بریلوی ہی ان کے فکر و نظر کے محور اور ساتھ ہی مرکز عقیدت بھی تھے، یہ وہ حقائق تھے جن کے پیش نظر رہ جانے والے اہم ترین اور چوٹی کے علما و مشائخ و پیرانِ عظام نے خود کو صرف مذہبی دائرے تک محدود کرلیا اور کچھ اپنے حزم و اتقا کے سبب اپنی مسجدوں وخانقاہوں تک محدود رہ کر بندگانِ خدا کے رُشد و ہدایت کے فریضہ میں خود کو مصروف کرلیا۔ کچھ خالص علمی شخصیات تھیں جو پہلے بھی دینی درس گاہوں تک محدود تھیں اور جو مردِ میداں تھے انھوں نے بھی اشاعتِ دین وسنّیت اور خالص دینی و مذہبی خطابت کو اپنا میدان منتخب کرلیا اور بادلِ ناخواستہ سیاستِ حاضرہ کے دروازے کو خود پر بند کرکے اسے شجر ممنوعہ قرار دے دیا۔ صرف چند استثنائی شخصیات کو چھوڑ کر جیسے محسنِ ملت حضرت علامہ حامد علی فاروقی، حضور مجاہد ملت مولانا حبیب الرحمٰن قادری اور ان کے رفقا و متبعین، قائدِ اہلِ سنّت حضرت علامہ ارشد القادری، مجاہدِ دوراں علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی (ایم پی)، نباضِ وقت مولانا سید اسرار الحق کوٹہ راجستھان اور مولانا چمن قادری وغیرہ کا جفاکش و جفاپیشہ تو بعد کا گروہ ہے۔

میدان بالکل خالی پا کر وہ طبقہ جو آزادی سے قبل ہی اپنے دین وضمیر اور اپنے عالمانہ منصب و جاہت اور اپنے شرعی و حیثیت عرفی کو کانگریس کی ہندو قیادت کے قدموں پر گروی رکھ چکا تھا، جس کی بے ضمیری اور خوشنودی اغیار کا عالم یہ تھا کہ اپنے مذہبی تقدس و اسلامی لبادے پر کھدّر پوشی کو ترجیح دی اور اس میں گاندھی و نہرو کی خوشنودی میں اتنا غلو کیا کہ ہر مسلمان کو کھدّر پوش دیکھنا اس کی بنیادی ترجیح بن گئی۔ یہاں تک کہ اس مرنے والے مسلمان کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے تھے جس کا کفن کھدّر کا نہیں ہوتا تھا۔ جن کے غلامانہ وخوش آمدانہ ذہنیت پر مولانا جسٹس اکبر الٰہ آبادی جیسے لوگ بھی بڑے دُکھ کے ساتھ کہہ پڑے ؂

یہ کانگریسی مُلّا تجھ کو بتاؤں کیا ہیں	نہرو کی پالیسیوں کا اردو میں ترجمہ ہیں

جو اپنے اوپر وطنیت کے بُت کو مسلّط کرتے وقت اسلام کی ابتدائی درخشاں تاریخ کو بھول گیا، جس پر ڈاکٹر اقبال جیسے دیدہ ور، ان کے شیخ الاسلام کے لبادے کو تار تار کرتے ہوئے انھیں کو آئینہ دکھاتے ہوئے یوں پھٹ پڑے ؂

عجم ہنوز نہ دانند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد چہ بوالعجبی است
سرود برسر منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باونہ رسیدی تمام بو لہبی است

ان اشعار کے بعد ڈاکٹر اقبال خاموش نہیں رہے بلکہ اپنے گراں قدر مکتوبات کے ذریعے جب دینی گرفت شدید کرتے گئے تو اپنے مقتدیٰ مولانا اشرف علی تھانوی کی اتباع کرتے ہوئے اپنی غلطیوں کا اعتراف ورجوع کے بجائے اپنے قول کی تاویل درتاویل کا سہارا لیتے ہوئے اور اگر مگر لگاتے ہوئے اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہوئے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ :

''اگر اس مشورے کو (یعنی اسلام ودین ومذہب پر وطن کو ترجیح دینے کو) خلافِ دین وامانت شمار کیا جاتا ہے تو اعلان کرتا ہوں کہ میں اس کو فریضہ سمجھتا ہوں فذالك ذنب لست منه اتوب۔ یہ ایسا گناہ ہے جس سے میں توبہ نہیں کرسکتا۔'' آزادی اور تقسیم لک کے بعد اس طبقے کو اندھوں میں کانا راجہ کی حیثیت حاصل ہوگئی اور جمعیۃ العلماء ہند کے نام سے چڑھتے سورج کے پجاریوں، اقتدارِ وقت کے دلالوں اور دین وضمیر فروشوں کا یہ طبقہ (جو مٹھی بھر افراد پر مشتمل تھا) بڑی تیزی کے ساتھ چار کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی نمائندگی کے نام پر اُبھرا اور مولانا ابوالکلام آزاد کے نقش قدم پر چلتا ہوا انھیں اقتدارِ وقت کے کشکول میں ڈال دیا۔

(تفصیل وتحقیق کے لیے دیکھیے ''الجمعیۃ'' کا ''شیخ الاسلام نمبر'' اور مولانا جسٹس محمد تقی عثانی بن مولانا مفتی محمد شفیع عثانی کا مبسوط وقابل ذکر سفر نامہ ''جہاں دیدہ'')

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا یہی حقیقت ہے، مسلکی عصبیت نہیں۔ جس کی تائید دہلی کے مشہور وسنجیدہ ماہ نامہ ''قاری'' سے بھی ہورہی ہے۔ اس کے دیدہ ور ایڈیٹر اپنے طویل ادارتی کالم میں رقم طراز ہیں:

''بدقسمتی سے تقسیم ملک کے بعد ملتِ اسلامیہ کے باصلاحیت وصاحبِ کردار افراد ترکِ وطن کر گئے اور اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی وسیاسی قیادت کے خود ساختہ دعوے دار جمعیتی لیڈروں نے اربابِ اقتدار سے انتہائی چالاکی وعیاری کے ساتھ ساز باز کر کے زخم خوردہ اور نیم جاں مظلوم امتِ اسلامیہ کے عظیم ترمفادات کو اپنے قابلِ مذمت اقتدار کی قربان گاہ پر چڑھا دیا۔ اس طرح سیاسی میدان میں ان درباریوں کے ناپاک وجود کو زندہ رکھنے کے لیے پارلیمنٹ کی کوئی سیٹ یا اسمبلیوں کی اِکّا دُکّا نشست بطور خیرات اِن گداگروں کی جھولی میں جاتی رہی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ خود ساختہ راج کمار اپنا شمار پانچ سواریوں میں کرنے لگے۔ (ملخصاً)

یہ اُن ملت فروشوں کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو تمام ہی اعزازات بطورِ نوازشِ خاص چور دروازے سے دیئے جاتے رہے اور ملک کی آزادی سے لے کر آج تک ان جمعیتی قبر فروشوں کو یہ جرأت نہ ہوسکی کہ یہ سینہ تان کر ملتِ اسلامیہ کے مظلوم عوام سے اپنے قول و عمل اور افعال و کردار کی حقّانیت پر سندِ تائید و استحسان حاصل کرسکیں۔"

(ماہ نامہ قاری، شمارہ جنوری ۱۹۹۸ء)

تقسیم ملک سے قبل خالص سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی کئی تنظیمیں میدانِ عمل میں کفن بردوش تھیں۔ جماعت انصار الاسلام (۱۹۱۲ء)، جماعت رضائے مصطفٰے (۱۹۲۰ء)، آل انڈیا سُنّی کانفرنس ۱۹۲۵ء، کل ہند جماعت الصوفیہ جن کی ایک حیرت انگیز اور زرّیں تاریخ ہے۔ مگر تقسیم ملک و تشکیل پاکستان کے بعد ان کی حیثیت و افادیت و اہمیت کی جہتیں بدل گئیں۔ ایسا بھی نہیں کہ ہندوستان میں رہ جانے والے اہم ترین اکابرین اہلِ سنّت و اساطین اُمت نے مسلمانوں کو لاوارث چھوڑ دیا بلکہ انھوں نے سوادِ اعظم و اسلامیانِ ہند کو آل انڈیا تبلیغ سیرت، آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ اور آل انڈیا سنّی جمعیۃ العلماء جیسی اہم ترین تنظیمیں دیں، جو اپنے اپنے وقتوں میں کافی سرگرم عمل رہیں۔ چونکہ جمعیۃ العلماء جو کانگریس کے مفاد کے بطن سے ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئی تھی اور مسلمانوں کو غیر مشروط طور پر کانگریس کی غلامی میں ڈالنے کے لیے بطور ایک چال تھی۔ گویا اس نے اپنے سیاسی بساط پر کچھ مذہبی پہرے بٹھادیے تھے، جسے جمعیۃ العلماء کا نام دے دیا تھا۔ جس کی اس نے مسلسل نصف صدی تک آبیاری کی، اس کو سرکاری نوازشات کے ذریعے مضبوط کیا اور ہر حال میں اس کی سرپرستی کی اور آج بھی کسی نہ کسی حد تک وہ رسمِ وفا نباہ رہی ہے اور کانگریس نمک خوار ہر منزل اور ہر موڑ پر حق نمک ادا کرتے رہے، جس کی ایک واضح مثال ۱۹۷۷ء میں اِندرا گاندھی کے زوال کے بعد بدعنوانیوں کے الزام میں اندرا جی کو جنتا پارٹی حکومت نے جیل میں ڈال دیا، جس کے لیے جمعیۃ العلماء ہند کے صدر مولانا اسعد مدنی نے شدید احتجاج کے طور پر اِندرا گاندھی اور کانگریس قیادت کی خوشنودی کے لیے اپنی رضا کارانہ گرفتاری پیش کی اور خود کو اپنے حواریوں کے ساتھ داخلِ زنداں کیا اور اِندرا گاندھی کو جیل سے باہر لانے کے لیے پورے ملک میں "ملک و ملت بچاؤ" تحریک چلائی، جس کو اہلِ نظر نے "ملک و ملت بیچ آؤ" کا نام دیا۔ گویا جمعیۃ العلماء کے نزدیک اِندرا گاندھی کا تنہا وجود ملک بھی تھا اور ان کا ملت بھی! غالباً اسی لیے دار العلوم دیوبند کے جشنِ صد سالہ کے اِجلاس کا افتتاح بھی علمائے دیوبند نے اپنی مِلّت اِندرا گاندھی سے کرایا تھا، وہ بھی عرب و عجم کے علما کی موجودگی میں! جس پر پورے ملک سے ان کے اپنوں نے بھی لعنت و ملامت کا سلسلہ بہت دنوں تک جاری رکھا تھا۔ کیوں نہ ہو کہ یہ اس باپ کے بیٹے تھے جس نے وطن کو ملت پر ترجیح دی تھی اور ہمیشہ کے لیے ڈاکٹر اقبال کی طرف سے "عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں" کا تمغہ حاصل کیا تھا، تو سعادت مند بیٹے نے الولد سرٌّ لِاَبیہٖ کے تحت اگر کانگریسی قیادت کو اپنی مِلّت ہی بناڈالا تو اس میں تعجب ہی کیا ہے ؎

خوشامدوں میں نہیں عظمت وفا یارو
اگر ضمیر ہے زندہ تو آؤ سچ بولیں

یہ ایک مثال ہے ورنہ جمعیۃ العلماء کے قیام ۱۹۲۰ء سے لے کر جناب اسعد مدنی کی حیات تک طویل دور کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو مجلّات تیار ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مٹھی بھر افرادی قوت کے باوجود وہ ایوانِ سیاست میں چودہ کروڑ مسلمانوں کے نمائندہ خود ساختہ ترجمان بن بیٹھے ہیں، حالانکہ آل انڈیا تبلیغ سیرت، مسلم متحدہ محاذ اور آل انڈیا سنّی جمعیۃ العلماء نے بار ہا اپنے افرادی قوت کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی حکومت کو دکھاتی رہی، مگر کانگریسی حکومت نے دانستہ ۸۵ رفیصد مسلمانانِ ہند کے مذہبی نمائندگی پر پانچ فیصد مسلمانوں کے نمائندوں کو ہی عملاً پورے ملک کے مسلمانوں کا نمائندہ مانا۔ انھیں بیچاروں نے ہمارے یعنی کانگریس کے لیے قربانیاں دیتے وقت اپنے دین و دھرم کو نہیں دیکھا بلکہ ہماری خوشنودی، ہماری مرضی اور ہماری رضا جوئی ہی ان کے پیش نظر رہی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اِجتماعی مفاد کو حکومت کے مفاد پر قربان کیا اور پورے عالمِ اسلام کو مطمئن بھی کرتے رہے کہ ہندوستانی مسلمانوں پر حکومت کا کرم ہے اور یہاں سب خیریت ہے۔ انعام کے طور پر ان پر سرکاری نوازشات کے دروازے ایسے کھلے کہ پارلیمنٹ و اسمبلی کی کرسیاں انھیں اعزازی طور پر مستقل پیش کی جانے لگیں اور مرکزی وصوبائی جتنے بھی سرکاری و نیم سرکاری اِدارے اور مسلمانوں کے تعلق سے سرکاری بورڈ تھے، ان سب سرکاری اِداروں اور بورڈوں میں انھیں جگہ دی گئی اور اس طرح سے سیاسی دروازے سے وہابیت و دیوبندیت کو پاؤں پسارنے کا خوب خوب زرّیں موقع میسر آیا۔ جس میں نہ وہ چوکے، نہ سست ہوئے۔ اس طرح سے وہابیت پورے ملک میں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی اور ہم اپنی غیر معمولی اکثریت کو اوڑھتے اور بچھاتے اور حکومت کو دکھاتے رہے مگر لاحاصل۔ ہر اہم جگہ وہی نظر آئے۔ کہاں ایک وقت وہ تھا کہ بقول شاعر اہلِ سنّت حضرت اجمل سلطان پوری ؎

وہابی سے پوچھو کہ تم ہو وہابی　　　　توفوراً کہے گا نہیں تو، نہیں تو

اور کہاں آج عالم یہ ہے کہ اب بڑے فخر و مباہات کے ساتھ وہ نہ صرف دیوبندی ہیں بلکہ اپنے تمام وہابیت اور اس کے اعلام کے باوجود وہ اہلِ سنّت بھی ہو گئے ہیں۔ اب وہ علمائے اہلِ سنّت بھی، خطیب اہلِ سنّت بھی، مناظر اہلِ سنّت بھی ہیں اور ہم بڑے تواضع و اِنکساری بلکہ کہیں کہیں شرمساری کے ساتھ فقط بریلوی ہو کر رہ گئے ہیں، کیوں کہ یہی ہمارا امتیاز اور ہمارا تشخص رہ گیا اور اس کے بغیر نہ ہماری سنّیت محقق ہے اور نہ حقّانیت۔ انّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

سلطان القلم قائد اہلِ سنّت حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے ایک ملاقات میں جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء دہلی کے لیے ایک پلاٹ سرکاری ریٹ میں حاصل کرنے کی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: مولا وارث جمال صاحب! چار سال تک میں نے جامعہ حضرت نظام الدین اولیاء کے نام پر پلاٹ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن جب فائل آخری مرحلے میں داخل ہوئی تو کہیں نہ کہیں کوئی جمعیۃ العلماء کے ہاتھ لگ جاتی اور اس کے قلم کی ایک بوند روشنائی میری سال بھر کی محنت کو برباد کر دیتی۔ جب میں نے محسوس کر لیا کہ مجھے اس نام پر پلاٹ نہیں مل سکتا تو میں نے ذاتی و خاندانی نام (غلام رشید) کے نام پر پلاٹ حاصل کرنے کی نئے سرے سے کوشش کی، جو بحمدہٖ تعالیٰ چھ ماہ کے اندر

صرف پلاٹ حاصل ہو گیا بلکہ اب اس پر ایک چار منزلہ پُرشکوہ عمارت آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ پھر مسکرا کر فرمانے لگے کہ اگر میں اپنے عرفی نام ''ارشد القادری'' پر پلاٹ حاصل کرتا تو اس کا بھی یہی حشر ہوتا۔ مولانا! جمعیۃ العلماء کی مہربانی سے وہابی تمام اہم و قابلِ ذکر سرکاری و نیم سرکاری اداروں اور مرکزی و صوبائی بورڈوں میں گھسے ہوئے ہیں اور واقعی اس راستے سے وہابیت کافی مضبوط ہوئی۔ تقسیم ملک کے بعد، تقسیم ملک کے الزام میں یہاں ہندوستانی مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی اور تباہی و بربادی و ہلاکت خیزی و عصمت ریزی کا جو طوفان برپا ہوا، اس کے پیش نظر ہندوستان بھر کے علما و مشائخ و اربابِ فکر و نظر کے اتفاق رائے سے سرزمین بریلی شریف عرسِ رضوی کے موقع پر ۲۴ر صفر المظفر ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۶ر دسمبر ۱۹۶۹ء آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام عمل میں آیا۔ حضور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفےٰ رضا خاں بریلوی، محدثِ اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی، ملک العلماء مولانا سید ظفر الدین بہاری کی سرپرستی میں، جس کے صدر حضور مجاہد ملت علامہ حبیب الرحمٰن قادری منتخب ہوئے اور علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی جنرل سیکریٹری، خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی، امین شریعت علامہ مفتی رفاقت حسین مظفر پوری، خلیفۂ اعلیٰ حضرت علامہ عارف اللہ میرٹھی، مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پوری، مولانا سید احسان علی، مولانا سلیم اللہ بنارسی، حکیم محمد یونس نظامی وغیرہ کلیدی جگہوں پر فائز ہوئے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت نے اپنی ترک تازیوں، اپنے حسن خدمات اور کارناموں سے حکومت کو بھی احساس دلایا کہ مسلمانانِ ہند کی اصل نمائندگی اور حقیقی قیادت کدھر ہے۔ اس صورتِ حال نے اقتدارِ وقت کے دلالوں کو فکر و تشویش میں مبتلا کر دیا۔ بالآخر ایک سازش کے تحت آل انڈیا تبلیغ سیرت کے گرد قانونی شکنجہ سخت سے سخت کر دیا۔ حوصلوں کی شکست و ریخت کے لیے اس کے قائد مجاہد ملت علامہ حبیب الرحمٰن قادری کو آئے دن قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا۔ آئے دن حکومت کی سختیاں جوں جوں بڑھتی گئیں۔ مجاہد ملت مسلمانوں اور ان کی آبرومندانہ بقا کے تعلق سے حکومت کے سامنے جھکنے و نرم پڑنے کے بجائے سخت سے سخت تر ہوتے گئے۔ انھوں نے ٹوٹنا تو گوارا کر لیا مگر جھکنا نہیں۔

یہ اسی نہ جھکنے کا شاخسانہ تھا کہ ۱۹۷۵ء کے ایمرجنسی کے سیاہ ترین دور میں اپنے بڑے بڑے سیاسی مخالفین کے ساتھ انھیں بھی جیل میں ڈال دیا گیا اور جیل میں اے کلاس کی بجائے سی گریڈ میں جگہ دی۔ جیل میں بے انتہا سختیوں کے سبب جب آپ بیمار ہوئے تو اسپتال میں علاج کے لیے جب داخل کیا تو پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ قاتلوں، ڈاکوؤں اور عادی مجرموں کی طرح بسترِ علالت پر بھی پاؤں میں بیڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس صورتِ حال نے رفیقوں اور جاں نثاروں کو بددل اور خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔ نتیجے میں متبادل کے طور پر آل انڈیا مسلم متحدہ محاذ کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ جس میں علامہ حامد علی فاروقی نے ایک تاریخی کردار ادا کیا۔ مولانا سید شاہ اسرار الحق، حضور سید العلماء حضرت علامہ سید آلِ مصطفےٰ مارہروی، حضرت محدثِ اعظم کچھوچھوی، خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی، رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری اور حضرت علامہ سید مظہر ربانی جیسی بلند پایہ شخصیات و رِجال کے باہمی مشورے و تعاون سے ایک مضبوط تنظیم ''مسلم متحدہ محاذ'' تشکیل پائی۔ کسی تنظیم میں جنرل سیکریٹری کا عہدہ ریڑھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلند عزائم، بالغ نظر اور

گونا گوں صلاحیتوں کے پیش نظر حضرت علامہ فاروقی کو اس کا جنرل سیکریٹری بنایا گیا۔ بہت جلد آپ نے اپنے عزم و حوصلہ، حسنِ تدبر، بالغ نظری اور جرأت مومنانہ سے اس تنظیم کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں اُتار دیا اور اقتدارِ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انھیں مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدہ ہونے پر مجبور کر دیا۔

رائے گڑھ، جبل پور اور جمشید پور کے فسادات میں آپ نے اپنی اولوالعزمی، بلند ہمتی، بے خوفی اور بالغ نظری سے عزیمت و استقامت اور جرأتِ اظہار کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ فرمایا۔ ۱۹۶۲ء میں جمشید پور میں ''کشمیر کانفرنس''، جو حضرت علامہ ارشد القادری کی رہنمائی میں منعقد ہوئی تھی، اس تاریخی کانفرنس میں آپ نے کشمیر کے تعلق سے ہندوستانی موقف کی جس طرح ترجمانی کی، اس نے اربابِ سیاست و اربابِ فکر و دانش کو حیرت زدہ کر دیا تھا ؎

الٰہی ایسی چنگاری بھی اپنے خاکستر میں تھی

سیاسی بصیرت، قانون فہمی، مجاہدانہ کردار اور سرفروشانہ جذبے کے ساتھ ہی آپ ایک مردِ قلندر اور صوفیانہ مزاج کے حامل تھے۔ آپ سادگی اور تواضع کے پیکر بھی تھے۔ آپ کی عاقلی، دانائی و فرزانگی کو اربابِ عقل و دانش اور اصحابِ فضل و کمال بھی خراجِ تحسین پیش کرتے تھے۔ بقول حضرت علامہ ارشد القادری آپ کی دینی و مذہبی خدمات کے انبار میں سیاسی کارنامے دب کر رہ گئے۔

کاش! اگر آپ کی سیاسی زندگی اور ملک و ملّت کے لیے ان کی حسن خدمات کو ضبطِ تحریر میں لے آیا گیا ہوتا تو جماعت اہلِ سنّت کے لیے ایک سرمایۂ افتخار ہوتا اور علمائے دین کے لیے ایک نشانِ منزل۔

آپ کی بے جگری اور اربابِ اقتدار کے سامنے جرأتِ اظہار کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب ۱۹۶۰ء میں مسلم متحدہ محاذ کی طرف سے ایک ''کل ہند سنّی اوقاف کانفرنس'' پریڈ گراؤنڈ دہلی میں منعقد ہوئی تو آپ کا تاریخی خطاب اور اس میں اس مردِ حق کا جرأتِ اظہار اور مسلم مسائل کے تعلق سے بے حد جذباتی ہوجانا ہی حاصلِ کانفرنس تھا۔ بقول حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کانفرنس کے اختتام کے بعد جب ہم علامہ فاروقی کی قیادت میں ایک وفد کی شکل میں وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کر کے انھیں بتایا کہ پورے ملک میں اہلِ سنّت کی تعداد ۹۰ رفیصد سے بھی زیادہ ہے، اس کے باوجود جمعیۃ العلماء (جو مٹھی بھر اہلِ کلمہ کی نمائندہ تھی) کو سنّی اوقاف کا مالک بنا دیا ہے۔ جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرد بُرد کرتے رہتے ہیں۔ دورانِ گفتگو پنڈت نہرو نے کہا کہ تقسیم ہند کے وقت سارے لوگ مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے تھے مگر جمعیۃ العلماء اس وقت ہمارے ساتھ تھی۔ تو آج ہم اپنی حکومت میں اسے کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں؟ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ نہرو جی کا اتنا کہنا تھا جس پر حضرت محسن ملت علامہ حامد علی فاروقی کا جلال دیکھنے کے لائق تھا۔ بڑے دبنگ لب و لہجے میں وقت کے وزیر اعظم کو آپ نے للکارتے ہوئے (آپ نے تعلقاتِ دیرینہ کی پرواہ کیے بغیر) فرمایا: نہرو جی! اگر آپ کو ان کا ایسا ہی خیال ہے تو آپ کیوں نہیں انھیں اپنے مکان کے کسی کونے میں ان کے لیے کوئی آفس کھول کر انھیں رکھ لیتے؟ مسلمانوں کے وقف شدہ املاک کو برباد کرانے کا حق آپ کو کس نے دیا؟ مسلمانوں کی وقف

شدہ جائداد کواس طرح برباد نہ کیجیے ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا ؎

بندہ مومن کا دل خوف و رجا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

بے شک فاروقِ اعظم کی ایک اولاد، قطب دیوہ حضرت سیدوارث علی شاہ کی دعائے خصوصی، مظہر فیضانِ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا وتلمیذ ارشد حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا کے حسنِ تربیت، اکابرین ملت واعیانِ اہلِ سنّت کے ممدوح و مطلوب و گوہر مقصود کو اتنا عظیم وقد آور تو ہونا ہی چاہیے کہ وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے۔

اقتدارِ وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس انداز میں بات کرنے سے آزادانہ قیادت وغلامانہ قیادت کا فرق بھی واضح ہوگیا ؎

فنا کے بعد بھی باقی ہے شانِ رہبری تیری
ہزاروں رحمتیں ہوں اے امیر کارواں تجھ پر

میں شکر گزار اور دعا گو ہوں عزیز گرامی مولانا محمد قمر الزماں مصباحی سلمہٗ (لیکچرر محسنِ ملت یونانی میڈیکل کالج) اور محبّ گرامی مولانا اکبر علی فاروقی (چیئر مین محسن ملت یونانی میڈیکل کالج، رائے پور) کا۔ انھوں نے سنّیت اور اسلامیانِ ہند کے بطل جلیل محسن ملت علامہ حامد علی فاروقی کے تعلق سے کچھ لکھنے کے لیے آمادہ کیا اور اُس تعلق سے ضروری معلومات بھی بہم پہنچائی۔ حضرت محسنِ ملت کے حوالے سے اپنی بے خبری پر بڑا افسوس ہوا۔ جب مجھ جیسے باخبر کا یہ حال ہے تو نئی نسلوں کے تعلق سے کچھ کہنا ہی کیا!

مولانا محمد قمر الزماں ایک صالح، سعادت مند، جواں فکر اور نوجوان عالمِ دین ہیں، ساتھ ہی متحرک وفعال بھی۔ ابتدا ہی سے قلم سے وابستگی اور کچھ کر گزرنے کی تڑپ ہے۔ اللھم زد فزد مولانا اکبر علی فاروقی ہماری جماعت کے وہ عالمِ دین ہیں جنھوں نے علما کی عام روش سے ہٹ کر ایک الگ پہچان بنائی۔ اکثر ہمارے علما یا تو مسجد قائم کرتے ہیں یا مدرسے، مگر انھوں نے پرائمری سے بارھویں تک ہندی، انگلش میڈیم غریب نواز اسکول اور محسنِ ملت یونانی میڈیکل کالج قائم کر کے ایک نئی مثال پیش کی اور سنیت کی اشاعت کے لیے ایک نئے پلیٹ فارم کا انتخاب کیا۔ مولائے کریم انھیں نظر بد سے بچائے۔ آمین

☑☑☑☑☑☑

یادِرفتگاں

ایک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

میرے مخلص دیرینہ ورفیق دیرینہ کرم گستر وکرم فرماں ہمہ درآن ہمہ صفت مرکزی درسگاہ دارالعلوم اہلسنت فیض الرسول براؤں شریف کے قابل ذکر افاضل وابنائے قدیم ایک بڑا روشن معتبر مستند نام حضرت مولانا قاری اطہر حسین قادری رضوی باتھ اصلی سیتامڑی بہار کا ہے جو کئی نسلوں سے مرکز اہل سنت ومرکز عشق وعقیدت بریلی شریف سے شرف بیعت و ارادت بھی رکھتے ہیں اور اعلی حضرت امام اہلسنت کے پاکیزہ مسلک مسلک حب رسول ﷺ کے دیرینہ خادم اور اسکے مبلغ بھی تھے دور دور تک علاقائی وعلمی حلقوں میں مرکز اہلسنت کے تشخص وعلامت وسواد اعظم اہلسنت وجماعت کی ایک شناخت بھی تھے مسلکی ومشربی بیجا تشدد اور اس کی اجارہ داری سے بہت دور تھے بلکہ ان بوالعجمیوں کے خلاف خود ہی ایک محاذ تھے جنہوں نے اسی رمضان المبارک کی پہلی شب جمعہ ۱۴۴۳ھ مطابق ۸ اپریل 2022 کو داعی اجل کو لبیک کہا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کے وصال سے ایک طویل عہد جو نصف صدی پر زیادہ مشتمل ہے کا خاتمہ ہوا اس عرصے میں وہ میرے ہمدم ہم نوا ہم نفس اور قدم قدم پر میرے دست راست رہے وہ آل انڈیا تبلیغ سیرت مہاراشٹرا باڈی کے طویل عرصے تک جنرل سیکرٹری بھی رہے اس کی تمام ترک تازیوں میں وہ آگے آگے رہے۔ وہ ایک بہترین مدبر، اعلیٰ درجہ کے مشیر اور صاحب الرائے تھے۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کو نئی نئی بلندیاں، نئی نئی جہت دینے میں ہمارے ساتھ ساتھ تھے۔ ان کا وصال صرف ان کے خانوادے ہی کا نہیں بلکی جماعتی نقصان بھی ہے۔ ایسے دور قحط الرجال میں انکا دم بڑا غنیمت تھا اپنی زہانت وبالغ نظری ودور اندیشی کے پیش نظر وہ ہمارے درمیان خلیل جبران بھی کہے جاتے تھے کسی بھی اہم پیچیدہ معاملے میں انکی رائے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی وہ ہر طبقے وہر زمرے میں بڑے ہردلعزیز تھے۔۔

انھوں نے اپنے پیچھے ایک بھرا پورا خانوادہ چھوڑا جس میں اہلیہ کے علاوہ ایک صاحبزادے محمد وقار عرف تمنا تین صاحبزادیاں فروس، نصرت، ثروت، جو اعلی تعلیم یافتہ چھوڑیں جو انکی زندگی میں ہی اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں۔

حضور مجاہد ملت کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت ان کے خانوادے کے غم میں برابر کی شریک ہے اور ان کے لیے دعا گو ہے کہ مولی تعالی اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے میں انکے مراتب ودرجات کو بلند فرمائے ان کے قبر پر رحمت و نور کی بارش فرمائے آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

ان کی یادوں کی لطافت دل اشفتہ دیکھ
پھول کھل آئے ہیں کتنے میرے ویرانوں میں

شریک غم: محمد وارث جمال قادری

مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی ۷ رمضان المبارک ۱۴۴۳ مطابق ۱۹ اپریل 2022

بحر العلوم تو پھر بحر العلوم تھے

دامن نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گل چین تو از تنگی داماں گلہ دارد

خواص اہلِ سنّت و جماعت بالخصوص علمی حلقوں میں یہ خبر وحشت اثر بجلی بن کر ٹوٹی کہ حضرت بحر العلوم نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ دنیائے علم و آگہی میں صفِ ماتم بچھ گئی اور علمی حلقے سوگوار ہو گئے۔ حضرتِ اقدس سراپا خیر و برکت، استاذ الاساتذہ، مرجع العلماء، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ مبارکپوری اعظمی سابق شیخ الجامعہ۔ الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور و شیخ الحدیث مدرسہ شمس العلوم گھوسی ضلع اعظم گڈھ علیہ الرحمہ بندگانِ خدا بالخصوص علماء و مشائخ و اہلِ علم کے لیے اللہ کی ایک بڑی نعمت تھے۔ آپ کے وصال پر ایک طویل علمی عہد کا خاتمہ ہو گیا اور دنیائے علم و آگہی پر ایک سناٹا طاری ہو گیا۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا کی اطلاع کے مطابق ضلع اعظم گڈھ کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ نہیں اُٹھا۔

ہنستے ہنستے یک بیک ناظر وہ کیسے رو پڑا
اس قدر آنسو کہاں سے لمحہ بھر میں آ گئے

کیوں نہ ہو کہ آپ کے فرقِ اقدس پر ''بحر العلوم'' کا لقب اس وقت سجا جب سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت میں اکابرین ملّت و اعاجم رجال صف بہ صف موجود تھے۔ حضور سیّد العلماء حضرت علامہ سیّد آلِ مصطفےٰ برکاتی، حضور احسن العلماء حضرت علامہ مصطفےٰ حیدر حسن مارہروی، مفتیٔ اعظم ہند حضرت علامہ مصطفےٰ رضا خاں بریلوی، برہانِ ملّت حضرت علامہ برہان الحق جبلپوری، مجاہدِ ملّت حضرت علامہ مفتی شاہ محمد حبیب الرحمٰن اڑیسوی، شیخ العلماء حضرت علامہ اویس حسن غلام جیلانی اعظمی، صدر العلماء شارح بخاری حضرت علامہ غلام جیلانی میرٹھی، شمس العلماء حضرت علامہ قاضی شمس الدین جعفری جونپوری، سلطان المناظرین حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین اشرفی حامدی، حافظِ ملّت حضرت علامہ حافظ عبد العزیز محدث مرادآبادی، سرکار کلاں حضرت علامہ سیّد مختار اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی، بادشاہِ علم سلطان الواعظین حضرت علامہ عبد المصطفےٰ اعظمی، بابائے ملّت حضرت علامہ مفتی عتیق الرحمٰن تلسی پوری، امام المعقولات حضرت علامہ محمد سلیمان بھاگل پوری، اجمل العلماء حضرت علامہ محمد اجمل شاہ سنبھلی، روحِ اشرفیہ امام الحکمت حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف بلیاوی وغیرہ وغیرہ علیہم الرحمۃ والرضوان۔

یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جو سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے اکابر و اساطین امّت تھے اور اس زمانے میں القابات متعلقہ شخصیات کے شایانِ شان ہوا کرتے تھے۔ آج کی طرح نہیں کہ القابات اس قدر ذلیل و بے توقیر کر دیے گئے کہ ان

کا غیر معمولی وزن واہمیت وافادیت ختم ہو کر رہ گئی۔

جبکہ ان کے معاصرین میں رئیس القلم سلطان المناظرین حضرت علامہ ارشد القادری، پاسبانِ مِلّت خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی، مجاہد دوراں حضرت علامہ سیّد مظفر حسین کچھوچھوی، رئیس الاتقیاء حضرت علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رضوی، فقیہ عصر حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی، حضرت علامہ سید الزماں حمدوی، حضرت علامہ کامل سہسرامی، حضرت مفتی محمد اسلم بہاری، حضرت علامہ مفتی محمد اشفاق صاحب قبلہ نعیمی، حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین پورنوی اور فقیہ مِلّت حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد امجدی وغیرہ جیسے اصحابِ فضل وکمال کے درمیان وہ مسلّم الثبوت بحر العلوم تھے۔ یہ اپنے زمانے کے وہ دینی ومذہبی مقتدا ہیں جو سوادِ اعظم کی روح اور دین وسنّیت کی دھڑکن اور جماعت اہلِ سنّت کی فصل بہار تھے۔ یہ وہ گنج ہائے گراں مایہ وقد آور شخصیتیں تھیں جن کے نزدیک حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ علیہ الرحمہ اپنے گراں قدر وشایانِ شان لقب بحر العلوم کے ساتھ بہت محترم تھے۔ ہم جیسے ایں قدروں اور ہمہ شما کی بات ہی کیا۔ ؎

بادِ نسیم آج بہت خوشگوار ہے
شاید ہوا کے رخ پہ کھلی چشمِ یار ہے

اللہ تعالیٰ اپنے کم ہی بندوں کو ہمہ جہت خصوصیات سے نوازتا ہے مگر اس نے اپنے بندۂ خاص حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب کو اپنے فضلِ خاص سے ہمہ صفت بنایا۔ علم وفضل کی بلندیوں کے ساتھ انھیں ہمہ تن سادگی، تواضع وانکساری کا پیکر جمیل بنایا۔ تصنع، ریاکاری اور نام ونمود سے بہت دور رکھا۔ وہ جہاں درسگاہی شہرت رکھنے والے ایک استاذِ کامل تھے وہیں وہ ایک اعلیٰ درجہ کے صاحبِ قلم وانشاء پرداز اور ایک کامیاب مصنف بھی تھے۔ وہ اپنے زمانے کے ایسے خطیب تھے جن کا نام جلسوں اور کانفرنسوں کی کامیابی کی ضمانت تھا۔ خطابت میں ان کا اپنا فطری انداز جو تصنع سے بالکل پاک وصاف ہوتا۔ وہ زبردست اثر پذیری کا حامل ہوتا، جو مجمع کو اپنے سحر میں آخر تک گرفتار رکھتا۔ ع کسی کی آنکھ جادو تیری زبان میں ہے۔ اس زمانے کے دینی ومذہبی جلسے جو ہوتے تھے وہ خالص دین وسنّیت کی اشاعت اور اللہ ورسول جل جلالہ وصلی المولیٰ تعالیٰ علیہ وسلم کی رضا وخوشنودی کے لیے ہوتے۔ آج کی طرح جلسوں کے لیے بھاری بھر کم فیس طے نہیں ہوتی تھی اور نہ لفافہ کھول کر دیکھا جاتا، جو بھی دے دیا اسے خوشی خوشی قبول کر لیا گیا۔ اس لیے پہلے کے مقابلے میں آج کے جلسوں وکانفرنسوں میں وہ خلوص وللّٰہیت نہیں رہ گئی۔ اکثر وبیشتر جلسے تقریباً کمرشیل ہو کر رہ گئے۔ جس کی اثر پذیری بھی نہیں کے منزل میں ہو کر رہ گئی ہے۔

حضرت بحر العلوم کا جوہرِ خطابت کسی انسانی ازدحام اور مجمع کثیر کا رہین منت نہیں تھا، ان کا اپنا ایک خاص انداز تھا۔ جس طرح پچیس یا پچاس ہزار کے مجمع میں بولتے، اسی انداز اور اسی نوعیت اور گرم جوشی سے وہ ۱۰۰ یا ڈیڑھ سو کے مجمع میں بھی بولتے۔ جس کا راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ غالباً ۱۹۷۰ء کی بات ہے جب میں دار العلوم اشرفیہ مبارک پور میں زیر تعلیم تھا تو اساتذہ میں سب سے زیادہ قربت مجھے آپ ہی کی بارگاہ سے تھی اور آپ کی شفقتیں وعنایتیں مجھے ہمیشہ حاصل

رہیں۔اسی زمانے میں ہم اپنے گاؤں میں واقع مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر یوپی کے لیے آپ کے جلسے کی تاریخ لی۔آپ نے خوشی خوشی تاریخ بھی عنایت فرمادی۔چونکہ اس زمانے میں آپ کے نام سے جلسوں میں کافی بھیڑ ہوتی تھی اور آپ کے بامقصد خطاب سے عوام وخواص سب مستفیض ہوتے تھے۔چنانچہ آپ کے شایانِ شان جلسے کی تیاری بھی ہوئی۔دور دور تک اس کی تشہیر کی گئی۔جلسے کی تاریخ میں مسلمانوں کی زبردست بھیڑ ہوئی مگر عین جلسے کے وقت وہ بھیڑ اچانک آئے ہوئے طوفانِ بادوباراں کی نظر ہوگئی اور پورا مجمع تتر بتر ہوگیا۔جب طوفان کا زور ختم ہوا مگر ہلکی بارش کا سلسلہ جاری رہا،ایسے عالم میں مدرسہ کے اندر جلسے کا انتظام ہوا۔صرف سو ڈیڑھ سو آدمی رہ گئے،انھیں کے درمیان آپ کا ایسا خطاب ہوا کہ محسوس ہی نہیں ہو رہا تھا کہ آپ ڈیڑھ دو سو افراد کے درمیان خطاب کر رہے یا دس بیس ہزار کے مجمع سے مخاطب ہیں۔ان کی صحتِ خطابت پر مجمع کی کمی بیشی کا کوئی اثر نہیں۔

میرے والد محترم الحاج ملا محمد حنیف قادری یار علوی بانی ومنیجر مدرسہ غوثیہ جو تقریباً ۹۰ سال کے ہو رہے ہیں وہ آج بھی حضرت کی اس تقریر کو یاد رکھے ہوئے ہیں کہ ہم نے ممبئی میں ایک سے بڑھ کر ایک مقرر کو سنا مگر ایسا خطیب نہیں دیکھا کہ مجمع کی کمی بیشی جس کی تقریر پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتی۔تصنع سے پاک خطابت کا وہ فطری ونیچرل انداز جو انھیں کا خاصہ تھا،بس وہ بولتے رہیں اور زمانہ سنتا رہے۔

تیری شمع حق نما میں ہے وہ زورِ رہنمائی
کہ ہزار آندھیوں میں نہ بجھی نہ جھلملائی

درسیات پر عبور کا یہ عالم کہ آغازِ شباب سے عمر کے آخری پڑاؤ تک وہ درسگاہ ہی سے وابستہ رہے۔جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے سیکڑوں تلامذہ دین وسنّیت کی تبلیغ وخدمت علمِ دین میں مصروف ہیں۔

وہ ایسے بحر العلوم تھے جس کی ایک جھلک چار ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے چھ جلدوں پر مشتمل ان کے فتاویٰ بحر العلوم میں دیکھی جاسکتی ہے۔وہ بے حد حقیقت پسند تھے،ان کا ظاہر و باطن ایک تھا،جو دل میں تھا وہی زبان پر اور سادگی میں بانکپن تو ان کی دلآویز شخصیت کا لازمہ تھا۔۲۰۰۰ء میں ہم نے جب حج بیت اللہ وبارگاہِ رسالت مآب میں حاضری کی تمام تر تیاری کر لی تو اسی موقع سے آپ ممبئی تشریف لائے ہوئے تھے۔اطلاع ملتے ہی قدم بوسی کی سعادت حاصل کی اور اپنے حج کے لیے دعا کی درخواست کی۔چونکہ یہ میری پہلی حاضری تھی،اس لیے حضرت سے حج کے ایام میں وہاں کے زمینی حقائق کو سمجھنا چاہا خاص کر حرم شریف میں نماز کو لے کر۔چونکہ حضرت کی ہر سال حرمین طیبین میں حاضری ہوتی تھی لہٰذا ان سے زیادہ وہاں کے زمینی حقائق کا علم اور کس سے مل سکتا تھا خصوصاً ہم جیسے افراد کو۔

وہاں کے حالات پر گفتگو فرماتے ہوئے جب حرم شریف میں نماز کی بات آئی تو فرمانے لگے،مولانا وارث جمال! ہمارے پاس مجاہد ملّت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کا سا کلیجہ تو ہے نہیں کہ عین نماز باجماعت کے وقت کھڑے ہو کر یہ اعلان کرنا کہ حرم شریف کا یہ امام وہابی نجدی عقیدے کا ہے جس کے پیچھے مسلمانوں کی نماز نہیں ہوتی اور جماعت کے

اختتام تک خود کھڑے رہتے، نہ خود ان کی جماعت میں شامل ہوتے، نہ اپنے ساتھ والوں کو پڑھنے دیتے بلکہ ان کی جماعت کے فوراً بعد علی الاعلان اپنی علیحدہ جماعت قائم کرتے۔

آنکھیں ملا کے دیدہ قاتل سے آئے ہیں
ہم ہیں جو اجل کے مقابل سے آئے ہیں

ہمارا اپنا ہمیشہ کا معمول ہے کہ جب ان کی جماعت ختم ہو جاتی ہے تو خاموشی کے ساتھ حرم شریف کے ایک گوشے میں نماز پڑھ لیتا ہوں اور وہاں اس وقت ہمارے جیسے سیکڑوں ہزاروں بوڑھے ہوتے ہیں اور وہاں کسی کو کیا پتہ کہ ان بوڑھوں میں ایک مبارک پور اعظم گڈھ انڈیا کا مولوی عبد المنان بھی ہے۔

ممبئی میں شدید علالت:

کم وبیش دو سال قبل آپ بہت شدید بیمار ہوئے۔ اس وقت بھی آپ کے میزبان مولانا معین الحق صاحب علیمی ہی تھی۔ علاج میں حضرت علامہ سیّد کمیل اشرف صاحب قبلہ نے خصوصی دلچسپی لی۔ آپ ممبئی کے مشہور اسپتال پرنس علی خاں میں ایڈمٹ کیے گئے۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں کی نگرانی میں علاج شروع ہوا۔ مولانا معین الحق صاحب قبلہ کی ساری مصروفیات گھر سے اسپتال تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ مولانا نے اپنی خدمت سے اپنی سعادت پر مہر لگوالی۔ فلحمد للّٰہ علی ذالک۔

دورانِ علالت ایک دن مولانا علیمی صاحب کا فون آیا کہ اسپتال جا کر دیدار کر لیجیے، حضرت اب تو ہمیں بھی نہیں پہچان رہے ہیں۔ آواز میں مایوسی تھی۔ میں بھاگم بھاگ اسپتال پہنچا، حضرت کے پاس اس وقت آپ کے ایک پوتے حضرت مولانا شکیب ارسلان کے بھتیجے موجود تھے، جو پیر سہلا رہے تھے۔ میں بھی انھیں کے ساتھ دست بوسی وقدم بوسی کے بعد شامل ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر ایک گونہ مسرت کا اجالا چہرے پر پھیل گیا، آنکھوں سے شناسا شفقتیں ظاہر ہونے لگیں۔ اس بچے نے حیرت ومسرت کے عالم میں پوچھا، دادا! آپ انھیں پہچانتے ہیں؟ حضرت نے اثبات میں سر ہلایا۔ بچے کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے بڑی حیرت کے ساتھ پوچھا کہ حضرت آپ ہیں کون؟ کل ہی سے دادا کسی کو نہیں پہچانتے تھے۔ میں نے کہا بیٹے میں تمہارے دادا کا شاگرد ہوں، وارث جمال نام ہے، یہیں ممبئی ہی میں رہتا ہوں۔ اب تمہارے داد بہت جلد اچھے ہو جائیں گے اور اب سب کو پہچاننے لگیں گے۔ ہمارے حضرت اور تمہارے داد کو اچھا ہونا ہی ہے، دیکھنا ہمارے حضرت بہت جلد اسپتال سے ڈسچارج ہو جائیں گے۔

پھر تو حضرت کچھ ہی دنوں کے بعد صحتیاب ہو کر اپنے وطن مبارک چلے گئے

حضور غوثیت کبریٰ کی بارگاہ میں:

بیماری سے شفایابی کے کچھ دنوں بعد آپ قطب ربانی غوث صمدانی شہنازِ لامکانی محی الدین جیلانی سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی بغدادی کی بارگاہ میں حاضری کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

یہ مقدس سفر غالباً عزیز گرامی مولانا انوار احمد سلمہ بانی وسربراہ مدرسہ غوثیہ غریب نواز اندور کی کوششوں سے ہوا۔ عمر کے

آخری پڑاؤ میں مولانا انوار حضرت سے کافی قریب ہو گئے تھے اور اپنے حسنِ خدمات و حسنِ عقیدت کے سبب حضرت کی خصوصی دعاؤں و کرم فرمائیوں کے مستحق بھی ٹھہرے۔ **فجزاہ اللہ احسن الجزاء**۔ روانگی کے وقت بھی آپ کی قدم بوسی و دعاؤں سے سرفراز ہوا۔ رخصت ہوتے وقت بڑی شفقت و محبت سے فرمایا، مولانا! میں وہاں خاص کر بارگاہِ غوثیت کبریٰ میں بھی آپ کے لیے دعا کروں گا اور جس دن بغداد شریف سے واپسی ہوئی تو یہاں بھی سہارا ایئر پورٹ پر استقبال کے لیے میں بھی موجود تھا۔

مجھ پر ایک خصوصی کرم:۔

۱۵ر دسمبر ۲۰۰۵ء کی شب محترم مولانا معین الحق علیمی صاحب زید مجدہ کا فون آیا کہ حضرت بحر العلوم صاحب قبلہ تشریف لائے ہوئے ہیں اور آتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ کو پوچھا کہ کیا مولانا وارث جمال سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ میں نے عرض کیا کیوں نہیں، وہ اطلاع پاتے ہی پہلی فرصت میں حاضر ہوں گے۔ چنانچہ آپ کل جلدی آئیے اور اپنی صاحبزادی کے نکاح خوانی کی دعوت بھی دے دیجیے۔ آپ کی بات کا شاید انکار نہ کریں۔ میں نے اس اہم اطلاع پر مولانا کا شکریہ ادا کیا اور دوسری صبح آٹھ بجے آپ کی قیام گاہ شالیمار گیسٹ ہاؤس واقع مجگاؤں پہنچ گیا۔ آپ اپنے ایئر کنڈیشن روم میں آرام فرما تھے۔ میں نے بڑی آہستگی سے پیر دبانا شروع کیا، آپ نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمانے لگے مولانا اتنی جلدی آپ آ گئے، سنا ہے کہ کہیں دور آپ رہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا جی یہاں سے چالیس کلومیٹر ایک جگہ ممبرا ہے، وہیں رہتا ہوں۔ مجھے رات ہی مولانا معین الحق صاحب سے یہ اطلاع ملی اور حاضر ہو گیا۔ فرمانے لگے ارے بھائی مولانا! وہ آپ کی ایک کتاب میرے پاس تھی (اسلام میں بریلوی ایک فرقہ؟) جس میں آپ کے استاذِ محترم حضرت علامہ میرٹھی صاحب کا تذکرہ تھا۔ حضرت علامہ میرٹھی صاحب کے داماد مولانا حافظ ایوب صاحب اشرفی (بولٹن) حضرت کی حیات و خدمات پر کوئی بڑا تاریخی نمبر نکال رہے ہیں۔ ان کا شدید اصرار ہے کہ میں اس میں حضرت کے تعلق سے کچھ لکھوں اور میں نے انھیں ہاں بھی کہہ دیا۔ سوچا تھا کہ آپ کی کتاب سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھ دیتا، مگر پتہ نہیں میرے پاس سے وہ کتاب کہاں چلی گئی یا کسی نے اپنے لیے اس کو رکھ لیا۔ تلاشِ بسیار کے بعد بھی وہ کتاب نہیں ملی، اس لیے آتے ہی میں نے آپ کو پوچھا کہ شاید آپ کے پاس وہ کتاب مل جائے۔ آپ کی باتیں سن کر میں پانی پانی ہو گیا۔ چہ پدی اور چہ پدی کا شوربہ اور چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ میرے پاس وہ کتاب تھی مگر اس نیت سے کہ حضرت اسے سامنے رکھ کر کچھ لکھیں، میں اسے پیش کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔

میں نے عرض کیا، حضور حافظ ایوب صاحب نے مجھے اپنے شدید محبانہ اصرار سے تیار کر لیا ہے اور میں کافی حد تک لکھ بھی چکا ہوں کہ انھوں نے مقالے کی وصولیابی کی آخری تاریخ ۳ر دسمبر بھی دے دی ہے اور میں نے اس میں وہی لکھا ہے جو انھیں دیکھا یا ان سے براہِ راست سنا۔ حالانکہ وہ مقالہ میں نے اپنی بچی کی شادی کی تیاریوں کے درمیان لکھا۔ سترہ (۱۷) فل اسکیپ صفحات پر وہ مضمون مشتمل ہے، قلم اس لیے روک دیا کہ کہیں مضمون لمبا نہ ہو جائے۔ کہ ایسی عظیم شخصیت

پر لکھنے والوں کی کمی نہیں تھی۔ فرمانے لگے نہیں مولانا آپ تو سب کچھ لکھیے جوان سے سنا ہے یا دیکھا ہے۔ ہاں وہ باتیں بھی جس کو آپ چھوٹی یا معمولی سمجھتے ہوں کیونکہ آپ کا وہ مضمون حوالہ وسند بنے گا کہ آنکھوں دیکھا لکھنے والے میرے خیال سے غالباً آپ تنہا ہوں گے۔

پھر لگے ہاتھوں وہیں میں نے اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت ونکاح خوانی کی دعوت دے دی، جو دو دن بعد منعقد ہو رہی تھی۔ آپ نے یہ فرما کر معذرت کردی کہ ہم تو مبارکپور اور مئو وغیرہ مقامی شادیوں میں بھی نہیں شرکت کرتے، چہ جائیکہ ممبئی جیسے شہر کی شادی۔ میں نے عرض کیا حضور میں آپ کی معنوی اولاد ہوں اور میری بچی آپ کی پوتی ہوتی ہے اور پھر آپ مجھ سے یہ کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ میں آپ کی عظمت وتقدس پر آنچ آنے دوں گا۔ بے شک آج کل کی شادیوں میں وہ منکرات اور بے ہودگیاں ہوتی ہیں جس میں آپ تو آپ ہیں ہم جیسے لوگ بھی شریک نہیں ہوتے۔ ان شاء المولیٰ تعالیٰ وہ شادی تمام تر منکرات سے پاک اور اسلامی شریعت کے دائرے میں ہوگی۔ چنانچہ آپ نے شادی میں شرکت فرمائی، ساتھ حضرت مولانا شکیب ارسلان اور مولانا معین الحق علیمی صاحب بھی تھے اور نکاح سے قبل نفسِ موضوع سے متعلق جو آدھے گھنٹے کا شادی حال میں خطاب فرمایا، وہ خطاب بھی ایک تاریخی خطاب تھا۔ شادی کے بعد لوگوں نے مجھے گھیر لیا، کہ یہ کون بزرگ ہیں کہ جنھوں نے اتنی زبردست تقریر نکاح کے تعلق سے فرمائی۔ تقریر کے دوران ایسا لگتا تھا کہ کوئی بہت قابل پروفیسر کلاس لے رہا ہو۔ وہ سب کے سب وی آئی پیز لوگ تھے، میں نے ان سے حضرت کا تعارف کراتے ہوئے کہا وہ ساٹھ سال سے زائد عرصہ ہوا، اب تک کلاس ہی لے رہے ہیں۔ وہ لوگ بہت ممنون ومشکور ہوئے کہ آپ کی صاحبزادی کی شادی کی برکت سے ایسے عظیم المرتبت عالمِ دین کی زیارت اور ان کے خطاب سے شادکام تو ہوئے۔

دنیائے سنّیت پر آپ کے احسانات:

یوں تو آپ کی پوری زندگی علمی ودینی کارناموں سے عبادت ہے، مگر دنیائے سنّیت پر آپ کا یہ احسان بڑی غیر معمولی ہے اور آپ کے تمام روشن علمی کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ فتاویٰ رضویہ شریف کا دنیا کے سامنے لانا ہے۔ امام الحکمت، روحِ اشرفیہ حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ علیہ کی حیات میں ان کا دست وبازو بن کر اور ان کے وصال کے بعد سنّی دارالاشاعت مبارکپور سے جو مزید چار جلدیں شائع ہوئیں اس میں تنہا حضرت بحرالعلوم کا خونِ جگر شامل ہے۔ امام الحکمۃ، خیر الامہ سیّدی وسندی واستاذی حضرت علامہ حافظ عبدالرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمہ بانی سنّی دارالاشاعت مبارکپور کی حیات میں تیسری اور چوتھی جلد شائع ہوئی تھی۔ کل چھ جلدیں سنّی دارالاشاعت مبارکپور سے شائع ہوئیں۔ راقم الحروف وارث جمال قادری کو اس کے کچھ حصے کی پروف ریڈنگ کی سعادت حاصل ہے کہ اس وقت وہاں زیرِ تعلیم تھا۔

مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم سے الجامعۃ الاشرفیہ تک:۔

مدرسہ اہلِ سنّت اشرفیہ مصباح العلوم کو الجامعۃ الاشرفیہ کے عظیم پیکر میں ڈھالنے اور اسے بلندیوں تک لے جانے میں اپنے آقائے نعمت استاذ کریم حضور حافظ ملّت علیہ الرحمہ کے شانہ بشانہ سفر وحضر ہر جگہ ان کی قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

اس کی تعمیر وترقی کے ہر نقش پر حضرت بحر العلوم کا خونِ جگر شامل ہے۔ مسلسل۲۹ ر برس تک اپنی حیات کا قیمتی حصہ اشرفیہ کو دیا اور اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی۔

کیا یوں ہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے
لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں
اے دیر ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

بے شک وہ آسمانِ خوش لہجگی کے بدرِ کامل، انجمن آگہی کے صدر نشین، اولیاء ذہانت کے قافلہ سالار اور اقلیم ژرف نگاہی کے تاجدار تھے۔ سادگی واعلیٰ ظرفی جن کا وصف خاص، تقویٰ وطہارت، خوف وخشیت، حزم واتقا کے پیکر! جن کے چلے جانے سے دنیائے سنّیت سوگوار اور انجمن علم وآگہی ماتم کناں! ان کا وصال صرف ان کے خانوادے کا ذاتی نقصان نہیں بلکہ دین وسنّیت اور سوادِ اعظم کا اجتماعی نقصان ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کے فرزند سعید حضرت مولانا شکیب ارسلان اور پورے خانوادے کے غم میں برابر شریک اور ساتھ میں دعا گو بھی کہ مولیٰ عز وجل اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے وطفیل انھیں اس عظیم سانحہ پر صبر جمیل عطا فرمائیں اور حضرت والا کے مراتب ودرجات کو بلند تر فرمائے آمین۔

ان کی یادوں کی لطافت دلِ آشفتہ دیکھ
پھول کھل آئے ہیں کتنے تیرے ویرانوں میں

اور ساتھ ہی آپ کے تلمیذ ارشد پیکر اخلاص وکرم، نازشِ دین وسنّیت، حامل علم وفن حضرت بابرکت علامہ محمد حنیف صاحب رضوی صدر المدرسین دار العلوم نوریہ رضویہ بریلی شریف کا (کہ اتنی مختصر مدت میں حضرت بحر العلوم علیہ الرحمہ پر اتنا شاندار علمی وتاریخی مجلّہ کسی کرامت سے کم نہیں۔ جسے اپنے عظیم وشفیق استاذ سے والہانہ وابستگی اور ان کی ذات سے بے پناہ عقیدت ومحبت کا شاخسانہ ہی کہا جائے گا۔ اس سے قبل چار ہزار صفحات پر مشتمل چھ جلدوں میں فتاویٰ بحر العلوم کی ترتیب واشاعت اپنی جگہ پر خود ہی ایک عظیم کارنامہ ہے جبکہ اس سے قبل وہ دس جلدوں میں جامع الحدیث کی شکل میں اتنا بڑا علمی کارنامہ وہ انجام دے چکے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اربابِ علم ودانش واصحابِ فضل وکمال میں ایک نمایاں مقام پا چکے) کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور انھیں دلی مبارکباد دیتا ہوں اور ان کے لیے دعا گو ہوں اللھم زد فزد۔ ع تم کام کرو ہو کہ کرامات کرو ہو۔

☑☑☑☑☑☑

مولانا معین الحق علیمی اور دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی

میں چراغ رہگذر ہوں مجھے شوق سے جلاؤ
میری زندگی یہی ہے میں کسی کے کام آؤں

بے شک اپنے کرم فرماؤں اور محسنوں کو یاد رکھنا، ان کے کارناموں کو زندہ رکھنا اور انھیں دہراتے رہنا، ان کے اخلاص وعمل، عزیمت و استقامت اور سوزِ دروں کو نسلاً بعد نسل منتقل کرتے رہنا یہ زندہ قوموں کی علامت اور جذبۂ احسان مندی و شکر گزاری کے مترادف ہے۔

یہ سن کر حقیقت میں بڑی مسرت ہوئی کہ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی کے اربابِ بست وکشا اور اس کے مخلص ترین ہمدردوں و بہی خواہوں بالخصوص اس ادارے کے مخلص و وفا شناس اساتذہ کرام نے مدرسہ علیمیہ کے صدرِ اعلیٰ وسربراہ حضرت مولانا معین الحق علیمی نور اللہ مرقدہ کی حیات وخدمات، دار العلوم علیمیہ کے ساتھ ان کی والہانہ وابستگی اور ادارہ کے تعلق سے ان کی ترک تازیوں اور تب وتاب جاودانہ کو خراجِ تحسین وعقیدت پیش کرنے کے لیے ایک خوبصورت تاریخی مجلّہ نکال رہے ہیں، جس پر بڑی تیزی کے ساتھ کام ہو رہا ہے۔ جس کے لیے فقیر وارث جمال قادری انھیں پُرخلوص دعائیں اور ہدیۂ تبریک پیش کر رہا ہے۔

مولانا معین الحق جو اسی رمضان یعنی ۱۴۴۱ھ کے آخری عشرے کے آخر میں جاں بحق ہوئے، جنہیں مرحوم یا نور اللہ مرقدہ لکھتے ہوئے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی ہے۔ وہ اپنی مختصر سی حیات میں بڑا کام کر گئے، وہ اپنے چھوٹوں پر بہت شفیق و مہربان اور اپنے بڑوں کے لیے وہ پُرخلوص تھے۔ جب بھی ملتے بڑی اپنائیت ومحبت سے اور اپنے بڑوں کے لیے تو وہ سراپا ادب واحترام تھے۔ مجھ خاکسار کو بھی وہ اپنے بڑوں میں شمار کرتے اور کافی احترام کے ساتھ پیش آتے تھے۔

انھوں نے اُجالوں میں آنکھیں کھولیں، زندگی بھر اُجالوں میں رہے اور پوری زندگی بڑے اہتمام کے ساتھ اُجالوں میں ہی گذاری۔ وہ اپنے والد گرامی الحاج شمس الحق علیمی کی طرح کافی کشادہ دست بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انھیں تمام دینی ودنیاوی ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا تھا اور ان کے ظاہری سراپا کو بھی بڑی خوبصورتی و وجاہت عطا فرمائی تھی۔ ع

تم کو دیکھوں کہ تم سے بات کروں

میرے تعلقات ان کے والد مرحوم الحاج سیٹھ شمس الحق علیمی سے بڑے دیرینہ ومخلصانہ تھے۔

☑☑☑☑☑☑

حضرت علامہ مفتی قدرت اللہ صاحب قبلہ کے سانحۂ ارتحال پر!

زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

علم وفضل کے ایک آسمان کو زیر زمین ہوئے ابھی ایک ہی دن گذرا تھا (یعنی بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب قبلہ، کہ اس خبر وحشت اثر نے علمی حلقوں کو ہلا کر رکھ دیا کہ فاضل معقول ومنقول حاوی فروع واصول، زینت فیض الرسول! آبروئے دانش کدہ قدیم! باادب بانصیب کے محسوس پیکر حضرت علامہ مفتی قدرت اللہ صاحب رضوی نے بھی داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اناللہ وانا الیہ رٰجعون۔ آپ کے انتقالِ پُر ملال پر ملک بھر کی قابلِ ذکر درسگاہیں غمناک ہوگئیں اور وہاں کی علمی فضائیں اداس! آپ دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کے قابل وممتاز ترین افاضل میں سے تھے اور فیض الرسول کے اعلیٰ ترین پروڈکٹ! کہ پھر ان کے بعد فیض الرسول سے ان جیسا کوئی فاضل نہیں نکل سکا۔ وہ عہد طالب علمی ہی سے سیکڑوں طلبا کے درمیان بے حد ممتاز تھے۔ ان کا گھرانہ متمول ہونے کے باوجود بہت مذہبی تھا۔ ان کے والد ماجد اور برادران کا ممبئی کے سیٹھوں میں شمار تھا۔ دینی ومذہبی حلقوں میں بھی ان کا احترام تھا۔ فیض الرسول سے فراغت کے بعد دار العلوم فیض الرسول کے شیخ الحدیث حضرتِ اقدس بابرکت علامہ غلام جیلانی اعظمی علیہ الرحمہ کے مشورے پر وہ بادشاہِ علم وفضل حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی کی بارگاہ حضور شیخ العلماء کا سفارشی والا نامہ لے کر دار العلوم منظر حق ٹانڈہ پہنچے۔ حضرت اعظمی صاحب قبلہ ان کی علمی قابلیت دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھیں وہاں کا باقاعدہ مدرس رکھ لیا، مع قابل مشاہرہ۔ وہ وہاں کے قابلِ ذکر استاذ بھی تھے اور درسگاہ سے خارج وقت میں علامہ اعظمی صاحب سے خصوصی اکتسابِ فیض بھی کرتے تھے۔

حضرت شیخ العلماء علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد حضرت علامہ اعظمی صاحب اپنے مشفق ومحسن استاذ کی جگہ دار العلوم فیض الرسول کے شیخ الحدیث ہوئے تو حضرت مفتی قدرت اللہ صاحب نے بھی منظر حق ٹانڈہ چھوڑ دیا۔ پھر تو وہ اپنے مادرِ علمی دار العلوم فیض الرسول میں باقاعدہ مدرس ہوگئے۔

حضرت علامہ اعظمی صاحب قبلہ کے وصال کے بعد پھر تو وہی اساتذہ کرام میں زینت فیض الرسول بھی تھے اور روحِ فیض الرسول بھی!

فقیہ ملّت حضرت علامہ مفتی جلال الدین امجدی علیہ الرحمہ کے بعد وہ فیض الرسول کے مفتی بھی ہوئے اور اپنے زمانے میں فیض الرسول براؤں شریف کے بلند معیار دار الافتاء کو مزید بلند کر دیا بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرے ایک تاریخی استفتاء جو عربی زبان میں تھا، اس کا عربی زبان میں طویل وتاریخی جواب نے دیگر ملک کے تمام قابلِ ذکر ومرجع عوام و

خواص دارالافتاء کے درمیان میں دارالعلوم فیض الرسول کے دارالافتاء کا نرخ بالاتر کردیا۔

بغداد شریف کے فائیو اسٹار ہوٹل الرشید کے ایک کمرے میں صدام یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ کی بارگاہ میں جب ہم نے اپنے ہاتھوں سے پیش کیا تو اسے بغور ملاحظہ فرمانے کے بعد تحیر خیز مسرت کے عالم میں بے ساختہ پکار اٹھے: **مَنْ هُو مفتی قدرت الله؟ هو صاحب العلم والفضل اُرِیْدُ هٰذا الفتوی** - یہ مفتی قدرت اللہ کون ہیں، وہ تو صاحب علم و فضل ہیں مجھے یہ فتویٰ چاہیے۔ وہ استفتاء اور اس کا جواب عراق کے عالمی اسلامی کانفرنس میں آئے ہوئے قابلِ ذکر ممالک اور ان کے مندوبین تک پہنچایا۔ اور کئی عربی ممالک کے وزارتِ اوقاف میں بھی اسے جمع کرایا گیا۔ اسی زمانے میں یٰسین ڈائجسٹ کانپور کے عراق نمبر میں وہ ترجمہ شائع ہوا اور یہاں اس مجموعے میں بھی شامل ہے۔

پورے ملک کے علمی حلقوں میں ان کا بڑا احترام تھا اور ان کی درسگاہی شہرت مسلم تھی۔ وہ فیض الرسول کے ایسے درِّ شاہوار تھے جس کی چمک سے علمی دنیا کی آنکھیں خیرہ تھی۔ وہ اپنے بلند علمی قد و قامت کے ساتھ وہ ایک صاحب الرائے بھی تھے، کسی بھی مسئلے پر کافی غور و خوض کے بعد وہ کوئی فیصلہ لیتے۔ اپنے فیصلے کے بعد جو موقف اختیار کرتے اس پر بڑی سختی کے ساتھ قائم رہتے۔ حضرت خلیفۃ صاحب قبلہ کے وصال کے بعد۔

خانقاہِ فیض الرسول کے سجادہ نشینی کا مسئلہ اس کی ایک بڑی مثال ہے۔ کہ جب انھوں نے ایک موقف اختیار کرلیا تو اسی پر قائم رہے اور اس تعلق سے اقتدارِ وقت کا کوئی دباؤ قبول نہیں کیا اور یہی سبب بنا ان کے فیض الرسول چھوڑ کر جانے کا۔ ؎

بے حسی کی زرد فصلیں روز ہی کٹتی رہیں
آبرو کا ایک دانہ جانے کن خوشوں میں تھا

☑☑☑☑☑☑

آئینۂ معاصر

علامہ قمرالزماں خاں اعظمی۔۔۔میری نگاہ میں!

مبلغِ دین وسُنّیت حضرت علامہ قمرالزماں خاں اعظمی سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے ایک بالغ نظر، حسّاس، صاحبِ سوزِ دروں، مخلص اور ایک باعمل بلند پایہ عالم دین ہیں۔ قابلِ ذکر علما کی صف میں وہ اس وقت بھی منفرد و ممتاز تھے جب اکابر وجید ترین علما ومشائخ صف بہ صف موجود تھے۔ چالیس برس قبل اکابر واساطینِ اُمّت کا اطلاق جن اہم ترین شخصیات ورِجال پر ہوتا، مولانا قمرالزماں صاحب اصاغر کی صفوں میں ہونے کے باوجود اپنے بزرگوں کی نگاہوں میں چڑھے ہوئے تھے، اور اپنے ادب وسعادت، کردار وعمل، تعمیری فکر اور پاکیزہ فطرت کے سبب ان کی پہلی پسند تھے۔ اب تو اکابر ہی نہیں رہ گئے کہ دورِ قحط الرجال کا ہے۔ دوائے دل کی ساری دُکانیں بند ہو چکی ہیں کہ ؎

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا چکے

اب جو بھی اکابر ہیں وہ کبّرنی موت الاکابر کے رہینِ منّت! ایسے عالم میں مولانا موصوف اپنی گوناگوں اور تہہ در تہہ صفات میں خود ہی کارواں ہیں اور خود ہی میرِ کارواں بھی۔ ان کا ادب وسعادت تو مَنۡ سَعَدَ سَعَدَ فِیۡ بَطۡنِ اُمِّہٖ کے مصداق ہے۔

اپنے اکابر کی بارگاہ میں وہ ہمیشہ سراپا ادب واحترام رہے۔ اپنے اسی حسنِ ادب کے سبب وہ اپنے بزرگوں کی دُعا بن کر اُبھرے۔ اور اُبھرے بھی تو ایسے کہ ؎

ایک قطرہ اس قدر موجوں کی طغیانی کے ساتھ

اپنے معاصرین کے ساتھ پوری وضع داری، رواداری ہی نہیں بلکہ اُن کی حیثیت علمی وعرفی کے مطابق بڑے اخلاص واحترام کے ساتھ پیش آتے، جبکہ ان کی خوردہ نوازی کی بھی شہرت ہے۔

آپ کی علمی، دینی، ملّی، فکری، تبلیغی خدمات کا دائرہ ایشیا سے یورپ وافریقہ وامریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اور ان کی خدماتِ دینی تقریباً دنیا کے تمام براعظموں کو فیض یاب کر رہی ہے۔ عالمی سطح پر اہلِ سنّت وجماعت میں مِنۡ کُلِّ الۡجِھَات اتنا قدر آور اور ہندوستانی عالم دین کوئی دوسرا اس وقت نظر نہیں آرہا ہے۔ ان کی تمام تر خدماتِ دینی پوری تفصیلات کے ساتھ یکجا کی جائے تو کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اغیار کی قابلِ ذکر شخصیات ورِجال کی طرح کاش مولانا بھی اپنا کوئی سفرنامہ یا یادداشتیں قلم بند کرادیں تو موجودہ وآیندہ دونوں نسلوں کے لیے ایک مینارۂ نور ثابت ہوگا۔ اور اہلِ سنّت وجماعت کے قیمتی ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگا۔ مسرّت بالائے مسرّت ایں کہ ان بلندیوں میں اللہ عزوجل کا خصوصی فضل اور ان کی ذاتی جدوجہد اور ان کی اپنی صلاحیتوں ہی کا دخل ہے۔ ان کے اس عروج میں کسی بھی طرح کے پدرم

سلطان بود کی کارفرمائیں نہیں ہیں۔ دراصل یہ یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کا شاخسانہ ہے۔۔۔اور بس!

کم سنی میں اُن کے نام کی خوشبو پھیلنا شروع ہو چکی تھی۔ میرے عہدِ طفل کا یہ واقعہ جبکہ آج میں عمر کی ساٹھویں منزل عبور کر چکا ہوں، شمالی مشرق کی عظیم دینی درس گاہ دارالعلوم فیض الرسول، براؤں شریف یوپی میں مفتی فیض الرسول فقیہ ملّت حضرت مولانا الحاج الشاہ مفتی جلال الدین احمد امجدی بستوی کی درس گاہ میں کافیہ پڑھ رہا تھا۔ حضرتِ والا جہاں ایک نامور عالمِ دین اور زبردست مفتی کے ساتھ ایک بلند پایہ ذمے دار خطیب بھی تھے۔ اپنی تحقیقی گفتگو میں زبان وہ استعمال فرماتے جس کو سادہ لوح عوام بھی سمجھ لیں۔ اس لیے دور ونزدیک کے اکثر جلسوں میں آپ کی شرکت ضروری ہوتی تھی۔ ایک روز دورانِ درس عالمِ سرخوشی میں فرمانے لگے: کل رات فلاں جگہ ایک بڑے دینی اجلاس میں شریک رہا۔ اپنے دیہاتی روایت کے مطابق وہ جلسہ کافی رات چلتا رہا۔ غالباً آخری شب میں جلسہ اختتام پذیر ہوا۔ اس جلسے میں ایک نوعمر عالمِ دین مولانا قمرالزماں بھی شریک تھے۔ انھوں نے اس کم عمری میں بڑی اچھی تقریر کی۔ خود مجھے بھی ان کی تقریر پسند آئی۔ اور جب انھیں مَیں نے اس گاؤں کی مسجد میں فجر کی جماعت میں پایا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اس نوعمری میں رات جاگنے کے باوجود فجر کی نماز باجماعت کا التزام! جس سے میں نے سمجھا کہ وہ نماز کے پابند آدمی ہیں، ورنہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مقررین رات دیر تک دھواں دھار تقریر کے بعد جب سوتے ہیں تو بے ہوش ہوتے ہیں۔۔۔ کیسی نماز؟ کیسی جماعت؟۔۔۔ معاذاللہ

مگر مولانا قمرالزماں صاحب مقررین کی عام روش سے الگ تھلگ مجھے ایک پابند عالم لگے۔ ایسے ہی لوگوں سے اُمیدیں کی جاتی ہیں۔ ہمیں یقین ہے وہ نوجوان آگے چل کر دین کا بڑا کام کرے اور اس میدان میں نام بھی پیدا کرے گا۔

حضرت فقیہ ملّت علیہ الرحمہ نے کم وبیش ۴۵ر برس پہلے جو پیشین گوئی کی تھی، گویا حضورِ والا نے مولانا قمرالزماں کا مستقبل ۴۵ر برس پہلے ہی سے دیکھ لیا تھا۔ اور آج بحمدہٖ تعالیٰ مولانا قمرالزماں خاں اعظمی پوری اسلامی دنیا کے مذہبی ودینی حلقوں میں اپنے کام اور نام کے حوالے سے اپنی ایک شناخت اور اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ؎

اہلِ وفا کے باغ سے پھوٹی نہیں اگر
خوش بو کہاں سے آئی یہ شاخِ گلاب میں

اس قدر زبردست شہرت وناموری اور اسلامیانِ عالم کے تمام مذہبی، دینی حلقوں میں زبردست پذیرائی کے باوجود دماغ میں کوئی گرمی نہیں چڑھی۔ تفوّق وبرتری کا کوئی شائستہ تک نہیں۔ اتنی ہمہ جہت وہمہ گیر وعالم گیر پذیرائی، مقبولیت و دل عزیزی نے ان کے لب ولہجے کو بدلا نہیں کہ ؎

شہرت ملی تو اس کے بھی لہجہ بدل گیا

بے شک شہرت وناموری ایک الگ چیز ہے۔ مگر شہرت وناموری کے ساتھ ہی مقبولیت ومحبوبیت وہر دل عزیزی

کے ساتھ احترام وعقیدت، دل پذیری، دل نوازی، دل رُبائی، خوش ادائی، خوش نوائی، خوش قبائی۔۔۔۔ یہ وہ نعمتِ کبریٰ ہیں جوزندگی کے طویل ترین سفر میں کبھی کبھی اور کسی کسی ہی کو ملا کرتی ہیں۔ بے شک حضرت علامہ قمر الزماں خاں قادری رضوی اعظمی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضلِ خصوصی سے ان تمام نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ ؎

بے شک یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

مولیٰ تعالیٰ حضرت مولانا کی عمر میں صحت کے ساتھ برکت عطا فرمائے اور اُن کا سایہ تادیر سلامت رکھے۔ بے شک ایسے لوگ کسی خاص خاندانی وراثت کا حصّہ نہ بن کر پوری قوم کے لیے سرمایہ اور امانت ہوتے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ انھیں اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ان کے امثال اور پیدا فرمادے۔ آمین بجاہِ سید المرسلین بحقِ طٰہٰ ویٰسین۔

☑☑☑☑☑☑

تیسری پشت ہے شبیر کی مداحی میں

محمد قمرالزماں قمر مصباحی ایک ایسانام ہے جواپنے مالہ وماعلیہ کے اعتبار سے ایک جہد مسلسل سے عبارت ہے علمی دنیامیں جس کے نام کی ایک پاکیزہ خوشبو ہے جس سے اصحابِ ذوق وار بابِ دین ودانش کا مشام جاں معطر ہے

برصغیر ہند میں سواداعظم اہل سنت وجماعت کی عظیم ترین دینی درسگاہ ازہر ہند الجامعہ الاشرفیہ مبارک پور کے ان قابلِ ذکرافاضل میں آپ کا شمار ہوتا ہے جس پر ان کی مادر علمی اپنے فرزند معنوی پر فخر کرسکتی ہے آپ کاوطن عزیز صوبہ بہار کے اس مردم خیز علاقے میں ہے جسے سیتامڑھی (موجودہ ضلع شیوہر) کہا جاتا ہے جہاں ہر سوعلمائے دین ودانش قافلہ در قافلہ نظر آرہے ہیں اہل تحقیق وتدقیق کا خیمہ بھی اپنی انفرادیت لیے ہوئے بقول شیخ ولی اللہ محدث دہلوی" خطہ بہار مجمع علماء بود" بے شک خطہ بہار ہمیشہ سے علم وفضل کی راجدھانی، اصحابِ فضل وکمال کی آماجگاہ اورار بابِ دین ودانش کامرکز رہا ہے سرزمین بہار کی ان گنج ہائے گراں مایہ ہستیوں اور بلند پایہ شخصیت ورجال کا احاطہ آسان نہیں جواس خاک پاک سے اٹھیں اور عہد درعہد اپنے وجود سے دنیا کو فیضیاب ومستنیر کر کے وہیں آسودہ خاک بھی ہوئیں ع

خدارحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ہر دوراور ہرزمانے میں بہ فرق مراتب و بہ فرق زمانہ وبہ فرق حالات عظیم ترین وتاریخ ساز شخصیتیں اس خاک سے اٹھتی رہیں اوراپنے فیضان سے انسانیت کو جل تھل کرتی رہیں اور آج بھی اس تاریخ سازاور بابرکت سرزمین پر اصحابِ فضل وکمال، ارباب دین ودانش، صاحبان درس وتدریس، والیان تصنیف وتالیف، اہل تحقیق وتدقیق اور باذوق اہل علم وادب کی ایک غیر معمولی تعداد موجود ہے جس کے نام وکام کی خوشبو دنیا کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کئے ہوئے ہے

کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے

انہیں میں بڑا معتبر، پاکیزہ اورایک مستند نام مولانا محمد قمرالزماں مصباحی کا بھی ہے مولانا محمد قمرالزماں رضوی ابن ڈاکٹر محمد اسماعیل رضوی ابن محمد عین الحق رضوی۔ گویا

تیسری پشت ہے شبیر کی مداحی میں

مرکز اہلسنت، مرکز عشق وعقیدت، مرکز دین وسنیت، مرکز عرب وعجم، مرکز علوم وفنون اعلیٰ حضرت امام اہلسنت، مجدد دین وملت آیۃ من آیات اللہ معجزۃ من معجزات رسول اللہ سیدی امام احمد رضا قادری بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان اوران کے پورے خانوادے نیزان کے شہر محبت بریلی شریف سے والہانہ وابستگی اوراس سے عقیدت ومحبت اباً وجداً ان کے خون میں شامل ہے۔

دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ اس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنائے

ان کے خاندانی پس منظر کے مطابق دین وعلم دین، ادب وحسن ادب، تصلب فی الدین اور بریلی شریف سے ان کو والہانہ عقیدت ورثے میں ملی ہے فالحمد اللہ رب العالمین

وہ خود پیشوائے قدسیاں، الولد سر لابیہ کے مظہر اتم سرکار مفتیٔ اعظم حضرت مولانا شاہ محمد مصطفی رضا قادری بریلوی قدس سرہ العزیز کے ست گرفتہ ہیں جن کی لاکھوں کروڑوں دلوں پر کل بھی حکمرانی تھی اور آج بھی ہے خود وارث جمال قادری کو بھی ان کی زیارت اور لمحاتی خدمت کا شرف حاصل ہے جب جب ان کی زیارت سے مشرف ہوا تو ان کے روئے زیبا پر نظر پڑتے ہی میر تقی میر کا یہ شعر لبوں پر آجاتا تھا

نازکی ان کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

مولانا محمد قمر الزماں مصباحی صاحب کا ایسے مرشدِ کامل سے بیعت ہوجانا ہی بہت بڑی سعادت ہے اور وہ بیعت بھی کیسی ؎

بک گئے جس کے ہاتھوں بک گئے
یہ نہیں ہے تو رسم بیعت کیا؟

(محدث اعظم کچھوچھوی قدس سرہٗ العزیز)

خود عزیز گرامی قدر مولانا محمد قمر الزماں مصباحی صاحب کے پاس ان کا اپنا ذاتی حسن بھی وافر مقدار میں ہے جو انہیں اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے ان کا حسنِ اخلاق، حسنِ ادب، گفتگو میں ان کا شیریں لب ولہجہ، ان کی تواضع، ان کی فروتنی، ناچیز وارث جمال قادری ان کا استاذ تو نہیں مگر انہوں نے ہر ملاقات میں ایک تلمیذ وفا پیشہ کا انداز پیش کیا ان کی خوش نوائی، خوش ادائی، شیریں لبی ان کے وصف ذاتی کا ایک لازمہ ہے ان کا حریف بھی گفتگو کرتے وقت یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

کتنے شیریں ہیں تیرے لب اے رقیب
گالیاں کھا کے بھی بدمزہ نہ ہوا

انہیں مولیٰ عزوجل نے ان کے مرشدِ اعظم قطب عالم مفتیٔ اعظم علیہ الرحمہ والرضوان کی فیضان نظر کے طفیل ہمہ جہت خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہ درس گاہ کے بھی مرد میداں ہیں اور مذہبی اسٹیج کے بھی، وہ سراپا اخلاص بھی ہیں اور سراپا اخلاق بھی، وہ منفرد لب ولہجے کے ادیب اور صاحبِ قلم بھی اس پر طرہ یہ کہ وہ ایک شیوہ بیان شاعر بھی ہیں شاعری بھی کیسی؟ نعتیہ شاعری!

ذالک فضل اللہ یعطیہ من یشاء

شاعری کے جملہ اصناف میں نعتیہ شاعری بہت ہی مشکل فن ہے زور قلم کے ساتھ فن شاعری پر مکمل عبور بہت ضروری ہے اس فن میں قدم قدم پر خطرات کا سامنا ہے اگر حد سے بڑھتا ہے تو الوہیت کی تجلی خاکستر کر دیتی ہے اور اگر کمی کرتا ہے تو تنقیص شانِ رسالت حبط ایمان وعمل کا سبب بن جاتی ہے اس لیے جذبہ اخلاص کے ساتھ اعتدال وتوازن کی بھی شدید ضرورت ہے، گویا نعت سرور کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے مکمل ہوش وحواس ضروری ہے ؎

باخدا دیوانہ باش با محمد ہوشیا

اور بقول حضرت بیکل اتساہی بلرام پوری ؎

یہ کعبہ ہے یہاں دیوانگی ہی حسنِ ایماں ہے
اگر طیبہ میں دامن ہوش کا چھوٹا تو سب چھوٹا

شاعری کی زبان اگر ایک طرف کوثر وتسنیم کی موجوں کا سماں پیش کرے، شراب طہور کی مستی میں کیفیت بار رہے تو دوسری طرف یہ ضروری ہے کہ اس کا قدم جادۂ مستقیم سے نہ ہٹنے پائے۔ حضرت عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

نعتِ رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پہلی شرط قلب کا عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے معمور ہونا ہے رہ گئی فصاحت وبلاغت، حلاوت وملاحت، لطافت ونزاکت، شعری محاسن اور شاعری کے جملہ اصول کی بالکلیہ رعایت تو یہ سب بعد کی چیزیں ہیں

بے عشق محمد جو پڑھاتے ہیں بخاری
آتا ہے بخاران کو بخاری نہیں آتی

امام نعت گویاں اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت، امام اہلسنت، شہید محبت علیہ الرحمہ والرضوان فرماتے ہیں:

حقیقۃً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل فن ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں۔ اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے آگے بڑھتا ہے تو الوہیت میں جا پہنچتا ہے اور اگر کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے کوئی حد بندی نہیں ہے جبکہ نعت میں دونوں طرف سخت حد بندی ہے۔''

(الملفوظ شریف حصہ دوم از حضور مفتی اعظم بریلوی قدس سرہ)

ہم دیکھ رہے ہیں کہ مولانا محمد قمر الزماں مصباحی صاحب کی شاعری اپنی تمام ترفنی رعایتوں اور شعری تقدس کے ساتھ ان تمام محاسن سے بھی پُر ہیں جو نعتیہ شاعری کے لیے لازم ہیں

توڑ کر دامن میں اپنے تم سجالو عاصیو
ہے کھلا صحرائے طیبہ میں شفاعت کا گلاب

کیا یہ شعر امام نعت گویاں کی اس فکر سے متاثر نہیں ہے؟

طیبہ میں مر کے ٹھنڈے چلے آؤ آنکھیں بند
سیدھی سڑک یہ شہر شفاعت نگر کی ہے

نگاہیں جھک رہی ہیں دیکھ کر ان کی حسیں جالی
یہ سجدہ کتنا اچھا ہے عبادت کتنی اچھی ہے

کیا اس شعر سے امام شعر وسخن اعلیٰ حضرت امام اہلسنت قدس سرہ کی اس حقیقت صادقہ کی بازگشت نہیں سنائی دیتی؟

اے شوقِ دل یہ سجدہ گران کو روا نہیں
اچھا وہ سجدہ کیجیے کہ سر کو خبر نہ ہو

یا مولانا کی نعت پاک کا یہ شعر

قلم تو غسل کرلے مشک وعنبر سے ذرا پہلے
کہ نعت مصطفیٰ کو بے وضو لکھا نہیں جاتا

عشق وعقیدت سے معمور اس شعر میں کیا تاجدار عشق حضرت علامہ عبدالرحمن جامی قدس سرہ کی شدید محبت کی خوشبو شامل نہیں؟

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

نیز یہ شعر حضرت شبنم کمالی کا ؂

تصور میں مدینہ روبرو ہے
جبھی تو آنکھ میری باوضو ہے

یا حضرت حفیظ بنارسی کا عشق وعقیدت سے بھرپور یہ شعر

اشکوں سے وضو کرکے قلم ہے تروتازہ
لکھنا ہے اسے مدحت سرکارِ دوعالم

کیا اس شعر سے میل نہیں کھاتا؟

اور حقیقت سے معمور یہ شعر بھی دیکھیں

شجر سجدہ کرے کلمہ پڑھے کنکر اشارے پر

تری انگشتِ انور کی یہ طاقت کتنی اچھی ہے۔

کیا اس میں امام الکلام کلام الامام کی اس پاکیزہ خوشبو کی آہٹ سنائی نہیں دیتی؟

اپنے مولیٰ کی ہے بس شانِ عظیم جانور بھی کریں جن کی تعظیم
سنگ کرتے ہیں ادب سے تسلیم پیڑ سجدے میں گرا کرتے ہیں

اس طرح اس پوری کتاب کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تو صنادیدان زبان وادب کی خوشبو بھی اس میں ملے گی اور گلستانِ ادب کی جھلک بھی۔

مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے عزیز گرامی مولانا محمد قمر الزماں مصباحی (جو سرزمین علم فصلِ بہار کے گوہرِ کمیاب بھی ہیں اور جوہرِ گرانمایہ بھی) انہیں سلامت رکھے ان کے علم میں، فضل میں، عمر میں برکت عطا فرمائے اور دین وسنیت ومسلک اعلیٰ حضرت کا مخلص خادم بنائے۔ آمین یارب العالمین بجاہ سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

☑☑☑☑☑☑

سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کا ایک گوہر آبدار!

''علامہ سیّد صابر حسین بخاری''

آزادی کے بعد دین وسنّیت کی ترویج واشاعت اور تبلیغ وارشاد، رُشد وہدایت کے محاذ پر جو کام مملکتِ خداداد پاکستان میں ہوا، وہ تاریخ کے زرّیں صفحات پر ایک جلی عنوان ہے۔ تحریکِ نظامِ مصطفےٰ، تحریکِ ختمِ نبوت، تحریکِ نفاذ شریعت حقیقی اسلام اور دین وسنّیت کی سرفرازی وسربلندی کے لیے ہے۔ وہاں کے علماء ومشائخ علمی وروحانی شخصیات اور اربابِ دین ودانش نے جو قربانیاں پیش کی ہیں وہ نہ صرف حیران کن بلکہ تحیر خیز مسرت کا باعث اور لائقِ تقلید ہیں۔

اس تعلق سے چند بڑے نام لیے جاسکتے ہیں جن کے احترام وعقیدت میں کروڑ ہا کروڑ دل ونگاہ مؤدب ہیں۔

حضرتِ اقدس بابرکت علامہ پیر مہر علی گولڑوی، مبلغِ اسلام حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، استاذ العلماء حضرت علامہ عبدالقیوم ہزاروی، جلالۃ العلم حضرت علامہ یار محمد بندیالوی، حضرت علامہ مفتی تقدس علی خاں، حضرت اقدس علامہ فیض احمد اویسی، حضرت علامہ غلام دستگیر قصوری، حضرت علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی، حضرت علامہ ابو النور محمد شبیر کوٹلی لوہاراں، حضرت علامہ محمد شفیع اوکاڑوی، حضرت علامہ سیّد سعید کاظمی، حضرت علامہ پیر کرم شاہ ازہری، تلمیذ ارشد حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی، حضرت علامہ مفتی غلام معین الدین نعیمی، حضرت علامہ عبدالمصطفےٰ ازہری، حضرت علامہ اشفاق اللہ نعیمی، حضرت علامہ سیّد ابوالحسنات قادری، قائد اہلِ سنّت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی، مجاہد دوراں حضرت عبدالستار نیازی الخ یہ فہرست کافی طویل ہے۔

پھر زبان وقلم کے محاذ پر بھی چند بڑے نام جو ہماری دعاؤں اور شکریے کے مستحق ہیں۔

سعادت لوح وقلم حضرت علامہ ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد مظہری، حضرت علامہ سیّد فاروق القادری، حضرت علامہ سیّد وجاہت رسول، حضرت علامہ کوکب نورانی، حضرت علامہ محمد منشاء تابش رضوی، حضرت علامہ عبدالحکیم شرف قادری، علامہ اجمل احمد فاروقی، علامہ شاہ تراب الحق وغیرہ الخ یہ فہرست بھی کافی طویل ہے۔

اور ہاں ہاں ایک اور بڑا پاکیزہ مہکتا اور سارے عالم میں محبت کی خوشبو بکھیرتا نام، لاکھوں کروڑوں دھڑکنوں میں بسا ہوا نام، اخلاص ووفا کا محسوس پیکر جس کے نام وکام پر عشق ووجدان جھوم اُٹھیں، جس کے حضور دل ونگاہ مؤدب ہوجائیں۔ وہ ہیں حکیم الامت حضرتِ اقدس بابرکت حکیم موسیٰ امرتسری قدس سرہ العزیز جنھوں نے ''مجلسِ رضا'' لاہور کے ذریعے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجددِ دین وملّت امامِ اہلِ سنّت سیّدنا امام احمد رضا بریلوی کے علم وفضل، ان کی عبقریت، ان کے عشق رسول ومحبت آلِ رسول وفنافی الرسول کی خوشبو سے سارے عالم کو مشکبار کیا۔

ان کی بارگاہ میں عقیدت ومحبت کا یہ خراجِ تحسین مبنی بر حقیقت ہے۔

اے کلیم وادی احمد رضا   اے عصائے موسوی درعصرِما

اور ایک بڑا علمی اور عالمگیر نام جو مملکتِ خداداد ہی سے جڑا ہوا ہے، قدرے متنازعہ ہی سہی لیکن علمی دنیا میں جس کی آفاقیت مسلّم ہے اور وہ ہے ڈاکٹر پروفیسر علامہ طاہر القادری بانی وسربراہ ادارہ منہاج القرآن۔

انہی کاروانِ محبت کے جلو میں ایک اور نام اُبھر رہا تھا جو اس وقت تک نہ ملک گیر ہوا تھا اور نہ ہی عالمگیر! مگر تشنگی ولذت تشنگی سے آشنا ہو چکا تھا۔ ؎

عشق ہے تشنگی کا نام توڑ دے گر ملے بھی جام
شدتِ تشنگی نہ دیکھ لذتِ تشنگی سمجھ

اور وہ تھا سیّد صابر حسین بخاری کا نام۔ پہلی بار ۱۹۹۷ء میں ان کے نام وکام سے دل ونگاہ شادکام ہوئے۔ اب سے کچھ کم وبیش ستائیس برس پہلے ریڈیو اور ٹی وی کے محدود ومشروط جواز وعدم جواز کو لے کر ہندوستان میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے دو مقتدر مذہبی رہنماؤں (یعنی شیخ الاسلام حضرت علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی کچھوچھوی اور حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا ازہری بریلی شریف) میں ایک بحث بھڑی ہوئی تھی جو دراصل شاخسانہ تھا ہالینڈ سے آئے ہوئے ایک استفتا کے جواب کا۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے مناظرانہ، پھر مجادلانہ، پھر آگے چل کر معاندانہ رُخ اختیار کرلیا۔ پھر بڑی تیزی کے ساتھ مختلف مراحل واشکال سے گذرتے ہوئے اس علمی وفکری بحث نے شدید منفی جہت اختیار کرلی۔ بالآخر یہ سلسلۂ بحث اختلاف وانتشار سے بہت آگے بڑھ کر ذلالت وخباثت، ابتذال وپراگندہ دنایت وہٹ دھرمی کے حدود میں داخل ہوگیا، جہاں وقارِ سنّیت مجروح اور اس کی حرمت وناموس داغدار ہوئی، نیز زید وبکر، خالد ومحمود کے فرضی ناموں سے حمایت وہمدردی، عقیدت ومحبت اور وفاداری کے میک اپ میں جو زہریلے حیاسوز اور گندی گندی کتابیں ولٹریچر منظرِ عام پر آئے۔ اس نے مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف اور مرکز روحانیت کچھوچھہ مقدسہ کی حرمت وناموس اور تقدس کو پامال کیا۔ غالب کے طرف داروں نے بڑی سرگرمی دکھائی، غیروں نے بھی اس جلتے الاؤ میں خوب ہاتھ سینکے، مفاد پرستوں، ابن الوقتوں اور بے روغن چراغ جلانے والے کمرشیل خطیبوں نے بھی اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، حالات کو اتنا سنگین اور ماحول کو اتنا برہم کردیا گیا کہ مخلصین اہلِ سنّت اور اصحابِ فکر دم بخود رہ گئے۔

ایسے ماحول میں اگر کوئی بلند قامت عالمی شخصیت[1] اپنے اخلاصِ بے پایاں اور سوزِ دروں سے بے چین ہوکر اپنے تمام تر خوش نوائی، خوش ادائی، خوش قبائی، ہر دل عزیزی اور اپنے حسنِ ادب کا جوہرِ گراں قدر لے کر چاک داماں سنّیت کی رفوگری اور لخت لخت سوادِ اعظم کی چارہ سازی وچارہ گری کے لیے آگے بڑھے بھی تو اس کے اخلاصِ بے کراں اور سوزِ دروں کو مسترد کردیا گیا نیز اسے گناہِ بے گناہی کا مجرم قرار دے کر اس کے مثالی وجود کو ہدفِ ملامت بنادیا گیا۔ ؎

پیشانی حیات پر کچھ ایسے بل پڑے

---

[1] یہاں بلند قامت عالمی شخصیت سے مراد مفکر اسلام حضرت علامہ قمر الزماں خاں اعظمی قادری رضوی جنرل سکریٹری ورلڈ اسلامک مشن لندن ہیں۔

ہنسنے کو جو کی چاہا تو آنسو نکل پڑے

ایسے سنگین ماحول اور گرم ماحول میں، حضرتِ اقدس بابرکت علامہ سیّد صابر حسین شاہ بخاری کی کتاب ''احترامِ سادات اور امام احمد رضا بریلوی'' سعادتِ دارین بن کر مملکتِ خداداد سے وارد ہوئی۔ محمد زبیر قادری مالک و ایڈیٹر افکارِ رضا ممبئی ایک دن یہ کتاب لے کر میری آفس دوٹانگی ممبئی نمبر ۸ میں لے کر آئے۔ نام اور موضوع ہی سے طبیعت پر ایک انبساط و سرور کی کیفیت طاری ہوگئی۔

پوری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھ لیا۔ بے شک اس کتاب کی پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں ضرورت تھی، خاص کر ایسے ماحول میں جہاں ایک چھ سو سالہ جیلانی النسب خاندانِ سادات اپنے تمام تر تاریخی و دستاویزی ریکارڈ رکھنے کے باوجود اپنوں کے ہاتھوں مسترد ہو رہا ہو اور جہاں خاندانِ نبوت کی بے توقیری اور اس کی حرمت و ناموس کی رسوائی کو خدمت دین اور مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف سے وفاداری کا تمغہ سمجھا جانے لگا ہو۔ پھر وہ خانوادہ جو اپنی پشت پر اتنی روشن و ناقابلِ تردید دستاویز نہیں رکھتا، اس کی بے توقیری کا کیا حال ہوگا؟ ؎

وہ پھول جس سے کبھی گلستاں کی رونق تھی
جلیل آج وہی نفرتوں کے زد میں ہیں

اس کتاب یعنی ''احترامِ سادات اور امام احمد رضا بریلوی'' کی اہمیت اور اس کی اثر پذیری کے پیشِ نظر اسی وقت چوالیس (۴۴) صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ لکھ کر جس میں اس خونچکاں المیے کی تفصیل تھی مقدمہ تلخ حقائق پر مبنی اور بہت خاردار تھا جس کا عنوان تھا

''تو مرا خراب کردی بایں سجدہ ربانی''

آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے شائع کر کے صرف اور صرف علماء کرام و مشائخ عظام، ائمہ مساجد تک پہنچایا۔ ملک کے گوشے گوشے میں اس کی حیرت انگیز پذیرائی ہوئی۔ اس کتاب اور میرے طویل مقدمہ نے فتنہ گروں کے حوصلوں کو توڑ دیا۔ اور جہاں جہاں یہ کتاب پہنچی، ساداتِ کرام و مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف کے بدخواہوں کی ہوا نکل گئی اور یہ کتاب ہر طرف نویدِ مسرت ثابت ہوئی۔

اور پھر وہ صبح مسرت طلوع ہوئی جس کا بے چینی سے کروڑہا کروڑ لوگوں کو انتظار تھا۔ اس کتاب کا ایک بڑا احسن یہ ہے کہ صاحبِ کتاب حضرتِ اقدس بابرکت علامہ سیّد صابر حسین بخاری، جو اسی شجرِ طوبیٰ کی ایک شاخ ہیں، اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہا۔ ساداتِ کرام کے تعلق سے جو بھی بات کی، تو اسی مشتاقِ طبع لذتِ سوزِ جگر کی سوز و گداز بھی پیش کیا ہے تو اسی تپ سینہ سوزاں کا جس کی بے تابی سے دونوں کا عالم تنگ ہیں ؎

تنگ آئے ہیں دو عالم تیری بے تابی سے
چین لینے دے تپ سینہ سوزاں ہم کو

ترانہ بھی اگر چھیڑا ے تو اسی سوختہ جاں، نوا سنجی بھی اگر پیش کی ہے تو اسی بلبل ہزار داستان کی، جو محبت کی ہر محفل کی جان ہے ع

مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

مولانا سیّد شاہ بخاری نے علوم امام احمد رضا کے سمندر میں غوطہ لگایا اور اہلِ محبت کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ اور لاکھوں کروڑوں دلوں کو خاندانِ نبوت کی عقیدت و محبت سے بھر دیا فجز اہ اللہ احسن الجزاء۔

لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں	کیا یوں ہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے
سوآفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں	اے دہر ہم سے چاک تمناؤں کا دن منا

حضرت سیّد صابر حسین بخاری اپنے نام وکام یعنی خدمت دین وعلمِ دین کے حوالے سے خود مطلع انوار بن چکے ہیں متعنا اللہ تعالیٰ بطول حیاتہ وحسن خداتہ اب تک وہ کم وبیش دو درجن کتابیں لکھ چکے ہیں اور ہر کتاب اپنے موضوع پر شاندار و لاجواب۔ اپنے حسنِ خدمات کے سبب مملکتِ خداداد میں ان کا نام بھی موجودہ چند بڑے ناموں کے زمرے میں آچکا ہے۔ وہ ادارہ جو سیّد موصوف کے حالات وخدمات پر ایک وقیع نمبر نکال رہا ہے وہ ہماری دعاؤں، مبارکباد وشکریے کا مستحق ہے۔

آج تک علی العموم یہی ہوتا ہے کہ ''قدرِ مردم بعد مردن'' لیکن یہ پیشرفت، احترام وعقیدت کا یہ خراجِ تحسین ان کی بارگاہ سیادت میں وہ بھی ان کی حیات میں واقعی بڑی خود آئند اور قابلِ تقلید ہے۔

ہمارے اور حضرت سیّد بخاری صاحب قبلہ میں ایک بڑا قدر مشترک ہے اور وہ ہے اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذاتِ ستودہ صفات سے والہانہ وابستگی۔ ان کا قلم بھی زیادہ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کی عظمتوں، جلالتوں کے اردگرد اپنے جلوے بکھیرتا ہے۔

ابتدا سے میرا بھی سب سے پسندیدہ موضوع اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کی ذاتِ ستودہ صفات ہے۔ امامِ شعروادب، انوارِ کنز الایمان، امام احمد رضا بین المدح والقدح، جہانِ حیرت و اعلیٰ حضرت اور کنز الایمان، اہلِ سنّت کی دو آنکھیں وغیرہ وغیرہ۔

وما توفیقی الّا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر

محمد وارث جمال قادری صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت

۲۱/ذی الحجۃ ۱۴۴۲ھ مطابق

یکم اگست ۲۰۲۱ء بروز اتوار صبح پونے آٹھ۔

سرِ بزم تصور آج جانے کون آیا ہے - میرے فکر و نظر کا گوشہ گوشہ جگمگایا ہے

فروغ القادری ایک ایسا نام ہے جو اپنے مالہٗ وماعلیہ کے اعتبار سے ایک جہدِ مسلسل سے عبارت ہے۔ علمی دنیا میں جس کے نام کی ایک پاکیزہ خوشبو ہے۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی ایک بڑی دینی درسگاہ الجامعۃ الاسلامیہ رونا ہی فیض آباد یوپی کے قابلِ ذکر افاضل میں ان کی حیثیت کافی نمایاں ہے۔ کوئی بھی مادرِ علمی اپنے ایسے مایۂ ناز فرزندوں پر فخر کرسکتی ہے۔

ان کا وطنِ عزیز ہندوستان کا مشہور صوبہ بہار ہے، جو ہمیشہ سے علم وفضل کی سرزمین رہی، جہاں کی خاک میں سیکڑوں افلاک آسودہ خاک ہیں۔ بہار عظیم ترین شخصیات ورجال کی جلوہ گاہ ناز۔ ان گراں مایہ وبلند پایہ شخصیتوں کا شمار بھی آسان نہیں جو اسی خاکِ پاک سے اُٹھیں اور ایک عہد کو اپنے وجودِ بامسعود سے فیضیاب کر کے وہیں آسودۂ خاک بھی ہوئیں۔ ؎

جن کے بغیر موسمِ گل بھی اداس ہے
جیسے بہار روٹھ گئی ہو بہار میں

ہر دور اور ہر زمانے میں یہ فرقِ مراتب، یہ فرقِ زمانہ عظیم ترین وبافیض شخصیتیں اس خاک سے اٹھتی رہیں اور اپنے فیضان سے انسانیت کو جل تھل کرتی رہیں۔ اور آج بھی اس تاریخی سرزمین پر اصحابِ فضل وکمال، اربابِ علم و دانش اور اصحابِ فکر ونظر ایک غیر معمولی تعداد موجود ہے، جن کے نام اور کام کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ع

کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے   بہار تیری ہمہ جہت عظمتوں کو سلام!

بہار کی مشہور خانقاہ بیت الانوار گیا سے مولانا فروغ القادری کا تعلق ہے۔ وہیں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما پائی، وہیں سے چل کر الجامعۃ الاسلامیہ رونا ہی آئے، وہیں پر علم وفضل کے دستار سے نوازے گئے۔ وہاں سے ممبئی کے لیے شدِ رحال کیا۔ ممبئی میں آکر مجھ سے ملے پورے ادب وحسنِ ادب کے ساتھ۔ اس وقت راقم الحروف وارث جمال قادری کا حال ڈاکٹر عنوان چشتی کے اس مشہور شعر کہ ؎

فقیر شہر سے ملیو ضرور دل میں   وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ ہے

کے مطابق تھا۔ جو معمولی ترمیم کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے ؎

فقیر شہر سے ملیو ضرور ممبئی میں   وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ ہے

چنانچہ وہ میرے قریب آتے گئے اور قریب سے قریب ہوتے گئے۔ مولیٰ تعالیٰ نے اپنے فضل سے گونا گوں صلاحیتوں سے نوازا بھی تھا۔ وہ خود ادب وحسنِ ادب کے پیکر تھے، ساتھ ان کے ناز وانداز اور گفتگو میں زبان وادب کی

چاشنی تھی۔ خطابت کا بھی شوق تھا، ساتھ عربی زبان وادب میں اچھی خاصی ممارشت تھی۔ وہ جدید عربی لب ولہجے میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بولتے تھے، ان کے اندر نوعمری کے باوجود خود اعتمادی تھی جو ان کے غمِ جاناں وغمِ دوراں دونوں جگہ بہت کام آئی۔ بقول حضرت ملک زادہ منظور ؎

کچھ غمِ جاں کچھ غمِ دوراں دونوں تیری ذات کے نام
ایک غزل میں تجھ پر لکھوں ایک غزل حالات کے نام

ان کی انھیں صلاحیتوں کے پیشِ نظر حضور مجاہد ملّت کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت میں لیا گیا اور جوائنٹ سکریٹری بنایا گیا۔ یہاں ممبئی میں عراقی قونسل سے رابطے کی کڑی بھی رہے تھے۔

۲ / اگست ۱۹۹۰ء کی شب میں کویت کے ذریعے امریکہ کا عراق قبضے کی سازش کے خلاف کویت پر قبضہ کر کے امریکہ کی سازش کو اسی پر اُلٹ دیا۔ جس سے خود امریکہ سناٹے میں آ گیا، پوری دنیا پر سنسنی طاری اور ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ اس واقعہ نے امریکہ کی نیند حرام کر دی، برطانیہ کی بوڑھی گھوڑی (تھیچر) بے لگام ہوگئی، روس ہل گیا، سعودی لرز اٹھا، اسرائیل بدحواس ہوگیا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے امیر وشیوخ، جن کے دن رات کے مشغلے ہی یہی تھے کہ ع بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

سکتے میں آ گئے اور کویت عیاش و بزدل حکمراں جابر جو عمر کی اس منزل میں تھا ؎

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے

اپنی چار بیبیوں اور ۶۶ / داشتاؤں کو چھوڑ کر ایسا بھاگا کہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ میرے پیچھے ان مہ وشوں، لالہ رُخوں، گل بدنوں اور غزالانِ چمن کا کیا حال ہوا۔

عراق کا کویت پر قبضہ دنیا کی تاریخ کا کوئی پہلا حادثہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے اس سے کہیں زیادہ اسی نوعیت کے حادثات ہوئے، جیسے تبت پر چین کا قبضہ، پناما امریکی دہشت گردی کا شکار ہوا۔ گوا ہندوستانی نقشے میں شامل ہوا۔ مگر اس طرح کسی بھی حادثے پر ایسا ہنگامہ برپا نہیں ہوا۔ اس چھوٹے سے مسئلے کو لے کر پوری دنیا کی سپر طاقتیں عراق کے خلاف ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئیں اور میڈیا کے ذریعے رائی کو پربت بنا کر پوری دنیا کی رائے عامہ کو گمراہ کر دیا گیا اور صدام حسین کے خلاف ایک منظم وزبردست پروپیگنڈے سے عالمی حالات اور ماحول کو اس حد تک بگاڑ دیا گیا کہ حق کی حمایت میں زبان کھولنا جرم سمجھا جانے لگا۔

ایسے ماحول میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک مذہبی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کا عراق کی حمایت میں میدان میں اُترنا کسی بڑے کارنامے سے کم نہیں تھا۔

جس کی ایک بڑی حیرت ناک تفصیل جو میرے سفر نامے "سفر نامۂ عراق جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد" جو کتابی شکل میں بھی دستیاب ہے دیکھی جاسکتی ہے۔ اور عراق کے تعلق سے آل انڈیا تبلیغ سیرت کی اس تحریک میں مولانا فروغ القادری کا کردار بڑا کلیدی رہا۔ اس کامیابی کے نتیجے میں جب آل انڈیا تبلیغ سیرت کے وفد کا عراق جانے کا وقت آیا تو مولانا فروغ قادری ہندوستان میں نہیں تھے ورنہ عراق کے عالمی کانفرنس میں کم وبیش ایک سو مما لک کے درمیان آل انڈیا تبلیغ سریت کی نمائندگی کا شرف بھی انھیں کو حاصل ہوتا۔ میں نے اپنے سفر نامے میں ان کے حسن خدمات کا ذکر بھی کیا ہے۔

مولانا فروغ القادری جب تک ممبئی میں رہے، آل انڈیا تبلیغ سیرت کا ایک حصہ رہے اور اپنے بڑوں کے معتمد علیہ اور جہاں بھی تبلیغ سیرت کو ان کی ضرورت ہوئی اپنی موجودگی کو فوراً درج کر دیا۔ اور اپنے حسنِ خدمات اور حسنِ ادب سے دلوں کو فتح کرلیا۔ بقول جگر مرادآبادی ؎

وہ ادائے دلبری ہو، کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو ختم کرے وہی فاتح زمانہ

کے مصداق رہے۔ وہ جہاں بھی دین وسنّیت کے ایک مخلص خادم کی حیثیت سے ہمیشہ آگے رہے۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ کے صدقے میں انھیں دونوں جہاں کی خوشیاں عطا فرمائے اور مع اہل وعیال انھیں اپنے حفظ وامان میں رکھے آمین! ؎

تجھ کو گئے ہوئے تو زمانے گذر گئے
اب تک تجھے گلے سے لگائے ہوئے ہیں ہم

☑☑☑☑☑☑

شیخ الجامعہ محترم علامہ الحاج فروغ احمد صاحب اعظمی

ایڈیٹر ماہنامہ اہلِ سنّت جمد اشاہی بستی یوپی

ہدیۂ سلام مسنون و اخلاص فراواں!

مبلغِ اعظم سفیر اسلام حضرت علامہ عبد العلیم صدیقی میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہٗ العزیز کے سالانہ عرس سراپا قدس منعقدہ ۱۰ ار محرم الحرام ۱۴۲۷ھ مطابق ۹ ر فروری ۲۰۰۶ء مصطفےٰ بازار ممبئی کے تقریب سعید میں شرکت خصوصی کے سبب دار العلوم علیمیہ کے دینی، علمی، تحقیق اور دعوتی ترجمان ماہنامہ اہلِ سنّت و الصوت الاسلامی (عربی) کے رسمِ اجرا کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ بے شک یہ علیمیہ کا ایک کارنامہ اور اردو کے ساتھ عربی مجلّے کا اجرا یہ تو ایک تاریخی جرأت ہے۔

جو میری فکر کے موسم بدل کر رکھ دے　　　　اے خدا سامنے ایسا کوئی منظر کر دے

تو ان شاء اللہ اس سے نہ صرف فکر کے موسم بدلیں گے بلکہ منفی افکار کو مثبت و تعمیری جہت ملے گی ان شاء المولیٰ تعالیٰ۔

بے شک اس میں اس ذاتِ ستودہ صفات کی روحانی دستگیری بھی حاصل ہے جس کے نام سے ادارہ منسوب ہے۔ رسالوں کے مالہ و ماعلیہ پر گفتگو تو بعد میں ہوگی، پہلے تو مجھے اس ساعت سعید کو دعائیں دے لینے دیجیے کہ جس ساعت میں اس مجلّے کا نام 'اہل سنّت' تجویز ہوا۔ اگر یہ نام الہامی ہے تو یہ قدرت کا احسان ہے کہ وہ ہمیں پھر اپنے آفاقی تشخص کی طرف واپس لے جانا چاہتی ہے جو چودہ سو (۱۴۰۰) سال سے ہمارا نشانِ امتیاز و سرمایۂ افتخار تھا، اور اگر الہامی نہیں تو یہ اساتذہ علیمیہ کی دیدہ وری و بالغ نظری ہے جو انھوں نے نوشتۂ دیوار پڑھنے میں تاخیر نہیں کی۔

بے حسی کی زرد فصلیں روز کٹتی ہی رہیں
آبرو کے چند دانے جانے کن خوشوں میں تھے

ایک سازش کے تحت غیروں کا دیا ہوا یہ لفظ 'بریلوی' نے سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کو بڑے زخم دیے اور عالمی سطح پر اس نے اہلِ سنّت کو بڑے نقصانات سے دوچار کیا۔ اس دام فریب کے ہم خود شکار ہوئے (وہ بھی بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ) اہلِ سنّت پر ہم نے اس لفظ بریلوی کو اوّلیت ہی نہیں بلکہ فوقیت دی اور اس کو نشانِ فخر و امتیاز سمجھ کر ہم نے اہلِ سنّت کے وسیع و عریض و آفاقی پلیٹ فارم کو ان کے حوالے کر دیا جن کا اس سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں تھا بلکہ وہ خود اسلام و سنّیت کے مقابل بہائیت و قادیانیت کی طرح ایک نئے فرقے کے بانی و داعی تھے 'یعنی وہابیت' جو آگے چل کر مصلحتاً دو حصوں میں تقسیم ہوئی۔ مقلدیت و غیر مقلدیت! جس کے مضرات پر مشتمل ڈیڑھ سال قبل میں نے ایک کتاب (کیا اسلام میں بریلوی کوئی فرقہ ہے؟) لکھ کر نفی میں اس کا جواب دینے کی ایک مخلصانہ کوشش کی ہے۔ بحمدہٖ تعالیٰ میرا درد جو اہلِ سنّت مشترکہ و اجتماعی درد تھا، یہ رنگ لا رہا ہے۔ اس لفظ پر ہمارا اجتماعی جمود ٹوٹ رہا ہے اور اس لفظ پر ملکی و عالمی سطح پر جو ہمارا

اجتماعی نقصان ہوااور ہو رہا ہے اس کا احساس جاگنے لگا۔ابھی حال ہی میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی معروف شخصیت جو اپنے علم وفضل اور اخلاص فی الدین کے حوالے سے علماء ومشائخ دونوں صفوں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، یعنی علامہ سیّد رکن الدین اصدق مدظلہٗ العالی ایڈیٹر جامِ شہود نالندہ بہار شریف نے اس سلسلے کو بڑے خلوص ودلسوزی کے ساتھ بڑے ہی احسن انداز میں ہماری اس کتاب 'کیا اسلام میں بریلوی کوئی فرقہ ہے؟' پر گفتگو کرتے ہوئے آگے بڑھایا اور اپنے مؤقر جریدہ جامِ شہود جنوری فروری مارچ ۲۰۰۶ء کے مشترکہ شمارے کا اسے اداریہ بھی بنایا۔اور وہی مضمون آفاقی شہرت کے حامل جریدہ جامِ نور کے فروری ۲۰۰۶ء کے شمارے میں نمایاں طور پر شائع ہوا۔اس سے قبل اسی لفظ بریلوی پر علامہ ابوالفیض معینی نے ایک معرکتہ الآرا بحث سپردِ قلم کیا جو ماہنامہ جامِ نور کے جولائی ۲۰۰۲ء کے شمارہ میں خامہ تلاشی کے زیرعنوان شائع ہوا۔جامِ نور اور اس کے جواں سال ایڈیٹر عزیزم خوشتر نورانی شکریے، مبارکباد اور دعاؤں کے مستحق ہیں کہ انھوں نے لفظ 'بریلوی' سے پیدا شدہ حالات کی سنگینی کو محسوس کیا اور مادی سود وزیاں سے بے نیاز ہوکر اپنے رسالے میں اسے نمایاں جگہ دی، جو سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے حق میں تریاق ثابت ہو رہا ہے۔اللھم زد غفردا۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہوگئی
اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ

ایسے ماحول میں ایک بڑے وقابلِ ذکر ادارہ کا اپنے دعوتی ترجمان کا نام ''اہلِ سنّت'' رکھنا، سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے لیے ایک نیک فال ہے۔خدا کرے کہ یہ صرف دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی کا ترجمان نہ ہوکر پورے سوادِ اعظم کا عالمی ترجمان ثابت ہو۔ع ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین آباد۔

ماہنامہ اہلِ سنّت کے نقشِ اوّل سے اندازہ ہوا کہ اس سے آگے چل کر کئی بڑی امیدیں کی جاسکتی ہیں۔اداریہ میں قلم کی فرماں روائی کو دلوں میں اتارنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے، جہانِ درس وتدریس میں علامہ محمد احمد مصباحی کی باتیں نہ صرف قابلِ غور بلکہ مخاطبین کے لیے اس پر عمل ناگزیر ہے، استاذی الکریم حضرت بحرالعلوم کے تبرکات نے مجلّہ کے حسن ووقار میں اضافہ کیا ہے۔قائدِ اہلِ سنّت، عبقری الشرق حضرت علامہ شاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ کے عظیم علمی خانوادے کے تعلق سے محترم ڈاکٹر مجید اللہ صاحب کے خراجِ عقیدت کا سلسلہ تو بہت ہی خوب ہے، اس تذکرہ محبت کو تو اوّلیت دینا ہی تھا کہ ان کی کرم فرمائیوں اور احسانِ مسلسل کا جو قرض علیمیہ پر ہے اس پر اس کا یہ فرض بنتا ہے!

الصوت الاسلامی (عربی) کا اجرا سیکڑوں دینی اداروں کے ہجوم میں اس کا یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جو اسے اور اداروں پر امتیاز دیتا ہے۔اس قدم سے ادارہ نے اپنے سب سے بڑے محسن قائدِ اہلِ سنّت علیہ الرحمہ کی بارگاہِ شایانِ شان میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی ضلع بستی نے حیرت انگیز تعلیمی ترقی کے میدان میں جو جست لگائی ہے، اس میں بانیانِ ادارہ

کے اخلاص کے روغنِ زیتون کے ساتھ موجودہ انتظامیہ اور اس کے اساتذہ کرام کے حسنِ کارکردگی کا بھی بڑا دخل ہے۔
معین دین وسنّیت محترم علامہ الحاج معین الحق علیمی پر ان کے مرشد اعظم کا فیضان اتم! ان کی خاموش جدو جہد اور محترم سیٹھ عبد المجید صاحب کرلا ممبئی کے ایثار و قربانی نے دار العلوم علیمیہ کو قابلِ رشک بنانے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوا۔ کسی بھی ادارے یا انسٹی ٹیوٹ کو عروج وارتقا کی طرف لے جانے میں جو اجزائے ترکیبی کار فرما ہوتے ہیں۔ ان اجزائے ترکیبی میں اس ادارہ کے اساتذہ واسٹاف کا کردار بھی بڑا اہم ہوتا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب انتظامیہ انھیں ملازم سمجھنے کے بجائے اس ادارے کے وجود کا ایک حصہ سمجھے، خود کو حاکم سمجھنے کے بجائے ان کے سامنے ادب وحسنِ احترام کا مظاہرہ کرے اور یہ تعاون واحترام دوطرفہ ہونا چاہیے۔

جس کی ایک مثال سامنے ہے دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کی، جب تک وہاں اساتذہ کرام کو فیض الرسول کے وجود کا ایک حصہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ انتظامیہ ان کے سامنے مؤدب تھی تب تک اس نے شہرت وعروج کی کئی منزلیں طے کرلیں۔ اور مدارسِ اسلامیہ میں اس کی انفرادیت کی دھوم تھی۔ مگر جب سے فردِ واحد کی حکمرانی کے سبب وہاں اساتذہ کو ملازمین کا مقام ملا اور ان کے ساتھ خالص ملازمین جیسا سلوک کیا جانے لگا۔ ان کے عزل ونصب میں علماء دین وخادمین دین متین کے بجائے ملازمین کا تصور کار فرما رہا۔ تو آج اس کا حال پہلے جیسا نہیں رہا اور اب تو صورت بہیں حالت میرس کی منزل بے چارگی بھی اسے حاصل ہوگئی ہے۔

دار العلوم علیمیہ اس اعتبار سے بہت خوش نصیب ہے کہ اسے اِس وقت جو اساتذہ کرام ملے ہیں وہ خود کو ملازم کے بجائے اپنے کو علیمیہ کے وجود کا ایک حصہ سمجھتے ہیں، اور انتظامیہ بھی اپنے اساتذہ واسٹاف کے سامنے مؤدب ہے فالحمد لله علی ذالك۔ خدا کرے کہ باہمی تعاون کا یہ جذبۂ خیر تا دیر سلامت رہے۔ جس سے علیمیہ کو نئے نئے آفاق طے کرنے میں کامیابی حاصل ہو۔ بیک وقت دو ماہناموں عربی واردو کے اجرا پر ہم صمیمِ قلب کے ساتھ دار العلوم علیمیہ کے جملہ ارکان وبہی خواہان واساتذہ کرام خصوصیت کے ساتھ علامہ معین الحق علیمی صدر ادارہ، شیخ الجامعہ علامہ فروغ اعظمی اور کھلے ہاتھ اور بڑے دل کے مالک سیٹھ عبد المجید رضوی خازن دار العلوم علیمیہ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ انھیں اس خدمت علمِ دین کا صلۂ عظیم دنیا وآخرت دونوں میں عطا فرمائے۔

☑☑☑☑☑☑

آئینۂ تحریکات

آل انڈیا تبلیغ سیرت
ایک تاریخ، ایک تحریک، ایک دعوت

تقسیم ملک کے بعد اصحابِ بصیرت اور حاملینِ کردار و عمل کی غالب ترین اکثریت ہجرت کے نام پر ترکِ وطن کر گئی مگر رہ جانے والے مسلمانوں کو تقسیم ملک کے جُرم میں سزا ملنی شروع ہوگئی۔ آبرومندانہ بقا کے تمام دروازے ان پر بند کردیئے گئے۔ پچھتر برس ہورہے ہیں، ملک کی دوسری سب سے بڑی اکثریت (یعنی مسلمان) تقسیم ملک کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تقسیم کے بعد کا طویل عرصہ جارحیت پسند ہندوؤں کو نرم نہ کرسکا کہ وہ گناہِ بے گناہی کی سزا سے اپنے ہاتھ روک لیں۔

اِدھر اقتدارِ وقت کی معنی خیز خاموشی، انتظامیہ کی پُراسرار بے بسی نے مسلمانوں کے عذابِ مسلسل کو دوچند اور ان پر عرصۂ حیات کو تنگ کردیا۔

پچھتر سال کے اندر مسلمانوں کے کتنے مقتل، کتنے مذبح، کتنے مدفن اور کتنے کربلا عالمِ وجود میں آئے، اس کا صحیح اعداد و شمار نہ تو حکومت کے پاس ہے اور نہ ہی اس ہندو سامراج کے پاس، جن کے ہاتھوں یہ کارنامے انجام پذیر ہوئے۔ فالی اللہ المشتکی ۔

ہماری خوابوں کی سرزمیں کو یہ کس نے مقتل بنا دیا ہے
قدم قدم پہ یہ آہ و گریہ، روش روش پہ یہ جلتے خیمے
وہ کون سا ہاتھ ہے کہ جس نے کئی دِیوں کو بجھا دیا ہے
میں سوچتا ہوں کہ پھر وہ کس نے یہ کربلا کو سجا دیا ہے

تقسیم ملک کے بعد رہ جانے والے مسلمانوں کے ساتھ رجعت پسند ہندوؤں، اقتدار میں گھسے ہوئے فرقہ پرستوں اور انتظامیہ کے سینے پر ناسور بنے عصبیت زدوں کی غالب ترین اکثریت کا یہ وحشیانہ سلوک، یہ ردِّ عمل ہے۔ اس یک طرفہ بے جا الزام کا جو مسلمانوں پر تقسیم وطن کے تعلق سے لگایا گیا ۔

ہے پڑی لاش تعصب کی دوراہے پہ مگر
اِک جنازہ ہے جو قوموں سے اُٹھائے نہ بنے تقسیم ملک کا سارا الزام مسلمانوں پر رکھ دیا گیا،

جو برصغیر کی تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ (۱) ہے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ملک کو مسلمانوں پر تھوپا گیا۔ حالانکہ مسلم لیگ انٹرم گورنمنٹ کے فارمولے پر تقریباً راضی ہو چکی تھی۔

جب کانگریسی ہندو لیڈروں نے یہ محسوس کیا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ملائے بغیر برہمنی اِقتدار ممکن نہیں تو انھوں نے تقسیم ملک کے لیے مسلم لیگ سے زیادہ سرگرمی دکھائی اور سیاست کے پیچ در پیچ بھول بھلیوں میں مسلمانوں کو ایسا مجبور کیا کہ وہ بجائے آدھی کے پاؤ ہی روٹی پر راضی ہو گئے۔ زمین کا ایک حصّہ دے کر مسلمانوں کو اقتدار سے الگ کر دیا اور ہزار سالہ وسیع و عریض مسلم سلطنت کے بلاشرکت غیر مالک و مختار ہو گئے ؎

مصلحت کوشی کہوں یا شب گزیدہ ذہنیت
دن کو دن کہنے سے بھی کچھ لوگ گھبراتے ہیں کیوں

اس تاریخی پس منظر کا ایک ہلکا سا اجمال یہ ہے:

پہلی جنگ عظیم کے سبب اسلام کا مردِ بیمار (خلافتِ عثمانیہ) عالمِ نزع کی کیفیت میں زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ ایک طویل عرصے سے الکفر ملۃ واحدۃ کی بنیاد پر عالمی طاقتیں خلافتِ عثمانیہ کو ختم کرنے کے لیے خاموش جدوجہد میں لگی ہوئی تھیں۔ خصوصاً پوپائیت، صیہونیت اور سامراجیت کی آنکھوں میں (ترکی خلافت) ایک کانٹا بنی ہوئی تھی۔ اس کو ختم کرنے کے لیے ان کی خفیہ سرگرمیاں اور زمین دوز تحریکیں نقطۂ عروج پر تھیں۔ بالآخر پہلی جنگِ عظیم کے سبب ان کی سازشیں، ریشہ دوانیاں اور شرانگیزیاں رنگ لائیں۔

اس طرح ایشیا اور یورپ پر محیط اس عظیم اسلامی خلافت کے حصے بخرے ہونے لگے ؎

---

(۱) بین الاقوامی شہرت کے حامل کانجی دوارکاداس جو گاندھی، نہرو، پٹیل، محمد علی جناح وغیرہ کے ہم عصر، ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔ جن کے تعلقات اس سطح کے لیڈروں سے بڑے دوستانہ و مساویانہ تھے۔ انھوں نے تقسیم ملک پر ایک بڑی غیر جانب دارانہ کتاب لکھی ہے، جس کا اردو ترجمہ محمد علی جناں کے نام سے شہاب دسنوی نے کیا، جو علمی مجلس دلی سے شائع ہو چکی ہے۔ جس میں انھوں نے اُس وقت کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے تقسیم ملک کا اصل ذمے دار کانگریسی لیڈروں بالخصوص جواہر لال نہرو اور ولبھ بھائی پٹیل کو ٹھہرایا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"میں سمجھتا ہوں کہ جناح پاکستان نہیں چاہتے تھے۔ ۱۹۴۶ء تک وہ متحدہ ہندوستان کے لیے کام کرنے کو تیار تھے۔ میرے خیال میں وہ پاکستان کا مطالبہ کر کے مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق و مراعات چاہتے تھے۔ وہ اگر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کانگریسی ان سے کوئی سمجھوتہ نہیں چاہتے تھے تو اس میں وہ حق بجانب تھے۔"

قدرے آگے چل کر بحث کے آخر میں پھر رقم طراز ہیں:

"ہندوستان تقسیم ہو گیا، بھارت اور پاکستان دو مملکتیں بن گئیں۔ جناح نے پاکستان نہیں جیتا، کانگریسی لیڈر نہرو اور پٹیل جناح کو پاکستان ہار بیٹھے۔"

اس کے باوجود یہاں کے فرقہ پرست خون آشام بلوائی اس طرح کی غیر جانب دارانہ بلکہ خالص ہندوانہ شہادت کی موجودگی میں تقسیم ملک کا تنہا ذمے دار مسلمانوں کو قرار دے کر یہاں کے امن پسند مسلمانوں پر ہر طرح کا ظلم و ستم اور فسادات کے نام پر یک طرفہ مسلم کشی کو اپنا موروثی حق اور فریضہ منصبی سمجھتے ہیں ؎ لو ہم الزام اُن کو دیتے تھے، قصور اپنا نکل آیا

؎ قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر   جو چُپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اُڑائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اس دوران یہاں ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس مختلف مذاہب بالخصوص ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تنظیم کے طور پر کام کرتی تھی۔ ٹھیک انھیں دنوں مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی (جو بعد میں ہندوستان کے راشٹر پتا، بابائے قوم اور باپو جی کہلائے اور گاندھی جی سے ایسے مشہور ہوئے کہ اصل نام موہن داس کرم چند لوگ بھول گئے) افریقہ سے ہندوستان آئے۔

ہندی سیاست کے امام اور جنگِ آزادی کے سُورما مولانا حسرتؔ موہانی نے کھلے دل سے میدانِ سیاست میں ان کا استقبال کیا اور ان کی ذہانت و دانائی کے پیش نظر اپنے بے پناہ جدو جہد اور بھر پور عملی تعاون سے انھیں صف اوّل کا ممتاز لیڈر بنا دیا ؎

ہم کو دُعائیں دو تمھیں قاتل بنا دیا

ان کی ذہنیت و ذہانت اور ہندو قوم کی سربلندی و سرفرازی اور بالادستی کے جذبہ کی شدت کو محسوس کر کے ہندو سامراج نے انھیں اپنا واحد لیڈر تسلیم کر لیا۔ اخلاقی طور پر کانگریس کی پوری باڈی ان کی مرضی و منشا کی پابند ہوگئی۔ کسی بھی معاملے میں ان کا اشارۂ ابرو ہی کانگریس کے لیے حکم کا درجہ رکھنے لگا۔

غیر کانگریسی مسلمان بھی اس وقت اپنی مختلف تنظیموں اور جماعتوں کے ساتھ کانگریس سے مکمل اشتراک و تعاون کر رہا تھا۔

خلافتِ عثمانیہ سے اسلامیانِ ہند کی والہانہ اور شدید جذباتی وابستگی کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کی متحدہ طاقت و توانائی کو کئی سمتوں میں بانٹ کر اس کا توازن ختم کرنے کے لیے مسٹر گاندھی کے فکر رسا ذہن نے ایک منصوبہ ترتیب دیا۔ وہ یہ کہ ہندی مسلمانوں کو اسلامی خلافت کو انگریزوں سے بچانے کی ترغیب دے کر انھیں انگریزوں سے بھڑا دیا جائے تا کہ وقت آنے پر طاقت کے اس عدم توازن سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جا سکے۔

چنانچہ انھیں کی تحریک اور ان کے تعاون کے پیش نظر مسلم قیادت عالمی سیاست اور ترکوں کے رُجحانات سمجھے بغیر تحریکِ خلافت میں کود پڑی۔

یہ تحریک آندھی بن کر اُٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندوستانی مسلمانوں کو بگولے کی شکل میں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شہر شہر، نگر نگر، ڈگر ڈگر، قصبات و دیہات جدھر دیکھیے ؎

بولیں امّاں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

نعرۂ مستانہ زبان زد عوام و خواص بن چکا تھا۔ اس ناعاقبت اندیشانہ تحریک نے مسلمانوں کا لہو نچوڑ کر رکھ دیا۔ مسلمان برطانیہ کی عظیم طاقت سے ٹکرا کر اپنی توانائی کو غیر محل میں استعمال کر کے کمزور ہو گیا۔ تحریکِ خلافت کا باطنی محرک اپنے مقصد

میں پورے طور پر کامیاب رہا ؎

نوکِ خنجر کی عبارت آپ پڑھیے تو سہی
خون کے دھبّے بتائیں گے کہ قاتل کون ہے

پھر سورۂ ممتحنہ کی چند آیات کو لے کر ایک تحریک چلائی گئی ''تحریکِ ترکِ موالات'' یعنی انگریزوں کا بائیکاٹ۔ اور وہ بھی اس انداز میں کہ ترکِ موالات، ترکِ معاملات کی شکل اختیار کر گیا۔ چھوٹے بڑے آں قدر وایں قدر سب اس سیلاب میں بہنے لگے۔ وہ ابوالکلام جس کی ذہانت وفطانت اور سیاسی شعور کا بڑا شہرہ تھا، اپنے شعور وآگہی پر بے خبری کی پرت چڑھا کر سیاست کے اس گدلے پانی میں ڈُبکیاں لگانے لگا۔ اہلِ دانش وبینش نے اس کے عقل وشعور اور علم وفہم کا ماتم کیا۔

یہ تحریک بھی بڑی شدّت سے اُٹھی اور رہی سہی توانائی کو صاف کر گئی۔ پھر یہ بحث چھڑ گئی کہ ہندوستان دارالکفر ہے یا دارالاسلام؟۔ کم علم، کم فہم، کم نظر ملّایان مکتبی سے ہندوستان دارالحرب ہے، دارالکفر کے فتاویٰ لے کر بڑے بڑے قد آدم پوسٹر چھاپے گئے اور مسلمانوں کو ورغلایا گیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے، لہٰذا یہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے۔ دارالحرب اور دارالکفر کی بنیاد پر تحریکِ ہجرت کا ہوّا کھڑا کیا گیا۔ سادہ لوح مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد نے اپنے قیمتی اثاثے اور پراپرٹی کو ہندوؤں کے ہاتھ کوڑیوں کے مول بیچ کر افغانستان کا رُخ کیا۔ راستے میں لٹنے، کٹنے، پٹنے سے جو بچے وہاں جا کر بھیک مانگنے لگے۔ یہاں کا سرمایہ دار وہاں کا بھکاری بن گیا۔ ہجرت کی تحریک چلانے والے، دارالحرب کا فتویٰ دینے والے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے ایک بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے ؎

ابھی سے کیوں چھلک آئے تمہاری آنکھ میں آنسو
ابھی چھیڑی کہاں ہے داستانِ دردِ دل ہم نے

پھر خلافت کمیٹی کی مدد سے ترکِ گاؤ کشی کی تحریک چلائی گئی۔ مسٹر گاندھی اور دوسرے سر برآوردہ ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نام نہاد مسلم دانشور بالخصوص خلافت کمیٹی کے ذمے داروں نے قرآن وحدیث کی ایسی ایسی تاویلیں اور کتر بیونت کی کہ اکبر بادشاہ کے جو درباری علمائے سو بادشاہ کے مزاج اور موڈ کو دیکھتے ہوئے قرآن وحدیث کی تعبیریں کیا کرتے تھے، ان کی روحیں بھی ان لوگوں کی قلابازی پر عش عش کر کے رہ گئی ہوں گی کہ کم ترك الاوائل للاواخر۔

تحریکِ ترکِ گاؤ کشی کے نتیجے میں متحدہ ہندوستان میں مسلمان جگہ جگہ مارا کاٹا، لوٹا، پھونکا، جلایا اور ستایا گیا۔ ذبیحۂ گاؤ کے سلسلے میں مسلمان ہندوستان میں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے۔

ادھر خلافت کمیٹی سے منسوب علما اور نام نہاد دانشور بشمولیت حکیم اجمل خاں وخواجہ حسن نظامی وغیرہ وغیرہ مسٹر گاندھی کی خوشنودی کے لیے مسلمانوں کو مذہباً ذبیحہ گاؤ سے روکنے کے لیے قرآن وحدیث کی نئی نئی تعبیریں کر رہے تھے۔ اور مظلوم ہندی مسلمان حیران وپریشان کہ ہم کیا کریں، کدھر جائیں؟ ؎

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ دُرویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ہجرت، تحریکِ ترکِ گاؤ کشی وغیرہ میں عوام تو عوام، وہ بیچارے تو ہمیشہ کالا نعام کے مصداق رہے، انھیں تو جس طرف بھی ہانکا جائے آنکھ بند کر کے چل پڑتے ہیں۔

علمائے دین کا وہ ذمے دار طبقہ جس کے کاندھے پر اُمتِ مسلمہ کی رہنمائی اور قیادت کا بوجھ ہے، وہ بھی عبا، قبا کے ساتھ سیاست کے بہتے ہوئے اس تیز گدلے دھارے میں کود پڑا۔

مولانا عبدالباری فرنگی محلی جیسی شخصیت بھی اس سحر سامری کی فسوں کاری کا ایسا شکار ہوئی کہ کہہ پڑی ؎

عمر یکہ بآیات واحادیث گزشت　　　　رفتی ونثار بُت پرستی کردی

ان مسلم کش تحریکات کے پس پردہ اس منظم سازش کو سب سے پہلے محسوس کرنے والے اور پردۂ زنگاری کے پیچھے چھپے ہوئے اس معشوق کے چہرے سے نقاب ہٹانے والے برصغیر کے مشہور عالم دین اور عظیم ترین روحانی پیشوا عرب وعجم، حلّ وحرم کے مقتدا، علومِ نقلیہ اور فنونِ عقلیہ کے آخری دانائے راز مشہور عاشقِ رسول اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی ہیں ؎

کہیں مدّت سے بھیجتا ہے ساقی ایسا مستانہ
بدل دیتا ہے جو بگڑا ہوا دستور مے خانہ

اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله۔
''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔''

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ
اور سیاسی سطح پر ڈاکٹر اقبالؔ کے محسوسات نے امام احمد رضا کا تتبع کیا۔

ڈاکٹر اقبال ہی کے مشورے پر اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر حاکم علی صاحب نے آیاتِ ممتحنہ کے متعلق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے شرعی حکم حاصل کرنے کے لیے سوالات کیے۔ جس کے جواب میں آپ کی وہ معرکۃ الآرا کتاب المحجة الموتمنه فی اٰیات الممتحنه منصۂ شہود پر آئی، جس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازش کا تار تار بکھیر کر رکھ دیا۔ کتنے ہی چہرے بے نقاب ہو گئے۔ اس کتاب نے ابوالکلام آزادؔ جیسے سیاسی پہلوانوں کی سیاست دانی کے حدودِ اربعہ بھی متعین کر دیئے اور فراستِ مومن کی جلوہ سامانیوں کا نقطۂ عروج تو اپنی مثال آپ ہے ؎

اِک دانشِ نورانی، اِک دانشِ بُرہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی

''ہندوستان دارالحرب ہے'' کی بنیاد پر تحریکِ ہجرت کے سدّ باب کے لیے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے ایک

شاہکار کتاب اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام [1] لکھ کر مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑنے سے روکا اور جب تحریکِ ترکِ گاؤ کشی کی آندھی چلائی گئی تو وہی مردِ مومن نشانِ منزل بن کر آگے بڑھا اور پوری توانائی کے ساتھ اس طوفانِ بلاخیز کا رُخ موڑا۔ تحریکِ ترکِ گاؤ کشی کے ردّ و استیصال اور فتنے کے سدّ باب کے لیے انفس الفکر فی قربان البقر لکھی اور کمالِ فقاہت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قربانی کے لیے گائے کی اباحت کو دلائل و براہین کی روشنی میں واجب قرار دے کر ہم عصر فقہا و مفتیانِ دین سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ الغرض تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریکِ ہجرت، تحریکِ ترکِ گاؤ کشی وغیرہ کے پس منظر کو بڑی دیدہ دری و بے جگری کے ساتھ اسلامیانِ ہند پر واضح کیا اور ان تحریکاتِ بد کی مضرت رسانیوں کے خلاف آپ نے پوری توانائیوں کے ساتھ جہاد بالقلم فرمایا ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اس میں آپ کے تلامذہ و خلفاء واہلِ محبت نے بھرپور حصہ لیا۔ خصوصاً آپ کے خلیفۂ ارشد حضرت مولانا سید سلیمان اشرف پروفیسر دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بے پناہ جدوجہد کی۔ نامساعد حالات اور شدید ترین مخالفتوں کے ہجوم میں حق کا علَم بلند کیے رہے۔ مسلم یونیورسٹی میں رہ کر حالات کے مدوجزر اور تیز و تند طوفان کی یلغار میں آپ کا وجود ناقابلِ تسخیر چٹان بنا رہا۔ اس بگڑے ہوئے ماحول میں معرکۃ الآرا سلگتے مسائل اور بولتے حقائق پر مشتمل ایک کتاب "النور" لکھ کر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل فرمایا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی بہترین اور علم و ادب کی شاہکار کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" میں اپنے استاذ محترم حضرت سید سلیمان اشرف کا ایک سوانحی خاکہ پیش کیا ہے۔ ان کی تہہ در تہہ، پہلو دار اور کوہ پیکر شخصیت پر بڑے ہی نیازمندانہ انداز میں تحریر کرتے ہوئے اس طوفانِ بلاخیز میں آپ کے عزم و ثبات، فراستِ ایمانی اور جرأتِ مومنانہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"بالآخر جذبات کا طوفان تھا تو وہی سب کچھ سچ ثابت ہوا جو میرے استاذ محترم فرما چکے تھے۔"

آپ کے دیگر تلامذہ و خلفاء میں حضرت پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، صدر الافاضل حضرت مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی، محدثِ اعظم ہند حضرت مولانا سید محمد کچھوچھوی، حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں، مفتی اعظم مولانا مصطفیٰ رضا خاں، برہانِ ملت مولانا برہان الحق، صدر الشریعہ مولانا امجد علی وغیرہ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں

---

1) اس کے برخلاف اکابر دیوبند نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا لیکن اس فتویٰ کے باوجود انھیں ہجرت کی نہ سوجھی۔ جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے۔ رشید احمد گنگوہی نے لکھا:

"سب ہندوستان بندے کے نزدیک دار الحرب ہے۔"

اسی فتاویٰ رشیدیہ کے حاشیہ پر رسالہ قاسم العلوم سے بانی دار العلوم دیوبند محمد قاسم صاحب نانوتوی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

"راجح نزد ہیچ مداں ہمیں باشد کہ ہندوستان دار الحرب است۔" (فتاویٰ رشیدیہ، کامل مبوّب، مطبوعہ سعیدی کراچی، ص ۴۹۳)

جب تحریکِ شُدّھی سنگھٹن نے زور پکڑا تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے انھیں تلامذہ و خلفاء اور دیگر اہلِ محبت بالخصوص اشرف المشائخ حضرت سید علی حسین اشرفی میاں، مولانا سید غلام قطب الدین وغیرہم قدست اسرارہم نے اس سیلابِ تباہی کے آگے مضبوط بند باندھا ؎

منزل خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے
ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اُٹھتا جائے ہے

دانشوروں کی صف میں ڈاکٹر اقبال غالباً وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مسٹر گاندھی کی سحر طرازیوں اور ان کی حکمت عملی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اور مسلمانوں کو پورے خلوص کے ساتھ ان کے مضمرات اور مضرت رسانیوں سے بچانے کی سعی کی۔ خصوصاً تحریک خلافت کے تعلق سے انھوں نے اسلامیانِ ہند کو کھل کر تلقین کی کہ سامراجی سازشوں کی وجہ سے جس بارِ گراں کو تُرک خود ہی اُتار پھینکنا چاہتے ہیں، اس کو بچانے کے لیے ہم ہندی مسلمان اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں کیوں ضائع کررہے ہیں ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے   تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟   خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ جس کو ہم اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

ابھی یہ تحریک جاری ہی تھی کہ سامراجی ریشہ دوانیاں بہت شدید ہوگئیں اور ترکوں نے خود وہ بارِ گراں اُتار پھینک دیا۔ یہ خبر مسلمانانِ ہند پر بجلی بن کر گری اور ہندی مسلمان اپنا دل تھام کر رہ گیا۔

مسٹر گاندھی نے جس مقصد کے تحت تحریکِ خلافت کی پُرزور حمایت کر کے مسلمانوں کو انگریزوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا اس میں وہ پورے طور پر کامیاب رہے۔ بساطِ سیاست کی اسی چال پر ڈاکٹر اقبال واضح لفظوں میں بڑے درد کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

ان مسلم کش تحریکات کے نتیجے میں ۱۹۲۳ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک مسلمانوں کی کوئی قیادت ایسی نہیں رہ گئی جو کانگریس پر اثر انداز ہوتی۔ لہٰذا مسٹر گاندھی نے ۱۹۲۹ء میں مسلم تنظیموں کے ان بے جان ڈھانچوں سے کھل کر کہہ دیا۔ کہ اگر آزادی کی لڑائی میں شریک ہونا ہے تو غیر مشروط طور پر کانگریس کا ساتھ دو۔ ورنہ ہم تمہارے بغیر بھی اور اگر تم نے مخالفت کی تو اس مخالفت کے باوجود بھی آزادی کی لڑائی لڑیں گے۔ ہمیں تمہاری کسی تنظیم کے مشروط تعاون کی قطعاً ضرورت نہیں۔

انھوں نے مسلمانوں کو ذہین اور صاحبِ اثر افراد کو خوش آئند مستقبل کا یقین دلا کر کانگریس میں لینا شروع کیا اور اس کے لیے انھوں نے ''مسلم ماس کانٹیکٹ'' کی تحریک شروع کی۔ ڈاکٹر اقبال نے اس کے ہلاکت خیز مضمرات کو بھانپا او

سیاسی اسٹیج سے اس کی سخت مخالفت کی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی انھوں نے نئے سرے سے تنظیم کی اور ۱۹۳۰ء میں الٰہ آباد کے اجلاس میں تقسیم ملک کا تخیل پیش کیا، جو ''مسلم ماس کانٹیکٹ'' کے مہلک مضمرات کے خلاف ان کے شدید ردِّ عمل کا لازمی نتیجہ تھا ؎

زخموں کی تیز دھوپ نے جھلسا دیا بدن
سوچوں کا ایک ہجوم مرے پاس رہ گیا

مسٹر گاندھی ان باریکیوں کو سمجھتے تھے کہ نمائندگی کرنے والی کسی قوم کی تنظیم کے ذریعے تعاون لینے میں کامیابی کے بعد اقتدار میں اس قوم کا حصہ دینا پڑے گا، برخلاف افراد کے کہ اُن کے آگے صرف ترنوالہ ہی ڈال دینا کافی ہوگا۔ ہر دور اور ہر زمانے میں جماعتی و قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دینے والے لوگ رہے۔ قوموں کے عروج و زوال میں جن کا رول بڑا مؤثر رہا ہے (عارضی طور پر ہی سہی) ؎

جعفر از بنگال، صادق از دکن
ننگِ ملّت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

مسٹر گاندھی جس قوم، جماعت اور تنظیم کی نمائندگی کرتے تھے، اس کے لیے وہ بہت پُرخلوص تھے۔ اس کے مفادات کے تحفظ نیز اس کی بالادستی اور حاکمیت اور اقتدارِ کلّی کے لیے اپنے ذہن و فکر کی تمام تر توانائیاں صَرف کر رہے تھے۔ تنظیم کے بجائے افراد کے مضمرات کا بروقت اِدراک اور اس پر عمل پیرا ہونے کا دوٹوک فیصلہ۔ یہ قدم ان کے حق میں بڑا امدبّرانہ رہا۔

چنانچہ آخر وقت تک ''مسلم ماس کانٹیکٹ'' کے فیصلے پر وہ ثابت قدم رہے۔

دوسری طرف مشہور شاعر، مفکّر، فلاسفر اور عظیم دانشور ڈاکٹر اقبالؔ نے ''تنظیم کے بجائے افراد'' کے مضمرات کو بڑی شدّت کے ساتھ محسوس کیا، اور اس کی مخالفت میں ناقابل تسخیر چٹان بن گئے۔ اقبالؔ اپنے طور پر محسوس کر رہے تھے کہ مسٹر گاندھی کی یہ تحریک اگر کامیاب ہوگئی تو مسلمانوں کی اجتماعی غلامی گویا قضائے مبرم بن جائے گی۔ غلامی کا بدیسی جوا دیسی جوئے سے بدل کر رہ جائے گا اور جنگِ آزادی کی تمام تر قربانیوں کے ثمرات صرف ایک ہی قوم کی جھولی میں چلے جائیں گے اور مسلمان جو عظیم ہندوستانی سلطنت کا مسلسل تنہا وارث رہا، اس کے ہاتھوں میں صرف کاسۂ گدائی رہ جائے گا۔ اقتدار سے محرومی ہمیشہ کے لیے اس کی سیاسی موت ہوگی۔

اگر مسٹر گاندھی اپنی قوم اور تنظیم کی حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کے حصول کے لیے ایسا سوچ سکتے تھے، تو پھر ڈاکٹر اقبال اپنی قوم (جو ہزار سالہ پُرشکوہ سلطنت کی وارث رہی) کی حاکمیت اور اس کے اقتدار کی بحالی کے لیے ایسا کیوں نہیں سوچ سکتے تھے۔ اگر کانگریس مسلمانوں کو ان کے تناسب کے اعتبار سے اقتدار میں حصّہ دیتی تو انگریزوں سے آزادی کی لڑائی لڑنے میں الگ الگ پلیٹ فارم کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ؎

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

چنانچہ ڈاکٹر اقبال مسلمانوں کو دوہری غلامی سے بچانے کے لیے سرگرم عمل ہو گئے اور جب خرابیٔ صحت نے عملی جدو جہد سے روک دیا تو انھوں نے محمد علی جناح کو لندن سے بلوا کر مسلم لیگ کی قیادت سپرد کر دی۔

ہندوستان کے جلیل القدر علما و مشائخ اور پیرانِ کرام نے اس خصوص میں بڑا مؤثر رول ادا کیا۔ ہندی مسلمان جو دنیا کے ہر ملک سے زیادہ مذہبی تھے، ہیں اور رہیں گے ان شاالمولیٰ تعالیٰ۔ جن کے دلوں پر ہمیشہ علما و مشائخ کی حکمرانی رہی۔ ان کی غالب اکثریت لیڈروں کو کم مگر علما و مشائخ کو سننے اور ان کی ہدایتوں پر عمل کرنے کی ہمیشہ عادی رہی اور آج بھی بحمدہٖ تعالیٰ اس کا یہی مزاج ہے۔

چنانچہ علما و مشائخ کے اس مقدس گروہ بالخصوص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری اور ان کے ہم عصر علما و مشائخ و رُفقا و معاونین نے جنگ آزادی کے وقت مسلم لیگ کو عوام کی دھڑکنوں میں اُتار دیا۔ مسلم لیگ کے ساتھ عوام کی زبردست تائید و حمایت رہی۔ یہ دراصل فیضان تھا علما و مشائخ کے اسی مقدّس گروہ کے تعاونِ خصوصی کا، ورنہ خالص لیڈروں کے ساتھ عوام نے کب اس طرح کا اعتنا کیا۔ ان کی حمایت کے بغیر کسی طرح کی ہمہ گیر کامیابی کا تصور ہی بے معنیٰ تھا۔ جمہوری لڑائی میں افراد کی کثرت ہی سب کچھ ہے۔ عاقلی و دانائی و فرزانگی کی حیثیت ثانوی (۱)! بقول ڈاکٹر اقبال ؎

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بالآخر بہ ہزار خرابیٔ بسیار ۱۹۴۷ء میں ہندوستان انگریزوں کے ظالمانہ پنجۂ اقتدار سے آزاد تو ہوا، مگر ٹکڑوں کی شکل میں بھارت اور پاکستان کی صورت میں برصغیر کے دو حصے ہو گئے۔ جغرافیائی، معاشرتی، تمدنی یکسانیت کے باوجود دونوں

---

(۱) تقسیم ملک کے پس منظر میں مذکورہ بالا تحریکات اور اُن کے اسباب پر جو اجمالی گفتگو میں نے کی ہے، ان پر قدرے تفصیلی معلومات کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کیجیے:

(۱) المحجة المؤتمنه فی ایات الممتحنه ازاعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی
(۲) اعلام الاعلام بان ہندوستان دار الاسلام ازاعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی
(۳) انفس الفکر فی قربان البقر ازاعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی
(۴) فتاویٰ رضویہ جلد ششم ازاعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی
(۵) النور از پروفیسر سید سلیمان اشرف، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
(۶) تحریک آزادیٔ ہند اور السواد الاعظم از پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد دہلوی
(۷) فاضل بریلوی اور ترکِ موالات از پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد دہلوی
(۸) رسالہ ترک گاؤ کشی از خواجہ حسن نظامی
(۹) پیام زندگی از محمد الیاس اعظمی

میں بعد المشرقین کا فاصلہ ہو گیا۔

ہر دو فریق کے انتقالِ مکانی کے وقت قتل وخوں ریزی، عداوت وخصومت، نفرت وحقارت، بہمیت ودرندگی کا آتش فشاں چاروں طرف اُبل پڑا۔ قیامت سے پہلے ایک ایسی قیامت برپا ہو گئی جس کا تصور بھی تقسیم ملک کے ذمّے داروں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ ہر طرف خوف ودہشت کا ماحول طاری ہو گیا۔ انسانوں نے اخوت ومحبت، رواداری و وضع داری، رحم ومروّت اور شرافت کے لبادے کو تار تار کر کے خالص درندگی کا لباس پہن لیا۔ آدمی کا آدمی سے اعتماد اُٹھ گیا۔ انسانیت لرزاں وترساں دم بخود جائے پناہ کی تلاش میں ماری ماری پھرنے لگی۔ بہتا ہوا انسانی خون پانی سے بھی ارزاں ہو گیا۔ لُٹتی پھُکتی جلتی کے ساتھ ہی ساتھ سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں عصمتیں تار تار ہوئیں۔ بے شمار ماؤں کی گود خالی ہوئی، بے حساب دُلہنوں کے سُہاگ اُجڑے۔ اَن گنت بچے یتیم ہوئے۔ ماؤں، بہنوں، عورتوں، بچوں، بوڑھوں کی آہوں، سسکیوں اور کراہوں نے قدم قدم پر ایک قیامت اُٹھا رکھی تھی۔ فطرت کی منتظر نگاہیں قدرت کی طرف بار بار اُٹھ رہی تھیں کہ۔

قیامت کیوں نہیں آتی الٰہی ماجرا کیا ہے؟

لاکھوں کروڑوں میں کھیلنے والے کوڑیوں کے محتاج اور کل کا گنگو تیلی وقت کا راجہ بھوج بن گیا ؎

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں کے نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

کچھ بھی ہو ملک بٹ گیا۔ اور اس کا سارا الزام مسلمانوں کے سر رکھ دیا گیا، جو برصغیر کی تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یہاں تقسیم ملک کے پس منظر پر ایک مختصر سی گفتگو کی جائے، تا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہونے والے یا شعوری طور پر بالغ ہونے والے مسلم وغیر مسلم دونوں نسلوں کو اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ تقسیم ملک کی بہت حد تک ذمے دار ہندو سماج ہے نہ کہ مسلمان! اور جس جرم میں یہاں کے مسلمانوں کو پچہتر سال سے سزا دی جا رہی ہے وہ سرتاسر غلط، بے بنیاد اور بے معنیٰ ہے۔ اور مسلم نوجوانوں کو یہ حقیقت معلوم ہونا چاہیے کہ جس یک طرفہ الزام کی بنیاد پر تمہارے ساتھ ہر شعبۂ زندگی میں امتیاز برتا جا رہا ہے بلکہ دوسرے اور کبھی تیسرے درجے کے شہری کی حیثیت دی جا رہی ہے، یہ تم پر ظلم ہے اور تمہاری حق تلفی ہے۔ تمہیں اب اس احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے کی ہر گز ہر گز ضرورت نہیں کہ ہمارے مسلمان بھائی اپنا حصّہ لے کر چلے گئے، ورنہ آج ہمیں یہ دن دیکھنا نہیں پڑتا۔۔۔ اس سوچ کو اپنے ذہن وفکر سے کھُرچ کر پھینک دو، یہ ملک تمہارا ہے۔ یہ وطن تمہاری میراث ہے۔ تم غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں، افغانوں اور مغلوں کے جانشین اور اُن کے وارث ہو۔ جمہوری قدروں کی بنیاد پر آزاد ہندوستان میں تمہارے حقوق ویسے ہی ہیں جیسے گاندھی، نہرو، پٹیل، مرار جی، اندرا گاندھی، اٹل بہاری واجپئی اور راجیو گاندھی وغیرہ وغیرہ کے۔ تمہیں مایوس اور حالات کی سنگینی سے خوف زدہ ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اس خوف کو اپنے اندر سے نکال پھینکو۔

یہ تقریباً پچہتر سالہ احساسِ کمتری اور خوف جو تمہارے اندر اندر پیدا کیا گیا ہے بلکہ تمہارے خون میں انجیکٹ کیا گیا ہے یہ فریضہ ان ہاتھوں کا انجام دیا ہوا ہے جسے بدقسمتی سے تم اپنا سمجھتے رہے۔

تمہارے تشخص، تمہاری اہمیت، تمہارے شہری حقوق اور تمہاری امیج کو خود تمہاری نگاہوں سے ختم کرنے والے وہ مسلمان کہلانے والے اقتدارِ وقت کے دلال تھے جو اپنے کو نیشنلسٹ (Nationalist) کہلانے پر مفتخر تھے۔ یا مذہبی لباس میں چڑھتے سورج کے پجاریوں کا وہ مقدس نما جرگہ تھا کہ اقتدارِ وقت کا تیور ان کے سجدوں کی سمت بدل دیتا ؎

یہ گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بتکدے میں کروں بیاں تو کہے صنم بھی ہری ہری

ترکِ سکونت کے وقت انسانیت کی تذلیل، آگ اور خون کے وحشت ناک نظاروں اور ابنائے وطن کے غضب ناک تیوروں نے رہ جانے والے مسلمانوں کو خوف زدہ کردیا۔ حالات کی سنگینی اور ماحول کے بگڑے تیوروں نے بچے کھچے مخلص دانشوروں، فقیہوں، عالموں، واعظوں اور مفتیوں کو خاصا محتاط بنا دیا۔ انھوں نے خالص اور خالص مذہبی دائرۂ عمل ہی تک اپنے آپ کو محدود کرلیا۔ مسلم اور ملکی مسائل سے اپنی آنکھیں بند کر کے مذہب کا گوشۂ عافیت تلاش کرلیا۔

ہر دور، ہر زمانے اور ہر ملک میں چڑھتے سورج کے پجاریوں کی ایک جماعت ایسی رہی جس نے حالات کے مطابق اپنی وفاداریوں کی سمت متعین کرلی۔ یہاں ہندوستان میں یہی سب کچھ ہوا۔ آزادی سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ چڑھتے سورج کے یہ پجاری عبا، قبا میں ملبوس انگریزوں کا بوٹ بڑے فدویانہ انداز میں چاٹ رہے ہیں۔ ان کو اپنی غلامی کے دستاویزی ثبوت سے مطمئن کرتے ہیں۔ اپنی مذہبی کتابوں میں [1] برٹش کے ظالم و جابر اور غاصب حکومت کو بار بار رحم دل گورنمنٹ لکھ رہے ہیں۔ حد یہ کہ ان سے جہاد کو غیر اسلامی فعل اور ان سے لڑنے پر عدم جواز کے فتوے دے رہے ہیں اور جنگجو بہادر اور انگریز جیسی شاطر قوم کے قابو میں نہ آنے والی قوم سرحدی پٹھان اور سکھ کا زور توڑنے کے لیے انگریزوں کی مالی امداد اور اخلاقی تعاون سے ان پر فوج کشی کو افسانۂ جہاد بتا، سُنا اور لکھ رہے ہیں اور انگریزوں کے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے اسے اسلامی جہاد ثابت کرنے کے لیے زبان و قلم اور ذرائع ابلاغ کی ساری توانائیاں خرچ کررہے ہیں ؎

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

اور جب اس چنڈال چوکڑی کو یقین ہوگیا کہ ہماری تمام تر وفاداریوں، وطن و ملّت فروشیوں کے باوجود انگریزوں کا چل چلاؤ یقینی ہوگیا تو غازیوں، شہیدوں اور وفاداروں میں نام لکھانا اور انگلی کٹا کر گردن بچانا ضروری سمجھا۔

---

(۱) عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے: ''جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انھوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔'' آگے لکھا ہے:

''جب بغاوت و فساد کا قصّہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی۔ الخ''

(تذکرۃ الرشید، حصہ اوّل، مطبوع محبوب المطابع، برقی پریس، دہلی صفحہ ۷۳ وصفحہ ۷۶)

ورنہ کیا وجہ ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کے وقت مجاہدین آزادی کے امام مجاہدِ حریت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی وطن کو آزاد کرانے کی پاداش میں اپنے ساتھیوں، دوستوں، رفیقوں سمیت کالا پانی (جزیرہ انڈمان) میں قید و بند کے عالم میں راہئ ملک بقا ہوں، مگر چڑھتے سورج کے پجاریوں کا یہی طبقہ انگریزوں کی نوازشات کا مستحق، ان کا معتمد علیہ، ان کے مفادات کا نگراں، ان کی ناک کا بال اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا رہا۔ اس کو زندگی کی ساری آسائشیں، نعمتیں، راحتیں، مسرتیں میسّر۔ حد یہ کہ یہی طبقہ انگریزوں کی نگاہ میں اسلام کا پادری بھی بنا رہا اور صلیب کا وفادار بھی ؎

رِند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

اور جب انگریزی حکومت کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا تو اس شاطر ترین طبقے نے ان سے بظاہر آنکھیں پھیرتے ہوئے وطن کے وفاداروں، آزادی کے دیوانوں، مجاہدوں اور غازیوں کی فہرست میں اپنا نام لکھالیا، ایک آدھ بار جیل جا کر ریشمی رومال لہرا کر مجاہدین آزادی کی صف میں داخل ہو گئے ؎

خوشامدوں میں نہیں عظمتِ وفا یارو
اگر ضمیر ہے زندہ تو آؤ سچ بولیں

اصحابِ فکر و نظر کے ترکِ وطن کرنے اور بچے کھچے دیدہ وروں کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد اس عیار ترین گروپ کو اندھوں میں کانا راجہ کی حیثیت حاصل ہو گئی اور تقسیم ملک کے بعد جمعیۃ العلماء ہند کے نام سے چڑھتے سورج کے پجاریوں اور اقتدارِ وقت کے دلالوں کا ایک گروپ بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں کی نیم مذہبی و نیم سیاسی نمائندگی کے نام پر اُبھرا اور انتہائی عیاریوں کے ساتھ رہ جانے والے ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ و ترجمان بن کر انھیں اقتدارِ وقت کے کشکول میں ڈال دیا ؎

کاش پھولوں پہ ہو جائے یہ حقیقت واضح
آج شبنم ہی سے خطرہ ہے شراروں سے نہیں

اس ملت فروش گروپ کا نصب العین ہی اقتدارِ وقت کی دلالی، کاسہ لیسی اور دریوزہ گری تھا۔ یہ بہروپیوں، دلالوں اور ملّت فروشوں کی وہی جماعت ہے جس کا لیڈر حسین احمد ٹانڈوی تھا (جو خواہ مخواہ مدنی کے نام سے مشہور کرایا گیا۔ رہیں ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں اور لوگوں کو یہ تاثّر دیں کہ ہم مدینے کے رہنے والے ہیں) حسین احمد ٹانڈوی کی ملت فروشی پر ڈاکٹر اقبالؔ جیسا آفاقی شاعر، دانشور و فلاسفر چیخ اُٹھا تھا ؎

عجم[1] ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود بر سرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی ست

---

[1] ارمغانِ حجاز، کلیاتِ اقبال

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　　اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

خوشامدیوں، جاہ طلبوں، اقتدار کے ایجنٹوں کی ذہنی غلامی کا عالم یہ تھا کہ کانگریس کے ناخداؤں کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے وہ ٹانڈوی (جسے خواہ مخواہ مدنی اور زبردستی شیخ الاسلام باور کرایا گیا) اس مسلمان کی نمازِ جنازہ ہی نہیں پڑھتا جس کا کفن کھدّر کا نہیں ہوتا۔ (۱)

ایسوں کی غلامانہ اور آوارہ ذہنیت پر اکبر الہٰ آبادی نے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا ہے ؂

یہ کانگریسی ملّا تم کو بتاؤں کیا ہیں
نہرو کی پالیسی کا اُردو میں ترجمہ ہیں

یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس کی تائید دہلی کے ایک مشہور و سنجیدہ ماہنامہ قاری جنوری ۱۹۸۷ء کی اشاعت سے بھی ہو رہی ہے۔ دیدہ ور ایڈیٹر اپنے طویل ادارتی نوٹ میں رقم طراز ہے:—

''بدقسمتی سے تقسیم ملک کے بعد ملّتِ اسلامیہ کے باصلاحیت و صاحبِ کردار افراد ترکِ وطن کر گئے اور (اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق) ہندوستانی مسلمانوں کو مذہبی و سیاسی قیادت کے خود ساختہ دعوے دار جمعیتی لیڈروں نے اربابِ اقتدار سے انتہائی چالاکی و عیاری کے ساتھ ساز باز کر کے زخم خوردہ اا ور نیم جاں مظلوم ملّتِ اسلامیہ کے عظیم تر مفادات کو اپنے قابلِ مذمت اقتدار کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔

اس طرح سیاسی میدان میں ان درباریوں کے ناپاک وجود کو زندہ رکھنے کے لیے پارلیمنٹ کی کوئی ایک سیٹ یا اسمبلیوں کی اِکّا دُکّا نشست بطور خیرات ان گداگروں کی جھولی میں ڈالی جاتی رہی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ خود ساختہ راجکمار اپنا شمار پانچ سواروں میں کرنے لگے۔ (ملخصاً)

''یہ ان ملّت فروشوں کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو تمام ہی اعزازات بطورِ نوازشِ خاص طور دروازے سے دیئے جاتے رہے اور ملک کی آزادی سے لے کر آج تک ان جمعیتی قبر فروشوں کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ یہ سینہ تان کر ملتِ اسلامیہ کے مظلوم عوام سے اپنے قول و عمل اور افعال و کردار کی حقّانیت پر سندِ تائید و استحسان حاصل کر سکیں۔' (ماہنامہ قاری، جنوری ۱۹۸۷ء)

بہر حال غلطی جس کی بھی رہی ہو آزادی ہوتے ہوتے ملک دو حصّوں میں بٹ گیا۔ ملک تقسیم ہوتے ہی یہاں پر رہ جانے والے مسلمانوں پر دورِ ابتلا شروع ہوا۔ ابنائے وطن کی طرف سے مسلمانوں کو نا کردہ گناہوں کی سزا ملنی شروع ہو گئی۔ تازہ ترین حادثہ ہونے کی وجہ سے انتقامی ردّ عمل کا مظاہرہ بڑا صبر آزما اور انتہائی دردناک تھا۔ حالانکہ جانے والوں کے مقابلے میں رہ جانے والے مسلمان برادرانِ وطن کی طرف سے ہمدردی، تسلی اور دلاسے کے زیادہ مستحق تھے، مگر بُرا ہو اندھی دشمنی اور تعصّب کی بالادستی کا کہ یہ سب نہیں ہوا بلکہ جو کچھ ہوا وہ مسلمانوں کے لیے بڑا خوف ناک، بڑا دہشت ناک،

---

۱) الجمعیۃ کا شیخ الاسلام نمبر

بڑا وحشت ناک، بڑا اندوہ ناک اور بڑا شرم ناک تھا۔ مسلمان اپنے موجودہ حالات سے بے حد پریشان اور خوف زدہ تھا۔

کنجِ قفس میں کہتی تھی رو رو کے عندلیب
اِک روز شاخِ گل پہ مِرا آشیانہ تھا

ایسے ماحول میں نیشنلسٹ کہلایا جانے والا وہ طبقہ جو حکومت اور مسلمانوں کے درمیان اپنے آپ کو رابطے کی سیاسی کڑی سمجھتا تھا، اسے چاہیے تو یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے کچھ کرتا۔ ان کی مظلومانہ اور دردناک صورتِ حال کو اربابِ اقتدار کے سامنے رکھ کر ان کی تکالیف دور کرنے کا کوئی راستہ نکالتا۔ عام مسلمانوں کے درد کو اپنا درد سمجھ کر ان کے درد کا درماں بنتا۔ ان کے جلتے زخموں پر تسکین کا مرہم رکھ کر ان کے آنسو پونچھتا۔

مگر اس کے بجائے وہ اپنی چند روزہ حیاتِ مستعار کی آسائش کے لیے حکومت کے حسبِ منشا مسلمانوں کو اجتماعی سیاست سے توبہ کرا رہا تھا۔ الہلال و البلاغ کا شعلہ نوا، حیرت انگیز ایڈیٹر، زبان و قلم کا مردِ میدان اپنی نوکِ قلم سے ہندوستانی ادب کو مالامال کرنے والا ابوالکلام آزاد، گاندھی، نہرو، پٹیل وغیرہ کے منشا کی تکمیل میں نیشنلسٹوں کا امام الہند بن کر مسلمانوں کو سیاسی موت مرنے کی تلقین کر رہا تھا ؎

نہ اِدھر اُدھر کی تو بات کر، یہ بتا قافلہ کیوں لٹا
ہمیں رہزنوں سے غرض نہیں، تری رہبری کا سوال ہے

اس بدترین صورتِ حال اور تلخ ترین حقیقت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سرد و گرم چشیدہ، مسلم مجلس اُتر پردیش کے رُکنِ خصوصی اور ڈاکٹر فریدی کے معتمد علیہ جناب محمد الیاس اعظمی رقم طراز ہیں:

''اپنی بزدلانہ بھگدڑ کو ہجرت کا مقدس نام دے کر انھوں نے باصلاحیت افراد کی پوری کھیپ کی بھگدڑ کا شرعی جواز تلاش کرلیا۔ رہی سہی کسر مولانا ابولکلام آزاد نے اس وقت پوری کردی جب انھوں نے ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ کنونشن کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی اجتماعی سیاست سے توبہ کرادی۔ اس طرح ''مسلم ماس کانٹیکٹ'' کا تتمہ اس ہاتھ سے لکھوایا گیا جس کی انگلیوں میں کلام اللہ کی تفسیر کی روشنائی ابھی تک لگی ہوئی تھی ؎

تسبیح توڑنے میں خود ان کا ہی ہاتھ ہے
جو آج کہہ رہے ہیں کہ دانے بکھر گئے

(پیامِ زندگی، از محمد الیاس اعظمی، صفحہ ۱۸)

دوسری طرف اقتدارِ وقت کے پروردوں کا وہ عیارترین طبقہ کہ بدلتے ماحول، بگڑتے تیور جن کے سجدوں کی سمت بدل دیتے۔ عبا، قبا میں ملبوس، اقتدار کی چوکھٹ پر کاسۂ گدائی لیے مسلمانوں کے اقدار، حمیت، غیرت اور دستوری حقوق دسترخوان کے پس خوردے کے عوض حکومتِ وقت کے کشکول میں ڈالنے کے لیے ہمہ وقت مستعد کھڑا رہتا۔ ''حضرت جی'' لوگوں پر مشتمل یہ مقدس نما طبقہ ہاں جی ملانے میں نیشنلسٹ کہلائے جانے والے گروہ سے دس قدم آگے تھا۔ انھیں کسی مسئلے

میں مسلمانوں کو اعتماد میں لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی ضرورت تو بس یہ تھی کہ بہر صورت ان کے آقایانِ نعمت ان کی ذات پر اپنے اعتماد کی مسند سجائے رکھیں اور انعام میں اسمبلی و پارلیمنٹ کی اکّا دکّا نشستیں بطور نوازش عطا فرماتے رہیں اور وقتاً فوقتاً خاص دستِ غیب کے دروازے کی کنجی عطا فرماتے رہیں۔

نیم سیاسی، نیم مذہبی جرگوں کا یہ پورا قافلہ ایسے پُرآشوب، بلاخیز، تاریک اور حوصلہ شکن ماحول میں دن رات بس یہی ایک خدمت انجام دیتا رہا کہ مسلمانو! تم پر دن رات چاہے جتنا ظلم و ستم ہو، تم آہ تک مت کرو۔ آئے دن تم لوٹے، پھونکے، مارے، کاٹے جاؤ مگر تم کچھ مت بولو۔ اب اس ملک میں ہمارا رہ ہی کیا گیا ہے۔ جو کچھ تھا وہ پاکستان کے نام پر ہمارے مسلمان بھائی لے جا چکے ہیں۔ یہ تو ہماری کوششیں اور ہماری رحم دل گورنمنٹ کی مہربانیاں ہیں کہ وہ دستورِ ہند کے پیش نظر تمہیں اپنے ملک بھارت میں زندہ یا مُردہ رہنے کا حق تو دیتے ہیں۔ اُن کا یہی احسان کیا کم ہے۔ لہٰذا ہر تازہ ظلم و ستم، لوٹ پھونک، مار کاٹ پر تم آہ و فغاں، گریہ وزاری، نالہ و شیون، چیخ اور پکار، احتجاج و مظاہرہ کے بجائے خاموش ہو کر صرف اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں سر چھپانے کے لیے دو ہاتھ وطن تو دیا۔ تمہارے اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے گھروں میں رہنے تو دیا ؎

یہی شیخ حرم ہے جو چُرا کے بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دَلقِ سلیماں، چادرِ زہرا

حالانکہ دوسروں کی بہ نسبت آخرت کو دنیا کے بدلے فروخت کر دینے والا یہ طبقہ اس حقیقت سے زیادہ باخبر تھا کہ تقسیم ملک کی اصل ذمے دار کانگریس ہے۔

دن بدن بگڑتے حالات نے باصلاحیت افراد کو مایوس و دہشت زدہ کر دیا۔ دانش وروں کا وہ باخبر طبقہ جو ماحول، معاشرہ، حالات کے پیچ و خم نیز زندہ حقیقتوں کا ترجمان ہوتا ہے، اس نے بھی حقائق سے آنکھیں بند کر کے ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے بجائے ادب برائے چاپلوسی کا اُصول اپنا لیا۔ رہ جانے والوں میں قابل ذکر علما و مشائخ نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو خانقاہوں، عقیدت مندوں اور خالص مذہبی حلقوں تک محدود کر لیا۔ متعدد مذہبی تنظیموں کا دائرۂ عمل بھی خالص مذہبی ہی ہو کر رہ گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور آئے دن مسلم کش فسادات پر ان کا موقف ٹک ٹک دیدم، دَم نہ کشیدم ہو کر رہ گیا۔

ایسے حوصلہ شکن، پُرآشوب اور رستاخیز ماحول میں جرأتِ مومنانہ کے ساتھ عزم و استقلال، عزیمت و استقامت کا تیور لیے بڑی گھن گرج کے ساتھ ایک آواز اُبھری جس نے ماحول کو سنّاٹے کو توڑا، حالات کے جمود کو تار تار کیا۔ مسلمانوں کے اندر خوف و ہراس اور دہشت زدگی سے پیدا شدہ مایوسی کو ختم کیا، جمہوری قدروں کے حوالے سے انھیں ان کے دستوری حقوق یاد دلائے، اقتدارِ وقت کے سیاسی، نیم سیاسی اور مذہبی ایجنٹوں کے پیدا کردہ احساسِ کمتری کے خول سے مسلمانوں کو باہر نکالا۔ التمش و خلجی، بلبن و تغلق، بابر و جہانگیر، شاہ جہاں و اورنگ زیب اور شیرِ میسور سلطان ٹیپو شہید کے وارثوں کو ان

کی حیثیت یاد دلائی ؎

بندۂ مومن کا دل بیم ورِجا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

جانے کیا بات تھی کہ اس آواز کو بڑی حیرتوں کے ساتھ سُنا گیا۔ خوشگوار حیرت!!!! نا گوار حیرت!!! بیزار حیرت!!! عام مسلمانوں نے تحیر خیز مسرّت کے عالم میں اس آواز کی پذیرائی کی۔ ہر طرف سے لبیک کہتے ہوئے اسے گھیرے میں لے لیا۔ دبے کچلے لوگوں اور دُکھ کے ماروں کی ایک بھیڑ اس کے ساتھ ہوئی۔ عام مسلمان اس کی قیادت میں چلتے ہوئے فخر محسوس کرنے لگے۔ عافیت کوشوں نے بڑی ناگوار حیرت کے ساتھ اس آواز کی طرف دیکھا اور اپنے عافیت کدے کے لیے اسے خلل محسوس کر کے اس سے دامن بچایا۔

اقتدارِ وقت کے چہیتوں کے خیموں میں گھبراہٹ طاری ہوئی اور براہِ راست اس کی دھمک اپنے پیٹ پر محسوس کرنے لگے۔ انتظامیہ اس آواز کی تاثیری قوت سے خوف زدہ ہوئی۔ مسلم کش فسادات اور مسلمانوں کے خلاف بڑھتے ہوئے مظالم کی روک تھام کے لیے اس کی قہرمانی تنقیدوں اور مجاہدانہ للکار نے اسے تشویش زدہ کر دیا۔

بالآخر اسے خاموش کرنے کے لیے سازش کا جال پھیلایا گیا، چڑھتے سورج کے پجاری اور مفاد پرست انڈر گراؤنڈ اس کے خلاف مصروفِ عمل ہو گئے۔ اقتدار کی سطح سے لے کر اندر تک مفاد پرستوں سے لے کر ابن الوقتوں تک سب اپنی اپنی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ مسلمانوں کی آبرومندانہ بقا کے لیے اس کی جہدِ مسلسل اور مجاہدانہ جوشِ عمل کو خبروں سے بائیکاٹ کر دیا گیا۔ نیشنل اور قومی پریس کو تو جانے دیجیے، نام نہاد محدود مسلم صحافت کو بھی زکام ہو گیا۔ خوشنودی، سُرخ روئی اور چاپلوسی میں اس نے بھی بلیک آؤٹ کیا۔ ذرائع ابلاغ پر گرفت مضبوط کر دی گئی کہ حوصلوں کو مزید توانائی نہ مل سکے۔ اس پر الزامات و مقدمات کی بھر مار کر دی گئی۔ بار بار اس کی عزّتِ نفس کو مجروح کیا گیا۔ آئے دن جیل یاترا اس پر واجب کر دی گئی۔ اتنے طویل عرصے تک اسے سرکاری مہمان بنایا گیا کہ جیل کے در و دیوار بھی اس سے مانوس ہو گئے۔ جیل میں ''اے کلاس'' کے مستحق کو ''سی کلاس'' دی جاتی رہی کہ حوصلوں کی شکست و ریخت ہو۔

بالآخر اس کے خلاف بگڑتے ماحول اور بدلتے حالات نے وفاداروں کو خوف زدہ، مایوس، بد دل اور شکستہ خاطر کر دیا۔ اپنی قوم کے تحفّظ اور آبرومندانہ بقا کے لیے وہ اتنا تیز گام ہوا کہ ساتھ میں چلنے والے راہ ہی میں رہ گئے۔

وفاداروں، جاں نثاروں اور نیاز مندوں کا جوش کم ہوتا گیا۔ اُن کا پُرخلوص تعاون بے تعلقی اور چشم پوشی سے بدل کر رہ گیا۔

اپنوں کا عدم تعاون، معاندین کی ریشہ دوانیاں اور اقتدارِ اعلیٰ کے لے پالکوں کی سازشیں رنگ لائیں اور پھر ایک وقت وہ آیا کہ جب وہ باطل قوتوں، ظالموں، جفا کاروں اور خون کے پیاسوں کے خلاف میدانِ عمل میں اُترا تو میمنہ، میسرہ اور پشت تینوں اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ صرف چند بے حد مخلصین کے ساتھ وہ جہادِ زندگانی میں اکیلا اور تنہا رہ گیا ؎

شبِ فراق ہے جی بھر کے آج روئیں گے
بَلا سے دُور یہ دل کا غبار ہو کہ نہ ہو

مگر وہ بدلے ہوئے حالات سے مایوس، بددل اور شکستہ خاطر نہیں ہوا۔ یقیں محکم، عمل پیہم کے سہارے وہ چلتا رہا۔ اس کی آواز کی گھن گرج کا وہی عالم تھا۔ تب وتابِ جاودانہ کی سرمستی وہی رہی۔ اپنی قوم کی سربلندی بلکہ ہر مظلوم کی دادرسی کے لیے اس کی جہدِ مسلسل کا وہی عالم رہا۔ اقتدارِ اعلیٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی کیفیت وہی رہی۔

دوستو! جانتے ہو وہ آواز کس کی تھی؟ اپنی قوم کی سرفرازی کے لیے آہنی زنجیروں اور جیل کے در و دیوار سے دوستی کرنے والے ذات کون تھی؟ وہ کون تھا جس کی مجاہدانہ للکار اور سرعام برہنہ تنقیدوں سے اقتدارِ اعلیٰ کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ پڑتا ؎

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے
جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

اپنی قوم کی بدحالی، بدعملی، تن آسانی اور بے بسی پر رات کی تنہائیوں میں پھوٹ پھوٹ کر رونے والا ؎

ساتھی ساتھ کہہ کے پکاروں ساتھی ہو تو جواب آئے
پھر جھنجھلا کر سر دے پٹکوں چل رے مولیٰ والی ہے

کہہ کر پھر نئے عزائم کے ساتھ کمر ہمت باندھنے والا۔ اپنی قوم کی سربلندی کے لیے پھولوں کی سیج چھوڑ کر کانٹوں کا بستر پسند کرنے والا، راجاؤں کا راجا، رئیسوں کا رئیس، علم کا تاجدار، فقر کا سرمایہ دار، دین کا غازی، بات کا دھنی، زبان کا مرد، اسلام وسنّیت کا پشت پناہ، فضل حق خیرآبادی کا جانشین، امام احمد رضا کے کچھار کا شیرِ نر، رازیِ زماں، غزالیِ دوراں، معقولات کا امامِ برحق، منقولات کا شیخ کامل، علم وفضل کا بادشاہ۔ ''یقیں محکم، عمل پیہم،، محبت فاتح عالم'' کی عملی تفسیر، لاکھوں کا پیشوا، کروڑوں کا مقتدا، سوادِ اعظم کا رہنما، رئیس التارکین، امام المتکلمین، قدوۃ العارفین، سرکار مجاہدِ ملت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمن (۱) قادری ہاشمی عباسی مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، بانی وامیر کل ہند خاکسارانِ حق، مؤسس جامعہ حبیبیہ، جوروفیہ اسٹیٹ دھام نگر کے والی اور اُڑیسہ کے رئیس اعظم تھے۔ جن کی خاندانی ریاست عہدِ مغلیہ سے شروع ہو کر انگریزوں کے دور میں کافی وسیع ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ برٹش گورنمنٹ کو آپ کی ریاست ہزاروں سالانہ ٹیکس کی شکل میں

---

۱) سرکار مجاہد ملت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمن قادری ہاشمی عباسی علیہ الرحمۃ والرضوان چودھویں صدی کے نصف ثانی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کے ایک اولوالعزم، پُرجوش اور عظیم مذہبی رہنما کی حیثیت سے اُبھرے۔ اُمت مسلمہ نے جس اعتماد کے ساتھ آپ کے فرق اقدس پر قیادت کا بارِ عظیم رکھا، اس اعتماد کی بجاطور پر آپ نے لاج رکھی۔ ملک وبیرونِ ملک ہر جگہ نازک ترین صورتِ حال میں بھی آپ نے سوادِ اعظم کو مایوس نہیں کیا۔ آئے دن کی قید وبند کی صعوبتیں آپ کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کرسکیں۔ اپنے زمانے میں قوم وملّت کی سرفرازی اور شوکت اسلام کی بقا کے لیے جو عظیم اور یادگار قربانیاں آپ نے دی ہیں دور، دور تک ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی ذاتِ بابرکات کو برصغیر ہند کے عصر جدید کی اسلامی تاریخ کا جلی عنوان قرار دیا جاسکتا ہے۔ آپ کی ہمہ صفت ذات میں تاریخ کے ہزاروں روزن جھانکتے نظر آتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے تمام گوشوں میں اسلامیانِ ہند کی مذہبی، سیاسی، معاشی، اقتصادی، ثقافتی تاریخ وابستہ ہے۔ اس مختصر سی تحریر کو خراجِ عقیدت ہی کہہ سکتے ہیں۔ اس تحریر سے آپ کی ہمہ جہت شخصیت کے کسی گوشہ کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت ہے کہ آپ کی حیاتِ طیبہ کے ہر گوشے میں اتنی سیر حاصل گفتگو کی جائے کہ ذکرِ حبیب کی جلو میں ایک جامع تاریخ مدوّن ہوجائے۔ اس ضمن میں صفحات نہیں بلکہ مجلّدات دیکھے جائیں۔ (محمد وارث جمال قادری)

دیتی تھی۔آزاد ہندوستان میں دھام نگر اسٹیٹ کی جاگیر کی تفصیلات اضلاعِ بالیسر و کٹک کے دھام نگر، دیوڑی، آند پور، جہاں گیر، برواں، تاراپوکھر، نلانگ، بھدرک، جاج پور، کورئی، دبلو وغیرہ مواضع پر مشتمل تھیں۔اتنی وسیع وعریض ریاست کا والی جو نازوں میں پلا، بڑھا، جوان ہوا۔لباس شاہانہ کے بجائے وہ فقیر بادشاہ اپنی دنیوی عظمتوں، حشمتوں، رفعتوں کی بلند چوٹی سے اُتر کر شوکتِ اسلام اور ملّت کی سرفرازی کے لیے فقیرانہ لباس میں زندگی بھر آبلہ پا رہا۔ جہادِ زندگانی میں جو اپنوں کے تغافل، بیگانوں کی ریشہ دوانیوں اور اقتدارِ وقت کے مسلسل مظالم کا شکار رہنے کے باوجود زندگی بھر سر بہ کف رہا ؎

فکر کی کیسے رہیں گے ہند میں اُن سے کیا مطلب جو ہیں اب سند میں
ہاتفِ غیب نے دی مجھ کو صدا سر بکف رہنا پڑے گا ہند میں

(حضور مجاہدِ ملت علیہ الرحمہ)

کسی تحریک یا کسی عظیم شخصیت کے کارناموں پر گفتگو کرنے سے پہلے اُس دور کے حالات اور گرد و پیش کے ماحول کی جب تک صحیح عکّاسی نہ کی جائے اس کی اہمیت و عظمت اور قربانیوں کا کماحقّہ اندازہ نہیں ہوسکتا۔آل انڈیا تبلیغ سیرت پر کچھ عرض کرنے سے قبل اتنی طویل گفتگو کی ضرورت صرف اس لیے پڑی تا کہ اس عظیم تحریک کا پس منظر و پیش منظر نگاہوں میں رہے۔آج کے حالات اور اُس دور کے حالات میں بڑا نمایاں فرق ہو چکا ہے۔کم از کم آج احساسِ کمتری، بدحالی، بے بسی، محرومی اور خوف زدگی کا وہ عالم نہیں رہا، جو تقریباً پچھتر سال پہلے تھا۔

اس دور میں مسلم کش فسادات، مسلمانوں کے دستوری حقوق کی پامالی ان پر ہونے والے مظالم پر اربابِ اقتدار کو سرزنش، ڈانٹ پھٹکار، انتظامیہ کی کوتاہیوں، لاپرواہیوں، جانب داریوں پر محاسبہ وہ بھی ہزاروں، لاکھوں کے مجمع عام میں! ایک کارنامے کی حیثیت رکھتا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد کا ابتدائی دور مظلوم مسلم اقلیت کے لیے آہوں، آنسوؤں، سسکیوں اور کراہوں کا دور تھا۔ایسے عالم میں مسلم قوم کی بہتری، سربلندی اور سرفرازی کے لیے اپنے وسیع وعریض اسٹیٹ سے منہ موڑ کر رات دن مصروفِ عمل ہو جانا یہ معمولی کارنامہ نہیں ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

انھیں ایّام میں فیض آباد کے اطراف و جوانب میں مسلسل دینی اجلاس چل رہے تھے۔علم و ایقان، عشق و عرفان، زبان و بیان کے بادشاہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے نامور خلیفہ محدّثِ اعظم ہند حضرت مولانا سید محمد کچھوچھوی اپنی پوری تب و تابِ جاودانہ کے ساتھ رونق افروز تھے۔اپنے مرکزِ عقیدت کی بارگاہ میں خلق کا رجوع قابلِ رشک تھا کہ اسی درمیان چند دردمند اصحابِ فکر و نظر مسلمانوں نے بطور انٹرویو چند سوالات کیے ؎

”حضورِ والا! مسلمانوں کے تعلق سے صورتِ حال جب اتنی ناگفتہ بہ، مخدوش اور دھما کہ خیز ہے تو ایسی صورت میں کسی ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کی نازک ترین صورتِ حال اور ان کے درپیش مسائل میں کوئی مؤثر ادا کر سکے؟

(تھوڑی دیر غور و فکر کرنے کے بعد)

ہاں، ایک نئی جماعت کی تشکیل کی ضرورت شدّت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں۔

حضورِ والا! گستاخی معاف! سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت میں بروقت متعدد جماعتیں مثلاً جمعیۃ العلماء قدیم، سنّی کانفرنس وغیرہ موجود ہیں، تو اِن تنظیموں کے ہوتے ہوئے ایک عدد مزید جماعت کی ضرورت کیوں؟

بے شک، مذکورہ بالا جماعتیں جو بروقت ہمارے اندر موجود ہیں، یہ خالص مذہبی دائرۂ عمل ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ مذہب اسلام سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت پر خارجی و داخلی حملے کی دفاع بالخصوص فرقہ ہائے باطلہ کا ردّ و استیصال ہی ان کا میدان رہ گیا ہے۔ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم، ان کو درپیش مسائل اور عصری تقاضوں کی تکمیل میں یہ جماعتیں بہت حد تک ناکام ہیں جبکہ اس وقت ہمیں ایک ایسی جماعت کی شدید ضرورت ہے جو مسلمانوں کے تمام تر مفادات کے تحفّظات، مسلمانوں کے دستوری حقوق کی عملی بحالی اور ان کو آئے دن درپیش مسائل کے حل کے لیے غیر صالح سیاسی آلودگیوں سے بچتے ہوئے بھرپور جدّ و جہد کر سکے۔ شوکتِ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقا اور ان کے دستوری حقوق کی مساویانہ بحالی کے لیے قربانیاں دے۔

تو کیا حضرت کے ذہن میں کچھ خاکے ہیں جن پر کسی نئی جماعت کی تشکیل کی جا سکے؟

نئی جماعت کی تشکیل سے متعلق جو خطوط اور خاکے میرے ذہن میں ہیں اُن پر اکابر علمائے اسلام و مشائخ عظام سے استصواب، ان کے قیمتی آرا اور اُن کا عملی تعاون و بے حد ضروری ہے۔ میری خواہش ہے کہ نئی جماعت کی تشکیل میں ہندوستان کا دل و دماغ شامل ہو۔ ان کے قیمتی مشوروں اور عملی تعاون سے یہ مبارک کام انجام پذیر ہو اور اس کے لیے مناسب موقع بمبئی میں مجالس محرم الحرام کے وقت ہوگا کہ اس وقت تقریباً پورے ملک کے جلیل القدر علمائے کرام و مشائخ عظام کی ایک کثیر تعداد وہاں موجود ہوتی ہے۔ اس اہم مسئلے کو بمبئی میں ان کے سامنے رکھا جائے۔

چنانچہ مجالس محرم الحرام ۱۳۶۹ھ کے موقع پر بمبئی میں اکابر علمائے کرام و شیوخ عظام کی متعدد نشستیں ہوئیں۔ کافی غور و خوض اور طویل بحثوں کے باوجود علمائے کرام کسی حتمی فیصلے پر متفق نہ ہو سکے۔ اس طرح اس وقت بمبئی میں کسی جماعت کی تشکیل ہی نہ ہو سکی۔ البتہ اس بات پر سبھی متفق ہو گئی کہ اس بیحد اہم مسئلے کو مجدّدِ اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے عرسِ مبارک پر اُٹھایا جائے کہ اس موقع پر پورے ہندوستان کے دیدہ وروں، دانشوروں کی اچھی تعداد، علما و مشائخ کا نورانی قافلہ نیز خواص الخواص کا محتاط طبقہ از خود عبقری الشرق اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کی بارگاہِ کرم میں خراجِ عقیدت کے لیے چاروں طرف سے اُمڈ پڑتا ہے۔ چنانچہ حسب وعدہ عرسِ اعلیٰ حضرت کے موقع پر سرزمین بریلی شریف میں صدر الافاضل حضرت مولانا سیّد محمد نعیم الدین مرادآبادی کے محترم شہزادے حضرت مولانا سید اختصاص

الدین نعیمی کی صدارت میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے علما، مشائخ، دیدہ وروں، دانشوروں کی ایک اہم میٹنگ ہوئی۔ لمبی بحثوں، قیمتی مشوروں اور بڑے غور وخوض کے بعد ۲۴ رصفر المظفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۶ ردسمبر ۱۹۴۹ء میں "**آل انڈیا تبلیغ سیرت**" کا قیام (۱) عمل میں آیا۔ **فالحمد للّٰہ تعالیٰ علیٰ منّہٖ و احسانہٖ۔**

ہندوستان بھر سے آئے ہوئے جلیل القدر علما و مشائخ، اصحابِ فکر و نظر، اربابِ علم و دانش اور حاملینِ کردار و عمل نے حضرت مولانا محمد حبیب الرحمٰن قادری ہاشمی عباسی رئیس اعظم اُڑیسہ والی رؤفیہ اسٹیٹ دھام نگر کو ان کی غیر موجودگی میں مرکزی صدر نامزد کیا۔ اسی وقت تین مرکزی سرپرستوں کا انتخاب بھی عمل میں آیا۔

مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خاں، محدّث اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی، ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری پروفیسر شمس الہدیٰ کالج پٹنہ۔ یہ نفوسِ قدسیہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے سرپرست ہوئے۔

مفتی آگرہ مولانا عبد الحفیظ صاحب نائب صدر کی حیثیت سے نامزد ہوئے۔ مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی جنرل سکریٹری کی حیثیت سے تبلیغ سیرت کے دست و بازو بنے، جبکہ مولانا مشتاق احمد نظامی اور سلیم اللہ بنارسی جوائنٹ سکریٹری منتخب ہوئے۔ اور ناظم نشر و اشاعت کے عہدہ کے لیے حکیم محمد یونس نظامی اور مولانا عبد المسجود صاحب کو نامزد کیا گیا۔

خلیفۂ اعلیٰ حضرت مولانا عارف اللہ صاحب میرٹھی، مولانا محمد محبوب صاحب کانپوری وغیرہ خصوصی ارکان کی حیثیت سے نامزد ہوئے۔

"آل انڈیا تبلیغ سیرت" کے قیام کے وقت یہ انتخاب عمل میں آیا تھا لیکن اس کے بعد مختلف اوقات میں مختلف عہدوں کے لیے بہت سے دوسرے حضرات کا انتخاب ہوا اور انتخابات سابقہ میں ردّ و بدل کیا گیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۲ء میں مولانا شاہ عزیز احمد صاحب بھی نائب صدر تھے۔ ۱۹۵۴ء میں مفتی رفاقت حسین صاحب بھی اور ۱۹۵۵ء میں مولانا ابوالوفا فصیحی بھی۔ اسی طرح ۱۹۶۲ء میں مولانا سید احسان علی صاحب نائب ناظم نشر و اشاعت رہے۔

سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کا یہ بے حد متحرک اور فعّال کارواں سرکار مجاہدِ ملت مولانا الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمۃ والرضوان کی قیادت میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ خدمتِ دین اور سرفرازیِ اسلام و مسلم کے بے کراں جذبے کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترا اور دیکھتے ہی دیکھتے دینی، تبلیغی و تنظیمی سرگرمیوں کا سلسلہ چل پڑا۔ مسلمانوں کے اندر بدعملی، مذہبی بے راہ روی، مایوسی، بددلی، احساسِ کمتری اور حالات کی سنگینی سے پیدا شدہ خوف و ہراس کو ختم کرنے کی مسلسل جد و جہد شروع کی گئی۔ انھیں ان کے وجود کی اہمیت سے روشناس کرایا گیا۔ ان کے دستوری حقوق سے آگاہ کیا گیا۔

---

(۱) یاد رہے کہ جس عہد کی یہ بات ہو رہی ہے اس زمانے میں علما و مشائخ کے حاشیۂ خیال میں بھی سُنّی جمعیۃ العلماء یا مسلم متحدہ محاذ جیسی تنظیمیں نہیں تھیں۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام اس کا نقطۂ عروج، پھر اس کے قائد حضرت مجاہدِ ملت علیہ الرحمہ پر آئے دن مقدمات کی بھرمار، قید و بند کی صعوبتیں، اقتدارِ وقت کے مظالم اور پل پل بدلتے ہوئے حالات بہت بعد میں سُنّی جمعیۃ العلماء اور مسلم متحدہ محاذ جیسی تنظیموں کا سبب بنے۔ (محمد وارث جمال قادری)

مسلمانوں کی بہتری و برتری کے لیے دن رات کی جہدِ مسلسل بہت جلد تبلیغ سیرت نے مسلمانوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔ لوگ جوق در جوق اس کے قریب آنے لگے۔ مسلسل اس کی اہمیت و افادیت محسوس کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا جب وکلاء اور بیرسٹر صاحبان اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فخر و مسرّت محسوس کرنے لگے۔

اگرچہ قیام کے وقت یہ تجویز کیا گیا تھا کہ مرکز فیض آباد میں رہے گا، پھر بھی ۱۹۷۸ء تک اس کا مرکز الٰہ آباد ہی میں رہا، اور ایک وقت پر خانقاہِ حلیمیہ الٰہ آباد میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا مرکزی دفتر قائم ہوا۔ اس وقت کا دستور العمل مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد پر مشتمل تھا:

- مسلم قوم کو لادینیت اور ہر قسم کی بدمذہبیت سے بچانے کے لیے دینی مدارس کا قیام
- قیامِ امن کے لیے جارح فرقہ پرستی کی روک تھام
- مساجد و مقابر و اوقاف کا تحفظ
- اسلامی نظریہ کے مطابق ملک و وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر ممکن قربانی پیش کرنا
- بیت المال کا قیام (تا کہ غربت و افلاس کے دلدل سے نکال کر مخلص، وفا شعار، متحرک و فعّال خدمت گاروں کا دستہ وجود میں لایا جاسکے، جو ایک زندہ قوم کی آبرومندانہ بقا کے لیے بہت ضروری[1] ہے)

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں طے ہوا کہ الٰہ آباد میں ایک بڑے پیمانے پر جلسہ کیا جائے تا کہ جلیل القدر علما و مشائخ سرد گرم چشیدہ اربابِ فکر و نظر کے قیمتی آرا اور اُن کے عملی تعاون سے **تبلیغ سیرت** کے طریقۂ کار کا تعین کیا جائے۔

مولانا انوار احمد نظامی فیض آباد جا کر حضرت محدّثِ اعظم صاحب سے بڑے بڑے علمائے کرام و مشائخ عظام و مشاہیر اہلِ سنّت کے ناموں کی فہرست لائے۔ بڑے بڑے اشتہارات شائع کیے گئے۔ مگر حسب اعلان چند در چند وجوہات کی بنیاد پر جلسہ تو نہ ہوسکا، البتہ علمائے کرام و مشاہیر اہلِ سنّت کے درمیان ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کے طریقۂ کار کے لیے چند نشستیں ہوئیں، جن میں تبلیغ سیرت کے طریقۂ کار کے لیے بحثیں بھی ہوئیں اور اس کے لیے لائحہ عمل بھی بنا۔

حسبِ پروگرام مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعقیدگی کی اصلاح ان کے عقائد و ناموس و عزتِ نفس کے تحفظ و بقا، ان کے آبرومندانہ وقار کی بحالی، ان پر ہونے والے یک طرفہ مظالم اور ان کے ساتھ برتے جانے والے امتیازی سلوک کے سدّ باب اور عوامی بیداری کے لیے ملک کے طول و عرض میں ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' نے دینی، تبلیغی و تنظیمی اجلاس کا سلسلہ شروع کیا۔

---

(1) اور اب تو موجودہ تعصّب و تنگ نظری، جارح فرقہ پرستی، مذہب بیزاری، شریعت شکنی، مساجد کی بے حرمتی، وطن دشمنی، ملک مخالف جاسوسی اور ملکی یک جہتی کو پارہ پارہ کردینے والی سازشوں کے پیش نظر بالخصوص اہم ترین تاریخی مساجد و مقابر پر فرقہ پرست جنونی ہندوؤں کے قبضہ و یلغار کو دیکھتے ہوئے یہ بہت ضروری ہوگیا ہے کہ اپنی صفوں کی ترتیب کو حالات کے پیچ و خم کے اعتبار سے درست کرکے ان کی مکمل شیرازہ بندی کی جائے اور نئے سرے سے پوری توانائی کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترا جائے۔ (محمد وارث جمال قادری)

عوامی بیداری کے لیے اس طرح بڑے بڑے تاریخی اجلاس کا انعقاد وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ ملک کی ناخواندہ مسلم اکثریت سے براہِ راست رابطہ کا یہی مؤثّر ترین ذریعہ تھا۔

رفتہ رفتہ یہ جماعت ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ مقتدر علما و مشائخ، نامور خطبا و شعرا، قومی و ملّی تڑپ رکھنے والے دانشوروں، ادیبوں نے اپنے مخلصانہ تعاون سے اس جماعت کے وقار میں چار چاند لگائے۔ صدر تبلیغ سیرت مجاہد ملّت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری کی بے پناہ جدوجہد، انتھک کوششوں اور حیران کن مالی قربانیوں کی بدولت ملک کے مختلف حصوں میں دینی مدارس، مکاتب، مساجد اور اسلامی سینٹر بڑی تعداد میں قائم ہوئے۔ غیر آباد مسجدیں آباد ہوئیں۔ ٹوٹی ہوئی اور خستہ حال مسجدوں کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ یتیم خانے کھلے آباد ہوئے۔ رفاہِ عام کے لیے کافی تعداد میں کنویں کھودے گئے۔ دینی لائبریریاں، اشاعتی اِدارے، اسلامی علوم کی نشر و اشاعت، فلاح و بقا کے سوتے جگہ جگہ اُبل پڑے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جانب سے ملک کے مختلف حصوں میں تاریخی اجلاس اور عظیم الشان کانفرنسوں میں تیزی آتی گئی۔ جس میں علما و مشائخ کا مقدس قافلہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ رونق افروز ہوتا۔ تبلیغ سیرت کے ان جلسوں پر عوام کو بڑا اعتماد ہو گیا۔ جگہ جگہ دیوانگانِ شوق "تبلیغ سیرت" کے پروگرام اور اس کے تعمیری مقاصد کی تکمیل کے لیے نظر آنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُڑیسہ، بنگال، بہار، اُتر پردیش، مدھیہ پردیش اور راجستھان وغیرہ میں سیکڑوں شاخیں اور آفس قائم ہو گئے، جو تبلیغ سیرت کے جلیل القدر قائد کی مساعیٔ جمیلہ کی جلوہ سامانیاں تھے۔

اس زمانے میں خطیبِ مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی نے اپنے آقائے نعمت حضور مجاہد ملت کی رضا و خوشنودی کے لیے آل انڈیا تبلیغ سیرت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ وہ اپنی تحریر و تقریر کی تمام تر صلاحیتیں تبلیغ سیرت کے دائرۂ عمل کو وسیع تر کرنے میں صَرف کرنے لگے۔ ان کی اس وقت کی ذاتی دل چسپی کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ انھوں نے ۱۹۵۵ء میں الٰہ آباد سے ایک بڑا معیاری رسالہ "ماہ نامہ پاسبان" جاری کیا اور اسے آل انڈیا تبلیغ سیرت کا آرگن اور ترجمان بنایا۔ پاسبان کے پُرانے شمارے آل انڈیا تبلیغ سیرت کی دینی خدمات کا تاریخی ریکارڈ ہیں۔ اپنے وقت میں اقلیم خطابت کے تاجدار نے اپنی ذاتی دل چسپی اور خصوصی توجہ کی وجہ سے "پاسبان" کو اتنا معیاری اور منفرد بنا دیا کہ اُردو صحافت میں پاسبان کا وزن محسوس کیا جانے لگا۔

ماضی میں "آل انڈیا تبلیغ سیرت" کے بڑے بڑے جلسوں اور اہم تاریخی کانفرنسوں نے جو عوامی بیداری کی لہر پیدا کی، اس کی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ ہو جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ تبلیغ سیرت کو جہاں ایک طرف علما و مشائخ کی سرپرستی حاصل تھی، وہیں پر پروفیسروں، دانش وروں، وکلا اور بیرسٹروں کا عمل تعاون اور ان کی حمایت بھی حاصل تھی۔

تبلیغ سیرت کی دینی خدمات اور ملّی تڑپ نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔

۹، ۱۰، ۱۱ر اپریل ۱۹۵۴ء کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ بہار میں "آل انڈیا تبلیغ سیرت" نے بڑے ہی وسیع پیمانے پر

ایک تاریخی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس یادگار کانفرنس سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ اس کانفرنس کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں شیخ الاسلام والمسلمین حضرت مولانا عبد القدیر بدایونی نے شرکت خصوصی فرما کر اس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی تھی، جو اس دور میں تبلیغ سیرت کے لیے ایک اعزاز اور اس کی خصوصی انفرادیت تھی کہ ایسی عظیم و کوہ پیکر شخصیت نے اس طرح کی عوامی کانفرنس میں قدم رنجہ فرمایا۔ یہ سرتا سر مجاہدِ ملت کے بے پایاں خلوص کی برکت تھی۔ غالباً اسی عظیم کانفرنس میں حضرت شیخ الاسلام نے مجاہدِ ملت کے لیے چند تاریخی کلمات اپنی زبانِ فیض ترجمان سے ارشاد فرمائے تھے:

> ”ہم میں اور مولانا حبیب الرحمٰن میں یہ فرق ہے کہ ہم لوگ سب سے ڈرتے ہیں، خدا سے نہیں ڈرتے جبکہ مولانا حبیب الرحمٰن صرف خدا سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے۔“

اس یادگار کانفرنس کی ایک جھلک کے لیے ”آگرہ اخبار“ کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

پٹنہ میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا شاندار جلسہ

برادرانِ اسلام! کیا آپ کو احساس ہے کہ آج مسلمان زبوں حال کیوں ہے؟ اس کی مذہبی و اخلاقی حالت پست کیوں ہے؟ یہ تعلیمی و اقتصادی بدحالی کا شکار کیوں ہے؟ یہ دربدر کی ٹھوکریں کیوں کھا رہا ہے؟

ان تمام مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے اشد ضرورت ہے کہ صوفیائے کرام، علمائے عظام اور تمام مسلمان عزم محکم اور ایثارِ کامل کے ساتھ ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ انھیں مقاصد کے پیش نظر آل انڈیا تبلیغ سیرت کا سالانہ اجلاس اس مرتبہ ۹، ۱۰، ۱۱/اپریل ۱۹۵۴ء کو انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ (بہار) میں ہو رہا ہے، جس میں ملک کے مندرجہ ذیل مشاہیر علمائے عظام کو دعوت دی گئی ہے۔ اگر آپ ملک کے چار کروڑ[1] مسلمانوں کو خوش حال، تعلیم یافتہ اور امن و امان کے گہوارے میں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس میں شرکت کر کے اپنی مسلم دوستی اور دینی عقیدت کا ثبوت دیں۔

جنرل سیکریٹری ڈاکٹر محمد اسماعیل خاں قادری

(آگرہ اخبار ۴/اپریل ۱۹۵۴ء)

اس اخباری اعلان میں ۲۸/مشاہیر علما، خطبا، صوفیائے کرام کو دعوت دی گئی، صرف چند کو چھوڑ کر بقیہ سب تشریف لائے۔ بڑا زبردست اہتمام کیا گیا تھا۔ بہت سارے مقامی حضرات ہفتوں سے انتظامات میں مصروف تھے۔ عالی جناب سیّد امام حیدر صاحب مرحوم بیرسٹر استقبالیہ کے صدر تھے۔ آٹھ صفحات پر مشتمل اپنے خطبۂ صدارت کے صفحہ ۷ اور ۸ پر رقم طراز ہیں:

> ”ہمیں پوری اُمید ہے کہ علمائے کرام کی ایمان افروز تقریروں سے اس جلسۂ سیرت کا ہر شخص نہایت مطمئن و سرشار ہو کر اُٹھے گا۔ قبل اس کے کہ میں اپنے مختصر سے خطبہ کو ختم کروں میں اپنی ذمے داریوں

---

[1] یہ بات ۱۹۵۴ء کی ہے اور اس وقت یہی تعداد ظاہر کی گئی ہوگی۔

سے سبک دوش نہ ہوں گا۔ اگر میں کل ارکانِ مجلسِ استقبالیہ کا تہہ دل سے شکریہ نہ ادا کروں جنھوں نے انتھک کاوشوں سے اس جلسے کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ خامیوں کے لیے میں آپ حضرات سے معذرت خواہ ہوں اور مجھے اُمید ہے کہ آپ حضرات ان کو فراخ دلی سے معاف فرمائیں گے۔
میں اپنے معزز مہمانوں کا بھی خصوصاً علمائے کرام کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ حضرات نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور ملک کے دور دراز گوشوں سے تشریف لاکر اس جلسہ کو کامیاب بنانے میں ہمارے معاون ثابت ہوئے۔ میں بیگم حبیبہ صغریٰ مالکہ کافی ہاؤس اور مولوی ولی الحق شاہد بیگھوی کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے کافی ہاؤس کو مہمانوں کے آرام وآسائش کے لیے خالی کردیا۔ میں خان بہادر سید حسن صاحب، ابوالفتح سید محمد صاحب وکیل اور حکیم محمد زکریا صاحب صدر وسیکریٹری انجمن اسلامیہ ہال کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ حضرات نے سیرت کے اس جلسے کے لیے ہال کا کوئی کرایہ طلب نہیں کیا۔
مولوی انوار الحق صاحب موضع مادھو پور ضلع چمپارن کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے بڑی نوازش اور دریا دلی سے غلّہ واسطے مطبخ عنایت فرمایا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری ان کوششوں کو قبول فرمائے اور ہمارے کاموں کو آسان کردے۔'' آمین

(بحوالہ ماہنامہ اشرفیہ، مبارک پور کا مجاہد ملت نمبر، صفحہ ۴۰،۴۱)

اخباری جھلک اور مندرجہ بالا صدارتی خطبے کے ان پیراگرافس کو دیکھنے کے بعد ''تبلیغ سیرت'' کی ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جلسے کے ناظم نشر واشاعت حضرت مولانا ظفر سجّاد صاحب، سجادہ نشین خانقاہِ سجّادیہ ابوالعلائیہ داناپور اور مجلسِ استقبالیہ کے سیکریٹری ایڈوکیٹ امیر علی وارثی تھے۔ پہلے اجلاس کی صدارت شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی نے فرمائی۔
ہزاری باغ، الٰہ آباد، کلکتہ، بنارس، کانپور، ٹاٹا، غازی پور، جھریا، اجمیر مقدس اور بمبئی وغیرہ میں آئے دن اسی طرح کی بڑی بڑی کانفرنسیں اور شاندار اجلاس ہوتے رہے۔
ان کانفرنسوں کی یہ خصوصیت رہی کہ ان کی سرپرستی وصدارت شیخ الاسلام مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی اور محدّث اعظم ہند مولانا سیّد محمد کچھوچھوی جیسی بلند پایہ واہم شخصیتیں فرمایا کرتی تھیں ؎

کچھ نقش تری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سروساماں سہی ویران نہیں ہے

اس طرح تبلیغ سیرت کا دائرۂ عمل مجاہد ملت کی پُرخلوص جدوجہد اور علما ومشائخ کے تعاون سے دن بہ دن وسیع تر ہوتا رہا۔ ایوانِ اقتدار میں تبلیغ سیرت کی آواز کی دھمک محسوس کی جانے لگی۔ مسلم نوجوانوں کے دل ودماغ سے خوف کم ہونے

لگا۔ ان کے ذہنوں سے مایوسیوں کی دھند چھٹنے لگی۔ نام نہاد نیشنلسٹوں اور اقتدارِ وقت کے دلّالوں کے پیدا کردہ احساسِ کمتری کے دلدل سے مسلم قوم نکلنے لگی۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس اور اپنی حیثیت کا اِدراک ہونے لگا۔

اس صورتِ حال نے اقتدارِ وقت اور اس کے دلّالوں کے اندر تشویش کی لہر دوڑا دی۔ تبلیغ سیرت اور اس کے قائد کی تاثیری قوت کو ختم کرنے کے لیے مجاہد ملت کے خلاف سازش کے جال تیار کیے گئے اور یوں مجاہد ملت کی گرفتاری اور اُن پر مقدمات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

غازی پور میں تبلیغ سیرت کے جلسے میں اور سلطان پور میں اربابِ اقتدار کے مظالم کے خلاف تبلیغ سیرت کے صدر مجاہد ملت مولانا الشاہ محمد حبیب الرحمٰن نے بہت برہنہ تقریریں کیں اور اقتدارِ وقت کی مسلم دشمنی، فرقہ پرستی، تعصّب و تنگ نظری اور جانب داری کو عوام میں ننگا کر دیا۔ جس کی پاداش میں ۱۹۵۶ء میں آپ کی گرفتاری عمل میں آئی اور آپ پر باقاعدہ مقدمات قائم کیے گئے۔ غازی پور کے مقدمے میں آپ بری ہو گئے۔ حکومت اُتر پردیش نے الٰہ آباد میں اپیل کی، جو آگے چل کر خارج ہو گئی۔ اور سلطان پور کے مقدمے میں آپ کو قیدِ بامشقّت کی سزا ہو گئی۔ ہائی کورٹ میں اپیل کے بعد وہ سزا بھی منسوخ ہو گئی۔

مسلمانوں کی آبرومندانہ بقا کے لیے آپ کی گرفتاری اور مقدمہ بازی کا جو سلسلہ حکومت نے ۱۹۵۶ء (۱) میں شروع کیا تھا، اس کا دور بڑا طویل اور صبر آزما ثابت ہوا۔ اور یہ سلسلۂ درازِ عشق ۱۹۵۶ء سے شروع ہو کر ایمرجنسی ۱۹۷۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی خاطر آپ کی آخری گرفتاری (۲) ایمرجنسی ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ گرفتاری کے بعد نندنی شٹ پتھی کی حکومت نے اتنی سختی برتی کہ بیمار ہو جانے پر اسپتال میں جب منتقل کیا ہے تو پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔

مسلمانوں کے تعلق سے آپ کو خاموش کرنے کے لیے حکومت کی سختیاں جوں جوں بڑھتی گئیں آپ کا موقف اتنا ہی سخت ہوتا گیا۔

آپ کو اربابِ اقتدار نے جتنا ستایا، جتنی گرفتاریاں اور جتنے مقدمات آپ پر قائم کیے، کم از کم ہندوستان کی جمہوری تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ ایک خالص مذہبی شخصیت کو بار بار مجروح کیا گیا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اپنی قوم پر ہونے والے بے پناہ مظالم پر وہ خاموش نہیں رہتا تھا۔

مجاہد ملت اپنی مجاہدانہ عزیمت کی بدولت بار بار جیل جاتے رہے۔ آئے دن آپ پر مقدمات قائم ہوتے رہے۔ اس

---

۱) کانگریسی دورِ حکومت میں یہ آپ کی پہلی گرفتاری تھی۔ ورنہ برطانوی دورِ حکومت میں بھی آپ کو اربابِ اقتدار کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنے کے نتیجے میں جیل جانا پڑا تھا۔

۲) یہ ہندوستان میں اور مسلمانوں کی بقا کی خاطر آپ کی آخری گرفتاری تھی۔ ورنہ عقائد اہلِ سنّت پر قائم رہنے کی وجہ سے ۱۹۷۹ء میں آپ کو سعودی عرب میں گرفتار کیا گیا تھا۔

صورتِ حال نے محبین، مخلصین، معاونین، تلامذہ ورفقا کو برداشتہ خاطر کردیا۔ کچھ لوگ حالات کے تیور ہی سے خوف زدہ ہو گئے۔
انھیں میں سے کچھ اہم شخصیتوں نے دوسری جماعتوں کا سہارا لیا۔ ان حالات نے مسلم متحدہ محاذ کے قیام کی راہ ہموار کی۔

انھیں ایّام میں عرسِ مقدس کے موقع پر اجمیر شریف میں علمائے کرام، مشائخ عظام اور اکابر ملتِ اسلامیہ کا اجتماع ہوا، جس میں یہ بات زیرِ غور آئی کہ تمام جماعتوں کو تحلیل کر کے کسی ایک ہی جماعت کو باقی رکھا جائے اور وہی سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی مرکزی تنظیم قرار پائے۔

حضرت مجاہد ملت الحاج مولانا محمد حبیب الرحمٰن قادری ہاشمی عباسی نے مخلصانہ و مؤدبانہ درخواست کی کہ بے شک تمام جماعتوں کو تحلیل کر کے کسی ایک جماعت کو برقرار رکھ کر اسے ہمہ جہتی دی جائے۔ اس کے صدر اور سیکریٹری خواہ کوئی بھی ہوں مگر اس خصوص میں اتنی سی گزارش نوٹ کر لی جائے کہ وہ جماعت صرف مذہبی دائرۂ عمل بالخصوص مذاہب باطلہ کے ردّ و استیصال ہی تک نہ محدود رہ جائے، بلکہ مسلم قوم کی آبرومندانہ بقا کے لیے ہمہ دم مستعد رہے۔ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف پوری گھن گرج کے ساتھ آوز بلند کر سکے۔ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے سلگتے مسائل پر بے باکی کے ساتھ اربابِ اقتدار کو متوجہ کر سکے۔

اگر ایسا ہوتا ہے تو سبحان اللہ! ورنہ میری ڈیڑھ اینٹ کی جماعت الگ رہے گی۔

اکابر ملّت نے مجاہد ملت کے درد اور ان کے موقف کو پورے طور پر محسوس نہیں کیا۔ تبلیغ سیرت کو ختم تو نہیں کیا گیا البتہ اکابر اہلِ سنّت نے اپنی توجہ آل انڈیا سُنّی جمعیۃ العلماء اور دیگر تنظیموں کی جانب مبذول کر دی۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے قابلِ ذکر ارکان حالات کی برہمی کی وجہ سے پہلے ہی پس و پیش میں تھے۔ حالات کے اس نئے موڑ نے انھیں تبلیغ سیرت سے عملاً علیحدگی کے لیے ایک خوب صورت موقع فراہم کر دیا۔

چنانچہ مخصوص افراد جو عام حالات میں مجاہد ملت کے دست و بازو تھے، ایک ایک کر کے الگ ہوتے گئے۔ اہم ترین لوگوں میں بس چند ہی مخلصین تھے جنھوں نے کافی عرصے تک حضور مجاہد ملت کا ساتھ دیا۔ خاص کر حضرت کے مرید و خلیفہ و شاگردِ رشید جاگیر دار الحاج مولانا محمد نعیم اللہ صاحب چھپروی (والد گرامی مولانا شمیم اشرف ازہری) نے اپنی آخری سانس تک حق رفاقت ادا کیا۔ مجاہدِ ملّت کی ذات سے ان کا والہانہ لگاؤ عشق کی حد تک تھا۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت اور حضرت مجاہد ملت کے لیے ان کی قربانیوں کا ایک طویل ریکارڈ ہے۔ مجاہدِ ملت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے جاگیردارانہ طمطراق اور امرانہ وضع قطع کو چھوڑ کر آپ نے درویشی کی چادر اوڑھ لی۔ کل تک جاگیردارانہ شوکت و حشمت اور رئیسانہ ٹھاٹ باٹ کو دیکھنے والی آنکھیں جب انھیں اپنے پیر کے پیچھے فقیرانہ لباس میں دیکھتیں تو عالمِ حیرت میں اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔

یہ چاہت یک طرفہ نہیں تھی بلکہ مجاہد ملت بھی ان کے لیے والہانہ تڑپ رکھتے تھے۔ بلکہ ایک طرح سے وہ آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے لیے ان کی قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں۔

ان کی وفات حسرت آیات نے مجاہد ملت کو بلا کر رکھ دیا۔ ان کی موت سے جو زخم مجاہد ملت کے دل کو لگا وہ زندگی بھر مندمل نہیں ہو سکا۔ اپنی بے مثال قربانیوں اور حسنِ عقیدت و محبت کی بدولت وہ زندگی بھر حضرت کی دھڑکنوں میں جاگزیں رہے۔

بنا کردند خوش رشمے کہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضور مجاہد ملت بنیادی طور پر ایک مردِ مومن تھے۔ زمانہ سازی، حیلہ جوئی، حالات کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق کی تبدیلی اور موجودہ سیاسی سفلہ پن سے پاک تھے۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اور ان کی تحریک آل انڈیا تبلیغ سیرت کماحقہٗ عوامی تحریک نہ بن سکی۔ اگر وہ اپنے موقف میں حسبِ ضرورت لچک پیدا کرتے رہتے۔ حالات کے تقاضوں اور وقتی مصلحتوں کو دیکھتے ہوئے اپنی پالیسیوں میں ترمیم کرتے رہتے، الغرض حسبِ ضرورت جھکنے اور لچکنے کی پالیسی اپنا لیتے تو وہ دنیاوی اعتبار سے وقت کے ایک کامیاب ترین انسان ہوتے۔ اور ان کی تحریک تبلیغ سیرت اب تک دُنیا کے مختلف ممالک میں زندہ تحریک کی حیثیت سے مانی جاتی۔

لیکن وہ اور خود ان کی یہ تحریک اس لیے کماحقہٗ پھل پھول نہ سکی کہ انھوں نے ہمیشہ سیاسی مصلحتوں کو اپنی جہاد آشنا ایڑیوں کی ٹھوکروں پر رکھا۔ اور اسی کو وہ کامیابی سمجھتے رہے۔ زندگی بھر وہ حمایتِ حق اور قومِ مسلم کی آبرومندانہ بقا کے لیے قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک رہے۔ وہ ایک ایسے سالارِ بے فوج تھے جو جہادِ زندگانی میں اکیلا اور تنہا سر بکف رہے۔ قوم تو ان کی قیادت میں اپنے جمہوری حقوق کے لیے اور اپنے سالارِ قافلہ کے لیے تن من دھن کی بازی لگانے کے لیے تیار تھی۔ مگر مذہبی قیادت پر زبان و قلم کے جن جادوگروں کا قبضہ تھا، وہ قوم کو ان تک پہنچنے نہیں دیتے تھے۔ ان کے قومی جذبات کو پُرتعیش زندگی کی طرف موڑنے میں ان مذہبی اداکاروں نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ گویا ڈاکٹر اقبالؔ کے شعر ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رُباب آخر

کے مفہوم کو اُلٹ کر سمجھانے میں یہ کلاکار کامیاب رہے۔ یہ وقت کا ماتم ہی نہیں بلکہ ایک بڑا المیہ بھی تھا کہ ایک مجاہد کی اذان مُلّاؤں کی اذان میں دب کر رہ گئی حالانکہ ؎

مُلّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور

کی حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم!

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے تعلق سے جب علما نے عدم تعاون بلکہ بائیکاٹ کی پالیسیوں کو اپنا لیا۔ مجاہد ملت تنہا تبلیغ سیرت کو لے کر چل پڑے۔ اب وہ اور تبلیغ سیرت دونوں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے۔ حضرت مجاہد ملت نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔

تبلیغ سیرت کا کام کبھی رُکا نہیں، جاری ہی رہا۔ کہیں کم کہیں زیادہ البتہ علما کے عدم تعاون بلکہ بائیکاٹ کے نتیجے میں اس کی عوامی مقبولیت وہ نہیں رہ گئی جو پہلے تھی۔ عملاً اس میں انحطاط آتا گیا۔ تاہم ملک کے متعدد صوبوں میں یہ کسی نہ کسی حد تک اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہی۔ بالخصوص اڑیسہ جو مجاہد ملت کا وطن مالوف ہے، جہاں کے حضرت رئیس اعظم تھے۔ وہاں یہ تحریک کافی متحرک وفعّال اور ہمیشہ بڑی حد تک سرگرم عمل رہی۔

غالباً ۱۹۷۲ء کے آس پاس جناب مدثر حسین حبیبی نے کلکتہ میں ارتقائے تبلیغ سیرت کے نام سے کام شروع کیا۔ بعد میں یہ ارتقائے تبلیغ سیرت، آل انڈیا تبلیغ سیرت میں ضم ہوگئی[1]۔

اور جناب مدثر حسین قادری حبیبی نے تبلیغ سیرت کے ذریعے دینی خدمات انجام دیں۔

یہ بات نہیں کہ حضرت مجاہد ملت کو افراد نہیں ملے۔ ملے مگر وہ اُس وقت اتنے صاحبِ اثر ونفوذ نہیں تھے ان کی حیثیت صرف علاقائی تھی۔ البتہ وہ اپنے وجود کے ساتھ مجاہد ملت سے اخلاص رکھنے والے تھے اور ہیں۔ جن میں قابلِ ذکر ہیں حضرت علامہ محمد عاشق الرحمٰن قادری حبیبی، حضرت مولانا قاری نعمت اللہ صاحب حبیبی، حضرت مولانا شوکت علی صاحب حبیبی، حضرت قاری خورشید احمد صاحب حبیبی وغیرہ وغیرہ۔

ان میں تو بعض حضرتِ والا کی رگِ جاں سے بہت زیادہ قریب تھے اور کچھ حضرت کے بالکل قدم بہ قدم محبین، مخلصین، مریدین کی اس چھوٹی سی جماعت نے اپنی بساط کی حد تک تبلیغ سیرت کے جھنڈے کو اُٹھائے رکھا اور اپنے آقائے نعمت کی خوشنودی کے پیشِ نظر وہ انفرادی واجتماعی طور پر "تبلیغ سیرت" کو حتی المقدور متحرک بنائے رہے۔

۱۹۷۲ء میں عنایت اللہ مشرقی کی مشہور زمانہ "تحریک خاکسار" کے بعض سالار اپنے ساتھیوں کے ساتھ خاکسار تحریک سے ٹوٹ کر حضور مجاہد ملت سے ملے اور گزارش کی کہ "تحریکِ خاکسار" کی قیادت آپ قبول فرمالیں۔ آپ نے مشرقی کے عقائد باطلہ پر شدید اعتراضات کیے اور اپنی شرطوں کے ساتھ قیادت قبول کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی۔ ان لوگوں نے حضرت کے اعتراضات اور شرائط کو تسلیم کر کے سرِ اطاعت خم کر دیا اور آپ کو اپنی تحریک کا امیر تسلیم کرلیا۔

حضرت نے اس تحریک کے دستور میں ضروری وشرعی ترمیم کر کے اس کا نام "کل ہند خاکسارانِ حق"[2] رکھا۔

بنیادی طور پر آپ مجاہد اور دین کے سپاہی تھے۔ کام کے افراد جب آپ کے گرد جمع ہونے لگے تو آپ کے حوصلوں کو بڑی توانائی ملی۔ ستر سالہ[3] بڑھاپے نے بڑی جواں مردی کے ساتھ اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے پھر ایک بار کمر ہمت باندھی۔ جہادِ زندگانی کے طویل سفر میں آپ وقتی طور پر شکستہ خاطر ضرور ہوئے۔ مگر آپ نے ہمت نہیں

---

[1] ایک عرصہ پہلے آل انڈیا تبلیغ سیرت کی شاخ کمل اسٹریٹ کلکتہ میں قائم تھی۔ یہ انضمام گویا تبلیغ سیرت، بنگال کی نشاۃ جدیدہ ہے۔

[2] حضور مجاہد ملت کی حیاتِ ظاہرہ میں شائع شدہ دستور العمل کل ہند خاکسارانِ حق میں آرٹیکل نمبر ۱، دفعہ نمبر ۲ کے تحت مندرج ہے: "کل ہند خاکسارانِ حق" آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ماتحت رہے گی" لیکن حضور مجاہد ملت کے وصال کے بعد کل ہند خاکسارانِ حق کے متحرک ذمے داران عملی طور پر آل انڈیا تبلیغ سیرت سے ایسا تعلق رکھتے ہوئے نہیں نظر آئے جیسا اس دفعہ کا تقاضا اور اس ماتحتی کا مقتضی کہا جا سکے۔

[3] سنہ ہجری کے اعتبار سے اُس وقت یہ عمر تھی کہ آپ کی ولادت ۱۳۲۲ھ میں ہوئی تھی۔

ہاری اور نہ ہی مایوس ہوئے۔ البتہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل کے لیے آپ بہت بے چین تھے۔ آپ کی نگاہیں مستقبل قریب میں جو دیکھ رہی تھیں، یہی وہ اپنی قوم کو دکھانا چاہتے تھے۔ مذہبی منافرت، فرقہ پرستی اور ہندو مسلم فسادات کے نام سے منظم طور سے کی جانے والی مسلم کشی پر آپ بہت بے قرار رہتے۔ ان کی یہ شدید خواہش ہی نہیں بلکہ تمنا تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل محفوظ ہو جائے اور یہ کہ مسلمان اپنے تحفظ اور آبرومندانہ بقا کے لیے کسی کا دست نگر نہ رہے۔ غیروں پر تکیہ اور حکومت کے دلالوں، جھوٹے وعدوں اور زبانی ڈھکوسلوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے وہ خود اتنے مضبوط ہوں کہ حسب ضرورت وہ اپنی زندگی کا ثبوت دیتے رہیں۔ مگر ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

ان کے اور قوم کے درمیان اقتدارِ وقت کے پروردوں، مصلحت کوشوں، ابن الوقتوں، سیاسی دلالوں اور مذہبی سپیروں کی پوری فوج حائل تھی، جو اپنے خود ساختہ فریضۂ منصبی کو بحسن وخوبی انجام دے رہی تھی ؎

یہ کیا ہوا کہ چیخ پڑے اہلِ کارواں
رہبر کے ذکر میں تو نہ تھی راہزان کی بات

آپ بیک وقت ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کے مرکزی صدر بھی تھے اور ''کل ہند خاکسارانِ حق'' کے امیر بھی۔
اس لیے عام طور پر جو لوگ تحریک خاکسارانِ حق سے منسلک ہوتے وہی تبلیغ سیرت کا بھی کام کرتے۔ اس وقت تحریک کا مدار النظام اور تبلیغ سیرت کا جنرل سکریٹری ایک ہی ہوتا۔
پھر آگے چل کر تحریک کا مدار النظام اور تبلیغ سیرت کا جنرل سکریٹری الگ الگ ہوئے۔
چنانچہ حضرت مولانا عبدالرب صاحب قادری حبیبی، تبلیغ سیرت کے جنرل سکریٹری اور مولوی محمد متین کانپوری تحریک کے مدار النظام مقرر ہوئے۔

بمبئی میں تبلیغ سیرت کا قیام اور اس کے اسباب:

ربیع الاوّل شریف ۱۳۹۸ھ مطابق مارچ ۱۹۷۸ء میں ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کا مرکزی دفتر الٰہ آباد سے بمبئی منتقل ہوا اور عارضی طور پر اس کا آفس ہانڈی والی مسجد، سیفی جوبلی اسٹریٹ ممبئی نمبر ۳ میں قائم ہوا۔
اسی سال آل انڈیا سُنّی جمعیۃ العلماء کے اسٹیج سے قومی مسئلے میں قوم سے خطاب کرنے کے لیے حضور مجاہد ملت کو اجازت نہیں ملی۔
آل انڈیا سُنّی جمعیۃ العلماء کے نائب صدر محسنِ سُنّیت حضرت مولانا الحاج عبدالقدوس کشمیری خطیب وامام ہانڈی والی مسجد بمبئی ۳ نے حضرت کو شکستہ خاطر دیکھ کر عرض کیا: ''حضور! اطمینان رکھیں۔ میں ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کا جلسہ کراؤں گا۔ تبلیغ سیرت کے اسٹیج سے آپ قوم سے جس انداز میں چاہیں خطاب فرمائیں۔''
چنانچہ اس مردِ میدان اور دین کے سپاہی نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اور چمنا بوچر اسٹریٹ (گرم بازار) بمبئی میں آل

انڈیا تبلیغ سیرت کا پہلا جلسہ ۲۴ ربیع النور ۱۳۹۸ھ مطابق ۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو بڑے تزک واحتشام کے ساتھ کروایا۔

اس کے بعد انجمن آفتاب رسول، کماٹی پورہ پانچویں گلی ممبئی ۸ میں محمد حسین صاحب پھول والے کے تعاون سے دوسرا جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں حضرت مولانا احسان علی صاحب باندوی اور حضور مجاہد ملت کی خصوصی تقریریں ہوئیں۔ اسی جلسے میں تبلیغ سیرت کی پرچم کشائی بھی ہوئی اور خاکسارانِ حق کے مجاہدوں کی پریڈ بھی۔

اس کے ساتھ ہی بمبئی میں ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ جس کی عملی سرپرستی بمبئی کے مشہور مردِ درویش عارفِ حق حضرت ٹوپی والے بابا نے فرمائی۔ اور تادمِ تحریر تبلیغ سیرت کا سارا بوجھ حضرت ٹوپی والے بابا کے الطافِ خسروانہ کا رہین منت ہے۔

اس نشأۃ جدیدہ (۱) کے موقع پر تبلیغ سیرت مہاراشٹر کی صدارت کا بارِ گراں مجاہدِ سُنّیت، مردِ بے باک حضرت مولانا الحاج عبدالقدوس کشمیری صاحب کے توانا و مضبوط کاندھے پر رکھا گیا۔ مولانا موصوف نے جس اولوالعزمی اور عالی حوصلگی کے ساتھ اپنے فریضۂ منصبی کو نبھایا وہ صرف انھیں کا حصہ تھا۔

اور آج بھی اس عمر میں تبلیغ سیرت کے لیے جس انداز میں وہ سرگرم عمل ہیں، اس پر صرف رشک ہی کیا جاسکتا ہے۔

جو لوگ مولانا موصوف کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا اُن کی دینی خدمات سے آگاہ ہیں اُن پر تو سب عیاں ہی ہے۔ مگر جو نہیں جانتے ان کے لیے صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ بمبئی میں سُنّیت کی تاریخ مولانا کشمیری کی حُسنِ خدمات کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ (مَتَّعَنَا اللّٰهُ بِطُوْلِ حَيَاتِهٖ وَحُسْنِ خِدْمَاتِهٖ)

سُنّی جمعیۃ العلماء کو چھوڑ کر بقیہ سُنّی انجمنوں، اِداروں، علمائے کرام و ائمہ مساجد اور عوام و خواص نے بڑے والہانہ انداز میں تبلیغ سیرت کا خیر مقدم کیا، خاص کر بمبئی میں اہلِ سُنّت کی مرکزی درس گاہ ''دارالعلوم محمدیہ'' اور اس کے بانی حضرتِ اقدس مولانا سیّد شاہ حامد اشرف صاحب نے تبلیغ سیرت کے ہر موڑ پر اپنے پورے اسٹاف کے ساتھ عملی تعاون فرمایا۔ اور آج بھی تبلیغ سیرت کی ہر آواز پر لبیک کہتے ہوئے عملی طور پر اس کی رہنمائی فرماتے ہیں۔ تبلیغ سیرت تمام سُنّی اِداروں بالخصوص دارالعلوم محمدیہ کی ممنون و شکر گزار ہے۔ اہلِ سنّت کی دوسری بڑی درس گاہ دارالعلوم محبوبِ سبحانی کرلا بمبئی ۷۰ اور اس کے لائق اساتذۂ کرام حسبِ استطاعت تبلیغ سیرت کے اخلاقی تعاون میں پیچھے نہیں رہے۔ اور جب بھی آواز دی گئی انھوں نے مایوس نہیں کیا۔ مولیٰ عزوجل ان اِداروں کو دینی خدمات اور سُنّیت کے استحکام کے لیے فروغ و ترقی عطا فرمائے۔ آمین

چھ ۶ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۳ مارچ ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت پونے چھ بجے ''کل ہند خاکسارانِ حق'' کے امیر اور ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کے مرکزی صدر جامعہ حبیبیہ الٰہ آباد کے بانی، کروڑوں سُنّی مسلمانوں کے مقتدا امام

---

(۱) ۱۰ دسمبر ۱۹۵۳ء کو جمعیۃ العلماء قدیم کے دفتر میں تبلیغ سیرت بمبئی کی تشکیل حکیم سید غلام مصطفیٰ کی صدارت میں ہوئی تھی اور حکیم سید قمر الاسلام صاحب تبلیغ سیرت بمبئی کے صدر منتخب ہوئے تھے۔

التارکین، سلطان المتکلمین، قدوۃ العارفین شیخ المعقولات والمنقولات، متولّی تولیت رؤفیہ حضرت مولانا الحاج الشاہ محمد حبیب الرحمن قادری ہاشمی عباسی علیہ الرحمۃ والرضوان واصل بحق ہوئے۔

ان کے انتقال کے بعد آل انڈیا تبلیغ سیرت پر ایک عارضی سکوت اور سناٹا طاری ہوگیا۔ اور ایک طویل عرصے تک مرکزی صدر اور مرکزی جنرل سکریٹری کا انتخاب عمل میں نہ آسکا، بلکہ یوں کہا جائے کہ مرکزی باڈی کی تشکیل جدید نہ ہوسکی۔

بالآخر ۱۰ رشوال المکرم ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۰ رجولائی ۱۹۸۴ء کو ہانڈی والی مسجد سیفی جوبلی اسٹریٹ بمبئی ۳ میں زیر صدارت حضرت مولانا عبدالرب صاحب قادری حبیبی تلمیذ وخلیفۂ مجاہدِ ملّت دستوری طور پر ہندوستان کے متعدد صوبوں کے نمائندگانِ تبلیغ سیرت اور بمبئی کے علما و مشائخ وعمائدین کی پُرہجوم میٹنگ میں مرکزی باڈی کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس میں متفقہ طور پر حضور مجاہد ملت کے نظر کردہ و پروردۂ نعمت، ماہر السنۃ وحید الزماں علامۃ الہند حضرت مولانا محمد عاشق الرحمٰن قادری حبیبی صدر المدرسین جامعہ حبیبیہ الہٰ آباد کو مرکزی صدر چنا گیا۔ جبکہ مرکزی جنرل سکریٹری آفاقی شہرت کے حامل انٹرنیشنل خطیب شہزادۂ محدثِ اعظم ہند حضرت غازیٔ ملّت مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں اشرفی جیلانی کچھوچھوی نامزد ہوئے۔ پھر تین مرکزی نائب صدر منتخب ہوئے۔

خطیب اہلِ سنّت عالم نوجوان مفکر اسلام صاحبزادۂ شعیب الاولیاء حضرت مولانا غلام عبدالقادر صاحب علوی مہتمم دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف یوپی، صوفیٔ باصفا حضرت مولانا سیّد تنویر اشرف صاحب اشرفی جیلانی کچھوچھوی عالم باعمل حضرت مولانا عبدالتواب صاحب قادری حبیبی۔

یوں تو غازیٔ ملت حضرت مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں تبلیغ سیرت سے باقاعدہ منسلک ہونے سے پہلے حضرت مجاہد ملّت کی حیات ہی میں تبلیغ سیرت کی تحریک میں آگے آگے تھے۔

جلوس گنبدِ خضرا کی قیادت ہو یا مجاہد ملت کی حج سے جبری واپسی پر سعودی نجدیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر احتجاج و مظاہرہ یا کوئی اور چھوٹا بڑا پروگرام۔ انھیں جب بھی آواز دی گئی اپنی ہر مصروفیت کو چھوڑ کر انھوں نے تبلیغ سیرت کی آواز پر لبیک کہا۔ غازیٔ ملت مولانا سید محمد ہاشمی میاں اپنی بے پناہ عوامی مقبولیت کے ساتھ مجاہد ملّت کے اُس وقت بہت قریب ہوئے جب حضرت مجاہد ملت کا بڑھاپا بانگِ جرس سننے لگا تھا۔

کاش! ایسے لوگ مجاہد ملت کو پہلے مل گئے ہوتے تو تبلیغ سیرت کروڑوں مسلمانوں کی دھڑکنوں میں اُتر چکی ہوتی۔

پھر ۱۲ رجمادی الاولی ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳ رجنوری ۱۹۸۷ء کو ایک میٹنگ ہوئی، جس میں ''تبلیغ سیرت'' کی تشکیل جدید ہوئی۔ بمبئی میں ''تبلیغ سیرت'' کا صدر راقم الحروف محمد وارث جمال قادری اور جنرل سکریٹری حضرت ٹوپی والے بابا کے پروردۂ نعمت جناب معین الدین اجمیری نامزد ہوئے۔

☑☑☑☑☑☑

اور جب دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کی تاریخ میں پہلی بار انسانی سروں کا سیلاب اُمڈا

نبیرۂ شعیب الاولیاء وشہزادۂ مظہر شعیب الاولیاء حضرتِ اقدس بابرکت پیر طریقت مولانا الحاج الشاہ محمد مختار احمد رضا علوی سجادہ نشین خانقاہ فیض الرسول و ناظم اعلیٰ دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف سدھارتھ نگر یوپی و بانی وسربراہ جامعہ فاطمۃ الزہرا (نسواں) اٹوا بازار ضلع سدھارتھ نگر یوپی نے محرم الحرام ۱۴۳۹ھ مطابق ۱۲/اکتوبر کی شب، شب جمعہ مبارکہ میں ۱۰/بج کر ۲۰/منٹ پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اور ۲۲/محرم بعد نمازِ عصر اپنے والد گرامی ومرشد بیعت واجازت وخلافت حضور مظہر شعیب الاولیاء حضرت مولانا صوفی محمد صدیق احمد قادری چشتی ضیائی سابق صاحب سجادہ ومتولی خانقاہ فیض الرسول وناظمِ اعلیٰ دارالعلوم فیض الرسول کے پہلو میں آسودہ خاک ہوئے۔ ع

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے ہر چہار جانب سے انسانی سروں کا سیلاب امڈ پڑا۔ تاحدِّ نگاہ صرف انسان ہی انسان! فیض الرسول کی وسیع وعریض میدان اتنا تنگ پڑ گیا کہ ہزار ہا ہزار لوگ جو صرف نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے آئے تھے وقت پر پہنچنے کے باوجود وہ شرکت سے محروم رہ گئے۔ اللہ اکبر! اتنی کم عمری میں اتنی عوامی مقبولیت ماضی قریب میں استاذ العلماء بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی مبارک پوری (صاحبِ فتاویٰ بحر العلوم)، اشرف العلماء حضرت علامہ سیّد حامد اشرف جیلانی بانی وشیخ الحدیث دارالعلوم محمدیہ ممبئی، یادگارِ سلف خطیب البراہین حضرت علامہ مفتی نظام الدین صاحب امرڈوبھا ضلع بستی اور حضرتِ اقدس سیّد حسنین میاں نظمی قادری برکاتی مارہروی ابن سیّد العلماء حضرت سیّد آلِ مصطفیٰ قادری برکاتی مارہروی کے علاوہ اتنا بڑا اژدھام کسی اور کے جنازے میں نظر نہیں آیا۔ اور یہ کتنا بابرکت اور چونکا دینے والا اتفاق ہے کہ حقیقی دادا حضور شعیب الاولیاء بانی فیض الرسول کا وصال بھی محرم الحرام کی ۲۲/ویں شب، شب جمعہ میں ہوا ایک بج کر ۳۸/منٹ پر اور تدفین بعد نمازِ جمعہ اور ان کے سگے پوتے اور ان کی خانقاہ معلّٰی کے حقیقی سجادہ نشین حضرت مولانا مختار احمد رضا علوی کا وصال پُرملال بھی ماہِ شہادت کی اکیسویں شب، شب جمعہ دس بج کر ۲۰/منٹ پر اور تدفین بروز جمعہ بعد نمازِ جمعہ عمل میں آئی۔

چشم دید لوگوں کا بیان ہے کہ نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے والوں کا اتنا بڑا اژدھام تھا کہ دارالعلوم فیض الرسول کی اتنی بڑی فیلڈ بہت تنگ ہوگئی۔ اس کے باوجود نمازِ جنازہ میں شرکت کرنے والوں کا ریلا تھا کہ رکتا ہی نہیں تھا، ہزاروں کی تعدا

تونمازِ جنازہ کے وقت کنفیوزن میں پڑگئی کہ نمازِ جنازہ بعد نمازِ مغرب ہوگی، مغرب کے بعد جب انہیں معلوم ہوا کہ جنازے کی نماز تو ہوگئی تو ہزارہا لوگ مایوس ہو کرالٹے پاؤں اسی وقت افسوس کرتے ہوئے واپس ہو گئے۔ بے شک وہ اپنے پیچھے ایک بھراپُرا خانوادہ چھوڑ کر گئے ہیں۔

حضور مجاہدِ ملّت کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کی شریک اور ہر ایک سے اپنا دلی تعزیت پیش کرتی ہے۔ اس عظیم سانحہ پر اللہ عزوجل انہیں صبر جمیل عطا فرمائے! مولیٰ عزوجل اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے! اور ان کی پاک روح کو اعلیٰ علّیین میں بلند مقام عطا فرمائے! آمین

موت تو اس کی ہے جس کا زمانہ کرے افسوس
ورنہ ہر ایک یہاں آیا ہے مرنے کے لیے

شریکِ غم وسوگوار:
محمد وارث جمال قادری یارعلوی،
صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی وارکان

حج کانفرنس

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"

امام التارکین حضور مجاہد ملت حضرت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی والیٔ ریاست "رؤفیہ اسٹیٹ" دھام نگر، اڑیسہ کی عظیم روحانی یادگار تنظیم "آل انڈیا تبلیغ سیرت" نے ایک حج کانفرنس کا اعلان پوسٹر کے ذریعے رمضان المبارک کے پہلے ہی کیا تھا اور بڑے پیمانے پر اسے پھیلایا۔ اس پوسٹر کی جھلکیاں کچھ یوں تھیں:

☆ حاجی اپنی محنت اور حلال کمائی سے اس یقین کے ساتھ حج کرنے جاتا ہے کہ وہ گناہوں سے پاک ہوجائے گا کہ حرم الٰہی میں ایک نیکی ایک لاکھ کے برابر ہے (یوں ہی ایک گناہ بھی ایک لاکھ کے برابر ہے) مگر وہ حج کمیٹی کی ناخدا ترسی کے سبب گناہوں سے اپنے دامن نہیں بچا پاتا، آخر کیوں؟

☆ کشمیر میں امبرناتھ یاترا، پریاگ الہٰ آباد میں کنبھ میلے اور گنگا صفائی مہم میں کروڑوں اربوں روپے خرچ کرنے والی حکومت حاجیوں کو کرائے میں دی جانے والی حقیر سی سبسڈی کو ختم کرنا چاہتی ہے، آخر کیوں؟ ایک بے رحمانی سازش کا انکشاف!

☆ حاجیوں کے لوٹ وگھسوٹ اور اس کے استحصال کی حیرت ناک تفصیلات!

☆ حج کرنا زیادہ مہنگا اور مشکل نہیں مگر اسے مہنگا اور مشکل حج کمیٹی اور سرکاری بیوروکریسی بناتی ہے، وہ کیسے؟

☆ کتنی عجیب بات ہے کہ حج اسلام کا پانچواں اور آخری رکن اعظم ہے، جس کا تعلق دین و مذہب سے ہے مگر اس خالص دینی و روحانی مسئلہ میں اہلِ دنیا نے اہلِ دین وحاملین دین و مذہب کو الگ تھلگ کر کے اسے ایک سیاسی اکھاڑہ اور خالص کاروباری منڈی بنالیا ہے، ایسا کیوں؟

☆ حجاج کرام پر کی جانے والی زیادتیوں اور ان کے خلاف کیے جانے والے ناروا سلوک پر خاموش رہنا بھی ایک سنگین جرم اور ظالموں کی مدد کرنا ہے۔ آخر آپ خاموش رہ کر کب تک ظالموں کی مدد کرتے رہیں گے؟

.... حج کمیٹی اور سرکاری بیوروکریسی کی مبینہ دھاندلیوں، زیادتیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جدوجہد کا آغاز ایک "حج کانفرنس" سے، تو آئیے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے قدم سے قدم ملائیے اور آگے بڑھ کر اس کا تعاون کیجیے۔ تاکہ آپ سب کے مشترکہ تعاون سے حج کمیٹی کو بدعنوانیوں سے پاک کیا جاسکے۔

کچھ سمجھ کر ہی ہوئے ہیں موجِ دریا کے حریف
ورنہ ہم بھی جانتے ہیں کہ عافیت ساحل میں ہے

یہ کانفرنس کب؟ کیسے؟ کہاں؟ اور کس نوعیت کی ہوگی؟ تفصیلات کا انتظار کیجیے۔

* *

اس عظیم کانفرنس کا اعلان کرتے وقت آل انڈیا تبلیغ سیرت کے اربابِ بست وکشاد کو اس حقیقت کا اِدراک اور احساس تو تھا کہ یہ قدم بڑا ہی جرأت مندانہ اور غیر معمولی نوعیت کا حامل ہوگا۔ یوں تو بمبئی میں آئے دن ایک سے بڑھ کر ایک کانفرنس، سیمینار، سمپوزیم تو ہوتے رہتے ہیں لیکن تیس ۳۰ ر سالہ اپنی بمبئی کی زندگی میں نہیں یاد پڑتا ہے کہ کبھی اس نوعیت کی بھی کوئی کانفرنس یہاں ہوئی ہے۔ انفرادی طور پر تو کبھی کبھار حج کمیٹی کے تعلق سے آوازیں اُٹھی ضرور ہیں مگر ان ہونٹوں کو فوراً چاندی کے تاروں سے سی دیا گیا ہے مگر اجتماعی اور جماعتی سطح پر کسی جماعت نے ایسی ہمت نہیں کی، وجہ جو بھی رہی ہو ؎

سونے کی قینچی لا کہ لَب کھل سکیں منصف کے
قاتل نے تو ہونٹ سی دیے ہیں چاندی کے تاروں سے

اس طرح کی کانفرنس کا اعلان ہی ایک بڑی جرأت ہے، ان ناخدا ترس اور ظالم عناصر کے خلاف جن کے منہ میں برسوں سے حرام کا خون لگا ہوا ہے۔ ایک دھڑکا ضرور تھا کہ اس کانفرنس کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیوں کہ گھپلے اور گھٹالوں کے اس ملک میں حج گھوٹالہ بھی ایک بہت بڑا گھوٹالہ ہے۔ جس کا پوسٹ مارٹم حج مافیا کبھی برداشت نہیں کرسکیں گے۔ اور ایسوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ایک کارے دارد کے مترادف ہے کہ وہ جہاں اصحابِ ذرائع و اسباب ہیں، وہیں اصحابِ اثر ورُسوخ بھی، جن کی جڑیں بڑی گہرائی لیے ہوئے ہیں اور حاجیوں کے استحصال نے انھیں دولت کے انبار پر بٹھا دیا ہے۔

جو اللہ کے مقدس مہمانوں پر رحم نہ کرسکیں اور جو زائرین حرم کی آنکھوں کا کاجل صاف چرالیں، وہ کسی اور پر کیا رحم کرسکتے ہیں ؎

آنکھ سے کاجل صاف چرالیں یہ وہ چور بلا کے ہیں

حج کمیٹی ہی کے ایک ذمے دار جو اکثر چیئرمین کی دھاندلیوں کے خلاف آواز اُٹھاتے رہے، ابھی چند دنوں میں اُن کا ٹرم ختم ہوگیا مگر انھوں نے یہ بات اس وقت کہی تھی جب وہ حج کمیٹی میں تھے کہ

”پہلے بھی حج کمیٹی میں حاجیوں کے ساتھ کالا کانڈی ہوتی تھی، یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔“

مگر اس احتیاط کے ساتھ کے کوئی جان نہ لے، کسی کو خبر نہ ہوجائے۔ گویا وہ حجاجِ کرام کا استحصال کرنے اور ان کی آنکھوں کا کاجل چراتے وقت وہ آگے پیچھے دیکھ لیا کرتے تھے کہ کوئی دیکھ نہ رہا ہو، یا کسی کو خبر نہ ہوجائے۔ لیکن اب جو چیئرمین اور اس کے ساتھ آئے ہیں (یعنی بھاجپائی چیئرمین اور اس کے نامزد ارکان) ان کی دیدہ دلیری کی حد ہوگئی۔ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ خدا کا خوف تو انھیں پہلے بھی نہیں تھا، دنیا کا خوف بھی کوئی نہیں رہ گیا ؎

”چہ دلاور دزدے بر کف چراغ دارد“

ایک طرف تو ایسے صنادید ظلم وستم پوری توانائی کے ساتھ اور دوسری طرف چند مٹھی بھر افراد تہی دست وتہی داماں اسباب وذرائع سے عاری! صرف خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کی دولت اور خدائے ذوالجلال کی نصرت کا یقین لیے ہوئے عوامی تعاون سے زیادہ پُر امید اس لیے نہیں کہ ان پر روشن چہروں والے پیرانِ طریق اور سُپر اسٹار قسم کے خطیبانِ شہر اور باباپانِ وقت کا قبضہ ہے، یہ بیچارے انھیں کے دسترس میں ہیں۔ یہ جس پر مہربان ہوجائیں ان کا کام آسان! اور یہ جس سے منہ پھیر لیں تو کس نمی پرسد کہ بھیّا کیستی، اور ہم ٹھہرے بے ہنر، بے تمیز ان نفوسِ قدسیہ کو خوش رکھنے کا ہنر نہیں جانتے۔ اس لیے ہمارے لیے کام کرنا آسان نہیں مشکلات ہی مشکلات دشواریاں ہی دشواریاں۔

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر وغنا نہ کر
کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

چوں کہ بامقصد کانفرنسیں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے پچاس سالہ تاریخ کا ایک حصہ رہی ہیں اور پورے ملک میں تبلیغ سیرت کی کانفرنسوں کی دھوم رہی ہے۔ ماضی کا ذکر ہی کیا۔ ان کانفرنسوں میں تو ایسے اعاظم رِجال اور قدآور شخصیتیں شریکِ اجلاس ہوا کرتی تھیں کہ جن کی زیارت ہی کے لیے عوام کا سیلاب اُمنڈ پڑتا تھا۔

ابھی چند سال پیشتر بمبئ میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے مسلسل جو کانفرنسیں کی ہیں، ان کی جلوہ سامانیوں کو عوام وخواص نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خصوصاً ''تحفظ حرمین کانفرنس'' وائی ایم سی گراؤنڈ، آگری پاڑہ، بمبئ ۸ میں جو ہوئی تھی۔ وہ اپنی نوعیت وانفرادیت اور مالہ وماعلیہ کے اعتبار سے بمبئ کی مذہبی تاریخ میں اس کی مثال اب تک نہیں پیش کی جاسکتی۔ جس کے دوررس اثرات دنیا کے ایک بڑے حصّے پر مرتب ہوئے۔ اور جسے حکومتِ بغداد نے اپنے ذرائع ابلاغ سے دنیا بھر میں پہنچایا۔ فلحمد للہ رب العلمین۔

اس عظیم تاریخی کانفرنس کے لیے یہ طے پایا کہ اسے ایسے وقت میں کیا جائے جب حجاجِ کرام کی روانگی حج بیت اللہ کے لیے ہونے لگے۔ چنانچہ ۱۲ر فروری ۲۰۰۲ء کو اس کے لیے مستان تالاب گراؤنڈ بُک کرلیا گیا۔ اور کچھ اہم ترین سیاسی شخصیتوں کو دعوت بھی دی گئی کہ اس درمیان میونسپل کارپوریشن کے لیے الیکشن کا ہنگامہ بمبئ میں شروع ہوگیا اور کورٹ آف کنڈم کا قانون نافذ ہوگیا۔ مجبوراً تاریخ آگے بڑھانی پڑی۔ اور کافی غور وخوض اور رائے مشورہ کے بعد ۱۳ر مارچ مطابق ۲۹ر ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ کو تاریخ ایک بار پھر متعین ہوئی اور اس کے لیے بھی میدان بُک کرلیا گیا، کہ یہ وقت تھا کہ حجاجِ کرام زیادہ تر واپس آچکے ہوں گے۔

ابھی ۱۳ر مارچ دور ہی تھی کہ ایک منظم ومنصوبہ بند سازش کے ذریعے آر ایس ایس کی گجرات حکومت نے آر ایس ایس کی مرکزی حکومت کے آشیرواد سے گجرات کے مسلمانوں پر قیامت ڈھادی اور وہاں کے مضبوط وخوش حال مسلمانوں کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے ایسے ایسے طریقے استعمال کیے گئے اور ستم کے ایسے ایسے انداز اختیار کیے کہ تاریخ وحشت و

بربریت میں اب تک اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔جس سے پورا ملک سکتے میں آ گیا۔اور خاص کر ہندوستانی مسلمان سنّاٹے میں آ گئے۔مسلمانوں کی ایسی اجتماعی تباہی وبربادی اورنسل کشی دس سال قبل شہادتِ بابری مسجد کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات میں بھی نہیں ہوئی تھی اور تقسیم ملک کے وقت جو بربادی ہوئی وہ بھی اس عظیم بربادی کے سامنے پھیکی پڑ گئی۔

ڈیڑھ ماہ ہورہے ہیں گجرات کا فساد تیسرے دور میں داخل ہو چکا ہے،مگر ہزار چیخ وپکار اور لعنت وملامت کے باوجود بلا کو وہٹلر اور مسولینی کو شرما دینے والے گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو مرکزی حکومت ہٹا نہیں رہی ہے۔اور ہٹائے کیوں؟ مودی نے تو وہی کیا جو اس کے اوپر والوں کی منشا تھی۔اور جس کے لیے اسے وزیر اعلیٰ بنایا گیا تھا۔مودی تو ایک مہرہ ہے جس کی ڈور ایل کے ایڈوانی اور اٹل بہاری واجپئی کے ہاتھ میں ہے۔اصل ذمّے دار تو واجپئی اور ایڈوانی جی ہیں۔ اور اس نوعیت کی بربادی کی ٹریننگ تو اسرائیل میں ہوئی ہے،جس کا سہرا ایڈوانی کے سر بندھتا ہے۔

مستعفی تو واجپئی اور ایڈوانی کو ہونا چاہیے،جس کی ہر طرف سے مانگ بھی ہو رہی ہے۔ایڈوانی جی جب تک مرکز میں وزیر داخلہ ہیں اور گجرات میں بھاجپا حکومت قائم ہے ایک مودی کو ہٹانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ایڈوانی جی دوسرا مودی بھیج دیں گے،جو پہلے مودی کے ادھورے کام کی تکمیل کرے گا۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

دنیا بھر کے مسلمان اس عظیم المیے پر تڑپ اُٹھے۔مسلمان ہی نہیں ہر باضمیر انسان لرز گیا۔پریس ومیڈیا نے بغیر کسی رعایت کے حقیقت دنیا کے سامنے پیش کی۔اپنے اس حقیقت پسندانہ وجرأت مندانہ کردار کے مظاہرے کے لیے ہندوستانی میڈیا شکریے اور مبارک بادی کی مستحق ہے۔

دیا بھر کے مسلمان اور خاص کر ہندوستانی مسلمان اپنے گجراتی بھائیوں کے آنسو پونچھنے اور ان کے امداد وتعاون اور بازآبادکاری میں لگ گئے۔اور اب تک لگے ہوئے ہیں **فجزاھم اللہ احسن الجزا**

دستک میں کوئی درد کی خوشبو ضرور تھی
دروازہ کھولنے کے لیے گھر کا گھر اُٹھا

ایسے پُر آشوب ماحول اور تاریک ایام میں جب مسلمانوں کے قلوب زخمی اور ان کی آنکھوں میں خون کے آنسو ہوں،ہم یا کوئی اور اس نوعیت کی یا کسی بھی نوعیت کی کوئی کانفرنس کیسے کر سکتے تھے؟ اوّل اپنے گجراتی بھائیوں کے جلتے زخموں پر مرہم اور ان کی بازآبادکاری،پھر کوئی کام۔

مگر نہیں! ایسے قیامت خیز ماحول میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے کچھ اہلِ کرم جو بمبئی میں کسی بھی صورت میں اس کانفرنس کو ہونے نہیں دینا چاہتے تھے،وہ گجرات کے بجائے اس کام میں بڑی ہی خاموشی کے ساتھ مصروف رہے۔انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ آل انڈیا تبلیغ سیرت نے کبھی کوئی اعلان ہواؤں میں نہیں کیا۔اور جب بھی کسی معاملے کے لیے وہ

کمر بستہ ہوئی، ہزار دقتوں کے باوجود اسے سر انجام دیا۔ انھیں اس حقیقت کا احساس تھا کہ دیر سویر تبلیغ سیرت اس کانفرنس کو ضرور کرے گی اور کتنے ہی تقدس لیے نورانی چہرے داغدار ہو جائیں گے۔ جس سے ان کا سیاسی کیریئر بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

لہٰذا انھوں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ روپے کے زور سے قانونی طور پر اس جماعت ہی کو ختم کرنا چاہا کہ نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ وہ شاخ ہی کیوں رہے جس پر مسلمانوں کے امیدوں کا کوئی نشیمن بنے۔ لہٰذا انھوں نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ جماعت کے نام پر شب خون مارا تاکہ اس کے وجود ہی کو عوام اور حکومت کی نگاہوں میں مشکوک کر دیا جائے۔ سوئے اتفاق کہیے کہ انھیں اس کام کے لیے ایک تہی دست و تہی دامن بے روزگار ایسا مہرہ مل گیا جو ان کی امیدوں پر ضرورت سے زیادہ پورا اُترا، وہ تھا اس جماعت کا ایک سابق عہدے دار جس نے تبلیغ سیرت کے شعبۂ مالیات کو ایک لمبی چوٹ دی تھی۔ جسے بار بار رعایت و موقع دینے اور پھر وجہ بتاؤ نوٹس دینے کے بعد اسے عہدے اور جماعت دونوں سے نکال دیا گیا تھا۔ جس کی اطلاع اسی وقت مقامی پولیس اسٹیشن اور چیریٹی کمشنر کو دے دی گئی تھی۔ پھر پھر تبلیغ سیرت کی جو خطیر امانت اس کے پاس تھی، اس کی وصول یابی کے لیے ایک سخت اور آخری قانونی نوٹس دی گئی کہ اب ساری رعایت ختم ہو چکی ہے۔ تجھے اب قانون کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ جسے پا کر وہ بلبلا اُٹھا اور لگا نوٹس کو لے کر اِدھر اُدھر دوڑنے اور اپنی مظلومیت کا رونا رونے۔ پھر ہمارے اور اپنے ایک مشترکہ کرم فرما کے پاس گیا کہ میری آفس کی کنجی لے لیں اور اسے اپنے طور پر بیچ کر جماعت کی رقم لے لیں اور بقیہ مجھے واپس کر دیں۔ حالانکہ اُس نام نہاد ٹراویل کی آفس جو چند بالشت پر مشتمل ہے، قیمت میں اتنی نہیں جتنا کہ اس کے اوپر جماعت کا بقایا تھا۔ ہم لوگ اس خوش فہمی میں آگئے کہ شاید قانون کے ڈنڈے کے ڈر سے وہ جماعت کی رقم دینے پر سنجیدہ ہو گیا، لیکن نہیں! یہ اُس کی ایک چال تھی کہ ہم لوگوں کو خوش فہمی میں رکھ کر وہ ان عناصر تک پہنچنے میں اور ان کا قرب حاصل کرنے میں کوشاں رہا جنھیں یہاں پر تبلیغ سیرت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اور ان کے ذریعے ان لوگوں تک پہنچنے میں مصروف رہا۔ یہ کانفرنس بظاہر جن کے خلاف ہو رہی تھی، براہِ راست نہ سہی وایا وایا ہی سہی۔

جو یندہ یابندہ کے مطابق دو طرح کے ضرورت مند ایک دوسرے کو مل گئے، براہِ راست نہ سہی بالواسطہ ہی انھیں عقل و شعور سے عاری ایک شدید ضرورت مند مہرہ چاہیے اور اسے پیسہ کے ساتھ زبان و قلم اور دماغ بھی۔ چنانچہ ان ضرورت مندوں نے ایک دوسرے کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ اس نے پائے ہوئے پیسے سے تبلیغ سیرت کے وجود پر بڑی خاموشی سے یوں شب خوں مارا کہ بہت پہلے سے رجسٹرڈ جماعت کو ٹھیک اسی نام سے ''آل انڈیا'' ہٹا کر رجسٹر کرایا۔ پھر اخباری اشتہارات کے ذریعے بڑی ڈینگ ڈانگ شروع کر دی اور عوام کی نگاہوں میں جماعت کے وجود کو مشکوک و مشتبہ بنانے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر کہ ٹھیک وقت پر جماعت کے ذمے داروں کو اس کی خبر ہو گئی اور میعاد کے اندر اندر اس کا قانونی سد باب کر دیا گیا۔ ان شاء المولیٰ تعالیٰ اس طرح سے قانون کو دھوکہ اور عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والا قانون کے

ہاتھوں اپنے منطقی انجام تک بہت جلد پہنچ جائے گا۔

خدا کا شکر و احسان ہے کہ تبلیغ سیرت ہر دور میں پڑھے لکھے لوگوں کی جماعت رہی ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہ اس کی جماعت ہے جو اپنے زمانے کا رازی، غزالی اور علامہ فضل حق تھا۔ اور قوت فرماں روا کے سامنے ہمیشہ بے باک رہا۔ یعنی حضور مجاہد ملت امام التارکین علامہ شاہ محمد حبیب الرحمن قادری عبّاسی۔ بے شک ہم عظیم نہ ہو کر بفضلہ تعالیٰ ان کی عظمتوں کے امین، وارث تو ہیں اور ہر حال میں ان کی عظیم اور یادگار تنظیم ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

میرا دامن بہت صاف ہے
کوئی تہمت لگا دیجیے!

☑☑☑☑☑☑

آل انڈیا تبلیغ سیرت کا ایک مختصر تاریخی جائزہ

مولای صل وسلم دائماً ابداً علی حبیبک خیر الخلق کلهم

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد اصحابِ بصیرت اور حاملین کردار وعمل اور مسلمانوں کی غالب ترین قوت وتوانائی ہجرت کے نام پر ترکِ وطن کرگئی۔ ساڑھے تین کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے، تقسیم ملک کا الزام مسلمانوں پر ڈال کر ان پر آبرومندانہ بقا کے تمام دروازے بند کردیئے گئے۔ یہاں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے حالات بڑے نازک، انتہائی مخدوش اور بڑے ہی صبر آزما تھے۔ بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے قومی جماعتیں منتشر ہوکر رہ گئیں۔ رہ جانے والی قابل اثر ونفوذ اور غیر معمولی شخصیتیں حالات کے خطرناک تیور کے پیش نظر خالص مذہبی گوشۂ عافیت میں پناہ گزیں ہوگئیں۔ دن بدن حالات نے قابل ذکر وباصلاحیت افراد کو بھی مایوس ودہشت زدہ کردیا۔

اہلِ صحافت اور اہلِ ادب واہلِ دانش کا وہ طبقۂ خاص جو زندہ حقیقتوں کا ترجمان ہوا کرتا ہے، جو حالات سے باخبر اور وقت کی نبض پر جس کی انگلیاں ہوتی ہیں، حالات کی برہمی نے اسے بھی خوف وبے ضمیری پر مجبور کردیا۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ قدآور قابل ذکر علمائے کرام ومشائخ عظام جو میدانِ عمل میں آگے آگے تھے اور جو کسی بھی حال میں اپنے اس وطن عزیز ہندوستان سے جانا گوارہ نہ کیا، ملک تقسیم ہوجانے کے بعد انھوں نے خود کو مسجدوں، خانقاہوں اور خالص مذہبی حلقوں تک محدود کرلیا۔ متعدد مسلم تنظیموں کا دائرہ عمل بھی خالص مذہبی ہوکر رہ گیا۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی وبے رحمانہ سلوک اور آئے دن مسلم کش فسادات پر ان کا مؤقف صرف ''خاموشی'' ہوکر رہ گیا۔

مسلم نمائندگی کے نام پر ایک تنظیم ''جمعیۃ العلماء ہند'' نام کی میدان میں تھی بھی تو وہ کانگریس کے اشارۂ ابرو کی پابند تھی۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ وہ بھی کانگریس کے وجود ہی کا ایک حصّہ تھی۔ اس سے کچھ قابلِ ذکر مذہبی وعلمی شخصیتیں وابستہ تھیں تو وہ اس حد تک کانگریسی تھے کہ اگر جنازے پر کھدّر کا کفن نہیں ہوتا تو وہ اس کی نمازِ جنازہ ہی نہیں پڑھاتے۔ ان کے فکر وعمل کی جہت، اقتدارِ وقت کی جنبش ابرو ہوا کرتی تھی، جس کی عکاسی حضرت اکبرالہٰ آبادی کرتے ہیں کہ ؎

یہ کانگریسی ملّا تم کو بتاؤں کیا ہیں
نہروں کی پالیسیوں کا اردو میں ترجمہ ہیں

اربابِ فضل وکمال واصحابِ فکر وعمل کے میدان سے ہٹ جانے کے بعد یہ جمعیۃ مسلمانوں کی نمائندگی کے نام پر میدان میں تنہا رہ گئی۔ مگر اس نے ہر قدم پر مسلمانوں کو مایوس اور اقتدارِ وقت کی خوشنودیوں کو ہی سامنے رکھا۔ یا یوں کہیے کہ اقتدارِ وقت کو خوش رکھنا ہی اس کا نصب العین تھا۔

ایک اور غیر معمولی سیاسی مذہبی وعلمی مانی جانے والی شخصیت جو ایک طرح سے اس جمعیۃ کی بھی امام تھی یعنی مولانا

ابوالکلام آزاد، وہ بھی گاندھی جی، پنڈت نہرو وغیرہ کی منشا کی تکمیل میں مسلمانوں کو اجتماعی سیاست سے توبہ کرا رہے تھے۔ آزادی کی لڑائی میں گاندھی جی نے مسلمانوں کی کسی تنظیم کے بجائے افراد کو لے کر چلنے کی ایک تحریک چلائی تھی۔ (مسلم ماس کنڈ یکٹ) جس کے مضمرات سے اہلِ نظر ناواقف نہیں تھے۔

''مسلم ماس کنڈ یکٹ'' کے لیے مولانا آزاد کا تیار ہو جانا، یہ گاندھی جی کی ایک بڑی کامیابی اور مسلم سیاست کا ایک بڑا المیہ تھا۔

سابق رکن پارلیمنٹ اور مشہور سماجی شخصیت جناب ارشد صدیقی کے والد جناب محمد الیاس اعظمی (سابق ایم پی) رقم طراز ہیں:

''اپنی بزدلانہ حرکت کو ''ہجرت'' کا مقدس نام دے کر انھوں نے باصلاحیت افراد کی پوری کھیپ کی بھگدڑ کا شرعی جواز تلاش لیا۔ رہی سہی کسر مولانا آزاد نے اس وقت پوری کردی جب انھوں نے ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ کنونشن کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی اجتماعی سیاست سے توبہ کرادی۔ اس طرح ''مسلم ماس کنڈ یکٹ'' کا تتمہ ان ہاتھوں سے لکھوایا گیا جس کی انگلیوں میں کلام اللہ کی تفسیر کی روشنائی ابھی لگی ہوئی تھی۔'' (پیامِ زندگی، ص ۱۸، مصنف محمد الیاس اعظمی۔ سابق ایم پی)

تقسیم ملک کے فوراً بعد یہاں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بڑا کڑا وقت تھا ابنائے وطن کے مسلسل بے رحمانہ و ظالمانہ سلوک اور اپنے لیے ان کی نگاہوں میں ذلت وحقارت پا کر مسلمانوں کا عام طبقہ خود کو گناہِ بے گناہی کا مجرم سمجھنے لگا تھا۔ اس کے اندر احساسِ کمتری اور خوف وہراس انجیکٹ کیا جانے لگا۔ عوام کی بات ہی کیا، خواص جو حالات کے پیچ وخم اور اس کی حقیقتوں سے باخبر تھے، وہ خود بھی جائے پناہ کی تلاش میں تھے۔ البتہ عبا، قبا میں ملبوس ایک خاص طبقہ ایسا تھا جو اقتدار کی چوکھٹ پر کاسۂ گدائی لیے مسلمانوں کے اقدار، عزت، حمیت، اوقاف، دستوری حقوق وغیرہ کی چند حقیر سی مراعات کے لیے حکومت کی منشا کی بھینٹ چڑھانے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا تھا۔ صرف دل ہی دل میں کروڑوں، اربوں کی مسلم اوقاف پر حکومت کے غاصبانہ قبضے پر ان کے سکوتِ مجرمانہ کو کس خانے میں رکھا جائے گا۔ انھیں کسی بھی معاملے میں مسلمانوں کو اعتماد میں لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی ضرورت تو بس اتنی تھی کہ حکومتِ وقت انھیں کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کا نمائندہ باور کرتی رہے اور ان کی ذات پر اپنے اعتماد کی سند سجائے رکھے۔ اور انعام میں اِکّا دُکّا اسمبلی یا پارلیمنٹ کی سیٹ عنایت کرتی رہے، اور اپنے سیکڑوں سرکاری ونیم سرکاری اداروں کی چند اہم کرسیاں دیتی رہے۔ نیم سیاسی ونیم مذہبی لوگوں پر مشتمل ایک جرگا تھا، جو ایسے پُرآشوب، بلاخیز، تاریک اور حوصلہ شکن ایام میں ہر ظلم وستم پر مسلمانوں کو صبر وضبط اور قناعت کی تلقین کرتا تھا کہ تم پر قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے تم آہ بھی نہ کرو، کہ اب اس ملک میں تمہارا رہ ہی کیا گیا ہے؟ جو کچھ تھا وہ پاکستان کے نام پر تمہارے بھائی لے جا چکے ہیں۔ یہ تو ہماری کوشش پر ہماری رحم دل گورنمنٹ کی مہربانیاں کہ تمھیں یہاں زندہ یا مردہ رہنے کا حق تو دیتی ہے۔

حالانکہ دوسروں کی نسبت یہ ظالم بہت اچھی طرح اس حقیقتِ صادقہ سے باخبر تھے کہ تقسیم ملک کے حقیقی ذمے دار

صرف اور صرف کانگریسی ہندو تھے، مسلمان ہرگز نہیں۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایت خوں چکا
ہر چند ہاتھ اس میں ہمارے قلم ہوئے

ایسے رستاخیز ماحول اور انھیں ایام میں فیض آباد یوپی اور اس کے اطراف وجوانب میں مسلسل دینی اجلاس چل رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے نامور خلیفہ اور خانوادۂ اشرفیہ کے چشم و چراغ حضرت محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی علیہ الرحمہ اپنی پوری آب وتابِ جاودانہ کے ساتھ رونق افروز تھے۔

۲۶ / مارچ ۱۹۴۹ء کو وہی پردلِ دردمند اور اصحابِ فکر ونظر کی ایک جماعت نے آپ سے بطور انٹرویو کچھ سوالات کیے۔ حضور والا! مسلمانوں کے تعلق سے جب حالات اتنے ناگفتہ بہ مخدوش اور دھما کہ خیز ہیں تو ایسی صورت میں کسی ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کی اس نازک ترین صورتِ حال اور ان کے درمیان مسائل میں کوئی اہم و مؤثر رول ادا کر سکے۔

ہاں ایک نئی جماعت کی تشکیل کی ضرورت شدّت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں۔

حضور والا! گستاخی معاف! سوادِ اعظم اہلِ سنت وجماعت بروقت متعدد جماعتیں مثلاً جمعیۃ العلما قدیم، سنی کانفرنس وغیرہ موجود ہیں، توان تنظیموں کے ہوتے ہوئے مزید ایک اور تنظیم کیوں؟

بے شک موجودہ تنظیمیں جو اس وقت ہمارے درمیان موجود ہیں، یہ بدلے ہوئے حالات میں خالص مذہبی دائرۂ عمل ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم، ان کو درپیش مسائل اور عصری تقاضوں میں یہ جماعت بروقت ناکام ہیں۔ جس کی ایک خاص وجہ ہے جو اہلِ نظر پر مخفی نہیں، جبکہ اس وقت ہمیں ایک ایسی جماعت کی شدید ضرورت ہے جو مسلمانوں کے تمام تر مفادات کے ساتھ ان پر ہونے والے مظالم بالخصوص مسلم کش فسادات، مسلم اوقات کے تحفظات، مسلمانوں کے دستوری حقوق کی عملی بحالی وغیرہ میں کوئی مؤثر رول ادا کر سکے۔ شوکت اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ وبقا اور ان کے دستوری حقوق کی مساویانہ بحالی کے لیے قربانیاں دے سکے۔

تو کیا حضرت کے ذہن میں ایسے خاکے ہیں جن پر کسی جماعت کی تشکیل کی جا سکے؟

جی ہاں! نئی جماعت کی تشکیل کے جو خطوط اور خاکے میرے ذہن میں ہیں، ان میں ہندوستان بھر کے اکابر علمائے دین اور مشائخ کرام سے استصواب ضروری ہے۔ ان کی قیمتی آرا کے ساتھ ہی ان کا عملی تعاون بھی ضروری ہے۔ میری خواہش ہے کہ نئی جماعت کی تشکیل میں ہندوستان کا دل ودماغ شامل ہو۔ اور ان کے قیمتی مشوروں اور عملی تعاون سے یہ مبارک کام انجام پذیر ہو۔ اور اس کے لیے مناسب موقع ممبئی کے مجالس محرم الحرام کے وقت ہوگا۔ کہ اس موقع پر وہاں تقریباً پورے ملک کے علمائے کرام اور مشائخ عظام کی ایک کثیر تعداد موجود ہوتی ہے۔ اس اہم مسئلے کو بمبئی میں ان کے سامنے رکھا جائے گا۔

چنانچہ مجالس محرم الحرام ۱۳۶۹ھ کے موقع پر بمبئی میں اکابر علمائے کرام اور مشائخ عظام کی اس موضوع پر متعدد نشستیں ہوئیں۔ کافی غور وخوض اور طویل بحثوں کے بعد علمائے کرام کسی حتمی فیصلے پر متفق نہ ہو سکے۔ اس طرح اس وقت بمبئی میں کسی جماعت کی تشکیل نہ ہوسکی۔ البتہ اس بات پر سبھی کا اتفاق ہوا کہ اس بے حد اہم مسئلے کو اگلے ہی ماہ عرسِ رضوی کے موقع پر اُٹھایا جائے، کہ اس موقع پر بریلی شریف میں دیدہ وروں، دانش وروں، علما و مشائخ اصحاب فضل و کمال کا قافلہ در قافلہ از خود عبقری الشرق مجددِ اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت کے لیے اُمنڈ پڑتا ہے۔

چنانچہ حسب وعدہ عرسِ اعلیٰ حضرت کے موقع پر سرزمین بریلی شریف میں حضور صدر الافاضل، فخر الاماثل، سید المفسّرین حضرت علامہ سید محمد نعیم الدین محقق مرادآبادی علیہ الرحمہ کے محترم شاہزادے حضرتِ بابرکت علامہ سید اختصاص الدین نعیمی علیہ الرحمہ کی صدارت میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے علماء و مشائخ اور اصحابِ فضل و کمال کی ایک اہم میٹنگ ہوئی۔ طویل بحثوں اور قیمتی مشوروں اور کامل غور وخوض کے بعد ۲۴ رصفر المظفر ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۶ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک نئی تنظیم بنام ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کا قیام عمل میں آیا۔ فلحمد للہ تعالیٰ علیٰ منہ واحسانہ۔

ہندوستان بھر سے آئے ہوئے علماء و مشائخ، اصحابِ فکر و نظر، اربابِ علم و دانش اور حاملین کردار و عمل نے متفقہ طور پر حضور مجاہد ملت حضرت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی رئیس اعظم اڑیسہ والیِ روٗفیہ اسٹیٹ دھام نگر کو ان کی غیر موجودگی میں مرکزی صدر منتخب کیا۔ اس وقت تین مرکزی سرپرستوں کا بھی انتخاب عمل میں آیا۔ حضور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفےٰ رضا خاں، محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی، ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری پروفیسر شمس الہدیٰ کالج پٹنہ۔ یہ نفوسِ قدسیہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے سرپرست کے منتخب ہوئے۔

مفتیِ آگرہ حضرت علامہ عبد الحفیظ صاحب، نائب صدر اور حضرت مولانا سید مظفر حسین کچھوچھوی جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے دست و بازو بنے۔ جبکہ خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی، اور جناب سلیم اللہ بنارسی جوائنٹ سیکریٹری منتخب کیے گئے اور ناظم نشر و اشاعت کے عہدے کے لیے حکیم محمد یونس نظامی الہٰ آبادی اور مولانا عبد المسجود کو نامزد کیا گیا۔

خلیفۂ اعلیٰ حضرت مولانا عارف اللہ صاحب میرٹھی اور مولانا محبوب صاحب کانپوری خصوصی ارکان نامزد کیے گئے۔

واضح رہے کہ جس عہد کی یہ باتیں ہو رہی ہیں، اس زمانے میں علما و مشائخ کے حاشیۂ خیال میں بھی سنّی جمعیۃ العلماء یا مسلم متحدہ محاذ جیسی تنظیمیں نہیں تھیں۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام، اس کا نقطۂ عروج، پھر اس کے قائد حضور مجاہد ملت پر مقدمات کی بھرمار، قید و بند کی مسلسل صعوبتیں، اقتدار وقت کے مظالم، پل پل بدلتے بے رحمانہ حالات کے بہت بعد سنی جمعیۃ العلماء اور مسلم متحدہ محاذ جیسی تنظیموں کے قیام کا سبب بنیں۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے قیام کے وقت یہ انتخاب عمل میں آیا تھا۔ لیکن آگے چل کر مختلف اوقات میں مختلف عہدوں

کے لیے دوسرے حضرات کا بھی انتخاب ہوا۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۲ء میں حضرت مولانا شاہ عزیز احمد الہٰ آبادی والد ماجد سید شمیم گوہر الہٰ آبادا ور ۱۹۵۴ء میں مفتیِ اعظم کان پور حضرت علامہ مولانا رفاقت حسین صاحب قبلہ اور ۱۹۵۵ء میں مولانا ابوالوفا فصیحی غازی پوری اور ۱۹۶۲ء میں حضرت مولانا سید احسان علی صاحب قبلہ نائب ناظم نشریات رہے۔

سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کا یہ بے حد متحرک وفعال کارواں سرکار مجاہد ملت کی قیادت میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ خدمتِ دینِ متین وسرفرازی اسلام ومسلمین کے لیے بے کراں جذبے کے ساتھ میدان میں اُترا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دینی، تبلیغی وتنظیمی سرگرمیوں کا سلسلہ چل پڑا۔ مسلمانوں کے اندر بدعملی، مذہبی بے راہ روی، مایوسی، بدحالی، احساسِ کمتری اور حالات کی سنگینی سے پیدا شدہ خوف وہراس کو ختم کرنے کی مسلسل جدوجہد شروع کی گئی۔ انھیں کے وجود کی اہمیت سے روشناس کرایا گیا۔ ان کے دستوری حقوق سے آگاہ کیا گیا۔ مسلمانوں کی بہتری اور برتری کے لیے دن رات کی جہدِ مسلسل سے بہت جلد تبلیغ سیرت نے مسلمانوں کے دلوں میں جگہ بنالی۔ لوگ جوق در جوق اس کے قریب آنے لگے۔ مسلسل اس کی اہمیت وافادیت محسوس کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ جب وکلاء اور بیرسٹر صاحبان اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے فخر ومسرّت محسوس کرنے لگے۔

اگرچہ قیام کے وقت یہ تجویز کیا گیا کہ مرکز فیض آباد میں رہے گا، پھر بھی ۱۹۷۸ء تک اس کا مرکز الہٰ آباد ہی رہا اور ایک وقت پر خانقاہِ حلیمیہ الہٰ آباد میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا مرکزی دفتر قائم ہوا۔ اس وقت اس کا دستور العمل مندرجہ ذیل اغراض ومقاصد پر مشتمل تھا:

☆ مسلم قوم کی لادینیت اور ہر قسم کی بدمذہبیت سے بچانے کے لیے دینی مدارس کا قیام۔

☆ قیامِ امن کے لیے جارح فرقہ پرستی کی روک تھام۔

☆ مساجد ومقابر اور اوقاف کا تحفظ۔

☆ اسلامی نظریے کے مطابق ملک ووطن کی تعمیر وترقی کے لیے ہر ممکن قربانی پیش کرنا۔

☆ بیت المال کا قیام (تاکہ غربت وافلاس کے دلدل سے نکال کر مخلص وفا شعار، متحرک وفعال خدمت گاروں کا دستہ وجود میں لایا جاسکے، جو ایک زندہ قوم کی آبرومندانہ بقا کے لیے بہت ضروری ہے(۱)

چنانچہ ۱۹۵۱ء میں طے ہوا کہ الہٰ آباد میں ایک بڑے پیمانے پر جلسہ کیا جائے، تاکہ جلیل القدر علما ومشائخ سرد وگرم چشیدہ اربابِ فکر ونظر کے قیمتی آرا اور ان کے عملی تعاون سے تبلیغ سیرت کے طریقِ کار کا تعین کیا جائے۔

---

(۱) اور اب تو موجودہ تعصب وتنگ نظری، جارح فرقہ پرستی، مذہب بیزاری، شریعت شکنی، مساجد کی بے حرمتی، وطن دشمنی، ملک مخالف جاسوسی اور ملکی یک جہتی کو پارہ پارہ کردینے والی سازشوں کے پیش نظر بالخصوص اہم ترین تاریخی مساجد ومقابر پر فرقہ پرست جنونی ہندوؤں کے قبضہ ویلغار کو دیکھتے ہوئے یہ بہت ضروری ہوگیا ہے کہ اپنی صفوں کی ترتیب کو حالات کے پیچ وخم کے اعتبار سے درست کرکے ان کی مکمل شیرازہ بندی کی جائے اور نئے سرے سے پوری توانائی کے ساتھ میدانِ عمل میں اُترا جائے۔

مولانا انوار احمد نظامی فیض آباد جا کر حضرت محدثِ اعظم صاحب سے بڑے بڑے علما و مشائخ عظام و مشاہیر اہلِ سنت کے ناموں کی فہرست لائے۔ بڑے بڑے اشتہارات شائع کیے گئے، مگر حسب اعلان چند در چند وجوہات کی بنیاد پر جلسہ تو نہ ہو سکا، البتہ علمائے کرام اور مشاہیر اہلِ سنت کے درمیان آل انڈیا تبلیغ سیرت کے طریقۂ کار کے لیے چند نشستیں ہوئیں، جس میں تبلیغ سیرت کے طریقۂ کار کے لیے بحثیں بھی ہوئیں اور اس کے لیے لائحہ عمل بھی بنا۔

حسب پروگرام مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعقیدگی کی اصلاح، ان کے عقائد، ناموس و عزتِ نفس کے تحفظ و بقا اور ان کے آبرومندانہ وقار کی بحالی، ان پر ہونے والے یک طرفہ مظالم اور ان کے ساتھ برتے جانے والے امتیازی سلوک کے سدباب اور عوامی بیداری کے لیے ملک کے طول و عرض میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے دینی، تبلیغی و تنظیمی اجلاس کا سلسلہ شروع کیا۔

عوامی بیداری کے لیے اس طرح بڑے بڑے تاریخی اجلاس کا انعقاد وقت کی اہم ضرورت تھی۔ ملک کی ناخواندہ مسلم اکثریت سے براہِ راست رابطے کا ایک یہی مؤثر ترین ذریعہ تھا۔

رفتہ رفتہ یہ جماعت ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ مقتدر علما و مشائخ، نامور خطبا، شعرا، قومی و ملّی تڑپ رکھنے والے دانش وروں اور ادیبوں نے اپنے مخلصانہ تعاون سے اس جماعت کے وقار میں چار چاند لگائے۔ صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت مجاہد ملت حضرت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری بے پناہ جدو جہد اور انتھک کوششوں اور حیران کن مالی قربانیوں کی بدولت ملک کے مختلف حصّوں میں دینی مدارس مکاتب، مساجد اور اسلامی سینٹر بڑی تعداد میں قائم ہوئے۔ غیر آباد مسجدیں آباد ہوئیں۔ ٹوٹی ہوئی اور خستہ حال مسجدوں کی دوبارہ تعمیر ہوئی۔ یتیم خانے کھلے، آباد ہوئے، رفاہِ عام کے لیے کافی تعداد میں کنویں کھودے گئے، لائبریریاں، اشاعتی اِدارے اور اسلامی علوم کی نشر و اشاعت، فلاح و بقا کے سوتے جگہ جگہ اُبل پڑے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جانب سے ملک کے مختلف حصوں میں تاریخی اجلاس اور عظیم الشان کانفرنسوں میں تیزی آتی گئی۔ جس میں علما و مشائخ کا مقدس قافلہ پورے جاہ و جلال کے ساتھ رونق افروز ہوتا۔ تبلیغ سیرت کے ان جلسوں پر لوگوں کا بڑا اعتماد ہو گیا۔ جگہ جگہ دیوانگانِ شوق تبلیغ سیرت کے پروگرام اور اس کے تعمیری مقاصد کی تکمیل کے لیے نظر آنے لگے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اُڑیسہ، بنگال، بہار، اُتر پردیش، مدھیہ پردیش اور راجستھان وغیرہ میں سیکڑوں شاخیں اور آفس قائم ہو گئے، جو تبلیغ سیرت کے جلیل القدر قاعد کی مساعی جمیلہ کی جلوہ سامانیاں تھے۔

اس زمانے میں خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی نے اپنے آقائے نعمت، حضور مجاہد ملت کی رضا و خوش نودی کے لیے آل انڈیا تبلیغ سیرت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اور وہ اپنی تحریر و تقریر کی تمام تر صلاحیتیں تبلیغ سیرت کے دائرۂ عمل کو وسیع تر کرنے میں صَرف کرنے لگے۔ ان کی اس وقت کی ذاتی دل چسپی کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ انھوں نے ۱۹۵۱ء میں الہ آباد سے ایک بڑا معیاری رسالہ ماہ نامہ ''پاسبان'' جاری کیا اور اسے آل انڈیا تبلیغ سیرت کا آرگن اور ترجمان بنایا۔

پاسبان کے پرانے شمارے آل انڈیا تبلیغ سیرت کی دینی خدمات کا تاریخی ریکارڈ ہیں۔ اپنے وقت کے اقلیم خطابت کے تاجدار نے اپنی ذاتی دل چسپی اور خصوصی توجہ کی وجہ سے ''پاسبان'' کو اتنا معیاری اور منفرد بنا دیا کہ اردو صحافت میں پاسبان کا وزن محسوس کیا جانے لگا۔

ماضی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بڑے بڑے جلسوں اور اہم تاریخی کانفرنسوں نے جو عوامی بیداری کی لہر پیدا کی اس کی ایک ہلکی سی جھلک ملاحظہ ہو۔ جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ تبلیغ سیرت کو جہاں ایک طرف علما و مشائخ کی سرپرستی حاصل تھی، وہیں پروفیسروں، دانش وروں، وُکلا اور بیرسٹروں کا عملی تعاون اور ان کی حمایت بھی حاصل تھی۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کی دینی خدمات اور ملّی تڑپ نے ان کے دلوں میں گھر کرلیا تھا۔

۹، ۱۰، ۱۱، اپریل ۱۹۵۴ء کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ بہار میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے بڑے ہی وسیع پیمانے پر ایک تاریخی کانفرنس کا انعقاد کیا۔ اس کے علاوہ ہزاری باغ الہ آباد، کلکتہ، کٹک، بنارس، کان پور، ٹاٹا جمشید پور، غازی پور، جھریا، اجمیر مقدس اور بمبئی وغیرہ میں آئے دن اسی طرح کی بڑی بڑی کانفرنسیں اور شاندار اجلاس ہوتے رہے۔

ان کانفرنسوں کی یہ خصوصیت رہی کہ ان کی سرپرستی و صدارت شیخ الاسلام مولانا مفتی عبدالقدیر بدایونی اور محدثِ اعظم ہند مولانا سید محمد میاں کچھوچھوی جیسی بلند پایہ شخصیتیں فرمایا کرتی تھیں ؎

کچھ نقش تری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سرو ساماں سہی ویراں نہیں ہے

اس طرح تبلیغ سیرت کا دائرۂ عمل مجاہد ملت کی پُرخلوص جد و جہد اور علما و مشائخ کے تعاون سے دن بہ دن وسیع تر ہوتا رہا۔ ایوانِ اقتدار میں تبلیغ سیرت کی آواز کی دھمک محسوس کی جانے لگی۔ مسلم نوجوانوں کے دل و دماغ سے خوف کم ہونے لگا۔ ان کے ذہنوں سے مایوسیوں کی دھند چھٹنے لگی۔ نام نیشنلسٹوں اور اقتدارِ وقت کے دلالوں کے پیدا کردہ احساسِ کمتری کے دلدل سے مسلم قوم نکلنے لگی۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس اور اپنی حیثیت کا اِدراک ہونے لگا۔

اس صورتِ حال نے اقتدارِ وقت اور اس کے دلالوں کے اندر تشویش کی لہر دوڑا دی۔ تبلیغ سیرت اور اس کے قائد کی تاثیری قوت کو ختم کرنے کے لیے مجاہد ملت کی گرفتاری اور ان پر مقدمات کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

غازی پور میں تبلیغ سیرت کے جلسے میں اور سلطان پور میں اربابِ اقتدار کے مظالم کے خلاف تبلیغ سیرت کے صدر مجاہد ملت حضرت شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری (علیہ الرحمہ) نے بہت برہنہ تقریریں کیں، اور اقتدارِ وقت کی مسلم دشمنی، فرقہ پرستی، تعصّب و تنگ نظری اور جانب داری کو عوام میں ننگا کر دیا۔ جس کی پاداش میں ۱۹۵۶ء میں آپ کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اور آپ پر باقاعدہ مقدمات قائم کیے گئے۔ سلطان پور کے مقدمے میں آپ کو قید بامشقت کی سزا ہوگئی۔ ہائی کورٹ میں اپیل کے بعد وہ سزا بھی منسوخ ہوگئی۔

مسلمانوں کی آبرومندانہ بقا کے لیے آپ کی گرفتاری اور مقدمہ بازی کا سلسلہ حکومت نے ۱۹۵۶ء میں شروع کیا

تھا۔ اس کا دور بڑا طویل اور صبر آزما ثابت ہوا۔ اور یہ سلسلہ دراز عشق ۱۹۵۲ء سے شروع ہو کر ایمر جنسی ۱۹۷۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں ہندوستان میں ہندی مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی خاطر آپ کی آخری گرفتاری ایمر جنسی ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ گرفتاری کے بعد نندنی شت پتھی کی حکومت نے اتنی سختی برتی کہ بیمار ہوجانے پر اسپتال میں منتقل کیا ہے تو پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔

مسلمانوں کے تعلق سے آپ کو خاموش کرنے کے لیے حکومت کی سختیاں جوں جوں بڑھتی گئیں، آپ کا موقف اتنا ہی سخت ہوتا گیا۔

آپ کو اربابِ اقتدار نے جتنا ستایا، جتنی گرفتاریاں اور جتنے مقدمات آپ پر قائم کیے، کم از کم ہندوستان کی جمہوری تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ ایک خالص مذہبی شخصیت کو بار بار مجروح کیا گیا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ اپنی قوم پر ہونے والے بے پناہ مظالم پر وہ خاموش نہیں رہتا تھا۔

مجاہد ملت اپنی مجاہدانہ عزیمت کی بدولت بار بار جیل جاتے رہے۔ آئے دن آپ پر مقدمات قائم ہوتے گئے۔ اس صورتِ حال میں محبّین و مخلصین، معاونین و تلامذہ و رفقا کو برداشتہ خاطر کردیا۔ کچھ لوگ حالات کے تیور، ہی سے خوف زدہ ہو گئے۔ انھیں میں سے کچھ اہم شخصیتوں نے دوسری جماعت کا سہارا لیا۔ ان حالات نے مسلم متحدہ محاذ کے قیام کی راہ ہموار کی۔

انھیں ایام میں عرس مقدس کے موقع پر اجمیر شریف میں علمائے کرام، مشائخ عظام اور اکابر ملتِ اسلامیہ کا اجتماع ہوا۔ جس میں یہ بات زیر غور آئی کہ تمام جماعتوں کو تحلیل کر کے کسی ایک ہی جماعت کو باقی رکھا جائے اور وہی سوادِ اعظم اہل سنّت و جماعت کی مرکزی تنظیم قرار پائے۔

حضرت مجاہد ملت الحاج مولانا شاہ حبیب الرحمٰن قادری ہاشمی عباسی نے مخلصانہ و مؤدبانہ درخواست کی کہ بے شک تمام جماعتوں کو تحلیل کر کے کسی ایک جماعت کو برقرار رکھ کر اسے ہمہ جہتی دے دی جائے۔ اس کے صدر اور سکریٹری خواہ کوئی بھی ہوں مگر اس خصوص میں اتنی سی گذارش نوٹ کرلی جائے کہ وہ جماعت صرف مذہبی دائرۂ عمل بالخصوص مذاہبِ باطلہ کے رَد و استیصال ہی تک نہ محدود رہ جائے بلکہ مسلم قوم کی آبرو مندانہ بقا کے لیے ہمہ دم مستعد رہے۔ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف پوری گھن گرج کے ساتھ آواز بلند کر سکے۔ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے سلگتے مسائل پر بے باکی کے ساتھ اربابِ اقتدار کو متوجہ کر سکے۔

اگر ایسا ہوتا ہے تو سبحان اللہ! ورنہ میری ڈیڑھ اینٹ کی جماعت الگ ہی رہے گی۔

اکابرین ملت نے حضور مجاہد ملت کے درد کو محسوس نہیں کیا۔ یا حالات کے پیش نظر کسی مصلحت سے کام لیا کہ قائم ہونے والی اس تنظیم کو خالص مذہبی دائرۂ عمل تک ہی محدود رکھا۔ اور قومی مسائل اور سیاست حاضرہ سے کسی بھی نوعیت کا کوئی تعلق نہ رکھنے کے لیے دستوری طور پر پابند کردیا۔

جس سے حضور مجاہد ملت برداشتہ خاطر ہوئے۔ ان کی آنکھیں مستقبل کے پردے کو چیر کر دیکھ رہی تھیں کہ آنے والے دنوں میں اس ملک میں مسلمانوں کا کیا حال ہوگا۔ اور طوفان آنے سے پہلے اگر بند نہیں باندھا گیا تو مسلمانوں کا کیا حال ہوگا۔ چنانچہ جن جن بے رحم حقیقتوں پر وہ زندگی بھر ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہے، وہ سب کچھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس ملک میں مسلم اُمت کو درپیش ہیں۔ علمائے دین نے ملک کی سیاست سے منہ موڑ کر اس ملک اور یہاں کے مسلمانوں کو جن شیطانوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا، اس کا نتیجہ نظروں کے سامنے ہے۔

چنانچہ حضور مجاہد ملت نے اپنی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کو لے کر اپنے مخلص جانثاروں کے ساتھ چل پڑے۔ اب وہ اور تبلیغ سیرت لازم وملزوم ہو کر رہ گئے۔ اور حضرت مجاہد ملت نے اسے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ حضور مجاہد ملت بنیادی طور پر ایک مردِ مومن تھے۔ زمانہ سازی، حیلہ جوئی، حالات کے اُتار چڑھاؤ کے مطابق موقف کی تبدیلی ان کی سرشت کے خلاف تھا۔ اسی لیے کہا جاتا ہے وہ اور ان کی تحریک آل انڈیا تبلیغ سیرت عوامی تحریک نہ بن سکی۔ اگر وہ اپنے موقف میں حسب ضرورت لچک پیدا کر لیتے، حالات ومصلحت کو دیکھتے ہوئے اپنی پالیسیوں میں ترمیم کرتے رہتے۔ الغرض جھکنے اور لچکنے کی پالیسی اپنا لیتے تو تبلیغ سیرت اب تک ایک عالم گیر تنظیم ہوتی۔

بے شک آل انڈیا تبلیغ سیرت نے اپنے پچاس سالہ تاریخ میں جو قومی وملّی، دینی خدمات انجام دی ہیں وہ اس کے قائد اعظم حضور مجاہد ملت نے مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ان کی آبرومندانہ بقا کے لیے جو قربانیاں دی ہیں ان کی مثال نہ تو یہاں پر انفرادی طور پر ملے گی اور نہ ہی اجتماعی طور پر۔ بے شک اس کی ایک درخشاں تاریخ ہے جو کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کا کام کبھی رُکا نہیں۔ کبھی نرم، کبھی گرم چلتا ہی رہا۔ البتہ اس کے گرد علمائے دین کی وہ بھیڑ نہیں رہ گئی جو پہلے تھی۔ رہ گئی مسلم اُمت تو وہ حضور مجاہد ملت کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہمیشہ دیوانی رہی۔ حضور مجاہد ملت مولانا شاہ حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمہ چودھویں صدی ہجری کے نصف آخر کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے ایک اولوالعزم، پُرجوش اور مذہبی قائد کی حیثیت سے اُبھرے۔ عرب وعجم، حل وحرم میں جن کی عظمتوں وعزیمتوں کا شہرہ ہوا۔ دنیا بھر کے مذہبی حلقوں نے آپ کو اپنا عظیم مقتدا جانا۔ اُمتِ مسلمہ نے جس اعتماد کے ساتھ آپ کے فرقِ اقدس پر قیادت کا بارِ عظیم رکھا، اس اعتماد کی بجا طور پر آپ نے لاج رکھی۔ ملک وبیرونِ ملک کہیں بھی، کسی بھی صورت میں سوادِ اعظم کو آپ نے مایوس نہیں کیا۔ آئے دن قید وبند کی صعوبتیں آپ کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کر سکیں۔ اپنے زمانہ میں دین وسنیت اور قوم وملت اور شوکتِ اسلام کے لیے جو قربانیاں دی ہیں، طبقۂ علما ومشائخ میں دور، دور تک اس کی مثال نہیں ہے۔

حالات کی برہمی کے سبب علمائے دین کے عدم تعاون کی وجہ سے اس کی مقبولیت میں کمی ہوئی، عملاً اس میں انحطاط آیا۔ تاہم ملک کے متعدد صوبوں مثلاً بہار، بنگال، اڑیسہ، مدھیہ پردیش، راجستھان وغیرہ میں اس کا وجود برقرار رہا۔ خاص کر دھام نگر اڑیسہ جو حضور مجاہد ملت کا وطن مالوف ہے۔ جہاں کے حضرت رئیس اعظم تھے۔ وہاں پر یہ تحریک کافی متحرک

اورفعال رہی اور ہمیشہ سرگرم عمل رہی۔ تحریکوں کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ لگا ہی رہتا ہے۔ جب انسان کی زندگی حالات کے اُتار چڑھاؤ سے متاثر ہوتی ہے تو جماعت بھی چند قابل ذکر شخصیات پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت نے اپنے دورِ عروج کو بھی دیکھا۔ طویل دورِ انحطاط کو بھی جھیلا اور پھر اس نے عروج کی طرف جست لگائی۔ ۱۹۷۸ء میں بمبئی میں اسے ایک مردِ درویش کا مضبوط اور توانا کاندھا مل گیا، جس کی برکتوں کے فیضان نے اسے عرب و عجم میں چمکایا اور دنیا بھر کے اسلامی ملکوں اور مذہب و سیاسی حلقوں میں اس کا آواز بلند ہوا۔

بمبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام

آل انڈیا تبلیغ سیرت اب تک ملک کے متعدد صوبوں میں کہیں نرم، کہیں گرم رواں دواں تھی، مگر مہاراشٹر بالخصوص بمبئی میں اس کا قیام عمل میں نہیں آسکا۔ اس کی ایک بڑی وجہ اہلِ سنّت و جماعت کی مرکزی تنظیم آل انڈیا سنّی جمعیۃ العلماء کی موجودگی تھی۔ حضور سید العلماء علامہ سیّد آل مصطفےٰ قادری برکاتی علیہ الرحمہ کے زمانے تک سنّی جمعیۃ العلماء کافی متحرک تھی۔ اور سچ پوچھیے تو بمبئی بھر کے مسلمانوں کی یہی ایک تنظیم تھی کہ اس وقت بمبئی صرف آل مصطفےٰ (علیہ الرحمہ) کی تھی۔ مگر حضرت کے وصال کے بعد وہ بات نہیں رہ گئی اور سنّی جمعیۃ العلماء کا تب وتاب جاودانہ بھی برقرار نہیں رہ سکا۔ پھر آگے چل کر حالات کے کچھ ایسے تقاضے سامنے آئے کہ یہاں بمبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام ناگزیر ہو گئے۔

حضرت ٹوپی والے بابا صاحب قبلہ کی خصوصی عنایتوں سے ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۸ء کے آخری عشرے میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام عمل میں آیا۔ اور چمنا بوچر اسٹریٹ بمبئی ۳ میں ۲۴؍ ربیع النور ۱۳۹۸ھ مطابق ۴؍اپریل ۱۹۷۸ء مولانا عبد القدوس کشمیری صاحب کی سربراہی میں پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں پہلا خطاب خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا۔ اور آل انڈیا تبلیغ سیرت اور حضور مجاہد ملت کی ملک گیر خدمات پر ایک تاریخی خطاب فرمایا۔ ان کا خطاب آل انڈیا تبلیغ سیرت کی خدمات کا گویا دستاویز تھا۔

اس کے بعد انجمن آفتاب رسول کمیٹی، کماٹی پورہ پانچویں گلی بمبئی ۸ محمد حسین پھول والے کے تعاون سے دوسرا جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں حضرت مولانا احسان علی صاحب باندوی اور حضور مجاہد ملت کا خطاب ہوا۔ اسی جلسے میں تبلیغ سیرت کی پرچم کشائی بھی ہوئی اور تحریک خاکسارانِ حق کا پریڈ بھی۔

اس کے ساتھ ہی بمبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا۔ جس کی عملی سرپرستی بمبئی کے مشہور درویش عارفِ حق حضرت ٹوپی والے بابا صاحب نے فرمائی۔ اور زندگی بھر اپنے مضبوط و توانا کاندھے پر اس کا بوجھ اُٹھائے رکھا۔ حبیب منزل ڈِمٹمکر روڈ، ناگپاڑہ بمبئی ۸ میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا مرکزی دفتر بھی حضرت بابا صاحب قبلہ کی الطافِ خسروانہ ہی کا رہین منت ہے۔

بمبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام گویا ایک طرح سے تبلیغ سیرت کا نشاطِ ثانیہ کہا جا سکتا ہے۔ آغاز ہی میں حضرت مولانا عبد الجبار ماہر اعظمی خطیب و امام ہندوستانی مسجد، حضرت مولانا عبد القدوس کشمیری، الحاج محمد منیف قادری یار علوی،

مولانا شمیم اشرف ازہری، مولانا قاری نسیم صاحب وانجاواڑی مسجد ماہم، مولانا محمد یونس نوری قادریہ مسجد دھاراوی، علامہ الحاج محمد حنیف اعظمی صاحب اور محمد یوسف صاحب منیہار مرحوم آل انڈیا تبلیغ سیرت سے منسلک ہوگئے۔

اس مذہبی ونیم سیاسی تحریک کے سب سے پہلے حضرت مولانا عبدالقدوس کشمیری صدر مہاراشٹر ہوئے۔ محمد یوسف منیہار اس کے جنرل سیکریٹری، مولانا عبدالجبار ماہر اعظمی سیکریٹری ہوئے۔ الحاج سیٹھ محمد منیف قادری یار علوی خازن اور راقم الحروف (محمد وارث جمال قادری) نائب ناظم نشرواشاعت مقرر ہوگئے۔ ایک ہی سال بعد خاکسار راقم الحروف کو ناظم نشرواشاعت بنایا گیا۔ ایک سال بعد مولانا کشمیری صاحب مستعفی ہوگئے اور ان کی جگہ پر حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب مصباحی خطیب وامام ناریل واڑی قبرستان مسجد صدر مہاراشٹر منتخب ہوئے۔ جو اپنی حیات تک صدر رہے۔

بمبئی بھیونڈی مضافات کے تقریباً تمام علمائے کرام، ائمہ مساجد اور سنّی تنظیموں نے آل انڈیا تبلیغ سیرت کا والہانہ خیر مقدم کیا، بالخصوص بمبئی کے سب سے قدیم وعظیم دینی ادارے دارالعلوم محمدیہ اور اس کے بانی وشیخ الحدیث سربراہِ اعلیٰ، اشرف العلماء حضرت علامہ سید حامد اشرف اشرفی الجیلانی کچھوچھوی مدظلہ النورانی نے بھرپور پذیرائی کی۔ اپنے پورے اسٹاف کے ساتھ بلکہ بمبئی بھر میں پھیلے ہوئے اپنے ادارے کے فارغ شدگان ائمہ مساجد جو بڑی تعداد میں تھے اور آج بھی ہیں، عملی تعاون فرمایا۔ جب بھی تبلیغ سیرت نے انہیں آواز دی، آگے بڑھ کر آپ نے سرپرستی فرمائی۔ کوئی عہدہ نہ قبول کرتے ہوئے خود کو اپنے ادارے کے اساتذہ وائمہ مساجد کے ساتھ تبلیغ سیرت سے منسلک رکھا۔ اور آج جب کہ وہ برسوں سے صاحبِ فراش ہیں (مولیٰ تعالیٰ اپنے نبی پاک ﷺ کے طفیل ان کا سایۂ عاطفت اہلِ سنت وجماعت کے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین) ان کی، ان کے فرزند گرامی حضرت خالد اشرف اور ان کے ادارے کے اساتذہ بالخصوص دارالعلوم محمدیہ کے لائق وفائق اور بے حد متحرک وفعال ناظم اعلیٰ جناب حافظ سید اطہر علی صاحب کی دعائیں، ہمدردیاں اور پُرخلوص تعاون تبلیغ سیرت کو حاصل ہے فلحمد علیٰ ذٰلك۔

☑ ☑ ☑ ☑ ☑ ☑

آل انڈیا تبلیغ سیرت رجسٹرڈ

ملک کی آزادی کے بعد سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی مرکزی نمائندہ تنظیم

وہ اہم ترین شخصیتیں جو آل انڈیا تبلیغ سیرت سے وابستہ رہیں

جس میں کچھ نے سرپرستی فرمائی، کچھ نے اس کے اہم وکلیدی عہدوں کو زینت بخشی، کچھ نے دستگیری کی، کچھ دست وبازو بنے اور کچھ حرکت وعمل کی مشین اور کچھ مقدس شخصیتیں اخلاصِ فراواں کے ساتھ دستِ بہ دُعا!

فجزاهم الله احسن الجزاء

آزادی کے بعد فوراً قائم ہونے والی سوادِ اعظم اہلِ سنت وجماعت کی پہلی نمائندہ تنظیم۔آل انڈیا تبلیغ سیرت! ہر دور کی سیاستِ حاضرہ سے جس کا تعلق تھا، ہے اور رہے گا۔

پیشوائے قدسیاں حضور مفتی اعظم ہند علامہ مصطفےٰ رضا خاں۔ بریلی شریف

فخر ہندوستان حضور محدث اعظم ہند حضرت علامہ سید محمد کچھوچھوی اشرفی جیلانی

تلمیذ وخلیفۂ اعلیٰ حضرت ملک العلماء حضرت علامہ ظفر الدین قادری رضوی بہاری

امام التارکین حضور مجاہد ملت علامہ مفتی شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری حامدی اشرفی، متولی رؤفیہ اسٹیٹ دھام نگر، اڑیسہ

خلیفۂ اعلیٰ حضرت، حضرت علامہ احمد مختار میرٹھی

شیخ الاسلام حضرت علامہ مفتی عبد القدیر عثمانی بدایونی

مفتی آگرہ بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد الحفیظ حقانی

سلطان المناظرین امین شریعت حضرت علامہ مفتی شاہ رفاقت حسین حامدی اشرفی مفتی اعظم کان پور

مخدوم المشائخ حضرت علامہ سید مختار اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی

پیر طریقت علامہ سید شاہ عبد العزیز ابو العلائی، سجادہ نشین خانقاہِ حلیمیہ ابو العلائیہ، الٰہ آباد، یوپی

رہنمائے ملت حضرت علامہ اختصاص الدین نعیمی مراد آبادی بن امام الہند حضرت صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی

شمس العلماء ثانی ملّا نظام الدین فرنگی محلی حضرت علامہ مفتی نظام الدین حبیبی، تلمیذ خاص حضور مجاہد ملت و پروردہ نعمت

اشرف العلماء حضرت علامہ سید حامد اشرف اشرفی جیلانی کچھوچھوی، بانی دار العلوم محمدیہ، ممبئی

شیخ الاساتذہ سند المحققین حضرت علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رضوی، مدرسہ غوثیہ فیض العلوم، بڑھیا، سدھارتھ نگر، یوپی

حضرت علامہ سید عبد المسجو دوجود القادری ربّانی
سحبان الہند حضرت علامہ ابو الوفا فصیحی غازی پوری
مجاہد دوراں حضرت علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی، سابق ممبر آف پارلیمنٹ
رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری، فاتح جمشید پور و بانی جامعہ حضرت نظام الدین، دہلی
خطیب مشرق، پاسبانِ ملت حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی الہٰ آبادی، مالک وایڈیٹر ماہنامہ پاسبان، الہٰ آباد
پیر طریقت حضرت سیّد انوار اشرف مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی کچھوچھوی
مجاہد سنیت حضرت مولانا قاری عبد القدوس کشمیری، بمبئی، سابق صدر تبلیغ سیرت، مہاراشٹر
خطیب الہند مولانا عبید اللہ خان اعظمی، سابق ممبر آف پارلیمنٹ
حضرت مولانا سید محمد ہاشمی میاں اشرفی جیلانی کچھوچھوی، سابق مرکزی جنرل سیکریٹری، آل انڈیا تبلیغ سیرت
حضرت علامہ حافظ وقاری ومولانا محمد ایوب اشرفی فرزند نسبتی حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی
حضرت مولانا انوار احمد نظامی، مہتمم دار العلوم غریب نواز، الہٰ آباد
حضرت مولانا سید سجاد ظہیر صاحب داناپوری
حضرت علامہ سید رکن الدین اصدق، خانقاہِ اصدقیہ، نالندہ بہار
حضرت علامہ احسان علی باندوی
حضرت علامہ حکیم محمد یونس نظامی الہٰ آباد
حضرت مولانا قاری نعت اللہ حبیبی، خلیفہ حضور مجاہد ملت
حضرت مولانا فضل حق صاحب، دھام نگر، اڑیسہ
حضرت علامہ ابو الوفا فصیحی صاحب غازی پوری
حضرت علامہ شمیم اشرف ازہری حبیبی بن الحاج نعیم اللہ خاں حبیبی، جاگیردار، الہٰ آباد
عارفِ حق حضرت صوفی دولہا خان ٹوپی والے بابا، ممبئی
حضرت علامہ قاری عبد الرب حبیبی مراد آبادی، خلیفہ و پروردہ نعمت حضور مجاہد ملت
محترم الحاج ملّا محمد منیف قادری یار علوی حبیبی، بانی و منیجر مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا وخلیفہ حضور مجاہد ملت
حضرت مولانا عبد الجبار ماہر اعظمی مصباحی حبیبی، خطیب وامام چشتی ہندوستانی مسجد، بائیکلہ، ممبئی
حضرت مولانا قاری محمد نسیم، خطیب وامام وانجہ واڑی مسجد، ماہم شریف
محترم ڈاکٹر اعجاز مدنی صاحب، برہانی کالج، بمبئی، مرید وخلیفہ عاشق خواجہ حضرت مولانا عبد الحق اعظمی ثم اجمیری
حضرت مولانا ڈاکٹر حسن رضا خاں، ایم اے پی ایچ ڈی۔ پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی، بہار

حضرت علامہ محمد فروغ القادری صاحب، لندن
عالی جناب محمد یوسف منہار، سابق سیکریٹری آل انڈیا سنّی جمعیۃ العلماء، بمبئی
حضرت مولانا عبد الوحید صدیقی حبیبی، سابق سجادہ نشین خانقاہِ حبیبیہ دھام نگر، اڑیسہ
محسن ملت الحاج احسان اللہ پہلوان عزیزی، بمبئی
حضرت مولانا عبد القیوم صاحب مرحوم سابق خطیب ناریل واڑی مسجد، بمبئی
مفسر قرآن حضرت علامہ ظہیر الدین قادری رضوی، صدر المدرسین دار العلوم محمدیہ، بمبئی
حضرت علامہ غلام عبد القادر یار علوی، دار العلوم فیض الرسول، براؤں شریف
مفتی سلیم اختر مجددی، دار العلوم غریب نواز، ملاڈ، بمبئی
حضرت مولانا محمد یونس نوری، خطیب و امام قادریہ مسجد، دھاراوی، بمبئی
حضرت مولانا محمد حنیف اعظمی مصباحی عزیزی، دار العلوم محمدیہ، بمبئی
مولانا حافظ شرافت حسین برکاتی، بانی دار العلوم برکاتیہ، جوگیشوری، بمبئی
فخر قوم و ملت محترم خان بہادر سیٹھ، سوناپور، بمبئی۔ سابق خزانچی آل انڈیا تبلیغ سیرت
ڈاکٹر عبد العزیز اورنگ آبادی، سابق چیئرمین وقف بورڈ، مہاراشٹرا اسٹیٹ
حضرت علامہ سید سراج اظہر رضوی، خلیفۃ مفتی اعظم ہند، امام رضا جامع مسجد، پھول گلی، ممبئی۔
حضرت مولانا قاری عبد التواب حبیبی، پکسر اواں، رائے بریلی
حضرت مولانا محمد علی جناح صاحب حبیبی
حضرت علامہ قاری سید مقبول صاحب حبیبی
علامہ نور الدین نظامی الہ آبادی
حافظ سید اطہر علی، ناظم اعلی دار العلوم محمدیہ، بمبئی
عالی جناب محمد شمیم جعفری اشرفی، بمبئی
حضرت علامہ سید تنویر اشرف اشرفی جیلانی
حضرت مولانا قاری غیاث الدین مراد آبادی، سابق خطیب و امام مینارہ مسجد، بمبئی
حضرت مولانا قاری اطہر حسین مظفر پوری، بہار
شمس العلماء حضرت علامہ نظام الدین الہٰ آبادی
حضرت علامہ الحاج جاگیردار نعیم اللہ خان پدر بزرگوار حضرت شمیم اشرف ازہری
سید حیدر امام، بیرسٹر پٹنہ

عالی جناب ڈاکٹر محمد اسمٰعیل صاحب پٹنہ
ایڈوکیٹ جلال شیخ، سابق جنرل سیکریٹری آل انڈیا تبلیغ سیرت
ایڈوکیٹ امیر علی وارثی صاحب پٹنہ
ڈاکٹر مزمل حبیبی الہٰ آبادی
ڈاکٹر سید کمال الدین، وارث وجانشین حضرت ٹوپی والے بابا
عالی جناب الحاج رشید طیب میمن صاحب
ادیب شہیر، رئیس التحریر حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری، مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، بمبئی
حضرت مولانا الحاج ہدایت اللہ خان قادری، نائب مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، ممبئی
حضرت علامہ مفتی محمد محسن رضا قادری رضوی ثقافی، مرکزی جنرل سیکریٹری آل انڈیا تبلیغ سیرت، ممبئی
حضرت علامہ سید شمیم گوہر صاحب، سجادہ نشین خانقاہِ حلیمیہ، الہٰ آباد
حضرت سیّد اسلم میاں وامقی اشرفی جیلانی، ولی عہد خانقاہِ وامقیہ اشرفیہ، بریلی شریف
معین الدین شیخ اجمیری، ممبئی
حضرت علامہ مولانا عاشق القادری عزیز مصباحی، صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت اڑیسہ
حضرت علامہ الحاج مفتی محمد ابراہیم مقبولی، سربراہِ اعلیٰ جامعہ امام احمد رضا، رتنا گیری، کوکن، مہاراشٹر
حضرت مولانا الحاج قمر الزماں مصباحی، سیتامڑھی، بہار
حضرت مولانا محمد آصف جمال قادری، اُستاذ جامعہ امام احمد رضا، رتنا گیری، کوکن، مہاراشٹر
حضرت مولانا الحاج غلام وارث حبیبی الہٰ آبادی
حضرت مولانا الحاج سراج احمد چشتی متینی، ممبئی
حضرت مولانا الحاج خلیل الرحمٰن نوری، ممبئی
حضرت مولانا نور العین اشرفی، ممبئی
حافظ محمد بشیر رضوی، کوسہ، ممبرا، تھانہ
محترم الحاج محمد مستقیم حبیبی، دھاراوی، ممبئی
محمد ارشد جمال قادری حبیبی، ممبئی
محمد ملک الظفر، ممبئی
برکات احمد صدیقی اشرفی، ممبئی
محمد اقبال قریشی، ممبئی

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے حسنِ خدمات کی چند جھلکیاں!

۱۹۵۲ء میں جب شدھی تحریک نے ملک کے متعدد صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لیا، خاص کر بہار کے گوپال گنج، ضلع سازن کے مسلمانوں کو شدھی یعنی مرتد کرلیا گیا تو آل انڈیا تبلیغ سیرت کے نائب صدر مولانا سیّد ظفر سجاد کی نگرانی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کی شاخ بہار نے پوری شدت کے ساتھ میدانِ عمل میں اُتری۔ اور جب گجرات کو اپنی لپیٹ میں لیا تو آل انڈیا تبلیغ سیرت کا وفد حضور مجاہد ملت کی قیادت میں جس میں علامہ سید مظفر حسین کچھوچھوی، علامہ مشتاق احمد نظامی، مولانا احسان علی، مولانا نعمت اللہ حبیبی وغیرہ پر مشتمل مسلسل گجرات میں سر بہ کف رہے، یہاں تک کہ وہ فتنہ سرد پڑا۔

یوپی سپورنا نند کے دورِ وزارت میں پائیونیر (Pioneer) نے توہینِ نبوت کی، تو حضور مجاہد ملت اور ان کی تحریک آل انڈیا تبلیغ سیرت نے اُس وقت تعاقب کیا جب تک یوپی حکومت نے گھٹنے نہ ٹیک دیئے۔

۱۹۵۴ء میں وقف بل، قاضی بل کے تعلق سے آل انڈیا تبلیغ سیرت نے بڑی تاریخی جدو جہد کی، یہاں تک اس مسئلے میں عمائدین ملت کا جو مؤقر وفد دلّی ممبرانِ پارلیمنٹ سے ملنے گیا تھا۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ایک نمائندے کی حیثیت سے حضور مجاہد ملت نے اس میں خصوصی شرکت فرمائی۔

۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸ / مارچ ۱۹۵۴ء کو کلکتہ میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے بڑے تاریخی اجلاس منعقد کیے، جس کی صدارت شیخ الاسلام حضرت علامہ مفتی عبدالقدیر بدایونی نے فرمائی۔ اور پھر مارچ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱/ ۱۹۵۴ء کو انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ میں جو عظیم و تاریخ ساز تبلیغ سیرت کے اجلاس منعقد ہوئے، ان میں پیش پیش وکلاء، ڈاکٹر، پروفیسر، بیرسٹر حضرات تھے۔ ان تاریخی اجلاس نے آل انڈیا تبلیغ سیرت کو عوام و خواص کی دھڑکنوں میں اُتار دیا۔

۲۸/ مئی ۱۹۵۳ء کو فیض آباد اور اجودھیا کے مسلمانوں نے بابری مسجد میں داخلے کے لیے حکومت سے پیشگی دے کر پُرامن معاہدہ کیا۔ جس کے جواب میں پولیس نے مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے ساتھ وحشت و بربریت، ظلم و ستم کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ جس کے تدارک میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے ۸/ جون سے ۱۱/ جون ۱۹۵۴ء تک ہزاری باغ میں مسلسل احتجاجی اجلاس کیے۔ جس میں حضور محدث اعظم ہند، علامہ ارشد القادری، علامہ مظفر حسین کچھوچھوی، علامہ سید ظفر ادیبی، علامہ فصیحی غازی پوری، حضور مجاہد ملت الہٰ آبادی وغیرہ نے شرکت فرمائی۔

۱۹۷۷ء میں ۱۹/ ماہ کے بعد جیل سے نکلنے کے بعد مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے پیش نظر کانگریس پارٹی سے ۸/

نکاتی معاہدہ کیا اور اس کے بعد مسلمانوں سے کانگریس کو ووٹ دینے کی اپیل کی۔

۱۹۷۷ء میں سعودی عرب کے ایک مشہور اخبار "الدعوۃ" کے ذریعے گنبد خضریٰ کو ڈھانے یا ڈھکنے کے لیے ایک تجویز کے خلاف پوری دنیا میں سب سے زیادہ شدید اور ہمہ جہت ردِعمل ہندوستان سے آل انڈیا تبلیغ سیرت نے ہی ظاہر کیا اور اس کے خلاف ایک زبردست تاریخی جلوس اشرف العلماء علامہ سیّد حامد اشرف اشرفی الجیلانی کی قیادت میں نکالا۔ پھر کچھ دنوں بعد ایک اور بڑا جلوس مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں کی قیادت میں نکالا۔ جس کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔

نومبر ۱۹۸۹ء میں میرٹھ، ملیانہ، بھاگل پور، سیتا مڑھی وغیرہ میں مسلمانوں کے اجتماعی قتل ونسل کشی کے خلاف پہلی بار بمبئی بھر کے علمائے اہلِ سنّت آل انڈیا تبلیغ سیرت کے پلیٹ فارم سے حضرت علامہ سید حامد اشرف اشرفی جیلانی کی قیادت میں کانگریس کے خلاف میدانِ عمل میں اُترے اور مرکز سے کانگریس کو بے دخل کرنے میں ایک تاریخی جدوجہد کی۔

۱۹۸۹ء میں علمائے اہلِ سنّت نے اجتماعی طور پر ایک کافی وسیع پیمانے پر ریلیف کمیٹی قائم کر کے اسے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے زیر انتظام کیا۔ جس میں حضرت علامہ سید حامد اشرف اشرفی جیلانی، حضرت علامہ ظہیر الدین خان، مولانا عبدالقدوس کشمیری، مولانا سید سراج اظہر، راقم الحروف (مولانا وارث جمال قادری)، سیٹھ احسان اللہ پہلوان، مولانا قاری غیاث الدین امام مینارہ مسجد، مولانا قاری اطہر حسین مظفر پوری وغیرہ پیش پیش تھے۔ حضرت مولانا ظہیر الدین خان اور دارالعلوم محمدیہ نے اس میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ پہلی بار سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی طرف سے اجتماعی طور پر بڑے پیمانے پر ریلیف تقسیم کی گئی۔

۶ ستمبر ۱۹۹۰ء کو خلیج میں امریکی مداخلت اور سعودی عرب کی ناعاقبت اندیشی کے خلاف ایک بڑا تاریخی مظاہرہ آل انڈیا تبلیغ سیرت نے بمبئی میں کیا۔ جس کو دنیا کے ایک سو بڑے بڑے اخبارات نے پہلے صفحہ پر شائع کیا۔ اور دنیا بھر کی نیوز ایجنسیوں نے اپنے ہر زبان کے نشریے میں اسے جگہ دی۔

۲۰ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو آل انڈیا تبلیغ سیرت نے وائی ایم سی گراؤنڈ بمبئی میں عراق کی حمایت میں ایک عظیم تاریخی کانفرنس بنام "تحفظ حرمین کانفرنس" منعقد کی۔ جس میں بیک وقت عرب و عجم نے شرکت کی۔ بمبئی کی مذہبی تاریخ میں اس طرح کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

۱۹۹۰ء میں وزیر خارجہ آئی کے گجرال اور بغداد حکومت کے معاہدے کے باوجود عراق نے کویت و عراق میں موجود ایک لاکھ ہندوستانیوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا تھا، مگر آل انڈیا تبلیغ سیرت کی کوششوں سے تمام ہندوستانی بخیر اپنے وطن واپس آ گئے۔ اور عراق کو غذائی طبّی امداد دس ہزار ٹن بحری جہاز سے بھیجنے میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کی کوششوں کا دخل ہے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ان کارناموں کے نہ صرف شاہد بلکہ ان تمام کوششوں میں اس وقت کے منسٹر فار اسٹیٹ

ہری کشور سنگھ آج بھی موجود ہیں۔ عراق کی حمایت کے سبب سے پہلی بار سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کی مذہبی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کو عراق کی عالمی اسلامی کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کی بار بار سعادت حاصل ہوئی۔

پہلی بار کسی طاقتور ملک نے ایک مذہبی تنظیم سے کئی معاہدے کیے، جس میں سب سے اہم ''تعلیمی معاہدہ'' تھا، جو حکومت عراق اور آل انڈیا تبلیغ سیرت کے درمیان ہوا۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت ہی کی کوششوں سے آج بغداد کا دروازہ ہندوستان کے سنّی مسلمانوں کے لیے بھی بڑی آسانی کے ساتھ کھل گیا۔ چنانچہ عربی زبان وادب کا جو قحط بارہ سال قبل تھا، وہ آج نہیں ہے۔

پوری دنیا میں عراق کے لیے جو ایثار اور بے دریغ قربانیاں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے پیش کی ہیں، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ چنانچہ آج بھی امداد و تعاون کرنے والوں کی عراقی حکومت کی فہرست میں ہندوستان سے آل انڈیا تبلیغ سیرت ہی کا نام پہلا ہے۔

☑☑☑☑☑☑

آل انڈیا تبلیغ سیرت کی مختصر تاریخ

از مولانا توفیق احسن مصباحی ، اُستاذ جامعہ اشرفیہ مبارک پور

سرزمین بمبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کی مذہبی وسیاسی سرگرمیوں پر گفتگو کرنے سے قبل اس کے قیام کا پس منظر، مقاصد اور ممبئی میں اس کی شاخ کی تاسیس اور اس کے اوّلین صدر حضور مجاہد ملت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن عباسی قادری علیہ الرحمہ (آمد: ۸ رمحرم الحرام ۱۳۲۲ھ/ ۲۱ رمارچ ۱۹۰۴ء دھام نگر، اڑیسہ۔ رخصت: ۶ رجمادی الاولی ۱۴۰۱ھ/ ۱۳ رمارچ ۱۹۸۱ء شہر بمبئی، تدفین: دھام نگر، اڑیسہ) کی حیات کے چند انقلابی گوشوں پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا سانحہ ایک خوں آشام اور المیاتی واقعہ کہا جائے گا، جس میں مسلمانوں کی غالب ترین قوت ہجرت کے نام پر ترکِ وطن کر گئی اور ساڑھے تین کروڑ ہندوستان نہ چھوڑنے والے مسلمانوں پر تقسیم وطن کا الزام ڈال کر ان کی عزت وناموس اور ترقی وعروج کے بقا کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اب حالات یقیناً بدل چکے تھے، متعدد مذہبی تحریکوں کا دائرۂ عمل بھی خالص مذہبی ہو کر رہ گیا تھا۔ مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات پر بھی کوئی بے باکی کے ساتھ بولنے والا نہیں رہ گیا تھا۔ جمعیۃ العلماء ہند جو کانگریس کے اشارۂ ابرو کی پابند تھی، اُس نے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ کی تھی۔ عوام تو عوام، خواص بھی جائے پناہ کی تلاش میں تھے۔ جماعت اہلِ سنّت کے متعدد علما و مشائخ فکری طور پر محسوس کر رہے تھے کہ ایسے رستاخیز ماحول اور روح فرسا حالات میں اہلِ سنّت کی نمائندہ کسی تنظیم کی داغ بیل ڈال دینی چاہیے جو مسلمانوں کے اس نازک ترین صورتِ حال اور ان کے درمیان مسائل میں کوئی مؤثر رول ادا کر سکے۔ انھیں ایّام میں فیض آباد، اُتر پردیش اور اس کے اطراف وجوانب میں مسلسل دینی اجلاس چل رہے تھے۔ خلیفہ و تلمیذِ امام احمد رضا حضرت محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی علیہ الرحمہ پورے جاہ وجلال کے ساتھ رونق افروز تھے۔

۲۶ رمارچ ۱۹۴۹ء کو وہیں پر دردمند دل رکھنے والی ایک جماعت نے آپ سے بطور انٹرویو کچھ سوالات کیے۔ ان سوالات کا حاصل یہ تھا کہ ایسے مخدوش اور پریشان کن حالات میں کسی طویل تنظیم کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کی مسیحائی کا فریضہ انجام دے سکے۔ آپ نے جواب میں فرمایا: ”ہاں! ایک نئی جماعت کی تشکیل کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں۔“ جس وقت آپ نے یہ جملہ ادا کیا تھا، اُس وقت بھی ہندوستان میں متعدد مذہبی تحریکیں موجود تھیں، پھر بھی ایک نئی تنظیم کی ضرورت کا احساس کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدلے ہوئے حالات میں وہ ساری تحریکیں خالص مذہبی دائرۂ عمل تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ مسلمانوں پر ہونے والے مظالم، ان کو درپیش مسائل اور عصری تقاضوں کی ادائیگی میں یہ

جماعتیں ناکام ہیں۔ اس لیے ایک نئی جماعت کی تشکیل ضروری ہے۔ اس نشست میں آپ نے بھر پور حاضر دماغی اور طباعی کے ساتھ نئی جماعت کے قیام کا پس منظر واضح فرما دیا تھا اور وہ جماعت جن خطوط اور خاکوں پر استوار ہوگی اس کے لیے بھی آپ نے اشارہ دے دیا تھا اور کہا تھا کہ ''نئی جماعت کی تشکیل کے جو خطوط اور خاکے میرے ذہن میں ہیں ان میں ہندوستان بھر کے اکابر علمائے دین اور مشائخ کرام سے استصواب ضروری ہے۔ ان کی قیمتی آرا کے ساتھ ہی ان کا عملِ تعاون ضروری ہے۔'' (مولانا وارث جمال قادری، مجلّہ حج کانفرنس نمبر، تبلیغ سیرت ممبئی۔ جون ۲۰۰۲ء، ص: ۷۹)

چناں چہ یہ اہم کام آپ نے سرزمین بمبئی میں منعقد ہونے والی مجالس محرم کے وقت تک مؤخر کر دیا تھا، کیوں کہ اس موقع پر یہاں تقریباً پورے ملک کے علمائے کرام اور مشائخ عظام کی ایک کثیر تعداد موجود ہوتی ہے۔ اس لیے یہ تاریخی اقدام بمبئی میں زیادہ مناسب رہے گا۔ ۱۹۴۹ء میں مجالس محرام الحرام کے موقع پر بمبئی میں اکابر علمائے کرام اور مشائخ طریقت کی اس موضوع پر متعدد نشستیں ہوئیں، کافی غور وخوض اور طویل بحثوں کے بعد علمائے کرام کسی حتمی فیصلے پر اتفاق نہ کر سکے۔ اور اتفاق رائے سے یہ بات سامنے آئی کہ اگلے ہی ماہ عرسِ رضوی بریلی شریف میں یہ اہم مسئلہ اُٹھایا جائے گا۔ چناں چہ حسب وعدہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہٗ کے عرس کے موقع پر بریلی شریف میں شہزادۂ صدر الافاضل حضرت علامہ سید اختصاص الدین نعیمی علیہ الرحمہ کی صدارت میں ہندوستان بھر سے آئے ہوئے علماء ومشائخ اور اصحابِ فضل وکمال کی ایک اہم میٹنگ ہوئی اور طویل بحث ومباحثے کے بعد ۲۵ رصفر المظفر ۱۳۶۹ھ/ ۱۶ ردسمبر ۱۹۴۹ء کو ایک نئی تنظیم بنام ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان بھر سے آئے تمام علما ومشائخ اور اربابِ فکر ونظر نے متفقہ طور پر حضور مجاہد ملت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمہ کو ان کی غیر موجودگی میں مرکزی صدر منتخب کیا۔ اس وقت تین مرکزی سرپرستوں کا بھی انتخاب عمل میں آیا۔ حضور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا نوری، محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی اور ملک العلماء علامہ ظفر الدین بہاری علیہم الرحمہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے سرپرست منتخب ہوئے (حوالہ سابق، ص: ۸۰)

ان کے علاوہ دوسرے عہدے داران کا انتخاب بھی ہوا اور سب کو ان کی ذمے داریاں سونپ دی گئیں۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کا یہ بے حد متحرک کارواں سرکار مجاہد ملت کی قیادت میں پوری تندہی اور جوش وخروش کے ساتھ اپنے مشن میں لگ گیا اور دینی، تنظیمی اور سماجی وسیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا اور بہت تھوڑے عرصے میں جماعت نے کامیابیوں کا پرچم بلند کر دیا۔ مسلمانوں کا اعتماد بحال ہوا اور لوگ جوق در جوق اس کے قریب آنے لگے۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت نے بڑے بڑے جلسوں اور اہم اہم تاریخی کانفرنس کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں بیداری کی لہر دوڑا دی اور ہندی مسلمانوں کا قابل اعتماد ستون بن کر اُبھری۔ حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ کی مجاہدانہ قیادت نے اس کی رگوں میں تازہ لہو دوڑا دیا اور جماعت نے ترقی کے نقطۂ عروج کو پالیا۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں ہزاری باغ (بہار) میں بھی ایک شاندار کانفرنس ہوئی۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں بخشی تالاب، الہٰ آباد میں اسی طرح کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی۔ جماعت نے جو اغراض ومقاصد طے

کیے تھے ان میں بہت حد تک اسے کامیابیاں میسر آئیں۔ حضور مجاہد ملت کی بے پناہ جد و جہد اور حیران کن مالی قربانیوں کی بدولت ملک کے مختلف حصوں میں دینی مدارس، مکاتب، مساجد اور اسلامی سینٹرز بڑی تعداد میں قائم ہوئے، غیر آباد مسجدیں آباد ہوئیں، لائبریریاں اور اشاعتی اِدارے قائم ہوئے۔ ان ہی کاموں کے لیے اہم اہم منصوبے تیار ہوئے اور ان کے مطابق عمل درآمد کیا گیا۔

مولانا سید آلِ رسول قدسی مصباحی لکھتے ہیں:

"حضور مجاہد ملت نے جہاں قوم مسلم کے اندر مجاہدانہ عزم وحوصلہ بخشنے کے لیے "تحریک خاکسارانِ حق" (۱۹۷۲ء) جیسی عظیم تنظیم عطا کی، وہیں آپ نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور ان کی عاقبت سنوارنے کے لیے "آل انڈیا تبلیغ سیرت" جیسی پاکیزہ تحریک بھی عنایت کی۔ اس کے اغراض ومقاصد یہ تھے کہ مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کی جائے، جن زبانوں میں اسلامیات کے ذخائر موجود ہیں ان کی بقا کی تدبیر کی جائے، مدارسِ اسلامیہ کی ترقی کے لیے سعیِ بلیغ کی جائے اور تمام مدارسِ اسلامیہ کے مابین اتحاد واتفاق کی خوش گوار فضا قائم کی جائے، اوران کے نصابِ تعلیم میں یکسانیت رکھی جائے، مساجد، مقابر اور قبرستانوں کے تحفظ وترقی کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں، پورے ہندوستان میں سنیت کی اشاعت کرنے کے ساتھ ساتھ جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کی جائیں۔"

(حضور مجاہد ملت کا گوشۂ حیات، مطبوعہ آل انڈیا سنّی تبلیغی جماعت، ممبئی ۲۰۰۵ء، ص:۴۵)

جب بھی تبلیغ سیرت کے زیر اہتمام کوئی کانفرنس یا کوئی جلسہ منعقد ہوتا وقت کے جید اور مستند علما و مشائخ وارباب کمال کا مقدس قافلہ پورے جاہ وجلال کے ساتھ رونق افروز ہوتا۔ اسی زمانے میں خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی نے اپنے آقائے نعمت حضور مجاہد ملت کی رضا کے لیے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور اپنی تحریر وتقریر میں اسی کے گن گاتے تھے اور ہر لمحہ اس کے دائرۂ عمل کو وسیع تر کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۵۳ء میں الہٰ آباد سے ایک معیاری مجلّہ "ماہ نامہ پاسبان" جاری کیا اور اسے آل انڈیا تبلیغ سیرت کا آرگن اور ترجمان بنایا۔

حضور مجاہد ملت علیہ الرحمہ نے تبلیغ سیرت کے لیے خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ آپ کی تقریریں انتہائی جامع اور بے باکی اور حقائق سے پُر ہوا کرتی تھیں۔ آپ اربابِ اقتدار کے مظالم کے خلاف کھل کر بولتے تھے۔ جس کا خمیازہ بھی آپ کو بھگتنا پڑا اور جیل کی سلاخوں میں بند بھی کیا گیا۔ آپ کو اربابِ اقتدار نے جتنا ستایا، جتنی گرفتاریاں اور جتنے مقدمات آپ پر قائم کیے گئے کم از کم ہندوستان کی جمہوری تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

پروفیسر مسعود احمد نقش بندی لکھتے ہیں:

"مجاہد ملت مدرس بھی تھے، مقرر بھی تھے، مناظر بھی تھے، وہ اخلاقِ عالیہ کا پیکر تھے۔ علم وفضل میں یگانہ، تقویٰ شعاری، پابندیِ سنّت، پابندیِ نماز، مدینہ منورہ سے والہانہ محبت، احترامِ سادات، محافل میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُلفت، تمنائے بقیع ان کی خوبیاں تھیں۔ سیرت وکردار میں بے مثال، عفوو درگزر، قناعت پسند، متواضع، غریبوں کے دست

گیر وغم خوار، ملت کے دردمند، خورد نواز، متحمل مزاج، سراپا اخلاص، پیکر تسلیم ورضا، علما کا ادب کرنے والے، اُستاذ زادوں کی تعظیم کرنے والے، حق گوئی وبے باکی میں یگانہ روزگار، اشداء علی الکفّار رحماء بینھم کی تفسیر، قیادت کی تو اس شان سے کہ حق گوئی کے جرم میں آٹھ بار قید وبند میں رہے، مگر ذرا قدم نہ لڑکھڑائے، ذرا تزلزل نہ آیا، کہ

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی'' (سہ ماہی تبلیغ سیرت، مجاہد ملت نمبر، کولکاتہ، مئی ۲۰۰۰ء، ص:۱۶)

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم مصباحی خامہ فرسا ہیں:

''حضور مجاہد ملت اگر چہ بیسویں صدی کے فرد تھے، مگر ان کی نظر مستقبل پر تھی۔ وہ ماضی سے سبق لے کر حال کی روشنی میں مستقبل کا تانا بانا درست کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے، اس لیے ہر دل میں ان کی قدر ومنزلت تھی اور جہانِ سنّیت میں ان کا قد بہت بلند تھا۔'' (سہ ماہی تبلیغ سیرت، مجاہد ملت نمبر، کولکاتا، مئی ۲۰۰۰ء، ص:۱۳۵)

۲۱۔ ۲۲ر جنوری ۱۹۵۶ء کو تبلیغ سیرت کے غازی پور کے جلسے کے بعد ۲۔ ۲۷ر مئی ۱۹۵۶ء کو انجمن اسلامی تقریبات سلطان پور کے سالانہ اجلاس میں مجاہد ملت نے اپنے چشم کشا اور مبنی بر حقیقت خطاب میں مسلمانوں کے تئیں حکومتِ وقت کے جانب دارانہ رویے کی قلعی کھول کر رکھ دی تھی۔ اسی تقریر کے متن کو بنیاد بنا کر سلطان پور میں آپ پر مقدمہ دائر کیا گیا اور یہی متن خفیہ محکمہ کے حوالے کیا گیا ۲۵ر مئی ۱۹۵۷ء کو سلطان پور سیشن کورٹ سے ایک سال قید بامشقت اور پانچ سو روپے جرمانہ کا فیصلہ سنایا گیا۔ اسی تقریر میں ایک مقام پر آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''تبلیغ سیرت نام کی یہ جماعت آپ کے لیے قائم کی گئی ہے۔ یہ اہلِ سنّت کی ایک جماعت ہے، غیر سنّی اس کا ممبر نہیں ہوسکتا۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ ہر اُس شخص کی حفاظت کے لیے ہر طرح لڑے گی اور اس کی مدد کرے گی جو اپنے کو مسلمان کہتا ہے اور ضرورت پڑے تو اس کے لیے حکومت سے بھی لڑے گی۔ ہماری عبادت کی جگہوں کی حفاظت ہونی چاہیے اور قرآن کی توہین نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے یہ جماعت مسلمانوں کو منظم کرے گی اور ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار کرے گی۔ قرآن کی توہین نہ ہونے پائے، اس کے لیے مسلمانوں کو اپنا سب کچھ قربان کر دینا چاہیے۔ حکومت قرآن کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ پنڈت جواہر لال نہرو یہ دعویٰ کرنا چھوڑ دیں کہ ہم مذہب کے ٹھیکے دار ہیں اور تمام مذہبوں کو یکساں دیکھتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے اور دھوکا ہے۔ مسلمانوں کو اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ مسلمانو! اگر تم لوگ اس دھوکے میں پڑ گئے تو تم لوگ مٹ جاؤ گے اور برباد ہو جاؤ گے۔ ہم اور کچھ نہیں چاہتے ہیں، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا اسلام زندہ رہے، اسی لیے مسلمان اس دنیا میں آیا ہے۔'' (سہ ماہی تبلیغ سیرت، مجاہد ملت نمبر، کولکاتا، مئی ۲۰۰۰ء، ص:۹۵،۹۶)

اللہ عزوجل نے آپ کو مضبوط قوتِ ارادی اور عزم محکم عطا فرمایا تھا کہ کبھی بھی آپ نے اپنی مذہبی پالیسی میں لچک نہ پیدا ہونے دی۔ اگر چہ ایک وقت میں اس جماعت پر عدم مقبولیت اور زوال کا سایہ منڈلایا اور عملاً اس میں انحطاط آیا، تاہم ملک کے متعدد صوبوں میں اس کا وجود برقرار رہا اور پھر اس نے دورِ عروج کی طرف ایک قدم بڑھایا۔

تاج الشریعہ علامہ مفتی اختر رضا خان ازہری اپنے عربی شعر میں مجاہد ملت کی مجاہدانہ قیادت کو سراہتے ہوئے رقم

طراز ہیں:

فاق المجاهدین هٰذا المجاهد　　　　هٰذا الفتیٰ هذا کم شهد المشاهد

مولانا محمد میکائیل ضیائی اس کا منظوم ترجمہ یوں کرتے ہیں:

ہر مجاہد پر یہ سبقت لے گئے ، ہر اِک ہے دنگ
ان کی ہمت دیتے ہیں میدانِ جنگ

آل انڈیا تبلیغ سیرت، شاخ بمبئی کا قیام:

سرزمین بمبئی میں اہلِ سنت و جماعت کی مرکزی تنظیم آل انڈیا سنّی جمعیۃ العلماء اپنے قائد و سالار حضور سید العلماء سید شاہ آلِ مصطفیٰ قادری مارہروی علیہ الرحمہ کی قیادت و سربراہی میں کافی سرگرم تھی اور سچ پوچھیے تو بمبئی بھر کے مسلمانوں کی یہی ایک تنظیم تھی کہ اس وقت بمبئی صرف آل مصطفیٰ کی تھی، مگر حضرت کے وصال کے بعد سنّی جمعیۃ العلماء اپنی سابقہ عظمت برقرار نہ رکھ سکی۔ پھر آگے چل کر کچھ حالات بھی ایسے بنے کہ بمبئی آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام اہلِ سنت کی ضرورت بن گیا اور مشہور درویش حضرت ٹوپی والا بابا کی سربراہی میں ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ۱۹۷۸ء کے آخری عشرے میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کا قیام عمل میں آیا اور چمنا بوچر اسٹریٹ بمبئی ۳ میں ۲۴؍ربیع النور ۱۳۹۸ھ مطابق ۴؍اپریل ۱۹۷۸ء کو اس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ نے اس تاریخی اجلاس میں پہلا خطاب فرمایا اور آل انڈیا تبلیغ سیرت کی خدمات اور حضور مجاہد ملت کے عظیم کارناموں کو آپ نے مفصّلاً بیان فرمایا۔ جو بعد میں اس جماعت کی خدمات کا ایک اہم دستاویز بن گیا۔

دوسرا اجلاس انجمن آفتابِ رسالت، کماٹی پورہ، پانچویں گلی بمبئی ۸ محمد حسین پھول والے کے تعاون سے منعقد ہوا۔ جس میں حضرت مولانا احسان علی باندوی اور خود حضور مجاہد ملت کا خطاب ہوا۔ اس جلسے میں تبلیغ سیرت کی پرچم کشائی بھی ہوئی اور تحریک خاکسارانِ حق کا پریڈ بھی۔ (مجلّہ حج کانفرنس، مطبوعہ بمبئی ۲۰۰۰، ص:۸۷)

یہ وہ نقطۂ آغاز تھا جو آل انڈیا تبلیغ سیرت کی عروس البلاد میں مذہبی وملّی سرگرمیوں کا سبب بنا۔ حبیب منزل، ڈِممکر روڈ بمبئی ۸ میں اس جماعت کا مرکزی دفتر قائم کیا گیا۔ مولانا وارث جمال قادری (جو تبلیغ سیرت شاخ بمبئی کے پہلے نائب ناظم نشر و اشاعت رہے اور بعد میں ناظم نشر و اشاعت بنے) نے بمبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بمبئی میں قیام کو تبلیغ سیرت کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا ہے۔ بعد میں قادری صاحب کو تبلیغ سیرت کا صدر نامزد کیا گیا۔

بمبئی، بھیونڈی مضافات کے تقریباً تمام علمائے کرام، ائمۂ مساجد اور سنّی تنظیموں نے تبلیغ سیرت کا والہانہ استقبال کیا اور بھرپور تعاون سے نوازا۔ ۱۹۵۲ء میں جب شدّھی تحریک نے ملک کے متعدد صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لیا، خاص کر بہار اور گجرات کے اضلاع میں اس فتنے نے سر اُبھارا تو تبلیغ سیرت کے نمائندوں نے پوری شدت کے ساتھ میدانِ عمل میں

اُتر کر اس آتش فشاں کو سرد کیا۔ مارچ ۱۹۵۴ء کو کلکتہ میں تبلیغ سیرت نے بڑا تاریخی اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت شیخ الاسلام حضرت علامہ مفتی عبدالقدیر بدایونی نے فرمائی اور اپریل ۱۹۵۴ء میں انجمن اسلامیہ ہال، پٹنہ میں عظیم الشان اجلاس منعقد ہوئے۔ ۱۹۸۹ء میں علمائے اہلِ سنّت نے اجتماعی طور پر تبلیغ سیرت کے زیر انتظام وسیع پیمانے پر ایک ریلیف کمیٹی قائم کی اور بڑے پیمانے پر ریلیف تقسیم کی گئی۔ ۶/ دسمبر ۱۹۹۰ء کو خلیج میں امریکی مداخلت اور سعودی عرب کی ناعاقبت اندیشی کے خلاف ایک بڑا تاریخی مظاہرہ آل انڈیا تبلیغ سیرت نے بمبئی میں کیا، جس کو دنیا کے ایک سو کے قریب بڑے اخبارات نے اوّل صفحہ پر جگہ دی اور دنیا بھر کی نیوز ایجنسیوں نے اپنی ہر زبان کی نشریات میں عام کیا۔ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۹۰ کو آل انڈیا تبلیغ سیرت نے وائی ایم سی گراؤنڈ بمبئی میں عراق کی حمایت میں ایک عظیم تاریخی کانفرنس بنام ''تحفظ حرمین کانفرنس'' منعقد کی، جس میں بیک وقت عرب وعجم نے شرکت کی۔ بمبئی کی مذہبی تاریخ میں اس طرح کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ (مجلہ حج کانفرنس نمبر، مطبوعہ بمبئی ۲۰۰۲ء، ص:۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸)

یہ وہ چند نمایاں اور تاریخی خدمات تھیں جو ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے بطور بیان کی گئیں ورنہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کی جھولی میں قوم وملت اور دین ومذہب کی بے شمار خدمتیں ہیں، جو تاریخ کے اوراق کی زینت ہیں اور جن کی دھمک آج بھی محسوس کی جاتی ہے۔ نشریاتی میدان میں بھی آل انڈیا تبلیغ سیرت کی تاریخی خدمات قطعاً ناقابلِ فراموش ہیں۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت نے مولانا وارث جمال قادری کی سربراہی میں جہاں ۲۰/ دسمبر ۱۹۹۱ء کو مستان تالاب بمبئی ۸ میں عظیم الشان تاریخی ''القدس کانفرنس'' منعقد کی، وہیں اکتوبر ۲۰۰۲ء میں اپنی روایتِ دیرینہ کو برقرار رکھتے ہوئے وسیع پیمانے پر تاریخ ساز ''حج کانفرنس'' کا انعقاد کر چکی ہے اور دوسو صفحات پر مشتمل ضخیم حج کانفرنس نمبر بھی شائع کیا ہے، جو اس وقت راقم کے پیش نگاہ ہے۔ بمبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے زیر اہتمام جو کتب ورسائل اشاعت پذیر ہوئے ان میں نمایاں نام، چشم و چراغِ خاندانِ برکات حضرت علامہ شاہ سید ابوالحسین نوری مارہروی علیہ الرحمہ کی کتاب ''سراج العوارف فی الوصایا والمعارف'' کا اردو ترجمہ (مترجم امین ملت ڈاکٹر سید محمد امین میاں برکاتی) ہے۔ اس کے علاوہ ''تبلیغ سیرت۔ ایک تاریخ'' (مولانا وارث جمال قادری)، احترامِ سادات اور امام احمد رضا (سید صابر حسین شاہ بخاری)، امام المسلمین امام اعظم ابوحنیفہ (مولانا وارث جمال قادری)، مجلہ حج کانفرنس (مولانا وارث جمال قادری) کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد کتب ورسائل اور ہیں جن کی تفصیل راقم کو دستیاب نہ ہوسکی۔

غرض کہ سرزمین بمبئی میں جہاں آل انڈیا تبلیغ سیرت عظیم الشان جلسوں اور کانفرنسوں کے ذریعے مذہب وملت کی خدمت کا عظیم ریکارڈ رکھتی ہے، وہیں کتب ورسائل کی اشاعت وطباعت میں بھی اس کے کارنامے آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

☑☑☑☑☑☑

سعودیہ کے خلاف علمائے حق کا فتویٰ

ما هوحكم الشريعة فی المسئلة الأتیہ۔ ايها العلماء الكرام والمفتيان العظام ان
يكفرون المسلمين ولا يزالون قائمين باهلاک المسلمين او بالرضاء عن استهلاكهم قال
ابن عابدين الشامی رحمة الله تعالٰی عليہ فی رد المحتار كما وقع فی زماننا فی اتـ
الذين خرجوا من نجد و تغلبوا على الحرمين الشريفين وكانوا ينتحلون مذہب الحنابلـ
اعتقدوا انهم هم المسلمون وان من خالف اعتقادهم مشركون و استباحوا بذٰلک قتل
السنة و قتل علماء هم وقال العلامہ احمد الصاوی رحمة الله تعالیٰ فی حاشية تفسيـ
الخوارج الذين يعرفون تاويل الكتاب والسنة و يستحلون بذٰلک دماء المسلمين واموالـ
هو مشابہ الآن فی نظائرهم وهم فرقة بارض الحجاز يقال لهم الوہابية۔ وما يدل
الوهابية كفروا اهل العراق قول عبدالرحمٰن بن حسن وهو حفيد الشيخ النجدی محـ
عبدالوہاب فی قرة عيون الموحدين، ان الشيخ عبدالقادر الٰہ اهل العراق۔

وان العائلة السعودية النجدية الحاكمۃ الآن على الحجاز من الوهابيہ۔

و تغلب هٰؤلاء على الحجاز و كفروا اهل الحرمين من اهل السنة واستباحوا قتلهـ
يزالون ينتظرون الفرصة لاهلاک المومنين و استهلاكهم۔

وان الملک فهد ا ملک العربية السعودية المستغاث بعساكر الولايات المتحده الامـ
حلفائها من النصارىٰ واليهود لتغريب العراق و اهلاک والعراقيين فی ذی المستـ
لتحرير الكويت و اعادة الامارة الكويتية الىٰ اخيہ۔

فخرب عساكر الولايات المتحده و حلفائها العراق و قتلوا العراقيين و ضرب مجـ
الامم المتحده وهٰذا المجلس فی الحقيقة لعبۃالاجماع كآية من الكتاب او حديث مـ
وجوب العلمل والعلم بہٖ فيكفر جاحده فی الانكار وفی كشف الاسرار للامام عبد
البخاری "يحكم بكفر من انكر اصل الاجماع۔ بان قال ليس الاجماع بحجة" وفی الفصـ
فی اصول الشرائع "يكفر جاحد حجية الاجماع مطلقا وهو المذہب عند مشايخنا"

الاصول للعلامة المولیٰ خسروا'' یکفر منکر حجیة الاجماع مطلقا هو المختار عند مش
والثالث انهم یعتقدون انهم بهم المسلمون وان من خالف اعتقادهم مشرکون
یقولون هٰذا بافواههم فقط سبا بابل یعتقدونهم مشرکین اعتقاد الانهم یستبیحون بذالک
اهل السنة وقتل علماء هم (کما اخبر العلامّة السید ابن عابدین الشامی رحمة ا
ویستحلون بذٰلک دماء المسلمین و اموالهم (کما رواه العلامة احمد الصاوی رحمة الله
قالوه سبابا فقط لما استباحوا بذٰلک و قتلهم ولا استحلوا دماءهم و اموالهم وقد قال النب
الله تعالٰی علیه وسلم ''لا یرمی رجل رجلا بالفسوق ولا یرمیه بالکفر الا ارقدت علیه
صاحبه کذٰلک'' کما فی الحدیث الصحیح البخاری۔
وما قال امام الوهابیة النجدیة فی ''قرة عیون الموحدین'' ان الشیخ عبدالقادر
العراق، فهو کذب محض و افتراء خالص و بهتان عظیم وما صدر منه بهٰذا القول
بضضه و عناده لاولیاء الله تعالٰی المخلصین وسیّما للشیخ العظیم المجمع بین الاٰفاق
و قربه من الله تعالٰی۔ وقد قال الله تعالٰی فی امثالهم ''قد برت البغضاء من افواههم
صدورهم اکبر''۔ ۔ وقد جاء فی غیر ما حدیث قال الله تعالٰی علٰی لسان حبیبه صلی الل
وسلم ''مَن عادیٰ لی ولیا فقد اذنتهٗ بالحرب۔''
ولا شکّ ان اهل العراق بریئون من هذا البهتاج الصریح والافترا القبیح لانهم م
للشیخ رحمة الله تعالٰی هٰذا القول الباطل۔ بل ما قالوا قولا فقط یلزم منهٗ انهٗ اٰلهَهُمْ وم
فعلاً یدل علٰی ان الشیخ رحمة الله الٰه اهل العراق۔۔ لا الٰه الا الله محمد رسول الله۔
احتیال لجواز تکفیر اهل العراق و تخریب بلادهم و امصاهم و استباحة دماءهم و
والحق ان اهل العراق یتوسلون به الٰی ربهم فی قضاء حاجاتهم و یستمدون منه و یس
عند نزول البلاء علیهم معتقدین ان الشیخ رحمة الله تعالٰی و رضی عنه مظهر عون
هٰذا النوع من التوسل والاستمداد والاستغاثة جائز بلا ریب لا مانع منه شرعا ولا ع
یشهدهٗ الاحادیث النبویة والتفاسیر المعتبره الا ان الوهابیة النجدیة تزعم ان الاس
والاستعانة بغیر الله تعالٰی شرک خالص ولو سلم هٰذا اعلیٰ سبیل الفرض فکیف استغ
العربیة السعودیة فهد بعساکرالولایات المتحدة الامریکة وحلفائها من النصارٰی وال
وهم اعداء الله تعالٰی المغضوب علیهم والضالین لتخریب العراق و اهلاک العراقیین
جمیع الوهابیة النجدیة و رضوا به فلو کانت الاستعانة والاستغاثة باولیاء الله تعال

لكانت الوهابية النجدية مشركين مرتدين بسبب استعانتهم باعداء الله تعالٰے من ا
والنصارٰی علی حسب اعتقادهم من لعب اتحاد الولايات والامريكية حصارًا جائر ا
يودی الٰی اهلاک العراقيين الی الآن مع ان العراق قد استرجع من الكويت ولا
السعودية والملک فهد علٰی استمرار هٰذا الحصار الظالم فانهم راضون عن استهلاک
كيف لا يرضون عن هٰذا؟ قد كفروالوهابية اهل العراق وقال فيهم امامهم عبد الرح
حسن۔ ان الشيخ عبدالقادر الہ اهل العراق۔

ما هو الحكم لهؤلاءِ السعودية النجدية؟ اهم يكفرون ام لا؟

المستفتی

محمدوارث جمال قادری

نائب رئيس عام جمعية تبليغ السيرة لعموم الهند

حبيب منزل، شارع دمتمكر، ناغباره، بومبائی ٨

بسم الله الرحمٰن الرحيم۔ والحمدلله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام علٰی حبيبہ
الاولين والآخرين وعلٰ الٰہ وصحبہ اجمعين الٰی يوم الدين۔

الجواب : اللهم هداية الحق والصواب لا شکّ ان الوهابية النجدية بسبب تكفير
الامة سواهم و بسبب اعتقاداتهم الباطة يرجع عليهم الكفر من وجوه كثيترة عديدةٍ وقد
بہ العلماء الاعلام ولفقهاء العظام۔ الاوّل ان الوهابية النجدية يثبتون لله تعالٰی المكان
كما فی الرسالة السماة بالاحتواء علٰی مسئلة الاستواء لامام الوهابية النواب صديق ح
البوفالی وغيرها من رسائل عمائدين الوهابين وقد صرّخ العلماء الاعلام انّ اثبات
تعالٰی كفره بلا ارتياب كما فی المجلد الخامس من البحر الرائق علی صفحة ١٢٩ يك
ان يفعل الله فعلاً لا حكمہ فيہ و باثبات المكان بِهِ تعالٰی۔

وقال فی فتاوٰی قاضی خاں يكون كفر الان الله تعالٰی منزةٌ عن المكان۔ (فی ف
خاں ، المجلد الرابع ص ٤٣٠، و صرّح فی المجلد الثانی من الفتاوٰی الهندية، ص
باثبات المكان لله تعالٰی۔" وفی المجلد الثانی من جامع الفصولين قاتلا عن الزخيرة۔ قا
فی السماء عالم لو اراد بہ المكان كفر وهٰكذا صرّح كثير من الايمة بتكفير من اثبت
كما قال الامام العلامة ابن حجر المكی فی رسالة الاعلام بقواطع الاسلام بعد نقل كلا
حجة الاسلام الغزالی رحمہ المولٰی المنعام "وهٰذا كما تریٰ ظاهر فی تكفير القائلين با

فیہ فی فصل الکفر المتفق علیہ ''او شبہہ تعالٰی بشئی او وصفہ بالمکان او الجهات
ینکرون الاجماع کما فی ''عرف الجاری'' وغیرھا من رسائل النواب البوفالی۔
وقد صرح الایمۃ الکرام والفقهاء العظام ان حجیۃ الاجماع عمن ضروریات الد
من انکر الاجماع مطلقا فهو کافر۔ کما فی المواقف للعلامۃ القاضی عضد الدین
للعلامۃ السید الشریف علی الجرجانی ''کون الاجماع حجۃ قطیعۃ معلوم بالضرورۃ من
وفی مسلم الثبوت و شرحہ فواتح الرحموت۔ الاجماع حجۃ قطعا ویفید العلم الجازم ع
اھل القبلۃ ولا یعتد بشر ذمۃ من الحمقاء الخوارج والروافض لانهم حادثون بعد ا
یتشککون فی ضروریات الدین وفی اصول الامام فخر الاسلام البزدوی ''فصارَ و
المذکورۃ نبذ من الوجوہ العدیدۃ الکثیرۃ التی بها یرجع الکفر علٰی الوھابیۃ النجدیۃ
الوجوہ المذکورۃ ولوجوہ شتی غیرھا اشارت بل صرحت الفقهاء الکرام بتکفیر
النجدیۃ۔ ۔ ۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہٗ اتم واحکم۔۔۔

کتبہ: محمد قدرۃ اللہ الرضوی غفرلہٗ المولی القوی
دارالافتاء فیض الرسول، ببراؤں شریف من مضافات سدارۃ نغر، یوفی (الهند)
۲۸؍ من شهر جمادی الأخریٰ ۱۴۱۲ ؁ من الهجرۃ النبویۃ علٰی صاحبها الف ا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

حضرات علمائے کرام ومفتیانِ عظام مسئلہ ذیل میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ فرقہ وہابیہ مسلمانوں کو کافر قرار دیتا ہے اور وہ لوگ (وہابی) مسلسل مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہیں یا ان کی ہلاکت سے خوش ہیں۔ علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ تعالی علیہ نے ردّالمحتار میں (وہابیوں سے متعلق) فرمایا کہ ''جیسا کہ ہمارے زمانے میں ابن عبدالوہاب نجدی کے ان پیروکاروں سے ظہور میں آیا، جنھوں نے نجد سے خروج کرکے حرمین شریفین پر غاصبانہ قبضہ جمالیا۔ اور وہ لوگ اپنے آپ کو حنبلی ظاہر کرتے تھے، حالانکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ صرف وہی مسلمان ہیں اور جو بھی ان کے عقیدے کے خلاف ہیں وہ مشرک ہیں اور صرف اسی بنیاد پر ان ظالموں نے اہلِ سنّت اور ان کے علماء کا قتلِ عام کیا۔''

اور علامہ احمد صاوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے تفسیر جلالین کے حاشیہ میں فرمایا کہ ''وہ خارجی لوگ جو قرآن وحدیث کے مطالب میں تحریفیں کرتے ہیں اور اس کی بنیاد پر مسلمانوں کا خون اور ان کے اموال کو اپنے لیے حلال قرار دیتے ہیں، جیسا کہ اس وقت ان کے نظائر وامثال میں دیکھا جارہا ہے اور یہ سرزمین حجاز پر غاصبانہ قبضہ کرلینے والا وہ فرقہ ہے جسے وہابیہ کہا جاتا ہے۔

اور اس کا ثبوت کہ وہابیوں نے اہلِ عراق کو کافر قرار دیا ہے۔ ''قرۃ عیون الموحدین'' نامی کتاب میں شیخ نجدی محمد

بن عبدالوہاب کے حفید عبدالرحمن بن حسن کا یہ قول ہے کہ "ان الشیخ عبدالقادر اِلٰہٌ اھل العراق" یعنی شیخ عبدالقادر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اہلِ عراق کے معبود ہیں۔ (معاذ اللہ)

اور سعودی نجدی خاندان جو اس وقت حجاز پر حکمراں ہے، وہابی ہے۔

ان لوگوں نے حجاز پر غاصبانہ قبضہ کر کے حرمین کے سنیوں کو کافر قرار دے دیا اور ان کا قتل عام کیا۔ اور وہ لوگ مسلسل ایمان والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور تباہ و برباد کرنے کے لیے موقع کی تاک میں لگے رہتے ہیں۔

اور سعودی عرب کے حکمراں شاہ فہد نے کویت کو آزاد کرانے اور کویتی حکومت اپنے بھائی کو واپس کیے جانے کے بہانے عراق کو ویران اور باشندگانِ عراق کا وجود صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے امریکہ اور اس کے حلیف، دوسرے یہود و نصاریٰ کی فوجوں سے مدد طلب کی۔ چنانچہ اتحادیوں اور ان کی حلیف فوجوں نے مل جل کر عراق کو تباہ و برباد اور باشندگانِ عراق کو قتل و غارت کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ اور اقوام متحدہ کی امن کمیٹی جو درحقیقت امریکی حکومت کی کٹھ پتلی ہے اس نے عراق کی ظالمانہ ناکہ بندی کر دی، جو لگاتار اب تک باشندگانِ عراق کی تباہی کا باعث بنی ہوئی ہے باوجودیکہ عراق کویت چھوڑ کر واپس لوٹ چکا ہے، پھر بھی سعودی حکومت اور شاہ فہد اس ظالمانہ ناکہ بندی پر معترض نہیں۔ کیوں کہ وہ اہلِ عراق کی بربادی و ہلاکت سے خوش ہیں اور کیوں نہ خوش ہوں جب کہ وہابیہ نے اہلِ عراق کو کافر قرار دے دیا ہے اور ان کے بارے میں امام الوہابیہ عبدالرحمٰن بن حسن نے یہاں تک لکھ مارا کہ "شیخ عبدالقادر (جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) باشندگانِ عراق کے معبود اور ان کے خدا ہیں۔" (معاذ اللہ تعالیٰ)

ان سعودی نجدیوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ ان کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟

المستفتی:

محمد وارث جمال قادری

نائب صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، حبیب منزل، ڈمٹمکر روڈ، ناگپاڑہ، بمبئی ۸۔ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

والحمدللہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علٰی حبیبہ سید الاولین والآخرین وعلی آلہ وصحبہ اجمعین الٰی یوم الدین۔

الجواب: اللھم ھدایۃ الحق والصواب۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نجدی وہابیوں پر اپنے سوا پوری اُمت مسلمہ کو کافر قرار دینے اور باطل عقائد رکھنے کے باعث بہت ساری وجہوں سے کفر عائد ہوتا ہے، جس کی تصریح علمائے اعلام اور فقہائے عظام نے فرمائی ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ نجدی وہابی اللہ تعالیٰ کے لیے مکان اور جہتیں ثابت کرتے ہیں جیسا کہ امام الوہابیہ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کے الاحتواء علی مسئلۃ الاستواء نامی رسالہ اور دیگر اکابر وہابیہ کے رسائل میں ہے۔

حالانکہ اکابر علماء نے اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنا بلاشبہ کفر ہے۔ جیسا کہ بحر الرائق کی جلد پنجم صفحہ ۱۲۹ پر ہے کہ "ایسا کہنے والے کو کافر قرار دیا جائے گا کہ یہ جائز ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسا کوئی کام کرے جس میں کوئی حکمت نہ ہو اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنے پر بھی تکفیر کی جائے گی۔"

اور فتاویٰ قاضی خاں، (ج ۴، صفحہ ۴۳۰) میں فرمایا کہ "(اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنا) کفر ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مکان سے منزّہ ہے۔" اور فتاویٰ ہندیہ (ج ۲، صفحہ ۱۲۹) پر تصریح فرمائی کہ "اللہ تعالیٰ کے لیے مکان ثابت کرنے پر تکفیر کی جائے گی۔"

اور جامع الفصولین جلد ثانی میں ذخیرہ سے نقل کرتے ہوئے فرمایا کہ "کسی نے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں جان رہا ہے اگر اس قول سے مکان کا ارادہ کیا (یعنی یہ سوچ کر کہا کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں متمکن اور موجود ہے، اسے خبر ہے) تو ایسے شخص کو کافر قرار دیا جائے گا۔"

اور اسی طرح بہت سے ائمہ نے ان لوگوں کی تکفیر بھی واضح طور پر کی ہے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے جہت ثابت کی ہے۔

جیسا کہ امام علامہ ابن حجر مکی علیہ الرحمہ نے اپنے رسالۂ مبارکہ "**الاعلام بقواطع الاسلام**" میں امام حجۃ الاسلام غزالی رحمہ المولیٰ المتعام کا قول نقل فرمانے کے بعد تحریر فرمایا کہ "یہ چیز جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو قائلین جہت کی تکفیر کے معاملہ میں بالکل واضح ہے۔"

نیز اسی رسالہ میں کفر متفق علیہ کی فصل میں ہے کہ "اللہ تعالیٰ کو کسی چیز سے تشبیہ دی یا اس کے لیے مکان یا جہات ثابت کیں" (یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے مکان یا جہات ثابت کرنا باتفاقِ علماء وفقہا کفر ہے)

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہابی اجماع کا انکار کرتے ہیں، جیسا کہ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی کے رسالہ "عرف الجاری" وغیرہا میں ہے۔

جبکہ ائمہ کرام اور فقہائے عظام نے تصریح فرمائی ہے کہ اجماع کا حجت ہونا ضروریاتِ دین میں سے ہے اور اس کی بھی صراحت فرمائی ہے کہ جو مطلقاً اجماع کا منکر ہے وہ کافر ہے۔

جیسا کہ علامہ قاضی عضد الدین کی مواقف اور علامہ سید شریف علی کی شرح مواقف میں ہے کہ "اجماع کا حجتِ قطعیہ ہونا یقینی طور پر ضروریاتِ دین میں سے ہے۔" اور مسلّم الثبوت نیز اس کی شرح فواتح الرحموت میں ہے کہ "اجماع یقینی طور پر حجت ہے اور سبھی اہلِ قبلہ کے نزدیک اس سے علمِ یقینی حاصل ہوتا ہے اور گنتی کے چند احمق خارجیوں اور رافضیوں (کے اختلاف) کا کوئی اعتبار و شمار نہیں، اس لیے کہ یہ اتفاق اہلِ قبلہ کے بعد کی پیداوار ہیں جو ضروریاتِ دین میں شک کرتے رہتے ہیں۔"

اور امام فخر الاسلام بزدوی علیہ الرحمہ کے اُصول میں ہے "اجماع قرآن کریم کی آیت یا حدیثِ متواتر کی طرح ہے،

اس سے علم حاصل ہونے اور اس پر عمل واجب ہونے کے معاملہ میں۔ لہٰذا اس کے منکر کی تکفیر کی جائے گی۔''

اور امام عبد العزیز بخاری کی کشف الاسرار میں ہے ''جو شخص اصل اجماع کا منکر ہو یعنی یوں کہے کہ اجماع حجت نہیں ہے، اس کے کافر ہونے کا حکم دیا جائے گا''

اور الفصول البدائع فی اصول الشرائع میں ہے: ''اجماع کے حجت ہونے کا مطلقاً انکار کرنے والا کافر قرار دیا جائے گا اور ہمارے مشائخ کے نزدیک مختار ہے۔''

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان وہابیوں کا اعتقاد یہ ہے کہ صرف وہی مسلمان ہیں اور جو بھی ان کے خلاف اعتقاد رکھتے ہیں وہ مشرک ہیں۔ اور وہ لوگ یہ بات صرف زبانی اور بطور سبّ وشتم نہیں کہتے ہیں، بلکہ وہ دوسرے سبھی مسلمانوں کو دل سے مشرک سمجھتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ لوگ محض اسی بنیاد پر اہلِ سنت اور ان کے علماء کا قتل مباح قرار دیتے ہیں (جیسا کہ علامہ سید ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ نے خبر دی)

اور صرف اسی وجہ سے وہ لوگ مسلمانانِ اہلِ سنت کا خون اور ان کے اموال کو اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں (جیسا کہ علامہ صاوی علیہ الرحمہ نے بیان فرمایا) اور اگر ان لوگوں نے یہ بات بطور سبّ وشتم ہی کہی ہوتی تو ہرگز ہرگز صرف اسی بنیاد پر نہ اہل سنت کا قتل عام کرتے اور نہ ان کے خون اور اموال کو حلال قرار دیتے۔

اور بلاشبہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جب بھی کوئی شخص کسی پر فاسق ہونے یا کسی پر کافر ہونے کا حکم لگائے گا تو اگر شخص مذکور درحقیقت ویسا نہ ہوا تو وہ فِسق یا کفر کا حکم اسی پر لوٹ آئے گا۔'' (جیسا کہ بخاری کی صحیح حدیث میں ہے) (اور یہ طے شدہ امر ہے کہ معدودے چند نجدی وہابیوں کے علاوہ پورا عالم اسلام ہرگز ہرگز کافر و مشرک نہیں ہے، لہٰذا ان پر حکم کفر وشرک لگا کر بحکم حدیث یہ نجدی وہابی خود ہی کافر ومشرک قرار پائے۔)

اور وہابیہ نجدیہ کے امام نے ''قرۃ عیون الموحدین'' نامی کتاب میں جو یہ لکھ مارا کہ ''شیخ عبد القادر (جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) عراق والوں کے معبود ہیں'' (معاذ اللہ تعالیٰ) تو یہ بات محض جھوٹ، خالص افترا اور بہت بڑا بہتان ہے۔ اور اس کے قلم سے یہ بات صرف اس لیے نکلی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سچّے ولیوں سے بُغض وعناد رکھتا ہے، بالخصوص ان شیخ عظیم سے جن کی ولایت اور قربِ خداوندی پر پوری دنیا والوں کا اتفاق ہے۔ ایسے ہی ظالموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''ان کے منہ اور ان کی زبانوں سے دشمنی ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

اور متعدد احادیث قدسیہ میں رب کریم کا یہ فرمان وارد ہوا ہے کہ ''جس نے میرے کسی بھی ولی سے عداوت ودشمنی کی تو میری جانب سے اسے اعلانِ جنگ ہے'' اور اس میں کوئی شک نہیں کہ باشندگانِ عراق اس صریح بہتان اور گندے افترا سے بَری ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے حضرت شیخ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق یہ قولِ باطل نہیں کہا (کہ معاذ اللہ! وہ ہمارے معبود ہیں) بلکہ انھوں نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کہیں جس سے یہ لازم ہی آتا ہو کہ حضرت شیخ ان کے معبود ہیں (معاذ اللہ

تعالیٰ) اور نہ ہی وہ ایسا کام کرتے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ اہلِ عراق انھیں اپنا معبود سمجھتے ہیں۔ (حق تو یہ ہے کہ)

لا إله إلّا الله محمد رسول الله

اللہ کے سوا کوئی معبود ولائق پرستش نہیں۔

حضور محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ شیخ نجدی کا یہ بہتان صرف اہلِ عراق کی تکفیر اور ان کے بلاد و اِمصار کو تباہ و برباد کرنے کے جواز اور ان کے خون اور اموال کو مباح قرار دینے کا حیلہ تلاش کرنے کے لیے ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اہلِ عراق اپنی حاجتوں کے پورا کیے جانے کے لیے حضرت شیخ کو اپنے پروردگار کی بارگاہ میں وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ اور اپنے اوپر کوئی مصیبت نازل ہونے کے وقت آپ سے مدد چاہتے اور فریاد کرتے ہیں، اس اعتقاد کے ساتھ کہ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی اللہ تعالیٰ عنہ عونِ الٰہی کا مظہر ہیں۔ اور اس طرح کا توسّل نیز مدد چاہنا اور فریاد کرنا بلاشبہ جائز ہے، شرع یا عقل کے فیصلہ سے اس پر کوئی مانع بھی نہیں۔ جیسا کہ احادیث نبویہ اور تفاسیر معتبرہ سے اس پر شہادت موجود ہے، البتہ نجدی وہابیوں کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے بھی مدد چاہنا اور فریاد کرنا خالص شرک ہے اور اگر بر سبیل فرض اسے تسلیم کرلیا جائے تو (ہمیں یہ بتایا جائے کہ) حکومت سعودیہ عربیہ کے شاہ فہد نے امریکیوں اور ان کے حلیف دوسرے نصرانیوں اور یہودیوں کی افواج سے جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے دشمن ہیں جو قرآن کی بولی میں **مغضوب علیہم** اور ضالین ہیں۔ عراق کو تباہ و برباد اور باشندگانِ عراق کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے کیوں کر مدد طلب کی اور اس استمداد و استعانت باعداء اللہ کو سبھی وہابیوں نجدیوں نے کیوں کر جائز رکھا اور اس سے خوش رہے، اور جب ان کے بقول اللہ تعالیٰ کے ولیوں سے مدد طلب کرنا اور فریاد کرنا شرک ٹھہرا تو پھر وہابیہ نجدیہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں نصاریٰ اور یہود سے مدد طلب کر کے اور ان سے فریاد کر کے اپنے عقیدے ہی کی بنیاد پر مشرک اور مرتد قرار پا گئے۔

اور یہ وجہیں جو مذکور ہوئیں ان بہت ساری وجوہ میں سے چند ہیں جن کے باعث وہابیوں نجدیوں پر کفر عائد ہوتا ہے اور انھیں وجوہِ مذکورہ نیز ان کے علاوہ متعدد وجوہ کی بنا پر حضراتِ فقہائے کرام نے وہابیہ نجدیہ کے کافر ہونے کی جانب اشارہ ہی نہیں بلکہ صراحت فرما دیا۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

کتبہ محمد قدرت اللہ الرضوی غفر لہ المولی القوی

دارالافتاء فیض الرسول، براؤں شریف، ضلع سدھارنگر، یوپی انڈیا

۲۸ / ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۲ھ

ترجمہ ۵ / شوال ۱۴۱۲ھ

☑☑☑☑☑☑

مجاہد ملت

از:مولانا اسلم بستوی، شیخ الحدیث انوار القرآن، گونڈہ، یوپی

وہ پیشوائے طریقت وہ رہنمائے سلوک
وہ ایک ذرّہ مگر کوہِ استقامت تھا

وہ ایک نقطہ مگر جوہر شرافت تھا
وہ ایک نقش، محبت کی جو علامت تھا
وہ ایک قطرہ مگر عزم کا سمندر تھا
نحیف جثّہ مگر وہ جہاد پیکر تھا
بلند جس نے کیا تھا صداقتوں کا علَم
رہِ وفا میں ہمیشہ رہا جو تیز قدم
وہ بے قرار کہ رگ رگ میں جس کی قوم کا غم
صلیب وقت پہ بن کر رہا جو مشقِ ستم
وہ خارزاروں میں دیوانہ وار پھرتا تھا
وہ دشتِ ظلم میں مردانہ وار پھرتا تھا
مگر جبیں پہ شکن تھی نہ لب پہ شکوہ تھا
رضائے مولیٰ پہ راضی رہے وہ بندہ تھا

دلوں میں آج بھی اس کا مقام روشن ہے
جہاں میں آج بھی اس کا پیام روشن ہے
عمل پسند رہو اور ”خاکسار“ بنو
حیاتِ نو کے لیے تم وفا شعار بنو

زمین قیس پہ اِک آسماں بنا کے رہا
دیارِ حسن سے کچھ اور زخم کھاکے رہا
وہ نجدیوں کو جھلک عشق کی دکھا کے رہا
وہ ریگزار میں فصل اُگا کے رہا
خلیج نجد نہ اس کے جنوں کو روک سکی
دیارِ حسن سے رحمت کا پھر پیام آیا
وہ مضطرب گیا، آیا تو شادکام آیا
وہ کوئی اور نہیں تھا وہ عاشق تھا
وہی امیر شریعت، وہی اسیر حبیب
مزاجِ وقت کا نبّاض قوم کا وہ طبیب
جہاں کو جہدِ مسلسل کی دے گیا دعوت
کہ جس کو کہتی دنیا ”مجاہد ملّت“

☑☑☑☑☑☑

جمعیۃ العلماء ہند کے نام آل انڈیا تبلیغ سیرت کے صدر

حضور مجاہد ملّت کا ایک تاریخی مکتوب

جناب مولانا حفظ الرحمن صاحب ناظم عمومی جمعیۃ علماء ہند وممبر پارلیمنٹ

بعد ماہوالمسنون! غالباً آپ پر پوشیدہ نہیں کہ مسلمانانِ ہند اس وقت مذہبی ومعاشرتی، جانی و مالی تباہ کاریوں کے ایک نازک ترین دور سے گذرر ہے ہیں۔ فی الحال مثال کے طور پر فیروز آباد کا روح فرسا واقعہ تحریر کرنے کے بعد وقت کے ایک اہم امر کی طرف آپ کی توجہ دلانی ہے۔

فیروز آباد میں مسجد کی بے حرمتی اور ظلماً مسلمانوں کی شہادت اور آبروریزی وغیرہ جیسے دل خراش واقعات کے بعد جب وہاں کے مسلمانوں نے پولیس واہل کارانِ حکومت اور بعض ارکانِ حکومت کی بے عنوانیوں کے خلاف احتجاج کیا اور ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لیے تیار ہوئے اور حکومت نے احساس کیا کہ یہ بے عنوانیاں غالباً قانونی طور پر طشت ازبام ہوجائیں گی، تو اسی اثنا میں بم کا واقعہ کرا کے انھیں مزید ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا گیا اور کچھ دنیاوی وجاہت رکھنے والوں کو حراست میں لے کر پھر ان کی کوئی شنوائی نہ کی۔

بخلاف اس کے قتل وغارت گری کرنے والوں کو کسی نہ کسی بہانے چھوڑ دیا گیا۔ وہاں کے مسلمان پریشان ہوکر جناب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جناب نے وزیر اعظم سے ملاقات کر کے اطمینان بخش جواب مسلمانوں کو سنا دیا۔ اور ان کی ضمانت کے متعلق وزیر اعلیٰ یوپی کی کارروائی سنا کر بہت کچھ اطمینان دلایا۔ لیکن نتیجہ صفر نکلنے پر وہاں کے مسلمان مایوس ہوگئے۔

اس کے بعد پھر مسلمانوں کو دھمکایا گیا کہ جب تم لوگ اپنے جائز حق کو پائمال کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو گے یعنی مسجد کے مشرقی پھاٹک کو بند کرانے پر تیار نہ ہو گے، اس وقت تک تمہاری کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ مجبوراً وہ لوگ تیار ہوئے انھیں ایک مہینہ کے لیے عارضی ضمانت پر رہا کیا گیا۔

اسی پریشانی میں مسلمانوں نے مسجد کے پھاٹک کے سامنے دیوار چن دی اور اس پر پلاسٹر بھی کر دیا گیا۔ حالانکہ اب تک حکومت کی طرف سے پہلے بلوے میں جو مسجد، عیدگاہ اور مقابر کی بے حرمتی ہوئی تھی، اس کا کوئی انتظام نہیں ہوا اور

دوبارہ بلوے میں جوخوں ریزی وسفّا کی اور حضرت صوفی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مزارِ مقدس کی بے حرمتی اور وہاں کے رہنے والے مسلمانوں کا صفایا اور نہ جانے کیا کیا مظالم ڈھائے گئے، جس کا اب تک کوئی مداوا نہ ہوا اور نہ ہی اب تک ان دہشت زدہ مسلمانوں سے مقدمہ اٹھایا گیا۔ مجھے یہ تمام باتیں اس وقت معلوم ہوئیں جب کہ اپنے دوسرے دورے میں بیسویں شعبان المعظم مطابق ۷ر فروری ۶۱ء کو فیروز آباد حاضر ہوا اور یہ بھی سننے میں آیا کہ جناب وہاں تشریف لائے تھے۔ لوگوں کو تسلی دی اور ہمت افزائی کی اور ساتھ ہی ساتھ مصالحت کی ہدایت بایں طور فرمائی تھی:

کہ دیوار تو اٹھانا ہی پڑے گا لیکن مصالحت باوقار ہونا چاہیے۔ جس سے وہ اور بھی بدحواس ہو گئے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے شہری و مذہبی حق کے خلاف وہ کر گزرے جو انھیں نہ کرنا تھا اور پولیس اور حکام بھی جو انھیں نہ کرنا چاہیے تھا کر گزرے اور کرر ہے ہیں۔

اور یہ بھی سننے میں آیا کہ اس وقت ذلت وخواری کی جس سطح پر مصالحت ہورہی ہے، اس کے خلاف احتجاج کرنے والوں کے لیے موجودہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے دھمکایا ہے کہ میرے ہاتھ میں ڈنڈا ہے، جو اس کے خلاف کرے گا کچل کے رکھ دوں گا۔

یہ ہے اہنسا پرست اور سیکولر اسٹیٹ کا ڈھونگ رچانے واقلیت نوازی کا شور مچانے والی حکومت کا طرزِ عمل۔

اس وقت جبل پور میں جو غارت گری کا بازار گرم ہے اس سے بھی غالباً جناب اچھی طرح واقف ہوں گے، جس کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

لہٰذا گذارش ہے کہ پنڈت جی اور گپتا صاحب سے مل کر جلد ایسی صورت پیدا کریں کہ فیروز آباد کے مسلمانوں کا خوف وہراس ختم ہو جائے اور کم از کم مقدمات فوراً اُٹھائے جائیں۔ انھیں حالات کے پیش نظر ”کانگریس“ نے جو اقلیت کی کمیٹی بنائی ہے، جس کے غالباً آپ بھی ممبر ہیں۔ آج کی تقریب میں اسی طرف آپ کی توجہ دلانی ہے کہ اقلیت بورڈ کوئی ایسی صورت اختیار کرے جس پر اقلیت کو اطمینان و بھروسہ ہو، ورنہ کانگریس یا کمیٹی یا حکومت کے اعتماد کر لینے سے اقلیت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ کیوں کہ انھیں کے اعتماد سے دستورِ ہند مرتب ہوا۔ لیکن وہ آج تک اقلیت کا اعتماد نہ حاصل کر سکا، جو چاہیے تھا۔ فقیر کا اپنا خیال ہے کہ قوانین بن جاتے ہیں، دستور سازی ہوتی ہے مگر اس پر عمل درآمد نہیں ہونے پاتا۔ اقلیت کے خلاف جو قانونی کارروائی و ہنگامہ خیزی ہوتی ہے اس کا کوئی مداوا نہیں ہوتا۔ اور اقلیت کو آئینی طور پر قانونی و دستوری حقوق حاصل کرنے کے لیے قانون میں کوئی اطمینان بخش صورت بھی نہیں ہے۔

لہٰذا دستور میں یقینی طور پر ایسی ترمیم ہونی چاہیے جس سے اقلیت کو اپنا قانونی حق طلب کرنے میں سہولت و آسانی ہو۔ اس سلسلہ میں فقیر کی ذاتی رائے ہے کہ اقلیت کی ایک وزارت قائم ہونی چاہیے، جس کے ممبری کے انتخاب کا حق صرف اقلیت کو ہوگا۔ اگر چہ اس وزارت میں کسی قسم کا کوئی خاص محکمہ نہ ہوگا مگر عملی طور پر اس وزارت کو ہر محکمہ بالخصوص پولیس اور حکام سے گہرا تعلق ہوگا کہ جس شعبہ میں اقلیت پر مظالم ہوں اس کے مدافعت میں یہ وزارت قانونی کارروائی کرے گی۔

ایسے حالات میں پولیس اور حکام کو بھی باز پرس ہونے کا خطرہ رہے گا۔ لہٰذا ''سیّاں بھئے کوتوال، اب ڈر کاہے کا'' کا جو تخیل کارفرما ہے، اس کی روک تھام ہوسکے گی۔

اگر یہ باتیں بذریعہ مراسلات طے ہوجائیں تو فبہا ورنہ میں اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود تبادلۂ خیال کی جو بھی مناسب صورت اختیار کی جائے گی، اس کے لیے تیار ہوں۔

اب سے کچھ دنوں پہلے بعض اراکین ''جمعیۃ علماء ہند'' نے اشتراکِ عمل کے لیے فقیر کی طرف پہل کی اور گفتگو بھی ہوئی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کی طرف بھی جناب کی خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کٹکی صدر جمعیۃ علماء اڑیسہ نے کٹک میں مجھ سے ملاقات کی اور یہ کہا کہ اس وقت بھارت کے مسلمان خوف وہراس، اُمید وبیم کے جس بحرانی دَور سے گذر رہے ہیں، اور آئے دن مسائلِ دینیہ سے متعلق جو قانون بن رہے ہیں ان کی اصلاح اور شر پسند عناصر کا مقابلہ بغیر اتحاد واشتراک کے ناممکن ہے۔ اگر کسی موقع پر گورنمنٹ کسی فریق کے مطالبے پر دست اندازی کرے اور دوسرا فریق بیٹھ کر مذاق اُڑائے اور اس پر ہنسے تو کیسے کام چلےگا؟ اور فیروزآباد میں اتفاقاً مولوی ابوالقاسم صاحب شاہ جہاں پوری ناظم ''جمعیۃ العلماء اترپردیش'' سے ملاقات ہوگئی تو انھوں نے مسلمانوں کی تباہی وبربادی، پولیس اور حکام کی زیادتیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اسی قسم کی گفتگو کی تو دونوں حضرات سے فقیر نے قریب قریب یہی کہا کہ اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے آپ حضرات پولیس اور حکام اور حکومت کے جن مظالم کے متعلق بھی کوئی اقدام کریں گے فقیر اپنی ''جماعت آل انڈیا تبلیغ سیرت'' کے ساتھ اشتراک کرے گا۔

مولوی اسمٰعیل صاحب کٹکی نے تو اسے منظور کرلیا مگر مولوی ابوالقاسم صاحب کو اس پر تامّل رہا۔ ابھی بہرائچ شریف میں سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانۂ عالیہ پر مولوی ابوالقاسم صاحب سے ملاقات ہونے پر پھر اس کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ اگر میری بات آپ کی سمجھ میں نہیں آتی تو ارکانِ جمعیۃ سے مشورہ کرلیں۔ ہوسکتا ہے ایوانِ جمعیۃ میں اس کا حل تلاش کرلیا جائے اور مشترکہ طور پر کوئی کام ہوجائے۔ لیکن اب تک اس کی کوئی اطلاع موصول نہ ہوئی۔

لہٰذا اب جناب سے گذارش ہے کہ ان مسائل پر غور کرکے اس خلیج کو دور کریں۔ اور اپنی رائے سے مجھے مطلع کریں۔

جواب کا منتظر

فقیر حبیب الرحمٰن قادری غفرلہٗ

خادم منصب صدارت تبلیغ سیرت، الہ آباد۔

۴؍رمضان المبارک مطابق ۲؍فروری ۶۱ء روز دوشنبہ مبارکہ

دھام نگر، ضلع بالیسر، اڑیسہ

آئینۂ خدمات

سوراشٹرو گجرات کا سب سے قدیم اور مرکزی ادارہ

دارالعلوم مسکینیہ دھوراجی اور مولانا غلام غوث علوی

ایک قطرہ اس قدر موجوں کی طغیانی کے ساتھ!

ایسے دورِ قحط الرجال میں جہاں ہر طرف ہوا و ہوس اور ریا و نمود کی حکمرانی ہو۔ اپنی ذات کے سوا ہر قابلِ ذکر وجود کی نفی کی جاتی ہو اور اسی کو دین وسنّیت کی سب سے بڑی خدمت سمجھی جاتی ہو۔ ایسے دورِ نفسا نفسی اور عالمِ ریا و نمود و خود غرضی، مفاد پرستی، خود پرستی و ابن الوقتی و شخصیت پرستی کے ہنگامہ ہاؤ ہو میں کوئی مردِ قلندر اخلاص و وفا کا روغن زیتون چراغِ محبت میں سرِ رہگذر جلائے اپنے وجود کو دوائے دل کی دوکان بنا ڈالے۔ جس کی اپنی ذات کے لیے امید قلیل مگر مقاصد جلیل ہوں، جس کی ادائے محبت دلوں کو تڑپا دینے والی اور جس کی نوا بڑی دلنواز ہو۔ نرم دل گفتگو اور گرم دم جستجو جس کی عادت اور استغنا و بے نیازی جس کی سرشت، اخلاص فی الدین جس کی پونجی اور اشاعت دین وسنّیت جس کی حیات کا ماحصل ہو، وہ جب کسی میدانِ عمل میں قدر رکھے گا تو اس کے ثمرات و حاصلات و اثر خیزی کا جو عالم ہوگا اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ یہ سچ ہے کہ ع وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا چکے۔

مگر یہ بھی سچ ہے کہ ان دوائے دل کے مقدس تاجروں کے عکسِ جمیل سے دنیا خالی بھی نہیں۔

دارالعلوم مسکینیہ دھوراجی کا نام چالیس برس سے زائد عرصے سے سنتا آرہا تھا، خاص کر بادشاہِ علم وفضل سلطان الواعظین، استاذ الاساتذہ حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ صاحب قبلہ اعظمی علیہ الرحمہ کی زبانِ مبارک سے، ان کی کتابوں میں، ان کے تذکرے میں اور ہم جیسے لوگوں کے لیے اس دارالعلوم کا نام اس وقت زیادہ روشنی میں آیا، جب حضرت العلام مولانا غلام غوث علوی وہاں تشریف لائے اور ان کے حسنِ خدمات کا غلغلہ دور دور تک بلند ہوا۔ اور ایک دن وہ بھی آیا جب مولانا غلام غوث علوی اور دارالعلوم مسکینیہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو کر رہ گئے، خاص کر حضرت مولانا غلام غوث علوی اپنے وطن براؤں شریف سے کم، دارالعلوم مسکینیہ دھوراجی سے زیادہ پہچانے گئے۔

مولانا موصوف جب وہاں تشریف لے گئے تو شباب کی ابتدائی دہلیز پر تھے۔ بالکل ینگ اور پھر اسی جگہ بوڑھا ہو جانا خاص کر میمنوں کے مدرسہ میں، اسے کرامت کہی جائے یا استقامت ؎

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اتنا تو پہلے ہی معلوم تھا اس مدرسہ میں بادشاہِ علم وفضل، سلطان الواعظین حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ صاحب قبلہ اعظمی علیہ الرحمہ خدمت علمِ دین کے لیے وہاں رہ چکے ہیں۔ جن کے علم وفضل کی ریاست کو ان کے باکمال معاصرین تسلیم کر چکے

تھے۔ حضور مجاہد ملّت حضرتِ اقدس علامہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی رئیس اعظم اڑیسہ وسابق صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت و بانی جامعہ حبیبیہ الہ آباد کی مجلس میں جب کبھی حضرت اعظمی صاحب کا ذکرِ جمیل چھڑتا (تو باوجود ذہنی دوری کے) حضور مجاہد ملّت کے الفاظ یہ ہوتے کچھ بھی ہو اعظمی علم کا بادشاہ ہے۔ اور بادشاہِ علم کا حال یہ تھا کہ جب ان کی زبان کھلتی کسی بھی علمی مسئلہ میں تو ایسا معلوم ہوتا کہ دریائے ذخار ہے جو لہریں لے رہا ہے۔ اور واقعی علم کی ریاست اب انھیں پر ختم ہو گئی ہے۔ اور ان کی تنقید اپنے معاصرین پر اللہ اکبر! وہ اتنی خاصے کی چیز ہوا کرتی تھی اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جن کا سابقہ پڑ چکا ہو۔ خدمت علم دین کے لیے ان کے سفر کا آخری پڑاؤ دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر، یوپی تھا۔ راقم الحروف وارث جمال قادری کا وطن براؤں شریف سے قریب جانب شمال صرف ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک مشہور گاؤں بڑھیا ہے۔ جہاں ایک مشہور دینی ادارہ مدرسہ غوثیہ فیض العلوم اور حضرت علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رضوی علیہ الرحمہ کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔ چونکہ فیض الرسول میرا بھی مادرِ علمی ہے اور حضور شعیب الاولیاء ہمارے مرشد اس لیے جب بھی ممبئی سے اپنے گھر جانا ہوتا تو براؤں شریف کی حاضری لازمی ہوتی۔ اسی حاضری کے درمیان علم و فضل کے اس قطب مینار کی بارگاہ میں حاضری کی چند قیمتی ساعتیں میسر آ جاتیں۔

ایک بار اسی نوعیت کی حاضری تھی اور میں ان کی باعظمت بارگاہ میں حاضر تھا اور ذکر تھا متحدہ ہندوستان کے سرخیلانِ امّت کا۔ بے شک ان کا سینہ بے کینہ برصغیر ہند کے مذہبی، قومی وملّی تاریخ کا بحر ذخار تھا، لب کھل گیا تو قیمتی وتاریخی حقائق کا دریا لہریں لینے لگتا۔ دورانِ گفتگو ایک بلند قامت شخصیت کا ذکر نکل آیا تو اس وقت مرحوم ہو چکے تھے اور وہی متحدہ ہندوستان کے بزعمِ خوایش سب سے بڑی سنّی اور سوادِ اھلِ سنّت و جماعت کے مقابلے میں تنہا سوادِ اعظم تھے۔ ان کے تعلق سے جب ان کی زبانِ حق آشنا لب کشا ہوئی تو جبینِ عقیدت پر سلوٹوں کا قبضہ ہوگا اور ہماری بے خبری کی عقیدت جائے پناہ تلاش کرنے لگی۔ بالآخر بڑی ہمت کر کے میں نے عرض کر ہی دیا کہ حضورِ عالی! پورے برصغیر میں کوئی ایسی بھی شخصیت ماضی قریب میں تھی یا ہے جس سے آپ متاثر ہیں اور جن کے لیے آپ کے دل میں احترام وعقیدت کا کوئی گوشہ ہے۔ کیونکہ اس وقت بھی بڑے بڑے اجلّہ اکابر ان کے معاصرین میں موجود تھے، ان میں سے کسی کو اپنے مقابلے پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ احترام وعقیدت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میرے اس سوال پر وہ آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا بیٹے بہت اچھا سوال تم نے کیا! دو شخصیتوں پر اعظمی کے ماں باپ قربان، جب بھی ان کی عظمتوں کا تصور کرتا ہوں تو قلب احترام وعقیدت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ میں نے بڑی حیرت سے مسکراتے ہوئے عرض کیا کہ حضور آخر وہ خوش نصیب شخصیتیں کون سی ہیں جن سے آپ عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے تصور ہی سے آپ کے قلب میں احترام وعقیدت کا جذبہ انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔

میرے اس عرض پر احترام وعقیدت میں ڈوبی ہوئی آواز میں چہرے پر واقعی احترام وعقیدت کی چمک لیے فرمایا کہ پہلی میری پسندیدہ اور محبوب ترین شخصیت جن سے میں آج بھی بڑی عقیدت رکھتا ہوں وہ ہیں شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت

مولانا حامد رضا خان بریلوی علیہ الرحمہ۔ وہ صرف اس لیے نہیں بہت بڑے تھے کہ وہ اعلیٰ حضرت مولانا امام احمد رضا خان علیہ الرحمہ کے بیٹے تھے، خدا کی قسم! اگر وہ اعلیٰ حضرت کے بیٹے نہ بھی ہوتے تو اپنے ذاتی فضل و کمال اور حیرت انگیز خداداد صلاحیتوں اور عظمتوں کے اعتبار سے وہ اتنے ہی بڑے ہوتے۔ اور پھر جب ان پر گوہر افشانی فرمانے لگے تو ایسا لگا کہ ایک وفا شعار شاگرد اپنے عظیم المرتبت استاذ یا ایک مرید مخلص اپنے مرشدِ کامل کی قصیدہ خوانی کر رہا ہو۔ لفظ لفظ سے احترام اور چہرہ شوقِ عقیدت سے تمتمایا ہوا۔ اور دوسرے شخصیت جس پر اعظمی کے ماں باپ قربان وہ حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی کی تھی، پھر تو ان دو شخصیتوں کے بعد پورے برصغیر ہندو پاک میں اعظمی کو اعظمی ہی نظر آیا۔

پھر بہت بعد میں بھی حضور مجاہد ملّت علیہ الرحمہ کی طویل صحبتیں میسر آئیں اور معاصرین قابل علماء کے ذکر میں حضرت اعظمی کا ذکر آتا تو ان کے علم و فضل اور اس کی شخصیت پر گفتگو کے آخر میں حضور مجاہد ملّت کہ جملے ہوتے کہ کچھ بھی ہو، اعظمی علم کا بادشاہ ہے۔ حضور مجاہد ملّت کے اس ارشاد کے بعد ''پورے برصغیر ہندو پاک میں اعظمی کو اعظمی ہی نظر آیا'' سمجھ میں آیا کہ وہ حضرت علامہ اعظمی کا عقلی نہیں بلکہ ایک طرح سے تحدیثِ نعمت کے طور پر اپنے علم و فضل کا اظہار تھا۔

دار العلوم مسکینیہ میں حضرت علامہ اعظمی صاحب کے علاوہ علامہ اعظمی وغزالی دوراں علامہ سعید احمد کاظمی کے استاذِ محترم شیخ العلماء علی الاطلاق حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی کہ سابق شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول، صاحبِ تصانیفِ کثیرہ حضرت علامہ مفتی احمد یار خاں نعیمی، مناظر اہلِ سنّت حضرت مولانا حشمت علی خاں لکھنوی، حضرت علامہ مفتی عبد الرشید صاحب قبلہ بانی جامعہ عربیہ ناگپور، ان کے برادرِ عزیز علامہ مفتی عبد العزیز، امین شریعت حضرت علامہ مفتی رفاقت حسین صاحب قبلہ مفتیٔ اعظم کانپور، حضرت علامہ مفتی عبد الجلیل اور حضرت علامہ مفتی محمد اسلم صاحب رضوی (بہاری) علیہم الرحمہ جیسی بلند قامت شخصیات و رجال نے اس مدرسہ مسکینیہ میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ جس علاقہ سوراشٹر گجرات میں اس دار العلوم کی قدامت اور اس کی اولیت و اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے، سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت و اسلامیانِ ہند کی یہ وہ بے پایاں باعظمت و بابرکت ہستیاں تھیں کہ ان کے دیکھنے والوں کو یہ حق کہ وہ بصد مسرت جھوم کر کہیں کہ ع نازم بچشمِ خویش کہ روئے آں دیدہ اند۔ بے شک ان میں کی اکثر ہستیاں تنہا اپنے اپنے وجود حیرت میں ایک جہان، ایک جامعہ، ایک جماعت، ایک انسٹی ٹیوٹ اور ایک دانش گاہ علم و فضل تھیں۔ جن کی عظمتوں کے تصور ہی سے اربابِ علم و دانش کا قلب عقیدت و احترام سے لبریز ہو جاتا ہے۔ ان میں سے دو تین شخصیات و رجال پر اپنے علم و اطلاع کے مطابق کچھ عرض کروں تو سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے کہ

ع سفینہ چاہیے ان بحرِ بے کراں کے لیے۔

مگر اتنی عظیم و جلیل شخصیات و رجال کے زمانے میں اس دار العلوم نے کوئی ترقی نہیں کی اور کسی بھی دور میں طلبا کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں ہو سکی اور نہ ہی مسجد کی چہار دیواری سے باہر آ سکا۔ اس کا تو تصور ہی جرم ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ سے وہ کام نہیں ہوتے، ان کی بے کراں شخصیت سے جس کی امید تھی۔ مولانا غلام غوث علوی اور ہم جیسوں کو ان کی بارگاہِ علم و فضل

سے وہی نسبت ہے جو ایک ذرے کو آفتاب، ایک رائی کو پربت اور ایک کوزے کو سمندر سے ہو سکتی ہے۔ مگر حقیقت کی بے رحمی یہی ہے۔ اس دور میں دارالعلوم مسکینیہ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے مسکین ہی رہا۔

آخر وہ کیا عوامل تھے کہ اتنی بے کراں شخصیتیں اپنی تمام تر علمی وفکری عظمتوں کے باوجود وہاں کام نہیں کر سکے، یا انھیں کام کرنے نہیں دیا گیا؟ یا اس زمانے میں علمی و دینی کام کرنے کے لیے وہاں حالات سازگار نہیں تھے، یا وہ اپنی عظمتوں کے ہمالیہ سے زمین کی اس سطح تک نہیں اُتر سکے جس سطح پر مولانا علوی صاحب اُترے یا اس زمانے میں انھیں میمنوں سے کوئی یعقوب کھاکھو نہیں دستیاب ہو سکا۔

بے شک وہ شہر، وہ علاقے زیادہ تر میمنوں کے ہیں۔ بڑے بڑے رئیس ومتمول میمن اور مدرسہ بھی میمنوں ہی کا ہے۔ جس کے انتظامیہ میں غیر میمن شہر ممنوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میمن بھائیوں کے سمجھ میں صرف مسجد، درگاہ اور اپنا پیر صاحب ہی سمجھ میں آتا ہے خواہ وہ خواندہ ہو یا غیر خواندہ یا نیم خواندہ، مدرسہ تو ان کی سمجھ میں آتا ہی نہیں ہے اور لاکھ سمجھانے سے آتا بھی ہے کچھ تو وہ بھی بہت دیر سے اس وقت تک ہاتھوں سے نکل چکا ہوتا ہے۔

اس کی مثال اس چھوٹے سے واقعے سے سمجھیں۔ یہاں ممبئی میں میرے ایک بڑے کرم فرما وقدرداں سیٹھ تھے الحاج رشید طیب وہ بھی میمن تھے۔ بے حد ذہین، بہت متحرک وفعال حضور غوث پاک کے دیوانے، تھے بھی بڑے رئیس کشادہ دل وکشادہ دست، جو ہزار پانچ سو روپیے عام بھکاریوں کو بھی دے دیتے۔ عراق وامریکہ کی پہلی جنگ میں وہ میرے قریب ہوئے اور اس حد تک قریب ہوئے کہ ان کی ترک تازی، کشادہ دستی اور ایثار وقربانی اور کام کرنے کا جذبہ صادق دیکھ انہیں آل انڈیا تبلیغ سیرت میں شامل کیا گیا اور انھیں جماعت کا سکریٹری بھی بنایا گیا۔ بے شک انھوں نے جماعت میں آکر جماعت کو بہت کچھ دیا۔ ان کے حسنِ خدمات آل انڈیا تبلیغ سیرت کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ عراق عالمی اسٹیج پر پورے برصغیر ہند اور اس کے سوادِ اعظم کی طرف متعدد بار اس جماعت جو نمائندگی کا شرف حاصل اور عالمی سطح پر آل انڈیا تبلیغ سیرت کا جو غلغلہ بلند ہوا اس کے لیے ان کی ترک تازیاں بہت نمایاں تھیں۔ تبھی ایک اور بہت مشہور دیندار ودین پسند سیٹھ الحاج احسان اللہ پہلوان لکڑے والے جو دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کی خدمات کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے، وہ ایک روز ہماری آفس تشریف لائے اور فرمانے لگے مولانا وارث جمال صاحب سنا ہے کہ رشید طیب میمن آپ کو بہت مانتا ہے، بڑا مخیر اور دیندار ہے مگر اس نے اشرفیہ مبارک پور کو صرف گیارہ سو روپیے چندہ دیے ہیں۔ چونکہ آپ بھی فرزند اشرفیہ ہیں اس لیے میں آپ کے ساتھ اشرفیہ کے لیے رشید طیب کے پاس چلنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی اس خبر سے حیرت ہوئی، میں نے کہا حاجی صاحب آپ کی اس خبر سے مجھے خود حیرت ہو رہی ہے، وہ تو اتنے کھلے ہوئے ہاتھ کا ہے، ہمارے سامنے بارہا بھکاریوں کو پانچ پانچ سو بھیک دے چکا ہے۔ نہیں پہلے مجھے بات کر لینے دیجیے، پھر آپ کو لے چلوں گا۔

میں ان کی آفس پٹھان واڑی گیا اور دریافت کیا کہ رشید بھائی حاجی احسان اللہ پہلوان لکڑے والے آپ کے پاس اشرفیہ مبارک پور کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے خوش ہو کر کہا ہاں اور میں نے انھیں گیارہ سو روپیے چندہ دیا۔ میں نے کہا

آنے والا احسان اللہ پہلوان وہ خود بھی تمہاری طرح بہت امیر و کبیر رئیس آدمی ہے اور ہندوستان کے سب سے بڑے سنّی مدرسہ کے لیے آیا تھا اور تم نے اس کے شایانِ شان چندہ تو کیا بھیک بھی نہیں دیا جبکہ آپ ہمارے سامنے ہزار پانچ سو بھکاریوں کو بھیک دے چکے ہو۔

انھوں نے جھینپے ہوئے انداز میں کہا، حضرت ہم میمنوں کو مدرسہ سمجھ میں نہیں آتا ہے البتہ درگاہ، مسجد کی بات فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ ہم اپنے میمن جماعت کو لاکھوں میں چندہ دیتے ہیں لیکن مدرسہ حلق سے نیچے نہیں اُترتا ہے۔ اور جب میں نے مدرسہ انھیں سمجھایا اور اس کی اہمیت کو ان کے دل میں اُتارا تو انھوں نے کہا حضرت پھر تو یہ سب سے زیادہ ضروری ہے اور پھر مجھے دس ہزار روپیے فوراً دیے کہ اتنے بڑے آدمی کو اب نہ تکلیف دیجیے، یہ انھیں مدرسہ اشرفیہ مبارک پور کے لیے اور دے دیں، کل گیارہ ہزار ہو جائے گا۔ اب تو میں سب زکوٰۃ دے چکا ہوں، آئندہ سال اشرفیہ کو اس کے شایانِ شان چندہ دوں گا اور دوسرے مدرسوں کو بھی ٹھیک سے چندہ دوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے میمنوں کو بہت نوازا ہے، ہر طرح کی نعمتوں اور خاص دولت سے مالا مال کیا ہے اور انھیں دلِ دردمند بھی دیا ہے۔ اور ان کے ہاتھ بھی بہت کھلے کیے ہیں یعنی جیسے اللہ رب العزت نے انھیں اپنے فضل سے نوازا، ویسے انھیں کشادہ قلب اور کشادہ دست بھی کیا ہے۔ اور۔۔۔ بھی اللہ تعالیٰ بڑے بڑے کام لے رہا ہے۔ ممبئی میں بڑی بڑی تاریخی مساجد کے جال پھیلے ہوئے ہیں، بڑی بڑی پر شکوہ درگاہیں نظر آتی ہیں۔ یہ زیادہ میمنوں کے مالی ایثار و قربانی کی دین ہے۔

آج کی تاریخ میں دعوتِ اسلامی، سنّی دعوتِ اسلامی کی غیر سیاسی عالمی تحریک جو ہے قیو ٹی وی، مدنی چینل وغیرہ کے ذریعے گھر گھر میں پوری دنیا میں جو دین وسنّیت کا اُجالا پھیلایا ہے اور اب دینی مدارس اور مذہبی کتابوں کی بڑے پیمانے پر نشر و اشاعت یہ بھی سب زیادہ تر میمن حضرات کے ایثار و قربانی کا شرمندہ احسان ہے۔ اور آج گجرات میں جو بڑے بڑے دینی ادارے جیسے سوراشٹر گجرات کا سب سے قدیم و مرکزی ادارہ جسے سوراشٹر گجرات میں ام المدارس ہونے کا شرف حاصل ہے۔ دار العلوم فیوض الرحمٰن جونا گڑھ، دھول جام نگر، بھاؤنگر، پوربندی وغیرہ وغیرہ اور بھی بہت بڑے بڑے دینی ادارے ہیں جنھیں ہم نہیں جانتے ہیں لیکن ہیں بڑے ادارے انھیں آج بھی کون چلاتا ہے۔ یہی میمن حضرات ہی تو چلاتے ہیں۔ اور میمنوں کے کارنامے میں شہادتِ بابری مسجد کے بعد کی قربانیوں میں اپنے انداز میں ذکر کرتا ہے۔ شہادتِ بابری مسجد کے بعد پورے اسلامیانِ ہند کو خوف وہراس، مایوسی سے باہر لا کر جس طرح سر بلند و بے خوف کیا، یہ بھی میمنوں۔۔۔ کا نتیجہ ہے۔ ان کے اپنے بچے تو بہت کم نہ کے برابر ان مدرسوں میں پڑھتے ہیں، آخر مسلم قوم کے بچے ہیں تو ان میں پڑھ کر حافظ، قاری، مولوی عالم فاضل ہو کر نکلتے ہیں۔

ویسے میمنوں میں ایک کمی کہیے یا غفلت کا نام دیجیے یا بے علمی یعنی شرعی مسائل سے ناواقفیت کہ یہ اپنی زکوٰۃ بڑی بڑی رقم اپنی جماعت کو دیتے ہیں اور ان کی جماعت کے غریبوں ہی میں مختلف شکلوں میں خرچ کرتی ہے۔ جیسے ماہ بہ ماہ گھر کے

لیے راشن، کپڑا، کاپی کتاب اور خاص کر بڑی میمن کالونیاں بنا کر صرف اپنی جماعت کے میمنوں ہی کو دیئے۔ غیر میمن غریب ترین مسلمان کو دینا جیسے عملاً غالباً یہ درست ہی نہیں سمجھتے۔ میں یہاں ممبئی میں میمنوں کے درمیان ہی رہتا ہوں اور اپنی کھلی آنکھوں سے میمنوں کی دریا دلی، میمن دائرے ہی کے اندر دیکھتا رہتا ہوں۔ ان کے یہاں میمنوں میں زکوٰۃ لینے والے، زکوٰۃ کا گھر لینے، اپنے بچوں کے لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے سالانہ فیس لینے والے یا اسکالرشپ لینے والے ایسے میمنوں کی ہوتی ہے جو خود صاحبِ نصاب ہوتے ہیں یعنی ان پر خود ہی زکوٰۃ دینا فرض ہے مگر بجائے دینے کے وہ اپنی جماعت سے مختلف شکلوں میں سال بھر زکوٰۃ لیتے ہی رہتے ہیں۔ غیر میمن مسلمان کے امیر لوگ اپنی بیٹی کو جہیز میں اتنا سونا نہیں دے پاتے، جتنا میمن کا غریب زکوٰۃ لینے والا اپنی بیٹیوں کو دیتا ہے۔ پھر بھی میمنوں کے لیے مستحق زکوٰۃ ہے۔ ایک میمن مکان ہوتے ہوئے مکان کے لیے لائن لگاتا ہے اور وہاں سے بھی مکان حاصل کر کے جو صحیح معنی واقعی غریب اور مستحق ہیں ان کا حق مارتا ہے۔

پیرِ طریقت حضرت مثنیٰ میاں صاحب جو یہاں ممبئی میں میمنوں میں گھرے رہتے تھے۔ وہ ایک بار مجھے بڑی حیرت سے کہنے لگے مولانا وارث جمال صاحب یہاں ایک بیوہ میمن عورت ہے جو ہمیشہ میمنوں سے زکوٰۃ وصولتی رہتی ہے، اس نے اپنی بیٹی کی شادی میں چالیس تولہ سونا دیا۔ اور جب رمضان شریف آیا تو پھر وہ اپنی زکوٰۃ وصول کی مہم پر نکلی، تو لوگوں نے کہا ارے تم پر خود زکوٰۃ فرض ہے۔ تم نے اپنی بیٹی کو چالیس تولہ سونا دیا اور پھر زکوہ مانگنے نکلی ہو تو اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ وہ سونا تو میں نے اپنی بیٹی کو دے دیا اب تو میں پھر غریب ہوگئی۔ ؎

امیر جمع ہیں سب لوگ دردِ دل کہہ لے
پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

ہم یہاں ممبرا ممبئی کالونی میں جس بلڈنگ میں رہتے ہیں، حنیفہ بلڈنگ نام ہے اس کا۔ یہاں ایک میمن فیملی رہتی ہے، ان کو خود کا بڑا مکان تھا۔ ۶۰۰ سو اسکوائر فٹ سے بھی زیادہ اور اس کا ہی ایک بیٹا تھا جو مکہ شریف میں بڑی اونچی ملازمت میں تھا اور ابھی بھی ہے۔ وہ جوگیشوری میمن کالونی میں زکوٰۃ کے لیے لائن میں تھی۔ اچانک اس نے اپنا بڑا فلیٹ اونے پونے میں بیچ کر چلی گئی۔ ہم لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی، اتنا اچھا فلیٹ اتنا سستے میں بیچ دیا۔ جبکہ اس کا لڑکا اتنی بڑی اونچی ملازمت ہے۔ آخر اس کو کون سی ایسی مجبوری تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو جوگیشوری جماعت کی طرف سے فلیٹ ملا ہے اس لیے اس نے اس کو اونے پونے بیچ دیا۔ ایسے کتنے لوگ ہیں جن پر خود زکوٰۃ فرض ہے مگر اپنی جماعت یعنی میمنوں کی زکوٰۃ لے کر ان غریبوں کا حق مار رہے ہیں جو واقعی غریب اور مستحق زکوٰۃ۔

ان صاحبِ حیثیت میمنوں کو اپنے پیروں سے جن کو وہ خدا اور سول کے بعد سب سے بڑا درجہ دیتے ہیں۔ اور ایک بار نہیں بلکہ بار بار اللہ و رسول کے حکم کو نظر انداز تو کر سکتے مگر پیر کے فرمان خواہ شریعت کے دائرے میں ہو یا شریعت کے خلاف، پیر صاحب نے جو فرما دیا گویا وہی خدا اور سول کا حکم ہو گیا۔

کم از کم انھیں اپنے پیروں سے تو پوچھنا چاہیے کہ اس طرح ہماری زکوۃ ادا ہوتی ہے کہ نہیں؟ اور اگر نہیں ہوتی ہے اور یقیناً نہیں ہوتی ہے، پھر اللہ و رسول کی بارگاہ میں جواب دہی سے بچنے کی کیا صورت ہوگی۔ اگر واقعی پیر کچھ پڑھا لکھا ہے تو ضرور بتائے گا۔ فی زمانہ تو اب پیری کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں رہ گیا، بس تام چھام، کل، بل چھل ہونا چاہیے۔ کچھ دعا تعویذ، کچھ بابا گیری کا فن اس زمانے میں عام طور پر پیری کے یہی اجزائے ترکیبی ہے۔

راقم الحروف وارث جمال قادری کو اس سال پہلی مرتبہ دار العلوم مسکینیہ کے جلسۂ دستار بندی کے اجلاس (منعقدہ ۲۴ رجب المرجب ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۵ جون ۲۰۱۲ء جمعہ مبارکہ بعد نماز عشاء حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ اجلاس دو روز پہلے ہی بڑے اصرار کے ساتھ بلایا گیا کہ صرف شرکت اجلاس مقصد نہیں بلکہ مجھے مدرسہ کے مالہٗ و ماعلیہ کو سمجھنا تھا۔

دار العلوم مسکینیہ دس بیگھے پر مشتمل ایک عظیم الشان ادارہ اور جدید طرز پر ایک شاندار عمارت جو بادی النظر میں اپنے ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے ایک وسیع و عریض جدید دانش کدہ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اس اجلاس میں میرے علاوہ باہر سے آنے والے حضرات میں خطیب الہند شہزدہ شعیب الاولیاء، صاحبزادہ حضرت علامہ غلام عبد القادر علوی براؤں شریف اور امیر سنّی دعوتِ اسلامی حافظ و قاری مولانا محمد شاکر نوری صاحب بھی تھے۔

چھہتر (۷۶) اسناد پر دستخط کرتے ہوئے اس لیے بھی بڑی مسرت محسوس ہو رہی تھی کہ اس میں آدھی تعداد ساداتِ کرام کی تھی۔ حفاظ و قراء اور فاضلین درس نظامیہ کی مجموعی تعداد ۷۶ تھی۔ ساداتِ کرام کا اتنی بڑی تعداد میں علمِ دین کی طرف راغب ہونا بڑی خوشی کی بات تھی کہ دراصل علمِ دین تو انھیں کا ورثہ ہے کہ ان کے جدِّ کریم مولائے کائنات خدا سیدنا علی مرتضیٰ حقیقی وراثت تو علم ہی ہے اور کل شیءٍ یرجع الٰہ اصلہ کے مطابق سادات کرام متوجہ تو ہوئے۔ فلحمدللہ علی ذالك۔ (باب مدینۃ العلم مولائے کائنات کا یہ ارشاد بھی تو بہت مشہور ہے۔ رضینا قسمت الجبار فینا الخ

اس علاقے بلکہ تقریباً پورے سوراشٹر گاؤں گاؤں، گھر گھر، محلہ محلہ علمِ دین کا اُجالا پھیلانے کا سہرا مولانا غلام غوث علوی کے سر جاتا ہے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ایک مشہور فارسی کہاوت ہے کہ ع مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید۔

اس کہاوت کی حقیقت کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے مجسم دیکھنا ہو تو آپ گجرات کے علاقہ سوراشٹر کے مشہور دھوراجی جائیے۔ اور وہاں حضرت علامہ مولانا غلام غوث علوی کو دیکھیں جن کے نام اور کام کی عطر بیزی سے پورا سوراشٹر معطر ہے۔ اس پورے علاقہ سوراشٹر کا وہ کون سا حصّہ ہے جہاں ان کے خونِ جگر کی لالہ کاری نہ نظر آتی ہو۔

کیا یوں ہی جگمگائے ہیں منزل کے راستے لاکھوں چراغ خونِ شہیداں سے آئے ہیں
اے دہر ہم سے چاک قباؤں کا دن منا سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

☑☑☑☑☑☑

علامہ نسیم بستوی اور دارالعلوم فیض الرسول

سر بزم تصور آج جانے کون آیا ہے
میرے فکر و نظر کا گوشہ گوشہ مسکرایا ہے

حضرت علامہ محمد صابر القادری نسیم بستوی (علیہ الرحمہ) کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ ایک مشہور عالمِ دین، ایک اعلیٰ درجے کے استاذ، ایک بلند پایہ نعت گو شاعر جس کی نعت گوئی اور نعتیہ شاعری کی گونج برصغیر ہندو پاک میں یکساں تھی۔ صاحبِ فکروفن، صاحبِ تصانیف کثیرہ، برصغیر ہندو پاک کے معتبر رسائل و جرائد آپ کے مضامین و مقالات سے مزین، ایک صاحبِ طرز ادیب، ایک بلند قامت انشاء پرداز! لطافت وظرافت و بزلہ سنجی کے پیکر ہر محفل کی جانِ محفل! خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی، حضرت علامہ کامل سہسرامی جیسی بلند قامت شخصیات کے ہم نوالہ! ہم پیالہ! جلیل القدر علماء کرام ومشائخ عظام کے محبوبِ نظر! جس بارگاہ میں پہنچیں پذیرائی ایسی کہ گویا ع بیا بیا عراقی توز خاصگان مائی، اپنے بڑوں کا احترام، ان کی بارگاہ کے نیازمند، معاصرین کا پاس وادب اور ان کا اعزاز واکرام، اصاغر پر کرم نوازی، خودنوازی ایسی ہم جیسے چھوٹوں تک خود بار بار چل کر آنا، خیریت ومزاج پرسی کرتے رہنا۔ تواضع وانکساری ومنکسرالمزاجی جن کا خاص وصف، دھان پان سا وجود جو تیز ہوا میں اُڑ جائے، نظم ونثر پر یکساں قدرت! ان کی ہمہ جہتی کا عالم یہ کہ اساتذہ کی صف میں بھی ایک امتیاز، فیض الرسول براؤں شریف جیسی بلند پایہ درسگاہ میں مسلسل ۱۷ رسال درسگاہ کی زینت! خطیب ایسے کہ ممبئی میں محرم کی مجالس میں پابندی سے ہمیشہ خطاب فرمایا۔ صاحبِ قلم ایسے کہ ۳۹ کتابیں آپ کے نوکِ قلم سے نکلیں اور مقبولِ انام ہوئیں۔ شاعر ایسے کہ پورے برصغیر ہند و پاک میں ان کی شاعری کا چرچا! صفِ علماء میں اتنی صلاحیتوں کا حامل وہ بھی بیک وقت بہت خال خال ہی تھے، آنکھیں بند کر کے دور دور تک دیکھیے ہمہ جہتی میں کتنی اہم علمی و دینی شخصیتیں حضرت علامہ نسیم بستوی کے ہم پایہ ملیں گی۔

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن   خوبی یار کا جواب کہاں

شیخ الادب حضرت علامہ غلام جیلانی اعظمی، حضرت علامہ عبد المصطفےٰ اعظمی، حضور حافظ ملّت محدث مرادآبادی، حضرت علامہ سیّد افضل حسین مونگیری، حضرت علامہ مفتی رجب علی قدست اسرارہم جیسی نابغۂ روزگار شخصیتیں آپ کے اساتذہ کرام تھے۔

خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی، سلطان القلم علامہ ارشد القادری، شیخ الاساتذہ علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری، مجاہد دوراں علامہ سیّد مظفر حسین کچھوچھوی، شارح بخاری علامہ مفتی شریف الحق امجدی جیسے اعاظم رجال آپ کے

معاصرین میں سے تھے۔ سبھوں کے دلوں میں علامہ نسیم بستوی کے لیے بڑا اخلاص بھی تھا اور احترام بھی! اور یہ سب آپ کے قدر دانوں میں تھے، شاعری میں آپ کو شرفِ تلمذ علامہ شفیق جونپوری، حضرت مولانا ضیاء القادری بدایونی، حضرت ادیب مالیگانوی جیسے بلند قامت صفِ اول کے اساتذہ شعرا سے حاصل تھا۔ آپ کے یہاں آمد ہی آمد ہے، آورد نہیں۔ آپ کا وجود جماعت اہلِ سنّت کے وجہ افتخار تھا۔

بانی دارالعلوم فیض الرسول حضور شعیب الاولیاء حضرت مولانا صوفی شاہ یار علی قدس سرہ العزیز نے اپنی خانقاہ میں جب دارالعلوم کی نشاطِ ثانیہ فرمائی تو مدرسِ اول کی حیثیت سے ۱۹۵۶ء میں آپ براؤں شریف تشریف لائے۔

واضح رہے کہ اس سے قبل استاذ العلماء سلطان المناظرین حضرت علامہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب قبلہ علیہ الرحمہ حضور شعیب الاولیاء کی دعوت پر وہاں زینت درسگاہ تھے، تعلیم بھی جلالین شریف تک پہنچ گئی تھی۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب ہر سو جہالت کا اندھیرا تھا، خاص کر بستی ضلع تو انتہائی کوردہ تھا۔ گاؤں کے گاؤں چھان مارے کوئی جنازہ پڑھانے والا نہیں دستیاب تھا۔ ایسے تاریک ایام میں حضور شعیب الاولیاء نے علم کی شمع روشن کی! اور وقت کے عظیم وجید عالمِ دین کی خدمات حاصل کیں۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا کہ حضرت مولانا صاحب قبلہ وہاں سے تلسی پور ضلع گونڈہ چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد وہ مدرسہ بند ہو گیا کہ اس زمانے میں علماء دین نایاب حد تک کمیاب تھے۔ مظہر شعیب الاولیاء، مجاہد سنیت حضرت بابرکت مولانا صوفی محمد صدیق عرف خلیفہ صاحب قبلہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ براؤں شریف اور عارف باللہ قطب زمانہ پیر روشن ضمیر حضرت پیر عبدالمتین صاحب قبلہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ قادریہ محبوبیہ ڈھلمؤ شریف جیسی عظیم و بلند قامت روحانی شخصیتیں حضرت علامہ عتیق الرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کے تلامذہ خاص میں سے ہیں۔ حضرت شعیب الاولیاء علیہ الرحمہ کو مدرسہ بند ہو جانے کا احساس بڑا شدید تھا۔ کچھ دنوں کے بعد آپ نے پھر کمر ہمت کسی کہ اس زمانے میں مدرسہ قائم کرنا، پھر اسے چلانا آسان نہیں تھا۔ پتھر کا جگر پانی کرنے کے مترادف تھا اور آج سب سے زیادہ آسان یہی ہو گیا ہے۔ پہلے دینی ادارے و مدرسے خالص اللہ عزوجل اور اس کے محبوب ﷺ رضا وخوشنودی اور اشاعت علمِ دین کے جذبے سے قائم ہوتے تھے، اس لیے اس کے اثرات وثمرات بہت حوصلہ افزا ہوتے تھے اور اس راہِ محبت کے امام وقائد علی العموم اہلِ دین ہی ہوا کرتے تھے، جو سراپا اخلاص ہوتے تھے جن کی برکتوں کے فیضان کا عالم ہی کچھ اور تھا۔

مگر آہ! آج یہ ایک پیشے سے عبارت ہو کر رہ گیا۔ ایک سستا ذریعۂ معاش جس میں اہلِ دنیا کود پڑے ہیں، جنھوں نے اہلِ دین کو پچھاڑ دیا ہے اور اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اب تو خلق کو دھوکہ دینے کے لیے اہلِ دنیا نے اہلِ دین کا لباس اور ان کا وضع قطع بھی اختیار کر لیا ہے تا کہ دین وعلمِ دین وتبلیغ دین کے نام پر یہ اعلیٰ تجارت کی منڈیاں سلامت رہیں۔ پہلے علمِ دین کی جو شمع جلائی جاتی تھی اس میں حسن نیت اور اخلاص کا روغن زیتون جلتا تھا اور اب اسی نوعیت کے شمع میں خودغرضیوں اور دنیوی مفاد کا بدبودار گھاسلیٹ جلتا ہے، ثمرات وحاصلات کے اعتبار سے نتیجہ اظہر من الشمس ہے۔

الٰہی یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

ایک عظیم وقد آور عالمِ دین کی جگہ پر فیض الرسول کی نشاطِ ثانیہ کے لیے حضرت علامہ نسیم بستوی کا انتخاب، وہ بھی ایک اللہ والے کا حسنِ انتخاب! بے شک موصوف کے لیے ایک بڑا اعزاز تھا۔ اس پر وہ جتنا بھی خدا کا شکر کرتے کم تھا اور جتنا بھی فخر کرتے بجا تھا۔ فیض الرسول براؤں شریف کے لیے آپ بڑے مبارک قدم ثابت ہوئے۔ آپ کو حضور شعیب الاولیاء کے انتخاب کا بڑا شدید احساس تھا، وہ بھی اس حال میں کہ ایک بڑی اور قدآور شخصیت کے شدرِحال سے وہ مدرسہ بند ہو گیا۔ اسی کو دوبارہ جاری کرنے کے لیے آپ بلائے گئے تو آپ نے بھی اپنے دورِ آغاز میں حسنِ کارکردگی اور فرضِ منصبی کا ایسا اعلیٰ مظاہرہ فرمایا، جس سے حضور شعیب الاولیاء کو بڑی مسرت ہوئی۔ مدرسہ کو تعلیمی وسعت دینے کے لیے حضرتِ اقدس نے دوسرا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری رضوی گورکھپوری کو بستی انجمن سے فیض الرسول میں لائے۔ ان کے بعد فقیہ ملّت حضرت مولانا الحاج مفتی جلال الدین احمد امجدی علیہ الرحمہ مدرسہ مخزن العلوم بھاؤ پور کے باہمی فتنے اور خلفشار سے تنگ آ کر دار العلوم فیض الرسول میں حضور شعیب الاولیاء کی کرم نوازیوں کے سائے میں پناہ لیا۔ کچھ دنوں بعد علم وادب کے بحرِ بیکراں شیخ العلماء حضرت علامہ غلام جیلانی علیہ الرحمہ جب زینت درسگاہ ہوئے۔ میں تو فیض الرسول کے علمی وادبی عظمتوں میں چار چاند لگ گئے۔ اب سبیل نور کی طرح فیض الرسول کے فیضان کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ طلبا کے ہجوم کے پیشِ نظر اساتذہ فکر وفن کا اضافہ ہوتا رہا۔ مفکرِ ملّت علامہ محمد حنیف قادری، شمس الحکماء علامہ دہر حضرت مولانا محمد نعیم الدین رضوی گورکھپوری وغیرہ، علم وفن کے ان مہ ونجوم کے ہجوم میں حضرت علامہ نسیم بستوی کی اہمیت و انفرادیت اپنی جگہ برقرار تھی بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ملک و بیرونِ ملک میں فیض الرسول کی شہرت کا آوازہ ابتدا میں حضرت علامہ محمد صابر القادری نسیم بستوی کے قلم کا رہین منت ہے۔

حضرت علامہ نسیم بستوی کا بڑا احسن یہ بھی تھا کہ ان کا گھر حضور شعیب الاولیاء کا سکندر پور ضلع بستی میں بہت طویل عرصے تک میزبان رہا۔ آپ کے والدین کریمین بڑے بھائی جناب مولوی نور الحق صاحب ان کے اہل وعیال ہی نہیں پورا خانوادہ بلکہ پورا گاؤں سکندر پور حضرت شعیب الاولیاء کے دامن ارادت سے وابستہ تھا۔

حضرت علامہ نسیم بستوی کا علمِ دین کی طرف رغبت اور پھر ان کا عالمِ دین بننا ان کے والدین کریمین کی دین پسندی، بزرگوں سے عقیدت ومحبت بالخصوص حضرت شاہ صاحب قبلہ علیہ الرحمہ سے عقیدت وارادت کا شاخسانہ تھا، جس میں حضور شعیب الاولیاء کے منشا وخواہش کا بھی دخل تھا بلکہ حضرت نے ان کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ بھی فرمائی۔

دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف نے عروج وترقی کی طرف جست لگائی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا آوازہ دور تک پہنچ گیا۔ اس شمع محمدی میں حضور شعیب الاولیاء عاشق محبوبِ کبریا، شیدائے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے اپنے اخلاص کا جو روغن زیتون ڈالا تھا، اس کا اُجالا دور دور تک پہنچ گیا اور ایک وقت وہ آیا جب فیض الرسول اپنی انفرادیت میں پورے

ملک کے بڑے مرکزی اداروں کی صف میں اپنی مثال آپ تھا۔ قابلِ ذکر اساتذہ فکروفن کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی اوران کی جوقدر دانی، عزت افزائی اوراعزاز واکرام حضور شعیب الاولیاء نے فرمایا دینی اداروں میں اس کی اب تک دوسری کوئی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ اساتذہ کرام اس دور میں وہاں ملازم نہیں سمجھے گئے، بلکہ فیض الرسول کی انتظامیہ خود ہی ان کے آگے ہمیشہ مودب رہی اورخود نہ علماء کرام واساتذہ فیض الرسول نے خود کوایک لمحے کے لیے ملازم سمجھا بلکہ اپنے فریضہ منصبی سے بہت اوپر اٹھ کرانھوں نے فیض الرسول کی ہمہ جہت ترقی کے لیے رات دن ایک کردیا۔

حضرت علامہ نسیم بستوی کے شہرت وعروج کا زمانہ بھی وہی ہے۔ ماہنامہ فیض الرسول کے اجرا کے وقت آپ مسند درس وتدریس اٹھا کراس کی ادارت کے منصب پر بٹھادیے گئے۔ لوح وقلم سے بڑا قرب تو پہلے ہی سے تھا، ماہنامہ فیض الرسول کی ایڈیٹری نے ان کے فکری وقلمی صلاحیتوں کو بڑا جلا بخشا۔ پھرتوان کے قلم نے ایک نئے انداز سے انگڑائی لی اور دیکھتے ہی دیکھتے سنّی صحافت میں ماہنامہ فیض الرسول ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ کافی دلوں کواس نے فتح کیا، فکرونظر متاثر ہوئے، ملک وملّت کے موقر جریدوں میں اس کوایک بڑی حیثیت ملی۔ ماہنامہ فیض الرسول کے ذریعے علامہ نسیم بستوی کی شہرت ومقبولیت کچھ آنکھوں سے نہیں دیکھی گئی، بالآخر ماہنامہ فیض الرسول بند ہوگیا۔ کیوں بند ہوا؟ اس کا بھی ایک پس منظر ہے (جوفی الحال ہمارے موضوع سے الگ ہے) ماہنامہ کے بند ہوجانے سے آپ کوشدید ذہنی وقلبی تکلیف ہوئی اورآپ بہت بددل ہوئے۔ حالانکہ ماہنامہ کے بند ہونے سے آپ بے کار نہیں ہوگئے اور نہ معاشی طور پر پریشان کیونکہ جیسے پہلے مدرس تھے ویسے ماہنامہ کے بند ہونے کے بعد بھی تھے، کہ ایڈیٹری کا الگ سے کوئی مشاہرہ نہیں تھا، بلکہ اسی پرانے مشاہرے ہی سے انھیں تنخواہ دی جاتی تھی۔ چونکہ ماہنامہ سے شدید وابستگی پیدا ہوگئی، گویا پورے ملک کے مذہبی وادبی حلقوں میں آپ کی شناخت! اس لیے اس کے بند ہونے سے آپ کافی افسردہ ہوئے، بالآخر آپ نے فیض الرسول کوچھوڑ دیا۔ براؤں شریف سے نکلتے ہی آپ ہاتھوں ہاتھ لے لیے گئے، کہ فیض الرسول سے طویل وابستگی اور وہاں کے حسنِ کارکردگی نے آپ کو بلند قامت وگراں مایہ بنادیا تھا۔

اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نوا دلنواز

ماہنامہ بند ہوجانے کے بعد ملک وبیرونِ ملک قارئین فیض الرسول نے اپنی بے چینیوں کا زبردست مظاہرہ کیا۔ آنے والا احتجاجی خطوط سے انتظامیہ کو ماہنامہ فیض الرسول کے خاموش اثرونفوذ کا اندازہ ہوا۔ زیادہ دنوں تک اپنے قدر دانوں کے محبانہ اصرار کونظرانداز نہ کرسکے۔ بالآخر فیض الرسول کی انتظامیہ بالخصوص اس کے لائق وفائق اورانتہائی حساس و دیدہ ور منیجر محترم مولوی محمد فاروق چشتی ابن شعیب الاولیاء شاہ محمد یارعلی نے فیصلہ کن انداز فرمایا کہ ماہنامہ فیض الرسول کی اشاعت اوراس کی ترسیل پر جوبھی خرچ آئے، اسے دارالعلوم کے سالانہ اخراجات کے بجٹ میں شامل کرلیا جائے، کہ ماہنامہ فیض الرسول کا اجرا بھی اشاعت دین وسنیت ہی ہے اوردارالعلوم فیض الرسول کا قیام کا مقصدزریں بھی اشاعت دین

وسنیت ہے۔ لہٰذا اس راستے میں مال سود وزیاں کا حساب ہی نہ رکھا جائے۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

چنانچہ جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ماہنامہ فیض الرسول کی بہر قیمت نشاطِ ثانیہ کرنا ہے تو اسی جگہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اس کے لیے علامہ نسیم بستوی کو دوبارہ واپس لایا جائے۔ علامہ نسیم بستوی کے اندر انا نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی کہ ٹال ومٹول سے کام لیتے، ان کا مشرب تو کچھ یوں تھا کہ۔

تم نہیں آتے تھے بلاتے تو
دوستی میں انا نہیں چلتی

یہاں تو برابری ودوستی کا بھی معاملہ نہیں تھا، آقائے نعمت کی بارگاہ سے آقا زادوں (حضرت خلیفہ ومنیجر صاحبان) کا بلاوہ پہنچا اور وہ خوشی خوشی دوبارہ حاضر ہو گئے۔ اور پھر ماہنامہ فیض الرسول حسب دستور پھر سے رواں دواں ہو گیا۔ فلحمد للہ علی ذالك

دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف ابتدا ہی میں الہ آباد (یوپی) بورڈ سے الحاق تھا۔ ابتدا میں الحاق سے صرف اتنا ہی فائدہ تھا کہ الہ آباد بورڈ سے مولوی عالم فاضل کی ڈگری مل جاتی تھی بس! پھر بتدریج حکومت اتر پردیش کی طرف سے ان عربی مدارس پر نوازش اور عطاؤ بخشش کا سلسلہ شروع ہوا، جو الہ آباد بورڈ سے ملحق تھے۔ پھر آگے چل کر اپنی عطاؤ بخشش کے حوالے سے ان مدارسِ عربیہ کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک وقت وہ بھی آیا کہ حکومت نے الحاقی اداروں کے اساتذہ کو پوری تنخواہ دینا شروع کیا اور ریٹائرمنٹ کے بعد سرکاری ملازمین کی طرح پنشن کا بھی اعلان کر دیا، کہ ریٹائرمنٹ کے بعد تاحیات الحاقی اداروں کے اساتذہ کو پنشن ملے گی اور ان کے انتقال کے بعد یہ پنشن ان کی بیواؤں کو ملے گی۔

علامہ نسیم بستوی صاحب قبلہ کو بھی مشاہرہ اور اساتذہ فیض الرسول کی طرح اسی سرکاری اسکیل کے حساب سے ملتا تھا۔ چونکہ دار العلوم فیض الرسول ابتدا ہی میں الہ آباد بورڈ سے ملحق ہو گیا تھا اور ملحق ہونے کے بعد اسے ایڈ والحاق کی امامت کبریٰ بھی حاصل ہو گئی۔ اس خصوص میں چھوٹے اور متوسط اداروں کا وہ مرکز امید بن گیا۔ ایں قدر سے آں قدر تک جیسے بھی اس دیوارِ قہقہہ تک پہنچنے کی طلب ہوئی وہ فیض الرسول تک پہنچا اور اس نے ایک ہی جھٹکے میں اسے دیوارِ قہقہہ تک پہنچا دیا۔ اور دیوارِ قہقہہ تک پہنچنے کے بعد ان مدارس کا حشر کیا ہوا اور ابھی کیا ہوگا۔ بڑی فیاضی کے ساتھ دینی اداروں کو کروڑ ہا کروڑ روپئے دینے والی حکومت فائدے میں رہی یا یہ دینی ادارے؟ کس نے کھویا؟ کس نے پایا؟

کعبہ دل منسلک ہے حسن کے سومنات سے
کس نے کسے مٹا دیا دیدہ وراں سمجھتے ہیں

ماہنامہ فیض الرسول کی اشاعت کا مبارک سلسلہ یوں جاری وساری تھا۔ فیض الرسول پورے صحافتی تقاضوں کے

ساتھ اپنی تجلیاں بکھیرتا رہا، کہ اسی درمیان فیض الرسول کی روح اور انتظامیہ کی جان فیض الرسول کا ساتھ چھوڑ گئی۔ فیض الرسول کی تعمیر وترقی کے پیچھے جو دل ودماغ کام کررہا تھا اس کا انتقال ہو گیا یعنی دار العلوم فیض الرسول کے انتہائی زیرک، ہوشمند، باحوصلہ، عالی دماغ منیجر مولوی محمد فاروق چشتی مرحوم بن شعیب الاولیاء علیہ الرحمہ۔ یہ سانحہ فیض الرسول کے لیے بہت بڑا سانحہ تھا۔ ان کے وصال سے فیض الرسول کا جو عظیم نقصان ہوا، اس کی بھرپائی نہیں ہوسکی۔ اس عظیم منصب واہم ترین ذمہ داری کے لیے جن کا انتخاب ہوا وہ قطعاً اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے اور وہیں سے فیض الرسول کے انتظامیہ کا ڈھانچہ چرمرانا شروع ہوا۔ مگر مجاہد سنیت، پیر طریقت حضرت بابرکت مولانا صوفی محمد صدیق صاحب قبلہ سجادہ نشین آستانہ عالیہ فیض الرسول وناظم اعلیٰ کا جاہ واقبال اسے کسی طرح سنبھالے رہا۔ شیخ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد صاحب قبلہ علیہ الرحمہ نے بار بار فیض الرسول کے بدلتے حالات کے پیشِ نظر مجھ سے خصوصی طور پر مخاطب ہو کر فرمایا، مولانا وارث جمال صاحب! حضرت خلیفۃ صاحب ایک مضبوط باندھ ہیں، جس دن یہ باندھ ٹوٹے گا سیلاب آجائے گا، جسے آپ دیکھیں گے۔ کبھی حسرت و مایوسی کے ساتھ فرماتے مولانا وارث جمال! حضرت خلیفۃ صاحب کی ذات ایک چراغ ہے، جب وہ بجھے گا تو بڑا زبردست اندھیرا چھا جائے گا جسے آپ دیکھیں گے۔ حضرت خلیفۃ صاحب کے وصال کے بعد ہی آپ نے بھی اس دنیا سے شدرِحال فرمایا۔ آپ کی روح کو ہزاروں سلام، بے شک حضرت خلیفۃ صاحب قبلہ ایک مضبوط باندھ تھے اس کے ٹوٹتے ہی فیض الرسول فتنوں کے سیلاب میں ہچکولے کھانے لگا۔ بے شک وہ ایک روشن چراغ تھے جس کے بجھتے ہی براؤں شریف میں اندھیروں کی حکمرانی ہوگئی، خانقاہ تباہ ہوگئی۔ فیض الرسول کی شہرت و ناموری کی الٹی گنتی جو شروع ہوئی تو کسی مقام پر رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہے۔ کہاں تو ایک وقت اس کے عروج کا وہ تھا کہ پورے ملک میں الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے بعد اپنے مالہ وماعلیہ کے اعتبار سے نمبر ایک پر تھا اور کہاں آج حال یہ ہے کہ قابلِ ذکر اداروں کی فہرست میں اسے اپنا نمبر ہی نہیں معلوم! ؎

زباں کھلے گی تو شعلے دہن سے نکلیں گے
میں جو سچ کہوں گا تو پھیلے گا انتشار بہت

مجاہد سنیت، مظہر شعیب الاولیاء، پیر طریقت حضرت خلیفۃ صاحب قبلہ علیہ الرحمہ کا وصال پُر ملال حضرت علامہ مفتی بدر الدین احمد قادری علیہ الرحمہ کی پیشن گوئی کے مطابق ایک مضبوط باندھ کا ٹوٹ جانا ثابت ہوا، کہ جس کے بعد فتنوں کا ایسا سیلاب امڈا جس میں فیض الرسول کا سب کچھ بہہ گیا۔ اسی بہنے والوں میں ماہنامہ فیض الرسول اور اس کے ایڈیٹر حضرت علامہ نسیم بستوی بھی تھے۔ ؎

کسی کے خانہ ویراں سے پوچھو　　　اجڑ جاتی ہے کیسے دل کی بستی

یہ داستانِ الم بڑی طویل! بڑی خونچکاں! اور بڑی دردناک ہے، جو کبھی بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے تمام جزئیات

کو کوسمیٹتے ہوئے ضرور سناؤں گا اور یہ داستانِ الم میں ہی سنا سکتا ہوں کہ خود ایک طویل ترین مدت تک میں اس کا ایک حصہ رہا ہوں۔ براؤں شریف کا قریبی حلقہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں وہاں کے لیے ایسا صاحب البیت ہوں جسے یدری ما فی البیت کی منزل حاصل ہے۔ چونکہ یہ تذکرہ حضرت علامہ نسیم بستوی صاحب قبلہ کا ہے، علامہ موصوف براؤں شریف سے کیوں الگ ہوئے یا الگ کیے گئے؟ ان کا آخری دور پریشانیوں میں کیوں گذرا؟ وہ تصویر الم کیوں بنے رہے؟ جس ادارے کے لیے انھوں نے اپنی جوانی کا لہو نچوڑ دیا، بڑھاپے میں اس ادارہ نے انھیں دربدری پر کیوں مجبور کیا؟ چونکہ فیض الرسول کی تعمیر و ترقی، اس کی شہرت و ناموری، اس کے اتار چڑھاؤ کا ایک حصہ وہ رہے اس لیے ان کی زندگی کا یہ باب بھی جاننا ضروری ہے، کہ اس ادارے کی طرف سے وہ بھی آخری عمر میں انھیں ایسا صلہ کیوں دیا گیا اور ان کو ایسے زخم کیوں دیے گئے جو زندگی بھر مندمل نہ ہو سکے، اور اسی غم کو سینے سے لگائے ہوئے وہ دنیا سے چلے بھی گئے۔ وہ فیض الرسول کے حلقۂ محبت و ارادت میں چل چل کر اپنا زخم دکھاتے رہے، بالآخر اسی زخم کو لیے ہوئے وہ دنیا سے چلے بھی گئے۔ ؎

مطمئن ہیں وہ ستم ڈھا کر کے یوں
مجھ پر احسان کیا ہو جیسے

☑☑☑☑☑☑

دینی درسگاہیں اور ان کی اہمیت

آج سے کم وبیش تین سال قبل آرایس ایس کے ڈپٹی چیف جو آج اس کے چیف بن چکے ہیں اور اگر یہاں تنہا بھاجپا ہی کی حکومت بنتی تو اس ملک کے حقیقی وزراعظم سدرشن بالی اور مسلمانوں کے دانش ورطبقہ کے درمیان محترم الحاج خلیل زاہد صاحب سابق مالک و مدیر اخبارِ عالم جو بمبئی کی ایک نمایاں، متحرک، فعال، ایثار پیشہ صحافی، سماجی اور نیم سیاسی قدآور شخصیت ہیں، انھیں کی وساطت وقیادت میں! آرایس ایس کے ذمے داروں کی خواہش اور انھیں کی خصوصی گذارش پر ایک خصوصی نشست خلیل زاہد صاحب کے ہی وسیع وعریض آفس واقع پرنس بلڈنگ جنکشن جے جے اسپتال میں منعقد ہوئی۔ موضوع تھا ہندو مسلم کے درمیان بڑھتی ہوئے دوری اور ان کے درمیان حائل وسیع اور گہری خلیج کس طرح کم ہو۔ خلیل بھائی نے مجھے خصوصی دعوت دیتے ہوئے گذارش کی کہ چند قابل ذکر علمائے دین کے ساتھ اس خصوصی نشست میں شرکت خصوصی فرمائیں۔ میں نے عرض کیا خلیل بھائی علمائے دین یہاں کے قابلِ احترام ائمۂ مساجد بھی ہیں۔ آرایس ایس جیسی مشہور مسلم دشمن تنظیم کے ساتھ شاید وہ بیٹھنے کی ہمت نہ کرسکیں، البتہ یہ خاکسار آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ایک ذمے دار اور علمائے بمبئی کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے ضرور شرکت کرے گا۔ اس مخصوص نشست میں صرف وُکلا، ڈاکٹرز اور پروفیسرز کے علاوہ مخصوص عمائدین شہر تھے۔ مسٹر سدرشن بالی کے ساتھ آرایس ایس کے ترجمان انگریزی اخبار آرگنائزر کے ایڈیٹر مسٹر مظفر برنی بھی تھے، جن سے خاکسار وارث جمال کی صاحب سلامت پہلے سے تھی۔ ہماری اور مسٹر سدرشن بالی کی کرسی ایک ساتھ تھی اور سامنے خواص کا ایک مجمع خاص!

شہادت بابری مسجد کی پاداش میں پورا ملک عتابِ الٰہی کی لپیٹ میں آچکا تھا، سیلاب، زلزلے، طوفان اور طاعون کی قہرمانیوں کے جلو میں عتابِ الٰہی کی جھلکیاں بہت واضح ونمایاں تھیں۔ سیاسی پارٹیوں میں خاص کر کانگریس مسلمانوں کے غضب کے نشانے پر تھی۔ مرکز سے کانگریس کے اقتدار کا جنازہ نکل چکا تھا۔ قدرت بھی اس پارٹی اور خاص کر اس کے اندر موجود مجرم ٹولے اور اس کے سرغنہ نرسمہا راؤ کو ذلیل کر کے مارنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ مرکز میں ایک کھچڑی سرکار ہچکولے کھا رہی تھی، کسی بھی وقت اس کا تارِ نفس ٹوٹ سکتا تھا۔ اس لیے سیاسی پارٹیاں آنے والے الیکشن کی تیاریوں میں تھیں۔ ہر پارٹی مسلمانوں کا جذباتی استحصال کرنے کے لیے طرح طرح کے دامِ فریب پھیلائے ہوئے تھیں۔ آرایس ایس کو بھی اس بے رحم حقیقت کا اِدراک واحساس ہوچکا تھا کہ مسلمانوں کی حمایت کے بغیر کسی پارٹی کو اقتدار نصیب نہیں ہوسکتا۔ حالیہ موجودہ سیاسی پیچیدگیوں کی وجہ سے مسلمان اپنی حکومت تو نہیں بناسکتے مگر ان کے بغیر کسی پارٹی کی حکومت بن بھی نہیں سکتی۔

یہی احساس انھیں مسلمانوں کے درمیان ازخود چل کر آنے پر مجبور کیا۔ محترم خلیل زاہد صاحب کے تعارفی رسم کے

بعد گفتگو کا آغاز ہوا۔ مذکورہ بالا موضوع پر وہ مسلم زعما کے نرم و گرم گفتگو وہ بڑے حوصلے کے ساتھ سنتے رہے۔ شہادت بابری مسجد کے پس منظر میں مسلمانوں کی اجتماعی بربادیوں اور تاریخی نسل کشی کے زخم سے مسلمان ابھی سنبھل نہیں پائے تھے، اس لیے کچھ قابلِ ذکر حضرات اظہارِ مدعا میں بڑے جذباتی ہو گئے۔ جس میں محترم ایڈوکیٹ حیدر پٹھان اور ممبئی امن کمیٹی کے صدر عبدالواحد خاں پیش پیش تھے۔ آخر الذکر شخصیت جناب عبدالواحد خاں (جن کا ایک سال قبل بڑے بے رحمانہ انداز میں قتل ہو چکا ہے) اپنے جذبات کے اظہار کرتے کرتے رو پڑے تھے۔

مسلمانوں کے بعد آر ایس ایس کے ڈپٹی مسٹر سدرشن بالی جو پرانے انداز کے آدھی آستین کی قمیص اور دھوتی پہنے ہوئے تھے، جوابی گفتگو کے لیے کھڑے ہوئے اور بڑے میٹھے و نرم لہجے میں اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ شکریہ کے رسمی کلمات کے بعد انھوں نے اپنی سادہ تقریر کا آغاز ان جملوں سے کیا۔

اسلام کا تعلق اپنے پہلے ہی دن سے راج نیت (سیاست) سے جڑا رہا ہے۔ چنانچہ جو اسلام راج نیت سے خالی ہو، وہ حضرت محمد ﷺ کا اسلام نہیں ہو سکتا۔

پھر انھوں نے اپنے انداز میں آقائے کائنات ﷺ ہجرت اور سرکار کے مدینہ تشریف لاتے ہی اس معاہدے کا ذکر جو آپ نے مدینہ کے مشرکین و یہود سے کیا تھا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے، کرتے ہوئے حضرت محمد ﷺ جب اپنی جنم بھومی مکّہ کو چھوڑ کر ہمیشہ رہنے کی نیت سے مدینہ آئے تو وہاں آتے ہی ایک راج نیت قائم کیا۔ آپ کے بعد آپ کے ماننے والے اسی راج نیت کو لے کر دنیا بھر میں پھیل گئے اور وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ نظامِ مصطفیٰ لے کر گئے اور آدھی سے زیادہ دنیا میں انھوں نے نظامِ مصطفیٰ کو لاگو کیا۔ وہ بار بار نظامِ مصطفیٰ کا لفظ بولتے رہے۔ پھر انھوں نے خواص کے اس مجمع سے سوالیہ انداز میں کہنا شروع کیا کہ ایک ایسا ملک جہاں تین سو ساٹھ جاتی و دھرم کے لوگ رہتے ہوں وہاں پر نظامِ مصطفیٰ کی بات کرنا کیا اُچت (مناسب) ہوگا؟ آج آپ لوگ کشمیر میں ۹۷ پرسینٹ ہیں اور ہم صرف تین، مگر آپ ہم تین پرسینٹ لوگوں کو نہیں برداشت کر پا رہے ہیں۔ وہاں کے مسلمان کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے اسی نظامِ مصطفیٰ کے لاگو کرنے کا جذبہ کام کر رہا ہے۔ جس کا جواب خاکسار راقم الحروف وارث جمال قادری نے بڑی تفصیل کے ساتھ تقسیم ملک کے بعد اہلِ کشمیر کا پاکستان کے بجائے ہندوستان سے الحاق کرنے کے پس منظر میں دیا، جس کی بڑی تحسین ہوئی اور جو بڑی خوش گوار جرأت کے ساتھ سنا گیا اور ۹۷ فیصد کا اپنے ۱۰۰ر فیصد بھائیوں سے منہ موڑ کر اپنا سیاسی و اقتصادی قبلہ ہندوستان کو بنایا۔ تو اس ملک نے انھیں معاشی بدحالی، بے روزگاری، بھوک مری کے علاوہ اور کیا دیا؟ اور آج ان کے ساتھ آپ کی فوج جو کچھ سلوک کر رہی ہے، کیا انھیں اپنا جہت قبلہ بدلنے کی سزا نہ مانا جائے۔ پھر میں نے کشمیر کے بدبختانہ حالات کا تاریخی تجزیہ کرتے ہوئے ان سے بار ہا پوچھا کہ آخر اس صورت کا ذمے دار اہلِ کشمیر ہیں یا آپ؟ تو اس کا کوئی جواب ان سے بن نہ پڑا۔ کشمیر کے تعلق سے اپنے تاریخی تجزیے کی تفصیل میں جانا طوالت کا باعث ہوگا، ورنہ میں اسے ضرور پیش کرتا۔ اور پھر یہ چیز ہمارے اس موضوع سے ہٹ کر بھی ہے۔ البتہ انھوں نے ہندو مسلم کے درمیان دوری کی

جو دوسری اہم وجہ بیان کی اس کا ہم ذکر ضرور کریں گے کہ وہ ہمارے اس موضوع سے متعلق ہے اور اسی کے پس منظر میں مجھے دینی اِداروں کی اہمیت پر روشنی ڈالنی ہے۔

چونکہ ان کا خطاب عوام سے نہیں بلکہ خواص سے تھا، دانش وروں، دیدہ وروں اور مسلمانوں کے خالص ذمے دار طبقے سے تھا۔ اس لیے اس کی ایک بڑی اہمیت تھی۔ پھر وہ اپنے نرم خوئی و نرم روئی و روایتی لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے یوں گویا ہوئے میری نگاہ میں ہندو مسلم کے درمیان دوری کی ایک بڑی و بنیادی وجہ مسلمانوں کی تعلیم بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں ایجوکیشن کی بڑی کمی ہے۔ کمی تو ہمارے ہندوؤں میں بھی ہے مگر مسلمانوں کے مقابلے میں ایجوکیشن میں وہ بہر حال آگے ہیں اور پھر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے بچوں کو کالجوں اور ہائی اسکول کے بجائے مدرسوں اور دینی مکتبوں میں بھیجتی ہے۔ وہاں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ کچھ اور قسم کی ہوتی ہے۔ مسلمان بچے جو دینی مکتب و مدرسے سے پڑھ کر نکلتے ہیں وہ ہندو مسلمان میں دوری کا ایک بڑا سبب بنتے ہیں، جبکہ کالج و اسکول میں پڑھنے والوں میں یہ باتیں نہیں ہوتیں۔ لہٰذا ہم مسلمان بھائیوں سے یہ پرارتھنا (اپیل) کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو زیادہ سے زیادہ کالج و اسکول میں پڑھائیں تا کہ ہندو مسلمان کے درمیان دوری کم سے کم ہو اور دونوں فرقوں کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے کو کم کیا جا سکے۔

ہمارے دینی مدارس کے تعلق سے اپنے ان احساسات کا اظہار وہ ہمارے درمیان کر رہے تھے۔ ہم ان کے شکر گزار ہوئے کہ ہمارے مذہبی اِداروں کے تعلق سے انھوں نے اپنے احساسات کو چھپایا نہیں۔ جب وہ ہمارے درمیان اپنی نیتوں اور خواہشوں کو اس انداز میں پیش کر رہے تھے تو پھر اندرون خانہ ہمارے وجود کے تعلق سے ان کی منصوبہ بندیوں کا عالم کیا ہوگا؟ اس بیان کی روشنی میں دینی اِداروں اور مدرسوں کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ آپ کی مذہبی بقا اللہ کے فضل و کرم اور اِن اِداروں کی بقا میں مضمر ہے۔ اپنے ان اِداروں کے تعلق سے آپ اب بھی اگر بے حسی و غفلت کے شکار ہوں تو خدارا اب سے آنکھیں کھولیں۔ اس خصوصی نشست کو انگریزی میڈیا نے بڑا کوریج دیا۔ آرگنائزر نے با قاعدہ ایڈیٹوریل لکھا مگر اردو اخبارات خاموش ہی رہے، وجہ جو بھی رہی ہو۔

آہ! ایڈ و اِلحاق کے نام پر ہمارے چھوٹے بڑے دینی اِداروں پر ایک کامیاب شب خون مار کر یہ ابھی مطمئن نہیں ہوئے ہیں۔ ایک چھوٹا سا مکتب کتنا اہم ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ابھی ماضی قریب ہی کی بات ہے صرف چند سال پیچھے جو لوگ اخبار پڑھنے کا عادی ہیں، ان کے حافظے میں یہ بات یقیناً ہوئی اور اگر حافظے سے نکل گئی ہے تو اس یاد دہانی سے یقیناً انھیں یاد آئے گا اردو اخبارات میں ایک ہاہا کار مچی تھی، بڑی بڑی سرخیوں کے ساتھ صفحات بھرے ہوتے تھے کہ علی گڈھ ضلع کے دور اُفتادہ دیہی علاقوں میں گاؤں کے گاؤں اسلام سے دور ہو گئے۔ عبد اللہ کے بیٹے شری رام اور عبد الرحمٰن کے بیٹے رام پرکاش ہو گئے۔ تحقیقاتی ٹیمیں جب وہاں پہنچیں اور ان کے سروے رپورٹ جب سامنے آئی تو معلوم ہوا۔ مسلم یونیورسٹی کے چکا چوند علمی و تہذیبی اُجالوں کے پیچھے جہالت و بے نوری کی بڑی بھیانک تاریکی

پھیلی ہوئی ہے۔ دور دراز گاؤں میں مسلمانوں کے بچوں کے لیے ابتدائی مرحلے کے لیے ایک دینی مکتب بھی نہیں کہ جہاں ان کا بچہ اپنا حلق بھی تر کر سکے۔ کلمہ، درود، خدا، رسول، دین و ایمان اور قرآنِ مجید کی صورت بھی دیکھ سکے۔ مجبور ہو کر مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری و پرائمری اسکولوں میں لے جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر جب بچے کا نام پوچھتا تو باپ اگر عبداللہ، عبدالرحمٰن، حبیب احمد بتا تا تو ماسٹر کہتا: بھائی! اس نام سے ہمارے یہاں داخلہ نہیں ملے گا۔ سادہ لوح حالات کا مارا دیہاتی مسلمان پریشان ہو کر کہتا: ماسٹر صاحب! جس نام سے بچے کا داخلہ مل جائے، وہی نام رکھ دیجیے۔ بس ہمارا بچہ بھی کسی طرح پڑھ لے۔ ماسٹر خوش ہو کر سمجھانے لگتا: ہاں نام بدل دینے سے بچے کا داخلہ بھی ہو جائے گا، فیس بھی معاف ہو جائے گی۔ اُلٹے سرکار کی طرف سے بچے کو وظیفہ بھی ملے گا۔

اس طرح سے مسلمان کے بچے عبداللہ، عبدالرحمٰن، احمد علی سے شنکر، رادھے شیام اور رام پرکاش بن جاتے۔ اگر آج ان گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکتب ہی ہوتا تو مسلمان بچے اپنی شناخت تو برقرار رکھتے۔ اللہ و رسول، دین و ایمان، کلمہ و قرآن اور درود و سلام سے تو واقف ہوتے۔

اُمید کی مدھم سی اِک لو ہو تو پیاری ہے
یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

آپ نے کبھی غور کیا، دینی و مذہبی اِداروں میں ایڈ و الحاق کی بیماری صرف بہار و اُتر پردیش ہی تک کیوں محدود رہی؟ مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، گجرات، آندھرا پردیش، پنجاب و ہریانہ، دلی، کرناٹک، تامل ناڈو، کیرالہ وغیرہ اس کی لپیٹ میں کیوں نہیں آئے، جب کہ یہ صوبے بھی ہندوستان کے اٹوٹ حصّے ہیں، صرف بہار اور اُتر پردیش ہی کو یہ خصوصی درجہ، خصوصی مرتبہ اور مخصوص ترین شرف و مقام کیوں؟ کون سے سُرخاب کے پَر لگے ہیں ان دونوں صوبوں میں؟ اگر اس حقیقت کبریٰ کے سرحد ادراک تک ابھی نہ پہنچے ہوں تو سن لیجیے یہی دو صوبے خاص کر یوپی وہ مقام ہے جہاں سے دین کی اشاعت کا کام عالم گیر بنا ہوا ہے۔ اندرونِ ملک کی تو بات ہی کیا بیرونِ ملک میں براعظم افریقہ، براعظم یورپ، براعظم امریکہ وغیرہ الغرض سندھ کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر اسلام کی عظمتوں اور اس کے فطری فیضان کا جھنڈا بلند کیے ہوئے ہے۔

اعظم گڑھ، بستی، سدھارتھ نگر، لکھنؤ، بریلی شریف، مراد آباد، علی گڑھ، بدایوں شریف، سہارن پور، رام پور، پٹنہ، جمشید پور، سہسرام وغیرہ یہ سب مقام یہیں واقع ہیں۔ علم کے جتنے بڑے بڑے اِدارے و عربی دانش کدے علی العموم سب یہیں ہیں۔ کسی اور صوبے میں بھی اگر کچھ قابلِ ذکر اِدارے قائم ہو گئے ہیں تو یہ بعد کی باتیں ہیں اور حقیقت میں انھیں مقامات سے جاری فیضان کی نہریں ہیں۔

دستورِ ہند میں دیئے ہوئے کاغذی حقوق کے تحت کوئی حکومت انھیں یک لخت ختم نہیں کر سکتی تھی، اور پھر عالمِ اسلام سے اسے اپنا سیاسی رشتہ بھی تو برقرار رکھنا تھا۔ آخر دنیا کے پچاس سے زائد مسلم ممالک کو بھی تو منہ دکھانا تھا۔ اس لیے ان

بڑے چھوٹے دینی اِداروں وعظیم دانش کدوں کو صورتاً باقی رکھ کر حقیقتاً ختم کردیا۔ ان کی ہمہ گیر اِفادیت وحقیقی عظمت اور اس کی روح کو ختم کر کے عملاً محسوس طور پر یہ جتادیا کہ

ع صورت ببیں حالت مپرس

جب جسم سے روح نکل جائے تو اس کی حیثیت کیا رہ جائے گی؟ موتیوں سے آب نکل جائے تو وہ صرف پتھر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ان اداروں سے علمی، دینی، فکری روح کو سلب کرنے اور اس کی قرار واقعی حیثیت وعظمت ختم کرنے کے لیے ایڈ والحاق کے نام پر اپنے خزانے کا منہ کھول دیا۔ روپے پیسے بہتر زندگی مستقبل کی حفاظت کے نام پر اپنے خونی پنجے ان عظیم عربی و دینی مراکز و دانش کدوں پر گاڑ کر انھیں بے بس کردیا۔ اب یہ اِدارے حکومت کی مرضی کے خلاف سانس نہیں لے سکتے۔ اپنی مخصوص انفرادیت کی حفاظت وصیانت کی بات تو بہت دور رہی۔

آج گرام پنچایت جیسے معمولی الیکشن کے لیے حکومت اپنی دینی اِداروں کے ملازمین کو حکم دیتی ہے کہ اپنی ان درس گاہوں کو بند کر کے الیکشن کی ڈیوٹی پر لگ جاؤ۔ بس فوراً وہ درس گاہیں بند ہوجاتی ہیں اور جب تک الیکشن اپنی آخری مرحلے سے نہیں گزر جاتا وہ درس گاہیں بند ہی رہتی ہیں اور وہاں کے شیخ الحدیث، شیخ القرآن، شیخ الادب، شیخ المعقولات، شیخ الجامعہ، امام النحو، شیخ الصرف قسم کی بے بس مخلوق اپنے خداوند نعمت کے حکم پر ایک پاؤں سے کھڑی ہوجاتی ہے۔ اور حدیث وتفسیر، اُصول وفقہ، بیان ومنطق وفلسفہ، نحو وصَرف اور ادبِ عالیہ کے نام گرامی اساتذۂ کرام، مفتیانِ عظام، اساطین اُمت الیکشن کی ڈیوٹی پر لگ کر کبھی ووٹوں سے بھری پٹیاں اپنے مقدس کاندھوں پر رکھ کر ڈھوتے نظر آتے ہیں تو کبھی وہ ٹرسٹ دیکھنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں تو کبھی پیارے پیارے ووٹروں کی بھدی انگلیوں پر نہ مٹنے والا نشان لگانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ آہ! یہی وہ مقدس لباس والے ہی تو تھے کہ جن مقدس جبینوں کی ایک شکن شاہانِ وقت تشویش میں مبتلا کردیا کرتی تھیں۔ جن کی دستار کو تھامنے اور جن کے قبا کو بوسہ دینے کے لیے سلاطین جہاں آگے بڑھا کرتے تھے۔ جن کا سامنا کرتے وقت کجکلاہانِ وقت کی سانسیں اُکھڑنے لگتی تھیں اور آج جب اسی طرح کے مقدس لباس والے فقیہانِ حرم، غزالی زماں اور رازیِ وقت اپنے بلند مقام ومنصب کے ساتھ علم دین کو اس انداز میں ذلیل کرنے پر جب مجبور ہوتے ہیں تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور جبر بھی کیسا؟ جبر اختیاری فاعتبروا یا اولو الابصار۔

میں بلبل نالاں ہوں اک اُجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو مولیٰ دے

ابھی تک تو حکومت کے نشانے عربی وفارسی کی بڑی اور متوسط درس گاہیں ہی تھیں، مگر اب اس کے دامِ فریب ونشانے پر ان درس گاہوں کے طلبا اور دینی مکاتب بھی آگئے۔

عربی وفارسی کے متوسطات تک طلبا اور پرائمری کے بچوں کو بھی حکومت خاطر خواہ وظیفہ دینے لگی ہے، جس کی وجہ سے اب چھوٹے ومتوسط تک کے طلبا پڑھنے والے کم اور وظیفہ کے نام سے روپیہ بٹورنے والے طلبا کی خاص تعداد پہنچ چکی

ہے کچھ تیز بندے تو بیک وقت تین تین اِداروں کے طالب ہوتے ہیں اور تینوں جگہوں سے مالِ غنیمت حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

گاؤں گاؤں پرائمری کے اسکیم سے گاؤں دیہات کے دینی مکاتب کافی متاثر ہو رہے ہیں، جہاں سرکاری، پرائمری کی کوئی ضرورت نہیں وہاں بھی سرکاری پرائمری لازم کردی گئی ہے اور اس پرائمری کے بچوں کو خاطر خواہ وظیفہ بھی جس سے دینی مکاتب سے نکل کر سرکاری پرائمری میں آجائیں۔ آپ کا یہ اِدارہ مدرسہ غوثیہ جس گاؤں میں قائم ہے، اس علاقے میں مذہبی اُجالا بڑا غنیمت ہے کہ اس مدرسہ کے مکتب میں پہلی کلاس سے پانچویں تک بچوں کی تعداد ساڑھے تین سو ہے۔ ذریعۂ تعلیم اردو کے ساتھ ہندی بھی ہے مگر اردو پر زور زیادہ ہے۔ اس مدرسہ کے پانچویں کی سَند سے سرکاری اسکول کے چھٹی کلاس میں داخلہ بڑی آسانی سے ملتا ہے۔ بلکہ یہاں کے بچوں کو اولیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک کے جی کلاس سے لے کر آٹھ کلاس تک ایک جونیئر پرائیویٹ اسکول بھی ہے۔ اس کے باوجود بڑھیا میں سرکاری پرائمری قائم کرنا ضروری سمجھا گیا، تا کہ پیسے کے لالچ میں غریب و معاشی بدحالی کے شکار والدین دینی مکتب سے اپنا بچہ نکال کر یہاں داخل کریں۔ اس طرح خود بخود ان بچوں کا رُخ سوئے حرم سے پھر جائے گا ؎

دامن پہ کوئی چھینٹ، نہ ہاتھوں میں کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو ....

شہر جہاں علم و تہذیب کا اُجالا خاطر خواہ ہوتا ہے، اس کے مقابل دیہات میں علم و تہذیب کا اُجالا بہت محدود ہوتا ہے اور پچھڑے علاقوں میں زیادہ تر اندھیرے و جہالت ہی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ ایسے میں چھوٹے بڑے دینی مکاتب خواہ وہ چھپڑ اور پھوس ہی پر کیوں نہ مشتمل ہوں، ان کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ وادیِ ظلمات میں امید کی کرن کی حفاظت بہت ضروری ہو جاتی ہے، تا کہ ہمارا بچّہ دین احمد سے رام دین نہ بن سکے۔

بڑے اور متوسط اِداروں کا نوحہ تو ہم کر چکے کہ کس طرح ایڈ و الحاق کے نام پر روپے کا دہانہ کھول کر انھیں اپنے بنیادی و عظیم مشن سے ہٹا دیا گیا۔ جس طرح ''مغربی استعمار'' نے ایک طویل، صبر آزما اور خاموش جدو جہد کے بعد ''ڈی جی ہوگارتھ''، ''لارنس آف عربیہ'' اور ''ہمفرے'' وغیرہ کے ذریعے عالم اسلام پر اپنا خونی پنجہ گاڑنے، مشرقِ وسطیٰ بالخصوص عربوں کو کنٹرول کرنے اور آئے دن اپنے سیاسی غنڈہ گردی کے مظاہرے کے لیے ارضِ فلسطین پر اپنے ایک فوجی اڈے کو ''اسرائیلی ریاست'' کی شکل دے کر ؎

خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

کی جو ناپاک و دل خراش اور جاں سوز روایت قائم کی ہے، مقصدیت کے اعتبار سے کچھ اسی طرح کا حادثہ یہاں ہندوستان میں ہمارے دینی اِداروں میں بھی پیش آیا۔ بہتر زندگی، مستقبل کی حفاظت کا لالچ دے کر ہمارے اکثر بڑے و قابل ذکر اداروں کو اپنے کنٹرول میں کرلیا۔ اسکول، کالج، یونیورسٹیز تو ان کے تھے ہی، مذہب و اسلامی علوم کی بقا اور فروغ

دین کے یہ خالص دینی ادارے وعربی دانش کدے جو تھے، یہ مسلمانوں کے اپنے ذاتی اور پرسنل اِدارے تھے، جواَب ان کے نہ ہوکر حکومت کے ہوکر رہ گئے ہیں۔ اینٹ و پتھر کی بڑی بڑی عمارتوں کا نام مدرسہ وادارہ نہیں بلکہ ان کے اساتذہ اورطلبا کا نام اِدارہ ہے۔فکرِ اسلامی، روحِ محمدی کے فروغ کی جگہ کا نام اِدارہ ہے۔اب ان اِداروں میں اساتذۂ کرام کم، خادم وحکومت کے وفادار ملازمین زیادہ ہیں۔رہ گئی فکر اسلامی وروحِ محمدی تو کچھ اَوروں سے تو رخصت ہوچکی ہے اور کچھ رُخصتی کے کگار پر ہے۔

صورتاً دیکھنے میں وہ اِدارے تو ہمارے ہی نظر آتے ہیں کہ بادی النظر میں وہ ہماری ملکیت دکھائی دیتے ہیں۔مگر حقیقتاً وہ بڑے دینی مراکز اب ہمارے نہیں رہے، بلکہ سب حکومت کی امانت ہیں جو ہماری نگرانی و چوکیداری میں دے رکھے ہیں اس نے۔ کہ ان کے پاس ایسے افراد ابھی تیار نہیں ہوسکے ہیں جو اِن اِداروں کو ہماری طرح چلاسکیں یا کچھ مصلحتیں کچھ دیر اور انتظار کے متقاضی ہیں۔

کیا آج سے تیس برس قبل ایڈ و اِلحاق کی برکتوں کے ظہور ترتیب کا یہ حال تھا جو آج ہے؟ ان ادارے کے بانیوں کے وہم وگمان میں یہ بات ہوتی کہ آگے چل کر ہمارے اِداروں کی حالت یہ ہوگی تو بے شک وہ نفوسِ قدسیہ اسی وقت ان اداروں کا الحاق تڑوا لیتے۔جس طرح حضور مجاہد ملت شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمۃ والرضوان نے ان آنے والے خطرات کومحسوس کر کے اپنے ادارے جامعہ حبیبیہ، الہٰ آباد، مدرسہ فیاض العلوم پکسر اواں رائے بریلی وغیرہ کا الحاق اُسی وقت تڑوا دیا تھا اور پھر اپنے حلقۂ اثر واطاعت میں کسی ادارے کو ملحق نہیں ہونے دیا۔ ؎

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیرانِ طریق

لیکن اب تو پانی سر سے کافی اونچا ہوچکا ہے اور ان بزرگوں کے خلاف جو اِن کے بعد ان اِداروں کے ذمے دار ہیں ان کے پاس اپنے بزرگوں جیسی شانِ استغناز، توکّل، خوداعتمادی اور خدااعتمادی کی دولت گراں نہیں ہے ورنہ یہ جال اب بھی توڑا جاسکتا ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ہم اپنے بڑے بڑے دینی اِداروں ومراکز سے توتقریباً ہاتھ دھو ہی بیٹھے ہیں (جی ہاں! تھوڑی سی جو کسر رہ گئی ہے وہ جلد پوری ہوجائے گی۔اس کے لیے اب زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا)۔

اب سرکاری پرائمری کے مقابلے میں اپنے دینی مکاتب کا بھی بس اللہ والی ہی والی ہے۔ ہندوستان میں زیادہ آبادی دیہات میں ہوتی ہے۔ شہروں کے مقابلے افرادی قوت دیہاتوں ہی میں زیادہ ہوتی ہے جبکہ شہروں کے مقابلے میں دیہاتوں کے وسائل وذرائع کافی محدود ہوتے ہیں۔ کوئی بڑا کام کرنے یا کوئی ادارہ چلانے یا مساجد و مدرسہ واداروں

کی تعمیر میں وہ دشواری نہیں جو دیہاتوں میں ہے۔ اہلِ خیر، اہلِ ثروت زیادہ تر شہروں ہی میں ہوتے ہیں۔ اور وہ یہاں اپنی آنکھوں کام دیکھتے ہیں، جبکہ دیہات کا معاملہ یؤمنون بالغیب کی منزل میں ہوتا ہے۔ اس مصروف و مشینی زندگی میں کسے اتنی فرصت کہ وہ دیہاتوں کی خاک چھانے جب کہ جنت کی کھڑکی و دروازے کھولنے کھلوانے کی چیزیں شہروں میں بھی دستیاب ہیں۔

اور اگر کوئی دل دردمند یا ٹرسٹ دیہات کی طرف متوجہ بھی ہوا تو وہ خود نہ جا کر اپنا معتمد علیہ نمائندہ بھیجتا ہے، جو اس کی آنکھ اور کان ہوتا ہے۔ جو علی العموم کسی خاص وجہ سے غیر جانب دار نہ رہ کر غالب کا طرف دار ہو جاتا ہے اور اپنی رپورٹ پیش کرتے وقت اس کی توجہ اس ہی طرف مبذول کراتا ہے جہاں سے وہ زیادہ خوش ہوتا ہے اور جن سادہ لوحوں کو نمائندہ خاص کو خوش کرنا نہیں آتا وہ بس منہ دیکھتے اور ہاتھ ملتے ہی رہ جاتے ہیں اور گاڑی پلیٹ فارم چھوڑ دیتی ہے۔

لہجے میں میرے تلخ حقیقت کی آنچ ہے
یہ آنچ تیرا پھول سا چہرہ جلا نہ دے

الغرض دیہاتوں میں دینی و سماجی کام کرنے یا کوئی دینی و مذہبی ادارہ چلانے میں پتہ پانی اور زہرہ آب کرنا پڑتا ہے اور خاص کر وہ دینی ادارے جو حکومت کے آگے خود سپردگی کے لیے تیار نہیں، ان کے لیے ادارہ باقی رکھنا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کہ انھیں بہتر و باصلاحیت افراد مناسب مشاہرے پر بھی دستیاب نہیں کہ حکومت کے مقابلے میں یہ ادارے نہ اپنے مدرسین کو مشاہرہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی پینشن کے نام پر ان کے اور ان کی رفیقۂ حیات کی مستقبل کی ضمانت۔

ہاں اگر کسی طرح صاحبِ صلاحیت کو ایڈیڈ مدراس میں جگہ نہیں ملتی تو وہ وقت گزاری کے لیے غیر ایڈیڈ مدرسوں پر احسان کر دیتا ہے، مگر ایڈیڈ مدرسے کے لیے جگاڑ لگائے رہتا ہے۔ بڑی خاموشی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور سالوں خاموش رہنے کے بعد جب اس کے تقدیر کی لاٹری کھل جاتی ہے تو وہ اُڑن چھو ہو جاتا ہے۔ اب وہی غیر ایڈیڈ ادارے خاطر خواہ چل سکتے ہیں جسے کسی بابا یا دادا یا کمرشیل پیر کی سرپرستی حاصل ہو یا سپر اسٹار قسم کے خطیب اس کے روحِ رواں ہوں۔

غیر ایڈیڈ ادارے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو ہو جو ایڈ و الحاق کی لائن میں برسوں سے کھڑے ہیں رشوت کی تھیلیوں کے ساتھ مگر بھیڑ کی وجہ سے لائن بڑی لمبی ہو گئی ہے کہ کاروبارِ حیات کی اس دوڑ میں خالص دنیادار کھلاڑی بھی اتر چکے ہیں کہ مدرسہ قائم کر کے اسے ایڈ و الحاق کرانا ایک کاروبار ہو کر رہ گیا ہے اور کاروبار بھی ایسا بڑا ہی نفع بخش جسے دیکھیے ڈیڑھ اینٹ کی ایک مسجد بنائی اور کاغذ پر ایک خاکہ بنایا، کاغذ کے پیٹ بھرے اور رشوت کی تھیلی پکڑی اور کھڑے ہو گئے ایڈ و الحاق کی لائن میں۔ چونکہ گوہرِ مقصود تک ابھی نہیں پہنچ سکے ہیں یعنی الحاقی قلادہ ان کی گردنوں میں ابھی تک نہیں پڑ سکا اس لیے وہ غیر ایڈیڈ ہیں۔ دوسرے غیر ایڈیڈ وہ ادارے ہیں جو ایڈ و الحاق کے معیار سے بلند تر ہونے کے باوجود ابتدا ہی

سے اپنے اوپر حکومت کی کرم فرمائیوں کے دروازے ارادتاً بند کیے ہوئے ہیں۔ کسی طرح کی ترغیب وتحریص انھیں متزلزل نہ کرسکی۔ آج ایڈ والحاق کے لیے آسانیاں نہیں رہ گئیں کہ جب سے یہ کاروبار بنا ہے تب سے لوگ ایک نفع بخش تجارت سمجھ کراس کی طرف دوڑ پڑے ہیں۔ اس وجہ سے بھیڑ زیادہ بڑھ گئی ہے، قطار لمبی ہو چکی ہے۔ پھر بھی لوگ اس دیوارِ قہقہہ کے لیے گر پڑتے ہیں۔ جب کہ آج سے تیس برس پہلے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ خالی خالی بڑے اِدارے ہی ایڈیڈ تھے اور ہمارے عہدِ طفلی میں تو صرف چند ہی ادارے تھے اور امتحان کا سینٹر الہٰ آباد ولکھنؤ ہوا کرتا تھا۔ اس وقت دینی اِداروں کے مدرسین کے لیے سرکاری تنخواہ اور روپے پیسے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

حکومت کے گماشتے اور رجسٹرار معیاری درسگاہوں تک خود جا جا کر ایڈ والحاق کے فضائل ومناقب اور فوائد بیان کرکے ترغیب وتحریص دیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے دامِ فریب میں جو آ گیا وہ پھنس گیا اور جسے اللہ نے اپنے فضل سے بچالیا وہ بچ گیا۔

اللہ جل جلالہٗ کے فضل وعنایاتِ خصوصی اور حضور سیدنا غوث الاعظم کی کرم گستری سے بچ جانے والے چند گنے چنے اداروں میں یہ ادارہ ''مدرسہ غوثیہ فیض العلوم'' بڑھیا، یوپی بھی ہے۔ حکومت وقت نے اس سے بھی ہاتھ صاف کرنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ اس وقت کے رجسٹرار محترم ابوذر رمعانی نظامی تین باراس ادارہ میں بہ نفس نفیس تشریف لا چکے تھے۔ طلبہ کی تعداد، مدرسین کا اسٹاف اور مدرسہ کی عمارت سب کچھ اس وقت کے ایڈ والحاق کے معیار پر تھا۔ اراکینِ مدرسہ کو قائل و مائل کرنے کا کوئی دقیقہ انھوں نے باقی نہیں لگایا۔ مگر اس ادارہ کے بانی ومنیجر محترم الحاج سیٹھ ملّا محمد منیف صاحب قادری یارعلوی مرید خاص حضور شعیب الاولیاء وخلیفۂ حضور مجاہد ملت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری متعنا اللہ بطول حیاته و حسن خدماته کو محترم ابوذر رمعانی نہ تو قائل کرسکے اور نہ ایڈ والحاق کی طرف مائل۔ ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔ ؎

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس وقت مدرسہ غوثیہ بڑھیا اپنے مرکز دارالعلوم فیض الرسول کے بعد ضلع بستی کی ایک منفرد، ممتاز اور نمایاں دینی درس گاہ تھی۔ راقم الحروف خاکسار محمد وارث جمال قادری یارعلوی نے اپنی پوری ایک جماعت کے ساتھ جلالین کے آٹھ پارے تک یہیں تعلیم حاصل کی۔ سال ہر سال مولویت کی دستار بندی ہوتی تھی۔ جن میں حضور سید العلماء حضرت علامہ سید آلِ مصطفےٰ صاحب قبلہ علیہ الرحمہ، حضرت علامہ ارشد القادری، حضرت علامہ مفتی عبدالمنان اعظمی، حضرت علامہ صوفی نظام الدین بستوی جیسی نفوسِ قدسیہ کا نزول اجلال ہوا کرتا تھا۔ چونکہ اراکین ادارہ عالم وفاضل کی سند ودستار کے لیے ہر چھوٹی بڑی جگہ کے قائل نہ کل تھے، نہ آج۔ وہ اس کی اہمیت کے پیش نظر چند مرکزی اِداروں تک ہی اسے محدود دیکھنا چاہتے ہیں۔ جیسے الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور، دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف، جامعہ نعیمیہ مرادآباد، منظر اسلام ومظہر اسلام بریلی شریف، مگر آج گاؤں گاؤں اور گلی گلی دستارِ فضیلت کے سوانگ نے اس کی عظمت وانفرادیت کو تقریباً ختم ہی کردیا

ہے۔اناللہ وانّاالیہ رٰجعون۔

ہر بولہواس نے نفس پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

چونکہ دارالعلوم فیض الرسول شمال مشرقی یوپی کاایک بڑامرکزی،تاریخی اور منفرد کردار کا حامل ادارہ تھااور بحمدہٖ تعالیٰ ہزاراُتار چڑھاؤ کے باوجوداس کی انفرادیت آج بھی اظہر من الشّمس ہے۔اس لیے مدرسہ غوثیہ میں تعلیم مکمل کرنے والے طلبا کوکل بھی براؤں شریف سندودستارِفضیلت کے لیے بھیج دیاجاتاتھااوروہی پاکیزہ روایت آج بھی برقرار ہے۔البتہ اگر کسی طالب علم کی خواہش اشرفیہ مبارک پور یا بریلی شریف کے لیے ہوتی تو اسے وہاں کے لیے اجازت دے دی جاتی۔ مقام مسرت ہے کہ بڑھیا سے اپنی تعلیم مکمل کر کے براؤں شریف جیسی بلند معیار کی مرکزی درس گاہ میں وہاں کے منتہی طالب علموں میں بڑھیا کے طالب علم اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے نہ صرف ممتاز بلکہ آج بھی نمبر ایک پر ہیں **فلحمدللہ رب العٰلمین**۔

ایک غلط فہمی کااِزالہ:

کچھ حلقوں میں یہ غلط فہمی ہے کہ اِس اِدارے کوشیخ الاساتذہ بدرالعلماء حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری علیہ الرحمہ نے قائم فرمایا تھا،نہیں! بلکہ حضرت والا کے بڑھیا(یوپی) تشریف لانے سے تقریباًدس سال قبل سے قائم تھا۔مظہر شعیب الاولیاء پیر طریقت بابرکت حضرت خلیفہ محمد صدیق احمد قادری چشتی علیہ الرحمۃ والرضوان خلیفہ وجانشین حضور شعیب الاولیاء وناظم اعلیٰ دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کی سرپرستی میں الحاج مُلّامحمد منیف قادری یارعلوی نے قائم کیا تھا، بھگوت پور کے حاجی عبداللہ وعبدالرؤف خاں وحاجی عین اللہ کیتھولیاکے تحصیل پردھان بڑھیا کے حاجی عبدالمصطفیٰ وغیرہ اس کے بانی ممبروں میں سے تھے۔

ابتدا سے کم وبیش ۲۵ر برس تک فقیہ ملت حضرت مولانا الحاج مفتی جلال الدین احمد امجدی مفتی فیض الرسول اس کے ناظم تعلیمات تھے۔دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کے صدرالمدرسین کے منصب جلیلہ سے چند در چند وجوہ سے مستعفی ہوکر مدرسہ کی غربت کے پیش نظر معمولی وقلیل تنخواہ کے باوجوداس ادارے کوخدمت علم دین کے لیے جومنتخب فرمایا اس کی دو بڑی خاص اہم وجہیں تھیں اوّل یہ کہ یہ ادارہ گورنمنٹ سے الحاق نہیں تھااوراپنے دور میں حضور مجاہد ملت کے بعد ایڈیڈ مخالفت کے سب سے بڑے سرخیل حضرتِ والا ہی تھے،عدم الحاق کی وجہ سے یہ حضرتِ والا کے مزاج کے عین مطابق تھا۔تعلیمی میدان میں ایک شاندار روایت اور ضلع بستی کے متوسط اِداروں میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔دوسری اہم وجہ یہ تھی بڑھیا وعلاقہ بڑھیا حضور شعیب الاولیاء کے روحانی قلم رو میں ایک خاص حیثیت رکھتا تھا۔اہلِ بڑھیا کی روحانی وابستگی براؤں شریف سے کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔بانی ادارہ الحاج مُلّامحمد منیف قادری یارعلوی کا حضور شعیب الاولیاء کے صف اوّل کے ممتاز مریدوں میں شمار تھااور اب توحضرت کے باقی رہ جانے والے صرف چند مریدوں میں

یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں ان کے وجود حیرت کو ان کے مرشد حضور شعیب الاولیاء کی کرامت ہی سمجھنا چاہیے۔ یہ وجہ ہے کہ آج پورا خانوادہ شعیب الاولیاء اس نسبت خصوصی کے حوالے سے ان کے لیے اپنا دل بچھائے رہتا ہے۔

بڑھیا براؤں شریف سے مسافتاً بھی بہت قریب ہے، صرف چھ میل کا فاصلہ۔ حضرت مولانا صاحب قبلہ کو حضور شعیب الاولیاء کی ذاتِ گرامی ستودہ صفات سے غایت درجے کی عقیدت بھی تھی۔ اظہارِ نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے بدرالدین کی دینی تربیت حضرت شاہ صاحب قبلہ (یعنی حضور شعیب الاولیاء) کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ حضور شعیب الاولیاء کے فیضانِ ولایت کی ٹھنڈی چھاؤں سے زیادہ دور جانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ حضرتِ والا کی عقیدت بھی تھی اور مستقبل بینی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک اسی ادارہ سے وابستہ رہے۔ حالانکہ بڑھیا سے زیادہ بڑے ادارے منہ مانگے مشاہرے پر لے جانے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے مگر سب سے صرفِ نظر فرما کر مدرسہ غوثیہ ہی کو اپنی خدمات کا جولان گاہ بنایا۔ بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا فیصلہ کتنا صائب تھا۔

اس علاقے کے خوش عقیدہ مسلمان بالخصوص اہلِ مدرسہ نے اپنے مرشد کی بارگاہ میں حضرتِ والا کی خصوصی وجاہت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حضور شعیب الاولیاء کا ایک نمایاں وصف علماء نوازی تھا۔ خاص کر ایک ایسا عالم جو صاحبِ تقویٰ اور متبع سنّت ہو، تو اس کے اعزاز و اِکرام کی سج دھج ہی نرالی ہوتی تھی۔ آپ کے فرزند ارجمند حضرت سیدی خلیفہ صاحب قبلہ کی علماء نوازی کا شہرہ دور دور تک تھا۔ مشائخ و پیرانِ طریقت کی صف میں علماء کی قدردانی اور ان کی عزت افزائی ضرب المثل تھی۔ اور آج بھی ان کے موجودہ اخلاف میں یہ صفت ان کے مقدس لہو کا ایک خصوصی امتیاز ہے۔

بڑھیا واہلِ مدرسہ نے اپنے مرشد کی بارگاہ میں حضرت کی جو قدر و منزلت دیکھی تھی، اسی کے پیشِ نظر انھوں نے حضور والا کو اپنے سر و آنکھوں پہ رکھا، دل کی دھڑکنوں میں جگہ دی اور آپ سے عقیدت و محبت کا وہ عملی مظاہرہ کیا کہ جس کی اُس دور میں دور دور تک مثال نہیں ملے گی۔ یہاں کے لوگوں کی نگاہ میں حضرت علامہ علیہ الرحمہ کا سب سے بڑا احسن اپنے مرشد کی بارگاہ میں ان کا غیر معمولی قدر و منزلت اور اِکرام تھا، تقویٰ و پرہیزگاری اور اخلاص فی الدین کا جوہر اس پر مستزاد۔

حضرت مولانا صاحب قبلہ ایک مردِ مومن تھے۔ سادگی کا مرقع، تصنّع سے دور، سادگی اور سیدھا پن ان کی پاکیزہ فطرت کا ایک حصہ۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ حضور والا کے زندگی کا یہ پہلو بھی بڑا عجیب و غریب تھا کہ انھیں اہلِ ریا اور نمائشی عقیدت مند ہمیشہ گھیرے رہتے، چاہے وہ براؤں شریف کا عہدِ زریں ہو یا بڑھیا کا طویل عہد۔ ان کے ظاہری نمود اور نمائشی عقیدت سے ان کی مومنانہ سادگی بہت جلد متاثر ہو جاتی اور اہلِ ریا اور مکاروں کا یہ ٹولہ اس لوحِ سادہ پر اپنی مطلب کی عبارت لکھنے میں ہمیشہ کامیاب رہتا۔ لمبا کرتا، سفید دو پلیا ٹوپی، ہاتھ میں تسبیح، اس پر دست بستہ انداز۔ یہ حضرتِ والا کی ایک پاکیزہ کمزوری تھی جس سے وہ بہت جلد فتح ہو جاتے۔ یہ ادارہ یعنی مدرسہ غوثیہ بڑھیا انھیں ایک سعادت مند اکلوتی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ اس کی غربت کے پیشِ نظر وہ بیماری و کمزوری کے عالم میں بھی ساٹھ سال کی عمر میں سائیکل چلا کر دیہات میں چندہ کے لیے جایا کرتے تھے۔

یہ کتنی عجیب بات اور حالات کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ جس ادارے کی فلاح و بہبود کے لیے رئیس الاتقیاء حضرت علامہ بدرالدین احمد قادری علیہ الرحمہ مسلسل مصروف رہا کرتے تھے، کمزوری، بیماری، بڑھاپا انھیں اس کی خدمت سے روک نہیں پاتا..... ان کے وصال پُرملال کے بعد ابھی مدرسہ اس عظیم سانحے سے سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ انھیں بہروپیوں، ریاکاروں نمک حراموں کی ٹولی جو زندگی میں ایک جھوٹی عقیدت اور منافقانہ نمود کی دکان سجائے ہوئے تھے، جن میں ان کے کچھ فرضی خلفاء آپ کی اجازت و خلافت کا خودساختہ سائن بورڈ لگائے مدرسہ غوثیہ کے خلاف درپے آزار ہو گئے اور اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس ادارے کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنالیا۔ اپنے زمانے کا وہ محتاط اعظم جس نے دارالعلوم فیض الرسول کے ان افاضل کی سندوں پر دستخط نہیں کیے جنھیں اپنے دینی مزاج کے خلاف پایا، وہ ان ذہنی یتیموں و بے صدا فقیروں اور علم و فضل کے دولت سے عاری نمائشی لوگوں کو اپنی اجازت و خلافت دے گا جس کے دستخط اتنے مہنگے، اس کی خلافت ٹکے سیر بھاجی کے حساب بن گئی۔ العیاذ باللہ تعالیٰ

بہروپیوں، مکاروں، فریب کاروں اور خودساختہ خلفا کے اس چھوٹے سے جرگے میں زیادہ تر معاشی بدحالی کے شکار لوگ ہیں، جو حضرتِ والا کے نام کو ان کے حلقۂ محبت میں کیش کر کے ذریعۂ معاش بنائے ہوئے ہیں اور لوگوں کی توجہ بڑھب سے ہٹانے کے لیے جگہ جگہ ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد ضرار بنا رکھی ہے اور اسی کا خالی تابوت کاندھے پر لیے پھر رہے ہیں۔ اس لیے وہ دن رات مدرسہ و اراکین مدرسہ کی کردارکشی اور جھوٹے پروپیگنڈے میں مصروف ہیں اور آئے دن یہ ہوائی چھوڑتے رہتے ہیں کہ مدرسہ بند ہو گیا معاذ اللہ۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو مدرسہ غوثیہ کے حصّے کی مالی امداد وہ کیسے حاصل کر پائیں گے۔ ان ناکاروں کو اچھی طرح سے اس حقیقت کا علم ہے کہ جب تک مدرسہ غوثیہ موجود ہے ہماری خاطرخواہ آمدنی میں رکاوٹ بنا رہے گا۔ اس لیے آئے دن وہ مدرسہ غوثیہ کے تعلق سے کوئی نہ کوئی نیا شوشہ یا نئی پھلجھڑی چھوڑے رہتے ہیں۔ اہلِ محبت سے التجا ہے کہ جب وہ اس طرح کی کوئی افواہ سنیں تو مدرسہ سے بذریعہ خط یا فون یا خود جا کر اپنا نمائندہ بھیجیں، اس کی تصدیق کرلیں یا بمبئی میں خاکسار وارث جمال قادری سے رابطہ قائم کرلیں۔ خادم بمبئی جیسے شہر میں گم نام نہیں ہے۔ دو سال قبل خیرانی روڈ ممبئی کے ایک مخلص دین پسند، دین دار سیٹھ الحاج سراج نوری صاحب (جو حضرت قبلہ کے عقیدت مندوں میں سے ہیں، جو سالہا سال سے حضرت کے عرس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، انھیں برسوں تک اس کی خبر ہی نہیں ہوسکی کہ کوئی اہلِ محبت ایسے بھی ہیں جو عرس کا پورا خرچ اُٹھاتے ہیں۔ حد یہ کہ حضرت کے فرزند نورانی شاہ کو بھی اس کی اطلاع نہ تھی۔ یہ تو خدا بھلا کرے شہزادۂ شعیب الاولیاء پیر طریقت مفکر اسلام، خطیب الہند حضرت علامہ غلام عبدالقادر علوی مدظلہ العالی کا، انھوں نے عرس پر اپنی تقریر کے درمیان عوامی سطح پر اس بات کا مائک کے ذریعے اعلان کیا اور بمبئی سے لائے ہوئے عرس کے اخراجات کا ڈرافٹ پیش کیا۔ مقامی اہلِ محبت حیران ہو گئے کہ وہ خود اپنے طور پر عرس کیا کرتے تھے اور سارے اخراجات دو تین گاؤں کے اہلِ محبت آپس میں تقسیم کرلیتے تھے۔ اس کے باوجود عرس کے مقامی و بعض

علاقائی تاجر حضرت کی جھوٹی اور کاروباری عقیدت کا جھنڈا اُٹھائے عرس کے چندے کے لیے دور دور تک دیہاتوں میں جال ڈالے رہتے ہیں۔ انھیں بھی کاروباری اہلِ عقیدت نے یہ باور کرا رکھا تھا کہ مدرسہ غوثیہ بند ہوگیا ہے۔ اطلاع ملنے پر ادارۂ ہٰذا کے صدر المدرسین حضرت مولانا محمد شمیم قادری رضوی (جو حضرتِ والا کے تلمیذ خاص اور مرید مخلص بھی ہیں) انھوں نے موصوف سے ملاقات کی اور پوری تفصیل سے صورت حال کی وضاحت کی، تو انھیں خوش گوار حیرت ہوئی اور جھوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہونے پر ندامت بھی پیش کی اور فوری طور پر ایک خطیر رقم مدرسہ کے لیے پیش کی۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

اعترافِ حقیقت:

بے شک حضور بدر العلماء کے بعد ادارہ حالات کی بے رحمی کا شکار ضرور رہا ہے اور پہلے کے مقابل میں متاثر بھی۔ جس کی ایک وجہ تو وہی ہے جو اوپر ذکر ہوا۔ اداروں کی زندگی میں اُتار چڑھاؤ لگے رہتے ہیں۔ بڑے قابل ذکر ادارے بھی آئے دن حالات کا شکار ہوتے رہتے ہیں، جس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ یہ اداروں کے لیے کوئی نئی اور اچنبھے کی بات نہیں۔ ہڑتال، اسٹرائیک طلبا کی دھینگا مستی سے کبھی کچھ دنوں کے بعد ادارہ بند کر دیا جاتا ہے، کبھی طلبا سے خالی کرا دیا جاتا ہے اور کبھی طلبہ منصوبہ بند طریقے سے مدرسہ کو جھکانے کے لیے از خود خالی کر دیتے ہیں مگر الحمد للہ! مدرسہ غوثیہ کے ساتھ اس طرح کبھی حالات پیش نظر نہیں آئے اور کبھی ایک ہفتہ کے لیے بھی مدرسہ کو بند نہیں کرنا پڑا۔ ال مالی پریشانیوں کی وجہ سے مدرسین کی تنخواہوں میں تاخیر ضرور ہوگئی مگر کسی خارجی سبب سے ایک دن کے لیے بھی مدرسہ ارادتاً بند نہیں کیا گیا۔ اس طرح کی کوئی بھی خبر شرارت پسندوں اور حاسدین کی شرارت کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری وجہ چھوٹے ایڈیڈ مدارس کی بہتات ہے ظاہر ہے کہ ایڈیڈ مدارس کے چاروں طرف جال بچھ چکے ہیں اور ان میں ہر ایک کو طلبا کی ضرورت ہے کہ انھیں حکومت کو طلبہ کی تعداد بھی دکھانی پڑتی ہے۔ کل تعداد تو فرضی نہیں دکھا سکتے، کچھ تو اصل ہونی چاہیے۔ اس لیے ان اداروں میں طلبہ کی ناز برداریاں اور ان کے معائب کی چشم پوشیاں ہوتی ہیں۔ بڑے و مرکزی ادارے اس سے مستثنیٰ ہیں کہ ان کے یہاں صاحب صلاحیت اساتذہ اور تعلیمی نظم وضبط غنیمت ہوتا ہے۔ اس لیے پڑھنے والے طلبا کی حسب ضرورت تعداد موجود ہوتی ہے، وہاں نہ طلبا کی منہ بھرائی ہوتی ہے نہ ناز برداری۔ مگر بڑے اور مرکزی ادارے ہیں ہی کتنے؟ گنے چنے صرف چند ہی اور ان میں بھی ملک گیر و آفاقی شہرت صرف چند ہی کو نصیب ہیں، بقیہ تو وہی ہر سال چھ آنے کے حساب والے ہیں، کہ جن میں پڑھنے والے پرائمری و دینی مکتب پڑھانے کی بھی صلاحیت نہیں رکھتے، کسی مسجد کی امامت تو بڑی بات ہے۔ بانگی گیری ہی مل جائے تو زہے نصیب! آغازِ سال میں تو مدرسہ بھر جاتا ہے مگر تعلیمی نظم وضبط اور دینی و تربیت اُصول کا جب سامنا ہوتا ہے تو ایک ایک کر کے کھسکنے لگتے ہیں۔ نماز کے لیے پابندی وہ نہیں جھیل سکتے، درسگارہ کا ضابطہ ان کے لیے بڑا ناخوش گوار تجربہ ہوتا ہے۔ سیر و تفریح، آزادی کو ایک ضروری عنصر سمجھتے ہیں۔ آخر گھر والوں کو اُلٹی سیدھی پٹی پڑھا کر وہ

چھوٹے ایڈیڈ مدارس کی راہ لیتے ہیں کہ وہاں ہر طرح کی آزادی ہے۔ وقت پر نماز پڑھیں یا سوئیں، درس گاہ میں حاضر ہوں یا گھومیں۔ بس مدرسہ کے فیلڈ میں سروں کی گنتی کے وقت حاضر رہنا چاہیے، تا کہ عوام وحکومت دونوں کی آنکھوں میں بیک وقت دھول جھونک سکیں۔

اب تو صرف چند بڑے ادارے اور مرکزی اداروں کو چھوڑ کر بقیہ اداروں میں علی العموم پڑھنے اور پڑھانے والوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا کہ دونوں کو اپنے مبلغ علم کی خبر نہیں ہوتی۔

ایڈ والحاق جب کاروبار نہیں ہوا تھا تو صورتِ حال یہ نہیں تھی مگر جب سے یہ نفع بخش کاروبار بن گیا ہے، علم کے نام پر جہالت کا اندھیرا اور بڑھ گیا ہے۔ طالب علم شرح جامی تک پہنچ گیا مگر اس کو اپنے نام کے مادۂ اشتقاق کی خبر نہیں، ایسے ہوش ربا ماحول اور تاریک ایام میں غیر ایڈیڈ اِداروں کا باقی رہ جانا ہی کارے دارد کے مترادف ہے، چہ جائیکہ پہلے کا معیار تلاشنا اور روشن ماضی کے مقابلے میں حال کا موازنہ کرنا۔

جب وہ بھاری بھرکم گراں قدر شخصیتیں جو درس گاہوں کی زینت اور اداروں کی شان اور پیکر دین ودانش ہوتی تھیں، وہی یادِ ماضی ہو چکی ہیں تو علم وفضل، دین ودانش کی اس طرح کی بہاریں کہاں سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان کے مقدس نقش پا پر چلنے کی کوشش یہی ہماری سعادت ہوگی اور بس!

یہ ہے دامن یہ گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

☑☑☑☑☑☑

نقدونظر

کتاب: احترام سادات اور امام احمد رضا
پر ایک طویل تاریخی مقدمہ

تومرا خراب کردی بہ ایں سجدہ ریائی

اب سے چند سال قبل ویڈیو اور ٹی وی کے محدود جواز و عدم جواز کو لے کر سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے دو ممتاز عالموں اور مقتدر مذہبی رہنماؤں کے درمیان ایک بڑی سنجیدہ و عالمانہ بحث شروع ہوئی تھی جو دراصل شاخسانہ تھا، ہالینڈ (یورپ) سے آئے ہوئے ایک استفتاء کے جواب کا۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے مناظرانہ، مجادلانہ بلکہ معاندانہ رُخ؛ پھر بڑی تیزی کے ساتھ مختلف مراحل و اشکال سے گذرتے ہوئے اس بحث نے شدید منفی جہت اختیار کرلی! بلکہ بالآخر یہ سلسلۂ بحث اختلاف و انتشار سے آگے بڑھ کر ابتذال و پراگندگی، دنایت و آلودگی میں داخل ہوگیا، جہاں وقارِ سنّیت مجروح اور اس کی حرمت و ناموس داغدار ہوئی نیز زید و بکر، خالد و محمود کے فرضی ناموں سے حمایت و ہمدردی اور عقیدت و وفاداری کے میک اپ میں جو حیا سوز، زہریلے اور گندی کتابیں و لٹریچر منظر عام پر آئے اس نے مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف و مرکز روحانیت کچھوچھہ مقدسہ کے تقدس کو پامال کیا، غالب کے طرف داروں نے بڑی سرگرمی دکھائی، بی جمالو نے بھی موقع غنیمت جانا اور غیروں نے بھی اس جلتے الاؤ میں خوب ہاتھ سینکے! مفاد پرستوں، ابن الوقتوں اور بے روغن چراغ جلانے والے کمرشیل خطیبوں نے بھی اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، حالات کو اتنا سنگین اور ماحول کو اتنا برہم کر دیا گیا کہ مخلصین واہلِ نظر دم بخود ہو کر رہ گئے، ایسے ماحول میں اگر کوئی بلند قامت شخصیت اپنے اخلاصِ بے پایاں اور سوزِ دروں سے بے چین ہو کر خوش نوائی، خوش ادائی، خوش قبائی، ہر دلعزیزی اور اپنے حسنِ ادب کا جوہر گراں قدر لے کر چاک داماں سنّیت کی رفوگری کے لیے آگے بڑھی بھی تو اس کے اخلاص کو رسوا اور سوزِ دروں کو مسترد کر دیا گیا نیز اسے گناہِ بے گناہی کا مجرم قرار دے کر اس کے مثالی وجود کو ہدفِ ملامت بنا دیا گیا۔ ؎

الزام تراشی کی ضرورت تھی نہ لوگو!
دینے کو سزا جرمِ محبت ہی بہت ہے

اس خونچکاں المیے کی قدرے تفصیل کچھ یوں ہے،

حضرت علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی جانشین حضور محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی کے پاس ڈین ہاگ ہالینڈ سے ایک استفتاء آیا جس کے تین سوالات میں سے ایک سوال ویڈیو اور ٹی وی کے تعلق سے بھی تھا، علامہ مدنی میاں صاحب نے اپنے مبلغ علم اور فہم و ادراک کے مطابق اپنا جواب قلمبند فرمایا، پھر اسے ملک و بیرونِ ملک کے اہم ترین دار الافتاء، قابلِ ذکر علمی و دینی شخصیات کی خدمتوں میں تصحیح و تائید یا اصلاح فکر و نظر کے خیال سے بھیجا۔

ابتدا میں جن اہم شخصیتوں نے علامہ مدنی میاں کے فتوے کی تائید وتصدیق کی وہ یہ ہیں:

(۱) غزالئ دوراں حضرت علامہ سیّد سعید احمد کاظمی (پاکستان)

(۲) فقیہہ العصر حضرت علامہ مفتی محمد شریف الحق امجدی دار العلوم اشرفیہ مبارکپور

(۳) علامہ مفتی عزیز الرحمٰن رضوی دار العلوم شاہ عالم احمد آباد

(۴) علامہ مفتی شفیق احمد شریفی دار العلوم غریب نواز الہ آباد

(۵) علامہ مفتی عبد الواجد صاحب ادارہ شرعیہ پٹنہ بہار

اوّل الذکر شخصیت یعنی علامہ کاظمی علیہ الرحمہ نے تصدیق وتصویب کے علاوہ ایک بڑا مسرت بخش وحوصلہ افزا دعا نامہ بھی ارسال فرمایا تھا جس میں بزرگانہ نوازشات و بے اندازہ کرم فرمائیاں تھیں خاص کر ویڈیو اور ٹی وی کے تعلق سے حضورِ والا کے ارشادات یہ ہیں۔

''میں ہر سہ فتاویٰ میں آپ سے متفق ہوں بالخصوص ویڈیو، کیسٹ، ٹی وی اور فلم کے بارے میں جس قدر عرق ریزی سے جناب نے تحریر فرمائی ہے اور پھر جس خوبصورت سے ان حقائق کی روشنی میں جائز وناجائز صورتوں میں امتیاز کرتے ہوئے فتویٰ قلمبند فرمایا ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔''

انھیں دنوں مرکزی دار الافتاء بریلی شریف سے اسی موضوع پر ایک احتسابی تحریر علامہ سیّد محمد مدنی میاں کو دستیاب ہوئی، جس میں بقول علامہ مدنی میاں فقیہانہ اسلوبِ بیان وعالمانہ طرزِ نگارش کے بجائے مجادلانہ ومعاندانہ رنگ زیادہ تھے، سوالات جو بھی تھے، نگارشات جیسی بھی تھیں، اسلوبِ بیان جتنا بھی صبر آزما رہا ہو جوابات بہر حال علامہ مدنی میاں نے لکھ لیے تھے مگر اسے حضرت علامہ ازہری صاحب کی خدمت میں بھیجا نہیں۔ انہیں اوروں کے جوابات کا بھی انتظار تھا کہ وہ بھی آجائیں تا کہ اثبات ونفی کی صورت میں شرح وبست کے ساتھ گفتگو مکمل کر کے متعلقہ افراد کی خدمت میں بھیجا جائے خاص کر مرکزی دار الافتاء بریلی شریف کو جس میں تاخیر ہوئی، غالباً زیادہ تاخیر کو حضرت علامہ ازہری صاحب قبلہ نے دین میں حرج سمجھا وہ زیادہ انتظار نہ کر سکے۔ راقم الحروف محمد وارث جمال قادری یار علوی نے بھی جمادی الاول ۱۴۱۲ ہجری میں سعودی نجدی وہابیوں کے تعلق سے ایک طویل استفتاء عربی زبان میں خالص ایک اہم ترین دینی مقاصد کے تحت کیا تھا۔ سنّی دار الافتاء کے علاوہ اسے وہابیوں، دیوبندیوں اور غیر مقلدوں کے یہاں بھی بھیجا گیا، سنّی اداروں میں سے صرف چھ اداروں نے جواب دیا، دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف، مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا ضلع سدھارتھ نگر یوپی، دار العلوم اسحاقیہ جودھ پور، دار العلوم مسکینیہ دھوراجی، جامعہ حبیبیہ الہ آباد، دار العلوم غریب نواز ملاڈ ممبئی کے علاوہ دار العلوم دیوبند، ندوۃ العلماء لکھنؤ،، جامعہ رحمانیہ مانگیر نے بھی جواب دیا، غیر مقلدین اداروں نے خاموشی اختیار کی اور دار العلوم اشرفیہ مبارک پور نے جواب سے پہلوتہی نہیں بلکہ باقاعدہ انکار کیا۔ انکار کی نوعیت کی تمام تفصیلات ہم نے یٰسین ڈائجسٹ کانپور کو عراق نمبر کے لیے ان فتاویٰ کی اشاعت کے لیے دیتے وقت ہی دے دیا تھا۔ مگر یٰسین نے غالباً اس کی

اشاعت کو اپنی تجارت کے حق میں مفید نہ پا کر اسے شائع نہیں کیا، صرف استفتاء اور جواب شائع کیا۔ بریلی شریف سے مکمل خاموشی رہی، حالانکہ وہ استفتاء اپنی نوعیت اور مقاصد کے پیشِ نظر تاریخی حیثیت کا حامل تھا، کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی نمائندہ تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے تھا، جسے عراق کے وزارتِ اوقاف و مذہبی امور میں داخل کرانا تھا، ملک کے تمام دار الافتاء کو جو رجسٹری سے بھیجا گیا تھا اور جواب کے لیے رجسٹری ٹکٹ بھی لفافے میں رکھے گئے تھے، ہم اب تک یہی سمجھتے رہے کہ دینی اداروں کا اور دین وسنّت کا مفاد مشترک ہوتا ہے اور ان کے مفاد کے مابین تساوی کی نسبت ہوتی ہے، یہ تو مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف کی خاموشی اور مبارک پور کے انکار سے یہ حقیقت سمجھ میں آئی کہ ادارے جب چھوٹے سے بڑے اور بڑے سے بہت بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے اور مفادِ سنّیت کے درمیان جو نسبت تساوی ہوا کرتی تھی وہ ترقی کر کے عموم خصوص من وجہٍ بن جاتی ہے،ؔ

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم
چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم

خود ممبئی میں اپنے رفیق دیرینہ مولانا قاری اطہر حسین باتھ اصل سیتامڑھی بہار جو تین نسلوں سے بریلی شریف کے خانہ زادوں میں سے ہیں، ان کے ساتھ حضرت علامہ اختر رضا خاں صاحب قبلہ ازہری کی خدمت شریف میں ممبئی ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوا۔ اور خاص کر ان کے دستِ کرم میں پیش کرتے ہوئے جواب کے لیے مودبانہ گذارش کی، اور اجمالاً اس اہم استفتاء کا پس منظر بھی عرض کیا، آپ نے پوری توجہ اور دلجمعی سے اسی وقت دیر تک اسے ملاحظہ فرمایا اور ایک آسودہ سانس لیتے ہوئے فرمایا: مولانا! ہمارے یہاں سے اس کا جواب ضرور دیا جائے گا۔ پھر دعائیہ کلمات سے بھی نوازا۔ اور فرمایا اس استفتاء کے بارے میں کل مفتی شریف الحق صاحب بھی تشریف لائے تھے اور اس کا ذکر فرما رہے تھے، مزید فرمایا جواب میں کچھ تاخیر ہوگی کہ آپ کو عربی زبان ہی میں جواب چاہیے اور ہمارے یہاں مفتی صاحب اُردو زبان میں جواب لکھتے ہیں!

بریلی شریف رجسٹری کرنے کے علاوہ دست کرم میں پیش کیے ہوئے بھی کم وبیش پانچ برس ہو گئے اور تاخیر کی مدت اتنے سالوں کو احاطہ کیے ہوئے ہے پھر بھی آل انڈیا تبلیغ سیرت کو بریلی شریف کے جواب کا انتظار ہے۔ البتہ مبارک پور اشرفیہ نے اسی وقت انکار کر کے انتظار کی زحمتوں سے ضرور بچا لیا تھا،ؔ

حق بات بھی احباب کو تنقید لگے ہے   ابرو کی کمانوں کو کھنچی دیکھ رہا ہوں

حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں کی طرف سے تاخیر کی مدت سالوں پر نہیں بلکہ مہینوں پر مشتمل تھی اور ہماری طرح صبر آزما بھی نہیں تھی! اور نہ ہی ان کی طرف سے مطبوعہ شکل میں ان کی تحقیق ہی منظر عام پر آئی تھی!

صالح قدروں کے زوال اور مسلم معاشرہ کے ابتذال و اخلاقی گراوٹ کے پیشِ نظر یہ ایسے مسائل نہیں تھے کہ انھیں عوام کے سامنے لایا جاتا۔ بحث مکمل ہوئے بغیر اس موضوع کو علماء دین وارباب علم وفضل کے دائرے سے باہر آنا ہی نہیں چاہتے تھے، بحث کے نتیجے وعلیہ الفتوی کو عوام کے سامنے لانے کے بجائے اصل بحث ہی کو عوام کے سامنے لے آیا گیا،

پہلی بار حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری کی زیر نگرانی نکلنے والے ماہنامہ سنّی دنیا بریلی شریف کے شمارہ نومبر ۱۹۸۵ء، دسمبر ۱۹۸۵ء اور جنوری ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں علامہ ازہری صاحب کے سوالات چھپے۔ ہم جیسے لوگوں کو بھی یہ اطلاع سنّی دنیا ہی سے ہوئی کہ اس طرح کا کوئی موضوع بھی علماء دین ومفتیانِ شرع متین کے درمیان زیر بحث ہے۔

اس موقع پر کینیا افریقہ کے ایک بڑے تاجر الحاج حافظ محمد ایوب صاحب جو عالمِ دین بھی ہیں، شمالی مشرقی ہند کے ایک عظیم مرکزی دینی ادارے دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف جو پورے برصغیر ہند وپاک میں اپنے تصلب فی الدین اور سنّیت کے تشخص کی علامت بھی ہے (جس نے ہر نازک موقع پر اپنے عمل سے یہ ثابت کیا ہے کہ دین وسنّیت اور دینی ادارے کے مفاد کے درمیان تساوی ہی کی نسبت ہوتی ہے) اسی کے فیض یافتہ اور سند یافتہ بھی ہیں، وہ افریقہ سے ممبئی تشریف لائے اور ہم سے فون پر رابطہ قائم کیا، کہ میں ہندوستان ایک دینی ضرورت کے تحت آیا ہوں جس کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ملاقات پر انھوں نے بتایا کہ میں یہاں اپنے سنّی علماء کرام کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے لیے آیا ہوں، اگر یہاں سے کام چل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ پاکستان جاؤں گا۔ پھر اپنے آمد کی غرض وغایت کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے جو تفصیل بتائی، وہ کافی تشویش ناک تھی۔ وہ یہ کہ ہمارے یہاں افریقہ میں علماء دین بہت کمیاب ہیں، یہاں ہندوستان وپاکستان میں تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ایک سے بڑے کر ایک عالمِ دین ہیں اور دینی ضرورتوں پر دستیاب بھی ہیں مگر ہمارے یہاں بہت خال خال! کسی عالمِ دین کی تشریف آوری پر لوگ دور دور سے زیارت کے لیے جاتے ہیں۔ ہم یہاں ہندوستان کی بات تو نہیں بتا سکتے مگر ہمارے یہاں گھر گھر ٹی وی اور ویڈیو موجود ہے اور آج انہیں کے ذریعے بے دینی وبدمذہبیت اور خاص کر قادیانیت مسلم گھروں میں داخل ہو رہی ہے اور خود میرا گھر اس کا شکار ہو چکا تھا، میرے بڑے بھائی کو ویڈیو کیسٹ لائبریری سے اتفاقی طور پر ایک ایسی کیسٹ دستیاب ہوگئی جو قادیانیت کے تبلیغ پر مشتمل تھی اور مرزا غلام احمد قادیانی کو قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک نئے نبی کی حیثیت سے پیش کر رہی تھی۔ چونکہ یہ ایک نئی چیز اور نئی بات تھی، اسلام کے صدیوں مسلّمہ اصولوں کے خلاف بڑے ہی خوبصورت انداز میں قرآن وحدیث کا سہارا لیتے ہوئے انسانی فطرت چونکہ تجسّس پسند ہے اسی کے تحت میرے بھائی صاحب اس موضوع پر یکے بعد دیگرے کیسٹیں لاتے رہے یہاں تک کہ وہ قادیانیت سے متاثر ہو گئے اور اس تعلق سے مجھ سے طرح طرح کے سوالات وبحث کرنے لگے۔ میں اپنے مقدور بھر انہیں مطمئن کرتا رہا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے جس سے میں ذہنی طور پر پریشان وفکر مند تھا کہ اسی درمیان ہمارے پڑوس کے ملک میں ایک پاکستانی عالمِ دین کی تشریف آوری کی خبر ملی اور میں فوراً اپنے بھائی کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں انہیں جزائے خیر عطا فرمائے، بڑی اچھی صلاحیتوں کے عالمِ دین تھے۔ میرے بھائی کے ساتھ بڑی محبت واخلاق کے ساتھ پیش آئے اور قادیانیت کے تعلق سے میرے بھائی کے تمام شکوک وشبہات کو دور کر کے انہیں بالکل مطمئن کر دیا۔ پھر مجھ سے فرمایا کہ آپ اپنے سنّی علماء دین کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹیں تلاش کر کے لائیے اور اسے اپنے یہاں پھیلائیے تا کہ ان غارت گرانِ دین وایمان کے پھیلائے ہوئے دامِ فریب سے مسلمان بچیں۔ بے شک یہ بھی دین کی ایک بڑی خدمت ہوگی، چنانچہ اس جذبہ کے تحت میں ہندوستان آیا ہوں۔

میں نے عرض کیا حاجی صاحب آپ کے بیان کردہ حالات کی سنگینی اس حقیقت کی غماز ہے کہ آپ کے یہاں افریقہ میں ویڈیو اور ٹی وی کا استعمال ایک دینی ضرورت بھی بن چکا ہے مگر ہمارے برصغیر ہند و پاک میں معاملے کی نوعیت اور سنگینی وہ نہیں جو آپ کے یہاں ہے اور مسلم معاشرہ کی زوال پذیری اور بیہودگی کی حد تک اس کی اخلاقی گراوٹ کے سبب شاید ہی علماء دین و مفتیانِ کرام عام طور پر اس کے تعلق سے کوئی ہمت کرسکیں البتہ ابھی تازہ اس مسئلے پر ہمارے یہاں علماء دین و مفتیانِ کرام کے مابین ایک بحث چلی ہوئی ہے، نتیجے کا انتظار ہے! انھوں نے فرمایا مولانا وارث جمال صاحب ہم نتیجے کا انتظار نہیں کرسکیں گے کہ ہمارے یہاں انھیں راستوں سے دین و سنّت پر یلغار ہے۔ ہمیں تو آپ بس کسی عالمِ دین کے ویڈیو کیسٹ کی طرف رہنمائی فرمائیں!

چنانچہ میں نے انھیں حضرت علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی اور مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں صاحب کے یہاں جو میزبان ہیں، ان کا نام و فون نمبر دے دیا کہ یہاں سے معلوم کریں، شاید ان دونوں حضرات کی وہ ویڈیو کیسٹیں جو انھوں نے یورپ افریقہ کے متعدد شہروں میں کی ہیں دستیاب ہو جائیں! ہماری گفتگو کی اس مجلس میں نابغۂ عصر پیر طریقت صاحبزادہ علامہ غلام عبدالقادر علوی آف براؤں شریف بھی موجود تھے!

یہ گفتگو ہوئے بھی پندرہ سولہ برس ہوگئے، اس طویل عرصے میں جدید ٹکنالوجی اور الکٹرانک میڈیا نے آسمانی جست لگائی ہے، اور آج ہمارے یہاں شہر و قصبات (بلکہ کسی حد تک دیہات میں بھی) کی جھونپڑی جھگی سے لے کر بلڈنگوں اور محلوں ہی نہیں بلکہ فقیہانِ حرم کے حرم تک (الاماشاء اللہ) ٹی وی پہنچ چکا ہے۔

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

ادھر شہادتِ بابری مسجد کے بعد مسلمانوں کی ہمہ جہت کمزوری اور ہندو مسلم منافرت کی شدت کے پیشِ نظر مقتدر و غیر مقتدر مسلم دشمن، فرقہ پرست اور فسطائی طاقتوں کی خاموش امداد و تعاون اور حوصلہ افزائی کی بدولت! عالمِ اسلام سے آئینی بے دخلی کے بعد ہندوستانی حکومت کے سیکولرزم کا سہارا لے کر یہاں کے بیس کروڑ مسلمانوں کو بہائیت و قادیانیت نے اپنا ٹارگیٹ بنالیا ہے اور اس وقت خاص کر بہائیت اسلام کے سینے میں ایک خنجر کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ اسلام کے خلاف بہائیت کی ہولناکی قادیانیت سے کہیں زیادہ خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے، ادھر پچھلے تین سالوں سے قادیانیت بالخصوص بہائیت نے جس تیزی کا مظاہرہ کیا ہے وہ حیران کن بھی ہے پریشان کن بھی[1]۔ آج قادیانیت وغیرہ نے تو

---

[1] پتہ نہیں ہماری قیادت کو بہائیت کے مالہ وما علیہ اسلام کے خلاف اس کے عالمی جدو جہد اور اسلام میں اس کی در اندازیوں و تباہ کاریوں اور ہندوستان کے اہم شہروں میں اس کی حالیہ ترک تازیوں کی اطلاع ہے کہ نہیں؟ آثار و قرائن بے خبری ہی کی طرف اشارہ کررہے ہیں ورنہ ہمارے دل و دماغ، فکر و نظر اور ذرائع ابلاغ و وسائل کے بہاؤ کا سمت اتنا منفی نہیں ہوتا۔

بحمدہٖ تعالیٰ فقیر قادری بہائیت پر کام کا آغاز کر چکا ہے، وقت اور حالات نے اگر ساتھ دیا تو اس موضوع پر تبلیغ سیرت کوئی تاریخی خدمت انجام دے گی ورنہ کتابی شکل میں ایک تاریخی دستاویز کے لیے تو کام کا آغاز ہو ہی چکا ہے۔

وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل

مستقل ٹی وی چینل لے رکھا ہے۔ ہندوستان و پاک و بنگلہ دیش کی بے دین و بدعقیدہ طاقتوں نے بھی ٹی وی چینل لے رکھا ہے۔ ہندوستان و پاک و بنگلہ دیش کی بے دین و بدعقیدہ طاقتوں نے بھی ٹی وی و ریڈیو کے ذریعے برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے گھروں پر دھاوا بول دیا۔ وہ اپنے بڑے چھوٹے سبھی موثر پروگرام کیبل کے ذریعے ٹی وی پر پیش کررہے ہیں۔ جواز و عدم جواز کے بحث میں پڑے بغیر ہمیں اپنے مذہبی قیادت سے یہ سوال کرنے کا حق تو بہرحال ہے کہ آخر دین و سنّیت پر اس نوعیت کے حملے کی دفاع کی موثر صورت کیا ہوگی؟ اور موجودہ سکہ رائج الوقت فقیہانِ حرم نے اس کے لیے دفاعی لائن کیا تیار کی ہے؟ کیا غارت گرانِ دین و ایمان و دشمنانِ اسلام کو یوں آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جس طرح اور جس انداز سے چاہیں امتِ مسلمہ کو اعتقادی خلفشار میں مبتلا کر کے ایک ایک کرکے دین و سنّیت سے اغوا کر لے جائیں اور ہمارے لیے یہی اطمیان کافی ہوگا کہ۔

لا ملئن جہنم تھا وعدہ ازلی
عبث نہ منکروں کو بدعقیدہ ہونا تھا

بہرحال پہلی بار یہ نازک موضوع خواص کی مجلس سے نکل کر عوام کے سامنے حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری مدظلہ العالی کی جانب سے آیا، پھر تو پوسٹر و ماہناموں کے ذریعے ایک سلسلہ ہی چل نکلا۔ بالآخر حضرت علامہ سیّد محمد مدنی اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی نے ۲۲/ابواب پر مشتمل ایک مبسوط کتاب بنام ”ریڈیو۔ ٹی وی کا شرعی استعمال“ لکھی جو ابتدا ہی سے مسئلے کی تنقیح اور اس وقت تک کی تمام جزئیات کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ نفس موضوع پر تکنیکی، تنقیحی، شرعی اور تفصیلی گفتگو کے علاوہ تین سو پندرہ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا ایک بڑا حسن اس کا اسلوبِ بیان تھا جو ادب، تہذیب، شائستگی، متانت و سنجیدگی، دل نشینی و دل پذیری کی ایک شاندار روایت لیے ہوئے تھا۔ مقامِ اختلاف میں اپنے مدِّ مقابل کے لیے اس کے خاندانی وجاہتوں اور ذاتی فضل و کمال کی تمازت کو مدھم نہ ہونے دینا، اس دورِ نفسا نفسی میں وسعت و اعلیٰ ظرفی کی قابلِ تقلید مثال ہے۔ حضرت علامہ مدنی کے اس کتاب کے صرف ایک باب کا جواب خواجہ علم و فن حضرت علامہ خواجہ مظفر حسین صاحب (پورنیہ بہار) نے ”ٹی وی کی تحقیق“ کے نام سے دیا۔ جس میں بحث کے اختتام پر حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں صاحب کے لیے یہ عبارت قلم بند ہوگئی۔ ”انہوں نے شریعت مطہرہ کے بالمقابل ایک نئی شریعت کی داغ بیل ڈالی ہے۔“ بے شک اس عبارت کی سنگینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا، ہم جیسے لوگوں نے خواجہ صاحب کے ان جملوں کو سبقت قلم پر محمول کیا۔ ہم حسنِ ظن ہی رکھتے ہیں کہ خواجہ صاحب کے ذہن و فکر میں ”نئی شریعت“ کا وہ مفہوم ہرگز نہیں رہا ہوگا جسے مخاطبین کرام نے سمجھا، بہرحال قلم سے ایسے چند جملے نکل گئے جس نے ایک سنجیدہ و خالص علمی بحث کو تلخیوں کا سمت دے دیا، اور ”مستند ہے میرا فرمایا ہوا“ کی روایت و ذہنیت جواب چل پڑی ہے اس کے پیشِ نظر معاملہ کی سنگینی و نزاکت کے بروقت ادراک و احساس کے باوجود اس کا فوری اندمال نہیں ہوسکا۔ حضرت خواجہ مظفر صاحب مدظلہ العالی ایک سنجیدہ باوقار بالغ نظر، محترم اور علمی شخصیت ہیں اور فکر و فن کی جولان گاہ میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کا ایک قیمتی سرمایہ! انہیں

خود ہی بروقت اس کا اندمال فرما دینا چاہیے تھا جیسا کہ ان سے اس کی توقع تھی مگر فوری طور پر ایسا نہ ہوسکا یا انہیں اس کا موقع نہیں ملا۔

خواجہ صاحب کے ان جملوں پر ملک کے مختلف دارالافتاء سے استفتاء لیا گیا۔ مفتیانِ کرام نے جو جواب دیئے انہیں شائع کیا گیا، یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ استفتاء اور اس کی اشاعت کے ذمہ داروں نے فتاویٰ شائع کرنے سے قبل خواجہ صاحب سے اتمامِ حجت کرلی تھی یا نہیں؟ کسی بھی ذمہ دار مذہبی شخصیت کے تعلق سے بات عوام تک لانے کے لیے ہمارے پاس تو اعلیٰ حضرت امامِ اہلسنّت کی روشن مثال موجود ہے۔ چاہے وہ بات گستاخانِ بارگاہِ رسالت ﷺ ہو یا معاملہ حضرت علامہ عبد الباری فرنگی محلی کا۔ ان فتاویٰ کی اشاعت نے اس بحث کو ایک نئی مگر منفی جہت دے دی اور یہیں سے جواب الجواب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اور اصل بحث ٹی وی اور ویڈیو، دور پس منظر میں چلا گیا۔ خواجہ صاحب کے تعلق سے جو فتاوے شائع ہوئے ان کے جوابات آپ کے تلمیذ رشید محترم مولانا مفتی مطیع الرحمٰن صاحب بہاری نے ''حرفِ آخر'' کے نام سے دیا جس کا فوری جواب مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں برادر خورد حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں صاحب نے ''ضربِ آخر'' کے نام سے دیا۔ مفتی مطیع الرحمٰن صاحب کی طرف سے بھی کوئی سُستی نہیں ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ''نذرِ آخر'' لے کر پھر آ موجود ہوئے، جس کے جواب میں ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ''سعیِ آخریہ'' لے کر مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں بھی پھر سے طلوع ہوئے، اللہ اللہ! مولیٰ تعالیٰ نے دونوں طرف وقت اور پیسے میں بڑی برکتیں دے رکھی تھیں۔ دین وسنّیت کی جوز بردست خدمات انجام پارہی تھیں۔

یہ گلہ جفائے وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بت کدے میں کروں بیاں تو کہے صنم بھی ہری ہری

خدا خدا کر کے قلمی معرکہ آرائی کا یہ محاذ کسی طرح سرد ہوا۔ خواہ چراغ میں روغنِ زیتون ختم ہوجانے کے سبب یا سنّیت کی بے بسی پر رحم آنے کی وجہ سے! ابھی اس محاذ پر سکوتِ مضمحل کا وقفہ صرف طاری ہی ہوا تھا کہ پھر سے ایک نئی معرکہ آرائی اور نئی فتوحات کے لیے بگل بج گئے، اس نئے محاذ کے لیے اصل شاخسانہ وہی تھا یعنی ریڈیو اور ٹی وی جو دور بہت دور پس منظر میں چلا گیا تھا اور اس بحث کے مرکزی دائروں کو حاشیوں نے حاشیے پر بٹھا دیا کہ آپ حضرات اب صرف آرام فرمائیں البتہ دور سے محاذ کی نگرانی کرتے رہیں ہم پیادے آپ کی آن پر قربان ہونے کے لیے کافی ہیں حالانکہ یہ بحث اگر صرف انہیں مرکزی دائروں تک رہتی تو بات اس حد تک نہ بگڑتی اور حالات ایسی منفی صورت اختیار نہیں کرتے مگر بھلا ہو غالب کے طرف داروں، سنّت کے مصنوعی خیر خواہوں اور فتنہ جو ذہنیت کا کہ انہوں نے اپنی جبین عقیدت کے سجدۂ ریائی سے سنّیت کا خانہ خراب کیا اور اسے اتنا نقصان پہنچایا کہ اب اس کے اندمال میں بھی کافی وقت لگے گا۔

چو بہ زمین سجدہ کردم ز زمیں نوا برآمد
تو مرا خراب کردی بایں سجدہ ریائی

ٹھیک انہیں ایام میں خواجہ خواجگان، سیّدالاقطاب عطائے رسول ﷺ سلطان الہند سرکار غریب نواز کے عرس سراپا قدس کے موقع پر اجمیر شریف میں ایک مجلس میلاد شریف منعقد تھی۔ حضرت علامہ اختر رضا صاحب مدظلہ النورانی صدرِ مجلس تھے۔ متعدد علماء کے علاوہ رئیس الاتقیاء شیخ الاساتذہ حضرت علامہ مفتی شاہ بدرالدین احمد قادری خلیفۂ حضور مفتیٔ اعظم ہند بھی زینت مجلس تھے۔ شہزادہ شیر بیشۂ سنّت حضرت مولانا ادریس رضا خاں صاحب تقریر فرمارہے تھے۔ دورانِ خطاب انہوں نے ''کالی کملی'' کا لفظ استعمال کیا، صدرِ مجلس حضرت علامہ ازہری مدظلہ نے برسرِ مجلس منع فرماتے ہوئے فرمایا ''کالی کملی'' بلکہ نوری چادر کہیے۔ مولانا موصوف نے بغیر کسی پس وپیش کے روایتی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تقریر روک کر بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ توبہ ورجوع کیا، مولانا ادریس رضا خاں صاحب ابتدا ہی سے اپنے بزرگوں ہی نہیں بلکہ ہم عصروں اور ہم عصر رفیقوں کے ساتھ بھی ادب وحسنِ اخلاق کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ مجھ جیسے ''غبارِ راہ'' پر بھی اگر کسی مجلس میں نظر پڑ جائے تو بھیڑ کو چیرتے ہوئے لپکتے اور گلے لگا لیتے ہیں۔

اجمیر شریف سے واپسی پر حضرت علامہ بدرالدین احمد قادری علیہ الرحمہ نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون ''مقالہ نورانی'' کے عنوان سے لکھا جو اسی سال اپنے ادارے مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھا پوسٹ کھنڈسری بازار ضلع سدھارتھ نگر، یوپی (جس کے وہ عمر کے آخری سانس تک صدر المدرس رہے) کے سالانہ روداد میں شائع فرمایا۔ جس میں بڑے انشراح صدر کے ساتھ توبہ ورجوع اور اپنی تصنیفات میں جہاں کہیں یہ لفظ استعمال کیا تھا یا کسی شاعر کا شعر نقل کیا تھا اس سے بھی توبہ ورجوع کیا جسے ممبئی کی مشہور علمی ودینی شخصیت محترم علامہ قاضی مفتی محمد اشرف رضا صاحب زید مجدہ نے حضرت علامہ علیہ الرحمہ کے عرس چہلم کے موقع پر مقالہ نورانی ہی کے نام سے کتابی شکل میں شائع فرما کر مفت تقسیم کیا، اس کے بعد لفظ کملی ہی پر علامہ مفتی شفیق احمد شریفی وحضرت علامہ مفتی شریف الحق صاحب قبلہ امجدی کی طرف سے پوسٹر وفتاوے آئے، پھر تو ''کالی کملی'' پر نئے سرے سے نئی بحث چھڑ گئی اور کلمۂ تصغیر کو لے کر یہ موضوع پھیلتا گیا، بے شک کالی کملی کی اصطلاح بہت قدیم تھی کان اسی سے آشنا تھے بزرگ ترین وجید علماء وخطبا نے اپنی تصنیفات وخطابات میں عام طور سے اس لفظ کا استعمال کرتے رہے اور آج بھی مسلّم الثبوت بزرگوں کی تصنیفات جلیلہ میں یہ اصطلاح والہانہ لب ولہجے میں موجود ہے، کالی کملی سے توبہ ورجوع اور اس پر پوسٹر فتاوے ومقالے سے ایسا لگا کہ واقعی یہ اصطلاح کوئی ایسی مقدس خطا تھی جس تک ہمارے مسلّم الثبوت بزرگوں کے پاکیزہ دل ونگاہ نہیں پہنچ سکے اور کم ترك الاوائل للاواخر کے تحت دورِ حاضر کے علماء ومحققین حضرت علامہ ازہری صاحب قبلہ کے توجہ دلانے پر متوجہ ہوئے۔ گویا اس عظیم ونئی تحقیق کا سہرا حضرت علامہ ازہری صاحب کے سر بندھ رہا تھا۔ ''نوری چادر'' کی اصطلاح کالی کملی کے مقابلے میں بہرحال ایک نئی اصطلاح تھی جو حضرت علامہ ازہری صاحب کی دین تھی!

اسے اخلاص کہیں یا جذبۂ خودنمائی یا حضرت علامہ ازہری صاحب کے خلاف ایک نئے محاذ کا آغاز، نیتوں کا حال تو خدائے علیم وخبیر ہی جانتا ہے کہ وہ کون سا جذبہ حقیقی تھا جس سے مجبور ہو کر غازی ملّت مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں اشرفی جیلانی

کچھوچھوی نے اس موضوع کو تختِ ستم بنایا۔ ''تختِ ستم'' اس لیے کہ اس موضوع پر اپنے نگارشات پیش کرتے وقت اپنے جلیل القدر و عالی مرتبت برادرِ اکبر حضرت علامہ سیّد محمد مدنی میاں کا بھی اتباع نہ کر سکے۔ اسلوبِ بیان کے لیے انہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی، کتاب ''ویڈیو۔ ٹی وی کا شرعی استعمال'' ان کے سامنے ہی تھی کہ مقامِ اختلاف میں اپنے خصم کے لیے دلائل کے ساتھ اپنے جذبات کے اظہر کا اسلوب کیا ہو؟ بے شک تحقیقات کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہر دور میں ہر صاحبِ علم کو اپنی تحقیق پیش کرنے کا حق ہے۔ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت نے بھی اپنے ہمالیہ جیسی بلندی رکھنے والے اسلاف کی تحقیقاتِ علمیہ کے مقابلے اپنی تحقیقاتِ جلیلہ پیش کی تھیں۔ خیر وہ اندازِ سعادت تو بڑی اور قدرے دور کی بات ہے، اپنے دور کے کچھ محققین کے نام لیے جاسکتے ہیں، مثلاً بحر العلوم علامہ سیّد مفتی افضل حسین، علامہ شفیع اوکاڑوی، صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خاں، مولانا صائم چشتی وغیرہ وغیرہ۔

مگر جب مولانا سیّد محمد ہاشمی میاں اشرفی جیلانی نے کملی کے موضوع پر اپنے بڑوں کی تحقیقات کے خلاف اپنی تحقیقات پیش کیں خصوصاً کلمۂ تصغیر کی بحث میں تو انہوں نے محققین کے عام روش کے خلاف اپنے قدآور مخاطبین بالخصوص حضرت علامہ مفتی اختر رضا صاحب قبلہ مدظلہ النورانی کے تعلق سے عدم شائستگی و غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ ان کا اسلوبِ بیان عالمانہ کے بجائے عامیانہ اور طرزِ نگارش سوقیانہ تھی جسے نہ تو احباب نے پسند کیا اور نہ ہی اہلِ محبت نے بلکہ خود اہلِ خانوادہ نے بھی پسند نہیں کیا اور ذمہ دارانِ خانوادوں کچھوچھہ شریف نے عملاً اپنی بیزاری ظاہر کی ''لفظ کملی پر علامہ اختر کے'' شبہات کا ازالہ جس سے انتشار و بے چینیوں میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ اس کتاب سے ان کے حریفوں کو نقصان کے بجائے فائدہ پہنچا، عوامی ہمدردی ملّی دلوں میں در در جا گے اور واضح طور پر ان کی مظلومیت کا احساس پیدا ہوا۔

البتہ نقصان سنّیت کا ہوا۔ سوادِ اعظم کا ہوا۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت کا ہوا اور ذاتی طور پر خود ان کا سب سے زیادہ ہوا کہ وہ ایک عظیم دینی، علمی اور روحانی خانوادہ کے ممتاز چشم و چراغ اور آفاقی شہرت کے حامل خطیب جید تھے۔ یہ روش خود موصوف کے شایانِ شان نہ تھی، حقیقت بڑی بے رحم ہوتی ہے اور حقیقت کی اس بے رحمی سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کے بعد ردِّ عمل کے طور پر حضرت مولانا سیّد محمد ہاشمی صاحب کی قبائے قامت زیبائی غبار آلود ہوئی۔ مقبولیت کا گراف نیچے آیا، عالمگیر نوا سنجی متاثر ہوئی۔ خطابت کی بے کراں وسعتوں میں ایک طرح سے ''نو فلائی زون'' لگنے لگا۔ جس کا بروقت احساس و ادراک موصوف کو بھی ہوا اور غالباً اسی کے تلافی یا انتشار کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے کچھوچھہ مقدسہ اور بریلی شریف کے اٹوٹ دینی ایمانی روحانی رشتوں اور باہم بے پناہ محبتوں کے تذکرے پر مشتمل ایک کتاب ''تحقیقِ ہاشمی'' تالیف فرمائی جو چھپ کر منظر عام پر بھی آئی، مگر اس سے حالات کی برہمی پر قابو نہیں پایا جاسکا۔ حالانکہ اس اسٹیج پر نیک نیتی سے مولانا موصوف کو سنبھالا جاسکتا تھا، اپنے بڑوں کے سامنے وہ نادم ہو سکتے تھے۔ اور اہلِ سنّت کو ایک نقصان سے بچایا جاسکتا تھا مگر بُرا ہو مفسدین و مانعین کا جو اسی طرح کے مواقع کی تلاش میں تھے۔ سوئے اتفاق یا ان کی تقدیر کہیے کہ انہیں یہ مواقع میسر آ گئے جس کی بدولت انہوں نے اختلافاتِ فکر و نظر اور اختلافاتِ علمی کو میدانِ کارزار سے بدل دیا۔ بیک

وقت کئی محاذ کھل گئے! محاذ بھی کیسے؟ مناظرانہ نہیں بلکہ مجادلانہ، مکابرانہ، معاندانہ، دل پذیری دلنوازی، نرم خوئی، نرم روئی، صلح جوئی اور جذبۂ مفادیت سے کلیتہً عاری! ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی کھائیں گے جو یوسف سا برادر پائیں

ایسے ہی گرم حالات میں غلام غوث رضوی کے فرضی نام سے ''اختری مذہب'' نام کی کتاب منظرِ عام پر آئی، نام ہی موضوع کو روشن کرنے کے لیے کافی ہے اور کسی تبصرے سے بے نیاز سُنّی مسلمانوں کے خلاف بریلوی مذہب، اعلیٰ حضرت کے خلاف ''بریلویت''، دیوبندی مذہب کے خلاف ''دیوبندی مذہب'' ان نام کی کتابوں کو سنا، دیکھا، پڑھا گیا مگر اختری مذہب وہ بھی بظاہر سنّیت سے سنّیت کی طرف، ہے نا ایک المیہ! جس کا اختتامیہ چند بہت ہی ذاتی مگر نازک خطوط کی اشاعت پر مشتمل تھا جو شمالی ہندوستان کے ایک بڑے ادارے کے ایک بڑی اور مقدس شخصیت کے تعلق سے تھا، کسی مذہبی دینی، علمی شخصیت جس کے منصب کا بنیادی عنصر تقدس بھی ہو اسے اس نوعیت کے خطوط لکھنا بھی چاہیے یا نہیں یا اس بحث میں پڑے بغیر اتنا بہرحال کہا جائے گا کسی مستند و معزز آدمی کی ذاتی زندگی کے پوشیدہ پہلو خواہ وہ لاکھ سچے ہوں اس طرح عوام کے سامنے لانا انتہائی گری حرکت اور انسانیت کی تذلیل ہے جس کی مذمت کی جائے گی ادارہ کی حرمت اور شخصیت کے تقدس کا تحفظ، ہر حال میں ضروری ہے اگر مقدس شخصیتیں ایسے ہی مجروح ہوتی رہیں تو یہ دین وعلمِ دین کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا اور اُن مقدس شخصیتوں کو خود اپنی تقدس کی حفاظت کرنی چاہیے ان کے تقدس کو اتنا سہل الحصول بھی نہیں ہونا چاہیے کہ تھوڑی سی کوشش سے وہ چوراہے پر آجائے۔ ؎

چمن میں تلخ نوائی میری گوارہ کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی

ان خطوط کا منظرِ عام پر آنا ایک بہانہ تھا اس ابتذال و دنایت کے ابلنے کا جو سینوں میں موجزن تھے جس کے ذریعے بریلی شریف کی ہمہ گیر مرکزیت و کچھوچھہ کے تقدس کی پامالی ممکن تھی! چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس کے بعد تو ابتذال و دنائیت کا طوفان اُمڈ آیا۔ گندے حیا سوز فحش کتابوں اور لٹریچروں کی بھرمار ہوگئی۔ ہمدردی وحمایت کے لبارے میں اپنے قد بت کو دیکھے بغیر جسے دیکھو اپنے رعشہ زدہ ہاتھوں میں احتساب کا کوڑا لیے پھرنے لگا گویا، ع

سنگ ہر ایک نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے

عبداللہ بن سبا کے نقشِ قدم پر فرضی ناموں سے دنائیت وحیاسوزی کے چشمے اُبلنے لگے۔ اہلِ سنّت کی رُسوائی وجگ ہنسائی کا سامان بڑے پیمانے پر ہونے لگا، اغیار واعدائے دین کے ہاتھوں ایسے ہتھیار پہنچنے لگے کہ وقت آنے پر جن کا استعمال بہرحال ہوگا۔ دشمنانِ دین وسنّیت، منکرین اولیاء، گستاخانِ بارگاہِ نبوت نے راحت کی آسودہ سانس لی۔ وہ فتاوے جن سے کبھی قصرِ سلطنت کی بنیادیں ہل جاتی تھیں، وقت کے دھارے بدل جاتے تھے، دین وسنّیت کی شاہراہ

متعین کرنے والے، حق و باطل کا صحیح امیاز عطا کرنے والے چھپے ہوئے کفر کو بے نقاب کرنے والے، فتاوے بے توقیر اور ان کے وزن کم کردیئے گئے، ان کے خوف سے دلوں کو آزاد کردیا گیا، ایمان و کفر، ہدایت و گمراہی کی جگہ جگہ دوکانیں کھلنے لگیں، جن سے متعلقہ افراد کے نقصانات کم فتاوے کی تذلیل و بے توقیری جس انداز میں ہوئی ایسی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ؎

میں نے پہنا دیا اشکوں کو تبسم کا لباس
درد کو جاننے والے بھی جانے میرے

اتنا سب کچھ ہونے پر بھی بس نہیں ہوا کہ موجودہ جانبین کی متنازعہ شخصیتیں سوادِ اعظم کی نگاہوں میں اپنے پیشرو بزرگوں کی طرح نہ تو محترم ہیں، نہ ہی قدآور، نہ مسلّم الثبوت! اور نہ ہی قدسی صفات! ان کے قدوقامت کو کم زیادہ کردینے سے بات نہیں بنی، فتنہ جُو طبیعتیں اور مفسدین و مرکز اہلِ سنّت کے حقیقی بدخواہوں کا کام اتنے سے نہیں چل رہا تھا، چنانچہ اس کے لیے کمند اُن بزرگوں کی قصرِ عظمت پر ڈالا گیا۔ داغدار اُن کی حرمت و ناموس کو کیا گیا، تیشہ اُن کی قبروں پر چلایا گیا، بے ستر اُن کا وجودِ بامسعود کیا گیا اور پامال اُن کے تقدس کو کیا گیا۔ علم و فضل، عشق و اخلاص، تقویٰ و طہارت، تقدس و پاکیزگی، خوف و خشیت کے ان محسوس پیکروں نے آخر کیا بگاڑا تھا؟ آمنے سامنے کی جنگ میں حضرت عبدالرزاق نورالعین، حضرت شاہ علی حسین اشرفی میاں، حضور مفتیٔ اعظم ہند اور حضور محدثِ اعظم ہند یہ نفوسِ قدسیہ کیوں کانٹوں پر کھینچ لیے گئے، حبّ بریلی شریف کے نام سے تذلیل سادات اور حبّ اہلِ بیت کی آڑ میں اہانت بریلی۔ ؎

انہیں بھی توڑ لیا اب کے گل فروشوں نے
وہ پھول جن کو بہاروں کی آبرو کہیے

ان مقدس و باعظمت خانوادوں کے موجودہ کسی فرد یا افراد سے کسی کے پندارِ علم و فضل یا نخوتِ فکر و نظر کو صدمہ یا کسی نوعیت کی تکلیف یا اس کے شہرت و عظمت پر قدغن یا کلاہِ صد افتخار پر کوئی حرف یا بے پناہ معاشی حجم و آسودگی کے راستے میں کوئی رکاوٹ یا اس کی رش لیتی مارکیٹ پر کوئی اثر پڑا ہو تو اس کے لیے یہ شخصیتیں تو ذمہ دار نہیں۔ ان مقدس روحوں کو آزار پہنچانے کی دانستہ کوشش اور ان کے وقارِ علم و فضل کو خاک آلود کرکے ہزاروں لاکھوں اہلِ عقیدت کو تڑپانے کے پیچھے کون جذبہ کارفرما تھا؟ ؎

تازہ شد زخم دلم از فیض نمکداں کسے
زندہ شد نخل دلم از آب پیکان کسے

ابتذال و حیاسوزی کے بھنڈار میں سے ایک کتاب ''چودھویں صدی کا سب سے بڑا فراڈ'' ہے۔ اس میں ساداتِ بسکھاری و کچھوچھہ و جائس کے جدِّ اعلیٰ حضرت شاہ عبدالرزاق نورالعین کے وجود ہی کا انکار کردیا گیا، گویا نشیمن پر بجلی نہیں گرائی گئی، نہ ان شاخوں کو کاٹا گیا جن پر نشیمن تھے بلکہ سرے سے درخت ہی کو اُکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی گئی تاکہ نہ رہے

بانس نہ بجے بانسری! اس میں شیخ المشائخ حضرت سیّد علی حسین اشرفی میاں جن کے لیے اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے پاکیزہ احساسات یہ ہوں۔ ؎

اشرفی اے رخت آئینہ حسن خوباں
اے نظر کردۂ پروردہ سہ محبوباں

ان کی سخت ترین توہین وتذلیل ہی نہیں، انہیں عیار ومکّار اور ایک مکمل فراڈ قرار دے کر مسترد کر دیا گیا۔ یہ سلسلہ چلنے نہیں بلکہ دوڑنے لگا، یہ ''نقلی سادات کے اصلی چہرے'' ''جعلی سیادت کی سوداگری'' ان میں اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کی آنکھوں کی ٹھنڈک آپ کے بارگاہ سے شہزادے کا خطاب پانے والے امام اہلِ سنّت کے علمی عظمتوں، فکری رفعتوں کے نقیب اور آپ کے مسلک محبت کے داعی حضور محدثِ اعظم ہند اور خاندانِ نبوت کی شہزادیوں کے لیے وہ زبان، وہ لب ولہجہ اور فحش نگاری کی وہ انتہا ہے کہ قلم کو یارا نہیں کہ ان کا اعادہ کرسکتے۔ ؎

وہ پھول جن سے کبھی گلستاں کی رونق تھی
جلیل آج وہی نفرتوں کی زد میں ہیں

''اہلِ کچھوچھہ وہابیت کی راہ پر، تاریخ گمشدہ، کچھوچھہ کی فریب کاریاں، کچھوچھہ کا یزید، اہلِ کچھوچھہ کی بدزبانیاں، شیخ الاسلام کچھوچھوی کا علمی جنازہ، پردہ اُٹھتا ہے وغیرہ اور ماہنامہ سنّی آواز، ناگپور مہاراشٹر شمارہ نمبر مئی وجون ۱۹۹۷ء صفحہ ۷۹ پر اشرفی رضوی اختلاف'' کے عنوان سے کتابوں کی ایک طویل فہرست پیش کی گئی ہے، فہرست سے پہلے دوسطری نوٹ کے الفاظ یہ ہیں۔

کچھوچھویوں کے ردّ میں جو کتب لکھی گئی ہیں، ان میں سے اب تک قریشی رضوی لائبریری کو جو دستیاب ہوسکیں اس کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

اس فہرست میں ۷۴ کتابوں کے نام ہیں جن میں ان کتابوں کا نام بھی ہے جو فرضی ناموں سے لکھی گئی ہیں جو ابتذال ودنایت وآلودگی اور بزرگوں کی حرمت وناموس کی پامالی پر مشتمل ہیں۔

اس فہرست سے دین وسنّیت کی کون سی خدمت انجام پذیر ہوئی، اس کو وہی محافظین سنّیت زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں جو اس کے ذمہ دار ہیں، وہابیوں، دیوبندیوں، قادیانیوں، رافضیوں کے خلاف کتابوں کی فہرست تو بہت دیکھی گئی مگر سنّیت کی طرف سے سنّیوں کے خلاف رزالت و ذلالت وخباثت ناموں پر مشتمل کتابوں کے ساتھ پہلی بار سامنے آئی۔

''کچھوچھویوں کے خلاف'' یہ جملہ اور اس کا تیور بتا رہا ہے کہ افراد کے بجائے اس مقدس مقام کے نام کو مجروح کرنے سے دلچسپی زیادہ ہے، حالانکہ اس نام سے سنّیت وروحانیت کا تشخص بھی وابستہ ہے۔

ورنہ فہرست ان مختصر ترین ناموں کے ساتھ بھی آسکتی تھی جو وجہ نزاع ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنے قدآور بزرگوں کے مقابلے ان کا مختصر وجود کچھوچھہ مقدسہ تو نہیں، پھر قلم کی دھار کو لفظ کچھوچہ پر تیز کرنے کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے؟ اور

''کچھوچھوی فرقہ ضالہ'' کی اصطلاح وہ بھی معتبر دینی درسگاہوں کے ذرائع ابلاغ سے اور وہ بھی صرف دو افراد کی بنیاد پر!
آہ جو مقامِ روحانیت وسنّیت کے تشخص کی علامت ہے اسے گمراہی کا سنبل دے دیا گیا؟

مجھ کو چمن کے کانٹوں سے کوئی نہیں
پھولوں نے کردیا میرے دامن کو تار تار

واضح رہے یہ موجودہ اختلافات جن میں جانبین سے وہ لوگ جو مرکزی دائرہ یا سرنامہ بنے ہوئے ہیں یا بنا دیئے گئے ہیں وہ نہ بریلی شریف ہیں، نہ کچھوچھہ مقدسہ اور نہ ان کی بنیاد پر ان مقدمات کو شرف ومجد ملے ہیں بلکہ وہ حضرات اگر صفِ علماء میں ممتاز ہیں تو صرف اپنے علم وفضل کی وجہ سے نہیں بلکہ ان سے بڑھ کر اصحابِ علم وفن آج بھی موجود ہیں اور ان سے زیادہ اربابِ فضل وکمال بھی۔ علم وفضل کے ساتھ ان کی توقیر وعظمت میں اس نسبت خاص کی کرم فرمائیاں زیادہ ہیں جو انہیں ان مقامات کی بدولت حاصل ہیں جن سے وہ منسوب ہیں! بے شک بریلی شریف وکچھوچھہ مقدسہ کے درمیان نہ پہلے کبھی اختلاف تھا نہ آج ہے اور نہ مستقبل میں کبھی ہوگا ان شاء اللہ المولی تعالی کہ کچھوچھہ مقدسہ نام ہے حضور سلطان مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کا، حضرت میر سیّد عبد الرزاق نور العین کا، ان کی بزرگ ترین اولاد امجاد کا، شیخ المشائخ حضور اشرفی میاں کا، اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کی آنکھوں کی ٹھنڈک علامہ احمد اشرف کا، ترجمان اہلِ سنّت حضور محدثِ اعظم ہند کا، یوں ہی بریلی شریف نام ہے حضرت علامہ مفتی نقی علی خاں کا، عبقری الشرق عاشق رسول امام احمد رضا بریلوی کا، شیخ الانام حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا کا، قطب عالم حضور مفتیٔ اعظم مولانا مصطفےٰ رضا کا اقدست اسرار ہے۔

یہی سوادِ اعظم کے امام بھی ہیں، یہی شیخ الانام بھی، یہی بریلی شریف بھی ہیں، یہی کچھوچھہ مقدسہ بھی، انہیں کے نشانِ قدم ہمارے لیے چراغِ ہدایت بھی ہیں، مشعل نور بھی، یہی اہلِ سنّت وجماعت کے لیے حجتِ تامہ ہیں اور دلیل راہِ یقین بھی! یہی سنّیت کی شاہراہ بھی ہیں، مینارۂ نور بھی کیا ان میں آپس میں کوئی اختلاف رہا، اختلافات تو درکنار کبھی کوئی خلش یا آئینے پر کوئی بال بھی نہیں پایا گیا۔ نہیں اور ہرگز نہیں کہ یہ رشتہ محبت وعقیدت کچے دھاگوں کا رہین منت نہیں! بلکہ اس کی اساس الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کی فولاد سے زیادہ مضبوط رشتوں پر ہے۔ اس کا بنیاد مرصوص حسام الحرمین ہے، اس کا قدرِ مشترک عشق رسول ﷺ حُبّ رسول ﷺ عظمتِ اولیاء ہے اور یہ سب سلامت ہے اور جب یہ سب سلامت ہیں تو اسے بریلی وکچھوچھہ کا اختلاف کیسے کہا جاسکتا ہے؟ اس طرح کی سوچ بھی ایک زیادتی اور وقت کا ایک بڑا جھوٹ ہے۔ کچھوچھہ مقدسہ، بریلی شریف یہ اہلِ سنّت کا مشترکہ دینی، ایمانی وروحانی سرمایہ ہے اور ان کا تقدس وتشخص سنّیت کا تقدس وتشخص ہے، مولیٰ تعالیٰ ہمیں اس تقدس وتشخص کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے۔ ؎

دل چور ہوا غم سے بھولا تو نہیں تم کو
آئینہ ہی ٹوٹا ہے تصویر سلامت ہے

پھر حبِّ بریلی وحبِّ کچھوچھہ، عظمت بریلی واحترام سادات کے نام پر جو بھی دنایت وابتذال کے چشمے اُبلے، وہ دیدہ ودانستہ سنّیت واہلِ سنّت کے ساتھ ایک فراڈ تھا اور ہے مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف کے نادان دوست، نمائشی اہلِ عقیدت

بار یا حاسدین اپنے ان منصوبہ بند کوششوں سے کچھوچھہ کا نقصان نہیں بلکہ مرکز اہلِ سنّت ہی کو سوالیہ نشان کے زد میں لانا چاہتے ہیں۔ نقصان پہنچانے کے لیے کچھوچھہ میں ہے ہی کیا؟ اور جو ہے تو اس کی حفاظت وصیانت کے لیے تو ذوالفقار حیدری دست امام احمد رضا بریلوی میں پہلے ہی سے بے نیام ہے۔ ؎

کلکِ رضا ہے خنجر خوں خوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

حضرت اشرفی میاں اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کے میر و مرشد، خاتم الاکابر تاجدارِ مارہرہ مطہرہ حضور سیّدنا آلِ رسول مارہروی علیہ الرحمہ والرضوان کے آخری خلیفہ ہیں جن کے لیے اعلیٰ حضرت کے دعا کی زبان یہ ہے۔

دوجہاں میں خادمِ آلِ رسول اللہ کر
حضرت آلِ رسول مقتدا کے واسطے

اپنی نسبت سیادت و نسبت مرشد کے سبب اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے یہاں ان کا زبردست احترام ہے۔ حضور حجۃ الاسلام و مفتیٔ اعظم ہند ان کی عظمت سیادت و نسبت مارہرہ کے پیشِ نظر خمیدہ سر ہیں! خیر حضرت اشرفی میاں کی بات تو بڑی بات ہے کہ وہ سرکار اعلیٰ حضرت کے پیر و مرشد کے آخری خلیفہ ہیں، نظر کردۂ پروردئ سہ محبوباں ہیں۔ اور بات اعلیٰ حضرت کے تلمیذ ارشد، خلیفۂ اجل آپ کی بارگاہ کے انتہائی وجیہہ و مغرب اور آنکھوں کی ٹھنڈک علامہ سیّد احمد اشرف جو حضرت اشرفی میاں کے فرزند ارجمند ہیں بات ان کی بھی نہیں بلکہ ان کے حقیقی بھائی جو ان کے خلیفہ و شاگرد بھی یعنی مولانا سیّد مصطفےٰ اشرف اُن کے فرزند ارجمند حضرت علامہ سیّد حامد اشرف بانی دار العلوم محمدیہ ممبئی کی بات ہے جو ابھی بقید حیات ہیں ان کی اور سرکار مفتیٔ اعظم ہند کی اندازِ ملاقات کو دیکھنے والی ابھی بہت سی آنکھیں زندہ ہیں جنہوں نے اس پیکر عشق و وفا کا اعزاز و احترام فرمانا بھی دیکھا ہے اور علی رؤس الاشہاد ان کی قدم بوسی کو بھی! پھر حضور اشرفی میاں کے خلفاء پر جب نگاہ ڈالی جاتی ہے تو ان کی عظمتیں اور فزوں تر ہو جاتی ہیں، شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا خان بن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی، قطب مدینہ حضرت علامہ مفتی ضیاء الدین مہاجر مدنی، صدر الافاضل فخر الاماثل حضرت علامہ سیّد نعیم الدین مرادآبادی، سیّد العلماء حضرت علامہ سیّد ابوالحسنات قادری پاکستان، صدر العلماء حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی، جلالۃ العلم حضور حافظ ملّت محدث مرادآبادی، امام التارکین سرکار مجاہد ملّت حضرت علامہ مفتی حبیب الرحمٰن قادری، سلطان المناظرین حضرت علامہ سیّد رفاقت حسین اشرفی، امام المعقولات حضرت علامہ محمد سلیمان بھاگل پوری، مبلغ اسلام حضرت مولانا عبد العلیم صدیق میرٹھی، علامہ قطب الدین برہمچاری، حضرت مولانا فاخر الہ آبادی وغیرہ وغیرہ یہ وہ اصحابِ فضل و کمال اور وہ اربابِ مجد و شرف ہیں جن کی یکتائی و بے نظیری کا دبدبہ آج بھی دلوں پر طاری ہے۔

تو کیا حضور پیر و مرشد سیّد آلِ رسول مارہروی سے لے کر اعلیٰ حضرت سیّدنا امام احمد رضا اور ان کے نامور فرزندانِ ارجمندان شیخ الانام حجۃ الاسلام اور سرکار مفتیٔ اعظم ہند اور ان نفوسِ قدسیہ کے گرد بکھرے یہ لعل و گہر جو ایک اپنی جگہ آفتابِ

فضل وکمال تھے سبھوں کا اجتماعی شعورِ مومن وفراست مومن ایک صدی سے زائد عرصے تک معطل رہا۔ ایک فراڈ اور اس کی اولاد واحفاد کو سیّد واولادِ فاطمہ زہرا سمجھتے ویقین کرتے رہے اور زندگی بھر اولادِ رسول سمجھ کر ان کا اعزاز واکرام فرماتے رہے، اتقوا فراسة المومن انما ینظر بنور الله۔ مومن کے فراست ایمانی سے ڈرو کہ وہ نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے۔ مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ۔ کیا مرکز اہلِ سنّت کے یہ نادان دوست یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جن کے عشق واخلاص، عرفان ووجدان، علم وفضل، ولایت وبزرگی، جہانگیری وپادشاہی کا شہرہ عالمگیر ہے وہ فراست مومن جیسی نعمت کبریٰ ہی سے خالی تھے۔

رئیس شہر تجھے بھی ذلیل کردیں گے
یہ کم نظر جو تیری صحبتوں کی زد میں ہیں

حضرت سیّد شاہ عبدالرزاق نورالعین کے وجود کا انکار اور ان کے قبر شریف کو دوسرے بزرگ کی قبر بتا کر تاریخ وتصوف کے چھ سوسالہ مستند ذخیروں اور شاہی فرامین کے دستاویزوں کا بڑی بے شرمی وڈھٹائی سے انکار کردیا گیا۔ مگر حیرت بالائے حیرت اینکہ کسی قابلِ ذکر حلقے یا کسی موثر وذمہ دار مذہبی شخصیت کی جانب سے اس کے خلاف کوئی قابلِ ذکر ردِّعمل سامنے نہیں آیا جبکہ کچھ شخصیتیں ایسی بھی تھیں جو اہلِ سنّت کے ہر طبقے میں بڑی صاحبِ اثر ونفوذ ہیں اور ان متنازعہ معاملات میں انہیں ریموٹ کنٹرول کی حیثیت حاصل تھی مگر وہ بھی تماشائے لب بام ہی میں منہمک رہ گئیں۔ شاید فریق بن جانے کے الزام کے خوف سے یا ان خرابات کے ابخرات ہی میں کوئی ایسا سرور تھا جو اک گونہ بے خودی طاری کیے ہوئے تھا۔ وہ بے خودی نہیں جس کے لیے کہا گیا ہے کہ۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بلکہ وہ بے خودی جس کے لیے حضرت غالب ہی نے فرمایا ہے۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

حالانکہ اصحابِ کچھوچھہ کی سیادت وسعادت اور شرف ومجد کے اعلان واعتراف میں وہ شاہی فرامین اور دعاؤں کی درخواست جو شرقی حکمرانوں سے لے کر بادشاہ دین پناہ شاہجہاں بادشاہ دہلی تک ۵۲ رگاؤں کے عطیات پر مشتمل ہے۔ اور خانقاہ معلّٰی کے تعلق سے وہ طویل مقدمات اور انگریز ججوں کے فیصلے نامے ہی کافی ہیں جو آج بھی بطور ریکارڈ سیّد نظام اشرف برادر خورد، پیر طریقت سیّد انوار اشرف مثنیٰ میاں، سیّد آفتاب اشرف وسیّد فخر الدین اشرف سجادہ نشینانِ درگاہِ معلّٰی کچھوچھہ مقدسہ اور کچھ قیمتی دستاویزات اور تاریخی شہادتیں پروفیسر ڈاکٹر سیّد وحید اشرف ریٹائرڈ پروفیسر آف عربک پرشین اینڈ اردو مدراس یونیورسٹی کی تحویل میں بھی ہیں۔ اور جن کے مجد وشرف وسیادت وامامت کا غلغلہ تصوف وتذکرہ کی بلند پایہ کتابوں میں موجود ہے۔ صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

مرآۃ الاسرار: تالیف حضرت شیخ عبد الرحمٰن چشتی متوفی ۱۰۹۴ ہجری یہ بلند پایہ تصنیف عہد شاہجہانی کی ہے، خود صاحبِ کتاب اصحابِ منصب ومقام کی فہرست میں شامل ہیں۔ یہ کتاب فارسی زبان میں تھی جسے کیپٹن واحد بخش سیال کے اردو ترجمے کے ساتھ ہندوستانی میں پہلی بار حضرت علامہ ارشد القادری مدظلہ العالی کے مشہور کتب خانہ ''جامِ نور دہلی'' نے شائع کیا۔ بارہ سو ترسٹھ صفحات پر مشتمل اس عظیم تذکرے سے ایک مختصر اقتباس پیش ہے:

حضرت حاجی میر سیّد عبد الرزاق

آلِ سیّد کریم الطرفین آں مخاطب بخطاب نور العین۔ آں اشرف آفاق حاجی میر سیّد عبد الرزاق قدس سرہ۔

آپ مقتدائے وقت اور میر سیّد اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ کے خلیفہ اور جانشین تھے۔ لطائف اشرفی میں لکھا ہے کہ میر سیّد اشرف جہانگیر ستائیس سال کی عمر میں حضرت شیخ علاؤ الحق کے مرید ہوئے، شیخ نے ان کے لیے اپنی خانقاہ کے قریب ایک حجرہ عطا فرمایا جہاں وہ مشغول رہتے تھے۔ ایک دن حضرت شیخ کی خدمت میں جانے کے لیے کمر باندھ رہے تھے کہ شیخ خود تشریف لائے اور دریافت فرمایا: کیا کر رہے ہو۔ آپ نے جواب دیا، خدمت شیخ کے لیے کمر باندھ رہا ہوں۔ شیخ نے فرمایا: مضبوط باندھنا اشارہ تھا کہ شادی سے گریز کرنا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے ساری عمر شادی نہ کی اور مجرد و مسافر رہے لیکن آپ اس خیال سے ذرا پریشان تھے کہ ہمارا بیٹا ہمارا جانشین نہ ہوگا۔ حضرت شیخ علاؤ الدین ان کے دل کے خطرے سے آگاہ ہو کر مراقبے میں چلے گئے، اور تھوڑی دیر بعد سر اُٹھا کر فرمایا حق تعالی نے تجھے ایک فرزند معنوی عطا فرمایا ہے جو تمہارا جانشین ہوگا اور تمہارا سلسلہ جاری رکھے گا۔ اسی دن سے آپ اس معنوی فرزند کے جستجو میں رہنے لگے۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ دوبارہ خراسان وعراق کی سیر کے لیے تشریف لے گئے تو سیّد حسین بن سیّد عبد الغفور سے ملاقات ہوئی۔ سیّد حسین غوث صمدانی محبوبِ سبحانی میر سیّد عبد القادر جیلانی قدس سرہ کی اولاد میں سے تھے اور میر سیّد اشرف کی خالہ زاد بہن ان کے گھر میں تھیں جو سیّد عبد الرزاق کی والدہ تھیں، چنانچہ میر سیّد عبد الرزاق کو بارہ سال کی عمر میں آپ نے فرزند بنالیا اور ان کے والدین نے رضا و رغبت کے ساتھ آپ کے ساتھ رخصت کر دیا اور بڑا جشن منایا۔ اسی وقت سے سیّد عبد الرزاق آپ کے زیرِ سایہ پرورش پانے لگے اور تمام ظاہری و باطنی علوم طے کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچے۔ آپ کمال شفقت سے فرمایا کرتے تھے، لوگ صلب (پشت) سے بچے نکالتے ہیں، میں نے عبد الرزاق کو اپنی آنکھوں سے نکالا ہے اور یہ شعر فی البدیہہ آپ کے زبان سے نکلا۔

چہ نور دیدہ ام از نور دیدہ　　　　که نور دیدہ باشد نور دیدہ

میں نے اپنی آنکھوں کے نور سے کیا نور دیکھا ہے جو میری آنکھوں کا نور بن گیا۔ اسی دن سے آپ کا خطاب نور العین ہو گیا۔ نیز فرمایا کہ میں نے سیّد عبد الرزاق کی اولاد کو خزانہ الٰہی میں شریک کیا ہے اور حق تعالی سے درخواست کی ہے کہ اگر عبد الرزاق کی اولاد قانع ہو تو ان کو کسی کا محتاج نہ کیجیے، ان کی ادنی سی توجہ سے لوگوں کے کام بن جائیں گے۔

سیّد عبد الرزاق نے آنحضرت کی دعا سے ایک سو بیس سال کی عمر پائی۔ اس میں سے بارہ سال بیعت سے قبل گذرے،

اڑسٹھ سال سفر و حج میں آنحضرت کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا اور آنحضرت کے وصال کے بعد چالیس سال تک حق سجادگی ادا کیا اور قسم قسم کے کرامات ظہور میں آئے۔ وفات کے بعد آنحضرت کے مقبرہ میں پہلو بہ پہلو دفن ہوئے۔

مرآۃ الاسرار شیخ عبد الرحمٰن چشتی مطبوعہ جام نور دہلی ۱۱۷۶۔ ۷۷۔ ۱۷۸ ایسے پہاڑ سے زیادہ بلند بالا حقائق کو جھٹلا کر سنّیت و قادریت کے حقیقی بدخواہ اپنا کام کر گئے کہ انتشارِ سنّیت ہی ان کی منفعت تھی، جس کی بدولت وہ فقیرانِ راہگذر جو سراپا سوال تھے! وہ بالشیے جو قدآوروں کی محفل میں گم تھے۔ وہ مفاد پرست جن کے چراغِ حسرت میں روغن ہی نہیں تھا اور ابن الوقت جن کے گھروں کا چولہا ٹھنڈا پڑ گیا تھا وہ سب کے سب حالت کے گرم توے پر اپنی اپنی روٹیاں سینکنے میں مصروف ہو گئے اور اختلاف و انتشار کے دائرے کو وسیع کرنا اور باہم نفرتوں کی خلیج کو اور گہری کرنا ہی مالی و بدنی عبادت سمجھانے و یقین کرانے میں کامیاب ہو گئے۔

یہ وقت دین و سنّیت کے لیے بہت نازک تھا، ایک عجیب سی بے بسی تھی، دانم و لے گویم، خواہم و لے نہ کردم کی منزل تھی۔ ایسے عالم میں جماعت علماء ہی سے ایک بلند قامت شخصیت آگے بڑھی جس کا اخلاص فی الدین، سوزِ دروں اور حسن ادب اہلِ سنّت کے ہر طبقے میں متفق علیہ تھا۔ جو شروع ہی سے صفِ علماء میں اپنے کردار و عمل، اخلاص و اخلاق، صلاحیت و اہلیت ادب و سعادت کے حوالے سے بڑا امتاز تھا۔ جس کے دینی خدمات کا ایک طویل و مبارک سلسلہ ایشیا سے یورپ و افریقہ و امریکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یعنی عالمِ باعمل، خطیب اعظم، مبلغ اسلام حضرت علامہ قمر الزماں خاں اعظمی قادری رضوی۔ بے شک انہوں نے اس راہِ محبت میں ایک بڑا موثر قدم اُٹھایا، مسلسل جد و جہد کے بعد انہیں ایک بڑی کامیابی ملی جس کا مثبت نتیجہ ۱۲رشعبان المعظم ۱۴۱۶ ہجری مطابق ۴رجنوری ۱۹۹۶ء ممبئی کے تمام اردو اخبارات کی اشاعتوں میں صفِ اول پر بڑے بڑے اشہاری چوکھٹے کے ذریعے ظاہر ہوئے۔ روزنامہ اردو ٹائمز، روزنامہ انقلاب، روزنامہ ہندوستان ممبئی میں اعلان خوش خبری کا جلی عنوان یوں تھا۔

"اکابر بریلی شریف اور ساداتِ کچھوچھہ مقدسہ سے متعلق مفتیٔ اعظم حضرت علامہ اختر رضا ازہری اور غازی ملّت حضرت علامہ سیّد محمد ہاشمی صاحب کا وضاحتی بیان"

جملہ مسلمانانِ اہلِ سنّت کو یہ جان کر بے پناہ مسرت ہوگی کہ بریلی شریف اور کچھوچھہ مقدسہ نے ان عناصر کی مذمت کی ہے اور ان سے اپنی بیزاری کا اعلان فرمایا ہے جو گمنام اشتہارات و کتابوں کے ذریعے اکابر علماء بریلی شریف اور ساداتِ کچھوچھہ مقدسہ کی کردار کشی کر رہے ہیں۔ چنانچہ مفتیٔ اعظم ہند حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری مدظلہ العالی نے ٹیلی فون پر احقر قمر الزماں اعظمی اور مولانا سعید نوری سے ارشاد فرمایا کہ:

"میں ان گمنام پوسٹروں سے جس میں ساداتِ کچھوچھہ کی توہین و کردار کشی کی گئی ہے اور "نقلی سادات کے اصلی روپ" جیسی کتابوں سے سخت بیزاری کا اظہار کرتا ہوں نیز اجازت دیتا ہوں کہ میرا یہ بیان شائع کر دیا جائے۔"

۲۱ردسمبر ۱۹۹۵ء کو غازی ملّت حضرت سیّد محمد ہاشمی میاں صاحب ممبئی تشریف لائے تو احقر قمر الزماں اور مولانا شاکر

رضوی نے ان سے ملاقات کی اور موجودہ حالات میں بریلی شریف کے تعلق سے ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ علامہ موصوف نے بڑی مسرت وخود اعتمادی کے ساتھ مندرجہ ذیل تحریری بیان اپنے دستخطوں کے ساتھ عطا فرمایا جس کے لیے ہم بے پناہ مشکور ہیں۔

"اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر اکابرین بریلی شریف کے خلاف جو توہین آمیز کتابیں اور پوسٹر خواہ فرضی ناموں سے ہوں یا اصلی ناموں سے میں سب کی مذمت کرتا ہوں اور خانوادہ اشرفیہ غوثیہ کے مریدین، متوسلین و متعلقین سے خصوصاً اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہم شبیہ غوث جیلانی سرکار علی حسین اشرفی میاں و دیگر اکابر کچھوچھہ کے مطابق اکابر بریلی کو اپنا دینی رہنما تصور کریں اور دشمنانِ رسول ﷺ کوئی موقع نہ دیں کہ وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے بنائے ہوئے قلعے کو کمزور کرسکیں۔ دستخط فقیر اشرفی گدائے جیلانی سیّد محمد ہاشمی اشرف جیلانی ماہم شریف ممبئی۔

مورخہ ۲۹ ر دسمبر ۱۹۹۵ء بروز جمعہ مبارکہ۔

"علمائے اہلِ سنّت وعوام اہلِ سنّت سے ایک دردمندانہ اپیل"

مندرجہ ذیل بیانوں سے بات واضح ہوجاتی ہے کہ اکابر بریلی شریف اور ساداتِ کچھوچھہ مقدسہ ان تمام تحریروں سے بیزار ہیں جو بریلی شریف اور کچھوچھہ مقدسہ کے تعلق سے فرضی ناموں سے شائع ہوتی رہی ہیں اس لیے ہم تمام علماء وعوام اہلِ سنّت سے اپیل کرتے ہیں کہ آج کے بعد بریلی شریف و کچھوچھہ مقدسہ یا کسی بھی سنّی عالمِ دین یا شیخ طریقت کے خلاف کوئی تحریر شائع ہو تو اس کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا جائے اور بریلی شریف اور کچھوچھہ مقدسہ کے تعلق سے صراحتاً، اشارۃً، کنایۃً کوئی ناپسندیدہ بات نہ کہی جائے۔ عقیدہ ومسلک، تعاون وتمانع کے تعلق سے بریلی شریف اور کچھوچھہ مقدسہ ناقابلِ تنسیخ رشتوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے دونوں کا احترام مسلمانانِ ہند کی اخلاقی ومذہبی ذمہ داری ہے۔ خدا ہم سب کو متحد، منظّم ہوکر ملّت اعلیٰ حضرت ومسلک اہلِ سنّت وجماعت کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اپیل کنندگان

احقر قمر الزماں اعظمی (مولانا) سعید نوری اسیر مفتیٔ اعظم

مولانا شاکر رضوی عبد الرشید طیب

اس طویل تحریری اعلان سے پہلے جوگیشوری ممبئی میں اہلِ سنّت کا ایک بڑا اجلاس پیرِ طریقت، انوار المشائخ حضرت سیّد انوار اشرف مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی سجادہ نشین درگاہ معلّٰی کچھوچھہ مقدسہ (صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت مہاراشٹر) کی صدارت میں منعقد تھا جس میں مقامی علماء کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ مہمان علماء میں خطیب الہند صاحبزادہ علامہ غلام عبد القادر علوی آف براؤں شریف خصوصی مقرر تھے۔ خود علامہ قمر الزماں خاں اعظمی نے اس اعلانِ مسرت کو جس وقت پڑھ کر عوام وخواص کو سنایا تو مسلمانوں کے انبوہِ کثیر پر جیسے خوشی ومسرت کا ایک ہیجان طاری ہوگیا۔ اس اعلان کا خیر مقدم فلک بوس نعروں کے ساتھ ہوا۔ عوام وخواص سبھوں کے چہروں پر مسرت واطمینان کا اُجالا پھیل گیا، فالحمد للہ رب العالمین اس

اعلانِ مسرت کے زبردست مثبت وخوشگوار ردِعمل سے مفسدین ومفلسین اہلِ سنّت میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی حالانکہ یہ اعلانِ مسرت اتحاد نہیں بلکہ اس کی سمت ایک مثبت وتعمیری قدم تھا۔ ایک قدم ہی سہی یہ بھی ان کے معاشی حجم کے لیے مضرت رساں تھا، چنانچہ وہ اپنی کوششوں میں لگ گئے، نتیجے کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تیسرے ہی دن اس اعلان مسرت کی تردید اسی نمایاں انداز میں انہیں اخبارات میں شائع ہوگئی۔

بہ قامت خون عالم ریختی پوشیدہ پوشیدہ
قیامت قامتت را بوسہ زد ترسیدہ ترسیدہ

تردید علامہ اختر رضا ازہری مدظلہ العالی کی طرف سے شائع ہوئی، تردید کا سرنامہ یہ تھا۔

غلط فہمی کا ازالہ علامہ ازہری

اخبارات میں ایک بیان چھپا جو میری طرف منسوب کیا گیا تھا۔ میں نے سعید نوری وغیرہ کو عجلت میں ایک بیان قلمبند کرا دیا تھا، جس میں میں نے واضح کر دیا تھا کہ مولانا قمر الزماں نے میری طرف سے منسوب کر کے جو بیان شائع کرایا تھا وہ الفاظ میرے بولے ہوئے نہیں ہیں۔ میں نے عجلت میں یہ بیان دیا تھا مگر مجھے آج ملک کے گوشے گوشے سے اطلاع ملی کہ مولانا قمر الزماں کے بیانوں سے غلط فہمیاں بڑھ رہی ہیں اور ہیجان میں اضافہ ہو رہا ہے لہٰذا میں واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ان کو اس طرح کا کوئی بیان ہرگز نہیں دیا جو اخبارات میں میری طرف منسوب ہو کر چھپا اور یہ بات میرے کل کے بیان سے بھی سمجھی جاتی ہے لیکن غلط فہمی کے ازالے کے لیے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اخبارات میں شائع ہوئے بیان سے اپنی لاتعلقی کا واضح طور پر اعلان کردوں، اس بیان کے لیے مولانا قمر الزماں صاحب خود ذمہ دار ہیں۔

دستخط مولانا محمد اختر رضا قادری ازہری

محمد سعید نوری نے کہا کہ مولانا قمر الزماں صاحب کے اعتماد پر میں نے دستخط کر دیا تھا، اب مجھے حقیقت حال معلوم ہوئی بہر حال مجھے اس کا افسوس ہے۔

اسیر مفتیٔ اعظم محمد سعید نوری

روزنامہ انقلاب وروزنامہ اردو ٹائمز مورخہ ۱۴ر شعبان المعظم ۱۴۱۶ ہجری بمطابق ۵ر جنوری ۱۹۹۶ء۔

حضرت علامہ ازہری صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے نفسِ مضمون میں جو اضطراب ہے اس کی نشان دہی کی بھی ضرورت نہیں اور نہ اس کی کمیت، کیفیت، نوعیت محتاجِ تبصرہ! یہ تردیدی بیان حضورِ والا پر بے پناہ ذہنی دباؤ کا نتیجہ تھا، جس کے ذمہ دار پس آئینہ نہیں رہ گئے۔

''یہ آپ نے کیا کیا؟ یہ بیان دے کر تو ایک طرح سے ہم لوگوں کا ہاتھ پاؤں کاٹ دیا آپ نے۔ ہم لوگ اب آپ کے لیے لڑیں گے کیسے؟

ان جملوں کی صدائے بازگشت خواص کے ایک بڑے حلقے تک پہنچ چکی ہے۔ ان جملوں کی سنگینی کا اندازہ لگائیے آہ!

ایک مقدس بابرکت صاحبِ نسبت باعظمت شخصیت کی مومنانہ سادگی کا یہ منفی استعمال! ؎

اس راز کو تو فاش کرا اے روحِ محمد — آیاتِ الٰہی کا نگہباں کدھر جائے

ان کے اس عمل سے ان کا تو کچھ نہیں بگڑا کہ ان کے پاس بگڑنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں اور نہ ہی قد چھوٹے ہوئے کہ پہلے سے بھی زیادہ بڑے نہیں تھے، البتہ ان کے اس عملِ ریائی سے مرکز اہلِ سنّت بریلی شریف کی پاکیزہ نسبت سوالیہ نشان کے زد میں آ گئی، نقصان پسِ آئینہ کا نہیں سرِ آئینہ کا ہوا کہ وہ وضاحتی بیان اور اس کی تردید موجودہ متنازعہ شخصیتوں سے کہیں زیادہ ان نفوسِ قدسیہ کے تعلق سے تھا جن کے لیے امامِ عشق ومحبت اعلیٰ حضرت عظیم البرکت اور ان کی نامور وقدسی صفات اولاد احفاد نے زبردست وتاریخی احترام پیش کیا ہے اور یہ احترام اک طرفہ نہیں تھا، باہمی احترام وعقیدت کی تفصیلات اگر یکجا کی جائیں، تو ایک ضخیم ومبسوط کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ماہنامہ ''تجلّیات'' ناگپور کے مجدد اعظم نمبر کا تاریخی خطبۂ استقبالیہ کی ایک جھلک ہی مساوات کچھوچھہ کے دلوں میں احترامِ بریلی کے لیے کافی ہے، باہمی احترام کی اس روشنی میں اب علامہ قمر الزمان کی کوششوں کو سبوتاژ کرنے والی تردیدی عبارت کو ایک بار پھر غور سے ملاحظہ فرمائیں!

''میں ان گمنام پوسٹروں سے جس میں ساداتِ کچھوچھہ کی توہین وکردار کشی کی گئی ہے اور ''نقلی سادات کے اصلی روپ'' جیسی کتابوں سے سخت بیزاری کا اظہار کرتا ہوں اور ان کی مذمت کرتا ہوں۔''

کیا ان سطور سے عوام اہلِ سنّت وخواص کے ایک بڑے طبقے کو یہ باور کرانا نہیں ہوا کہ بریلی شریف کی سب سے زیادہ اہم ومرکزی شخصیت سادات واکابرین کچھوچھہ کی توہین وتذلیل اور کردار کشی سے ناراض نہیں۔ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے مسلک محبت کے ایک بڑے ترجمان اور آپ کے قوتِ بازو اور بارگاہِ عشق ومحبت کے شہزادے حضور محدثِ اعظم ہند کے رافضی زادہ قرار دیئے جانے کا انہیں کوئی ملال نہیں! اور شیخ المشائخ ہم شبیہ غوث جیلانی نظر کردہ پروردہ سہ محبوبان کی توہین وتذلیل اور انہیں ایک مکمل فراڈ قرار دیئے جانے سے علامہ ازہری قبلہ کے نزدیک سنّیت کا کوئی نقصان نہیں؟ خاندانِ نبوت کی شہزادیوں کے بدکرداریوں کی فرضی داستان سے بھی حضورِ والا بیزار نہیں! اور نہ ان خرافات کی آپ مذمت کر سکتے ہیں! اور اگر وقارِ سنّیت کی بحالی کے لیے کوئی وضاحتی بیان آ جائے کہ ایسے خرافات سے مرکز اہلِ سنّت کی مرکزی شخصیت بیزار ہے تو ایسے بیان کی تردید بریلی شریف کی مرکزی شخصیت کے لیے ضروری ہے۔ بالفرض اگر وہ وضاحتی بیان دروغ مصلحت آمیز بہتر از صدق فتنہ انگیز کے مطابق تعمیر سنّیت واتحادِ اہلِ سنّت کے چھپ بھی گیا تو اس سے دین وسنّت کے لیے کتنا بڑا نقصان ہوا، یا حضرت علامہ کی قبائے قامت زیبائی کتنی شکن آلود ہوئی؟ یا حضرت کی قدآوری پر کوئی قدغن لگا۔ بے کراں شخصیت پر کوئی حرف آیا، یا کسی طرح کی کوئی تخفیفِ شان ہوئی۔

بہر حال کام کرنے والے اپنا کام کر گئے مرکز اہلِ سنّت کو جن مقاصد کے تحت زخم دینا تھا دے چکے!

واضح رہے کہ صرف ایک حضرت اشرفی میاں کی نفی سے سنّیت کا پورا ڈھانچہ چرمرا کر رہ جائے گا۔ ان کی نفی سے پہلے دین وسنّیت فضل وکمال کے ان آسمانوں کی نفی کرنا پڑے جن کا ذکر ابھی اُوپر گذرا یعنی خلفاء واکتسابِ فیض کرنے والوں

کی فہرست علامہ قمرالزماں اعظمی کے اس مخلصانہ ومتشکرانہ جدوجہد کی سبوتاژی سے کچھ مثبت اثرات بھی مرتب ہوئے، عوام نے وضاحتی بیان ہی کو اہمیت دی تردید پر دھیان ہی نہیں دیا، خواص اہلِ سنّت کے ایک بڑے طبقے نے اپنے رویئے کا احتساب کیا، ساداتِ کچھوچھہ کے لیے دلوں میں درد جاگے جو کبھی حضرت علامہ ازہری صاحب قبلہ کے لیے لفظ ''کملی'' پر سے پیدا شدہ زخم سے جاتے تھے اور اکابرین بریلی شریف کے کردار کشی کے خلاف اپنے مذمتی بیان میں مولانا ہاشمی میاں نے فرضی کے ساتھ اصل ناموں کی قید لگا کر ایک طرح سے ان جارحیت کے اندمال کی کوشش کی جو کبھی ان کے تعلق سے سمجھا جاتا رہا، جس کے ذاتی فوائد خود انہیں حاصل ہوئے کہ ان کے تعلق سے جو عوامی غبار دلوں میں تھا وہ بہت کم ہوا اور ان کی بے کراں خطابت پر جو جگہ جگہ نو فلائی زون لگے ہوئے تھے وہ از حد خود اُٹھنے لگے۔ ؎

میں بلبل نالاں ہوں ایک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں محتاج کو داتا دے

اور ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ خواص اہلِ سنّت پر ان تخریب کاروں اور فساد سنّیت کو بڑھاوا دینے والے اصل کرداروں کی قرار واقعی حیثیت واضح ہوگئی اور ابتذال و انتشار اور بزرگوں کی حرمت وناموس کی پامالی کے حقیقی ذمہ دار پسِ آئینہ سے سرِ آئینہ آگئے، اور خود علامہ اعظمی پر اس بے رحم حقیقت کا انکشاف ہوگیا کہ ان ساری آلودگیوں کا اصل سرچشمہ کہاں ہے اور سنّیت کو لخت لخت کرنے والے نیکوکار چہرے کون کون ہیں۔ اب سوادِ اعظم کا لہو انگلیوں پر تلاشنے کے لیے پورے شہر کا دستانہ اتارنے کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی ہے کہ۔ ؎

میں کس کے ہاتھ میں اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر تو پہنے ہوئے ہے دستانے

احترامِ سادات اور امام احمد رضا بریلوی :۔ ایسے ماحول میں یہ کتاب سعادتِ دارین بن کر مملکتِ خداداد سے وارد ہوئی۔ نام اور موضوع ہی سے طبیعت پر ایک انبساط وسرور طاری ہوگیا، ایک نشست میں پوری کتاب دیکھ ڈالی۔ بے شک اس کتاب کی ضرورت پاکستان سے زیادہ ہندوستان میں ہے۔ خاص کر ایسے ماحول میں جہاں ایک چھ سو سالہ سادات کا خاندان اپنے تمام تر تاریخی ودستاویزی ریکارڈ کے باوجود اپنوں کے ہاتھوں مسترد ہو رہا ہو اور جہاں خاندانِ نبوت کی بے توقیری اور اس کے حرمت وناموس کی رسوائی کو خدمت دین باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہو، تو پھر وہ خانوادہ جو اپنی پشت پر اتنی روشن وناقابلِ تردید دستاویز نہیں رکھتا اس کی بے توقیری کا کیا حال ہوگا؟

مولیٰ تعالیٰ قافلہ محبت کے سالارِ اعظم آبروئے عشق ووفا اعلیٰ حضرت سیّدنا امام احمد رضا کی تربتِ انور پر دن رات رحمت ونور کی موسلادھار برسات فرمائے کہ جہاں آپ نے دین وسنّیت کی بہت ساری قدریں، نورانی، عرفانی، روحانی محفلیں، صالح روایات وآثار وتبرکات کو مٹنے سے بچالیا تھا، وہیں اپنے عشق رسول ﷺ بدولت سرکار کی اولاد امجاد آپ کی اہلِ بیت اور ذریاتِ طیبات کی عظمت وجلالت کو اتنا روشن واُجاگر اور خاندانِ نبوت کی حرمت وناموس کے گرد اتنا

سخت پہرہ بٹھا گئے ہیں کہ اب ان کی قصرِ عظمت و کرامت میں کوئی نقب زنی بھی کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا۔ جب تک دنیائے محبت کی بے کراں وسعتوں میں ان کے سوزِ جگر کی خوشبو سلامت ہے سادات کا چراغ عظمت و احترام یوں ہی جلتا رہے گا اور جب تک کائنات عشق و عقیدت میں ؎

تیری نسلِ پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور تیرا سب گھرانہ نور کا

کا ترانہ گونجتا رہے گا، ساداتِ کرام کی عظمت و کرامت کی نوبت بجتی رہے گی، ان کے احترام و عقیدت کا سورج سوا نیزے پر چمکتا رہے گا۔ ؎

آ کچھ سُنا دے عشق کے بولوں میں اے رضا
مشتاق طبع لذت سوزِ جگر کی ہے

اس کتاب کا ایک بڑا حسن یہ ہے کہ صاحبِ کتاب محترم مولانا سیّد صابر حسین شاہ بخاری نے اس کتاب میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا۔ بات بھی کی ہے تو اسی مشتاقِ طبع لذتِ سوزِ جگر کی۔ سوز و گداز بھی پیش کی ہے تو اسی تپ سینہ سوزاں کا جس کی بے تابی سے دو عالم تنگ ہیں۔ ؎

تنگ آ گئے ہیں دو عالم تیری بے تابی سے
چین لینے دے تپ سینہ سوزاں ہم کو

ترانہ بھی اگر کوئی چھیڑا ہے تو اسی سوختہ جاں کا، نوا سنجی بھی اگر پیش کی ہے تو اسی بلبلِ ہزار داستان کی جو محبت کے ہر محفل کی جان ہے۔ ع مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام۔ مولانا سیّد صابر شاہ نے علومِ امام احمد رضا کے سمندر میں غوطہ لگایا اور اہلِ محبت کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا۔ فجز اءاللہ احسن الجزاء۔

سیّد موصوف کو پہلی بار پڑھنے کی سعادت ملی بقول علامہ سیّد وجاہت رسول وہ مسلسل دس سال سے اپنے قلم سے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اولیاء، صلحا بالخصوص اعلیٰ حضرت امام احمد رضا ان کا پسندیدہ موضوع ہیں۔ اپنے بے خبری پر جہاں مجھے افسوس ہوا وہیں اس بات کی مسرت کہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک بڑا قدرِ مشترک ہے اور وہ ہے اعلیٰ حضرت کی ذات ستودہ صفات یہی ابتدا سے ہی میرا بھی موضوع قلم رہا، اس موضوع پر اعلیٰ حضرت اور کنز الایمان پہ میرا پہلا طویل مقالہ جو استقامت ڈائجسٹ کانپور میں بہت پہلے چھپ چکا ہے۔ ''جہانِ حیرت'' یہ دوسرا طویل مقالہ ہے جو میری کتاب بھیگی پلکوں میں شائع ہوا۔ امام شعر و ادب، انوارِ کنز الایمان یہ مستقل کتابیں ہیں۔ ایک طویل ترین مقالہ جسے کتاب کی حیثیت حاصل ہے۔ ''الامام احمد رضا بین المدح والقدح۔''

یہ اعلیٰ حضرت بریلوی پر میرا تازہ مقالہ تھا جو کم و بیش دو برس سے مولانا رحمت اللہ صدیقی پوکھرہ سیتامڑھی بہار کی تحویل میں ہے، یہ مقالہ میں نے بڑے نازک حالات میں لکھا تھا۔ میرے جواں سال بیٹے محمد راشد جمال قادری جیبی کا ایک بڑا

شدید ایکسیڈنٹ گوا میں ہوا تھا، وہ مقالہ گوا میڈیکل کالج میں ۱۴؍ دن میرے ساتھ رہا، اس مقالے سے میری جذباتی وابستگی بھی ہے، یہ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کی مستقل و مسلسل فرمائش پر ''پیغام رضا'' کے لیے اس وقت دیا تھا جب ان کے اپنے بھی ان پر اعتماد کرنے اور کسی طرح کی قلمی معاونت سے انکار کر چکے تھے، غیر مطبوعہ مقالوں میں وہ پہلا اہم مقالہ تھا۔ ''پیغامِ رضا''، مسلسل نکل رہا ہے مگر موصوف نہ اسے چھاپتے ہیں نہ مانگنے پر واپس دیتے ہیں! غالبا! مالِ مفت کی بے قدری اسی کا نام ہے یا ہوسکتا ہے یہ بھی سرکار اعلیٰ حضرت سے عقیدت کا کوئی انداز ہو۔

بے شک سیّد صاحب نے بڑے منفرد موضوع کا انتخاب وہ بھی منفرد انداز میں فرمایا اور احترامِ سادات کے تعلق سے اعلیٰ حضرت کے ارشاد کے حوالے سے اپنی اس مخلصانہ کاوش کو اصلاحِ فکر ونظر کا سامان بنا دیا۔ محترم مولانا سیّد صابر حسین شاہ قادری رضوی نے نفسِ موضوع پر ''حدیث دیگراں'' کو سمیٹتے ہوئے جو اختتامیہ پیش کیا ہے وہ بڑے خاصے کی چیز ہے و بقول علامہ سیّد وجاہت رسول قادری بڑا سبق آموز وفکر انگیز ہے۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں قبول فرمائے۔ بے شک ساداتِ کرام کی ایک اچھی خاصی تعداد اپنا منصب و مقام چھوڑ چکی ہے، خود احتسابی کے جوہر گرانقدر سے بھی اپنے کو الگ کر چکی ہے اور ''منفرد ہے موصف میں خونِ رسول ہاشمی'' کا احساس تک کھو بیٹھی ہے۔ اس مقدس قبیل سے کچھ مقدس ہستیاں تو ایسی بھی ہیں جنہوں نے اپنی بد خلقی کو خلق کے عظیم کے مترادف سمجھ لیا ہے، مولیٰ تعالیٰ میدانِ کرب و بلا کے شہیدوں کے مقدس لہو کے صدقے میں سادات کو بھی اپنے پاکیزہ لہو کے احترام کی توفیق عطا فرمائے اور انہیں اپنے حسب ونسب کے بے جا افتخار و غرور کی بیماری سے بچائے اور ان کے دلوں میں یہ احساس جاگزیں کردے کہ ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

آل انڈیا تبلیغ سیرت: یہ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کے ایک ایسے عظیم مقتدا کی جماعت ہے جو بیک وقت رضویت و اشرفیت کا ایک بڑا سنگم تھا۔ امام التارکین سرکار مجاہد ملّت حضرت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی رضوی اشرفی، جو شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت علامہ مفتی شاہ حامد رضا ابن اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی نسبت بیکراں (یعنی اجازت وخلافت کی نعمت کبریٰ) کے حوالے سے رضوی اور شیخ المشائخ ہم شبیہ غوث جیلانی شاہ علی حسین اشرفی جیلانی کی نسبت خلافت کے واسطے سے اشرفی تھا اور دونوں مبارک و مسعود سلسلوں کے وسیع تر حلقوں میں یکساں محترم تھا اور خود دونوں سلسلوں کے بزرگوں کی بارگاہ میں حسنِ ادب کا ایک شاہکارِ اعظم تھا، اس لیے ان کی یادگار جماعت آل انڈیا تبلیغ سیرت نے اس کتاب کی اشاعت کو ایک دینی وروحانی ضرورت سمجھ کر شائع کیا، تاکہ اس کے ذریعے اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے پیغامِ محبت سے دل ونگاہ کو پاکیزگی ملے، فکر ونظر کے غبار دھلیں، شکستہ قلوب جوڑے جاسکیں، اور زبان وقلم کے نیزوں سے پیدا شدہ زخم کی مرہم کاری ہو سکے اور وہ لوگ جو صرف اپنے مفاد کے لیے اہلِ سنّت کے دو عظیم سلسلوں کے درمیان فصل کی ناخوشگوار فریضہ انجام دے رہے ہیں، وہ اب خدارا وصل کے کاموں میں لگ جائیں کہ ؎

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

مُقدمہ: انوارِ کنزالایمان

"کون سنتا ہے فغانِ درویش؟"

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناراض
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

تاج کمپنی لاہور نے اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجددِ دین وملّت سیّدنا امام احمد رضا بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ترجمۂ قرآن "کنز الایمان" مع تفسیر "خزائن العرفان" (از صدر الافاضل حضرت علامہ سیّد محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہٗ العزیز) بڑے اعلیٰ پیمانے پر پندرہ پندرہ پاروں پر مشتمل دو نفیس جلدوں میں شائع کیا جس کا ہندوستانی ہدیہ فی نسخہ تین سو پچاس روپے تھا۔ "رضا اکیڈمی" ممبئی نے اس نسخے کو ایک ہی جلد میں فوٹو آفسیٹ پر تقریباً ڈھائی لاکھ روپے کی لاگت سے اپریل ۱۹۸۰ء میں ممبئی سے شائع کیا فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

"انجمن غلامانِ رضا" ممبئی مسلسل کئی سالوں سے ممبئی ہی میں بڑے اہتمام وشوق سے "یوم رضا" مناتی ہے۔ ۱۳۹۹ھ کے عرس میں مجھے بھی شرکت کا تحریری دعوت نامہ ملا ۲۵ صفر المظفر کی شب میں، میں اپنی عقیدت کی دنیا آباد کیے اس تقریب سعید میں حاضر ہوا۔ وسیع وعریض اسٹیج علماء وواعظین سے بھرا ہوا تھا۔ سامعین کا عالم نہ پوچھیے، بس جہاں تک نگاہ پہنچتی آدمی ہی آدمی نظر آتے۔ یہ دیوانے اس فرزانے کا ذکر سننے آئے تھے جس نے محبت رسول کے کشتِ ویراں کو لالہ زار کیا۔ دل کی ریگزار وادیوں میں عقیدت کے چشمے جاری کیے۔ صحرا میں پھول کھلائے، طوفانوں میں کشتیاں چلائیں، دلِ خانماں برباد کو آباد کیا۔ بادِ مخالف کا رُخ موڑا اور آندھیوں کی زد پر عشق کا چراغ جلایا۔

عالمِ اسلام بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کی علمی، دینی، مذہبی، اخلاقی، روحانی، معاشرتی اور سیاسی قیادت کی جس نے اسلام دشمنوں کی اجتماعی طاقت کو شکست فاش دی۔ اسلام کے خلاف خارجی وداخلی فتنوں کو زندگی بھر سر اٹھانے کا موقع نہ دیا۔ چاہے وہ ہنود کی ریشہ دوانیاں ہوں یا یہود کی! نصاریٰ کی فتنہ سامانیاں ہوں یا مرتد قادیان کی۔ اکبر بادشاہ کا مرا ہوا فتنہ "دینِ الٰہی" بشکل ہندو مسلم مواخاۃ ہو یا ترکِ موالات۔ خلافت کمیٹی ہو یا ترکِ گاؤکشی، ہندو مسلم موالات ہو یا "نان کوآپریشن" غرض انسانی فضل وکمال کے اس پیکر مجسم کے آگے سب کے کس بل نکل گئے۔

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار

اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

بالخصوص نصاریٰ کا وہ فتنۂ عظیم جو اپنے چہرے پر پلاسٹک سرجری کا میک اپ کر کے نجد کے راستے سے چل کر سہارنپور آیا تھا، وہ بھی اس مردِ مومن کی فراست سے چھپ نہ سکا۔ اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور الله۔ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے۔ ع

مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

اس کے خوں خوار برق بار سیفِ قلم نے تہ در تہ نقاب کے پیچھے چھپے ہوئے چہرے کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ وہ فتنہ دن کے اُجالے میں ننگا ہو کر رہ گیا۔

دین کُش ان ڈائنوں کو تم نے بے پردہ کیا
سرزمین نجد سے جو بن کے آئی تھیں دولہن

مگر جیسا کہ ہمارے اسٹیج کا دستور ہے ذہنی وفکری طور پر نابالغ اور عطائی مقررین اصل وقت کو ضائع کر دیتے ہیں اور جب بامقصد گفتگو کا وقت آتا ہے تو نصف مجمع رخصت ہو چکا ہوتا ہے اور بقیہ نصف شرماحضوری میں نیند اور اونگھ کی نذر ہو جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ○

عطائی اور فکری طور پر نابالغ مقررین کے جلو میں ہمیں بھی لب کشائی کا موقع دیا گیا۔ ایک عرصے سے سینے میں مچلتے آتشین جذبات صرف چند منٹ کے لیے باہر ہوئے اور جانے کتنی پیشانیاں شکن آلود ہو گئیں اور نہ جانے کتنے چہروں پر حیرت واستعجاب کے ساتھ سرور وانبساط کی لہر دوڑ گئی۔ میں کوئی ساحر البیان مقرر نہیں، علومِ اسلامیہ کی تحصیل کے بعد صرف ایک تاجر ہو کر رہ گیا ہوں۔ ہاں علمی دُنیا سے دیرینہ تعلق خاطر کسی حد تک برقرار ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ نشتریت سے بھرپور اپنے اسٹیج کے منفی رول سے متعلق چند حقائق تھے۔ عام حالات میں جس کا اظہار ایک کارے دارد کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ اور اس تقریر کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہم نے امام اہلِ سنّت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی زندگی کے رنگا رنگ تہ در تہ، ہمہ صفت اور جامع الصفات شخصیت کے وہ فروزاں نقوش پیش کیے تھے جس سے ہمارا اسٹیج کلی طور پر اغماض برت رہا ہے۔ قصداً، سہواً یا مجبوراً۔ (اِلَّا مَاشَآءَ الله) اور ہمارے مخالف کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس نابغۂ روزگار شخصیت کا وہ تابناک رُخ پیش کرے جس پر ناواقفیت اور طرح طرح کی غلط فہمی کا دبیز پردہ پڑا ہوا ہے، عوام تک پہنچانے کے لیے ہمارا واحد ذریعۂ ابلاغ صرف اسٹیج رہ گیا ہے۔ وہ بھی غیر محسوس نہیں محسوس طور پر وہی سب کچھ پیش کر رہا ہے جو ”رضا مخالف مشن“ کا عین مطلوب ہے۔ ترمیم وتنسیخ اور قطع وبرید کے ساتھ وہ راگ جو ”رضا مخالف مشن“ پورے عالمِ اسلام میں نصف صدی سے زائد الاپ رہا ہے۔ اور ایک تحریک کی شکل میں منظم طور پر بڑے تندہی کے ساتھ زندگی کے صرف ایک پہلو کو لے کر اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورا پیٹ پیٹ کر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا ہے۔ سوئے اتفاق کہیے یا امام احمد رضا کی مظلومی نادانستہ طور پر خود فریبی میں مبتلا ہو کر بڑے خلوص کے ساتھ ہمارا اسٹیج وہی سب کچھ پیش کر رہا ہے جو ”رضا مخالف مشن“ چاہتا ہے۔

ع۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

امام کی علمی، فکری، قومی، معاشرتی اور سیاسی خدمات کا علم جب ان فضلاء و واعظین کو خود ہی نہیں تو وہ عوام کو کیا بتا سکیں گے۔ وہ تو اپنے اسٹیج پر دو چار ہزار آدمیوں کو جمع کر لینا ہی وقت کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔

ہمارے علماء و واعظین اور پیرانِ کرام کو اللہ رب العزت جل جلالہٗ نے امام احمد رضا فاضل بریلوی کے طفیل بڑا اچھا رزق اور مسلمانوں کی مذہبی قیادت کا امتیازی اعزاز عطا فرمایا هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان کے طور پر انھیں چاہیے تو یہ تھا کہ وہ امام اہلِ سنّت کا بھی کوئی کام کرتے۔ ان پر جو امام کا حق تھا اس سے عہدہ برآ ہوتے مگر وہ ''مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' پڑھ کر جھومتے، وجد کرتے اور خوش ہوتے رہے اور اعلیٰ حضرت زندہ باد، اعلیٰ حضرت کا دامن نہیں چھوڑیں گے کہہ کہلوا کر یہ یقین کر بیٹھتے ہیں کہ ہم نے امام احمد رضا کی سات پشتوں پر احسان کر دیا ؎

دل سلگتا ہے تو چہرے سے دھواں اٹھتا ہے
احتیاطوں کے جہنم کو بُجھا دے کوئی

انھیں کیا معلوم جب کفر اسلام کو لرزا رہا تھا اور ابنائے مسلمان لیڈروں کو بے وقوف بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہے تھے۔ اندر باہر ہر طرف کفر کی یلغار تھی، ہندوستان سے اسلامی عظمتوں کو مٹا دینے کی جان توڑ کوشش کی جا رہی تھی، اسلامی شعائر کو پاؤں تلے روندا جا رہا تھا۔ اقتصادی اور معاشی طور پر مسلمانوں کو تباہ و برباد کیا جا رہا تھا، ان کے چاروں طرف خود فریبی کے جال بچھائے جا چکے تھے، ان کے فطری جذبات کا استحصال کیا جا رہا تھا۔ قومی توانائیوں کا رخ خوبصورت انداز میں ہلاکت کی طرف موڑا جا چکا تھا، اس وقت اس مردِ مومن نے کیا کارنامے انجام دیے۔ طوفانِ بلاخیز کا رُخ کتنی پامردی سے موڑا۔ طلسم سامری کے تار و پود کس طرح بکھیرے۔ قوم کی توانائیوں کو صحیح سمت عطا کرنے میں کسی دلسوزی کا مظاہرہ کیا۔ اسلام کے اس بطلِ جلیل نے کفر کے کس کس سیلاب کے آگے بند باندھا۔ اسلام دشمن منصوبوں کو اپنے ناخنِ تدبیر سے کس طرح تارِ عنکبوت کیا۔

آپ پہلے امام احمد رضا کو پڑھو، سمجھو، پھر ہمیں پڑھاؤ سمجھاؤ۔ صلاحیتوں کو مار دینے والی وعظ کی صرف ان مروجہ کتابوں پر انحصار نہ کرو۔ اسلاف امت بالخصوص فاضل بریلوی اور آپ کے معاصرین علماء کی تصانیف کا مطالعہ کر کے اسٹیج پر تشریف لاؤ، پھر نہ صرف ہمیں بلکہ آپ حضرات کو خود محسوس ہوگا کہ۔ ع

عجب چیز ہے لذّت آشنائی

البتہ جو واقف کار ہیں حالات و واقعات پر جن کی نظر گہری ہے، صلاحیتیں جن کی بارگاہ میں خود دست بستہ امید و بیم کی کشمکش میں منتظر ہیں وہ تن آسانیوں کے خول سے باہر نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ امت پہ کچھ بھی گذر جائے دست و قدم بوسی کے فریضہ ادا کرانے سے زیادہ اہم نہیں۔ ان میں اگر کچھ حضرات ازراہِ خلوص آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو حالات کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر دم بخود ہیں۔ قوم کے مزاج کو اس طرح سے بگاڑ دیا گیا ہے کہ وہ الفاظ کے مدو جزر میں گم ہو کر رہ گئی

ہے۔اب علم کے پرکھنے کا معیار بدل چکا ہے۔ پرانے پیمانے توڑے جاچکے ہیں، آج علمی حیثیت کو قدبت سے ناپا جاتا ہے، علمی جبروت آج شکل وصورت اور چہرے کی وجاہت سے عبارت ہوکررہ گئی ہے۔

سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی مضبوط ترین تنظیم آل انڈیا سنّی جمعیۃ العلماء علماء عوام اور خواص سب کا مرکز امید تھی۔مگر اس کی صوبائی قیادت یعنی ممبئ عظمیٰ (جو حقیقۃً اصل قیادت ہے) پر ایسے لوگوں کو قبضہ ہوگیا ہے جو قطعاً کسی طرح اس کے اہل نہیں۔وہاں صرف فردِ واحد کی حکومت ہوتی ہے، کسی بھی معاملے اور مشورے میں اختلافِ رائے کی قطعاً گنجائش نہیں۔اگر شامت اعمال سے کسی نے اختلافِ رائے کی جرأت کربھی دی خواہ وہ کتنا ہی صاحبِ علم وفضل ہو سنّی جمعیۃ کے دروازے ہمیشہ کے لیے اس پر بند ہوجاتے ہیں۔اس لیے کہ اب وہاں ملّت کے نفع نقصان سے زیادہ اپنا ذاتی نفع و نقصان دیکھا جاتا ہے۔رسمی وروایتی طور پر مقامی باڈی ایسے عضوِ معطل لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کے اندر اختلافِ رائے کی جرأت نہیں ہوتی۔ان کے اندر صرف اتنی ہی جرأت کافی ہے کہ ہر غلط وصحیح ایجنڈے پر ''الجواب صحیح'' کا مہر لگا سکیں۔اور ضرورت پڑنے پر گائے کے بچے کو شتر مرغ کا بچہ کہنے میں تامل نہ کرسکیں۔ان کے لیے یہی اعزاز بہت ہے کہ وہ سنّی جمعیۃ العلماء کے کچھ ہیں۔اس وقت وہاں پر علم وفضل نہیں بلکہ نسبت کی بنیاد پر امیدوار کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اہم جگہوں کی تنصیبات نسبت ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے یا پھر بارگاہ ناز میں جذبۂ جبیں سائی امتیازی فضیلت کا معیار قرار پاتا ہے۔اہلِ علم کا کوئی پُرسانِ حال نہیں۔اسی لیے باوقار اور صاحبِ فضیلت علماء ازخود اس طرف رُخ کرنا اپنے علم کی توہین سمجھتے ہیں اور اگر کوئی ناواقف اپنے علم کا طمطراق لیے پہنچ بھی گیا تو ایک ہی جھٹکے میں اس کے پندار کا قلعہ زمین بوس ہوجاتا ہے اور اپنے اوپر خود ہی نفریں کرتا ہوا واپس آتا ہے ؏

بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچے سے نکلے ہم

میدان خالی ہے کوئی کلائی پکڑنے والا نہیں، عوام کی قوتِ محاسبہ مرچکی ہے کَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَل کا عملی نمونہ بن چکے ہیں۔بعض لوگ ازراہِ خلوص کچھ کرنا چاہتے ہیں تو نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مترادت ؏

کون سنتا ہے فغانِ درویش!

یقین نہ ہو تو محرم الحرام کے چاند کے ایک دن آگے پیچھے سنّی جمعیۃ العلماء کے مرکزی آفس مدن پورہ میں چلے جائیے اور علم وعلما کی بے بسی، کس مپرسی اور ناقدری کا عبرت انگیز دردناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے۔یہ صرف چند جھلکیاں ہیں۔ماتم یہ ہے کہ جس سنّی جمعیۃ العلماء کو ہمارے بزرگوں نے اپنا خونِ جگر دے کر اسے متحرک وفعّال اور ملک گیر بنایا تھا، وہی آج چند ہاتھوں میں بازیچۂ اطفال بنی ہوئی ہے اور ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔سنّی جمعیۃ العلماء کا دائرۂ عمل محدود ہوتا جارہا ہے اور ہم ٹس سے مس نہیں ہورہے ہیں۔کل میدانِ قیامت میں اگر سید نور اللہ حسینی، سید محدث کچھوچھوی، سید آلِ مصطفےٰ، شیر بیشۂ اہلِ سنّت، مولانا محبوب علی قدست اسرارہم وغیرہ نے ہم سے جواب طلب کرلیا کہ سوادِ

اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی وہ امانت (یعنی سنّی جمیعۃ العلماء) جو ہم تمہارے سپرد کر آئے تھے وہ کیا ہوئی؟ تو یقین جانیے ہمارا یہ افسوس ناک تغافل اور مجرمانہ سکوت جواب دہی سے نہیں بچا سکتا۔

یہ ہے دامن، یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

آج سُنّی جمیعۃ العلماء کی صوبائی قیادت ایسے ہاتھوں میں آ گئی ہے جو چند کھوٹے سکّوں کے عوض اس کے بلند مقاصد اور بے مثل نصب العین کا سودا اغیار کے ہاتھوں کر سکتے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ کر بھی چکے ہوں۔ کیوں کہ جلوسِ گنبد خضرا سے لے کر مظلوم حجاز مجاہد ملت حضرت علامہ محمد حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ کے حجازِ مقدس سے جبری اخراج تک ہماری صوبائی قیادت کا رول بڑا پُر اسرار رہا۔ بمبئی کے ہوش مند مسلمانوں پر یہ حالت مخفی نہیں کہ جلوسِ گنبد خضرا سے لے کر مجاہد ملت کے جبری اخراج تک صوبائی قیادت سعودی بادشاہ خالد کے حضور کس کس طور پر سپر انداز وزمیں بوس ہوئی۔ غیر یقینی کشمکش سے الگ ہو کر ذہن پر زور دیجیے، اسرار کھُلتے جائیں گے۔ یہ کوئی فکری ونظری مسئلہ نہیں کہ جسے مثالوں سے سمجھایا جائے

چمن مسکن بنا ہے اُلوؤں کا یہاں گنجائش بلبل نہیں ہے

اگر مرکزی قیادت نے ہمارے اِن معروضات پر ٹھنڈے دل سے غور کر کے کوئی مستقل اطمینان بخش حل نہیں پیش کیا تو عن قریب وہ کتاب منظر عام پر آئے گی جس سے ہلچل مچے گی، طوفان اُٹھے گا، زلزلے آئیں گے، عوام کی قوتِ محاسبہ بیدار ہوگی اور مذہبی قیادت، احتسابِ نفس پر مجبور ہوگی، جس کی تمام تر ذمے داریاں آل انڈیا سنّی جمیعۃ العلماء کی مرکزی قیادت پر عائد ہوگی۔

تمھیں نے جرأتِ اظہار شوق دی ورنہ
مجال کیا تھی ہماری کہ آرزو کرتے

بات پر بات نکلتی گئی اور میں اپنے موضوع سے دور ہوتا گیا۔ گفتگو چل رہی تھی ''انجمن غلامانِ رضا'' اور ''یوم رضا'' کی۔ آئیے پھر اسی طرف واپس چلیں۔ تقریر کے بعد یہ سُن کر بے حد خوشی ہوئی کہ ''رضا کیڈمی'' عن قریب امام اہلِ سنّت کا ترجمہ ''کنز الایمان'' شائع کرنے والی ہے۔ میں نے ان کو ایک مشورہ دیا کہ قرآن مجید کے ساتھ امام اہلِ سنت اور ترجمۂ پاک کنز الایمان سے متعلق ایک تعارفی مقالہ ضرور شامل کیجیے۔ رضا اکیڈمی کے ارکان نے ہمارے اس مشورے کو گوشِ قبول سے سنا اور ہمیں کو مجبور کیا کہ آپ خود ہی لکھ دیں۔ خصوصاً میرے دیرینہ کرم فرما محمد یوسف منہار صاحب جو اہلِ سنّت و جماعت کے ایک مخلص، دردمند، متحرک، فعال اور ایک بیباک مردِ مجاہد ہیں۔ انھوں نے اپنے شدید اخلاقی دباؤ اور پیہم اصرار سے مجھے مقالہ لکھنے پر آمادہ کر لیا۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے باوجود حسب وعدہ صرف چند دن کے اندر یہ مقالہ میں نے رضا اکیڈمی کے ارکان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مقالہ کو سُن کر وہ لوگ کافی محظوظ ومشکور ہوئے۔ کچھ دنوں بعد جب قرآن شریف پریس جانے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مقالہ اپنی طوالت کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے گا۔ حالانکہ

یہ بات نہیں تھی، وہ مقالہ کاپی کے ۲۲ رصفحات پر مشتمل تھا۔ قرآن مجید کا زیادہ سے زیادہ چھ یا سات صفحات لیتا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس مقالے میں مذہبی قیادت کے جمود پر چند سطور تلخ آمیز ریمارکس پر مشتمل تھیں، جو اتنی جائز اور برحق تھیں کہ مقالہ سنتے وقت اکیڈمی کے ارکان بھی میرے ہمنوا نظر آنے لگے (جیسا کہ ابھی آپ اسے ملاحظہ فرمائیں گے) غالباً بعد میں کسی کی توجہ دلانے پر اپنی مصلحت کوشیوں کے پیش نظر اس کی عدم اشاعت کو اپنی تجارت کے حق میں مفید سمجھا۔ اس موضوع پر جب میری اُن لوگوں سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ قرآن مجید چونکہ ہم ایک ہزار صفحات کے اندر لانا چاہتے ہیں، اس لیے اگر اس میں کچھ بھی صفحات کا اضافہ ہوا تو فارم بڑھ جانے کی وجہ سے کافی اخراجات برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ مقالے کو اور مختصر کر دیجئے۔ مگر میں نے مختصر کرنے سے انکار کر دیا۔ میری تسلی کے لیے کہنے لگے کہ مقاللہ بے حد قیمتی اور کافی معلومات افزا ہے، اس لیے ہم اسے کتابی شکل میں شائع کر کے مفت تقسیم کر لیں گے۔ میں نے اسے طفل تسلی پر محمول کرتے ہوئے بڑی خوب صورتی سے اپنا مقالہ واپس لے لیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اکیڈمی اپنے عذر میں کہاں تک مخلص ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ حضرت مولانا مفتی حافظ جہانگیر صاحب خطیب و امام مینارہ مسجد نفس موضوع سے متعلق ایک مختصر، جامع اور تحقیقی مقالہ قلمبند فرما رہے ہیں۔ معاً اپنے مقالہ کی عدم اشاعت کا پس منظر سمجھ میں آ گیا۔ کچھ بھی ہو میری حیثیت حضرت کے سامنے ایک طفل مکتب کی سی ہے۔ ہماری جماعت کے وہ ایک قدآور عالم ہیں۔ رضا اکیڈمی کے ارکان کو مجھ سے نہایت صاف گوئی کے ساتھ کہہ دینا چاہیے کہ مولانا اس وجہ سے آپ کا مضمون شائع نہیں ہو سکے گا۔ میں صاف گو ہوں اور صاف گوئی کو پسند کرتا ہوں۔ مگر جس انداز میں انھوں نے مجھے اذیت پہنچائی ہے اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں ؎

جلوؤں سے اسے بھر دو یا آگ لگا دو تم
آنکھیں بھی تمھاری ہیں یہ دل بھی تمھارا ہے

قرآن مجید چھپ جانے پر جہاں اس کی زیارت سے آنکھیں سیراب اور دل کی خوش گوار دھڑکنیں اضافہ پذیر ہوئیں، وہاں مفتی صاحب کے مختصر ایک صفحہ کے مضمون نے بے حد مایوس کیا۔ اس قدر پھس پھسا اور بے جان! کم از کم ان کی بھاری بھر کم شخصیت سے اس طرح کے مضمون کی امید نہیں تھی۔ اسلوب نگارش سے علم کا غیر معمولی پندار ٹپکا پڑتا ہے، جس سے بزم عقیدت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اس مضمون نے اعلیٰ حضرت کی ذات والا صفات سے رضا اکیڈمی کی عقیدت کا ''حدودِ اربعہ'' بھی واضح کر دیا۔ والہانہ وابستگی کا زبانی خروش بہت آسانی سے سمجھ میں آ گیا ؎

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں کے نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

مفتی صاحب قبلہ اپنے شاہکار مضمون میں اعلیٰ حضرت کا تعارف تو نہ کرا سکے البتہ اپنا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس کی۔ حضور والا نے ترجمۂ کنز الایمان پر صرف چند سطور میں جس انداز میں خامہ فرسائی کی ہے یہ اندازِ فکر عالم اسلام

کے کسی عظیم المرتبت اور مسلم الثبوت شخصیت نے بھی اختیار نہیں فرمایا۔ اس اندازِ نگارش کا حق اُستاذ العلماء مولانا ہدایت اللہ صاب جونپوری، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا فضل الرحمن گنج مراد آبادی، مولانا وصی احمد محدث سورتی، مولانا سید پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، پیشوائے قدسیاں پیر سید مہر علی، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، مولانا ارشاد حسین مجددی رام پوری، مولانا عبد الحئ لکھنوی، مولانا خیر الدین (والد ابو الکلام)، مولانا سید نور اللہ حسینی، سیاحِ عالم مولانا عبد العلیم صدیقی، سلطان العلوم حضرت صدر الافاضل مراد آبادی، صدر الشریعہ مولانا امجد علی، حضرت مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی قدست اسرارہم جیسی نفوسِ قدسیہ کو بھی نہ تھا، جن کا میدانِ عمل برصغیر کے علاوہ پورا عالمِ اسلام بلکہ براعظم یورپ تھا۔ جو عالم اسلام کے مسلم الثبوت امام و پیشوا، قبلہ و کعبہ، سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کے سرخیل اور عوامی قیادت کے متفقہ علمبردار تھے اور اس کا علم تو حضور والا کو بھی ہوگا کہ پورا ہندوستان مینارہ مسجد کا مصلّی نہیں اور اب عوامی قیادت تو بڑی بات ہے، یہاں مذہبی قیادت ہی متنازعہ فیہ ہے۔ یہ چند معروضات تلخ ضرور ہیں مگر حقائق سے مملو! اس گستاخی کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں ؎

جہاں بھولوں بنا جس جا بھٹک جاؤں ہدایت کر
جو ہو جو لغزش تو مجھ کو تھام میرا مہر بان ہو کر

بعد اشاعت رضا اکیڈمی کا یہ عذر لنگ بھی ظاہر ہو گیا کہ وہ مقالہ شاملِ اشاعت صفحات کی قلت کی بنا پر نہ ہو سکا۔ کیونکہ قرآنِ مجید چھپ جانے کے بعد اب بھی اس میں اتنی جگہ بچ گئی ہے کہ اس میں میرا زیرِ نظر مقالہ آجاتا۔ کتابی شکل میں شائع کرتے وقت اب جا کر اس میں قدرے اضافہ کیا ہے۔ خصوصاً حضرت صدر الافاضل سے متعلق جو مضمون ہے وہ مکمل اضافہ ہے۔

معزز قارئین! اپنی گراں قدر آراء سے نوازیں اور جہاں کہیں کسی طرح کی کوئی لغزش ہوئی ہو مخلصانہ طور پر اصلاح فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں۔

اُستاذ مکرم محترم محتشم ذو المجد واللطف والفضل والکرم شیخ الاساتذہ، رئیس المحققین، حضرت علامہ بدر الدین احمد قادری رضوی صدر المدارسین مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا و ناظم تعلیمات دار العلوم فیض الرسول براؤں شریعت کا بے حد ممنون کرم ہوں کہ حضور والا نے زیرِ نظر کتاب کا مسودہ تنقیدی نظر سے دیکھا اور اس کی اصلاح فرمائی۔ نیز اپنے گرانقدر مشوروں اور پُرخلوص دعاؤں سے مجھے مستفیض فرمایا۔

آخر میں رضا اکیڈمی کے ارکان سے صرف یہ کہہ کر بات ختم کرتا ہوں ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است

☑☑☑☑☑☑

فتاویٰ صدر الافاضل: چند تاثرات

مولای صل وسلم دائمًا ابدًا　　علی حبیبك خیر الخلق کلھم

استاذ العلماء، سند المحققین، سید المفسرین، سلطان المناظرین، صدر الافاضل، فخر الاماثل، حضرت علامہ مفتی سیّد شاہ محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان برصغیر ہند کے ان اعاظم رجال میں سے تھے جن کے قامت زیبا پر یہ قول خوب سجتا تھا۔

لیس علی اللہ بمستنکرٍ　ان یجمع العالم فی واحدٍ

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وعطا سے ان کے وجودِ حیرت میں ایک عالم کو جمع فرما دیا تھا ذلك فضل اللہ یعطیہ من یشاء۔ ایسوں کی ہی ذاتِ مقدسہ پر موت العالِم موت العالَم کا اطلاق بھی ہوتا ہے، آپ کی شخصیت بڑی جامع و ہمہ جہت تھی۔ شرف ومجد، علم وفن، کرامت و بزرگی، امت مسلمہ کی قیادت وسیادت و امامت کا وہ کون سا میدان ہے؟ جس میں آپ کی یکتائی و بے نظیری کا سورج سوا نیزے پر نہیں چمکا!۔

مضت الدھور وما آتینا بمثلہٖ　ولقد اتی فعجزت عن نظرائہٖ

متحدہ ہندوستان میں اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت مجدِ دِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے بعد اس قدر ہمہ جہت اور قدآور کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی، علمی، دینی، ملّی، قومی، فکری، جس میدان میں دیکھیے آپ ہی مرجع علماء وملجائے اخص المخصصین ہیں۔

امیر ملّت حضرت علامہ سیّد امیر الدین مخدوم گجرات و مفتیٔ اعظم گجرات علم وفضل کے بحرِ بیکراں اور مجد وشرف کرامت وسیادت کے امیرِ کارواں تھے، جن کی عظمت شان کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت نے اپنے دوسرے حج وزیارت کے بعد ممبئی سے گجرات کا جو سفر فرمایا تو حضرت امیر ملّت سے ازخود ملاقات کی خاطر نوساری تشریف لے گئے۔ حضرت امیر ملّت سے ملاقات کے وقت اعلیٰ حضرت نے شہزادۂ رسول کا بڑا اعزاز واکرام کیا اور ان سے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار کیا اور یہ عقیدت واحترام دوطرفہ تھا۔

انہوں نے اپنے تلامذہ، خانوادہ، مریدین ومعتقدین اور اہلِ محبت کے لیے ایک وصیت نامہ تیار کیا۔ جس کی ایک خاص شق یہ ہے۔

”ہر مسئلہ دین میں امام اہلِ سنّت شاہ احمد رضا بریلوی کے فتوؤں پر عمل کیا جائے جو بالکل صحیح ہیں۔“

جو بالکل صحیح ہیں، کا لفظ ہی دلالت کر رہا ہے کہ وصیت کرنے والا میدانِ فقہ کا شہسوار اور اس بحرِ بیکراں کا ایک بڑا غواص ہے۔

اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کے بعد حضور صدرالافاضل پر انہیں کس قدر اعتماد تھا ملاحظہ فرمائیے۔ اسی وصیت نامے کی ایک شق یہ بھی ہے۔

”اگر کسی مسئلہ میں فتوے کی ضرورت ہو تو مولانا نعیم الدین مرادآبادی سے رجوع کیا جائے۔“ (مجلّہ امیرِ ملّت و عظیمِ ملّت، ناشر خانقاہِ اہلِ سنّت بڑودہ، مقالہ نگار ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی)

ان کے علمی اور روحانی خوانِ نعمت سے واسطہ و بالواسطہ مستفیض ہونے والوں کے اسماء کی فہرست سے جنت نگاہ بناتے چلیں تاکہ ان کی قصرِ عظمت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے وقت ہماری عقیدت و احترام کو باادب باملاحظہ ہوشیار کی منزلِ سعادت مل جائے۔

استاذی الکریم امام النحو شارح بخاری حضرت علّامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی، استاذ العلماء جلالۃ العلم حضرت علّامہ حافظ عبدالعزیز صاحب قبلہ محدث مرادآبادی، حضرت علّامہ سردار احمد لائل پوری محدثِ پاکستان، حضور مجاہد ملّت حضرت علّامہ الحاج شاہ مفتی محمد حبیب الرحمٰن قادری رئیس اعظم اڑیسہ (سابق صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت)، سلطان المناظرین امین شریعت حضرت علّامہ مفتی رفاقت حسین صاحب قبلہ مفتیٔ اعظم کانپور، شمس العلماء حضرت علّامہ شمس الدین جعفری صاحب قانونِ شریعت، امام المعقولات علّامہ محمد سلیمان صاحب بھاگلپوری، حکیم الامت علّامہ مفتی احمد یار خان صاحب نعیمی صاحبِ تصانیف کثیرہ وجلیلہ، حضرت علّامہ جسٹس پیر کرم شاہ ازہری، مجاہدِ دوراں حضرت علّامہ مظفر حسین کچھوچھوی، عبقری الشرق حضرت علّامہ شاہ احمد نورانی علیہم الرحمہ اور آبروئے اہلِ سنّت صاحبِ تصانیف کثیرہ وجلیلہ حضرت علّامہ فیض احمد اویسی[1] متعنا اللہ بطول حیاتہ وحسن خدمتہ الاسلام۔

یہ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جو حضور صدرالافاضل کے علمی، فکری اور روحانی خوانِ نعمت سے مستفیض و مستنیز ہوئے۔ ع

”کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے۔“

آپ کی شخصیت کس قدر ہمہ گیر اور ہمہ جہت وفیض رساں تھی، اس کے سرحدِ ادراک تک کماحقہٗ اربابِ دین و دانش اور اصحابِ لوح وقلم کی رسائی ہی نہیں ہوسکی۔ ان کے فضل و کمال، دانش و بینش، علم وفن، حیات و خدمات اور کارناموں کا تمام تر جزئیات کے ساتھ جب احصار ہوگا تو اصحابِ بصارت و بصیرت کے دیدۂ حیرت کا عالم یہ ہوگا۔ ع

”ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے“

اُستاذ الکل حضرت علّامہ شیخ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے آخری دور میں برطانوی استعمار کے سیاسی بطن

---

[1] واضح رہے کہ مؤخر الذکر یادگار سلف حجۃ الخلف حضرت علّامہ اویسی صاحب قبلہ تین ہزار کتابوں کے مصنف ومترجم ہیں اور اس وقت سوادِ اعظم اہلِ سنّت کا سب سے قیمتی سرمایہ۔ ۳؍محرم الحرام ۱۴۲۵ھ مدینہ طیبہ میں بعد نمازِ مغرب جواہر مدینہ ہوٹل میں راقم الحروف وارث جمال قادری کو مولانا قاضی محمد ابراہیم مقبولی کے ہمراہ زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ بعد تعارف حضورِ والا نے گلے سے لگایا اور اسی وقت سلسلہ عالیہ قادریہ اویسیہ وسلسلہ رضویہ کی اجازت وخلافت مرحمت فرمائی۔ میرے ہمراہ قاضی محمد ابراہیم مقبولی بھی اس نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز ہوئے۔ فلحمد للہ علی ھٰذہ النعمۃ۔

سے جو مذہبی فتنے پیدا ہوئے تھے جسے حکومت برطانیہ کی عظیم قوت اپنے سیاسی مقاصد کے لیے مسلسل توانائی فراہم کررہی تھی جو آپ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے کافی زور پکڑ چکے تھے۔ ایک طرح سے متحدہ ہندوستان برطانوی سامراج کے بدولت قومی، ملّی اور مذہبی فتنوں کا دنگل بن چکا تھا، جو ہر طرف سے حقیقی اسلام کو اپنے نرغے میں لے کر اس کے متبادل ایک مصنوعی اسلام پیش کررہا تھا۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کا امام جس کا فراست مومن ان حالات میں ہمیشہ چاق و چوبند رہا، اپنے رب کی بارگاہ میں فریاد کناں ہے۔ ؎

اک مہ چوں صد داغے فریاد اے خدا　　　　بہر اسلامے ہزاراں فتنہا

(اعلیٰ حضرت بریلوی)

اسلام کی سربلندی اور اس کی حفاظت و صیانت میں اسلام کے خلاف تمام داخلی و خارجی فتنوں کی سرکوبی و استیصال میں آپ امامِ اہلِ سنّت مجدد دین وملّت کے دست راست اور قوتِ بازو بن کر ان کے شانہ بشانہ رہے۔ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کے جلو میں اربابِ فضل وکمال کے درمیان آپ کی شان بہت نمایاں تھی۔ آپ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ اعلیٰ حضرت کے اعتمادِ کامل تھے۔ آپ اعلیٰ حضرت کے تلمیذ نہیں، بلکہ آپ کے معاصر اور تحریک عشق رسول کے ایک بڑے حامی و ناصر اور موید و معین تھے۔ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں آپ کو بڑی وجاہت اور قربِ خصوصی حاصل تھا۔ آپ امامِ اہلِ سنّت کے قلب کی دھڑکن اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ اہلِ کمال کے درمیان صدر الافاضل کا لقب خود امامِ اہلِ سنّت نے اپنے دستِ محبت سے ان کے فرقِ اقدس پر سجایا تھا، جو آپ کے اوپر ایسا سجا کہ یہی لقب آگے چل کر آپ کے نام کا علم بن گیا۔ ؎

زندگی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

بے شک آپ کی شخصیت بڑی بے کراں اور جامع الصفات تھی جو اپنے وجود میں خود ہی ایک جہانِ حیرت تھی۔ آپ کی زبان دانی اور اس کے تب وتابِ جاودانہ کا عالم یہ تھا کہ بقول استاذی الکریم بحر العلوم حضرت مفتی عبد المنان صاحب قبلہ مبارک پوری کہ ”آپ کی اردو اگر ابو الکلام سن لیتا تو اپنی زبان دانی بھول جاتا۔“ آپ کی شانِ خطابت اور زبان کی فصاحت و بلاغت وطلاقت لسانی کا تذکرہ کرتے ہوئے بحر العلوم فرماتے ہیں۔ ”ایک بار مبارکپور کے گولا بازار میں ایک بہت بڑے مجمع میں خطاب فرمارہے تھے، زبان کی فصاحت و بلاغت اور طلاقت لسانی سے مجمع دم بخود تھا۔ سیرتِ پاک کے ایک ایک گوشے پر بولتے بولتے یہ جملہ بڑی روانی کے عالم میں زبان سے نکلا ”پتھر میں جان ڈال دی گویا بنا دیا۔“ آپ کے اس جملے پر اہلِ ذوق اور اربابِ ادب مچل مچل گئے اور شعرا مبارکپور نے کوثر و تسنیم سے دھلے اس جملے کو مصرع طرح بنا کر پورا مشاعرہ کرڈالا۔ ع پتھر میں جان ڈال دی گویا بنا دیا۔

اور عربی زبان وادب اور اس کے بلاغت کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ ایک دیوبندی جس کو اپنی عربی دانی پر بڑا

نازتھااور وہ قابلیت وہمہ دانی کے بخار میں بھی مبتلا رہا کرتا تھا۔ حضرت صدر الافاضل کے فضل وکمال کا شہرہ سن کر وہ مرادآباد آیااور آپ کو چیلنج مناظرہ دے کر یہ شرط لگادی کہ مناظرہ عربی زبان میں ہوگا۔ آپ نے آنجناب کے چیلنج کو بطیب خاطر منظور کرتے ہوئے اپنی طرف سے دوشرط اور لگادی کہ بے شک مناظرہ عربی زبان میں ہوگا مگر وہ منظوم اور غیر منقوط ہوگا۔ عربی دانی اور قابلیت کے بخار میں مبتلا رہنے والے مولوی صاحب منظوم وغیر منقوط کی شرط پر بدحواس ہو گئے، عربی دانی کا سارا نشہ اکھڑ گیا، قابلیت کا بخار سرے سے اُتر گیا، بھیگی بلّی بن کر رات کی تاریکی میں بڑی خاموشی کے ساتھ فریلفر فرار اَہی میں اپنی عافیت سمجھی اور نو دو گیارہ ہو گئے۔

بیمار انا کے ہاتھوں جب فرعون خدا بن جاتے ہیں
انہیں محلوں میں پل کر بچے موسیٰ بن جاتے ہیں

اسلامی علوم میں سب سے اہم اور مہتمم بالشان علم، علمِ فقہ ہے۔ جس کی عظمت وجلالت پر قرآن شاہد ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتِ الحِكمة فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرا ۔ (جسے حکمت ودانائی عطا کی گئی، یقیناً اسے خیر کثیر عطا کیا گیا۔ اربابِ تفسیر خیر کثیر سے علمِ فقہ مراد لیتے ہیں۔ حدیث پاک ہے من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہٗ فی الدین ۔ (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے) یہ علم یعنی تفقہ فی الدین اپنے اندر بڑی وسعت، گہرائی، تنوع اور عظمت وجامعیت رکھتا ہے۔ تمام علوم اسلامیہ میں یہی علم مشکل تر وکارے دارد کے مترادف بھی ہے جس میں محنت شاقہ، دیدہ ریزی وجگرسوزی کے ساتھ توفیق الٰہی وعنایاتِ ربانی کی بھی ضرورت ہے۔ صحیح عبارت خوانی وعبارت فہمی اور چند فقہی جزئیات سے باخبری، مفتی بننے کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ اس کے لیے اٹھائیس شرطیں اور قرآن وسنّت کی تفہیم کے لیے اٹھارہ علوم ضروری ہیں۔ جبکہ فی زمانہ علی العموم مفتی کہلانے والے حضرات ''رسم المفتی'' کی زیارت تک سے محروم ہیں ''آداب المفتی'' تو بڑی بات ہے۔ ایسے لوگ بھی خود کو مفتی کہلانے میں بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں جو اپنے علمی افلاس کے سبب اپنے نام کے مادہ اشتقاق سے بھی واقف نہیں۔ آج یہ لفظ مفتی بھی لفظ علّامہ کی طرح بڑا بے توقیر ہو چکا ہے اور اپنی افادیت واہمیت ومعنویت ختم کر کے جناب کے معنی میں ہو کر رہ گیا ہے۔ جیسے عربی زبان میں سیّد وسیّدہ جناب وجنابہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں جس کا اطلاق غیر مسلم پر بھی ہوتا ہے۔ مثلاً قال السید راجیو غاندی والسیدۃ اندرا غاندی! ؎

ٹپکے گا لہو اور میرے دیدۂ تر سے — دھڑکے گا دل خانہ خراب اور زیادہ
ہوگی میری باتوں سے انہیں اور بھی حیرت — آئے گا انہیں مجھ سے حجاب اور زیادہ

حالانکہ اس لفظ کے عظمت وجلالت کا عالم یہ ہے کہ عدالت اسلامیہ کے اہم مناصب میں یہ ایک اہم منصب ہے۔ جیسے قاضی، قاضی القضاۃ، یوں ہی مفتی شرعی عدالت کا اہم عنصر ہے۔ جس طرح دنیاوی کورٹ وقانون میں جج، جسٹس، چیف جسٹس، منصف، مجسٹریٹ وغیرہ یہ بڑے اہم پوسٹ ومنصب ہیں۔ جیسے قانون کی ڈگری اور حکومت کی منظوری کے بغیر کوئی شخص اپنے نام کے ساتھ ہرگز ہرگز لگا نہیں سکتا ورنہ ملکی تعزیرات کے تحت وہ مجرم مانا جائے گا۔ خواہ وہ کتنا ہی قابل و

دولتمند کیوں نہ ہو۔ یونہی عدالت اسلامیہ کے ان مناصب کے استعمال کے لیے اعلیٰ ترین علمی، دینی وفقہی صلاحیت چاہیے اور ساتھ ہی کسی عظیم دینی وعلمی درسگاہ سے سند! اور تخصص فی الفقہ کی عملی تربیت! اور برسوں کسی طبیب حاذق کی صحبت! تب کہیں جا کر یہ مرتبۂ بلند ملتا ہے۔ ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

حکیم الامت صاحبِ تصانیف کثیرہ حضرتِ اقدس علّامہ احمد یار خاں نعیمی علیہ الرحمہ نے ایک مفتی کے لیے اٹھائیس شرطوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جن میں کچھ اہم شرطوں کا ذکر یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مفتی عدالت اسلامیہ کا ایک عظیم ترین نام ہے اور اس عظیم منصب کا اہل وہی ہوسکتا ہے جس کے اندر فقہائے کرام کی فرمودہ اٹھائیس شرطیں پائی جائیں۔ ایک مفتی کے لیے پہلی شرط اس کی اعلیٰ نسبی ہے اگر چہ وہ غریب ہو، کیونکہ متبحر اور جید علماء ہر دور میں علی العموم سفید پوش رہے۔ اور ان کی سفید پوشی ان کے غربت کا بھرم رکھے رہتی تھی۔ شرافت، تہذیب، شائستگی، حسنِ اخلاق یہ سب خاندانی شرافت ونجابت کا ایک حصہ ہے۔

مفتی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لیے وہ اٹھارہ علوم کا ماہر ہو۔ (فتاویٰ عالمگیری، فتح القدیر)

مفتی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ جتنے علاقے میں اس کا فتویٰ جاری ہوتا ہو، ان علاقوں کے لغت ورسم ورواج نیز ضرب الامثال سے بھی واقف ہو کہ عقد رسم مفتی کے مطابق جو اپنے زمانے کے رواج سے ناواقف ہو وہ علماء فتویٰ کے نزدیک جاہل ہے۔

مفتی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ صاحبِ عقل وخرد ہو، ذہانت وفطانت، بالغ نظری اور قوتِ فیصلہ کا حامل ہو، فروعی مسائل کے لیے اس کے اندر اجتہادی ملکہ ہو۔

مفتی کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ تمام دینی تعلیم کسی بلند پایہ ومتبحر عالمِ دین سے حاصل کی ہو اور سند یافتہ ہو کتب بینی کے ذریعہ خواہ وہ کتنا بھی بڑا عالم بن جائے مگر وہ فتویٰ دینے کا اہل نہیں ہوسکتا۔

ایک مفتی کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ اغنیا اور دولت مندوں سے اور کثرتِ محافل سے دور بلکہ کسی حد تک گوشہ نشین رہے۔

ایک مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ صاحبِ حلم ومروت، نرم رو، نرم خو اور صاحبِ اخلاق ہو۔

ایک مفتی کے لیے تقویٰ پرہیز گاری بھی لازم ہے ساتھ ہی وہ حق گو وباہمت بھی ہو، بزدل اور مصلحت پسند نہ ہو۔

ایک مفتی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ استفتاء کا جواب ترتیب سے دے، کسی امیر کی رعایت سے ترتیب نہ توڑے اگر چہ امراء دباؤ ہی کیوں نہ ڈالیں، مگر یہ کہ کسی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو البتہ بہت ضروری فتوے کے لیے ترتیب توڑ سکتا ہے۔ البتہ علماء دین ومشائخ کرام کی جانب سے اگر کوئی استفتاء ہو تو پھر وہاں ترتیب نہ دیکھے بلکہ جتنی جلد ہو سکے جواب دے۔

ایک مفتی کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر مگر کر کے فتویٰ نہ لکھے بلکہ اگر کسی دوسرے شخص کا اس فتویٰ سے تعلق ہو تو صرف مستفتی پر انحصار نہ کرے بلکہ اس فریق کو بلا کر شہادتِ شرعی و حلف کے ذریعہ پوری تشفی حاصل کرے اور بڑی خود اعتمادی و پُراعتمادی کے ساتھ شریعت کا حکم نافذ کرے اور اپنے فتوے کو فقہ کے کتبِ معتبرہ کے حوالے سے مدلل و مبرہن کرے اور یہ خیال دل میں نہ لائے کہ اس مسئلے سے رجوع کرلیں گے، حوالہ جات کے لیے نادر کتابوں سے پرہیز کرے کہ جب وہ خواص کو دستیاب نہیں تو عوام بے چارے کیا کر سکتے ہیں۔ (ماہنامہ سنی آواز شمارہ جنوری فروری ۲۰۰۲ء)

فی زمانہ مفتیانِ دینِ متین یا اس مقدس صف میں کھڑے ہونے کا جذبہ و تڑپ رکھنے والے مذکورہ بالا شرائط پر ضرور غور فرمائیں۔

مفتی کہتے ہیں شریعت کے احکام بتانے والے کو اور جو شریعت کے احکام معلوم کرنا چاہیں انہیں مستفتی کہیں گے۔ اور جہاں سے فتویٰ جاری ہوتا ہے اسے دارالافتاء کہتے ہیں۔

برصغیر ہند میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت میں یوں تو بہت سی جگہوں پر دارالافتاء قائم ہیں۔ علاقائی حیثیت سے ان کا وجود بھی ضروری ہے، مگر پورے ملک میں (۱) بریلی شریف (۲) الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور (۳) صاحبِ تذکرہ حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ کی عظیم یادگار جامعہ نعیمیہ مرادآباد (۴) اور دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کو مرکزیت حاصل ہے۔

چونکہ فقہ و ابوابِ فقہ و متعلقاتِ فقہ و اصطلاحاتِ فقہ اور اس کے اُصول مبادی پر ایک بے حد قیمتی تاریخی و علمی مقدمہ اس مجموعہ فتاویٰ میں شامل ہے جو فتاویٰ صدر الافاضل کی زینت بھی ہے۔ یہ مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جو مفتیانِ دینِ متین کے لیے ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مقدمہ علمِ فقہ پر ایک قیمتی دستاویز بھی ہے جس میں فقہ کے سارے مالہٗ و ماعلیہ پر تفصیلی گفتگو ہے۔ اس کے اصول و مبادی پر گفتگو کرنا تحصیل حاصل کے مترادف تھا اس لیے ہم نے اپنی گفتگو کو سمیٹا۔ صاحبِ مقدمہ استاذ العلماء حضرت علّامہ مفتی محمد شعبان علی نعیمی مدظلہ العالی ممبئی کے جلیل القدر علمی شخصیت ہیں اور خانوادۂ نعیمی سے روحانی طور پر وابستہ، اس لیے اس مجموعہ فتاوی پر مقدمہ نگاری کا حق بھی حضرتِ والاہی کو تھا اور حق تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قامت علمی کے اعتبار سے اس کا حق بھی ادا کر دیا۔ فجزاہُ اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

حضرت علامہ مفتی محمد شعبان علی قبلہ نعیمی نے جس دیدہ وری و دیدہ ریزی سے یہ مقدمہ لکھا ہے اور اس کبر سنی میں جو محنت شاقہ کی ہے اس میں وہ شدید والہانہ وابستگی بھی کارفرما ہے جو علّامہ کو حضور صدر الافاضل کی ذاتِ ستودہ صفات سے ہے۔

اس نے مانگا ہے محبت میں تڑپنے کا ثبوت
ہم گواہی میں تجھے دیدہ تر رکھتے ہیں

کم و بیش ۲۳ سال قبل حضور صدر الافاضل علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات پر راقم الحروف وارث جمال قادری نے ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو اس وقت ماہنامہ پاسبان الہ آباد میں شائع ہوا تھا، جسے بڑی پذیرائی ملی تھی۔ پھر اس کے بعد متعدد

بار شائع ہوا۔ آخیر میں قدرے اضافے کے ساتھ ہم نے اپنی کتاب ''انوارِ کنز الایمان'' میں شائع کیا۔ علامہ نور الدین نظامی حبیبی نے اسے ہندی میں ''اہلِ سنّت کی دو آنکھیں'' کے عنوان سے شائع فرمایا۔ اس میں آپ کے فتویٰ نویسی کے ضمن میں ایک حسرت ظاہر کی تھی کہ اے کاش آپ کے فتاوے منظر عام پر آجاتے تو عوام و خواص دونوں کا بڑا افائدہ ہوتا۔ میری حسرت و اپیل میں جو درد و اخلاص تھا وہ تاخیر ہی سے سہی رنگ لایا۔ ان کے فرزندانِ روحانی کی پچھلی صفوں سے ایک نوجوان فاضل اٹھا اور اس نے کمر ہمت کسی اور حضور صدر الافاضل کے اس علمی خزانے سے جزوی طور پر ہی سہی ایک منفرد فقہی شاہکار کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

فتاویٰ صدر الافاضل کے فاضل مرتب عزیزم مولانا نور محمد نعیمی نعیم القادری بلرامپوری نے ایک ملاقات میں بتایا کہ آپ کے اس مقالے اور اس میں حضور صدر الافاضل کے فتاویٰ کے تعلق سے آپ کی حسرتِ دیرینہ پڑھ کر ہی میرے دل میں یہ عزم پیدا ہوا کہ لاؤ میں ہی یہ کام کر جاؤں، چنانچہ اسی وقت سے آپ کے فتاویٰ کے حصول میں لگ گیا، جس کے لیے انہیں جگہ جگہ کی خاک چھاننی پڑی۔ انہوں نے بڑے درد کے ساتھ بتایا کہ اس تعلق سے آپ کی عظیم یادگار جسے آپ نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا جو پورے ملک میں اپنی ایک انفرادی شان لیے ہوئے ہے ''جامعہ نعیمیہ'' وہاں اس تعلق سے ایک صفحہ بھی نہیں مل سکا، جبکہ اس نوعیت کے ساتھ علمی ذخیرے وصال تک جامعہ نعیمیہ ہی میں تھے، مگر وہاں کا حال تو یہ ہے ؎

کہیں بھی کوئی دریچہ کھلا نہیں ملتا　　　اس گلی میں میاں کون لوگ رہتے ہیں

مقدمہ نگار علّامہ مفتی محمد شعبان علی صاحب زید مجدہٗ اس تعلق سے اپنے درد کا اظہار مقدمہ کے آغاز ہی میں یوں کرتے ہیں۔

''اس مجموعہ کو ہزاروں صفحات اور متعدد جلدوں پر مشتمل ہونا چاہیے چونکہ فقہ کے ہر باب پر فتوے بلاد و امصار، قصبات و قریات میں گئے اور ان کے ضبط و تحریر کا نظم بھی قائم رہا۔ جامعہ نعیمیہ کے دار الافتاء میں رجسٹر نقل فتاویٰ سے بھرے ہوئے تھے مگر بدقسمتی سے آپ کے وصالِ پُرملال کے بعد وہ رجسٹر حصہ دشمنان و نذرِ حاسداں ہو گئے، کہاں گئے؟ کون لے گیا؟ کچھ پتہ نہ چلا۔

راقم الحروف وارث جمال قادری کو بھی یہی خوش فہمی تھی کہ فتاویٰ کے ذخیرے تو انہیں جامعہ نعیمیہ ہی سے مل گئے ہوں گے (مرتب کے ذمہ ترتیب و تہذیب و تبویب کا کام تھا حالانکہ یہ کام کم زہرہ گداز نہیں، اس کے لیے بھی پتھر کا جگر پانی کرنا پڑتا ہے۔

کیونکہ روایت و طریقہ یہی ہے چھوٹے اور علاقائی مفتی صاحبان بھی اپنے فتاوے کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ جبکہ حضور صدر الافاضل، اعلیٰ حضرت سیّدنا امام احمد رضا محدث بریلوی علیہ الرحمہ کے بعد متحدہ ہندوستان میں سب سے بڑے اور سب سے زیادہ قد آور عالمِ دین تھے۔ عوام تو الگ رہے وہ خواص ہی نہیں بلکہ اخص المخصصین کے بھی مرکز امید و ملجیٰ و ماویٰ

تھے۔جن کے علم وفضل کا شاہکار تو ترجمہ پاک کنز الایمان پر خزائن العرفان کا عظیم تفسیری حاشیہ ہے، جو اپنے وجودِ با مسعود میں ایک جہانِ علم وفضل ہو، جس نے کمسنی میں ہی اہلِ کمال سے اپنے اعتبار کی سند حاصل کرلی ہو۔ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، علّامہ حسرت موہانی وغیرہ کے شانہ بشانہ جس کے قلم نے علم وادب کے گوہر لٹائے ہوں۔ جو اپنے آپ کو نوجوانی ہی میں دینی، ملّی، قومی ہر محاذ پر اپنی قیادت وسیادت وامامت کا اہل ثابت کرچکا ہو، جس کے آغازِ شباب کو اہلِ کمال واہلِ نظر نے حیرت ومسرت سے دیکھا ہو، جو نوجوانی میں ہی تاجدارِ علم وفن اعلیٰ حضرت عظیم البرکت مجدد دین وملّت سیّدنا امام احمد رضا محدث بریلوی کا دست راست اور ان کا اعتماد بن چکا ہو، اس ہستی بے کراں کے دورِ عروج کا عالم کیا رہا ہوگا۔ جو اپنے زمانے کا استاذ الکل اور اس دور کے اعاظم رجال کا مرکز ملجا وماویٰ ومرجع رہا ہو۔جس کے تلامذہ کے تلامذہ اپنے وقت کے رازی وغزالی وابن سینا ہوں۔ جو زبان سے زیادہ قلم اور قلم سے زیادہ کردار وعمل کا بادشاہ رہا ہو۔ پورے برصغیر میں جس کے دین ودانش بصیرت وجہاں بینی کا غلغلہ ہو اور جس کے سوزِ دروں اور اخلاص فی الدین کی قسم کھائی جاسکتی ہو۔اس نے کیا اپنے علمی خزانے میں فتاویٰ کے ذخیرے نہیں چھوڑے ہوں گے؟

اس صبر آزما سکوت اور مجرمانہ غفلت کو کس خانے میں ڈالا جائے اور کس کا نام لے کر نوحہ خوانی کی جائے۔ ؎

کعبہ دل منسلک تھا حسن کے سومنات سے
کس نے کسے مٹا دیا دیدہ دوراں سمجھتے ہیں

فتاویٰ صدر الافاضل کا یہ مجموعہ ان کے علمی خزانہ عامرہ کا تلچھٹ ہی سہی، فتاویٰ رضویہ شریف کے بعد سارے مجموعہ فتاویٰ جو اس وقت مارکیٹ میں ہیں ان شاء اللہ المولیٰ ان کے ہجوم میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوالے گا۔ان کے فتاویٰ کے تعلق سے مجھ جیسے بے بضاعت کا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

فاضل گرامی محترم مولانا نور محمد نعیم القادری سلمہٗ سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی طرف سے شکریے، دعاؤں اور مبارکباد کے مستحق ہیں، جنہوں نے بے زادوراحلہ اتنا دشوار ترین سفر وہ بھی کامیابی کے ساتھ طے کیا، اور ان کے شانہ بشانہ اور اس راہِ محبت میں ان کے رفیق ودست راست عزیزم محمد رضوان سلمہٗ جو اس فتاویٰ کے خوشنویس ہیں۔ یہ ایسے اعلیٰ درجے بالخصوص عربی کے ماہر خطاط ہیں جن کی عربی کتابت ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ بھی ہماری دعاؤں، شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔مولیٰ تعالیٰ ان حضرات کو دارین کی نعمتوں سے نوازے اور ان کے دینی خدمات کو حسنِ قبولیت عطا فرمائے۔آمین ؎

تمام حرف و حکایات تمام دیدہ و دل
اس اہتمام پہ بھی شرح عاشقی نہ ہوئی

☑☑☑☑☑☑

کلماتِ تبریک
(''شیر نیپال حیات وخدمات'')

عزیز گرامی، محترم مولانا غیاث الدین احمد عارفؔ مصباحیؔ
استاذ سعید العلوم، لکشمی پور، مہراج گنج!

ہدیہ سلام مسنون واخلاص فراواں وادعیہ وافرہ

آپ کی اس اطلاع سے بے حد مسرت ہوئی کہ آپ فخر الاساتذہ، سند المدرسین، حضرتِ اقدس بابرکت، مولانا صوفی محمد صدیق خان صاحب قبلہ نیپالی، مدظلہ العالی (جو درسِ نظامی کی بنیادی کتابوں سے لے کر جلالین شریف تک فقیر راقم الحروف وارث جمال قادری کے بہت مشفق ومحسن استاذ رہے ہیں، ان) کی حیات وخدمات پر ''شیر نیپال حیات وخدمات'' کے عنوان سے کتاب لکھ رہے ہیں۔ آپ واقعی بہت خوش قسمت ہیں کہ یہ سعادت آپ کے حصے میں آئی۔

۱۳/اپریل ۲۰۱۸ء کے ایک بڑے عوامی جلسے میں (جو نیپال ہی میں منعقد ہورہا ہے) حضرت صوفی صاحب قبلہ کو سکوں سے تولا جائے گا۔ اور اسی موقع پر یہ کتاب عوام وخواص کو تقسیم کی جائے گی۔ بے شک یہ ایک تاریخی قدم ہوگا جو کسی عالمِ دین کے عظیم علمی ودینی خدمتوں کے اعتراف میں ہوگا۔ فالحمدللہ رب العالمین۔

ہمارے یہاں تو ''قدرِ مردم بعد مُردن'' کا مظاہرہ بہت عام ہے۔ لیکن آپ حضرات بے شک مبارک باد اور دعاؤں کے مستحق ہیں کہ استاذی الکریم حضرت علامہ صوفی صاحب قبلہ کی گراں قدر علمی ودینی وملّی خدمات اور قدر دانی کا اعتراف اور اس تاریخی انداز میں! سبحان اللہ، الحمدللہ!

بے شک اہلِ علم میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ مدرسین کا ہے۔ آج جہاں جہاں اور جس جس انداز میں دین اور علمِ دین کا اُجالا پھیلا ہوا ہے، وہ انھیں دینی مدارس اور ان اساتذہ کا پھیلایا ہوا ہے۔ یہی طبقۂ خاص معمولی مشاہروں پر اپنا خونِ جگر جلا جلا کر کانفرنسوں کو خطیب، مسجدوں کو امام، خانقاہوں کو سجادہ نشین اور ملّتِ اسلامیہ کے لیے قائدین بناتا ہے۔ خود تو پوری زندگی عسرت وتنگ دستی میں گزار دیتے ہیں مگر دین وعلمِ دین کی لَو مدھم نہیں ہونے دیتے۔ جس کا صلہ عظیم انھیں ان کا رب تعالیٰ ہی دے سکتا ہے اور یقیناً دے گا۔

ہنوز ایوان استغنا بلند است   مرا فکر رسیدن ناپسند است

حضرت صوفی صاحب قبلہ کی پوری زندگی جُہدِ مسلسل سے عبارت ہے، انھوں نے بڑی محتاط زندگی گزاری، جہاں بھی رہے اپنے فریضۂ منصبی سے بہت اوپر اٹھ کر کام کیا۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

استاذی الکریم حضرت صوفی صاحب قبلہ اُس دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کی فصلِ بہار کا ایک بے حد قیمتی ثمر ہیں، جو حضور شعیب الاولیاء، بانی فیض الرسول اور مظہر شعیب الاولیاء حضرت خلیفۃ صاحب علیہما الرحمہ کے زمانے کا تھا، آج اور اِس زمانے کے فیض الرسول کا نہیں، جس کی قیادت کو دواؤں سے زیادہ دعاؤں کی ضرورت ہے۔

فیض الرسول کی پہلی فصلِ بہار کے ثمرات و حاصلات میں حضرت مولانا صوفی امام بخش صاحب قبلہ تیغی مظفر پوری، دوسرے مولانا محمد محسن چشتی دھنورا، ضلع سدھارتھ نگر، تیسرے مولانا محمد اسماعیل صاحب اطہر بستوی، چوتھے مولانا عبد العلیم صاحب پورنیہ، ضلع بستی اور حضرت مولانا جمیل احمد شمیم قادری یار علوی (شامل ہیں)۔ فیض الرسول براؤں شریف کی دوسری فصلِ بہار میں جن خوش نصیبوں کو علم و فضل کی دستار سے نوازا گیا وہ حضرت مولانا صوفی محمد صدیق خان مدظلہ العالی کی جماعت تھی، جس میں دو نام بہت نمایاں بلکہ فیض الرسول کے لیے باعثِ صد افتخار تھے، جس میں پہلا نام فاضل معقول و منقول، حاوی فروع و اصول، زینت فیض الرسول حضرت علامہ مفتی قدرت اللہ عارف رضوی رضی اللہ عنہ، سابق مفتی فیض الرسول و شیخ الحدیث دار العلوتنویر الاسلا، امر ڈوبھا، ضلع بستی کا ہے، اور دوسری اہم ترین شخصیت نازش فیض الرسول حضرت مولانا صوفی محمد صدیق صاحب شیر نیپال کی ہے۔ جو کم عمری ہی میں علم و فضل کی دولت کے ساتھ دور بینی، دور اندیشی اور ملّی بصیرت سے نوازے گئے اور نوجوانی ہی میں انھوں نے میدانِ قدم رکھا یعنی دار العلوم فیض الرسول سے فراغت کے بعد براؤں شریف سے جانب شمال ایک دینی ادارے مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا میں پڑھانے کے لیے تشریف لے گئے، مدرسہ غوثیہ بھی ابھی اپنی ابتدائی منزل میں تھا، ایک بند مکان میں صاحبِ مکان کی اجازت سے برسوں مدرسہ اسی مکان میں رہا، جہاں آپ نے اپنے حسن خدمات، حسنِ عمل، حسنِ کردار اور اپنی پاکیزہ زندگی کے انمٹ نقوش چھوڑے۔

کچھ نقش تری یادوں کے باقی ہیں ابھی تک
دل بے سر و ساماں سہی ویران نہیں ہے

مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا میں اشاعت دین و علمِ دین کے ساتھ ساتھ اطراف و جوانب میں (جو بڑے بڑے گاؤں ہیں، وہاں) کے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ضرورتوں میں ہمیشہ آگے آگے رہے، ان کی فطرتی اور خداداد صلاحیتیں نمایاں ہوئیں۔ پھر بھیرہواں، نیپال کے مسلمانوں کے شدید اصرار پر یہاں سے وہ با چشم نم رخصت ہوئے، چونکہ وہ ان کا وطن تھا، وہاں کی دینی ضرورتوں کا تقاضا بھی تھا کہ وہاں پر جہل کی تاریکیاں دور ہوں اور علمِ دین کا اُجالا پھیلے۔ اتنی دور چلے جانے کے بعد حضرتِ والا نے خود کو مدرسہ غوثیہ بڑھیا سے الگ نہیں سمجھا، بلکہ جب بھی مدرسہ کو آپ کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھیں موجود پایا گیا۔

فقیہ ملّت حضرت علامہ مفتی جلال الدین احمد امجدی، مفتیٔ فیض الرسول ﷺ جب مدرسہ غوثیہ کے ناظمِ تعلیمات کے شعبے سے مستعفی ہوئے تو حضرت کی جگہ صوفی صاحب قبلہ کو مدرسہ کا ناظمِ تعلیمات بنایا گیا۔ مدرسہ غوثیہ سے کافی دور

دوسرے ملک میں رہ کر مدرسہ کی ضرورتوں کے لیے جب بھی ان کی طرف دیکھا گیا، وہ اپنی ہر مصروفیت چھوڑ کر تشریف لائے۔ مدرسہ غوثیہ میں رہ کر ان کی خدمات ایک مستقل موضوع ہے جو کافی تفصیل طلب ہے۔ مدرسہ غوثیہ کو غربت و بے سرو سامانی سے نکال کر عروج کی نئی سمت و جہت انھوں نے عطا کی ہے وہ خود ہی ایک مستقل کتاب کی متقاضی ہے۔

انھوں نے ہمیشہ اپنے تلامذہ کو اپنا فرزند روحانی سمجھا، اور ان پر ایک باپ سے زیادہ شفیق و مہربان رہے۔ اور ان کی ضرورتوں اور آسائشوں کے لیے حتی المقدور کوشاں۔ اور تلامذہ بھی آپ کی بارگاہ میں نہ صرف مودب بلکہ بڑے وفادار اور جاں نثار تھے۔

آپ کا ایک بڑا حسن یہ بھی تھا کہ علاقے کے مسلمانوں کے درمیان اختلاف و لڑائی اور بات بات میں تھانہ پولیس، کورٹ کچہری کی بات کرنے ہی نہیں دیتے بلکہ اپنے حسنِ تدبیر اور سیاست مدنی سے انھیں سمجھا بجھا کر بات وہیں ختم کرا کے گلے ملا دیتے۔ اسی لیے آج بھی بڑھیا کا پورا علاقہ ان کے لیے اپنے دل و نگاہ کو فرش راہ کیے ہوئے ہے۔ بے شک استاذی الکریم حضرت صوفی صاحب قبلہ نے زندگی کے ہر موڑ پر اپنے آپ کو ڈاکٹر اقبال کے اس شعر کے مطابق کر رکھا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

☑☑☑☑☑☑

سوادِ اعظم! ایک تاثر

مولای صل وسلم دائما ابدًا

علی حبیبك خیر الخلق کلهم

عزیز گرامی قدر! مولانا غلام مصطفےٰ نعیمی صاحب

پُرخلوص دعائیں وہدیہ سلام مسنون!

غالباً دسمبر ۲۰۱۱ء میں آپ ممبئی تشریف لائے تھے اور مجھ ناچیز سے ملاقات کی کوشش بھی آپ نے کی مگر ملاقات نہ ہوسکی، جس کا مجھے افسوس رہا۔ عزیز القدر مولانا نورمحمد نعیم القادری صدر افکارِ صدر الافاضل ممبئی و ناظمِ اعلیٰ دار العلوم محمدیہ نعیم الاسلام گملارامن نگر گونڈی کی معرفت ''سوادِ اعظم'' کا پہلا شمارہ دستیاب ہوا تھا۔ اسے دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ع اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں۔ اللّٰھم زد فزد! نقشِ اوّل سے اندازہ لگ گیا تھا کہ اس کا نقشِ ثانی کوخوب تر ہونا چاہیے اور واقعی اس کا دوسری خصوصی شمارہ امام النحو نمبر خصوصاً میرے لیے دوآتشہ ثابت ہوا، کہ شارح بخاری امام النحو فخر المحدثین صدر العلماء حضرت علامہ الحاج الشاہ السیّد غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ جہاں نعیمی و امجدی سلسلۃ الذہب کا سب سے روشن، تابناک اور عظیم سرمایہ اور سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے متاعِ گرانمایہ ہیں، وہیں میرے بھی استاذِ محترم ہیں۔ ان کے علمی خوانِ نعمت سے میں نے بھی اپنا حصہ حاصل کیافلحمد للہ علی ھٰذہ النعمہ، سوادِ اعظم دلی کے دوسرے شمارے کی اس نسبت نے اس شمارے کو نہ صرف بڑا محترم بلکہ باوقار و باوزن کردیا ہے۔ اسے دیکھ کر جہاں آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں وہیں دل کی خوشگوار دھڑکنوں میں اضافہ کا باعث بھی ہوا۔ ع اے آمدنت باعث شادی ما۔ جس کے لیے میری طرف سے بے پناہ دعاؤں، شکریے اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس سے قبل حضرتِ اقدس علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے فرزند نسبتی محترم مکرم حضرت مولانا حافظ محمد ایوب شمسی مدظلہ العالی خطیب جامع مسجد نور الاسلام بولٹن یو کے حضور کی حیات و خدمات و کارناموں پر دو جلدوں میں پندرہ سو صفحات پر مشتمل ایک عظیم، تاریخی وحیرت انگیز و ناقابلِ فراموش کارنامہ ''محدث میرٹھی'' کے عنوان سے مرتب فرما کر بہت خوبصورت انداز میں شائع فرما چکے ہیں۔ بے شک یہ موصوف کا ایسا کارنامہ ہے جس نے انھیں زندہ جاوید کردیا ہے۔ اس کی پہلی جلد میں اس ناچیز کا بھی ایک طویل مقالہ شاملِ اشاعت ہے لیکن وہ عظیم و قیمتی نمبر اپنی ضخامت و قیمتی ہونے کے باعث خواص کے دسترس سے بھی بہت دور ہے، عوام کی تو بات ہی کیا۔

بے شک میرے آقائے نعمت، استاذی الکریم، تاج العلماء الکاملین حضرت علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی علم و فضل، شرف و مجد، فکر و فن، عزیمت و استقامت، کردار و عمل کے بادشاہ تھے۔ جن کی نظیر نہ تو ان کے زمانے میں دیکھی گئی اور ان کے بعد تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ آنکھیں بڑی خوش نصیب ہیں جنھیں ان کے دیدار کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے

پاک نام اور مقدس ذات سے منسوب ''سوادِ اعظم'' دہلی کا یہ شمارہ اپنے صوری و معنوی حسن اور آپ کی عمر و ذرائع و وسائل، تجربے اور صلاحیت کے اعتبار سے واقعی خوب تر ہے۔ اس کے تمام مضامین منتخب اور لائق تحسین ہیں۔ بے شک آپ نے حضورِ والا کے وجود کے سمندر کو ایک کوزے میں رکھ کر اہلِ عقیدت، اربابِ علم واہلِ ذوق تک پہنچانے کی کوشش کی ہے آپ نے نعیمی سلسلۃ الذہب اور سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے اس رجلِ عظیم کی بارگاہ میں یہ خراجِ عقیدت جو آپ نے پیش کیا، نعیمی فرزند ہونے کی وجہ سے یہ آپ کا حق بھی تھا۔

آپ نے اس خصوصی شمارے میں متعدد جگہ ''سوادِ اعظم'' کے فروغ و ارتقا کے لیے صرف فرزندانِ نعیمی سے اپیل کی، جبکہ حضور صدر الافاضل کے پسماندگان میں پورا برصغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش ہے۔ اس امام الہند کے احسانات سے تمام اسلامیانِ ہند کی گردنیں جھکی ہوئی ہیں، کوئی بھی علمی و روحانی خانوادہ، خانقاہیں و دینی ادارے اور تمام مشربانِ طریقت خواہ وہ قادری ہوں یا چشتی، سہروردی ہوں یا نقش بندی یا ان چاروں سے نکلے ہوئے ذیلی سلاسل ع کون سے کشت پہ برسا نہیں جھالا ان کا۔

ان کے تلامذہ در تلامذہ اور سیکڑوں کی تعداد میں پیرانِ طریق جوان سے فیضیاب ہوئے، انھوں نے اپنے علم و فضل، فکر وفن، اپنی دینی و علمی و روحانی خدمات سے کائنات کی وسعتوں کو بھر دیا ہے، جدھر نگاہ ڈالیے ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا وغیرہ ان کا سحابِ کرم کہاں نہیں برس رہا ہے۔ ع کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوشبو کہاں تک ہے۔ ان کی ذات سے منسوب اس سوادِ اعظم کے لیے اپیل محدود نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ہر سنّی خوش عقیدہ مسلمان خواہ وہ کوئی بھی نسبت رکھتا ہو، کسی بھی خانوادے سے متعلق ہو، کسی بھی سنّی ادارے سے منسوب ہو ان سب سے عموماً اور فرزندانِ نعیمی سے خصوصاً اپیل کریں۔ تاج العلماء حضرت علامہ محمد عمر نعیمی علیہ الرحمہ کے بعد حضورِ والا کے تعلق سے بڑا جمود وطویل سناٹا طاری تھا۔ اوروں کو تو جانے دیجیے خود ان کی عظیم ترین یادگار جامعہ نعیمیہ مرادآباد کے اربابِ بست و کشاد نے اپنے بانی و سرپرست کے تعلق سے احسان ناشناسی، اجتماعی سکوت، تاریخی بے حسی و غفلت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں خامشی ان کی مجرمانہ ہے

آپ کے تعلق سے جماعت اہلِ سنّت کی اجتماعی بے حسی کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ اب سے کم و بیش ۳۵ برس پہلے اس رندِ خرد باقی وارث جمال قادری ''سلطان العلوم'' کے نام سے ایک طویل مقالہ لکھ کر خطیب مشرق پاسبانِ اہلِ سنّت حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی کی خدمت میں ان کے ہفت روزہ تاجدار کے آفس واقع مدنپورہ ممبئی ۸ میں حاضر ہوا اور اپنا مقالہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اصلاح چاہی۔ آپ کے حکم پر ابھی دو تین صفحات ہی سنائے تھے کہ آپ نے وہ مقالہ میرے ہاتھوں سے لیتے ہوئے بڑی دعائیں دیں کہ مولانا وارث جمال صاحب آپ نے جماعت اہلِ سنّت کی طرف سے ایک فرضِ کفایہ ادا کیا۔ نئی نسل کو ان کے بارے میں شاید ہی کچھ معلوم ہو، واقعی ان کی ذات والا صفات کی طرف سے بڑی غفلت ہوئی۔ اس مضمون کو میں الہ آباد لے جا رہا ہوں، یہ ماہنامہ پاسبان کے اگلے شمارے میں ضرور شائع ہوگا۔

چنانچہ وہ مقالہ ماہنامہ پاسبان میں ”سلطان العلوم“ کے نام سے شائع ہوا جس کی بڑی پذیرائی ہوئی، متعدد جگہوں سے وہ بار بار شائع ہوا۔ حضرت مولانا نورالدین نظامی ابن استاذی العلماء حضرت علامہ نظام الدین الہ آبادی نے اس کو ہندی زبان میں ”اہلِ سنّت کی دو آنکھیں“ کے عنوان سے شائع کیا۔

اس کے بعد وقفے وقفے سے حضور صدر الافاضل کے تعلق سے پانچ اور طویل مقالے ہم نے لکھے۔ تین مقالے تو تنظیم افکارِ صدر الافاضل کی طرف سے شائع ہوئے، ایک مقالہ مولانا حیدر علی نعیمی کے بے حد اصرار پر لکھا، اسے لکھے ہوئے بھی دس برس سے زائد ہو گیا مگر انھوں نے نہ تو خود چھاپا نہ کسی کو شائع کرنے کے لیے دیا۔

ایک مقالہ آپ کے شرف امجد کی دفاع میں لکھا جو کافی طویل اور بڑا مدلل تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں حلقۂ نعیمی نے بڑے فخر و مسرت سے اس کا زیروکس تقسیم کیا۔ چونکہ جس تعمیری مقصد کے لیے اسے لکھا گیا الحمدللہ وہ مقصد پورا ہو گیا اور آپ کے شرف مجد کا آئینہ جمال و کمال بے غبار ہو گیا، اس لیے اسے شائع کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔

اس کے کافی عرصے کے بعد حلقۂ نعیمی کی پچھلی صفوں سے ایک نوجوان فاضل[1] اٹھا، وہ بھی بے زادِ راہ محض اخلاص و محبت و شوق و عقیدت کی پونجی لے کر اس راہِ محبت میں خود کو لالۂ صحرائی ثابت کر دیا۔

سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے امام الہند حضرت سیّدنا صدر الافاضل کو نئی نسل تک پہنچانے کے اپنے قد کے اعتبار سے انھوں نے بہت کچھ کیا، مگر انسانی فضل و کمال کے اس بحرِ بیکراں کے اعتبار سے اسے ایک جرعہ ہی کہا جائے گا کیونکہ ع سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے۔ جو ان کے پاس نہیں تھا اور نہ ہے، مگر جن کے پاس سفینہ نہیں سفینے تھے وہ ساحل ہی پر بڑی معنی خیز خاموشی کے ساتھ کھڑے کھڑے اس دنیا سے بھی رخصت ہو گئے۔ مگر نہ خود اُترے اور نہ آس پاس والوں کو اُترنے دیا۔

حضور صدر الافاضل کے تعلق سے جماعت اہلِ سنّت کی اجتماعی بے حسی پر ہم نے اپنے درد کا اظہار کرتے ہوئے چند سال پہلے لکھا تھا کہ:

”حضور صدر الافاضل کے اخلاف و باقیات و پس ماندگان میں یوں تو پورا برصغیر ہند و پاک ہے، پورا سوادِ اعظم ہے جن کی گردنوں پر ان کے بے پایاں احسانات ہیں۔ قومی و ملّی، مذہبی و سیاسی وہ کون سا میدان ہے جسے آپ نے اپنے خونِ جگر سے لالہ زار و اسلامیانِ ہند کے لیے مستنیر نہ کیا ہو هَل جزاء الاحسان الا الاحسان کے طور پر کیا اسلامیانِ ہند و پاک کے دامن میں ایسی کوئی متاعِ گراں مایہ ہے جو ان کی بارگاہِ عظمت میں بطور خراجِ عقیدت پیش کیا جا سکے؟ ؎

قافلہ درد کا اس رات کی تاریکی میں
منزلِ ضبط کا رہ رہ کے پتہ مانگے ہے

ہمارے اس کرب کو استاذ العلماء حضرت علامہ مفتی محمد شعبان علی نعیمی حبابی نے ”فتاویٰ صدر الافاضل“ کے اپنے طویل

---

[1] مراد مولانا نور محمد نعیمی (نعیم القادری) صدر تنظیم افکارِ صدر الافاضل ممبئی ہیں، جنھوں نے اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ استاذ العلماء حضرت مفتی محمد شعبان نعیمی حبابی کی سرپرستی میں حضور صدر الافاضل فخر الاماثل کی ذاتِ والا صفات کے تعلق سے اپنے شوقِ عقیدت کا عملی مظاہرہ کیا اور مسلسل آپ کی حیات و خدمات و کارناموں پر کتابیں شائع کیں اور کئی تصنیفات بالخصوص فتاویٰ صدر الافاضل بھی شائع کیا۔ مسلسل اس راہِ محبت میں پابہ رکاب ہیں۔

ترین مقدمہ میں اسے کوڈ کیا ہے۔ (فتاویٰ صدرالافاضل، ص ۹۲ ۷ :)

آپ کا جریدہ سوادِ اعظم نے اس عظیم جریدے "السواد الاعظم" کی یاد تازہ کردی ہے سیّدنا حضور صدرالافاضل کے تب وتابِ جاودانہ اور آپ کی علمی، دینی، قومی، ملّی اور سیاسی بصیرتوں کا شاہکار اور ان کی عظیم صحافتی یادگار ہے۔ ذرائع ابلاغ کی اہمیت تو ہر دور اور ہر زمانے میں رہی لیکن ان کے زمانے میں صرف پرنٹ میڈیا ہی تھے، ریڈیو تھا بھی تو خال خال! اپنے پیغامات، اپنے مقاصد کی ترسیل و اظہار کے لیے اخبارات و رسائل، ماہنامے، پندرہ روزہ و ہفت روزہ ہی ہوا کرتے تھے۔ آپ کے ابتدائی دور میں الہلال و البلاغ کلکتہ سے ابوالکلام آزاد کی ادارت میں نکلتا تھا، جس میں ابوالکلام کے شانہ بشانہ آپ کے رشحاتِ قلم بھی چھپتے تھے اور ایک عرصے تک آپ اس میں رضا کارانہ طور پر لکھتے اور قومی وملّی رہنمائی فرماتے رہے۔ مگر جب اس کی بدعقیدگی و گمرہی کے ساتھ ہی اس کا سیاسی و نظریاتی موقف اور مسلم امہ کے اجماعی مفادات سے انحراف سامنے آیا تو آپ نے اسی وقت اس سے علیحدگی اختیار کی اور "السواد الاعظم" کے نام سے مرادآباد ہی سے ایک ماہنامہ کا اجرا فرمایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس السواد الاعظم نے معاصر جریدوں کے درمیان اپنا ایک بلند نمایاں ومنفرد مقام بنالیا۔ وہ السواد الاعظم اسلامیانِ ہند وسوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کا آرگن وترجمان ہی نہیں بلکہ ان کی دھڑکن بن چکا تھا۔ جس کے روشن صفحات حضور صدرالافاضل فخرالاماثل امام الہند حضرت علامہ سیّد محمد نعیم الدین مرادآبادی کی علمی، دینی، فکری، قومی، ملّی اور سیاسی اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہِ ناز اور آپ کی فکری، سیاسی بصیرت کے آئینہ دار اور آپ کی تب وتابِ جاودانہ کے شاہد عادل ہوئے ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

آج ہر شعبے میں تقابلی دوڑ کا سامنا ہے، شعبۂ صحافت اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہماری مذہبی صحافت نے ماضی کے ایک مخصوص روش سے اپنا دامن بچاتے ہوئے حال کے تقاضوں اور ضرورتوں کو اپنے پیشِ نظر رکھا ہے، فی زمانہ جس کی شدید ضرورت تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ قلمی محاذ پر آج جماعت اہلِ سنّت میں جمود نہیں بلکہ اشاعتی محاذ پر ہم کامیابی وکامرانی کی روشن تاریخ مرتب کررہے ہیں۔ فلحمد للہ علی ذالک۔ آپ نے اپنے جریدے کا نام "سوادِ اعظم" رکھنا قابلِ ذکر وکامیاب ماہناموں کے درمیان ایک بڑا چیلنج ہے۔ کاش آپ کو حضور صدرالافاضل کے السواد الاعظم کا فائل دستیاب ہوجائے تو اس سوادِ اعظم کو انفرادیت کی ایک نئی جہت مل جاتی۔ "سوادِ اعظم" کو ایک نمایاں، منفرد اور بلند مقام کے لیے آپ کو کافی جدو جہد کرنا ہے۔ اس راہِ محبت میں کئی صبر آزما مراحل آئیں گے، آپ کو نہ تھکنا ہے، نہ حالات سے مایوس بددل ہونا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اس راہِ محبت میں آپ کو ضرور کامیاب فرمائے گا کہ ع سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے۔ مولیٰ تعالیٰ "سوادِ اعظم" کو نظرِ بد سے محفوظ رکھے تاکہ اس کے ذریعے سوادِ اعظم و اسلامیانِ ہند کے لوائے عظمت کو بلند کیا جاسکے ؎

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

کتاب ''تجلی غوثِ اعظم'' پر تقدیم

مولای صل وسلم دائما ابدا
علی حبیبک خیر الخلق کلھم
محمد سید الکونین والثقلین
وَالفرِیقین من عرب ومن عجم

ہمارے گاؤں موضع بڑھیا جو ضلع سدھارتھ نگر یوپی کا ایک مشہور گاؤں ہے، جہاں مدرسہ غوثیہ فیض العلوم کے نام سے ایک بڑا دینی ادارہ ہے جسے علاقائی طور پر ایک ہمہ جہت مرکزیت بھی حاصل ہے۔ اسی جگہ رئیس الاتقیاء شیخ الاساتذہ سند المحققین حضرت علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رضوی علیہ الرحمہ سابق صدر المدرسین مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا وناظمِ تعلیمات دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف اسی گاؤں میں ایک خوبصورت و دیدہ زیب گنبد کے نیچے آرام فرما ہیں۔ اسی گاؤں کے زمیندار گھرانے کے ایک ذمہ دار عالمِ دین گرامی قدر محترم مولانا طفیل احمد خاں فاضل فیض الرسول جو دار العلوم انوارِ ملّت چھتر پارہ اترولہ ضلع بلرام پور (یوپی) کے استاذ بھی ہیں۔ اور ذہنی وفکری وقلبی طور پر مجھ سے کافی قریب بھی! انھوں نے اسی رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ کے آخری عشرہ میں حضور پیر پیراں، میر میراں، شاہ جیلاں، قطب ربانی، غوث صمدانی، شہنازِ لامکانی محی الدین جیلانی سیّدنا سرکار سیّد عبد القادر جیلانی حسنی حسینی بغدادی کے ذکر جمیل پر مشتمل دو سو پچیس (۲۲۵) صفحات کا ایک کمپوز شدہ غیر مطبوعہ کتاب پیش کرتے ہوئے فرمایا، اس کتاب پر آپ کو ایک مقدمہ لکھنا ہے۔ اور اس پر زور دیتے ہوئے کافی اصرار کیا کہ اس پر آپ کو ایک مقدمہ لکھنا ہی ہے۔ میں نے اپنی آنکھ کا عذر پیش کیا، مگر انھوں نے میرے عذر کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا، آپ سن لیں کہ اس کتاب پر مقدمہ کیوں لکھنا ہے اور جب انھوں نے اس کی وجہ بتائی تو واقعی اس کے سامنے میرا عذر چھوٹا پڑ گیا۔ انھوں نے وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ صاحبِ کتاب مولانا محمد احسان الحق فیضی جو اپنا تخلص واصف القادری لکھتے تھے وہ یہ پاکیزہ حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے کہ اپنی کتاب پر حضرت مولانا وارث جمال صاحب قادری سے اس پر ایک مقدمہ لکھوانا ہے اور میری یہ کتاب حضرت کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوگی۔ اس سال رمضان شریف میں چلیں گے اور ان سے تین گھنٹے کا پہلے ٹائم لے لیں گے۔ پھر اسی کے اعتبار سے ہم دونوں ساتھ چل کر ملیں گے، ان سے اکتسابِ فیض بھی کریں گے اور اصرار کر کے اس کتاب پر ایک مقدمہ لکھوا لیں گے اور اس کے لیے وہ بار بار مجھ سے پلاننگ کرتے رہے۔ مگر رمضان شریف آنے سے قبل ہی یہ پاکیزہ حسرت لے کر دنیا سے چلے گئے انا لِلّٰہِ وَاِنا الیہ راجعون۔

مولانا طفیل احمد خاں صاحب نے یہ بھی بتایا وہ یہاں آپ سے آ کر مل چکے ہیں۔ وہ آپ کے قلم کے دلدادہ وقدرداں تھے اور آپ کے اسلوبِ نگارش کے ایک بڑے مداح! مگر کچھ یاد نہیں آرہا ہے اور نہ ان کا چہرہ ہی ذہن نشین ہے کہ مجھ سے ملنے والوں کی ایک تعداد ہوتی ہے، کہ فقیر رہگذر جو ٹھہرا۔ انھیں کا چہرہ ذہن میں رہ جاتا ہے جو بار بار ملتے رہتے ہیں۔ بہر حال ان کے اس پاکیزہ حسرت پر میرا قلب گداز ہو گیا۔ اور میں مولانا موصوف سے وہ کتاب لے کر گھر آ گیا۔

چونکہ میں اب عمر کی اس منزل پر پہنچ چکا ہوں جسے آخری پڑاؤ کہا جا سکتا ہے۔ میرے قلم کی عمر بھی کم وبیش نصف صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اب تو میری آنکھوں میں موتیا بھی اُتر آیا کسی بھی وقت جس کا آپریشن ہو سکتا ہے۔ ؎

منزلِ خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے
ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے

میں نے دو تین نشستوں ہی میں پوری کتاب پر ایک نظر ڈال لی۔ کتاب دیکھ کر بڑی خوسگوار حیرت ہوئی کہ ع اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں اور انھیں آہوئے پوشیدہ میں ایک نام مولانا مرحوم کا بھی تھا۔

نوّر اللہ مرقدہ وجعل الجنّۃ مثواہ

انھوں نے اپنی کتاب کا تاریخی نام "اسرار العارفین فی اوصاف السید محی الدین" رکھا۔ ۱۴۳۵ھ۔ جس کو اردو میں "تجلیاتِ غوثِ اعظم" کا نام دیا۔ اس کتاب کے سطر سطر سے صاحبِ کتاب مولانا واصف القادری کا حضور سیّدنا غوثِ اعظم محی الدین جیلانی بغدادی علیہ الرحمہ والرضوان ورضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ اقدس سے عشق وعقیدت اور ان کی شدید والہانہ وابستگی وشیفتگی ٹپکا پڑتا ہے۔ اور شاید نہیں بلکہ یقیناً اسی والہانہ اخلاص وعقیدت ہی کا شاخسانہ ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے یہ احساس نہیں ہوتا ہے کہ کسی نوآمیز صاحبِ قلم کی کتاب ہے۔

کتاب کا حسنِ ترتیب اپنی جگہ جو ہے سو ہے ہی! انھوں نے سرکار غوثِ اعظم کی پاکیزہ حیات کے جس پہلو پر قلم اٹھایا، اسے تصوف وتذکرہ کی اہم ترین کتابوں سے آئینہ کر دیا۔ اور انھیں کتابوں کو مآخذ بنایا اور اپنی بات کو حوالہ جات کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ عربی وفارسی کے مستند وقدیم ذخیروں کی طویل طویل عبارات مع سلیس ترجمے کے ساتھ پیش کر کے کتاب کے وقار ووزن میں اضافہ کر دیا ہے۔ کتابت شدہ دو سو پچیس (۲۲۵) صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ابواب اور اس کے مشتملات ایسے چشم کشا ہیں کہ

ع کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

جسے پڑھ کر قاری کا سینہ حضور غوثِ اعظم کے عشق وعقیدت کا مدینہ بن جاتا ہے۔ بے شک حضرت مرحوم کی بخشش و مغفرت کے لیے یہ کتاب ہی کافی ہے۔ اس کتاب کے ذریعے مولانا مرحوم نے حضور سیّدنا غوثِ اعظم حضرت سیّد شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وفا کیش غلاموں میں اپنی جگہ بنا کر عالمِ آخرت کے تمام مراحل کو اپنے لیے آسان ترین بنالیا۔ فلحمد للہ علی ذالك

اپنے علم و اطلاع اور حسنِ مطالعہ کی بنا پر اس حقیقت صادقہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ اپنی کمیت، کیفیت، نوعیت اور انفرادیت کے اعتبار سے اردو زبان میں نفسِ موضوع پر اس نوعیت کی کوئی دوسری کتاب دور تک نظر نہیں آ رہی ہے۔

مولانا مرحوم نے سرکار غوثیت کبریٰ کے حیات کے جس رخ پر بھی قلم اٹھایا، اسے آئینہ کر دیا۔ کسی بھی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور اس کے لیے انھوں نے قدیم ترین ذخیروں اور مستند تذکروں سے طویل طویل عربی، فارسی عبارتوں کو مع ترجمہ پیش کر کے سرکار غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اپنی وسعت مطالعہ کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے ایک سمندر کو ایک کشکول میں بھرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اور اپنے ذوقِ مطالعہ اور قوتِ پرواز کی بدولت اس کتاب کو سندِ اعتبار درجہ دے دیا ہے۔ یہ کتاب عوام وخواص دونوں کو حرزِ جاں بنانے لائق ہے۔ مجھ ناچیز راقم الحروف وارث جمال قادری کو حضور پیر پیراں، میر میراں، قطب الاقطاب، فرد الافراد، غوث الاغواث، سید الاوتاد حضور پُرنور سیّدنا شیخ عبد القادر جیلانی حسنی حسینی بغدادی کی بارگاہِ قدس میں متعدد بار آل انڈیا تبلیغ سیرت کے وفد کے ساتھ بڑے اہتمام سے حاضری کی سعادت حاصل ہے۔ قلم وزبان کو یارا نہیں اس بارگاہ کی عظمت وجلالت، رفعت شان، علو مرتبت اور آپ کی مقبولیت و محبوبیت کبریٰ کا اندازہ لگا سکے۔ صدیوں پر صدیاں گذر جانے کے باوجود ان کی مقبولیت، محبوبیت اور اثر ونفوذ کی ایک عجب شان ہے۔ اہلِ عراق بالخصوص بغداد شریف کے عوام وخواص بڑی علمی سیاسی شخصیات و رجال کی غلامانہ، نیازمندانہ، فدویانہ حاضری کا انداز تو بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

جن کے رتبے ہیں سوا۔ ان کے سوا مشکل ہے

بندہ جب پہلی بار اُن کی بارگاہ میں حاضری دیتا ہے تو ان کی بارگاہ کا خارجی گیٹ اس کی وسعت و پھیلاؤ اور سج دھج دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے اور بدن پر ایک ہلکی سی کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور زبان پر جاری ہو جاتا ہے

ٹوپیاں تھام کر خاک درِ ولا دیکھو

اور جب سرکار غوث پاک کے سیرت نگاروں کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو اس کی اگلی صف میں اسلام کی اہم ترین شخصیات و رجال کی ایک طویل فہرست نظر آئی۔ جس میں اپنے زمانے کے اعاظمِ رجال جس میں محدثین زمانہ اور بڑے بڑے ائمہ علم وفن اور عظیم المرتبت علمی و دینی اور روحانی شخصیات نظر آتی ہیں۔ وہ بھی باادب بالملاحظہ کا انداز لیے ہوئے۔

مولانا واصف القادری نے اسلام کے بطلِ جلیل اور عظیم تر روحانی شخصیت یعنی حضور سیّدنا غوثِ اعظم کے حضور میں اپنی کتاب ”تجلیاتِ غوثِ اعظم“ کے ذریعے خراجِ عقیدت پیش کر کے بڑے بڑے مدحت وسیرت نگاروں کی طویل فہرست کے آخری صف ہی سہی، اپنی جگہ بنا کر خود کو

نازم بعمرے خویست کہ کارے کردم

کے مصداق بنالیا ہے۔

مولانا احسان الحق فیضی واصف القادری دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف ضلع سدھارتھ نگر یوپی کے قابلِ ذکر

افاضل میں تھے۔ براؤں شریف ہی میں رہ کر خصوصی اکتسابِ فیض، سلطان الواعظین استاذ الاساتذہ سلطان العلماء حضرت علامہ عبدالمصطفیٰ صاحب قبلہ اعظمی علیہ الرحمہ والرضوان سابق شیخ الحدیث براؤں شریف سے حاصل کیا۔

شرفِ بیعت:

مظہر شعیب الاولیاء، مرشد طریقت مجاہد سنّیت حضرتِ اقدس بابرکت مولانا صوفی محمد صدیق صاحب قبلہ قادری چشتی ضیائی سابق سجادہ نشین ومتولی خانقاہِ یارعلویہ براؤں شریف وناظمِ اعلیٰ دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ مولانا واصف القادری کا آبائی وطن موضع جمڑی ہے (جو تحصیل ڈومریا گنج کے قریب ایک مشہور گاؤں ہے)۔

براؤں شریف سے فراغت کے بعد وہ دارالعلوم محمدیہ فیض غوثیہ موضع بیراگل ضلع بستی میں مدرس ہوکر گئے۔ جسے ہمارے رفیق دیرینہ اور میرے مشفق وکرم فرما حضرت مولانا قاری محمد اشفاق صاحب یارعلوی جو حضور شعیب الاولیاء بانی فیض الرسول کے ایک مرید مخلص وخادم خصوصی تھے۔ وہ بھی براؤں شریف کے قابلِ ذکر افاضل میں سے انھوں نے قائم کیا تھا اور اس کے لیے تاعمر جدوجہد کرتے رہے۔ بیراگل کے بعد وہ امیٹھی ضلع سلطان پور کے کسی دینی ادارے سے منسلک ہوئے۔ وہاں سے وہ منتقل ہوکر وہ دارالعلوم اہلِ سنّت انوارِ ملّت چھتر پارہ اترولہ ضلع بلرام پور میں مدرس ہوئے اور وہاں آکر ایسے جمے کہ گویا وہیں پر آخری سانس لی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولیٰ تعالیٰ عزوجل اپنے حبیب پاک صلی المولیٰ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے میں انھیں ان کی دینی خدمات اور بالخصوص اس کتاب کے طفیل ان کی مغفرت فرمائے اور خلد بریں میں جگہ مرحمت فرمائے اور ان کی اس کتاب کو عوام وخواص میں مقبول بنائے۔ آمین بجاہ سیّد المرسلین

☑☑☑☑☑☑

''تذکرہ مخدوم علی مہائمی'' پر تقدیم

مَنَّ عَلَیۡنَا رَبُّنَا اِذۡ بَعَثَ فِیۡنَا مُحَمَّدًا
صَلُّوۡا عَلَیۡهِ دَآئِمًا صَلُّوۡا عَلَیۡهِ سَرۡمَدًا

اسلام کے تفردات وخصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت وانفرادیت یہ بھی ہے کہ فرزندانِ اسلام میں جو اہم ترین شخصیات ورجال، اربابِ فضل وکمال، اصحابِ زہد وتقویٰ، صاحبانِ اثر ونفوذ، پیکرانِ دین ودانش اور اللہ کے برگزیدہ و منتخب بندوں کی حیات وخدمات، ان کی پاکیزہ زندگی وفیض رسانی کو محفوظ کر کے آئندہ نسلوں تک پہنچانے کا التزام واہتمام کیا گیا ہے اور یہ حسنِ اسلام اور اہلِ اسلام کے ساتھ ہی خاص ہے۔

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تاریخ وتذکرہ اور سیرت کے اہم ترین مجلدات میں ان اعاظم رجال کی طویل فہرست ہے جس کے سلسلۃ الذہب میں ایک بڑا، روشن، محترم بابرکت اور انتہائی فیض رساں نام حضرت سیّدنا مخدوم علی فقیہہ ماہمی کا ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

صدیوں پر صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ہزاروں لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنا ہوا ہے جو کل بھی ہزاروں لاکھوں انسانوں کا قبلۂ حاجات تھا اور آج بھی ان کی ضرورت! جس کے در کی خاک بھی خاکِ شفا! صدیوں سے دیوان گانِ شوق کا قافلہ در قافلہ ان کی بارگاہِ عالی کی طرف رواں دواں ہے۔ ولولہ شوق وعقیدت کا ایک سیلاب ہے جو اُن کے آستانے پر اُبلتا رہتا ہے۔ خلقِ خدا کا ایک زبردست ہجوم ہے جو ٹوٹا پڑتا ہے۔ اُن کے فیض وعطا کا ایک سیلِ رواں ہے جو رکنے کا نام نہیں لیتا۔ اُن کے فیض رساں وجود کی ایک چھٹکی چاندنی ہے جو صدیوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور ان کی بارگاہِ رحمت ایک ایسا چشمہ شیریں وچشمہ آبِ زُلال ہے جہاں ہر تشنگی آ کر دم توڑ دیتی ہے۔ ؎

نہ دیکھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہے تو دیکھ ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

جو سیّدی امام عبد الوہاب شعرانی کی طرح بیک وقت طبقۂ علما واولیا کے امام تھے۔ جن کے وجودِ با مسعود میں شریعت و طریقت کی دونوں نہریں آ کر سما گئی تھیں۔

حضرت سیّدی مخدوم علی فقیہ ماہمی بے شک اپنے زمانے میں علمائے حق کے سرخیل اور اولیاے امت کے مقتدا تھے، طبقۂ فقہا کے فقیہِ اعظم، علمِ کلام کے امام المتکلمین، زمرۂ مفسرین کے سیّد المفسرین، طبقۂ صوفیہ کے امام اہلِ صفا اور صفِ عرفا کے امام العرفاء، فلسفۂ وحدۃ الوجود میں برصغیر ہند کے شیخ اکبر (یعنی محی الدین ابن عربی شیخ اکبر کے بعد) یہی وصف ان کا

وصفِ امتیاز تھا۔ حضرت شیخ ولی اللہ محدث دہلوی کے نزدیک: اتنا بڑا عالم ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔

جنھیں وہ یعنی حضرت شیخ ولی اللہ اپنے نورِ ولایت اور چشمِ بصیرت سے اجلۂ اولیاے کرام کے طبقۂ خاص میں پائیں، جہاں شیخ الشیوخ حضرت سیّدنا شیخ شہاب الدین سہروردی پیشواے قدسیاں حضرت سیّد نجم الدین کبریٰ (پیر و مرشد امام رازی) بہا۔۔۔والدین حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی وغیرہ جیسی عظیم و بلند پایہ شخصیتیں جلوہ فرما۔۔۔جس کی شانِ علمی میں حضرت سیّدی شیخ عبدالوہاب متقی شاذلی محقق علی الاطلاق حضرت۔۔۔شیخ عبدالحق مجدد و محدث دہلوی کاملانِ وقت کے استاد و امام حضرت سیّدنا شیخ وجیہ الدین گجراتی قدست اسرارہم جیسی ہستیاں زمزمہ خواں ہوں۔

شیخ الاسلام والمسلمین امام اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت اعلیٰ حضرت سیّدنا امام احمد رضا بریلوی جس کے لیے "عارف باللہ سیّدی علی ماہمی" فرمائیں اور ان کی معرکۃ الآرا تفسیر "تبصیر الرحمٰن" (تفسیر ماہمی) کو اپنے حوالے میں پیش کریں۔

ہمہ شما کا ذکر ہی کیا جس کی بارگاہِ علم وفضل و بارگاہِ ولایت میں ایسی ایسی مایۂ ناز شخصیتیں اپنی تمام تر علمی، فکری و روحانی بلند قامتی کے ساتھ اپنے دل ونگاہ کو مؤدب کیے ہوں اس کی عظمتوں، شوکتوں اور رفعتوں کا اندازہ کون لگا سکتا ہے وہ بھی اس دورِ قحط الرجال میں!

اگر گھٹے تو بس اک مشتِ خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعتِ کونین میں سما نہ سکے

وہ دور اور زمانہ جس میں آپ جلوہ افروز تھے جس میں ہر چہار جانب سے آپ کو تسلیم کیا گیا، دل ونگاہ خم ہوئے، ان کی عظمت وجلالت کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا، خاکِ پا کو آنکھوں سے لگایا گیا، جگہ جگہ اعاظم رجال نے پذیرائی کی، ان کی علمی فکری اور روحانی عظمتوں کو سلام کیا گیا، انھیں احترام وعزت کی نگاہوں سے دیکھا گیا وہ زمانہ بڑا زرخیز تھا، ہر طرف صف بہ صف بڑی بڑی قدآور شخصیتیں موجود تھیں، جگہ جگہ اہلِ کمال وعلم وفضل و روحانیت کے تاجدار خیمہ زن تھے، وہ انھیں اصحابِ بصیرت و بصارت کے درمیان دیدۂ بینا کے مالک تھے۔ ان کے معاصرین جو پیشواے قدسیاں اور حاملِ انوارِ قدسیہ تھے اپنی باوضو نگاہوں سے ان کے ناموں کی زیارت تو کیجیے تب جا کر یہ اندازہ ہوگا کہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کے سوا مشکل ہے

(۱) حضرت سیّد علاء الدین ضیاء الحسنی الحسینی	دولت آباد، مہاراشٹر
(۲) حضرت شیخ زین الدین داؤد چشتی شیرازی (بائیسویں خواجہ)	دولت آباد، مہاراشٹر
(۳) حضرت شاہ ابوالبرکات حافظ حسینی	بیجاپور کرناٹک
(۴) حضرت سیّد مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی	کچھوچھہ مقدسہ، یوپی
(۵) حضرت شیخ نظام الدین، برہان پوری	برہانپور، مدھیہ پردیش
(۶) حضرت سیّد محمد حسینی گیسو دراز بندہ نواز	گلبرگہ، کرناٹک

(۷)	حضرت شاہ عبدالحق ردولوی	بارہ بنکی
(۸)	حضرت شیخ بدی الدین زندہ شاہ مدار	مکن پور، یوپی
(۹)	حضرت شیخ احمد کھتو مغربی	احمد آباد، گجرات
(۱۰)	حضرت قطب عالم برہان الدین بٹوہ شریف	احمد آباد، گجرات
(۱۱)	حضرت علامہ عبدالرحمٰن جامی	وغیرہ وغیرہ

یہ ایک لمبی فہرست ہے جو ۱۸۶ شخصیات ورجال پر مشتمل ہے جس کو میں نے اسی کتاب کے صفحہ ۲۶ سے لیا ہے۔

مجمع البحرین تاجدارِ روحانیت امامِ شریعت وطریقت غواص بحر معرفت وحقیقت فلسفۂ وحدت الوجود کے دانائے راز، نکتہ داں ونکتہ رس اپنے زمانے میں فلسفۂ وجودی کے امام مطلق، امام الہمام، قدوۃ الانام، سند المحققین، سیّد المفسرین، شمس العارفین، نور الراسخین، قدوۃ الاولیاء، زبدۃ الاصفیاء، افقہ الفقہاء، سیّدنا ومولانا حضرت مخدوم علی فقیہ ماہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اسمِ گرامی علاء الدین اور علی ہے، کنیت ابوالحسن، لقب زین الدین، خاندان نوائط کی ایک شاخ پَروسے تعلق کے سبب لفظ پرو آپ کے نام کا جز، میدانِ فقہ بالخصوص فقہِ شافعی میں مجتہدانہ بصیرت کے سبب ''فقیہ''، والدہ ماجدہ عابدہ عارفہ کاملہ کے بے مثل خدمات اور بے پناہ رجوعِ خلق کے سبب مخدوم اور یہ لفظ مخدوم آپ کے نام کا ایسا علم ثابت ہوا جس کے سامنے نام، لقب، کنیت، سرنیم سب دب گئے۔

آپ کی ذاتی، شخصی مجد وشرف، کردار کی پاکیزگی وبلندی اور اعلیٰ نسبی کے پیشِ نظر بادشاہِ دین ودنیا احمد شاہ بادشاہ گجرات بانی احمد آباد مرید باصفا حضرت شیخ احمد کھتو نے اپنی ہمشیرہ کو آپ کے حبالۂ عقد میں دے کر ہمیشہ مفتخر ونازاں رہے۔جس کے فیض وعطا کا دریا صدیوں سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا ان شاء اللہ المولیٰ تعالیٰ۔آپ کے فیضانِ کرم کے سحاب سے مخلوق کل بھی شرابور تھی، آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔

نہ حسنے غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

زیر نظر کتاب ''تذکرۂ مخدوم مہائمی'' میرے مخلص دیرینہ عزیز گرامی قدر مولانا حافظ مفتی عبدالمجید قادری رضوی مصباحی کا سرکار مخدوم ماہمی کی حیات وخدمات، فیض رسانی اور علم وفضل، ولایت ومعرفت، کشف وکرامات، علمی وفکری وروحانی مراتب ودرجات پر ایک زبردست علمی وتاریخی تذکرۂ محبت ہے جو ان کی ایک علمی وقلمی شاہکار بھی ہے اور توشۂ آخرت بھی جس کو ایک گدائے بارگاہ کی طرف سے علم وفضل اور اقلیم روحانیت کے ایک عظیم تاجدار کی بارگاہ میں صرف ایک خراجِ عقیدت ومحبت سمجھا جائے اور بس کہ۔

چہ نسبت خاک را بہ عالمِ پاک
کہ میں اک ذرہ ہوں وہ سراپا افلاک

مفتی عبدالمجید صاحب یہاں ممبئی کی ایک معروف علمی و دینی شخصیت ہیں جو یہاں کے مذہبی و دینی و علمی حلقوں میں اپنے علمی و دینی و قلمی خدمات کے سبب احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ مولانا ایک عالمِ باعمل شخصیت ہیں اور کسی بھی حال میں وقارِ علم وفضل کو اب تک مجروح ہونے نہیں دیا۔ اپنے چھوٹوں پر شفقت اور اپنے بڑوں کی بارگاہ میں بڑے مؤدب اور باادب بانصیب کے فارمولے پر عمل پیرا بھی۔ آپ اتر پردیش کے مشہور ضلع بستی کے رہنے والے ہیں، حفظ دار العلوم محمدیہ ممبئی سے کیا، درسِ نظامیہ وعالیہ کی تکمیل از ابتدا تا آخر الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور سے کی، جہاں شمس العلماء حضرت علامہ قاضی شمس الدین جعفری جونپوری، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب مبارکپوری، شیخ الادب حضرت علامہ محمد شفیع صاحب مبارکپوری سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ ان کے علاوہ حضرت علامہ ضیاء المصطفیٰ صاحب قادری بن حضرت صدر الشریعہ علامہ مفتی امجد علی مصنف بہارِ شریعت، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب، حضرت مولانا اسرار احمد صاحب، میرے رفیق درس حضرت مولانا نصیر الدین پلاموی، حضرت علامہ افتخار احمد قادری اور حضرت علامہ یٰسین اختر مصباحی ان کے اساتذہ رہے۔

مؤخر الذکر حضرت مولانا یٰسین اختر مصباحی بانی دار القلم دہلی سے انھیں لکھنے کی ترغیب وحوصلہ ملا۔ انھیں کامیاب صاحبِ قلم بنانے میں آپ ہی کا دخل زیادہ ہے اور اس کے لیے مفتی عبدالمجید صاحب علامہ یٰسین اختر کے بہت ممنونِ کرم بھی رہے ہیں جس کا تذکرہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ مولانا موصوف صاحبِ علم کے ساتھ صاحبِ قلم بھی ہیں، کم وبیش دو درجن کتابوں کے مصنف ومؤلف اور مختلف موضوعات پر مشتمل بارہ عربی کتابوں کے مترجم بھی ہیں۔

اصولِ حدیث میں آپ کی ایک کتاب ''میزان الحدیث''، علومِ قرآن میں ''انکشافات القرآن'' اور فن حدیث میں ''مسند امامِ اعظم'' کا ترجمہ وشرح جو اٹھارہ سو صفحات اور تین جلدوں میں مجمع الاسلامی مبارکپور سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ان کے علاوہ چھوٹی بڑی متعدد کتابیں اور تصنیفات کے ترجمے۔ ان کی یہ قلمی اور علمی سفر مسلسل جاری وساری ہے۔ اشرف العلماء حضرت علامہ سیّد حامد اشرف اشرفی جیلانی علیہ الرحمہ پر ایک امتیازی مقالہ پیش کرنے پر اشرف العلماء ایوارڈ سے بھی نوازے گئے۔ اللھم زدفزد

اشرفیہ مبارکپور سے تکمیل کے بعد ۹ سال تک ماریشیس افریقہ میں رہے، جہاں پر انھوں نے ۹ ہزار اسکوائر فٹ پر ایک دینی ادارہ ''جامعہ امام احمد رضا'' قائم فرمایا جو تاہنوز دینی وعلمی خدمات انجام دے رہا ہے۔ مولانا کو اللہ کے فضل اور علمِ دین کی برکتوں سے معاشی استحکام حاصل ہے۔ اس لیے وقارِ علم وعلما برقرار رکھنے میں کامیاب ہیں۔ بے ضمیری، منہ بھرائی، تملق بازی اور دین کے لباس میں اہلِ دنیا کے آگے خمیدہ سر نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں مولانا کو ان تمام موذی بیماریوں سے اب تک محفوظ رکھا ہے اور دعا ہے کہ آئندہ بھی انھیں اور ان کی طرح دیگر علمائے کرام جو دین وعلم کی آبرو بنے ہوئے ہیں انھیں اس طرح کی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

بے شک یہ کتاب مفتی عبدالمجید صاحب قادری رضوی مصباحی کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے جس میں موصوف کی ذاتی

کوشش وکاوش کے ساتھ حضرت سیّدنا مخدوم پاک کی روحانی دستگیری بھی شامل ہے۔اس کتاب میں کوکن کی تاریخ پر بڑی تفصیل و تحقیق پیش کی گئی، بالخصوص ماہم اور اس کے ملحقات ومتعلقات، اس کے علمی، دینی، مذہبی، تاریخی، اقتصادی، تجارتی اور اس عہد میں ماہم کی ہمہ گیر مرکزیت کو آئینہ کیا ہے۔حضرت مخدوم صاحب کا جس قبیلۂ نوائط سے تعلق تھا اس پر بڑا تحقیقی، تاریخی و تفصیلی مواد پیش کیا ہے نیز اس قبیلے کے اہم ترین علماء، مشائخ اور ارباب دین ودانش کی حیات وخدمات اور ان کے دینی وعلمی، تصنیفی کارناموں پر ایک تاریخی وعلمی دستاویز بھی پیش کی ہے۔حضرت مخدوم صاحب کے ذکر کی برکتوں سے ان سرخیلانِ امّت کے حالات اور خدماتِ دینی وعلمی جو پردۂ خفا میں تھے عصرِ حاضر کے اُجالوں میں آگئے ہیں۔

اس کتاب میں صاحبِ کتاب نے حضرت سیّدنا محی الدین ابن عربی شیخ اکبر کی ذات اور ان کے فلسفۂ وحدت الوجود اور اس کے متعلقات پر زبردست کلام کیا ہے اور اس موضوع پر آپ کی عظیم وجلیل ومعرکتہ الآرا کتاب فصوص الحکم اور اس کے مالہ وماعلیہ پر کافی ذخیرۂ معلومات فراہم کیا ہے۔

حضرت شیخ اکبر کے اس فلسفۂ وحدۃ الوجود نے پورے عالمِ اسلام پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے، پورے عالمِ اسلام کی اہم ترین علمی ودینی وروحانی شخصیتوں نے جس طرح اسے حرزِ جاں بنایا وہ بھی ایک تاریخی ریکارڈ ہے، یہاں برصغیر ہند میں متحدہ ہندوستان میں یہاں کی عظیم ترین علمی وروحانی شخصیات نے اس فلسفے کو آگے بڑھ کر جو پذیرائی کی اسے آنکھوں سے لگایا، دل کی دھڑکنوں میں جگہ دی اور اس کی تائید وحمایت میں اپنے علم وفضل کا بڑا عظیم الشان تاریخی مظاہرہ کیا۔جس کی جھلکیاں اس کتاب میں جگہ جگہ ملیں گی اس نظریے یعنی فلسفۂ وحدۃ الوجود کے اپنے زمانے میں سب سے بڑے داعی، حامی، مؤید اور اس کے سب سے بڑے علم بردار حضرت مخدوم علی ماہمی تھے،اس فلسفۂ وجودی کے سالارِ قافلہ کی حیثیت پورے عالمِ اسلام کے اعاظم رجال اور عظیم اور روحانی شخصیات کے درمیان آپ کی انفرادیت، ہمہ دانی اور شانِ امتیاز ایک مسلمہ حقیقت ہے، گویا کہ وہ اپنے عہد یعنی آٹھویں صدی ہجری کے شیخ اکبر تھے۔اس حقیقتِ صادقہ کا نظارہ اس کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ دیکھنے کو ملے گا۔اس کے بعد دوسری اہم گفتگو آپ کی عظیم ترین تفسیر، تفسیر ماہمی پر کی گئی ہے جس میں حضرت مخدوم کے علم وفضل کا بحرِ بیکراں لہریں لیتا ہوا نظر آئے گا۔اس تفسیر کے جمال وکمال اور علمی گیرائی و گہرائی اور علمِ لدنی کی نمود کتاب کے ایک بڑے حصے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔اس وہبی وعطائی تفسیر میں ایک خود آگاہ وخدا آگاہ بندے کا جلال وجمال پوری شان کے ساتھ موجود ہے جس کی جھلکیاں وافر مقدار میں دیکھنے کو ملیں گی۔ ؎

خودی ہے مرد خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے باقی تمام تفسیریں

مولانا موصوف نے اپنی اس معرکتہ الآرا تالیف میں مختلف موضوعات پر مشتمل متعدد اہم ترین تصنیفات کا تعارف ان کے اصل عربی عبارات وترجمے کے ساتھ کرایا ہے جس سے قاری کی معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے اور جتنے بھی موضوع کو چھیڑا ہے اس پر حوالہ جات کی بھرمار کردی ہے جس سے ان کی وسعتِ مطالعہ اور قلمی دیانت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایسا ہرگز نہیں کہ حضرت مخدوم پاک پر اردو زبان میں یہ کوئی پہلی کتاب ہے۔ نہیں اس سے پہلے بھی اس علمِ لدنی کے حامل شاہکار اعظم پر بہت لکھا گیا۔ اگر پہلے سے آپ کی فیض رساں شخصیت پر کتابیں تذکرے نہ ہوتے تو اتنا بڑا قیمتی ذخیرہ کہاں سے دستیاب ہوتا۔ مگر وہ قیمتی کتابیں، تذکرے، علمی، تاریخی، تحقیقی دستاویزات عوام تو عوام خواص کی دسترس سے بھی باہر ہیں۔ ان قیمتی ذخیروں کو دستیاب کرنا، ان کی تلاش و جستجو اس کے لیے بڑے وقت اور خاصی جدو جہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر ان کمیاب ذخیروں تک پہنچ کر ان علمی دستاویزات کو پڑھنا، سمجھنا، ان سے موتیاں چننا، پھر اسے مسلکِ تحریر میں پرو کر جدید عصری تقاضوں کے حسن کے ساتھ منظر عام پر لا کر عوام و خواص کے لیے سہل الحصول بنانا یہ مرحلۂ شوق اتنا آسان نہیں۔ اس کے طے کرنے کے لیے پتھر کے جگر کو پانی کرنا پڑتا ہے، اس کے لیے خونِ جگر جلانا پڑتا ہے، دل اور دماغ سوزی، درد و کرب کے صحرا کو بھی عبور کرنا پڑتا ہے تب جا کر اس نوعیت کا علمی شاہکار اور گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔ اس راہِ محبت میں اپنے مقصد سے والہانہ لگاؤ ہی نہیں بلکہ مکتب عشق میں بھی بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ بغیر توفیقِ الٰہی کے ممکن نہیں۔ ؎

دیوانگیِ عشق بڑی چیز ہے سیمابؔ
یہ ان کا ہے کرم جسے دیوانہ بنالیں

اس خصوصیت میں مفتی عبد المجید رضوی پورے سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی طرف سے شکریے، دعاؤں اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس عظیم فرضِ کفایہ کے ذریعے پوری جماعت کو منتِ غیر سے بچالیا۔

ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

یہ کتاب ایک ہمہ جہت علمی و تاریخی معلومات کا خزانہ ہے جو بیک وقت تاریخ، تذکرہ، تصوف، اصطلاحاتِ تصوف، فقہ، تفسیر، حدیث، علومِ حقیقت و معرفت، کشف و کرامات اور تصرفات کا ایک جہانِ حیرت لیے ہوئے ہے۔ ؎

دامنِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گل چیں تو از تنگیِ داماں گلہ دارد

مولانا نے اپنی اس کتاب میں اپنی طرف سے نہیں بلکہ علمی، فکری، قلمی، تاریخی دستاویز و ذخائر سے جو موتی چنے ہیں اس حدیثِ دیگراں کو پوری دیانت و متانت کے ساتھ قدم قدم پر حوالہ جات کے حسن سے مزین کرتے ہوئے اہلِ علم اور اصحابِ ذوق کے سامنے پورے احترام و عقیدت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ؎

اک چاند کی تلاش میں کھو کر نگر نگر
لوٹے تو آسماں نے ستارے بجھا دیے

اس کتاب میں انھوں نے سب سے پہلے ۹ صفحات پر مشتمل ایک سو انیس عنوانات قائم کیے، پھر ہر عنوان کے تحت حقائق و معلومات کے جلوے بکھیرے ہیں۔

اس سفرِ محبت میں وہ کتنے دشوار کن و صبر آزما مراحل سے گزرے ہوں گے اس کا صحیح اندازہ اس راہ کے مسافر ہی کو

ہوسکتا ہے جو اس وادیِ پُر خار سے گزر چکے ہیں مگر انھیں مقررین وواعظین کی طرح کوئی دنیوی صلہ نہیں ملتا بس آخرت ہی اس کی آخری امید ہوتی ہے۔ بخلاف پیشہ ور مقررین وواعظین کے کہ انھیں آخرت میں نہیں اس کا صلہ اہلِ دنیا سے لینا پڑتا ہے جو اپنے اچھل کود، چیخنے، دہاڑنے، ہنسنے ہنسانے کی فیس نذرانے کی شکل میں اہلِ دنیا سے وصول لیتے ہیں اور اس کے بدلے میں ان سادہ لوحوں کو جنت کا زبانی ٹکٹ دے دیتے ہیں۔

اس دنیا کا سب سے مظلوم طبقہ اہلِ قلم کا ہے کہ مقررین وواعظین کی طرح انھیں کوئی اہلِ کرم نہیں ملتا۔؎

بہت عزیز ہے ہم کو ردائے فقر و غنا
ہمارے ہاتھ میں کیوں کاسۂ سوال دیا

یہ مولانا مفتی عبد المجید رضوی مصباحی کا اخلاصِ بے پایاں کہیے یا حضرت مخدوم پاک کی کرامت کہ انھیں اپنی اس کتاب کی طباعت کے لیے صبر آزما مراحل سے نہیں گزرنا پڑا۔ بے شک کسی کتاب کی تصنیف وہ بھی علمی کتاب لکھنا ایک بڑا مرحلہ تو ہے مگر اس کا وقت پر چھپ جانا بھی کسی بڑے مرحلے سے کم نہیں۔؎

قدرداں قیمت بازار سے آگے نہ بڑھے
فن کی دہلیز پر فن کار نے دم توڑ دیا

یہ تو بھلا ہو سنّی دعوتِ اسلامی کے اشاعتی ادارے "مکتبۂ طیبہ" کا کہ اس مکتبہ کے ذمے داروں نے اس کی اشاعت کا بوجھ اپنے توانا کاندھوں پر اٹھالیا اور بزرگانِ دین بالخصوص حضرت سیّدنا مخدوم علی ماہمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنی والہانہ وابستگی اور حسنِ عقیدت کا عملی مظاہرہ کیا۔ بے شک سنّی دعوتِ اسلامی جس کے بانی وقائد روحِ رواں وامیر عزیز گرامی قدر محترم مولانا حافظ محمد شاکر صاحب نوری ہیں جو یہاں ہندوستان میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی نمائندہ وترجمان اور سنّی مسلمانوں کی خالص دینی، مذہبی عالمی تنظیم ہے جو اسلام کی تبلیغ، دین وسنیت کی ترویج واشاعت اور اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت کے پاکیزہ مسلک مسلکِ حبِّ رسول کی داعی ونقیب ہے نیز اکابرین امّت ورہنمایانِ دین و سنیت مثلاً ☆ محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبد الحق مجدد ومحدث دہلوی ☆ بحر العلوم حضرت مولانا عبد العلی فرنگی محلی ☆ سراج الہند حضرت شیخ عبد العزیز مجدد ومحدث دہلوی ☆ مجاہد حریت امام اہلِ سنّت حضرت علامہ فضلِ حق خیر آبادی ☆ سیف اللہ المسلول حضرت مولانا شاہ فضلِ رسول بدایونی ☆ خاتم الاکابر حضرت سیّد شاہ آلِ رسول مارہروی ☆ استاذ العلماء حضرت علامہ شاہ ارشاد احمد مجددی رام پوری ☆ تاج الفحول حضرت علامہ عبد القادر بدایونی ☆ حافظ بخاری حضرت سیّد عبد الصمد مودودی چشتی سہسوانی ☆ نور العارفین حضرت شاہ ابو الحسین نوری مارہروی ☆ استاذ العلماء حضرت مولانا ہدایت اللہ جونپوری تلمیذِ ارشد حضرت علامہ فضلِ حق خیر آبادی ☆ امام اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی ☆ شیخ المشائخ حضرت شاہ علی حسین اشرفی وغیرہ وغیرہ کے مذہب ومسلک اور ان کے طریقۂ احسن پر گامزن ہے۔ سبیلِ نور کی طرح جس کے حسنِ خدمات کا دائرہ ملک وبیرونِ ملک دنیا کے کئی براعظموں تک پھیل چکا ہے۔ وہ دین وسنیت

کی تبلیغ و اشاعت، مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مسلم بچوں اور بچیوں کی سرفرازی و کامرانی اور ان کے لیے بیک وقت دینی و عصری علوم کے حصول کے لیے کئی محاذوں پر مصروف ہے اور عوامی سطح پر لاکھوں مسلمانوں کو دین وسنیت سے نہ صرف قریب بلکہ اس سے جوڑ دیا ہے۔ اس کے بڑے بڑے تبلیغی و تاریخی اجتماعات نے مسلمانوں میں مذہبی بیداری کی روح پھونک دی ہے، ان کی پیشانیوں میں سجدۂ بندگی کا شوق ہی نہیں بلکہ انھیں اپنے رب کے حضور سجدہ ریز بھی کرا دیا۔ ہزاروں بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو راہِ راست پر ڈال دیا اور تاریک رات کے مسافروں کو حق و صداقت کے اُجالوں سے ہم کنار کر دیا۔

جو بغیر کسی پروپیگنڈے اور بغیر دھواں دھار اشتہار کے مسلم نوجوانوں کو اصلاحِ فکر و نظر کے ساتھ تعلیمی و تعمیری بیداری کے ایک خاموش انقلاب کی کوشش میں ہے اور اگر اس کی خاموش جد و جہد اخلاص کے ساتھ یوں جاری رہی تو وہ یقیناً اس کے مصداق ہو جائے گی کہ ؎

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

اور اب تو اس کے حسنِ خدمات کا دائرہ دینی، مذہبی، علمی، تبلیغی، اشاعتی سرگرمیاں اور اس کی جماعتی تُرک تازیاں اس منزل میں آچکی ہیں جسے ایک جلی عنوان دیا جا سکتا ہے۔ مولیٰ عز وجل اپنے حبیب پاک صاحبِ لولاک ﷺ کے صدقے میں اس جماعت کے امیر و قائد اور ان کے دست و بازو، ان کے میمنہ و میسرہ اور قلب، نیز ان کے اعوان و انصار کو سلامت رکھے، انھیں دارین کی نعمتیں اور خوشیاں عطا فرمائے اور اس جماعت کو عروج کے ساتھ ساتھ اس منزل پر پہنچا دے جسے دیکھ کر دل تحیر خیز مستوں سے لبریز ہو جائے اور زیرِ لب گنگنا کر کہنا پڑے۔ ؎

حد سے نہ گزر طوفان نہ بن سیلاب نہ بن گرداب نہ بن
بن ہلکی موج مگر ایسی جس موج پہ دریا ناز کرے

☑☑☑☑☑☑

تقدیم بر کتاب ''سوانح مقبول''

میں کہ میری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
یہ تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام اہلِ سنّت مجددِ دین وملّت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے گرد دین وسنّیت اور ان کے پاکیزہ مسلک حبّ رسول کی تبلیغ واشاعت ومسلمانوں کی حفاظت وصیانت کے لیے اربابِ فضل وکمال اور انوارِ قدسیہ کے حاملین کی جو مقدس جماعت تھی جس نے اپنے مرکزِ عقیدت کا دست و بازو بن کر برصغیر ہند کے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کے ایمان وعقیدے کو خارجی وداخلی فتنوں کی یلغار سے محفوظ و مامون رکھنے، دین وسنّیت کے دفاع اور شوکتِ اسلام کے لیے سردھڑ کی بازی لگائی تھی۔ انھیں میں ایک ذات علامہ جلیل عالمِ ربّانی جامع معقول ومنقول حاوی فروع و اصول مناظرِ اعظم حضرت اقدس بابرکت علامہ سیّد مقبول احمد کشمیری فاضل جامعۂ ازہر شریف مصر بھی تھی۔ جو ہانگل شریف ضلع دھارواڑ (میسور) میں آسودۂ خاک ہیں اور پورے علاقہ میں دور دور تک اعلیٰ حضرت کشمیری کے لقب سے مشہور ہیں۔

واضح رہے کہ اعلیٰ حضرت کا اطلاق مسلم نوابین ووالیانِ ریاست کے لیے بھی ہوتا تھا۔ جیسے اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان خاں، حیدرآباد۔ مگر اہم ترین دینی شخصیات ورجال کے لیے بھی اعلیٰ حضرت کا اطلاق ہوتا ہے۔ علاقائی حد تک ہی سہی۔ حضرت مکان قطبِ ویلور کے سجادہ نشینانِ کرام کو بھی اس علاقہ میں اعلیٰ حضرت کہا جاتا ہے۔ مگر جب دینی وعلمی حوالے سے مطلقاً اعلیٰ حضرت بولا جائے گا، تو اس سے مراد وہی ایک ذاتِ جامع الصفات ہے جو کہ کروڑوں مسلمانوں کی مرکزِ عقیدت! جس نے محبت کے کشتِ ویراں کو لالہ زار کیا۔ طوفانوں میں کشتیاں چلائیں۔ بادِ مخالف کا رُخ موڑا۔ آندھیوں کی زد پر عشق ومحبت کا چراغ جلایا۔ اور برصغیر میں انگریزی سامراج کے ناپاک بطن سے جتنے بھی مذہبی وسیاسی فتنے نکل کر مسلمانوں کے خلاف آندھی وطوفان بن کر اُٹھے وہ اس کوہِ عزیمت واستقامت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئے۔ جس کی ذوالفقارِ قلم نے پوری قوتِ حیدری کے ساتھ دشمنانِ دین وایمان کو خاک آلود کیا اور انھیں خبردار کرتے ہوئے یوں للکارا۔

کلکِ رضا ہے خنجر خوں خوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

جس نے کائنات بھر کے اہلِ ایمان کے دل، جان وایمان، روحِ ایمان، اصلِ ایمان حضور آقائے کائنات جنابِ احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ارواحنا وجسادنا فداہ ﷺ کی طرف موڑتے ہوئے اپنے قول وعمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ع آبروئے ما زنامِ مصطفیٰ

جس کے مسلکِ حبّ رسول کی روح بھی یہی ہے۔

اللہ کی سرتابہ قدم شان ہیں یہ ۔۔۔ ان سانہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انھیں ۔۔۔ ایمان یہ کہتا ہے میری جان ہیں یہ

یعنی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی جن کا سوزِ عشق اذان کے بعد پوری دنیا میں سب سے زیادہ سنا جاتا ہے۔ ع

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

حضرت علامہ سیّد مقبول احمد قبلہ علیہ الرحمہ چمنستانِ فاطمی کے ایک گلِ سرسبد ہوتے ہوئے وہ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنّت کے نہ صرف ایک زبردست مدّاح بلکہ اعلیٰ حضرت کے عاشقِ صادق اور ان کے مسلکِ حبّ رسول کے ایک بڑے داعی بھی تھے۔ اس پورے علاقہ میں عوام وخواص سے اعلیٰ حضرت کو متعارف آپ ہی نے کرایا ہے۔ یہ اعلیٰ حضرت کے مرید وخلیفہ وتلمیذ تو نہیں تھے مگر اعلیٰ حضرت سے ایسی والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے کہ گماں ہوتا تھا کہ اعلیٰ حضرت ہی مرشد ہیں۔

مسلمانانِ عالم کی تمام تر توانائیوں کو ختم کرنے کے لیے دشمنانِ اسلام نے انگریز سامراج کی قیادت میں مسلمانوں کے دلوں سے روحِ محمد ﷺ نکالنے کا منصوبہ بنا کر اس پر سختی سے عمل پیرا ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے دلوں، جانوں اور روحوں میں روحِ محمدی کی بقاوسلامتی کے لیے جو جو نفوسِ قدسیاں دور ونزدیک جہاں بھی تھیں اعلیٰ حضرت کو اپنا قائد وامام مانتے ہوئے ان کے مسلکِ حبّ رسول ﷺ پر چم بلند کیے ہوئے تھیں۔ ڈاکٹر اقبال کا سوزِ دروں بھی اسی سلسلے میں اپنا کام کر رہا تھا۔

یہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں ذرا ۔۔۔ روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات ۔۔۔ اسلام کو حجاز ویمن سے نکال دو

اور اس تعلق سے تو اقبال کا مردِ مومن تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس حد تک تڑپ اُٹھتا ہے کہ

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ ۔۔۔ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر است ز مقام محمد عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر باو نہ رسید تمام بالھبی است

(کلیاتِ اقبال)

حضرت علامہ کشمیری مسلمانوں کے دلوں سے روحِ محمد ﷺ نکلنے پائے اس کے لیے وہ زندگی بھر آبلہ پا رہے۔ انہوں نے دین وسنیت کی اشاعت اور اپنے جدِّ کریم کی اُمت کے دلوں میں حبّ رسول کی بحالی کے لیے اپنے وطن کشمیر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑا اور پھر اس جہادِ زندگانی میں وہ ہمیشہ کانٹوں کو روندتے رہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے

آپ کا قدرِ مشترک صرف حبّ رسول تھا۔ اور پھر زمانے بھر سے زیادہ جب حبّ رسول وفنافی الرسول کی دولت گراں مایہ امام احمد رضا کی ذات میں محسوس کرلیا۔ تو پھر ہمیشہ کے لیے انھیں اپنا امام وقائد مان کر انھیں ٹوٹ کر چاہا۔ اُن سے محبت کی اور اُن سے عقیدت ایسی کہ جب کبھی آپ کی پاک مجلس میں اعلیٰ حضرت کا ذکر چھڑ جاتا یا کسی اہلِ محبت کے منہ سے آپ کا نام سُن لیتے تو دعا کے لیے فوراً ہاتھ اُٹھا دیتے۔ اس معمول میں فرق نہ آیا۔ آپ کے کسی مخلص مرید نے پوچھ لیا ''حضور! اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں آپ کی نیازمندی کا عالم یہ ہے، ایسا تو فی زمانہ شاید ہی کسی مرید کا اپنے پیر کے لیے ہو۔ جبکہ وہ آپ کے پیر ومرشد بھی نہیں۔''

اس پر آپ آبدیدہ ہو گئے اور خالص کشمیری انداز میں فرمایا:

''آہ! تمھیں کیا معلوم۔ اگر وہ نہ ہوتا تو پورے ہندوستان سے سنّیت بے دخل ہو گئی ہوتی۔ آج یہاں دین وسنّیت کا جو بھی اُجالا قائم ہے یہ اُسی کا احسان ہے۔ یہ اُسی کا احسان ہے۔''

گفت تو کے دیدی آن رخسار را چشم مجنون باید آں دیدار را
گر بچشم من بہ بینی روئے رو تو تیا سازی بخاکِ کوئے رو

آپ کی پوری زندگی جہادِ مسلسل سے عبارت ہے۔ ترویجِ دین مصطفےٰ اور بے دینیت کے ردّ واستیصال کے لیے وہ ہمیشہ کمربستہ رہے۔ آپ کی خدمت دین وسنّیت اور داستانِ عزیمت واستقامت قارئین کرام اس کتاب کے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں گے۔

بے شک ہمارا تعلق ایک ایسی جماعت سے ہے جو اکابر فراموشی اور اُن سے اغماض وچشم پوشی میں یگانۂ روزگار ہے۔ بزرگوں، محسنوں اور بے کراں شخصیات کی ایک بڑی فہرست ہے جن پر ہم نے خود ہی ڈھنڈی ڈھول ڈال رکھی ہے۔

نصف صدی تک تو ہم نے یہی سلوک سیّدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے بھی روا رکھا تھا۔ یہ تو خدا بھلا کرے مملکتِ خداداد کے اہلِ محبت کا کہ انہوں نے اعلیٰ حضرت پر بڑا کام کیا اور نصف صدی کی کوتاہیوں کا نہ صرف ازالہ بلکہ اس سے سوا کر دیا۔ اعلیٰ حضرت سے منسوب اور اُن کے تعلق سے ہر ذرّے کو آفتاب کیا مگر ابھی کچھ کڑیاں باقی ہیں، کچھ آفتابانِ فضل و کمال پر بے خبری کی پرت پڑی ہوئی ہے۔ ہم نے خود ہی جانے کیوں منہ موڑ رکھا ہے۔ اعلیٰ حضرت سے سوالات کرنے والے، اعلیٰ حضرت کو خط لکھنے والے اور اعلیٰ حضرت کے مکتوب الیہ تک چمکتے دمکتے اُجالے میں آ گئے ہیں۔

مگر کتنی عجیب بات ہے کہ کچھ گراں قدر شخصیتیں ایسی جنھیں اعلیٰ حضرت کی بارگاہ سے بڑا قرب حاصل تھا وہ آپ سے نسبتِ خصوصی بھی رکھتے تھے مگر ذکرِ رضا کے ضمن میں اُن کا نام دور دور تک کہیں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ مثال کے طور پر ہاتھ اصلی ضلع سیتامڑھی کے حضرت مولانا رحیم بخش صاحب قبلہ علیہ الرحمہ ہی کو لے لیجیے جو ہاتھ اصلی میں ہی آسودۂ خاک ہیں راقم الحروف وارث جمال قادری نے اُن کے مزارِ مبارک پر حاضری کی سعادت حاصل کی ہے۔ یہ اعلیٰ حضرت کے نہ صرف

تلمیذِ خصوصی بلکہ شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرت مولانا حامد رضا خاں فرزندِ اکبر و جانشین اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے ہم جماعت و رفیق درس بھی تھے۔ سیتامڑھی سے متصل ایک مشہور گاؤں پوکھریرا ہے جہاں سیکڑوں علماء ہیں، حضرت مجی کا مزار بھی وہیں ہے۔ میرے رفیق دیرینہ مولانا قاری اطہر حسین اور مشہور ادبی شخصیت شین مظفر پوری اور ممبئی کی معروف علمی و دینی شخصیت مولانا قاضی مفتی اشرف رضا بھی اسی گاؤں کے ہیں۔ مولانا اظہار الحسن صاحب آپ کے بیٹے تھے جن کا ایک سال پہلے انتقال ہو گیا۔ سیتامڑھی آبادی کے اعتبار سے بہت بڑا گاؤں ہے جہاں کئی ہزار ووٹر ہیں۔ وہ علاقہ بہت دور تک رضوی بیلٹ بھی کہلاتا ہے۔ حضرت مولانا رحیم بخش صاحب اس علاقے کے بڑا مولانا کہلاتے تھے۔ اعلیٰ حضرت سے خصوصی نسبتِ تلمذ اور اپنے تقویٰ و پرہیز گاری اور علم و فضل کی بنیاد پر علاقے بھر میں محترم تھے۔ اور پورے علاقے کو رضوی بیلٹ بنانے میں ان کا کردار بنیادی تھا۔

مگر واحسرتا! ذکرِ رضا کے ضمن میں آگے پیچھے اعلیٰ حضرت کے تعلق سے کہیں بھی ان کا نام نہیں ملتا۔ وہاں کے درجنوں قابلِ ذکر علماء کیا اس کے ذمہ دار نہیں؟

تو پھر ہمیں رضویات کے تعلق سے اعلیٰ حضرت کشمیری حضرت علامہ سیّد مقبول احمد صاحب قبلہ فاضل ازہر کے تعلق سے کوئی معلومات نہیں تو زیادہ تعجب خیز بات نہیں۔

خود اعلیٰ حضرت کے فرزندِ اکبر ان کی علمی، دینی، فکری اور روحانی عظمتوں کے وارث و امین و جانشین شیخ الانام حجۃ الاسلام حضرتِ اقدس بابرکت علامہ مفتی شاہ محمد حامد رضا قادری رضوی علیہ الرحمۃ والرضوان کے تعلق سے ہماری بے اعتنائی اور اجتماعی جمود کیا کم افسوسناک ہے؟

جن کے تعلق سے بادشاہِ علم و فضل حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی علیہ الرحمہ یہ فرمائیں "دو شخصیتوں پر اعظمی کے ماں باپ قربان جب ان کا تصور کرتا ہوں تو اُن کی عقیدت سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔"

یہ وہ علامہ اعظمی ہیں معاصر علماء میں جن کو کسی کی عظمت و برتری تسلیم ہی نہیں تھی۔ یہ وہ علامہ اعظمی ہیں جن کے بارے میں حضور مجاہد ملّت علامہ شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری (قدرے ذہنی دوری کے باوجود) فرمایا کرتے تھے کچھ بھی ہو اعظمی علم کا بادشاہ ہے۔ یہ وہ علامہ اعظمی ہیں جو فرمایا کرتے تھے۔ ان دو شخصیتوں کے علاوہ پورے برصغیر ہند و پاک میں اعظمی کو اعظمی ہی نظر آیا۔ جن دو شخصیتوں پر علامہ اعظمی اپنے ماں باپ قربان کرتے تھے ان میں پہلی ذات حجۃ الاسلام حضرت علامہ مفتی حامد رضا اور دوسری ذات حضور محدثِ اعظم ہند کی ہے۔

فرماتے تھے "بیٹا حجۃ الاسلام اس لیے نہیں بڑے تھے کہ وہ ایک عظیم باپ کے بیٹے تھے ارے وہ اعلیٰ حضرت کے بیٹے نہ بھی ہوتے تو بھی بہت عظیم تھے، مجموعہ حسنِ خوباں! ان جیسا عظیم انسان اعظمی کی آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ تو جب ایسے صاحبِ عظمت و جلال کے ساتھ ہماری اعتنا کا عالم یہ ہے کہ ایک عدد سالانہ عرس کر کے ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کا

ملّت اسلامیہ بالخصوص سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت پر جو احسان ہیں اس سے ہم سبک دوش ہو گئے۔

جو درد چھپا ہے سینے میں اس درد کا کوئی نام نہیں — یہ زخم ہمارا اپنا ہے یہ زخم متاعِ عام نہیں
اس درد لا علاج کا کوئی دوا نہیں — رضوی ہیں مگر وارث احمد رضا نہیں

جبکہ ان کے حقیقی اخلاف آج اتنی عظمتیں لیے ہوئے ہیں کہ دم میں چاہے جو کرے دور ہے شاہا تیرا کے مترادف! تو پھر اگر حضرت سیّد مقبول کشمیری جو اعلیٰ حضرت کے مسلکِ حبّ رسول کے ایک بڑے داعی اور مذہب اہلِ سنّت کے ایک اولوالعزم ترجمان اور دین وسنّیت کے ایک زبردست مبلغ کو شمالی ہندوستان نہ جانتا ہو تو زیادہ تعجب نہیں۔

چراغِ لالہ میں جلتا رہا یہ خونِ بہار — یہ اور بات ہے گلوں میں روشنی نہ ہوئی

پورے سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی طرف سے شکریے دعاؤں اور بہت ہی مبارکباد کے مستحق ہیں حضرت مولانا بالفضل مولانا قاضی محمد اسماعیل مقبولی جنہوں نے آپ کے حالات سے بہت زیادہ تفصیل نہ سہی پردہ تو اُٹھایا اور دین و سنّیت کا وہ درِّ شاہوار جس پر بے خبری کے کئی پرت پڑے ہوتے تھے اسے حالات کے اُجالے میں لاکر ہماری آنکھوں کو خیرہ کیا۔ فلحمد علیٰ ذالك۔

وہ اعاظم رجال جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہو۔ ان کے تعلق سے لکھنا تو زیادہ مشکل نہیں مگر جس کے تعلق سے بالکل بے خبری ہو وہاں اتنا ہی اُجالا بہت ہے۔ اور یہ بھی اعلیٰ حضرت کشمیری کا فیضانِ خاص ہی ہے جو حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل مقبولی سے یہ کام لے لیا۔

بہار آئے تو کانٹے بھی مسکراتے ہیں — خزاں میں پھول کھلاؤ تو کوئی بات بنے

حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل بن قاضی وجیہ الدین یہ ہانگل شریف دھارواڑ صوبہ میسور میں ۱۹۳۶ء-۵-۲۵ میں پیدا ہوئے اردو میڈیم سے ۷ رکلاس پڑھا اور ہائی اسکول انگریزی ہندی مدراس بورڈ سے کیا، دینیات کی کچھ ابتدائی کتاب صاحبِ تذکرہ حضرت علامہ سیّد مقبول کشمیری سے پڑھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ انہیں ملا وہ ان کے مرشد کے فیضانِ نظر کا ہے جس میں فیضانِ نظر والی بات زیادہ اور مکتب کی کرامت کم!

آپ حضرت علامہ کشمیری کے مرید خاص ہیں اور سفر وحضر میں بیس سال تک خدمت کی سعادت حاصل کی موصوف کو کئی زبانوں پر دسترس حاصل ہے اپنی روزمرہ کی گفتگو میں وہ عربی وفارسی زبان کے محاورے ایسے استعمال کرتے جیسے کہ محاورے خود ہی ان کی زبان پر آنے کے لیے بے چین ہوں۔ اردو، انگریزی اور عربی رسم خط تو قابلِ رشک ہے۔

آنکھیں دینی ماحول میں کھولیں پرورش بھی دینی ماحول میں ہوئی آپ کا خاندان علی عادل شاہ بیجاپوری کی بادشاہت میں منصب قضا پر فائز المرام تھا گویا کہ یہ خاندانی طور پر بھی این ہمہ خانہ آفتاب است کی منزل میں ہے۔

دار العلوم امام احمد رضا کونڈ یورے رتنا گیری جو دین وسنّیت کا ایک عظیم قلعہ اور اعلیٰ حضرت کے مسلک حبّ رسول کا

سرزمین کوکن میں سب سے بڑا ترجمان ہے۔ جہاں چارسو سے زائدلڑکیاں اور تین سو سے زائدلڑکے دن رات مصروفِ علم دین جہاں کے معلمات کی کارکردگی کی دھوم اوران کے دینی خدمات کی خوشبو چارسو پھیلی ہوئی ہے جوسرزمین کوکن ہی نہیں بلکہ پورے مہاراشٹر میں حفظ وقرأت کی بھی سب سے اعلیٰ ومنفرد درسگاہ ہے جہاں لڑکیاں بھی عالمہ حافظہ اورقاریہ ہوتی ہیں۔ جسے اللہ کے ایک مخلص بندے اور رسولِ عربی کے ایک سچے غلام اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے ایک شیدائی شیخ طریقت محترم الحاج محمد اسماعیل جانی قادری برکاتی نے قائم کیا اوراسے اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا۔ اورسرزمین کوکن میں تیزی سے پھیلتی ہوئی بے دینیت کے سیلاب پرایک مضبوط بند باندھا۔ بے شک یہ حضرت الحاج جانی پراللہ تعالیٰ کا بےحد وحساب احسان اور بے پایاں فضل وکرم ہے جوان سے اتنا بڑا دین کا کام لے لیااللھم زد فزد اسی عظیم ادارے کے سربراہ اورروحِ رواں محترم الحاج مفتی ابراہیم مقبولی آپ ہی کے فرزندارجمند ہیں ان کے علاوہ ان کے دو بیٹے اور ہیں اوردونوں عالمِ دین مولانا عبدالرحیم مصباحی اور مولانا نثاراحمد یہ دونوں بھی اسی دارالعلوم میں خدمت دین میں لگے ہیں۔

بے شک حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل مقبولی ایک عالمِ دین خادمِ دین وسنّیت اور کامیاب مناظر بھی ہیں خطیب مشرق علامہ مشتاق احمد نظامی علیہ الرحمہ نے فاتح گوا کالقب بھی دیا۔ اور یہ لقب اس زمانے کا دیا ہوا ہے جب القابات کی بڑی اہمیت تھی آج کی طرح نہیں آج القابات جتنے بےتوقیر ہوکر رہ گئے ہیں ایسا کسی زمانے میں نہیں بےتوقیر تھے۔ بے پڑھے لکھے علاماؤں کے آگے آج پڑھا لکھا عالم دم بخود ہے۔

جل بھی چکے پروانے ہوبھی چکی رسوائی　　　　اب خاک اُڑانے کو بیٹھے ہیں تماشائی

آج جب وہ کبرسنی کی منزل سے گزررہے ہیں مگر خدمت دین کے لیے آج بھی وہ جوانوں سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ اورمناظرہ کے نام پرتوان کا حوصلہ بلند تو اتنا جوان ہوجاتا ہے کہ نوجوان علماء عش عش کرتے ہیں۔ ان کے پورے خانوادے پران کے مرشداعظم حضرت علامہ کشمیری کا فیضان ایسا ٹوٹ کے برسا ہے جس نے کئی نسلوں کوشرابور کردیا اور ان کی برکتوں کافیضان نسل درنسل باقی رہے گا۔ ان شاءالمولیٰ ان کی خوش بختی بڑی بے مثالی ہے۔

بے مثالی کی ہے مثال وہ حسن　　　　خوبی یار کاجواب کہاں

خودبھی عالمِ دین ہی نہیں بلکہ خادمِ دین سارے بیٹے عالمِ دین، اوران کی بہوئیں بھی عالمہ، فاضلہ، معلّمہ، ان کی ایک بہوتو دارالعلوم امام احمد رضا کے شعبہ بنات کی صدر معلّمہ ہیں محترمہ رضیہ آپا! جو دارالعلوم امام احمد رضا کونڈیورے رتنا گیری کی ساڑھے چارسولڑکیوں کوعلمِ دین سے آراستہ اورانہیں دینی طور پرسجانے وسنوارنے میں دن رات مصروف ہیں۔ جن کی دینی خدمات کی خوشبو نے پانچ صوبوں کواپنے لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ اوراب تو دارالعلوم امام احمد رضا مسلمان بچیوں کے لیے چشمۂ آب زلال کی حیثیت اختیار کرتا جارہا ہے۔

عندلیب مست داند قدر گل　　　　چغد ارا از گوشہ ویرانہ پرس

مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب نے اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت کی محبت وعقیدت کا جام اپنے مرشد سے ایسا پیا ہے کہ اس عقیدت کا خمار ہر دن ترقی پر ہے۔ مولانا موصوف سے ہمارا قدرِ مشترک بھی یہی ہے اعلیٰ حضرت کے عاشقِ صادق امام اہلِ سنّت کے والا وشیدا اعلیٰ حضرت کی کتابوں بالخصوص فتاویٰ رضویہ شریف کا بالاستیعاب گہرا مطالعہ اور اس کی برکتوں سے مسائل کا استحصار ایسا کہ

تجھ کو دیکھوں کہ تجھ سے بات کروں

میرے مرشد گرامی عاشق محبوبِ کبریا شیخ المشائخ شعیب الاولیاء حضرت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قدس سرہ بانی دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کا بھی طبقہ صوفیاء میں کوئی جواب نہیں تھا اعلیٰ حضرت کے نہ شاگرد نہ مرید مگر ان کے پاکیزہ مسلک حبِّ رسول کو اپنے مضبوط وتوانا کاندھے پر جس طرح اُٹھایا تھا دور بہت دور بہت دور تک اس کا جواب نہیں۔ وہ اعلیٰ حضرت کے ایسے عاشقِ صادق تھے کہ جن کے مزار شریف کے داخلی دروازے پر سنگِ مرمر کے کتبے پر شیدائے سرکار اعلیٰ حضرت کندہ ہے۔ ہم نے بھی اعلیٰ حضرت کے عشق وعقیدت کا جام انہیں کے ہاتھوں پیا ہے میرے مرشد نے اس تعلق سے کسی اور کے زیر احسان ہونے سے بچالیا ہے۔

مولیٰ تعالیٰ حضرت مولانا قاضی محمد اسماعیل صاحب مدظلہ العالی کے اس خدمت دینی کو قبول فرمائے۔ اور کتاب سوانح مقبول کو مقبولیت عامہ عطا فرمائے ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور ان کی اولاد وامجاد کو یوں ہی نسل درنسل خادمِ دین وعلمِ دین بنائے رہے آمین بجاہ سیّد المرسلین بحق طٰہٰ ویٰسین۔

☑☑☑☑☑☑

خطبۂ استقبالیہ

خطبۂ استقبالیہ
تحفّظِ حرمین کانفرنس

طویل خطبۂ استقبالیہ کی ایک جھلک

منعقدہ ۳/ اکتوبر ۱۹۹۰ء بمقام: وائی ایم سی گراؤنڈ اگری پاڑہ ممبئی ۸

منحصر موسمِ گل پر نہیں سودا میرا　　　آ گیا ذکر ترا، اور میں دیوانہ ہوا

صدر باوقار، قابلِ احترام علمائے کرام، لائق تعظیم مشائخ عظام، ملک و بیرونِ ملک سے تشریف لانے والے مہمانانِ عالی وقار، عمائدین شہر و معزز حاضرین کرام!

سوادِ اعظم اہلسنّت و جماعت کی عظیم مذہبی تنظیم ''آل انڈیا تبلیغ سیرت'' دل کی گہرائیوں کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔ جس طرح اس کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے آپ حضرات یہاں تشریف لائے ہیں اور اس راہِ محبت میں کلفتیں اٹھائیں، اس کے لیے تبلیغِ سیرت کے اربابِ بست و کشا و ارکان عہدیداران بصمیمِ قلب شکر گذار ہیں اور ساتھ ہی پُر امید بھی کہ جن اہم دینی مقاصد کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں اس میں ان شاء اللہ یقیناً ہمیں کامیابی حاصل ہوگی۔

دوستو! اس عظیم کانفرنس کے انعقاد کے لیے ہم نے ممبئی ہی کو کیوں منتخب کیا جس کی بے کراں وسعتوں میں رنگ و آہنگ کا موسم، نغمہ و نور کی برسات، بہجت و مسرت کے شادیانے، حیرت و حسرت کی تصویریں، نشاط و عشرت کے تلاطم خیزیاں اور یاس و آس کی پرچھائیاں ہیں تو دوستو! صرف اس لیے کہ یہ شہر عجیب سے عروس البلاد بھی کہا جاتا ہے (جو یقیناً شہروں کی دلہن ہے) کئی وجہ سے بہت اہم ہے۔

اوّل تو اس لیے کہ یہ غوث و خواجہ کا شہر ہے، یہ امام احمد رضا کے دیوانوں کا شہر ہے، یہ قادریوں کا گلشن ہے، یہ چشتیوں کا مسکن ہے، یہ ابوالعلائیوں کی آماجگاہ ہے، یہ رضویوں کا مدینۂ محبّت ہے اور اشرفیوں کا گلدستۂ آرزو، غرض یہ ہر طرح سے شہر محبت ہے جس طرف نظر اٹھائیے محبّت ہی محبّت اور وارفتگی ہی وارفتگی، یہ مقصد سے والہانہ لگاؤ اور مذہب محبّت کی جلوہ سامانیاں تو ہیں کہ تاحدِ نظر انسانی سمندر کی موجیں لہریں لے رہی ہیں۔

جلیل آساں نہیں آباد کرنا گھر محبّت کا
انہیں کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

اور اس لیے بھی کہ یہ ذرائع و اسباب کا شہر ہے اور اس لیے بھی کہ یہ شہر وفا اپنے وجود میں ایک چھوٹا سا ہندوستان ہے۔ منی انڈیا ہے۔ سرزمینِ ہند کا وہ کون سا علاقہ ہے جہاں کے لوگ یہاں پر بڑی تعداد موجود نہیں۔ اور اس لیے بھی کہ یہ ایک بین الاقوامی شہر ہے۔ ہندوستان کا اہم ترین عالمی شہر جہاں کی ہر قابلِ ذکر آواز نہ صرف پورے ہندوستان بلکہ پوری

دنیا میں پہنچتی ہے۔

کیا آپ نے ابھی جلد ہی نہیں دیکھا کہ اس عظیم تاریخی واحتجاجی جلوس کو جو آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے ۷ر ستمبر ۱۹۹۰ء کو تحفظِ حرمین کے سلسلے میں برپا کیا گیا تھا۔ جس کی اثر خیزی اور اس کی دھمک دنیا کے ایک بڑے حصّہ تک محسوس کی گئی۔ بی بی سی لندن نے اپنے ہر زبان کے نشریے اور پریس میڈیا نے اس کا ساتھ دیا، کہ آزادی کے بعد پورے ہندوستان کی تاریخ میں کسی مذہبی جلوس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ برصغیر تو الگ رہا، لندن و امریکہ اور یورپ کے بڑے بڑے اخبارات نے پورے مالہ وماعلیہ کے ساتھ اس جلوس کو نمایاں مقام دیا اور اپنی معلومات کی حد تک دنیا کے بڑے بڑے اخبارات کی وہ زینت بنا۔ مگر ہندوستانی سرکاری ذرائع ابلاغ کے اپنی متعصّبانہ روایت کے مطابق اس سے چشم پوشی کا حیرت ناک وشرمناک مظاہرہ کیا۔

اہلِ وطن کے اکثریتی طبقہ کا کوئی تہوار یا پچاس آدمیوں پر مشتمل کوئی ہلکا سا جلوس ہو تو سرکاری ذرائع ابلاغ اس کے لیے ایسے وقف رہتے ہیں کہ دیکھنے والا یہ محسوس کر کے کہ دنیا کی سب سے اہم خبر یہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ قاتل رتھیں جس کی وجہ سے انسانی خون سے فضائیں بوجھل اور لاشوں کے انبار سے وحوش وطیور شکم سیر ہو جائیں، اس کے لیے بھی سرکاری ذرائع ابلاغ کشادہ قلبی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ابھی عید میلاد النبی کا جو عظیم تاریخی جلوس نکلا، پہلی بار ممبئی کے آسمان نے انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو دیکھا۔ اس کی بھی ہمارے سرکاری ذرائع ابلاغ نے چند سیکنڈ میں صرف لمحاتی جھلکیاں پیش کر کے اپنے وسیع النظری کا عظیم مظاہرہ کیا۔ اس کے باوجود دستورِ ہند کے مطابق ہمارا یہ ملک جمہوری ہے، جہاں ہر فرقے اور مذہب کے حقوق بحق دستور محفوظ ہیں۔

میں شہرِ گل میں زخم کا چہرہ کسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو خنجر چبھو گئے

محترم حضرات! آج اس عظیم کانفرنس کے آراستہ و پیراستہ و پُرشکوہ اسٹیج پر میں ان نورانی و مقدس چہروں کے تصور میں ڈوب کر رہا گیا، جو اس طرح کے اسٹیج کی زینت اور اس پر مہ وانجم بن کر جگمگایا کرتے تھے، اور خلقِ خدا کی ایک بڑی تعداد انہیں بولتے چہروں اور خدا بھاتی صورتوں کی زیارت کے لیے حسرتِ دید کی تمنا لیے حاضر ہوتی ہے۔

وہ کبھی مل جائے تو کیا کیجیے   رات دن صورت کو دیکھا کیجیے

مگر آج وہ ہم میں موجود نہیں، بلکہ ہمیں روتا بلکتا چھوڑ کر وہ اپنے رب کی جوارِ رحمت میں چلے گئے۔ انسانی فضل و کمال، حسن و جمال، جاہ وجلال، تقویٰ وطہارت، طاعت وعبادت اور خشیت الٰہی کے ان پیکروں میں مفتیٔ اعظم مولانا مصطفےٰ رضا خاں، محدثِ اعظم مولانا سیّد محمد، مجاہدِ ملّت مولانا شاہ حبیب الرحمٰن، سیّد العلماء مولانا شاہ سیّد آلِ مصطفےٰ، صدر العلماء علامہ سیّد غلام جیلانی میرٹھی، امین ملّت علامہ مفتی رفاقت حسین، شعیب الاولیاء حضرت شاہ محمد یار علی قدست اسرارہم یاد آرہے ہیں۔ ع ''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔''

ہماری اور آپ کی خوش نصیبی ہے کہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے اس مقدس اسٹیج پر آج عرب وعجم کا خوبصورت سنگم دیکھ رہے ہیں۔ عرب کی وہ مقدس سرزمین جو اسلام کا سرچشمہ ہے۔ وہاں کے اشراف وامجاد کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔ ان کے شکرگذار ہیں کہ انہوں نے تبلیغ سیرت کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ خصوصاً عراق کے محترم ومعزز سفیر جناب عبدالودود شیخلی قونسل جنرل مسٹر عامر ۔، محترم صباح، والحاج علی العثمان اور ان کے ساتھ آئے ہوئے متعدد ممالک کے اشراف عرب کا والہانہ خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کے ہم بے حد ممنون ومشکور ہیں۔

حضرات! اسے ایک نیک فال اور اپنے مقدر کی ارجمندی ہی سمجھنا چاہیے کہ اس وقت ہمارے درمیان وہ ہستی معتبر اور مقدس ذاتِ گرامی جلوہ فگن ہے جس کے لیے شہید محبّت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی نے فرمایا کہ ؎

تیری نسلِ پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا
تو ہے عین نور، تیرا سب گھرانا نور کا

میری مراد شہزادۂ غوث الوریٰ، اربابِ فکر ونظر کے مرکزِ عقیدت مخدوم المشائخ حضرتِ اقدس بابرکت علامہ الحاج الشاہ السیّد محمد مختار اشرفی اشرف الجیلانی صاحب سجادہ کچھوچھہ شریف جن کی زیارت ہی ایک بڑی سعادت ہے۔ آپ حضرات کو آل انڈیا تبلیغ سیرت کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ جس کی بدولت اسلاف کی ایک جھلملاتی اور اپنے عمرِ طبعی کی سرحدوں کو پار کرتی ہوئی یادگار کی زیارت کے لیے آپ کو زیرِ بار نہیں ہونا پڑھا۔

محترم حضرات! آل انڈیا تبلیغ سیرت کے اس تحفظِ حرمین کانفرنس کی مقصدیت کو سمجھنے کے لیے آپ کو چودہ سو سال اپنے ماضی کو پلٹنا ہوگا۔ علماء کی برکتوں اور دین سے والہانہ لگاؤ کے باعث اتنا تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ اسلام سے قبل پوری دنیا بالخصوص عرب کی کیا حالت تھی؟ عرب ایامِ جاہلیت میں کس قدر خودسری ووحشت وبربریت اور ظلم وستم کے خوگر تھے۔ جہالت وسرکشی، حسب ونسب کے غرور اور تکبّر وبے جا احساسِ برتری کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ایسے عالم میں جب محسنِ انسانیت ﷺ اس قدر ستایا گیا اور اتنی اذیتیں دی گئیں کہ جس کی وجہ سے مکّہ کی سرزمین ان پر تنگ ہوگئی اور آپ مکّہ چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے مدینہ تشریف لے گئے۔ مدینہ آتے ہی آپ نے قیامِ امن اور بقائے امن کے لیے یہودیوں سے ایک معاہدہ کیا کہ مدینہ پر کسی بھی باہری حملے کی صورت میں مسلمان اور یہودی دونوں مل کر دفاع کریں گے۔

قریشِ مکّہ اور دیگر مشرکین عرب سے مسلسل تصادم اور لڑائیوں کے درمیان یہودیوں کی جانب سے بار بار معاہدہ شکنی ہوتی رہی، جس کی سزا مختلف اوقات میں انہیں ملتی رہی۔ اس کے باوجود رات دن وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مصروف رہے۔ یہاں تک کہ غزوۂ خندق میں ناقابلِ برداشت غداریوں کے سبب انہیں عبرت ناک سزا دی گئی اور ان کی عورتوں اور بچوں بوڑھوں کو مدینہ سے نکال کر خیبر میں کردیا گیا۔ اب خیبر میں سارے جزیرہ عرب کے یہودی جمع ہوگئے اور وہاں ایک بڑی طاقت بن گئے۔

انہیں چاہیے تو یہ تھا کہ اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل کرتے، مگر وہ اسلام دشمنی میں ایسے

اندھے تھے کہ وہ ہمیشہ مشرکین عرب کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکاتے ورغلاتے اور خفیہ طور پر ان کی ہر طرح سے مدد کرتے رہے، کسی لمحہ پیغمبر کو امن وامان اور مسلمانوں کو چین لینے نہیں دیا۔ نتیجہ ۷ھ میں غزوۂ خیبر کا وہ معرکہ عظیم پیش آیا جس میں فاتح خیبر حضرت مولیٰ علی شاہ زمن باطل شکن کی بازوؤں کی طاقت کا اندازہ دنیا کو ہوا۔ حیدرِ کرار نے قلعہ کے اس دروازے کو اکھاڑ کر تنہا پھینک دیا، جسے چالیس آدمی مل کر اٹھاتے تھے۔ اسی خدائی طاقت کو دیکھ کر دنیا کو حیرت مسرت کے ساتھ چیخ کر اس حقیقت صادقہ کا اعتراف کر لینا پڑا۔

شاہِ مرداں شیرِ یزداں قوت، پروردگار لافتیٰ الاعلی لاسیف الاذوالفقار

اور پھر تو اس کے بعد آقائے کائنات حضور ﷺ نے یہودیوں کو حکماً جزیرۃ العرب سے نکال دیا کہ یہ شری اور فسادی نہ رہیں گے اور نہ فتنے رونما ہوں گے۔

عیسائی بھی اپنے خصلتِ بد میں یہودیوں ہی کی طرح ہیں، عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) معاذ اللہ ابن اللہ ہیں مگر ان کے ابن اللہ کو انہیں کے عقیدے کے مطابق یہودیوں نے قتل کر دیا۔ مگر یہ کیسے خودغرض دین فروش ہیں کہ اتنی بڑی بات اسلام دشمنی میں گول کر کے یہودیوں کے ساتھ ہو گئے۔ حالانکہ یہ جب جب صلیب کو دیکھتے، اٹھاتے، چومتے ہوں گے تو انہیں اپنے نبی کی مظلومیت اور اپنے ابن اللہ کی بے بسی اور یہودیوں کی شقاوتِ قلبی ضرور یاد آتی ہوگی۔ اسلام اور مسلمانوں سے یہ عیسائی کتنی عداوت رکھتے ہیں کہ دشمنی میں وہ اپنے پیغمبر کا قتل بھول گئے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے انہیں اسلام دشمنیوں اور فتنہ طرازیوں کی وجہ سے پیغمبر اسلام ﷺ نے حکماً فرمایا: ''اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب۔'' یہ دشمنانِ اسلام شروع ہی سے اسلام اور مسلمانوں کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑے ہوئے تھے۔ ان کے اسلام کش حرکات کا اثر اس لیے زیادہ نہیں پڑا کہ مسلم اکثریتی علاقے ہر دور میں کسی نہ کسی مرکز کے تحت رہے، چاہے وہ زمانہ بنوامیہ کا رہا ہو، یا عباسیوں کا دورِ خلافت، سلجوقیوں کا عہد نیم روز ہو یا آلِ عثمان کا ماہ نیم ماہ۔

عثمانیوں کے دورِ اقبال میں اسلام کا آفتاب تقریباً پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ دنیا کے کئی براعظموں کو اسلام کی عظمتیں احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ یہ پوری دنیا کی تاریخ میں پہلا وہ خاندان ہے جس نے ۶۴۷ برس تک بڑے جاہ و جلال کے ساتھ اپنی حکومت کی اور اسلامی کی عظمتوں کا آفتاب ساری دنیا میں چمکاتے رہے، یہ اپنے دورِ اقبال میں خاکِ حجاز کے ایسے نگہبان تھے جو ہمیشہ اس کی رفعتوں پر قربان تھے۔

چونکہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی محبّت ان کے خون میں اور دودھ میں شامل تھی۔ اور یہ ادائے محبّت انہیں ننہال سے و دادہال دونوں طرف سے وراثت میں ملی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہر اس چیز کو اسلامی آثار میں بدل دیا، جس کا کچھ بھی تعلق واسطہ یا بالواسطہ مصطفےٰ جانِ رحمت ﷺ سے تھا۔ دنیا کی تاریخ اس اندازِ محبّت پر آج تک حیران ہے کہ اپنے رسول سے محبّت کے ایسے ایسے انداز کیسے کیسے ہو گئے۔ وقت کی قلّت مانع نہ ہوتی تو میں یہاں پر اس کی کچھ جھلکیاں ضرور پیش کرتا۔ پھر خود بخود آپ کی دیدۂ حیرت چشمِ مسرت سے بدل کر رہ جاتی۔

خطبۂ استقبالیہ: القدس کانفرنس

منعقدہ ۱۲ر جمادی الاخرہ ۱۴۱۲ھ مطابق ۲۰ر دسمبر ۱۹۹۱ء بروز جمعۃ المبارک بمقام مستان تالاب ممبئی ۸۔

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

مولای صل وسلم دائمًا ابدًا　　علی حبیبك خیر الخلق کلھم

صدرِ باوقار، معزز علماء کرام، مشائخ عظام وحاضرین مجلس۔۔۔ السّلام علیکم ورحمہ

حضراتِ گرامی!

آج کی یہ عظیم الشان "القدس کانفرنس"، جس میں ہم سب شریک ہیں اسے "آل انڈیا تبلیغ سیرت" نے منعقد کیا ہے۔ "تبلیغ سیرت"، برصغیر ہند میں سوادِ اعظم اہلِ سنّت وجماعت کی ایک عظیم نمائندہ مذہبی تنظیم ہے۔ جو اس طریق پر گامزن ہے، جس کی تعلیم حضور ﷺ نے دی۔ وہ طریقِ مصطفوی جس پر صحابہ کرام واہلِ بیتِ اطہار چلے۔ علمائے ربانیین، اولیائے کاملین بالخصوص قطب الاقطاب، غوث الاغواث، سیّد الاوتاد، فرد الافراد، غوثِ صمدانی، قطب ربانی سیّدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس طریقِ پاک کی تعلیم دی۔ اور ائمہ کرام خصوصاً امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک بن انس، امام محمد بن ادریس الشافعی، امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم نے دین پر چلنے کے جو طریقے بتائے۔ شیخ ابومنصور ماتریری، قاضی عیاض، شیخ الاسلام علامہ تقی الدین سبکی، امام احمد قسطلانی، علامہ احمد زینی اور علامہ یوسف بن اسمٰعیل نبہانی قدست اسرارہم جس راہ پر چلے ان نفوسِ قدسیہ کی صراطِ مستقیم پر چلنے کی تعلیمات اور ان کے مقدس طریق کی نشر واشاعت امام احمد رضا بریلوی نے اپنی گرانقدر تصنیفات میں فرمائیں۔

امام احمد رضا علیہ الرحمۃ والرضوان نے برصغیر ہند میں ہر طرح کی بدعقیدگی کے ماحول میں اسلام کی نشر واشاعت کی۔ سوادِ اعظم اہلسنّت وجماعت کے تشخص کو اُجاگر کیا۔ عشق رسول کے بے مثال تبلیغ کی اور جابجا محبّتِ رسول کا عظیم الشان عملی مظاہرہ کیا۔ اسلام وسنّیت کی بقا ودفاع نیز عالمِ اسلام کی فلاح کے لیے مختلف موضوعات اور مختلف علوم وفنون میں عربی، اردو، فارسی زبانوں میں کم وبیش ایک ہزار کتابیں تصنیف فرمائی: "الکفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" اور "الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ"، میں آپ کی جلالت علمی دیکھ کر علمائے عرب بالخصوص مکّہ مکرمہ ومدینہ منورہ کے جلیل القدر علماء ومشائخ نے ان کے بے پناہ علم وفضل اور عبقریت کے احترام میں اپنی گردنیں جھکادیں۔ وہ ہندوستان میں فقہ حنفی اور اس کے جزئیات کے سب سے بڑے عالم اور طریقۂ قادریہ کے زبردست مبلغ اور غوث الاعظم محی الدین جیلانی کے نائب اکبر تھے۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت یہاں پر انہیں کے ماننے والوں کی جماعت ہے۔ جسے یہاں کے جلیل القدر علماء ومشائخ اہلسنّت بالخصوص مفتیٔ اعظم ہند مولانا مصطفےٰ رضا خاں اور محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی، ملک العلماء حضرت علامہ ظفر الدین بہاری وغیرہ نے ۲۴ رصفر المظفر ۱۳۶۱ھ مطابق ۱۶ / دسمبر ۱۹۴۹ء کو بریلی شریف میں عرس امام احمد رضا بریلوی کے مقدس تقریب کے موقع پر قائم کیا۔ مجاہد ملت سماحۃ الشیخ حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی متولی رؤفیہ اسٹیٹ دھام نگر، اڑیسہ کو ان کی غیر موجودگی میں ہمیشہ کے لیے اس کا صدر نامزد کیا گیا۔ ۳۲ / سال اپنی حیات کے آخری سانس تک وہ اس کے صدر رہے ۲۸ / برس تک تبلیغ سیرت کا

صدر مقام الہ آباد (یوپی) رہا۔ اپنی زندگی ہی میں آپ نے ربیع الاوّل ۱۳۹۸ھ مطابق مارچ ۱۹۷۸ء میں اس کے مرکزی دفتر کو ممبئی میں منتقل کیا۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے اغراض ومقاصد میں مساجد ومقابر، مقاماتِ مقدسہ اسلامی شریعت کی حفاظت وصیانت کے لیے پیہم جدوجہد شامل ہے چاہے وہ الہ آباد کی مسجد اعظم ہو، یا اجودھیا کی بابری مسجد، گنبد خضریٰ کا تحفظ ہو یا مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت، حرمین طیبین کے تقدس کا معاملہ ہو، یا بیت المقدس کی بازیابی، بھاگلپور، میرٹھ ملیانہ کی بربادی ہو یا فلسطینی مسلمانوں کی دربدری، امریکہ ودیگر سُپر طاقتوں کی چنگیزیت ہو یا اہلِ عراق کی مظلومیت، ہر جگہ اپنی بساط کی حد تک تبلیغ سیرت کی جدوجہد اپنی ایک انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ اندرونِ ملک وبیرون گنبد خضریٰ کی سلامتی سے لے کر حرمین طیبین کی حرمت وجلالت، اور بیت المقدس کی آزادی سے لے کر فلسطین کی واپسی تک عراق کے مقاماتِ مقدسہ سے لے کر عراق کی بے خطا جانوں کی غذا ودوا تک وہ کون سا میدان ہے جہاں پر آل انڈیا تبلیغ سیرت نے اپنی نصرت وحمایت اور اپنے اسلامی وانسانی دردمندی کا منفرد وعظیم الشان مظاہرہ نہ کیا ہو۔

حضرات گرامی! ایک سال پہلے ۶ / ستمبر ۱۹۸۹ء کے اس عظیم الشان مظاہرے کو تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جو خلیج میں امریکی مداخلت کے ردِعمل کے طور پر آل انڈیا تبلیغ سیرت نے برپا کیا تھا۔ وہ مظاہرہ شاہ فہد کی ناعاقبت اندیشی کے خلاف زبردست صدائے احتجاج تھا۔ اور پھر ۲ / اکتوبر ۱۹۹۰ء کو وہ عظیم کانفرنس جو وائی۔ ایم۔ سی میدان اگری پاڑی ممبئی میں آل انڈیا تبلیغ سیرت نے تحفظ حرمین کانفرنس کے نام سے حالات کی ناسازگاری اور ماحول میں کشیدگی کے باوجود اپنے مالۂ وماعلیہ کے اعتبار سے وہ ایک جہانِ حیرت ومسرت لیے ہوئی تھی۔

الغرض اللہ ورسول کی رضا اور حضرت غوث الاعظم کی خوشنودی ومحبّت کی خاطر عراق ومقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کے لیے تبلیغ سیرت نے جو بھی قدم اٹھایا، اسے صیہونی وامریکی گرفت میں جکڑا ہوا ذرائع ابلاغ بھی نظر انداز نہ کرسکا۔ برصغیر ہند وپاک مشرقِ وسطیٰ کے اخبارات کا ذکر ہی کیا، بی بی سی لندن سے لے کر امریکہ ویورپ کے بڑے بڑے اخبارات نے اس کے ساتھ خصوصی اعتنا کیا۔ اور پہلی بار ہندوستانی قومی پریس نے بھی حیرت انگیز طور پر اس مظاہرے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ اس وقت ان احتجاجی اقدامات کی خصوصیت اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کی حامل رہی کہ اس نے عالمِ اسلام کو

خصوصاًاور عالمِ انسانیت کو عموماًاس قضیہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔

تبلیغ سیرت کی یہ آواز پوری دنیا میں سب سے پہلی اور مؤثر آواز تھی۔ جو مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت اور حمایت حق میں برصغیر ہند سے اٹھی تھی۔ جو امریکہ کی عالمی دہشت گردی اور سعودیہ کے پیٹرو ڈالر سے بے نیاز ہو کر اٹھی تھی۔ اس جلوس و کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اسے بغداد ٹیلی ویژن اسٹیشن نے ۴ دن تک مسلسل پورے عالمِ عرب میں عربی ترجمہ کے ساتھ دکھایا۔ اور اس کی بے شمار ویڈیو کیسٹ پوری دنیا میں پھیلائی گئی، جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔

حاضرین محترم! آج کی یہ ''القدس کانفرنس'' بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ آج دنیا جس نازک دور سے گذررہی ہے اور حالیہ دنوں میں اس کے نقشہ اور جغرافیہ میں جو حیرت ناک تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ بڑی حدتک عبرت خیز ہیں۔ کل تک روس ایک بڑی طاقت تھا، جس سے امریکہ خوفزدہ تھا اور دنیا میں طاقت کا توازن برقرار تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ عر[illegible] سے غداری کے جرم میں قدرت اسے ایسی عبرت ناک سزا دے گی کہ اس کا کوہ پیکر اور ہمالیائی وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ آج عالمِ اسلام خصوصاً عرب کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا ہے، ایسا خطرہ دورِ صدیقی کے بعد عالمِ اسلام پر غالب نہیں آیا تھا کہ اس وقت اس کے دفاع اور فروغ کے لیے آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے والا کوئی ابوبکر، کوئی عمر، کو[illegible] خالد، کوئی طارق، کوئی صلاح الدین ایوبی نہیں۔ آج بادشاہ ہیں، امیر ہیں، شیخ ہیں، پاسبانِ حرم ہیں۔ شیخ بھی کیسے؟ شیخ النساء والبنات، پاسبانِ حرم بھی کیسے، مہ جبینوں، نازنینوں، گل اندامو ں، گل بدنوں کے، یہ وہ ہیں جنہیں دولت عزیز ہے۔ یہ ہیرو ہیں، یہ آئیڈیل ہیں، یہ مردِ میداں ہیں۔ مگر کس کے؟ اپنے حرم کے گل بدنان نکہت بیز کے، گل اندامان نزہت ریز کے، پورے عالمِ عرب ہی نہیں بلکہ عالمِ اسلام میں غازی ومجاہد صدام حسین کی شکل میں ایک مردِ میدان ہے بھی تو یہ اپنی جانوں کے دشمن اور غلام حکمراں اسے اور اس کے ملک عراق کو ختم کردینے کے ہی درپے ہیں۔ جس کے اندر آج بھی صیہونیت کے منہ زور گھوڑے کو لگام دینے، باطل کا پنجہ مروڑنے، امریکہ کو للکارنے، فلسطین کو آزاد کرانے، مسلمانوں کے قبلہ اوّل بیت القدس پر اسلامی پرچم لہرانے کا دم خم ہے۔ مگر یہ بندگانِ ہوا وہوس بیت القدس کیا آزاد کرائیں گے، ڈر ہے کہ کہیں حرمِ الٰہی وحرمِ مصطفائی ہی نہ اسرائیل کو دے بیٹھیں۔ ان غلام حکمرانوں نے اپنے اوپر جو امریکہ کا سحر طاری کر رکھا ہے۔ وہ امریکہ کا نہیں بلکہ اسرائیل کا ہے۔ امریکہ تو اس سحر کا میڈیا (یعنی ذریعہ) ہے۔ آج امریکہ گفتگو کے میز پر فلسطین کا حل ڈھونڈنے کے لیے عربوں و اسرائیلیوں کو ایک جگہ بیٹھا کر جس انداز میں عربوں کو ذلیل کررہا ہے، کیا اس سے بھی ابھی ان کی آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔ گفتگو میں گولان کی پہاڑی، غازہ پٹی، دریائے اردن کا کنارہ وغیرہ کا ذکر تو سننے کو ملتا ہے مگر مسجد اقصیٰ کا نہیں۔ دنیائے صیہونیت اور سرخ وسفید سامراج کو معلوم ہے کہ حرمین طیبین کی طرح بیت القدس بھی عالمِ اسلام کی امانت ہے جس کے لیے پوری دنیا کا مسلمان اس وقت تک بے چین رہے گا جب تک کہ اپنی اس عظیم امانت کو اپنی تحویل میں نہیں لے لیا۔ اور اس کے لیے آج بھی عالمِ اسلام کی نگاہیں غازی ومجاہد صدام حسین اور ان کے

جیالوں کی طرف اٹھی ہوئی ہیں۔ حالیہ امریکہ اور عراق جنگ جو جدید ترین ٹیکنالوجی اور عقیدے کا براہِ راست تصادم تھا جس میں جدید ٹیکنالوجی عارضی طور پر مورچہ جیت کر جنگ ہار چکا ہے۔ ع

"یزید مورچہ جیتا ہے جنگ ہارا ہے"

ایک طرف تو پوری دنیا کی سپر طاقتیں اوران کے جدید ترین اسلحے عراق کو تباہ و برباد اوراس کے سر براہ وغازی ومجاہد صدام حسین کو قتل کرنے نیز ایران کی خاموش مدد سے عراق کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے آئے تھے۔ مگر امریکہ اوراس کے اتحادی زبردست اندرونی بغاوتوں کے باوجود ناکام رہے اوراس پر طرہ یہ کہ ہم جنگ جیتے چکے ہیں۔ اگر امریکہ جنگ جیت ہی چکا ہے اوراپنی قہرمانی قوتوں سے عراق کو تباہ و برباد کر چکا ہے تو پھر ناکہ بندی کیوں؟ جبکہ صدام حسین از خود کویت خالی کر کے جنگ بندی کے لیے اقوام متحدہ کی تمام شرطیں بھی تسلیم کر چکے ہیں۔ تو پھر عراق کی طرف سے اب کون سا خوف امریکہ کی نیندیں حرام کیے ہوئے ہے؟

دنیا پر یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ عراق انسانی تاریخ کے اس خوفناک جنگ میں فاتح عالم ہے۔ کم از کم عراقی عوام بڑے یقین اور فخر سے یہی کہتے ہیں اوراپنے فاتحِ عالم ہونے کی مضبوط دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ ابھی حال ہی میں تبلیغ سیرت کا ایک نمائندہ وفد الحاج رشید احمد طیب جوائنٹ سکریٹری آل انڈیا تبلیغ سیرت کی قیادت میں پندرہ دن عراق رہ کر واپس آیا ہے۔ دنیا پر واضح رہے کہ اس جنگ میں امریکہ جوہری بم بھی استعمال کر چکا ہے۔ مگر عراق نے اخیر وقت تک انسانیت کو جنگ کی حالت میں بھی نہیں جانے دیا، اس لیے کہ جواب میں وہ کیمیکل اسلحہ استعمال کرسکتا تھا۔ امریکہ اوراس کے اتحادیوں اوراس کے عرب غلاموں کو اس حقیقت صادقہ کا اچھی طرح احساس تھا کہ عراق کی مقدس سرزمین ہیروشیما نہیں ہے بلکہ وہ ارضِ انبیاء ہے، ارضِ صحابہ ہے۔ مولد ابراہیم ہے، شہدا وصالحین، اولیائے کاملین بالخصوص غوث الاعظم شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی کی مقدس سرزمین ہے۔ ورنہ اتنی وحشت ناک بمباری کے نتیجہ میں بغداد کو صفحۂ ہستی سے مٹ کر ایک جھیل میں بدل جانا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود بغداد پر مسلسل بمباری کی حماقتیں کرتے رہے۔ خلیج کے اس پورے قضیے کے اندر حقیقتاً بات صرف اتنی تھی کہ امریکہ اپنی ناجائز اولاد اسرائیل کی بقا کی فکر میں ہر دم رہتا تھا۔ اسے تمام عرب ممالک میں صرف عراق سے خطرہ تھا اوراس خطرہ کو وہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کی خاطر سعودی حکمرانوں سے مل کر ایک زبردست سازش کی اور انتہائی چابک دستی سے کویت کا قضیہ کھڑا کر کے عراق کے گرد سازش کا جال بُن دیا۔ کویت اس سازش میں صرف ایک جملہ معترضہ کی حیثیت رکھتا تھا اور بس۔ اس پورے قضیے میں الِ سعود کا منفی مگر کلیدی کردار اس تاریخی دستاویز سے بھی واضح ہے۔ وھو ھٰذا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ان السلطان عبد العزیز بن عبد الرحمٰن اٰل فیصل اٰل السعود اقر واعترف الف مرة

للسربرسی کوکس مندوب برطانیا العظمٰی لا مانع عندی من اعطاء فلسطین المسکین
الیهود او غیرهم کما تراه برطانیا التی لا اخرج عن رائیها حتی تصبح الساعة۔

ازافادات تاریخ آلِ سعود، مصنفہ ناصرالسعید ناشر منشورات دارمکہ مطبوعہ ۱۴۰۴ھ

ترجمہ: میں سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آلِ فیصل آلِ سعود برطانیہ عظمٰی کے مندوب سر برسی کوکس کے لیے ایک ہزار مرتبہ اس بات کا اقرار واعتراف کرتا ہوں کہ فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ برطانیہ فلسطین کو جسے چاہے دے دے میں برطانیہ کی رائے سے صبح قیامت تک اختلاف وانحراف نہیں کرسکتا۔

یہ مسئلہ صرف عالمِ اسلام اور عرب ہی کا نہیں بلکہ پوری دنیائے انسانیت کا ہے۔ صدام حسین صرف عرب اور اسلام کے مفادات ہی کے لیے نہیں بلکہ کمزور ممالک خصوصاً ایشیا کے لیے بھی لڑ رہے تھے۔ یورپ کی بالادستی واجارہ داری کے خاتمہ کے لیے لڑ رہے تھے۔ عراق کی کمزوری پورے ایشیا کا نقصانِ عظیم ہے۔ اور امریکہ کی برتری پوری انسانیت کے لیے تحقیر وتذلیل کے مترادف ہے۔ آل انڈیا تبلیغ سیرت نے جن بنیادوں پر عراق کی حمایت کی تھی، وہ حمایت جاری رہے گی کیونکہ عراق کی سرزمین سے ہمارا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ وہیں پر کربلا ہے، وہیں بغداد ہے، وہیں پر قادسیہ ہے، وہیں پر سلمان پاک ہے، وہیں پر نجف اشرف ہے۔ اس مقدس سرزمین سے شدید جذباتی وابستگی ہمارے ایمان کا حصّہ ہے۔

جو سر دے کے ترا سودا خریدے
خدا دے عقل وہ عاقل ہے یاغوث

آل انڈیا تبلیغ سیرت غوث وخواجہ کے دیوانوں کی تنظیم ہے اور اس عظیم مجاہد اور عاشق غوث الوریٰ کی جماعت ہے۔ جس کی روح ہی یااللہ یارسول اللہ یاغوث پر نکلی ہے اس لیے اس تنظیم نے بھی اپنا سارا سرمایہ دے کر غوث الاعظم کی محبت کا سودا خریدا۔ اور راہِ محبّت میں اس نے قربانیاں دیں اور دیتی رہے گی۔ اگرچہ کم نظر اور حاسد اس کا الٹا مطلب نکالتے رہے۔ اس راہِ الفت میں بڑے صبر آزما مراحل سے بھی یہ جماعت گذری۔ غیروں سے شکوہ ہی کیا اپنوں نے بھی اس راہِ محبّت میں کلیجہ شکنی کیا۔ ؎

دشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھیے اب کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون؟

تو پہلا تیر اور پہلا پتھر اپنوں ہی کی طرف سے اس جماعت پر پڑا۔ لیکن اس پر چیخنے اور آہ کرنے کے بجائے اس درد کو آنسوؤں کے ساتھ اس التجا کو بارگاہِ غوثیت کبریٰ میں رکھ دیا گیا۔ ؎

خدارا مرہمِ خاکِ قدم دے! جگر زخمی ہے دل گھائل ہے یاغوث
ان کے راستے کی ذلّت ورسوائی پر تو ہزاروں عزتیں قربان کہ

مجھ کو رسوا بھی اگر کوئی کہے گا تو یوں ہی
کہ وہی نا وہ رضا بندۂ رسوا تیرا

آل انڈیا تبلیغ سیرت نے اب اپنے علماء کرام وائمہ مساجد اور دین پسند اور دین دار تاجروں کی تعاونِ خصوصی سے عراق اور اس کے مظلوموں کے لیے جس دیوانگیٔ شوق کا مظاہرہ ۲۹/اگست ۱۹۸۹ء کی کانفرنس سے لے کر ۲۰/دسمبر ۱۹۹۱ء کی "القدس کانفرنس" تک اللہ ورسول اور شیخ جیلاں کی رضا کے لیے کیا۔ اس کا ایک بڑا اور تاریخی دستاویز ریکارڈ فائلوں کی شکل میں بھی موجود ہے۔ جب ان کی بارگاہ سے چور تک نوازے جاسکتے ہیں تو کیا ہم لوگ چور سے بھی گئے گذرے ہیں۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ ان بے پناہ قربانیوں اور کسی حد تک رسوائیوں کے صلہ میں بارگاہِ غوثیت مآب سے فیض وعطا کی قسطیں شروع ہوچکی ہیں اور سوادِ اعظم اہلسنّت وجماعت کے جس عظیم اجتماعی مقاصد کے لیے یہ اہم قدم اٹھایا گیا تھا، اس کی ایک جھلک پروٹوکول کی شکل میں ۴/دسمبر ۱۹۹۱ء کے اسی علماء کی میٹنگ میں پیش کر چکے ہیں۔ جس پر ہمارے علماء ائمہ نے بے پناہ مسرت واطمینان واعتماد کا اظہار داد وتحسین کی صورت میں فرمایا۔ اور اس وسیع وعریض اسٹیج اور دائیں و بائیں کرسیوں پر علماء ومشائخ کا یہ عظیم اژدہام ہمارے خلوص پر اعتماد کا عملی مظاہرہ ہے۔ فللحمد للہ۔

گدائے آمد اے سلطاں بامید کرم نالاں
تہی داماں مگر دانم اختنی یارسول اللہ

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

☑☑☑☑☑☑

تحقیقی مقالات

عربی مدارس اور جدید عصری تقاضے

الاهداء

سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی بلند قامت، نمایاں اور قابلِ احترام علمی شخصیت رئیس الاتقیا، شیخ الاساتذہ، استاذ الفقہاء، سند المحققین، بدر العلما حضرت علّامہ مفتی شاہ **بدرُ الدین احمد قادری رضوی** خلیفۂ اجل قطبِ عالم، نائب غوثِ اعظم حضور مفتیٔ اعظم ہند بریلوی علیہما الرحمۃ الرضوان کی روحِ مقدس کی بارگاہ میں میری یہ قلمی کاوش بطورِ عقیدت نذر ہے۔ کہ جنہوں نے صرف اور صرف ایڈ والحاق کی وجہ سے شمالی مشرقی ہند کی مرکزی درسگاہ (جسے خود انہوں نے اپنے خونِ جگر سے شہرت و نیک نامی کا آسمان بنا دیا تھا۔) اسے اور اس درسگاہ کی سب سے قیمتی منصب اور اعزاز کی سب سے بڑی مسند کو خالصاً اللہ و رسول جل و اعلےٰ وصلی المولیٰ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے چھوڑ کر اسی سے قریب حضور شعیبُ الاولیاء کی روحانی قلمرو اور انہیں کے فیضانِ ولایت کے ایک ایسے شاہکار ادارے (**مدرسہ غوثیہ فیض العلوم**، بڑھیا پوسٹ کھنڈسری بازار، ضلع سدھارتھ نگر یوپی) میں تشریف لے آئے جو ایڈ والحاق کی آلودگیوں سے پاک وصاف ہے۔

علامہ بدر الدین احمد قادری جنہوں نے مسلسل چوالیس سال تک خدمت علمِ دین و خدمت درس و تدریس فرمائی۔ جس کی زندگی **الحب فی اللہ و البغض فی اللہ** کی عملی تفسیر رہی۔ جو زندگی بھر شریعتِ مطہرہ کی ننگی تلوار رہا۔ جس کے احتسابِ شرعی سے اچھے اچھوں کا زہرآب تھا۔ جس نے عصرِ حاضر کے فقیہہ ملّت و فقیہانِ ملّت کو تفقہہ فی الدین کا شعور اور درس و تدریس کی آگہی بخشی اور مسند نشینانِ افتاء کو فتویٰ نویسی کی بصیرت عطا فرمائی۔

جس نے اہلِ تصنیف کے ہاتھوں کو قلم پکڑنے کا سلیقہ بتایا۔ اور علی العموم درسی کتابوں کی تصنیف و تالیف کو اپنا مقصد زندگی بنایا۔ جس کی تقویٰ و پرہیزگاری کا شہرہ اور جس کے عشق و اخلاص اور تصلب فی الدین کی دھوم تھی۔ اعلیٰ حضرت امامِ اہلِ سنّت شہید محبت کے پاکیزہ مسلک حبّ رسول کی تبلیغ جس کا مشن! اور اسی مسلک محبت کی اشاعت جس کی زندگی تھی! برصغیر ہند میں جو امام احمد رضا بریلوی پر اپنے زمانے کا سب سے بڑا اتھارٹی تھا۔ جس کے عشق و اخلاص کی خوشبو سے ایک عالم مشکبو ہوا۔

جو زندگی بھر قطبِ ربّانی، محبوبِ سبحانی، محی الدین جیلانی سیّدنا غوث الاعظم دستگیر و معینِ بے کساں، خواجۂ خواجگاں، عطائے رسول سلطان الہند اور ان کے نائب اکبر اعلیٰ حضرت امامِ عشق و محبت سیّدنا امام احمد رضا بریلوی کی محبت کا بیمار رہا۔ اور اسی مرضِ محبت میں اس کا تارِ نفس[1] بھی ٹوٹا۔ ع

---

[1] جمعہ ۷ / رمضان المبارک بعد نماز مغرب ۱۴۱۲ھ مطابق ۱۳ / مارچ ۱۹۹۲ء کو وہ آفتابِ فضل و کمال ممبئی میں غروب ہو کر یوپی کے ضلع سدھارتھ نگر کے مشہور گاؤں بڑھیا میں مدرسہ غوثیہ و مسجد غوثیہ کے درمیان لب روڈ وہ آسودۂ خاک ہوا۔

زبردست خراجِ عقیدت کے طور پر اہل مدرسہ غوثیہ بڑھیا نے ۲۷ / شوال المکرم ۱۴۱۵ھ مطابق ۲۹ / مارچ ۱۹۹۵ء کو بعد نمازِ عصر علماء و مشائخ کے مقدس ہاتھوں سے ان کے عظیم الشان مزار شریف کی تعمیر کا سنگِ بنیاد رکھ دیا ہے۔ فالحمد للہ رب العالمین!

محمد وارث جمال قادری

ابتدائیہ

اثر کرے نہ کرے سُن لے تو میری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

اس کا مسودہ جب تیار ہوا تو حسنِ اتفاق کہیے ممبئی میں میرے آفس (واقع یوپی اسٹیل مارٹ دوٹانکی ممبئی نمبر ۴۔فون: ۳۸۶۷۰۴۵) میں میرے مخلص دیرینہ کرم گستر و کرم فرما مکرم و محترم محتشم خطیب الہند حضرت علامہ مولانا غلام غوث علوی مدظلہ العالی شیخ الحدیث دار العلوم مسکینیہ دھوراجی روایت دیرینہ کے مطابق اپنے سدا بہار و دلنواز مسکراہٹوں، عالمانہ جاہ وشکوہ اور مثالی وجاہت کی تمام تر دلآویزیوں کے ساتھ تشریف لائے۔ زیرِ نظر کتاب کے چند پیراگراف ملاحظہ فرما کر پھڑک اٹھے۔ اور فرمایا مولانا یہ کام تو ہم جیسے درسگاہی لوگوں کا تھا۔ جسے آپ اپنے ملاقاتیوں اور کاروباری مصروفیتوں کے دوران انجام دے رہے ہیں۔ بے شک مولا عزوجل کا بے پایاں کرم واحسان ہے، جو ایسے ماحول میں بھی مسلسل آپ سے دینی خدمات لے رہا ہے۔ اور ہمہ جہت مصروفیات کے عالم میں یہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ صرف آپ کا ہی حصہ ہے۔ آپ کے مرشد برحق حضور شعیب الاولیا کا فیضانِ خصوصی آپ پر سایہ گستر ہے۔ اور انہیں کے فیض وعطا کا اُجالا ہے، جو آپ کے گرد پھیلا ہوا ہے۔

بے شک یہ سب انہیں کا کرم ہے اپنا حال تو یہ ہے کہ ؎

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

محترم مولانا غلام غوث علوی اس مقدس روحانی خانوادے کے ایک نمایاں وممتاز فرد ہیں، جس کی وسیع تر روحانی عملداری میں ہم، ہمارا گھر، ہمارا خاندان، ہمارا گاؤں، ہمارا مسلم اکثریت پر مشتمل علاقہ بھی آتا ہے۔ یعنی خانوادۂ حضور شعیب الاولیاء[1] براؤں شریف جن کی مقدس چوکھٹ سے وابستگی ہی میری ابدی سعادت اور میرے سرفرازی کا باعث ہے

بک گئے جس کے ہاتھوں بک ہی گئے — یہ نہیں ہے تو رسمِ بیعت کیا

آستانۂ شعیب الاولیا سے وابستگی کے علاوہ ہمارے اور مولانا علوی صاحب مدظلہ العالی میں ایک قدرِ مشترک بھی ہے جو ہماری ذہنی ہم آہنگی کا ایک سبب ہے اور وہ ہے حق پسندی اور منہ درمنہ جرأتِ اظہار کا حوصلہ بلند! ضمیر کی آزادی اور عزتِ نفس کا احترام! بے شک یہ ہم دونوں کا قدرِ مشترک ہے اور اسی لیے ؎

---

[1] شیخ المشائخ حضور شعیب الاولیاء حضرت مولانا صوفی شاہ محمد یار علی قدس سرہٗ العزیز کی حیات وخدمات اور کارناموں پر مشتمل میری ایک کتاب بطور خراجِ عقیدت ”شعیب الاولیا ایک ہمہ گیر شخصیت“ بھی اسی کتاب کے ساتھ تکمیل پا چکی ہے۔ نظر ثانی وقدرے اضافے کے ساتھ بہت جلد وہ منظر عام پر آئے گی۔ محمد وارث جمال قادری یار علوی

اپنے بھی خفا ہم سے ہیں بیگانے بھی ناراض
ہم زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکے قند

مجھے بے پناہ مسرت ہے کہ یہ کتاب مولانا موصوف کی سعی و جہد سے دار العلوم فیض الرحمٰن جونا گڑھ کے زیر اہتمام شائع ہورہی ہے۔ یہ مسرت دوآتشہ اس لیے بھی ہوگئی کہ اپنے موضوع کی یہ منفرد کتاب ایک ایسے ادارے کے اہتمام میں شائع ہورہی ہے جو اپنی کمیت، کیفیت، نوعیت میں دینی اداروں کی بھیڑ میں بہت منفرد ہے۔ اور بے شک اس طرح کی کتابوں کی اشاعت کا حق اسی طرح کے ادارے کو ہونا بھی چاہیے۔

قابلِ صد مبارکباد ہیں دار العلوم فیض الرحمٰن جونا گڑھ کے مہتمم اور اس کے باہمت و باہوش اراکین جنہوں نے تیزی سے بدلتے حالات کی سنگینی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، نوشتۂ دیوار پڑھنے میں زیادہ تاخیر نہیں کی اور بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ وقت کی رگوں پر انگلی رکھ دی۔ اور دینی اداروں کے لیے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کردی۔ اور اپنے عمل سے بتا دیا۔ ؎

مشکلے نیست کہ آساں نشود — مرد باید کہ ہراساں نشود

علامہ غلام غوث علوی کی محررہ مکتوب 95-3-9 کے مطابق دار العلوم فیض الرحمٰن جونا گڑھ ایک ایسا ادارہ جس میں دینی تعلیم کے ساتھ عصری تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

یعنی دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم اور حکومتِ وقت سے منظور شدہ، ٹیکنیکل کا معقول انتظام ہے۔

مولیٰ عزوجل اس ادارے کو روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی طرف سے شکریے، مبارکباد اور خصوصی دعاؤں کے مستحق ہیں۔ اس ادارے کے راحِ رواں حضرت مولانا مجددی اور ان کے باحوصلہ رفقاء و معاونین و اراکین!

ہمیں قطعاً خوش فہمی نہیں کہ یہ کتاب دینی اداروں بالخصوص الحاقی اداروں میں بے چینی پیدا کردے گی۔ اور وہ اپنے موجودہ کوتاہیوں پر نظر ثانی کے لیے تیار ہوجائیں گے!

البتہ وہ دینی ادارے جو اس دیوارِ قہقہہ کے لیے رشوت کے لمبے لمبے لفافوں کے ساتھ طویل قطار میں ایڑیاں اٹھائے کھڑے ہیں! شاید ان میں کے کچھ کے قدم رک جائیں دینی علوم کے مقدس نصب العین کی حرمتوں کا احترام کرلیں! اور اس کی بھی امید ہے کہ مولیٰ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔ بات دل سے نکلی دل پر مار کرسکتی ہے۔ شانِ کریمی کرم کردے اور کچھ بڑے الحاقی اداروں کی بڑی بڑی پیشانیاں عرقِ انفعال سے تربتر ہوجائیں اور شانِ کریمی بڑھ کر اسے اپنے دامنِ رحمت میں لے لے۔ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے گرے جو میرے عرقِ انفعال کے

رَبَّنَا ظَلَمۡنَا أنفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونَنَّ من الخاسرین۔

مَولای صل وسلم دائما ابدا

علی حبیبك خیر الخلق کلهم

محمد وارث جمال قادری

۷ ربیع النور ۱۴۱۵ھ دوشنبہ مبارکہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مولای صلِّ وسلم دَائِمًا ابدًا

علی حبیبك خیر الخلق کُلِّھِم

یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر گاہے گاہے کسی نہ کسی گوشے سے آواز اٹھتی رہی ہے۔ مگر آج تک اس کی سنگینی کو کما حقہ محسوس نہیں کیا گیا۔ ماضی میں اس کے لیے چند جزوی کوششیں ضرور ہوئیں مگر عملاً اس کے کوئی خاص اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ جس طرح تالاب میں کچھ کنکر پھینکنے کے بعد چند بلبلے اس کے بعد پھر اس سکون! یا جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر گاڑی آنے کے وقت تھوڑی سی ہلچل اور کچھ ہلکے سے خوسگوار ہنگامے اور اس کے گذر جانے کے بعد پھر وہی سکوت مضمحل!

جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکوت مضمحل گاڑی گذر جانے کے بعد

ضرورت ہے کہ عربی مدارس کے اربابِ بست و کشاد نوشتۂ دیوار پڑھیں، تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کا بغور جائزہ لیں اور وقت کی آواز سنیں اور اس پر انشراحِ صدر کے ساتھ لبیک کہیں۔ اور صدیوں سے چلے آئے عربی نصابِ تعلیم کو جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کریں۔

جگا جگا کے تمہیں تھک چکے ہیں ہنگامے نشاطِ لذتِ خواب گراں بدل ڈالو
غلط روی سے منازل کا بُعد بڑھتا ہے مسافرو رہِ کارواں بدل ڈالو

اسلام ہی ایک ایسا مذہب مہذب ہے جس نے ہر حال میں حصولِ علم کے لیے بڑا زور دیا ہے۔ ناسازگار ماحول میں بھی اس کے لیے اقدام کیے ہیں اور تحصیلِ علم کے لیے بڑی زبردست تلقین فرمائی ہے۔ یہاں تک کہ مسلمان مردوں و عورتوں پر فرض قرار دے دیا ہے طلب العلم فریضة علی کل مسلم۔ آغوشِ مادر سے لے کر قبر میں جانے تک اس کے لیے تلقین کی ہے۔ یعنی اطلبوا العلم من المھد الی الاحد۔ اور صرف دینی علوم ہی نہیں بلکہ ہر وہ علم وفن جس سے خدا کی مخلوق کا بھلا ہو۔ اور جس کے ذریعہ انسانیت کی تعمیر کی جا سکے۔ اس کے لیے بھی تاکید ہے حدیث پاک ہے اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ علم حاصل کرو چاہے اس کے لیے تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

حد یہ کہ اسلام اپنے دورِ آغاز میں جبکہ وہ انتہائی غربت، تنگ دستی، کسمپرسی اور سخت ترین معاشی ناہمواریوں سے گذر رہا

تھا۔ ایسے عالم میں حصولِ علم کے لیے اس نے جو اقدام کیے ہیں وہ بڑا حیران کن ہے۔
اسلام و کفر کی پہلی جنگ عظیم جو اپنی نوعیت، کمیت، کیفیت اور انفرادیت کے سبب تاریخ ضرب و حرف میں جہانِ حیرت ہے۔ گویا چیونٹیوں نے ہاتھیوں کو پچھاڑا۔ اور سوئیوں کے نوکوں سے پہاڑوں کو زیر و زبر کیا گیا ہے یعنی جنگِ بدر ۱۷ رمضان المبارک ۲ھ میں بھوکوں پیاسوں رہ کر لڑی گئی تھی۔ فاتح بدرِ حسنین نے اپنے مٹھی بھر جانثاروں کی بڑی بے سرو سامانی کے عالم میں بہ نفسِ نفیس جس کی قیادت فرمائی تھی۔ آج بھی ماہرین حرب و ضرب اس انہونی پر حیران ہیں۔ اسلام و کفر کی اس پہلی جنگ عظیم میں جب بڑے بڑے صنادید عرب گرفتار ہو کر جنگی قیدی کی حیثیت سے لائے گئے تو کافی غور و فکر اور بڑے بڑے اصحاب الرائے کے مشورہ کے بعد طے یہ پایا کہ جنگی قیدیوں کو تاوانِ جنگ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے۔ انہیں چھوڑ دینے میں جہاں اور بہت ساری مصلحتیں تھیں وہیں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ انتہائی کمزور گرتی پڑتی لڑکھڑاتی اسلامی معیشت اور مسلمانوں کی بے پناہ غربت کو کچھ سہارا مل جائے گا۔ مگر ایسے نازک ترین اور سخت ایام میں اسلام نے تعلیم کو اتنی بنیادی اہمیت دی کہ ان گرفتار شدہ قیدیوں میں جو اہلِ علم تھے، ان کا کوئی زرِ فدیہ نہیں لیا گیا۔ بلکہ ان کی جاں بخشی کی یہ شرط رکھی گئی کہ ان میں سے ہر ایک دو مسلمانوں کو لکھا پڑھا دیں یہی ان کا تاوانِ جنگ ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔
گویا اسلام نے اپنے دورِ آغاز ہی سے (جو سخت ترین ابتلا کا دور تھا) تعلیم کو روزی روٹی، کپڑے اور مکان پر ترجیح دی۔ اور اس کے نزدیک تمام بنیادی ضرورتوں میں سے بڑی بنیادی ضرورت حصولِ علم ہے۔
خود بابِ مدینۃ العلم مولائے کائنات علی شیر خدا فرماتے ہیں ۔

رضینا قسمۃ الجبار فینا   لنا علم وللجهال مال
فان المال لیفنی عنقریب   وان العلم باقی لایزال

ہم اللہ جل جلالہ کے اس تقسیم پر راضی ہیں کہ اس نے ہمیں مال دیا اور جاہلوں کو دولت دی۔ بے شک مال و دولت ایک فانی چیز ہے۔ جبکہ علم ایک ایسی دولت ہے، جس کے لیے کبھی زوال ہی نہیں۔
بے شک قرونِ اولیٰ سے لے کر ہر اس عہد اور اس زمانے میں جہاں سیاسی اقتدار میں اسلام کار فرما تھا۔ اس کے لیے بڑے پُرخلوص و مؤثر کوششیں ہوئیں۔ جس کے بڑے مثبت نتائج بھی ظاہر ہوئے۔
دینی و مذہبی تعلیم کے ساتھ اسلام نے عصری علوم و فنون کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی عصری علوم کی نفی کی۔ یہ تو بُرا ہو مغربی استعمار کا کہ اس نے حاملین دین متین علماء ربانین کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ عصری علوم سے الگ تھلگ کر دیا جس طرح اس نے دین کو سیاست سے جدا کر دیا۔ ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' اسلام دشمن طاقتیں بالخصوص مغربی استعمار اسلامی عبادات سے نہیں بلکہ اسلامی سیاست و اسلامی اقتدار سے خوف زدہ تھیں اور ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان صرف اسلامی عبادات تک ہی محدود رہیں، وہ صرف نمازوں و روزوں ہی میں مصروف رہیں۔ نکاح و طلاق، عبادت و ریاضت، طہارت و نجاست کے مسائل ہی تک محدود رہیں کہ ان سے ان کا کچھ نقصان نہیں۔ زندگی کی دوڑ، تعمیر و ترقی و

جدید ٹیکنالوجی سے یہ جتنا ہی زیادہ دور رہیں گے ہمارے مفاد کے لیے اتنا ہی زیادہ سودمند ہوں گے تا کہ ہم بڑی آسانی کے ساتھ ان کے پٹرول کے چشموں، تیل کے کنوؤں پر ہمارا قبضہ اور اپنی مصنوعات کے لیے ان کی مارکیٹ پر ہماری اجارہ داری برقرار رہے۔

انہوں نے مسلمانوں بڑی مہارت وفنکارانہ چابکدستی کے ساتھ اپنی تہذیب، اپنا تمدن اور اپنا نظامِ حیات مسلّط کردیا۔ اور انہیں سمجھا دیا کہ یہی سب سے اچھی تہذیب، سب سے اچھا تمدن اور یہی اصل زندگی ہے۔ جبکہ اسلامی تعلیمات، اس کے اصول وقوانین پر عمل پیرا ہونے میں سوائے فرسودگی و پسماندگی کے کچھ نہیں۔ (معاذ اللہ) البتہ عبادات کی حدتک اسلام بڑا ہی اچھا مذہب ہے۔ لیکن زندگی کے ہر شعبے میں وہ ناقابلِ عمل ہے۔ ان ظالموں کے نزدیک اسلام اور حاکمیت، اسلام اور سیاسی اقتدار، اسلام اور احکامِ اسلام کے تنفیذ کی قوت یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

حالانکہ اصلاحِ معاشرہ، تہذیب کی آراستگی اور تمدن کی پاکیزگی کے لیے چاہے جتنے اچھے قوانین بنا دیے جائیں۔ بہترین سے بہترین اصول وضوابط وضع کر دیے جائیں، مگر تنفیذ کی قوت کے بغیر ان کا کوئی خاص حاصل نہیں۔

آقائے کائنات حضور محمد عربی ﷺ نے دعوت وتبلیغ کے ساتھ ہی ساتھ عملی زندگی میں احکامِ اسلام کے نفوذ کی جدوجہد بھی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اسلامی حکومت تشکیل دی۔ جسے آپ کے بعد آپ کے خلفاء وعمال اسی اسلامی حکومت کے بدولت احکامِ اسلام کو مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کرتے رہے۔ خلفائے راشدین کے بعد جس بھی عہد میں سیاسی اقتدار میں اسلام کارفرمار ہا۔ کلی طور پر نہ سہی احکام اسلام کی تنفیذ علی العموم ہوتی رہی۔

چنانچہ وہ دشمنانِ دین وایمان نے اسلام کو سیاست سے جس طرح الگ تھلگ کردیا۔ ٹھیک انہیں خطوط پر حاملین نبوت کو عصری علوم اور اس کے جدید تقاضوں سے الگ تھلگ کردیا۔

حالانکہ عصری علوم پر جب تک دین کی گرفت مضبوط رہتی ہے اسے گمراہ نہیں ہونے دیتی اور جہاں دینی گرفت سے وہ آزاد ہوئی ہے بے دینی وگمرہی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور پھر اگر دین کے عمل دخل کو زندگی سے نکال دیا جائے تو پھر باقی ہی کیا بچا؟ ایک طرف اگر حاملین علوم جدیدہ نے دینی شعور وآگہی سے نفی کی بنیاد پر دین سے اپنا منہ موڑ لیا۔ تو دوسری طرف کتاب وسنّت اور فکر اسلامی کے ذمہ داروں نے بھی وقت کے تقاضوں سے گریز کیا اور زندگی کے ہر آن بدلتے ہوئے حالات سے آنکھیں بند کرلیں۔ وقت کے چکاچوندا جالوں کا سامنا نہیں کر سکے اور اپنی دون ہمتی کے سبب اسے یہ بھی احساس نہیں رہ گیا کہ اپنے اس عمل اور افسوسناک تغافل سے ہم نے کیا کھویا۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے فکر کی بحروں میں اضطراب نہیں

دینی وعصری علوم کے درمیان مغربی استعمار اور اس کے مقامی حواریوں نے اتنی اونچی دیوار کھڑی کردی کہ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے کہ ادھر کیا ہو رہا ہے۔ اس مصنوعی اور مضرت رساں تقسیم پر ہمارا ردعمل بھی

مثبت نہیں رہ گیا۔

عیسائی کوششیں اپنے اس مقصد میں بہت کامیاب رہیں کہ مسلمان ان علوم وفنون کو ہاتھ نہ لگائیں، جو عیسائیوں سے منسوب ہوں۔ اور نہ ہی ان چیزوں کی طرف اعتناء کریں، جو دیارِ مغرب میں فروغ پائی ہوں، اگر چہ وہ تعمیری ہی کیوں نہ ہوں۔ اور ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہم محسوس طور پر ان کی اس سازش کے شکار ہو گئے۔ جبکہ ایک طرف اہلِ مغرب کشادہ دلی نہیں انتہائی ہوش مندی کے ساتھ ذہن عربی وفکر اسلامی کو اپنی جدید تحقیق وجستجو کا اساس بنایا جس میں وہ بہت کامیاب رہے۔ یا جرتاً و یا حسرتاً!

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مشہور صحافی و کالم نگار جناب سیّد حامد صاحب نے اسی حساس موضوع پر اپنی بے چینیوں کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

اسلام کی تعلیمات اور قرونِ اولیٰ میں اس کے تجربات یہ بتاتے ہیں کہ اس نے تحقیق وجستجو کو فروغ دیا۔ علوم کی بازیابی کی اور ان میں گراں قدر اضافہ کیا۔ تہذیب پر اس کا یہ ایک بڑا احسان ہے۔ مسلمانوں کا زوال وہیں سے شروع ہوا، جب انہوں نے علوم سے (جو زندگی کے ترجمان ہوتے) ناطہ توڑ لیا۔ اور دینی تعلیم کو اس کے وسیع قلمرو سے ہٹا کر قلعہ میں بند کر دیا۔ اب نوبت یہ آ گئی ہے کہ ہم اپنے دین کو دنیا کے سامنے نہیں پیش کر سکتے۔ ہم نے اسے گوشۂ تنہائی میں بٹھا دیا ہے۔ چشمۂ خیر اور مخزنِ نور کے اطراف ہم نے بند باندھ دیے ہیں۔ یورشوں سے گھبرا کر ہم قلعہ بند ہو گئے ہیں۔ ایسی صورت میں دین کی صحیح ترجمانی کون کرے گا؟ دعوت کا کٹھن کام کون انجام دے گا؟ علوم کے بحر ذخار سے خائف ہو کر جو لوگ کنارے کھڑے ہو کر نظارہ کر رہے ہیں، ساحل نے جن کے ہاتھ پکڑ لیے ہیں۔ وہ زندگی کی موجوں سے ٹکرانے اور ان پر قابو پانے کی تعلیم کیونکر دے سکیں گے؟

ہمیں بہرحال دنیا کو دین کے قریب لانا ہے۔ اس کے پہلو میں بٹھانا ہے۔ علم کی دنیا سے دوئی کو مٹانا ہے۔ یہ فیصلہ ہمیں کرنا چاہیے، جرأت وبصیرت کے ساتھ! مدرسوں میں جا کر دیکھیے جدید علوم کی پیاس آپ طلبہ کے چہروں پر لکھی ہوئی دیکھیں، طلبہ آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ کہیں گے کہ آپ کی بات سنی جاتی ہے۔ اب نئے مضامین کو داخلِ نصاب کیوں نہیں کراتے۔ (روزنامہ انقلاب ممبئی ۱۴ اراگست ۱۹۹۴ء)

مذکورہ بالا بے رحم حقائق کے پیشِ نظر اب یہ ضروری ہو گیا کہ اسلامی درسگاہیں نئے سرے اور نئے زاویے سے اپنا جائزہ لیں۔ دینی طلبہ کے اندر جدید عصری علوم کے مقابلے میں جو مرعوبیت واحساسِ کمتری پیدا ہو چکی ہے، اسے کلّی طور پر ضائع کرنے کی کوشش اور اس کے لیے پُرخلوص جدوجہد کریں۔ اس لیے کہ کسی قوم کی ترقی، سرفرازی، سربلندی، تہذیبی ارتقاء اور آبرومندانہ بقا منحصر ہے۔

صحیح تعلیم:۔ صحیح تعلیم سے مراد یہاں نصابِ تعلیم کی موزونیت اور نصب العین کی بلندی ہے۔

کسی بھی علم کے لیے دو چیزیں بنیادی اینٹ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

نصب العین اور نصابِ تعلیم:۔نصابِ تعلیم اپنے نصب العین کے تابع ہوتا۔نصب العین ہی کے پیشِ نظر تعلیم کی نظر کی جاتی ہے۔اور یہ حقیقت بھی اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ نظامِ تعلیم بھی اپنی ایک روح وضمیر رکھتا ہے۔اور یہ روح وضمیر اس کے واضعین ومرتبین اور اس کے نظر وضبط کرنے والوں کے عقائد ونظریات، اخلاق ونفسیات کا عکس وپرتو ہوتا ہے۔جو اس مرحلۂ شوق سے گذرنے والوں کو ایک مستقل روح وضمیر، ذہن ونظریہ عطا کرتا ہے۔لہٰذا کسی بھی نصابِ تعلیم کی تدوین کے وقت اس امر کا بطورِ خاص خیال رکھا جائے۔

علم کوئی بھی اس کے لیے دو چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ایک نصب العین اور دوسرا نصابِ تعلیم۔نصابِ تعلیم اپنے نصب العین کے تابع ہوتا ہے۔نصب العین کے پیشِ نظر تعلیم کی نظر وضبط کی جاتی ہے۔

یہ نصب العین اور نصابِ تعلیم ہی کی دین ہے کہ اہلِ مغرب سے اپنی گردنیں چھڑا لینے کے باوجود ہمارے دل و دماغ، عقل وشعور، فکر ونظر پر انہیں کا قبضہ ہے۔انہوں نے ایک گردن آزاد کر کے ہم سے سب کچھ لے لیا۔

میخانۂ یورپ کے انداز نرالے ہیں
دیتے ہیں سرور اول لاتے ہیں شراب آخر

حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے اقوامِ عالم بالخصوص عالمِ اسلام کی گردنوں کو آزاد کیا۔تو انہیں یوں ہی آزاد رہنے نہیں دیا، بلکہ اس کے لیے انہوں نے بہت پہلے منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔اور ہماری حکومت کی طرح ان کا کوئی اہم منصوبہ پنج سالہ نہیں ہوتا تھا، بلکہ معاملے نوعیت واہمیت کے پیشِ نظر سو سالہ و دو سو سالہ ہوتا ہے۔وہ بہت پہلے سے پیش بندی کرتے ہیں، کہ غیر محسوس طور پر ان کے دامِ فرنگ میں پھنس جانا یقینی ہو جاتا ہے۔مغربی استعمار نے اپنے دورِ اقتدار میں یہ محسوس کر لیا تھا، پوری دنیا بالخصوص عالمِ اسلام کو زیادہ دنوں غلام نہیں رکھا جا سکتا۔چنانچہ وقت سے بہت پہلے انہوں نے منصوبہ بندی کر لی تھی کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یہ ہماری غلامی سے نہ نکل سکیں۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔آزادی حاصل کرنے کے بعد آج بھی دنیا خاص کر عالمِ اسلام ان کے جال سے باہر نہیں نکل سکا۔پورا برِّصغیر، مشرقِ وسطیٰ، براعظم افریقہ بالخصوص تمام عالمِ اسلام کے منظرنامے پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں کہ کس طرح ان کے غلام ہی ہر جگہ حکمراں نظر آ رہے ہیں۔(اِلّا ماشاءاللہ) پہلے وہ براہِ راست ہماری گردنوں پر مسلّط تھے اور اب اپنے غلام حکمرانوں کے ذریعے ہمارے گردنوں پر سوار ہیں۔دور نہ جائیے اپنے پڑوس میں اس مملکت خداداد (پاکستان) کو دیکھ لیجیے، جو معرضِ وجود میں آیا تھا زمین کے ایک ٹکڑے پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی کے نام پر

صفحہ نمبر ۱۹ اور ۲۰ سادہ ہے۔

پھر آگے چل کر ذرا کھل کر اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

اس کے بعد ڈاکٹر اقبال جو اس تجربے کی بھٹی سے گذر چکے تھے، انہوں نے اس خوفناک حقیقت کو پوری سنجیدگی و متانت سے پیش کرتے ہوئے فرمایا ہے۔ ؎

مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی!
کہ ازوے روح قومے می تواں کشت

یہ نصابِ تعلیم کس طرح قلب ماہیت کر دیتی ہے۔ اسے دوسری جگہ وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو اسے چاہے جدھر پھیر
تعلیم میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب!
سونے کا ہمالہ ہے تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

ڈاکٹر صاحب مغرب کے اس نصابِ تعلیم کو اسلام کے خلاف ایک سازش قرار دیتے ہیں۔ ان کی شہادت اس لیے بھی زیادہ سندِ اعتبار رکھتی ہے کہ وہ اس آتشِ نمرود سے بفضلِ الٰہی بڑی سلامتی کے ساتھ گذر گئے ہیں۔ ؎

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

نصابِ تعلیم اور نصب العین پر اس اجمالی گفتگو کے بعد اس کی اہمیت اور بہت زیادہ واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ اسلام کے آفاقی پیغام اور اس کی تعلیم کو عالمی سطح پر عام کرنے نیز اسلام کے دفاع، اہلِ اسلام کی صیانت، اس کے فیضان اور ابدی حقیقتوں کو موثر طور پر پہنچانے کے لیے اپنے عربی دانش کدوں و دینی اداروں کے نصابِ تعلیم و تعلم اور علمی نظم و ضبط پر بڑی باریک بینی و جگر سوزی کے ساتھ نظرِ ثانی کرنی ہوگی تا کہ ان درسگاہوں سے اکتسابِ فیض کرنے والے خوش نصیب افراد دین کے خادم و مبلغ کی حیثیت سے عصرِ حاضر کے اُجالوں میں قدم رکھیں تو ان کی آنکھیں اس کی تمازت سے چکا چوند نہ ہو سکیں۔ وہ کسی احساسِ کمتری و محرومی کے شکار نہ ہوں بلکہ خود شناسی و خود اعتمادی ان کے پاس ہو، علم و ادب اور زبان کا سرمایہ ان کے سینے و پشت کو مضبوط کیے ہو۔

چونکہ تناسب آبادی کے اعتبار سے عربی دانش کدے و دینی ادارے علی العموم زیادہ تر برّ صغیر ہند و پاک ہی میں ہیں اس لیے صحیح طور عالمی سطح پر بھی دعوت و ارشاد، تبلیغ و موعظت، اصلاحِ عقائد و اعمال، اصلاحِ معاشرہ، صیانت دین و ایمان کی حقیقی ذمہ داریاں بھی انہیں عربی دانش کدوں اور دینی اداروں کے سر زیادہ ہیں۔ لہٰذا بدلے ہوئے حالات اور عصری تقاضوں کے پیشِ نظر ہماری ان مقدس درسگاہوں کو اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل کے لیے نئے سرے سے نئی صف بندی کرنی ہوگی۔ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہ عصر حاضر کی دینی ضرورت بھی!

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی قوم کی سرفرازی و سربلندی کے لیے بنیادی عنصر صحیح تعلیم ہے، اور صحیح تعلیم کا انحصار صحیح

نصب العین اور صحیح نصابِ تعلیم پر ہے۔

یعنی نصابِ تعلیم موزوں اور وقت کے تقاضے کے مطابق ہو۔ فی زمانہ عمر یعنی پیمانۂ حیات بھی نظروں میں رہے۔ نصاب میں شامل فی زمانہ غیر ضروری کتابیں جو تضیع اوقات کے مترادف ہیں ان سے نجات حاصل کریں۔ معقولات میں بھی بہت سارے مضامین جو رطب و یابس ہی ہیں ان سے نصابِ تعلیم کے بوجھ کو کم کیا جائے، بخارات، زلزلے، انفجار عیون، قوس و قزح کی رنگینی کے زمانے لد چکے ہیں (کہ انسان اب پانی میں مچھلی اور زمین کے بہت اندر پہنچ چکا ہے۔ فضاؤں میں پرندوں سے زیادہ صاحبِ پرواز اور بلندی میں چاند کو پامال کر چکا ہے) طریقۂ تعلیم مادری زبان بھی ہو بلکہ زیادہ تر مادری زبان ہی ہو۔ جس پر ہم آگے بحث کریں۔ ابتدائی و بنیادی تعلیم کے لیے مادری زبان لازمی قرار دے دی جائے۔ اور یہ بنیادی تعلیم انتہائی ٹھوس و مستحکم ہو RCCE آر۔ سی۔ سی۔ پائے کی طرح کہ اس پر علم کی پوری عمارت کھڑی کی جائے گی۔ پائے اگر کمزور رہے تو عمارت کتنی اچھی و خوبصورت ہی کیوں نہ ہو، وہ دیکھتے ہی دیکھتے زمین بوس ہو جائے گی۔ اساتذہ قابل، ذہین، مخلص، متدین فرض شناس، رحم دل، شفیق، مہربان، خود شناس و خود اعتماد اور غیرت مند ہوں۔ بے شک درس و تدریس کے یہی اجزائے ترکیبی ہیں جنھیں نظر انداز کر کے کوئی بہتر و مثبت و موثر نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

رہی نصب العین کی بات تو یہ تعلیمی میدان کی سب سے اہم بنیادی حقیقت ہے۔ نصب العین جتنا ہی زیادہ پاکیزہ، بلند و انسانیت نواز ہوگا، کامیابی اسی کے اعتبار سے ملے گی۔ دراصل کامیابی و ناکامی، نفع بخش و مضرت رسانی کا انحصار نصب العین ہی پر ہوتا ہے۔ گویا مثبت و منفی نتائج کا یہی حقیقی معیار ہے۔

جس طرح کالجوں یونیورسٹیوں کا اپنا ایک نصب العین ہے، وہ ہے بہتر زندگی کی تشکیل اور اچھے مستقبل کی تعمیر۔ چاہے وہ ملازمت کے ذریعے یا سیاست کے ذریعے یا تجارت کے ذریعے۔ یعنی ایک انسان کسی کالج و یونیورسٹی کا نصاب مکمل کر کے ڈگری حاصل کر لیتا ہے، تو اس کے ذریعے اپنے مستقبل کی تعمیر اور ایک بہتر اور شاندار زندگی کی تشکیل چاہتا ہے۔ ایک طرف تو وہ تاجر، کارخانے دار، صنعت کار، مل اونر بن جاتا ہے۔

تجارت و زراعت کو نئی نئی جہتیں دے کر شادابی و خوشحالی لاتا ہے تو دوسری طرف وہ اپنے اپنے اسی ڈگری کے ذریعے وہ ملازمت حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعے اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بناتا ہے۔ یعنی وہ ایک ٹیچر سے، لیکچرر، پروفیسر، ڈائریکٹر، دانشور، مسٹر، منسٹر، وزیر اعظم، صدر جمہوریہ بنتا ہے۔

یہی جدید دانش کدے یعنی کالجز و یونیورسٹیز کی تعلیم کا نصب العین ہے۔

اس کے مقابلے میں دینی درسگاہوں، مذہبی اداروں، عربی دانشکدوں کا نصب العین ہے۔ بڑا مقدس، بلند اور انسانی قدروں کا حامل ہوتا ہے اور وہ ہے دین و علمِ دین کا فروغ، اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور انسانیت کی خدمت، قرآن و صاحبِ قرآن، آقائے دو جہاں، محسنِ انسانیت، معلمِ کائنات سیّدنا محمد عربی ﷺ زندگی جو بنی نوع انسانی کی فلاح و

نجات اور انسانیت کی تعمیر وتشکیل کے لیے ایک منشور کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہیں انسانیت کے تمام طبقات تک پہنچانا کہ و انسانیت کے ہر طبقے کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ انی رسول اللہ الیکم جمیعًا۔ چنانچہ دینی اداروں کا نصب العین ایسے افراد کی تعمیر وتشکیل ہے جو دین وانسانیت کے مخلص خادم، پُرخلوص مبلغ اور بشریت کی فلاح وبہبود کے نقیب بن سکیں۔ اور اس راہِ محبت میں اپنا سود وزیاں، جان ومال، حرمت وناموس کو ثانوی قرار دیں۔

ہمیں ایسے افراد کی کامیابی اور ناکامی اور ان اداروں کے سود وزیاں کو اسی معیار اور اس نصب العین سے جانچنا ہوگا۔ اگر وہ اپنے اس بلند معیار اور مقدس نصب العین کے پیشِ نظر اپنے عظیم پاکیزہ رہنما مقاصد میں کامیاب ہیں تو پھر ہمیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم ان کو کالجز، یونیورسٹیز کے معیار سے جانچیں اور ان کی کامرانیوں کا سرکاری و نیم سرکاری کامرانیوں سے موازنہ کریں۔ اور جب ان اداروں اور ان کے افراد کو اس معیار پر نہ پائیں تو انہیں ہدفِ ملامت بنائیں اور ان کی تنقیصِ شان کریں۔

آج ہم اس مثالی معیار وبلند نصب العین کو سامنے رکھ کر عربی دانش کدوں و دینی اداروں کے نصابِ تعلیم اور نظر تعلیم و تعلم اور ان کے حسنِ کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں تو بڑی مایوسی اور ساتھ ہی بڑی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ کہ اگر عربی مدارس و دینی اداروں کے تنزل کی رفتار یہی رہی تو اسلامی علوم وفنون کا حشر کیا ہوگا؟ ذہن عربی وفکر اسلامی کے ذخیروں کا کیا ہوگا؟ علومِ قرآنی کے سدا بہار گلدستوں اور عربی ادب کدوں کے دُر ہائے شاہوار کا انجام کیا ہوگا؟

تقریباً نصف صدی سے عربی مدارس کا معیارِ تعلیم ونظر تعلم جس تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوا اور تقسیمِ ملک اور انتقالِ مکانی کے بعد تو انحطاط کی طرف آنے میں گویا جست لگائی ہو۔ جس کے کچھ معقول وجوہات، تاریخی عوامل اور بنیادی اسباب ہیں جو تقسیمِ ملک اور ترکِ سکونت کے پس منظر میں بڑی آسانی کے ساتھ محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

ادھر تقریباً تیس سالوں سے اجتماعی طور پر اسلامی درسگاہوں کی تعلیمی زبوں حالی مایوسیوں کے اُس حد کو چھونے لگی ہے۔ جہاں پر یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ اسلامی فکر وفن کا سورج اب اپنی تمازت کھو بیٹھا ہے اور وہ اب تب ہی میں ہماری بے حسی کے ساگر اور ہمارے وجود کے بحر الکلاہل میں ڈوبنے والا ہے۔ ؎

پابہ گل ہیں سب رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے میری زنجیر کون

پہلے عربی مدارس میں اعلیٰ نظام تعلیم اور طلبہ کی دینی، فکر اور علمی تعمیر ہی پر زور دیا جاتا تھا۔ ان کی مثالی تربیت اور کردار و عمل پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ ان عظیم درسگاہوں سے اکتساب کرنے کے بعد جب باہر آتے تو بھیڑ میں بھی تنہا دکھائی دیتے تھے۔ مگر آہ! آج وہ سب کچھ ع جو کچھ دیکھا خواب تھا جو کچھ سنا افسانہ تھا، کے مترادف ہو کر رہ گیا ہے۔ اب تو صرف عمارتیں تعمیر کرنے کرانے کی دوڑ میں ایک دوسرے کو پچھاڑ دینے کا جذبۂ نامحمود ہی سب سے بڑا نصب العین بنا ہوا ہے۔ آج دینی اداروں کی برتری وبڑائی کا معیار طلبہ کی تعمیر وتشکیل کے بجائے فلک بوس عمارتوں اور دیدہ زیب وپُرشکوہ بلڈنگوں

کی تعمیر وتزئین بنی ہوئی ہے۔ ان میں طلبہ کا بے مقصد ہجوم کامیابی کی ضمانت۔ ایسے عالم میں اگر کچھ مخصوص نوعیت کے ادارے ایڈ والحاق اور سرکاری امداد سے بے نیاز ہو کر اس بلند نصب العین اور دینی اداروں کے اس اعلیٰ روایتی اقدار کی بحالی کے لیے پُرخلوص جدوجہد کر رہے ہیں، تو وہ حالات کی بے رحمی کے اس قدر شکار ہیں کہ ع کون سنتا ہے فغاں درویش، کے مصداق ہو کر رہ گئے ہیں۔ الحاقی اداروں کی چمک دمک اور ان کی ظاہری نمود کے سامنے ان کا وجود ہی ایک مسئلہ ہوا ہے۔

نہیں منت کشِ تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

بے شک اسلامی درسگاہیں دیدہ زیب عمارتوں میں بدلتی گئیں، ان کا رقبہ پھیلتا گیا۔ ان کے حسن وتزئین میں چار چاند لگتے گئے، مگر علم وہاں سے سمٹتا گیا۔ ایڈ والحاق کے سبب دھاندلیاں نقطۂ عروج پاتی گئیں، جن کی نحوستوں سے علم کی برکتیں وہاں سے اٹھتی گئیں۔ طلبہ کی تعلیمی کیفیت کسمپرسی کی شکار ہوگئی اور دینی تربیت ومعیارِ تعلیم نہ کے برابر ہو کر رہ گیا۔

آج عربی دانش کدوں و دینی اداروں میں پڑھ کر نکلنے والی بھیڑ کی اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مبلغ علم کے باعث علی العموم مساجد ومکاتب پر انحصار کے لائق ہوتی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ غیر معیاری، سستی وکمرشیل خطابت کے قابل! یہ بات خواہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نفوس غیر مطمئنہ مجموعی طور پر خود شناسی وخود اعتمادی کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے اندر حکیمانہ ژرف نگاہی، مجتہدانہ رنگ، قوتِ فیصلہ، خود نگاہی، خود آگاہی، مومنانہ بصیرت، تفقہ فی الدین اور احساسِ سود وزیاں کا علی العموم فقدان ہوتا ہے۔ ان کا علمی اثاثہ وفکری سرمایہ وقت وحالت کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ جبکہ آج ہمیں صرف سُپر اسٹار مقررین، لسّان وچرب زبان قسم کے بے فیض وبے عمل خطبا مکاتب و پرائمری سطح تک کے لیے اساتذہ اور صرف وصرف دو رکعت کے ائمہ کی ضرورت نہیں، بلکہ قوموں کی امامت وقیادت کے لیے بالغ نظر واصحب الرائے ائمۂ زمانہ کی ضرورت ہے۔ صرف یہی ائمہ کافی نہیں ہوں گے، جن کے بارے میں ڈاکٹر اقبال نے بڑی خدالگتی باتیں کہیں ہیں۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
کیا سمجھ پائیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

من لم یعرف اهل زمانی فهو جاهل۔ جس کی نگاہ اپنے زمانے کے (تیزی سے بدلتے ہوئے) حالات پر نہ ہو (گویا وہ) ایک طرح سے جاہل ہے۔

آج مسائل در مسائل سے پُر اس دنیا کے لیے ایسے بالغ نظر، بیدار مغز، فرض شناس، خود اعتماد، خود شناس افراد اور گونا گوں صلاحیتوں کے حامل علماء، فقہا، خطباء، مبلغین، متکلمین اور دیدۂ بینا رکھنے والے اصحاب دعوت وارشاد کی بڑی ضرورت ہے۔ جو بڑے خلوص واعتماد کے ساتھ اسلام اور اس کی تعلیمات کو اسلام کی اخلاقی، روحانی، جمہوری، شورائی، تہذیبی قدروں اور اس کے نظامِ عدل ومساوات اور اس کی حقیقی روح کو بڑے سائنٹیفک اور نیچرل انداز میں دنیا کے

سامنے رکھ سکیں۔ دینِ فطرت کو فطری انداز میں پیش کرسکیں۔ دانشوری کے نام پر جدیدیت کی بوالعجبیوں وآزاد خیالیوں کے سامنے سپر انداز نہ ہوں۔ اور عصر جدید کے اجالوں سے مرعوب ہوئے بغیر ہر حال وہر ماحول میں اپنی شناخت واعتماد کو برقرار رکھ سکیں۔ جس کے لیے ضروری ہے کہ حالات وزمانہ کو سامنے رکھتے ہوئے عصر جدید کے تقاضوں کو نظر انداز کیے بغیر عربی نظامِ تعلیم کو بہتر بنائیں اور اس کی گرتی اور ختم ہوتی ساکھ کو بچالیں۔ اور عربی نصابِ تعلیم میں بھاری تبدیلی کے لیے کمربستہ ہوجائیں۔

درسِ نظامیہ میں مؤثر وبڑی تبدیلی شجرِ ممنوعہ نہیں! خود صاحبِ درسِ نظامی حضرت مولانا نظام الدین محمد سہالوی (بارہ بنکی یوپی) کی یہ تدوین تبدیلی نصاب کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ان سے پہلے بھی علومِ اسلامی کی تحصیل کے لیے نصابِ تعلیم تھا۔ کم ازکم وہ نصاب تو تھا ہی جسے خود انہوں نے پڑھ کر اصحابِ فضل وکمال کی صف میں شامل ہوئے۔ اور جب انہوں نے اس حقیقت کو شدّت کے ساتھ محسوس کیا کہ یہ نصابِ تعلیم اب اس عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، تو انہوں نے قدیم نصاب کو سامنے رکھ کر ایک نئے نصاب کو مدون فرمایا۔ جسے زمانے نے سر وآنکھوں پر رکھا اور اجتماعی طور پر وہ عربی درسگاہوں کی زینت بنی۔

تو جب اُس وقت حالات کے تقاضوں کے پیشِ نظر تغیر وتبدل ممکن ہے بلکہ مستحسن تھا، تو پھر آج جبکہ حالات کے تقاضے اس سے کہیں زیادہ شدید تر ہوچکے ہیں، تو اس میں تبدیلی کیوں مستحسن نہیں۔

البتہ جن ترمیمات کا تعلق وحیٔ الٰہی سے ہے خواہ متلو ہوں یا غیر متلو، اس میں کسی بھی تبدیلی وترمیم پر نہ ہم کل قادر تھے اور نہ ہی آج ہم کو یہ حق پہنچتا ہے اور نہ ہی مستقبل میں اس طرح کا کوئی تصور کیا جاسکتا ہے۔

البتہ وہ علوم وفنون جو قرآن وسنّت کے خادم کی حیثیت سے زیرِ درس ہیں، وہ حالات وزمانہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر بدلے جاسکتے ہیں۔ بلکہ ضرورتوں کے پیشِ نظر ان میں غیر معمولی اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔

قرآن ہر زمانے میں رہا ہے اور رہے گا۔ سنّت کی تمازت نہ کبھی مدھم پڑی ہے، نہ پڑے گی۔ مگر ان کی تفہیمات کا انداز اور ان سے اکتسابِ فیض کے انداز بدلتے رہے۔ جس زمانے میں فلاسفہ کا بول بالا تھا تو کتاب وسنّت کی تفہیم کے لیے فلسفیانہ انداز اختیار کیا گیا۔ اور فلسفۂ یونان کے مقابلے میں فلسفۂ اسلام نے اپنی عظمتوں اور رفعتوں کا سکّہ بٹھایا اور فلسفۂ اسلام نے فلسفۂ یونان کو سرنگوں کیا۔ ڈاکٹر اقبال نے اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

اور جب زمانے پر تصوف کی حکمرانی تھی تو کتاب وسنّت کی تفہیم کے لیے تصوف کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا۔ اور جب آج سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کا سورج سوا نیزے پر ہے، تو قرآن کو سائنس کی روشنی میں سمجھنا کافی نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ سائنس خود قرآن پر ایمان لائے اور سائنس کی پرکھ اور اس کی تصدیق قرآن کی روشنی میں ہو۔

الغرض قدیم مسائل کی تفہیم کے لیے جدید دلائل ہوں، نئے حالات میں نئے آلات ہوں، دین کی روح، اسلامی تعلیمات، قرآن کی تفہیم اور اسلام کی ابدی صداقتوں کو مخاطب کرکے دل و دماغ تک پہنچانے میں غیر معمولی زحمتیں و پریشانیاں نہ اٹھانی پڑیں۔ اور یہ سب اس وقت ممکن ہوگا جب ہماری عربی درسگاہیں اور دینی ادارے جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں گی۔

ورنہ اسلام کا داعی و دین کا خادم اپنے سینے میں قلزم ہی کیوں نہ لیے ہو، مگر مخاطب تک پہنچانے میں وہ گومگو کی کیفیت دانم دلے نہ گویم کی کشمکش اور ع زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم۔ کی منزل میں خود ہی ہو تو پھر اس سے کسی بہتر نتیجے کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

بے شک یہ کام ہمہ شما کا نہیں۔ دینی اداروں اور عربی دانش کدوں کے نصابِ تعلیم میں تبدیلی اور نظامِ تعلیم میں غیر معمولی ردّ و بدل اور اس میں وقت کی ضرورتوں کے پیشِ نظر کوئی خاص اضافہ یہ اجلۂ علماء دین و درس و تدریس کے غیر معمول ماہرین کا کام ہے۔ اس میں ان عظیم دانشوروں کے پُرخلوص تعاون کی بھی شدید ضرورت ہے جو اس پل صراط سے کامیابی و سلامتی کے ساتھ گذر چکے ہیں۔ اور جدید دانش کدے کے سارے حسن و قبح ان کی نگاہوں میں ہیں۔ بے شک یہ ایک امرِ عظیم ہے۔ آگ کے دریا میں ڈوب کر جانے، پتھر کا جگر پانی کرنے اور جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مگر اس کے لیے آگ کے دریا میں ڈوب کر گذرنا اور پتھر کا جگر پانی کرنا ہی ہوگا، کہ اسلامی درسگاہوں، دینی اداروں اور عربی دانش کدوں سے عصر حاضر کا یہی تقاضہ اور وقت کا یہی مطالبہ ہے۔

یہ عشق نہیں آساں تو جس کو سمجھتا ہے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

بحر العلوم فرنگی محلی کے والد ماجد حضرت ملّا نظام الدین سہالوی اپنے زمانے میں مروجہ نصابِ تعلیم کو وقت کے تقاضوں کے مطابق نہ پاکر انہوں نے جب ایک نیا نصاب مدون کرنا چاہا تھا، تو ان کے سامنے بھی کئی طرح کے چیلنج تھے۔ مگر انہوں نے خود شناسی، خود اعتمادی، خدا اعتمادی اور توفیق الٰہی سے اپنے عہد کا چیلنج قبول کیا۔ ایک بڑی جرأت کی اور پتھر کا جگر تنہا پانی کیا تھا۔ یہ ان کے اخلاصِ بے پایاں کی برکتیں اور حسنِ نیت کا صلہ تھا، کہ ان کے مدون کردہ نصابِ تعلیم درسِ نظامی کو حیرت انگیز شہرت و مقبولیت ملی۔ اجتماعی طور پر تمام دینی اداروں اور عربی مدارس نے بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اسے قبول کیا۔ اور صدیوں سے پورے برّ صغیر کے دینی اداروں میں وہی جاری اور نافذ تھا۔ اور بہت حد تک آج بھی عربی مدارس میں اس کی حکمرانی اور اسی کا سکّہ رائج الوقت ہے۔

بے شک آج عربی مدارس و دینی اداروں کو تیزی سے بدلتے حالات اور سائنس و جدید ٹیکنالوجی کے سبب زمین کی طنابیں سمٹ جانے کے سبب اُس عہد سے کہیں زیادہ سنگین اہم و نازک ترین چیلنجوں کا سامنا ہے۔ اور موجودہ ترمیم و اضافہ و تغیر و تبدل اس سے کہیں پیچیدہ و نازک ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ اہم و کارے دارد کے مترادف ہے! جو تنہا ایک یا

چند اداروں یا مدارس کے افراد کے بس کا نہیں، بلکہ پورے ملک کے دل و دماغ پر مشتمل ایک نمائندہ ومنتخب بورڈ کا کام ہے۔

یوں اگر دیکھا جائے تو ملّا نظام الدین سہالوی کا نصابِ تعلیم درسِ نظامی ابتداً صرف ۱۱ رفنون پر مشتمل تھا، جس میں ۴۳ رکتابیں داخلِ نصاب تھیں۔ (۱) نحو، (۲) منطق، (۳) صرف، (۴) فلسفہ، (یعنی حکمت)، (۵) ریاضی، (۶) بلاغت، (۷) فقہ، (۸) اصولِ فقہ، (۹) حدیث (۱۰) تفسیر، (۱۱) کلام، مگر آگے چل کر اقتدارِ زمانہ اور وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر اس نصابِ تعلیم میں ترمیم و اضافہ ہوا۔ ۱۱ رفنون سے بڑھا کر ۱۷ رفنون کیا گیا اور اس میں ۴۳ کے بجائے ۷۹ کتابیں رکھی گئیں۔

مگر عربی درسگاہیں خود اپنا احتساب کریں کہ آج ان سترہ فنون کی ۷۹ کتابوں میں سے کتنی کتابیں ان کے یہاں پڑھائی جاتی ہیں؟ کتنی ہی اہم ترین کتابیں تو ایسی رہ جاتی ہیں کہ ان کا پڑھنا پڑھانا تو الگ رہا ان کی زیارت کی سعادت بھی میسر نہیں ہو پاتی۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ گوشِ مبارک ان کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہیں ہو پاتے۔ یہ وقت کا کتنا بڑا ماتم ہے کہ ہیئت، حساب، ہندسہ، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کے لیے عربی درسگاہوں کو شجرِ ممنوعہ بنا دیا گیا۔ بلکہ یوں کہنا حق بجانب ہوگا کہ دینی درسگاہوں و عربی دانش کدوں کے لیے یہ نامحرم قرار دیئے جا چکے ہیں! اور عملاً یہ شجرِ ممنوعہ بن چکے ہیں۔ حالانکہ درسِ نظامی کے نصاب میں اُن فنون پر کتابیں داخلِ نصاب ہیں۔ ؎

حیراں ہوں سر کوٹوں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں!

ادھر عرصہ تیس برس سے زیادہ ہوا ایڈ و الحاق کے نام سے اسلامی درس گاہوں میں ایک خطرناک وبا پھیلی، یہ طاعون کی طرح ایک متعدی مرض ثابت ہوا۔ (باستناد چند) ساری چھوٹی بڑی درسگاہیں جس کی لپیٹ میں آگئیں خاص کر سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کے بڑے بڑے دینی ادارے وعظیم عربی دانش کدے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ اس لعنت کدے کی اگلی صف میں جلوہ افروز ہیں۔ جبکہ خصم کے بڑے بڑے دینی ادارے عالمی شہرت یافتہ عربی دانش کدے اپنا دامن بچائے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت، تعجب، افسوس، شرمندگی اور ندامت دار العلوم منظر اسلام بریلی شریف، دار العلوم اشرفیہ مبارکپور اور دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف پر ہے، جن کی امامت و قیادت و سیادت میں متوسط و چھوٹے ادارے بھی آنکھیں بند کر کے چل پڑے۔

بے شک اس طرزِ عمل نے اسلامی درسگاہوں کے تقدس کو پامال اور دینی تعلیم کی ابتری میں بڑا مؤثر رول ادا کیا۔ حصولِ دولت کے لیے سب سے پہلے ذرائع پر کڑی نگاہ رکھنے کی تعلیم و تاکید کرنے والی اسلامی درسگاہیں اور دینی ادارے حکومت سے اندھا دھند روپیہ حاصل کرنے کے جنون میں ذرائع کو سرے سے نظر انداز کر کے حصولِ زر پر نگاہیں گاڑ رکھی ہیں۔ خدمتِ علمِ دین کے نام پر اس مقدس کاروبار کے فروغ و ترقی کے لیے بساطِ تجارت پر ایسی ایسی چالیں چلی جاتی ہیں کہ اگر اہلِ دنیا و ماہرینِ تجارت کو ان تفصیلات کا علم ہو جائے تو عش عش کر اٹھیں کہ ؎

بلائے جاں ہے غالب ان کی ہر بات
عبارت کیا؟ اشارت کیا؟ ادا کیا؟

اورزبانِ حال سے ان کے محسوسات کچھ اس نوعیت کے ہوں گے۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ!
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ایڈ والحاق نے خالص ان دینی اداروں کو دنیادار بنا کرر کھ دیا ہے۔اس طرزِ عمل نے اسلامی درسگاہوں میں بڑی ابتری پھیلائی۔وہاں کا تقدس رسوا ہوااور وہاں سے علم کی برکتیں اٹھ گئیں!اورنظامِ علم و تعلیمی نظم درہم برہم ہو گیا۔

میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں کے نگہبانوں کو
میری زنجیر کی جھنکار نے سونے نہ دیا

اس الحاقِ خانہ خراب نے عربی مدارس و دینی اداروں کی مٹی کس قدر پلید کردی ہے اور انہیں بربادیوں کے کس دہانے پرلا کرکھڑا کر دیا ہے۔اس کی ایک جھلک گھر کے ایک بڑے بھیدی کی زبان سے سنیں!

دارالعلوم فیض الرسول جو ابتدا ہی سے الحاقی ادارہ ہے۔اسی ادارے کی ایک نمایاں شخصیت حضرت مولانا مفتی جلال الدین احمد امجدی صدر دار الافتاء براؤں شریف اپنی ایک مشہور کتاب خطباتِ محرم میں شاگردوں کو وصیت کے زیرِ غور عنوان یوں رقمطراز ہیں:

الحاق جس سے اکثر دینی ادارے دنیادار ہو گئے اور ان کی تعلیم برباد ہو گئی۔اس سے بچو اور مکر وفریب سے گورنمنٹ کا پیسہ بھی حاصل نہ کرو کہ غدر و بدعہدی مطلقاً سب سے حرام ہے۔(خطباتِ محرم،ص:۵۴۲)

اکثر دینی ادارے میں لفظ اکثر یہ رعایت لفظی ہے۔پھر یہی حضرت قبلہ ع اک طرف جامِ شریعت ایک طرف سندانِ عشق، کے طور پر ایک استفتاء کے جواب میں دوسرے مقام پر ایک صاحب منصب ومقام کی حیثیت سے ارقام فرماتے ہیں:

مدرسین وطلبا کی تعداد، ان کی حاضریاں اور داخلہ وغیرہ کے جھوٹے کاغذات بنا کر گورنمنٹ سے بھی رقم حاصل کرنا جائز نہیں کہ یہ غدر ہے اور غدر و بدعہدی مطلقاً سب سے حرام ہے۔

پھر اسی سوال کے تحت تفصیلی گفتگو کے بعد حاصلِ گفتگو کے طور پر فرماتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ الحاقی مدارس کی غلط کاریوں کے ذمہ داران ممبران وارا کین ہیں نہ کہ مدرسین وملازمین (فتاویٰ فیض الرسول جلد دوم،ص:۲۱۔۷۲۰)

حالانکہ بے چارے ارا کین وممبران جو بھی دھاندلی کرتے ہیں وہ مدرسین وملازمین کی تحریری رضا سے انہیں کے لیے، انہیں تو حکومت کی طرف سے ایک پیسہ بھی نہیں ملتا ہے۔یہ بے چارے تو بظاہر صرف لذتِ بے گناہی کے مجرم ہیں!یہ صرف دھاندلیوں کے انبار سے ایک مثال ہے ورنہ سارے الحاقی اداروں کا حال یہ ہے کہ۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

یا ایھا الذین آمنو الماتقولون مالا تفعلون۔ کبر مقتاعند اللہ ان تقولو امالا تفعلون

ع چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مُسلمانی

گویا یہاں پر اسلام کی ابدی صداقتیں اپنے مبداء ومنشاہی میں اجنبی ہوتی جارہی ہیں۔ اور تعلیم کے ایک اہم عنصر یعنی نصب العین سے یہ اسلامی درسگاہیں وعربی دانش کدے ہٹتے جارہے ہیں۔ تو ایسے عالم میں جو نتیجہ ظاہر ہونا چاہیے وہ ظاہر ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے مکہ ومدینہ میں نجدیوں کی تباہ کاریوں کو دیکھ کر بطور مرثیہ کہا تھا۔

اسلام اپنے مبداء و منشا میں اجنبی
تیرا غضب کہاں ہے خداوند ذوالجلال

آج اسلامی درسگاہوں وعلمی دانش کدوں میں تعلیم کی بربادی پر دل زخمی اور آنکھیں اشک آلود ہیں کہ۔ ع

تیرا غضب کہاں ہے خداوند ذوالجلال

عربی دانش کدوں ودینی اداروں کے لیے ابھی ابھی وقت ہے سورج ابھی مغرب سے طلوع نہیں ہوا ہے۔ اس مخیر و دین داتا و دین پسند قوم کی رگوں میں لہو ابھی باقی ہے۔ ان کی اسلامی غیرت اور دینی حمیت ابھی زندہ ہے۔ اور ابھی اس عظیم مخیر قوم کا جذبۂ خیر پوری تب وتابِ جاودانہ کے ساتھ سلامت ہے۔

ایسا نہ ہو کہ درد بنے دردِ لازوال
ایسا نہ ہو کہ تم بھی مداوا نہ کرسکو

ایک طرف تو کہاں درسِ نظامیہ ہی کے لیے وقت بہت تنگ تھا، بہت ساری اہم ترین کتابیں اس تنگیٔ وقت کی نظر ہو کر رہ گئیں۔ اور جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ بھی ادھوری۔ اور بعض اہم ومشہوری مرکزی اداروں میں اس آدھی ادھوری میں بھی زبردست کٹوتی۔ بعض اہم مرکزی ادارے کی مصدقہ رپورٹ میرے علم میں ہے کہ بخاری شریف پچاس صفحات بھی نہیں ہوئی مگر ختم بخاری کی رسم ادا کرا کے دستارِ فضیلت کی تہمت لگا کے ان غریب طلبا کو سندِ فضیلت دے دی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس قدر تنگیٔ اوقات کے باوجود ایڈ والحاق کے سبب درسِ نظامیہ کے ساتھ درسِ عالیہ کو شامل کر دیا گیا۔ اور یہ شمولیت بھی ناگزیر تھی اس وقت علی العموم عربی درسگاہوں کا جو نصابِ تعلیم ہے وہ درسِ نظامیہ وعالیہ کا مرکب ہے۔ ہمیں درسِ عالیہ کی افادیت سے انکار نہیں مگر کیا یہاں دونوں نصابوں کی بیک وقت گنجائش ہے؟ اس عمل سے بھی اسلامی درسگاہیں تباہی کے دہانے تک پہنچ گئیں اور وہاں سے درس وتدریس کا ماحول تقریباً ختم ہوگیا۔ البتہ ایک خوشنما فریب کا عمل جاری ہے۔ ان اداروں سے تعلیم کی روح تو نکل گئی صرف مقدس ڈھانچہ بچا ہوا ہے۔ اور اسی کے ذریعے ان کے اساتذہ وملازمین کا حال ومستقبل روشن وتابناک ہی نہیں بلکہ کلی طور پر محفوظ ہوگیا۔ اور ایک خاموش سمجھوتے اور باہمی تال میل کے ذریعے اراکین وملازمین کے لیے راوی عیش ہی عیش لکھ رہا ہے۔ بھولی بھالی امّت تو ان اداروں کے جھوٹے اشتہارات اور موٹی

موٹی رودادوں وخوشنما، دیدہ زیب اور پرشکوہ عمارتوں ہی سے خوش ہے اور اپنی آخرت طلبی میں ان پر بے دریغ خرچ بھی کر رہی ہے۔ اور یہ مقدس تاجر بھی بہت زیادہ خوش ہیں کہ ہماری خوشنما فریب کی عمر میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس وقت ان کا حال تو یہ ہے کہ ع

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی!

اس طرح سے دیکھا جائے تو اسلامی درسگاہیں اپنے ایک اہم تعلیمی عنصر یعنی نصب العین سے ہٹ گئیں، کہ اسلامی دانش کدوں کا نصب العین صرف افراد کے مستقبل کی تعمیر نہیں بلکہ ان قیمتی افراد کے ذریعے اسلام کے اخلاقی، روحانی، تہذیبی شعور کی تشکیل و تبلیغ، انسانیت کی خدمت اور بنی نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔

اب ہم اسلامی علوم وفنون کے عروج وزوال کا ایک تاریخی جائزہ پیش کریں گے۔ اور کوشش کریں گے کہ برصغیر کے عربی درسگاہوں اور دینی اداروں کے انحطاط وزوال کے اسباب وعوامل پر روشنی پڑ سکے۔

آج وقت وحالات کی برہمی نے مجموعی طور پر عالمی سطح پر من حیث القوم جو پے در پے ٹھوکریں لگائیں ہیں، اس نے ہماری آنکھیں تو ضرور کھول دی ہیں مگر ان آنکھوں میں حیرت، بےبسی، کسل مندی ابھی بھی باقی ہے۔ ہم اب بھی اپنی روایتی سستی، کاہلی، تن آسانی اور جہالت کی کوکھ سے پیدا فضول خرچیوں کے حصار سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔

وہ طوفان جو قوموں کی تقدیر اور اس کے عروج کی علامت ہوتے ہیں، اس سے ہماری پوری تاریخ بھری پڑی ہے۔ مگر ہم اس سے نا آشنا، بےتعلق، بےخبر ہو چکے تھے۔ مگر بحمدہٖ تعالیٰ وہی طوفان عالمی سطح پر ہمارے دل و دماغ کے بند دریچوں پر پھر ایک بار دستک دینا شروع کر دیا ہے۔ اس کی آہٹ بھی ہم سُن رہے ہیں، صدیوں کے بعد ایک بار پھر اس کے مانوس چاپ سے ہمارے کان آشنا ہو رہے ہیں۔ دنیا بھر میں اسلامی بیداری اور مسلمانوں کی خود اعتمادی ایک تابناک اور خوش آئند مستقبل کا غماز ہے۔ ان شاء اللہ المولیٰ تعالیٰ مسلمان اپنا تابناک ماضی اور روشن تاریخ ضرور دہرائیں گے۔ اقبال کی روح و کب سے بےچین و پُرامید ہے۔ ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

یہ سب کچھ اپنی جگہ پر حوصلہ افروز فرحت بخش! مگر خود برِّصغیر کے مسلمان میں وہ اضطراب پیدا نہیں ہوسکا۔ جس کے لیے آج بھی ایک بےچین روح، آج بھی بےچین ہے۔ ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اس الحاقِ خانہ خراب نے عربی مدارس کی مٹی کس قدر پلید کی ہے۔ اس کی سرگذشت ایک بڑے اور صفِ اول کے الحاقی ادارے کے ایک سینئر مدرس اور صدر مفتی کی زبان سے سنیں:

حضرت مولانا مفتی جلال الدین احمد امجدی اپنی ایک کتاب خطباتِ محرم میں شاگردوں کو وصیت کے زیر عنوان رقم طراز ہیں:

''الحاق جس سے اکثر دینی ادارے دنیادار ہو گئے اور ان کی تعلیم برباد ہو گئی، اس سے بچو اور مکر و فریب سے گورنمنٹ کا پیسہ بھی حاصل نہ کرو کہ غدر و بد عہد مطلقاً سب سے حرام ہے۔'' (خطباتِ محرم، ص: ۵۴۳)

قوم تو ایک نئے طوفان سے آشنا ہو رہی ہے، اب اسے صحیح و مثبت سمت اور اس کے اندر تعمیری اضطراب کا عمل پیدا کرنا صحیح و مخلص قیادت کا کام ہے۔ اور صحیح و مخلص قیادت درسگاہوں و دانش کدوں ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی درسگاہوں کو اپنا احتساب کرنا چاہیے اور نئی لام بندی بھی!

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی علم و فن ہو تین مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی اپنے درجۂ کمال کو پہنچتا ہے۔ پہلا مرحلہ تدوین کا ہوتا ہے۔ دوسرے تنقیح کا اور تیسرا تکمیل کا۔

اسلامی علوم و فنون کو بھی انہیں تین مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے۔ اسلامی تاریخ پر جن کی نگاہ ہے، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اسلامی علوم کی نشو و نما دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں ہوئی۔ گویا یہی زمانہ اسلامی علوم و فنون کی تدوین کا ہے۔ البتہ تیسری صدی ہجری میں اسلامی علوم کی تدوین میں نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس صدی میں جو علوم مدون ہو چکے تھے اس میں تنوع، ہمہ جہتی، گہرائی، گیرائی، نئی تحقیق، نئی تلاش، نئی منزلیں، نئے راستے، حاملانِ کتاب و سنّت کی آبلہ پائیاں، اصحابِ تفقہ کی دیدہ ریزیاں، قافلۂ علم و فن کی صحرا نوردیاں، کاروانِ محبت کی جگر سوزیاں اور ان شہیدانِ عشق و وفا کی بے چینیوں کا عروج تو اسلامی تاریخ کا زریں باب ہے۔ یہی وہ عہد زریں تھا جب اسلامی علوم و فنون جہاں آرائیوں، کشورستانیوں اور نئی نئی فتوحات کی طرف گامزن تھا۔ یہ دور اسلامی علوم و فنون کی تنقیح کا دور تھا جس کا سلسلہ جنون پانچویں صدی ہجری تک پھیلا ہوا ہے گویا تیسری صدی ہجری سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کا زمانہ اسلامی علوم کے دوسرے دور یعنی تنقیح کا تھا اور پانچویں صدی ہجری سے لے کر تقریباً ساتویں صدی ہجری تک کا دور اسلامی علوم و فنون کی نشر و اشاعت کا حیرت انگیز دور تھا۔

ذہن عربی و فکر اسلامی کی تمازت سے ساری کائنات دم بخود تھی۔ اسلام کی عسکری فتوحات کی طرح اس کے فکر و فن کا سیلِ رواں راہ کے ہر خشک و تر کو سیراب کر رہا تھا۔ دنیا کی ساری چھوٹی بڑی قدریں، تہذیبیں، معاشرتیں ان کی ایجادات سے ششدر تھیں، ذہن عربی اور فکر اسلامی کی شمع فروزاں کے آگے سارے غیر اسلامی فکر و فن کے جوت یا تو بجھ چکے تھے یا ان کی چاندنی پھیکی پڑ چکی تھی۔ ؎

اڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی داستاں میری

دوسری صدی ہجری کے نصف آخر ہی سے مشرقِ وسطیٰ (یعنی مدینۃ الاسلام بغداد) دنیا بھر کے اصحابِ فضل و کمال و

اربابِ فکر وفن کا گہوارہ بننا شروع ہو چکا تھا۔ خلفائے بنوعباس علوم وفنون کی سرپرستی میں ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ چکے تھے۔ خلیفۃ ہارون رشید کا جانشین صاحبِ علم وفضل فرماں روا مامون رشید کی علم دوستی کی خوشبو سارے عالم میں پھیل چکی تھی۔ جس کی وجہ سے دنیا بھر کے اہلِ کمال کا رخ بغداد کی طرف ہو چکا تھا۔ لوگ جوق درجوق بغداد چلے آرہے تھے۔ علمی مذاق سے آراستہ فکر وفن کا دلدادہ خلیفۃ انہیں ہاتھوں ہاتھ لے رہا تھا۔ یونانی حکمت ودانش سے استفادے کے لیے دار الترجمہ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ افلاطون، ارسطو، سقراط، جالینوس، اقلیدس، بقراط، بطلیموس کی کتاب اہلِ عرب کے لیے علم و آگہی کے نئے نئے افق فراہم کررہی تھیں۔ قدیم ہندی، سندھی، مصری علوم وفنون بھی عربی قالب میں ڈھل چکے تھے۔ اسلامی تاریخ ہی نہیں بلکہ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایک رصدگاہ مامون کے نام سے تعمیر ہو چکی تھی۔ جہاں یہ ستاروں پر تحقیق کی کمندیں ڈالنے میں یحییٰ بن ابی منصور، خالد بن عبد الملک مروزی، سند بن علی اور عباس بن سعید جیسے عظیم ہیئت داں مصروفِ عمل ہو چکے تھے۔ موسیٰ خوارزمی، ابن رشد وجابر بن حیان تو آج بھی اہلِ مغرب کے لیے جہانِ حیرت بنے ہوئے ہیں۔ ادھر یورپ (اندلس) اسپین میں اموی خلیفۃ عبد الرحمٰن الداخل اور اس کے جانشین اسلامی عظمت وشوکت کے ساتھ اسلامی علوم وفنونِ لطیفہ کی سرپرستی نیز اصحابِ فضل وکمال کی پذیرائی وقدر افزائی میں ایک نیا عالمی ریکارڈ قائم کررہے تھے۔ الداخل کے جانشین اسپین میں ہارون ومامون رشید کا عکسِ جمیل ثابت ہورہے تھے، بلکہ بعض خصوصیات میں تو بغداد کو بھی پیچھے کیے ہوئے تھے۔ علومِ اسلامی کی ضیا وفکر اسلامی کے جلوؤں سے جب سارا عالم مستفیض ومستفید ہورہا تھا، تو اس وقت آج کا یورپ (جو فی الوقت اقوامِ عالم کا امام بنا ہوا ہے) اپنی غربت وافلاس اور ایامِ جاہلیت کے تاریک ترین دور سے گزر رہا تھا۔

آج یورپ وامریکہ اپنے اپنے ناموں سے جو نئی نئی تحقیقات وایجادات سے عالم کو حیران کیے ہوئے ہیں۔ اس کی اصل اساس ذہن عربی وفکر اسلامی ہی پر ہے، جو اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ بے شک اس کے کچھ تاریخی عوامل ہیں، جس کا تذکرہ ہم آگے کررہے ہیں۔

اس جدید ٹیکنالوجی اور حیرت انگیز سائنسی ترقی کے دور میں آج بھی دنیا ابن رشد وجابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی، الغزالی، البیرونی، الفرغانی، الرازی، الطبری، ابن البطار، ابن الہیثم، ابن سینا، الفارابی اور امام احمد رضا کی دوسری کوئی مثال نہیں پیش کرسکی۔ یہ ذہن عربی وفکر اسلامی کی ایک مثال ہے ورنہ فکر اسلامی کی فہرست بہت طویل وحیران کن ہے۔

پانچویں صدی سے لے کر ساتویں صدی ہجری کے درمیان اسلامی انقلاب کے جلو میں فکر اسلامی کی حیرت ناکیاں اپنے منتہائے کمال کو پہنچ چکی تھیں مگر ساتویں صدی ہجری سے پہلے ہی اسلامی علوم ایک نئی صورت حال سے دوچار ہوا۔ جس کی وجہ سے اس کے عالمگیر پھیلاؤ میں سست روی پیدا ہونے لگی۔ اس کے سیلِ رواں میں ٹھہراؤ پیدا ہونے لگا اور اس کی حیرت انگیز ترقی سوالیہ نشان بننے لگی۔ خلافِ توقع اسلامی علوم وفنون پر ایک عالمگیر تنزل طاری ہونا شروع ہو گیا۔ جس کی کچھ معقول وجوہات وبنیادی اسباب تھے۔

ایک تو بابِ نظر و اجتہاد کا کلی طور پر سختی سے بند ہو جانا۔ دوسرے فتنۂ تاتار یعنی چنگیزیوں کی وحشت و بربریت و حیوانیت و درندگی کے سبب اسلامی علوم و فنون کا افسوسناک ضیاع۔ ان کی وحشت و بربریت و عالمِ اسلام کی بربادی پر مرثیہ خوانہ کرتے ہوئے سعدی شیرازی نے فرمایا تھا۔ ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد برزمین

اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا۔

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے

علم و فن کی ترقی کے لیے جو چیز بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی تھی، وہ منظر سے پس منظر میں چلی گئی۔ یعنی نظر و اجتہاد اس باب کے کلی طور سے بند ہو جانے کی وجہ سے علم کے تمام گوشے متاثر ہوئے اور بتدریج ان پر جمود طاری ہوتا گیا۔ نظر و اجتہاد کا باب کیوں بند ہوا۔ سر دست اس پر یہاں نہ تو بحث کی گنجائش ہے اور نہ ہی موضوع سے متعلق! اس عالمگیر فکری تنزل کے دور میں دنیا کے کسی بھی گوشے سے اگر کوئی قدآور علمی شخصیت اس بزمِ ہستی میں رونق بخش ہوئی بھی تو اس کی حیثیت صرف استثنائی تھی جیسے علامہ سعد الدین تفتازانی، علامہ سیّد شریف جرجانی، علامہ جلال الدین سیوطی، شاہ ولی اللہ دہلوی، علامہ فضل حق خیرآبادی، امام احمد رضا خاں بریلوی، اس طرح کی نابغۂ روزگار ہستیوں کی تعداد اتنی مختصر ہے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے بعد اس عالمگیر فکری تنزل کے دور میں علمی کام بھی ہوئے تو ان میں نمایاں حیثیت شروح کی تھی۔ تحقیق و جستجو کی جولان گاہ پر جو چیز ناپید ہو گئی تھی وہ تھی نظر و اجتہاد، اس تلخ حقیقت کو دیدہ بینا رکھنے والی شخصیتوں نے محسوس کیا۔ جیسے علامہ ابن خلدون جنہوں نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف مقدمہ ابن خلدون میں اس حقیقت کے تعلق سے واضح اشارے کیے۔ حد یہ ہے کہ مشہور برطانی جاسوس، ہمفرے جو صاحبِ فکر و دانش بھی تھا۔ اس نے اس کمی کو بُری طرح سے محسوس کیا۔ اور اپنی بے حد قیمتی ڈائری جو ہمفرے کے اعترافات کے نام سے انگریزی و اردو میں شائع بھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اہلِ تشیع کے فکر و اجتہاد کے تذکرے کے ضمن میں اہلِ سنّت کے یہاں اس کی کمی پر کھل کر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور اس فکری جمود کے نتیجے میں ہونے والے نقصانات کا جائزہ بھی لیا ہے۔ جس کے قیمتی محسوسات کو صرف عیسائی یا انگریز کے محسوسات کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال علمی تنزل کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں بجائے کمی کے دن بدن اضافہ ہوتا رہا۔ جس کا سب سے زیادہ اثر شعبۂ درس و تدریس پر پڑا۔

برّصغیر ہند میں درس و تدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا اور جن خطوط پر اسلامی علوم و فنون کی یہاں داغ بیل پڑی، وہ خطوط و نہج اس دورِ تنزل کی پیداوار تھے۔ جن کا سلسلہ ساتویں صدی ہجری سے کچھ قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں منگولوں کی وحشت و بربریت، ان کے ہاتھوں اسلامی تمدن کی تاراجی، علمی مراکز کی پامالی، عالمِ اسلام کی اجتماعی بربادی،

سقوطِ بغداد، خلافت بنوعباسیہ کا خاتمہ، اہلِ بغداد کا قتلِ عام، علوم وفنون کے قیمتی ذخائر کا تاتاریوں کے ہاتھوں المناک ضیاع اس نے بھی فکری تنزل اور علمی انحطاط میں بڑا مؤثر رول ادا کیا۔ فکروفن کے ان گراں قدر خزانوں کی بربادی نے اسلام کے علوم وفنون کی عمارتوں کو گویا ایک طرح سے ڈھا دیا۔ ؎

قیامت کیوں نہیں آئی الٰہی ماجرا کیا تھا

وحشت و بربریت کے اس رستاخیز دور میں جب جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے، عوام تو الگ رہے اربابِ اقتدار کی بات بھی جانے دیجیے خود فکر اسلامی کے ستون اور علومِ اسلامی کے دل و دماغ سرگرداں، حیران و پریشان جان ہتھیلیوں پر لیے جائے پناہ کی تلاش میں تھے۔ فکروفن کے تمام شہ پارے الگ نذرِ آتش و دریابُرد کردیئے گئے تھے۔ علمی کارواں کو آگے بڑھانے کے لیے جس فکری سرمائے، اسباب وذرائع اور پُرسکون ماحول کی ضرورت تھی وہ غارت گر دین و دنیا کے ہاتھوں ناپید ہو چکا تھا۔

جزوی وانفرادی طور پر کہیں منزلِ امان ملی بھی تو نئے سرے سے فکر اسلامی کی شیرازہ بندی اسباب وذرائع کی فراہمی اور علمی توانائی کی بحالی میں اتنا وقت لگ گیا کہ زمانہ کافی آگے اور علمی کارواں بہت پیچھے رہ گیا۔ ؎

کس میں رکھوں اب مئے حسرت کو میں بھلا
شیشہ تو دل کے خونِ جگر ہی سے بھر گیا

پھر پانچ سو برس قبل اندلس (اسپین) سے مسلمانوں کی بے دخلی اور سقوطِ غرناطہ نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ بچے کھچے اربابِ فضل وکمال کی دربدری و بے دخلی کے وقت فکر اسلامی و ذہن عربی کے خزانے جو اہلِ یورپ کے ہاتھ لگے اس سے انہوں نے کافی فائدہ اٹھایا۔ اسی فکر اسلامی و ذہن عربی کے اساس پر انہوں نے محنت کی، پھر تو آئے دن نت نئی ایجادات کا سہرا اپنے سر باندھنے لگے۔ ؎

مئے خانۂ یورپ کی ہر بات نرالی ہے

اور آخر میں ترکی خلافت کے خاتمے اور دنیا کے تین بڑے اعظموں سے آلِ عثمان کی سیاسی بے دخلی نے تو ساری بساط ہی الٹ دی۔ اس کے بعد تو کسی بھی میدان میں اہلِ مغرب کا کوئی حریف ہی نہیں رہ گیا۔ عالمی سطح پر مسلمان سیاسی ادبار کے شکار کیا ہوئے کہ جیسے ہر میدان ان کے ہر ہاتھ سے نکل گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے فضل وکمال، جاہ وجلال، حکمت و دانائی، علوم وفنون اور نت نئی ایجادات کا ہر سورج صرف مشرق ہی سے طلوع ہوتا تھا مگر عالمی سطح پر مسلمانوں کی سیاسی بے دخلی کے بعد اب اس طرح کی ایجادات کا سورج صرف مغرب سے نکلتا ہے۔ ؎

میرے قہقہوں کے زد پر کبھی گردشِ جہاں کی
میرے آنسوؤں کی رو میں کبھی تلخئ زمانہ

حالات کی اس برہمی نے اسلامی فکروفن کے تمام شعبوں کو بُری طرح متاثر کیا۔ چونکہ علم وفن کے تمام شعبوں میں درس و

تدریس ہی سب سے زیادہ اہم ہے، اس لیے یہ شعبہ متاثر بھی سب سے زیادہ ہوا۔

آج عربی درسگاہوں میں تعلیم و تعلم، درس و تدریس کا زیادہ انحصار اس درسِ نظامیہ پر ہے جسے بارہویں صدی ہجری میں **بَحر العلوم فرنگی محل** کے والد محترم حضرت **مُلّا نظامُ الدین سہالوی** (بارہ بنکی) جو حضرت **شاہ ولی اللہ دھلوی** کے ہم عصر بھی تھے، نے مدون فرمایا تھا۔ یہ نصابِ تعلیم ان کا اپنا کوئی نیا ایجاد نہیں تھا بلکہ ان کے دور میں علومِ اسلامیہ کی تحصیل کے لیے جو نصابِ تعلیم رائج تھا، اسے عصری تقاضے کے مطابق نہ پا کر اس میں ایک جامع روشن ترمیم کی اور اسے ایسے حسن و خوبی کے ساتھ تشکیل دی کہ اسے پوری توجہ، لگن و محنت سے پڑھنے کے بعد آدمی جس فن میں چاہتا کمال حاصل کر لیتا۔

اس نصاب کی تشکیل میں ان کے اخلاصِ بے پایاں کا یہ عالم تھا کہ بذاتِ خود وہ ایک زبردست عالم و فاضل اور صاحبِ تصانیف جلیلہ ہو کر اپنی ایک بھی کتاب اس میں نہیں رکھی جبکہ ان کی تصنیفات میں کچھ بڑے پائے کی کتابیں ایسی تھیں جو اس نئے نصابِ تعلیم کی زینت بن سکتی تھیں۔

بے شک وہ نصابِ تعلیم جس میں زیادہ تر عنصر معقولات کا ہے وہ اس دور اور اس دور سے متصل ایک زمانے کے لیے تو بہت مناسب و بہت احسن تھیں لیکن صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ہمارا علمی کارواں اسی ڈگر پر چل رہا ہے۔ جبکہ عصرِ حاضر کے تقاضے کچھ اور بھی کہتے ہیں۔

آج عربی درسگاہوں میں وہ کتابیں، وہ فنون بھی لازمہ درس و تدریس بنی ہوئی ہیں، جن کی افادیت فی زمانہ ختم ہو چکی ہے۔ اور ایک طرح سے متروکات کی منزل میں داخل ہو چکی ہیں۔ پھر بھی دینی مدارس کے عزیز طلبا کے قیمتی اوقات ان کتابوں کے ذریعے ضائع کرائے جا رہے ہیں۔

آج سرکاری و نیم سرکاری اور علومِ جدیدہ کے نصاب تو ہر پانچ سال بعد بدل دیئے جاتے ہیں۔ یا اس میں ضروری ترمیم کر دی جاتی ہیں مگر ہماری عربی درسگاہیں ہیں کہ اس مقدس آثارِ قدیمہ کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ آخر یہ درسگاہیں اپنا احتساب کیوں نہیں کرتیں؟

وقت کے تقاضے سے گریز کب تک؟ خدانخواستہ کہیں نظر و اجتہاد کی طرح یہ باب بھی تو سختی سے نہیں بند کر دیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ضرورت ہے کہ عربی درسگاہیں اپنا نصابِ تعلیم عصری تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نئے سرے سے مدون کریں۔ اور اس کے لیے ماہرینِ تعلیم پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ جس میں جدید دانش گاہوں کے قابلِ ذکر افراد بھی شامل کر لیے جائیں۔ ذہین ترین افراد ماہرین درس و تدریس پر مشتمل بورڈ جو نصابِ تعلیم نئے سرے سے مدون کرے۔ اسے تمام عربی درسگاہوں کے ذمہ داروں اور اساتذہ کے خصوصی اجلاس میں پیش کر دیا جائے۔ ان کی منظوری کے بعد تمام عربی درسگاہوں میں وہی نصاب داخل کر دیئے جائیں۔

نصابِ تعلیم کے مراحل سے گزرنے کے بعد بھی اس بورڈ کو باقی رکھا جائے۔ اور اسی کے ذمہ تمام عربی درسگاہوں کی

نگرانی سپرد کردی جائے۔ وہ یہ دیکھے کہ اس نئے نصاب پر عمل کرنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہورہی ہے۔ اور اگر دشواری ہو رہی ہو تو اسے وہ حل کرے۔

آج عربی درسگاہوں میں تعلیم یافتہ حضرات کی اکثریت حساب وجغرافیہ تو الگ رہے، تاریخ اسلامی اور سیرتِ طیبہ کے اہم گوشوں سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتی۔ حساب جو علمِ فرائض کا بنیادی عنصر ہے، اسے عربی درسگاہوں سے دیش نکالا کردیا گیا۔ یہی حال طب کا بھی ہے۔ پہلے علمائے دین حکیم بھی ہوا کرتے تھے۔

آج اگر عربی درسگاہوں میں طب کی بنیادی کتابیں داخلِ نصاب کردی جائیں اور تخصیص کی طرح طب وحکمت پر خصوصی توجہ دے دی جائے تو علومِ اسلامیہ کا عالم اپنی ذاتی کاوشوں سے اس میں اتنی ترقی کرہی سکتا ہے۔ اسے ایک مقدس پیشہ یا خدمت خلق کا ذریعہ بنائے۔

عربی درسگاہوں کا یہ پہلو بھی بہت ہی قابلِ غور ہے کہ یہاں ذریعۂ تعلیم فارسی وعربی زبان ہے جبکہ یہ دونوں زبانیں اساتذہ کی اکثریت خود ان زبانوں پر عبور نہیں رکھتی ہے، بس کسی طرح ترجمے وشروح سے اپنی گاڑیاں چلاتی ہے۔ وہ زبانیں جن کے ذریعے درس وتدریس کی اصل روح کو سمجھنا اور سمجھانا ہے، وہ زبانیں جو اساتذہ وتلامذہ جب دونوں کے لیے ایک مسئلہ بنی ہوئی ہو، تو پھر ان سے بہتر نتائج کی کیا امید ہے۔

اس حقیقت صادقہ کا احساس تو بہتوں کو تھا مگر کتنے ماہرین درس وتدریس واصحابِ فضل وکمال نے اس کے لیے پتھر کا جگر پانی کیا۔ خدائے بزرگ وبرتر حضرت علامہ مفتی **بدر الدین احمد قادری** علیہ الرحمہ صدر المدرسین مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا و ناظمِ تعلیمات دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف کی قبر کو رحمت ونور سے بھر دے۔ دورانِ درس وتدریس جب انہیں ان بے رحم حقیقتوں کا ادراک ہوا، تو اپنے اکابرین واساتذہ کی موجودگی میں انہیں کی دعاؤں کا سہارا لے کر اس راہِ محبت میں بڑے خلوص واعتماد کے ساتھ قدم اٹھایا۔ اور مادری زبان اردو میں عربی درسگاہوں کے طلبا کی مشکلات کی گرہ کشائی کی۔ درس وتدریس کی ابتدائی وبنیادی مسائل سے لے کر درسِ نظامیہ کی معیاری کتابوں کی مشکل مسائل کی تسہیل کے لیے اہم کتابیں لکھیں۔ منطق کے طلبا کے لیے فیض المنطق، جواہر المنطر، عربی ادب کے طلبا کے لیے عروس الادب، فیض الادب کے دو حصے، نحو کے ابتدائی مسائل کے لیے تلخیص الاعراب، فارسی زبان کی تسہیل کے لیے تعمیر قواعد کے دو حصے تصنیف کیے جو عربی مدارس میں داخلِ نصاب ہیں۔ اور جنہیں قبولیت عام کی سند ملی۔

آپ کے اس پُرخلوص جذبے کی قدر کی گئی۔ اور ان کی حیات ہی میں ان کی کتابیں ملک کی چھوٹی بڑی اور متوسط درسگاہوں میں اپنی جگہ بنا چکی تھیں۔ برّصغیر ہند کے طول وعرض ہی نہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش نیپال وغیرہ کی عربی درسگاہوں میں داخلِ نصاب ہوچکی ہیں۔ ان کتابوں نے درس وتدریس کے مشکل ماحول میں مسائل کے افہام وتفہیم میں آسانیاں پیدا کیں۔ **فجزاهم الله احسن الجزاء**۔

آپ کے علاوہ ایک اور بہت ہی محترم ومکرم وعظیم المرتبت شخصیت نے اس کے لیے خصوصی توجہ فرمائی اور مختلف فنون

پر بری معرکتہ الآرا کتابیں تصنیف فرمائیں! پتھر کا جگر کرنے میں بحر العلوم حضرت علامہ مفتی سیّد افضل حسین صاحب علیہ الرحمہ والرضوان نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ ہدایۃ المنطق، ہدایۃ الصرف، ہدایۃ النحو وغیرہ یہ کتابیں بھی اپنے موضوع پر بڑی گراں مایہ ہیں، مگر نہ جانے کیوں ان کتابوں کو عربی درسگاہوں میں وہ جگہ نہیں مل سکی، جس کی وہ مستحق تھیں۔ ایک اور بلند قامت شخصیت نے سب سے پہلے اس طرف توجہ فرمائی تھی۔ وہ حضرت علامہ مفتی عبد الرشید صاحب قبلہ علیہ الرحمہ جامعہ عربیہ ناگپور جنہوں نے بہت پہلے آمد نامہ کی جگہ پر تسہیل المصادر لکھی جسے قبولِ عام کی سند ملی۔ اور بڑی تعداد میں اسلامی درسگاہوں میں وہ داخلِ نصاب ہوئی۔

فارسی زبان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اسلامی علوم وفنون کا ایک بڑا ذخیرہ اس زبان میں موجود ہے۔ وہ آج بھی دنیا کی اہم زندہ زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ آج کروڑوں انسانوں کے رابطے کی زبان فارسی ہے۔ اور ایک طاقتور مسلم ملک ایران کی سرکاری زبان بھی! اسی زندۂ جاوید زبان میں لکھی گئی مثنوی، مولانا روم کے لیے کہا گیا ہے۔ ؎

ہشت قرآن در زبان پہلوی

لیکن اس برّصغیر ہند میں اس کی اہمیت وافادیت اس وقت بہت زیادہ تھی، جب اس کا تعلق براہِ راست معاش سے جڑا ہوا تھا یعنی یہ سرکار و دربار کی زبان تھی! غوریوں، ایبکوں، بلبنوں، لودھیوں، تغلقوں، سوریوں، مغلیوں اور ان کی ہزار سالہ حکومتوں کی اکثریت کی زبان! لیکن اس شیریں لطیف اور افادیت سے بھرپور زبان کو برصغیر سے رخصت ہوئے بھی تو ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہوا۔

لہٰذا عربی درسگاہوں اور دینی اداروں میں فارسی زبان کی جو کتابیں ذریعۂ تعلیم بنی ہوئی ہیں۔ جیسے علم الصیغہ، فصولِ اکبری، پنج گنج، نحو میر، صرف میر وغیرہ بے شک یہ کتابیں درسِ نظامیہ کی تکمیل کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن مسائل کی کماحقہٗ تفہیم کے لیے پہلے اس زبان کی تحصیل لازم ہے۔ جو ابتدائی درجات کے بچوں کے لیے جن کی اردو بھی ایک سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ ان کے لیے ایک دقّت طلب امر ہے۔ جبکہ فارسی زبان کی تفہیم نئی نسل کے اساتذہ کے لیے بھی علی العموم ایک مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ چہ جائے کہ اصل مسائل کی تفہیم! جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر عربی درسگاہوں میں فارسی زبان ذریعۂ تعلیم کیوں؟ بچے ان مسائل اور ان کتابوں کو جتنی جلدی اور آسانی کے ساتھ اپنی مادری زبان میں سمجھ لیں گے، اتنا دوسری زبان میں نہیں۔ خاص کر ایسی زبان کہ جس پر درک اور اس پر عبور رکھنے والے ملک میں خال خال ہی رہ گئے ہوں۔ جن کی حیثیت صرف استثنائی ہو کر رہ گئی ہے۔ اور ان کا شمار تو بطور تبرک ہے یا بطور آثار قدیمہ! ذریعۂ تعلیم اور مسائل کی تفہیم کے لیے مادری زبان کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جائے کہ سُریانی زبان جو ازمنۂ قدیم میں ایک اہم زبان تھی۔ وہ پیغمبروں کی زبان تھی مگر تقریباً دو ہزار برس پہلے ہی ختم ہو کر خالص یہودی ربیوں یعنی مذہبی پیشواؤں کی مذہبی زبان ہو کر خالص یہودی مذہبی گھرانے کے گھر آنگن ہی کی زبان بن کر رہ گئی تھی۔ چند سال قبل تک ان یہودیوں کے پاس اپنا کوئی مخصوص وطن اور نہ ہی کوئی خاص ملک تھا جسے یہودی ریاست یا یہودی مملکت کہا جا سکے۔ یہ صدیوں سے محکوم و رعایا بن کر

ہی رہے۔ یہ کبھی آشوریوں، کبھی کلدانیوں، کبھی جمورایوں، کبھی ایرانیوں، کبھی رومیوں اور کبھی مسلمانوں ہی کے زیر سایہ محکوم ورعایا بن کر رہے۔ (مسلمانوں کے سوا ہر قوم نے ان کے ساتھ جانور سے بدتر سلوک کیا۔ جس کے لیے بخت نصر وہٹلر کی مثالیں کافی ہیں۔ کہ یہودیوں کے ساتھ من حیث القوم ان کا سلوک تاریخ کا تاریک و دردناک حصہ بن چکا ہے۔) اور ہر دور، ہر زمانے میں وہی زبان ان کی اپنی زبان قرار پائی، جو ان کے حکمرانوں کی زبان ہوتیں۔

آلِ عثمان کی روایتی نرم خوئی و فراخدلی کے سبب صدیوں کی خاموش جدوجہد، ریشہ دوانیوں و شرمناک سازشوں کی بدولت یہ دشمنِ جان، دشمن دین و ایمان و دشمن انسانیت مغربی استعمال کا ایک ضروری عنصر بن کر عالمِ اسلام کے قلب میں اپنا خونی پنجہ گاڑنے میں کامیاب ہوگئے اور ارضِ فلسطین پر اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد ہی سے انہوں نے اپنی مردہ زبان کی احیاء شروع کردی اور اپنی حکومت کی مذہبی و سرکاری زبان بنا کر اسے نئی زندگی دے دی۔ آج اسرائیل میں علوم جدیدہ سائنس اور جدید ترین ٹیکنالوجی کی تعلیم سریانی زبان ہی میں دی جاتی ہے۔ اسرائیل میں ہر شعبۂ زندگی کا علوم سریانی زبان ہی کے ذریعے دی جاتی ہے۔ یہ تو ایک مردہ زبان کی مثال تھی۔ ترقی کے دور میں حیرت انگیز ترقی کرنے والے چائنا و جاپان جن کی جدید ٹیکنالوجی و سائنسی ایجادات کا لوہا مغرب بھی مانتا ہے۔ ان کے کالجوں و یونیورسٹیوں کا نصابِ تعلیم بھی ان کی مادری زبان چینی و جاپانی میں ہے۔ تو پھر ہم اپنی دینی درسگاہوں کے نصابِ تعلیم کے لیے اپنی مادری زبان اردو کو کیوں نظرانداز کررہے ہیں۔

فارسی کے بعد برِّصغیر ہند کے مسلمانوں کی مادری زبان علی العموم اردو ہوئی۔ جس کی وجہ سے اسلام کا سرمایہ بڑی تیزی کے ساتھ اردو زبان میں منتقل ہونا شروع ہوگیا۔ صرف چند صوبوں کو چھوڑ کر باقی سارے ملک کی زبان اردو قرار پائی، جس میں مسلم وغیر مسلم دونوں شامل تھے۔ البتہ مسلمانوں نے علی العموم اسے اپنی مادری زبان بھی بنالیا۔ اس شیریں و دل کو چھو لینے والی پیاری زبان نے ملک کی آزادی میں بڑا کلیدی و تاریخی رول ادا کیا۔ اس زبان کے شعروں، مستانہ نعروں نے انگریزی حکومت پر لرزہ طاری کردیا۔

سر کٹانے کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ۔۔۔ دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
دیش پہ قربان ہوتے جاؤ اے ہندیو ۔۔۔ زندگی کا راز مضمر خنجر قاتل میں ہے

بڑھے چلو! بڑھے چلو! بہادرو بڑھے چلو! نشان ہمارے ہاتھ ہے یہ چھوٹی فوج ساتھ ہے۔ نشان کبھی جھکے نہیں۔ قدم کبھی رکے نہیں۔

بڑھے چلو، بڑھے چلو، انقلاب زندہ باد، زندہ باد، سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا سکتے نہیں! وغیرہ کے نعرے زبان زدعام ہوچکے تھے۔ اردو زبان کی انقلابی کوششوں سے ملک آزاد ہوا۔ پاکستان بن جانے کے بعد یہاں رہ جانے والے ہندی مسلمان کو جرمِ بے گناہی کی جو سزائیں دی گئیں ان میں سے ایک بڑی سزا ان کی مادری زبان اردو کو چھین لینے کی سرکاری و نیم سرکاری وغیر سرکاری کوشش بھی ہے۔ جبکہ یہ ایک مسلّم امر ہے کہ کسی قوم کو من حیث القوم ختم کردینے کے

اتنا بہت کافی ہے کہ اس سے اس کی مادری زبان چھین لی جائے۔ اور یہ گھناؤنی کوشش یہاں ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے لے کر اب تک ہو رہی ہے۔

یہ تو کہیے کہ خود اردو ہی اتنی سخت جان ہے کہ اسے نیست و نابود کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسے اپنی مادری زبان بنا لیا ہے۔

آج ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے سیکڑوں ہزاروں مدارس و مکاتب اور دینی ادارے اردو کی تعمیر و ترقی اور تحفظ و بقا کی ضمانت بنے ہوئے ہیں۔

اردو زبان کے تعلق سے حکومت کے سخت بے رحمانہ و سرد رویے پر تو قومی سطح کے شاعر بھی چیخ پڑے ہیں۔ اردو دشمن طاقتوں نے سیاسی و نیم سیاسی سطح پر اردو کو جتنا ہی دبانے کی کوشش کی، سرکاری و نیم سرکاری و قومی اداروں سے نکال باہر کیا۔ مگر اللہ رے اس زبان کی سخت جانی و دل آویزی کہ وہ اتنی شدت سے ابھری اور وطن سے بے وطن ہو کر اس نے ایسی سرخروئی حاصل کی کہ آج یہ دنیا کی سب سے بڑی تیسری زبان بن چکی ہے۔ یہ ملک جہاں پیدا ہوئی، پھلی، پھولی اور پھلی پھیلی، اپنی ہر دل عزیزی و دل آویزی کے سبب ملک کو غلامی سے آزاد کرانے میں ساری زبانوں سے زیادہ اہم و کلیدی رول ادا کیا۔ اور جب اس زبان کی قربانیوں کی بدولت ملک آزاد ہوا۔ (تو صرف اس جرم میں کہ مسلمانوں کی مادری زبان بھی بن چکی ہے) اسے بجائے انعامات سے سرفراز کر کے معتوب قرار دے کر تمام سرکاری و نیم سرکاری و قومی اداروں سے نکال باہر کر کے اس پر زندگی کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔

آزادی کامل کا اعلان ہوا جس دن معتوب زباں ٹھہری غدار زبان ٹھہری

البتہ مسلمانوں کے ووٹوں کی خاطر اردو زبان کے تعلق سے ہمیشہ انہیں سبز باغ دکھایا گیا۔ طفل تسلیاں دی جا رہی ہیں۔ مسلمانوں کے ووٹوں کو کیش کرنے کے لیے ان کے گرد بڑے پُر فریب جال بچھائے جاتے رہے۔ کبھی کسی بڑے اردو شاعر کے جنم دن پر کوئی مشاعرہ کرا دیا گیا۔ کسی کو ایوارڈ سے نواز دیا۔ اور ایک قدم آگے بڑھ جگہ جگہ اردو اکاڈمیاں قائم کر دیں۔ اور اس کے صدر و سکریٹری و ممبران کی شکل میں صرف اپنے نمک خواروں کو اپنی نوبت بجانے کے لیے چوبدار رکھ دیا گیا ہے۔

بہت برسوں پہلے یہاں ممبئی میں اردو کے مشہور و عظیم شاعر مرزا غالب کے جنم دن پر ایک جشن جشنِ غالب کے نام سے برپا ہوا تھا وہ بھی ایک مشاعرے کی شکل میں۔ جس میں بڑے بڑے قومی سطح کے شاعر بھی جمع ہوئے تھے۔ اردو زبان کے تعلق سے سرد و بے رحم رویے سے جل کر ایک بلند قامت شاعر ساحر لدھیانوی نے ایک نظم پڑھی جس میں تلخ حقائق کی آنچ و حکومت کے نکروہ و گھناؤنے جذبے و بے رحم عزائم کی پردہ داری تھی۔ اردو زبان کے متعلق حکومت کی نیت کیا تھا، اس سے ایک اندازہ ہوگا۔

اکیس برس گذرے آزادی کامل کو تب جا کے کہیں ہم کو غالب کا خیال آیا

تربت کہاں ہے اس کی مسکن کہاں تھا اس کا ‏ ‏ اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں خیال آیا
سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی! ‏ ‏ اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا ‏ ‏ یہ جشن یہ ہنگامہ خدمت ہے کہ سازش ہے
جس شہر میں گونجی تھی غالب کی نوا برسوں ‏ ‏ اس شہر میں اب اردو بے نام ونشاں ٹھہری
آزادی کامل کا اعلان ہوا جس دن ‏ ‏ معتوب زباں ٹھہری غدار زباں ٹھہری
جس عہد سیاست نے یہ زیدہ زباں کچلی! ‏ ‏ اس عہد سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہے
غالب جسے کہتے ہیں اردو ہی شاعر تھا ‏ ‏ اردو پہ ستم کر کے غالب پہ کرم کیوں ہے

اپنے وطن سے بے وطن ہو کر یہ زبان بڑی قیمتی وسرخرو ہوگئی واقعی ۔

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

حقیقتاً وطن سے بے وطن اس زبان کو بڑی عزت، بڑی توقیر، بڑی پذیرائی اور بڑی اہمیت دی گئی۔ حد یہ کہ دنیا کی اہم ترین نیوز ایجنسیوں اور اہم ترین میڈیوں نے اپنی اپنی خبروں کی ترسیل کے لیے اسے اپنے یہاں بڑا نمایاں مقام دیا ہے۔ بی بی سی لندن، وائس آف امریکہ، وائس آف جرمنی، وائس آف چائنا، وائس آف روس، سعودی عرب، دوبئ، ایران، پاکستان، سری لنکا، بنگلہ دیش یہ دنیا کے اہم ترین ذرائع ابلاغ ہیں۔ جنہیں اردو زبان کی اہمیت و ہمہ گیری کا نہ صرف ادراک بلکہ شدید احساس بھی ہے۔

البتہ یہ ملک جو اردو کا مادرِ وطن ہے۔ جس کی اس وطن عزیز کے لیے بڑی خدمات وقربانیاں ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں بیس کروڑ مسلمانوں کی خوشنودی کے لیے یہ حکومت اگر چند منٹ اپنے ذرائع ابلاغ میں اردو کو جگہ بھی دیتی ہے۔ تو ہندی لفظوں کی آمیزش کے ساتھ جناب کی جگہ شری اور وزیر اعظم کی جگہ پردھان منتری وغیرہ وغیرہ کے ساتھ بدلے اور بگڑے ہوئے ملکی وسیاسی حالات کا ہی نتیجہ ہے کہ یوپی و بہار میں جزوی طور پر ایک حیثیت دی بھی گئی ہے تو وہ بھی صرف اعلان کی حد تک، عمل کے راستے میں ابھی ایک ناقابلِ عبور صحرا حائل ہے[1]۔

البتہ اردو ہندوستان میں زندہ، پائندہ، درخشندہ وتابندہ ہے تو وہ مسلمانوں کے مدرسوں ومکتبوں و پرائیویٹ اسکولوں اور دینی اداروں میں مدارسِ اسلامیہ کے مضبوط حصاروں میں۔ اردو ادب کے ذاتی ایوانوں ولاچتیر یریوں میں مسلمانوں کے گھر وآنگن میں۔ اور کچھ غیر مسلم اردو دوستوں کے حلقۂ محبت میں جن کی حیثیت صرف استثنائی ہے۔ جیسے کالیداس، گپتا

---

[1] ابھی نومبر ۱۹۹۴ء میں صرف ۱۰ منٹ کے لیے نیوز سروس اردو میں شروع ہوئی تو اردو دشمنوں نہیں بلکہ اسلام دشمنوں نے بنگلور کے مسلمانوں اور ان کی کروڑوں کی پراپرٹی کو جلا ڈالا، اور جانے کتنے بے گناہ جان ہی سے مار دیئے گئے حالانکہ اس کے لیے مسلمانوں نے کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا تھا کہ ٹیلی ویزن بنگلور سے اردو نیوز سروس شروع کی جائے۔ وارث جمال قادری۔

رضا، کرشن بہاری نور وغیرہ۔

گفتگو ہو رہی تھی فارسی وعربی زبان پر درمیان میں اردو زبان کا ذکر مادری زبان کے ضمن میں ناگزیر ہو گیا۔ آئیے پھر اسی طرف واپس چلیں۔

ہندوستان میں فارسی زبان کی افادیت ونوعیت ملاحظہ فرمایا جا چکا ہے۔ اب رہ گئی بات عربی زبان وادب کی۔ تو اس خصوص میں شمالی ہندوستان کی تمام درسگاہوں کا حال تقریباً یکساں ہے۔ وہاں یہ عربی زبان وادب کے حصول کی کوششیں تو ضرور کرائی جاتی ہیں۔ اور اس کے لیے نحو، صرف کے قوانین کی کتابیں بھی ازبر کرائی جاتی ہیں۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ لکھنے، بولنے یا اختصار کے ساتھ تقریر کی نوبت آجائے تو صنائع بدائع واسالیب بلاغت کی بات تو بڑی بات ہے فی البدیہہ روانی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ تقریباً ہر درسگاہ کے فضیلت مآبوں اور ان کے اساتذہ کا حال ایک جیسا ہے، اقلِ قلیل چند استثنائی افراد کے علاوہ جو اپنی درسگاہ کی نیک نامی کی علامت بن جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنی خداداد صلاحیتوں، ذاتی کاوشوں اور پُرخلوص جدوجہد سے یہ دشوار گزار گھاٹی عبور بھی کر لیتے ہیں تو غالب ترین اکثریت کے مقابلے میں ان کا پرسنٹز ہی کتنا ہوتا ہے؟

اسلامی روح اور اس کی فکر کی گہرائی وگیرائی تک علی العموم رسائی اس لیے نہیں ہو پاتی کہ جس زبان کے ذریعے اس کی روح تک پہنچنا ہوتا ہے، اسی پر عبور نہیں!

حالانکہ یہ قرآن کی زبان ہے۔ اسی زبان کی اسالیب بلاغت پر قرآن بھی نازل ہوا۔ یہی حدیث واصولِ حدیث، فقہ واصولِ فقہ اور اسماء الرجال کی زبان ہے۔ اسلامی علوم وفنون اور اس کے قوانین کا ذخیرہ بھی اسی زبان میں ہے۔ ایک طرح سے حاملین کتاب وسنّت کے لیے اس زبان کا حصول واجب کی منزل میں ہے۔ عام مسلمانوں اور جدید عصری دانش کدوں کا ذکر ہی کیا۔ جبکہ حاملین علومِ نبوت اور ان کی بڑی بڑی درسگاہیں مایوس کن کردار ادا کر رہی ہوں تو اس کا شکوہ کہاں؟ کیسے؟ اور کس سے کیا جائے؟ ؎

میں اس شہرِ گل میں زخم کا چہرہ کسے دکھاؤں

جبکہ عربی زبان اپنی افادیت واہمیت میں بین الاقوامی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اسلامی دینی اور مذہبی ضرورت کے ساتھ سخت ترین معاشی ضرورت بھی بن چکی ہے۔

زکوٰۃ، صدقات، عطیات کی شکل میں ملک وبیرونِ ملک سے کروڑوں روپئے عربی درسگاہوں کو ملتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی مثبت وٹھوس نتیجہ ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے؟

مدارسِ عربیہ کی قرار واقعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے شیخ الاساتذہ سند المدرسین حضرت علامہ مفتی شاہ بدر الدین احمد قادری رضوی کہ جن کے اخلاصِ عمل، تقویٰ خداوندی، خشیت الٰہی کا احساس واعتراف اپنوں، غیروں، سبھوں کو ہے۔ جن کے درس وتدریس کی مہارت مسلّم!

جنہوں نے اسلامی مکاتب کے بچوں کے لیے ابتدائی درجے سے لے کر پانچویں درجے تک تعمیر ادب کے نام سے ایک بہت کامیاب کتاب لکھی۔ اور عربی درسگاہوں کے طلبا کے لیے چند بے حد اہم اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت منفرد کتابیں لکھیں، جو تمام مدارسِ اسلامیہ میں داخلِ نصاب ہیں۔ ان کے احساسات سے آگاہی حاصل کریں۔ وہ ایک مشہور دینی درسگاہ مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا پوسٹ کھنڈسری بازار ضلع سدھارتھ نگر یوپی۔ کے زندگی کی آخری سانسوں تک صدر المدرسین رہے۔ اسی ادارے کی سالانہ روداد ۱۳۹۵ھ میں وہ رقمطراز ہیں:

موضوع ہے علمِ نافع و عملِ صالح جس کے تحت آپ یوں فرماتے ہیں:

یہ حقیقت پوست بر کندہ ہے کہ دین برحق کی زندگی اور اس کی بقا اسلامی تعلیم و کردار سے وابستہ ہے یہی وجہ ہے کہ زمانہ گذشتہ کے مسلمانوں نے اپنے خرچ سے ایسی تعلیم گاہیں قائم کی تھیں۔ جن میں طلبا کو تفسیر و حدیث، عقائد و فقہ کا درس دیا جاتا اور ان کا کردار پختہ کیا جاتا۔ پھر یہی طلبا عالمِ دین کی سند پا کر اپنی تعلیم گاہ سے باہر آتے تو فساق و فجار مسلمانوں کا سدھار کرتے، بدمذہبوں کے عقائد فاسقہ کی اصلاح کرتے، حلال وحرام سے ناواقف مسلمانوں کو احکامِ شرع سے آگاہ کرتے، ملحدوں کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا قلع قمع کرتے۔ مسلمان ان کے بلند کردار، سنجیدہ گفتار، پاکیزہ رفتار کو دیکھ کر ان کا پورا احترام کرتے۔ اور غیر مسلم ان کی عالمانہ شان وشوکت سے متاثر ہو کر ان کو عزت وعظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مگر افسوس علم وعمل کا یہ خوشگوار ماحول بالکل بگڑ چکا ہے۔ دورِ حاضر کے فارغ التحصیل علماء ان میں اکثر وبیشتر حضرات تقاضائے دین سے نا آشنا، ان کا دامن علمِ نافع سے خالی۔ ان کے پاس عملِ صالح کی کوئی پونجی نہیں، ان کے کردار اور عام فاسقوں کے اعمال میں کوئی امتیاز نہیں۔ ان کے طرزِ عمل سے اسلامی معاشرہ سدھرنے کے بجائے بگڑتا جا رہا ہے۔ ان کا ٹڈی دل لشکر موجود ہے، مگر پھر بھی مسلمانوں کی دینی حالت پست ہے۔ اس تشویشناک صورتِ حال کا سبب بالکل ظاہر ہے۔ ادارے قائم ہیں، دینی تعلیم کے لیے۔ مسلمانوں سے چندہ لیا جاتا ہے، اسلامی تعلیم کے نام پر۔ مگر افسوس ان تعلیمی اداروں میں نہ تو علمِ نافع کی لگن ہے، نہ عملِ صالح کا کوئی پُرسانِ حال! بس لے دے کر گنی چنی درسی کتابوں کے شروع کے چند صفحات کی تدریس ہے اور پھر کاپیوں میں لکھے ہوئے مخصوص نوٹوں کو رٹا رٹا کر مولوی عالم فاضل کا امتحان دلانا اور جلسۂ عام میں امیدواروں کی دستار بندی کرا دینا۔ ان الحاق مولویوں ومولاناؤں میں اکثر کا حال یہ ہے کہ علامہ ہوتے ہوئے صحیح طور پر میزان ومنشعب کا درس نہیں دے سکتے۔ ان کو نہ تو دینیہ کی خبر ہے نہ مسائل شرعیہ کی، نماز وروزہ کے موٹے موٹے مسائل سے بھی ناواقف ہیں۔ صورت فاسقانہ، سیرت ملحدانہ پھر ان لوگوں سے حمایت دین اور احیاء شریعت کی امید رکھنا سانڈ سے دودھ دوہنا ہے۔ (اتم کلامہ)

علامہ بدرالدین احمد قادری کے ان احساسات کو بار بار پڑھیں اور غور فرمائیں آج اسلامی درسگاہوں کے فضیلت مآبوں کی اکثریت کا یہ حال کیوں ہے۔ بڑے بڑے مرکزی ادارے ایسے نااہلوں کو سند فراغت ودستارِ فضیلت دیتے ہی کیوں ہیں؟

کیا یہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا نہیں؟ جبکہ ان خاصانِ خدا کی قرار واقعی علمی لیاقت سے ذمہ دارانِ ادارہ اور ان کے اساتذہ آگاہ ہیں تو پھر ان نااہلوں کو اہلیت کی سند دے کر اسلامی علوم کو ذلیل ورسوا کرنا نہیں تو پھر اور کیا ہے؟

آج مدارسِ عربیہ کی اس پستی وزبوں حالی کا ذمہ دار کون ہے؟

مدراسِ عربیہ کا ایک بے حد تاریک و مایوس کن پہلو یہ بھی ہے کہ وہاں کے سند یافتہ حضرات جب میدانِ عمل میں قدم رکھتے ہیں تو انہیں بڑی حیرانی و مایوسی ہوتی ہے۔ ایک معمولی ملازمت بھی ان کے لیے جوئے شیر کے مترادف ہوتی ہے۔ اچھے اور صاحبِ صلاحیت افراد بھی حالات کی بے رحمی کے ایسے شکار ہوتے ہیں کہ جنہیں دیکھ کر دل زخمی ہوجاتا ہے۔

خدایا! یہ دس برس عمر کا قیمتی حصہ صرف کرنے کے بعد علمِ دین حاصل کرنے والے اپنی معاش اور خانگی ضرورتوں کے لیے حسرت و یاس، بے کسی و بے بسی کی تصویر بنے کیوں مارے مارے پھرتے ہیں۔ مساجد و مدارس و مکاتب کے علاوہ بہت کم لوگ اپنے آپ کو کسی اور جگہ فٹ کر پاتے ہیں۔ ہر سال مختلف اداروں سے فارغ شدگان کے مقابلے میں مساجد و مکاتب و مدارس تو بہت کم ہوتے ہیں۔

قابلِ ذکر مرکزی اداروں کے ذمہ داران جن کا بجٹ لاکھوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے تعلیمی بجٹ کے ساتھ محدود پیمانے ہی پر سہی کوئی ٹیکنکل بجٹ کیوں نہیں بناتے؟ جیسے ٹیلرنگ، ٹائپنگ، ڈرائیونگ، گھڑی سازی، کمپیوٹرنگ وغیرہ وغیرہ تاکہ ان کی درسگاہ کا پڑھا ہوا کسی دینی شعبے میں اگر جگہ نہ پاسکے تو اپنے کسی ہنر کے ذریعے باعزت روزی تو حاصل کرسکے جیسے کہ ساؤتھ یعنی جنوبی ہند کی دینی درسگاہیں جہاں پر دینی وعصری تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ صنعت وحرفت کے شعبے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔

یہاں پر ہم جنوبی ہند کی صرف دومرکزی دینی درسگاہوں کا ذکر کریں گے۔ ایک جامعہ سعدیہ عربیہ سعد آباد، ویلی کلناڈ کاسرگوڈ کیرالا کا جو صرف تیئس سال کے اندر ایک ذاتی مکان سے شروع ہوکر علم وادب کے ایک کمپلکس کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ جس میں پندرہ شعبے، ایک سو پچیس اساتذہ وملازمین اور پندرہ سو طلبا زیرِ تعلیم ہیں۔ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ملیالم کے علاوہ عربی، انگریزی اور اب بحمدہٖ تعالیٰ اردو زبان بھی ہوگئی ہے۔ جہاں دینی، مذہبی وعصری تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک شعبہ صنعت وحرفت کا بھی ہے۔

دوسرا دینی ادارہ جو کیرالا کا سب سے بڑا ومرکزی ادارہ ہے، وہ جامعہ مرکز الثقافۃ السنیہ ہے۔ یہ جنوبی ہند میں سب سے عظیم اسلامی درسگاہ ہے، جو کیرالا کے مسلمانوں کے لیے خصوصاً پورے ملک کے مسلمانوں کے لیے عموماً سرمایۂ افتخار ہے۔ جو اٹھارہ شعبوں پر مشتمل ہے۔ جہاں پانچ ہزار طلبا دینی ومذہبی تعلیم کے ساتھ ہی عصری علوم بھی حاصل کرتے ہیں۔ جہاں صنعت وحرفت کا ایک شعبہ مصروفِ عمل ہے۔ اسے علوم وفنون کا ایک مستقل شہر کہا جاسکتا ہے۔ جس کا یومیہ بجٹ ساٹھ ہزار روپئے ہے۔

ان دواداروں کے علاوہ چھوٹے ومتوسط درجے کے مکاتب، مدارس اور جامعہ کی تعداد ساٹھ ہزار ہے، جو کیرالا سنّی

تعلیم بورڈ کے زیر نگرانی چلتے ہیں۔ اس بورڈ کا تیار کردہ نصابِ تعلیم ان سات ہزار چھوٹے بڑے ادارے میں نافذ ہے۔ اسی بورڈ کے تحت ان مدارس کا سالانہ امتحان بھی ہوتا ہے۔ وہی بورڈ امتحانی پرچہ بھی تیار کرتا ہے۔ اور مدارس کے امتحانات اسی بورڈ کے تحت ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ وہی بورڈ انہیں سند بھی دیتا ہے۔ اتنے سب کام صرف ایک مرکز جمیعۃ علماء اہل السنۃ والجماعت کے تحت ہوتے ہیں **فلحمدللہ علےٰ ذالک۔**

مگر ہم جنوبی ہند کی ان عظیم درسگاہوں سے کوئی سبق حاصل نہیں کر سکے کہ ہم ان سے ایسے لاتعلق و بے خبر ہیں کہ جیسے وہ ملک کا خوش حال، ترقی وصدفی صد تعلیم یافتہ حصہ برصغیر ہند کے بجائے کسی دوسرے براعظم میں بسا ہو۔ ہمیں لندن و برطانیہ، امریکہ و ہالینڈ کے مذہبی حلقوں اور ان کی خدمات کی خبر تو ہے مگر ہم اپنے اس ملک میں آباد ایک خطے سے بالکل بے خبر ہیں۔ دیوارِ برلن تو گر گئی مگر نارتھ وساؤتھ کے درمیان جو دیوارِ چین حائل ہے، اسے ابھی ہم گرا نہیں سکے۔

جنوبی ہند کی درسگاہیں اور ان کے علماء کی خاموش مگر ٹھوس علمی و دینی خدمات باعث رشک صد ہزار ہے۔ وہ بڑی خاموشی کے ساتھ دن رات مصروفِ عمل ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کام کم پروپیگنڈہ زیادہ ہے۔ تعلیمی معیار کی ابتری اور اس کی پستی پر نظر نہیں البتہ تعمیری دوڑ میں مقابلہ آرائی ہی سب سے بڑی علمی خدمات کے مترادف ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ دارالتفسیر ہے، یہ دارالحدیث ہے، یہ دار الفقہ ہے۔ یہ دارالمطالعہ کی عمارت ہے۔ یہ دارالاقامہ ہے۔ (جو سڑی اور شدّت کی گرمی میں پنکھوں سے محروم ہے۔) وغیرہ وغیرہ۔ مگر اتنی بڑی بڑی عمارتوں کے درمیان کہیں کوئی ایسی عمارت نظر نہیں آتی، جس پر دارالصّنائع کا بھی بورڈ ہو۔

مسلم سائنسدانوں کا ایک اجمالی خاکہ

جہاں البیرونی، الغزالی، ابن رشد، جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی وغیرہ کا ذکر آیا ہے تو یہ اسلامی دورِ عروج کے یہ وہ مسلم سائنس داں اور ذہن عربی وفکر اسلامی کے وہ عظیم شاہکار ہیں جن کی دورونزدیک دوسری کوئی مثال نہیں۔ انہوں نے ہی طب، جراحی، کیمیا، نباتات، فلکیات، ریاضی وطبعیات و دیگر سائنسی علوم وفنون میں اپنے علم وتحقیق اور تجربے سے پوری دنیائے انسانیت پر احسانِ عظیم کیا۔ انہیں کی فراہم کردہ اساس پر آج سائنس وجدید ٹیکنالوجی کی محیر العقول عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ یہی وہ ذہن عربی وفکر اسلامی کے نمائندے ہیں جن کے فکری کارناموں سے ایشیا و یورپ و امریکہ مستفیض و مستنیر ہوا۔ اور پھر اسی اسلامی وفکری اساس پر مغربی سائنسدانوں نے اپنے علم وتحقیق کو آگے بڑھایا۔ اور اسی سے روشنی حاصل کرتے ہوئے نت نئی ایجادات کا سہرا وہ اپنے سر باندھنے لگے۔

یہی وہ اصحابِ علم وفضل اور والیانِ فکر وذہن ہیں جنہوں نے اسلامی تمدن کے دورِ عروج میں نئے نئے فنون ایجاد کیے اور قدیم علوم فنون میں نئی نئی موشگافیاں کیں، انہیں نئی نئی جہتیں اور نئے نئے آفاق فراہم کیے۔ انہوں نے مردہ علوم کو نئی زندگی اور فرسودہ علوم کو حیاتِ تازہ سے ہمکنار کیا۔

بے شک مسلم سائنسدانوں وذہن عربی وفکر اسلامی کے عظیم شاہکاروں کی فہرست بڑی طویل اور ان کا ایک شاندار

سلسلہ ہے، جو دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک روشن اور حیرت انگیز کڑی امام احمد رضا بریلوی بھی ہیں۔ ایشیا و یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں جن کی طرف متوجہ ہو چکی ہیں۔

یہاں ہم ان حاملین فکر و فن کی ایک مختصر سی فہرست اور ان کا اجمالی تذکرہ کریں گے جن کے علمی و فکری اور عظیم کارناموں سے دنیائے انسانیت ممنون و مشکور ہے۔

جابر بن حیّان:۔ (م: ۱۰۴ھ ۔ ۸/۸/۷۲۱ء میں) ابوموسیٰ جابر بن احمد بن حیان یہ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے کارناموں کا رعب و جلال آج بھی یورپ پر قائم ہے ۷۶ھ ہی میں ایک کامل طبیب و ماہر کیمیا کی حیثیت سے شہرت حاصل ہو چکی تھی، اسے کیمسٹری کا بانی کہا جاتا ہے۔ یہی وہ ماہر کیمیا ہے جس نے جدید کیمسٹری کی بنیاد رکھی اور طرح طرح کے تیزاب ایجاد کیے، سونے کو گلا دینے والا تیزاب بھی اسی نے ایجاد کیا تھا۔

الغرض اس کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، جس کے لیے مستقل ایک کتاب چاہیے۔ اسے حضرت سیّدنا امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شرفِ تلمذ بھی حاصل تھا۔

البیرونی:۔ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (م: ۴۳۹ھ ۱۰۶۸ء) برصغیر کا پہلا عظیم جغرافیہ داں، ارضیات و علمِ ہیئت، طول البلد و عرض البلد، طبقات الارض کا زبردست ماہر، مورخ و سیاح، دھاتوں کی کثافت اضافی معلوم کرنے والا پہلا عظیم سائنسداں ۹۷۳ء میں جو ایران کے ایک شہر خوارزم میں پیدا ہوئے۔

الغزالی:۔ (م: ۵۰۵ھ ۔ ۱۱۱۱ء) اسمِ گرامی محمد، لقب حجۃ الاسلام، عرفیت غزالی اور شہرتِ عام امام غزالی سے۔ اسلام کے مجدد، عالمِ اسلام کی عظیم المرتبت و قابلِ احترام علمی و دینی شخصیت اور ایک عظیم روحانی پیشوا، فلسفۂ یونان کے مقابلے میں فلسفۂ اسلام کے گویا ایک طرح کے موجد، علمِ کلام کے امام اعظم، جدید فلسفۂ اخلاق کے بانی، علمِ نفسیات و فلسفہ کے عظیم محقق، جن کے علمی شوکت و دبدبے سے پوری دنیائے علم و فضل مرعوب و متاثر و مستفیض ہے۔

اہلِ مغرب کی گردنیں بھی جس کے وقارِ علم و فضل کے آگے خم ہیں۔ ان کے بعد دنیا پھر کوئی اور امام غزالی پیدا نہیں کر سکی۔ خراسان کے مشہور ضلع طوس میں پیدا ہوئے۔ ۲۸ سال ہی کی عمر میں پوری دنیائے اسلام میں ان کے علم و فضل کی دھوم اور ان کی ناموری کی شہرت پھیل چکی تھی۔ ۱۴ جمادی الآخر ۵۰۵ھ طوس ہی میں وصال فرمایا اور وہیں آپ کی آخری آرام گاہ بھی ہے۔

ابن سینا:۔ (م: ۴۲۸ھ/ ۱۰۳۸ء) شیخ حسین عبداللہ بن علی بن سینا بخارا کے قریب افشنہ نام کے ایک مقام پر ۹۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ طبعیات والامراض کے شعبے میں بڑا کمال حاصل تھا۔ ابن سینا اپنے وقت کا سب سے بڑا طبیب، فلسفی، عالم، ریاضی داں اور ماہر فلکیات تھا۔ اس کی دو کتابوں کی بے پناہ شہرت ہوئی۔ القانون (جسے قانون ابن سینا سے بھی کہا جاتا ہے) اور الشفاء۔ کہا جاتا ہے کہ علمِ طب کا بحیثیت فن موجد بقراط ہے۔ حکیم جالینوس نے اسے نئی زندگی دی۔ الرازی نے اسے اکٹھا کیا اور ابن سینا نے اسے تکمیل کے آخری مرحلے تک پہنچا دیا۔

الرّازی:۔ ابوبکر محمد بن زکریا رازی ۸۶۴ء میں ایران کے ایک شہر رے میں پیدا ہوا۔ وہ طب، ریاضی، ہیئت، کیمیا کا زبردست عالم اور علمِ جراحی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ آنکھوں اور جلد کی بیماریوں کے لیے اس نے کئی دوائیں ایجاد کیں۔ چیچک اور خسرہ کو اسی نے دو الگ مرض ثابت کیا اور اس کے لیے علاج بھی دریافت کیا۔ وہ اتنا عظیم طبیب تھا کہ دور دور تک اس کی دوسری کوئی مثال نہیں تھی۔ اس کی کتابوں نے دنیائے طب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ایک بڑا کیمیاداں بھی تھا اور اس موضوع پر اس نے ایک اہم کتاب، کتاب الاسرار کے نام سے لکھی تھی جو ایک طویل عرصے تک یورپ کی درسگاہوں میں داخلِ نصاب تھی۔

سلفیورک ایسڈ اور دوسرے کئی تیزاب اس نے ایجاد کیے۔ گنّے کے رس سے الکحل سب سے پہلے اسی نے ایجاد کیے۔ وہ ایک عظیم طبیب و ماہر کیمیا ہونے کے ساتھ ہی وہ ایک بڑا فلسفی بھی تھا۔ اس نے سائنس پر دو سو سے زیادہ کتابیں لکھیں جس میں بیس کتابیں صرف کیمیا ہی کے موضوع پر تھیں۔

الطبری:۔ علی بن سہل الطبری ایران کے مشہور صوبے طبرستان میں ۸۳۸ء میں پیدا ہوا۔ اپنے زمانے میں وہ طب و فلسفہ کا امام تھا۔ طب، فلسفہ، طبعیات میں اس نے اہم و یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ اس کی عظمتوں کے لیے اتنا بہت کافی ہے کہ وہ زکریا رازی کا استاد تھا۔

الفارابی:۔ حکیم ابونصر محمد بن فارابی (م: ۳۳۸ھ/ ۹۵۰ء) ایک ترک جنرل کا بیٹا تھا جو ترکستان کے ایک گاؤں فاراب کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے علمی کارناموں کی دھمک پوری دنیا میں ہے۔ طبعیات، جیومیٹری، کیمیا، فلسفۂ طب، سیاست، اخلاق، موسیقی اور علمِ نجوم کا ماہر تھا۔ موسیقی میں اسے ایسا کمال حاصل تھا کہ مغربی سائنس آواز پر جس طرح کی تحقیق کر رہی ہے، ہزار سال پہلے ہی وہ اس طرح کے تجربات سے گزر چکا ہے۔ سائنس و حکمت پر اس نے بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ تقریباً ہر قابلِ ذکر موضوع کا احاطہ اس کا علم و ادراک کیے ہوئے ہے۔ اس نے کل کتنی کتابیں تصنیف کیں اس کا صحیح علم مولیٰ عزّوجل جو علیم و خبیر ہے اسی کو ہے۔ البتہ اس کی ایک سو سترہ کتابوں کا علم دنیا کو بھی ہے۔

ابن الہیثم:۔ ابوعلی حسن ابن الہیثم (م: ۴۳۰ھ/ ۱۰۲۱ء) ۹۵۶ء میں پیدا ہوا۔ بصرہ ہی میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ یہ عظیم سائنسداں مختلف علوم و فنون بالخصوص آنکھوں کے سلسلے علم البصریات میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ اس نے بڑے بڑے سائنسی کارنامے انجام دیئے بالخصوص آنکھوں کے سلسلے میں دنیائے انسانیت کے لیے اس کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اس خصوص میں اپنے زمانے کا امام برحق تھا۔

علمِ نور کا عظیم ماہر اور انعطافِ نور کے نظریے کا دریافت کرنے والا، آنکھوں کی پتلیوں کے محقق اور کیمرہ کے حقیقی موجد!

ابن البیطار:۔ ابومحمد ابن عبداللہ ابن البطار، ان کے والد مویشیوں کے علاج کے ماہر حکیم ضیاء الدین جو اس نسبت سے البطار کہلائے۔ ابن البطار ایک عظیم مسلم سائنسداں جڑی بوٹیوں کا ماہر تھا۔ اور علمِ نباتات کا امام! دنیائے انسانیت کے لیے جس کی بڑی خدمات ہیں۔

ابن رشد: محمد بن احمد ابن رشد (و: ۱۱۲۶ء، م: ۱۱۹۸ء) قرطبہ (اندلس) موجودہ اسپین میں پیدا ہوا۔ اعلیٰ درجے کا طبیب، فلسفی، ریاضی داں، ماہر فلکیات تھا۔ انہوں نے ہی چیچک پر تحقیق کی، اس کا علاج دریافت کیا اور اس پر اہم طبی معلومات کا ذخیرہ جمع کیا۔ اسی عظیم انسان نے زیرو یعنی صفر ایجاد کیا، جو آج علم الحساب کا سب سے اہم و بنیادی ستون ہے۔ چیچک کے علاج کا سہرا مغربی سائنسداں جو اپنے سر باندھے ہیں، یہ سراسر جھوٹ ہے۔ اسی طرح کے ذہن عربی وفکر اسلامی پر یورپ نے اپنے کارناموں کی عمارت سجائی ہے۔

الفرغانی:۔ ابو العباس احمد الفرغانی عہد مامون رشید کا عظیم سائنس داں اور رصد گاہِ مومون کا نگراں وسربراہ۔ جس کی پوری زندگی کارناموں سے عبارت ہے۔ اس نے بہت سے سائنسی آلات ایجاد کیے۔ خصوصاً آلہ محیط زمین جس کی مدد سے زمین کا محیط معلوم کرنا آسان ہوا۔

ابو القاسم زہراوی:۔ ۹۳۶ء میں اندلس کے مشہور شہر قرطبہ کے مشہور اہم تاریخی جگہ مدینۃ الزہراء میں پیدا ہوا۔ اسی نسبت سے زہراوی کہلایا۔ دورِ جدید کے سرجری کا سہرا اسی مسلم سائنسداں کے سر ہے۔ پہلی سرجری کے آلات اسی نے بنائے۔

محمد موسیٰ خوارزمی:۔ (م: ۲۳۲ھ/ ۸۵۰ء) مشہور ریاضی داں اور الجبرا کا موجد۔

احمد بن موسیٰ:۔ (م: ۲۴۰ھ/ ۸۵۸ء) دنیا کا پہلا مکینکل انجینئر!

احمد بن محمد علی مسکویہ:۔ (م: ۴۲۱ھ/ ۱۰۳۲ء) علمِ سماجیات، حیوانات، نباتات، نفسیات اور اخلاقیات کے عظیم محقق نباتات میں زندگی اور حیوانات میں حِس اور دماغی ارتقاء میں دریافت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

عمر خیّام:۔ (م: ۱۱۲۳ھ) جن کی رباعیوں کی شہرت ہر زمانے اور ہر ہر دور میں پوری دنیا میں تھی اور ہے اور رہے گی۔ ان کی اسی شہرت کی وجہ سے انہیں عام طور پر صرف ایک عظیم شاعر کی حیثیت سے جانا گیا۔ حالانکہ وہ ایک زبردست عالم اور فلسفہ و ریاضی کے گویا اپنے دور کے امام تھے۔ وہ تاریخ عالم کی عظیم شخصیت خواجہ نظام الملک الطوسی و بانی مدرسہ نظامیہ بغداد (جس کے امام غزالی، غوث اعظم محی الدین جیلانی جیسی شخصیتیں طالب علم رہ چکی ہوں) اور حسن بن صباح کے رفیق درس بھی تھے۔ جن کے علم وفضل کے سامنے فلسفۂ یونان کا طمطراق سرنگوں ہو گیا۔ وہ ایک عالم و فاضل فلسفی و ریاضی داں بھی پہلے تھے شاعر بعد میں۔ لیکن یہ تاریخی ٹریجڈی ہے کہ جو وصف ان کے لیے ثانوی تھا، اسی سے اس کو شہرتِ دوام ملی۔ اور علی العموم وہ ایک شاعر کی حیثیت ہی سے دنیا میں جانے جاتے رہے۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ:۔ اسی عظیم سلسلے کی ایک روشن کڑی اور گل سرسیّد امام احمد رضا بریلوی بھی ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں انسانی فضل و کمال کی تاریخ میں جن کا وجود ایک جہانِ حیرت تھا۔

افغان نسل کے ایک خوشحال گھرانے میں بریلی شریف کی سرزمین پر ۱۰رشوال المکرم ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴رجون ۱۸۵۶ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ اپنے والد ماجد حضرت علامہ نقی علی خاں سے تحصیل علوم کی۔ ۱۴رسال کی عمر میں جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ سے فراغت حاصل کی اور اسی وقت یعنی ۔۔۔ میں سند افتاء کو زینت بخشی ۶۵رسال کی عمر یعنی ۲۵رصفر المظفر

۱۳۴۰ھ مطابق نومبر ۱۹۲۱ء کو بریلی شریف ہی میں وصال فرمایا۔

۶۵ سال حیات میں ۶۰ سے زیادہ علوم وفنون پر ایک ہزار کتابیں اور رسائل تصنیف فرمایا۔ ایک زبردست عالمِ دین وفقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں علومِ عقلیہ پر بھی حیرت ناک عبور تھا۔ اور دینیات یعنی تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، عقائد وکلام، لغت فقہ، فرائض، تجوید، تصوف، افکار، دقاق، تعبیر، اخلاق، تاریخ، سیر، مناقب، فضائل وغیرہ وغیرہ کے علاوہ نحو، نعت، عروض، ادبیات، سیاسیات، تنقیدات پر تقریباً ۹سو کتابیں تصنیف فرمانے کے ساتھ ہی علوم وفنون عقلیہ، مثلاً منطق، فلسفہ، جفر وتکسیر، جبر ومقابلہ، زیجات، مثلث، ارثما طیقی، لوگارثم، توقیت، نجوم، حساب، ہیئت، ہندسہ، ریاضی وغیرہ پر ایک سو سے زائد کتابیں لکھیں اور بعض علوم تو خود ایجاد کیے۔

کئی صدی پیشتر اہلِ کمال کی تاریخ میں مجموعی حیثیت سے ان کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔

وہ ایک عظیم دینی ومذہبی وروحانی پیشوا تھے۔ اور یہی حیثیت ان کی زیادہ نمایاں ہوئی۔ وسیع تر مذہبی حلقوں میں وہ اعلیٰ حضرت سے مشہور ہوئے اور یہ لقب علی العموم ایک علم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یعنی مذہبی ودینی حلقوں میں جب اعلیٰ حضرت بولا، لکھا یا پڑھا جائے تو اس سے صرف اور صرف امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ العزیز ہی مراد ہوتے ہیں۔

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہیں سکّے بٹھا دیے ہیں

☑☑☑☑☑☑

تصوف اور رواداری

یہ مقالہ انٹرنیشنل صوفی کانفرنس سیمینار دہلی منعقدہ ۷، ۸، ۹، ۱۰ جمادی الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ مارچ کو دہلی میں پڑھا گیا۔

مولای صل وسلم دائما ابدا — محمد سید الکونین والثقلین
علی حبیبك خیر الخلق کلهم — والفریقین من عرب و من عجم

یہ اجلاس خاص جس میں اربابِ فضل وکمال، اصحابِ دین و دانش، وابستگانِ شریعت وطریقت وہ بھی ایک ایسے تاریخ ساز شہر میں جس کے تعلق سے حضرت مرزا غالب کا یہ مصرعہ بڑی حقیقت لیے ہوئے ہے

دلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب

بے شک دلی ہمیشہ سے اہلِ بصیرت و بصارت اور صاحبانِ سیاست وامارت کے دلوں کی دھڑکن اور ان کا مرکز ومحور رہی ہے۔ یہ دنیا کے منتخب ترین شہروں میں ایک بہت ہی نمایاں وممتاز شہر ہے۔ یہ شہر براعظم ایشیا کے تمام ملکوں اور ان کے قابلِ ذکر شہروں کا مرکزِ توجہ ومرکز امید ہے۔ جہاں ایک طرف یہ سیاست کی راجدھانی ہے وہیں یہ روحانیت کی بھی ایک بڑی آماجگاہ ہے۔ جہاں وقت کے بڑے بڑے بایزید جنید آرام فرما ہیں، جن کی روحانی عظمت وجلالت کو شاہانِ زمانہ نے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ہمارا فہم و ادراک ان بلندیوں کا احاطہ نہیں کرسکتا، اس شہر عظیم میں ولایت، بادشاہی اور روحانیت کا اتنا زیادہ حسن اکٹھا ہو گیا کہ اس کا ہر گوشہ محبت، ولایت وبزرگی اور روحانیت کا یوسفستان بنا ہوا ہے۔ گویا

کوچے کوچے میں مہکتی ہے یہاں بوئے قمیص

اس شہر بے مثال کی تاریخ وتہذیب، زبان وادب کو سارے ملک کی نمائندگی کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ زبان وادب کے حوالے سے خود اس کی اپنی ایک دبستاں بھی ہے۔ بے شک تصوف کے موضوع پر یہ عظیم سیمینار اور صوفی کانفرنس جس عظیم تر مقاصد ومحاسن وضرورت کے تحت ہو رہی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ پوری دنیا پر اس کے بڑے مثبت اور اچھے اثرات مرتب ہوں گے اور اکیسویں صدی کے عالمی بحران کے حل میں بڑی مدد ومعاون ثابت ہوگی۔

آج نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری دنیائے انسانیت کو تصوف اور صوفیاء کرام کے نقشِ پا کی جتنی ضرورت ہے، اتنی شدید ضرورت اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ بے شک اس وقت دنیا میں قتل و غارت گری، وحشت و بربریت، درندگی و دہشت گردی، فرقہ پرستی، نارواداری اور عصبیت سے دوچار ہی نہیں بلکہ اس سے خوفزدہ و بے امان ہے اور بارود کے جس ڈھیر پر یہ کھڑی ہے اور نفرت وحقارت، شدت پسندی، دہشت گردی کی جس آگ میں جھلس رہی ہے اسے تصوف کے چشمۂ آب زلال اور اس کے نہر شیریں ہی سے بجھایا جاسکتا ہے۔ جہاں کہیں بھی دہشت گردی اور انسانیت سوزی کا کوئی واقعہ

رونما ہوا تو فوراً کچھ انگلیاں اسلام اور مسلمانوں کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

جبکہ کسی طرح کی دہشت گردی سے اسلام کا تعلق نہ پہلے تھا اور نہ آج ہی اس دہشت گردی سے اسلام اور مسلمانوں کا کچھ لینا دینا ہے۔ اتنے واضح اعلان کے بعد بھی اگر کہیں دہشت گردی کا الاؤ جلتا ہوا نظر آئے تو اب یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ کچھ اسلام اور مسلم دشمن طاقتیں جو جہادی لبادہ اوڑھے اور جہاد جہاد کا نعرہ لگا کر پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو بدنام، بے امان کرنا چاہتی ہیں۔ جبکہ حالتِ جنگ میں اسلام کا قانون یہ ہے کہ مسلمان جب کسی شہر کو فتح کریں تو وہاں کی عبادت گاہوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے خواہ وہ کسی بھی مذہب کی عبادت گاہیں ہوں، اس شہر کی عورتیں، بچے، بوڑھے کو ہاتھ نہ لگایا جائے، وہاں کے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ عزت سے پیش آیا جائے۔

کھڑی فصلیں اور ہرے بھرے درختوں کو نقصان نہ پہنچے، اس شہر مفتوح کی حرمت و ناموس پر آنچ نہ آئے وغیرہ وغیرہ۔

حالت جنگ کے یہ موٹے موٹے نمایاں اور واضح اصول وضوابط کیا امن وسلامتی کی دلیل نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی دنیا کا سب سے بڑا امن پسند مذہب ہے، جس کی امن وآشتی وصلح جوئی کی مستقل ایک تاریخ ہے۔ بے شک یہ سیمینار و عظیم صوفی کانفرنس اسلام کے خلاف عالمی سطح پر پھیلی ہوئی بدگمانیوں، غلط فہمیوں، الزام تراشیوں اور اس کے خلاف پھیلاتی افواہوں کو دور کرنے میں ایک سنگ میل ثابت ہوگا۔ اس عظیم کانفرنس وسیمینار کے ذمہ داران اور اربابِ نسبت و کشاد پوری دنیائے انسانیت کی طرف سے شکریے ومبارکباد اور دعاؤں کے مستحق ہیں کہ۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اموی بادشاہ (خلیفۃ) ولید بن عبد الملک بن مروان کے عہدِ حکومت ۹۲ھ ۷۱۲ء سے لے کر ۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء تک کل چھہتر (۷۶) بادشاہوں نے دہلی پر حکومت کی ہے، جن میں آخری بادشاہ مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر تھے، جو سب کے سب سنّی مسلمان تھے۔ جو علی العموم صوفیاء کرام، اولیاء عظام اور بزرگانِ دین سے زبردست عقیدت ومحبت رکھتے تھے اور اپنے تمام تر شاہانہ جاہ وجلال کے باوجود وہ صوفیاء کرام وبزرگانِ دین کی بارگاہ میں بڑے مؤدب تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اسلام کے سیاسی شوکت واقبال کو جب جب زوال آیا تو صوفیاء کرام (جو مبلغین اسلام بھی تھے) نے آگے بڑھ کر دستگیری کی، اسے سنبھالا اور اسے پھر وہی شوکت واقبال عطا کیا۔

مثال کے طور پر اسلام کے خلاف چنگیزی یورش ہی کو لے لیجیے کہ انہوں نے تقریباً پورے عالمِ اسلام کو کس طرح تہہ و بالا کیا، مسلم سلطنتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اسلام کے سیاسی شوکت واقبال کو خاک میں ملا دیا۔ (اندلس) موجودہ اسپین کو چھوڑ کر پوری متمدن دنیا پر اپنے شوکت واقتدار کا جھنڈا لہرانے والی عباسی بادشاہت (خلافت) کو نیست ونابود کر دیا۔

سقوطِ بغداد جس کا ایک بڑا دلدوز وتاریخ مرثیہ حضرت شیخ شیرازی نے بھی لکھا تھا جس کا ایک مصرعہ اہلِ علم کے درمیان زبان زد ہو کر رہ گیا ہے۔

آسماں راحق بود　　　　گرخون بہ بارد برزمین

خلافت عباسیہ کے بدترین زوال اور سقوطِ بغداد کے عظیم ترین سانحہ کے بعد ایک صوفی درویش مبلغ کے ہاتھ چنگیز خان کے پوتے برقائی خان کا اپنے تمام سرداروں، امیروں اور رعیت کے ساتھ اسلام قبول کرنا، پھر اُنہیں اسلام دشمنوں، خون آشام بلوائیوں اور پورے عالمِ اسلام کو تہہ و بالا کرنے والوں اور جگہ جگہ مسلمانوں کے سروں کا مینار بنانے والے وحشی تاتاریوں کا اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام اور مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا چکے تھے ان کی بھر پائی کرنا اسلام اور مسلمانوں کے شوکت و اقبال کو پھر سے نقطۂ عروج کی طرف لے جانے کے لیے ان کی حیرت ناک قربانیاں، اسلام اور مسلمانوں کی شوکت و عظمت اور ان کے اقبال کو نہ صرف بحال کرنے بلکہ پہلے سے زیادہ اُسے دوبالا کرنے کے لئے ان کی ترکتازیاں آج بھی خوشگوار حیرت کا باعث ہیں۔ جن کے تذکرے سے تاریخ کے روشن صفحات جگمگا رہے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعرِ مشرق ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں ؎

ہیں عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

بے شک اولیاء کرام وصوفیاء عظام کا کردار و عمل ہر دور میں بڑی عظمت لیے رہا۔ انہوں نے اپنے آقا و مولیٰ محسن انسانیت معلمِ کائنات سیدنا محمد عربی ﷺ اس حدیث پاک کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا اور حرزِ جاں بنا کر ہمیشہ اس پر عمل پیرا رہے۔

اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالیہ۔ (مشکوۃ شریف)

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، پس اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب اسے وہ ہے جو اس کے عیال (کنبے) کے ساتھ اچھا برتاؤ اور نیک سلوک کرے۔ اسی حدیث پاک کے پیشِ نظر صوفیاء کرام، اولیاء اللہ نے نہ صرف اپنی خانقاہوں بلکہ اپنے دلوں کے دروازوں کو بندگانِ خدا کے لیے ہمیشہ کھول رکھے تھے، یہ دیکھے بغیر کہ اپنی حاجتوں، ضرورتوں، حیرانیوں، پریشانیوں کو لے کر ہمارے پاس آنے والا یہ بندہ ہندو ہے یا مسلمان، یہودی یا عیسائی، سکھ ہے یا پارسی یا اور کوئی بلکہ وہ تو

نہ تو ہندو کبھی دیکھا نہ مسلمان دیکھا
ہم نے انسان کی نظر سے سوئے انسان دیکھا

کے مصداق رہے جن کے ذکر سے تصوف و تذکرہ کی بڑی بڑی قابلِ ذکر ماخذ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

دلداری، دلنوازی، دل بستگی، رحم دلی، رواداری یہ صوفیاء عظام کا وصف خاص تھا اور وہ خود سراپا محبت ہوتے ہیں اور ان کا مسلک بھی مخلوقِ خدا سے محبت کرنا ہے۔

ان کا جو کام ہے اربابِ سیاست جانیں
میرا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے

ان کے اسی دلداری، دلنوازی، دردمندی، چارہ سازی اور اندازِ مسیحائی کے سبب مخلوقِ خدا جوق در جوق ان کے آستانوں تک پہنچی اور اپنی جبینِ عقیدت کو ان کے قدموں میں رکھ دیا۔ جہاں سے ان کے درد کو درماں، ان کی حاجت روائی اور ان کے اندازِ مسیحائی نے لاکھوں دلوں کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔

حضرات صوفیاء کرام و اولیاء عظام کا اخلاص و اخلاق، ان کی دلجوئی و دلنوازی، رواداری اور ان کا کردار و عمل ہی اسلام کی حیرت انگیز اشاعت کا باعث ہوا ہے۔ بے شک انہوں نے لاکھوں دلوں کو فتح کر کے ان کے قلوب میں دولت اسلام کو رکھ کر انہیں راسخ کر دیا۔

جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ

اس خصوص میں اولیاء کرام و بزرگانِ دین ہی سب سے بڑے فاتح عالم ہیں۔ خود اسی شہر میں آرام فرما بایزید زمانہ، جنید وقت، سلطان الاولیاء، محبوبِ الٰہی خواجہ خواجگان حضرت خواجہ سیّد نظام الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذاتِ ستودہ صفات ہی کو لے لیجیے کہ وہ اپنی پوری زندگی بندگانِ خدا میں محبت بانٹتے رہے، ان کی دردمندی و چارہ سازی کرتے رہے اور اپنے اندازِ مسیحائی سے لوگوں کی حاجت روائی کرتے رہے، ان کے آنسو پونچھتے رہے، ان میں خوشیاں تقسیم کرتے رہے، ان کی چارہ سازی کرتے رہے، ان کا درد بانٹتے رہے اور آج بھی ان کے آستانے پر بلا تفریق مذہب و ملّت و بلا تفریق امارت و غربت انسانوں کا امڈتا ہوا سیلاب یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ حیاتِ ظاہری کی طرح ان کی حاجت روائی اور چارہ سازی و مسیحائی کا سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ ؎

نہ دیکھ ان خرقہ پوشوں کو ارادت ہو تو دیکھو ان کو
ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

جہاں ڈاکٹر اقبال جیسا دیدہ ور اور عالمگیر شہرت کا حامل شخص دست بستہ سر جھکاتے یوں عرض کناں ہے۔ ؎

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تیری فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے قائم ہیں
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں شانِ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

غیر مسلموں سے روابط اور ان سے حسنِ سلوک

اولیاء کرام، صوفیاء عظام اور بزرگانِ دین اپنے تو اپنے غیروں کے ساتھ بڑی رواداری اور حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آتے تھے۔ خود سلطان الاولیاء حضرت خواجہ سیّد نظام الدین محمد بدایونی ثم دہلوی کا سابقہ ہندو جوگیوں سے پڑا کرتا تھا

مگر آپ استغفر اللہ معاذ اللہ پڑھنے کے بجائے ان کے ساتھ بڑے اچھے انداز میں پیش آتے تھے۔ خود آپ کی خانقاہ میں ہندو جوگیوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ ایک بار چھ (۶) جوگی ایک ساتھ آئے اور آپ کی جماعت خانہ کی دہلیز پر سب سے لاتعلق ہو کر بیٹھ گئے، وہ بھی حالتِ مراقبہ میں۔ خادمِ خاص اقبال نے جا کر حضرت سلطان الاولیاء کو خبر دی کہ حضور چھ جوگی دہلیز پر مراقبہ کی حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت نے خادم سے فرمایا، انہیں اندر لا کر بیٹھاؤ۔ اندر آ کر وہ جوگی سلطان الاولیاء سے بڑے احترام کے ساتھ پیش آئے اور ہر ایک نے آپ کو تعظیم پیش کی۔ ان میں ایک نے اپنے ہر ساتھی کا فرداً فرداً تعارف پیش کیا، یہ فلاں صاحب ہیں جو فلاں پہاڑ کے غار میں چالیس سال تک دنیا، اہلِ دنیا سے الگ تھلگ رہ کر گیان دھیان میں لگے رہے اور کسی منش سے ملاقات تک نہیں کی۔ پھر دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعارف پیش کیا کہ فلاں گیانی ہیں جو پچاس برس سے ایک کھوہ میں پناہ لیے ہوئے سمادھی لگائے بیٹھے تھے، اسی طرح وہ سب جوگیوں کی ریاضت و تپسیا کا حال بتا تا رہا کہ وہ کس طرح دنیا و اہلِ دنیا سے الگ تھلگ ہو کر تیس تیس چالیس چالیس پچاس پچاس سال مراقبہ میں رہے اور اب ہمیں غیب سے یہ اشارہ ملا ہے کہ دہلی میں ایک بہت بڑے بزرگ ہیں تو ہم نے باہم مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ چل کر آپ کا دیدار کیا جائے اور اپنی اپنی عقیدت پیش کریں۔ اس کے علاوہ ہمارا آپ کے پاس آنے کا دوسرا کوئی مقصد نہیں۔ حضرت سلطان الاولیاء کافی دیر تک ان جوگیوں سے اخلاق و محبت کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے، پھر انہیں رخصت فرمایا۔ (فوائد الفواد، خواجہ امیر حسن علی سنجری اردو ترجمہ خواجہ حسن نظام مطبوعہ اردو اکیڈمی دہلی نمبر ۱۵)

کہاں تو ایک زمانہ تو وہ تھا کہ جگہ جگہ اللہ والوں نے اللہ کے بندوں کی مسیحائی اور چارہ سازی کے لیے دوائے دل کی دوکان سجا رکھی تھی اور اب حال یہ ہے کہ ؎

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دُکان اپنی بڑھا چکے

تصوف اور صوفی:۔

یوں تو کہنے کو یہ دو الفاظ ہیں مگر یہ حقائق و معارف کے ایسے سمندر کہ عوام تو الگ رہے خواص کو بھی جانے دیجیے البتہ اخص الخصیص میں سے جو نفوسِ قدسیہ اس کی تہہ تک پہنچے وہ اپنے وقت کے بایزید بسطامی اور جنید بغدادی ہوئے، غوث اعظم دستگیر اور شہاب الدین سہروردی ہوئے، بہاؤ الدین زکریا، عطا و رومی، رازی و غزالی سے شہرت ملی، خواجہ خواجگان عطائے رسول خواجہ نظام الدین اولیاء اور نصیر الدین چراغ سے مشکبو ہوئے، سیّد مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی اور سلطان المحققین مخدوم بہار یحییٰ منیری سے ان کا آوازہ بلند ہوا۔ اور حضور داتا گنج بخش علی ہجویری لاہوری سے دنیائے تصوف کو سند اعتبار حاصل ہے وغیرہ وغیرہ۔

تصوف اور صوفی ان کی تشریح و تعبیر اور ان کی حقیقت و ماہیت اور ان کی قرار واقعی چشت پر ہزاروں صفحات پر مشتمل کئی دفتر موجود ہیں جس تک اس دور میں رسائی ہی ایک بڑی بات ہوگی اور اس کو سمجھ کر پڑھ لینا اسے فیضانِ نظر یا بلکہ مکتب کی کرامت سمجھی جائے گی۔

ویسے تصوف جیسے اہم موضوع پر ہم جیسے ہمہ شما کی لب کشائی ایک تطفلات سے زیادہ کچھ نہیں، اس پر لب کشائی انہیں کو زیبا ہے جن کو اس کا حق ہے اور جنہیں اس چشمہ آب زلال سے ایک جرعہ میر آیا ہو بقول حضرت غالب ؎

یہ مسائل تصوف اور تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے گر بادہ خوار نہ ہوتا

ویسے اس کوچۂ محبت میں جنہیں قدم رکھنے کی سعادت حاصل ہے انہیں غالب کے اس شعر پر بھی وجد آجاتا ہے اور آنکھیں گریاں و دل بریاں ہونے لگتا ہے۔ ؎

کچھ ان کے آنے سے ساقی کے ایسے ہوش اڑے
شراب سیخ پہ رکھی کباب بوتل میں

اب ہم تصوف و اہلِ تصوف پر اس احساس کے ساتھ کچھ عرض کرنے کی سعادت حاصل کریں گے کہ ؎

سنبھل کر میکدے میں پاؤں رکھنا شیخ جی صاحب
یہاں پگڑی اچھلتی ہے اسے میخانے کہتے ہیں

حاملین تصوف و اربابِ صدق وصفا نے تصوف کی تعریف کئی جہتوں سے کی ہے۔ بعض اہلِ صفا کے نزدیک اہلِ تصوف وہ ہیں جو صوف کا کپڑا پہنتے ہیں اور کسی نے یوں تعریف کی ہے کہ صوفی وہ ہیں جو اصحابِ صفہ کے مشرب پر ہوں اور انہیں کے طریقے پر گامزن ہوں۔

اصحابِ صفہ :۔

صحابہ کرام کی وہ خاص جماعت جو ہمیشہ حضور سیّد الکونین آقائے کائنات سیدنا محمد عربی ﷺ خدمت میں رہا کرتی تھی۔ انہیں نہ کچھ دنیا سے لینا تھا نہ دینا۔ چند مفلس و نادار حضرات جن کا نہ کوئی گھر تھا نہ در، مسجد نبوی کے باہر ایک چبوترہ اسی پر ان کا قیام تھا۔ دن رات وہ حضور کی خدمت میں علمِ دین حاصل کرتے تھے۔ غربت و افلاس و فقر و فاقہ جن کی پونجی اور توکل جن کا سرمایہ، کہیں سے کچھ مل گیا تو کھا لیے نہیں ملا تو کوئی ملال نہیں، اپنے رب پر توکل ہی ان کا وصف خاص تھا۔ خود حضور نبی کریم ﷺ کا خاص خیال رکھا کرتے۔

حضرت ذوالنورین مصری فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو نصیحت کرنے سے پہلے خود وہ اس پر عمل پیرا ہو نیز جس نے تمام چیزوں کو ترک کر کے صرف اللہ کو اختیار کر لیا ہو اور اللہ تعالیٰ اسے اپنا دوست رکھتا ہو۔

حضرت ابوبکر شبلی کے نزدیک بارگاہِ الٰہی میں بے غم زندگی گذارنے کا نام تصوف ہے۔ حضرت سیدنا معروف کرخی کے نزدیک حقائق کا اعتبار اور دقائق کا بیان کرنا اور خلق سے ناامید ہونا تصوف ہے۔

حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں تصوف مشتق ہے اصطفاء سے جو برگزیدہ ہوا وہی صوفی ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ صوفی وہ ہے جو خلف ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام، غم داؤد، صبر ایوب، شوق موسیٰ علیہم السلام اور حضور نبی کریم ﷺ

اخلاص حاصل کرے۔ نیز فرماتے ہیں ماسوا اللہ کے تمام کو ترک کر دینا اور خود اللہ میں فنا ہو جانا تصوف ہے اور تصوف کی ایک تحقیق یہ ہے کہ تصوف کی اصل احسان ہے اور احسان کی تعریف حضور آقائے کائنات ﷺ نے یوں فرمائی ہے۔

ان تعبدوا الله کانك تراه فان لم تکن تراه فانه یراك ۔(مسلم شریف)

اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو (گویا) تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ پا رہے ہو تو یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ وہ تمام علوم و اعمال و احوال جو رجوع الی اللہ کے لیے ضروری ہیں وہ تصوف کے زمرے میں آتے ہیں اور تصوف کے تمام معانی کا رخ اسی طرف ہے جسے اصطلاحِ شریعت میں احسان کہتے ہیں اور احسان کا علم و عمل سے وہ تعلق ہے جو جسم کا جان سے ہے چنانچہ حضرت سیدنا امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

من تصوف ولم یتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم یتصوف فقد تفسق ومن جمع بینهما فقد تحقق۔

یعنی جو صوفی بنا مگر علم سے دور رہا وہ زندیق ہوا اور جس نے علمِ دین حاصل کیا مگر تصوف حاصل نہ کیا وہ فاسق ہوا اور جس نے دونوں کو حاصل کیا اس نے تحقیق سے کام لیا۔

بے شک یہ لفظ بعد کی چیز ہے لیکن جس پر اس کا اطلاق ہوا وہ بعد کی چیز نہیں۔ عہدِ رسالت پاک میں نہ تو کسی کو صوفی کہا جاتا نہ عالم، نہ حافظ، نہ قاری اور نہ کسی کو فقیہ کہا جاتا تھا نہ ہی محدث۔ اس زمانے میں سب سے بڑی نسبت کرامت شرفِ صحابیت تھی۔ جس نے ایمان کی حالت میں ماتھے کی آنکھ سے حضور پاک ﷺ زیارت کی وہ صحابی ہوا اور نبوت کے بعد سب سے بڑی منزلت و کرامت اور شرفِ امتیاز یہی صحابیت رہی، جس سے اس دور کے لوگ ممتاز تھے، اور اسی نسبت خاص سے وہ پکارے بھی جاتے۔ ان کے بعد جن خوش نصیبوں کو ایمان کی حالت میں صحابہ کی زیارت اور اتباع نصیب ہوئی وہ تابعی کہلاتے، اور جنہیں ایمان کی حالت میں ان تابعین کی زیارت و صحبت و اتباع نصیب ہوئی وہ تبع تابعین کہلاتے۔ اور انہیں کا دور، دورِ خیر القرون کہلاتا، اور اس دور ان نسبتوں سے بڑی نہ کوئی نسبت تھی اور نہ ہی کوئی فضل شرف، اولیاء، اصفیاء، اغواث، ابدال، اوتاد وغیرہ سب ان کے بعد میں۔

ان زمانوں کے بعد اسلام دنیا کے بڑے حصے تک پھیل گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے زیادہ ملکوں اور علاقوں کو اپنے پشت میں لے لیا تو وہیں سے فتنوں کا دور بھی شروع ہوا، نئی نئی بدعتیں فروغ پانے لگیں اور اسلام کی بے مثال انفرادیت مجروح ہونے لگی۔ تو ایسے عالم میں اہلِ حق کا وہ گروہ جو اسلام کا صحیح نمائندہ و ترجمان تھا، وہ اسلام کا اصل حسن اور روح برقرار رکھنے کے لیے میدانِ عمل میں اُترا اور امارت و سلطنت اور جاہ و منصب سے منہ موڑ کر حضور پاک ﷺ ظاہری و باطنی احوال کے اتباع کو اپنے لیے لازم قرار دیا اور اس راہِ محبت میں بڑے مستحکم قدم اٹھائے اور بلاخوف لائم کتاب سنّت کی اشاعت میں مصروف ہو گئے۔ ان کا پاکیزہ وجود اور اعلیٰ ترین سیرت اسلام سے عبارت ہو کر رہ گئی۔ اور وہ جماعت حق انسانی بھیڑ میں صوفی اور اہلِ تصوف سے ممتاز ہوئی۔

چنانچہ لفظ صوفی دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں شہرت پاچکا تھا۔ حضرت سفیان ثوری کے فرمان کے مطابق کہ اگر ابو ہاشم صوفی نہ ہوتے تو ہم دقائق ریا کو نہ پہچان پاتے۔

کچھ لوگ بہت دنوں تک اس فریب میں رہے کہ تصوف اسلام سے کوئی جداگانہ چیز ہے جو ان کی کم علمی، کم نگاہی اور کج فہمی کا نتیجہ تھا۔ بے شک تصوف کلّی طور پر اسلام ہے، اس کی روح و مغز ہے، اس کا حسن و جمال اور اس کا اتمام ہے۔

تصوف اور صوفیاء کے تعلق سے سید المحققین مخدوم بہار حضرت سیدنا شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ والرضوان فرماتے ہیں: زمانے میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کی وجہ سے زمانے والوں کی آنکھوں میں صوفیوں کا بُرا حال دکھائی دیتا ہے۔ ان کی پاک دامنی پر دھبہ لگانے کا خاص سبب یہی ہے کہ خود صوفیوں نے اپنی روش بدل دی اور خلافِ اصول عادتوں میں مبتلا ہو کر تصوف کو بدنام کر دیا ہے ورنہ تصوف تو دین و ایمان کی جان ہے۔ (مکتوباتِ صدی، ص:۱۷۱)

حضور سیدنا داتا گنج بخش علی ہجویری فرماتے ہیں: صفائے باطن کے لیے کچھ اصول و فروع ہیں۔ ایک اصل تو یہ ہے کہ دل کو غیر سے خالی کر دے اور فروع یہ ہے کہ مکر و فریب سے بھری ہوئی دنیا کو دل سے خالی کر دے۔ (کشف المحجوب، ص:۶۴)

اسی کتاب کے صفحہ ۶۸ پر مزید فرماتے ہیں کہ جملہ مشائخ طریقت کا اس پر اجماع ہے کہ جب بندہ مقامات کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور احوال کی کدورتوں سے خالی ہو کر تغیر و تلون کے حدود سے نکل جاتا ہے تو وہ تمام احوالِ محمودہ سے متصف ہو جاتا ہے اور تمام بشری کدورتوں سے نجات پا جاتا ہے اس لیے اولیاء کاملین اور عرفاء محققین کا نام صوفی ہے۔ (کشف المحجوب)

تصوف کا بانی کون؟

امام المحققین حضرت سیدنا شیخ شرف الدین یحییٰ منیری مخدوم بہار فرماتے ہیں: اگر تصوف کی ابتدا پر غور کرو گے تو اس کو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت ہی سے پاؤ گے، اس عالم میں سب سے پہلے صوفی حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا، پھر اجتبا و اصطفا کے مقام تک پہنچایا، خلافت عطا فرمائی، پھر صوفی بنایا۔ وہ مرقع جو دریوزہ گری کے بعد پہنایا گیا تھا آپ اس کو بڑا عزیز رکھتے تھے۔ آخر عمر میں وہ مرقع حضرت شیث علیہ السلام کو پہنا دیا اور خلافت بھی سپرد کر دی۔ چنانچہ نسلاً بعد نسلٍ اسی طریقے پر عمل ہوتا رہا اور تصوف کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی تک منتقل ہوتی رہی۔

صوفی اوّل حضرت آدم علیہ السلام خلوت در انجمن کے لیے خانہ کعبہ کی بنیاد پڑی یعنی دنیا کی پہلی خانقاہ کعبہ مکرمہ ہے۔

حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام نے بیت المقدس کو خانقاہ بنایا، چنانچہ دنیا کے اور ملکوں میں بھی خانقاہیں بنائی گئیں، جن میں عبادتیں کی جاتیں اور اسرارِ الٰہی کا بیان ہوا کرتا۔ پھر جب دورِ مبارک حضرت سیدنا سلطان الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ آپہنچا، حضور نے خانقاہ کعبہ کا قصد کیا، علاوہ اس کے خود مسجد نبوی میں ایک گوشہ متعین کر دیا، اصحاب میں وہ گروہ جو سالکانِ خاص کا تھا اس سے وہیں راز کی باتیں ہوا کرتیں۔ اس جماعت خاص صوفیاء کے لوگ قریب ستّر (۷۰) اشخاص تھے۔

تصوف وطریقت جس کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی، اس کا تتمہ رسولِ مقبول ﷺ نے فرمایا۔ (مکتوباتِ صدی، ص: ۱۷۳ تا ۱۷۵)

خواجہ خواجگان فخرِ ہندوستان عطائے رسول سلطان الہند حضرت سیدنا خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رضی اللہ تعالی عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت پیرومرشد (خواجہ عثمان ہارونی) فرماتے ہیں کہ جس شخص میں یہ تین خصلتیں ہوں وہ اللہ کا دوست ہوتا ہے، اول سخاوت، دوم شفقت، سوم تواضع۔

اصطلاحاتِ تصوف:۔

ہر علم کی اپنی ایک اصطلاح ہوئی، چنانچہ تصوف کی بھی اپنی ایک اصطلاح ہے اور یہ اصطلاح اس کے لیے بے حد ضروری ہے کہ تصوف کے بہت سارے معاملات رموز و کنایات ہی میں ادا کیے جاسکتے ہیں تا کہ نااہلوں اور نامحرموں سے اسے بچایا جاسکے۔ تصوف کے سرحدِ ادراک تک پہنچنے کے لیے اس کی اصطلاح کا علم بہت ضروری ہے ورنہ کبھی مقصود تک پہنچ ہی نہ سکے گا کہ۔

تو چہ دانی زبان مرغارا　　　　که نہ دیدی گہہ سلیماں را

مصطلحاتِ تصوف دو قسموں پر منقسم ہیں، علمی، شاعرانہ ۔

(۱) علمی:۔ اصطلاحات، مثلاً احدیت، وحدت، واحدیت، برزخ، عروج نزول، وجود، شہود، سکر و صحو، قبض و بسط، حال مقام، مشاہدہ، مکان نوائح، لوامع، زوائد، شاہد، مشہور، موجود، مفقود، غیبت، حضور، فنا، بقا، مبتدی، مرید، مراد، تواجد تساکرو غیرہ وغیرہ۔ (کتاب اللمع فی التصوف، ص ۴۶۵ تا ۶۲۳، شیخ ابونصر سراج ترجمہ سیّد اسرار بخاری)

(۲) شاعرانہ اصطلاحات کی چند مثالیں یہ ہیں:۔ قد، قامت، زلف، خط، خال، چشم، ابرو، رخسار، لب، دہن وغیرہ وغیرہ۔ (سرِ دلبراں سیّد محمد ذوقی)

یہ اصطلاحات کافی وسعت لیے ہوئے ہیں جس کی یہاں گنجائش نہیں، تفصیل و تحقیق کے لیے دیکھیے کتاب اللمع فی التصوف اور سرِ دلبراں سیّد محمد ذوقی۔

حضرات صوفیاء کرام اور لفظ صوفی کی عظمت و جلالت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جائے کہ مجدد سلسلہ نقشبندیہ حضرت سیدنا شیخ ابوالحسن خرقانی جن کا تصوف میں انتساب سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامی سے ہے اور سلوک میں جن کی تربیت بھی حضرت بایزید بسطامی کی روحانیت سے ہوئی ہے جو حضرت بایزید سے ۱۰۰/سال بعد پیدا ہوئے۔ جن کے تعلق سے حضرت شیخ فریدالدین عطار فرماتے ہیں کہ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی اپنے زمانے میں بادشاہِ قطب، ابدال اور اوتادِ اعظم تھے۔ بارگاہِ الٰہی میں جوان کا قربِ خاص اسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ طریقت کے سلطان اور صاحبِ اسرار و حقائق تھے۔ یہی حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی اپنی خانقاہ میں ۴۰/درویشوں کے ساتھ بیٹھے تھے، مسلسل سات روز کے فاقے

سے تھے، کھانا تو کھانا اس کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ ایسے عالم میں ایک شخص جو بزرگوں کا نیازمند وعقیدت مند تھا آٹے کا تھیلا اور بکرا لے کر حاضر ہوا اور خانقاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی کہ صوفیوں کے لیے کچھ لے کر آیا ہوں اسے قبول کرلیا جائے۔ حضرت شیخ خرقانی نے اپنے ساتھی درویشوں سے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی صوفی کہلانے کے لائق ہے تو جا کر اس سے لے لے، مجھے اس کا یارہ نہیں کہ میں صوفی ہونے کا دعویٰ کرسکوں۔ آپ کے سب درویش ساتھی یہ سن کر خاموش رہے کہ جب حقیقت ومعرفت اور اپنے زمانے میں روحانیت کا سب سے بڑا بادشاہ اس بلند مقام پر خود کو نہیں پاتا تو ہم لوگ کس شمار وقطار میں ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا کہ یہاں تمہارے مطلب کے لوگ نہیں رہتے، آٹا و بکرا واپس کردیا۔ (حضرات القدس ص:۱۰۶، از حضرت علامہ بدرالدین سرہندی نقش بندی، ناشر مکتبہ نعمانیہ سیالکوٹ لاہور پاکستان)

بے شک تصوف کی حقیقت و ماہیت اور قرار واقعی حیثیت کو سمجھنے اور گوہر مراد تک پہنچنے کے لیے اصطلاحاتِ تصوف کا علم ضروری اور یہ اصطلاحاتِ تصوف کے حقائق کبریٰ تک پہنچنے کا ایک زینہ ہیں۔

وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

☑☑☑☑☑☑

فقہ و بانی فقہ اور فقہ حنفی

مِنَّ عَلَيْنَا رَبُّنَا اِذْ بَعَثَ مُحَمَّداً　　اَيَّدَهٗ بِاٰيَةٍ اَيَّدَنَا بِاَحْمَداً
اَرْسَلَهٗ مُبَشِّراً اَرْسَلَهٗ مُمَجَّداً　　صَلُّوْا عَلَيْهِ دَائِماً صَلُّوْا عَلَيْهِ سَرْمَداً

ہر دور میں ائمۂ علم وفن نے اپنے اپنے طور پر علم فقہ کی جو تعریف کی ہے وہ سب سر آنکھوں پر مگر برصغیر ہند کے فقیہ اعظم اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مجدد دین وملت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ نے جو تعریف کی وہ تمام تعریفوں کا عطر مجموعہ ہے۔

اعلیٰ حضرت کے الفاظ میں ''مقاصد شریعت کے ادراک کا نام فقہ ہے''

گویا دوسرے لفظوں میں شریعت ہم سے کیا چاہتی ہے؟ اور اس کا ہم سے مطالبہ کیا ہے؟ اسی کو جاننے کا نام فقہ ہے اور اس کا جاننے والا فقیہ کہلاتا ہے۔

فقہ، فقیہ، تفقہ استنباط واجتہاد ومجتہد، یہ الفاظ جب نظروں سے گزرتے ہیں یا دوران کلام ان کا استعمال عمل میں آئے تو اس کے پس منظر میں ایک عظیم وجلیل بے مثل و بے مثال، صاحب فضل وکمال، پیکر دین ودانش، محیر العقول، عبقری الشرق والغرب، صاحب فضل وعطا، منبع جود وسخا اور ایک ہمہ داں، ہمہ جہت شخصیت کا ایک محسوس پیکر دل ودماغ کو مسخر اور فکر ونظر کو معطر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے عہد زریں سے لے کر اس عہد تک تمام مائیں جس کا مثل پیدا کرنے سے عاجز تھیں اور عاجز ہیں۔ ۱۳؍ صدیاں گزر جانے کے بعد زمانے نے اس کا مثل نہیں دیکھا۔ اور اگر کوئی رجل رشید غلاف کعبہ پکڑ کر قسم کھالے کہ اس کا مثل زمانوں نے نہیں دیکھا تو وہ حانث نہیں ہوگا۔

اے آمدنت باعث آبادی ما
ذکر تو بود زمزمہ شادی ما

بڑے بڑے علما، مشائخ، پیران طریقت، ارباب فضل وکمال، پیکران دین ودانش، اصحاب فکر ونظر، شاہان زمانہ، سلاطین عالم، فاتحین عالم، فقہا، محدثین، متکلمین، مجتہدین، حاملین قوت قدسیہ، اولیا، اقطاب، اوتاد، ابدال، اغواث، سب اپنے اپنے وقتوں میں اپنی اپنی جگہوں پر اس کے حلقۂ اطاعت کا قلادہ اپنی اپنی گردنوں میں ڈالے۔

نازم بعمرے خویش کہ کارے کردم

کے مصداق مفتخر، فرحاں، نازاں وشاداں نظر آرہے ہیں۔ جو کل بھی پیشوائے قدسیاں تھا اور آج بھی متبحرین زمانہ کا امام، بلکہ ہر زمانے کا امام الائمہ! عاقلی، دانائی وفرزانگی جس کے قدموں کا بوسہ لینے کے لیے بے چین، زبان وقلم جس کے قد

آوری کے سامنے ہونے اور امامت وقیادت جس کے حضور باادب، باملاحظہ، ہوشیار! مراد میری جن سے امام الائمہ، سراج الامۃ، کاشف الغمۃ، فخر عجم، رشک عرب حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ النعمان رضی اللہ عنہ کی ذات ستودہ صفات ہے ۔

زباں پہ بار الہا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

امام اعظم ابوحنیفہ

اسم گرامی، نعمان بن ثابت بن زوطیٰ بن ماہ۔

لقب، امام اعظم۔

کنیت، ابوحنیفہ۔

امام اعظم کی یہ کنیت کسی صاحب زادی کے نام پر نہیں تھی کیوں کہ حضرت حماد کے علاوہ آپ کی کوئی اور اولاد نہ تھی۔ یہ لقب آپ کا وصفی تھا، جسے خود آپ نے اختیار فرمایا تھا۔ جس کا مطلب ہوتا ہے صاحب ملت حنفیہ۔ یعنی تمام باطل ملتوں سے منہ موڑ کر ملتِ حق کو اختیار کرنے والا۔ آپ کی پاکیزہ ذات خدمتِ دین اسلام کے لیے وقف تھی۔ آپ کی ذات ملت حقہ سے مرادف تھی اسی لیے لت حنفیہ کی نسبت آپ کی کنیت ابوحنیفہ مشہور ہوئی اور دنیا کے کروڑوں مسلمان اسی پاک نسبت حنفی مسلمان کہلائے۔

مولیٰ عزوجل نے اس لفظ کو قرآن مجید میں بار بار استعمال فرمایا: فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ O ترجمہ: تو ابراہیم کے دین پر چلو جو ہر باطل سے جدا تھے اور شرک والوں میں نہ تھے۔ (سورہ آل عمران، پ: ۴)

وَمَنْ أَحْسَنُ دِينًا مِّمَّنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا O ترجمہ: اور اس سے بہتر کس کا دین جس نے اپنا منہ اللہ کے لیے جھکا دیا اور ابراہیم کے دین پر چلا جو ہر باطل سے جدا تھا (سورۂ نساء، پ ۵)

فقیہ اور محدث میں فرق

ہر فقیہ محدث ہوتا ہے کیوں کہ محدث ہونا فقیہ کی صفت ہے جب کہ ہر محدث فقیہ نہیں ہوتا۔ فقہا کی تعداد محدثین کے مقابلے میں ہمیشہ بہت کم رہی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک لاکھ کم وبیش ۲۴ رہزار صحابہ کرام میں صرف دس مجتہد تھے، جن میں نمایاں نام حضرت سیدنا عمر بن خطاب، حضرت سیدنا علی بن ابی طالب، حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود، حضرت ابن ابی کعب، حضرت سیدا ابوموسیٰ اشعری اور حضرت سیدنا معاذ بن جبل رضوان اللہ تعالی اجمعین تھے۔

اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی اتنی بھاری جمعیت کے درمیان صرف ایک سوتیس صحابہ منصب افتا پر فائز تھے۔

فقیہ ومحدث کے درمیان بڑا واضح فرق مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی ہوتا ہے:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھا کے تلمیذ ارشد حضرت مجاہد بن جبیر (۱۰۲ھ) فرماتے ہیں۔

بینا نحن جلوس اصحاب ابن عباس (رضی الله تعالیٰ عنه) عطاء، طاؤس و عکرمة اذجاء رجل وابن عباس قائم یصلی۔ فقال هل من مفتی؟ فقلنا سل! فقال انی کلما بلت تبعه الماء الدافق فقلنا الذی یکون منه الولد؟ قال: نعم، فقلنا علیك الغسل فولی الرجل وهو یرجع وعجّل ابن عباس فی صلاته۔ فلما سلم قال یاعکرمة علیٰ بالرجل فاتاه به ثم اقبل علینا فقال ارأیتم ما اَفیتم به هذا الرجل عن کتاب الله قلنا: لا! قال فعن اصحاب رسول الله ﷺ؟ قلنا لا! فقال ابن عباس فعمن؟ قلنا عن رائنا۔

فقال لذالك یقول رسول الله ﷺ فقیه واحد اشد علی الشیطان من الف عابد۔ ثم اقبل علی الرجل فقال ارأیت اذا کان ذالك منك هل تجد شهوة فی قلبك؟ قال: لا! قال فهل تجد خدر فی جسدك؟ قال: لا! قال هذا بردة یجزیك منه الوضو۔

(فریابی کتاب الصیام، ص:۱۵۵،۱۵۶، بحوالہ امام ابوحنیفہ امام الائمہ فی الحدیث، جلد اوّل ص:۱۳۳، ۳۴، ۳۵، ڈاکٹر پروفیسر علامہ طاہر القادری پاکستان)

ہم حضرت عبداللہ بن عباس کے اصحاب، (حضرت) عطا، (حضرت) طاؤس اور حضرت عکرمہ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت عبداللہ بن عباس وہیں نماز پڑھ رہے تھے اسی درمیان ایک شخص نے آکر پوچھا کہ کیا تم میں کوئی فتویٰ دینے وال ہے؟ ہم نے کہا کہ تم پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں جب بھی پیشاب کرتا ہوں پیشاب کے بعد ماء دافق نکلتا ہے (تو کیا اس سے غسل واجب ہوجاتا ہے)؟ تو ہم نے اس سے پوچھا کہ کیا وہی ماء دافق جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے؟ تو اس نے کہا کہ ہاں وہی ماء دافق جس سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو ہم نے اس کو جواب دیا کہ اس سے غسل واجب ہوجاتا ہے۔ یہ جواب سن کر وہ واپس چلا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز سے جلدی فراغت حاصل کر کے عکرمہ سے فرمایا کہ اس آدمی کو جلدی بلاؤ۔ جب وہ آدمی واپس آ گیا تو آپ نے ہم لوگوں سے پوچھا کہ تم لوگوں نے قرآن سے فتویٰ دیا ہے؟ ہم نے کہا: نہیں! پھر آپ نے پوچھا کہ تم نے حدیث سے فتویٰ دیا ہے؟ تو ہم نے کہا: نہیں! تو کیا تم نے اقوال صحابہ سے فتویٰ دیا ہے؟ ہم نے کہا: نہیں! تو پھر آپ نے پوچھا کہ آخر تم نے کس کے قول سے فتویٰ دیا؟ ہم نے کہا کہ ہم نے اپنی رائے سے فتویٰ دیا ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ اسی وجہ سے حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

پھر ہماری موجودگی ہی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آدمی سے پوچھا کہ بتاؤ کہ پیشاب کرنے پر جو مادہ نکلتا ہے اس وقت تمہارے دل میں کوئی شہوت پیدا ہوتی ہے؟ اس نے کہا: نہیں! پھر آپ نے اس سے

پوچھا کہ کیا وہ مادہ نکلنے کے بعد تمھارا عضو تناسل ڈھیلا پڑ جاتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں! اس پر آپ نے اس آدمی سے فرمایا: یہ ویسے ہی قطرے ٹپکتے ہیں، تمھارے لیے صرف وضو ہی کافی ہے غسل کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس روایت سے یہ پتہ چلا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ماء دافق سے ان جلیل القدر محدثین کو دھوکا ہوا اور صرف ظاہری معنی کے پیش نظر ان محدثین عظام کو دھوکہ ہوا جس کے پیش نظر انھوں نے غسل کی فرضیت کا فتویٰ دے دیا اور علتِ غسل پر غور نہیں کیا۔ تو سمجھ گئے کہ ان میں کوئی فقیہ نہیں ورنہ علتِ غسل پر غور وفکر ضرور کرتے۔ اور اتنے بڑے بڑے محدثین جو اپنے زمانے میں محدثین کے استاذ، ان کے شیخ اور ان کے امام تھے، انھیں فقیہ نہیں سمجھا کہ انھوں نے علتِ غسل تشخیص نہیں کی۔

فقہا و محدثین کے درمیان کے فرق مزید واضح کرنے کے لیے یہ واقعہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ جسے امام حسن بن عبد اللہ (۳۶۰ھ) اور ابوبکر خطیب بغدادی (۳۶۴ھ) نے بیان فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ محدثین ایک مجلس میں امام یحییٰ بن معین، ابوخثیم اور خلف بن سالم موجود تھے۔ جن کا شمار محدثینِ زمانہ میں ہوتا تھا۔ یہ لوگ آپس میں کسی حدیث پر گفتگو کر رہے تھے۔ کہ اسی دوران ایک عورت نے آکر ان سے ایک مسئلہ پوچھا کہ کیا ایک حائضہ عورت کسی میت کو غسل دے سکتی ہے؟ ان محدثین میں سے کسی نے اس عورت کو کوئی جواب نہیں دیا۔ بس وہ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے کہ اسی دوران اس زمانے کے ایک بڑے فقیہ حضرت امام ابوثور وہاں تشریف لے آئے۔ ان محدثین کرام نے اس خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تم اپنا مسئلہ ان سے بیان کرو۔ چناں چہ اس خاتون نے اپنا مسئلہ ان کے سامنے بیان کیا۔ جس پر آپ نے جواب دیا کہ بے شک حائضہ عورت میت کو غسل دے سکتی ہے۔ اور انھوں نے دلیل میں اس حدیث کو پیش کیا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی تھی کہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہ سے فرمایا تھا: ان حیضتك لست فی یدك۔ بے شک تیرا حیض تیرے ہاتھ میں نہیں لگا ہوا ہے (مسلم شریف، کتاب الحیض، باب جواز غسل الحائض)

اور اسی تعلق سے ایک دوسری حدیث میں حضرت صدیقہ ہی مروی ہے:

کنت افرق راس رسول اللہ ﷺ بالماء وانا حائض۔

(ترمذی کتاب الطہارت، باب ماجاری فی الحیض)

میں حالتِ حیض میں حضور ﷺ کے سرِ انور پر پانی کے ساتھ کنگھا کیا کرتی تھی۔ اپنے دلائل کو پیش کرتے ہوئے حضرت امام ثور نے فرمایا جب پانی کے ساتھ حیض میں زندہ شخص کو کنگھا کیا جا سکتا ہے تو مردہ تو اس سے زیادہ کا مستحق ہے۔ اس حدیث کو سن کر ان محدثین نے فرمایا: ہاں یہ روایت ہمیں فلاں فلاں طریقے سے پہنچی ہے۔ تو اس عورت نے انھیں مخاطب کر کے کہا: فاین کنتم الی الاٰن۔ تو اب تک تم لوگ کہاں تھے۔

ان واقعات سے یہ پتا چلا کہ احادیث کریمہ کو یاد رکھنا اور انھیں سنداً و مستنداً روایت کرنا محدثین عظام کا کام ہے۔

اور انھیں احادیثِ طیبہ سے مسائل کا استخراج و استنباط کرنا فقہا کا کام ہے۔

ایک فقیہ کے لیے کچھ کڑی شرطیں بھی ہیں۔ ایسا نہیں کہ چند مسائل کو جاننے اور بتانے والے کو ہم فقیہ کا درجہ دیں۔ مثلاً ایک فقیہ کے اندر مندرجہ ذیل شرطیں نا گزیر ہیں، بغیر اس کے فقیہ ہو ہی نہیں سکتا۔

(۱) قرآن مجید کا صحیح فہم اور اس کا حفظ و استحضار۔

(۲) سنت کا علم اور اس میں صحیح، حسن اور ضعیف کی تمیز ہو۔

(۳) اجماع کا علم تا کہ اجماع کے خلاف کوئی رائے قائم نہ کرے۔

(۴) علوم عربیہ کا علم ہو، زبان کے لطائف و دقائق سے آگہی ہو تا کہ شرعی نصوص کا صحیح علم ہو اور اس کے نتیجے میں درست احکام کا استخراج کر سکے۔

(۵) مقاصد شریعت کا علم ہو تا کہ اس کی روشنی میں مسائل دین کی تشریح و توضیح کر سکے۔

(۶) اقوالِ صحابہ کی معرفت ہو تا کہ ان سے بصیرت حاصل کر سکے۔

(۷) ضبط و استدلال کی حیثیت سے قیاس کا علم ہو۔

(۸) فقہی قواعد و کلیات و جزئیات کا علم ہو۔

(۹) مصالح کا اندازہ اور بدلتے حالات کا علم ہو۔

(۱۰) اقوال تابعین کی معرفت ہو۔

(بحوالہ ماہنامہ جام نور، فروری ۲۰۱۶ء، مولانا مجیب الرحمٰن علیمی)

اسی لیے فقہائے کرام کا مقام محدثین سے بہت بلند ہے۔ اور یہ سب اللہ عزوجل کی توفیق کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

جس طرح ارسطو کو بانی منطق کہا جاتا ہے اسی طرح بانی فقہ کی حیثیت سے حضرت امام اعظم کی عظمت و جلالت ان کی عبقریت و تفقہ فی الدین کا آفتاب سوا نیزے پر تھا، ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ بقول امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت سیدنا شیخ احمد سرہندی:

"بانی فقہ ابوحنیفہ است و سہ حصہ اورا مسلم داشتہ اند و در ربع باقی ہمہ شرکت دارند در فقہ خانہ اوست و دیگراں ہمہ عیالے وے"

فقہ کے بانی حضرت امام اعظم ابوحنیفہ ہیں۔ فقہ کا تین حصہ انہیں ملا چوتھے میں سارے فقہا و مجتہدین شامل، (گویا) فقہ ان کا گھر بقیہ دوسرے فقہا ان کے عیال!

حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ کا تعلق اس خوش نصیب جماعت سے ہے جس کے لیے مژدہ ہی مژدہ، خوش خبری ہی خوش خبری اور بشارت ہی بشارت ہے۔

"طوبیٰ لمن رآنی و آمن بی و طوبیٰ لمن رائ من رآنی" (مشکوٰۃ: ص۵۵۴)
خوش خبری ہے اس کے لیے جس نے مجھے دیکھا اور ایمان لایا اور خوش خبری ہے اس شخص کے لیے بھی جس نے میرے دیکھنے والوں کو دیکھا۔

"لاتمس النار مسلماً رآنی ورائ من رآنی" (مشکوٰۃ: ص۵۵۴)
اس مسلمان کو آگ نہیں چھوئے گی جس نے مجھے دیکھا اور اس کو بھی جس نے میرے دیکھنے والوں کو دیکھا۔

"خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم"
میری امت میں سب سے بہتر میرے زمانے والے ہیں پھر وہ جو ان کے بعد آئے پھر وہ جو ان کے بعد ہیں۔
یعنی حضرت انبیا و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کے بعد سب سے افضل سب سے اشرف سب سے بالا و اعلیٰ مرتبہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ہے۔ ان کے بعد تاج کرامت تابعین کرام کے سروں پر رکھا گیا ان کے بعد تمام تر شرف و بزرگی تبع تابعین کے لیے خاص ہو کر رہ گئیں۔

گویا فرمانِ نبوت کے مطابق جہنم کی آگ نہ تو صحابی کو چھو سکتی ہے نہ تبع تابعی کو اور زمانوں میں سب سے بہتر زمانہ صحابہ کا پھر صحابہ تابعین کا پھر تابعین کا۔ یعنی خیر قرون صرف انھیں تین زمانوں پر مشتمل اور منحصر ہے۔ جس سے اس حقیقت صادقہ کا انکشاف ہوا کہ حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ خیر القرون میں پیدا ہوئے، پوری حیات انھوں نے خیر القرون ہی میں گزاری اور خیر القرون میں ہی آپ واصل بحق ہوئے اور آپ کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی کہ آپ تابعی ہیں اور صحابہ کی ایک مقدس جماعت کا دیدار کیا، ان کی زیارت کا شرف حاصل کیا اور ان سے فیضیاب بھی ہوئے آپ کی عہد سعادت تک ۲۰ رتا ۲۳ رصحابۂ کرام باحیات تھے۔ اور اس سعادت و شرف اور اس بزرگی و خوش بختی میں آپ کے زمانے کے علما، فقہا، محدثین، مجتہدین اور علما راسخین کوئی شریک نہیں، چاہے وہ سیدنا امام مالک بن انس ہوں یا امام ثوری و امام اوزاعی۔ رہ گئے امام شافعی و امام احمد بن حنبل تو یہ بہت بعد کے ہیں، آپ کے تلامذہ در تلامذہ! ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست

بے شک امام اعظم اجلہ تابعین میں سے ہیں اور تابعین کے اللہ جل مجدہ کا یہ ارشاد ان کی عظمت و جلالت اور ان کی شرف و بزرگی کے لیے بہت کافی ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسٰنٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. (سورۂ توبہ، آیت:۱۰)

جنھوں نے نیکیوں میں (حضرات صحابۂ کرام) کی اتباع کی اللہ ان سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں۔ ان کے لیے جنت تیار کی گئی جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (اور) یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہ فضیلت امام اعظم کو اللہ کی جانب سے عطا ہوئی جس میں نہ تو امام اعظم کے کسب کا دخل ہے اور نہ کسی اور کے احسان کا۔ اور درجۂ تابعیت میں بھی آپ کو خصوصی امتیاز حاصل ہے جو دوسروں کو نہیں، خواہ وہ آپ کے ہم زمانہ ہی کیوں نہ ہو۔ ؎

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یوں تو حضرت امام اعظم کی پوری زندگی کارناموں سے بھری ہوئی ہے مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے انھیں نہ صرف اسلامی بلکہ انسانی تاریخ میں لازوال شہرت و عظمت اور عظیم تر آفاقیت عطا کی اور شخصیات و رجال کی تاریخ میں آپ کا نام جلی عنوان اور قاموش المشاہر کی آبرو بنا۔ آپ کا وہ عظیم کارنامہ اس زبردست خلا کو پر کر دیتا ہے جو خلافت راشدہ کے بعد شورائی نظام کے ختم ہونے کے بعد پیدا ہوا تھا۔

خلافت راشدہ جو علی منہاج النبوت تھی اسے ملوکت نے ختم کر دیا۔ اور شورائی نظام درہم برہم گیا۔ اللہ و رسول حکم رانی اور قرآنی و سنت کی فرماں روائی کی جگہ بندوں کی بادشاہت نے لے لیا۔ جنھوں نے کیاب و سنت پر عمل کم سے کم، البتہ قرآن و سنت کو اپنی مرضی کے مطابق کرنے میں پوری پوری کوششیں کیں اور اس کے لیے بیت المال کو اپنی پراپرٹی اور ذاتی ملکیت سمجھ کر خزانوں کے منہ کھول دیے جس کی لپیٹ میں بڑی بڑی علمی، دینی و روحانی شخصیتیں بھی آ گئیں۔

بس وہی محفوظ رہ سکا جس کو اللہ نے اپنے فضل سے بچالیا۔

ہر حال میں اللہ و رسول کی رضا و خوش نودی چاہنے والوں کے لیے بڑی ابتلا و آزمائش کا دور تھا جور و استبداد کی تاریخ جس سے شرمندہ ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام کے قانونی نظام میں ایک عظیم خلا واقع ہو چکا تھا۔ اس کمی کا احساس ارباب فضل و کمال اور بلند پایہ علمی و دینی شخصیتوں کو بڑی شدت کے ساتھ تھا، چاہ کر بھی وہ کچھ کر نہیں پا رہے تھے۔

ایک طرف اسلام کا دائرہ تھا جو سیل نور کی طرح وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کا مسلسل فاتحانہ یلغار تقریباً آدھی متمدن دنیا کو اپنے لپیٹ میں لے چکا تھا۔ حدود سندھ سے لے کر اندلس (موجودہ اسپین) تک اسلام کا لوائے عظمت و جلالت لہرا رہا تھا۔ مسلم حکومتوں کا دائرہ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ درجنوں قومیں اپنے اپنے الگ الگ تہذیب و تمدن اور روایات و رسومات کے ساتھ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں۔ ؎

اے موج دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
رکتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

خود عباسی سلطنت بنام خلافت آدھی متمدن دنیا پر قابض ہو چکی تھی۔ اس کے حدود مملکت میں کروڑہا کروڑ انسان آباد تھے جن میں بھاری اور غالب ترین اکثریت مسلمانوں کی تھی جو آئے دن نت نئے مسائل و حالات سے دوچار ہو رہے تھے۔ کتاب و سنت یعنی اللہ و رسول کے احکامات کے پیش نظر کوئی دستور حیات اور کوئی مجموعۂ قانون موجود نہیں تھا جو ات سے

لے کر معاملات تک کا احاطہ کیے ہوئے تو۔ جو راعی و رعایا، عوام و خواص ہی نہیں بلکہ اخص المخصصین کے لیے یکساں مفید اور قابل عمل ہو۔ اسلامی حکومتوں اور ان کی عدالتوں کے لیے ضروری و ناگزیر ہوں، عدالتوں کے تمام فیصلے اسی مجموعۂ قانون کے مطابق کیے جائیں۔ عبادات میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج و عمرہ وغیرہ سے لے کر نکاح، طلاق، ایلا، ظہار، رضاعت، قضائے قاضی وغیرہ اور معاملات تجارت لین دین، قرض، اصول تجارت کے تمام شعبوں، زراعت، مال گزاری، ٹیکس، مقدمات میں دیوانی، فوجداری، قتل، قصاص، سرقہ (چوری)، قانون جنگ، قانون صلح، سفارتی ذرائع و آداب اور اس کے قوانین اور ایک فاتح قوم کی حیثیت سے رابطہ۔ رعایا میں مسلمان، کافر، ذمی، مستامن کے ساتھ پیش آنے کا طریقہ، کفن، دفن، موت، وراثت اور وصیت، غرض انسان کی حیات، آغاز سے لے کر اس کے انجام، اس کے آخری منزل یعنی مہد سے لے کر لحد تک کے مسائل، انسان کے انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک مضبوط، مستحکم، مربوط دستور حیات اور قانون کی شدید ضرورت تھی جو اسلام اور مسلم حکومتوں کو درپیش تھی گو یا وقت کا ایک بہت بڑا چیلنج تھا جو اسلام اور مسلم امہ کو درپیش تھا۔

دوسری طرف دور ملوکیت (خواہ بنو امیہ کی ہو یا بنو عباسیہ کی) میں کوئی ایسا ادارہ، کونسل یا مجلس قانون ساز نہیں تھی جس کے ذریعے معتمد علیہ علمی و دینی و فقہی شخصیتیں اصول شریعت اور اسلامی قانون کے مطابق کوئی ایسا مستند حل پیش کرتیں جو عوام و خواص کے دلوں میں جگہ پاتا اور اسلامی عدالتوں اور سرکاری محکموں میں وہ قوانین اور تقریرات بنتے۔ اہم ترین علمی و دینی شخصیات و رجال ہی نہیں بلکہ خلفا و حکام کو بھی اس کا بڑا شدید احساس تھا کہ انفرادی اجتہاد کے ذریعے روزمرہ کے کثیر مسائل کو حل کر لینا ہر عالم و مفتی و قاضی کے بس کا نہیں تھا۔ خلفا کی شکل میں ظالم و جابر گورنر و حکام اور ان کے سرکاری دربار سے وابستہ علما و فقہا کے لیے مسلمانوں کے دلوں میں کوئی جگہ نہیں تھی اور نہ ہی ان کا کوئی احترام! ایسی حالت میں وہ اگر کوئی قانون بناتے تو دلوں میں جگہ ہی نہ پاتے۔ وہ قوانین صرف ڈنڈے کے زور پر نافذ العمل ہوتے جن کی عمر بہت مختصر ہوتی۔

چوں کہ یہ عمل بہت ہی دشوار، پیچیدہ اور بہت ہی غیر معمولی تھا۔ ایک پہاڑ کو اپنی جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے سے بھی بڑا۔ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے اور ریگزاروں میں کشتیاں چلانے سے بھی زیادہ دشوار! اور یہ عظیم کارنامہ وہی انجام دے سکتا تھا جو علم کا بحر بے کراں، میدان تفقہ کا شہ سوار، عبقری الشرق والغرب کے ساتھ ایک بے مثل فکر رسا ذہن کے ساتھ غیر معمولی بصیرت کا حامل ہو اور ساتھ ہی اللہ و رسول کی بارگاہ میں منتخب و برگزیدہ بندہ، عوام و خواص کے دل و نگاہ پر جس کا قبضہ ہو۔ خواص ہی نہیں بلکہ اخص المخصصین کے لیے بڑا ہی محترم ہو بلکہ واجب التعظیم ہو۔ عظمتیں خود جس کو جھک جھک کر سلام کرتی ہوں اور بلندیاں جس کے قدموں سے لگ کر عزت و احترام و اعتبار کی سند پاتی ہیں۔ ایسا بندہ خاص اپنے حسن و اضافی میں نایاب کی حد تک کم یاب ہوتا ہے۔ ؎

مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں
پھر خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

بے شک امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اللہ جل مجدہ کے ایسے برگزیدہ، محبوب اور مقبول بندے تھے کہ رب العلمین نے اس امرِ عظیم کے لیے اپنے کروڑوں بندوں میں سے آپ کا انتخاب فرمایا۔

آپ کی یکتائی و بے نظیری اور آپ کی مقدس ذات کی ہمہ جہتوں کا اندازہ کرنے کے لیے ان بلند پایہ شخصیات و رجال کی بارگاہ میں چلیں جن کے حضور میں خود ہی لاکھوں کروڑوں دل ونگاہ مودب اور گردنیں احترام وعقیدت سے خمیدہ ہیں۔

حضرت سیدنا عبداللہ بن مبارک علیہ الرحمۃ والرضوان جو سید الفقہا، سرتاج المحدثین، شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت کے امام اور بالاتفاق امیر المومنین فی الحدیث ہیں، جنھوں نے چار ہزار محدثین سے حدیث روایت کی اور ان کی شاگردی کی سعادت سے مشرف ہونے کے باوجود حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کی بارگاہ میں زانوے ادب تہہ کیا اور آپ کی شاگردی کی عزت حاصل کی اور اپنے اس پاکیزہ نسبت تلمذ پر نازاں رہے۔ انھوں نے اپنے عظیم استاذ کی بارگاہ میں ایک تاریخی قصیدہ عربی زبان میں پیش کیا ہے جس کا صرف ایک شعر یہاں نقل کر رہا ہوں۔ ؎

بان الناس فی فقه عيال   علی فقه الامام ابو حنيفة

بے شک تمام لوگ فقہ میں امام اعظم ابوحنیفہ کے محتاج ہیں کیوں کہ امام اعظم کی شان میں حضرت امام شافعی کا یہ ایک مشہور قول ہے جس کو حضرت عبداللہ بن مبارک نے اپنے قصیدے میں شعری لباس پہنایا ہے۔ خود حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ حضرت امام اعظم کی شان میں فرماتے ہیں:

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکره هو المسك ما کررته يتوضوع

ہمارے لیے حضرت نعمان بن ثابت کے ذکر کو بار بار دہراؤ کہ ان کا ذکر ایک خوش بو ہے کہ جب دہراؤ گے اس کی خوش بو پھیلے گی۔

اور جب حضرت امام اعظم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تو جب تک وہاں رہتے، خود ایک مستقل صاحبِ مسلک ہونے کے باوجود وہاں پر اپنا مسلک ترک کر کے امام اعظم کا مسلک اختیار فرماتے۔ پوچھے جانے پر کہ حضور آپ تو خود ایک مسلک کے بانی و امام ہیں، پھر یہاں اپنا مسلک کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ فرماتے اس عظیم ہستی کے سامنے اپنا مسلک جاری کرنے میں شرم محسوس کرتا ہوں۔ اللہ اکبر! بڑوں کی عظمت وجلالت بڑے ہی سمجھتے ہیں۔ ؎

آنکھ والے تیری جلووں کا تماشا دیکھیں
دیدۂ کور کیا آئے نظر کیا دیکھے

اب ہم وہ نام پیش کر رہے ہیں جو اپنے اپنے زمانوں میں اصحاب فضل وکمال اور اہل زمانہ کے امام تھے۔ جن کی یکتائی و بے نظیری کا سورج ہمیشہ سوا نیزے پر چمکتا رہا۔ جنھوں نے اپنی تصنیفات وتالیفات میں امام اعظم ابوحنیفہ کی خداداد عظمتوں کو خراج تحسین وعقیدت پیش کیا ہے۔ جن میں ایک بھی فقیہ ومجتہد محدث وامام حنفی نہیں۔

(۱) حضرت امام مالک بن انس (بانی مذہب مالکی)
(۲) حضرت امام محمد ادریس شافعی (بانی مذہب شافعی)
(۳) حضرت امام احمد بن حنبل (بانی مذہب حنبلی)
(۴) حافظ مغرب حضرت علامہ ابن البر مالکی قرطبی
(۵) حافظ محمد بن احمد بن عثمان ذہبی مالکی
(۶) حضرت امام محمد ولی الدین الخطیب التبریزی شافعی (صاحب مشکوۃ المصابیح)
(۷) حضرت امام جلال الدین سیوطی شافعی
(۸) حضرت امام شمس الدین محمد بن یوسف دمشقی شافعی
(۹) حضرت علامہ حافظ شمس الدین ذہبی شافعی استاذ المحدثین
(۱۰) حضرت علامہ ابن کثیر دمشقی شافعی
(۱۱) حضرت امام ابن حجر ہیثمی شافعی مکی
(۱۲) حضرت امام ابن حجر عسقلانی شافعی
(۱۳) حضرت علامہ ابوبکر خطیب بغدادی شافعی
(۱۴) حضرت علامہ ابن خلدون اشبیلی مغربی مالکی (مشہور مؤرخ) صاحب تاریخ اب خلدون
(۱۵) علامہ ابن تیمیہ حرانی (غیر مقلدین کے امام و پیشوا اوران کے سب کچھ)
(۱۶) علامہ ابن قیم حنبلی
(۱۷) حضرت علامہ عبدالوہاب شعرانی شافعی
(۱۸) حضرت علامہ ابن الحماد حنبلی
(۱۹) حضرت علامہ ابن حزم ظاہری اندلسی
(۲۰) حضرت علامہ یوسف الاتابکی ظاہری
(۲۱) حضرت علامہ ابن خلقان شافعی

اور ماضی قریب کے مصری محققین حضرت علامہ استاذ ابوزہرہ، استاذ محمد بک خضرمی اور استاذ عبدالحکیم حضرمی کے اسمائے گرامی بہت نمایاں ہیں۔

حضرت زید ابوالحسن فاروقی مجددی نے اپنی گراں مایہ تصنیف "سوانح بے بہا امام اعظم ابوحنیفہ" کے صفحہ ۱۹۵ پر حضرت علامہ امام ابوعمر ابن عبدالبر مالکی علیہ الرحمۃ کی کتاب "الانشقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء" کے

حوالے سے امام اعظم کے ۲۶ رمورخین اور چالیس اکابرین امت کے نام لکھے ہیں جن میں زیادہ تر آپ کے معاصر ہیں۔

چالیس اکابرین امت کی فہرست میں سے صرف چند معاصرین کے اسمائے گرامی ملاحظہ فرمائیں:

(۱) حضرت سیدنا امام باقر ابن امام زین العابدین ابن سید الشہد اسیدنا امام حسین شہید کربلا

(۲) رأس المحدثین امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت امام عبد اللہ بن مبارک (تلمیذ ارشد حضرت امام اعظم ابو حنیفہ و حضرت امام بخاری کے شیخ)

(۳) حضرت سیدنا امام سفیان ثوری رضی اللہ عنہ

(۴) حضرت امام مسعر بن کدام

(۵) حضرت امام سفیان عیینہ

(۶) حضرت امام شبرمہ

(۷) حضرت یحییٰ بن سعید قطان (امام بخاری و امام مسلم کے شیخ)

(۸) حضرت امام وکیع (استاذ امام شافعی)

(۹) امام الاولیا حضرت سیدنا فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ (شیخ حضرات صحاح ستہ)

(۱۰) حضرت سیدنا امام شقیق بلخی

(۱۱) حضرت امام ابو عاصم نبیل (شیخ حضرت امام بخاری)

(۱۲) حضرت ابن یحییٰ بن معین انصاری

(۱۳) حضرت امام اصمعی

(۱۴) حضرت امام عبد الرزاق بن ہمام

(۱۵) حضرت شریک القاضی

(۱۶) حضرت امام یزیدین بن ہارون

(۱۷) حضرت امام حماد بن زید

(۱۸) حضرت امام ایوب سختیانی

(۱۹) حضرت امام ابن جریج وغیرہ وغیرہ

یہ اسلام کی وہ عظیم الشان ہستیاں اور ملت اسلامیہ کا قیمتی سرمایہ ہیں جو تقویٰ، طہارت، دین و دیانت، علم و فضل، فکر و فن کی آبرو، تفسیر، اصول تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقائد، کلام، تصوف، اذکار، اوفاق، تاریخ، سیر، مناقب، ادب، نحو، صرف، لغت، معانی، بیان، شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت اور زہد و تقویٰ کے امام اور اپنے زمانوں

کے آفتاب فضل و کمال ہیں جو امام الائمہ، سراج الامۃ حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ النعمان کے مداحین وثنا خوان اور اس آئینہ حسن خوباں کے شان میں رطب اللسان اور مجموعۂ محاسن کے شاہد عدل! گویا۔

ہمہ عالم گواہ عصمت او

"ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ"

لیس علی الله بمستنکر ان یجمع العالم فی واحدٍ

اب ایسے عالم میں چند مٹھی بھر کوتاہ قد اور بالشتے بصیرت و بصارت سے محروم اس آفتاب فضل و کمال کے جلووں کی تمازت کی تاب نہ لاکر آنکھیں بند کر کے ان کی تنقید وتنقیص اور ان کی شان عالی میں گستاخی و بے ادبی کے مرتک ہوں تو وہ قابل رحم ہیں۔ ان کی مثال ان چمگاڈروں کی سی ہے جو سورج کو دیکھنے سے معذور ہیں کہ جب سورج غروب ہوتا تو وہ بے چارے طلوع ہوتے ہیں۔

گر نہ بیند بروز سپرہ چشم چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

اللہ جل مجدہ حضرت امام اعظم اور ان کے تلامذۂ خاص پر کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے کہ آپ ہی وہ پہلی عظیم شخصیت ہیں جنھوں نے فقہ کو باقاعدہ مدون کر کے اسے اسلامی قانون کی شکل دی۔ جس میں کتاب اللہ وسنت رسول، آثار صحابہ، اقوال صحابہ وافعال صحابہ کو سامنے رکھا۔ فقہ اسلامی کی تدوین میں آپ نے ستر ہزار سے زائد احادیث اور چالیس ہزار آثار صحابہ سے انتخاب فرمایا۔

تراسی ہزار مسائل بیان کیے جن میں ۳۸ رہزار کا تعلق عبادات سے ہے اور بقیہ مسائل کا تعلق معاملات سے ہے۔

(الجواہر المضیہ، جلد۲، ص: ۴۷۲، بحوالہ ماہنامہ فیض الرسول براؤں شریف، بابت ماہ اپریل ومئی ۱۹۹۰ء)

علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب "سیرت النعمان" میں مسائل کی تعداد بارہ لاکھ سے زیادہ لکھی ہے۔ آپ نے اپنے تلامذہ کو تدوین فقہ میں اتنی مہارت عطا فرمادی کہ یہ سلسلہ آپ کے بعد پوری تندہی سے جاری رہا۔ اور آپ کے متبعین فقہائے حنفیہ نے اس سلسلے کو ہر زمانے میں جاری رکھا۔ بے شک یہ امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے تلامذۂ خاص واحباب اور ہر دور کے متبعین فقہائے حنفیہ کا امت مسلمہ پر احسانِ عظیم ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا۔

حضرت قاضی امام ابو یوسف کی "کتاب الخراج" حضرت امام محمد حسن شیبانی کی "کتاب الاصل" چار ضخیم جلدوں میں، امام محمد ہی کی کتاب "کتاب الحج" چار جلدوں میں، حضرت امام سرخسی کی "مبسوط" تیس جلدوں میں، امام کاسانی کی "البدائع والصنائع" سات جلدوں میں، حضرت امام ابن ہمام کی "فتح القدیر" چھ جلدوں میں، فتاویٰ عالمگیری چھ جلدوں میں، حضرت امام احمد رضا بریلوی کی "فتاویٰ رضویہ" تیس جلدوں میں، انھیں کی "جد الممتار" پانچ جلدوں میں، فقیہ اعظم صدر الشریعہ حضرت علامہ مفتی امجد علی کی "بہار شریعت" بیس حصوں پر مشتمل چار جلدوں میں، الفقہ الاکبر، شرح فقہ الاکبر،

بحر الرائق، کنز الدقائق، درمختار، ردالمحتار، فتاویٰ قاضی خان، فتاویٰ تاتارخانیہ، فتاویٰ حدیثیہ، ہدایہ، بنایہ، عنایہ، وقایہ، خلاصۃ الفتویٰ وغیرہ وغیرہ، یہ فقہ حنفی کے ایسے بحر بے کراں ہیں جن کی تہہ تک پہنچنا اس زمانے میں آسان نہیں۔ فقہ حنفی اسلامی قانون کی شکل میں دلوں کے آفاق پر جو چھا گیا اور دنیا کے ۸۰؍کروڑ سے زائد مسلمانوں نے اسے اپنایا، اس کی اتباع و پیروی کی اور اس کو اپنے لیے لازم سمجھا۔ وہ بلاوجہ نہیں ؎

کیا یوں ہی جگمگاتے ہیں منزل کے راستے
لاکھوں چراغ خون شہیداں سے آئے ہیں

ایسا ہرگز نہیں کہ امام اعظم ابوحنیفہ سے پہلے فقیہ و مجتہد اور امام و محدث نہیں تھے اور بے شک تھے اور انھیں اپنے اپنے وقتوں کے مرکزیت اور امامت بھی حاصل تھی۔ ان نفوس قدسیہ نے اپنے زمانوں کے تقاضے کے مطابق دین وعلم دین اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کی حضرت امام مالک بن انس، عالم مدینہ منورت، امام زمانہ حضرت امام شافعی، حضرت امام ہشام بن عروہ بن زبیر، حضرت امام اعمش، حضرت امام ابراہیم نخعی فقہ وحدیث کے مسلم الثبوت امام اور امام اعظم کے دادا استاذ حضرت حماد بن سلیمان عراق کے سب سے بڑے فقیہ و رئیس اعظم اور امام اعظم کے استاذ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) جنھوں نے اپنے اپنے وقتوں میں دین وعلم دین اسلام کی بڑی زبردست خدمات انجام دیں اور امت مسلمہ کی خیرخواہی میں ہمیشہ پیش پیش رہے (فجزاھم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء)

مگران وقتوں میں قرآن وسنت سے استدلال اور اجتہاد واستنباط کے کوئی مستقل قاعدے وضابطے مقرر نہ تھے اور نہ ہی ایسے اصول وضوابط جن کی روشنی میں نت نئے احکام وضع کیے جاسکتے نیز قاضی (جج) حضرات اپنے فیصلوں میں اس ضابطے کو سامنے رکھتے۔ چناں چہ حضرت امام علامہ شمس الدین محمد بن یوسف صالحی شافعی دمشقی علیہ الرحمۃ والرضوان اپنی کتاب مستطاب ''عقود الجمان'' کے صفحہ ۱۸۴؍ پر تحریر فرماتے ہیں:

"انہ ابا حنیفۃ النعمان اول من دوّن علم الفقہ ورتّبہ ابوابا ثم تابعہ انس بن مالك فی ترتیب الموطا لم یسبق ابا حنیفۃ احد لان الصحابۃ والتابعین رضی اللہ عنھم ایما کانوا یعتمدون علی قوۃ حفظھم فلما رای ابو حنیفۃ العلم منتشراً خاف علیہ فجمعہ ابوابا مبوّبۃً و کتاباً رتّبہ فبدا بالطھارۃ ثم بالصلوٰۃ ثم بالصوم. ثم بسائر العبادات ثم بالمعاملات ثم ختم بالاموات لان اٰخر الاحوال للناس و ھو اول من وضع کتاب الفرائض و اول من وضع کتاب الشروط."

ترجمہ: امام اعظم ابوحنیفہ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے علم فقہ کی تدوین کی۔ اور اس کو ابواب پر مرتب کیا پھر مالک بن انس نے موطا کی ترتیب میں ابوحنیفہ کا اتباع کیا۔ (امام اعظم) ابوحنیفہ پر کوئی سبقت نہیں کرسکا کیوں کہ حضرات صحابہ و

تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اعتماد اپنی قوت حافظہ پر تھا۔ جب ابوحنیفہ نے دیکھا کہ علم شریعت اطراف واکناف عالم پھیل چکا ہے، آپ کو اس علم کے ضائع ہونے کا خوف ہوا۔ لہذا آپ نے اس کو ابواب وکتب میں مرتب اور منضبط کیا۔ ابتدا کتاب الطہارت سے کی پھر کتاب الصلوٰۃ وکتاب الصوم پھر کتاب العبادات اور معاملات کا بیان کیا اور کتاب المواریث پر ختم کیا۔ کہ یہی لوگوں کی آخری حالت ہے۔ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے کتاب الفرائض وکتاب الشروط تصنیف فرمایا۔

حضرت امام محدث عجلونی اپنے رسالہ عجلونیہ میں فرماتے ہیں: "**اول من فتح باب الاجتهاد بالاجماع**" اس حقیقت صادقہ پر اجماع ہے کہ سب سے پہلے اجتہاد کا دروازہ امام اعظم نے کھولا۔

بے شک یہ امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے تلامذۂ خاص کے اخلاص بے پایاں کی برکتیں ہیں کہ اس قانون اسلامی یعنی فقہ حنفی کی تقریباً پوری اسلامی دنیا نے پذیرائی کی۔ اندلس کو چھوڑ کر دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں نے اسے اپنایا۔ اور اپنی اپنی حکومتوں کا مذہب مذہب حنفی ہی قرار دیا۔ عوام سے لے کر خواص ہی نہیں بلکہ اخص المخصصین تک کا وہ طبقہ جو دین کی زینت اور اسلام کی آبرو ہیں (یعنی علما، فقہا، محدثین، متکلمین، صوفیا، عرفا، اغواث، اقطاب، اوتاد، ابدال واخیار) نے اس مجموعہ قانون اسلامی یعنی فقہ حنفی کو اپنے لے واجب الاتباع سمجھ کر اپنایا۔

میری دنیا جگمگا اٹھی کسی کے نور سے
میرے گردوں پر میرا ماہ تمام آہی گیا

اسلامی حکومتوں کی باگ ڈور جن ہاتھوں میں ہمیشہ رہی ان کی غالب ترین اکثریت ہر دور میں حنفی تھی اور ان کی حکومتوں کا مذہب بھی حنفی تھا۔

بے شک فقہ حنفی کوفہ میں پیدا ہوا بغداد میں پروان چڑھا اور جب اس کی اشاعت عام ہوئی تو وہ بغداد سے نکل کر مغرب (یعنی اندلس) موجودہ اسپین کو چھوڑ کر تمام اسلامی مما لک کے شہروں پہنچ گیا۔

عراق، مصر، شام اور تمام شہروں سے ہوتا ہوا ماوراء النہر تک وسیع ہو گیا۔ پھر عرب مما لک سے غیر منقسم ہندوستان سے ہوتا ہوا چین تک پہنچ گیا۔ جہاں کوئی مذہب اس کا راستہ نہ روک سکا۔ ان مما لک کے دور دراز علاقوں میں اپنی تمام تر انفرادیت وعظمت کے ساتھ زندہ پائندہ ہے۔ وہاں کے کروڑہا کروڑ مسلمان اپنی عبادات سے لے کر معاملات تک میں فقہ حنفی کے اصولوں پر عمل پیرا ہیں اور پورے اسلامی دنیا کے دو تہائی حصے سے زیادہ پر پورے تب وتاب جاودانہ کے ساتھ مذہب حنفی کا اقتدار وقبضہ ہے۔ اندلس (موجود اسپین) کے سوا تقریباً پوری اسلامی دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ النعمان رضی اللہ عنہ کے علم وفضل کا فیضان ان کے تلامذہ کی شکل میں نہ پہنچا ہو۔ اور ان کے وفور علم و فن کا سحاب جھوم جھوم کر نہ برسا ہو اور اس کے زبردست اثرات نہ مرتب ہوئے ہوں۔ مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بغداد، کوفہ،

بصرہ، یمن، یمامہ، بحرین، رملہ، اہواز، کرمانستان، دمشق، اصفہان، نہاوند، نیشاپور، جرجان، طبرستان، سمرقند، بخارا، ترمذ، ہرات، سیستان، آذربائیجان وغیرہ وغیرہ۔ الغرض آپ کے علمی فیضان کی کوئی سرحد ہی نہیں بڑے سے بڑے شہنشاہ اور فاتح عالم کے حدود مملکت سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں پورے عزت و وقار اور احترام کے ساتھ آپ حکمراں ہیں۔ اور آپ کی بارگاہ میں دل و نگاہ باوضو۔

اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اسلامی حکمراں ہر دور اور ہر زمانے میں ان کی غالب ترین اکثریت حنفی تھی اور ان کی حکومتوں کا مذہب حنفیت۔

عباسی خلافت کے عروج و زوال دونوں میں عوام کا مذہب، مذہب حنفی تھا، عباسی خاندان کے زوال کے بعد جن خاندانوں کو عروج نصیب ہوا وہ تقریباً سب کے سب حنفی تھے اور ان کی حکومتوں کا مذہب حنفیت۔

سلاطین آل سلجوق، سلاطین آل عثمان، سلاطین آل بویہ، چراکان مصر، سلطان نورالدین زنگی شہید رحمۃ اللہ علیہ، الملک العادل (سلطان صلاح الدین ایوبی کا بھتیجہ) سلطان محمود غزنوی، تمام سلاطین ہند خصوصاً آل تیمور ظہیر الدین محمد بابر سے لے کر آخر مغلیہ تاجدار حضرت بہادر شاہ ظفر تک سب کے سب حنفی تھے۔ بالخصوص حضرت شہنشاہ محی الدین محمد اورنگ زیب علیہ الرحمہ تو سنیت و حنفیت کے نشان نصرت تھے۔ فقہ حنفی پر مشتمل چھ جلدوں میں فتاویٰ عالمگیری نے تو انھیں قیامت تک کے لیے زندہ و جاوید بنا دیا ہے۔

حضرت سلطان محمود غزنوی فاتح ہندوستان، عظمت نشان جو انسانی تاریخ کے ایک باجبروت حکمراں تھے۔ وہ خود صاحب علم و فضل تھے علم حدیث کے شائق اور فقہ حنفی کے ایک زبردست عالم! جن کا دربار علما، فقہا، محدثین، ادبا و شعرا و دیگر ارباب فضل و کمال سے بھرا رہتا تھا۔ وہ خود حنفی تھے اور ان کی حکومت کا مذہب بھی مذہب حنفی تھا۔ فقہ حنفی پر مشتمل ایک عظیم و جلیل کتاب ''التفرید'' بھی ان سے منسوب ہے جس میں پچاس ہزار سے زائد مسائل کا ذکر ہے۔ ؎

کہاں کھولے ہیں گیسو یار نے خوش بو کہاں تک ہے

آپ کا مولد و مسکن: امام اعظم ترجیحی روایات کے اعتبار سے ۸۰ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے یہ شہر دریائے فرات کے کنارے آباد ہے خلیفۂ دوم حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے حکم سے فاتح ایران حضرت سیدنا سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ میں بسایا تھا یہ شہر بہت عظمت و جلالت کا حامل ہے۔ یہ اسلام کی شان اور قرون اولی کے مسلمانوں کی آن تھا۔ اس شہر عظیم کو اسلام کا دوسرا دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل ہے، حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مدینہ طیبہ کی جگہ اسے اپنا مرکز خلافت بنایا، اس شہر مبارک کو ۷۰ ؍ اصحاب بدر اور تین سو بیعت الرضوان والے اصحاب رسول ﷺ نے اپنے قدموں سے عزت بخشی۔ اس میں نزول اجلالی فرمایا اور سرزمین پر آباد ہو کر اس کی شرف و بزرگی کو چار چاند لگایا۔ باب العلم حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سیدنا عبد اللہ بن مسعود اور ان کے جلیل القدر تلامذہ

نے اس شہر کو علم وفضل سے بھر دیا تھا ایک ہزار سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس شہر میں آباد ہوئے۔ مستقل سکونت اختیار کی اس کے اندر ایک عظیم الشان جامع مسجد بھی ہے جس میں بیک وقت چالیس ہزار آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں یہ اسی وقت کی تعمیر ہے جب یہ شہر آباد ہوا تھا۔ راقم الحروف وارث جمال قادری کو دوبار اس میں فرض نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔

حضرت سیدنا سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کوفہ کو قبۃ الاسلام فرمایا۔ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ شیرِ خدا نے کوجہ کو جمجمۃ الاسلام، وکنز الایمان وسیف اللہ ورمحہ فرمایا، یعنی کوفہ اسلام کی کھوپڑی، ایمان کا خزانہ اللہ کی تلوار اور اس کا نیزہ ہے۔ سیدنا فاروق اعظم امیر المؤمنین نے کوفہ کو جمجمۃ العرب، رقم اللہ وکنز الایمان سے یاد کی۔ یعنی کوفہ کو اللہ کا نیزہ، ایمان کا خزانہ اور عرب کی کھوپڑی قرار دیا۔ اور کیوں نہ کہ جہاں ایک ہزار سے زائد اصحاب رسول اپنی ازواج واولاد وامجاد کے ساتھ جلوہ افروز رہے ہوں اسے انھوں نے کیا کچھ نہیں عطا فرمایا ہوگا۔ اس لیے کوفہ اس زمانے میں علم کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ جہاں پر رات دن علم وفن کے دریا ابلتے تھے۔ حضرت سیدنا امام بخاری اپنے سفر علم کے تذکرے میں فرماتے ہیں: دوبار مصر وشام اور چار بار بصرہ گیا اور حصول علم کے لیے کوفہ وبغداد اتنی بار گیا جس کو شمار نہیں کرسکتا۔

یہ تو کوفہ بدنام ہوا اور بے وفائی میں ضرب المثال بنا شیعان امام حسین وشیعانِ امام زید شہید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی دغابازیوں، غداریوں اور بے وفائیوں سے، جن میں اکثریت منافقین ودشمنان دین وتقیہ باز رافضیوں کی تھی، اور آج بھی بدنامی کا باعث وہی ہیں، کہ غداری وبے وفائی ان کے خون ودودھ میں صدیوں سے رچ بس آئی ہے۔ صدام حسین شہید کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے دنیا نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس طرح ایک عظیم شہر کو بے وفا اور وہاں کے رہنے والوں کے لیے کوفی لا یوفی ایک محاورہ بن گیا اور آج تو شیعہ عصبیت نے اس کی تمام رونق وروحانیت اور وہاں کے علم وفن پر ایک طرح سے بلڈوزر ہی چلادیا ہے۔ چہل پہل تروتازگی رونق ورعنائی نام کی اشیا کو تلاش کرنا پڑے گا۔ اور یہ تلاش بسیار کے بعد مل بھی جائے اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ جب کہ اس شہر کے علمی ماحول اور اس کے اندر علمی خزانے کا حال یہ تھا کہ امام اعظم کی ولادت کے کم وبیش دوسوسال بعد حضرت امام بخاری کو حصول علم کے لیے کوفہ کا اتنی بار سفر کرنا پڑا کہ جس کا وہ خود شمار نہیں کرسکتے تو پھر امام اعظم کا زمانہ جو صحابہ کا آخری دور اور تابعین کے نقطہ عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت اس شہرِ علم وفضل کا عالم کیا رہا ہوگا۔ چشم تصور تو اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں کرسکتی ۔

قیاس ز گلستانِ من بہار مرا

امام اعظم کی آنکھیں کھلیں تو اپنے ہر طرف علم کا اجالا نور کا چشمہ بہتا ہوا دیکھا آپ نے علم حاصل کرنے کی ابتدا کوفہ ہی سے کی۔ ۹۳ رجلیل القدر مشائخین کوفہ سے علم حدیث حاصل کی جن میں ۲۹ رصرف محدثین عظام تھے جن میں زیادہ تر تابعی تھے کوفہ کے علاوہ بصرہ کے تمام محدثین سے بھی علم حاصل کیا کہ بصرہ بھی اس وقت علم حدیث کا ایک بڑا مرکز تھا۔ علم

حدیث میں اس کی مرکزیت کی ایک بڑی وجہ مشہور صحابی رسول حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات بابرکات تھی۔ فقہ میں آپ نے کوفہ کے سب سے بڑے فقیہ حضرت حماد بن سلیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شاگردی اختیار کی اور پورے اٹھارہ سال جب تک آپ باحیات تھے حضرت حماد کی صحبت اپنے اوپر لازم قرار دے لیا تھا۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کے مسند علم وفضل کو امام اعظم نے زینت دی۔

آپ نے پچپن حج کیے۔ گویا حرمین طیبین میں پچپن بار حاضری نصیب ہوئی۔ اس وقت حضرت عطا بن رباح جو ایک مشہور تابعی تھے جنھوں نے دوسو صحابہ کرام سے احادیث سماعت فرمائی تھی۔ اس وجہ سے ان کی عظمت وجلالت کا سورج نصف النہار پہ تھا۔ امام اعظم نے ان کی شاگردی اختیار کی اور کم وبیش بیس برس تک ان سے کسب فیض کرتے رہے۔ ان کے علاوہ حضرت سیدنا عکرمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بڑے اور اجلہ صحابہ کرام جیسے حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین وغیرہ کے شاگردِ رشید ہیں۔ امام اعظم نے ان سے بھی علوم حاصل کیے اور ایک زمانے تک خوب خوب سیراب ہوئے۔

حضرت امام اعظم چار ہزار احادیث کی روایت کرتے ہیں۔ دو ہزار احادیث اپنے استاذ حضرت حماد سے اور دو ہزار احادیث دوسرے شیوخ سے۔

آپ نے فقہ حنفی کی تدوین کی بنیاد کتاب اللہ یعنی قرآنِ مجید، سنّتِ رسول یعنی احادیثِ طیبہ، پھر اجماعِ امت پر رکھی۔ آپ ہر مسئلے کا حل سب سے مقدم اللہ کی کتاب قرآن مجید میں تلاش کرتے۔ جب کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں ملتا تو دوسرے درجے پر احادیث مبارکہ دیکھتے۔ جب احادیث مبارکہ میں کوئی حکم نہیں ملتا تو پھر اجماعِ امت کو سامنے رکھتے۔ فقہ حنفی کی بنیاد ہی کتاب اللہ، سنت رسول، اجماعِ امت وقیاس مجتہد پر ہے۔

آپ اپنے وقت کے بہت بڑے تاجر بھی تھے اور آخر وقت تک تجارت کرتے رہے۔ کتنی عجیب بات ہے اور اللہ تعالیٰ کا ان پر کتنا فضل وکرم تھا کہ اتنی علمی وفقہی مصروفیات کے ہجوم کے باوجود اپنی تجارت سے غافل نہیں رہتے۔ اپنے وقت کے بہت کامیاب کپڑوں کے تاجر تھے۔ بہت خوش حال۔ یہ تجارت آپ کی خاندانی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کبھی کسی بادشاہ کا کوئی عطیہ نہیں قبول فرمایا نہ حکومت کا کوئی عہدہ لیا۔ زندگی بھر بڑی سے بڑی طاقت کا دباؤ قبول نہیں کیا جس کی وجہ سے آپ کو بڑی سخت آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ حتیٰ کہ جان بھی دینی پڑی، مگر اپنے موقف سے کبھی ایک قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔

وفات حسرت آیات: بنوامیہ کے ظالمانہ دور کے خاتمے کے بعد مسلمانوں نے راحت کی سانس لی مگر ان کا یہ اطمینان و راحت بڑا عارضی ثابت ہوا۔ ظلم وستم کے اسٹیج پر صرف چہرے بدلے، ظلم وستم اپنی جگہ قائم رہا۔ بنوعباسیہ نے اپنی حکومت کی مضبوطی اور لوگوں کے دلوں میں اپنی ہیبت اور اپنی حکومت کا ڈر وخوف بٹھانے کے لیے وہ مظالم کیے جو تاریخ میں ظلم وستم کا

ایک سیاہ باب ہے۔ بنوعباسیہ کے دوسرے خلیفہ یعنی بادشاہ منصور جو ہارون رشید کا دادا تھا، وہ فرعونِ وقت اور انتہائی ظالم و جابر تھا۔ بالخصوص سادات کرام کا جانی دشمن۔ ان کے مظالم سے تنگ آ کر ہی حضرت محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) اور ان کے بھائی ابراہیم جو امام حسن بن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد تھے، یکے بعد دیگرے اس ظالم کے خلاف میدان میں آئے۔ اس وقت امام اعظم شہرت و عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے۔

مسلمانوں نے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی حمایت کی۔ بڑے بڑے علما، فقہا و ائمہ نے ان کا ساتھ دیا، حتیٰ کہ امام اعظم نے بھی ان کی حمایت کی۔ آپ خود بعض مجبوریوں کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے جس کا افسوس آپ کو زندگی بھر رہا۔ البتہ زبردست مالی مدد کی اور عوام و خواص کو ان کی حمایت کے لیے آمادہ فرمایا۔ مگر اللہ کی مشیت دونوں حضرات منصور کے مقابلے میں جام شہادت سے سرفراز ہوئے۔

ظالم و جابر حکمراں منصور کو جب ان جنگوں سے فرصت ملی اور اس کو قدرے اطمینان نصیب ہوا تو ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جنھوں نے حضرت زکیہ اور ان کے بھائی حضرت ابراہیم کی مدد کی تھی۔ بالخصوص ان علمائے کرام وائمۂ عظام کی طرف اس نے اپنے انتقام کا رُخ کیا، جن کا اثر و رسوخ عام مسلمانوں میں زیادہ تھا۔ اسی ضمن میں حضرت سیدنا مالک بن انس اس کے زیر عتاب ہوئے۔ اور اس نے جس انداز کا ظلم و ستم ان کے ساتھ کیا وہ بڑی روح فرسا ہے۔ امام مالک کے ساتھ اس نے بدترین سلوک کیا اس سے مسلمانوں کی نگاہوں میں وہ بہت ذلیل و خوار ہوا۔ پھر اپنی خفت مٹانے کے لیے حج کے بہانے مدینہ طیبہ امام مالک کی بارگاہ میں اپنی ندامت و برأت ظاہر کرنے پہنچا کہ یہ جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا وہ میرے گورنر مدینہ نے کیا۔ میں بے قصور و بے خبر ہوں حالاں کہ امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ اسی ظالم کی مرضی و منصوبے سے ہوا تھا۔

چوں کہ امام اعظم رضی اللہ عنہ نے ان شہزادگانِ رسول کی مدد بہت زیادہ کی تھی اور مسلمانوں کو منصور کے مقابلے میں ابھارا تھا۔ اس ظالم کے ظلم و ستم کے خلاف ان کی جانی و مالی مدد کو مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔ اس لیے منصور کی نگاہ میں ان کا جرم بہت سنگین تھا۔ مگر امام کی عظمت و جلالت اور عوام و خواص میں ان کی مضبوط پکڑ سے خوف زدہ تھا اور امام مالک کے ساتھ مدینہ منورہ میں جو ظلم و ستم کیا تھا اس کی صدائے بازگشت عالم اسلام میں تھی۔ اس لیے امام اعظم سے انتقام کے لیے اس نے انتظار کی پالیسی اپنائی اور اسے کسی مناسب بہانے کی ضرورت تھی۔ اسے یہ حقیقت معلوم تھی کہ امام ابوحنیفہ حکومت کا کوئی منصب کسی بھی قیمت پر قبول نہیں کریں گے۔ اس سے پہلے وہ دیکھ چکا تھا کہ بنوامیہ آخری بادشاہ مروان بن محمد نے اپنے بے حد قابل و معتمد علیہ گورنر عراق ابن ہبیرہ کو جب عراق کا گورنر بنایا تو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے اس نے بڑے بڑے علما و ائمہ کرام کو حکومت کا منصب قہراً و جبراً ہی سہی لینے پر مجبور کیا۔ اس وقت کی بڑی بڑی محترم شخصیتیں اس کے خوف و دباؤ میں حکومت کا منصب قبول کر لیا۔ اس نے امام اعظم کو بلوایا اور آپ کو قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا۔ آپ نے سختی سے

انکار کیا مگر وہ بضد رہا۔ اس کا جوں جوں اصرار بڑھتا رہا آپ کا انکار بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے قسم کھالیا کہ ابوحنیفہ آپ کو قاضی القضاۃ (یعنی پوری حکومت کا چیف جسٹس) کا عہدہ قبول کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے مقابلے میں آپ نے قسم کھالی کہ میں حکومت کا یہ عہدہ ہرگز قبول نہیں کروں گا۔ گورنر کو اپنی قسم کے مقابلے امام اعظم کا قسم کھانا بڑا اچنبھا لگا اور اس کو بڑا غصہ آیا اور کہا تم ہماری قسم کے مقابلے میں قسم کھاتے ہو میں اس وقت تک تمھیں کوڑوں سے پٹواتا رہوں گا جب تک تم اس عہدے کو قبول نہیں کرلوگے۔ آپ نے ہمت و استقامت کے ساتھ فرمایا: آخرت کے عذاب کے مقابلے یہ عذاب مجھے قبول ہے۔

چناں چہ اسی وقت آپ کے سر پر بیس کوڑے مارے گئے۔ آپ نے اس سے خوف زدہ ہوئے بغیر بڑی شان سے فرمایا: ابن ہبیرہ تم یاد رکھو! تمھیں اللہ تعالیٰ کے سامنے (جواب دہی کے لیے) کھڑا ہونا ہوگا۔ اس وقت اللہ تم سے اس ظلم کا جواب طلب کرے گا۔ یہ سن کر ابن ہبیرہ نے جلاد کو رک جانے کا اشارہ کیا اور فوراً جیل بھیج دیا۔ رات کو اس نے اپنے خواب میں سرکار دوعالم ﷺ ناراضگی کے عالم میں یہ فرماتے ہوئے سنا: ''تو اللہ سے ڈرتا نہیں۔ میری امت کے ایک شخص کو بغیر جرم کے مارتا ہے اور اسے دھمکیاں دیتا ہے۔'' چناں چہ ابن ہبیرہ نے سرکار دوعالم ﷺ کے خوف سے صبح ہی آپ کو آزاد کردیا۔ اس طرح ایک ظالم حکمراں کے خلاف آپ کی قسم پوری ہوئی۔

اس کے بعد بڑی خاموشی سے آپ حجاز مقدس چلے گئے اور جب تک بنوامیہ کی حکومت ختم نہیں ہوئی آپ کوفہ لوٹ کر نہیں آئے۔

چوں کہ منصور عباسی حضرت امام کے اس واقعے سے واقف تھا، چناں چہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد آپ کو بغداد بلوایا۔ آپ کو شہید کرنے کے لیے وہی بہانہ بنایا۔

منصور نے آپ کو عہدۂ قضا پیش کیا۔ آپ نے انکار کیا۔ پہلے بہت سمجھایا پھر لالچ دیا، پھر دھمکیاں دیں، مگر کسی چیز کا اثر آپ نے قبول نہیں کیا۔ چناں چہ اس جرم پر کہ امام اعظم نے قضا کا عہدہ قبول نہیں کیا آپ کو قید کردیا اور ہر روز قید خانے سے نکال کر دس کوڑے مرواتا تھا۔ چناں چہ دس دنوں تک مسلسل یہ ظلم وستم آپ پر جاری رہا۔ کوڑا پڑتا اور جسم مبارک سے خون بہا کرتا تھا۔ دس دن تک یہ ظلم وستم آپ نے برداشت کیا، بالآخر اپنے ربّ کی بارگاہ میں بہت روئے اور دعا کی۔ دعا قبول ہوئی۔

ایک دن بڑی خاموشی سے منصور ظالم نے زہر پلا کر شہید کردیا۔ وہ بھی اپنے سامنے آپ کو لٹا کر زبردستی زہر کا پیالہ منہ میں ڈلوایا۔ جب موت کا احساس ہوا تو آپ سجدے میں چلے گئے اور حالت سجدہ ہی میں آپ کی شہادت ہوئی۔ نوے سال کی عمر میں دو شعبان المعظم ۱۵۰ھ کو آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تجہیز وتدفین: آپ کے وصال کی خبر آناً فاناً پورے بغداد میں پھیل گئی جس نے جہاں سنا وہیں سے بھاگا ہوا چلا

آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کا سیلاب ہر طرف سے امڈ آیا۔ چھ بار آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ آخری بار نمازِ جنازہ آپ کے فرزند حضرت حماد نے پڑھائی اور بیس دن تک آپ کی قبر کے پاس آپ کی نماز جنازہ پڑھی جاتی رہی۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو خیزراں کے مقبرے میں دفن کیا گیا کہ وہ جگہ غصب کی نہیں تھی۔ حسن بن عمارۃ قاضی بغداد نے آپ کو غسل دیا اور جب وہ غسل سے فارغ ہوئے تو روتے ہوئے فرماتے تھے:

اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ تیس برس سے آپ نے افطار نہیں کیا اور چالیس سال سے رات کو کروٹ نہ لی۔ تم ہم میں سب سے زیادہ فقیہ تھے، سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔ ہم میں سب سے زیادہ بھلائی کی خصلتوں کو جمع کرنے والے تھے اور جب دفن ہوئے تو بھلائی سنت کے ساتھ اور اپنے بعد کے آنے والوں کو آپ نے مشکل میں ڈال دیا۔

آپ کی تدفین کے وقت بڑے بڑے علما، فقہا، محدثین جمع تھے اور سبھی غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت سیدنا عبد اللہ بن مبارک آپ کے شاگرد وصال کی خبر سن کر بغداد آئے۔ امام کے مزار پر حاضری دی۔ آپ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے امام ابو حنیفہ تم پر اللہ رحمت برسائے۔ ابراہیم نخعی گئے تو اپنی جگہ اپنا جانشین چھوڑ گئے۔ حماد بن سلیمان دنیا سے گئے تو تمھیں اپنی جگہ دے کر گئے اور جب تم دنیا سے گئے تو کسی کو اپنا جانشین نہیں چھوڑا۔ یعنی پورے عالمِ اسلام میں کوئی اس مرتبے ہی کا نہیں تھا جو امام اعظم کی جگہ پر کرسکتا۔

آپ کا مزار پرانوار: سلجوقی شہنشاہ سلطان الپ ارسلان نے ۴۵۹ھ آپ کے مزار پاک پر ایک عالی شان گنبد بنوایا۔ روزِ اوّل ہی سے آپ کا مزار مبارک عوام وخواص کا مرکز ومرجع بنا ہوا ہے۔ حضرت سیدنا امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں روزانہ ان کے مزار کی زیارت کو جاتا ہوں اور جب بھی مجھ پر کوئی مشکل گھڑی آتی ہے یا کوئی حاجت پیش آتی ہے تو ان کے مزار کے قریب دو رکعت نماز نفل پڑھتا ہوں اور آپ کے وسیلے سے اللہ سے دعا کرتا ہوں تو اللہ ہماری دعائیں قبول فرماتا ہے اور امام اعظم کے طفیل ہماری حاجات پوری ہوجاتی ہیں۔

سلطان الپ ارسلان نے آپ کے مزار کے قریب ایک عالی شان مدرسہ بنوایا تھا یہ بغداد کا اپنی نوعیت کا پہلا مدرسہ تھا جو مدرسہ مشہد ابو حنیفہ کے نام سے مشہور ہے۔ بغداد کا مشہور مدرسہ نظامیہ اس کے بعد قائم ہوا۔ سطان نے مدرسہ کے افتتاح کے وقت بغداد کے تمام علما، فقہا و شرفا کو دعوت دی۔ اس قبر کے قریب ایک شاندار مسافر خانہ بھی بنوایا جس میں قیام وطعام کی سہولت۔

راقم الحروف وارث جمال قادری صدام حسین شہید کی دعوتَ خصوصی پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ بار بار حاضر ہوا۔

۱۹۹۰ء، ۱۹۹۱ء کے سفر میں بغداد کے عالمی اسلامی کانفرنس آل انڈیا تبلیغ سیرت کے نمائندے کے طور پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہمارے ساتھ پہلی بار کی حاضری میں الحاج رشید طیب حضرت علامہ غلام عبد القادر علوی، براؤں شریف حضرت سید مثنیٰ میں اشرفی جیلانی شہید راہ مدینہ، رفیق دیرینہ حضرت مولانا قاری اطہر حسین مظفر پوری تھے اور

دوسری بار کی حاضری میں حضرت پیر طریقت الحاج سید مثنیٰ میاں اشرفی جیلانی، الحاج رشید طیب مولانا قاری اطہر حسین، مولانا مفتی سلیم اختر مجددی، قاری محمد عرفان سنبھل معین الدین شیخ اجمیری عارف لدھا صاحب وغیرہ وغیرہ انیس افراد آل انڈیا تبلیغ سیرت کے وفد میں ساتھ تھے۔

امام اعظم کے نام سے منسوب جامع امام اعظم جو مسجد ہے وہ اپنے کمیت کیفیت اور نوعیت میں امام اعظم کی نسبت سے واقعی وہ مسجد اعظم ہی ہے راقم الحروف کو اپنے مذکورہ احباب کے ساتھ اس میں جمعہ کی نماز پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔ اس قدر وسیع و عریض اس قدر پر شکوہ جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتا ہے۔

دوسری صدی ہجری کے مجدد اعظم مجتہد و فقہ شافعی کے صاحب مذہب امام حضرت سیدنا ادریس شافعی ہاشمی مطلبی رضی المولیٰ تعالیٰ عنہ جواوتادِ زمانہ بھی تھے۔ وہ جب اپنے دادا استاد حضرت امام اعظم کی بارگاہ میں حاضر ہوتے تو اپنا مذہب وہاں ترک کر دیتے، نماز میں رفع یدین اور قنوت نازلہ نہیں پڑھتے، چناں چہ جب آپ کی توجہ اس امر کی طرف دلائی گئی کہ آپ تو خود ایک صاحبِ مذہب امام ہیں تو پھر یہاں اپنا مذہب کیوں نہیں جاری کرتے تو آپ فرماتے اس رجل عظیم کے احترام میں! مجھے ایسی پر عظمت بارگاہ میں شرم آتی ہے کہ میں یہاں ان کے مذہب پر عمل نہ کر کے اپنا مذہب جاری کروں۔ حضرت امام شافعی کا یہ حسن ادب امام اعظم کی بارگاہ کے گستاخوں اور دیدہ دہنوں کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے۔ ہم نے وہاں جامع امام اعظم کے کچھ طلبا سے ملاقات کی اور ہمارے رفیق دیرینہ مولانا قاری اطہر حسین صاحب رضوی نے ان طلبا سے عربی میں ان کی تعلیم کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا ہم سب شافعی ہیں مگر ہم یہاں فقہ حنفی پڑھنے آتے ہیں۔

مولانا نے خوش گوار حیرت کے ساتھ پوچھا کہ آپ حضرات شافعی المذہب ہو کر فقہ حنفی کیوں پڑھ رہے ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا: احترامالھذا الامام الاکبر ۔ہم یہاں حضرت امام اعظم کے احترام میں حنفی فقہ پڑھ رہے ہیں ۔

بادِ نسیم آج بڑی خوش گوار ہے شاید ہوا کے رخ پہ کھلی چشم یار ہے

دعا ہے کہ مولیٰ عز وجل اپنے حبیب پاک ﷺ کے طفیل بزرگانِ دین و ائمہ مجتہدین بالخصوص ائمہ اربعہ یعنی حضرت سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ حضرت سیدنا امام مالک بن انس حضرت سیدنا امام شافعی، حضرت سیدنا امام بن حنبل رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی بارگاہ کا باادب بنائے رہے کہ

باادب بانصیب بے ادب بے نصیب

اور وہ لوگ جو اپنی شامت اعمال سے ان نفوس قدسیہ کی بارگاہ میں بے ادبی و گستاخی کا طمغہ امتیاز لیے ہوئے ہیں۔ انھیں بھی ہدایت اور حسنِ ادب نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلوۃ والتسلیم دائماً ابدا۔

لفظ فقہ کے لغوی معنی جواب دینا جیسا کہ قرآن مجید سورہ یوسف میں یوں فرمایا گیا: ''يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ'' اے درباریو! میرے خواب کا جواب دو۔ اور اصطلاح میں کسی شرعی مسئلے کے حکم بیان کرنے کو افتا کہتے ہیں۔

حضرت علامہ شامی کے فرمان کے مطابق: ''الافتاء فانه افادة الحکم الشرعی'' شرعی فیصلے سے آگاہ کرنے کو افتا کہتے ہیں۔ (ردالمحتار، ج:۴،ص:۳۳۶)

افتا کی عظمت اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی نسبت اللہ جل مجدہ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ ارشاد باری ہے''یَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ'' (سورہ نسا، آخری آیت) اے محبوب تم سے فتویٰ پوچھتے ہیں تم فرماؤ اللہ کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے۔

فتویٰ پوچھنے والے کو مستفتی، جواب دینے والے کو مفتی اور نفس جواب کو فتویٰ کہا جاتا ہے۔ اس منصب خاص سے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب حضور سید الانبیا آقائے کائنات روح کائنات جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ سرفراز فرمایا۔ سرکار مصطفیٰ ﷺ کے بعد حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جو لوگ اس منصب جلیلہ پر فائز ہوئے ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں:

حضرت سیدنا ابوبکر صدیق، حضرت سیدنا عمر فاروق، حضرت سیدنا عثمان غنی، حضرت سیدنا علی مرتضیٰ مولائے کائنات، حضرت سیدنا عبداللہ بن مسعود، حضرت سیدنا ابوموسیٰ اشعری، حضرت سیدنا معاذ بن جبل، حضرت سیدنا اُبَیّ بن کعب، حضرت سیدنا زید بن ثابت، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔

پھر صحابۂ کرام کے بعد تابعین میں حضرت علقمہ بن قیس نخعی، حضرت سعید بن مسیب، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت حماد بن مسلم اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ النعمان رضی اللہ عنہم اجمعین منصب افتا پر فائز ہوئے۔ لیکن ان نفوس قدسیہ میں تنہا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے ہی فن کی صورت میں افتا کا آغاز فرمایا اور اسے باقاعدہ ایک فن کی شکل دی اور تدوین فقہ کا سہرا آپ ہی کے سر بندھا اور آپ ہی نے افتا کے قواعد وضوابط مقرر فرمائے۔

اور جب تبع تابعین کا دور آیا تو افتا کی تمام تر ذمہ داریاں ان کے سر آگئیں جیسے حضرت امام مالک بن انس، حضرت امام قاضی ابویوسف، حضرت امام محمد بن حسن شیبانی، حضرت امام شافعی، حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہم۔

حضرت امام اعظم کے مقرر کردہ اصول وضوابط کے مطابق مسائل واحکام کے استنباط کو آپ کے شاگرد رشید حضرت امام قاضی ابویوسف ہی نے فروغ دیا اور امام اعظم کے اصول فقہ پر سب سے زیادہ آپ ہی نے کتابیں لکھیں۔ پھر حضرت امام محمد نے اسے تنقیح وتہذیب کے بعد اتنے عروج پہنچادیا کہ پھر اس میں کسی اضافہ کی حاجت نہ رہی۔ (شامی، جلد ا، ص:۲۷)

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ وَهُوَ حَسْبِي وَنِعْمَ الْوَكِيل نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْر

☑☑☑☑☑☑

اختلاف بین المسلمین اور اس کا پس منظر

یوں تو اسلام کی مخالفت تو اس کی آغاز کے روزِ اوّل سے ہی شروع ہو گئی تھی۔ فاران کی چوٹیوں سے جب خورشید رسالت طلوع ہوا تو اہلِ مکّہ نے رسالت کے اس آفتاب کو بجھانے کی جان توڑ کوشش کی۔ لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے بلکہ ابدی سعادت کا وہ دائرۂ سبیل نور کی طرح دن بدن وسیع تر ہوتا گیا۔ اور جب حضور آقائے کائنات محسن انسانیت پیغمبرِ امن واماں ﷺ عز وجل کے حکم پر مکّہ چھوڑ کر مدینہ ہجرت کر آئے تو بھی ان ظالموں نے آپ کا پیچھا نہ چھوڑا۔ جوں جوں اسلام توانا ہوتا گیا مخالفت وتصادم بھی اسی اعتبار سے بڑھتا گیا۔ اہلِ مکّہ تو خون کے پیاسے تھے ہی مدینہ میں آ کر سکون کی کوئی سانس لینے کا موقع میسّر نہ آیا۔ ایک طرف تو اہلِ مکّہ تھے دوسری طرف یہود، تیسرے طرف منافقین، ہر دَم مارِ آستین بن کر اسلام اور مسلمانوں کو ڈستے رہے۔ گویا کہ مدینہ میں اسلام کو سہ رُخی مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود عہدِ رسالت میں دشمنانِ اسلام کی کوئی سازش اور اسلام کے خلاف ان کی کوئی چال کامیاب نہ ہو سکی۔ ہر مخالفت، ہر سازش پنپنے سے پہلے کچل دی گئی۔ سرکار رسالت مآب ﷺ کے بعد جب حضرت ابو بکر صدیق کا زمانۂ خلافت کا زمانہ آیا تو ایک بار پھر اسلام کے خلاف دلوں کی نفرتیں، کدورتیں اور دشمنیاں پوری توانائی کے ساتھ اُٹھ کھڑی ہوئیں اور ہر چہار جانب سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ اس طوفانِ بلاخیز اور بے حد نازک حالات میں حضرت صدیق کے عزیمت واستقامت، جرأت واستقلال، شجاعت، شہامت، تدبّر ودانائی، بالغ نظری اور مومنانہ جرأتِ اظہار نے بہت جلد مخالفتوں وتصادموں کے کس بل نکال دیے۔ اور سازشوں کے سارے تار وپود بکھیر کر رکھ دیا۔ جس سے ایک بار پھر سارا عرب اسلام کے حضور خمیدہ سر ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عمر فاروق کا دورِ خلافت آیا، جو اسلام کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ آپ کے زمانے ہی میں اسلامی فتوحات نے اقصائے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بڑے بڑے کج کلاہانِ زمانہ کی تنی ہوئی گردنیں ٹوٹ گئیں۔ اور دنیا کی سُپر طاقتوں کا غرور خاک میں مل گیا۔ مجاہدین اسلام نے قیصر وکسریٰ کی عظمتوں کو اپنے گھوڑوں کے سُموں تلے روند ڈالا۔

الغرض اسلام کا سیلِ رواں راستے کی ہر مخالفت، ہر رُکاوٹ، ہر تصادم کو خس وخاشاک کی طرح بہالے گیا۔ اسلام کے خلاف کوئی بھی سازش دورِ فاروقی میں پنپ نہ سکی۔ اور دنیا میں کوئی ایسی قابلِ ذکر طاقت نہیں رہ گئی جو مسلمانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔ جلالِ فاروقی کے سامنے تمام طاغوتی وسرکش طاقتیں لرزہ براندام تھیں ؎

اے موج دجلہ تُو بھی پہچانتی ہے ہم کو
رُکتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

عہدِ رسالت سے لے کر دورِ فاروقی تک اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو بھی سازشیں ہوئیں وہ نہ صرف بے نقاب بلکہ انھیں جڑ پکڑنے سے پہلے تہس نہس کر دی گئیں۔ اسلام کی اسی ہمہ گیر وسعت وطوفانی پھیلاؤ وہمہ جہتی کے پیش نظر اعدائے اسلام خصوصاً یہود ونصاریٰ ومجوسین نے یہ یقین کر کے کہ اسلامی فتوحات کا یہ سیلاب صرف عمر کی ذات پر منحصر ہے۔ اگر کسی طرح سے انھیں ہٹا دیا جائے تو اسلام کی ساری ترک تازیاں رُک جائیں۔ اور بڑھتے ہوئے اسلامی سیلاب پر روک لگ جائے گی۔

چنانچہ ایک خوفناک سازش کے تحت ابولولو فیروز نامی پارسی کے ذریعے آپ کو شہید کر دیا گیا۔ یہی وہ خوف ناک سازش تھی جو بے نقاب نہ ہوسکی بلکہ دور تک اپنے اثرات چھوڑ گئی۔ شہادتِ عمر کے بعد حضرت عثمان غنی کے دورِ خلافت میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ سازشوں اور اسلام دشمنوں کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ ہمدان، آذربائیجان، نیشاپور، طوس، بلخ، اسکندریہ، افریقہ کے اکثر ممالک۔۔۔ قبرص، کریٹ، مالٹا، یورپ اور ایشیا کے اکثر قابلِ ذکر علاقے آپ ہی کے عہد مبارک میں فتح ہوئے ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اسلامی فتوحات کا یہ سلسلہ یوں ہی مزید جاری رہتا اگر آپ بھی شہید نہ کر دیے گئے ہوتے۔ حضرت عثمان غنی کی شہادت ہی وہ سانحۂ عظیم اور فتنۂ کبریٰ ہے کہ جس کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ کے اندر انتشار وافتراق واختلاف کا ایک ایسا دروازہ کھل گیا جو آج تک بند نہ کیا جاسکا۔ اس حادثۂ فاجعہ ہی کی وجہ سے اسلام میں فرقہ بندی کی بنیاد پڑی اور ملتِ اسلامیہ لخت لخت ہوئی۔ جو دشمنانِ اسلام کی خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا لازمی نتیجہ تھا ؎

اے چشم شعلہ بار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو جل رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفّار ومشرکین، نصاریٰ ومنافقین ودیگر اعدائے دین کی جانب سے مستقل تخریب، انتشار، انحطاط، زوال اور اختلاف بین المسلمین کی خلیج کو وسیع سے وسیع تر کرنے کے لیے ہر زمانے میں مختلف شکل وصورت میں سازشیں ہوتی رہیں۔ ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ شورشیں برپا ہوتی رہیں۔ نئے نئے فتنے جڑ پکڑتے رہے۔ اور اب تک یہی سب کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔

شہادتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو بنیاد بنا کر یمن کے عبد اللہ ابن سبا نے عالمِ اسلام کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے ایک ایسی سازش تیار کی کہ جس کے تصور ہی سے آدمی لرزہ براندام ہوجائے۔ اسی کی ناپاک کوششوں کا نتیجہ جنگ صفّین اور جنگ جمل میں تقریباً اسّی ہزار مسلمانوں کی شہادت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابۂ کرام بھی شامل

تھے۔ اور پھر مستقل طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف غیر محسوس طور پر ایک ایسا محاذ کھڑا کر دیا جس نے وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور پھر اپنے بنائے ہوئے پروگرام کے تحت محبتِ علی کی آڑ میں خانوادۂ نبوّت کو تباہ و تاراج کرنے اور آخیر دَم تک حضرت علی و حضرت امیر معاویہ کو اُلجھا کر اسلام کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی کوششیں اور اسلام پر یہ شب خون یہ دَور اُسی کافر و اکفر، ملحد و زندیق ابن سبا اور اس کے حواریین کے تہہ در تہہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی بدولت تھا ؎

اس راز کو تُو فاش کر اے روحِ محمد
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

جنگ صفین کے بعد حضرت علی و حضرت امیر معاویہ کے درمیان ایک مضبوط و مستحکم صلح کو ثالث کے ذریعے طے کرنے کے نتیجے میں خوارج کا ظہور ہوا۔ جو بالآخر جنگ نہروان (صفر ۳۸ ہجری) میں شدید خوں ریز تصادم کی شکل میں رونما ہوا۔ جس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے خوارج کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ تاہم اس خاکستر میں کچھ چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں۔ جنھوں نے اتحادِ اسلامی کے خلاف اپنی خفیہ و زمین دوز تحریک کو جاری رکھا۔ انھیں ظالموں کی خفیہ سازش (کہ حضرت علی و حضرت امیر معاویہ و حضرت عمرو بن العاص کو ختم کر دیا جائے) کی وجہ سے عبد الرحمن ابن ملجم کے ہاتھوں حضرت علی کو شہادت نصیب ہوئی۔ جبکہ حضرت امیر معاویہ و عمرو بن العاص کسی طرح بچ گئے۔

سَبائیوں نے اپنی تحریک کو قتل و خوں ریزی ہی کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ مذہبی معتقدات پر بھی حملے شروع کر دیے۔ اور دین میں ایک نئی بات یہ نکالی کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے، جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وصی تھے۔ یوں ہی حضرت علیؓ حضور ﷺ کے وصی ہیں۔ انھیں چھوڑ کر کسی اور کو خلیفہ بنانا درست ہی نہیں ہے۔ بالخصوص حضرت علی کی موجودگی میں عثمان غنی کی خلافت کسی طرح درست نہیں۔ ظالموں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اتحاد بین المسلمین کی خلیج کو وسیع تر کرنے کے لیے کبھی محب اہلِ بیت کا روپ دھارن کیا اور حُبِّ علی اور حُبِّ اہلِ بیت کی آڑ میں عظمتِ صحابہ، عظمتِ اُمہات المومنین سے کھیل کھیلے اور کبھی خوارج کی ہاں میں ہاں ملا کر اہلِ بیت کے درپے آزار ہو گئے۔ خوارج، سبائی اور منافقین کی سازش کے نتیجے میں حضرت علی کی شہادت ہوئی۔ شہادتِ عثمان غنی میں بھی ان کا رول پُر اسرار ہی رہا۔ پھر قصاصِ عثمان کو غلط رنگ دینے والوں میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ ان شر پسند عناصر کو جب یہ یقین ہو گیا کہ علی و معاویہ میں مخلصین کی کوششوں سے یہ طے قرار پا گیا کہ انصاف کے تقاضوں کی روشنی میں قاتلین عثمان کا فیصلہ ہر حال میں ہو جائے گا اور انصاف کے تقاضے کی تکمیل میں حضرت علی جو مہلت چاہتے تھے، وہ مل جائے گی۔ اس خبر نے ان کے ہوش اُڑا دیے کہ اس طرح تو حقیقی مجرم بے نقاب ہو جائیں گے اور ہمارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی کہ انھوں نے حضرت علی، معاویہ، عمرو بن العاص کو ایک ساتھ ختم کر دینا چاہا۔ چنانچہ منصوبے کے مطابق حملہ تو تینوں پر ایک ہی وقت میں کیا گیا۔ لیکن شہادت صرف ایک ہی کو نصیب ہوئی۔ حضرت امیر

معاویہ صرف زخمی ہوئے۔ عمرو بن العاص کی جگہ پر دوسرا شخص مارا گیا۔

حضرت علی کے بعد حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے خلیفۃ و جانشین مقرر ہوئے۔ آپ کی دور اندیشی، اصابت رائے، نرم روئی، نرم خوئی، صلح جوئی سے فتنہ پردازوں کا یہ گروہ سخت پریشان ہوا۔ خاص کر آپ کے ایک خطبے سے کہ اے لوگو! تم لوگوں نے صلح و جنگ دونوں صورتوں میں میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ اس لیے تمھیں ہر حال میں میرا حکم ماننا ہوگا۔

اس تقریر نے ان کے ہاتھ کے طوطے اُڑا دیے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت علی کی طرح آپ کی زندگی کے چراغ کو بجھا دینا اپنے مفاد کے حق میں ضروری سمجھا۔ پہلے انھوں نے لوگوں کو صلح کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تو موقع محل دیکھ کر آپ پر ایک شدید قاتلانہ حملہ کیا۔ اس حملے میں آپ شدید زخمی ہوئے۔ کچھ جاں نثاروں نے جان پر کھیل کر آپ کو بچالیا۔ اس حملے سے آپ کا یہ احساس اور شدید تر ہو گیا کہ جتنی جلد ہو سکے دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ملّتِ اسلامیہ کی عظیم قوت کو ایک ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ ۴۱ھ میں آپ نے اپنی شرائط پر حضرت امیر معاویہ سے صلح کر کے خلافتِ راشدہ کی عظیم امانت کو ان کے سپرد کر کے اتحادِ اسلامی کو مضبوط کر دیا۔ اس صلح عظیم کے بعد حضرت امیر معاویہ نے ان مفسدین، منافقین، خوارج اور اعدائے دین کا اس شدّت سے تعاقب فرمایا کہ وہ وقتی طور پر بے پناہ ہو گئے۔ کچھ قتل، کچھ قید اور کچھ چھپ گئے۔ ۴۱ھ تا ۶۰ھ حضرت امیر معاویہ کے عہدِ خلافت میں جتنی بھی شورشیں، بے چینیاں اور بد امنیاں ہوئیں، یہ سب انھیں شیطانوں کی پیدا کردہ تھیں۔ کوفہ، بصرہ ان کے دو بڑے مراکز تھے۔ اتحادِ اسلامی اور مسلم اجتماعیت کو لخت لخت کرنے کے لیے منافقین، خوارج اور سبائی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ہی سے سرگرم رہے۔ گردشِ حالات کے مطابق یہ دشمنانِ اسلام چہرہ بدلتے رہے اور ایک چہرے پر کئی کئی چہرے سجانے میں کمال حاصل کرتے رہے۔ ملاحدہ، زنادقہ اور معتزلہ وغیرہ انھیں کے بدلتے ہوئے روپ ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

سیاسی فتنے تو الگ رہے انھوں نے اتحادِ اسلامی ڈائنامائٹ کرنے کے لیے مسلمانوں کو اعتقادی و فکری انتشار و افتراق میں مبتلا کر دیا۔ خلقِ قرآن، اہلِ قرآن، منکرینِ حدیث، قدریہ، جبریہ، جہمیہ وغیرہ وغیرہ انھیں کے اعتقادی خلفشار کی فتنہ سامانیاں ہیں۔

سبائی، خوارج اور منافقین کے اس طبقۂ خاص نے عباسیوں، اُمویوں، علویوں اور فاطمیوں کے لیے ایسی ایسی سیاسی اُلجھنیں کھڑی کر دیں کہ جس سے یہ زندگی بھر نہیں نکل سکے۔ کبھی عباسیوں کی طرف داری کر کے اُمویوں کا خون بہایا۔ اور کبھی علویوں کی ہم نوائی کر کے عباسیوں سے بھڑا دیا۔ جس کو تباہ کرنا انھیں منظور ہوتا یہ بظاہر اُسی کے خیر خواہ

ہوجاتے۔ ایک دوسرے کولڑانے میں انھیں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ ہر دَور میں ان کا رول اُمّت کے حق میں بڑا پُراسرار و بھیانک رہا۔ یہ ناپاک سلسلہ یوں ہی آگے بڑھتا رہا۔ زمان ومکان کے اعتبار سے ان کی صورتیں بدلتی رہیں۔ اور اتحادِ اسلامی پارہ پارہ ہوتا رہا ؎

مقیّد کردیا سانپوں کو یہ کہہ کر سپیروں نے
یہ انسانوں سے انسانوں کوڈسوانے کا موسم ہے

یہاں تک کہ ۵۱۸ھ میں خواجہ نظام الملک طوسی اور عمر خیّام کا رفیق درس حسن بن صباح نے عروج حاصل کیا۔ جس نے اپنے فدائین کے ذریعے عالمِ اسلام کوتہہ وبالا کیا۔ اسلام کی ہر معتبر ہستی اس کے خوف سے لرزہ براندام رہی۔ اپنی خوف ناک چیرہ دستیوں سے اس نے عالمِ اسلام کوذہنی وفکری لحاظ سے بھی تاخت وتاراج کیا۔

پھر اُمتِ مسلمہ کے تاروپود کوبکھیرنے کے لیے کبھی شعوبیت وقبائلیت کے بُت تراشے گئے۔ کبھی قریش وغیر قریش کا فتنہ کھڑا کیا گیا اور جب اسلام عرب کی سرحدوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے عجم کے ایک بڑے حصّے کو اپنے زیرِ نگیں کرلیا تو انھیں ظالموں نے عرب اور غیر عرب کا جھگڑا کھڑا کردیا ہے ؎

مرہم کی جگہ بانٹتے پھرتے ہیں نئے زخم
یہ رسم بھی نکلی ہے عجب چارہ گروں میں

کئی برّاعظم پر مشتمل عظیم ترکی خلافت جو دورِ اخیر میں اسلامی جاہ وجلال اور اس کی جبروت سطوت کی آئینہ دار تھی۔ خاکِ حجاز کے ان نگہبانوں کو ان کی عظیم سلطنت سے محروم کرنے اور خلافتِ عثمانیہ کے عظیم سرمائے کو تہس نہس کرنے کے لیے ایک سے ایک ہتھ کنڈے استعمال کیے گئے۔ حد یہ ہے کہ نازک اندام وگلبدنانِ نکہت بیز وغزالانِ چمن کے ذریعے ''بابِ عالی'' یعنی مرکز آلِ عثمان کی جڑوں تک جاسوسی وسازش کے جال پھیلا دیے گئے۔ تقریباً ساڑھے چھ صدی پر محیط عظیم ترکی خلافت کوٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے ترکوں اور عربوں کے درمیان نفرت وعداوت کی ایک ایسی خلیج حائل کردی جس کو پاٹنا ناممکن ہوگیا۔ خود ترکوں کو خلافت کے عظیم سرمائے سے ایسا متنفر کردیا گیا کہ وہ اسلام کی اس عظیم امانت کو ایک بارِ گراں سمجھتے ہوئے اس سے نجات حاصل کرلی۔ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبالؔ نے بڑے کرب کے ساتھ فرمایا ؎

چاک کردی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اَوروں کی عیّاری بھی دیکھ

بالآخر ایک طویل صبر آزما مگر خاموش جدوجہد کے بعد ''مغربی استعمار'' عالمِ اسلام پر اپنے خونی پنجے گاڑنے میں کامیاب ہوگیا۔

ڈی جی ہوگارتھ[1]... لارنس آف عربیا[2]... ہمفرے[3] وغیرہ کے ذریعے عرب قومیت کا تشخص اور عربی عصبیت کو اُبھار کرانھیں عثمانی خلافت سے بغاوت کرا کے ترکوں سے الگ کر دیا گیا۔ پھر عربوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم

---

[1] ڈی جی ہوگارتھ... آشمولین میوزیم کا ڈائریکٹر مشرقِ وسطیٰ اور عثمانی خلافت پر باریک نظر رکھنے والا برطانوی انٹیلی جنس کا انتہائی قابل آفیسر جو لارنس آف عربیا کا گویا ایک طرح سے استاذ، سرپرست اور سیاسی نگراں تھا۔ لارنس آف عربیا کو ایک عرب کی حیثیت سے عربوں میں پیش کر کے اس کو عربوں میں کامیاب بنانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔

[2] لارنس آف عربیا..... عرب سیاست کا مشہور افسانوی کردار جسے مغربی اہلِ قلم نے عربوں کی آزادی کا ہیرو بنا کر پیش کیا۔ جس نے عربوں کو ترکوں سے آزاد کرایا۔ حالانکہ وہ برطانیہ کے خفیہ محکمے کا عیّار ترین متعصّب عیسائی تھا، جسے حکومت برطانیہ نے وسیع اختیارات دے کر عرب کی حیثیت سے عربوں میں پیش کر کے انھیں عثمانی خلافت سے بغاوت پر آمادہ کر کے ترکی خلافت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ تحقیق و تفصیل کے لیے دیکھیے: نائٹلی اور کولن سمپن کی کتاب "دی سیکریٹ لارنس آف عربیا" (The Secret Lawrence of Arabia) اسلام دشمنی اس کو وراثت میں ملی تھی۔ اس کے خون میں اسلام دشمنی کے جراثیم سرایت کیے ہوئے تھے۔ اس لیے اتنی سرگرمی دکھائی۔ حبّ الوطنی، فرائضِ منصبی کے علاوہ عرب و اسلام مفاد کے خلاف تخریب کاری کو اپنا فرضِ مذہبی بھی سمجھتا تھا۔ اس کا جدِّ اعلیٰ سر رابرٹ لارنس رچرڈ بادشاہ کے ہمراہ ساڑھے سات صدی پیشتر صلیبی جنگ میں سلطان صلاح الدین ایوبی سے مذہبی لڑائی لڑنے اور بیت المقدس کو ایوبی کے ہاتھوں سے بچانے کے لیے آیا تھا۔ وہ شخص کوئی عام آدمی نہیں تھا، بلکہ رچرڈ شیر دل کا خاص آدمی اور اس کے کافی قریب اور اس کا معتمد علیہ تھا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کو نہایت ہی بے دردی کے ساتھ کچلنے میں سر ہنری جان لارنس نے بہت اہم رول ادا کیے، جو لارنس کے داداؤں میں سے تھے۔ وہ ایک اسکاچ آیا 'سارا میڈن' کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس کا باپ تھامس رابرٹ ایک درمیانی درجے کا اینگلو آئرش زمیندار تھا۔ خود انگریزوں نے اس کار بد کو جو اس نے عربوں کی شکل میں عرب میں رہ کر عربوں کو ترک سے لڑانے اور ترکی خلافت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کا ایک ڈاکومینٹری فلم لارنس آف عربیا ایک عظیم کارنامے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ایک گھنٹے کی وہ دستاویزی فلم کی کیسٹ یورپ کے علاوہ عرب بالخصوص سعودی میں دستیاب ہے۔

[3] ہمفرے... یہ بھی ایک اعلیٰ درجے کا برطانوی جاسوس تھا، جو عربوں کو لڑانے اور قابلِ ذکر لوگوں کو خرید کر برطانوی استعمار کے لیے انھیں استعمال کرنے میں بڑا ماہر تھا۔ اسے ۱۷۱۰ء میں برطانیہ کی نوآبادیاتی علاقوں کی وزارت نے مصر، عراق، حجاز اور عثمانی مرکز استنبول میں جاسوسی پر مامور کیا۔ اپنے فرائضِ منصبی کی تکمیل میں اختلاف بین المسلمین کے لیے عجیب عجیب ہتھکنڈے استعمال کیے۔ اس نے عربی و فارسی میں عبور حاصل کیا۔ اور اسلامی تعلیمات میں بھی عبور حاصل کر کے انگریز سامراج کے خنجر عالمِ اسلام کے سینے میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ اُتارا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے نجد کے مشہور مذہبی شیخ طریقت شیخ عبد الوہاب کے بیٹے محمد پر شباب و شراب کا جال پھینک کر اسے برطانیہ کے زلفوں کا اسیر بنایا۔ یہی وہ محمد بن عبد الوہاب نجدی تھا جس نے اپنے مذہبی خانوادے اور علمی گھرانے کا فائدہ اٹھا کر برطانیہ کی مدد سے ایک نئے دین "وہابیت" کی بنیاد ڈالی۔ اور اپنے علاوہ سارے جہاں کے مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر ان کا قتل جائز اور مسلمانوں کی عورتوں کو بے نکاح اپنے ماننے والوں پر حلال کر دیا۔ یہی وہ شرابی، زانی، عیّاش شخص (پچھلے صفحے کا بقیہ) آگے چل کر وہابیوں اور ہندوستان کے بد مذہبوں کا شیخ الاسلام قرار پایا۔ اس کی عیاشیوں، شہوت رانیوں، خرمستیوں اور اس بوالہوس کی رنگین و گنہ گار زندگی کی تصویر دیکھنی ہو تو اسی برطانوی جاسوس ہمفرے کی ڈائری پڑھیے، جس نے اس وحشی سانڈ کو شراب و شباب، حسن و ادا، عشوہ غمزہ اور خوب صورت نیلی آنکھوں کی جھیل میں ڈبو کر اسے برطانوی مفاد کا غلام بنا دیا تھا۔ دیکھیے "ہمفرے کے اعترافات" جو انگریزی، اردو زبانوں میں اور بھی بڑی بڑی حیرت ناک ان کہیاں ہیں جسے دیکھ کر ڈاکٹر اقبال یاد آنے لگتے ہیں ؎

خدایا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں ‌ ‌ ‌ کہ درویشی بھی عیّاری ہے، سلطانی بھی عیّاری

کرکے انہیں ایک دوسرے سے لڑا کر رہی سہی توانائی کو کئی جہتوں میں تقسیم کرا کے...... بالکل کمزور کر دیا گیا۔ پھر نہایت اطمینان اور بڑی آسانی سے عربوں کے سینے میں اسرائیل کا خنجر اُتار دیا گیا۔

ارضِ فلسطین پر اسرائیلی ریاست کا قیام سرخ وسفید سامراج کے معاشی استحکام اور سیاسی مفاد کے لیے بہت ضروری تھا۔ مشرقِ وسطیٰ بالخصوص عربوں کو کنٹرول کرنے اور اپنی سیاسی غنڈہ گردی کے مظاہرے کے لیے انھیں ایک فوجی اڈّے کی شدید ضرورت تھی، جو عرب سرزمین پر اسرائیلی ریاست کی شکل میں انھوں نے حاصل کر لی۔ اس طرح سے گویا۔

خشت بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

تن کے اُجلوں، من کے کالوں کی خوش بختی سے انھیں عالمِ عرب میں ایسے افراد مل گئے جو ان کے عزائم کی تکمیل میں بڑے سرگرم ثابت ہوئے۔ قتل وخوں ریزی، بے رحمی، سنگ دلی، شقی القلبی اور اسلام دشمنی کے مظاہرے میں بڑے جری وبے باک نکلے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ اپنے اس غارت گری وعصمت ریزی کو کتاب وسنّت کا فریب دے کر اسلام ثابت کرنے کے لیے آمادۂ پیکار رہتے تھے۔ ایک ڈاکو رہزن بھی ڈاکہ ورہزنی کو ڈاکہ ورہزنی ہی سمجھتا ہے۔ اپنے اس فعل کو اپنی ضمیر کی عدالت میں غلط ہی سمجھتا ہے۔ لیکن وہ ایسے غارت گرِ دین ودنیا تھے جو بیک جنبشِ قلم اپنے علاوہ دیگر مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر ان کا قتل جائز، ان کی عصمتیں حلال، ان کے اموال غنیمت اور ان سے قتال کو جہاد سے تعبیر کرتے تھے۔ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤفَكُوْن۔

اسلام اپنے مبدأ و منشا میں اجنبی
تیرا غضب کہاں ہے خداوند ذوالجلال

زندہ تو الگ رہے۔ حد یہ کہ دنیا سے کوچ کیے ہوئے لوگوں تک کو نہ بخشا گیا۔ صحابہ وبزرگانِ دین کے مزارات کو ڈھا دیا گیا۔ اُن کی قبروں پر بلڈوزر چلا دیے گئے۔ اسلام کے ان محسنوں کی ہڈیوں پر ایک نئے دین کی قصرِ عظمت تعمیر کرنے لگے۔

نوکِ خنجر کی عبارت آپ پڑھیے تو سہی
خون کے دھبّے بتائیں گے کہ قاتل کون ہے

بارھویں صدی ہجری کے نصف اوّل تک عالمِ عرب فتنۂ عظیم ''وہابیت'' کی قہرمانیوں سے دوچار ہو چکا تھا اور صدی کے اختتام تک وہ قتل وغارت گری، وحشت وبربریّت، ظلم وستم کے اتنے دریا، اتنے صحرا، اتنے مقتل، اتنے مدفن، اتنے مذبح اور ایسے ایسے کرب وبلا سے گذر چکا تھا کہ

آسماں را حق بود گر خود ببارد بر زمیں

گیارہ سو برس پہلے کا اسلام مسترد کیا جاچکا تھا۔ نجد کے مشہور خطّے ''درعیۃ'' میں ایک مشہور علمی و دینی و روحانی خانوادے اور اس خانوادے کے مشہور عالمِ دین، روحانی پیشوا و معروف شیخ طریقت شیخ عبدالوہاب کے ناخلف بیٹے محمد نے اپنے آباء واجداد کی مقدّس روش سے الگ ہٹ کر برطانیہ کی امداد و تعاون سے ایک نئے مذہب کی داغ بیل ڈالی۔ صرف اور صرف مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا اور ان پر نت نئے مظالم کے پہاڑ توڑ کر قتل و غارت گری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔[1]

اور تم پر میرے آقا کی عنایت نہ سہی
نجدیو کلمہ پڑھانے کا بھی احسان گیا

تیرھویں صدی ہجری کے نصف آخر تک عالمِ اسلام تقریباً ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دیو استبداد یعنی مغربی استعمار کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جاچکا تھا۔ سرخ و سفید سامراج عالمِ اسلام کے بندر بانٹ میں مصروف ہو چکے تھے۔ تین برّاعظموں پر مشتمل براعظم، ایشیا برّاعظم یورپ، برّاعظم افریقہ، عظیم ترکی خلافت کا جاہ وجلال، عظمت و

---

[1] نجدی تحریک کے لرزہ خیز مظالم و داستانِ قتل و غارت گری نیز اس نئے دین کے محرکات، مضمرات و مضرات کی تفصیل و تحقیق کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کریں :

(۱) الفجر الصّادق (عربی) ... علامہ جمیل عراقی
(۲) جلاء الظلام (عربی)... علامہ سید علوی مالکی
(۳) خلاصۃ الکلام فی امراء البلد الحرام (عربی)... علامہ شیخ زینی دحلان مکّی شافعی
(۴) الصواعق الالٰھیۃ (عربی)... علامہ شیخ سلیمان بن عبدالوہاب برادر محمد بن عبدالوہاب
(۵) ردالمحتار (عربی)... علامہ ابن عابدین شامی
(۶) محمد بن عبدالوھاب (عربی)... علی طنطاوی مصری
(۷) عنوان المجد فی تاریخ نجد (عربی)... عثمان بشر نجدی
(۸) الدرر السنیۃ (اردو/عربی)... شیخ احمد زینی دحلان مکّی
(۹) فتنۃ الوھابیہ (عربی)... علامہ شیخ احمد زینی دحلان مکّی
(۱۰) شہاب ثاقب (اردو)... مولانا حسین احمد ٹانڈوی، صدر دیوبند
(۱۱) سیف الجبار (اردو)... علامہ فضلِ رسول بدایونی
(۱۲) تاریخ نجد و حجاز (اردو)... مفتی عبدالقیوم ہزاروی
(۱۳) عالمِ اسلام پر سامراجیت کے سائے (اردو)... قاری محمد میاں مظہری دہلوی
(۱۴) تبلیغی جماعت (اردو)... علامہ ارشد القادری
(۱۵) حیاتِ سلطان ابن مسعود (اردو)... سید سردار احمد حسنی بی اے (محمد وارث جمال)

اقبال ہوسِ سامراجیت کی نذر ہو کر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکا تھا۔ خالص توحید کے نام پر اہلِ اسلام کے لہو سے ریگ زارِ عرب سیراب ہو چکا تھا۔ تاریخ نجد وحجاز اپنے رقصِ ابلیس سے شدّاد، ہامان، فرعون، نمرود، چنگیز، ہلاکو اور یزید کی ارواح کو شرمندہ کر چکی تھی۔ حجاز کے قافلے در قافلے و قبیلے در قبیلے لٹ چکے تھے۔ عصمتوں کے نازک آبگینے ٹوٹ اور عفتوں کی چادریں نیلام ہو چکی تھیں ؎

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
دردِ دل کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

اِدھر برصغیر میں مسلمان سیاسی ادبار کا شکار ہو چکے تھے۔ ان کے اقبال کا سورج ڈوب چکا تھا...... غوریوں، بلبنوں، لودھیوں، خلجیوں، تغلقوں، سوریوں کا جاہ وجلال یادِ ماضی بن چکا تھا۔ عظیم فرماں روا مغلِ اعظم شہنشاہ محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر غازی کے جانشین اور اس کے جلال وتمکنت کے وارث نااہلی کے سارے ریکارڈ توڑ چکے تھے۔

پورے برّصغیر ہند میں اپنوں اور غیروں کے نرغے میں ایک شیر[1] کے دھاڑنے کی آواز کروڑوں دھڑکتے دلوں کی مرکزِ اُمید بنی ہوئی تھی۔ زندگی سے بھرپور اُس آواز میں حیات کی ساری توانائیاں سمٹ کر آ گئی تھیں اور اس کا وجود مینارۂ عظمت بن کر کروڑوں یاسوں کا آس بنا ہوا تھا۔

اُمید کی مدّھم سی اِک لَو ہو تو پیاری ہے
یہ اک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

اور جیسے ہی اس ضیغم کے دہاڑنے کی آواز خاموش ہوئی، پورے ماحول پر ایک بار پھر خوف ودہشت اور مایوسیوں کا سنّاٹا طاری ہو گیا اور پورا ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا۔ پھر ہندوستان کے تاریک سیاسی اُفق پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ستارۂ اقبال بلند ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف اس کے شوکت واقتدار کا پرچم لہرانے لگا۔

تیرھویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی سیاسی قوت وحشمت ماضی کی روایتوں کا ایک حصّہ بن چکی تھی۔ چونکہ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں سے منتقل ہو کر انگریزوں کے ہاتھ آیا تھا، اس لیے وہ اپنے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ بھی مسلمانوں ہی کو سمجھ رہے تھے۔ تیرہ سو برس سے وہ مسلمانوں کے قوتِ بازو کو آزماتے ہوئے آئے تھے۔ حرب وضرب اور جہادِ زندگانی کے ہر محاذ پر وہ مسلمانوں سے پٹتے رہے، اس لیے ان کے محسوسات کچھ غلط بھی نہ تھے۔ مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ حیرت ناک عسکری تاریخ ان کے نگاہوں کے سامنے تھی ؎

---

[1] مراد شیر میسور فخر ہندوستان حضرت ٹیپو شہید جن کا قول تھا کہ شیر کے ایک دن کی زندگی گیدڑ کے صد سالہ زندگی پر بھاری ہے۔ جن کے جذبۂ حریت، شجاعت وشہامت، عزیمت واستقامت اور آزادی کی تڑپ سے انگریز خائف ہی نہیں بلکہ لرزہ براندام تھے۔ وہ شیر نر جب دہاڑتا ہوا اپنے کچھار سے نکلتا تو اس کی گرج ودھمک سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایوانوں میں کپکپی طاری ہو جاتی۔ اپنوں کی غداری سے جوں ہی انھیں شہادت نصیب ہوئی انگریز خوشی سے ناچنے اور چیخ چیخ کر کہنے لگے : آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

اس نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسے آزار و انتشار میں مبتلا کر دیا جائے جس سے وہ اگر نکلنا بھی چاہیں تو بھی نہ نکل سکیں۔ اور ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جائے کہ وہ اپنے ہی نشیمن سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو کالی گھٹا سمجھتے رہیں۔

تمہیں کالی گھٹاؤں کا نہیں پہچاننا آیا
نشیمن سے دھواں اُٹھتا ہے تم کہتے ہو ساون ہے

مقدّر کے ان سکندروں کی خوش بختی سے انھیں عرب کی طرح برّصغیر ہند کے اس عظیم و تاریخی شہر دہلی (جس کے لیے کہا گیا ہے کہ ؏ دہلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب) میں ایک مشہور مذہبی و روحانی خانوادے کا ایک فرد[1] بڑے سستے داموں نہایت آسانی کے ساتھ دستیاب ہو گیا۔ جو اپنے حواریین کے ساتھ اپنے آقاؤں کے اَن دیکھی اعانت و تعاون سے ان کے عزائم کی تکمیل کر سکتا تھا۔

انگریزوں نے یقینی طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ سیاسی ابتری، اقتدار سے بے دخلی اور تمام تر بے سروسامانی کے باوجود مسلمان بالکل تہی دست نہیں ہو گئے ہیں۔ ابھی ان کے پاس ایک بڑا زبردست سرمایہ ہے کہ جس کے ذریعے اگر وہ چاہیں گے تو انقلاب لے آئیں گے۔ اور وہ گراں قدر سرمایہ ہے محبتِ رسول و بزرگانِ دین سے والہانہ عقیدت اور یہی وہ مرکزی نکتہ تھا جسے انگریز ہر گز نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں یہ ڈر تھا کہ محبت رسول کا عظیم مشترکہ سرمایہ اور بزرگانِ دین و اولیاے کرام سے اجتماعی عقیدت و وابستگی انھیں کہیں پھر نہ منظم کر دے۔ تخت و تاج چھن جانے کے باوجود ہندوستان کی بڑی بڑی خانقاہیں اپنی کثرتِ رجوع کے سبب ایک عظیم اجتماعیت کا تصوّر پیش کر رہی تھیں اور اپنے فیضان و عطا سے مسلمانوں کی آخری اُمید بنی ہوئی تھی۔

انھیں یہ مقدس خانقاہیں مصیبت گاہیں نظر آنے لگیں۔ بے حد چالاک مغربی استعمار نے ان خانقاہوں کی طرف مسلمانوں کے کثرتِ رجوع اور عظیم اجتماع کو اپنے اقتدار کے لیے زبردست خطرہ محسوس کیا کہ کہیں انھیں خانقاہوں سے

---

[1] مراد اس سے شاہ اسماعیل دہلوی ہے، جنھیں سرحد کے غیور پٹھانوں نے انگریزوں کے ناپاک عزائم کی تکمیل کے جرم میں انھیں ان کی پوری جماعت کے ساتھ بالاکوٹ کی پہاڑی پر قتل کر کے ان سبھوں کی لاشوں کو وحوش و طیور کے حوالے کر دیا تھا۔ جنھیں دفن ہونے کے لیے دو گز زمین بھی نہ مل سکی۔

پریس و قلم کی توانائی اور قلم کے مزدوروں کی بے ضمیری نے اس قتل برحق کو شہادت کا نام دے دیا اور مسلمان سرحدی پٹھانوں کے اس کے ساتھ شاہ اسماعیل دہلوی کی قتل و غارت گری و خوں ریزی کو افسانۂ جہاد بنا دیا۔ اور خود آنجہانی کو شہید! جس کی طرف اہلِ سنّت کے امام و مجدد اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ؎

وہ شہید لیلیٰ نجد تھا، وہ ذبیح تیغ خیار ہے　　وہ جسے وہابیہ نے دیا ہے لقب شہید و ذبیح کا

مسلمانوں میں اجتماعی نظم اور شیرازہ بندی نہ شروع ہوجائے۔ اور اپنے شوکت اقتدار کو واپس لانے کی تحریک کسی انقلاب کا پیش خیمہ بن جائے۔ کیوں کہ مسلمانوں کے خاکستر میں ابھی بھی کچھ چنگاریاں ایسی تھیں جو کسی وقت بھی بھڑک کر آگ بن سکتی تھیں جیسے انقلاب ۱۸۵۷ء اسلامی تاریخ پر جن کی گہری نگاہ ہے، انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہر نازک دَور میں مسجدوں، خانقاہوں سے جو آواز بلند ہوتی ہے اس کے اثرات پورے طور پر ظاہر ہوتے۔ ہر زمانے میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کے اجتماعی نظم میں ان کا رول بہت اہم تھا۔

انگریزوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور مسلمانوں کی نفسیات سے انھیں مکمل آگاہی حاصل تھی۔ جمنا، راوی، چناب، جہلم کے کنارے دور دراز سے چل کر جو اسلامی قافلے اُترے تھے۔ حالات کے بے رحم ہاتھ بھی اب تک ان نشانات کو مٹا نہیں سکے تھے۔ اور پھر تیرہ سو سالہ اسلامی جذبے اور عسکری تاریخ (کہ جس سے برّاعظم ایشیا، برّاعظم افریقہ، برّاعظم یورپ اور روم و شام وغیرہ میں ہزاروں بار دو چار ہو چکے تھے) کو وہ کیسے بھول سکتے تھے ؎

اُڑائے کچھ ورق لالہ نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

چنانچہ اس نے ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کے دلوں کو سب سے پہلے محبتِ رسول کے عظیم تر سرمائے سے خالی کردیئے جائیں اور پھر ان کا رُخ بزرگانِ دین کی طرف سے پھیر دیا جائے۔ اولیائے کرام کی محبت اور ان کے احترام سے انھیں محروم کردیا جائے۔

بالآخر اس نے سیاسی بساط پر اپنے خریدے ہوئے مذہبی مہروں کو بٹھا کر مسلم اتحاد اور ان کی عظیم تر اجتماعیت کو شہ مات دینا شروع کیا۔ چند روزہ حیاتِ مستعار کی ان آسائشوں کے لیے اپنے دین و مذہب، خاندانی اقدار کو اور جبّہ و دستار کو کلیسا کے ہاتھوں سودا کردیا گیا۔ پھر تو بڑے منظم پیمانے پر علمی، دینی، فکری، مذہبی اور روحانی پراگندگی کا آغاز ہوا۔

انگریزوں نے برّصغیر ہند میں اپنے مذہبی مہروں سے ٹھیک انھیں خطوط پر کام کروایا، جس کا وہ عرب میں ایک کامیاب تجربہ کر چکے تھے۔ وہاں سب سے پہلے انھوں نے ایک مذہبی کتاب[1] لکھوائی، جس میں اپنے اور اپنے مٹھی بھر ماننے والوں کے سوا تمام مسلمانوں کو مشرک قرار دے کر ان کا قتل جائز اور ان کی بہو بیٹیاں بے نکاح حلال کردی گئیں۔ ٹھیک وہی نقشہ یہاں بھی دہرایا گیا۔ برّصغیر ہند میں بھی سب سے پہلے اردو میں ایک کتاب[2] لکھوائی گئی، جس میں بیک جنبش ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کے مذہب کو مسترد کرتے ہوئے دنیا بھر کے مسلمانوں کو مشرک قرار دے دیا گیا۔ اور مسلمانوں سے جدال و قتال کو جہاد سے تعبیر کیا گیا۔

---

[1] کتاب التوحید

[2] تقویت الایمان

سکھوں کے خلاف جہاد مشہور کر کے حملہ پٹھانوں پر کیا گیا اور غیرت مند سرحدی مسلمانوں کے ساتھ اس جنگ[۹] کو

[۳] اسماعیل دہلوی اور ان کے متبعین کی فکری بے راہ روی و دینی بد اعتقادی، انگریز دوستی و ملّت میں فتنہ انگیزی و وحدت ریزی اور اس پر علماے حق بالخصوص علّامہ فضلِ حق خیر آبادی کا عالمانہ احتساب، فاضلانہ محاکمہ و مجاہدہ نیز اسماعیل دہلوی اور ان کے پیر سید احمد رائے بریلوی کے افسانۂ جہاد و شہادت کی نوعیت اور اس کی قرار واقعی حیثیت، ان کا سیاسی کردار، ان کے مقابل علّامہ فضلِ حق خیر آبادی کے مجاہدانہ کارنامے، علمی طمطراق، وطن پرستی، انگریز دشمنی، حبّ الوطنی اور جذبۂ حرّیت کی جلوہ سامانی کے لیے مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کریں:

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
۱	تنزیل التنظیر فی نظیر البشیر والنظیر	مولانا ابو محمد قلندر علی الزبیری الاسدی پانی پتی
۲	بہارستان افغانی (پشتو)	قاضی میر احمد رضوانی
۳	حقائق تحریک بالا کوٹ	شاہ حسین گردیزی
نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
۴	تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ	علّامہ فضلِ حق خیر آبادی
۵	تاریخ تناولیاں	سید مراد علی خاں
۶	تاریخ عجیبہ	محمد جعفر تھانیسری
۷	باغی ہندوستان	عبد الشاہد شیروانی
۸	ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک	عبید اللہ سندھی
۹	تاریخ اعیانِ وہابیہ	مولانا محبوب علی لکھنوی
۱۰	ترجمانِ وہابیہ	نواب محمد صدیق حسن خاں بھوپالی
۱۱	ترجمانِ اہلسنّت، کراچی	جنگ آزادی نمبر، جولائی ۱۹۷۵ء
۱۲	تذکرۂ علماے ہند (فارسی)	رحمٰن علی
۱۳	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک	مسعود عالم ندوی
۱۴	فضلِ حق خیر آبادی اور سن ستاون ۵۷	حکیم محمود برکاتی
۱۵	داستانِ تاریخ اردو	حامد حسن قادری
۱۶	خون کے آنسو	مولانا مشتاق احمد نظامی
۱۷	زلزلہ	علامہ ارشد القادری
۱۸	غالب نام آورم	نادم سیتاپوری
۱۹	امتیازِ حق	راجہ غلام محمد
۲۰	آثار الصنادید	سر سید علی گڑھی
۲۱	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء	خورشید مصطفےٰ رضوی
۲۲	۱۸۵۷ء کے ہیرو	سیدہ انیس فاطمہ رضوی
۲۳	۱۹۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ	خلیق احمد نظامی
۲۴	سیرت سید احمد شہید	ابو الحسن علی ندوی
۲۵	علمائے ہند کا شاندار ماضی	مولانا محمد میاں دیوبندی دہلوی

(باقی اگلے صفحے پر)

(گذشتہ سے پیوستہ) واضح رہے کہ ان مندرجہ بالا کتابوں کی فہرست میں ان لوگوں کی تصنیف وترتیب بھی ہے جو ملّا اسماعیل دہلوی وسید احمد رائے بریلوی سے فکری واعتقادی رشتہ رکھتے ہیں اور جابجا ان کی حمایت میں سرگرم بھی محسوس ہوں گے۔ لہٰذا کچھ مقامات پر اگر مدحت سرائی مبالغہ کی سرحدوں کو پار کر جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے کانے محبوب کو بھی آنکھ والوں سے زیادہ خوب صورت ثابت کرنے کے لیے الفاظ کا خرچ بڑی بے دردی کے ساتھ کرتے ہیں۔ رہ گئے غلام رسول مہر ومفتی انتظام اللہ شہابی جیسے لوگوں کی کتابوں کا عدم ذکر تو یہ لوگ نئی نئی روایات گڑھنے، نئی نئی تاریخ وضع کرنے اور فرضی کتابوں کا حوالہ دینے میں بہت کمال حاصل کر چکے ہیں۔ ان لوگوں نے ہٹلر کے دست راست گوئبلز کے اس قول کو مضبوطی کے ساتھ دانتوں سے پکڑ لیا ہے کہ ایک جھوٹ کو اتنی بار بولو کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔ جب نوبت بایں جا رسید تو پھر ایسے لوگوں کو اصحابِ قلم کی فہرست میں شامل کرنا انصاف ودیانت کے منافی ہے فاعتبروا یا اولی الالباب۔

افسانۂ جہاد سے تعبیر کر کے اس میں قتل ہونے والوں کو شہید اور بچ جانے والوں کو غازی کا خطاب دیا گیا۔ وہاں بھی ایک مشہور مذہبی وروحانی خانوادہ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی، شاہ رفیع الدین محدّث دہلوی، شاہ عبد العزیز محدّث دہلوی، شاہ مخصوص اللہ محدّث دہلوی، شاہ موسیٰ محدّث دہلوی...... ان میں کسی کا پوتا، کسی کا بھتیجا، کسی کا بھائی ایسے معتبر نام، ایسا معتبر خاندان تو نصیب والوں کو ہی ملتے ہیں۔

بلاشبہ انگریز خوش نصیب ہی تھے جو ایسے مقدّس خانوادے کا ایک فرد اپنے حواریوں کے ساتھ ان کے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے دستیاب ہو گیا۔ طالب ایسے ہی مطلوب کے لیے کہتا ہے ع

بیا بیا عراقی تو زخاصگان مائی

پہلے نام پاک، پھر ذاتِ پاک، پھر علمِ پاک، پھر تصرّفاتِ جلیلہ کو نشانہ بنا کر اہلِ محبت کو تڑپایا گیا۔ وہی نام جو کروڑوں دِلوں کی دھڑکن، کروڑوں آنکھوں کی ٹھنڈک اور کروڑوں ٹوٹے یاس کی آس ہے۔ وہ نامِ پاک جس کی خوشبو سے سارا عالم معطر ہے اور جس کے دَم سے چمنستانِ محبت میں بہاروں کا موسم بڑا عطر بیز ہے ع

ہے مجھ سے گریبان گل صبح معطّر
مَیں عطر نسیم چمن بادِ صبا ہوں

ہاں ہاں وہی مقدّس نام جس کے لیے اہلِ محبت کے سالار قافلہ حضرت جامی بڑے والہانہ انداز میں قربان ہوتے ہوئے عرض کرتے ہیں ع

ہزار بار بشویئم دہن ز مشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

جس نامِ پاک کے لیے درباری شاعر وصحابی حضرت حسّان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ؎

ما ان مدحت محمد ابمقالتی
لکن مدحت مقالتی بمحمد

اے پیکر رعنائی! ہم نے اپنے کلام سے آپ کے پاک ومقدّس نام کا خطبہ نہیں پڑھا ہے، بلکہ اپنے کلام کو آپ کے

نام کی برکت سے سنوارا ہے۔ وہ پاک نام جس کے لیے ڈاکٹر اقبالؔ یوں نغمہ سرا ہوں ؎

در دلِ مسلم مقام مصطفےٰ
آبروئے ما ز نام مصطفےٰ

اور جس بارگاہ میں حضرت جان محمد قدسیؔ یوں منفعل ہوں ؎

نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگ کوئے تو شد بے ادبی

اور جس کے لیے جانِ رضائے مصطفےٰ رضا یوں ترانہ چھیڑیں ؎

دمِ واپسیں تک تیرا گیت گاؤں
محمد محمد پکارا کروں میں

ہاں ہاں وہی نام نامی جس کی برکت سے ہستی کی زلفِ برہم سنواری گئی۔ حیات کا چہرہ نکھارا گیا۔ اور مردہ انسانیت کی رگوں میں زندگی کا گرم گرم لہو عطا کیا گیا۔

ہاں! وہی منتخب، برگزیدہ اور اپنی صفتِ بندگی میں وحدہٗ لاشریک ذات جس کے لیے گیتی کا فرش بچھایا گیا۔ آسمان کا شامیانہ لگایا گیا۔ اسے کہکشاں، چاند ستاروں سے دل کشی و رعنائی عطا کی گئی۔ ہاں ہاں وہی ذات جو وجودِ کائنات دو جہاں کا باعث اور اصل وجودِ کائنات ہے ؎

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا، وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی جان ہے تو جہان ہے

وہ ذاتِ گرامی وقار کہ جس کی بارگاہ کے ادب و احترام کا یہ عالم ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ آید جنید و بایزید ایں جا

وَلَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ الخ۔

اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند کرو اور انھیں اس طرح سے نہ پکارو جیسے تم ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔ اور جس کے لیے تب سینۂ سوزاں سے یہ آرزو مچلے ؎

آرزوئے جنت الماویٰ بروں کردن ز دل
جنتم ایں بس کہ بر خاک درت ماویٰ کنم
(جامیؔ)

جس کے لیے احترام کا یہ جذبہ کہ وہاں کے پھول تو پھول کانٹوں کے لیے یہ زبان استعمال کی جائے ؂

ان کی حرم کے خار کشیدہ ہیں کس لیے
آنکھوں میں آئیں سر پہ رہیں دل میں گھر کریں

جس ذاتِ پاک کے لیے اقبال کا سوزِ دروں یوں لباسِ حقیقت پہنے ؂

وہ دانائے سُبل ختمِ رُسل مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسٓ وہی طٰہٰ

اور جس کی مدحت سرائی کے لیے علامہ امام بوصیری دوٹوک انداز میں یوں فرمائیں ؂

دَع ما ادعتہ النصارٰی فِیۡ نبیّھم
وَاحکُمۡ بِمَا شِئۡتَ مَدحًا فیہِ وَاحتکِمِ

(قصیدہ بردہ)

مسلمانوں پر میرے آقا محمد عربی ﷺ کے غلامو! نصاریٰ نے اپنے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو باتیں کہی ہیں (یعنی خدا اور خدا کا بیٹا) تو ان سے باز رہ۔ اس کے علاوہ تو اپنے پیارے نبی کی شان میں جو چاہے کہے اور یقین و اعتماد کے ساتھ کہتا چلا جائے۔

حضرت حسّان بن ثابت مسجد نبوی میں سرکارِ اقدس کے روبرو یوں جھومیں ؂

وَاَجمَلُکَ مِنۡکَ لَمۡ تَرَقُّطُ عَیۡنِیۡ
وَاَکۡمَلُ مِنۡکَ لَمۡ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقۡتَ مُبَرَّاً مِّنۡ کُلِّ عَیۡبٍ
کَاَنَّکَ قَدۡ خُلِقۡتَ کَمَا تَشَاءُ

یعنی اے کائنات بزم محبت کے دولہا! آپ سے زیادہ حسین و جمیل میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے بڑا صاحبِ کمال دنیا جہاں کی عورتوں کی آغوش میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ آپ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے۔ گویا آپ کی تخلیق آپ ہی کی مرضی کے مطابق ہوئی ؂

ترے تو وصف عیب تناہی سے ہیں بَری
حیراں ہوں میرے شاہ مَیں کیا کیا کہوں تجھے

(اعلیٰ حضرت)

علّامہ جامی اس حقیقتِ صادقہ کو محبت کی شکل یوں دیں ؎

يَا صَاحِبَ الْجَمَالُ وَ يَا سَيِّدِ الْبَشَرْ
مِنْ وَّجْهِكَ الْمُنِيْر لَقَدْ نَوَّرَ الْقَمَرْ
لَا يُمْكِنُ الثَّنَا كَمَا كَانَ حَقَّهُ
بعد از خدا بزرگ توئی مختصر

اے سراپا حسن وجمال اور بشریت کے تاجدار چاند کی چمک دمک (توبس) آپ ہی کے روئے انور سے ہے۔ کماحقہٗ آپ کی تعریف وتوصیف تو ممکن ہی نہیں۔ بس مختصر بات یہ ہے کہ خدا کے بعد شرف وبزرگی میں آپ ہی کا مرتبہ ہے۔ اور جس کی بارگاہِ محبت میں حقیقت یوں لباسِ محبت لیے ہوئے ہو کہ ؎

وجودِ کائنات دوجہاں جس کی بدولت ہے
اسی کا ذکر کرنا میرے مذہب میں عبادت ہے

ہائے افسوس! انتشار بین المسلمین کے لیے اسی مقدّس ذات اور اسی ہستیِ بے کراں کو نشانِ ہدف بنایا گیا۔ مسلمانوں کو مذہبی ہیجان میں مبتلا کر کے انھیں باہم دست وگریبان کرنے کے لیے آقائے کائنات، فخرِ موجودات، نورِ مجسّم، سرورِ عالم حضور ارواحنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ عظمت پناہ میں گستاخیوں، دل آزاریوں، ہرزہ سرائیوں، بے ہودہ گویوں کا ایک منظم سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ وہ جن کی ناموس پر کائنات بھر کے ناموس قربان ان کا مقدّس ناموس معرضِ بحث میں لایا جانے لگا۔ اس ستودہ صفات ہستی کو عام انسانوں کی سطح پر کھڑا کیا جانے لگا۔ اور خود بھی اس مقدّس شانے سے اپنا شانہ ملا کر کھڑے ہونے لگے۔ بشریت کی عام سطح پر لا کر بھائی برادر کا مرتبہ دینے لگے۔ چمار سے زیادہ ذلیل، ذرّہ ناچیز اور مر کر مٹی میں مل جانے والا، پیٹھ پیچھے سے بے خبر وغیرہ۔ نہ جانے کیسی کیسی ہذیان وبے ہودہ گوئی ودل آزاری کا دروازہ کھول دیا گیا۔ علمِ غیب جو کسی بھی نبی کا وصفِ خاص اور اس کی نبوت کے لیے ضروری عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، اس وصف کو اس حد تک ذلیل و رُسوا کیا گیا کہ اسے زید، بکر، مجنوں، بہائم اور بچوں کے علم کے برابر قرار دے دیا گیا۔ حد یہ کہ آپ کے علمِ پاک کو شیطان سے بھی کم ثابت کرنے کے لیے قرآن کا سہارا لیا جانے لگا۔ اور سرکار کے علمِ پاک کو شیطان لعین سے زیادہ ماننے کو شرک قرار دیا جانے لگا۔ امکانِ ختم نبوت وامکانِ نظیر کا سہارا لے کر آپ کی بے مثلی پر موشگافیوں کے نئے نئے دروازے کھول دیے گئے۔ اپنے آقاؤں کے اشارے پر احترامِ نبوت وعصمت رسالت کے تار و پود بکھیر کر پوری اُمّتِ مسلمہ کو شدید ذہنی، فکری، مذہبی ودینی ہیجان وبحران میں مبتلا کر دیا گیا۔

مغربی سامراج نے افتراق بین المسلمین کے لیے اپنی حکومت کے خزانے کا منہ کھول دیا۔ اور اس کے زرخریدوں نے اپنے آقاؤں کے حسبِ منشا جبّہ ودستار، اپنے خاندانی کلاہ صد افتخار کے ساتھ ہر طرف قلمی ولسانی پیکار کے لیے نئے

نئے محاذ کھول دیے۔

اولیاے کاملین، شہداے اُمت و بزرگانِ دین کہ جنھوں نے ہزاروں رکاوٹیں، ہزاروں تصادم اور ہزاروں مخالفتوں کے باوجود چار دانگ عالم میں اسلام کی عظمتوں کا جھنڈا لہرایا۔ دین کی اشاعت، حبّ رسول کی تبلیغ کی اور اس راہِ محبت میں ہزاروں نفوسِ قدسیہ نے بڑی سے بڑی قربانیاں دے کر گھر گھر اسلام کا اُجالا پھیلایا اور اپنے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کی۔ آج دنیا کے جس بھی حصّے میں اسلام کی شمع فروزاں ہے، یہ انھیں قدسی صفات بندوں وخدا رسیدہ انسانوں کے وجودِ ذات کا فیضان ہے۔ برّ اعظم ایشیا، براعظم افریقہ، براعظم امریکہ، براعظم آسٹریلیا...... الغرض آج کائنات بزمِ ہستی میں جو بھی اُجالا نظر آتا ہے یہ سب انھیں کے قدم کی بہاریں ہیں۔ انبیا ومرسلین کی مقدّس جماعت کے بعد عالمِ انسانیت پر انھیں نفوسِ قدسیہ کا احسانِ عظیم، انھیں کی قربانیوں کا صلہ اور انھیں کی عزیمت واستقامت اور انھیں کے خون، جسم وجگر کی گرمی کا ثمرہ ہے کہ اسلام کی عظمتیں، برکتیں، رفعتیں، حقیقتیں مذہبی انحطاط کے اس نازک دور میں بھی اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ زندہ ہی نہیں بلکہ روشن وتابندہ ہیں۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

الٰہی یہ تیرے پُراسرار بندے   ہے بخشا جنھیں تو نے ذوقِ خدائی

دونیم ان کی ٹھوکر سے ہیں کوہ وصحرا   سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

مگر ہائے رے گردشِ ایّام کی خرمستی وہ کہ جنھوں نے کلمے کا شعور، آگہی کی حقیقت اور جبینِ نیاز میں سجدوں کی تڑپ عطا کی تھی، خدا کے انھیں قدسی صفات برگزیدہ خدا رسیدہ بندوں کو بھی نہیں بخشا۔ انتشار بین المسلمین کو بڑھاوا دینے کے لیے ان کی توہین، تذلیل کی جانے لگی۔ اور ان کی شان میں زبانِ طعن وتشنیع دراز ہونے لگیں۔ ان کی عظمت وبزرگی، تصرّف وفیضِ باطنی کو للکارا جانے لگا۔ حد یہ کہ ان سے عقیدت ومحبت بعطاے الٰہی ان سے استمداد واستعانت، ان کی بارگاہ میں حاضری اور ان کی طرف رجوع کو شرک وبدعت، جہالت وگمراہی قرار دے دیا گیا۔ اور بزرگانِ دین سے محبت رکھنے والے تمام مسلمانوں کو بت پرستوں، مشرکوں، ہندوؤں کی طرح قبر پرست قرار دے دیا گیا۔ گویا کہ اولیاے کرام کے مسلّم عقیدت مندوں کو مزاراتِ اولیا پر والہانہ حاضری اور ان کی بیکراں شخصیت کے احترام ومحبت میں ان کی قبر کے احترام کو مشرکانہ بُت پرستی کے مساوی کر دیا گیا ؎

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں

جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے

غرض پورے برّصغیر میں علمی، فکری، دینی، مذہبی افراتفری کا ایک زبردست طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ نتیجتاً پوری اُمّتِ مسلمہ ایک دوسرے سے باہم دست وگریبان ہوگئی اور تقریباً ہر مسلم خاندان اختلاف وانتشار کا ایک اکھاڑہ نظر آنے لگا۔

ہم باشعور اہلِ کلمہ و دیدہ ور اہلِ دل اور مسلم اتحاد، یک جہتی کے لیے دلِ دردمند رکھنے والے سے اہلِ محبت خصوصاً جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم ایس، آئی، ایم (اسٹوڈنٹ اسلامی موومینٹ) وایس، آئی، او (اسٹوڈنٹ اسلامک آرگنائزیشن)...... نیز کالجز و یونی ورسٹیز کے دیگر عالی دماغ، عالی فکر، عالی حوصلہ و روشن خیال طلبا و طالبات جو اپنے اندر مسلم اخوّت، مسلم اتحاد و یک جہتی کے لیے ایک دھڑکتا ہوا بے چین دل رکھتے ہیں اور ملت کی شیرازہ بندی کے لیے کچھ کر گزرنے کے حوصلے کے ساتھ ہی اس راہِ محبت کو سلام! آپ سے صرف اتنی گذارش و مخلصانہ التجا اور محبتانہ التماس ہے کہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا نہ صرف کارِ عظیم بلکہ ایک بڑا کارِ ثواب ہے۔ مسلمانوں کا ملّی انتشار ایک بڑی بیماری کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کے علاج کے لیے پہلے اسباب تلاشیے۔ ان محرکات پر غور کیجیے۔ اختلاف بین المسلمین کے اس بنیادی پسِ منظر پر توجہ دیجیے اور ملّی انتشار کی اس دُکھتی رگ پر انگلی رکھیے، جو اس موذی مرض اور مادّۂ فاسدہ کا ضروری عنصر بنا ہوا ہے۔ خدا و رسول کا واسطہ آپ کچھ دیر کے لیے جماعتی و مسلکی تعصّبات سے بلند ہو کر ایک غیر جانب دار مبصّر کی حیثیت سے دوسو[۲۰۰] سالہ مذہبی تاریخ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیجیے۔

اپنے فہم و شعور، فکر و ادراک کا جائز استعمال عمل میں لائیں اور اس مرکزی نکتے پر پوری توجہ مبذول کر دیجیے کہ اس گھر کو آگ کب لگی؟ کیسے لگی؟ مسلمانوں کو باہم لڑانے کا منصوبہ کس نے بنایا؟ افتراق بین المسلمین کس کی ضرورت تھی؟ ملّی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کون سے ہاتھ آگے بڑھے اور ان ہاتھوں کو کس ڈھنگ سے استعمال کیا گیا؟ اتحاد المسلمین پر پہلا تیشہ چلانے والے کا ٹریڈ مارک اور وہ کس ہیئت کذائی میں تھے؟

ابھی تاریخ کی روشن حقیقتیں زندہ ہیں اور ابھی بھی ان واضح حقیقتوں کا اِدراک ممکن ہے۔ آپ کا فہم و ادراک، فکر و آگہی، شعور و احساس اور سب سے بڑھ کر ضمیر زندہ ہے، تو تاریخ کی یہ اَن مٹ حقیقتیں اور مسلم اتحاد و اخوّت کے دامن پر بڑے بڑے خون کے دھبّے بتائیں گے کہ قاتل کون ہے؟

مَیں کس کے ہاتھ میں اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر تو پہنے ہوئے ہیں دستانے

کیا برّ صغیر ہند کی مذہبی تاریخ میں تقویت الایمان، جلاء العینین، صراطِ مستقیم، رسالہ یکروزی کے پہلے[۱] بھی کسی قابلِ ذکر مذہبی مناقشے اور افتراق بین المسلمین کی نظیر پیش کی جا سکتی ہے؟

لو ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

انگریزوں کے عزائم کی تکمیل میں لکھی گئی یہ وہ مذہبی کتابیں تھیں اور اب بھی ہیں جو تیرہ سو سال پہلے کے اسلام کو مسترد

---

[۱] یہاں پر اہلِ تشیع کی مثال نہ پیش کی جائے کہ وہ ابتدا ہی سے اپنی معمولی اور انتہائی قلیل مقدار کے ساتھ خود کو سوادِ اعظم سے خارج کیے ہوئے ہیں اور عام اسلامی برادری سے انھوں نے خود کو الگ تھلگ رکھا ہے۔ واضح رہے یہاں شیعہ سے مراد اس کے تمام اُصول و فروع و مالہٗ و ماعلیہ ہے۔

کررہی تھیں۔ ان کتابوں کو برٹش گورنمنٹ نے لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کرایا۔ آخر قاتلوں، خون کے پیاسوں، اسلام کے دشمنوں کو اسلامی کتب کی اشاعت سے اتنی دل چسپی کیوں ہوگئی تھی ؎

کوئی محبوب ہے اس پردۂ زرنگاری میں

ان کتابوں کی اشاعت سے مسلمانوں کے اندر زہر پھیل گیا۔ مسلم اتحاد پر جبّہ ودستار کی آڑ میں یہ انگریزوں کا پہلا اٹیک تھا۔ مسلم اجتماعیت پر یہ پہلا زبردست حملہ تھا اور انگریزوں کا یہ پہلا کامیاب شب خون تھا، جو اسلامی اتحاد پر مسلم نما ہاتھوں سے کیا گیا۔ ان کتابوں کے ذریعے انگریز کا اسلامی عقیدے پر پہلا جارحانہ اقدام تھا جو اپنی نوعیت کا بڑا ہی شدید تر تھا۔ یہ حملہ انگریز اپنے پادریوں اور راہبوں کے ذریعے کراتا تو وہ بات ہی پیدا نہ ہوتی اور نہ ردِّ عمل ہی اتنا شدید ہوتا، بلکہ یہ کام اس نے مسلم پادریوں سے لیا۔ پوری اُمتِ مسلمہ اس لیے چیخ پڑی کہ حملہ مسلم نما ہاتھوں سے کرایا گیا۔ شیخ نما، عالم نما، جبّہ نما لوگوں نے اسلامی اتحاد کو ڈائنامائٹ کرکے انگریزوں کے عزائم کی تکمیل کی ؎

یہ گلہ جفا وفا نما جو حرم کو اہلِ حرم سے ہے
کسی بُت کدے میں کروں بیاں تو کہے صنم ہری ہری

ایسے عالم میں شدید ردِّ عمل کے طور پر اسلام کی حمایت، حق کی دفاع میں اہلِ حق کی ایک مقدّس جماعت بڑی بے چینی کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوستی، رفاقت، رشتے، شیخ زادگی کا لحاظ کیے بغیر صرف رضائے الٰہی اور حمایتِ حق میں وہ فیصلے کیے جو ایسے ماحول میں انھیں کرنا ہی چاہیے تھے ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

وقارِ علم وفضل، مجاہدِ حرّیت حضرت علّامہ فضلِ حق خیر آبادی، صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، مولانا شاہ احمد سعید مجددی، مولانا شاہ منور الدین دہلوی، مولانا شاہ فضلِ رسول بدایونی، مولانا شاہ مخصوص اللہ محدّث دہلوی بن شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی، مولانا شاہ محمد موسیٰ بن شاہ رفیع الدین بن شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی۔

مولانا خیر الدین والد ابو الکلام آزاد وغیرہ وغیرہ علما، فقہا، محدّثین کی یہ وہ مقدّس جماعت تھی جنھوں نے اسلامی عقیدے پر حملہ کرنے والوں اور اسلامی اتحاد کے مجرموں کا نہایت سختی کے ساتھ احتساب فرمایا اور برّ صغیر ہند میں علما و مشائخ اور محدّثین کا یہ پہلا شاید تاریخی ردِّ عمل تھا، جو اِس عمل کے جواب میں رونما ہوا۔

شیرِ حق علامہ فضلِ حق خیر آبادی نے منصب قضا و اِفتا کی ذمے داریوں کو پورا کرتے ہوئے انگریزوں کے ان مذہبی غنڈوں کی مذہبی دہشت گردی وملّت فروشی پر حکمِ شرع نافذ کرتے ہوئے فرمایا:

قائل ایں کلام لاطائل از روئے شرع مبین کافر و بے دین است ہر گز مومن و مسلم نیست و حکم او شرعاً قتل و تکفیر است[1]

---

[1] تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ، از علامہ فضلِ حق خیر آبادی

یعنی اس بے ہودہ کلام کا قائل (یعنی اسماعیل دہلوی) شریعت غرہ کے نزدیک بے شک کافرو بے دین ہے۔ ہر گز مومن و مسلمان نہیں۔ اس کے لیے حکمِ شرعی یہ ہے کہ اسے کافرو مرتد قرار دے کر اس کی گردن ماردی جائے۔

اس حکمِ شرعی کی تصدیق وتائید دہلی شہر کے سترہ[1] جلیل القدر علما و مشائخ، فقہا و محدّثین نے فرمائی۔ جس میں مجرم کے سگے چچا زاد بھائی شاہ مخصوص اللہ محدّث دہلوی و شاہ محمد موسیٰ محدث دہلوی بھی شامل ہیں۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔**

برصغیر ہند میں انگریزوں کے پروردۂ نعمت اور اس کے ہم نواؤں کے خلاف شدید ردّ عمل کے طور پر علماے حق کا یہ پہلا تاریخی فیصلہ اور جہاد بالقلم تھا، جس میں خونی رشتہ، قرابت، خاندان، رفاقت کو پسِ پشت ڈال کر علما، فقہا، محدّثین، متکلمین نے اسلامی جذبے، حمایتِ حق اور دینی تقاضوں کو سامنے رکھا، جس کے نمایاں اثرات رونما ہوئے۔

ابتدائی مرحلے میں اس کا استیصال اس لیے نہیں ہوسکا کہ ایک ایسی عظیم اور بڑی طاقت و حکومت اس فتنے کو جلا بخش رہی تھی کہ جس کے قلمرو میں سورج ہی نہیں غروب ہوتا تھا۔ وقت کے ساتھ ہی یہ فتنے جڑ پکڑتے رہے۔ سرکاری سرپرستی میں ان کا نشو و نما ہوتا رہا اور اختلاف بین المسلمین کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہا۔ اس میں مزید اضافے کے لیے نت نئی کتابیں سرکاری سرپرستی میں منظر عام پر آتی رہیں اور مزید انتشار بڑھتا رہا۔

یہ حفظ الایمان ہے... یہ براہین قاطعہ ہے... یہ تحذیر النّاس ہے... وغیرہ وغیرہ ؎

مَیں شہرِ گل میں زخم کا چہرہ کسے دکھاؤں
شبنم بدست لوگ تو کانٹے چبھو گئے

خدا گواہ ہے کہ انھیں کتابوں نے ملّی اتحاد، اسلامی اخوت اور مسلم بھائی چارگی کو پارہ پارہ کیا۔ یہ ظالم اسلامی معتقدات پر اتنا شدید حملہ کرتے ہوئے یہ بھول گئے کہ اس کا اتنا ہی شدید ردّ عمل بھی ہوگا۔ ایکشن کے بعد ری ایکشن اور عمل پر ردّ عمل فطری و لازمی ہوتا ہے۔

ہزار گذارش، ہزار فہمائش، توبہ و ندامت کی بار بار دعوتوں کے باوجود اتحادِ اسلامی کے یہ دشمن جب اپنے موقف پر پوری بے شرمی کے ساتھ ڈٹے رہے تو ایک بار پھر اسلامی معتقدات پر جارحانہ اقدام کے ردّ عمل میں اپنے بزرگوں کی اتباع اسلام کی حمایت، مذہب اہلِ سُنّت کے دفاع، دینی ضرورتوں اور شرعی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عالمِ اسلام کے مرجع اکابر علما و مشائخ کے مرکز عقیدت، علماے حرمین کے مرکزِ اُمید، رشکِ عرب، فخرِ عجم، قافلۂ محبت کے سپہ سالار شیخ الاسلام والمسلمین اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی نے بارگاہ رسالت کے گستاخوں، اتحادِ اسلامی کے دشمنوں، اسلام کے مجرموں اور شاتمانِ نبوت کے خلاف وہ عظیم اور تاریخی فیصلہ کیا جس نے برصغیر ہند کے مذہبی تاریخ کا دھارا ہی بدل دیا۔ لمبی داڑھی اور جبّہ و دستار کی آڑ میں چھپے ہوئے کفر و بے دینی کو عالمِ اسلام پر آشکارا کر دیا اور اہلِ اسلام کو بتادیا کہ لوگ کفری بولی بول کر اپنے کو اسلام سے خارج کر لیے ہیں۔ گویا کہ **وَلَا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم**[1] کی منزل میں داخل

ہو چکے ہیں۔

اب ان کے علم وآگہی اور جبہ ودستار سے کوئی دھوکہ نہ کھائے۔ ان کی عبادت وریاضت یَفْعَلُوْنَ رِیَاءَ النَّاسِ کے مصداق ہے۔ جس کا اسلامی روح سے کوئی واسطہ نہیں اور اپنے اس ایمانی فیصلے کی تائید وتوثیق مرکز اسلام مکّہ مکرّمہ و مدینہ منورہ کے جلیل القدر علمائے کرام، مفتیانِ عظام، فقہائے اسلام اور مشائخین ذی الاحترام سے کرائیں جو حسام الحرمین کی شکل میں دورِ حاضر میں حق وباطل کی سب سے بڑی کسوٹی ہے۔

بخدا خدا کا یہی ہے دَر، نہیں اور کوئی مفر مقر
جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو، جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

احقاقِ حق کا یہی وہ فریضہ تھا جسے اسلام کے بطلِ جلیل اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی نے انجام دیا۔ جس کی پاداش میں باطل کی طاقتیں متحدہ محاذ بنا کر اس امامِ برحق کے مقابلے سینہ سپر ہو گئیں اور آپ کو بدنام کرنے کے لیے وہ سارے ہتھ کنڈے استعمال کیے جو انسانی امکان کے اندر تھا۔

آپ کے خلاف فرضی لٹریچروں کا طوفان کھڑا کر دیا گیا اور بقول ہٹلر کے دست راست گوئبلز کہ ایک جھوٹ کو اتنا دہراؤ کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔ ان بندگانِ نفس نے بھی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے خلاف جھوٹ اور فرضی پروپیگنڈے کا وہ طومار باندھا کہ اس سے خواص اور اہلِ علم کا ایک بڑا طبقہ متاثر ہو گیا۔ حد یہ کہ آپ کے نام کو مذہبی دہشت گردی کی علامت قرار دے دیا گیا اور آپ کے حیرت ناک وکوہِ پیکر اور قد آور علمی شخصیت کو طرح طرح کے الزامات سے ڈھک دیا گیا ۔

بہتان تراشی کی ضرورت نہیں لوگو
دینے کو سزا جرمِ محبت ہی بہت ہے

اور بلاشبہہ امام احمد رضا کو محبتِ رسول کے جرم میں بندگانِ نفس اور دشمنانِ عشق ومحبت نے کڑی اور بڑی سزا دینے کی امکان بھر کوشش کی۔ علمی دنیا سے بائیکاٹ کی مہم چلائی اور اصحابِ فضل وکمال کی تاریخ سے نکال کر باہر کرنے کی پوری کوشش کی اور تقریباً ایک صدی سے امام احمد رضا کے خلاف اہلِ باطل نے جھوٹ کا پیشہ آبائے سپہ گری اختیار کر رکھا ہے الّا ماشاء اللہ

واقف نہیں ہے اس کے لبوں کو کنول نہ لکھ
الفاظ کو خضاب لگا کر غزل نہ لکھ

یہ تو خدا بھلا کرے اور پوری اُمتِ مسلمہ کی طرف بے حد وحساب جزائے خیر عطا فرمائے مرکزی مجلسِ رضا لاہور کے بانی ومؤسس حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری علیہ الرحمہ کا کہ انھوں نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا پر پاکستان میں دانش وروں

اور دیدہ وروں اور اصحابِ فضل و کمال کا ایک تحقیقاتی بورڈ قائم کر کے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی صحیح تصویر اور آپ کی بیکراں و بے غبار شخصیت کا آئینۂ جمال و کمال دنیا کے سامنے رکھا۔ اور اس خصوص میں مفتیِ اعظم دہلی حضرت علامہ مفتی مظہر اللہ صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کے بلند اقبال، گونا گوں صلاحیتوں کے حامل، صاحبِ علم و فضل، نکتہ داں، نکتہ رس، صاحبِ طرز انشاء پرداز اور دیدہ ور فرزند ارجمند ڈاکٹر پروفیسر محمد مسعود احمد مظہری ایم، اے۔ پی ایچ ڈی نے بڑا کام کیا۔ تقریباً پچیس برس سے اعلیٰ حضرت کی بیکراں شخصیت کو اپنے قلم کی جولان گاہ بنایا اور اس علم کے بیکراں بحر کی تہہ سے ایسے ایسے موتی چن کر لائے کہ دیدۂ حیرت کو حیرت زدہ کر دیا۔ ان کے محققانہ و جستجویانہ قلم حقیقت رقم نے حقائق کے ایسے انبار اہلِ علم، اہلِ دانش کے سامنے لائے کہ جس سے ان کی نگاہیں خیرہ ہوگئیں۔ نتیجے میں آج براعظم ایشیا، براعظم افریقہ، براعظم امریکہ، براعظم یورپ کی ایک درجن سے زائد بڑی بڑی یونی ورسٹیاں اور جدید علمی دانش کدے امام احمد رضا کی کوہ پیکر علمی شخصیت کی طرف متوجہ ہو چکی ہیں۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔**

کھلنا کہیں چھپا ہے چاہت کے پھول کا
لی گھر میں سانس اور گلی تک مہک گئی

اور اب اہلِ علم، اہلِ فہم اور اربابِ علم و دانش پر بھی یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے لگی کہ اسلام کی عظمت ناموسِ رسالت کی تقدیس و تطہیر اور انبیا و اولیا کی عظمتوں کے تحفظ کے لیے امام احمد رضا نے اپنے تلامذہ و خلفا و اہلِ محبت و معاصرین علما و مشائخ کے ساتھ مل کر جو چوکھی دفاعی جنگ لڑی ہے، پورے عالمِ اسلام میں اس کا اس دورِ اخیر میں کوئی جواب نہیں۔ اور یہ کہ نجد سے لے کر سہارن پور تک امام احمد رضا کی برہمی عین مطلوبِ اسلام و تقاضائے ایمان نیز اپنی بے پناہ وابستگیِ رسول اور اس ذاتِ ستودہ صفات سے اپنی عشق و محبت و وارفتگی و وفاداری کا ایک عظیم الشان مظاہرہ ہے۔ جس کے لیے ڈاکٹر اقبالؔ نے کہا ہے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بو لہبی است

اب ہم آخر میں ان سے ایک مخلصانہ اپیل کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتے ہیں جو اتحاد بین المسلمین کے لیے کوشاں ہیں اور آئے دن اتحادِ اسلامی کا نعرہ بلند کرتے رہتے ہیں کہ اگر واقعی آپ حضرات مسلم اتحاد اور ہفتۂ دعوتِ وحدت منانے میں مخلص ہیں اور اتحاد بین المسلمین کے لیے کچھ کر گزرنے کی تڑپ رکھتے ہیں اور حقیقتاً آپ اس کے لیے دردمند تڑپتا ہوا دل رکھتے ہیں تو آئیے پہلے اس ناسور کی حقیقی بنیاد تلاشیے اور دیکھیے کہ اسلامی اخوت میں یہ فساد کہاں سے پیدا ہوا اور اس صالح خون میں مادۂ فاسد کہاں سے آیا؟ اور اب تک وہ مواد بند کیوں نہ ہوا۔ آپ صورتِ حال کے دونوں رُخ کو سامنے رکھیں۔ صرف زبردست ردِّعمل اور ہائی ری ایکشن ہی پر نگاہ نہ رہے، بلکہ اسلامی اتحاد کو ڈائنامائٹ کرنے والے اس

عملِ جارحیت، متشددانہ اقدام اور شر پسندانہ ایکشن بھی آپ کی نگاہوں کے حصار میں رہنا چاہیے۔ جن اسباب و وجوہات کی بنا پر اختلاف بین المسلمین کا جوالا مکھی پھٹا' ملّی شیرازہ منتشر ہوا' قلوب مومنین زخمی ہوئے اور مسلمانوں کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پہلے اس حقیقی بنیاد پر انگلی رکھیے کہ جب تک فساد کا وہ جڑ اور مادۂ فساد کا وہ مخرج باقی ہے' علاج ممکن نہیں۔ ہواؤں میں تیر چلانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی اس ہوائی فائرنگ کا کوئی حاصل۔

جب تک مسلمانوں کے اندر تقویت الایمان، صراطِ مستقیم، حفظ الایمان، براہین قاطعہ، تحذیر الناس... وغیرہ اپنی دل آزار تحریروں، گستاخانہ عبارتوں، دینی خرابات و باطل نظریات کا علم اُٹھائے ہوئے موجود ہیں... اسلامی اتحاد ناممکن اور اسلامی اخوت کے لیے ساری کوششیں رائیگاں و بے سود۔ جس طرح تکلیف دہ زخم پر بغیر اس کا فاسد مواد نکالے ہوئے لاکھ ڈریسنگ کی جائے وہ زخم اچھا نہیں ہوسکتا۔ یوں ہی اتحادِ اسلامی کی راہ اور مسلم جذبۂ اخوت کی صحت کے لیے ایک بدبودار مواد کی شکل میں یہ کتابیں رُکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔ اگر واقعی آپ اسلامی اتحاد کے علم بردار اور مسلم اخوت کے لیے مخلص ہیں تو سب سے پہلے ان کتابوں کے گستاخانہ و دل آزار پیرا گراف اور ان سے پیدا شدہ باطل نظریات کا قلع قمع کیجیے۔ مسلم معاشرے کو ان کے وجود سے پاک کیجیے۔ آخر یہ ادلۂ اربعہ[1] تو نہیں۔

جن کتابوں اور جن نظریات نے مسلم اخوت اور اسلامی اتحاد کو ڈائنامائٹ کیا ہو، مسلمانوں میں اس کی ضرورت ہی کیا۔ دوستو! بہت کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ اگر کچھ کھو کر بہت کچھ مل جائے تو جھوٹی انا اور فانی آن کھو کر اتحا ملت اور مسلم اخوت کا دولتِ لازوال مل جائے تو اس سے بڑی نعمت اور کیا ہوسکتی ہے؟

چھٹ جائے اگر دولتِ دنیا تو کیا غم
چھوٹے نہ مگر ہاتھ سے سرکار کا دامن

مَیں نے کچھ عرض کیا اس کی صداقت کا احساس ان مذکورہ بالا کتابوں کے مصنّفین سے اعتقادی نسبت رکھنے والوں کے ایک باشعور طبقے کو بھی ہمیشہ رہا۔ اور اندرونِ خانہ وہ اس پر منفعل تھے کہ اسلامی اتحاد اور مسلم اخوت کو ہمارے بزرگوں کی انھیں کتابوں نے پارہ پارہ کیا ہے۔ مگر وہ اپنے نام نہاد بزرگوں کے اعتقادی و کفری جرم کو جرم اور اتحادِ اسلامی کے اصل مجرم! علیٰ رؤس الاشہاد کہنے کی اخلاقی جرأت نہیں کر سکے۔ اس خصوص میں اس طبقۂ خاص نے جو عوام کا معتمد علیہ بھی تھا، اس نے نار پر عار کو ترجیح دیا۔

یاں تو کٹتی ہے خیر سے غالبؔ
عاقبت کی خبر خدا جانے

یا غالبؔ کے اس خالص صوفیانہ شعر کا غلط مطلب سمجھ کر کہ ؎

---

[1] ادلۂ اربعہ... قرآن مجید، حدیث، اجماعِ اُمت، قیاسِ مجتہد کو کہتے ہیں۔ اسلام میں انھیں چار چیزوں کو دلیل میں لایا جاتا ہے، بس۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ان کے نزدیک جنت، عار، نار کے تکون میں صرف عار ہی سب سے اہم عنصر ہے۔ ورنہ ان باشعور طبقے کے خاکستر میں کچھ چنگاریاں ایسی بھی تھیں جو اپنے ضمیر کی ٹیس نہ برداشت کر سکنے پر کبھی کبھی بھڑک کر آگ ہو جایا کرتی تھیں۔ اتحاد المسلمین کے حقیقی اسباب کا اِدراک تو ان کے ایک بڑے باشعور طبقے کو تھا ہی، لیکن اس کے اظہار اور اس سے برأت کا اخلاقی مظاہرہ بہت کم یاب رہا۔

مثال کے طور پر جناب عامر عثمانی مالک و ایڈیٹر ماہ نامہ 'تجلّی' دیوبند ہی کو لے لیجیے کہ موصوف کے بارے میں شہرت ہے کہ وہ ایک بالغ نظر، حقیقت پسند، صاحبِ طرز انشاء پرداز، صحافی، رائٹر، شاعر و ادیب... سب سے بڑھ کر وہابی مذہب کے ایک زبردست عالم دارالعلوم دیوبند کے صفِ اوّل کے فاضل، جماعت اسلامی کے ایک بے حد مخلص و متحرک و فعّال اور بے دار مغز ستون اور جناب مودودی صاحب کے بے پناہ عقیدت مند۔

انھوں نے اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے ان تلخ و دل خراش حقیقتوں کا لمحاتی مظاہرہ کیا تھا۔ وہ ایک مذہبی کتاب ''زلزلہ'' پر حقیقت پسندانہ تبصرہ کرتے ہوئے کمالِ دانائی و اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ...

> ''ہمارے نزدیک جان چھڑانے کی بس یہی ایک راہ ہے کہ تقویت الایمان، فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ امدادیہ اور بہشتی زیور اور حفظ الایمان جیسی کتابوں کو چوراہے پر رکھ کر آگ دے دی جائے اور صاف اعلان کر دیا جائے کہ ان کے مندرجات قرآن وسُنّت کے خلاف ہیں۔''

(ماہ نامہ تجلّی دیوبند، بابت ماہ مئی ۱۹۷۳ء)

کاش ان کے زرّیں مشورے پر اسی وقت سے عمل درآمد شروع ہو گیا ہوتا تو باہم منافرت و اختلاف کی خلیج بہت حد تک کم ہو چکی ہوتی۔ بہر حال ابھی بھی بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اتحادِ اسلامی کے لیے سب سے پہلے ان کتابوں اور ان سے پیدا شدہ نظریات سے توبہ و برأت کے بعد ان کتابوں کی نحوست سے زمین کو پاک کر دیا جائے۔ ردّ عمل کے طور پر ان کے جوابات میں جتنے مسائل اور نکتہ چینیاں اور ان کے ردّ عمل سے جو بے چینیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائیں گی۔ رہ گئے چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل یہ تو حقائق سے گریز پائی کے لیے گرتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ہے۔ اصل تو اُصول و اعتقادی اختلاف ہیں۔ جب یہی نہیں رہیں گے تو یہ شاخیں اپنی نمو کے لیے تری کہاں سے لائیں گی؟ پھر کسی عظیم مقصد کے حصول کے لیے قربانیاں دینی پڑتی ہیں اور خصوص میں دونوں طرف کے سنجیدہ و باشعور لوگوں کو آگے بڑھنا چاہیے اور ہر طرح کی قربانی پیش کر کے اختلاف بین المسلمین کی خلیج کو ختم کرنا چاہیے۔ مناظرہ اس کا حل نہیں۔ تقریباً ایک صدی سے

جانبین کے باکمال اصحابِ علم وفضل مناظرہ کرتے ہی آئے۔ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی[1] اب نہ پہلے جیسے اصحابِ فضل و کمال رہ گئے اور نہ ہی ان کا جذبۂ خلوص وحوصلۂ بلند۔ اب تو مذہبی اختلاف بھی ایک معاشی ضرورت بن چکی ہے۔ جماعتی و مذہبی اختلاف تو اپنی جگہ پر تھے اور ہے ہی! یہاں سلاسلِ طریقت کے درمیان خلیج ومنافرت اپنے اقتصادی استحکام اور معاشی حجم کے لیے ایک ضروری عنصر ہو کر رہ گئے ہیں۔ سوادِ اعظم اہلِ سنّت و جماعت کی نمائندہ خالص مذہبی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت اتحادِ اسلامی کے لیے ہر امکانی قربانی پیش کرنے کو تیار ہے ؎

یہ ہے دامن یہ ہے گریباں، آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

☑☑☑☑☑☑

---

[1] مناظرے سے فائدے بھی ہوئے۔ بے خبروں کا ایک بڑا طبقہ تقدّس مآبی کے ظاہری نمود کے پیچھے چھپے ہوئے بے دینی سے باخبر ہو کر بد مذہبوں سے الگ تھلگ ہوا۔ مناظرہ ہر دَور میں ہوا، ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کے اثرات مرتب ہوں گے اور ہوتے رہیں گے۔ اس کے باوجود اختلاف بین المسلمین کی خلیج اپنی جگہ برقرار ہے۔

اسلام میں بریلوی ایک فرقہ؟

غریب شہر!

سخن ہائے گفتنی دارد

میں آئینہ ہوں وہی بولتا ہوں جو سچ ہے
میں آدمی کی طرح جھوٹ بولتا ہی نہیں

مذہبی اصطلاح میں:۔ اصول وقوائد سے اختلاف کو فرقہ کہا جاتا ہے۔ اور فروعی اختلافات کو مسلک! جیسے بابیت، بہائیت، قادیانیت، وہابیت اور رافضیت، یہ اسلام کے مقابلے میں ایک فرقے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اصول وعقائد میں یہ اسلام سے قدم قدم پر متصادم ہیں۔ ان کے مقابلے میں سواد اعظم اہل سنت وجماعت مستقل ایک فرقہ ہے۔ البتہ ان کا مسائل میں فروعی اختلافات مسلک کہلاتا ہے اور ان کا مسلکی اتباع انہیں جماعت سے الگ نہیں کرتا، خواہ وہ حنفی ہوں، شافعی ہوں، مالکی ہوں یا حنبلی۔ یہ چاروں اُصول وعقائد میں مستقل ایک فرقہ ہیں اور یہی سواد اعظم! جس کے لیے ارشادِ نبوی ہے:

اِتَّبِعُوا السَّوَادَ الْاَعْظَمَ فَاِنَّہٗ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ۔

پیروی کرو سوادِ اعظم کی اس لیے کہ جو سواد اعظم سے الگ ہوا وہ جہنم میں گیا۔

سوادِ اعظم اہلِ سنت وجماعت سے مراد مسلمانوں کی وہ بھاری جماعت اور اغلب ترین اکثریت جو ہر دور اور ہر زمانے میں حضور سید عالم ﷺ اور ان کے اصحاب یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طریقے پر گامزن رہی، قرآن وسنت واتباعِ صحابہ وتابعین میں حق ہمیشہ اسی بھاری اکثریت کے ساتھ رہا۔ یعنی حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی ہر زمانے میں یہی معیارِ حق، یہی صراطِ مستقیم، یہی سوادِ اعظم اور یہی اسلام کا حقیقی چہرہ تھے، ہیں اور رہیں گے۔

ہزار آندھیاں اٹھیں انہیں بجھانے کو
حریم کعبہ کے پھر بھی چراغ جلتے رہے

اس کے علاوہ بھی اگر اسلام کے نام پر کچھ ہے تو وہ فریب محض ہے جس کا اسلام سے کچھ لینا دینا نہیں۔

بیشک اسلام میں ''بریلوی'' نام کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ قدیم مذہب اہل سنت وجماعت کو وہابیہ دیابنہ نے ایک خطرناک سازش کے تحت یہ نام دیا اور اس کی خوب تشہیر کی اور اس نام کا خوب ڈھول پیٹا۔ جو بارہویں صدی ہجری میں سرزمین نجد

سے ظہور پذیر ہوا۔ جس کی خبر حضور مخبر سیدنا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت پہلے سے دے رکھی ہے کہ

هُنَاكَ الزِّلَالُ وَالْفِتَنُ وَيُطْلَعُ بِهَا قَرْنَ الشَّيْطَانِ

وہاں تو زلزلے اور فتنے پیدا ہوں گے اور وہاں سے شیطان کی سینگ طلوع ہوگی چنانچہ بارہویں صدی ہجری میں محمد بن عبد الوہاب نجدی کی شکل میں سرزمین نجد پر زلزلے و فتنے پیدا ہوئے اور شیطان کی سینگ نمودار ہوئی جس کی تفسیلات اس موضوع کی کتابیں عربی، اردو اور فارسی میں بھری ہوئی ہیں۔

بارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں سرزمین نجد کا وہ عظیم فتنہ یہاں ہندوستان میں شاہ اسماعیل دہلوی کے ذریعے ظہور پذیر ہوا۔ جس نے تیرہ سو سالہ قدیم مذہب اسلام کے مقابلے میں ایک نیا دین اور مصنوعی اسلام پیش کیا اور وہ حقیقی اسلام جو حضور ختمی مرتبت ﷺ لے کر آئے تھے جس پر صحابہ کرام وتابعین عظام وتبع تابعین واسلاف امت چلے اور اس کو حرز جاں بنایا۔ اسے یہ نیا دین وہابیت کلی طور پر مسترد کر رہا تھا۔ شدید ردعمل کے طور پر علمائے حق و پاسدارانِ اسلام ہر طرف پوری شدت وتوانائی کے ساتھ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے جذبہ ایمانی کے ساتھ وہابیت کے چہرے کو ننگا اور مسلمانوں میں اس کی قرار واقعی حیثیت کو اجاگر کیا۔ اور محمد بن عبد الوہاب کے اس نئے دین اور اس جدید عقائد کو وہابیت اور اس کا اتباع کرنے والوں کو وہابی کا نام دے کر انہیں اسلام سے باہر کا راستہ دکھایا۔

چونکہ یہ فتنہ شاہ اسماعیل دہلوی کے ذریعہ رونما ہوا۔ اس لیے اس کا ایک نام فرقہ اسماعیلیہ بھی پڑا جو اپنی دہشت گردی اور کالے کرتوتوں کے سبب ایک گالی کے مترادف ہو گیا۔ بقول حضرت اجمل الہ آبادی

وہابی سے پوچھو کہ تم ہو وہابی | توفوراً کہے گا نہیں تو نہیں تو

اس فتنہ وہابیت کی سرکوبی اور اس کے رد واستیصال کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا خانوادہ ان کے تلامذہ وابستگان ہی آگے آئے حضرت شیخ عبد العزیز محدث دہلوی کے بھائی حضرت شیخ عبد القادر محدث دہلوی آپ کے بھتیجے حضرت شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی حضرت شاہ موسیٰ محدث دہلوی اور آپ کے ارشد تلامذہ نے خون اور تعلقات پر دین کو ترجیح دی اور دین پاک کے مقابلے میں ہر رشتے کو مسترد فرما دیا۔

عشق اعجاز شرکت کا قائل نہیں | یا محمد کا بن یا زمانے کا بن

معاصرین میں مجاہد حریت، امام الحکمت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی سیف اللہ المسلول حضرت شاہ فضل رسول بدایونی کا نام نامی مذہبی تاریخ کا جلی عنوان بن گیا۔

انگریزی حکومت کی سرپرستی میں یہ فتنہ مختلف شکلوں میں پھلتا پھولتا اور زور پکڑتا رہا۔ مگر علماء حق کبھی اس سے غافل نہیں رہے۔ یہاں تک کہ چودھویں صدی ہجری میں اس نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلائے جس کی سرکوبی کے لیے اس عہد کے سربرآوردہ علماء کرام اور مشائخ عظام نے بڑا حیران کن کارنامہ انجام دیا جس نے مذہبی تاریخ کا دھارا ہی بدل دیا۔ چونکہ

اس خصوص میں اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی کے خدمات و کارنامے بہت ہی نمایاں تھے اور آپ کی حیثیت سالار قافلہ کی تھی اس لیے اغیار و مخالفین و اعدائے دین کے نشانے پر اس وقت سے لے کر آج تک آپ ہی تھے۔ بقول مشہور خانقاہی عالم دین حضرت علامہ زید ابوالحسن فاروقی دہلوی جو اس موضوع پر ہمیشہ خاموش رہے بلکہ ایک طرح سے دوری بنائے رہے۔ انہیں بھی بالآخر اپنی خاموشی توڑتے ہوئے قلم اٹھانا پڑا اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے اخلاص دین اور ان کی خدماتِ جلیلہ کو خراج تحسین پیش کرنا پڑا کہ

''مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ نے ان گستاخوں اور بے ادبوں کے منہ میں لگام دے دی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ دنیا جہاں کے علوم قرآن میں ہیں اور قرآن سینۂ مصطفی میں تو پھر سینۂ مصطفی میں دنیا جہاں کا علم کیوں نہیں۔ ان کے نزدیک ''علم ما کان و ما یکون'' سے باخبری حضور ﷺ نبوت کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ علامہ اقبال بھی مولانا احمد رضا کی تائید کرتے ہیں اور علوم غیبیہ کو نبوت کا خاص امتیاز قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

چشم او برزشت و خوب کائنات　　　　در نگاہ او غیوب کائنات

مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ کے پیش نظر شریعت مصطفوی تھی۔ دوست یا دشمن جس نے بھی شریعت کے خلاف قدم اٹھایا انہوں نے سخت گرفت کی، پوری قوت سے اس کی مزاحمت کی آپ کے نزدیک شخصیات نہیں شریعت تھی۔ آپ نے شریعت کو پیمانہ بنایا۔ یہی آپ کے فکر ارجمند کا امتیاز خاص ہے۔ مولانا احمد رضا کو یہ شکایت تھی کہ ان کے مخالفین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں گستاخیاں کیوں کرتے ہیں اور مخالفین کو یہ شکایت تھی کہ مولانا احمد رضا خاں ان کو اور ان کے اکابر کو برا کیوں کہتے ہیں۔ یہیں سے دونوں کے افکار کی بلندیوں اور پستیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''

(تذکرہ حضرت محدث دکن جلد اول صفحہ ۱۶۹، مؤلف ڈاکٹر ابوالحسنات عبدالستار خاں نقشبندی، ایم اے۔ پی ایچ ڈی امریکہ، سابق صدر شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن انڈیا)

مولانا احمد رضا خاں پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ (انہوں نے) ملت میں انتشار پیدا کیا اور تفرقہ کی بنیاد ڈالی یہ بات سراسر غلط ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے قدیم افکار و عقائد کو زندہ کیا اور ان کو زبان عطا کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اہل وطن کو شکست ہوئی۔ انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چھینی اس نے دیکھا کہ قرآن سے محبت اور حضور ﷺ سے عشق اور اہل اللہ اور اولیاء اللہ سے محبت و عقیدت مسلمانوں کی طاقت کا راز ہے تو حضور ﷺ ذات و صفات کو موضوع بحث بنا کر اس محبت و عشق کو ضعیف کیا گیا۔ انبیاء و اولیاء اللہ کو عاجز بندہ بنا کر مسلمانوں کو ان سے روگردانی کرایا گیا اور اس صف میں لاکھڑا کیا گیا جہاں ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم سے انکار کیا تھا ایسے فتوے لکھے گئے کہ علماء سابقین و لاحقین سب مشرک قرار پائے اور مسلمان کئی فرقوں میں بٹ گئے اور یہ سارے فرقے و جماعتیں سعودی حکومت کے بعد کی پیداوار ہیں۔

(اور سعودی حکومت کا باقاعدہ قیام بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں ہوا)

(تذکرۂ حضرت محدث دکن صفحہ ۱۷۱)

علامہ زید الحسن فاروقی دہلوی مزید فرماتے ہیں:

''مولانا احمد رضا خاں کے آفاقی پیغام کو بریلویت کے نام سے مشہور کر دیا گیا حالانکہ آپ اہل سنت کی علامت ہیں دنیا میں لاکھوں کروڑوں ایسے سنی بستے ہیں جو بریلویت کی اصطلاح تک سے واقف نہیں ہیں مگر عقائد وہی رکھتے ہیں جن کی تبلیغ و اشاعت مولانا احمد رضا خاں رحمۃ للہ علیہ نے کی یہی وجہ ہے کہ علماء عرب و عجم نے آپ کو چودہویں صدی ہجری اور بیسویں صدی کے مجددین میں شمار کیا ہے۔''

(تذکرہ محدث دکن صفحہ ۱۷۱، تالیف ڈاکٹر ابوالخیرات محمد عبدالستار خاں ایم اے پی ایچ ڈی امریکہ، سابق صدر شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)

چونکہ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کا وطن بریلی شہر تھا آپ اباو جداً بریلی کے رہنے والے تھے اس لیے بریلوی آپ کے نام کے ساتھ ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا تھا جبکہ آپ کی مہر پر آپ کے نام کے ساتھ سنی، حنفی، محمدی بالالتزام کندہ ہوا کرتا تھا۔ اس لفظ بریلوی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اغیار و مخالفین و اعدائے دین نے پورے سواد اعظم اہل سنت و جماعت کو بریلوی کا نام دے دیا اور اس پر شدت سے عمل پیرا ہوئے اور اس کے لیے بڑی خاموشی کے ساتھ ایک مؤثر تحریک چلائی عربی میگزین اور عربی زبان میں اس پر کتابیں لکھی گئیں اور بڑے پیمانے پر عالمی سطح پر اس کی تقسیم ہوئی جس کا دفاع بھی اسی وقت سے ہونے لگا مگر جس شدت سے ملک و بیرون ملک اس کی تشہیر ہو رہی تھی اس کے مقابلے ہمارا دفاع بڑا کمزور و جز وقتی تھا، ہمارا ایک مخصوص حلقہ وہابیت کے اس خطرناک عالمی سازش کی سنگینی کو محسوس کرنے کے بجائے خوش فہمی کا شکار ہو کر اس لفظ بریلوی کو اپنا امتیازی نشان سمجھنے لگا اور اس پر فخر سے سینہ پھلانے لگا کہ ہم بریلوی ہیں جس سے مخالفین کا کام اور زیادہ آسان ہو گیا اور خود اپنے لعنتی داغ وہابیت کو اہلِ سنت کے لبادے میں چھپانے لگے اور ڈھٹائی کا عالم یہ ہے کہ اس وقت وہ علی الاعلان اہلِ سنت اور خود کو سُنّی لکھنے پڑھنے کہنے اور کہلانے لگے ہیں۔

جو بات معتبر تھی وہ سر سے گذر گئی   جو حرف سرسری تھا وہ دل میں اتر گیا

قطب عالم حضور مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مصطفی رضا خاں ابن امام احمد رضا خاں بریلوی کی فکر رسا اور مستقبل بینی کو سلام! وہابیوں کی اس خطرناک سازش کو وہ اسی وقت سمجھ گئے تھے۔ چنانچہ لفظ بریلوی کے تعلق سے ایک استفسار کے جواب میں فرماتے ہیں۔ (جواب کا تیور بھی نگاہ میں رہے)

جب اہل سنت کو بریلوی کہہ کر خطاب کیا جائے تو اس جدید خطاب سے شدت کے ساتھ انکار کیا جائے۔ ہم وہی چودہ سو سالہ قدیم اہل سنت و جماعت ہیں۔ یہ جدید نام وہابیہ ملاعنہ اہل سنت و جماعت کو دیتے ہیں۔

(اہل سنت و جماعت اختلاف و تفریق کے المناک واقعات، صفحہ ۹۳ تالیف حضرت علامی محمود احمد رفاقتی اشرفی)

عالمی شہرت یافتہ اہلِ سنت و جماعت کے مایہ ناز عالم دین حضرت علامہ کوکب نورانی بن حضرت علامہ مفتی محمد شفیع اوکاڑوی علیہ الرحمہ رقمطراز ہیں۔

''برصغیر میں دیوبند کے وابستگان نے جب اپنی راہیں جدا کیں اور اپنے دیوبندیوں نئے مسلک کو متعارف کرایا تو یہاں صحیح العقیدہ اہل سنت و جماعت کے لیے ''بریلوی'' کا لفظ دیوبندی کے مقابل بیان ہوا۔ ورنہ بریلوی نہ کسی مسلک کا نام ہے نہ ہی کسی فرقے کا۔ (بحوالہ ''نعت اور آدابِ نعت'' صفحہ ۹۸ مطبوعہ مہر منیر اکیڈمی کراچی)

اب ہم یہاں سوادِ اعظم اہل سنّت و جماعت کی امیدوں، امنگوں، آرزوؤں کے ترجمان ماہنامہ جام نور دہلی کا اداریہ من وعن پیش کررہے ہیں:

''میرے جوابات میں ان تمام لوگوں کے لیے چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ ''بریلوی'' کوئی فرقہ نہیں۔''

آج سے چودہ سو برس پہلے حجاز اقدس کی دہلیز سے اسلامی روایات و مذہبی اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے جو تحریک اٹھی تھی ہم اسی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں جسے اہل سنت و جماعت کہا جاتا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں نجدی افکار کے بطن سے نئے عقائد و روایات کے ساتھ جن فرقوں نے جنم لیا۔ ان کا ہم نے شدت سے مقابلہ کیا۔ جو مختلف ناموں سے پکارے گئے نوک قلم سے ان نوزائیدہ عقائد میں شگاف ڈالنے والوں میں اہل سنت کی جانب سے ایک نمایاں نام اعلی حضرت بریلوی علیہم الرحمۃ والرضوان کا آتا ہے۔ جن کے علم وفضل، لازوال کارناموں اور مسلک حقہ پر تصلب کی وجہ سے متلاشیان حق اور اپنے ایمان کا تحفظ چاہنے والوں نے انہیں اپنا قائد اور امام تسلیم کرلیا، مخالفین نے اہل سنت کو بریلوی کا نام دے دیا اور اعلی حضرت فاضل بریلوی کو اس کا بانی بنا دیا۔ اس حیثیت پر ہماری خاموشی نے رضامندی کو جلا بخشی، آج ہمارے مذہبی قائدین اور علماء کرام کو بھی اس پہلو پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے کہ مخالفین کے دئے گئے جس ''نشان امتیاز'' کو ہم نے عقیدت محضہ کے ہاتھوں مسرور ہو کر قبول کرلیا ہے۔ آج اس شرک و بدعت کے خمیر سے اٹھنے والے ایک نئے فرقے کے طور پر عوام وخواص میں متعارف کرایا گیا ہے۔ ماضی میں ہمارے چند اسلاف نے اس سنگین الزام کو خطرے کا الارم محسوس کرتے ہوئے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تو ان کی آوازیں ہماری عقیدتوں کے نعروں میں دب کر رہ گئیں۔''

(اداریہ ماہنامہ جام نور دہلی شمارہ نمبر جون ۲۰۰۵ء از قلم ایڈیٹر خوشتر نورانی نبیرۂ علامہ ارشد القادری)

راقم الحروف وارث جمال قادری نے ۲۰۰۳ء میں ایک کتاب لکھی کیا اسلام میں بریلوی کوئی فرقہ ہے؟ جسے مکتبہ قادریہ اٹوا بازار ضلع سدھارتھ نگر یوپی نے شائع کیا، جو ہاتھوں ہاتھ نکل گئی اس کتاب پر یادگار سلف، آبروئے قلم پیر طریقت حضرت بابرکت علامہ سید رکن الدین مصباحی مدظلہ العالی نے ایک وقیع و تاریخی تبصرہ سپرد قلم فرما کر اسے اپنے مؤقر جریدہ جام شہود کا اداریہ بنایا۔ موضوع و مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اسے ماہنامہ جام نور نے بھی نمایاں طور پر شائع فرمایا۔ اسی وقت پاکستان کے ایک ماہنامہ ''اہل سنت'' نے بھی شائع فرمایا۔ یوں اس کتاب کی صدائے بازگشت مذہبی دنیا کے ایک

بڑے حصے تک پہنچی پھر تو ہر طرف اہل فکر ونظر اٹھ کھڑے ہوئے اور اس موضوع پر تبصرہ وتاثر کا ڈھیر لگ گیا۔ اور لفظ بریلوی پر ہمارے فکر وجذبات کی عالمگیر پذیرائی ہوئی اور پہلی بار ہماری جامد عقیدتوں میں حرارت پیدا ہوئی۔ اس موضوع پر بحث کا دروازہ کھلا اور لفظ بریلوی پر ہمارے حساس وذمے دار اربابِ فکر ونظر مثبت احتساب کی طرف مائل ہوئے فالحمد للہ رب العالمین۔

اس کتاب کے ناشر عزیزم مولوی محمد قاسم جن کے سینے میں اشاعت دین وسنت کا جذبہ بھی موجود ہے۔ وہ بہت دنوں سے اصرار کررہے تھے دوسرے ایڈیشن کی اجازت دیجئے میں موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اسے اور وقیع اور گراں قدر بنانا چاہتا تھا مگر ہماری ہمہ جہت مصروفیت نے موقع نہیں دیا ادھر پھر ان کا اصرار بڑھا تو میں خوب تر کا خیال چھوڑ کر انہیں چند صفحات کے اضافے پر قناعت کرتے انہیں دوسرے ایڈیشن کی اجازت دیدی بیشک ہماری جامد عقیدتوں نے بڑے بڑے گل کھلائے ہیں جس کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان ہوا ادھر عقیدت ومحبت کے پردے میں ایک خالص تاجر طبقہ اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنت پر تنہا اپنا اجارہ داری جتا کر ان کے نام اور کام کو کیش کر کے عیش میں مصروف ہے۔

اے کاشِ اہل سنت کے ساتھ اپنے والہانہ عقیدت اور شدید وابستگی کی نمود میں وہ مخلص بھی ہوتے؟

مولیٰ عز وجل اعلیٰ حضرت امام اہل سنت پر اپنی کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے کہ وہ جس قدر پیکر اخلاص تھے اس کا ایک ذرہ بھی ہم ان سے عقیدت ومحبت کے دعویداروں کو مل جائے تو پھر ہمارا بیڑا دنیا ہی میں نہیں بلکہ آخرت میں بھی پار ہوا جائے۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی
اب ذرا دل تھام کے فریاد کی تاثیر دیکھ

☑☑☑☑☑☑

اسلام میں بریلوی ایک فرقہ؟

مولای صل وسلم دائماً ابداً　　　　علیٰ حبیبک خیر الخلق کلھم

عبقری الشرق اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان جہاں رشکِ عرب تھے وہیں فخرِ عجم بھی تھے۔ وہ اپنے وجود میں ایک ایسے جہانِ حیرت تھے کہ اگر کوئی قطب وقت مطافِ کعبہ میں رکنِ یمانی پر ہاتھ رکھ کر قسم کھالے کہ اس کے مثل زمانوں نے نہیں دیکھا تو حانث نہیں ہوگا۔

مگر یہ وقت کا کتنا بڑا المیہ ہے، حالات کی کتنی بڑی بوالعجبی ہے کہ ایسی ہمہ صفت و ہمہ جہت شخصیت جو اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور آئینۂ فضل و کمال کے ساتھ عشقِ رسول کا ایک پیکر بھی تھی، وہ بہتان والزام تراشیوں، افترا اور بدگمانیوں کے غبار میں چھپادی گئی جس کی ایک وجہ کل ذی نعمۃ محسود بھی تھی۔ خود ہی فرماتے ہیں ؎

اِک طرف اعدائے دیں ایک طرف ہے حاسدین
بندہ ہے تنہا شہا تم پہ کروڑوں درود
کردو عدو کو تباہ حاسدوں کو روبراہ
اہلِ ولا کا بھلا تم پہ کروڑوں درود

حضرت غوثیت کبریٰ کی بارگاہ میں بطور استغاثہ عرض کرتے ہیں ؎

عدو بد دین مذہب والے حاسد
تو ہی تنہا کا زور دل ہے یا غوث
حسد سے ان کے سینے پاک کردے
کہ بدتر دق سے بھی یہ سل ہے یا غوث

اللہ جل وشانہ نے اپنے حبیب ﷺ کے صدقہ میں اپنے حبیب کے وفادار غلام ان کے ناموس کے پہرے دار اپنے بندۂ خاص احمد رضا کو اپنے فضل وعطا کے خزانے سے اتنی نعمتیں اور اتنی فضیلتیں عطا فرمادی تھیں کہ وہ سرتابقدم خدا کی نعمت ہوکر رہ گئے تھے بلکہ چودہویں صدی ہجری میں وہ حضور خاتم النبیین ﷺ کا ایک معجزہ تھے جو عقل وقیاس اور گمان کی منزل سے بہت آگے تھے اور معجزہ کہتے ہی اسے ہیں جو عقل کو عاجز اور فکر کو حیرت زدہ کردے۔

نغمہ سنجی زمزمہ خوانی میرا مقصد نہیں
ہے مجھے محبوب یوں ہی آپ کا ذکر حسن

آپ کے اوصاف تک کس کی رسائی ہو بھلا
ہو نبی کا معجزہ بس ختم ہے اس پر سخن

ان کی ذات سے ایسی بے سر وپا بیہودہ باتیں اوران کے نام سے ایسی جھوٹی چیزیں منسوب کردی گئیں جوزمین اور آسمان میں نہ سماسکیں۔

کبرت کلمة تخرج من افواھھم اِنْ یقولون الا کذباً۔

ترجمہ: کتنابڑابول ہے جوان کے منہ سے نکلتا ہے مگرجھوٹ کہہ رہے ہیں۔

اس تعلق سے پیٹروڈالر نے بھی موثر رول ادا کیا جس کی بدولت زبان وقلم اور ذرائع ابلاغ کا استعمال بڑی بے دردی کے ساتھ ہوا کہ ضمیر فروش قلم کے مزدور بھاری داموں میں خرید لیے گئے اس صف میں عربی زبان وادب کے اسکالروں سے لے کر اردو، انگریزی زبان وادب کے خود ساختہ ادیب، ناول نویس واخبارنویس، افسانہ وڈرامہ نگارتک شامل ہوگئے۔ پیٹروڈالر نے انھیں مصروف کردیا کہ رزم گاہ حق وباطل میں امام احمدرضا نے سبھوں کو خاک چٹادی تھی۔

تھا ترا سیف قلم اعدا کے حق میں ضوفشاں
رزم گاہ حق و باطل میں رہا تو صف شکن

معاندین اسلام حقیقی اسلام کے مقابلے میں ایک مصنوعی اسلام لانا چاہتے تھے۔اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کے جسم وقالب سے روح محمدی ﷺ نکال دیں جب تک مسلمانوں کے جسم وجان میں روح محمد صلی اللہ علیہ و سلم کارفرما ہے انھیں حقیقی اسلام سے ہٹایانہیں جاسکتا۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں کبھی
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو

معاندین اسلام کے انھیں منصوبوں کے مقابلے میں پاسداران اسلام جواپنے رسول پاک کے سچے غلام (جو بآں فضل وکمال سرکار کی حرمت وناموس کے پہریدار بھی تھے) جہاں جہاں تھے سب کوہ استقامت بن کر اٹھ کھڑے ہوئے اورضلالت وگمراہی کی اندھیری راتوں کواپنے سروں کے چراغ سے روشن کرنے کے لیے سبھوں نے اپنا رخ بریلی کی طرف کرلیا کہ رسول پاک کی محبت میں ''کباب آہو'' کومات دینے والی ''کباب دل'' کی خوشبواسی طرف سے اٹھ رہی تھی جوکشتگان خنجر تسلیم کوتڑپارہی تھی۔

جلی جلی بو سے اس کی پیدا ہے سوزش عشق چشم والا
کباب آہو میں بھی نہ پایا مزہ جو دل کے کباب میں ہے

اہم ترین شخصیات ورجال پر مشتمل عشاقانِ رسالت کا قافلہ در قافلہ ''احمد رضا بریلوی'' کو اپنا سالار قافلہ تسلیم کرتے ہوئے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے انھوں نے بہت دور سے عرش کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے عظمت رسالت کے اس پرچم دیکھ لیا تھا جو ''امام احمد رضا'' نے بڑی مضبوطی کے ساتھ تھام رکھا تھا۔

فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

اور اس لیے بھی کہ:

(۱) علمی وفکری توانائیوں اور دینی وملی اولوالعزمیوں کی جولان گاہ میں ''امام احمد رضا'' کی انفرادیت بے مثل تھی

(۲) احقاق حق وابطال باطل میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے انھیں امامت کبریٰ کا منصب عطا فرمایا تھا۔

(۳) رسول وآل رسول کی محبت کی یکتائی و بے نظیری کا سورج ہمیشہ سوا نیزے پر چمکتا تھا رسول پاک کی تو بات ہی کیا ''آل رسول'' کے لیے ان کے جذبہ سوز دروں دعا کی زبان بن چکی تھی۔

وہ جہاں میں خادم آل رسول اللہ کر
حضرت آلِ رسول مقتدا کے واسطے

اور یہ یکتائی و بے نظیری تو کئی صدیوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جسے اپنوں غیروں سبھوں نے بہ بانگ دہل تسلیم کیا ہے کہ عشق رسول کا جو لنگر امام احمد رضا کے پاس تھا اس کا عشر عشیر بھی محبت رسول کے دعوے داروں کے یہاں نہیں تھا۔ عارف رومی کی زبان میں وہ عشق رسول کی اس منزل پر فائز المرام تھے کہ

عشق آں شعلہ کہ چوں فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

عشق وہ شعلہ ہے کہ معشوق کے علاوہ ہر چیز کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ خود بھی فرماتے ہیں ؎

الروح فداک فزد حرقا۔ یک شعلہ دگر برزن عشقا
مورا تن من دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا

بے شک تاجدار عشق حضرت علامہ جامی کی حسرتیں ایک خاصے کی چیز ہیں ؎

سگت را کاش جامی نام بودے

مگر امام احمد رضا کے عشق کی جلوہ سامانیاں بھی تو دیکھئے کہ

رضائے عجمی ہو سگ حسان عرب

حضرت قدسی کے سوز دروں کی انفرادیت سبحٰن اللہ! ؎

نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگے کوئے تو شد بے ادبی

مگر حضرت امام کی حسرتوں کا عالم بھی تو دیکھیے ؎

رضا کسی سگ طیبہ کے پاؤں بھی چومے
تم اور آہ کہ اتنا دماغ لے کے چلے

دل کے ٹکڑے نذر حاضر لائے ہیں
اے سگان کوچہ دلدار ہم!

سرکار تو ﷺ لک کونین ہیں، حیات دارین ہیں، انسانیت کی معراج ہیں، خلاصۂ موجودات ہیں، اصل کائنات ہی نہیں بلکہ روح کائنات ہیں۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہاں کی جان ہے تو جہاں ہے

ان کی بارگاہ تو ایسی بارگاہ ہے کہ ؎

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

ان کی ذات کا عالم تو یہ ہے کہ یا ابابکر لم یعرفنی حقیقتۂ غیر ربّی اور ان کے اوقات کی بات لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملك مقرب ولا نبی مرسل۔

آپ کے شہزادگانِ عالی مرتبت امام حسن مجتبیٰ وحسین گلگوں قبا کے شہزادۂ والا گہر محبوبِ سبحانی قطب ربانی محی الدین جیلانی حسنی حسینی کی بارگاہ میں ان کی نیازمندیوں کی بلندیوں کا عالم ملاحظہ ہو ؎

رضا قسمت ہی کھل جائے جو گیلاں سے خطاب آئے
کہ تو ادنیٰ سگِ درگاہ خدّامِ معالی ہے

دیوانوں کی بات ہی کیا، غلاموں کی اوقات ہی کیا، نیازمندوں کی بساط ہی کیا کہ ان کے عشقِ رسول کے تعلق سے لب کشائی کی جرأت کرسکیں۔ معاصرین زمانہ جو یگانۂ روزگار اور علم وفضل کے قطب مینار بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے ماتھے کی آنکھوں سے اس کے عشق کی حشر سامانیوں اور وارفتگی شوق کی بلندیوں کو دیکھا تھا، وہ تو اس کی کمیت وکیفیت کا اندازہ ہی نہ لگا سکے! تو بھلا وہ ہما شما جنھیں ان موجوں کی طغیانی دیکھنے کے لیے ساحل ہی نہ میسر آیا ہو وہ بے چارے کیا کہہ سکتے ہیں۔

حرفِ تمنا لوحِ جنوں پر کیسے ہم تحریر کریں
اپنا پردہ آپ اٹھا کر اپنی کیوں تشہیر کریں

گستاخانِ بارگاہِ رسالت کے امام العصر مولانا اشرف علی صاحب تھانوی بھی فرمایا کرتے تھے:

"میرے دل میں احمد رضا خان کے لیے بڑا احترام ہے۔ وہ مجھے کافر کہتا ہے تو کسی اور غرض سے نہیں صرف عشق رسول کی وجہ سے کہتا ہے۔"

(ہفت روزہ چٹان، لاہور ۲۳/اپریل ۱۹۶۲ء)

مشہور سیاسی، مذہبی، علمی و ادبی شخصیت علامہ کوثر نیازی، سابق وزیر اطلاعات پاکستان رقم طراز ہیں:

"میں نے صحیح بخاری شریف کا درس دیوبندی شیخ الحدیث مولانا محمد ادریس کاندھلوں مرحوم ومغفور سے لیا۔ کبھی اعلیٰ حضرت کا ذکر آجاتا تو مولانا کاندھلوی فرمایا کرتے: مولوی صاحب (مولوی صاحب ان کا تکیۂ کلام تھا) مولانا احمد رضا خان کی بخشش تو انھی فتووں کے سبب ہوجائے گی، اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "احمد رضا تمہیں ہمارے رسول سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ اتنے بڑے بڑے عالموں کو بھی تم نے معاف نہیں کیا۔ تُو نے سمجھا کہ انھوں نے توہینِ رسالت کی ہے تو ان پر بھی کفر کا فتویٰ لگادیا، اسی ایک بات سے میں نے تمہاری بخشش کردی۔"

کم وبیش اسی انداز کا ایک واقعہ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی سے میں نے سنا کہ "جب فرمایا احمد رضا خاں کی وفات ہوئی تو کسی نے آکر حضرت تھانوی کو اطلاع دی۔ مولانا تھانوی نے بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیئے۔ جب دعا کر چکے تو حاضرینِ مجلس سے کسی نے پوچھا: وہ عمر بھر آپ کو کافر کہتے رہے اور آپ ان کے لیے دعائے مغفرت کررہے ہیں! (مولانا نے کہا اور یہی بات سمجھنے کی ہے) کہ مولانا احمد رضا خان نے ہم پر کفر کا فتویٰ اس لیے لگایا کہ انھیں یقین تھا کہ ہم نے توہینِ رسول کی ہے۔ اگر وہ یقین رکھتے ہوئے بھی ہم پر کفر کا فتویٰ نہ لگاتے تو وہ خود کافر ہوجاتے۔

(امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت۔ص ۲)

اسی انداز کی ایک روایت تو خود ہم نے اپنے کانوں سے سنا جسے بھیّا مظفر الدین نواب آف لال کرتی میرٹھ مہتمم مدرسہ اسلامیہ عربی اندر کورٹ میرٹھ نے کلیر شریف میں عرس صابر پاک کے موقع پر بیان کیا۔ غالباً ۱۹۶۱ء کی بات ہے خاکسار وارث جمال قادری صدر العلماء حضرت علامہ سید غلام جیلانی علیہ الرحمہ کی درسگاہ کا شہرہ سن کر خاص حضرت والا سے پڑھنے کے شوق میں دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف سے میرٹھ پہنچا درمیان سال ہونے کے باوجود تحصیل علم کے جذبے کو دیکھ کر ازراہ کرم حضرت نے داخلہ فرمایا میرے ساتھ میرے رفیق درس صوفی عبد العزیز بستوی، مولوی لعل محمد قریشی گونڈوی اور میرے بھائی مولانا عارف مصباحی بھی تھے۔ خطیب الہند پیر طریقت حضرت علامہ کلیم اشرف جائسی بھی بہت پہلے سے وہاں زیرِ تعلیم تھے، جو اس وقت صرف کلیم میاں کے نام سے جانے جاتے تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے مدرسہ اسلامیہ عربی اندر کوٹ میرٹھ بڑے عروج پر تھا۔ اس میں تیس (۳۰) اساتذہ پانچ سو طلباء رہا کرتے تھے۔ ان تمام اساتذہ

کے صدر المدرسین حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ تھے۔ وہ شخصی نوعیت کا ادارہ تھا، جس کے تمام مصارف کا بوجھ نواب آف لال کرتی میرٹھ کے جیب خاص پر تھا۔ تقسیم ملک کے بعد اسٹیٹس اور ریاستیں جب ختم کر دی گئیں اور نوابین کے ہاتھ تنگ ہو گئے تو وقت وحالات کے مطابق یہ ادارہ زبوں حالی کا شکار رہا۔ مگر حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ اس دور زوال میں بھی اسی سے وابستہ رہے جبکہ ملک کے بڑے بڑے دینی ادارے ان کے لیے آنکھیں بچھائے ہوئے تھے ان کا اخلاص فی الدین انہیں ہٹنے نہیں دیتا تھا۔ وہ اس وقت میرٹھ سے چلے جاتے تو وہاں کی سنیت کا خاتمہ ہو جاتا کہ دیوبند سے قریب ہونے کی وجہ سے وہ دیوبندی اثرات کی زد پر تھا۔ علامہ میرٹھی جن کے شکوہ علمی کا دبدبہ پورے ملک پر تھا خود دار العلوم دیوبند کے نزدیک ان کی جلالتِ علمی مسلم تھی۔ بیشک جو لوگ اس دریائے علم وفضل تک پہنچے اور اس سے چند چھینٹے پا لیے ان کا کہنا ہی کیا۔ مگر جن خوش نصیب آنکھوں نے ان کی صرف زیارت کی ہے انھیں بھی حق ہے کہ وہ خود پر فخر کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں میری خوش نصیب آنکھوں نے علم وفن کا ایک پہاڑ دیکھا ہے۔ انسانی پیکر کی شکل میں۔ جسے دنیا علامہ غلام جیلانی میرٹھی کے نام سے جانتی ہے اور جنہیں زیارت کی بھی سعادت حاصل نہیں وہ آج بشیر القاری فی شرح البخاری بشیر الناجیہ فی شرح الکافیہ بشیر الکامل فی شرح مأۃ عامل اور نظامِ شریعت میں ان کے شکوہ علم وفضل کا جلوہ دیکھ سکتے ہیں۔ ؂

تمہاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا ہے سرمایہ

ابھی ۲ مئی ۲۰۰۳ء کو بعد نمازِ مغرب رضا مسجد ٹھکر بابا کالونی کرلا ممبئی میں پیر طریقت حضرت بابرکت علامہ سید رکن الدین اصدق ایڈیٹر جام شہود بہار نے حضرت علامہ میرٹھی کے وفورِ علمی پر ایک واقعہ بیان کر کے ہم سبھوں کو حیران کر دیا۔ حضرت سے میرے والد کے دیرینہ تعلقات تھے، مجھے اطلاع ملی کہ وہ ممبئی آئے ہوئے ہیں اور مسجد مذکورہ میں وہ کسی تقریب میں تشریف لا رہے ہیں۔ ان کے بیٹے مولانا سیف الدین اصدق مصباحی وہاں امام وخطیب ہیں، ان کی اطلاع پر میں وہاں پہنچا اور حضرت والا سے ملاقات کی۔ بعد نماز مغرب امام صاحب کے حجرے میں جانے کیسے حضرت علامہ میرٹھی کا ذکر نکل آیا۔ علامہ اصدق نے فرمایا کہ مولانا مجھے ان کی زیارت کا شرف حاصل ہے میری ان خوش نصیب آنکھوں نے حضرت کا دیدار کیا ہے۔ بات ان کے وفور علمی پر ہونے لگی اور ذکر نکل آیا بشیر الکامل کا فرمانے لگے اشرفیہ مبارکپور میں میرے ہم سبق مولانا عبید الرحمٰن پورنوی تھے، جو دورِ طالب علمی ہی میں کافی ذہین تھے۔ ان کی ذہانت وفطانت کا احساس اساتذہ کو بھی تھا۔ ایک روز انہوں نے امام الحکمت حضرت علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب قبلہ علیہ الرحمہ جو جانِ اشرفیہ ہی نہیں بلکہ اپنے استاد محترم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی آنکھوں کی ٹھنڈک بھی تھے، حضور حافظ ملت بڑے فخر سے انہیں امام الحکمت فرمایا کرتے تھے، کے سامنے بشیر الکامل کی اس بحث کو سامنے رکھ دیا جہاں حضرت علامہ میرٹھی نے حضرت علامہ جامی کے اس موقف کے خلاف اپنا الگ موقف اختیار فرمایا ہے۔ مولوی عبید الرحمٰن صاحب نے حضرت سے عرض کیا کہ

یہاں حضرت علامہ جامی کے موقف کو مانا جائے یا حضرت علامہ میرٹھی کے۔ حضرت حافظ صاحب قبلہ نے فرمایا کہ چونکہ حضرت علامہ میرٹھی اس وقت اس فن کے امام ہیں، میری مجال نہیں کہ اس پر انگلی رکھوں۔ تم ایسا کرو کہ خوش قسمتی سے حضور والا ابھی حیات ہیں۔ دونوں موقف کو سامنے رکھ کر حضرت ہی سے فیصلہ لے لو۔

علامہ سید رکن الدین اصدق صاحب فرماتے ہیں کہ: ''مولوی عبید الرحمٰن صاحب نے یہی کیا۔ دونوں موقف کو تفصیلاً لکھ کر حضرت کی بارگاہ میں بذریعہ ڈاک بھیجا۔ دس دن میں ہی جواب بھی آ گیا۔ جس میں شروع میں مولوی عبید الرحمٰن صاحب کو دعائیں دیتے ہوئے علامہ میرٹھی نے خوشی کا اظہار فرمایا تھا کہ اس دور میں اتنی جستجو بڑی خوش آئند ہے۔ پھر بڑی تفصیل سے اپنے موقف کی تائید میں ستر سے ائمۂ نحو کے اقوال مع حوالہ جات پیش کیے اور آخر میں فرمایا جب ستر سے ائمۂ نحو علامہ جامی کے مذکورہ موقف کے خلاف ہیں تو میں ان کا موقف کیونکہ اپنا سکتا تھا۔ مولوی عبید الرحمٰن صاحب نے جب حضرت کا جواب حضور حافظ عبد الرؤف صاحب قبلہ کے سامنے رکھا تو اسے ملاحظہ فرما کر وہ خود سناٹے میں آ گئے کہ حضرت تو ہم لوگوں کے گمان سے بھی بہت آگے ہیں۔

یہ تو بر سبیل تذکرہ تھا۔ کبھی ان شاء اللہ حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ پر تفصیل سے ضرور عرض کروں گا۔ اس وقت حضرت مولانا محمد عیسیٰ مصباحی مولانا سید سیف الدین اصدق اور گونڈہ کی مشہور کی سماجی شخصیت محترم شیر علی یار علوی بھی تھے۔

ہاں تو میرے دوران قیام ہی کلیر شریف کا عرس آ گیا۔ بچپن ہی سے سرکار صابر پاک کی عقیدت رچی بسی تھی۔ چنانچہ ہم اور کلیم میاں صاحب ساتھ ساتھ کلیر شریف حاضر ہوئے۔ کلیر شریف میں عوام و خواص کا بڑا زبردست اژدہام ہوتا ہے۔ خود دار العلوم دیوبند کا بھی ایک بڑا کیمپ لگتا تھا۔ سہارن پور بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔ مدرسہ اسلامی کے طلباء کے قیام و طعام کا انتظام بھیا مظفر الدین، مہتمم مدرسۂ عربیہ کے خیمہ میں تھا۔ نواب صاحب کا ایک بڑا خیمہ لگتا تھا۔ اور خیمے میں حضرت صابر پاک کا لنگر جاری رہتا۔

میرٹھ کی سنت بھی گلابی تھی اور وہاں کی دیوبندیت کا حال بھی عجیب تھا۔ وہ نیاز و فاتحہ بھی کرتے تھے، مولود شریف بھی سنتے تھے، کلیر شریف کا عرس بھی کرتے تھے۔ اس کے باوجود خود کو دیوبندی سمجھتے تھے اور دار العلوم دیوبند کو اپنا ادارہ بھی مانتے تھے۔ ویسے بھی دار العلوم دیوبند کے حقیقی بانی قادری سلسلے کے بزرگ حضرت سید عابد حسین صاحب قدس سرہٗ العزیز تھے اور تیس برس تک ادارہ اہلِ سنت کے اسی طریقے پر گامزن رہا جس کی قیادت بدایوں و بریلی شریف، رامپور، مارہرہ مطہرہ اور کچھوچھہ مقدسہ کے علماء و مشائخ فرماتے تھے اور آج بھی اہلِ سنت کا تشخص انہیں کے ساتھ برقرار ہے، جس میں نمایاں حیثیت بریلی شریف کو حاصل ہے۔

اور کون جانے دیوبند کا خانہ ساز مذہب بطور تقیہ عوام کے سامنے اپنے دیوبندیت کا اظہار ویسے ہی کرتے رہے ہوں جیسا کہ میرٹھ کے دیوبندیوں کا طریقہ رہا۔ آخر اب تک جتنے فرقہ ہائے باطلہ پیدا ہوئے ہیں انہوں نے افرادی قوت

تواہل سنت ہی سے حاصل کی۔عوام کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے اول اول وہ یہی طریقہ اپناتے ہیں جیسا کہ ان کے پیشوا مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے مدرسہ فیض عام کانپور یوپی میں جوطریقہ اپنایا کہ شروع شروع میں انہوں نے خوب لوگوں کے گھروں میں جا کر نیاز وفاتحہ کیا۔مولود شریف پڑھا اور بتدریج جب ذہن سازی کر کے کچھ لوگوں کو اپنا ہمنوا اور حمایتی بنالیا توانہوں نے اپنا چولا بدل دیا۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

میرٹھ کی سنت کس قدر گلابی تھی اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ دوران تعلیم ایک دن حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ فرمایا کہ آج فقیر ایک رئیس کی دعوت پر ان کے گھر پہنچا تو بہت چہک کر ملے اور کہنے لگے کہ کاش صرف دس منٹ پہلے آجاتے تو وہابیت اور سنّیت کا جھگڑا جو کئی نسلوں سے چلا آرہا ہے، اس کا کوئی حل ضرور نکل آتا۔فقیر نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ وہ کیسے؟ کہنے لگے کہ آپ کے آنے سے صرف دس منٹ قبل مولانا قاری طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند اٹھ کر گئے ہیں۔اے کاش! آپ صرف دس منٹ پہلے آجاتے۔حضرت علامہ نے فرمایا اے بھائی قاری صاحب تو ابھی میرٹھ میں ہیں نا!وہ کہنے لگے جی ہاں ابھی وہ یہیں ہیں،تو پھر حق و باطل کا فیصلہ دس منٹ میں ہوسکتا ہے۔انہوں نے بڑے تعجب سے کہا ارے جناب جومسئلہ کئی نسلوں سے نہیں طے ہو پارہا ہے اور آئے دن مناظرہ ومجادلہ کی نوبت آتی رہتی ہے وہ صرف دس منٹ میں کیسے طے ہوسکتا ہے۔فرمانے لگے اگر قاری صاحب واقعی اس اختلاف کوخلوص سے مٹانا چاہتے ہیں تو وہ دس منٹ میں مٹ سکتا ہے وہ اس طور پر کہ آپ عوام کے سامنے ہم دونوں کو بٹھا دیجئے۔دیوبندیت کی نمائندگی وہ کردیں کہ وہ اس وقت دیوبندیوں کے سب سے بڑے عالم ہیں اور سنیوں کی طرف سے فقیر غلام جیلانی ہوجاتا ہے۔دونوں کو آدھا آدھا سیر سنکھیا زہر گھول کر دے دیجیے کہ وہ اعلان کر کے پئیں کہ حق جس کے ساتھ ہے اسے یہ زہر کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔اگر حق علمائے دیوبند کے ساتھ ہے تو قاری طیب صاحب کو کچھ نہیں ہوگا۔میری یہ تجویز سن کر وہ گھبرا گئے۔ارے نہیں نہیں یہ تو بڑی خطرناک بات ہوگی۔یہ تو ممکن ہی نہیں، کوئی دوسری تجویز بتائیں۔فقیر نے فوراً دوسری تجویز پیش کردی کہ میرٹھ کے گھنٹہ گھر کی بلند عمارت پر ہم دونوں کو کسی طرح چڑھا دو اور ہم دونوں ایک دوسرے ساتھ زمین پر کود یں۔جس کا مذہب حق ہوگا اسے چوٹ نہیں آئے گی اور باطل کا تیاپانچہ ہوجائے گا۔وہ رئیس صاحب کہنے لگے کہ ارے نہیں نہیں!صاحب یہ بھی تو بہت خطرناک تجویز ہے، جوناممکن العمل ہے۔کوئی تیسری تجویز بتائیے۔فقیر نے تیسری اور آخری تجویز پیش کردی کہ میرٹھ کے فلاں میدان میں (حضرت نے میدان کا نام لیا تھا مگر زیادہ دن ہونے کی وجہ سے یاد نہیں رہ گیا) ہزاروں مسلمانوں کے سامنے فقیر اپنے اہل وعیال کو لے کر آجاتا ہے اور قاری صاحب اپنے اہل وعیال کو لے کر آجائیں اور وہیں مباہلہ ہو جائے۔تھوڑی دیر میں اللہ تعالی اپنے بندوں کے سامنے حق کو ظاہر کردے گا۔اور آئے دن کے اختلافات ہمیشہ کے لیے ختم

ہوجائیں گے۔صاحب خانہ اس بات سے خوش ہوگئے کہ ہاں یہ کوئی بات ہوئی۔ میں قاری صاحب سے مل کر خود یہ تجویز ان کے سامنے رکھتا ہوں۔ پھر آپ کو اطلاع کرتا ہوں۔آپ نے چلتے چلتے یہ فرمایا لیکن بطور پیش گوئی یہ بھی سن لیجئے کہ قاری صاحب اس پر ہر گز تیار نہیں ہوں گے۔ کچھ دنوں بعد وہ حضرت بڑی ندامت کے ساتھ ملے کہ جناب کی پیش گوئی کے مطابق قاری طیب صاحب اس پر بھی تیار نہیں ہوئے تو حضرت میرٹھی علیہ الرحمہ نے فرمایا بھائی میرے اس بات پر کم از کم آپ کی آنکھیں کھلنی چاہیے کہ حق کدھر ہے۔اعلیٰ حضرت بریلوی کی طرف یا علمائے دیوبند کی طرف؟

جی چاہتا ہے آئیں حقیقت کی دھوپ میں
سایہ سروں پہ انا کا شجر بھی ہے

بھیا مظفر الدین لال کرتی میرٹھ کے رئیس تھے اور حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کے مدرسہ کے وراثتاً مہتمم اور غالباً اس وقت بھی مدرسہ کے مصارف انہیں کے جیب خاص کے رہین منت تھا لمبا قد اچھی وجاہت لیے ہوئے نفیس عالمانہ لباس زیب تن! گھٹنوں سے کافی نیچے لمبا کرتہ چہرے پہ سفید لمبی داڑھی سر پر دو پلیا ٹوپی، علمی وقار و تمکنت لیے ہوئے! حاضری کے دوسرے دن بھیا صاحب کے خیمے میں ایک باوقار نشست لگی ہوئی تھی، ہمیں بھی اپنے عمر کے حساب سے اس مجلس میں پیچھے جگہ ملی ہم اور سید کلیم میاں جائسی ایک ساتھ ہی بیٹھے تھے۔بھیا مظفر الدین صاحب اس مجلس کے خود صدر نشین تھے۔ حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ بھی انہیں کے ساتھ مسند نشین تھے۔بھیا صاحب کی عمر اس وقت بھی بہت زیادہ تھی طویل العمری کے سبب ان کی بھویں پلکوں پر لٹک آئیں تھیں۔(۱۹۷۰ء میں میرٹھ وملیانہ فساد کے وقت بھی وہ باحیات تھے) نشست بڑی سنجیدہ باوقار تھی اہل مجلس آدابِ مجلس سے بھی آشنا تھے بھیا صاحب مختلف موضوع پر عالمانہ لب ولہجہ میں لب کشا تھے۔اور لوگ ہمہ تن گوش! کہ اسی اثنا میں انہوں نے بری حسرت سے فرمایا حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان پہلے باہم بہت محبت تھی یہ تو برا ہو حاشیوں کا انہوں نے بہت دور کر دیا چونکہ میں دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف سے تازہ تازہ وارد ہوا تھا۔(عمر بھی سترہ اٹھارہ کے درمیان اور کتابیں جلالین شریف،شرح جامی وغیرہ چل رہی تھیں حضرت علامہ میرٹھی سے شرح جامی قطبی اور دوسری جماعت کے ساتھ بشیر الکامل بھی سبقاً سبقاً پڑھ رہا تھا) وہ فیض الرسول جس کے دینی وعلمی ماحول میں بانئ فیض الرسول حضور شعیب الاولیاء شاہ محمد یار علی قدس سرہٗ العزیز کا تصلب فی الدین،ان کا عشق رسول اور اعلیٰ حضرت کی ذات والاصفات سے مرشد برحق کی بے پناہ وابستگی مزید براں حضرت علامہ مفتی الشاہ بدر الدین احمد قادری رضوی علیہ الرحمہ کا تصلب فی السنیہ اور ان کی حسن تربیت کار فرما تھا اور اس وقت کے براؤں شریف کا دینی ماحول اور اس کی ''مخصوص انفرادیت'' بالخصوص اس کا تصلب فی الدین اور اعلیٰ حضرت کے پاکیزہ مسلک ''حبِّ رسول'' کی اتباع و پاسداری کے معاملے میں بڑے بڑے معاصر دینی اداروں میں بشمول بریلی شریف اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔

اعلیٰ حضرت کے ساتھ ساتھ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے ''رحمۃ اللہ علیہ'' ہونے سے میں بہت حیران ہوا خود کو اظہار حیرت سے روک نہیں پایا۔ دونوں گھٹنوں پر اٹھتے ہوئے اضطراری کیفیت میں بلند آواز سے عرض کیا! ہاں ہاں حضور والا آپ کیا فرما رہے ہیں؟ اس مجلس میں غالباً میں ہی سب سے کمسن تھا۔ مسیں بھیگ چکی تھیں اور چہرے پر سبزے کا آغاز ہو چکا تھا۔ کلیم میاں جو اس وقت ہم سے زیادہ باشعور تھے۔ ان کو میری جرأت توقع یا آدابِ مجلس کے خلاف لگی سرگوشیوں میں فرمانے لگے۔ میاں جمال! حد ادب! چونکہ میں خالص دیہات سے آیا تھا۔ ہاں براؤں شریف ایسا ہی دیہات تھا جس کے تعلق سے حضرت علامہ نسیم بستوی صاحب قبلہ کی ایک نظم بھی ہے۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

چند بنیوں کی پھٹیچر سی ہے دوکان یہاں
پیسہ ہوتے ہوئے ملتا نہیں سامان یہاں

گویا کہ میں ایک طرح سے بدو تھا جو اس طرح کی مجلسوں اور اس کے آداب سے ناآشنا تھا یا یہ کہ براؤں شریف کا عطا کردہ دینی مزاج اسے برداشت نہ کر سکا۔ بھیا صاحب نے غور سے مجھے سر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا کہ میاں صاحبزادے! آپ کچھ کہہ رہے ہیں؟ عرض کیا۔ جی ہاں! حضور عالی کی زبان سے کچھ اجتماع ضدین قسم کے کلمات نکل رہے ہیں۔ اس تعلق سے عرض کرنا چاہتا ہوں انہوں نے پلکوں پر لٹکی ہوئی بھوؤں کو اٹھایا اور فرمایا میاں صاحبزادے! ذرا آپ آگے آجایئے۔ میں کلیم میاں کی تنبیہی نگاہوں کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اہلِ مجلس کی نگاہیں بھی میری جانب اٹھ گئیں استاذ ذی الکریم حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ نے بطور خاص میری طرف دیکھا تھوڑی دیر کے لیے میرا دل دھڑکنے لگا۔ مگر براؤں شریف کے عطا کردہ دینی ماحول نے پھر ایک بار حوصلہ بخشا۔ میں بھیا صاحب کے قریب آ گیا انہوں نے بڑی بزرگانہ شفقت کا مظاہرہ کیا اور حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمایا ہاں میاں صاحبزادے! اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو بے جھجھک ہو کر کہو بالکل مت گھبراؤ اور نہ ہی ڈرو میں نے عرض کیا حضور والا ابھی آپ نے اعلیٰ حضرت اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی دونوں کو ایک ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کہا ہے۔ جس پر مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ آپ جیسی بزرگ و علمی شخصیت ایسی بات کیسے کہہ رہی ہے جو سمجھ کے باہر ہے۔ آپ نے آگ و پانی دونوں کو اکٹھا کر دیا۔ ان دونوں میں تو ایک ہی رحمۃ اللہ علیہ ہو سکتا ہے دونوں ہرگز نہیں۔ کہاں اعلیٰ حضرت امام اہل سنت جو ایک مشہور عاشق رسول ہیں اور کہاں مولانا تھانوی صاحب جو مشہور گستاخ رسول ہیں۔ دونوں کیسے ''رحمۃ اللہ علیہ'' ہو سکتے ہیں۔ ایک گستاخِ رسول کو ایک عاشق سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک
کہ تو ذرہ وہ خورشید افلاک

میرے اس سوال و محاکمے پر استاذ ذی الکریم حضرت علامہ میرٹھی علیہ الرحمہ کا چہرہ وفور مسرت سے تمتما اُٹھا اور لب ہائے ناز پر طاری مسکراہٹ نے مجھے بڑا حوصلہ بخشا۔ بھیا صاحب نے فرمایا اچھا صاحب زادے! آپ حضرت تھانوی

صاحب کی کتاب ''حفظ الایمان'' کے تعلق سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں۔ کیا آپ کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت نے ان کلمات سے رجوع فرمالیا ہے جو گستاخی کے تھے۔ آپ کا رجوع نامہ بسط البنان کی شکل میں حفظ الایمان ہی کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ میں نے کہا معاذ اللہ وہ رجوع نامہ کہاں وہ تو تاویل نامہ ہے اور الفاظ صریحہ میں تاویل کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ جب پورا برصغیر چیخ رہا تھا کہ یہ الفاظ شانِ رسالت میں شدید گستاخی ہے حد یہ کہ ان کے خاص احباب و مریدین بھی عرض کر رہے تھے کہ حضور ان عبارات سے بڑا ہنگامہ ہو رہا ہے۔ بات حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نازک بارگاہ کی ہے جہاں جنید و بایزید کے ہوش اڑے ہوئے ہیں۔ ؎

نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

اردو زبان بانجھ کہاں ہے کہ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے اس کے دامن میں اور الفاظ ہی نہیں مگر مولانا تھانوی صاحب نے اپنے نوک قلم سے نکلے ہوئے ان گستاخانہ کلمات میں ترمیم کو قرآنی آیات میں ترمیم کے مترادف سمجھا اور اپنی گستاخانہ عبارات پر اٹل رہے۔ وہ اور ان کے پیارے ان الفاظ کی نئی نئی تشریح و تعبیر میں بڑی دور دور کی کوڑیاں لاتے رہے جو اہل ایمان کو ہرگز تسلیم نہیں تھے۔ اس تعلق سے ان کے اور ہمارے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا۔ اہل مجلس کچھ حیرت اور کچھ بڑے شوق سے گوش برآواز ہو کر سن رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے مجھے مطمئن اور قائل کرنے کے لیے ذیل کا واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ سنایا جسے میں اختصار کے ساتھ نقل کر رہا ہوں۔ پھر انہوں نے تمہید کے طور پر اس واقعے کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے زور دیکر کہا۔ صاحب زادے یہ جو آپ کو سنانے جا رہا ہوں یہ کوئی روایت نہیں نہ ہی کوئی سنا سنایا واقعہ پھر وہ اپنی بھوؤں کو پلکوں سے اٹھاتے ہوئے یوں گویا ہوئے۔''

یہ واقعہ میری انہیں آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور حضرت تھانوی صاحب کے وہ کلمات میرے انہیں کانوں نے خود سنا:

''یہ میری سعادت تھی کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی خدمت کے لیے اپنے عمر کی آخری منزل میں مجھے ساتھ رکھتے تھے اور اپنی خدمت کی عزت سے سرفراز فرماتے تھے۔ ایک بار ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں کے لوگ (انہوں نے کسی گاؤں کا نام لیا جو طویل مدت گذرنے کی وجہ سے مجھے یاد نہیں رہا۔)

مسلسل تین برس کی کوششوں اور مخلصانہ جدو جہد کے بعد حضرت کی تاریخ لینے میں کامیاب ہوئے کہ آخر عمر میں حضرت نے اپنے دورے کم کر دیئے تھے۔ حضرت نے وہ سفر بیل گاڑی پر کیا میں بھی حضرت کے ساتھ بیل گاڑی میں تھا۔ شام کے وقت ہم مذکورہ گاؤں پہنچے۔ چونکہ تین برس کی کوششوں کے بعد حضرت نے وعظ کے لیے وقت دیا تھا اور آپ وہاں تین برس بعد پہنچے تھے۔ اس لیے گاؤں والوں کی خوشی قابل دید تھی۔ جیسے سوکھے دھانوں پر ابرِ کرم۔

بعد نمازِ عشاء مجلس وعظ کا آغاز ہوا خطبۂ مسنونہ کے بعد ابھی وعظ شروع ہی کیا تھا کہ اسی اثناء کسی نے کان میں آکر

کچھ کہا جسے سن کر حضرت سناٹے میں آ گئے اور آپ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی پھر آپ نے پورے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ سب حضرات تین تین بار درود شریف تین تین بار قل ھو اللہ شریف ایک ایک بار الحمدللہ شریف پڑھ لیں حضرت مولانا احمد رضا خاں کا وصال ہو گیا ہے انہیں کی روح کو ایصال ثواب کیا جائے گا۔ پھر ہاتھ اٹھا کر آپ حضرت مولانا کی روح کو ایصال ثواب کرتے رہے اور بڑے خشوع کے ساتھ بڑی دیر دعائیں مانگتے رہے دعا کے اختتام پر آخر دعوانا ان الحمد للہ کہہ کر وعظ ہی ختم کر دیا اور کافی افسردہ ہو کر آپ اسٹیج سے اٹھ کر قیام گاہ پر آ گئے گاؤں والوں اور خاص کر مجھ فقیر کو بڑی حیرت اور ساتھ افسوس بھی ہوا کہ بیچارے ان گاؤں والوں کو تین برس کی کوششوں کے بعد تاریخ بھی ملی تو ایک شخص کے وفات کی نذر ہوگئی۔ جو زندگی بھر نہ صرف آپ کو بلکہ تمام اکابر دیوبند کے خلاف کفر و ارتداد کا فتویٰ دیتا رہا۔ بلکہ حرمین طیبین زاد اللہ شرفاً و اجلالاً کے جلیل القدر علماء و مشائخ و اکابرین اسلام سے ان کے کفر و ارتداد پر فتویٰ لایا۔ اور بڑی سختی کے ساتھ پوری زندگی اس پر قائم رہا۔ ایک صاحب نے ہمت کر کے پوچھ لیا کہ حضرت جس کا رویہ آپ کے اور اکابرین دیوبند کے خلاف اتنا سخت رہا ہو کہ وہ آپ سب کو مسلمان ہی ماننے سے انکار کرتا تھا اور مسلمان ماننے کو تیار نہیں تھا اس کی وفات پر آپ نے اتنا اثر لے لیا کہ ان بیچارے گاؤں والوں نے تین برس کوششوں کے بعد آپ کے وعظ کی تاریخ لی تھی وہ آپ کے مواعظ حسنہ بھی نہ سن سکے۔ حضرت نے اس کی طرف بڑی زخمی نگاہوں سے دیکھا اور فرمایا:

''میاں تمہیں کیا معلوم آج ہندوستان سے عشق رسول کا چراغ بجھ گیا۔''

روح ایماں مغز قرآں اصل دیں
ہست حب رحمۃ للعلمین

بھیّا مظفر الدین نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے اور پوری مجلس سے دادخواہی کے انداز میں دیکھتے ہوئے فرمایا میاں صاحب زادے اس سے کیا سمجھا جائے ہم کتابی ملّا ان گہرائیوں اور باریکیوں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ بڑوں کا معاملہ ہے بزرگوں کا بھید ہے اسے وہی جانیں۔ خدا کی قسم صاحب زادے اس واقعے کا میں عینی شاہد ہوں، میں نے عرض کیا حضور والا یہ بات بالکل صحیح ہے اور جو واقعہ آپ نے بیان کیا جس کے آپ خود چشم دید گواہ ہیں۔ اس میں بھی شک کی کوئی گنجائش نہیں اور مولانا تھانوی صاحب کا اعلیٰ حضرت کے وصال کی خبر پر یہ ردعمل فرمانا کہ ''آج ہندوستان سے عشق رسول کا چراغ بجھ گیا۔'' صدفی صد صحیح ہے مگر اس سے علمائے اسلام بالخصوص حرمین طیبین کے علماء و مشائخ و اساطین امت نے مولانا تھانوی صاحب و دیگر اکابر دیوبند پر اہانت رسول ﷺ کے جرم میں جو فرد جرم عائد کر کے اسلام کا حق فیصلہ ان کے خلاف نافذ کر کے انہیں اسلام سے خارج کیا ہے اس کا کیا۔ اس واقعہ سے ان کا فرد جرم تو اٹھ نہیں گیا۔ اور نہ یہ ان کے جرم کی سنگینی کم ہوئی بلکہ علمائے حرمین طیبین نے ان کے خلاف اسلام کا جو یہ فیصلہ حق سنایا ہے من شك فی کفرہ و عذابہ فقد کفر وہ تو ویسے ہی رہا البتہ یہ واقعہ اعلیٰ حضرت امام عشق و محبت کی عظمت شان پر الفضل ما شھدت بہ

الاعداء کا درجہ رکھتا ہے:

مدّعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

وہ مجھے دیکھتے ہی رہ گئے اہلِ مجلس کی حیرت ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ حضرت علامہ میرٹھی کا اشارہ پا کر میں خدا حافظ کہتا ہوا خیمے سے باہر نکل آیا۔

تو و طوبیٰ و ما قامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

بقول علامہ کوثر نیازی:

"مخالفین جس بات کو شاہ احمد رضا کا تشدد کہتے ہیں وہ تشدد نہیں، ان کا عشقِ رسول ہے۔ ان کا ادب و احتیاط ہے جو فتویٰ نویسی سے لے کر ترجمۂ قرآن تک اور ترجمۂ قرآن سے لے کر نعتیہ شاعری تک ہر جگہ آفتاب و ماہتاب بن کر ضوفشانی کر رہا ہے۔"

(امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت صفحہ ۱۲)

اعلیٰ حضرت کی ذات کو الزامات سے ڈھک دیا گیا۔ اور آپ کی طرف ایسی ایسی روایات منسوب کی گئی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں اور اس تعلق سے جھوٹ کی ایسی فصل اگائی گئی جس کے سامنے داستان امیر حمزہ اور طلسمات ہوشربا کی جلدیں ماند پڑ گئیں۔

الزام تراشی کی ضرورت نہیں لوگو!
دینے کو سزا جرم محبت ہی بہت ہے

مگر بحمدہ تعالیٰ یہ غبار کسی حد تک چھٹ چکا ہے۔ مجلس رضا لاہور، جہاں رضا لاہور، رضا اکیڈمی لندن، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی، معارف رضا کراچی، المجمع الاسلامی مبارکپور، رضا فاؤنڈیشن پور بندر گجرات اور رضا اکیڈمی ممبئی یہ ملک و بیرون ملک کے دینی و اشاعتی ادارے ہیں جو حتی المقدور اس محاذ پر کام کر رہے ہیں۔ خصوصاً مملکت خداداد کے اہل محبت تو بے پناہ شکریے اور دعاؤں کے مستحق ہیں کہ اس محاذ پر انہوں نے ریگزاروں پر گویا دودھ کی نہریں بہا دی ہیں۔ اور کشت امید کے سوکھے دھانوں پر ابر کرم برسا دیا ہے امام مظلوم کے تعلق سے حقیقت کو ایسا آئینہ کیا کہ سچائی کا سورج سوا نیزے پر آ گیا اور اب تو یہ حال ہے کہ ؎

جس سمت دیکھئے وہ علاقہ رضا کا ہے

اعلیٰ حضرت پر ایک خطرناک الزام یہ بھی ہے کہ وہ بریلوی نامی ایک فرقے کے بانی تھے۔ معاذ اللہ صد بار معاذ اللہ! جو قادیانی طرز پر خارج از اسلام ایک فرقہ ہے جس کا ڈھول عالمی سطح پر خوب پیٹا گیا۔ خصوصاً عالم عرب کو کسی حد

تک یہ باور کرانے میں کامیابی بھی حاصل کرلی گئی جس کا کماحقہ توڑ اور اس کا کامل دفاع اہلِ سنت ابھی تک نہیں کر سکے۔

''بریلوی'' یہ غیروں کا پھیلایا ہوا جال تھا۔ یا دامِ تزویر جس میں ہم سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت شعوری و لاشعوری و غیر محسوس طور پر پھنس چکے ہیں۔ اور جس سے نکلنے کی اب تک کوئی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی بلکہ اس کے مضمرات کو سمجھے بغیر ''بریلوی'' کو ہم اب اپنا امتیازی نشان سمجھ کر اسے اپنے فخر کی علامت سمجھنے لگے۔ کہ ''بریلوی'' ہی ہمارا امتیازی تشخص ہے جبکہ دشمنانِ اہلِ سنت نے بڑی چابک دستی اور کامل منصوبہ بندی کے ساتھ ہماری گھیرابندی کی ہے بقول ماہر رضویات محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود مظہری بن مفتی اعظم دہلی حضرت علامہ مفتی محمد مظہر اللہ صاحب دہلوی۔

''کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) کی فاضلہ اوشا سانیال (جنہوں نے بریلوی تحریک پر ڈاکٹریٹ کی ہے) سے راقم نے جب یہ کہا کہ بریلوی کوئی فرقہ نہیں تو وہ چونک گئیں اور حیرت سے منہ تکنے لگیں جب سمجھایا تو فکر میں پڑ گئیں۔ اصل میں یہ حقیقت آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتی کیونکہ عام تاثر یہی ہے کہ ''بریلوی'' ایک فرقہ ہے جس کے بانی امام احمد رضا بریلوی تھے۔ بقول ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی حضرات اہلِ حدیث (یعنی وہابیہ غیر مقلدین) نے اہلِ سنت کو یہ لقب دیا تھا۔ پھر اہلِ سنت نے اس لقب کو قبول کرتے ہوئے اپنایا اور بریلوی مشہور ہوگئے۔''

(تقدیم امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت صفحہ ۸)

اور ابو یحییٰ خاں نوشہروی غیر مقلد کا ایک قول یہ بھی ہے:

''یہ جماعت (اہل سنت و جماعت) امام ابو حنیفہ کی تقلید کی مدعی ہے مگر دیوبندی مقلدین یعنی تعلیم یافتگان مدرسہ دیوبند اور ان کی اتباع کرنے والے انہیں بریلوی کہتے ہیں۔''

(تراجم علمائے اہل حدیث ہند صفحہ ۳۷۶ سبحانی اکیڈمی)

وہابیہ مقلدین ہوں یا غیر مقلدین انہوں نے اہل سنت کو جو یہ لقب عنایت فرمایا تھا تو کسی خوشی میں نہیں نہ ہی محبت کے سوغات کے طور پر اور نہ کسی جذبہ خیر سگالی کے طور پر بلکہ ایک زبردست سازش و منصوبے کے تحت جسے غیر محسوس طور پر اعیان اہل سنت نے بڑی بشاشت کے ساتھ ہی نہیں بلکہ فخر و مباہات کے طور پر قبول فرمایا، اسے اپنایا، اور اس سلو پوئزن (میٹھا زہر) کو اپنا طغرہ امتیاز بھی قرار دے دیا۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اس تعلق سے جماعت اہل سنت کے ایک نامور قائد و سرخیل حضرت علامہ ارشد القادری صاحب علیہ الرحمہ نے بیس (۲۰) سال قبل ایک رسالہ بھی تصنیف فرمایا تھا۔ دورِ حاضر میں بریلویت اہل سنت کا علامتی نشان۔'' جس پر شیخ الاسلام

جانشین حضور محدث اعظم حضرت علامہ سید محمد مدنی میاں اشرفی جیلانی مدظلہ النورانی کا ایک گراں قدر مقدمہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مقدمہ کتاب کی تائید و تحسین ہی میں ہوگا۔ نہیں بلکہ ہے اور ابھی تازہ بہ تازہ نوع بہ نوع ماہنامہ اشرفیہ مبارکپور نے اسی سال یعنی ۲۰۰۳ء میں ایک بہت ضخیم و مبسوط نمبر تقریباً چودہ سو صفحات پر مشتمل ''سیدین'' نمبر نکالا ہے۔ ماشاء اللہ، سبحان اللہ، الحمدللہ۔ اس میں حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کا ایک مقالہ بھی شامل ہے۔ فرماتے ہیں۔

''امر واقعہ ہے کہ اہل سنت کا صحیح ترجمان ہونے کی حیثیت سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی علمی و دینی شخصیت ساری دنیا کے مسلمانوں کی مرکز فکر ہے انہوں نے اپنے گراں قدر تصنیفات کے ذریعہ دین حق کو باطل کی آمیزش سے اس طرح پاک وصاف کر دیا ہے کہ اب ان کے فکر کے ساتھ وابستگی اہل حق کی علامت بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے فرقہ ہائے باطل کے مقابلہ میں اپنی دینی و جماعتی شناخت کے لیے ''بریلوی'' کے لفظ سے زیادہ جامع اور مختصر کوئی دوسرا جملہ نہیں ہے۔

اللہ و رسول کے دوستوں سے دوستی اور دشمنوں سے علیحدگی ہی مسلک اعلیٰ حضرت کی تعبیر ہے۔''

(ماہ نامہ اشرفیہ، سیدین نمبر، صفحہ ۸۳۴)

بیشک سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت میں یہ شخصیتیں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں ان کا علمی و فکری و تحریکی قامت بہت بلند ہے مجھ جیسے بے بضاعت کا اس تعلق سے ان کی بارگاہ میں خطا کی نسبت کرنا۔ ''فروغِ تجلی بسوزد پرم'' کے زمرے میں داخل مانا جائے گا۔ جبکہ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان ایک آفاقی حقیقت ہے اور ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ''خطائے بزرگان گرفتن خطا است'' مگر اتنا عرض کرنے میں ہماری مسلمانی شاید خطرے میں نہ پڑ جائے کہ ''سہو چوک'' لاشعوری اور غیر محسوس طور پر حالات کا شکار ہو جانا، فریب کھا جانا یہ تو بشری تقاضوں میں سے ہے۔ اور ہم بہر حال بشر ہی ہیں کوئی فرشتہ نہیں بیشک اس تعلق سے اہلِ سنت اغیار کے سازش کا شکار ہوئے جس پر بعد کے حالات و واقعات نے اپنی مہر لگا دی اور ہمارے یہ خالص اللہ والے بزرگ ان ظالموں کے جال میں پہلی بار نہیں پھنسے بلکہ اپنی مومنانہ سادگی سے وہ بار بار ان کے دام فریب میں آئے ہیں۔ جنتیوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اھل الجنۃ بُلْہٌ، صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

علم و عمل عزیمت و استقامت کے جبل شامخ مجاہد حریت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کے عظمتوں کے وارث و امین حضور مجاہد ملت حضرت علامہ الحاج الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری عباسی سابق صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت، اپنی عمر کے آخری دور میں ہانڈی والی مسجد، سیفی جوبلی اسٹریٹ ممبئی ۳ میں قیام سے پہلے پکسر انوں رائے بریلی یوپی کے اپنے ایک مخلص اہلِ عقیدت فضل خاں مرحوم کے اسپورٹس کے کارخانے واقع گرانٹ روڈ ممبئی ۴ میں ٹھہرا کرتے تھے۔ راقم الحروف الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور سے فراغت کے بعد ایک سال گذار کر یعنی ۱۹۷۰ء میں ممبئی آیا۔

اسی درمیان اطلاع ملی کہ سرکار مجاہد ملت علیہ الرحمہ ممبئی آئے ہیں۔ بچپن ہی سے نہاں خانۂ دل میں ان کی عقیدت کا چراغ جل رہا تھا۔ اپنے دور طفلی میں ایک بار دار العلوم فیض الرسول میں حضرت کی زیارت و دست بوسی کی سعادت حاصل کی تھی۔ دوسری بار شکرولی ضلع گونڈہ کے تاریخی مناظرے میں دور سے زیارت ہوئی تھی۔ چنانچہ زیارت و ملاقات کے لیے حاضر ہوا دست بوسی کے بعد اسی مجلس میں بیٹھ گیا۔ بات نکل پڑی مناظروں کی۔ بقول حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی مناظرے تو گویا حضور مجاہد ملت کی خوراک تھے۔ حضور مجاہد ملت اپنے زمانے میں مناظرے پر ایسے اتھارٹی تھے کہ جس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ان کی حیات کا آخری دور تو گویا جیسے مناظروں ہی کے لیے وقف تھا۔ دو سال قبل شکرولی کے مناظرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

میں نے عرض کیا حضور گستاخی معاف! کیا یہ صحیح نہیں کہ مخالفین نے مناظروں کے نام پر ہمارے دل و دماغ کو الجھا لیا ہے۔ انہوں نے اپنے یہاں کے چند مدفاضل افراد کو الجھانے اور پھنس جانے پر بھاگ لینے کی ٹریننگ دے کر مناظر کی حیثیت سے میدان میں اتار رکھا ہے۔ تا کہ اہل سنت کے ''اکابرین'' کو مناظرے کے نام پر الجھائے رکھیں۔ اور ان کا دل و دماغ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تعمیر کے نام پر تخریب کی نئی نئی جہتیں تلاش کرتا رہے۔ اور اس کے لیے بڑے بڑے پلندے تیار کرے۔ یہ مولوی نور محمد ٹانڈوی، یہ مولوی ارشاد، یہ بدزبان مولوی طاہر گیاوی اور جیل میں پیدا ہونے والا پالن گجراتی یہ دیوبندی مناظر ہیں؟ اپنی جماعت کے ان مدفاضلوں کے مقابلہ میں خطیب مشرق حضرت علامہ مشتاق احمد نظامی، رئیس القلم علامہ ارشد القادری، فقیہ عصر علامہ مفتی شریف الحق امجدی وغیرہ کا ان کے منہ لگنا اور پھر آپ جیسی ہمالیائی شخصیت جو چند در چند خصوصیات میں پورے ملک میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی۔ اس کا یوں رات دن مناظرے کے نام پر مارے مارے پھرنا کیا یہ دیوبندیوں کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسنا نہیں؟

آپ نے جب درسگاہ کو زینت بخشی تھی تو کتنے لعل و جواہر اہل سنت کو عطا فرمائے جس کی مثال میں حضرت علامہ نظام الدین علیہ الرحمہ الہ آبادی کی ذات ہے۔ جن کی درسگاہ سے حضرت علامہ نظامی جیسے افراد پیدا ہوئے یہ جو کل تک اپنے اداروں کے چندے کی رسیدیں لیے گلی گلی کوچوں کوچوں مارے مارے پھرتے تھے۔ وہ آج آپ کے مقابلے میں مناظر بن کر اترے ہوئے ہیں کیا ہمارے یہاں اس سطح کے مدفاضل افراد نہیں تھے اور نہیں تھے تو کیا نہیں بنائے جا سکتے تھے؟ جب سے آپ نے میدان مناظرہ میں قدم رکھا اور درسگاہ کو چھوڑا تو پھر کوئی علامہ نظام الدین کے امثال پیدا ہوئے؟ غرضیکہ اہل سنت کے یہ دل و دماغ جو دین و سنت کا ستون ہیں وہ مناظروں میں ضائع تو نہ ہوتے۔

حضور کیا مخالفین کا کوئی جید عالم بھی اس میدان میں اترا ہے پہلے کی بات تو میں نہیں بتا سکتا کہ ان کا کوئی پڑھا لکھا غیر معمولی آدمی اس میدان میں کمر کسا ہو۔ ہم تو بہت دنوں سے مخالفین کی طرف سے انہیں چند بے بال و پر افراد کو پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ یعنی جو کل تک صرف روداد و رسید کے مرد میدان تھے انہیں وقت اور ہماری سادہ لوحی نے

میدان مناظرہ کا پہلوان بنا کر ہمارے بڑوں کے سامنے کھڑا کر دیا ہے۔ بھلے وہ کھڑا ہو نے، گر پڑنے پھر بھاگ لینے میں کمال حاصل کر چکے ہیں۔ مگر اپنے اس داؤں پیچ کے ذریعہ ہمارے دل و دماغ کو سکون سے کوئی تعمیری کام تو نہیں کرنے دے رہے ہیں۔

ایک صحرا کو راستہ دے کر　　　　ایک دریا نے خودکشی کر لی

سرکار مجاہد ملت علیہ الرحمہ میرے معروضات کو بہت غور سے سنتے رہے۔ جب میں خاموش ہوا تو فرمایا مولوی صاحب کیا نام ہے؟ کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ فضل خاں مرحوم نے کہا: حضور یہ ہمارے حاجی ملّا منیف کے صاحبزادے ہیں۔ جو آپ کے ساتھ حج میں تھے۔ اور جن کی اسٹیل کی دوکان دوٹانکی پر ہے جہاں حضرت اکثر تشریف لے گئے ہیں۔ وارث جمال قادری نام ہے ایک سال قبل اشرفیہ مبارکپور سے فراغت حاصل کی ہے۔ ابھی جلد ہی ممبئی آئے ہیں۔ حضرت نے خوش ہو کر فرمایا ماشاء اللہ دینی گھرانے کے فرد ہیں۔ پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ مولوی صاحب اسی چھوٹی سی عمر میں آپ نے بڑی پکی بات کی ہے۔ مولوی صاحب! حقیقت وہی ہے جو تم نے ابھی کہا ہے۔ بیشک ہم ان ظالموں کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس چکے ہیں۔ اور پھنسے بھی اس طرح سے ہیں کہ اب اس سے نکلنا بھی چاہیں تو نہیں نکل سکتے۔

مولوی صاحب! تم نے مفتی اعظم کو دیکھا ہوگا؟ عرض کیا جی حضور! سرکار کی زیارت کی سعادت حاصل کی ہے تو پھر تم نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ وہ کس طرح سے حاجت مندوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ غرض مندوں اور ضرورت مندوں نے انہیں تعویذ کے لیے گھیر رکھا ہے۔ وہ ہمیشہ سے تعویذ خواہوں کے گھیرے میں نہیں تھے۔ بڑے قابل آدمی ہیں۔ مفتی اعظم! وہ اس لیے نہیں مفتیٔ اعظم ہیں کہ وہ اعلیٰ حضرت کے بیٹے ہیں بلکہ اپنے علم و فضل جوہر قابلیت اور تقویٰ و پرہیزگاری کے سبب مفتیٔ اعظم ہیں۔ ان کی پوری زندگی کارناموں سے بھری ہوئی ہے لیکن عمر کے اس حصے میں جس طرح وہ تعویذ خواہوں اور حاجت مندوں کے گھیرے میں گھرے ہوئے ہیں وہ چاہیں بھی تو اس گھیرے کو توڑ نہیں سکتے۔

مولوی صاحب! آپ کے محسوسات بہت صحیح ہیں۔ جس کا فقیر کو اعتراف ہے۔ اس ملاقات کے بعد حضور مجاہد ملت نے راقم کو اپنے قدموں سے اتنا قریب کر لیا اور اتنا اعتماد فرمایا کہ آج ان کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت کا منصب صدارت میرے ناتواں کاندھوں پر ہے فالحمد للہ علیٰ ذالك۔

خلیج کی پہلی جنگ سے چند سال پیشتر جماعت اہلِ سنت کی ایک نمایاں شخصیت جو جماعت اہلِ سنت کے فروغ کے لیے ہمیشہ سے متحرک و فعال تھی۔ اور اب تو دار العلوم امام احمد رضا کونڈورے، رتنا گیری مہاراشٹر کے حوالے سے ان کا نام اور کام بڑے روشن اُجالوں میں آ گیا ہے۔ پیر طریقت الحاج محمد اسمٰعیل جانی قادری رضوی برکاتی کویت سے شائع ہونے والا ایک عربی مجلہ لے آئے تھے جس میں حال کے گمراہ، باطل اور خارج از اسلام فرقوں کا تعارف کرایا گیا تھا۔ انھیں گمراہ باطل اور خارج از اسلام فرقوں میں آخری نام تھا ''بریلوی فرقہ''۔ اس کا آغاز کچھ یوں تھا و منھم

البریلویۃ"۔ پھر اس کے بانی کی حیثیت سے اعلیٰ حضرت کا نام ان کے وطن اور ان کے افکار ونظریات کا گمراہ کن تذکرہ اور ایک نئے فرقے کی حیثیت سے اس کا تعارف۔ اس مجلّے کی بنیاد پر الحاج اسمٰعیل جانی صاحب کی کوششوں سے حضور سید العلماء کی مسجد کھڑک میں حضرت اشرف العلماء علامہ سید حامد اشرف علیہ الرحمہ بانی وسربراہ دار العلوم محمدیہ ممبئی کی صدارت میں علماءے کرام وائمۂ مساجد کی بڑی پرہجوم میٹنگ ہوئی۔ میٹنگ کی غرض وغایت یہی تھی کہ اگر ہم اب بھی غفلت وانتشار کا شکار رہے تو پھر وہ دن دور نہیں کہ سوادِ اعظم اہلِ سنت وجماعت کو بریلوی فرقہ اور قادیانیت طرز پر غیر مسلم اقلیت قرار دے کر پوری دنیا میں اچھوت قرار دیا جائے اور یہ کام بڑی خاموشی کے ساتھ عالمی سطح پر سنیوں کے خلاف ہو رہا ہے، جس میں سعودی عرب کی نجدی حکومت اپنے خزانے کا منہ کھولے ہوئے ہے۔

فقیر وارث جمال قادری نے بھی اس میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ذمے دار کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ اور اس مجلّے کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اسے پڑھا بھی تھا۔ میٹنگ کی غرض وغایت یہی تھی کہ اگر ہم اس پر بھی غفلت وانتشار کا شکار رہے تو پھر وہ دن دور نہیں کہ سوادِ اعظم اہلِ سنت وجماعت کو "بریلوی فرقہ" اور قادیانی طرز پر غیر مسلم اقلیت قرار دے کر پوری دنیا میں کہیں اچھوت نہ قرار دے دیا جائے اور یہ کام بڑی خاموشی کے ساتھ عالمی سطح پر سنیوں کے خلاف اندر ہی اندر بڑی تیزی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جس میں سعودی عربیہ کی نجدی حکومت اپنے خزانے کے منہ کھولے ہوئے تھی۔ تا کہ دنیا سے حقیقی اسلام ختم کر کے یا اسے انتہائی کمزور بنا کر اس اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے جس طرح کا اسلام مغربی سامراج چاہتا ہے جس میں روح جہاد وروح محمد نہ کارفرما ہو۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

چونکہ بات زیادہ دنوں کی تھی اس لیے لکھتے وقت محترم اسماعیل جانی صاحب سے تصدیق بھی کی جو حسن اتفاق سے ان دنوں ممبئی آئے ہوئے تھے۔ یہ تصدیق ہم نے ۱۲ رمئی ۲۰۰۳ء کو انجمن اسلام وی ٹی ممبئی میں دار العلوم امام احمد رضا کے سربراہ اعلیٰ محترم الحاج مفتی محمد ابراہیم صاحب مقبولی کے سامنے کی تو جانی صاحب نے فرمایا حضرت! وہ مجلہ ابھی بھی محفوظ ہے۔ آپ چاہیں گے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی (یعنی اہلِ سنت وجماعت کو قادیانی طرز پر اسلام سے خارج کرنے کی سازش) احسان الٰہی کی رسوائے زمانہ کتاب "البریلویۃ" ہے جو عربی زبان میں لکھی گئی ہے اور پورے عالم اسلام بالخصوص عالم عرب میں لاکھوں کی تعداد میں برسوں مفت تقسیم کی گئی۔ جس طرح انگریزوں نے برصغیر ہند میں "تقویت الایمان" کو لاکھوں کی تعداد میں مفت برسوں تقسیم کیا۔ اس کے بعد تقسیم کا یہ فریضہ مسلم نما پادریوں کے حوالے کر دیا۔ جو راقم الحروف وارث جمال قادری کے عہد طفلی تک مفت تقسیم ہوتی رہی۔

کتاب "البریلویۃ" کی زبردست اشاعت میں سعودی ریال وپٹرو ڈالر نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ کذب وافتراء اور سراسر جھوٹ پر مبنی اس کتاب نے اہل سنت وجماعت کے تعلق سے عالم اسلام بالخصوص عالم عرب میں بڑا ہی منفی رول ادا

کیا۔ اگرچہ اس پرفریب کتاب کا مسکت و دندان شکن جواب حضرت علامہ عبد الحکیم شرف قادری علیہ الرحمہ کے قلم سے پاکستان سے من عقائد اہل السنۃ کے نام سے دیا جاچکا ہے۔ مگر اس وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت و تقسیم کا کام نہیں ہوسکا جیسا کہ البریلویۃ کا ہوا اور ہو بھی نہیں سکتا کہ اسے وسائل سے مالا مال ایک دولت مند حکومت کرا رہی تھی۔ اس لیے یہ گندی و پرفریب کتاب اپنا کام کرگئی۔ عربی زبان نے اس پر دو آتشہ کا کام کیا۔ ؎

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

یہ تو اگر ۱۹۹۱ء میں خلیج کی پہلی جنگ نہ ہوگئی ہوتی اور نجدیت دنیا کے سامنے بے نقاب نہ ہوگئی ہوتی اور نجدی حکومت کا آلہ کار اور قلم کا مزدور احسان الٰہی ظہیر اپنے رفقاء کے ساتھ ایک عبرت ناک موت نہ مار دیا جاتا تو یہ ظالم اہل سنت کے خلاف اپنی کوشش و سازش میں کسی حد تک کامیاب ہوجاتے۔ ذی الحجۃ ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء میں مقتدائے اہل سنت سرکار مجاہد ملت حضرت علامہ مفتی شاہ حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمہ کو نجدی وہابی عقیدے کے امام حرم کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کے باعث حج کرنے نہیں دیا گیا اور حج سے دو روز قبل جبراً واپس ہندوستان بھیج دیا جس پر پوری دنیا میں کافی ہنگامہ ہوا غالباً اسلام کی تاریخ میں اس طرح کی دوسری مثال نہیں ملتی کہ اسلامی حکومت کی دعویدار کسی حکومت نے کروڑوں مسلمانوں کے مذہبی مقتدا کو حج نہ کرنے دیا ہو اور حج سے دو روز قبل اس کے وطن واپس کردیا ہو۔ جس کی وجہ سے دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ نجدی حکومت پر لعنت بھیج رہے تھے اور عقال کی شکل میں گھونگھٹ نکالے نجدی دنیا کو مارے شرم کے منہ نہیں دکھا پا رہے تھے۔

غالباً اس کے تیسرے سال پھر ایک ہندی وہابی کی مخبری پر جانشین مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں ازہری مدظلہ العالی کو دوران حج سعودی حکومت نے گرفتار کرکے اپنے مقرر کردہ قاضی حرم کے سامنے پیش کیا۔ قاضی حرم نے آپ سے متعدد سوالات کئے۔ جس میں اہم ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا آپ بریلوی ہیں؟

اگر اس وقت حضرت علامہ ازہری صاحب ہاں میں جواب دیتے تو بھی غلط نہیں ہوتا کہ آدمی اپنے وطن ہی کی طرف نسبت کرتا ہے جیسا کہ خیر آباد کی طرف نسبت کرتے ہوئے حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی، بدایوں کی طرف نسبت کرتے حضرت علامہ فضل رسول بدایونی، یوں ہی اعظم گڑھ کی نسبت کرتے ہوئے حضرت علامہ عبد المصطفیٰ اعظمی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح علامہ ازہری اپنے وطن مالوف بریلی شریف کی نسبت سے یقیناً بریلوی تھے مگر اس "مردِ مومن" نے اپنی نور بصیرت سے نجدی قاضی حرم کے سوالات کے مضمرات کو سمجھ لیا تھا، اس لیے آپ نے حالات کے پس منظر میں اس کا جواب بھی بڑا تاریخی دیا:

"میں بریلوی نہیں" ایک سنت و جماعت کا ایک فرد ہوں، بریلی میرا وطن ہے۔"

اس جواب میں قاضی حرم کی نیت اور اس کی مضمرات کا جواب تھا۔ جس نے اس کو مبہوت کر دیا۔ اور اس کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اگر آپ بریلوی کہہ دیتے کہ ہاں میں بریلوی ہوں تو ان کے ہاتھ میں اہل سنت کے ایک فرد کو قادیانی طرز پر بریلوی فرقہ ثابت کر کے ان پر ظلم کرنے کا آلہ و ہتھیار مل جاتا۔ راقم الحروف وارث جمال کو حضرت والا کے اس جواب سے دیگر علماء و دانشور طبقہ کی طرح اتنی خوشی ہوئی تھی کہ اسی وقت واپسی پر آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے ایک طویل مبارکباد بذریعہ ڈاک بریلی شریف آپ کی خدمت میں بھیجا جو ماہنامہ المیز ان ممبئی میں اسی وقت شائع بھی ہوا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ بریلی والا یہ کہے کہ بریلوی نہیں سنی ہوں اہل سنت کا ایک فرد ہوں مگر بریلی کے باہر والے یہ کہیں کہ ہم سنی کم بریلوی زیادہ ہیں نہیں بلکہ ہم صرف بریلوی ہیں۔ اور یہی ہمارا سرمایۂ افتخار اور ہمارے تشخص کی علامت ہے۔

جب سے ہم لفظ بریلوی یا بریلویت پر اکتفا کر کے اہلِ سنت و جماعت کے وسیع و عریض پلیٹ فارم کو غیر محسوس طرف پر چھوڑنے لگے ہیں۔ وہابیہ مقلدین خود کو اہلِ سنت لکھنے، کہنے اور سمجھنے لگے ہیں۔ اہلِ سنت سے شانہ ملاتے ہوئے وہ اب خود کو اہلِ سنت (دیوبندی مکتب فکر) لکھنے لگے ہیں۔ یعنی پہلے وہ اسلام کے مقابلے میں ایک مذہب تھے اور اب خود کو اہلِ سنت (دیوبندی مکتب فکر) سمجھنے لگے ہیں۔ ایک خود ساختہ تقسیم کے ذریعہ اب وہ اہلِ سنت کے ایک جز یعنی ایک مکتب فکر بننے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ پہلے وہ وہابی مناظر ہوا کرتے تھے اور خود کو بھی وہابی مناظر سمجھتے تھے مگر اب وہ ہماری عقلمندی سے خود کو مناظر اہل سنت اور اپنی تنظیموں کا نام ''تنظیم اہل سنت'' اور ''تنظیم علمائے اہل سنت'' رکھ رہے ہیں۔ اور ہم ''مناظر اہل سنت'' سے ''مناظر بریلوی'' ہو گئے۔ ''سنی مناظر'' سے ''بریلوی مناظر'' کہلانے میں اپنی شان زیادہ سمجھنے لگے ہیں اور اہل سنت کے آفاقی تشخص اور اس وسیع و عریض پلیٹ فارم کو ہم غیروں کے حوالے کر کے لفظ بریلوی کو اپنا طرہ امتیاز سمجھنے لگے اور لوگوں کو اسی کا خوگر بنانے میں بڑے خلوص کے ساتھ مصروف ہیں۔ ؎

اے دل ترے خلوص کے صدقے ذرا سا ہوش
دشمن بھی بے شمار ہیں یاروں کے شہر میں

بے شک بریلوی و بریلویت نہ کوئی مسلک ہے اور نہ ہی کوئی فرقہ، بلکہ وہابیہ مفسدین وظالمین کا ایک پر فریب پھیلایا ہوا جال ہے جس میں سنّی لاشعوری اور غیر محسوس طور پر بڑے خلوص کے ساتھ پھنس چکے ہیں اور خواہ مخواہ اس لفظ کو اہل سنت کے تشخص کی علامت اور اس کے کلاہ صد افتخار پر چار چاند سمجھنے لگے ہیں۔ اور اس لفظ کے ذریعہ جماعتی سطح پر ہم جو اپنا نقصان کر چکے یا کر رہے ہیں اس کی بھر پائی کرنا بہت مشکل ہو جائے گا۔ ابھی وقت ہے کہ اساطینِ امت و اعیان اہل سنت سر جوڑ کر بیٹھ جائیں اور اس کا کوئی حل نکالیں۔ جس لفظ کو ہم فخر و تشخص کی علامت سمجھتے ہیں آج وہی ہمارے گلے کا پھندا بنتا جا رہا ہے اس پھندے سے نجات حاصل کر کے اغیار کے سازش کا تار و پود بکھیر دیں۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ اگر کوئی شخص ہمارے گھر پر غاصبانہ قبضہ کرے یا ہمارے تشخص کو اپنانے کی کوشش کرے تو اس کے لیے ہم کوئی موثر مدافعت

کرنے کے بجائے اپنا گھر اور اپنا تشخص ہی چھوڑ دیں۔ یا ہم نادانستہ غیر محسوس طریقہ پر کسی دام فریب میں پھنس گئے اور حقیقت واضح ہونے کے بعد اس جال سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ ماریں۔ بلکہ اسی پر قناعت کر بیٹھیں تو یہ ہماری اجتماعی خودکشی ہوگی۔

آخر بیس پچیس سال قبل ہم صرف سنّی ہوا کرتے تھے اور ہماری جماعت کو اہلِ سنت کہا جاتا تھا اور یہی ہمارا سرمایۂ فخر و امتیاز بھی تھا۔ اور ہندوستان پاکستان و بنگلہ دیش، سری لنکا کے ۸۵ فیصد مسلمان سنّی صحیح العقیدہ تھے۔ جس کی قیادت بریلی شریف، مارہرہ مطہرہ، بدایوں شریف اور کچھوچھہ مقدسہ کے جلیل القدر علمائے کرام مشائخ عظام فرمایا کرتے تھے اور آج بھی بحمدہ تعالیٰ مذکورہ ملکوں کی غالب ترین مسلم آبادی ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر مسلمانوں کی غالب ترین اکثریت اسی عقیدے اور طریقہ کو اپنائے ہوئے ہیں۔ جو اہل سنت کے تشخص کی علامت ہے جس کی امامت وقیادت بریلی شریف، مارہرہ مطہرہ، بدایوں شریف و کچھوچھہ مقدسہ کے علماء و مشائخ فرمارہے ہیں۔

ہم آئے دن اغیار کی سازشوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں اور جب احساسِ زیاں ہوتا ہے تو کافی دیر ہو چکی ہوتی ہے جس کی صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کے نام کے ساتھ بالالتزام مجدد لکھا جاتا تھا۔ اور حق لکھا جاتا تھا کہ وہ صرف مجدد ہی نہیں بلکہ اپنے کارناموں کی نوعیت کے اعتبار سے مجدد اعظم تھے اور ایک مجدد و محدث میں عظمت و رفعت کے اعتبار سے جو فرق ہے وہ اہل علم پر ظاہر ہے آج خطابات و القابات بے توقیر ہو گئے ہیں۔ ہر داڑھی، ٹوپی، کرتہ والا مولانا اور علم کا معمولی شد بد رکھنے والا علامہ ہو گیا ہے۔ بلکہ اب لفظ علامہ و مولانا حضرت و محدث، فقیہہ و متکلم سب اپنی معنویت و اہمیت کھو بیٹھے ہیں۔ جس نے چند سال بخاری کا درس دے دیا وہ محدث اور بعد نماز مسجد میں کبھی تفسیر کی کتاب پڑھ کر سنا دے وہ مفسر قرآن اور لفظ مفتی کی بے توقیری کا عالم یہ ہے کہ وہ لفظ جناب کی طرح ہو گیا ہے۔ جبکہ مفتی کے لیے ۲۸ رعلوم کا جاننا ضروری ہے۔ القابات کی اس طرح بے توقیری کے دور میں لفظ مجدّد کی حرمت ابھی تک سلامت ہے۔ ورنہ ہم اپنے ممدوح کو اور آداب و القاب کے ساتھ اگر مجدّد بھی لکھنا شروع کر دیں تو کوئی ہمارا کیا کرے گا کر تو کچھ نہیں پائے گا البتہ ہمیں فاتر العقل اور علم سے عاری ضرور سمجھا جائے گا۔ اب اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ اس دورِ نفسا نفسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے لفظ مجدّد کی حرمت کو محفوظ کر رکھا ہے۔ خصوصاً جلسوں کے اسٹیج پر اناؤنسر آنے والے خطیب کو کھینچ کھانچ کر جب بالغ کرتا ہے اور اس کے نام سے پہلے جب الفاظ کی فصیل تیار کرتا ہے تو سب کچھ بنا دیتا ہے مگر اس کی زبان پر لفظ مجدد سہواً بھی نہیں آتا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا مجدد اعظم تھے، اس لیے بالالتزام ان کے نام کے ساتھ مجددِ دین وملت لکھا جاتا تھا۔ مگر ادھر دو تین برسوں سے برصغیر ہندو پاک کے سارے اہلِ قلم آپ کے نام کے ساتھ مجدد لکھنا جیسے بھول ہی گئے۔ اب صرف امام احمد رضا محدث بریلوی ہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے اور اس پر اتنی شدت برتی جا رہی ہے کہ اگر یہ لفظ محدث آپ کے نام کے ساتھ نہ لکھا گیا تو گویا امام احمد رضا کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی۔ حد یہ کہ فقیہ ملت حضرت علامہ مفتی جلال الدین علیہ

الرحمہ والرضوان جو اپنے زمانے میں ایک اعلیٰ درجہ کے فقیہ مانے جاتے تھے اور جن کے فتوؤں میں بڑا وزن بھی تھا اور اعلیٰ حضرت کی ذات سے جنہیں غایت درجہ عقیدت بھی تھی اور جو مجدد، محدث، فقیہ وغیرہ کے فرق مراتب کو بھی اچھی طرح سے سمجھتے تھے مگر حضور والا بھی جانے کیوں اخیر وقت میں اسی عام روش کو اپنا کر مجدد کے بجائے محدث لکھنے لگے تھے۔ اور اب تو ایں قدر سے لے کر آں قدر تک کہنہ مشق سے لے کر نو آموز تک ((ایک راقم وارث جمال کے علاوہ) سبھی لفظ محدث کے پیچھے ایسے پڑ گئے ہیں گویا لفظ مجدد کوئی بہت معمولی سی چیز تھی جو پہلے کے ناسمجھ اور کم علم اہل قلم استعمال کرتے تھے۔

اعلیٰ حضرت کے نام کے ساتھ مجدد کی جگہ لفظ محدث لفظ کا استعمال پاکستان سے امپورٹ ہوا ہے اور اعلیٰ حضرت کی عظمت وجلالت کے اظہار کے لیے گویا کہ مجدد سے بھاری بھر کم حیثیت رکھتا ہے اور پاکستان کے اہل قلم کی اتباع میں ہندوستان کے سارے اہل قلم نے اسے دانتوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑنا ناگزیر سمجھا۔

اعلیٰ حضرت کے نام کے ساتھ بروقت محدث کا التزام غالباً خصم کے اس چاندماری پر ہے کہ کان قلیل العلم فی التفسیر الحدیث اگر واقعی محدث بریلوی لکھنے کا شاخسانہ یہی ہے تو اس کا ردِعمل اتنی تاخیر سے کیوں؟ اس چاندماری کی عمر تو پچاس سال سے زائد ہے اور پھر مفسر بریلوی لکھنے کا آغاز کب سے ہوگا۔ کیا اس کے لیے بھی مملکت خداداد کی در آمدات کا انتظار ہے؟ کہاں تو اعلیٰ حضرت اب تک مسند نشین تھے مجددینِ کرام کے اس منصب بلند پر جن کی بلندیوں تک نگاہ اُٹھانے کے لیے ٹوپیوں کو تھامنا پڑتا تھا۔

کہاں تو اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے۔ خلیفۂ راشد امیر المومنین سیدنا عمر بن عبد العزیز، حضرت امام شافعی، امام حسن بن زیاد، امام ابوحسن اشعری، حضرت امام غزالی، امام فخر الدین رازی، امام جلال الدین سیوطی، ملا علی قاری، امام ربانی مجدد الف ثانی، شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالم گیر وغیرہ کی صف میں اور اب ہماری عقیدت کی گل گاری انہیں شرف ومجد کے کس صف میں لے آئی۔ مخالفین نے اپنے ترکش سے ایک تیر بغیر ہدف کے پھینکا جس کے جواب میں ہماری باسی کڑھائی میں ایسا اُبال آیا کہ ہم اعلیٰ حضرت کو عظمت وجلال کے ساتویں آسمان سے اتار کر پہلے آسمان پر لے آئے جس کے سرخیل خود وفور عقیدت سے دست بستہ حاضر بارگاہ تھے، بیشک مجدد ایک ایسا منصب بلند ہے جس کے لیے مبعوث کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اہل علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اس لفظ کا استعمال کتنا محدود ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ:

ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مأۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ابھی بھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا ہے۔ ہمیں لفظ بریلوی کے تعلق سے اپنا احتساب کر لینا چاہیے اور بدلے ہوئے حالات کے تحت ہمیں مان لینا چاہیے کہ ہم اپنے بیحد شاطر حریف کی سازش کا شکار ہیں ہمارا فکری المیہ یہ ہے کہ ہم اپنے

ماننے والوں کی محدود بھیڑ اور اپنے مسجد کے صحن نیز اپنے اسٹیج کے سامنے چند ہزار یا چند لاکھ سروں کو دیکھ کر اسی کو عالم اسلام سمجھنے لگتے ہیں۔ اور اسی تناظر میں ہم کوئی بات طے کرتے ہیں۔ ؎

لطیف باتیں بھی احباب کو کھٹکتی ہیں
نہ جانے کون سا کانٹا مری زبان میں ہے

دارالعلوم مینائیہ گونڈہ یوپی کے سابق شیخ الادب عزیز گرامی قدر مولانا تاج محمد فاضل صدام یونیورسٹی بغداد شریف عراق ایک ذی علم وذی استعداد عالم دین ہیں خصوصاً عربی زبان وادب پر اچھی دستگاہ حاصل ہے۔ پانچ برس سے زائد بغداد شریف میں رہ کر امتیازی حیثیت حاصل کی ۲۹ ؍جنوری ۱۹۹۹ کو آل انڈیا تبلیغ سیرت کے زیر اہتمام مستان تالاب گراؤنڈ ممبئی کے عظیم الشان تاریخی ''تحفظ بغداد کانفرنس'' میں موصوف نے کافی جدوجہد کی تھی۔ اس کانفرنس میں عراق کے سفیر محترم کو دلی جا کر تبلیغ سیرت کی دعوت دینا پھر انہیں وہاں سے لانا اور اس تاریخی کانفرنس میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کے نمائندے کی حیثیت سے سفیر کو عربی زبان میں سپاسنامہ پیش کرنا اور ان کی عربی تقریر کو فی البدیہہ بامحاورہ اردو زبان میں عوام کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری مولانا نے ادا کی۔ مولیٰ تعالیٰ ان کے اس سعی حسن کو قبول فرمائے اور انہیں علم دین کی خدمت کی مزید توفیق رفیق عطا فرمائے۔ آمین

آں عزیز راقم سے تعلق خاطر رکھتے ہیں اور بڑے ہی ادب واحترام کے ساتھ پیش آتے ہیں اس فقیر کو وہ استاد کی سی عزت دیتے ہیں۔ انہوں نے بغداد شریف سے واپسی کے بعد راقم کو بتایا کہ ایک بار انہوں نے بغداد شریف میں اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی حیات وخدمات وکارنامے پر ایک طویل اور وقیع مقالہ عربی زبان میں لکھ کر ایک مشہور عربی میگزین میں شائع کرایا۔ اس کے شائع ہونے کے بعد مجھے بڑی مشکلات اور کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ محسوس یوں ہوا کہ جیسے میں نے کوئی بڑا جرم کر دیا ہو اس لیے کہ معاندین نے اعلیٰ حضرت کا تعارف عرب کے ارباب علم ودانش و اصحاب فضل وکمال کے درمیان بڑے منفی انداز میں کر دیا ہے کہ وہ بریلوی نامی ایک گمراہ وبے دین فرقے کے بانی تھے۔ اور ان کے افکار ونظریات باطل اور دین حق سے متصادم تھے۔

مولانا تاج محمد فرماتے ہیں کہ ہمیں ان ارباب علم وفضل کو یہ یقین دلانے میں کافی محنت کرنی پڑی کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی اسلام میں بریلوی نام کے کسی فرقے کے ہرگز بانی نہیں تھے بلکہ وہ برصغیر ہند میں اہل سنت کے امام، اسلام کے ایک بڑے داعی، دین حق کے ایک عظیم مبلغ اور بیمثل عاشق رسول تھے۔ حب رسول ان کی امتیازی خصوصیت تھی وہ مسلکاً حنفی ومشرباً قادری تھے۔ انہوں نے دین حق کو باطل کی آمیزش سے پاک کیا اور باطل کے غرور کو خاک میں ملادیا۔

ان سے تھرّا رہا باطل پرستوں کا غرور
جس کا شاہد ہے زمانہ اور خود تھانہ بھون

ایک حیرت انگیز بحث

اتر پردیش کا مشہور ضلع بستی جس کے اندر ایک اور ضلع سدھارتھ نگر کے نام سے بنا دیا گیا ہے اس میں ایک مشہور قصبہ ہے ڈومریا گنج۔ جو تحصیل بھی ہے اور تحصیل ڈومریا گنج بہت قدیم زمانے سے مشہور چلا آرہا ہے وہاں ایک مسجد وعید گاہ کے امامت کے تعلق سے ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا جو کورٹ تک پہنچا۔ وہاں کے سنی مسلمان بہت کمزور تھے اور غریب بھی۔ جبکہ دیوبندی حضرات مالی طور پر بہت مضبوط اور کافی اثر ورسوخ والے۔ دیوبندی حضرات دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف کے مقرر کردہ امام کو وہاں سے ہٹا کر دیوبندی امام لانا چاہتے تھے۔ براؤں شریف شمالی مشرقی یوپی کے کئی اضلاع میں اپنے تصلب فی الدین میں بڑی شہرت اور خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔ براؤنی ہونا متصلب سنی ہونے کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ بانی فیض الرسول حضور شعیب الاولیاء محمد یار علی قدس سرہ العزیز نے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کے پاکیزہ مسلک ''حب رسول'' کا جھنڈا جس انداز میں بلند کیا تھا۔ دورونزدیک میں اس کی انفرادیت کا کوئی جواب نہیں تھا۔

رئیس الاتقیاء حضرت علامہ مفتی بدرالدین احمد قادری علیہ الرحمہ جن کے تصلب اور حزم اتقاء کا شہرہ بہت دور دور تک ہے اور جن کا دبدبہ ورعب علمی ہندوستان کے تمام قابل ذکر دینی اداروں پر تھا وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ''بدرالدین کی دینی تربیت حضرت شاہ صاحب کے ہاتھوں ہوئی۔'' یعنی شاہ محمد یار علی قدس سرہ العزیز۔

اس امامت کا تنازعہ اتنا بڑھا کہ اسے ضلع بستی کے مشہور تحصیل بانسی کی کورٹ میں لے جایا گیا اور برسوں مقدمہ چلا فائنل بحث کی تاریخ پر غریب سنی مسلمان کسی طرح گونڈہ کے ایک مشہور مسلم ایڈوکیٹ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے جسے اختلاف مذاہب پر بڑا عبور حاصل تھا۔ تاریخ مقررہ پر جب وہ ایڈوکیٹ بحث کے لیے آیا تو وہاں کے اکثر وکلاء اس کی بحث سننے متعلقہ کورٹ میں جمع ہو گئے۔ حد یہ کہ اس مقدمہ میں فریق مخالف کا وکیل بھی بحث سننے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔

اس وکیل نے بڑے اعتماد کے ساتھ جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: جناب عالی! ہماری بحث یک طرفہ ہی سہی عدالت اسے سماعت کرے ہوسکتا ہے اگلی پیشی پر ہمارے فاضل دوست اس بحث کا جواب دیں۔ دونوں طرف کی بحث سننے کے بعد ہمیں پورا یقین ہے کہ عدالت وہی فیصلہ کرے گی جس سے حق وانصاف کی فتح ہوگی۔ اس نے اپنے بحث کے آغاز میں اسلام کی ابتدائی تاریخ بیان کی پھر خلفائے راشدین کا ذکر کرتے ہوئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت اور آپ کی مظلومانہ شہادت اور اس کے محرکات وپس منظر کا ذکر کرتے ہوئے خون عثمان کے قصاص کے معاملے کو اٹھاتے ہوئے اسلام کے چوتھے خلیفہ امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ وخلیفہ راشد حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان شدید خوں ریزیوں کو بند کرانے کے لیے اصحاب الرائے صحابہ کرام کے مشورہ پر مبنی

واقعہ تحکیم کا تفصیل سے ذکر کیا۔ جس کے نتیجہ میں خوارج کا ظہور ہوا۔ پھر خوارج کے خونریزیوں اور ان کے ساتھ حضرت علی کے جہاد و قتال کا ذکر کیا۔ باوجود اس کے کہ اس میں قائم اللیل و صائم النہار و تہجد گزار حضرات بھی تھے مگر انہیں اسلام سے خارج قرار دے کر ان کے قتل کو جائز و مباح قرار دیا گیا اور خوارج کو ہمیشہ کے لیے اسلام سے خارج کیا گیا۔ پھر خوارج لے کر جس جس عہد میں جو جو فتنے جس جس شکل میں اسلام کے مقابل آئے ان سب کا ذکر کیا گیا۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے ظہور اور اس کے باطل افکار و نظریات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ہندوستان میں پہلی بار انگریزوں کی کوکھ سے نکلے ہوئے فتنۂ وہابیت کی تفصیل پر آیا۔ شاہ اسماعیل دہلوی و مجاہد آزادی حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کی تحریکات کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے ہندوستان میں فتنۂ وہابیت کے امام شاہ اسماعیل دہلوی کے متعلق فقہائے اسلام خیر آباد، دہلی و رامپور و بدایوں کے علاوہ ہندوستان کے جید علماء کرام و مشائخ عظام و مفتیان دین نے کہا کہ ''قائل ایں کلام لاطائل کافر و ملحد و زندیق است قتل و تکفیر او واجب است۔''

منزل بہ منزل اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی کے عہد تک آیا۔ اس نے زبردست دلائل قاہرہ اور تاریخی شواہد پیش کرتے ہوئے ثابت کیا کہ جس طرح ماضی میں طرح طرح کے باطل فرقے و فتنے مذہبی روپ لیے اسلام کے مقابل آئے مگر وہ سب فنا کے گھاٹ اتر گئے اور اسلام ہر دور میں نازک ترین ابتلاء سے گزرنے کے بعد آج بھی موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا۔

بہر اسلامے ہزاراں فتنہا   اک مہ و صد داغ فریاد اے خدا

صدیوں کے مذہبی تاریخ کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے وہابیت و دیوبندیت کو تاریخی شواہد اور زبردست استدلال سے ثابت کیا کہ وہابیت اسلام کے مقابلے میں خود ایک مذہب ہے جس کا چودہ سو سالہ قدیم اور حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ رہ گئی بات ''بریلوی'' یا بریلویت کی تو یہ نہ اسلام میں کوئی فرقہ ہے نہ ہی کوئی مسلک بلکہ یہی وہابی، دیوبندی حضرات تمام خوش عقیدہ مسلمانوں کو جو پوری دنیا میں اہل سنت و جماعت سے مشہور ہیں کبھی ''بریلوی'' اور کبھی رضا خوانی کہتے ہیں۔ جبکہ گورنمنٹ کے یہاں بھی اسلام کے اندر صرف دو مذہب ہیں اہل سنت و جماعت اور اہل تشیع۔ قبرستان بھی صرف دو ہی ہوتے ہیں۔ سنی قبرستان، شیعہ قبرستان، وقف بورڈ بھی دو ہی نام سے ہیں سنی وقف بورڈ، شیعہ وقف بورڈ، سرکاری کاغذات، مولوی، عالم، فاضل کے سرکاری امتحانات میں فارم پر بھی دو ہی مذہب ہوتے ہیں۔ شیعہ اور سنی بس۔

صرف اہلِ سنت و جماعت ہی وہ پاکیزہ مذہب ہے جو چودہ سو سال سے جوں کا توں چلا آرہا ہے یہی وہ مذہب ہے جس کی تبلیغ ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری نے کی، خواجہ نظام الدین اولیاء دہلی، خواجہ امیر خسرو اور تمام اولیاء اللہ و بزرگان دین نے رات دن جس کی تبلیغ و اشاعت فرمائی۔

انگریز کے آنے سے پہلے یہاں برصغیر ہند میں صرف ایک مذہب ہوا کرتا تھا۔ اہل سنت و جماعت اور تھوڑی تعداد

اہل تشیع کی تھی بس۔ یعنی مٹھی بھر تعداد شیعہ حضرات کو چھوڑ کر پورا برصغیر سنی مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ تو جب انگریز کے منحوس وناپاک قدم یہاں آئے اور پورے ملک کا اقتدار ان کے ہاتھوں میں آیا تو اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے کچھ ایجنٹ تیار کئے اور وہیں اسلام کا چہرہ بتدریج داغدار ہونا شروع ہوا۔ چونکہ اس نے اقتدار مسلمانوں سے مکروفریب کے ذریعہ چھینا تھا اسی لیے اپنے استحکام کے لیے مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑانا اس کی سیاسی ضرورت تھی لہٰذا اس نے اپنے مسلم نما ایجنٹوں سے اسلام کے چودہ سو سالہ متفقہ عقیدے کو چیلنج کرایا اور جب اس نے اپنے حسن تدبیر سے گھر گھر آگ لگا دی تو اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑایا کہ وہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی نہ اپناتا تو سات سمندر پار سے آکر اتنے دنوں تک حکومت کیسے کرتا؟

جج:۔ مسلمانوں کے باہمی نزاع میں بار بار بریلوی کا نام کیوں آتا ہے؟

وکیل:۔ جناب عالی! جب انگریزوں نے اپنے مفاد اور اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے اپنے مسلم نما پادریوں کے ذریعے اسلام کا تشخص ختم اور اسلام کی روح نکال کر اسے بیجان کرنا چاہا اور اس کا چہرہ بری طرح مسخ کیا جانے لگا اس پر بڑے بڑے داغ دھبے ڈال دیئے گئے تو اس کے چہرے پر فتنوں کے اتنے جھاڑ جھنکاڑ نکل آئے کہ ایک مسلمان کے لیے اس کی صحیح پہچان بہت مشکل ہوگئی ایک طرف پورا برصغیر ہند تھا اور دوسری طرف مٹھی بھر چند انگریزی ایجنٹ اپنی پشت پر مادی وسائل کا لامحدود ذخیرہ لیے ہوئے۔ ان کی پشت پر دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ جس کی حکومت کی حدود میں کبھی سورج ڈوبتا ہی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بہت بڑا مذہبی آتنک پیدا کر دیا۔ لوگ حیران و پریشان تھے اور اپنے اپنے طور سے جس سے جتنا ہو سکتا تھا اسلام کی دفاع اور انگریزوں کے ان ایجنٹوں کی قرار واقعی حیثیت سے لوگوں کو خبردار کر رہے تھے۔ کہ اسی اثنا میں اللہ تعالیٰ نے اپنے سچے دین کی پہچان اور اس کی حمایت کے لیے سرزمین بریلی سے ایک عظیم شخصیت کو اٹھایا جس کا نام احمد رضا تھا اس نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے انگریزوں کے ایجنٹوں کو لگام دی اور ان کے سارے کس بل نکال دیئے اور اسلام کے چہرے پر پڑے داغ دھبے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر کے اس کے چہرے کو روشن و بے غبار آئینہ بنا دیا اور انہیں للکارتے ہوئے خبردار کیا کہ ؂

کلک رضا ہے خنجر خونخوار برق بار
اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

اس لیے اسلام کے خلاف فتنوں کے اس جنگل میں اس کی ذات کو حق اور سچائی کی شناخت کے لیے ایک معیار مان لیا گیا کہ وہ جس طرف ہے حق اسی طرف ہے۔ اہل سنت کی شناخت اسی کے حوالے سے ہونے لگی۔ پوری اسلامی برادری نے اسلام کے اس مرد آہن کو دین وسنیت کا پیشوا اور اہل سنت کا امام تسلیم کر لیا۔ چونکہ وہ بریلی کا رہنے والا تھا۔ اس لیے مخالفین نے اہل سنت کو اس کی اتباع کرتے دیکھ کر بریلوی کہنا شروع کیا۔ اور کچھ لوگ تو تحقیراً سنی مسلمانوں کو رضا خوانی بھی

کہنے لگے۔لیکن وہابیت اور دیوبندیت سنیت کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اسلام کے مقابلہ میں مستقل ایک مذہب ہے جس کا کام حقیقی اسلام کے مقابلہ میں ایک ایسا مصنوعی اسلام پیش کرنا جو اسلام کی روح سے بلکل خالی ہو ایک جسد بے روح کی طرح۔

سامعین میں کچھ علمائے دین، کچھ اہل نظر بھی تھے جو تڑپ گئے اور کف افسوس ملتے رہے کہ کاش! آج ٹیپ ریکارڈ ہوتا تو ایک نامور وکیل کا اہل سنت و جماعت کی حمایت میں اتنی ساری قیمتی تاریخی شواہد اور طریقہ استدلال محفوظ ہو جاتا۔

میرے والد ماجد الحاج محمد منیف قادری یارعلوی بانی مدرسہ غوثیہ فیض العلوم بڑھیا جو حضور شعیب الاولیاء براؤں شریف کے مخصوص ترین مریدوں میں آخری یادگار اور حضور مجاہد ملت حضرت علامہ حبیب الرحمٰن قادری عباسی علیہ الرحمہ کے آخری خلیفہ بھی ہیں۔اس دن وہ بھی کورٹ میں موجود تھے۔اسی شام کو انہوں نے ہی راقم الحروف وارث جمال قادری کو یہ تمام تفصیلات سنائیں۔تفصیلات سناتے وقت ان کا چہرہ فرط مسرت سے تمتمایا ہوا تھا۔

اگلی تاریخ پر وکیل مخالف نہ تو کوئی بحث کرسکا اور نہ ہی کوئی صفائی پیش کرسکا۔اس لیے فیصلہ اہل سنت کے حق میں ہو گیا۔فالحمد للہ علیٰ ذالك۔

اس تعلق سے مزید تفصیلات علاقائی شہرت رکھنے والے وعالم دین مولانا حفیظ اللہ صاحب اشرفی بانہ و مہتمم دارالعلوم غریب رواز ڈومریا گنج ضلع سدھارتھ نگر کے پاس بھی ہونا چاہیے۔اس واقعہ کو بھی تقریباً پندرہ برس یا اس سے زائد ہو چکے ہوں گے۔

اعلیٰ حضرت مجدد اعظم سیدنا امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان نے ہر طرح کی بدعقیدگی کے ماحول میں اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔ اہل سنت و جماعت کی آبیاری کی۔ وہابیت، لادینیت، بیدینیت، بدعات و منکرات کے ردو استیصال میں ایک تاریخ ساز کارنامہ انجام دیا عشق رسول کی بے مثال تبلیغ فرمائی۔حب رسول اور روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے قلوب میں جاگزیں کیا انہیں راسخ العقیدہ مسلمان بنانے اور بنے رہنے کے لیے زبردست جدو جہد فرمائی۔ دین وسنیت کی بقاو دفاع، حفاظت وصیانت دینی دنیوی واخروی فلاح ونجات کے لیے عربی اردو و فارسی زبانوں میں کم وبیش ۶۵ علوم وفنون پر ایک ہزار کتابیں تصنیف فرمائیں آپ کی جلالت علمی، بے پناہ علم وفضل اور عبقریت کے سامنے دنیا بھر کے ارباب فضل وکمال بالخصوص حرمین طیبین کے جلیل القدر علماء ومشائخ نے ان کے احترام عقیدت میں اپنی اپنی گردنیں جھکادیں اور انہیں دین حنیف کا مجدد، اسلام کا رجل رشید اور اہل سنت و جماعت کا امام تسلیم کیا بے شک وہ ہندوستان میں فقہ اسلامی بالخصوص فقہ حنفی اور اس کے جزئیات کے سب سے بڑے عالم ہی نہیں بلکہ اس کے امام و مجتہد بھی ہیں۔وہ مسلکاً حنفی مشرباً قادری اور یہاں ہندوستان میں غوث اعظم محی الدین جیلانی کے نائب اکبر تھے۔ ؎

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

سرکار مجاہد ملت حضرت مولانا شاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمہ کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت یہاں ہندوستان میں سرکار غوث وخواجہ و جملہ بزرگان دین سے حسن اعتقاد رکھتے۔ اور انہیں دل وجان سے ماننے والے مسلمانوں کی تنظیم ہے جو اس حقیقت صادقہ کا اعلان کرتی ہے کہ پوری دنیا کے خوش عقیدہ مسلمان صرف اہلِ سنت و جماعت ہیں۔ بالخصوص برصغیر ہندو پاک، بنگلہ دیش و نیپال کے صرف سنّی ہیں جن کے مقتدا شیخ محقق حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلوی، امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، مولانا شاہ عبد العزیز دہلوی، مجاہد حریت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی، حضرت علامہ شاہ فضل رسول بدایونی، حضرت سید شاہ آل رسول مارہروی اور ان سب کے علمی و دینی وفکری عظمتوں کے وارث وامین مقتدائے اہل سنت اعلیٰ حضرت مجدد دین وملت مولانا شاہ امام احمد رضا بریلوی ہیں اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا اعتقادی و فکری مرکز بریلی شریف ہے جو اعلیٰ حضرت بریلوی کا وطن مالوف اور ان کی جلوہ گاہ ناز ہے۔

بریلوی جو ایک خطرناک منصوبے کے تحت مخالفین اہل سنت کا دیا ہوا ٹائٹل ہے جس سے ہم دانستہ اور غیر محسوس طور پر خود کو وابستہ کئے ہوئے ہیں اس سے اہل سنت کا کچھ لینا دینا نہیں ہے بیشک وہ سنی بریلوی ہے جس کا وطن بریلی یا جس کا ضلع بریلی ہو جیسے حضرت حسن بریلوی، حضرت نیاز بریلوی، حضرت شمس بریلوی، حضرت رضا بریلوی وغیرہ جیسا کہ مقتدائے اہل سنت حضرت علامہ اختر رضا خاں ازہری بریلوی نے بہت پہلے قاضی حرم کے اس سوال کہ ''کیا آپ بریلوی ہیں؟'' کے جواب میں بڑے پر اطمینان انداز میں فرمایا تھا کہ

''میں اہلِ سنت و جماعت کا ایک فرد ہوں، البتہ بریلی میرا وطن ہے۔''

ہم پرورشِ لوح وقلم کرتے رہیں گے　　　دل پر جو گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اَلْحَقُّ مُرٌّ ایک آفاقی حقیقت ہے جس سے ہم آنکھیں بند نہیں کر سکتے۔ ہم ہندوستانیوں کا ایک المیہ ہے کہ ہم ہر چیز عقیدت کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اپنے محسوسات کے غیر جانبدارانہ وحق پسندانہ اظہار و اعتراف میں ہم بز دل ہی نہیں بلکہ تنگ دل ہیں۔ جبکہ عقیدت کی آنکھ صرف حسن ہی دیکھ سکنے پر قادر ہے مگر نقد ونظر میں حسن عقیدت کا گذر نہیں یہ تو ایسی کسوٹی ہے جہاں پر بے رحم حقیقتوں کا ہی سورج طلوع ہوتا ہے اور اگر صاحب نقد ونظر کسی عصبیت کے زد پر نہ ہو تو پھر یہاں اعلیٰ حضرت بریلوی کئی صدیوں میں تنہا اور ہر صدی کے امام نظر آتے ہیں۔

لیس علی اللہ لمستنکر　　　ان یجمع العالم فی واحد

بقول علامہ کوثر نیازی:

''برصغیر میں یوں تو کئی جامع الصفات شخصیات گذری ہیں مگر جب ایک غیر جانبدار مبصر ان سب کا جائزہ لیتا ہے تو جیسی ہمہ صفت شخصیت امام احمد رضا کی نظر آتی ہے ویسی کوئی دوسری نظر نہیں آتی۔''

(امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت صفحہ ۴ معارف نعمانیہ لاہور ۱۹۹۰ء)

ایسی ہمہ صفت وجامع الصفات شخصیت جونعمت الٰہیہ بھی تھی اسے ہم ان حلقوں اور مقامات تک ابھی نہیں پہنچا سکے ہیں جسے پڑھا لکھا حلقہ یا جدید دانش کدہ کہا جاتا ہے ویسے ہم نے رضویات پر دریا تو ضرور بہائے مگر صرف اپنے گھروں میں۔ہم نے اعلیٰ حضرت کو بار بار انہیں حلقے اور انہیں جگہوں تک پہنچایا ہے جہاں وہ پہلے ہی پوری عظمت وجلال کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ہم انہیں ان قابلِ ذکر افراد تک نہیں پہنچا سکے جو اعلیٰ حضرت کو نہیں جانتے یا سوئے ظنی کے شکار ہیں یا الزام تراشیوں سے متاثر ہیں۔یا منفی انداز میں جانتے ہیں وجہ جو بھی ہو خواہ ان حلقوں تک پہنچنے کا طریقہ نہ معلوم ہو یا ان تک اعلیٰ حضرت کے افکار ونظریات پہنچانا ضروری نہ سمجھا گیا ہو یا اس خوف سے کہ کہیں اعلیٰ حضرت صحیح قدر دانوں تک نہ پہنچ جائیں اور اپنے ''واندے'' ہو جائیں یا اس راہِ محبت میں کسی طرح کا کوئی مصنوعی تقدس حائل ہو جس سے وضو وغسل اور نکاح کو خطرات لاحق ہوں مگر بار ہا کا مشاہدہ وتجربہ یہ ہے کہ وہی مصنوعی اربابِ تقدس اپنے نام ونمود وذاتی مفاد کے لیے ان حدود کو دیدہ ودانستہ پامال کرتے ہوئے ہم جیسے رند مشربوں کو حیرت کے اتنے جھٹکے دے ڈالتے ہیں کہ ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے۔اور خاص کر ویڈیو کیمرہ ٹی وی جدید الکٹرانک میڈیا اور دیگر منہیات پر اس وقت بلند آواز سے لاحول اور توبہ واستغفار پڑھتے ہیں جب ان کی دلی خواہش اور خاموش اجازت سے کیمرہ چل چکا ہوتا ہے اور کیمرہ مین اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں۔

شیخ صاحب تمہاری بھی اچھی کٹی خوب سجدے کیے خوب دھو کے دیئے

حال ہی میں ۱۲ر محرم الحرام ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۶ر مارچ ۲۰۰۳ء بروز اتوار شام ۴ر بجے آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی کی جانب سے ایک علمی وادبی نشست کا اہتمام بہ عنوان ''امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت'' انجمن اسلام کے اکبر پیر بھائی ائر کنڈیشن ہال میں ہوا۔انجمن اسلام کو اب ایک یونیورسٹی کا درجہ مل چکا ہے جس کے دور ونزدیک تمام شعبوں میں پھیلے ہوئے طلباء کا تعداد اسی (۸۰) ہزار ہے جس میں پینتالیس ہزار صرف طالبات ہیں۔انجمن اسلام کی یہ حیرت انگیز ترقی ماہر تعلیم اور متعدد بار ریاستی حکومت میں کیبنٹ منسٹر رہے عالی جناب ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ صدر انجمن اسلام کی ذاتی دلچسپی ان کی مساعی جمیلہ اور ان کی پرسحر شخصیت کے رہین منت ہے۔بیشک ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے مسلم بچوں اور بچیوں کے لیے تعلیمی میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ بھی موجودہ حالات کے متعصّبانہ تناظر میں جس پر صرف حیرت کی جاسکتی ہے اور آئے دن وہ انجمن اسلام کی تعمیر وترقی کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

آل انڈیا تبلیغ سیرت کے اس علمی وادبی نشست کی صدارت ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب نے فرمائی مہمان خصوصی تھے الجامعۃ الاشرفیہ مبارکپور کے نائب ناظم تعلیمات حضرت علامہ محمد ادریس بستوی صاحب اور خدمت خلق وانسانیت کے محسوس پیکر آل انڈیا خلافت کمیٹی،خلافت بی ایڈ کالج،مہاراشٹر کالج کے سکریٹری اور ان قومی اداروں کے روح رواں میرے مخلص دیرینہ اور آل انڈیا تبلیغ سیرت کے خصوصی کرم فرما محترم ڈاکٹر ایم اے عزیز صاحب ایم ایل سی وچیئر مین

وقف بورڈ آف مہاراشٹر اسٹیٹ جس میں خصوصی خطاب کے لیے زحمت دی گئی تھی محبّ گرامی وقار محترم ڈاکٹر حسن رضا خاں ایم اے پی ایچ ڈی ڈائرکٹر شعبۂ تحقیقات عربک اینڈ پرشین تو نیورسٹی بہار کو۔

موصوف جماعت اہل سنت کے وہ خوش نصیب شخصیت ہیں جنہوں نے پوری دنیا میں سب سے پہلے اعلیٰ حضرت امام اہلِ سنت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان پر پی ایچ ڈی کی سعادت حاصل کی اوران کا یہ آغاز اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ اس کے بعد ہی دنیا کے کئی براعظم کے جدید و عظیم دانش کدوں سے اعلیٰ حضرت پر پی ایچ دی کرنے والوں کی ایک لائن لگ گئی جسے انگلیوں پر گنا نہیں جاسکتا۔ بلکہ اس کے لیے باقاعدہ ایک فہرست مرتب کرنی پڑے گی۔ ڈاکٹر حسن رضا خان نے یہ کارنامہ اس اور ایسے ماحول میں انجام دیا تھا جب یونیورسٹیز کے کلیدی عہدوں پر امام احمد رضا کے حریفوں کا قبضہ ہوا کرتا تھا اور اس طرح کے دانشکدوں کے دروازے امام مظلوم پر سختی کے ساتھ بند تھے۔

این کار راز تو آید و مرداں چنیں کنند

اس علمی و ادبی اجلاس کے خصوصی سامعین میں ممبئی و مضافات ممبئی کے علماء وائمہ مساجد، اہل سیاست وصحافت اور قدیم وجدید دانش کدوں کے ذمہ داروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ نظامت راقم الحروف وارث جمال قادری کے ذمہ تھی۔ اس خالص علمی اجلاس کا آغاز تلاوت کلام مجید سے ہوا۔ شبنم بستوی نے نعت پاک پیش کی پہلا خطاب اس اجلاس کے مہمان خصوصی حضرت علامہ ادریس بستوی (جن کا علم وفضل تدبر و دانشمندی اور سیاسی شعور اپنوں، غیروں سبھوں کو مسلم ہے) کا ہوا آپ نے اپنے خطاب میں اعلیٰ حضرت کے سیاسی خدمات کا تاریخی جائزہ لیا اور اس وقت کے تاریک نازک ایام میں اعلیٰ حضرت نے جوامت مسلمہ کی سیاسی رہنمائی جس دلسوزی کے ساتھ کی تھی اس کا تذکرہ قدرے تفصیل سے کیا۔ بالخصوص خلافت کمیٹی اور اس کے حقیقی سرپرستوں وسربراہوں کی مضرت رسانیوں اور مسلمانوں کے تعلق سے ان کی منفی جذباتیت کا احتساب اور ان کا تاریخی تعاقب حالات وواقعات کے پس منظر میں ۳ نکاتی فارمولہ بیان کیا تو وہاں موجود ارباب علم ودانش بالخصوص اہل سیاست کے حیرت واستعجاب کی حد نہ رہ گئی۔

علامہ ادریس بستوی کے بعد ہی اس اجلاس کے خصوصی خطیب جو شہر علم ودانش پٹنہ سے چل کر آئے تھے وہ مائک پر تشریف لائے اپنے مخصوص محققانہ انداز میں (جس کے لیے وہ شہرت بھی رکھتے ہیں) اعلیٰ حضرت کے حیات وخدمات پر لب کشا ہوئے تو رنگ وآہنگ کا موسم ہی کچھ کا کچھ ہو گیا سامعین آئینۂ حیرت بنے ہوئے اعلیٰ حضرت کے عبقریت کا وہ رخ ملاحظہ کررہے تھے جس سے ہمارے خطیب علی العموم دور ہی دور رہتے ہیں اور سامعین جو خواص ہی تھے گویا وہ آنکھوں سے سن رہے تھے۔ ڈاکٹر حسن رضا خاں نے دوران خطاب سامعین سے ایک مخلصانہ اپیل بھی کی کہ یہ عظیم دانش کدہ جہاں ہم اور آپ بیٹھے ہیں اس میں آل انڈیا تبلیغ سیرت کی مخلصانہ کوششوں سے گوشۂ امام احمد رضا قائم ہو چکا ہے۔ جس کے اندر کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے بالخصوص فتاویٰ رضویہ کی ساری جلدیں اور بیس جلدیں مع حواشی وتعلیقات بھی موجود ہیں۔ میں آپ کا مہمان ہوں اور بڑی دور سے آیا ہوں یہاں سب اہلِ نظر ہیں اہلِ علم موجود ہیں یہ کوئی عوامی اجلاس نہیں بلکہ

ایک بڑا ہی علمی و ادبی خصوصی اجلاس ہے آپ سب سے میری گذارش ہے کہ آپ امام احمد رضا کو پڑھیں انہیں مانیں یا نہ مانیں۔ پڑھنے کے لیے ماننا کہاں ضروری ہے آپ نے ان کے بارے میں اوروں سے کیا سنا کیا پڑھا اسے چھوڑ دیں آپ براہ راست انہیں پڑھیں انہیں سے سنیں تا کہ "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے مصداق ہو جائے۔

انہوں نے سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مثال دیتے ہوئے ان کے واقعات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب اس عظیم دانشور کی طرح غیر جانبدار رہو کر آپ اعلیٰ حضرت کو پڑھیں گے تو انہیں کی طرح آپ اعلیٰ حضرت سے محبت بھی کرنے لگیں گے اور انہیں کی اتباع میں چہرہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جگمگانے لگے گا۔ آپ پانچ وقت کے نمازی ہو جائیں گے اور جوں جوں آپ اعلیٰ حضرت کو کھلے ذہن سے پڑھتے جائیں گے تو محسوس یوں ہوگا کہ "ہر آن نیا طور نئی برق تجلی"

پھر ان شاء اللہ اس راہ محبت میں آپ کا مرحلۂ شوق کبھی طے ہی نہیں ہوگا۔ ؎

اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا

ڈاکٹر حسن رضا خاں کے بعد ممبئی کی مشہور سیاسی سماجی شخصیت اور اس علمی اجلاس کے دوسرے مہمان خصوصی ڈاکٹر ایم اے عزیز صاحب نے اپنے تاثرات کا اظہار بڑی خوشگوار حیرت کے ساتھ کیا اور فرمایا کہ ہم آل انڈیا تبلیغ سیرت کے بے حد شکر گزار ہیں جو اس نے یہ موقع فراہم کیا اور اعلیٰ حضرت کے بارے میں اتنی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئی اور خاص کر خلافت کمیٹی کی غلط روش پر اتنے بڑے بڑے قومی سطح کے لیڈران اور وقت کے جید علما کرام کا شدید دینی و علمی و شرعی گرفت اور ان کا تاریخی احتساب کیا۔ ہمیں انتہائی مسرت ہوئی یہ معلوم کر کے کہ ہمارے اس ملک میں اتنی عظیم الشان ہستی بھی گذری ہے۔ ہم اعلیٰ حضرت کا نام سنتے ضرور تھے مگر اعلیٰ حضرت کو آج سے پہلے اس طرح سے نہیں جانتے تھے جیسا کہ آج جانا۔

بہت پہلے جس خلافت کمیٹی کے نظریات کے خلاف مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لیے وہ میدان عمل میں اترے تھے اتفاق سے اسی خلافت کمیٹی کا میں ایک بڑا ذمہ دار ہوں اور خلافت کمیٹی اس وقت میرے ہی ہاتھوں میں ہے جس کے چیئرمین محترم ڈاکٹر رفیق زکریا ہیں۔ بیشک وہ خلافت کمیٹی آج مسلمانوں کا ایک بڑا تاریخی ورثہ ہے۔ خلافت ہاؤس آج بھی مسلمانوں کی امانت ہے جس میں خلافت کمیٹی کا دفتر اور اسی میں مسلم بچوں اور بچیوں کے بی ایڈ کالج قائم ہیں۔

آل انڈیا خلافت کمیٹی کی طرف سے سال میں عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر ایک بڑا تاریخی جلوس بھی نکلتا ہے جو غالباً دنیا کا سب سے بڑا تاریخی جلوس ہوتا ہے جس کی قیادت برسوں سے علماء کرام کرتے آرہے ہیں۔ میں انشاء اللہ خلافت کمیٹی کی طرف سے آل انڈیا تبلیغ سیرت کے تعاون سے اسی نوعیت کا ایک بڑا اجلاس خلافت ہاؤس کے وسیع و عریض ہال میں خود رکھوں گا جس میں ملک کی مشہور علمی و ادبی و سیاسی شخصیتیں شرکت فرمائیں گی اور اعلیٰ حضرت پر جس نوعیت کے اجلاس کا آغاز آل انڈیا تبلیغ سیرت نے کیا ہے اسے بڑی وسعت و ہمہ جہتی دی جائے گی۔

آخر میں صدر اجلاس معمارِ قوم عالی جناب ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا صاحب (جنہوں نے اس اجلاس کے لیے ناچیز راقم الحروف پر بڑا فراخ دلانہ تعاون پیش فرمایا) نے اپنے خطبۂ صدارت میں اور پیش رو مقررین کے خطاب پر اعلیٰ حضرت کے تعلق سے اپنا تاثر اور خوشی و مسرت سے لبریز اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کیا اور اعلیٰ حضرت کے لیے انجمن اسلام کی طرف سے اپنے اس فراخدلانہ پیش کش کو پھر دہرایا جو تقریباً ایک سال قبل ''گوشۂ امام احمد رضا'' کے قیام کے وقت انجمن اسلام کے اسی ہال میں ایک علمی اجلاس میں اعلان کیا تھا کہ ہمارے یہاں اعلیٰ حضرت پر مسلسل پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے ساری سہولیات میسر کی جائیں گی۔ اور ہماری نہ صرف خواہش بلکہ یہ کوشش ہوگی کہ انجمن اسلام سے لوگ اعلیٰ حضرت پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری لیتے رہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ انجمن اسلام جو پورے ملک بالخصوص اہل مہاراشٹر کے مسلمانوں کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جس کے شعبۂ تحقیقات میں تقریباً دو لاکھ کتابیں مختلف علوم وفنون میں موجود ہیں۔ ممبئی جو سنی مسلمانوں کا گڑھ اور سنیوں کا شہر سمجھا جاتا ہے اور پورے ملک میں اعلیٰ حضرت کا جھنڈا ابھی اسی شہر میں سب سے زیادہ بلند ہے مگر اتنے بڑے قیمتی و علمی ذخیرے میں نہ تو اعلیٰ حضرت کی کوئی کتاب تھی نہ ان کی ذات پر کوئی معمولی سا لٹریچر۔ ایک انجمن اسلام ہی کیا غالباً ممبئی کے کسی بھی اس طرح کے دانش کدہ میں رضویات کے تعلق سے کچھ بھی نہیں ہے مگر بحمدہ تعالیٰ اس وقت انجمن اسلام کے شعبۂ تحقیقات کے ''گوشۂ امام احمد رضا'' میں ایک قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔

فتاویٰ رضویہ کی بارہ مکمل جلدوں اور اس پر حواشی و تعلیقات کی بیس جلدوں کے ساتھ! جس کے لیے شکریئے اور دعاؤں کے مستحق مولانا سید سراج اظہر صاحب امام مسجد پھول گلی ممبئی ۳ ہیں۔ جس وقت انجمن اسلام میں ''گوشۂ امام احمد رضا'' قائم ہوا تھا اسی وقت اس تعلق سے انجمن اسلام کے اکبر پیر بھائی ہال ہی ایک علمی جلسے کا انعقاد ہوا تھا جس میں خصوصی خطاب کے لیے قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند کے مطابق یہ سعادت راقم وارث جمال قادری کے حصے میں آئی تھی چوں کہ اس خالص علمی جلسے میں ایک بڑی تعداد ان ارباب دانش کی تھی جو اعلیٰ حضرت کے خلاف غلط فہمیوں اور پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی وجہ سے سوئے ظنی کے شکار تھے جنہیں ہر حال میں غالب کا طرفدار سمجھا جاتا رہا۔ اس لیے اقتضائے حال کے مطابق ہم نے اعلیٰ حضرت کی عظمت و جلالت اور اہل کمال کے درمیان ان کی انفرادیت وعبقریت اور ان کے وجود و حیرت کا تذکرہ اسی طبقے کے جید و نامور اہل علم کے حوالے سے شروع کیا جو ان کے نزدیک مسلم الثبوت ہیں اور جن پر ان کا زبردست اعتقاد اور اذعان ہے کہ ''مستند ہے ان کا فرمایا ہوا۔'' یعنی مولانا علی میاں ندوی صاحب کے والد مولانا حکیم عبدالحئی رائے بریلوی، مشہور غیر مقلد (اہل حدیث) عالم اور انگریزی، عربی، ملیالم زبانوں میں دو سو کتابوں کے مصنف پروفیسر محی الدین الوائی استاذ جامعہ ازہر شریف مصر، ماضی قریب کی بے حد جانی مانی علمی و ادبی شخصیت مولانا کوثر نیازی وغیرہ اور آخر میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علم و فضل ان کے زبیری خاندان کی نجابت کا پس

منظر مسلم تونیورسٹی کے لیے ان کے تاریخی خدمات اور شخصیات ورجال کے درمیان ان کے بلند قامتی کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں ان کا رجوع واعتراف اور پھر آپ کی ذات سے ان کی عقیدت ومحبت اور ان کی اتباع پر گفتگو ختم کی چونکہ اس طرح کے جدید دانش کدوں وہ بھی ارباب علم ودانش کے درمیان اعلیٰ حضرت پر گفتگو پہلی بار ہوئی تھی وہ بھی عربی زبان کے طویل طویل اقتباسات پھر ان کے تراجم اور مضبوط حوالوں کے ساتھ اس لیے وہ پوری مجلس علمی آئینۂ حیرت بنی ہوئی تھی کہ مذکورہ بالا شخصیات کے گرانقدر خیالات واعترافات نے گفتگو کو بہت باوزن کر دیا۔ اور اعلیٰ حضرت کے پیکر کی جودلنواز تصویر ان کے ذہن وفکر میں نئے سرے سے مرتسم ہوئی تو گویا۔ ؎

دیکھ کر ان کی تصویر کو! آئینہ بن کے ہم رہ گئے!

اجلاس کے اختتام پر کئی اہل نظر نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھے مبارکباد دینے اور ہاتھ ملاتے ہوئے شکریے اور دعاؤں سے نوازا اور یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے مولانا آپ نے تو ہماری آنکھیں کھول دیں۔ حضرت امام احمد رضا کے تعلق سے اس طرح کی باتیں پہلی بار سامنے آئی ہیں۔ اس نوعیت کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے تا کہ اتنی عظیم و بلند قامت شخصیت کے تعلق سے بدگمانیاں وغلط فہمیاں دور ہوں۔

صدر انجمن اسلام عالی جناب ڈاکٹر جمخانہ والا صاحب اس علمی اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے۔ کنوینر مولانا سید سراج اظہر صاحب تھے شرکت خصوصی علامہ قاضی مفتی اشرف رضا صاحب قادری رضوی نے فرمائی اور افتتاحی خطاب بھی فرمایا۔

وہ میرے خطاب کے درمیان ایسے آئینۂ حیرت بنے ہوئے تھے کہ جسم کی ساری حسیات جیسے آنکھیں بن گئی ہوں۔ میری تقریر کے بعد بالآخر جب وہ صدارتی خطاب کے لیے کھڑے ہوئے تو اظہار حیرت سے خود کو روک نہ سکے۔ اپنے صدارتی خطاب کا آغاز بھی انہیں کلمات سے کیا کہ ابھی ابھی مولانا وارث جمال قادری صاحب نے حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان پر عربی زبان میں جو تقریر کی اور ساتھ ہی اس کا ترجمہ بھی کیا اور بڑے بڑے جید علمائے کرام کے مضبوط حوالوں سے امام صاحب پر جو گفتگو فرمائی اس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا مجھے تو یہی نہیں معلوم تھا کہ مولانا علی میاں کے والد بھی مولانا تھے جو نہ صرف مولانا بلکہ بقول مولانا وارث جمال قادری وہ اپنی جماعت کے ایک بہت بڑے عالم اور مشہور عربی اسکالر تھے کہ ان کے علمی وقلمی خدمات علی میاں سے کئی گناہ زیادہ ہیں۔ کہ مولانا علی میاں کی تمام عربی کتابیں ایک پلڑے میں رکھ دی جائیں اور دوسرے پلڑے میں صرف ان کی ایک کتاب (نزہۃ الخواطر) رکھ دی جائے تو اسی ایک کتاب کا پلڑا بھاری ہوگا اور جب ایسے ایسے جید عالم وعظیم اسکالر امام صاحب (اعلیٰ حضرت) پر ایسی گرانقدر رائے رکھتے ہوں جیسا کہ ابھی مولانا نے بتایا اللہ اکبر! تو پھر ہما شما کی بساط ہی کیا۔ البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ ایسی عظیم ہستی کا اس انداز میں تعارف پہلی بار ہوا اور اتنے عرصے تک ہم ان کی عظمتوں سے غافل وبے خبر رہے۔ پھر انہوں نے بڑے جذبے کے ساتھ فرمایا "میں بحیثیت صدر انجمن "امام احمد رضا میموریل لکچر" اور ساتھ ہی انجمن اسلام میں "امام احمد رضا ریسرچ

سینٹر'' کا اعلان کرتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت پر ریسرچ کرنے والوں کو یہاں انجمن اسلام میں ساری سہولتیں مہیا کی جائیں گی اور ہمیں اس بات سے بے حد خوشی ہے کہ ہمارے یہاں سے لوگ ہر سال اعلیٰ حضرت پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لیں۔

فالحمد للہ علیٰ ذالك

۱۲ر محرم ۱۴۲۴ھ مطابق ۱۶ر مارچ ۲۰۰۳ء کا مذکورہ بالا پروگرام ''امام احمد رضا ایک ہمہ جہت شخصیت'' آل انڈیا تبلیغ سیرت کی طرف سے منعقد ہوا تھا اس مبارک سلسلہ کی پہلی کڑی تھی اب ضرورت ہے اس محاذ پر بھی اعلیٰ پر کام کرنے کی۔ ورنہ اپنے گھروں میں عقیدت کے خواہ کتنے ہی دریا بہائیں، محبت کے چشمے جاری کریں وہ اثرات مرتب نہیں ہوں گے جس کی آج شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ان خطوط پر کام نہیں ہوا اور نہ اس انداز پر کام ہو پا رہا ہے جیسا کہ ''مملکت خداداد'' میں ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں کام کم نمود زیادہ ہے اور اس لیے بھی عقیدت کے اس بیجا نمائش کے لیے ہمیں وافر مقدار میں ''را''میٹریل بھی فراہم ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا نام اس وقت ایسا بیریئر چیک بن چکا ہے جو ''اتوار'' کے دن بھی کیش ہو سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم عقیدت کی بیجا نمود میں ان حدوں کو آئے دن پامال کرتے رہے ہیں جسے خود امام اہلِ سنت نے قائم فرمایا تھا۔

آپ ہی کا فتویٰ ہے کہ ''اگر کسی مزار شریف پر ایک چادر چڑھی ہوئی ہو تو دوسری چادر چڑھانا اسراف ہے۔'' مگر ہم اہلِ عقیدت آج ان کے نام پر، ان کی یاد میں اپنی عقیدت کی انفرادیت کے بیجا مظاہرہ کے لیے اسراف کے ایسے تاج محل تیار کرتے ہیں کہ ہر طبقے کے اہل نظر ہماری عقیدت کے اس نمود کا استہزاء کرتے ہیں اور ہماری فکری بے مائگی اور منفی سوچ کے مظاہرے پر رحم بھری نگاہ ڈالتے ہوئے افسوس کرتے ہیں۔

بریں علم و دانش بہ باید گریست

مولیٰ عزوجل اپنے حبیب رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ و طفیل اپنے حبیب کے عاشق صادق اعلیٰ حضرت امام عشق و محبت تاجدار اہل سنت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ سے ہمیں سچی عقیدت و محبت اور ان کی سچی اتباع کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین بحق طہٰ و یٰس۔

اللہ جسے توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

وما توفیقی الا باللہ وھو حسبی و نعم الوکیل نعم المولیٰ و نعم النصیر۔

منم آں قطرۂ شبنم بہ نوک خار می رقصم

☑☑☑☑☑☑

ایک بے حد ضروری التماس

میں نوائے سوختہ درگلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو
میں حکایت غم عاشقی تو حدیث ماتم دل بری

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بعد اس امت مسلمہ پر سب سے زیادہ احسانات اگر کسی کے ہیں علماء، فقہا، محدثین و مجتہدین کا جن کی بے لوث خدمات و بے پناہ قربانیوں کی بدولت اسلام اپنے پورے کلیات و جزئیات کے ساتھ پورے طور پر محفوظ حالات میں ہم تک پہنچا اور اس مقدس جماعت میں سب سے و نا قابل فراموش احسانات و خدمات اور امت مسلمہ کی فلاح ونجات کے لیے حیرت انگیز و ایثار قربانیاں! فخر عجم، رشک عرب امام الائمہ، سراج الاُمّۃ حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے تلامذہ در تلامذہ و اصحاب کا ہے امت مسلمہ کی گردنیں تاقیامت جن کے احسانات کے تلے ہمیشہ ہمیشہ جھکی رہیں گی۔ ؎

اے دہر ہم سے چاک قباؤں کا دن منا
سو آفتاب جن کے گریباں سے آئے ہیں

يَجِبُ عَلٰى اَهْلِ الْاِسْلَامِ اَنْ يَّدْعُوا اللهَ لِاَبِيْ حَنِيْفَةِ فِيْ صَلَوَاتِهِمْ لِحَفْظِهٖ عَلَيْهِمُ السُّنَّةَ وَالْفِقْهِ. (تبیض الصَّحِیْفَہ فی مناقب ابی حنیفہ ۔حضرت امام جلال الدین سیوطی شافعی)

''مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنی نمازوں میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے لیے دعا کریں کہ انہوں نے سنن وفقہ کی حفاظت فرمائی۔'' بیشک دنیا بھر کے مسلمانوں پر حضرت سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ کا یہ احسان عظیم ہے کہ تنہا انہوں نے اپنے تلامذہ کو لے کر بغیر کسی مالی تعاون اور سرکاری امداد کے قرآن وسنت و اقوال صحابہ نیز اپنے اور اپنے باکمال تلامذہ کے قیاس واجتہاد کے ذریعہ ایک ایسا جامع اسلامی قانون بنادیا جو قیامت تک کے مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے اسی اسلامی قانون کو فقہ حنفی کہا گیا جسے ہم ''مذہب حنفی'' کے نام سے جانتے ہیں اور اسی پر عمل پیرا بھی ہیں اور قیامت تک مسلمانوں کا سواد اعظم اسی پر عمل پیرا رہے گا۔

لیکن ادھر ہم ایک طویل عرصے سے دیکھ رہے ہیں کہ دین کے ان ستونوں اور امت مسلمہ کے ان عظیم محسنوں یعنی سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ اور ان تلامذہ خاص جو فقہ حنفی کے تدوین میں اپنے عظیم وجلیل استاد کے شانہ بشانہ رہے۔ حضرت قاضی امام ابویوسف، حضرت امام محمد بن حسن شیبانی، حضرت امام زفر بن ہذیل، حضرت عافیہ بن یزید، حضرت عبداللہ بن مبارک، حضرت یحییٰ بن سعید قطان، حضرت وکیع بن جراح، حضرت یحییٰ بن زکریا، حضرت امام داؤد طائی وغیرہ وغیرہ کو تقریباً بھول چکے ہیں ان سے ہمارا کوئی ظاہری تعلق و وابستگی کا مظاہرہ تقریباً نہیں کے منزل میں ہے، ہماری وابستگی کا عملی

مظاہرہ فقط چند محسنوں، بزرگوں اور چند عدد اعراس مقدس تک محدود ہو کر رہ گیا جن میں ماضی قریب کے چند پیران طریق اور اپنے باپ دادا کو اسلاف و اساطین امت کے شانہ بشانہ اور کبھی ان سے بھی چار قدم آگے کھڑا کرنے میں ہم بہت مصروف ہو گئے اور اس تگ و دو میں ہم قوم کا سرمایہ بڑی بے دردی و بے رحمی کے ساتھ خرچ کر رہے ہیں۔ کسی طرح کی احساس مسئولیت کے بغیر!

بے شک اپنے عظیم ترین اسلاف کے تعلق سے ہمارا اغماض وسکوت! اب سکوت مجرمانہ کے حدوں میں داخل ہو گیا ہے۔

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں　　　خامشی ان کی مجرمانہ ہے

آج عوام اہل سنت ہی نہیں بلکہ خواص کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جو اپنے دین کے تمام ارکان تو مذہب حنفی کے مطابق ادا کرتے ہیں مگر انہیں امام اعظم ابو حنیفہ کی ہی خبر نہیں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ حنفیت کیا چیز ہے۔ اور جو ہم دین کے ارکان یعنی عبادات سے لے کر معاملات تک نماز، روزہ، حج، زکوۃ، نکاح، طلاق، خلع، ایلاء، ظہار، قضائے قاضی اور دنیا کے معمولات پر عمل پیرا ہیں معالات، تجارت، اصول تجارت، معاشرت، قرض، ادئیگی قرض، لین دین، حقوق ہمسایہ وغیرہ کا اصل سر چشمہ کہاں ہے؟ ایک قدم اور آگے بڑھ کر دینی درسگاہوں سے دستار فضیلت لے کر نکلنے والے فارغین سے فقہ حنفی کے مالہ وما علیہ امام اعظم ان کے تلامذۂ خاص اور فقہاء حنفیہ کے بارے میں پوچھ لیا جائے تو ان میں ایک اچھی خاصی تعداد ہر طرف دیدہ حیرت زدہ تکتا کیا ہے؟ کے مصداق نظر آئے گی۔

کوئی ڈھٹائی تو دیکھے میرے تمنا کی
بہشت گود میں آجائے اور امتحاں بھی نہ ہو

بے شک ہم فکری واعتقادی کے طور پر حضرت خواجہ خواجگان عطائے رسول خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ نظام الدین دہلوی، امام ربانی مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، محقق علی الاطلاق حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی، حضرت شیخ عبد العزیز مجدد و محدث دہلوی، حضرت شاہ غلام علی نقشبندی دہلوی، حضرت شاہ احمد سعید مجددی رامپوری، مجاہد حریت امام الحکمت حضرت شاہ فضل حق خیر آبادی، بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد العلی فرنگی محلی، حضرت علامہ شاہ فضل رسول عثمانی بدایونی، حضرت سید شاہ آل رسول مارہروی، حضرت علامہ نقی علی خاں، حضرت غلام دستگیر قصوری لاہوری، تاج الفحول حضرت علامہ شاہ عبد القادر بدایونی، اعلی حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی، شیخ المشائخ حضرت سید شاہ علی حسین اشرفی جیلانی کچھوچھوی، شیخ الاسلام حضرت شاہ انوار اللہ فاروقی حیدر آبادی، صدر الافاضل امام الہند حضرت علامہ سید شاہ نعیم الدین مرادآبادی، مفتی اعظم ہند حضرت مولانا مصطفی رضا خاں بریلوی علیہم الرحمۃ والرضوان کے جاننے ماننے اور ان سے حسن اعتقاد اور ان سے عقیدت ومحبت رکھنے والے لوگ ہیں جو سب کے سب قصر حنفیت ہی کے ستون ہیں۔

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے دل سے کہہ دی
بات چل نکلی ہے اب دیکھو کہاں تک پہنچے

سوادِ اعظم اہلِ سنت و جماعت کے سالار قافلہ اور کروڑوں کروڑ مسلمانوں کے مرکز عقیدت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی تو برصغیر ہند میں سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نائب اکبر اور اپنے زمانے سے لے کر اس زمانے تک فقہ حنفی کے ایک بڑے امام بھی تھے، جنہوں نے ''العطایا النبویۃ فی الفتاویٰ الرضویہ'' کی تیس جلدوں اور جد الممتار کی پانچ جلدوں کے ذریعے فقہ حنفی میں گراں قدر اضافہ فرمایا۔ فقہ حنفی میں جس کی عدیم النظیری کئی صدیوں کا احاطہ لیے ہوئے ہے اور شہرستان علم وفضل میں یندر نظیرہ فی عصرہ فی اطلاع الفقہ الحنفی وجزئیاتہ کا لوائے عظمت دل ونگاہ کو مسخر کیے ہوئے ہے۔

شمیم دل سے پریشاں ہے باغباں کا دماغ
یہی خطا ہے مگر بادِ صبح گاہی کا

اپنے زمانے میں فقہ حنفی اور اس کے جزئیات پر امامت کبریٰ کا منصب پانے کے باوجود اعلیٰ حضرت امام عشق و محبت مقتداء اہلِ سنت مولانا شاہ احمد رضا بریلوی نے اپنے امام! حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کو جس طرح جانا، مانا ان سے عقیدت ومحبت کی اور ان کی اتباع و پیروی کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈالا اور ہر گام پر اپنی حنفیت اور امام اعظم سے اپنی شدید وابستگی کا مظاہرہ کیا۔ زندگی بھر وہ اپنی حنفیت پر نازاں وفرحاں وشاداں ومفتخر رہے حد یہ کہ اپنی مہر میں اپنے نام کے ساتھ سنی، حنفی، محمدی کندہ کرایا۔

پٹنہ بہار میں بدمذہبیت بالخصوص ندوہ کے خلاف سنی لٹریچر کی اشاعت کے لیے اپنے محبوب و جانثار خلیفہ حضرت مولانا نواب عبد الوحید صاحب رئیس اعظم پٹنہ کے ذریعے ایک پریس قائم کیا تو اپنے امام اعظم ابوحنیفہ کی نسبت سے ''حنفیہ پریس'' نام رکھا۔ اور انہیں رئیس اعظم کے ذریعے ایک ماہنامہ جاری کرایا تو اس کا نام ''تحفہ حنفیہ'' رکھا۔ یہ صرف ایک جھلک ہے اعلیٰ حضرت کی اپنے امام، امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے شدید وابستگی کا اور ان سے حسن عقیدت ومحبت کا۔

اس لیے ہم کو امام اہلِ سنت سے عقیدت ومحبت اور ان پر جاں نثاری کا دعویٰ کرنے پر غور کرنا چاہیے کہ اس امرِ عظیم میں ہم نے اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کی اتباع کس حد تک کی۔ کیا ہم نے کبھی ان کی عظمتوں کے تعارف اور ان کے احسانات کے تشکر میں کوئی عملی قدم اُٹھایا، ان کے لیے کوئی کانفرنس کی، اپنے دینی اداروں اور علمی دانش کدوں کا نام ان کے نام پر رکھا؟ ان کی عقیدت ومحبت میں اپنے بچوں کا نام ان کے نام پر رکھا، ان کے یوم وصال دو شعبان المعظم کو ''یوم امام اعظم'' کی حیثیت سے منایا۔ اس تاریخ میں ان کی روح پاک کے ایصال ثواب کے لیے قرآن خوانی، کھانے کا لنگر جاری کیا۔ امت مسلمہ پر ان کے احسانات وخدمات اور قربانیوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھایا۔ اگر کوئی قدم اٹھایا ہے تو سبحان اللہ، ماشاء اللہ، اور اگر نہیں تو پھر ہمیں اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ کہیں ہم اپنے محسن اعظم سے

بے وفائی تو نہیں کر رہے ہیں؟

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ کے پیش نظر کہیں ہمارا نام ناشکروں، واحسان ناشناسوں کی فہرست میں تو نہیں چلا گیا؟ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ثُمَّ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اسی احساس مسئولیت اور بطور فرضِ کفایہ بھی۔ حضور مجاہد ملت حضرت مولانا شاہ حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمہ کی تنظیم آل انڈیا تبلیغ سیرت نے مورخہ ۱۹؍ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ مطابق ۶؍مارچ ۲۰۱۰ء کو کوسہ ممبرا ضلع تھانہ مہاراشٹر جو ممبئی کے مضافات میں جو دس لاکھ مسلم آبادی کا شہر ہے۔ ایک عظیم وتاریخی کانفرنس ''امام اعظم ابوحنیفہ کانفرنس'' منعقد کیا، جس میں بہار و یوپی و ممبئی و مقامی علماء کا ایک بڑا قافلہ جلوہ بار ہوا۔ اور اسی میں راقم الحروف وارث جمال قادری کی کتاب ''امام المسلمین امام اعظم ابوحنیفہ'' تقسیم بھی ہوئی۔ آپ سے محبتانہ التجا ہے کہ ۲؍شعبان کو ''یومِ امام اعظم'' کا نام دے کر اس کا خوب چرچا کریں۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

نازم بعمرے خویش کہ کارے کردم

☑☑☑☑☑☑

سرِ میداں کفن بر دوش دارم
یعنی
ملک کی آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں

غمِ زندگی کی حکایتیں جو شریکِ جرم و خطا نہ ہوں
میں سناؤں قصّہ دردِ دل اگر آپ سُن کے خفا نہ ہوں

اُموی خلیفۃ ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت ۹۲ ہجری مطابق ۷۱۲ عیسوی سے لے کر ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء تک مسلسل چھ سو نوے (۶۹۰) برس تک ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ سلاطینِ گجرات، مالوہ، مانڈو، میسور، سلاطین بہمنہ، شاہانِ عادل شاہی اور شاہانِ نظام حیدر آباد، شاہانِ فاروقی برہان پور، شاہانِ گلبرگہ وغیرہ وغیرہ کو چھوڑ کر صرف پایۂ تخت دہلی پر ۷۶ مسلمان بادشاہوں نے حکومت کی۔ جس کے آخری تاجدار حضرت بہادر شاہ ظفر تھے۔ یہ ہندوستان جس کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کے تقریباً ہزار سالہ عظمت و جلال اور شوکت و اقبال کے نشان ثبت ہیں۔ شرق سے غرب اور جنوب سے شمال تک، سندھ کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر مسلمانوں کی سطوت و جبروت اور اولوالزمیوں کے جھنڈے فضائے بسیط میں لہراتے رہے اور مسلمانوں نے اس خاکِ ہند کو اتنا عروج بخشا کہ زمانے میں اس کا کوئی ہمسر نہ رہ گیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اور اسے اپنے دل کی دھڑکنوں سے لگا کر اور اس پر مر مٹنے کا جذبہ لے کر اسے اتنا مالا مال کر دیا اور اسے ایسی ہمہ جہت ترقی اور حسن عطا کیا کہ پوری دنیا میں اپنی مثال آپ رہا اور قدرت نے اسے اپنی فیاضیوں سے اتنا مالا مال کر دیا کہ دنیا کے سارے برّاعظموں کے حسن و خصوصیات کو اس برصغیر ہند میں رکھ دیا۔ اسی کے ایک طویل قطعۂ اراضی جسے اپنے وجود میں ایک ملک کہنا چاہیے یعنی کشمیر بے نظیر کو جنت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ؎

اگر فردوس بروئے زمیں است ہمیں است وہمیں است وہمیں است

پھر مسلمانوں ہی کے دورِ حکومت میں ایک وقت وہ آیا کہ اپنے مضبوط استحکام اور خوش حال و آسودگی کے باعث پوری دنیا میں سونے کی چڑیا کے نام سے یہ ملک عظیم مشہور ہوا۔ بہ فرقِ زمانہ جو معاشی آسودگی و خوش حال یورپ کے ترقی یافتہ ممالک جیسے امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی و جاپان کو آج نصیب ہوئی ہے (وہ بھی ترقی پذیر ممالک بالخصوص افریقہ، مشرقِ وسطٰی و دیگر کمزور ایشیائی ممالک کی لوٹ کھسوٹ اور ان کو نچوڑ لینے کے بعد) اس معاشی آسودگی و خوش حالی کے دور سے کسی کمزور ملک کو لوٹے کھسوٹے اور کسی کمزور ملک کا گلہ دبائے بغیر یہ عظیم ملک ہندوستان تو کئی سو برس پہلے ہی گزر چکا

ہے۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان دنیا کے جس ملک میں گئے انھوں نے اسے اپنا ملک سمجھا اور اس کی ترقی و تعمیر میں نہ صرف اپنا خونِ جگر بلکہ اپنی ساری توانائیاں اس کے لیے صرف کر دیں اور اسے ترقی پذیر نہیں بلکہ ترقی یافتہ ملک بنایا۔

مثلاً یورپ کا ایک ملک جو آج اسپین کہلاتا ہے، یہی اسپین ماضی میں مسلمانوں کا اندلس تھا۔ اشبیلہ، غرناطہ، طلیلہ اس ملک کے مرکزی شہر تھے۔ ان کی ترقی و خوش حالی شہرت و ناموری ماضی میں ایسے ہی تھی جیسے کہ آج لندن، نیویارک، ٹوکیو، سنگاپور، شنگھائی وغیرہ۔ مسلمانوں نے اس ملک پر آٹھ سو سال حکومت کی۔ اور اسے اتنا ترقی یافتہ، خوش حال، متمدن اور مخزنِ علوم وفنون بنا دیا کہ بغداد کو چھوڑ کر دنیا میں اس کا کوئی جواب ہی نہیں تھا۔ اپنے زمانے کا اندلس عروج و ارتقا میں جب ثریا پر کمندیں ڈال رہا تھا تو آج کے ترقی یافتہ انگلینڈ کے لوگ ٹاٹ کے خیموں میں گوبر لیپ کر زندگی گزار رہے تھے۔ اور جب اندلس کی راتیں کہکشاں کا منظر پیش کرتی تھیں۔ تو آج کا ترقی یافتہ انگلینڈ بدبودار تیل سے اپنا چراغ جلاتا تھا۔ مسلمان جب باہمی اختلاف اور اپنی نااہلی وعیش پرستی کی بدولت وہاں سے کلّی طور پر بے دخل ہوئے تو اسی بے دخلی میں علوم وفنون کا سارا سرمایہ عیسائیوں کے ہاتھ لگا۔ جابر بن حیّان، البیرونی، الغزالی، الرازی، ابن سینا، ابن رشد، الطبری، الفارابی، ابن الہیثم، ابن البیطار، الفرغانی، عمر خیام، محمد موسیٰ خوارزمی، احمد بن موسیٰ، احمد بن محمد علی مسکویہ وغیرہ وغیرہ یہ ذہن عربی اور فکر اسلامی کے وہ عظیم قیمتی سرمایہ تھے۔ جن کی اساس پر جدید یورپ اور ان کی زبردست ٹیکنالوجی اور صنعتی انقلاب اور سائنسی ارتقا کا سورج طلوع ہوا۔ آج یورپ کی ساری ترقی اور جدید ٹیکنالوجی اور صنعتی انقلاب انھیں قیمتی اسلامی اثاثے کی رہین منت ہے۔ یورپ میں انھیں نایاب و نادر اور بے حد قیمتی اسلامی ذخیروں کو دیکھ کر ڈاکٹر اقبال تڑپ اُٹھے تھے اور کہا تھا ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

مسلمان ایک فاتح کی حیثیت سے جب ہندوستان میں داخل ہوئے اور انھیں یہاں کی حکمرانی میسر آئی اور حکمرانی چند سالوں پر نہیں بلکہ آٹھ صدیوں پر محیط رہی۔ تو انھوں نے اس ملک ہندوستان کو اپنا ملک سمجھا۔ اسے اپنی دھڑکنوں میں بسایا اور اس کو ایک عظیم ملک بنانے میں حیران کن قربانیاں دیں۔ اسے دنیا کے طاقت ور ممالک کی صف میں نمایاں جگہ دلوائی اور پوری دنیا نے اس کے شوکت واقبال اور سطوت و جبروت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کے آگے خمیدہ سر ہوئے۔ یہاں کے مسلمان بادشاہوں نے صنعت وحرفت کے ساتھ علوم وفنون اور اہلِ کمال کی زبردست سرپرستی کی۔ جس کی وجہ سے پوری دنیا سے اہلِ کمال اور اربابِ علم وفن کھنچ کر ہندوستان میں جمع ہو گئے۔ جن کی وجہ سے پوری دنیا میں ہندوستان کی یکتائی و بے نظیری کا غلغلہ بلند ہوا اور اس کی خاک کو افلاک کی بلندی نصیب ہوئی۔ خوش حالی وآسودگی ومعاشی استحکام نے اس کے قدم چومے اور اس کی دولت وثروت، خوش حالی وآسودگی دنیا بھر میں پھیلی اور دنیا بھر کی بڑی طاقتیں ہندوستان کو

حریصانہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ انھیں لالچی وحریص اور بڑی طاقتوں میں سات سمندر پار بسنے والے قوم انگریز تھی، جو ہندوستان کے عروج واقبال کو بڑی حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ اور سونے کی چڑیا کو جس نے سونے کے انڈے دے دے کر ہندوستانی خزانوں کو بھر دیا تھا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوگئی۔ بالآخر ایک طویل المدت منصوبے کے ساتھ تاجروں کی شکل میں عہدِ مغلیہ کے دورِ عروج میں ہندوستان میں داخل ہوئی اور بڑی ذہانت ومنصوبہ بندی کے ساتھ وقت وحالات کو دیکھ کر بتدریج قدم بڑھاتی رہی۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے اپنے مکروفریب اور زیرکی ودانائی سے اس وقت کے حکمرانوں سے خصوصی مراعات حاصل کرتی رہی اور اپنی وفاداریوں اور حسنِ خدمات کا سوانگ بھر کر اقتدارِ وقت کے دلوں میں اپنے لیے نرم گوشے پیدا کرتی رہی اور بڑی صبر آزمائی کے ساتھ حالات پر گہری نگاہ رکھتے ہوئے وقت کے انتظار میں صبر کا پتھر سینے پر رکھے بیٹھی رہی اور اپنے ارادوں کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ اس کمپنی کے دل ودماغ گربہ مسکیں کی شکل میں اقتدارِ وقت کے سامنے میاؤں میاؤں ہی کرتے رہے اور یہ سفید بھیڑیئے بھیگی بلی بنے اس وقت تک تاجروں کے خول سے باہر نہیں نکلے جب تک شاہانِ مغلیہ کا عظیم ترین فرماں روا اور برِ صغیر کا ناقابلِ تسخیر رجلِ رشید شہنشاہ محی الدین اورنگ زیب عالم گیر کی آنکھیں بند نہیں ہوئیں۔ جس کا وجودِ مسعود عہدِ مغلیہ کے نقطۂ عروج کا آخری حد تھا۔ درویشی وفرماں روائی کا ایسا حسنِ مجسم مذہب وسیاست کا ایسا حسیں پیکر، عزم وحوصلہ، عزیمت واستقامت، شجاعت وشہامت، شوکت واقبال، جہاں گیری وجہاں بانی، کردار وعمل، دین وسیاست اور راسخ الاعتقادی کا ایسا حیرت ناک نمونہ تھا کہ برصغیر کی تاریخ عظمت وجلالت جس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اہالیانِ ہند بالعموم اور اسلامیانِ ہند بالخصوص کے لیے اس کی ہستی بے کراں ایسے مضبوط باندھ کے مترادف تھی کہ جس کے ٹوٹتے ہی ایک سیلاب آ گیا۔ جس میں ہندوستان کا قصرِ عظمت وجلالت بہنے لگا۔ اورنگ زیب عالم گیر بادشاہِ دین پناہ کے وارث وجانشیں عظیم تر ہندوستان پر اپنی مضبوط گرفت برقرار نہ رکھ سکے۔ ظہیر الدین محمد بابر کے وارثوں وجانشینوں نے ہندوستان کی عظمتوں میں جو چار چاند لگائے تھے، وہ عالم گیر کے وارثوں وجانشینوں کی بے حسی، نااہلی وخود غرضی، عیش پرستی اور باہمی اختلاف وانتشار کی فضاؤں میں اپنی چمک دمک جلد ہی کھو بیٹھے۔ دلّی کی مرکزیت کے کمزور پڑتے ہی طوائف الملوکی نے اپنے پر پھیلائے اور دیکھتے ہی دیکھتے جگہ جگہ علاقائی طاقتوں نے خودمختاری اختیار کرتے ہوئے مرکز سے الگ ہٹ کر اپنی اپنی شناخت بنائی۔ اس طرح دہلی کی مرکزیت جوملک کی اصل طاقت تھی وہ اپنی اہمیت اور افادیت کھو بیٹھی۔ سات سمندر پار کے بنیوں کو جس وقت کا انتظار تھا وہ بڑے صبر آزما انتظار کے بعد آیا۔ مرکز کے کمزور ہوتے ہی اور عالم گیر کے وارثوں کو عیش وعشرت میں ڈوبے دیکھ کر انھوں نے اپنا تجارتی لبادہ اُتار کر پھینک دیا اور اپنی اصلی صورت میں آ گئے۔ پھر سوداگری سے ملک گیری کی طرف انھوں نے بڑی تیزی کے ساتھ قدم بڑھایا۔ اور اپنے ٹارگیٹ کے مطابق ہندوستان پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی تمام تر جنگی توانائیاں صرف کر دیں۔ اپنے مقصد کے لیے جگہ جگہ آگ وخون کے سیلاب سے گزرے۔ حضرت اورنگ زیب عالم گیر

کے جانشینوں اوران کے جلالت وتمکنت کے وارثوں نے عیش وطرب میں ڈوب کراپنی نااہلی وکم ہمتی کے جو ریکارڈ قائم کیے اس کے سبب ہی برصغیر ہندوستان مسلمان سیاسی ادبار کے شکار رہوئے۔

غوریوں، ایبکوں، بلبنوں، خلجیوں، تغلقوں، سوریوں، لودھیوں کا جاہ وجلال تو پہلے ہی یادِ ماضی بن چکا تھا۔ انھیں کے قصرِ عظمت ہی پر تو مغلوں نے نیا آسمان بنایا تھا اور تقریباً تین سو برس تک مغلوں کے اقبال کا سورج پوری دنیا کو اپنی طرف مبذول کیے ہوئے تھا۔

دلّی جو مرکز قوت واستحکام تھا جو عظیم برصغیر ہند کو متحد و مستحکم کیے ہوئے تھا۔ اس کے کمزور ہوتے ہی ملک کی وحدت طاقت ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس ملک میں بیک وقت کئی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ زورِ بازو اور قسمت آزمائی نے اصل وحدت و مرکزیت کو کئی حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ہر اسٹیٹ، ہر ریاست کی اپنی طاقت، اپنی فوج، اپنی پالیسی الگ الگ تھی۔ جو شاطر انگریز کے لیے بڑے سنہرے مواقع فراہم کر رہی تھی۔ اس کے لیے پورے ملک سے ایک ساتھ لڑنا محال تھا۔ اس لیے اس نے بڑی حکمت ودانائی اور مکر وفریب اور وفاداریوں کے خرید وفروخت کے حیلوں سے مسلح ہو کر اس نے قدم بڑھانا شروع کیا۔

اس کے قبضہ واقتدار کا سفر بنگال سے شروع ہو کر میسور سرنگا پٹنم پر ختم ہوا۔ اس نے یکے بعد دیگرے تمام ریاستوں پر قبضہ کیا۔ طاقت کے ذریعے، دامِ تزویر کے ذریعے، وفاداریوں کی خرید وفروخت کے ذریعے، حسن وشباب کے ذریعے، الغرض وہ تمام حربے جو اس کے امکان میں تھے اُن کو اس نے استعمال کیا۔

دو تہائی سے زیادہ ملک پر حقیقی قبضہ کرنے کے بعد بھی اسے چین وسکون نہیں تھا۔ صرف ایک طاقت کے سوا پورے ملک میں کوئی ایسی طاقت نہیں رہ گئی تھی جس سے انگریز خوف زدہ ہوتا یا اس کی اسے کوئی فکر وتشویش زیادہ ہوتی اور وہ تھی طاقت میسور شیر سلطان ٹیپو شہید کی۔

پورے برصغیر ہند میں ایک شیر کے دھاڑنے کی آواز کروڑوں دھڑکتے ہوئے دلوں کی آخری اُمید بنی ہوئی تھی۔ زندگی کی حرارت سے معمور اس آواز میں حیات کی ساری توانائیاں سمٹ کر آ گئی تھیں۔

شیر میسور جن کا یہ قول تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی پر بھاری ہے۔ جن کی شجاعت وشہامت، ہمت وجرأت، آزادی کی تڑپ اور جذبۂ شہادت سے انگریز خائف ولرزہ براندام تھے اور شیر نر انگریزوں کے خلاف جس طرف رخ کرتا تو ایسا لگتا کہ ؎ ضیغم دھاڑتا ہوا نکلا کچھار سے

انگریزوں کی تمام عسکری قوت شیر میسور کے آہنی عزم کے سامنے دم توڑ دیتی تھی۔ آمنے سامنے کی جنگ میں جب انگریز اپنا خون چاٹ چاٹ کر تھک گئے تو مکر وفریب ودغا کی ایک تاریخ مرتب کی اور جو فارمولہ انھوں نے شیرِ بنگال نواب سراج الدولہ کے ساتھ آزمایا تھا وہی نسخہ یہاں بھی آزمایا۔ یعنی سلطان کے مشیر ومعتمد میر صادق کو خریدا۔ جس کی غداری سے

سلطان ٹیپو شہید کیا گیا۔ آپ کی شہادت سے انگریز خوشی سے ناچنے اور اُچھل اُچھل اور چیخ کر کہنے لگے کہ اب آج سے ہندوستان ہمارا ہے۔

سلطان ٹیپو کی شہادت سے پوری ملک میں خوف و ہراس طاری ہوگیا اور اسی وقت ہندوستان مکمل طور پر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا۔

پھر ہندوستان کے تاریک سیاسی اُفق پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ستارہ اقبال بلند ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف انگریزوں کے شوکت و اقتدار کا پرچم لہرانے لگا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی سیاسی شوکت و عظمت اور بچی کھچی عزتِ سادات ماضی کی روایات کا ایک حصّہ بن گئی۔ چونکہ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھوں منتقل ہو کر انگریزوں کے ہاتھوں میں آیا تھا، اس لیے وہ اپنے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ بھی مسلمانوں ہی کو سمجھتا رہا۔ سلطان شہید کے بعد انگریز کے دلوں سے مسلمانوں کا خوف نکل گیا۔ اور جب پورے ملک پر سفید چمڑی اور کالے دل انگریز کا قبضہ ہوگیا تو پھر انھوں نے مسلمانوں کو اپنا ٹارگیٹ بنالیا۔ چن چن کر مسلمانوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ اور مسلمانوں کی عزتِ نفس کو اس حد تک مجروح کیا کہ الامان والحفیظ۔ گویا۔۔ ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا و جعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ۔ کا خوب خوب عملی مظاہرہ کیا۔ ذلت وخواری اور ظلم و ستم کے انداز بھی کیسے؟

لا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر۔ ظلم کے ایسے انداز نہ آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کبھی دل پر خطرہ گزرا۔ ان مظالم کی تفصیل کے لیے پتھر کا جگر چاہیے۔ جن مظالم کے تصور سے قلم لرزرہا ہو، اسے لکھا بھی کیسے جاسکتا ہے۔ ۱۷۹۹ء شہادت ٹیپو سلطان سے لے کر ۱۸۵۷ء تک یہ پورا ملک انگریزوں کے لیے ایک شکار گاہ تھا کہ وہ جب اور جہاں جس انداز میں چاہتے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی جان و مال، حرمت و ناموس اور عزتِ نفس کا شکار فخریہ طور پر کر لیتے تھے۔

کسی بھی چیز کی ایک حد ہوتی ہے اور جب وہ چیز حد سے بے حد ہوجاتی ہے تو دبے کچلے جذبے بھی طوفان بن جاتے ہیں۔ اذا ئیس الانسان طال لسانہ۔۔۔ کسنور مغلوبٍ یصول علی الکلب۔

ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے اشراف و امجاد کی املاک کی بربادی ان کی ذلت و رسوائی ان کی حرمت و ناموس اور عزتِ نفس کی مسلسل پامالی، اُمرا اور رؤسا، اہلِ ثروت و دولت کو فقر و فاقہ، بھکمری اور دربدری اور انھیں ذلت و نکبت میں مبتلا کردینے کے پیچھے یہ حکمت کارفرما تھی کہ انھیں اتنا ذلیل و رسوا اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر کے ذہنی طور پر اتنا مفلوج اور ان کے حوصلوں کی ایسی شکست و ریخت ہوجائے کہ دماغ سے بوئے سلطانی نکل جائے اور اپنی حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کا تصور تک نہ کرسکیں۔ ہندوستانی بالخصوص مسلمانوں نے قعرِ مذلت کے اس طوق کو بھی قہراً و جبراً پہن لیا۔ مگر بات جب دین و

ایمان اور دھرم وعقیدے کی پامالی کی آئی اور طاقت کے زعم میں عیسائی انگریزوں نے پورے ہندوستان کے کروڑوں ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو اپنے دین سے بے دین کر دینے کے منصوبے کا آغاز میرٹھ کی فوجی چھاؤنی سے سور اور گائے کی چربی کی آمیزش سے بنی ہوئی کارتوس سے کیا، تو برداشت کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں۔ پھر برسوں سے سینے میں دبے ہوئے جذبات اُبل پڑے۔ کارتوس کی چربی سے دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا۔ پھر وہی سے تحریک آزادی کا آغاز ہوا۔

۱۱؍مئی انقلاب ۱۸۵۷ء تو ایک آزادی کا آغاز ہے اور وہی جنگ آزادی کی خشتِ اوّل تھی ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء اسی کا آغاز کا تکملہ ہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء اگرچہ ناکام ہوا، جس کے صلے میں انگریزوں نے ہندوستانیوں بالخصوص علما و مشائخ کے ساتھ ظلم وستم و بربریت کی ایسی انسانیت سوز تاریخ رقم کی کہ اس وقت ظلم وستم کی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔ دعوے دارانِ تہذیب وتمدن قوم فتح مندی کے زعم اور انتقام کے جوشِ جنوں میں مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت وحقارت اور جگر خراش سلوک کیا وہ قلم کو یارا نہیں کہ اسے بیان کیا جاسکے۔ بس اتنا سمجھ لیجیے کہ آسمان راحق بود گر خوں ببارد برزمیں۔۔ صرف ہلکی سی جھلک ملاحظہ ہو۔

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں ڈلوایا۔ سکھ رجمنٹ سے دن کے اُجالے میں لوگوں کے سامنے اغلام کروانا۔ فتح پوری مسجد سے لال قلعے کے دروازے تک تمام درختیوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشیں لٹکا دینا۔ شاہ جہانی مسجد دہلی میں گھوڑوں کا باندھنا۔ مسجدوں کے حوض میں پانی کے بجائے لید ڈلوانا وغیرہ۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ''انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رُخ''، از شیخ حسام الدین۔

چونکہ ہندوستانیوں پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے راستے میں شروع سے آخر تک مسلمان ہی مزاحم رہا، انگریزوں کو قدم قدم پر مسلمانوں سے ہی مقابلہ کرنا پڑا (باستثناء چند) ہر جگہ مسلمان ہی سدِ راہ بنا رہا۔ چاہے ۱۸۵۷ء جنگ پلاسی ہو یا ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر یا ۱۷۷۴ء کی جنگ روہیل کھنڈ ہو یا ۱۷۹۹ء کی جنگ سرنگا پٹنم، اودھ، بندیل کھنڈ وغیرہ ہر جگہ انگریزوں کے راستے میں مسلمان ہی رکاوٹ بنا رہا۔ ایسا نہیں تھا کہ انگریزوں نے بڑی آسانی اور اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندوستان کو لے لیا۔ جگہ جگہ میر جعفروں، میر صادقوں، میر علی نقیوں کے باوجود ہندوستان کو اپنی غلامی میں لینے کے لیے انھیں جگہ جگہ آگ کے دریا اور خون کے صحرا سے گزرنا پڑا اور یہ خون کے دریا وصحرا صرف مسلمان تھے۔ اس لیے ہندوستان پر مکمل قبضہ کر لینے کے بعد انگریزوں نے اپنا سارا ابخار مسلمانوں پر اُتار دیا۔ اور جب تاریخ جنگ آزادی کا پوری دیانت دارانہ جائزہ لیا جائے گا تو یہ حقیقت آئینہ بن کر سامنے آجائے گی کہ پوری اُنیسویں صدی میں حصولِ آزادی کا بس ایک ہی راستہ تھا، وہ تھا انگریز کے خلاف طاقت کا استعمال۔ اس لیے تشدد کا راستہ ہی ناگزیر تھا۔ ملک میں انتشار و بدامنی پیدا کرنا انگریزوں کو خوف کی نفسیات میں مبتلا کرنا، ان کے خلاف نفرت کے جذبات کو ہوا دینا، زمیں دوز تحریکوں اور گوریلا طریقہ

جنگ سے انگریزوں کو حواس باختہ کرنا، سرکاری خزانوں کو لوٹ لینا، پلوں اور برجوں کو بم سے اُڑا دینا، انگریز افسران کو گھات لگا کر قتل کرنا خاص کر ان کی تفریح گاہوں کو بم سے اڑا کر انھیں خاک وخون میں بدل دینا۔۔۔۔الغرض انھیں اپنی دہشت گردانہ کارروائیوں سے ان کے ناک میں دم کر دینا اور اس پورے دور میں تنہا مسلمان ہی تھا جو انگریزوں کے خلاف سرمیدان کفن بردوش دارم کا عملی تفسیر بنا رہا۔

جنگ آزادی کے اس پورے سفر میں جو تقریباً نصف صدی کا احاطہ کیے ہوئے ہے، مسلمان ہی ہراول دستہ تھا۔ وہی میمنہ بھی تھا اور میسرہ اور قلب بھی۔ **للاکثر حکم الکل** کے پیش نظر میرا دعویٰ مبنی برحقیقت ہے۔ اس پورے سفر میں چند غیر مسلم بھی ساتھ تھے جو نہ کی منزل میں تھے۔ جن کی تعداد بے حد مختصر تھی۔ جو انگلیوں پر گنے جانے کے لائق تھے۔ جیسے بھگت سنگھ، منگل پانڈے، نانا پیشوا، رام کنور سنگھ، راجہ ناہر، رام راؤ، تلا رام، رانی لکشمی بائی وغیرہ۔ کم ہی سہی پھر بھی ان کی قربانیوں کا احترام اور ان کے کارناموں پر خراجِ تحسین ہماری قومی ذمے داری ہے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد بیسویں صدی کے آغاز تک انگریزوں کے خلاف آزادی کے لیے صرف مسلمان ہی میدانِ عمل میں رہ کر ان کی وحشت و بربریت و جوشِ انتقام میں ان کے قتل وغارت گری اور بے پناہ ظلم وتشدد کا ہدف بنا رہا۔

تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خوں می ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خوں خوار می رقصم

تو وہ قاتل ہے جو تماشا دیکھنے کے لیے میرا خون بہاتا ہے۔ اور میں وہ بسمل ہوں کہ خوں خوار خنجر کے نیچے رقص کرتا ہوں۔

۱۹۲۱ء میں جنوبی ہند مالابار کیرالہ میں موپلا کسانوں نے انگریزوں کے خلاف جس جرأت و بہادری کا مظاہرہ کیا اور آزادیِ وطن کے لیے جو قربانیاں دیں وہ آزادیِ وطن کی تاریخ میں عظیم یادگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ موپلا کسان سب کے سب مسلمان تھے اور موپلا تحریک کا مقبول ترین لیڈر ابوبکر تھا۔ جس کی ترکتازیوں نے انگریزوں کو دم بخود کر رکھا تھا۔ ابوبکر کی والدہ خدیجہ خاتون خود بھی مجاہدہ تھیں۔ جنھوں نے کسانوں کی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بیسیوں صدی کی دو دہائیوں تک غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا انگریزوں کے خلاف طاقت وتشدد کا راستہ جس پر تمام ہندوستان بالخصوص مسلمان عمل پیرا تھے۔ رہ گئی آزادی کے آخری مرحلے میں عدم تشدد کی باتیں تو یہ صرف باتیں تھی۔ مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی اور ان کے مٹھی بھر ہم نواؤں کی۔ جس پر کچھ لوگوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے عمل شروع کیا۔ جو عام ہندوستانی بالخصوص مسلمانوں کے حلق سے نیچے اُترا ہی نہیں۔ ورنہ فلسفہ عدم تشدد کے دوران ۱۹۲۲ء میں گورکھ پور کے قریب چورہ چوری اسٹیشن کا واقعہ تاریخ آزادی میں جلی عنوان کیوں بنتا؟ جب پورے تھانے کو آگ لگا کر ایک خونی تاریخ رقم کی گئی۔ جواب میں انگریز جور و جفا کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کا

اضافہ کیوں کرتا؟ اس پورے علاقے کو تہس نہس کرتے ہوئے ۲۷ ارلوگوں کو پھانسی کا حکم سنایا گیا، جو سب کے سب مسلمان تھے۔

اگست ۱۹۴۲ء میں مدراس سے لے کر اُتر پردیش، بہار، بنگال، آسام تک کے لوگ انگریزوں کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے اور پوری قوت کے ساتھ تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے ہنگامۂ محشر برپا کردیے۔ اس وقت کروڑوں ہندوستانیوں کے سینے آتش فشاں بنے ہوئے تھے۔ میلوں تک ریل کی پٹریوں کو اُکھاڑ پھینکا۔ حکومت کے دفاتر، کورٹ، کچہری، سرکاری عمارتوں کو جلا کر خاکستر کردیا گیا۔ جو بھی سامنے آیا عوام کے غیظ وغضب کا شکار ہوا۔ مہینوں تک نظامِ حکومت درہم برہم رہا۔

۱۹۴۲ء کی تحریک ''کرو یا مرو'' میں ڈیلائٹ ٹاکیز جبل پور جس میں صرف انگریز ہی جاسکتے تھے۔ اس ٹاکیز میں انگریزوں سے بھرے ہوئے ہال کو بم سے اُڑا دینے والے جیالے کا نام سلیمان جناح تھا۔ ۱۹۳۰ء میں شولا پور میں فلسفۂ عدم تشدد کے بانی مسٹر گاندھی کی گرفتاری کے خلاف بڑا پُرتشدد احتجاج برپا کیا گیا۔ جواب میں انگریزوں نے بغاوت کا مقدمہ چلانے والے لیڈروں میں دو مسلمان جوان عبدالرشید و قربان حسین بھی تھے، جنھیں بڑودہ جیل میں پھانسی دی گئی۔ ۱۹۳۰ء میں تحریک عدم تشدد میں پشاور کے قصہ خوانی بازار میں جنگ آزادی کی جو خونی تاریخ پشاور کے جیالے مجاہدین پٹھانوں نے اپنے گرم گرم لہو سے لکھی اس کی اہمیت جلیان والا باغ سے کسی طرح کم نہیں۔ ایک عینی شاہد جناب ملک کلدیپ کپور کے مطابق ایک محتاط اندازے کے مطابق سات سو بہادر پٹھان قصہ خوانی بازار میں شہید کیے گئے اور اپنے خون سے آزادی کا فرمان لکھ گئے۔ (قومی آواز، لکھنؤ، ۲۴ر اپریل ۱۹۸۴ء)

اسی طرح ۱۹۴۲ء میں تحریک کوائٹ انڈیا کے موقع پر عدم تشدد کے فلسفہ کو عملاً مسترد کرتے ہوئے عوام نے تشدد کی راہ اپنا کر اور ہتھیار بند ہو کر انگریزی اقتدار پر زبردست حملہ کیا۔ وہ تحریک بہت دور تک پھیلی۔ یہاں تک کہ ورسوا بمبئی کے ماہی گیروں نے اس کے لیے سر سے کفن باندھا۔ جس میں تادمِ تحریر ۸ر مجاہدین آزادی زندہ ہیں اور اپنے اس کارنامے پر بہت شاداں و فرحاں ہیں۔ (روزنامہ انقلاب، ممبئی ص ۲، ۱۶ر اگست ۲۰۰۷ء)

پھر ۱۹۴۴ء میں نیتا جی سبھاش چند بوس نے جاپانیوں کی مدد سے آزاد ہند فوج بنائی، تاکہ اس کے ذریعے بزورِ طاقت انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا جائے۔ جس کی انڈین نیشنل آرمی کے فوجی افسران کی ایک بہت بڑی تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ مثلاً جنرل شاہنواز، کرنل حبیب الرحمن، کیپٹن عبدالرشید اور کرنل برہان الدین وغیرہ۔ ۱۹۱۹ء میں پنجاب کے جلیان والا باغ میں جنرل ڈائر نے ۱۵۰۰ر نہتے ہندوستانیوں کو گولیوں سے بھون دیا۔ جس میں سیکڑوں کی تعداد میں مسلمان بھی تھے۔ ایسے ہولناک خونی ڈرامے کو اسٹیج کرتے وقت گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کا ذرا بھی خیال نہیں کیا۔ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فلسفۂ عدم تشدد کتنا بے جان تھا کہ انگریز گاندھی جی کے عدم تشدد

کے آگے نہیں بلکہ مجاہدین آزادی کی بے پناہ قوت، ہمت، حوصلہ اوران کی مسلسل سرفروشی اور پُرتشدد کارناموں کے سامنے سرنگوں ہوا۔ آزادی وطن کے اس پورے سفر میں مسلمان پوری جرأت، عزیمت اور استقامت کے ساتھ شمشیر بہ کف رہا۔ اس نے غیروں سے زیادہ اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کیا۔ جب تک ان کے بازوؤں میں قوت اور سینوں میں دَم رہا وہ انگریزوں کے مقابلے میں ہمیشہ تازہ دم رہے۔ گویا ؎

ہر آن نیا طور، نئی برقِ تجلی

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد سے لے کر ۱۹۰۰ء تک ۴۳ رسال کا طویل عرصہ جو تحریک آزادی کا خشتِ اوّل تھا اس میں انگریزوں کے خلاف جہادِ زندگانی میں صرف مسلمان تھے۔ وہی تنہا آگ وخون کے دریا میں ڈوبتے تیرتے رہے۔ چونکہ مسلمانوں نے ہی اس ملک کی تعمیر کی۔ اس کو دنیا کے نقشے پر ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کی تعمیر وترقی اور خوش حالی کے لیے صدیوں سے مرے مٹے اور اس مٹی کو اپنے خون سے زرخیز کیا۔ اس لیے ان کو اس خاک پاک سے نہ صرف محبت ہے بلکہ انھیں اپنے اس ملک سے عشق تھا اور عشق بھی کیسا؟

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

اور بلاشبہہ مسلمان اپنے وطنِ عزیز کی آزادی کے لیے آگ کے اس دریا سے ڈوب کر سرخرو وشادکام ہو کر نکلے اور اپنے دیگر برادرانِ وطن کو اپنے عمل سے یہ پیغام دیا کہ

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک کی ستم کی سیاہ رات چلے

وطنِ عزیز کے لیے مسلمانوں کی اسی حیران کن قربانیوں کے پیش نظر انگریز مسلمانوں کے خلاف آتش زیر پا تھے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد موقع ملتے ہی اس نے سارا نزلہ مسلمانوں پر اُتار دیا۔ جوشِ انتقام میں اندھا ہو کر مسلمانوں کے ساتھ ظلم وبربریت کی جو تاریخ رقم کی، وہ تو کی ہی ایک ستم یہ کیا کہ برادرانِ وطن کے مقابلے اس نے بڑا امتیازی سلوک مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا۔ ہزار خرابی کے باوجود اگر مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل بھی کی تو ان پر سرکاری ملازمت کے دروازے ہی بند کر دیے گئے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اگر مسلمانوں سے انگریزوں کی نفرت میں شدت پیدا ہوئی تو یہ نفرت ایک طرفہ نہیں تھی۔ مسلمانوں نے بھی قدم قدم پر انگریزوں سے سخت نفرت کی اور ان کی مخالفت کو اپنے دین وایمان کا ایک حصہ سمجھا۔ جب کہ اس طویل دور میں برادرانِ وطن انگریزی تعلیم میں مصروف اور اعلیٰ انگریزی تعلیم حاصل کر کے انگریز کی خوش نودی حاصل کرتے رہے اور اپنے آقاؤں کی خوشنودی میں مسلمانوں کی جدوجہد اور آزادی کی مخالفت کرتے رہے۔ بعد میں کچھ

مسلمانوں نے ہمت کر کے انگریزی تعلیم اور اس میں اعلیٰ ڈگری حاصل بھی کی تو انگریزوں نے مسلمانوں پر سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر کے ان کے حوصلوں کو شکست وریخت سے دوچار کر کے انھیں احساسِ بے بسی میں مبتلا کر دیا۔ وہ بے چارے نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ انگریزی تعلیم حاصل کر کے مسلمانوں میں معتوب ہوئے اور ڈگری پا کر بھی ٹاٹ باہر رہے۔ گویا نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔

تھی دیر چھلکنے کی لبریز تھا پیمانہ
آنکھوں سے گرے آنسو اور ختم تھا افسانہ

اس طویل عرصے میں ہندوؤں کی دو نسلیں تعلیم یافتہ ہو کر حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز ہو چکی تھیں اور مسلمان تعلیم یافتہ و ڈگری ہولڈر ہو کر بھی کہیں کا نہ رہا۔ انگریزوں کے اعلیٰ افسران نے یہ سرکلر جاری کر رکھا تھا کہ جو بھی سرکاری جگہیں خالی ہوں ان پر صرف ہندوؤں کو رکھا جائے۔ سر ولیم ہنٹر کے مطابق ۱۹۳۴ء تک کلکتہ کے سرکاری دفاتر میں چپراسی یا پوسٹ مین یا اس سے ملتی جلتی حقیر و ذلیل ملازمتیں ہی مسلمانوں کی تقدیر تھیں۔ اور سٹی کالج کلکتہ کے شعبۂ تاریخ کے صدر مسٹر شانتی رائے کی کتاب "Role of Indian Muslims in the Freedom Movement" (ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار) کے مطابق مسلمانوں نے انگریزوں سے انتہائی نفرت کے سبب تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی اور ہزار مخالفت کے باوجود جن لوگوں نے انگریزی تعلیم حاصل بھی کی تو ان پر ملازمت کے دروازے ہی بند کر دیئے گئے۔ ۱۸۷۰ء تک کسی مسلمان کو انگریزوں نے سرکاری ملازمت نہیں دی۔ آزادی کے اس طویل سفر ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء مسلمانوں نے جتنی قربانیاں اور وطن عزیز کے لیے جتنے خون بہائے غیر مسلموں نے اتنا پسینہ بھی نہیں بہایا ہوگا۔ عام مسلمانوں کی بات ہی کیا خود ان کے دینی رہنما، علما و اکابرین ملت، پیرانِ عظام و مشائخ کرام جنھیں مسلمان اپنی پلکوں پر بٹھاتے اور دل کی دھڑکنوں میں بساتے رہے، وطن عزیز کے لیے جو انھوں نے قربانیاں دیں پوری تحریک آزادی میں ان کا کوئی جواب نہیں۔ پندرہ ہزار اور مؤقر جریدہ روزنامہ اردو ٹائمز تاریخ اشاعت ۱۹/اگست ۲۰۰۷ء سنڈے میگزین صفحہ ۳ کے مطابق پچاسی ہزار (۸۵۰۰۰) علمائے کرام و مشائخ عظام نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ برٹش سامراج کے خلاف میدانِ جہاد میں علمائے کرام و مشائخ عظام اُترے۔ جن کے پشت پر کروڑوں ہندوستانی کھڑے تھے اور جنگ آزادی کے اصل ہیرو و قائد یہی علمائے کرام تھے۔ جن کے کارناموں اور قربانیوں کو ہند و پاک دونوں حکومتوں نے نظر انداز کر دیا۔ انگریزوں کی نگاہوں میں سب سے زیادہ مجرم یہی علما تھے، جنھوں نے پورے ملک کو انگریزوں کے خلاف کھڑا کر دیا تھا۔ چنانچہ حالات پر قابو پانے کے بعد سب سے بھیانک سزا بھی انھیں کو دی۔ ہزاروں کو پھانسی پر چڑھایا۔ ہزاروں کو گولیاں ماردی گئیں اور جو ان کی نگاہوں میں سب سے بڑے خطا کار تھے انھیں سولی و پھانسی سے بھی بڑی سزا دی۔ یعنی ہزاروں ہزار علمائے کرام و مشائخ عظام کو کالا پانی بھیج دیا۔ کالا پانی کا مطلب جیتے جی مر جانا اور

وہاں کی زندگی پرموت کو ہزار بار ترجیح دینا۔ کالا پانی (یعنی جزیرۂ انڈمان) کلکتہ سے اسّی میل دور جو ایسے بڑے بڑے قید خانوں کے متبادل تھا جس میں چہار دیواریاں اور فصیلیں نہیں تھیں۔ تاحدِ نگاہ صرف سمندر ہی لہریں لیتا رہتا تھا۔ وہاں کی فضا سخت مذموم، ہوائیں بدبودار اور اس کا پانی زہر ہلاہل۔ کالا پانی اور دریائے شور کیا تھا؟ اس کی ایک جھلک مجاہد حریت امام اہلِ سنّت حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی کی خود نوشت سوانح حیات ''الثورۃ الہندیہ'' (عربی) کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں۔ اردو ترجمہ مولانا عبد الشاہد خاں شیروانی مرتب ''باغیِ ہندوستان'' فرماتے ہیں:

''پھر ترش رو، دشمن کے ظلم نے مجھے دریائے شور کالا پانی کے کنارے ایک بلند و مضبوط، ناموافق آب و ہوا والے پہاڑ پر پہنچا دیا۔ جہاں سورج ہمیشہ سر ہی پر رہتا تھا۔ اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں تھیں۔ جنھیں دریائے شور کی موجیں ڈھانپ لیتی تھیں۔ اس کی نسیم صبح بھی گرم و تیز ہوا سے زیادہ سخت اور اس کی نعمت زہر ہلاہل سے زیادہ مضر تھی۔ اس کی غذا حنظل سے زیادہ کڑوی۔ اس کا پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں۔ اس کا آسمان غموں کی بارش کرنے والا۔ اس کا بادل رنج و غم برسانے والا۔ اس کی زمین آبلہ دار۔ اس کے سنگ ریزے بدن کی پھنسیاں اور اس کی ہوا ذلت و خواری کی وجہ سے ٹیڑھی چلنے والی تھی۔ ہر کوٹھری پر چھپر تھا۔ جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ ہوا بدبودار اور بیماریوں کا مخزن تھی۔ خارش وقوبا وہ مرض جس سے بدن کی جلد پھٹنے اور چھلنے لگتی ہے، عام تھی بیمار کو علاج، تندرست کو بقائے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر ذرا آگے چل کر جب کوئی ان میں سے مرجاتا ہے تو نجس و ناپاک خاکروب جو درحقیقت شیطان یا دیو ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہوا غسل و دفن کے بغیر اس کے کپڑے اُتار کر ریگ کے تودے میں دبا دیتا ہے۔ نہ اس کی قبر کھودی جاتی ہے نہ نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر میت کے ساتھ یہ برتاؤ نہ ہوتا تو اس جزیرے میں مرجانا سب سے بڑی آرزو ہوتی اور یقیناً موت سب سے زیادہ تسلی بخش تھی۔ اور اگر مسلمان کو خودکشی مذہب میں ممنوع اور قیامت کے دن عذاب و عتاب کا باعث نہ ہوتی تو کسی کو یہاں مقید و مجبور بنا کر تکلیف مالا یطاق نہ دی جا سکتی اور مصیبت سے نجات پالینا بڑا آسان ہوتا۔'' (الثورۃ الہندیہ، ص ۷۶، اردو ترجمہ ص ۷۷، ۷۸، ۷۹ مع باغیِ ہندوستان، از عبد الرشید شیروانی۔ ناشر المجمع الاسلامی، مبارک پور اعظم گڑھ)

یہ تھا وہ دریائے شور (کالا پانی) جس کی ایک جھلک آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ انگریز جسے اپنی حکومت کا سب سے بڑا مجرم سمجھتے اور اس کو سولی و پھانسی سے بھی زیادہ سخت سزا دینی ہوتی اسے دریائے شور (کالا پانی) بھیج دیا کرتے تھے۔ جہاں کی موت زندگی سے بہت آسان تھی اور اگر اسلام میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو وہاں کی اذیت ناک زندگی پر موت کو ترجیح دی ہوتی۔

ایسی جگہ ہندوستان کے مشاہیر، صاحب اثر و نفوذ علمائے کرام، مشائخ عظام، اربابِ علم و دانش اصحابِ فضل و کمال جن کے مثل اس زمانے کے آسمان نے نہ دیکھا ہو۔ جن کے لیے مسلمانوں کے دلوں میں بڑا احترام اور جن کی ذات سے والہانہ عقیدت و وابستگی تھی اور اُمرا اور رؤسا جن کے آگے پیچھے خدامین اور ہٹو بچو کی بھیڑ ہوتی، وہ رکھے جاتے۔ اور وہاں پر

ان سے انتہائی ذلیل کام لیے جاتے۔ جیسے لکڑی کاٹنا، گندی نالیاں صاف کرنا، غلاظت کا ٹوکرا سروں پر رکھ کر دور پھینکنا وغیرہ وغیرہ۔ اس وطنِ عزیز کی آزادی کی خاطر تقریباً پانچ ہزار (۵۰۰۰) علما و مشائخ و اربابِ فضل و کمال اور اُمرا و رؤسا نے کالے پانی کی ذلتوں کو گلے سے لگایا اور اس میں ہزاروں اس وطن کی خاطر وہیں پر پیوند خاک بھی ہوئے۔ اپنے زمانے میں علوم وفنون، دین و دانش کا جو سب سے بڑا بادشاہ تھا یعنی بطلِ حریت امام اہلسنّت مجاہد اعظم حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی جن سے زیادہ صاحبِ عظمت و عزیمت، صاحبِ فضل و کمال و گنجینۂ علوم وفنون پر ان کے زمانے کا سورج طلوع نہیں ہوا۔ اور اگر کوئی صاحبِ بصیرت قسم کھالیتا کہ اس کی نظیر اس کے زمانے میں نہیں دیکھی گئی، تو وہ حانث نہیں ہوتا۔ **یندر نظیرہ فی عصرہ بین اصحاب الکمال۔**

حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی جن کے تعلق سے علامہ عبد الشاہد شیروانی اپنے استاد جلیل حضرت علامہ معین الدین اجمیری جو شاگرد تھے حضرت علامہ عبد الحق بن علامہ فضل حق خیر آبادی کے ان کے حوالے سے اپنی عظیم کتاب ''باغیِ ہندوستان'' میں لکھتے ہیں: ''ایک سرکاری آفیسر جو بڑے عہدے پر فائز تھے، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں صرف اس لیے مسلمان ہوں کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی اور حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی مسلمان تھے۔ یہ اشارہ تھا ثانی الذکر کے علمی، فنی، فکری عظمتوں کی طرف۔ ایسی عظیم ترین ہستی سے انگریز سر پر غلاظت کا ٹوکرا رکھوا کر پھنکواتے تھے۔ بے خبری میں نہیں بلکہ قصداً و ارادتاً۔

ان کی یادوں کی لطافت دل آشفتہ دیکھ
پھول کھل آئے ہیں کتنے تیرے ویرانوں میں

سرِ میداں کفن بردوش دارم

اللہ اکبر! اس ملکِ عظیم کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں بالخصوص علما و مشائخ نے جتنی قربانیاں دی ہیں اور جتنا اپنا لہو بہایا ہے مجموعی طور پر دوسرے برادرانِ وطن نے تو اتنا پسینہ بھی نہیں بہایا ہے۔ جنگ آزادی کے آخری مرحلے میں بھی نہ تو قربانی دینے میں مسلمان پیچھے رہے اور نہ ہی علما و مشائخ ہی۔ بالخصوص سنّی علمائے کرام و مشائخ عظام میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، مولانا حامد علی فاروقی، صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی، پیر جماعت علی محدث علی پوری، مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا بریلوی، علامہ سید دیدار علی محدث علی پوری، محدث اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی۔۔۔ یہ وہ سرخیلانِ اُمت تھے جن کی قیادت میں ہزار ہا علما کفن بردوش تھے۔ جنگ آزادی میں بنارس کی آل انڈیا سنّی کانفرنس منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰/ اپریل ۱۹۴۶ء تاریخ آزادی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں صرف علما و مشائخ کی تعداد ۵/ ہزار، ۷/ ہزار اور ۲۴/ ہزار تھی۔ جب کہ تین لاکھ مسلمانوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ آزادی کی ایک سنہری تاریخ رقم کی تھی اور یہ سنّی علما و

مشائخ کا جنگ آزادی میں ایسا کارنامہ تھا جس کی نظیر ملک کی آزادی کے آخری دور میں نہیں ملتی۔ شہزادۂ اعلیٰ صدرالافاضل حضرت علامہ سید اختصاص الدین نعیمی علیہ الرحمہ کی روایت کے مطابق حضور صدرالافاضل کے نمایاں کارناموں میں سُنّی کانفرنس کا انعقاد ایک بڑا کارنامہ تھا، جس میں ۲۴ ہزار علما و مشائخ اور تین لاکھ مسلمان شریک ہوئے تھے۔

(فتاویٰ صدرالافاضل صفحہ ۲۳، مقالہ نگار علامہ مفتی محمد شعبان علی نعیمی، شائع کردہ تنظیم افکار صدرالافاضل ممبئی)

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ انگریز گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کے آگے سرِ نگوں ہو گیا اور گاندھی جی کے اس فلسفۂ عدم تشدد کو دل و جان سے قبول کر کے ملک ان کے حوالے کر دیا کہ ارے تم لوگ پہلے سے کہاں تھے؟ اگر یہی بات پہلے سے کہہ دیتے کہ ہم آپ کے سامنے کبھی سر نہیں اٹھائیں گے۔ آپ سے ہاتھ جوڑتے ہیں۔ بس ہمارا ملک ہمیں دے کر چلے جاؤ۔ تو ہم آگ و خون کی بارش نہ کرتے اور تمہیں ملک دے کر کب کا چلے گئے ہوتے۔ انگریز اتنا رحم دل کب سے ہو گیا تھا۔ جلیان والا باغ اور پشاور کے قصہ خوانی بازار میں ہزاروں نہتے ہندوستانیوں کو گولیوں سے بھون دینے والا جلاد گاندھی جی کے صرف اس اُصول پر شہید ہو گیا کہ مائی باپ آپ چاہے جو سلوک کرو، ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ چاہے جتنی قیامت ڈھا دو ہم سر نہیں اُٹھائیں گے۔ پورے ملک کو خون کے دریا میں ڈبو دو، ہم چپ رہیں گے۔ بس یہی کہتے رہیں گے کہ آپ ہمارا ملک اب ہمیں دے دو۔

بس اس ادا پر انگریز قربان ہو گیا اور گاندھی جی کو ہندوستان دے کر چلا گیا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد تحریک آزادی ختم نہیں ہو گئی بلکہ نامساعد حالات کے سبب تحریک کمزور اور رفتار دھیمی پڑ گئی تھی اور پھر وقت کے ساتھ اس کا جذبہ تب و تاب جاودانہ واپس ہوا۔ اور آزادی کے دیوانے بہت جلد اپنے ٹارگیٹ یعنی حصولِ آزادی پر آ گئے۔ مگر اس بار دیوانوں نے فرزانگی کا اعلیٰ مظاہرہ کرتے ہوئے جنگ کے انداز بدل دیے۔ ایک ایسے دشمن جس کے حدودِ مملکت میں سورج نہ ڈوبتا ہو، جس کی فوجی توانائی اور عسکری بالادستی دنیا کے ایک بڑے حصے کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہو۔ اس سے آمنے سامنے کی جنگ لڑی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے اپنی عسکری قوت کے پیش نظر نقشۂ جنگ کی ترتیب بدل دی۔ یعنی انگریزوں کے خلاف مجاہدین وطن بیک وقت کئی محاذ کھولے۔ گوریلا جنگ یعنی مارو اور بھاگو جس کے لیے خفیہ تحریکیں چلائی گئیں۔ زمین دوز راستے اپنائے گئے۔ تشدد، تخریب کاری، خفیہ تباہ کاری نے انگریزوں کی ناک میں دَم کر دیا تھا۔ ابھی انگریز اپنا ایک زخم چاٹتا ہی رہتا کہ دوسرا کاری زخم لگ جاتا۔ اس زخم کی ٹھیس ابھی کم نہیں ہوتی کہ تیسرے زخم سے بلبلا پڑتا اور زخم لگانے، تباہ کاری پھیلانے اور انگریزوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کرنے والے نہ تو پکڑے جاتے اور نہ ان کا پتہ لگ پاتا۔ اگر کبھی مخبری و غداری کے باعث کوئی پکڑ جاتا تو ہنستا ہوا وطن پر قربان ہو جاتا اور بڑے فخر سے پھانسی کے پھندے کو چوم کر کہتا کہ

عمرے است کہ افسانہ منصور کہن شد
من از سر نو زندہ کنم دار و رسن را

مجاہد منظم ہو کر انگریزوں پر ٹوٹتے اور انھیں جہنم میں پہنچا کر چھلاوہ بن جاتے۔ مجاہدین کے بڑھتے ہوئے حوصلوں اور کامیاب شب خونوں سے برٹش حکومت نڈھال ہوتی جارہی تھی اور اس کے جلاّدوں کے قویٰ مضمحل، اعصاب کشیدہ اور حوصلے پست ہونے لگے۔ تشدد، تخریب اور تباہ کاری کے نت نئے طریقوں اور اس پر مسلسل شدت وقہرمانی نے انگریزی حکومت کو نڈھال کر دیا تھا۔ ظلم وستم، قہر وغضب، وحشت و بربریت کا عفریت یعنی برٹش سامراج جاں بلبی کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اتنے عظیم ملک کو یوں ہی چھوڑ کر بھاگ جانے سے پوری دنیا میں اس کی ذلت ورسوائی کا باعث بنتا اور جو نوآبادیات اس کے قبضے میں اس وقت تھے، اس کے ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ تھا۔ یعنی ہندوستان کی دیکھا دیکھی وہاں کے لوگ بھی شیر ہوجاتے۔ مستزاد برآں دوسری جنگ عظیم میں جرمنی وجاپان نے بھی اس کے کس بل نکال دیے تھے۔ خدا کی بے آواز لاٹھی چاروں طرف سے ان کے سروں پر پڑ رہی تھی۔ وہ ہندوستان میں یومِ حساب کی منزل میں گھر چکے تھے۔ ان کی اُلٹی گنتی شروع ہوچکی تھی۔ ایسے عالم میں وہ ہندوستان سے بھاگنا چاہتا تھا۔ مگر بھاگنے میں بھی اپنے کالر کڑک رکھنا چاہتا تھا۔ یعنی باعزت پسپائی۔ اس لیے اسے ہندوستان سے فرار یا باعزت پسپائی کے لیے گاندھی جی کا فلسفۂ عدم تشدد نجات کا ایک واحد ذریعے نظر آیا۔ ورنہ ان تن کے اُجلوں، من کے کالوں کے ظلم وستم اور سیاہ کاریوں کے لیے تھوڑا پیچھے پلٹ کر دیکھیے تو پورا ہندوستان وادیِ ظلمات نظر آئے گا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے لے کر ۱۹۰۰ء صدی تک ۴۳ رسال کا یہ طویل عرصہ جو تقریباً نصف صدی پر مشتمل ہے یہ زمانہ غلامی ہندوستان کا بدترین وتاریک زمانہ تھا۔ وہ زمانہ ہندوستان بالخصوص مسلمانوں کے لیے خوف وہراس کا زمانہ تھا۔

اس طویل عرصے میں انگریزوں کے ظلم وستم اور وحشت وبربریت اور انسانیت سوزی کا سورج مسلمانوں کے سروں پر سوا نیزے پر تھا۔ انھوں نے اس طویل عرصے میں ستم کے ہر نئے انداز کے لیے مسلمانوں کو تاک رکھا تھا۔ اس طویل و تاریک دور میں ظلم وستم کا وہ کون سا تیر تھا جو مسلمانوں پر نہیں چلایا گیا۔ اور وہ کون سی عبرت ناک سزا تھی جو انھیں نہیں دی گئی۔ اُمرا، شرفا واہلِ نعمت بالخصوص علما ومشائخ کے ساتھ جو انتہائی حقارت وتوہین آمیز سلوک کیا اگر حیات مستعار کی چند سانسیں انھیں لینے بھی دیں تو انتہائی حقارت وذلالت کے ساتھ وہ علما ومشائخ جو علمی روحانی برتری کے ساتھ دینوی وجاہت وشوکت لیے ہوئے تھے، انھیں تہس نہس کر دیا۔ پندرہ ہزار (۱۵۰۰۰) سے زائد علما ومشائخ کو پھانسیوں، سولیوں اور سینوں پر گولیاں مار کر شہید کیا گیا۔

ایک انگریز مؤرخ ایڈورڈ ٹامس کی ڈائری کے مطابق ۱۸۸۴ء سے لے کر ۱۸۸۷ء تک انگریزوں نے علما کو ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور یہ تین سال ہندوستان کی تاریخ کے بڑے المناک سال ہیں۔ ان تین سالوں میں انگریزوں نے چودہ ہزار علمائے کرام کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ دلّی کے چاندنی چوک سے لے کر خیبر تک کوئی ایسا درخت نہیں تھا جس پر علما کی گردنیں نہ لٹکی ہوئی ہوں۔ علما کے جسم کو تانبے سے داغا گیا۔ علما کو سور کی کھال میں لپیٹ کر جلتے ہوئے تندور میں ڈالا گیا۔ علما

کو ہاتھیوں پر کھڑا کر کے درختوں سے باندھ کر ہاتھیوں کو نیچے سے چلا دیا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ دلّی کے خیمے میں مجھے مردار کی بدبو محسوس ہوئی۔ اس کو دیکھنے کے لیے جب میں خیمے کے پیچھے گیا تو دیکھتا ہوں کہ آگ کے انگارے دہک رہے ہیں اور چالیس علما کے کپڑے اُتار کر انھیں انگاروں پر ڈال دیا گیا۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے چالیس اور علما کو بلایا گیا۔ میرے سامنے ان کے کپڑے اُتارے گئے۔ انگریزوں نے ان سے کہا: مولویو! تم صرف اتنا کہہ دو ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہم شریک نہیں تھے۔ تو ہم تمہیں ابھی چھوڑ دیں گے۔ پھر وہ قسم کھا کر لکھتا ہے کہ ان میں کوئی عالم ایسا نہیں تھا جس نے انگریزوں کے آگے گردن جھکائی ہو۔ سارے عالم آگ میں پک گئے، مگر وہ جھکے نہیں۔

(ڈائری ایڈورڈ ٹامس، بحوالہ راشٹریہ سہارا، جنگ آزادی نمبر، ص ۱۴۳، شمارہ اگست ۲۰۰۷ء)

ایک صدی سے طویل عرصہ میں جس نے ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کے خون کو پانی سے زیادہ ارزاں کر دیا ہو، ان کی حرمت و ناموس اور عزتِ نفس کو ہمہ وقت اپنے بوٹ کے نیچے رکھا ہو۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہندوستان پر قبضے کے بعد صرف دو لاکھ انگریزوں نے ۳۲ رکروڑ ہندوستانیوں کو زر خرید غلام سے بھی بدتر رکھا اور پورے ملک کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے مقتل و مذبح و عقوبت گاہ بنا دیا ہو۔ وہ شری مان گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کے سامنے سرنگوں ہو گیا اور بڑی شرافت کے ساتھ ہندوستان گاندھی نہرو و پٹیل اور ابوالکلام کے حوالے کر کے چلا گیا۔۔۔۔ یا للعجب۔

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ

اے اسیرانِ چمن میں تو گرفتاروں میں ہوں

یہ وہ عظیم تاریخی و ناقابلِ فراموش قربانیاں ہیں مسلمانوں خاص کر علمائے کرام و مشائخ عظام کی ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے انگریزوں کی پسپائی کو سمجھنے کے لیے عراق کے موجودہ حالات کو سامنے رکھ کر اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ امریکہ کے اپنے سب سے بڑے اتحادی برطانیہ اور پوری دنیا کی طاقتوں کو اپنے پشت پر رکھ کر عراق پر اس یقین کے ساتھ حملہ آور ہوا کہ صرف چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں میں عراق کو فتح کر کے اور وہاں پر ہمارے فوجی چند روز پکنک منا کر ہنستے کھیلتے واپس آجائیں گے۔ لیکن امریکہ، برطانیہ و دیگر دنیا کی بڑی طاقتوں کا جو حشر ہوا عراق میں اور جو ہو رہا ہے اسے پوری دنیا ٹی وی اسکرین پر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ عراق ان کے لیے ایک ایسا دلدل بن چکا ہے کہ جس سے نکلنے کے لیے وہ جتنا زیادہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اتنا ہی زیادہ اور اس میں دھنستے جاتے ہیں۔ آج عراق امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے لیے ویت نام سے بدتر بنتا جا رہا ہے۔ عراقی جیالوں اور جذبۂ حریت سے سرشار عراقی دیوانوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی پوری قہرمانی قوتوں اور جدید ٹیکنالوجی کے باوجود بے بسی کی تصویر بنا رکھا ہے۔ جسے پوری دنیا اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ امریکہ کا سب سے بڑا اتحادی برطانیہ ذلت و رسوائی کا طوق پہن کر عراق سے بھاگ چکا ہے اور امریکہ بھی وہاں سے بھاگنا چاہتا ہے۔ مگر حالات اسے بھاگنے نہیں دے رہے ہیں۔ سپر پاور ہونے کے

غرور باطل کو تو عراقی جاں باز اپنے قدموں تلے روند چکے ہیں۔ عراق سے باوقار پسپائی کے لیے امریکہ کو عراق میں کسی گاندھی جی کی ضرورت ہے، جو بر وقت مل نہیں رہا ہے۔ جیسے ہی اسے کوئی عذر لنگ یا بہانہ ہاتھ آئے گا وہ بھی سر پر پاؤں رکھ کر برطانیہ کی طرح بھاگ لے گا۔

پھر جس دن ایسا ہوا اور وہ دن بہت جلد آنے والا ہے، جو انگلی کٹائے بغیر غازیوں، شہیدوں، مجاہدوں میں اپنا نام لکھوا لیں گے اور امریکہ اپنی مرضی کا سہرہ ان کے سروں پر باندھ کر بھاگ جائے گا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں یہی سب کچھ ہوا تھا۔ مجاہدین نے آزادی کے جذبہ حریت نے ایک قہر برپا کر رکھا تھا۔ دوسری جنگ عظیم نے الگ اس کی کمر دوہری کر رکھی تھی۔ وہ حالات کے ایسے گرداب میں پھنس چکا تھا کہ اسے ہندوستان سے جانا ہی تھا۔ یہ تو اس کی تقدیر سے کچھ لوگ مل گئے تھے جس کی وجہ سے اسے بھاگنے کی ذلت سے بچ جانا پڑا اور اس طرح ملک کی آزادی کا سہرہ ان کے سروں پر بندھ گیا کہ ملک کی آزادی میں جن کی ایک انگلی نہیں کٹی اور نہ ہی چند قطرے خون کے بہے۔ ہاں ملک کی آزادی کے لیے کچھ تگ ودو ضرور کی تھی۔ جس کے لیے ان کے پسینے ضرور بہے۔ ان پسینوں کی اہمیت وقت و حالات نے بہتے ہوئے لہو سے زیادہ قیمتی بنا دیے۔

زبان کھلے گی تو شعلے دہن سے نکلیں گے
جو سچ کہوں گا تو پھیلے گا انتشار بہت

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔ لیکن مسلمان پھر بھی غلام کے غلام ہی رہے ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک اس طویل عرصے میں اس وطن کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے جتنا لہو بہایا حیران کن قربانیاں دیں، حریت و ناموس جان و مال الغرض مسلمانوں کی ہمہ جہت قربانیوں سے آزادی کی تاریخ مالامال ہے۔ لیکن اس آزادی سے مسلمانوں کو کیا ملا؟ ملک آزاد ہوتے ہوتے دو ٹکڑوں میں بٹ گیا اور مسلمانوں کو تقسیم ملک کا ذمے دار قرار دے دیا گیا۔ اور مسلمانوں کو اس احساس میں مبتلا کر دیا گیا کہ تمھیں تمہارا حصہ پاکستان کی شکل میں مل چکا ہے۔ حالانکہ اس موضوع پر اگر کھل کر بحث کرائی جائے تو حقیقت روز روشن کی طرح کھل کر سامنے آجائے گی۔ کہ ملک کی تقسیم کے ذمے دار محمد علی جناح اور مسلم لیگ کم پنڈت نہرو، ولبھ پٹیل اور دیگر ہندوؤں اور کانگریسی لیڈر زیادہ ہیں۔ بقول کانجی دوارکا داس محمد علی جناح پاکستان نہیں جیتے بلکہ پنڈت نہرو، ولبھ پٹیل دیگر ہندو لیڈر جناح کے ساتھ پاکستان ہار گئے [1] (محمد علی جناح، از کانجی دوارکا داس)

منزل ہی خود آگہی کا قرب بڑھتا جائے ہے
ہوش کھوتا جائے ہے پردہ سا اٹھتا جائے ہے

انگریز ہندوستان سے چلے گئے مگر ہندوستانی مسلمان جو آج بیس کروڑ کی تعداد میں ہیں دوہری غلامی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ آج مسلمانوں کے حالات دوہری شہریوں جیسے ہو کر رہ گئے ہیں۔ وہ کون سا ظلم و ستم ایسا ہے جو مسلمانوں پر نہیں ٹوٹا۔

وحشت وبربریت کی وہ کون سی تاریخ ہے جومسلمانوں پر کے ساتھ نہیں دہرائی گئی۔ جوظلم انگریزوں نے روا رکھا تھا اس سے کہیں زیادہ ظلم وستم مسلمانوں پر ہو چکے۔ ۱۳ رہزار فسادات کے ذریعے مسلمانوں کو تباہ وبرباد کرنے کی کوشش میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ میرٹھ، ملیانہ، بھاگل پور، رانچی، مرادآباد، ممبئی کا ۹۲۔ ۹۳ کے فسادات، شہادتِ بابری مسجد کے ردِعمل میں ملک کے طول وعرض میں پھوٹ پڑنے والے فسادات میں مسلمانوں کی اجتماعی نسل کشی اور گجرات فسادات نے تو ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ آج مسلمان ہندوستان میں جو زندگی جی رہے ہیں اس سے کہیں بہتر تو انگریز کی غلامی ہی تھی۔ مسلمانوں کی مساجد وقبرستان میں بم پھوٹتے ہیں۔ مجرم کے طور پر گرفتار مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ جرم ملک کے کسی کونے میں ہو، گردنوں میں پھندا ڈالنے کے لیے مسلمان حاضر ہیں۔ مالیگاؤں قبرستان، مکّہ مسجد حیدرآباد میں بموں کے ذریعے جو تباہی پھیلی پولیس کے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر مسلمان مجرم کی حیثیت سے مل گئے۔ آج مسلمانوں کی مجموعی حالت اس ملک میں حکومت کی بدولت بہت بدتر ہو چکی ہے۔ جیسا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ مسلمانوں کی تمام تر بدحالی کا ثبوت ہے۔ وہ ملک کیوں کر ترقی یافتہ مما لک کی صفوں میں جگہ پا سکتا ہے، جس کی ۲۰ رفی صد آبادی غربت وبدحالی اور معاشی ناہمواری کا شکار ہو۔ آزادی کے بعد سے لے کر اب تک مسلمانوں کے اتنے مقتل، اتنے مذبح اور اتنے کربلا اس ہندوستان کے اندر عالمِ وجود میں آئے جن کا شمار بھی بہت مشکل ہے۔ صرف اس جرم میں کہ ہم یہاں اپنے اسلامی تشخص کے ساتھ کیوں مسلمان ہیں۔ ہماری آبرومندانہ بقا فرقہ پرستوں کو بہت کھٹکتی ہے۔ دراصل پانچ ہزار برس سے یہاں انسانوں کی غالب ترین آبادی چند اونچی ذات کے ہندوؤں کی غلام کی حیثیت سے رہتی تھی۔ اپنے سارے نچلے کام وہ انھیں سے کرواتے تھے۔ شدرا چھوت و کمین بنا کر ساری غلاظت وذلالت ان کی تقدیر بنا دی گئی تھی اور یہ لوگ ان اونچی برادری کے ہندوؤں کے بندھوا مزدور اور ان کی بہن بیٹیاں رکھیل کی حیثیت رکھتی تھیں۔

اب سیاسی بیداری کے باعث یہ کروڑوں افراد ان کے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں اور ان میں بھی اب ایک طبقہ اس پوزیشن میں پہنچ چکا ہے کہ ان سے بھی وہی خدمات لے جو پانچ ہزار برس سے یہ مٹھی بھر اونچی ذات کے لوگ ان سے لیتے آئے ہیں۔ شیڈول کاسٹ کے نام سے یہ طبقہ ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ چونکہ ہزاروں سال سے حکمرانی وآمرانہ ذہنیت ورثے میں ملی ہے اس لیے ان شدر وکمین لوگوں کی جگہ پر بیس کروڑ مسلمانوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے پاؤں کی جوتیاں بنا کر۔ حالانکہ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔

مسلمانوں کے دستوری حقوق صرف کاغذ ہی پر محفوظ ہیں۔ عملاً ان کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی ہے۔ بقیہ کروڑوں اقلیتیں ان کی رہینِ منت وزیرِ احسان۔ ان کے حقوق صرف کاغذ پر ہیں۔ عملاً دور دور تک ان کا پتہ نہیں۔ اقلیتوں کے حقوق کی پامالی کی عمر ۶۶ ربرس ہو چکی ہے۔ دراصل ۱۵ راگست جہاں ہندوستان کی آزادی کا، مظلوموں اور مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کا دن بھی ہے۔ وہ ملک کیوں کر ترقی یافتہ کہلانے کا حقدار ہو سکتا ہے جہاں قدم قدم پر اقلیتوں بالخصوص

مسلمانوں کے حقوق پامال ہوتے ہوں۔ حالانکہ دستورِ ہند میں بغیر کسی تفریق کے سب کو یکساں اقتصادی، معاشی اور سیاسی اختیارات حاصل ہیں۔ جو صرف کاغذ پر ہیں۔ تمام حقوق عملاً صرف ہندو اکثریت کو حاصل ہیں۔ اور مسلمانوں کا حامی و ناصر تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور بس۔

وھو حسبنا۔ حسبنا اللہ و نعم الو کیل نعم المولیٰ و نعم النصیر

مطمئن ہیں وہ ستم ڈھا کر کے یوں مجھ پہ احسان کیا ہو جیسے

☑☑☑☑☑☑

آئینۂ تعزیت زوجۂ جمال

تعزیت نامے برائے زوجہ محترمہ علامہ وارث جمال قادری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انا للہ وانا الیہ راجعون

محترم المقام حضرت علامہ وارث جمال صاحب قبلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

انتہائی صدمہ کے ساتھ یہ المناک خبر مسموع ہوئی کہ آپ کی شریک حیات آخرت کے سفر پر روانہ ہوگئیں ولہ ما اعطی ولہ ما اخذ، اللہ کی نیک بندی تھیں اللہ کے زیر سایۂ رحمت زندگی کا آخری سفر مکمل فرمالیا۔

ابھی دو سال پہلے میں بھی ایسے حالات سے گزر چکا ہوں اور اب محبتوں کے ہجوم میں خود کو تنہا محسوس کرر ہا ہوں، قرآن عظیم نے تعزیت اور تسلی کے جو کلمات عطا فرمائے ہیں اس سے بہتر تعزیت اور کلمات تسلی دنیا کے کسی ادب میں موجود نہیں ہے۔

غم اس کا ہوتا ہے جو ہمیشہ کے لئے اپنے گھر سے باہر جارہا ہے مگر اس کا کیا غم جو اپنے حقیقی گھر کے لئے روانہ ہو جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا کو آپ کو صبر جمیل سے نوازے امین بجاہ سید المرسلین ﷺ

قرآن پاک کی متعدد آیات اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ والدین میاں ہوں اور بچے یا دیگر اہل خانہ اگر نیک ہیں تو جنت میں ایک جگہ کر دئے جائیں گے اور پھر کبھی جدا نہ ہوں گے تو میاں جدائی وقتی ہے اور ان شاء المولی وصال دائمی ہوگا خدا مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں میری طرف سے جملہ اہل خانہ اور متعلقین کو تلقین صبر کے ساتھ تعزیت پیش کرتا ہوں۔ فقط

شریک غم

محمد قمر الزماں خان اعظمی

سکریٹری جنرل ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ

/۲/۲۰۲۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نازش لوح وقلم حضرت مولانا محمد وارث جمال صاحب مدظلہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

رات آپ کے فون سے معلوم ہوا کہ گزشتہ جمعہ مبارکہ کی شب کو رفیقۂ حیات زبان حال سے کل نفس ذائقة الموت، ویبقیٰ وجه ربك ذوالجلال والاکرام ، کہتی ہوئیں آپ کو اس دار فنا میں تنہا چھوڑ گئیں۔

خدا ان کو جنت اور آپ کو صبر و قرار دے!

مجھے تنہائی کی زندگی گزارتے ہوئے سولہ سال ہو گئے۔ اور جب تک اجل مسمی نہیں آجاتی لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون کے بموجب اسی طرح کاٹے جانا ہے۔ یعنی

ہنس کر گزار یا اسے روکر گزار دے

فجر کے بعد فقیر کے ساتھ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے قرآن کریم کی تلاوت کر کے مرحومہ کی روح کو ایصال ثواب کیا، ان کی مغفرت اور پسماندگان کے صبر و استقامت کے لئے دعا کی۔

دعا گو و دعا جو

فقیر محمد مطیع الرحمٰن رضوی غفرلہ

جامعہ نوریہ، شام پور، رائے گنج، ضلع اتر دیناج پور، مغربی بنگال

۲۶ جمادی الآخرہ ۱۴۴۴ھ — 19-01-2023

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری
مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج آپ کی تحریر ''پرخلوص گزارش اور مؤدبانہ التجا'' نظر سے گزری۔ جس سے آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کی اطلاع ملی۔ انا للہ وانا الیہ رجعون۔

اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے ایک مقررہ میعاد کے بعد سفر آخرت کی جانب روانہ ہو جانا ہے۔ ہم سب اللہ عزوجل کی امانت ہیں اور اسی کی جانب کوچ کرنے والے ہیں۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی اس دنیائے فانی میں اپنی حیات مستعار مکمل کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوگئیں للہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل شیئ عندہ الی اجل مسمی۔ آپ کی شریک حیات کی رحلت آپ کے لیے اور ان کے قرابت داروں کے لیے روح فرسا گھڑی، جاں گسل لمحہ اور جاں کاہ صدمہ ہے۔ اس غم ناک گھڑی میں صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اللہ عزوجل اپنے بندے کو صبر پر بے پایاں اور بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔

ہم آپ کی رفیقۂ حیات کی رحلت پر صبر کی تلقین کرتے ہیں اور انھیں چند کلمات کے ساتھ آپ کو اور جملہ اہل خانہ کو تعزیت پیش کرتے ہیں۔ اللہ عزوجل مرحومہ کی مغفرت فرمائے، شمیم جنت کی راحتیں نصیب فرمائے، آپ کو اور ان کے جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل اور اجر جزیل عطا فرمائے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَهَا ، وَارْحَمْهَا ، وَعَافِهَا، وَاعْفُ عَنْهَا ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهَا ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهَا ، وَاغْسِلْهَا بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ ، وَنَقِّهَا مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهَا دَارًا خَيْرًا مِنْ دَارِهَا ، وَأَهْلًا خَيْرًا مِنْ أَهْلِهَا ، وَزَوْجًا خَيْرًا مِنْ زَوْجِهَا ، وَأَدْخِلْهَا الْجَنَّةَ ، وَأَعِذْهَا مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ۔ آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

شریک غم

محمد نظام الدین رضوی

شیخ الحدیث وصدر شعبہ افتا جامعہ اشرفیہ مبارک پور

27/جمادی الآخرہ 1444ھ 20/جنوری 2023ء جمعہ

نزیل گجرات

محترم المقام امیر القلم ناشرِ مسلکِ اعلیٰ حضرت!

حضرت علامہ الحاج محمد وارث جمال صاحب قبلہ قادری مدظلہ العالی مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغِ سیرت

السلام علیکم ورحمۃ اللہ تعالیٰ وبرکاتہ

آج مورخہ 21 جنوری 2023ء کو میں دیارِ اعلیٰ حضرت بریلی شریف سے حیدرآباد دکن کے لئے ایئرپورٹ پر آیا اسی وقت آپ نے موبائل پر یہ اندوہناک خبر دی کہ آپ کی اہلیہ صاحبہ وصال فرما گئیں۔

اناللہ وانا الیہ رٰجعون

میں نے فوراً حضور محبوبِ ملت حضرت علامہ حافظ قاری الحاج الشاہ مفتی محمد محبوب عالم صاحب قبلہ رضوی سنی بریلوی قاضیٔ شہر اجین کو خبر دی حضرت نے بھی افسوس کیا مجھ کو تعزیت پیش کرنے کے لئے فرمایا کیونکہ حضرت کے پاس آپ کا فون نمبر نہیں ہے اور فرمایا کہ میں ابھی ایصالِ ثواب کیلئے دارالعلوم رضویہ غریب نواز میں طلبہ ومدرسین سے کہتا ہوں۔علامہ صاحب آپ ماشاءاللہ بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں آپکی دینی خدمات قابلِ قدر ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے امیدِ قوی ھے کہ اس کا اجرِ عظیم محترمہ صاحبہ کو بھی سرکاروں کے صدقے میں میرا رب عطا فرمائے گا—ہم لوگ آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں بارگاہ خداوندی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے میں اور مرحومہ صاحبہ کے پیرومرشد سلطان المناظرین رئیس اعظم اڑیسہ سیدی سرکار مجاھدِ ملت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طفیل ان کے صغائر وکبائر گناہوں کو معاف فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین یارب العالمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ اصحابہ اجمعین

شریکِ غم

سگِ بارگاہ اعلیٰ حضرت

محمد لیاقت رضا نوری

ناظم اعلیٰ دارالعلوم رضویہ غریب نواز رضا نگر اجین مدھیہ پردیش

نزیل حیدرآباد دکن

السلام علیکم

فقیر سفر پر تھا، اسی دوران یہ بڑی افسوس ناک خبر ملی کہ علامہ وارث جمال قادری کی اہلیہ اس دار فانی سے دار جاویدانی کی طرف کوچ فرما گئیں۔ اناللہ وانا الیہ رٰجعون۔

رب کریم مرحومہ کی مغفرت فرمائے جنت نعیم میں جگہ عطا فرمائے حضرت اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین جامعہ میں طلبہ طالبات نے قرآن خوانی کی مرحومہ کیلئے ایصال ثواب کیا گیا۔

یہ جان کر بے حد افسوس اور قلبی صدمہ گزرا کہ بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب رئیس التحریر حضرت علامہ وارث جمال قادری صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت بمبئی کی اہلیہ محترمہ کا گزشتہ دنوں قدرے علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ رٰجعون

رب قدیر مرحومہ کو غریق رحمت اور خصوصی مغفرت سے نوازے آمین یارب العٰلمین۔ مرحومہ صوم وصلوٰۃ کی پابند نہایت ہی دین دار اور تقویٰ شعار خاتون تھیں۔

امام التارکین، سلطان المناظرین، حضور مجاہد ملت علامہ الشاہ محمد حبیب الرحمٰن قادری رئیس اعظم اڑیسہ سے شرف بیعت وارادت بھی رکھتی تھیں، ایک نیک سیرت اور وفا شعار شریک حیات کا اچانک داغ مفارقت دے جانا یقینی طور پر کسی عظیم سانحہ سے کم نہیں۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک تقویٰ کے بعد مومن کے لئے سب سے بڑی نعمت نیک بیوی ہے، نیک بیو[ی] کی نشانی یہ ہے کہ جب اس کا شوہر اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کر دے۔

عن ابی هریرة قیل لرسول الله ﷺ ای النساء خیر قال النبی تسرہ اذا نظر وتطیعه اذا امرا۔ (راوہ نسائی)

وفا کیش اور اطاعت مند رفیق حیات کی حیثیت درخت سایہ دار کی طرح ہوتی ہے۔ جس کی رفاقت اپنے شوہر کو زندگی کے صحراء میں گرم ہواؤں سے محفوظ رکھتی ہے، اسے ہر لمحہ حیات تازہ بخشتی ہے۔ وہ غم اور خوشی میں برابر کا شریک ہوتی ہے۔ مگر مقدرات کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اس دنیائے فانی میں کسی کو بھی دوام وثبات نہیں۔ دنیا دار عمل ہے اور آخرت دار جزاء ہے۔ ہم سب کو دار جزاء کی طرف ایک متعینہ عمر کے بعد لوٹ جانا ہے۔ ابتلاء وآزمائش کی اس گھڑی میں ہم سب علامہ وارث جمال قادری زیدہ مجدہ کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ اللہ جل شانہ ابھی بے پناہ توفیقات صبر وشکیب سے نوازے۔ اوران کا سایۂ عاطفت اہلسنت کے سروں پر بہت دیر تک باقی رکھے۔ آمین

میں اپنی اور ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ کے جملہ قائدین کی جانب سے حضرت علامہ وارث جمال قادری اوران کے جملہ اہل خانہ کو تعزیت پیش کرتا ہوں۔

شریک غم: **محمد فروغ القادری**

ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ (برطانیہ)

مولانا وارث جمال کو صدمۂ عظیم

اس حقیقت کا اندازہ و مشاہدہ سبھی کو جب ایک شریف النفس خوش اخلاق، فعال اور صاحب علم کو بد مزاج، ضدی اور گستاخ بیوی مل جاتی ہے یا جن کا بیٹا اور بیٹی غیر محتاط اور غلط راستے پر چل پڑتی ہے تو باپ کی زندگی اجیرن اور گھر کا ماحول خراب بن جاتا ہے تاہم جذبۂ ایمانی رمق اور دینی ذمہ داریوں کا احساس اس کشمکش کے باوجود تدریسی، تصنیفی، تبحری اور تبلیغی مشن پر آنچ نہیں آنے دیتا ایسے قابل قدر حضرات ملت کے لئے عبرت بن جاتے ہیں۔

جماعت کے ممتاز و نامور عالم دین اور صاحب قلم محب گرانقدر حضرت مولانا وارث جمال صاحب قبلہ مصباحی کو اللہ تعالیٰ ازدواجی اذیت سے ہمیشہ محفوظ رکھا اور محترمہ حسن بانو شکل میں ایسی راحت بخش نعمت ملی کہ موصوفہ کی موجودگی میں تمام زندگی خوشگوار، پرسکون اور سازگار رہی قال میل اور اتحاد و اتفاق کی تجلیوں نے دونوں شاد و شاداں رکھا۔ ۵۲ر برس ساتھ رہنے کے بعد ۶۵ر سال کی عمر میں مولانا موصوف کی نیک سیرت شریک حیات محترمہ حسن بانو (علیہا الرحمہ) دار فانی کو خیرباد کہہ گئیں اناللہ وانا الیہ راجعون، مولانا موصوف کو اچانک اس شدت غم نے نڈھال کر کے رکھ دیا کثیر اوصاف ومحاسن اور اخلاقی روش کی یادوں نے تمام فیصلوں کو متاثر کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں مولانا موصوف اور ان کے بچوں کو صبر جمیل اور قوت برداشت کی توفیق عطاء فرمائے۔

مرحومہ ماشاء اللہ بہت دیندار محتار شوہر نواز خاتون تھیں۔ علمائے دین اور اصحاب دانش کی آمد پر اظہار مسرت کرتے ہوئے تواضع کرتیں۔ سادات کرام کا خصوصی ادب واحترام کرنے کو اپنی سعادت سمجھتیں رشتہ داروں اور پڑوسیوں میں مرحوم کا اخلاقی کردار اور خدماتی جذبہ بہت معقول تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں غریق رحمت فرمائے ان کی تربت پر رحمتوں کی بارش کرے اور زندگی بھر کی تمام نیکیوں کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ آمین

غم زدہ

سید شمیم احمد گوہر مصباحی، ایرایاں

04/02/2023

جماعتِ اہلِ سنت کے ممتاز ترین عالم دین، رئیس التحریر، آبروئے فکر وقلم، مصنف کتب کثیرہ حضرت علامہ وارث جمال قادری صاحب قبلہ مدظلہ العالی کی شخصیت جہان لوح وقلم میں محتاج تعارف نہیں آپ کی درجنوں کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل فضل وکمال اور صاحب فکر وبصیرت سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں آپ کی تحریریں وفور علم، استحضار ذہن، وسعت مطالعہ، اشعار کی برجستگی، علم کی گہرائی وگیرائی، ادبی لطافت، معلومات کی فراوانی، قلم کا وقار، معنی آفرینی، فکر وتخیل کی بلندی اور پاکیزہ لب ولہجہ کا شور ہر سطر سے سنائی دیتا ہے۔

صد حیف کہ آپ کی شریکِ سفر 6 رجنوری 2023 بروز جمعہ اس دار فانی سے کوچ کر گئی انا للہ وانا الیہ راجعون اس عمر میں شریکِ حیات کا داغ مفارقت دینا کسی کے لیے بھی بہت بڑی مصیبت کا سبب ہوتا ہے اور خاص طور سے آپ جیسی مصروف ترین شخصیت جن کے رات دن کے بیشتر اوقات قرطاس وقلم اور مطالعہ کتب میں گزرتے ہوں ان کے لئے تو کچھ زیادہ ہی غم کا باعث ہے کیونکہ امور خانہ داری سے لے کر بال بچوں کی پرورش وپرداخت تک ساری ذمہ داری بہ حسن وخوبی انجام دے رہی ہوں اور اچانک ایسے ساتھی کا ساتھ چھوڑ دینا یقیناً پریشانی سے دوچار ہونا ہے۔ مرحومہ نہایت نیک، اپنے بچوں پر شفیق، خوف خدا سے آراستہ اور صوم وصلوٰۃ کی حد درجہ پابند تھیں، اپنے شوہر کی فرمانبرداری اور وفا شعاری ان کا خاص وصف تھا، بچوں کی تربیت میں بھی بہت ہی اہم کردار ادا کیا۔ خدائے غافر وغفور مرحومہ کی مغفرت فرمائے، ان کی قبر پر رحمت وغفران کی بارش فرمائے، ہر چھوٹی بڑی خطا کو معاف کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

سوگوار

محمد قمر الزماں مصباحی

ڈائریکٹر ادارہ لوح وقلم مظفر پور بہار

پیکر اخلاص ومحبت واجب الاحترام حضرت مولانا الحاج محمد وارث جمال قادری صاحب قبلہ دامت برکاتہم العالیہ
صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ!

آپ کی اہلیہ مرحومہ کی خبر وفات حسرت آیات سن کر انتہائی افسوس ہوا فقیر ودیگر اساتذہ نیز طلبہ ادارہ نے ایصال ثواب کیا اوران کی مغفرت و بلندیٔ درجات کے لیے دعائیں کیں۔ مرحومہ کا انتقال اہلِ خانہ و دیگر اقارب بالخصوص آپ کے لئے انتہائی غم واندوہ کا باعث ہے اللہ تعالیٰ سب کو صبر واجر عطا فرمائے۔ آمین انسان دنیا میں جتنی لمبی زندگی گزار لے بالآخر ایک دن راہی ملک عدم ہونا ہے ارشاد ربانی ہے۔ وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد۔ کسی بشر کے لئے ہمیشگی نہیں، کل من علیہا فان حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں عرض کیا عِش ما شئت فانك ميت واحبب من شئت فانك مفارقه ۔ یہ دنیا فنا کے داغ سے داغدار ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ كل نفس ذائقة الموت ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ فقیر آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔
انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهَا وَارْحَمْهَا وَعَافِهَا وَاعْفُ عَنهَا وَاَكْرِمْ نُزُلَهَا وَوَسِّعْ مُدْخَلَهَا وَاغْسِلْهَا بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ وَنَقِّهَا مِنَ الْخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الْاَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ وَاَبْدِلْهَا دَارًا خَيْرًا مِّنْ دَارِهَا وَاَهْلاً خَيْرًا مِّنْ اَهْلِهَا وَزَوْجًا خَيْرًا مِّنْ زَوْجِها وَاَدْخِلْهَا الْجَنَّةَ وَاَعِذْهَا مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْقَبْرِ وَعَذَابِ النَّارِ

اصبر لكل مصيبة و تجلد — واعلم بأن المرء غير مخلد
فاذا اتتك مصيبة يشجى بها — فاذكر مصابك بالنبي محمد

فقیر کو یقین ہے کہ مرحومہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کی بشارت پا کر اپنے رب کے حضور مسرور و شادمان ہوں گی اور زبان حال سے کہہ رہی ہوں گی یا لیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین

جھونکے نسیم خلد کے ہونے لگے نثار — جنت کو اس گلاب کا تھا کب سے انتظار

اللہ تعالیٰ آپ و دیگر اہلِ خانہ کو صبر کے ساتھ اس حادثۂ فاجعہ کو برداشت کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

یکے از سوگواران **محمد عرفان لطفی نعیمی سنبھل**
موبائل 9897013662

رئیس التحریر نمونۂ سلف حضرت علامہ وارث جمال قادری صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت جو سیدی مجاہد ملت قدس سرہ کے مقربین میں سے ہیں ان کی اہلیہ محترمہ حسن بانو بنت عبد المجید جن کا انتقال ۱۲ ر جمادی الاخری ۱۴۴۴ ھ مطابق 5 جنوری 2023 شب جمعہ کو ہو گیا (الاسترجاع)

مرحومہ نیک، پارسا، بزرگان دین بالخصوص غوث اعظم اور مجاہد ملت کی دیوانی اور سادات کرام کی شیدائی تھیں، اللہ انکو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے اور حضرت علامہ وارث جمال قادری کو صبر اور اس صبر پر اجر عطا فرمائے آمین یارب العلمین بجاہ النبیٔ الامین علیہ اکرم التسلیم۔

الجامعۃ القدوسیہ، بھدرک شریف، اڈیشا میں آج مرحومہ کی روح کو ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی اور کلمہ خوانی کی گئی جس میں طلبۂ جامعہ کے علاوہ اراکین و مصلین نے شرکت کی رب تعالی بطفیل رسول اعلی حسن بانو مرحومہ کو قبر و حشر میں حسن و زیبائش سے سرفراز کرے آمین بجاہ النبی الکریم علیہ اکرم التسلیم

-------پیش کش-------

(قاری) فیضان احمد قادری

ناظم نشر و اشاعت خانقاہ قدوسیہ، بھدرک شریف، اڈیشا

* * * * * * * * * * * * * * * * * * *

انا للہ وانا الیہ راجعون

اللہ تبارک وتعالی اپنے حبیب اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے طفیل مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنتیں عطا فرمائے۔ آپ کو اور گھر کے تمام افراد کو صبر کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین یارب العالمین انشاء اللہ تعالی ابھی مغرب کی نماز میں مسجد حسنین میں دعا ہوگی۔ اور آئندہ کل مدینۃ العلوم انسٹیٹیوٹ کلکتہ میں بھی دعا کا اہتمام ہوگا۔

خیر اندیش: **محمد مجاہد حسین حبیبی**، کلکتہ

خادم آل انڈیا تبلیغ سیرت مغربی بنگال

تعزیت نامہ

بخدمت حضرت بابرکت ادیب شہیر سلطان القلم ملک التحریر فاضل علوم عقلیہ ونقلیہ حضرت علامہ وارث جمال قادری فیضی مصباحی مدظلہ العالی

5 جنوری سن 2023 کی شب جوشب جمعہ تھی میں آپ کی شریک حیات علیھا الرحمہ کے وصال کی خبرسن کر بڑا صدمہ ہوا آپ کی اہلیہ جوصوم وصلوٰۃ اوراد ووظائف صلوٰۃ وسلام کی سخت پابند تھیں جس کی وجہ سے آپ کا گھر جنت نشان بنا ہوا تھا اور کیوں نہ ایسا ہوتا جب کہ آپ مخدوم الملت سید العابدین سلطان المناظرین رئیس اعظم اڑیسہ امام المتقین حضرت علامہ حبیب الرحمٰن قادری المعروف حضور مجاھد ملت علیہ الرحمۃ والرضوان سچی مریدہ تھیں مرحومہ کی یہ نسبت تو بڑی مضبوط تھی ہی اس پر مستزاد آپ جیسے شہرہ آفاق حق گو وحق شناس قاید اسلام کی شریک حیات تھیں جنھوں نے آپ کو ہر موڑ پر مضبوط سہارا دیا آپ کو خدمت دین واسلام کے لیے بھرپور حوصلہ دیا آپ کے گھر کو جنت نشان بنا کے رکھا ایسے بہترین ہم نشین و ہم سفر کا آپ سے دور رحمت الٰہی کی آغوش میں چھپ جانا آپ کے لیے انتہائی روح فرسا ہے ان کی یادوں کا جو درد وکرب آپ کو جھنجھوڑ رہا ہے اسے لفظوں کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا میری دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل آپ کو صبر وقرار عطا فرمائے اور مرحومہ کی بے حساب مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور انکے درجات بلند فرمائے اور پورے خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب اس مصیبت کی گھڑی میں آپ کے ساتھ ہیں فقط والسلام

خلیفۃ فخر المشائخ
مفتی غلام معین الدین چشتی فیضی
شیخ الحدیث وخادم الافتاء جامعہ اھل سنت فاطمۃ الزہرا
نارائن نگر گھاٹ کوپر ویسٹ
وخطیب وامام فاروقیہ جامع مسجد ٹرسٹ اندھیری ویسٹ ممبئی58

تاثر تعزیت

یوں تو ہر جاندار کو موت سے ہم آغوش ہونا ہی ہے مگر کبھی کبھی اس یقین کامل کے باوجود کچھ واقعات اس طرح وقوع پذیر ہوجاتے ہیں جو ذہن ودماغ کو شل کردیتے ہیں۔

۴؍جنوری ۲۰۲۳ کو نبیرۂ شعیب الاولیاء حضرت مولانا فرید احمد عثمانی کے انتقال پر ملال کا غم ذہن ودماغ پر حاوی ہی تھا کہ ان کے فاتحہ سوم کے دن ہی مولانا فرید احمد کے صاحبزادے مولانا رضوان احمد عثمانی نے بتایا کہ فیس بک پر صاحب قلم رئیس التحریر ادیب شہیر مولانا وارث جمال درقادری صاحب اللہ العالی تھے۔ اہلیہ محترمہ جن صاحبہ کے انتقال کی خبر گشت کررہی ہے۔ افسوس کے ساتھ اسی وقت اپنے جگری دوست بچپن کے ساتھی ہر خوشی وغم میں سہارا بننے والے کی دلی کیفیت کو سوچ کر دل پاش پاش ہوگیا۔ بہرصورت مولانا موصوف سے فورا رابطہ قائم کیا، حالات معلوم کئے مگر صبر وتلقین کے سوا تو اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے صبر جمیل ودعائے جزیل کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں عرض کناں ہوں کہ مولیٰ تعالیٰ اپنے کرم سے مرحومہ کی بخشش فرما کر روح کو اعلیٰ علّیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

شریک غم

محمد اسماعیل علوی الہاشمی

سابق صدر المدرسین شیخ الحدیث دار العلوم فیض الرسول براؤں شریف

* * * * * * * * * * * * * * * * * * *

انتہائی غم والم کے ساتھ یہ روح فرسا اطلاع دی جارہی ہے کہ حضرت علامہ وارث جمال صاحب قبلہ قادری (صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت) کی اہلیہ کا آج رات ۶ جنوری دس بجے انتقال ہوگیا ہے اناللہ وانا الیہ راجعون آپ حضرات سے گزارش ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں

ظفر احمد نورانی

وہ جوایک دعائے سکون تھی

۵ رجنوری ۲۰۲۳ جمعہ کی رات مجھ پر اور میرے پورے خاندان پر ایک ایسی ہلاکت خیز بجلی گری جس نے ہمارے خرمن وجود کو نیست و نابود کر دیا۔ جب ڈاکٹر نے یہ دل خراش خبر دی کہ آپ کی والدہ نہیں رہی بہت دیر لگی حسرت و یاس غم واندوہ کی کیفیت سے باہر آتے آتے۔ زندگی کی رفتار، دنیا کی رونقیں سب یکلخت تھم گئیں۔

یقین ہی نہیں ہورہا تھا کہ میری دعائے سکون کھوگئی۔ میرا باغ ارم اجڑ گیا۔ میرے انتظار میں جاگتی ہوئی آنکھیں اب سوگئیں۔ میرے لیے دعاؤں والے ہاتھ اب گر چکے ہیں۔ میری کامیابیوں پر خوشی سے تمتما تا چہرہ بجھ چکا ہے۔ میری ناکامیوں پر حوصلہ دیتی زبان اب خاموش ہو چکی ہے۔ ع

خاک میں ڈھونڈتے ہیں ہونا لوگ ہم نے سونا سپرد خاک کیا

زندگی اب بھی چل رہی ہے۔ تعزیت کے لیے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ سب اپنے شب و روز میں مشغول ہو چکے ہیں مگر میرے گھر کی ویرانی ہے کہ ختم نہیں ہوتی۔ نہ جانے کیا خلا ہے جو پر ہی نہیں ہوتا۔ ماں کے لیے بہت کچھ نہ کر پانے کا افسوس ختم نہیں ہوتا۔ تنہائی، تاریکی و غم پیہم کے منحوس سائے ہر طرف اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہیں۔

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر اداسی بال کھولے سو رہی ہے

اب معلوم ہوا کہ ایک زاہدہ، عابدہ، تہجد گزار بالخصوص صبر و شکر کی پیکر میری ماں کے خاموش وجود میں کتنے قہقہے پھوٹتے تھے۔ ان کی کم گوئی میں گفتار و سخن کے لئے ہی باب پوشیدہ تھے۔ ان کی ہلکی سی مسکراہٹ میں ہمارے پورے گھر کی زندگی کی رمق چھپی ہوئی تھی۔

بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں شب جمعہ کی ساری سعادتیں نصیب کرے۔ ان کے صبر و شکر کی بہترین جزا عطا کرے۔ ہمیں اور بالخصوص میرے والد کو صبر جمیل عطا کرے۔

میری زندگی کا جو وقت ہے میری التجا ہے تو بس یہی
کٹے اس کی اجلی دعاؤں میں تیری بخششوں کے دیار میں
میری ماں کی روح جمیل کو سدا رکھنا اپنے جوار میں
سدا پر فضا وہ لحد رہے بڑی لطف خاص کی چھاؤں میں

طالب مغفرت
مولانا آصف جمال بن حسن بانو محمد وارث جمال

افسوس صد افسوس

ابھی ابھی یہ خبر سن کر بدن پر لرزہ طاری ہو گیا کہ ہندوستان کے بہت بڑے عالم دین صاحب تصنیف کثیرہ ادیب شہیر رئیس التحریر حضرت علامہ ومولانا الحاج الشاہ وارث جمال قادری صاحب قبلہ مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی مہاراشٹرا کی اہلیہ کا آج رات ۱۰ بجے شب جمعہ میں انتقال ہو گیا ہے لنا للہ وانا الیہ رٰجعون

ابر رحمت انکی مرقد پر گہرباری کرے — حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

اللہ رب العزت اپنے پیارے حبیب ﷺ کے صدقے مرحومہ کی مغفرت فرمائے پسماندگان بالخصوص شہزادگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

شریک غم
عطاء الرحمن قادری فیضی
مقیم حال مدینہ منورہ

انا للہ وانا الیہ رٰجعون

رب قدیر بوسیلہ اپنے حبیب رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم مرحومہ کی بے حساب مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ حضرتِ علامہ وارث جمال صاحب وجملہ اہل خانہ کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

شریک غم
عبد القدوس یار علوی

ادیب شہیر رئیس القلم حضرت علامہ وارث جمال قادری مدظلہ العالی کی اہلیہ محترمہ کا گذشتہ شب رات دس بجے انتقال پر ملال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ رٰجعون

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل مرحومہ کی بے حساب مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین بالخصوص حضرت علامہ وارث جمال قادری مدظلہ العالی کو صبر وقرار عطا فرمائے آمین بجاہ النبی الامین صلی اللہ علیہ وسلم

رب قدیر مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ بالخصوص علامہ وارث جمال صاحب کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین ثم آمین یارب العالمین۔

دعا گو: **عبد المصطفیٰ ازہری**
خادم جامعہ حنفیہ رضویہ

انا للہ وانا الیہ راجعون
پروردگار عالم حضرت علامہ وارث جمال صاحب کی اہلیہ کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین

شریک غم
قاضی رضوان احمد عثمانی فیضی
قاضی بگولہواں شہرت گڑھ سدھارتھ نگر

☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼

دکھ بھری خبر

شوشل میڈیا کے ذریعہ دکھ بھری خبر ملی کہ نازش قلم وقرطاس شہرہ آفاق ادیب وقلمکار حضرت علامہ الحاج محمد وارث جمال قادری صاحب صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی کی شریک حیات کا آج انتقال پر ملال ہو گیا ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ رب العزت اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں مرحومہ کی مغفرت فرما کر انہیں جنت الفردوس کی بہاروں میں جگہ عنایت فرمائے حضرت علامہ محمد وارث جمال صاحب اوران کے شہزادگان و متعلقین کو صبر جمیل واجر جزیل عطا فرمائے آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

شریک غم وسوگوار
عبداللہ عارف صدیقی
بگولہوا قاضی شہرت گڑھ ضلع سدھارتھ نگر یوپی

☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼☼

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیارے حبیب سید عالم نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وصحبہ وبارک وسلم کے صدقے میں حضرت مولانا محمد وارث جمال صاحب کی شریک حیات کی مغفرت فرمائے اور حضرت نیز ان کی آل و اولاد کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔ آمین یارب العالمین برحمتك یاارحم الراحمین

تیمی علیم اللہ الصدیقی النوری المصباحی
ناسک مہاراشٹر

ادیب شہیر رئیس القلم حضرت علامہ ومولانا وارث جمال صاحب قادری مدظلہ العالی کی اہلیہ محترمہ کا گذشتہ شب رات دس بجے انتقال پرملال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ رٰجعون

اللہ رب العزت جل جلالہ اپنے حبیب پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقہ وتوسل مرحومہ کی بے حساب مغفرت فرمائے اوران کے درجات بلند سے بلندتر فرمائے جملہ لواحقین کوصبرجمیل عطافرمائے آمین یارب العالمین بجاہ سیدالمرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

شریک غم

محمداحسان احمدقادری چشتی یارعلوی ارشدی

وجملہ مدرسین وملازمین

دارالعلوم اہل سنت نورالعلوم ٹنڈواسدھارتھ نگر

✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲ ✲

اناللہ وانا الیہ رٰجعون! چندیوم قبل ادیب العصر حضرت علامہ الحاج محمدوارث جمال صاحب قادری کے در دولت کدہ پرحاضر ہوا ملاقات میں بہت سارے موضوعات پر گفتگو ہوئی مولاناظفرنورانی اور شاعراسلام عمران گونڈوی موجود تھے ان دنوں علامہ اپنی کتاب کے ترتیب وتبویب میں مصروف ہیں مختلف موضوعات پر آپ کے گراں قدر مقالات اور مضامین کا عطر مجموعہ ہے آپ کی یہ کتاب جوانشاءاللہ ارباب علم ودانش کے لیے بیش قیمت تحفہ ثابت ہوگی ابھی کل یعنی 5 جنوری کوصبح قریب گیارہ بجے علامہ کافون آیااورانھوں نے بتایا کہ اہلیہ کواٹیک جیسی حالت کااحساس ہورہاہے ہاسپٹل اور علاج ومعالجہ کے حوالے سے گفت وشنید کے بعدفون رکھا کسے معلوم تھا کہ ان کاوقت پوراہوگیاہے اوروہ اپنے اہل خانہ کو روتابلگتا چھوڑ داعی اجل کولبیک کہنے والی ہیں رب العالمین حضرت علامہ الحاج وارث جمال صاحب اوران کے افرادخانہ کو صبرجمیل عطافرمائے نیز علامہ موصوف کوہمت وقوت عطافرمائے کہ صبروشکر کے ساتھ وہ اپنا علمی وفکری کام پایۂ تکمیل کو پہنچا سکیں میں ناچیز نورمحمدنعیم القادری بلرام پوری حضرت علامہ اوران کے شہزادگان کوتعزیت پیش کرتاہوں رب تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کوصبرجمیل عطافرمائے آمین یارب العالمین بحق طہٰ ویسین

نورمحمدنعیم القادری ،بلرام پور

آئینه در آئینه/روبرو

روزنامہ ''انقلاب''، ممبئی کا مولانا وارث جمال قادری صاحب سے ایک اہم انٹرویو
(بروز جمعہ ۲۸؍اکتوبر ۲۰۰۵ء)
رزقِ حرام تمام برائیوں کی جڑ اور تمام تر کمزوریوں کا سبب ہے

از: ندیم صدیقی

ہمارے معاشرے میں بالخصوص عوام میں لمبے کُرتے، شیروانی اور ریش ہی تقدّس کی علامت بن کر رہ گئے ہیں، ہر چند کہ دینِ حنیف میں معیار صرف تقویٰ ہے۔ یعنی عام لفظوں میں جسے کردار و عمل کی صفائی بھی کہا جا سکتا ہے اور یہ کردار و عمل ہی آج ہمارے طبقۂ خاص میں نایاب ہوتا جارہا ہے لیکن اِنھیں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اسلاف کے صحیح معنوں میں جانشین نہ سہی مگر ان سے گفتگو کر کے اسلاف و اکابر ضرور یاد آجاتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت یا احساس ممبئی میں مقیم مولانا محمد وارث جمال قادری سے مل کر ہوا۔

مولانا محمد وارث جمال قادری اُس سُنّی گروپ کے عالم سمجھے جاتے ہیں جسے معروف معنوں میں بریلوی حلقہ کہا جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں یہ خیال بھی کیا جاتا ہے کہ وہ ایک معتدل مزاج کے حامل عالمِ دین ہیں۔ ہم نے اسی خیال کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا اِس وقت آپ مسلمانوں کے تمام طبقوں، حلقوں یا مسلکی گروپس کے اتحاد کی ضرورت محسوس نہیں کرتے؟

ہمارے اس سوال پر ''اختلاف بین المسلمین اور اس کا پسِ منظر'' جیسی کتاب کے مصنف بالکل دوٹوک انداز اختیار کرتے ہوئے گویا ہوئے کہ ندیم صاحب! اس بے رحم حقیقت سے آپ جیسے لوگ یقیناً واقف ہیں کہ (مسلمانوں میں) مذہبی اتحاد ناممکن ہے۔ البتہ سیاسی، معاشی، ثقافتی اور اقتصادی بنیادوں پر اتحاد ممکن ہے اور اس کی ضرورت بھی محسوس کی جاتی ہے۔ اس دور میں جب کہ ہمارے وجود کا تحفّظ ہی ایک مسئلہ بن چکا ہو، ایسے میں اس کی ضرورت اور زیادہ ہو جاتی ہے بلکہ شدّت سے محسوس ہوتی ہے۔

سدھارتھ نگر (اُتر پردیش) کے ایک قصبے سے تعلق رکھنے والے مولانا محمد وارث جمال قادری اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہادتِ بابری مسجد کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے جسم و روح پر جو زخم لگے تھے، اس کے ردّ عمل کے طور پر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی، معاشی، ثقافتی اور اقتصادی (وغیرہ) اتحاد ہو جائے اور اس سلسلے میں مولانا ضیاء الدین بخاری نے کوششیں بھی کی تھیں۔

اس ضرورت پر اُس زمانے میں خاصا زور بھی دیا گیا تھا، بالخصوص بخاری صاحب اس ضمن میں بڑے فعال تھے اور ان کی شخصیت میں اللہ نے اثر و نفوذ بھی رکھا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ اُس وقت اس مسئلے میں مجھے مخلص بھی نظر آرہے تھے

مگر اللہ کو شاید کچھ اور ہی منظور یا مطلوب تھا۔ اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کچھ ممبئی کے خاص ہی نہیں عام مسلمانوں سے بھی پوشیدہ نہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں سے بنیادی یعنی حق و باطل کا اختلاف ہے، ہمارے عمائدین یا قائدین اُن لوگوں سے تو ملنا نہ صرف پسند کرتے ہیں بلکہ ان کی ہر تقریب میں شرکت کو افتخار کا درجہ دیتے ہیں۔ انھیں اپنی تقریبات میں بلانا اور ان کی شرکعت کو اپنی تقریب میں چار چاند لگانے سے کم نہیں سمجھتے، مگر جن سے کوئی بنیادی اختلاف نہیں یا جو اللہ اور رسول ﷺ برحق جانتے اور مانتے ہیں، ان سے دوری ہی نہیں بلکہ اپنی مسجدوں میں اُن کا نماز پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم نے اُن سے پوچھا کہ کیا مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں کوئی ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس شدّت سے باہر نکل آئیں؟ تو انھوں نے پھر نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس ضمن میں بھی مجھے اس وقت پھر ضیاء الدین بخاری یاد آرہے ہیں کہ ان سے میری اس مسئلے پر بھی خاصی گفتگو ہوئی، جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ بھی جانتے تھے بلکہ اقرار کرتے تھے کہ آج بھی وہ کتابیں ہمارے یہاں چھپ رہی ہیں اور پڑھائی جارہی ہیں جو اختلافات کی نہ صرف بنیادوں کی حامل ہیں بلکہ یہی انتشار کا سبب بنی ہوئی ہیں۔ ضیاء الدین بخاری نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر مجھ کو اللہ نے موقع دیا تو میں اس مسئلے میں بھی چاہے مجھے اپنے علما کے پیر پکڑنے پڑیں، میں ضرور اپنی سی کوشش کروں گا۔

آل انڈیا تبلیغ سیرت جیسی اہم تنظیم کے صدر نے یہ بھی کہا کہ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ ہم لوگ سخت گیر ہیں جبکہ میں نے جو حالات بتائے ہیں کہ وہ کتابیں اب بھی داخلِ نصاب ہیں جو اختلاف و انتشار کا سبب ہیں، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سخت کون ہے؟ جب یہ صورتِ حال ہو کہ ساری دُنیا میں مسلمان پٹ رہے ہوں مگر اس کے باوجود لوگ باگ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئیں تو ایسے میں ہم سے اتحاد کی توقع کرنا یا اِسے ہماری انتہا پسندی قرار دینا آخر کہاں کا انصاف ہے؟؟

مولانا وارث جمال قادری کا خیال ہے کہ برادرانِ وطن سے ہمارے اتحاد یا اتفاق کی بنیاد یا ذریعہ ہمارے بزرگانِ دین اور ان کی درگاہیں ہیں۔ ہمارے برادرانِ وطن جب کسی وقت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ یا ممبئی میں حاجی علی رحمۃ اللہ علیہ یا پھر حضرت بہاء الدین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے آستانے پر پہنچتے ہیں تو یقیناً یہ سوچتے ہوں کہ یہ اسی قوم کے سمراٹ ہیں جن کے خلاف ہم شمشیر بکف ہیں۔ یہاں مولانا وارث جمال قادری سوال کرتے ہیں کہ کیا یہ بات بھی ہمارے لیے سوچنے کی نہیں؟؟

تاریخ ہند اس بات کی شاہد ہے کہ یہاں اسلام کی تبلیغ و اشاعت صرف کسی جید عالم یا کسی کے علم سے نہیں ہوئی بلکہ اِنھیں بزرگانِ دین کے کردار و عمل نے یہاں اسلام کا اُجالا پھیلایا اور یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ ان بزرگانِ دین کے فیوض کا منبع عمل ہی نہیں علم بھی رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اپنے اسلاف اور اکابر کے اُسوہ کو بُھلا بیٹھے ہوں مگر اس غفلت سے

بزرگوں کا علم وعمل متاثر نہیں ہوتا۔

مولانا وارث جمال قادری اسی بات کو اِجمالاً یوں بھی کہتے ہیں کہ ہمارے اکابر کا یہ احسان ہے کہ ہم اس ملک میں جس طرح بھی ہیں مگر اپنا وجود رکھتے ہیں اور اس بات پر ہمیں فخر بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کہیں کسی جگہ مسلمانوں کی کوئی چھوٹی سی بات یا معمولی سی کمزوری میڈیا کے ہاتھ لگتی ہے تو وہ اُسے بہت بڑا مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں بلکہ اس پیش کش میں ایسا لگتا ہے کہ انھیں خود اپنی خبر پر اعتبار نہیں ہوتا کہ اُس جھوٹ کی مانند اسے زیادہ سے زیادہ بولا جائے تا کہ سادہ لوح عوام اسے سچ سمجھ لیں۔ اس تمام پس منظر میں ہمارے کچھ تشہیر پسند عالم نما حضرات بھی اپنا کردار ادا کرتے ہیں، جو عکسی میڈیا کے جھوٹ کو صداقت کا جامہ دیتے ہیں۔ اس فریب مسلسل کے خلاف آخر ہم ہندوستانی مسلمان کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہم اِس کے جواب میں کوئی منصوبہ رکھتے ہیں؟

ہمارے ان خیالات یا سوال کے جواب میں جامعہ اشرفیہ (مبارک پور، اعظم گڑھ) کے فارغ التحصیل مولانا محمد وارث جمال قادری افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس ضمن میں اجتماعی سطح پر تو نہیں البتہ انفرادی سطح پر ضروری مساعی جاری ہیں مگر ان کا دائرۂ کار بہت محدود ہے۔ وہ اس موضوع پر بھی سنجیدہ ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اس طرف فوراً سے پیش تر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ہمارا دشمن اس معرکے میں بہر طور قوی ہے اور اس کی رفتار بھی تیز تر ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بظاہر ہمارے یہاں سے وہی لوگ میڈیا تک پہنچتے ہیں جو علی العموم شعور و آگہی نہیں رکھتے اور اہلِ علم و اہلِ فکر میڈیا تک نہیں پہنچ پاتے یا میڈیا ان لوگوں تک نہیں پہنچتا، جبکہ ہر مکتب فکر میں صاحبِ صلاحیت لوگ موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کا بروقت جواب نہیں دیا جاتا۔

اس ضمن میں مولانا موصوف کوئی چاہتے تو ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اس میں ہماری طرف سے جتنی بھی تاخیر ہوگی وہ ہمارے لیے بہر حال پچھڑنے والی صورت پیدا کرے گی۔

ہر دَور میں اور ہر جگہ مسلمانوں پر دین کی تبلیغ واجب ہے اور یہ کارِ واجب اس دور میں بھی اور ہر طریقے سے انجام دیا جارہا ہے مگر اس کے نتائج جو برآمد ہونے چاہئیں وہ نہیں ہیں۔ ایسے میں دُنیا کا وہ دَور جب انسان مادّی طور پر اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا لیکن اُس دور میں تبلیغ دین کے نتائج مثبت نکلتے تھے لیکن ذرائع ابلاغ کی فراوانی کے اس زمانے میں جبکہ کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے تبلیغ دین کا فریضہ ادا نہ کیا جارہا ہو، مگر بغور دیکھیے تو نتائج حوصلہ افزا نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجوہ ہوسکتی ہیں؟

ہمارے اس سوال پر ۲۲ر کتابوں کے مصنف و مؤلف مولانا وارث جمال قادری نے دوٹوک لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اس کی اصل وجہ صرف اور صرف اخلاص کی کمی ہے۔ پھر انھوں نے اس حوالے سے یہ بھی کہا کہ اس وقت دُنیا جس نہج پر پہنچا دیا گیا ہے اور جو نظم دے دیا گیا ہے اُس میں ہمارا ہر طریقۂ کار یا ہمارا ہر کام معاش سے جُڑ گیا ہے، یعنی کہیں

نہ کہیں ہر کام میں ہمارے مفاد شامل ہوتے ہیں، البتہ کچھ لوگ اس سے بچ بھی جاتے ہیں مگر وہ اِلّا ماشا اللہ کے ہی ذیل میں آتے ہیں بلکہ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایسے لوگ دال میں نمک کے برابر ہیں۔

موصوف نے اسلاف کو یاد کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ لوگ خالص رضائے الٰہی کے لیے کام کرتے تھے۔ آج ایسا نہیں ہوتا۔ اب تو کسی نہ کسی سطح پر کہیں نہ کہیں ہمارے مفادات آڑے آجاتے ہیں، جس کا نتیجہ اظہر من الشّمس ہے اور پھر آپ ہم سب جانتے ہیں کہ ہر عمل کا نتیجہ نیت پر انحصار کرتا ہے۔ اسی موضوع پر مولانا وارث جمال قادری از خود کہتے ہیں کہ ہم اکثر اخبارات میں کہیں نہ کہیں، کسی دینی اِدارے کے قیام کی خبر پڑھتے ہیں مگر ہمارے یہاں تیرگی چھٹنے کی بجائے مزید اندھیرا ہوتا جارہا ہے اور پھر اچانک ان کی آنکھوں میں ایک چمک اُبھری اور وہ گویا ہوئے کہ اس صورتِ حال کا حل موجود ہے اور وہ حل ہے صرف اور صرف خوفِ خدا۔

انھوں نے اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ سچ یہ بھی ہے کہ اس دور میں ہمارے علما کے دلوں سے اللہ کا خوف ختم ہو چکا ہے۔ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے قابل اساتذہ کے تربیت یافتہ وارث جمال قادری بلا کسی تردّد جب یہ کہتے ہیں تو ہم جیسوں کو کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ اس کی وجہ رزقِ حرام کی فراوانی ہے اور حرام وحلال کی تمیز کا ختم ہوجانا ہے۔ اسی کے ساتھ و یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں احتساب کا عمل بھی ختم ہو چکا ہے۔

علما کے ہی موضوع پر وہ اپنی بات کو کتاب اللہ سے جوڑتے ہوئے فرماتے ہیں: قرآن شریف میں ہے کہ اللہ سے علم والے ہی ڈرتے ہیں۔ گویا کہ اللہ سے جو نہیں ڈرتا وہ لاکھ علم رکھتا ہو مگر قرآن کی اصطلاح میں ہرگز ہرگز وہ عالم نہیں۔ لہٰذا ہم جو اسلام کی نمائندگی کرتے ہیں، ہم سے ہی دینِ اسلام غیروں میں پہچانا جاتا ہے اور ہم نے اپنے منصب ومقام کو تج دیا ہے۔ رہے عوام تو وہ بے قصور ہیں، خطاوار تو ہماری مذہبی قیادت ہے یا سیاسی قیادت پر اس کی اصل ذمے داری ہے۔ لیکن عوام اس حد تک ضرور قصوروار ہیں کہ انھوں نے قیادت کا احتساب ترک کر دیا ہے۔

آخر اس صورتِ حال کو کیوں کر بدلا جاسکتا ہے؟ اس سوال پر مولانا موصوف کا خیال ہے کہ اس سلسلے میں جو لوگ درد مند دل رکھتے ہیں اور صاحب الرائے بھی ہیں انھیں اِکھٹا ہونا چاہیے اور ذاتی وسیاسی مفادات سے اوپر اُٹھ کر قومی وملّی مفاد کی خاطر مخلص ہو کر کام کرنا چاہیے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا تب تک اس صورتِ حال کا ختم ہونا (شاید) ممکن نہیں۔

وہ اس گفتگو کو اختتام پر پہنچاتے ہوئے بھی اپنی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ رزقِ حرام ہی ہماری تمام بُرائیوں کی جڑ ہے، تمام ترکمزوریوں کا سبب ہے۔ بقول حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہمیں سب سے پہلے اپنے لقمے کی اصلاح کرنی چاہیے۔

☑☑☑☑☑☑

MEMORANDUM

Date: 29/01/1999

in the committee of Nations. U.S.A..

has the Blackest record, of naked aggrressions, destructions, and political terrorism against otherweaker Nations of the World. In fact U.S.A., is the worst enemy of humanitythough it apparently plays the role of saviour of humanity.We all know that for the last 40 years it has imposed economicsanctions against CUBA, only to remove president Fedral Gastro.We all know its barberic role in SOMALIYA. We are aware that U.S.A.continued Bombing of VIETNAM for may years and by bombarding Nepalm Bombs. Thousand of hactors of greenary was burnt to ashes and agricul-tural lands became useless due to chemical reactions. In CAMBODIA itcontinued its aggressaion for 11 years and used chemical weapons indisS-criminately causing great loss of life and přoperty. IN LIBYA it suddenly firedmissiles in the dead of night on the place of colnel Ghadafi to kill him but heescaped and his son died. In SUDAN a Pharmaceutical plant was blown upby

misile attack alleging that it was terrorists den. Again to kll Osama-Bin-Laden, Afghanistan territory was under American missile attack andinnocent citizents were killed. NoW, more recently IRAQ was under misileattack and under bombordment of American and Brithis Bombers therehas been colossol lose of life and property, and the attack is still continueing.It is just a cursory glance of the menacing activities and politicalterrorism disployed by U.S.A. through out the world and specially Afro Asianand Middle East Countires were the target. This is all done by U.S.A. underthe Sacred name of Human Right.In 1968, the U.N. Conference of Human Right was held in Tehran. Allthe member natins constituted an obligation udner the Declation of HumanHigts. The Declation of Human Riaths contatined 30 Articles with regard tothe individual freedom and Rigths of human being. of the Land shall''PEOPLE of the'Article 21 states that"WILL be the basis of government.Ihe great change that occured in the international law since theSecond world war, is the extension of that law to individuals in all lands ofsovereign

states.Formerly intermational law was applied only to the Nations of the world.Citizens of nations could not seek redress from the intermnational communityin their own land. Now it is the concen and subiect metter of INTERNA-TIONAL LAW, how people are treated in their own LAND. It is notconsidered interference in the internal affairs of a country. Sovereignty of acOuntry is not absolute. Observation of and giving good human treatment toWith the change of concept of international law, since 1968, U.S.A.and its allies have exploited he situation from country to country tramplingtheir sovereignty and integrity by interfering in their affairs under somepretext or the other.It is high time that Middle East and Afro-Asian countries specially ourgreat country, INDIA, should jointly adopt a proper strategy to obviate suchexploitation of America and its alies from interfering in their affairs militarilyand without peaceful means.Amrica and Brithain or any other nation has No CONCERN, if thepeople of IRAQ consider SADAM HUSAIN as the supreme Leader, Justas Gandhigi and Jawaharla Nehru were the Supreme Leaders of

nation inIndia. By crying out destruction of Iraq and doing massacre of Iraqi people,Amrica can not change the Leadership in Iraq.American role in Irag is Dictatorial and that of political terrorism. TheU.S.A. and Britain want to terrorise other underdeveloped nations bydestroying Iraq, which they can not. The large scale killing and genocide ofthe people and children and imposing Economic Sanctions is most inhuman activity ofAmerica and its allies amounting to unprecedented Barborism in this mod-ern civilised world, wherein protection and safeguard is given even to wildanimals. America speaks from the Tower of Strength and pride and all otherAfro-Asian and Middle East nations face humiliation, death and destructionin the hands of American and its allies.The Missile &attack and Bombordment on the territory of Iraq byAmerica Britain is an act of Aggression, which, we strongly condemn anddemand adequate compensation to the victims. We also demand immedi-ate removing of Economic Sanctions against IRAQ. We also pray for theunity of Arab Nations.Ibring an end "to this Memorandum with this"Quranic Couplet.

(for other than man slaughterWhoever killeth a human-being"

in the earth, it shall be, as if, he had killed all(orcorruption

mankind, andwhosoever, saveth the life of one, it shall be as if

"he had saved the life of allmankind

Quran Surha 5/35

Sd.(MAULANA WARIS JAMAL QADRI

PRESIDENT

ALL INDIA TABLIGH-E-SEERAT

Presented to

The President of India.

The Prime Minister fo India.

The President of Iraq

MEMORANDUM

RESPECT FULLY SUBMITTED TO THE HON'BLE PRIME MINISTERAND HON'BLE FOREIGN MINISTER OF INDIA FOR THEIR KINDC ONSIDERATION

From: ALL INDIA TABLIGH-E-SEERAT

having its registered office at,

A-1, Ground Floor,

58, Habib Mansion,

Dimtimkar road, Nagpada,

Mumbai-400008

Date: 20th October, 2000:

1, The Hon'ble Prime Minister of India

Shri Atal Bihari Vajpai,

Prime Minister's Secretariat,New Delhi.

2, The Hon'ble Foreign Minister of India

Shri Jaswant Singh,

New Delhi.

Respected Sirs,

Sub: Evil designs of Israel to destroy Islamic Heritage and Holiest Monuments in Palestine.

On 28th September, 1897, in the world Jewish Conference held inSwitzerland, a unanimous resolution was passed in which it was decided to occupy enmass the Palestinian territory and to establish their Home-land. This is the starting point of Jewish evil designs for grabbing Arabterritory, with active support of Britain and the United States.Arabs could not tolerate this novel method of land grabbing and thenestablishing their own Sovereign Government. There was confrontation,between World-assembled Jews in Palestine and Arabs. Wars broke ourin 1948, 1956, 1967 and 1973 between them, With the active support orUnited States and Britain to Israel, Arabs were not successful n these wars.Jewish Home-land in Palestine had a far reaching consequence itras in fact not only the conspiracy against Arabs but a conspiracy againstthe uprising of Islam, which was vehemently opposed by Christians andIsrael, from its very incepton.The main Jewish

object in collusion with Christianity was not todisplace Arabs in Palestine from their own Home-land, and themselves toreplace them, but it was to destroy the Islamic heritage and holiest andmost revered shrines which formed the strongholds of Islamic History,Islamic precepts and Islamic , is one of the threeholiest Mosques of"Vision."Masjid-e-Aqsa the world which is located in Palostine in Jerusalem.Masjid-e-Agsa, has great Islamic History and significance. It is a LIVINGSYMBOL of Islam and its vision. The zionist open plan is to destroy anddemolish, Masjid-e-Aqsa and construct in the same place their HaikalSulemani. If it comes under their permanent control, they would do the sameand Muslims may be initially helpless, once it is demolished, which isunthinkable phenomenon.We Muslims are mainly concerned with the safeguard andprotection of such Islamic heritage in Palestine. Any permanent control ofIsrael of such Holy places, is unthinkabel and can not be tolerated, byMuslims throughtout the World.Our sentiments against Israel are based on the past

History of Israeland its anti-Islamic movements. Our sentimnts are also based on certainquranic ordains, and preceits.We may recall that our Government had in the past very cordialrelations with Arabs and it had always supported the cause of Arab againstInhuman acts of barbarism of Israel. Indo Arab Scoeity in Bombay iseXisting for more than 40 years. On 13.01.1988 a masSIVe processionWas taken out in Bombay, against Israel for tis Barbaric Killings ofInnocent Arabs. A number of Muslim organisations.had participated in itOur national leaders Mahatma Gandhi, Jawaharlal Nehru, Smt. India Gandhiand Rajiv Gandhi, always supported the Arab cause knowing the mischiefand conspiracy of Israel and its allies Britain and U. S. A.We are earning valuable foreign exchange from Arab countries, asthey have employed a good number of indians in their Establishments. Ourmutual friendship is reciprocal.We expect that our Indian Government shuld honour the feeligs ofmore than 20crore Indian Muslims for their purely Islamic interest inMasjid-e-Aqsa and other places in Palestine. It is our demand thatMasjid-e-Aqsa and

other Holy places should never go under thedomination and control of Israel and must remain with palestenian Arabs.The role of United States has been anti-Arab pro-Israeli America isapparently playing the role of Peace-keeper, but in fact it is not so. If ourGovernment takes up a just stand in view of the facts as stated above it willbe a great help to Islamic World and the Arabs Brothren wil highlyappreciate the same

Sd.MAULANA WARIS JAMAL QADRI

President,

ALL INDIA TABLIGH-E-SEERAT

JALLAH H. SHAIKH,

General Secretary.

ALL INDIA TABLIGH-E-SEERAT

علامہ وارث جمال ایک ہمہ گیر شخصیت

از محمد عاشق القادری عزیزی مصباحی

حضرت موصوف کی ذات وہ ہے جو ظلم وزیادتی کا جواب صبر واستقامت اور تحمل وبردباری سے دیتی ہے، جنہیں دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ جن کی اداؤں میں مرجع تصوف جلوے کار فرما ہیں، جو بازوئے مجاہد ملت ہے، جو رضویت کا علمبردار ہے، جو گلشن کا مہکتا گلاب ہے، جو چمنستان محبت میں نرگس مستانہ ہے، جو امن کا پیامبر ہے، جو دکھی دلوں کا سکھ ہے، جو بہتی آنکھوں کا پونچھنے والا ہے۔ جو پر غم زندگی کو مسرتوں کی بھیک دیتا ہے، جو اپنی عزت وآبرو کو مذہب وملت کے لیے داوں پر لگاتا ہے، جو غم گشتگان راہ کو انگلی تھما کر منزل سے ہمکنار کرتا ہے، جو شرافت کا مینار ہے، جو سادگی سراپا ہے، جو حرص وطمع سے بیزار ہے، جو مذہب کا کام اپنی ذات کے لیے نہیں کرتا بلکہ ناموس رسالت کی حفاظت کے لیے کرتا ہے، جو منبع اخلاص ووفا ہے، جو بے نفس خصلت کا مالک ہے، جن کی دعائے سحر گاہی کا لاکھوں کو انتظار ہے، جن کی آہ نیم شب سے سینکڑوں کی تقدیر بن جایا کرتی ہے، جو ابر رحمت ہے، جو خود تکلیف جھیلتا ہے پر دوسروں کو تکلیف سے بچا لیتا ہے، جن کا احساس زندہ ہے، جن کا ضمیر روشن ہے، جن کی نظر ماضی، حال، مستقبل پہ یکساں ہے، جو شعور وآ گہی کا درخشندہ آفتاب ہے، جو شان ولایت ہے، جو تحریک مجاہد ملت کا انتخاب ہے، جو الحاد وگمرہی، زندقہ وبے دینی کا خاتمہ آل انڈیا تبلیغ سیرت کے ذریعہ کیا ہے، جس کی شبانہ روز کی مصروفیات میں ملت کی آرزوؤں، تمناؤں کی بہتری پوشیدہ ہے، جو آئینہ کمال محبت ہے، جو آ گہی کو شعور اور شعور کو آ گہی عطا کرتا ہے، جو علما نواز اور علم دوست ہے، جو دین کا ہمدرد اور مسلک کا ترجمان ہے، جو اپنے آباواجداد کی پہچان ہے، جو تحریک اہل سنت کا امین ہے، جس کے سوز دروں سے آج بھی یہ آواز آتی ہے۔

سورج ہوں روشنی کی رمق چھوڑ جاوں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاوں گا
چمن میں پھول کا کھلنا تو کوئی بات نہیں
زہے وہ پھول گلشن بنائے صحرا کو

وہ علامہ وارث جو ایک عظیم مفکر مصلح قوم وملت پیکر اخلاق وشرافت اور باکمال مقرر ہے آپ کی تقریر عام تقریروں کی طرح نہیں آپ کی تقریر میں لطیفہ بازی عامیانہ باتیں شوقیانہ انداز اور ٹھٹا وتمسخر کا مواد نہیں ہوتا بلکہ صرف خلوص ومحبت حقانیت وصداقت عشق ورفاقت کا رعب شامل رہتا ہے جس کا اثر لوگوں میں ہوتا ہے آپ کا انداز بیاں

انتہائی باعظمت پروقار مشفقانہ وناصحانہ ہوتا ہے اور اصلاح عقائد کے ساتھ اصلاح اعمال کی بھی تلقین فرماتے اور آپ کے نزدیک مجمع کی قلت وکثرت کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ مقصد اصلی لوگوں کو سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے اور آپ صرف مقرر عالم وفاضل ہی نہیں بلکہ نہایت متقی وپرہیزگار اور پابند شریعت اور شیدائے سنت ہیں بنا بریں آپ اپنے آقا ومولی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نیازمندوں اور غلاموں کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت سے پیش آتے اور گستاخ رسول اور بدمذہبوں سے سخت نفرت وعداوت رکھتے ہیں وہ علامہ وارث ایک عظیم مفکر اور مصلح قوم وملت ہیں جن کی زندگی کے ایام ولمحات اصلاح قوم، تبلیغ اسلام اور نصرت دین میں گذرتے ہیں جب قوم مسلم کی بداعمالیوں اور بدکرداریوں کو دیکھتے تو بیتاب وبیقرار ہوجاتے اور ان میں انقلاب پیدا کرنے کی سچی لگن اور تڑپ آپ کے قلب وجگر میں انگڑائیاں لینے لگتی گویا قوم کی اصلاح وفلاح وبہبودی آپ کی زندگی کا نصب العین بن گیا ہے

وہ علامہ وارث جس کا دل عشق وفکر کی دولت سے مالامال ہے اور جس کا سینہ خدا کے نور سے روشن اور اس کے بازو میں مژدۂ لاتخف سے بے پایاں قوت ہے وہ ہر طاقت سے لڑتا اور ہر مصیبت سے بے پرواہ موت کو زندگی سمجھتا ہے اور وہ جنگ میں عزم وثبات کا پیکر اس کے ہاتھ میں قوموں کی ترقی ہوتی ہے اپنے عزم وعمل سے وہ زندگی کا نقشہ بدل دیتا ہے ان کی صحبت کیمیائی اثر رکھتی ہے وہ دوسروں میں بھی نصب العین کی تڑپ پیدا کردیتا ہے اور بے چین دلوں کو سوز آرزو بخش دیتا ہے آپ کے گوشہ زندگی اور مخلصانہ کردار وعمل کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ یقینا حضور علامہ کی زندگی مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور اصلاح عقائد واعمال میں گذرتی ہے جب بھی لوگ بھٹکنے لگتا

تو آپ اصلاح کی کوشش فرماتے۔ **صفات**۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ ایک مرد حق آگاہ اور خاصان خدا سے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے قلب وجگر میں تاجدار مدینہ کی محبت اور اولیاء اللہ خصوصاً سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالی عنہ کی الفت کا شعلہ دہک رہا ہے۔ آپ کا سینۂ پاک عرفان الہی کا مخزن ہے۔ ذہن وفکر کی گہرائیوں میں دین کے تحفظ کا تخیل ہے۔ اس لئے کبھی بھی آپ کی آواز حق کو طاغوتی اور باطل طاقت نہ دبا سکی اور نہ ہی آپ کو جادۂ حق میں پیش قدمی سے باز رکھ سکی۔ یوں تو راقم کو زیادہ وقت اور قربت نہیں ملی ہے مگر دو تین سفر میں طویل باتیں ہوئی ہیں۔ جب سن ۲۰۲۱ء میں حضور علامہ کو عرس مجاہد ملت و ترقی آل انڈیا تبلیغ سیرت کے لیے کسی زاویے دعوت دی گئی شوسیل مڈیا کے ذریعہ خبر نشر ہوگئی علامہ آرہے ہیں خواندہ طبقوں میں مسرت کی لہر ڈوڑنے لگی، مقررہ تاریخ میں سرزمین تلسی پور کٹک حضرت تشریف لائے حضرت سے ملاقات کے لیے بڑا اژدہام تھا ۔راقم اور بالخصوص علامہ مفتی محسن رضا ثقافی جیسا ہی ہم لوگ قیام گاہ پہنچے حضرت بے ساختہ کھڑے ہوگئے مصافحہ معانقہ کے بعد حضرت تب تک نہیں بیٹھے جب تک ہم کھڑے رہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کس قدر حضرت لوگوں کی قدر کرتے ہیں۔ یوں تو

علامہ کی شخصیت گونا گوں صفتوں سے متصف ہے آپ ایک باکمال صوفی ایک بلند پایہ عالم اور قوم کے سچے ہمدرد ہونے کے ساتھ ساتھ عابد شب زندہ دار، احکام الہیہ کے فرماں بردار، تبلیغ سیرت کے صدر نتہائی متحمل مزاج اور خاکسار ہیں۔آپ کی زندگی بیک وقت بہت سارے کمالات کا مظہر ہے-**خطاب**۔**علامہ وارث جمال قادری**۔تقریری پروگرام میں تشریف لے جاتے۔ نذرانے کا نہ تو کبھی مطالبہ فرمایا اور نہ ہی نذرانے کے سلسلے میں کوئی رقم مقرر فرمائی بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ جب لوگوں نے نذرانہ پیش کیا تو حضرت نے قبول فرما کر گاؤں کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں خرچ کردیا اسی پر بس نہیں بلکہ علاقے کے بچوں کو تحصیل علم کے لئے دور دراز علاقوں میں اپنے اخراجات سے روانہ فرمایا اور آپ کی شخصیت آل انڈیا تبلیغ سیرت اور مجاہد ملت کی قربت اور قلمی دنیا کو زینت بخش نے کی وجہ سے معترف ہے مگر موقع پر اچھوتے انداز میں علمی عملی سنجیدہ گفتگو فرمایا کرتے ہیں۔کچھ ماہ کی بات ہے خلیفۃ مشائخ کثیرہ حضرت علامہ مفتی محسن رضا ثقافی نائب قاضی ادارہ شرعیہ اڑیسہ نے ایک جلسے کی دعوت دی آپ نے دعوت قبول فرمائی اور ایک بار بھی نذرانے کا ذکر نہیں فرمایا اور بروز جلسہ پورا دن گھٹا ٹوپ بارش ہوتی رہی ہم لوگوں نے جانے سے ارادہ منقطع کرنا چاہا مگر حضرت کا جذبہ اس قدر عروج پر تھا کہ قبل از وقت تیار ہوگئے۔ آپ کچھ وقت خطاب فرمائے راقم زمانہ طالب علم سے بہت خواہش مند تھا کہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر جہاں طرز قلم کی روشنی پاتا تھا وہیں تقریر سننے کا بھی مشتاق تھا اس پروگرام میں آپ نے علم اور علما پر خطاب کیا **انما یخشی اللہ من عباہ العلما** پر تبصرہ وتفسیر فرمایا کہ اس آیت کے مصداق حضور مجاہد ملت حافظ ملت اعلی حضرت وغیرہ ہیں اور ہم لوگ ان کے زیروکس کاپی ہیں جیسے خانہ کعبہ کی تصویر جانماز وغیرہ میں ہوتی ہے اس کا احترام بجالایا جاتا ہے اس طرح ہم جیسے زیروکس کاپی کا عزت واحترام کیا جاتا ہے۔کما حقہ آپ کے سنجیدہ خطاب میں حضور مجاہد ملت کی عطا کردہ صلاحیتوں کے جولانیت مکمل طور سے نظر آتی ہے۔**قول وفعل**۔علامہ کی زندگی قول وفعل کی مطابقت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔حضرت موصوف میں کوئی ایسا واقعہ نظر نہیں آتا ہے جہاں قول وفعل میں تضاد نظر آتا ہو۔اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے ہمیشہ اپنی زندگی میں اپنے افعال کو اپنے اقوال کے مطابق رکھا تو بے جا نہ ہوگا، بلکہ ہمیشہ ہی اپنی گفتار کے مطابق ہی اپنے کردار کو پیش کیا۔ایسی بات نہ تھی کہ کہتے کچھ اور ہو کرتے کچھ اور ہو۔وعدے کے بھی سخت پابند ۔ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نظر نہیں آتا کہ انہوں نے وعدے کر کے وعدہ خلافی کی ہو۔کافی تجسس کے بعد بھی نگاہوں سے کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا کہ علامہ جو حکم دے رہے ہوں صادر فرمانے سے قبل میدان عمل میں خود پہلے قدم رکھا کرتے ہیں۔عزم وارادہ اتنا مستحکم کہ غیر تو غیر اپنے بھی اگر پیچھے ہٹ جائیں تو یہ شیر مرد مجاہد عہد پیری میں بھی ہمت وحوصلہ کے ساتھ آگے قدم بڑھاتے رہتے ہیں — علامہ وارث جمال قادری۔حدیث رسول ﷺ **العلماء ورثۃ الانبیاء**'' کے مطابق حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب صادق ہیں۔اس لئے ان کی عبقری شخصیت حسن اخلاق کا مجسمہ ہے۔ان کے عادات کریمانہ ہیں، وہ رقیق

القلب ،مزاج میں نرمی ہے، دل میں رحم کا جذبہ ہے، منکسر المزاج ہیں، ہمیشہ سچ بولتے ہیں، مہربان اور ہمدرد بھی ہیں۔آپ نے کبھی کسی کی دل شکنی نہ کی۔کبھی بھی آپ کی زبان سخت کلموں سے آلودہ نہ ہوئی۔ایک خصوصیت آپ کی یہ ہے کہ آپ کبھی کسی کے عیب اور کمزوری کا تجسس نہ فرماتے بلکہ ہمیشہ عفوخطااور بردباری سے کام لیتے ہیں۔بلاوجہ کسی سے مخالفت نہ فرماتے۔ہاں مخالفین حق سے کبھی بھی سمجھوتہ نہ کرتے بلکہ حق کی حمایت میں جاں نثاری کا جذبہ رکھتے۔شریعت مطہرہ کے احکام کے مطابق اپنی زندگی کے شب وروز گذارتے۔ **مقصد حیات** حضور علامہ کی کتاب زندگی کاایک ایک ورق قابل تعریف وستائش مصائب وآلام کے طوفان بداماں ماحول میں استقامت واستقلال کا کوہ گراں بن کراپنے مستقر پر قائم رہنا،اوراپنے مقصودعزیز کے فروغ میں جان بکف ہوکرصبرواستقامت کامظاہرہ کرنا،مالی منفعت سے بالکل بےنیازہوکرآقائے دوجہاں صلی اللہ تعالی علیہ وسلم کے دین متین کوحرزِجان سمجھ کرشب وروزاس کے فروغ میں منہمک ہوکرسربکف میدانِ عمل میں نکلنااعدائے دین وملت کی تمام ریشہ دوانیوں کے باوجودشجاعت وجسارت کے گوہ گراں بن کر دین حق اورعلوم نبویہ کی ترقی میں ہمہ وقت وسیع ترکوشاں رہنا،آپ کامقصدِحیات ہے۔آپ کواللہ تبارک وتعالیٰ نے بے پناہ خصوصیت کاحامل بنادیاعلم وعمل،اصابت فکرونظر،خوف وخشیت،معرفت ودرایت،تقویٰ وطہارت،عبادت وریاضت،اخلاق ومروت،انسانیت وشرافت،تفکرو تدبیر،صبروشکر،حلم وبردباری،وقاروطمانیت،عفوودرگزر،کرم وسخا،جودوعطااورتوکل واستغنا کے بحربے کراں ہیں۔

عاجزی وانکساری۔علامہ کی ذات تواضع وانکساری کامجسمہ ہے۔اتنے بڑے بڑے عالم فاضل محقق مدبرمفسر،حق گوہونے پر بھی آپ میں عاجزی اورملنساری بدرجۂ اتم موجود ہے۔عوام عرصۂ دراز سے یہ مشاہدہ کرتے چلے آرہے ہیں۔آپ کے صرف لباس اور چال ہی میں سادگی اورانکساری کی جھلک نہیں پائی جاتی ہے بلکہ دنیا کے سارے معاملات میں آپ تواضع سے کام لیا کرتے ہیں۔علمافضلا کی بات تو الگ ہے اگرکسی اورغیرعالم کی بھی عزت فرمایا کرتے ہیں جیسا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے عالی جناب سراج رضوی وغیرہ کے آپ کی عزت واحترام کرتے ہوئے۔یہ ایک بہت بڑی خوبی ہے جس کوقطعاً نظرانداز نہیں کیاجاسکتااورحقیقت یہ ہے کہ حضرت کایہی مشفقانہ فعل ان کی ہردلعزیزی اور برتری کابین ثبوت ہے۔راقم الحروف اس امر میں ذکرکرنامناسب سمجھتا ہے کہ عاجزی وانکساری کابحرذخاروِلی نعمت مرشد برحق حضور مجاہدملت کے کرامت کی شکل میں آپ کومیسر ہوا ہے اس مختصر تحریر میں چند باتیں جودیکھا سمجھااورموازنہ کیا ہے اسے حیطہ تحریر میں پیش کرنے جسارت کی ہے ان جیسے شہرہ آفاق شخصیت پرمکمل کام ہوناچاہئے مگرآپ کی کتاب میں چندمضامین شامل کی گئی ہیں جومضمون نگار کے لیے ایک روشنی ملے گی۔ اللہ سے دعا ہے کہ حضرت کو بےشمار نعمتوں سے مالامال فرمائے اورآپ کے فیوض وبرکات سے مالا فرمائے آمین سیدالمرسلین ۔

ادیب شہیر، رئیس التحریر، صاحبِ تصانیف کثیرہ، حجۃ الخلف، یادگارِ سلف حضرت مولانا محمد وارث جمال قادری یار علوی کی حیات وخدمات کا جائزہ لیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ آپ کا سینہ خشیت ربانی سے معمور اور آپ کا لمحہ حیات انوار وتقوی سے پر نور ہے آپ کا ہر عمل اطاعت خداوندی کا مظہر اور آپ کی ہر ہر ادا سنت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ترجمانی ہے اور عشق مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رنگ میں ایسا رنگ لیا ہے کہ خلوت وجلوت ظاہر وباطن اقوال وافعال واطوار حرکات وسکنات نشت وبر خواست غرضیکہ آپ کی شخصیت کو جس ضابطہ سے دیکھا جائے عشق رسول کا جلوہ نظر آئے گا ۔مال ودولت، حکومت واقتدار دنیا کی لذت ودلکشی دراصل زندگی کے راستے کی جھاڑیاں ہیں جن میں پھنس کر انسان اپنی منزل کو بھول جاتا ہے مگر راقم نے حضرت علامہ صاحب کے توشہ حیات اور کارناموں کا مطالعہ کیا تو صاف وشفاف آئینہ کی طرح دیکھا خلوص للہیت عدل وانصاف ایثار وقربانی علم وبردباری امانت و دیانت داری میں اپنی مثال آپ ہیں آپ نے کردار وعمل کی ایسی صدہا قندیلیں روشن کی ہیں جسے عوام وخواص فراموش نہیں کرسکیں گے۔ ویسے تو حضرت علامہ بے شمار خوبیوں کے حامل ہیں۔مگر جو کارنامے آل نڈیا تبلیغ سیرت رجسٹرڈ کے پلیٹ فارم سے کہ جس کی گونج عرب وعجم میں سنی گئ وہ ناقابل فراموش ہیں اور آپ کی ساری کتابیں پوری دنیا میں مقبولیت کا درجہ رکھتی ہیں قارئین آپ کی کتاب پڑھتے وقت ایک قلبی سکون محسوس کرتے ہیں زیر مطالعہ آئینہ حسن خوباں کتاب حضرت کے کارناموں کی ایک جھلک ہے انشاء اللہ جلد دوم میں حضرت کے سارے دینی کارناموں کو پیش کیا جائے گا خدائے تعالی حضرت کی عمر میں بے شمار برکتیں عطا فرمائے ۔آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین۔

از محسن رضا ثقافی
مرکزی جنرل سکریٹری
آل انڈیا تبلیغ سیرت ممبئی

آل انڈیا تبلیغ سیرت
R

Tel.: 300 16 86
386 70 45
308 47 52
Fax: 305 21 39

A-1 گراؤنڈ فلور ۵۸/حبیب منزل ڈمٹمکر روڈ، ناگپاڑہ، بمبئی ۸
ALL INDIA TABLIGH-E-SEERAT (REGD.)
A-1, Ground Floor, 58/Habib Manzil, Dimtimker Road, Nagpada, Bombay-400 008.

Ref.______ Date______

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میمورنڈم برائے تحفظ بغداد کانفرنس

منعقدہ ۲۹/جنوری ۱۹۹۹ء مطابق ۱۰/شوال المکرم ۱۴۱۹ھ

۱ **آل انڈیا تبلیغ سیرت کی یہ عظیم "تحفظ بغداد کانفرنس"** امریکا و برطانیہ کی اس دہشت گردی کی مذمت کرتی ہے جو اس نے عراق پر بمباری و معاشی ناکہ بندی کی صورت میں مسلسل کر رکھی ہے اور امریکا سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس تازہ بمباری سے عراق کا جو نقصان ہوا ہے اس کی فوراً تلافی کرے اور عراق پر بمباری کا سلسلہ فوراً بند کرے یوں ہی "لیبیا" پر جو اس نے فضائی پابندی عائد کر رکھی ہے اُسے فوراً ختم کرے۔

۲ آج کی یہ عظیم کانفرنس "اقوام متحدہ سلامتی کونسل" سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ عراق سے معاشی و سیاسی پابندی کو فوراً ختم کرے اور امریکا کو لگام دے کہ وہ دہشت گردی اور عالمی پیمانے پر اپنی من مانی کو ختم کرے۔

۳ آج کی یہ کانفرنس عالم اسلام سے یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ عالمی سطح پر اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے عراق پر ہو رہے مظالم کو بند کرانے کی سنجیدگی سے کوشش کرے اور حکومت ہند کے باا ثر ذمہ داروں سے یہ اپیل کرتی ہے کہ وہ بین الاقوامی سطح پر اپنے عراقی بھائیوں کی پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے کوششیں کرے۔

۴ آج کی یہ عظیم کانفرنس افریقی و ایشیائی ممالک سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے مقابلے کے لئے اپنا ایک بلاک خود بنائیں کیونکہ اقوام متحدہ اب صرف بڑی طاقتوں کی آلہ کار بن کر رہ گئی ہے۔

۵ آج کی یہ عظیم الشان کانفرنس انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ انسانیت کے احترام میں انسانیت کے نام پر عراق، لیبیا، سوڈان، افغانستان، کیوبا، انڈونیشیا، فلسطین، بوسنیا، البانیہ وغیرہ پر جاری امریکہ کی سیاسی دہشت گردی پر روک لگانے کی اپنی کوششیں تیز کردیں، اور امریکہ کو انسانیت کی تذلیل سے روکیں۔

محمد وارث جمال قادری
مرکزی صدر آل انڈیا تبلیغ سیرت

CONSULATE GENERAL
OF THE
REPUBLIC OF IRAQ
203, WALKESHWAR ROAD, BOMBAY-400 006.

القنصلية العامة
للجمهورية العراقية
بومباي
٢٠٣ ، شارع والكيشور بومباي - ٤٠٠٠٠٦

R.NO.: العدد :

Date: January 4, 1991. التاريخ :

The Protector of Immigrants,
Regional Passport Office,
Khira Nagar,
Santa Cruz,
Bombay.

Dear sir,

We are pleased to request you to clear immigration formalities for the undermentioned five gentlemen :

1. Mr. Rashid Tayab - A-071149(P.P.No.)
2. Mr. Hussain Akhar - A-858866
3. Mr. Mohammed Waris Jamal Mohammed Munif R-820935
4. Mr. Syed Anwar Ashraf -F-550527
5. Mr. Ghulam Abdul Qadir Alvi - A-312696

The above mentioned gentlemen have been invited to visit Baghdad by the Government of Iraq, hence all travel arrangements, ticketing and expenses will be borne by the Government of Iraq, viz. our Embassy in New Delhi.

We confirm that the air ticket to Baghdad, via Jordan by Jordaniar airlines from New Delhi to Amman (Jordan) onwards to Baghdad have been booked by our Embassy in New Delhi. It may be noted that this delegation of the All India Tabligh e Seerat isscheduled to fly to New Delhi tonigh by IC 183 at 20.50 hours and are flying to Amman early morning at 6.a.m.tomorrow i.e.5.1.91 Therefore, they shall not have time to clear immigration formalities in New Delhi as their stay is less than four hours. Their tickets will be handed over to them only upon their arrival in Delhi Airport.

You are requested to kindly do the needful and oblige.

Thanking you,

Yours faithfully,

Amer Naji

Amer Naji
Consul General

CONSULATE GENERAL
OF THE
REPUBLIC OF IRAQ
203, WALKESWAR ROAD,
PANORAMA 1ST FLOOR,
BOMBAY-400 006.

قنصلية الجمهورية العراقية العامة
بومبي

R. No.: الرقم

Date : October 14, 1992. التاريخ

Moulana Warth Jamal Qadri,
All India Tabligh e Seerat,
Bombay.

Dear sir,

We are pleased to extend to you, an invitation from the Ministry of Awqaf and Religious Affairs, Government of Iraq, to attend the Popular Islamic Conference to be held in Baghdad from 25th to 27th November 1992.

Due to the present economic situation which our country is facing under the embargo, the Government will bear all expenses from the time of your arrival in Jordan, including all expenses of your stay in Baghdad etc. and return trip to Jordan. The expenses for the ticket for the Bombay-Jordan-Bombay return trip will be borne by the invitee.

Kindly convey your acceptance at the earliest.

Thanking you,

Yours faithfully,

Raad Khalil
Consul General

بسم الله الرحمن الرحيم

سفارة جمهورية العراق
دلهي الجديدة

EMBASSY OF THE
REPUBLIC OF IRAQ
169-71, Jor Bagh
NEW DELHI-110003

التاريخ/1999/1/23

السيد محمد وارث جمال قادري
رئيس جمعية تبليغ السيرة لعموم الهند المحترم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

التقينا صباح هذا اليوم 1999/1/23 مع الوفد الذي ارسلتموه الى العاصمة نيودلهي من جمعيتكم الموقرة. نشكركم على مواقفكم النبيلة التي تعبر عن الاخوة الصادقة ونؤكد لكم بان ممثل من السفارة سيحضر مؤتمركم الذي سيعقد يوم 1999/1/29.

مع خالص الشكر والتقدير.

القائم بالاعمال المؤقت
محسن رضا هادي
1999/1/23

بسم الله الرحمن الرحيم

منظمة المؤتمر الاسلامي الشعبي
الامانة العامة

1 شارع المغرب - بغداد - العراق
تلفون ٥٤٢١٢٥٦٤٢١
٢٥١١١٩
٢٥٢٣٣١
تلكس ٢١٣٧١١ مؤتمر - لامي

العدد/
التاريخ/ ٢٠ ربيع الاول ١٢
٢٨/١٠/١٩٩١م

اتفاقية تعاون بين

منظمة المؤتمر الاسلامي الشعبي وجمعية تبليغ السيرة لعموم الهند

انه بتاريخ ٢٠ ربيع الاول ١٤١٢هـ الموافق ليوم ٢٨/١٠/١٩٩١م تم عقد اجتماع بين ممثلي جمعية تبليغ السيرة لعموم الهند والسيد الدكتور عرفان عبدالحميد فتاح الامين العام لمنظمة المؤتمر الاسلامي الشعبي ببغداد - العراق . وبحضور بعض اعضاء المجلس التنفيذي للمنظمة . حيث تمت مناقشة قضايا الدعوة الاسلامية وما تتعرض له العقيدة الاسلامية من تحديات تستهدف تشويه وتحريف مقاصدها الانسانية النبيلة . وكذلك ما تتعرض له البلاد العربية والاسلامية من غزو امريكي صهيوني صليبي يستهدف وجودها الحضاري واغتيال آمالها في الحياة بخاصة القطر العراقي العربي المسلم الأبي، باعتباره قلعة الصمود والتصدي لمخططات اعداء العروبة والاسلام .

تدارس الطرفان السبل الكفيلة بمقاومة هذه التحديات بما يخدم الاسلام والمسلمين ويعزز وحدتهم وتضامنهم لمواجهة الاخطار المحيطة بهم وقد تم الاتفاق على ما يأتي:

١ - التعاون والتنسيق بين منظمة المؤتمر الاسلامي الشعبي ببغداد - العراق وجمعية تبليغ السيرة لعموم الهند في مجال عقد المؤتمرات والدعوة اليها وتوحيد المواقف فيها .

٢ - عقد لقاءات دورية في كل من بغداد والهند بين المنظمة والجمعية لوضع الخطط ومتابعة تنفيذها وتبادل الخبرات والاساتذة والمحاضرين .

٣ - التعاون والتنسيق في مجال مكافحة الحركات الهدامة ومناهجها الفاسدة عن طريق :

أ - طبع الكتب والدراسات التي تفضح عقائدها الفاسدة وتحذر المسلمين من الانخداع بها .

ب - طبع الدراسات الجيدة وترجمتها الى اللغات الحية .

جـ - التعاون في مجال كتابة وطبع وتوزيع المنشورات والدراسات الصادرة عن المنظمة والجمعية .

بسم الله الرحمن الرحيم

منظمة المؤتمر الاسلامي الشعبي
الأمانة العامة

١ شارع المغرب - بغداد - العراق
تلفون ٤٢٥٦٤٢٤
٤٢٥٦٦١٩
٤٢٥٢٣٣٤
تلكس: ٢١٢٧١١ مؤتمر اسلامي

العدد/
التاريخ/

د - عقد الندوات والمؤتمرات واللقاءات الكفيلة بتبصير الرأي العام الاسلامي في المخاطر التي تهدد العقيدة الاسلامية والوجود الاسلامي

ع - العمل على تخصيص مقاعد دراسية في المعهد الاسلامي العالي للامامة والخطابة وجامعة صدام للعلوم الاسلامية ببغداد لعدد من ترشحهم جمعية تبليغ السيرة لعموم الهند .

كتب ببغداد في يوم الاثنين ٢٠ ربيع الاول ١٤١٢هـ الموافق ٢٨/تشرين الاول /١٩٩١م.

ممثلو جمعية تبليغ السيرة لعموم الهند	منظمة المؤتمر الاسلامي الشعبي
الشيخ الطهر حسين القادري	الدكتور عدنان عبدالحميد فتاح
الامين العام لفرع الجمعية في مهارا اشترا	الامين العام
Rashid Teyeb	
رشيد طيب القادري	الدكتور عبدالمنعم احمد صالح
مسؤول الشؤون الخارجية	الامين العام المساعد

EMBASSY OF THE
REPUBLIC OF IRAQ
169-171, Jor Bagh.
NEW DELHI-110003

سفارة جمهورية العراق
دلهي الجديدة

July 16, 1992

Dear Mr. Rashid Tayab,

I would like to thank you and our brothers:
Syed Mohammed Hashemi
Maulana Waris Jamal Sabri
Maulana Athar Hussain
Maulana Arif

for the kind representation of Tabligh-E-Seerat and salute you all before my departure.

I am leaving the friendly country India on 1st of August, 1992 at the end of my seven years tenure, so I would like to express to you and all other members of Tabligh - E - Seerat my profound thanks for your kind cooperation during my stay here. You will always have a brother in Baghdad and I look forward to see you there. My private address in Baghdad is:

Dr. Abdul Wadood Shekhly,
ZUQAQ (Lane No.20) House No.34,
Al-Yarmouk 612,
Baghdad - Iraq (Telephone No.5410562)

Eventually I wish you all the best of health, happiness and welfare.

Assuring you of my highest appreciation and God Bless you.

Yours sincerely,
A.W. Shekhly
Dr. A.W. Shekhly
Ambassador

Mr. Rashid Tayab,
G.N. Commercial Agencies (Regd),
43, Piru Lane,
Bombay - 400 009

الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ

وعلی آلک واصحابک یا حبیب اللہ



عبدالقادر جیلانی

علم ودانش کی ترقی پذیر تربیت گاہ

مرکز الدراسات الاسلامیۃ الجامعۃ القادریۃ

MARKAZUD DARASATIL ISLAMIA

AL JAMIATUL QUADRIA

Pachhim Kachh Madhiya Kachh Satbatia Jagatpur Cuttack Odisha

زکوۃ، صدقہ، فطرہ یہاں ادا کریں

SCAN AND PAY YOUR ZAKAAT, SADQA, FITRAH



ASSALAMO ALAIKUM

Al-Jamiatul Quadria needs zakaat and sadaqua funds

I need to atate that Al-Jamiatul Quadria at Satbatia, Cuttack, (Odisha) a poor state of India. In this madrasa poor students are being provided islamic education as well as Modern English Medium Education (CBSE) pattern along with food and accoinmodation at free of cost. Medical faci are also being provided to those students from madrasa itself.

Tharefore we request kindfy help this poor madrasa.
Madrasa will gratetul and thinks to you,

May Allah will give all your needs and helps forevar.

OUR'S BANK

STATE BANK OF INDIA
A / C Name :-
ABDUL HAKIM EDUCATIONAL AND WELFARE TRUST
A / C No. 38511059623, IFSC. SBIN0003942 SALIPUR ADB

Madrasa Committee Satbatia Jagatpur Cuttack Odisha

S. SADRUDDIN SB	M.MD ASHIQUL QUADRI SB	M.MOHSIN RAZA SAQAFI SB	DR MD NOOR SB
PRESIDENT	NAAZIM E ALA	SECRETARY	CASHIER
9237000025	9853757574	9658133151	7008810815

شائع کردہ



"آئینۂ حسنِ خوباں: ایک مستحسن کام

بسم اللہ الرحمن الرحیم حامداً و مصلیاً و مسلماً

مجھے یہ جان کر بے پایاں مسرت ہوئی کہ حضرت مولانا وارث جمال مدظلہ العالی کی حیات اور کارناموں پر ایک کتاب مرتب ہو رہی ہے۔ بلا شبہ یہ ایک مستحسن کام ہے۔ ان کی خدمات کو پڑھ کر بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے ان کے خطوط پر کام کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ مولانا موصوف سے میرا تعلق ان کے زمانہ طالب علمی سے آج تک قائم ہے۔

مولانا نے زیادہ تر تعلیم براؤں شریف کے مشہور دار العلوم میں حاصل کی۔ ان کا زمانہ طالب علمی العلوم براؤں شریف کا انتہائی تابناک زمانہ تھا اور جامعہ اشرفیہ کے بعد وہاں کے نظم و نسق اور تعلیم کا شہرہ پورے ملک میں تھا۔ مولانا وارث جمال کے اساتذہ میں سے حضرت علامہ بدر الدین علیہ الرحمہ اور حضرت علامہ مفتی جلال الدین علیہ الرحمہ وغیرہ تھے۔ براؤں شریف کے بعد انھوں نے اپنی تعلیم الجامعۃ الاشرفیہ سے حاصل کی اور اس زمانے میں استاذ العلماء سیدی حافظ ملت اور حضرت علامہ عبد الرؤف صاحب نائب شیخ طریقت، نیز بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب علیہم الرحمۃ والرضوان جیسے عظیم اور عبقری شخصیات مسند تدریس پر فائز تھیں۔ اس کے بعد اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے سیبویہ وقت اور اخفش زماں حضرت شیخ العلماء حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی علیہ الرحمہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

براؤں شریف میں آپ نے شعیب الاولیاء جناب صوفی یار علی صاحب علیہ الرحمہ کے فیض صحبت سے فیض یاب ہوئے، جو اپنے تقویٰ، عبادات اور اخلاص و دردمندی کے اعتبار سے بہت ممتاز تھے۔ وہ نماز باجماعت کے بہت پابند تھے اور سفر و حضر میں اپنے ساتھ ایک خادم اور ایک حافظ کو رکھتے تھے۔ جو جماعت کے نظام کو قائم رکھ سکے۔ غالباً وہ صاحب ترتیب بزرگ تھے۔ مشرقی یوپی بالخصوص براؤں سے نیپال تک انھوں نے مسلک کے تحفظ میں عظیم کارنامہ انجام دیا۔ میں نے ان کی زیارت ناپارہ کے زمانہ تدریس میں ۱۹۶۳ء میں کی اور دو روپے سے نوازا گیا۔ میں ان سے بہت متاثر ہوا اور یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی ان کے نقش قدم کی اتباع کر سکتا۔

مولانا ایک اچھے ادیب اور مصنف ہیں اور اپنے معاصر علماء اور ادباء سے آپ کی مراسلت تھی۔ جن میں حضرت علامہ ڈاکٹر پروفیسر مسعود صاحب قبلہ، علامہ فیض احمد اویسی، حیات اللہ انصاری مدیر قومی آواز لکھنؤ، شمیم مظفر پوری سے مراسلت ان کے علمی اور ادبی ذوق کی شہادت کے لیے کافی ہے۔ یوں تو مولانا موصوف اپنے دور کے جملہ اکابر سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر مفکر مجاہد ملت حضرت مولانا سید حبیب الرحمن صاحب سے بہت متاثر ہیں اور ان کی تحریک خاکساران حق نیز تبلیغ سیرت سے وابستہ رہے۔ ان کے زمانے میں تبلیغ سیرت ایک بہت ہی نمایاں تحریک ہے اور مختلف اخبارات و رسائل میں تحریک کی تائید میں مولانا کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے مراسلات کا انگلش ترجمہ بھی انگریزی اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ کاش یہ سارے مواد ان کی کتاب میں موجود ہوں۔

اپنے معاصر بزرگوں میں علامہ ارشد القادری، خطیب مشرق علامہ نظامی سے بہت قریب رہے۔

وہ ایک بہت اچھے قلم کار ہیں۔ ان کی تحریریں انتہائی معیاری ادب پارے کا نمونہ اور شگفتہ ہیں۔ قاری ان کو پڑھتے وقت کہیں بھی اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔

علمی اور ادبی کتابوں کے علاوہ انھوں نے تحریک خاکساران حق کا تعارف، حج کانفرنس نمبر، ہندو دھرم قوم مجاہدین آزادی، اسلام اور شادی، جنگی پلوں کا بوجھ اور سفرنامہ عراق وغیرہ تحریر کیں۔ انھوں نے تحریک تبلیغ سیرت کے پلیٹ فارم سے عراق کا سفر کیا اور وہاں کے عمائدین سے ملاقاتیں کیں۔ میرے نزدیک غالباً انھوں نے بابری مسجد کے حوالے سے مجاہد اول اور شہید حضرت مولانا امیر الدین علی امیٹھوی کا ذکر بھی کیا ہے، جن کا مزار ردولی کے قریب شجاع گنج کے پاس ہے۔

ان کی شہادت کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے واجد علی شاہ کے زمانے میں بابری مسجد کو رام جنم بھومی کے نام سے مشہور کیا اور ہندوؤں کو اکسایا کہ وہ رام جنم بھومی کو آزاد کرائیں۔ اس زمانے میں اجودھیا کے ہندوؤں نے اس پر قبضہ کر لیا، جس کو آزاد کرانے کے لیے مولانا امیر الدین علی نے واجد علی شاہ کی اجازت سے ایک فوج تیار کی اور اجودھیا کے لیے روانہ ہوئے۔ ادھر انگریزوں نے ہندوؤں کو آمادۂ جنگ کیا اور ادھر واجد علی شاہ سے کہا کہ امیر علی طاقت ور ہو رہے ہیں۔ انھیں اجودھیا پہنچنے سے پہلے شہید کر دیا جائے۔ چنانچہ اجودھیا سے ہندوؤں کی فوج اور لکھنؤ سے واجد علی کی فوج روانہ ہوئی۔ مولانا امیر علی کو حالات کی نزاکت کا ادراک ہوا۔ چنانچہ انھوں نے شہادت سے ایک روز قبل یہ رباعی لکھی۔

بذکر حق سراپا گوش دارم — مے حب علی در جوش دارم
سنو تاریخ من قبل از شہادت — سر میدان کفن بر دوش دارم

سر میدان کفن بر دوش دارم سے ان کی تاریخ شہادت نکلتی ہے۔ یہ رباعی آج بھی ان کے لوح مزار پر تحریر ہے۔ مگر لوگ ناواقف ہیں۔ یہ میری اپنی تحقیق ہے۔ مگر مولانا وارث جمال کی تحقیق اس کے برعکس ہو تو اسے قلم زد کر سکتے ہیں۔ بہرکیف میں ان کی حیات اور کارناموں پر مشتمل کتاب کا انتظار کروں گا اور ان کے صاحبزادے سے درخواست کروں گا کہ وہ ان کی کتابیں دوبارہ شائع کرا کر اہل علم تک پہنچائیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ مولانا موصوف کو ان کی خدمات کا بہترین صلہ دے۔ آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

مفکر اسلام حضرت علامہ قمر الزماں خان اعظمی
جنرل سکریٹری ورلڈ اسلامک مشن انگلینڈ